بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا

سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء

شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ

سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)

۵۔ لوئر مال ○ سیمنٹ مکہ سنٹر ○ اردو بازار ○ لاہور۔

فون: 042-37361460, 0321-320-9464017

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمۃ اللہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ۔۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی ۵۔ لوئر مال ۰ بیسمنٹ مکہ سنٹر ۰ اردو بازار ۰ لاہور

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

لا إله إلا الله محمد رسول الله

فہرستِ مضامین

***

سُورَةُ آلِ عِمْرٰنَ

آیاتها ۲۰۰ ۳ سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ ۸۹ رکوعاتها ۲۰

سورۂ آل عمران مدنی ہے، اس کی ۲۰۰ آیتیں اور بیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

الٓمّٓ ۝۱ اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، زندہ ہے تھامنے والا ہے ۝۲ اُتاری اُس نے آپ پر کتاب جو حق پر مشتمل ہے،

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ

تصدیق کرنے والی ہے اُس چیز کی جو اس سے پہلے ہے، اور اتاری اُس نے توراۃ وانجیل ۝۳ اس کتاب سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے،

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ

اور اتاری اُس نے حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز، بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اُن کے لئے

عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ

سخت عذاب ہے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام والا ہے ۝۴ بیشک اللہ، نہیں چھپتی اُس پر کوئی چیز

فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ

زمین میں اور نہ آسمان میں ۝۵ وہی ہے جو تمہاری تصویر بناتا ہے رحموں میں جیسے چاہتا ہے،

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ

کوئی معبود نہیں مگر وہی، زبردست ہے حکمت والا ہے ۝۶ اللہ وہ ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری، اس کتاب میں سے کچھ آیات

مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ

محکم ہیں، وہی آیات کتاب کا اصل ہیں، اور کچھ اور آیات متشابہ ہیں، پھر وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڱ

وہ پیچھے لگ جاتے ہیں ان آیات کے جو اس کتاب میں سے متشابہ ہیں فتنہ تلاش کرنے کے لئے اور ان کا مطلب طلب کرنے کے لئے،

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ

حالانکہ نہیں جانتا ان آیاتِ متشابہات کی تاویل کو مگر اللہ، اور وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان لے آئے،

كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ رَبَّنَا

ہر قسم کی آیتیں ہمارے ربّ کی طرف سے ہیں، اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے ⑦ اے ہمارے پروردگار!

لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ

ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں سیدھے راستے پر چلایا، اور عطا کر ہمیں اپنے پاس سے رحمت، بیشک تو بہت

الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ

عطا کرنے والا ہے ⑧ اے ہمارے پروردگار! بیشک تو اکٹھا کرنے والا ہے لوگوں کو ایسے دن میں جس کے آنے میں کوئی شک نہیں،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ ع

بیشک اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتا ⑨

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ الٓمّٓ: یہ حروفِ مقطعات ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، اِن حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ بہتر جانتے ہیں۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، زندہ ہے، تھامنے والا ہے، نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: اُتاری اُس نے آپ پر کتاب ٹھیک، جو مشتمل ہے حق پر، حق کے بیان پر مشتمل ہے، مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: تصدیق کرنے والی ہے اُس چیز کی جو اس سے پہلے ہے، وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: اور اتاری اُس نے توراۃ اور انجیل، مِنْ قَبْلُ: اِس کتاب سے پہلے، هُدًى لِّلنَّاسِ: لوگوں کی ہدایت کے لئے، وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ: فرقان: الفارِق بین الحق والباطل، اس سے انبیاء ﷩ کے معجزات مراد ہیں، ''حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز اس نے اُتاری''، اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے ہیں، لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: اُن کے لئے سخت عذاب ہے، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ: اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ: بیشک اللہ، نہیں چھپی اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں، فِي الْاَرْضِ اور فِي السَّمَآءِ یہ دونوں شَيْءٌ کی صفتیں ہیں، یعنی ایسی شَیْ جو زمین میں ثابت ہو اور ایسی شَیْ جو آسمان میں ثابت ہو، وَلَا فِي السَّمَآءِ میں جو لَا ہے یہ لَا يَخْفٰى والے لَا کی تاکید ہے، هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ: وہی ہے جو تمہاری تصویر بناتا ہے، فِي الْاَرْحَامِ: رحموں میں، كَيْفَ يَشَآءُ: جیسے چاہتا ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ

اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ: اللہ وہ ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری، مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ: اُس کتاب میں سے کچھ آیات محکم ہیں، جن کی مراد بالکل واضح ہے جس میں کوئی تاویل کی گنجائش نہیں، محکمات کا یہی معنی ہے واضح المراد، ''اُس کتاب میں سے کچھ آیات محکم ہیں'' هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ: وہی آیات کتاب کا اصل ہیں، وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ: اور کچھ اور آیات متشابہ ہیں، یعنی جن کی مراد مشتبہ ہے، واضح نہیں، فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ: پھر وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے، فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ: وہ پیچھے لگ جاتے ہیں اُن آیات کے جو اِس کتاب میں سے متشابہ ہیں، ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ: فتنہ تلاش کرنے کے لئے، وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ: اور اُس کا مطلب طلب کرنے کے لئے، تاویل کا معنی حقیقت، ''اُس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے'' وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ: حالانکہ نہیں جانتا اُن آیات متشابہات کی تاویل کو، تَاْوِيْلَهٗ کی ضمیر جو مفرد لوٹ رہی ہے یہ مَا تَشَابَهَ میں مَا کی وجہ سے ہے، ورنہ مراد وہی آیات متشابہات ہیں، ''نہیں جانتا اُن کی تاویل کو اللہ کے سوا کوئی بھی، نہیں جانتا اس کی تاویل کو مگر اللہ''، تاویل: مطلب، حقیقت، وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ: اور وہ لوگ جو علم میں پکے ہیں، راسخ ہیں، جن کو علم میں رُسوخ حاصل ہے، پختگی حاصل ہے، ''اور وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں'' يَقُوْلُوْنَ: کہتے ہیں، اٰمَنَّا بِهٖ: ہم اِس کتاب پر ایمان لے آئے، كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا: ہر قسم کی آیتیں ہمارے رَبّ کی طرف سے ہیں، وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ: نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے، الباب لُبّ کی جمع ہے، لُبّ خالص عقل کو کہتے ہیں، رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا: اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا: بعد اِس کے کہ تو نے ہمیں سیدھے راستے پر چلایا، وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً: هَبْ امر کا صیغہ ہے، وَهَبَ يَهَبُ سے، اور عطا کر ہمیں اپنے پاس سے رحمت، اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ: بیشک تو بہت عطا کرنے والا ہے، رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ: اے ہمارے پروردگار! بیشک تو اکٹھا کرنے والا ہے لوگوں کو ایسے دن میں جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: بیشک اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

سورت کا نام اور اس کی وجہِ تسمیہ

اِس سورت کا نام سورۂ آلِ عمران ہے، اور اِس سورت میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا واقعہ آرہا ہے، اور وہ آلِ عمران میں سے ہیں، حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا، اُسی جزء کے اعتبار سے اِس سورت کا نام آلِ عمران رکھ دیا گیا۔ مدنیہ ہے، مدینہ میں نازل ہوئی یعنی ہجرت کے بعد، جس وقت سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں چلے گئے تھے تو مدنی زندگی کے اندر یہ سورت نازل ہوئی، وھی مائتا اٰیۃ وعشرون رکوعًا: اِس کی دوسو آیتیں ہیں اور بیس رُکوع ہیں۔

سورۂ بقرہ وآلِ عمران کی فضیلت

سورۂ بقرۃ اور سورۂ آلِ عمران دونوں کی فضیلت سرورِ کائنات ﷺ نے ایک روایت میں اکٹھی بیان فرمائی، کہ جو شخص اِن

کو پڑھے گا اور اِن پر عمل کرے گا قیامت کے دن یہ دونوں سورتیں اِس طرح آئیں گی جس طرح دو سائبان ہوتے ہیں، جن کے درمیان میں ایک چمک ہوگی جو دونوں کو علیحدہ علیحدہ کرے گی، اور وہ اپنے پڑھنے والوں پر میدانِ محشر میں سایہ کریں گی۔ حدیث میں ظُلّۃ کے ساتھ بھی تعبیر کیا گیا ہے، اور اسی طرح جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرندے اکٹھے ہوکر اڑتے ہیں تو وہ بھی سائبان کی شکل بن جاتی ہے، جیسے پرندوں کا جھنڈ ہوتا ہے، ایک یہ جا رہا ہے، ایک یہ پیچھے آ رہا ہے، اور درمیان کے اندر فصل ہوتا ہے، تو پرندوں کے دو جھنڈ کے ساتھ بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں سورتیں اس طرح آئیں گی اور اپنے پڑھنے والوں پر قیامت کے دن سایہ کریں گی۔[1] اس سے دونوں سورتوں کی آپس میں مناسبت بھی واضح ہوجاتی ہے۔

ماقبل سے ربط اور سورۂ بقرہ وآلِ عمران میں وجوہِ فرق

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے طلب ہدایت کی گئی تھی، سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اُس دُعا کو قبول فرماتے ہوئے اِس کتاب کی نشاندہی کی تھی، اور سورۂ بقرہ میں کثرت کے ساتھ آپ کے سامنے احکام بیان کئے گئے ہیں، سورۂ بقرہ میں لفظ ایمان کو ذکر کر کے دو تین جگہ اُس کی وضاحت کی گئی، پہلے پارے کے آخر میں بھی اور اس کے آخری رکوع میں بھی كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ، مؤمنین کی صفات کے طور پر اور اسی طرح ایمان کی تفصیل کے طور پر وہ چیزیں بتائی گئیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور سورۂ آلِ عمران میں زیادہ تر لفظ اسلام کے تحت وضاحت کی جائے گی اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ، تو دونوں سورتوں کی آپس میں مناسبت ایسے ہی ہے جیسے ایمان واسلام کی مناسبت ہے۔ سورۂ بقرہ میں عقائد کی وضاحت زیادہ آئی اور اِس سورت میں زیادہ تر عملی چیزیں آئیں گی، سورۂ بقرہ میں بھی عملی چیزیں آئی تھیں لیکن اکثر وبیشتر اُس کو ایمان کے عنوان کے تحت واضح کیا گیا تھا، اور اِس میں اسلام کا عنوان اختیار کیا گیا ہے...... سورۂ بقرہ میں مخالفین میں سے زیادہ تر رجحان یہود کی طرف رہا اور عیسائیوں کا تذکرہ ضمناً کچھ آیا تھا، اور اِس سورت میں زیادہ تر گفتگو کا رجحان عیسائیوں کی طرف ہے یعنی نصاریٰ کی طرف، یہود کو بھی خطاب ہوگا، اُن کے متعلق بھی ذکر کیا جائے گا لیکن ضمناً، زیادہ تر رجحان اہل کتاب میں سے نصاریٰ کی طرف ہے۔ نصاریٰ کا ایک وفد سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آیا تھا، اور آ کر اُنہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ کچھ مذہبی گفتگو کی تھی، اُس مذہبی گفتگو میں خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت زیر بحث آئی، چونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اُلوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے، اور یہ عقیدہ توحید کے خلاف ہے، اور وہ ساتھ توحید کے مدعی بھی تھے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے اُن کے سامنے عقیدۂ توحید کی وضاحت کی، اور عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کو دلیلِ توحید کے تحت باطل کیا۔ جب اُن عیسائیوں کے پاس کسی قسم کا جواب نہ رہا تو پھر اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت یا ابنیت کو ثابت کرنے کے لئے قرآنِ کریم کے اس قسم کے الفاظ سے سہارا لیا، کہ قرآنِ کریم عیسیٰ علیہ السلام کو ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' کہتا ہے، آخر اِس کا کیا مطلب؟ اس قسم کی چیزوں سے سہارا لے کر اُنہوں نے اپنے عقیدے کو ثابت

---

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۲۷۰، باب فضل قراءۃ القرآن وسورۃ البقرۃ / مشکوٰۃ ج۱ ص۱۸۴، کتاب فضائل القرآن، فصل اول عن ابی امامۃ وعن النواس۔

کرنا چاہا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُس کی وضاحت بھی کی گئی کہ بعض الفاظ اس قسم کے ہوتے ہیں جن کی مراد پوری طرح سے انسان کے فہم میں نہیں آتی، عقائد کی بنیاد اُن پر نہیں ہوتی، عقائد کی بنیاد اُن آیات پر ہوتی ہے جو بالکل واشگاف، اور لغوی دلالت کے تحت ان کا مطلب خوب اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اِس طرح سے اُن کی تردید کی گئی...... تو ابتدائے سورت سے وہی عقیدۂ توحید کا بیان ہے، اور آگے تقریباً نصف سورت سے زائد تک کلام براہِ راست اِنہی نصاریٰ کے متعلق ہی رہے گی، اور اُس کے بعد پھر غزوات کا ذکر آجائے گا، جس میں کچھ بدر کا اشارہ بھی ہوگا، اور زیادہ تفصیل غزوۂ اُحد کی آئے گی، اور آخر میں جا کر غزوۂ حمراء الاسد کی طرف بھی اشارہ آئے گا۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخر میں جو ہمیں دُعا تلقین فرمائی تھی فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کہ کافرلوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما، تو اِس سورت میں مسلمانوں کا غلبہ دلائل کے اعتبار سے اور غزوات کے اعتبار سے اللہ کی نصرت جو مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوئی اُس کا تذکرہ ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کس طرح سے شاملِ حال رہی، اس طرح بھی مابعد والی سورت ماقبل کے ساتھ مرتبط ہوجاتی ہے...... اور سورۂ بقرۃ میں انبیاء علیہم السلام میں سے آدم علیہ السلام کا ذکر ہوا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر ہوا تھا، اور اِس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، آلِ عمران، حضرت زکریا علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام، اِن کا ذکر آئے گا، یہ بعد والے ہیں، تو متقدمین کا ذکر پہلی سورت میں ہے اور اُس کے بعد متاخرین کا ذکر اِس دوسری سورت آلِ عمران میں ہے...... اور ایک وجہ فرق دونوں میں اس طرح بھی نمایاں ہے کہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو ثابت کرنے کے لئے زیادہ تر استدلال عقلی دلائل سے کیا گیا ہے یعنی آفاقی دلائل، زمین کا پیدا کرنا، آسمان کا پیدا کرنا، ہواؤں کا چلنا، بادلوں کا آنا، زمین کو بنجر ہونے کے بعد آباد کرنا، اِس قسم کے دلائل جن کو آپ آفاقی دلائل سے تعبیر کرتے ہیں یا عقلی دلائل سے تعبیر کرتے ہیں تو اثباتِ توحید زیادہ تر انہی دلائل سے کیا گیا ہے، اور اِس سورت میں زیادہ تر نقل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات اور پہلی کتابوں کے حوالے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے تحت۔

حروفِ مقطعات کے متعلق وضاحت

پہلا لفظ ''الٓمّٓ'' ہے، سورۂ بقرہ کی ابتدا میں بھی یہی لفظ آیا تھا، اور عام طور پر تفسیر میں اِن کو حروفِ مقطعات کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، مقطعات کا معنی یہ ہے کہ اِن کو توڑ توڑ کر اور علیحدہ کر کے پڑھتے ہیں، لفظ جس طرح سے اکٹھا لکھا ہوا ہے یوں نہیں پڑھتے، جیسے اکٹھا پڑھنا ہوتا تو اس کو اَلَمْ کی طرح پڑھتے، ایسے لفظ آتے ہیں جیسے اَلَمْ دُکھ کے معنی میں، وہ ایسے ہی لکھا ہوتا ہے الف لام میم، لیکن اُس کو اکٹھا پڑھا جاتا ہے اَلَمْ، اور ہمزہ استفہام اور لام علیحدہ کرلیں تو بھی اس کو اکٹھا اَلَمْ پڑھتے ہیں، بہر حال لام کو لام کے طور پر، میم کو میم کے طور پر اِس طرح سے اِن کو توڑ کر نہیں پڑھا جاتا، اور یہ جو حروف سورتوں کے شروع میں آجاتے ہیں اِن کو توڑ کر پڑھا جاتا ہے، جیسے الف: اِس کو مابعد کے ساتھ جوڑا نہیں گیا، لام: یہ بھی پورا آگیا، میم: یہ بھی پورا آگیا، تو اِن کو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھتے ہیں اس لیے اِن کو مقطعات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ سورتوں کے

نام ہی ہوتے ہیں، اور قدیم عرب کا جو لٹریچر ہے اُس میں اس چیز کا ثبوت ملتا ہے کہ فصحاء بلغاء جس وقت اپنی کسی تقریر اور کسی بیان کا آغاز کرتے تھے تو ابتدا میں وہ اس قسم کے حروف بولتے تھے، پرانے ادب میں یہ چیزیں موجود ہیں، اسی لئے قرآنِ کریم کے اِن الفاظ پر کسی مخالف کی طرف سے اُس زمانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا کہ قرآنِ کریم کی سورتوں کی ابتدا ایسے الفاظ سے کیوں کی گئی جو معروف نہیں ہیں اور یہ ایک نیا طرز ہے، کسی کی طرف سے یہ سوال نہیں اُٹھایا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم فصحاء بلغاء میں یہ طرز معلوم تھا۔ باقی! اللہ تعالیٰ نے اِس میں کیا اشارہ فرمایا، کیا بیان کیا، اور بعض سورتوں کے شروع میں کہیں ''الٓمّٓ''، کہیں ''الر''، کہیں ''المر''، کہیں ''طٰهٰ''، کہیں ''یٰسٓ''، کہیں ''نٓ''، کہیں ''قٓ''، اِن حروف میں کیا رُموز ونکات ہیں؟ یہ اللہ اور اللہ کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کا اِبطال صفاتِ اِلٰہیہ کی روشنی میں

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: پہلے یہ توحید بطورِ دعویٰ کے ہے، اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ: یہ لفظ آپ کے سامنے آیت الکرسی میں گزر چکے ہیں، اَلْحَیُّ: زندہ، جس کی زندگی ذاتی ہے، جس کے اوپر موت کا ورود ہوا اور نہ ہوگا۔ اَلْقَیُّوْمُ: خود قائم رہنے والا اور دوسروں کو قائم رکھنے والا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات ذکر کی جارہی ہیں جن سے استدلالاً خود بخود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا اِبطال ہو جائے گا، کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عیسائیوں کے سامنے ذکر کیا کہ ''عِیْسٰی یَاْتِیْ عَلَیْهِ الْفَنَاءُ'' (طبری وعام تفاسیر)، کہ اللہ تو حی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام پر تو فنا آئے گی۔ (جو روایت تاریخ کے اندر ذکر کی گئی ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یاتی کا لفظ استعمال کیا، کہ فناء آئے گی، حالانکہ اُن عیسائیوں پر دعوے کو ثابت کرنے کے لئے یہ بات زیادہ واضح تھی کہ یہ کہا جاتا کہ تمہارے اپنے خیال کے مطابق تو عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہوگئے اور اِس دنیا سے فناء ہوگئے، اُن کے فناء ہونے کا ذکر کر کے اُن کی الوہیت کو زیادہ واضح طور پر رد کیا جاسکتا تھا، لیکن چونکہ یہ بات خلافِ واقع تھی، اور صحیح بات کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر فنا نہیں آئی، ان کی وفات نہیں ہوئی، لیکن ایک وقت آئے گا جب ان کی وفات ہوگی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقامِ الزام میں بھی اُن کو میت نہیں مانا، بلکہ یہ کہا: ''یَاْتِیْ عَلَیْهِ الْفَنَاءُ'' اُن کے اوپر فناء آئے گی [عام تفاسیر] ایک وقت آئے گا کہ وہ نہیں رہیں گے، وفات ہو جائے گی، تو یہ حی ہونے کے خلاف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات قیوم ہے، قیوم کا معنی ہے کہ جو خود قائم ہو اور دوسرے کو تھامنے والا ہو، قائم رکھنے والا ہو، تو اللہ تعالیٰ کی ذات تو ایسی ہے کہ وہ کسی کے سہارے قائم نہیں ہے، اپنی حیات کو باقی رکھنے کے لئے اُسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں، اور ساری کائنات اُسی کی تھامی ہوئی ہے، بخلاف اِس کے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ مریم، یہ دونوں پہلے نہیں تھے، بعد میں پیدا ہوئے۔ اور پھر جو زندگی اُنہوں نے یہاں گزاری اُس کے متعلق قرآن کہے گا: كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ (سورۂ مائدہ: ۷۵) یہ دونوں تو کھانا کھایا کرتے تھے، اُن کو اپنی زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانے کا احتیاج تھا، اور صرف اتنا عنوان کہ ''کھانا کھاتے تھے'' آپ جانتے ہیں کہ یہ انسان کی طبیعت میں ایک بہت بڑا احتیاج ہے جس کی یہاں نشاندہی کی گئی، روٹی کا احتیاج بہت بڑا احتیاج ہے، جو شخص کھانے کا محتاج ہے وہ یوں سمجھو کہ کائنات کے ہر ذرے کا محتاج ہے،

زمین کا محتاج ہے، آسمان کا محتاج ہے، بارش کا محتاج ہے، سورج کی روشنی کا محتاج ہے، لوہے کا محتاج ہے بونے اور کاٹنے کے لئے، اور لکڑی کا محتاج ہے، آگ کا محتاج ہے، پانی کا محتاج ہے، کون سی چیز ایسی ہے جس کی ضرورت نہیں پیش آتی روٹی کا لقمہ حاصل کرنے کے لئے؟ تو ساری کائنات کی طرف اُس کا احتیاج نمایاں ہوجاتا ہے۔ اور پھر جو شخص روٹی کھاتا ہے تو وہ بھی آپ سمجھتے ہیں کہ روٹی کھانے کا پھر آخر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ پیشاب پاخانے کی طرف احتیاج، اسی طرح انسان کے ساتھ اِسی کھانے پینے کی بناء پر کتنے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔ تو جس شخصیت پر اس قسم کے حالات طاری ہوتے ہیں کہ اُس کو بھوک لگتی ہے، بھوک لگنے کے بعد اپنی زندگی کو سہارا دینے کے لئے وہ روٹی کا محتاج ہے، اور روٹی کمانے کے لئے، روٹی حاصل کرنے کے لئے وہ درختوں کا، فصلوں کا، زمین کا، آسمان کا، موسم کا، ہواؤں کا، بادلوں کا، بارشوں کا، ہر چیز کا وہ ضرورت مند ہے، وہ قیوم کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ قیوم نہیں، وہ تو محتاج ہے، اور جو محتاج ہو وہ اِلٰہ کیسے ہوگیا؟ خدا کیسے بن گیا؟ تو اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یہ دو صفتیں جو ذکر کی گئیں اِن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی برتری تمام کائنات کے مقابلے میں بالکل نمایاں ہے، اور معبود وہی ہوسکتا ہے جس کو انتہائی درجے کی عظمت حاصل ہو، کیونکہ عبادت انتہائی درجے کی فروتنی اور عاجزی ہے جو اُس کے مقابلے میں اختیار کی جاسکتی ہے، تو جس کو انتہائی عظمت حاصل ہوگی یہ عاجزی اور فروتنی اُسی کے مقابلے میں ہی اختیار کی جائے گی، چونکہ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں، اس لئے کسی دوسرے کو اِلٰہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

قرآنِ کریم اور دیگر آسمانی کُتب کا تذکرہ

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: اُس نے آپ پر کتاب اُتاری جو حق پر مشتمل ہے، جس میں حق بات واضح کردی گئی، یہ کتاب بھی توحید کی منادی کرتی ہے، مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: اور جو اِس سے پہلے اتری اُس کی یہ کتاب تصدیق کرتی ہے، تصدیق کا معنی یہ ہے کہ اُس کے حقائق کی تائید کرتی ہے یا اُس کی پیش گوئیوں کا مصداق بنتی ہے، یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے پہلے واضح کی جاچکیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اُن پیش گوئیوں کی صداقت آپ ﷺ کے آنے کے ساتھ اور اِس کتاب کے اترنے کے ساتھ ہی واضح ہوئی، گویا کہ یہ کتاب اُن کو سچا قرار دیتی ہے، اگر یہ نہ آتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نہ اُترتی تو اُن صحیفوں کی تصدیق کس طرح ہوتی جن میں کہا گیا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے اور ایک ایسی کتاب اُترنے والی ہے، اِس اعتبار سے اُن پیش گوئیوں کا یہ مصداق بنتی ہے، اور مصداق بن کر اُن کتابوں کی صداقت کو ظاہر کرتی ہے۔ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: اتارا اُس نے توراۃ اور انجیل کو، یعنی یہ ساری کتابیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی اتاری ہوئی ہیں، اور اپنے حقائق میں اور مضامین میں ایک دوسرے کی مصدِّق ہیں، اور عقیدۂ توحید اِن کتابوں میں بھی خوب اچھی طرح سے واضح کیا ہوا ہے، مِنْ قَبْلُ: اِس کتاب کے اترنے سے پہلے۔ توراۃ وانجیل اتاری هُدًى لِّلنَّاسِ: لوگوں کی راہنمائی کے لئے'' اور اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز اُتاری'' اس کا مصداق انبیاء علیہم السلام کے معجزات ہیں، اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام لینے والا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ کی

صفتِ علم کا ذکر آ گیا "بے شک اللہ نہیں مخفی اُس پر کوئی شی زمین میں نہ آسمان میں" یعنی اُس کا علم تام ہے، ذرے ذرے پر محیط ہے، اور اس قسم کا علم چونکہ کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں تو کوئی اُس کی الوہیت میں شریک بھی نہیں ہوسکتا۔ حیات، قیومت اور علم یہ اُمہاتِ صفات شمار ہوتی ہیں۔

عقیدۂ ابنیت کی ایک دلیل کا جواب

آگے خالقیت کا ذکر آ گیا، هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ: اِس میں عیسائیوں کے اُس شبہ کو بھی زائل کیا جاسکتا ہے کہ وہ جو کہتے تھے کہ عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، جب اِس کی تردید کی جاتی تو وہ کہتے کہ پھر بتاؤ اِس کا باپ کون ہے؟ اور اُن کے سامنے یہ بات ایک اشتباہ پیدا کردیتی کہ اِن کا جب باپ کوئی نہیں تو وہ کہتے کہ پھر یہ اللہ کی طرف ہی منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اِس بات کو واضح کیا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ: عیسیٰ علیہ السلام کی مثال تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم جیسی ہے، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (سورۂ آل عمران:۵۹) کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا، بنانے کے بعد کہہ دیا کہ جاندار ہوجا، وہ ہوگیا۔ تو جیسے اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب کے خلاف یعنی جو اِس وقت انسان کے وجود میں آنے کا سلسلۂ اسباب ہے اِس کے خلاف جس طرح اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں کی وساطت کے اور بغیر باپ کی وساطت کے پیدا کیا تھا، مٹی سے بنا کر کہہ دیا کُنْ، تو فَيَكُوْنُ: پس وہ گیا، عیسیٰ علیہ السلام کی مثال بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے ہی ہے، کہ اگر آدم علیہ السلام کو بغیر ماں کے اور بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ براہِ راست بناسکتے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی باپ کی وساطت کے بغیر پیدا کرسکتے ہیں، اگر باپ نہ ہونا اللہ کے بیٹے ہونے کی دلیل ہے تو سب سے پہلے یہ عقیدہ آدم کے متعلق بنانا چاہیے تھا، کیونکہ آدم علیہ السلام کا بھی تو باپ کوئی نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ۔ اور یہاں بھی وہی بات ذکر کی جارہی ہے کہ تمہاری صورتیں اللہ تعالیٰ رحموں کے اندر بناتا ہے، تمہاری تصویر کھینچتا ہے، یہ اُس کی خالقیت ہے اور اُس کی قدرت ہے، تو اگر وہ مرد کے پانی کو عورت کے پانی کے ساتھ شامل کرکے تصویر بنا سکتا ہے تو صرف عورت کے پانی پر بھی بنا سکتا ہے، اُس کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں۔ "وہی ہے جو تمہیں صورتیں دیتا ہے، تمہاری تصویریں بناتا ہے (ارحام رحم کی جمع) رحموں میں جیسے چاہتا ہے"۔ اِن سب صفات کا تقاضا یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

"محکمات ومتشابہات" کی تفصیل

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ: عیسائیوں نے روح اللہ، کلمۃ اللہ، اور اس قسم کے الفاظ سے جو استدلال کرنے کی کوشش کی تھی اب اُن کے اِس استدلال کو رد کیا جارہا ہے، حاصل اِس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اتاری تو اِس کتاب میں دو قسم کی آیات ہوا کرتی ہیں، بعض آیات ایسی ہیں جن کو محکمات سے تعبیر کیا جاتا ہے، محکمات وہ آیات ہوا کرتی ہیں کہ کوئی شخص جو زبان جانتا ہے، عربی زبان کی تراکیب سے واقف ہے، اُس کی لغوی دلالت سمجھتا ہے، اُس کے سامنے اُس کی مراد بالکل منکشف ہوتی ہے، اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، اور یہ چیزیں ایسی ہی ہوتی ہیں جو ہمارے حالات سے تعلق رکھنے والی ہوتی

ہیں، کہ جب بات ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم اُس کا مصداق، اُس کی حقیقت اور اُس کا واقعہ سمجھ جاتے ہیں۔ اور بعض آیات اس قسم کی ہوتی ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کوئی حقائق غیبیہ پیش کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ ہمارے مشاہدے میں نہیں ہوتے، جب وہ انسان کی گرفت میں آتے ہی نہیں، نہ آنکھ اُن کو دیکھ سکے، نہ کان اُن کو براہِ راست سن سکے، نہ ہم کسی دوسرے حاسہ کے ساتھ اُن کو معلوم کر سکیں، اور وہ اللہ تعالیٰ نے سمجھانے ہوتے ہیں اور ہمارے سامنے واضح کرنے ہوتے ہیں ایمان لانے کے لئے، یعنی وہ حقائق ہمارے سامنے نمایاں کیے جاتے ہیں تا کہ ہم اُن کو سمجھیں اور اُن پر ایمان لائیں، لیکن چونکہ وہ ہمارے ماحول کی چیزیں نہیں ہوتیں اس لئے ایسے کوئی الفاظ ہماری زبان میں موجود نہیں ہوتے جو اُس کی صحیح تصویر آپ کے سامنے پیش کر دیں، کہ جس سے آپ کے ذہن کو اور آپ کے دل دماغ کو اطمینان ہو جائے اور اس میں شک وشبہ نہ رہے، اس لئے اُن کی نشاندہی کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ الفاظ وہی استعمال فرماتے ہیں جو آپ لوگوں کی اصطلاح اور استعمال میں ہوتے ہیں، لیکن وہ الفاظ اپنی دلالت کے اندر اُس مفہوم پر جو اللہ کو مطلوب اور مقصود ہے واضح نہیں ہوتے، اور اُس سے زائد وضاحت کرنے کے لئے آپ کی اصطلاح میں اور آپ کی لغات میں وہ الفاظ نہیں ہیں۔ پھر چونکہ وہ غیبی چیز ہے، تو انسان کے ذہن کی وہاں تک رسائی نہیں، اس لیے اُن سے کچھ پردہ اٹھانے کے لئے اور اُن کی نقاب کشائی کے لئے الفاظ تو استعمال کر لئے جاتے ہیں، اور ساتھ انسان کو یہ مکلف کر دیا جاتا ہے کہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو، ظاہری طور پر جتنا سمجھ میں آ گیا اُس پر ایمان لاؤ، زیادہ کھود کرید کرنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ شبہات میں پڑتے چلے جاؤ گے، کیونکہ وہ چیز ایسی ہے جو تمہاری گرفت میں آنے والی نہیں ہے، بعض آیات اِس قسم کی ہوتی ہیں، یعنی اُن میں کچھ ایسے حقائق بیان کئے ہوئے ہوتے ہیں جن تک کماحقہ انسان کے ذہن کی رسائی نہیں۔

مثالوں سے وضاحت

اب میں آپ کے سامنے ایک مثال ذکر کروں، اِس کو آپ اس طرح سے سمجھئے کہ روٹی پانی کپڑا وغیرہ دنیا کے اندر جو کچھ آپ استعمال کرتے ہیں، یہ چیزیں تو جب بھی بیان کی جائیں گی اور جب اِن کے متعلق گفتگو ہوگی تو اِن کا نقشہ آپ کے سامنے بالکل اچھی طرح سے آتا چلا جائے گا اور آپ سمجھتے چلے جائیں گے، مثلاً آپ سے کہا جائے کہ فلاں شخص فلاں کے ساتھ لڑ پڑا تھا اور اس نے چھری ماری اور اُس کا پیٹ پھاڑ دیا، اب چونکہ یہ واقعات آپ کے سامنے آتے رہتے ہیں اس لیے لفظ سنتے ہی آپ اِس کی حقیقت سمجھ گئے، لیکن جس وقت آپ کے سامنے یہ کہا جائے کہ مرنے کے بعد جس وقت انسان قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے اُس وقت اُس کو سزا دینے کے لئے ایک فرشتہ متعین ہے، اور وہ فرشتہ اس کو ایک گرز مارتا ہے جس کے ساتھ وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، اور پھر وہ اسی طرح زندہ ہو جاتا ہے پھر گرز مارتا ہے پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے،[1] اب یہ واقعہ آپ کے سامنے آیا، لیکن چونکہ اس کی مثال آپ کے سامنے کوئی نہیں، کہ ایک چیز دیکھتے ہی دیکھتے ریزہ ریزہ بھی ہو جائے پھر زندہ ہو جائے پھر ریزہ ریزہ ہو جائے، تو آپ اتنی ہی حقیقت کو سمجھنے کے بعد اِس پر ایمان لے آیئے کہ واقعہ ہے، اور اس طرح سے پیش آتا ہے، اور بار بار انسان ریزہ ریزہ ہوگا

(۱) فیضربہ بہا ضربۃ یسمعہا ما بین المشرق والمغرب إلا الثقلین فیصیر ترابا قال ثم تعاد فیہ الروح (ابوداؤد ۲/ ۲۹۸ / مشکوٰۃ ص ۲۶)

اور بار بار زندہ ہوگا، لیکن اگر آپ اِس کو سوچنا شروع کریں گے کہ کس طرح ریزہ ریزہ ہو جائے گا پھر کس طرح یکدم بن جائے گا، پھر کس طرح اُس کو گرز ماری جائے گی؟ ہم تو دیکھتے ہیں قبروں میں کچھ نظر نہیں آتا، وہاں تو نہ کوئی کھڑکا ہے نہ کوئی آواز ہے، نہ چیخ ہے نہ پکار ہے، اب یہ ایک حقیقت تو ہے کہ برزخ میں عذاب دیا جائے گا اور مختلف صورتوں میں دیا جائے گا، لیکن اُس کو آپ اُس وقت تک واضح انداز میں نہیں سمجھ سکتے جس وقت تک آپ کے سامنے اُس کی کوئی مثال نہ آئے۔

اسی طرح آپ کے سامنے یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں آدمی کہروڑپکا کا چیئرمین ہے تو آپ فوراً حقیقت سمجھ جائیں گے کہ کمیٹی کا ایک دفتر ہے، اور اُس کے اندر کرسیاں رکھی ہوئی ہیں، ایک کرسی مقامِ صدر پہ ہوتی ہے، اور وہ شخص وہاں جا کے بیٹھتا ہے، پھر کہروڑپکا کی حکومت اُس کو حاصل ہو جاتی ہے، اور جتنے معاملات ہیں سب وہی طے کرتا ہے، وہ سب کے اوپر حاکم بن گیا، فوراً آپ کے ذہن میں یہ نقشہ آگیا، اب جس وقت کہا جائے کہ کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ عرش نشین ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا ایک عرش ہے، تو اگر آپ یونہی سوچیں گے کہ کوئی کرسی رکھی ہوئی ہے اور اللہ آ کے اُس کے اُوپر بیٹھتا ہے، اِس سوچنے پر پابندی ہے کیونکہ اِس میں تو تشبیہ لازم آگئی، اللہ تعالیٰ کا تجسّم لازم آگیا کہ اللہ بھی ایک جسم ہے، پھر کرسی کے اوپر جو آدمی بیٹھتا ہے وہ کرسی اُس کو محیط ہوتی ہے، کہ کرسی بڑی ہوتی ہے اور بیٹھنے والا آدمی چھوٹا ہوتا ہے، اگر کرسی چھوٹی ہو اور آدمی بڑا ہو تو کرسی پر بیٹھے گا کیسے؟ اسی طرح عرش یعنی تخت کے اوپر جب انسان بیٹھتا ہے تو تخت اس کے اردگرد بڑھا ہوا ہوتا ہے، اور انسان اُس کے اندر چھوٹا ہوتا ہے، اب یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو اگر آپ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنا چاہیں گے تو یہ خلافِ واقع بات ہو جائے گی، لیکن ایسا بھی نہ سوچیں اور پھر یہ کہیں کہ وہ کرسی نشین ہے، عرش نشین ہے، تو یہ بات ذہن میں نہیں آتی، اب اس میں پھر جو فتنہ ڈالیں گے اور اس طرح سے اِس کی تعبیرات کریں گے وہ غلط ہوں گی، وہ واقع کے مطابق نہیں ہیں، یوں فتنہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ حقائق جو بیان کیے جاتے ہیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اسی طرح جہنّم کے اندر اللہ تعالیٰ نے سزا دینے کے لئے اُنیس فرشتے قائم کر دیے، جیسے سورۂ مدثر میں کہا: عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ، مشرکوں نے مذاق اڑایا کہ یہ اُنیس اتنی مخلوق کو کیا کریں گے؟ ایک کہنے لگا: ''دس کو تو میں اکیلا سنبھال لوں گا، باقی نو کو تم قابو کر لینا!'' تو انہوں نے مذاق بنا لیا، اب یہ ہے کہ عذاب کس طرح ہوگا؟ اُنیس فرشتے وہاں انتظام کس طرح کریں گے، ساری مخلوق کو کیسے سنبھالیں گے، یہ سارے کے سارے حقائق ایسے ہیں جو ہمارے ذہن کی گرفت میں اس لئے نہیں آتے کہ ہمارے مشاہدے میں نہیں ہیں۔ اب آگ بھی جل رہی ہے اور اُس کے اندر گرم پانی بھی ہے، اور لوگ آگ میں بھی جل رہے ہیں اور گرم پانی بھی پی رہے ہیں، تو آگ کے اندر پانی کا کیا جوڑ؟ اسی طرح اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ (سورۂ صافات: ۶۴) یہ درخت جہنّم کے اندر پیدا ہوگا، تو ادھر آگ سے بھری ہوئی جہنّم ہے تو اُس میں درخت کس طرح سے اُگ آیا؟ جو وہاں جہنمیوں کو کھانے کے لئے دیا جائے گا۔ اب اس قسم کی جو چیزیں ہیں، چونکہ ہمارے سامنے اِن کی مثالیں واضح نہیں ہیں، واقعات نہیں ہیں، اس لیے ان حقائق کو ذہن میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے، عقل مند کا کام یہی ہے کہ اِن کو سنے، سننے کے بعد مان لے، اور اِس کی حقیقت اور اس کا واقعہ جو کچھ ہے اُس کو اللہ کے علم کی طرف محول کر دے، کیونکہ اُن کو کما حقہ واضح کرنے کے لئے نہ تو آپ کی لغات میں الفاظ

ہیں، اور جس وقت تک واقعہ سامنے نہ آجائے ہمارا ذہن اُس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے۔ تو اس قسم کی آیات میں منصفانہ رویہ یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے، اور ان کو ہمارے ذہنوں کے قریب سے قریب کیا ہے، ہماری لغات جہاں تک متحمل ہیں وہ الفاظ استعمال کئے ہیں، تو ہم اِس بات کی رعایت رکھتے ہوئے ان کو سمجھیں اور ایمان لائیں۔

مثلاً اللہ کے لئے ہاتھ کا ذکر آگیا، ہم اُس ہاتھ کو مانیں گے کہ اللہ کا ہاتھ ہے، لیکن کیسا ہے؟ یہ ہماری گرفت میں نہیں آسکتا، کیونکہ مثال سامنے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کلام فرماتے ہیں، یہ واقعہ ہے، ہم اِس پر ایمان لائیں گے کہ اللہ کلام فرماتا ہے، لیکن کس طرح؟ کیا اِسی طرح ہونٹ ہلاتا ہے؟ زبان ہلاتا ہے؟ حاشا وکلا، ہم اس طرح نہیں کہیں گے، کیونکہ یہ تو مثال اور تشبیہ لازم آجائے گی، تشبیہ اور مثال بھی نہیں دی جاسکتی لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورۂ شوریٰ:۱۱)، تو اِن چیزوں پر ایمان لانا اِن حدود کی رعایت رکھتے ہوئے یہ عقل مندوں کا کام ہے، حقیقت حال اللہ کے سپرد کردو جیسی بھی ہے، اِسی لئے جب ہم ان صفات کو ذکر کیا کرتے ہیں تو یوں کہہ دیا کرتے ہیں: "كَمَا يَلِيْقُ بِشَانِهٖ" یہ چیز اللہ کے لئے ثابت ہے جس طرح اُس کی شان کے لائق ہے۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے لئے کسی کی بھی اِبنیت ثابت نہیں کی جاسکتی، کہ وہ اللہ کا بیٹا ہو، یہ بات قرآنِ کریم میں واشگاف الفاظ میں کہہ دی گئی لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ (سورۂ اخلاص) کہ نہ اللہ نے کسی کو جنا ہے اور نہ اللہ جنا گیا، نہ اُس کا باپ نہ اُس کا کوئی بیٹا، یہ بات بالکل واشگاف الفاظ میں کہہ دی گئی، اب کوئی اس قسم کا لفظ لے کر کہ "کلمۃ اللہ" کا لفظ آگیا، "روح اللہ" کا لفظ آگیا، جس کی حقیقت آپ کے سامنے واضح نہیں ہے، اس لفظ کو لے کر اگر کوئی شخص ابنیت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ محکمات کو چھوڑتا ہے اور متشابہات کے پیچھے لگتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (سورۂ زخرف:۵۹) اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں تھا کہ ہمارا بندہ ہے، ہم نے اُس پر انعام کیا ہے، یہ کتنی واضح بات ہے کہ ہمارا بندہ ہے، تو جب وہ عبد ہوگیا تو معبود کیسے؟ جب وہ ہمارا بندہ ہے تو پھر اُس کو ہمارے ساتھ شریک کس طرح ٹھہراتے ہو؟ یہ وہ آیات ہیں جن کو آپ محکمات کہہ سکتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (زخرف: ۶۴) اللہ ہی میرا ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے، تم اُسی کی عبادت کرو، یہ محکمات میں سے ہے، اِس کا مطلب بالکل واضح ہے۔ تو اب ایسے الفاظ جن کی حقیقت انسان کی گرفت میں نہیں، اُن کا سہارا لے کر اِس قسم کے غلط عقیدے نکالنے کی کوشش کرنا یہ اتباعِ متشابہات ہے، یہ اہلِ علم کا کام نہیں، سمجھدار لوگوں کا کام نہیں، سمجھدار لوگوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو حقائق ایسے الفاظ سے بیان کئے گئے ہیں جو ہمارے سامنے واضح ہو گئے اور واشگاف ہیں، ہم اُن کو تو مانیں گے، اُن پر تو اُسی وضاحت کے ساتھ ایمان لائیں گے، باقی! جس کی حقیقت ہماری گرفت میں نہیں آتی ہم اُس کو اللہ کے سپرد کریں گے اور اُس کے ظاہر سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اُس پر ایمان لائیں گے، اُس کی حقیقت کی گرفت کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اور اگر ہم اُس کی حقیقت میں زیادہ سے زیادہ کھود کرید کریں گے تو شبہات بڑھتے چلے جائیں گے، انسان کے ذہن کو تشفی نہیں ہوتی، یہ عقل والوں کا کام نہیں ہے کہ اس قسم کی الجھنیں پیدا کریں، اس لیے اِن آیات پر ان کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ایمان لاؤ اور اُس کی حقیقت اللہ کے سپرد کرو، اور جو محکمات ہیں جن کا مطلب آپ کے سامنے بالکل واضح ہوگیا اُن پر اُسی تفصیل سے ایمان لاؤ۔

''متشابہات'' میں کھود کرید کی ممانعت

بنیاد محکمات پر رکھی جایا کرتی ہے نہ کہ متشابہات پر، متشابہات کا مطلب اُتنا سا سمجھا جایا کرتا ہے جو محکمات کے ساتھ ٹکرائے نہیں، اس لئے اصل تو ہیں محکمات، اور متشابہات کو اُن کے تابع کر کے ہم مانیں گے، اور یہ کہیں گے کہ اِن کی حقیقتِ حال اللہ جانتا ہے، چونکہ یہ محکمات کے ساتھ اتنی سی مطابقت رکھتے ہیں تو ہم اِتنا اِن کو مان سکتے ہیں، باقی اگلا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، یہ ہے ہدایت یافتہ لوگوں کا طریقہ جو کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور جو محکمات کو تو چھوڑ دیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے پیچھے لگ جائیں، اُن کے نقشے کھینچنے لگ جائیں گے، متشابہات کے پیچھے لگ جائیں، تو حضور ﷺ نے بھی فرمایا کہ جس وقت تمہارے سامنے اس قسم کے لوگ آئیں جو محکمات کو چھوڑیں اور متشابہات کے پیچھے لگیں تو اُن سے بچا کرو، یہی ہیں اہلِ زَیغ جن کا قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔[1] اور آپ حضرات کو شاید کبھی واسطہ نہیں پڑا ہوگا، یہ جو قبرنشین ملنگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جو ''باطنی'' کہلاتے ہیں، اپنے آپ کو ''اہلِ باطن'' قرار دیتے ہیں، ان کے پاس اگر کبھی آپ کو بیٹھنے کا اتفاق ہوگا تو آپ دیکھیں گے کہ اِن کو اگر کوئی شغف ہے تو اِنہی متشابہات کے ساتھ ہی ہے، وہ جب بھی ذکر کریں گے اِسی قسم کی باتیں ذکر کریں گے جن کو متشابہات قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے متعلق اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق۔ اور محکمات سے کوئی دلچسپی نہیں، یہی گمراہ ہونے کی نشانی ہے۔ تو کتاب سے استفادے کا طریقہ یہی ہے کہ محکمات پر اپنے عقائد اور اپنے خیالات کا مدار رکھو، اور متشابہات پر ایمان لاؤ اور اُس کی جتنی حقیقت محکمات کے ساتھ جوڑ کھاتی ہے اتنی حقیقت اپنے ذہن میں لا کر مانو، اور جو ذہن کی گرفت میں نہیں آتی اُس پر ایمان لاؤ اور یہ کہو کہ حقیقتِ حال اللہ جانتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ: اللہ وہ ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری، اُس کتاب میں سے کچھ آیتیں محکمات ہیں، جن کی مراد بالکل واضح ہے، جس میں کوئی اشکال نہیں، جو شخص صاحبِ زبان ہے اور زبان کی ترکیب کو سمجھتا ہے اور دلالت لغوی سے واقف ہے وہ اس کے مفہوم کو فوراً سمجھ جاتا ہے، کوئی دیر ہی نہیں لگتی۔ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ: یہی ہیں کتاب کی اصل، کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے انہی پر ہی مدار رکھا جاتا ہے، وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ: اور کچھ دوسری آیتیں ہیں جو متشابہات ہیں فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ: پھر وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے، ٹیڑھ ہے، فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ: اُس کتاب میں سے جو آیتیں متشابہ ہیں وہ اُن کے پیچھے لگ جاتے ہیں، ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ: گمراہی تلاش کرنے کے لئے، شرارت پھیلانے کے لئے، وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ: اور اُن مَا تَشَابَهَ کا مطلب تلاش کرنے کے لئے، حقیقت معلوم کرنے کے لئے اُن کے پیچھے لگ جاتے ہیں، وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ: اور اُن کی حقیقت، اُن کا مطلب نہیں جانتا مگر اللہ، اُن کا مصداق انسان کے دماغ کی گرفت سے باہر ہے، حقیقی طور پر انسان کے ذہن میں آجانا انسان کے ذہن کے بس سے باہر ہے، جس وقت تک آپ آخرت میں جا کر اُن چیزوں کو دیکھیں گے نہیں اور آپ کے سامنے مشاہدہ نہیں ہوگا، عقل کے ساتھ اگر آپ سوچنے کی کوشش کریں گے تو سوائے اِشکالات کے کچھ پلے نہیں پڑتا۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۶۵۲ کتاب التفسیر، سورۃ آل عمران / مشکوۃ ج ۱ ص ۲۸ باب الاعتصام، فصل اول عن عائشۃ رضی اللہ عنہا۔

"معتزلہ" کیوں گمراہ ہوئے؟

اور جن لوگوں نے بھی عقل کے ساتھ اس قسم کی چیزوں میں سوچ بچار کرنے کی کوشش کی وہ گمراہی کی دلدل میں جا پھنسے۔ جیسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رُؤیت ہوگی، یہ ایک بات بیان کردی گئی، ہم اِس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ رُؤیت ہوگی، اور اس بات کی تمنا رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا دیدار کروائے، بس ہم نے اِس حقیقت کو مان لیا۔ باقی! کیسے رُؤیت ہوگی؟ دیکھنے کے لئے تو ضروری ہے کہ کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو، پھر آنکھوں سے اِتنی دُور ہو تب نظر آئے گی، بالکل ساتھ آ جائے تو بھی نظر نہیں آتی، اور زیادہ دُور چلی جائے تو بھی نظر نہیں آتی، پردے میں ہو جائے تو بھی نظر نہیں آتی، اس قسم کے شکوک شبہات پیدا کر کے معتزلہ اِس حقیقت کے منکر ہو گئے کہ آخرت میں رُؤیت ہوگی ہی نہیں، کیونکہ یہ عقل کے خلاف ہے، یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا، کہ چیز جب دُنیا میں دیکھی جاتی ہے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اُس میں کچھ کثافت ہو تو نظر آئے گی، جیسے ہوا میں لطافت ہے تو نظر نہیں آتی، اسی طرح ایک خاص فاصلے پر ہو تو نظر آئے گی، اگر زیادہ قریب آ جائے تو نظر نہیں آتی، تو کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی چیزیں ثابت کی جاسکتی ہیں جو ہم کہیں کہ اللہ نظر آئے گا؟ جب اِس چیز میں غور وفکر شروع کیا تو شکوک ہی شکوک اور شبہات ہی شبہات پیدا ہوتے چلے گئے۔ بخلاف اِس کے ہدایت یافتہ لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت ہوگی، ہم اِس پر ایمان لاتے ہیں۔ باقی! کیسے ہوگی؟ حقیقتِ حال اللہ جانتا ہے، ہوگی، جب واقعہ سامنے پیش آ جائے گا تو پتا چل جائے گا کہ ایسے ہوئی ہے۔ تو اس قسم کے حقائق جو ہمارے ذہن میں نہیں آسکتے اُن کو اللہ کے سپرد کردیا، اور جتنا سمجھ میں آتا ہے اتنا سمجھ لیا۔

"راسخین فی العلم" کی صفات

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ: یہاں وقف لازم ہے، آگے مضمون نیا شروع ہو گیا وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ: اور جو علم میں رسوخ پیدا کرنے والے ہیں، جن کو علم میں پختگی حاصل ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا: ہر قسم کی آیات ہمارے رَبّ کی طرف سے ہیں، جو اللہ نے بیان فرما دیا ٹھیک ہے، ہم نے مان لیا، وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ: نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے، عقل والوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز کو اُس کے منصب پر رکھیں۔

سوال:- وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کا اگر اللّٰهُ پر عطف کیا جائے تو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوگی کہ اللہ اور راسخ فی العلم جانتے ہیں؟

جواب:- یہ ترکیب ہمارے نزدیک نہیں ہے، یہاں دیکھو اِلَّا اللّٰهُ کے بعد میم وقف لازم کی نشانی ہے، اور وقف لازم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مابعد والا مضمون ماقبل سے منقطع ہو گیا۔ تو وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ یہاں بات ختم ہوگئی، کہ اُن مَا تَشَابَهَ مِنْهُ کی مراد، اُن کا حقیقی مطلب سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ ہاں اتنی بات ہے کہ جتنا اللہ وضاحت کردے، جتنا بتلا دے اُتنا معلوم ہو جائے گا، حقیقت کے اعتبار سے اُس کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے۔ باقی راسخون فی العلم کا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ کہیں کہ یہ سب تعلیم اللہ کی طرف سے ہے، ہم اِس کو مانتے ہیں، محکمات کے ساتھ جوڑ دے کر جتنا اُس کا مطلب نکالا جاسکے نکالیں گے، اور جہاں اُن کا

مطلب محکمات کے ساتھ ٹکرانے لگے وہیں ہم چھوڑ دیں گے، مدار محکمات پر ہے، متشابہات پر نہیں ہے۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا: تمام آیات ہمارے رب کی طرف سے ہیں، وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

''راسخون فی العلم'' کی دوسری صفت یہ ہے کہ اپنے علم پر غرور نہیں کرتے کہ جو چیز اُن کی گرفت میں نہیں آتی اُس میں بھی دخل دینے کی کوشش کریں، اور اپنے علم کے اوپر اتنے نازاں ہوں کہ ہم ہر چیز کو سمجھ سکتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اور پھر ساتھ اللہ تعالیٰ سے وہ دُعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمارے دلوں کو سیدھا رکھنا، ہمارے دلوں کو کجی میں نہ ڈال دینا بعد اِس کے کہ تو نے ہمیں سیدھا راستہ دکھادیا۔ اس لیے استقامت یعنی ہدایت کے اوپر جمنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ سے وہ مانگتے رہتے ہیں، اپنی اِس عملی زندگی پر بھی اُن کو کوئی غرور نہیں ہے کہ ہم جس طریق پر چل رہے ہیں ہم ایسے ہی رہیں گے، بلکہ اِس میں بھی اللہ کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ تو انسان کو علمِ صحیح کے لئے، عملِ صحیح کے لئے، پھر اس پر استقامت کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعا کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ یہ ہدایت جو نصیب ہوتی ہے پھر ہدایت کے اوپر جو ثابت قدمی انسان کو نصیب ہوتی ہے یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اُس کی رحمت سے ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ دُعا فرمایا کرتے تھے: ''يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ''، اور فرماتے تھے: ''اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ'' کہ انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جدھر چاہے گھمادے، جیسے کوئی چیز انگلیوں کے درمیان پکڑی ہوئی ہو تو اُس کا گھمانا بہت آسان ہوتا ہے، اِس لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیے جو دلوں کا پھیرنے والا ہے کہ ہمیں ہدایت کے اوپر اور اپنے دین کے اوپر ثابت قدم رکھے۔[1] اور ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ'' اے اللہ! تو دلوں کا پھیرنے والا ہے، ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے، تو دلوں کو گھمانے والا ہے، ہمارے دلوں کو دین کے اوپر ثابت رکھنا۔ اِس قسم کی دُعائیں حضور ﷺ سے منقول ہیں، اور وہ بات یہیں سے نکلتی ہے کہ راسخون فی العلم اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا بعد اس کے کہ تُو نے سیدھے راستے پر لگا دیا۔ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً: اِس رحمت کا مصداق یہاں یہی تثبیت ہے یعنی ثابت قدم رکھنا، ''ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بیشک تو بہت عطا کرنے والا ہے''۔ اور یہ جو ہم ہدایت کی دُعا کرتے ہیں اور ہدایت پر ثابت قدم رہنے کی دُعا کرتے ہیں اِس میں ہم آخرت کی کامیابی چاہتے ہیں، کیونکہ تو لوگوں کو اکٹھا کرنے والا ہے ایک ایسے دن میں جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، یہ تیرا وعدہ ہے کہ تو اکٹھا کرے گا، اور بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا، اور اُس دن یہی ہدایت اور ہدایت پر ثابت قدمی کام آئے گی، جس کی بناء پر ہم یہ دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں اس ہدایت پر ثابت قدم رکھ جو ہدایت تو نے ہمیں دے دی، اور ان لوگوں کی طرح نہ کرنا جو متشابہات کے پیچھے لگ کر ہدایت کے راستے کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) ترمذی ۳۶/۲ باب ما جاء ان القلوب بین الخ مشکوۃ ۲۲/۱۔ اور اگلی حدیث مسلم ۳۳۵/۲ باب تصریف اللہ الخ/مشکوۃ ۲۱/۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہرگز فائدہ نہیں پہنچائیں گے اُن کو اُن کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی،

وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

یہ لوگ جہنم کا ایندھن ہیں ⑩ ان کا حال فرعون کے لوگوں کے حال کی طرح ہے اور ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں،

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱

انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا پھر پکڑ لیا اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُن کے گناہوں کے سبب سے، اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ⑪

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ

آپ کہہ دیجئے اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کئے جاؤ گے، اور وہ بہت برا

الْمِهَادُ ۝۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ

ٹھکانہ ہے ⑫ تحقیق تمہارے لئے نشانی ہے ان دو جماعتوں میں جن کی آپس میں ٹکر ہوئی، ایک جماعت لڑائی کرتی تھی

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ

اللہ کے راستے میں، اور دوسری جماعت کافر تھی، کافر دیکھتے تھے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا آنکھ کا دیکھنا، اللہ تعالیٰ قوت پہنچاتا ہے

بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳ زُيِّنَ لِلنَّاسِ

اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، بے شک اس میں البتہ عبرت ہے آنکھوں والوں کے لیے ⑬ مزین کردی گئی لوگوں کے لئے

حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ

چاہی ہوئی چیزوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور جمع کئے ہوئے ڈھیر سونے کے

وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ

اور چاندی کے، اور نشان زدہ گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی، یہ دنیوی زندگی کا

الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝۱۴ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ

سامان ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے ⑭ آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں خبر دوں ان سب چیزوں سے اچھی چیز کی،

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اُن کے رَبّ کے پاس باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، وہ ہمیشہ رہنے والے
فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾
ہوں گے ان باغات میں، اور پاک صاف بیویاں ہیں اور اللہ کی طرف سے رضا ہے، اور اللہ دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو ﴿۱۵﴾
اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾
جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لے آئے، پس ہمارے گناہ معاف کردے اور ہمیں جہنّم کے عذاب سے بچا ﴿۱۶﴾
اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾
جو صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں اور اطاعت کرنے والے ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور رات کے آخری حصوں میں استغفار کرنے والے ہیں ﴿۱۷﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، ہرگز اُن کے کام نہیں آئیں گے اُن کے اموال اور نہ اُن کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی۔ لَنْ تُغْنِيَ: اَغْنٰى يُغْنِيْ اِغْنَاءً اِس کا ترجمہ فائدہ پہنچانے کے ساتھ بھی کردیا جاتا ہے، ہرگز فائدہ نہیں پہنچائیں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی۔ اغنٰی عنہ کا ترجمہ دُور ہٹانے کے ساتھ بھی کردیا جاتا ہے "ہرگز دُور نہیں ہٹائیں گے اُن سے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کو" یعنی عذاب میں سے کسی چیز کو دُور نہیں ہٹا سکتے۔ اور اغنٰی عنہ کا ترجمہ کام آنے کے ساتھ بھی کردیا جاتا ہے، اور مفہوم سب کا ایک ہے کہ اللہ کے مقابلے میں یہ چیزیں کام آنے کی نہیں ہیں، وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ: وقود واؤ کے فتحہ کے ساتھ مَا يُوْقَدُ بِهِ النَّارُ، ایندھن، (وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ یہ لفظ پہلے بھی سورۂ بقرۃ میں آپ کے سامنے گزرا ہے) یہ لوگ جہنّم کا ایندھن ہیں، كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ: دَاْبُهُمْ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ان کا حال فرعون کے لوگوں کے حال کی طرح ہے، وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: اور اُن لوگوں کے حال کی طرح ہے جو اُن سے پہلے گزرے ہیں، كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اُنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ: پھر پکڑ لیا اللہ تعالیٰ نے انہیں اُن کے گناہوں کے سبب سے، ذُنوب ذَنب کی جمع، وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ: آپ کہہ دیجئے اُن لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے، وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ: اور جہنّم کی طرف جمع کیے جاؤ گے، وَبِئْسَ الْمِهَادُ: بِئْسَ الْمِهَادُ هِيَ، مخصوص بالذم هِيَ ضمیر ہے جو جہنّم کی طرف لوٹے گی۔ وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ مِهاد: آرام کرنے کی جگہ۔ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ: تحقیق تمہارے لیے نشانی ہے دو جماعتوں میں، فِئَتَيْنِ فِئَةٌ کا

تثنیہ، اِلْتَقَتَا: جن کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی، وہ دو جماعتیں جو آپس میں ٹکرائی تھیں۔ اِلْتِقَاءُ الْعَدُوِّ: دشمن سے ٹکرانا، کیونکہ دشمن سے جو ملاقات ہوا کرتی ہے وہ ٹکر کی صورت میں ہوا کرتی ہے، اس لیے اُردو میں اِس کا مفہوم ٹکرانے کے ساتھ ہی ادا کیا جاتا ہے، ویسے اِلْتِقَاء ملنے کو کہتے ہیں، ''اُن دو جماعتوں میں جن کی آپس میں ٹکر ہوئی''، فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ: ایک جماعت لڑائی کرتی تھی اللہ کے رستے میں، وَأُخْرٰى كَافِرَةٌ: اور دوسری جماعت کافر تھی، جس سے مقابلۃً یہ بات سمجھ میں آگئی کہ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ یا فِي سَبِيلِ الشَّيْطَانِ، کہ دوسری جماعت کافر تھی جو شیطان کے راستے میں لڑتی تھی، طاغوت کے راستے میں لڑتی تھی، يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ: وہ کافر لوگ دیکھتے تھے اُن مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا، رَأْيَ الْعَيْنِ: دیکھنا آنکھ کا، یعنی کھلی آنکھوں وہ کافر مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھتے تھے۔ يَرَوْنَهُمْ کی هُمْ ضمیر مسلمانوں کی طرف لوٹائیں تو ترجمہ یوں ہوگا ''وہ کافر اُن مسلمانوں کو دیکھتے تھے اپنے سے دوگنا آنکھ کا دیکھنا'' یعنی بالکل مشاہدے کے طور پر، کھلی آنکھوں۔ اور اگر هُمْ ضمیر يَرَوْنَ کے فاعل کی طرف ہی لوٹے تو ترجمے میں یہ بھی احتمال ہے کہ ''دونوں جماعتوں میں سے ہر ایک جماعت اپنے آپ کو دیکھتی تھی دوگنا دیکھنا آنکھ کا''، تفسیر میں یہ بات آپ کے سامنے آجائے گی۔ وَاللهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاءُ: اللہ تعالیٰ قوت پہنچاتا ہے اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ: بیشک اس میں البتہ عبرت ہے آنکھوں والوں کے لئے۔ اَبصار بصر کی جمع۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ: مزین کردی گئی لوگوں کے لئے، حُبُّ الشَّهَوٰتِ: شہوات جمع ہے شہوۃ کی، اور شہوۃ مصدر ہے شَهِيَ يَشْهٰى کا، بمعنی چاہنا، اور یہاں اِس کا مفہوم ہے مُشْتَهَيَات یعنی مصدر کو اسم مفعول کے معنی میں لیں گے، حُبُّ الْمُشْتَهَيَات: حُبُّ الْمَرْغُوبَات، چاہی ہوئی چیزوں کی محبت، ''مرغوبات کی محبت لوگوں کے لئے مزین کردی گئی''، مِنَ النِّسَاءِ: مِن بیانیہ ہے، مشتہیات کی تفصیل یہ ہے، عورتیں، بیٹے۔ قناطیر قِنْطَارٌ کی جمع، بمعنی ڈھیر، مُقَنْطَرَة: لگائے ہوئے، ''لگائے ہوئے ڈھیر، جمع کیے ہوئے ڈھیر سونے کے اور چاندی کے'' وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ: اور نشان زدہ گھوڑے، مُسَوَّمَة: نشان لگائے ہوئے، یعنی عمدہ گھوڑے، عمدہ گھوڑوں کے اوپر وہ نشانات لگاتے تھے، ''اور چوپائے اور کھیتی''۔ مشتہیات کے تحت یہ ساری چیزیں آگئیں، ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: یہ دنیا کی زندگی کا برتنے کا سامان ہے، متاع: ایسا سامان جس سے فائدہ اٹھایا جائے، ''یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے'' وَاللهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ: اور اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ: آپ کہہ دیجیے کہ کیا میں تمہیں خبر دوں؟ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ: اِن سب چیزوں سے اچھی چیز کی، ذٰلِكُمْ کا اشارہ وہی پیچھے جو مشتہیات آئی ہیں ان کی طرف ہے بتاویل مذکور، ''کیا میں خبر دوں تمہیں اس مذکور سے اچھی چیز کی''، لِلَّذِينَ اتَّقَوْا: اُن لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اُن کے رب کے پاس باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُن باغات میں، اور پاک صاف بیویاں ہیں، وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ: اور اللہ کی طرف سے رضا ہے، رضوان کا معنی رِضا، یہ مصدر ہے، وَاللهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ: اور اللہ دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو، اَلَّذِينَ يَقُولُونَ: جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! إِنَّنَا اٰمَنَّا: بیشک ہم ایمان لے آئے، فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا: پس تو بخش دے ہمارے گناہ، اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط وخلاصۂ مضامین

آپ کے سامنے ذکر آیا تھا کہ ابتدائی آیات کا تعلق زیادہ تر عیسائیوں کے ساتھ اُس گفتگو سے ہے جو سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ایک وفد کی صورت میں آئے تھے، اور کچھ اختلافی مسائل پر انہوں نے حضور ﷺ سے گفت وشنید کی تھی۔ پچھلی آیات میں مسئلۂ توحید کو واضح کیا گیا، اور متشابہات سے وہ لوگ استدلال کر کے جو اپنے عقائدِ باطلہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، اُس پر انکار کیا گیا ہے، اِن آیات میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت کی یاد دہانی کراتے ہیں، اور اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ دنیا کی طمع اور لالچ میں آ کر جو لوگ حق کو قبول کرنے سے رکتے ہیں وہ اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رہے ہیں، یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والی نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جانے کے بعد یہ چیزیں کچھ کام نہیں آئیں گی، کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور اللہ کے احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں، اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین نہ عیسائیت ہے نہ یہودیت ہے، بلکہ مقبول دین یعنی جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول کیا جائے گا وہ صرف دین اسلام ہے، اور ان اختلاف کرنے والوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اب یہ محض ضد کے طور پر اختلاف کرتے ہیں، کہ اسلام قبول کرنے کی صورت میں اِن کی سرداریوں میں فرق آتا ہے، اور اِن کے جاہ ومال میں کمی آتی ہے، جس کی بناء پر یہ قبول نہیں کر رہے، ورنہ دلیل کے اعتبار سے مسئلہ بالکل صاف ہو چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اِن کے کام نہیں آئیں گے اِن کے مال اور نہ اِن کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، اور یہ جہنّم کا ایندھن ہیں، اس لئے مال واولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر جو لوگ کُفر کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں۔ وَقود کا لفظ آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا، جس کے ساتھ آگ بھڑکائی جاتی ہے، وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ یہ لفظ پہلے بھی آ چکا ہے۔

بطورِ عبرت آلِ فرعون وغیرہ کے اَنجام کا ذِکر

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ: ان کا حال فرعون کے لوگوں کی طرح ہے، دَأب حال کو کہتے ہیں، دَاْبُهُمْ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ، آلِ فرعون سے فرعون کے متعلقین مراد ہیں، کیونکہ جس فرعون کا قرآنِ کریم میں ذکر آتا ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کا مدمقابل تھا، عام طور پر مشہور یہی ہے، تفسیری روایات میں یہی ذکر کیا جاتا ہے کہ اُس کی اولاد نہیں تھی، اس لئے یہاں لفظِ آل اولاد کے معنی میں نہیں ہے، اور یہی دلیل ہے اس بات کی کہ آل کا لفظ متبعین کے لئے بھی بولا جاتا ہے، تو جس طرح آلِ فرعون میں فرعون کی فوجیں، فرعون کے درباری، فرعون کے متعلقین، اور اُس کے متبعین مراد ہیں، اسی طرح جب آلِ محمد کا ذکر آئے تو اُس کو بھی عمومی معنی کے طور پر حضور ﷺ کے متبعین کے لئے لے لیا جاتا ہے، جیسے آپ کہا کرتے ہیں: ''كُلُّ تَقِيٍّ نَقِيٍّ فَهُوَ آلِي''[1] وہاں یہی مفہوم ہے کہ متقی پرہیزگار سب میری آل میں شامل ہیں، یہ آل کا عمومی مفہوم ہوتا ہے۔ تو یہاں آلِ فرعون سے فرعون کے متعلقین مراد ہیں، ''ان کا

(۱) تفسیر روح البیان، سورۂ اسراء: ۱۰۳ کے تحت، ولفظه: كل تقي نقي آلي۔ نیز ابن کثیر، سورۂ انفال: ۳۴ کے تحت ہے: سُئِلَ رسولُ اللهِ ﷺ مَن آلُكَ قَالَ كُلُّ تَقِيٍّ۔

حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے اور اُن لوگوں کے حال کی طرح ہے جو اِن سے پہلے گزرے''، اُن کا کیا حال تھا جو دونوں میں مشترکہ ہے؟ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اِن سب نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، تو پھر اللہ نے اُن کو پکڑ لیا ان کے گناہوں کے سبب سے۔ اِن کو بھی تنبیہ کردی گئی کہ اگر یہ بھی اِسی حال پر قائم رہیں گے تو جو حال آلِ فرعون اور دوسرے لوگوں کا ہوا تھا وہی حال ان کا ہوگا، کہ ان کے جرائم اور ان کے گناہوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ اِنہیں پکڑ لیں گے وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: عِقاب باب مفاعلہ کا مصدر ہے، عَاقَبَ مُعَاقَبَةً: سزا دینا، اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہیں، یعنی اللہ کا عقاب بہت سخت ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو سزا دیتے ہیں تو اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (سورۂ بروج) تیرے رَبّ کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے۔

کافروں کے دُنیوی انجامِ بد کی پیش گوئی

آگے قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں پیش گوئی کی ہے کہ ''اِن کافروں سے کہہ دیجئے''، اب یہاں جو کُفر کا عنوان اختیار کیا جارہا ہے اِس میں بہت صراحت ہے کہ تمہارا طریقہ غلط ہے، ''اِن کافروں سے کہہ دیجئے'' جو اِن موجودہ حقائق کو تسلیم نہیں کرتے جو سرورِ کائنات ﷺ پر اترے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی وحی کو تسلیم نہیں کرتے، اِن کافروں سے کہہ دو کہ آخرت میں تمہارے مال واولاد تو کام نہیں آئیں گے، وہ بات تو اپنی جگہ حقیقت ہے، اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ دنیا میں بھی تمہیں یہ جاہ وجلال حاصل نہیں رہے گا، سَتُغْلَبُوْنَ: عنقریب تم مغلوب کردیے جاؤ گے۔ اِن کافروں کا مصداق عمومی الفاظ کے طور پر اُس زمانے کے مشرکین مکہ بھی ہوسکتے ہیں، ورنہ جو صراحتاً مدمقابل تھے یہود ونصاریٰ وہ بھی اِس کا مصداق ہیں، اور ''سین'' استقبال قریب کے لئے ہے، چنانچہ بہت جلد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ کی صداقت لوگوں کے سامنے واضح کردی، مشرکین کا جاہ وجلال بھی سات آٹھ سال کے اندر اندر خاک میں مل گیا، اور یہودیوں کا انجامِ بد تو ان سے بھی پہلے سامنے آگیا، اور عیسائی جو اردگرد آباد تھے جو اُس وقت گفتگو وغیرہ کے لئے آئے ہوئے تھے، نجران وغیرہ کے علاقے کے، وہ بھی سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں ہی مغلوب ہوگئے، تو سَتُغْلَبُوْنَ کی جو پیش گوئی تھی لوگوں نے اُسی وقت اپنی کھلی آنکھوں دیکھ لی۔ ''اِن کافروں سے کہہ دیجئے کہ تم عنقریب مغلوب کئے جاؤ گے'' یہ تو دنیا میں ہوگا، وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ: یہ آخرت میں ہوگا، اور تم جمع کئے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

بطورِ نمونہ غزوۂ بدر کا ذِکر

باقی تم یہ نہ سمجھنا کہ ہمارے پاس مال زیادہ ہے، دولت زیادہ ہے، ہم بڑے خاندانی لوگ ہیں، یہ ہے، وہ ہے، ابھی ابھی تمہارے سامنے بدر کے میدان میں حق اور باطل کی ٹکر ہوئی تھی۔ چونکہ سورت کا نزول غزوۂ بدر کے بعد ہے، اِس لئے آگے اس جنگ کا نمونہ دکھایا جارہا ہے، جیسے سورۂ بقرۃ میں طالوت اور جالوت کی جنگ کا نمونہ دکھایا تھا، وہ بیان کے درجے میں چیز آئی تھی، کہ یہ طالوت اور جالوت کا جو مقابلہ ہوا تھا، جالوت اُس وقت کی بہت بڑی قوت تھی، اُس کو ہر قسم کا سامان حاصل تھا، اس کے پاس افراد کی کثرت تھی، اور اُس کے مقابلے میں حق کے علمبردار جو طالوت کی قیادت میں آئے تھے وہ چند گنتی کے تھے، روایاتِ صحیحہ

میں آتا ہے کہ اُن کی تعداد تین سو تیرہ تھی، اور کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً کا نمونہ اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے دکھایا، کہ طالوت کو فتح ہوئی اور جالوت مارا گیا، وہ چیز تو صرف بیان میں آئی تھی اور اِس زمانے کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا، لیکن بدر کا معرکہ تو موجودہ لوگوں نے دیکھا، اُن کے سامنے ایک بات آگئی، اُس کی طرف نشاندہی کی جارہی ہے، کہ ذرا اِس واقعہ کو دیکھ لو۔ ایک جماعت اللہ کے لئے لڑنے والی تھی اور ایک جماعت کافر تھی، تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کافروں کو کس طرح اِن مسلمانوں کے ہاتھوں پٹوادیا، اس لیے تم اپنے ساز وسامان پر غرور نہ کرنا اور اپنی کثرت پر ناز نہ کرنا، جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آجائے تو پھر یہ مال واولاد اور یہ کثرت دنیا میں بھی کام نہیں آتی، یہ اُن کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ اب ذرا آنکھیں کھولو، وقت بہت قریب آرہا ہے۔ ''تمہارے لئے نشانی ہے دو جماعتوں میں'' اِن دو جماعتوں سے مراد ایک جماعت مشرکین مکہ کی اور ایک جماعت صحابہ کرام کی، اور یہ جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے، اِلْتَقَتَا: جن کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی، ایک جماعت لڑتی تھی اللہ کے راستے میں، اور دوسری کافر تھی جو لڑتی تھی شیطان کے راستے میں، طاغوت کے راستے میں۔ پھر جب میدان کے اندر دونوں جماعتیں آپس میں مدمقابل ہوئی ہیں (اس کی زیادہ تفصیل تو آپ کے سامنے سورۂ انفال میں آئے گی، اُس سورت کا اکثر حصہ غزوۂ بدر کے حالات پر ہی مشتمل ہے) تو وہاں مختلف حالات طاری ہوئے، واقعہ کے لحاظ سے تو کافر مسلمانوں کے مقابلے میں تین گنا سے بھی زیادہ تھے، کیونکہ کفار کی تعداد ایک ہزار یا اس سے کچھ اُوپر تھی، اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، بِضْعَةَ عَشَرَ کا لفظ بھی آتا ہے یعنی دس سے کچھ اوپر (بخاری)، اور ثَلٰثَةَ عَشَرَ کا ذکر بھی صراحتاً آتا ہے یعنی تیرہ (ترمذی)، تو تیرہ جو ہیں یہ بضعۃ عشر کا مصداق بھی ہیں۔ بہرحال واقع کے لحاظ سے تو کافر تین گنا تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کو چونکہ یہ لڑائی کروانی مقصود تھی تاکہ حق اور باطل کا فیصلہ مشاہدے کے ساتھ ہوجائے۔ ابوجہل نے میدانِ بدر میں اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کے دُعا کی تھی، اور یہ کہا تھا کہ اے اللہ! آج فیصلہ ہوجائے، جو قاطع الرحم ہے، جس نے رشتہ داریاں برباد کردیں، قوم میں پھوٹ ڈال دی، ہمارے حالات خراب کردیئے، گھر گھر میں جنگ برپا کردی، جو باطل پر ہے، جو قاطعِ رحم ہے، اُس کو برباد کردے ''مَنْ كَانَ اَقْطَعَ لِلرَّحِمِ فَاَحِنْهُ الْيَوْمَ''[1] جو رحم کے لئے قاطع ہے، جس نے رشتہ داریوں کا لحاظ نہیں کیا (یہ اشارہ تھا حضور ﷺ کی طرف) اِس کو ہلاک کردے۔ گویا کہ اُن کے نزدیک بھی یہ معرکہ حق اور باطل کے فیصلے کا تھا (جیسے وہ دُعا تو قرآنِ کریم نے بھی نقل کی ہے جو نضر بن الحارث نے ایک موقع پر کی تھی ''اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ''[2] اے اللہ! اگر یہ حق ہے جو یہ کہتے ہیں تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا اور ہمارے اُوپر عذابِ الیم بھیج دے)۔ اور اُدھر سرورِ کائنات ﷺ نے بھی اپنے صحابہ ﷺ کو غلبے کی پیش گوئیاں کی ہوئی تھیں، حتیٰ کہ صحیح روایات میں موجود ہے، مشکوۃ میں باب المعجزات میں آئے گا، اور بخاری شریف میں بھی یہ روایات موجود ہیں، کہ حضور ﷺ جب میدانِ بدر میں پہنچے ہیں تو صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہاتھ لگا کر

---

(۱) کتب تفسیر سورۂ انفال: ۱۹ کے تحت اس سے ملتے جلتے مختلف الفاظ مذکور ہیں۔ مستدرک حاکم کے الفاظ یہ ہیں: قَالَ حِيْنَ الْتَقَى الْقَوْمُ اَللّٰهُمَّ اَيُّنَا كَانَ اَقْطَعَ لِلرَّحِمِ وَاٰتَانَا بِمَا لَا نَعْرِفُ فَاَحِنْهُ الْغَدَاةَ

(۲) جلالین، ابن کثیر وغیرہ سورۂ انفال: ۳۲ کے تحت۔ نوٹ: بخاری میں ہے کہ یہ دُعا ابوجہل نے کی تھی۔

حد بندی کردی تھی، کہ یہ فلاں کا مصرع ہے، یہاں فلاں گرے گا، یہاں فلاں گرے گا، یوں نشاندہی کردی تھی، تو گویا کہ حضور ﷺ کی طرف سے بھی یہ فیصلہ کن بات تھی، اور صحابہ کرام ؓ کہتے ہیں کہ جس وقت مقابلہ ہوا تو جہاں جہاں حضور ﷺ نے جس جس شخص کے متعلق پیش گوئی کی تھی وہیں وہیں وہ گرا، تو گویا مشاہدے کے طور پر حضور ﷺ کی حقانیت لوگوں کو دکھادی گئی، اور وہ خود حق اور باطل کا فیصلہ طلب کر کے آئے تھے تو اُن کے سامنے فیصلہ بھی آ گیا، اِسی لئے بدر کو اللہ تعالیٰ نے ''یوم الفرقان'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے کہ یہ حق اور باطل کے درمیان فیصلے کا دن تھا، یعنی مشرکین اور مسلمین کے درمیان یہ پہلی لڑائی تھی اور اُس کی حیثیت فیصل کی بن گئی۔ پھر وہ پٹے اور اچھی طرح سے پٹے، تو اللہ تعالیٰ نے کھلی آنکھوں دکھادیا کہ جب اللہ تعالیٰ غلبہ دینا چاہے تو نہ کثرت کام آتی ہے نہ ہتھیار کام آتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوتی ہے وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ اب تم آنکھیں کھول کر ذرا اِس واقعہ کو دیکھ لو، اس لئے اپنے مالوں پر اور اپنی کثرت پر اور اپنے اقتدار پر ناز نہ کرو۔ سَتُغْلَبُوْنَ کے لئے ایک نمونہ دکھایا جارہا ہے۔ اب واقع کے لحاظ سے تو مشرکین کی تعداد زیادہ تھی، لیکن آپ کے سامنے مختلف احوال آئیں گے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے جس وقت مسلمان کافروں کی طرف نظر دوڑاتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی آنکھوں پر کوئی ایسا تصرف تھا کہ اُن کو کافر تھوڑے نظر آتے تھے، سورۂ انفال میں لفظ آئیں گے وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ (آیت: ۴۴)، اور کافر جب مسلمانوں پر نظر ڈالتے تھے تو اُن کو وہ تھوڑے نظر آتے تھے اور وہ واقع کے اعتبار سے بھی تھوڑے تھے۔ یہ تھوڑا نظر آنا اس لئے تھا تا کہ دونوں کے حوصلے بڑھیں اور لڑنے پر تیار ہوجائیں، ایسا نہ ہو کہ اگر کافروں کو مسلمانوں کی زیادہ تعداد نظر آجائے تو دل چھوڑ کر میدان سے کوئی بہانہ کر کے پہلے ہی چلے جائیں، اور اللہ کا مقصد تھا کہ اب اِن کا سر کٹوادیا جائے، اِن کو آپس میں بھڑادیا جائے، اسی طرح اگر مسلمانوں کے سامنے اُن کی تعداد بہت زیادہ نمایاں ہوجاتی اور یہ بہت تھوڑے ہوتے تو اپنے سے دگنی تعداد کے ساتھ تو اگرچہ لڑنے کا حوصلہ ہوتا ہے، زیادہ نمایاں ہوجاتے تو ہوسکتا تھا کہ اِن کے حوصلوں پر بھی اثر پڑتا۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کو قلیل تعداد میں نظر آئے، کہ کچھ بھی نہیں، مٹھی بھر ہیں، ہم اِن کا خاتمہ کردیں گے، دونوں طرف سے حوصلے بڑھ گئے، پھر جس وقت آپس میں ٹکراؤ ہوگیا، لڑائی ہوگئی، اور مسلمانوں کی طرف سے فرشتے نازل ہوئے تو مسلمانوں کی تعداد کافروں کو اپنے سے دگنی نظر آنے لگ گئی، اور تعداد کے دگنی نظر آنے سے اُن کے حوصلے ٹوٹ گئے، اور لڑائی کے میدان میں کسی کی ہمت پست ہوجائے سب سے بڑی شکست یہی ہوتی ہے، جب دل میں قوت نہ رہے اور انسان کا حوصلہ ٹوٹ جائے تو بازو سے بھی لڑنے کی قوت ختم ہوجاتی ہے۔ پھر وہ کافر اِن مسلمانوں کو کھلی آنکھوں دوگنا دیکھنے لگ گئے جس سے اُن کے حوصلے پست ہوگئے، یہ ایک ذہنی انقلاب تھا، اور تصور کے طور پر اِس قسم کے حالات پیدا کئے جارہے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل تھی، جس کے ساتھ دشمن کے حوصلے چھوٹ گئے، بہر حال یہ مختلف احوال پیش آئے تھے اس لیے یہاں جو ذکر کیا جارہا ہے یہ ایک حال ہے۔ ''کافر دیکھتے تھے اُن مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا کھلی آنکھوں'' اور یہ دیکھنا خلافِ واقع تھا، یعنی مسلمان اُن سے دگنے تھے نہیں، لیکن فرشتوں کی شمولیت کی وجہ سے یا اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر ایسا تصرف کیا کہ جب اِن کی تعداد زیادہ نظر آئی تو اُن کے حوصلے چھوٹ گئے۔ ''اللہ تعالیٰ قوت پہنچاتا ہے اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، بے شک اِس میں البتہ عبرت ہے آنکھوں والوں کے

لیے۔"چونکہ یہ واقعہ مشاہدے کے طور پر پیش آیا، تو جن کی آنکھیں ہیں وہ جا کر دیکھیں، میدان کا نقشہ دیکھیں اور اِن کے حالات کو سمجھیں، پتہ چل جائے گا کہ فتح وہی پایا کرتا ہے جس کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوتی ہے، اس لیے مال، اولاد، کثرت، اور سامان ایسے موقع پر کچھ کام نہیں آتے، یہ تو اُن کو سَتُغْلَبُوْنَ کا نمونہ دکھایا ہے، کہ اِس کو دیکھ کر ہوا کا رخ سمجھ جاؤ، کہ اب اِن کافروں کا کیا انجام ہونے والا ہے، اب اپنے مال واولاد پر ناز چھوڑ دو، بڑے بڑے فرعون پہلے گزرے ہیں اور بڑے بڑے سرکش پہلے گزرے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے اِن کے جرائم اور گناہوں کی بناء پر پکڑنا چاہا تو کسی کی فرعونیت سامنے رکاوٹ پیدا نہ کرسکی۔

دُنیا کی مرغوبات کی وجہ سے حق کو چھوڑنے پر تنبیہ

آگے دوسرے انداز میں تنبیہ ہے، کہ انسانوں کے سامنے دنیا کی چیزیں اور اس کی مرغوبات ومشتہیات بڑی مزین ہیں، انہیں بڑی خوبصورت لگتی ہیں، اور اِن کی محبت کے اندر مبتلا ہو کر انسان حق کو چھوڑ دیتا ہے، اب جتنی چیزیں یہاں شمار کی گئی ہیں یہی ہیں جن کے ساتھ دنیا میں انسان کا تعلق ہوتا ہے، پہلے نمبر پر عورتیں آگئیں، سب سے زیادہ مشتہیات میں یہی شامل ہیں، اِن کی طرف رغبت ہوتی ہے، اور پھر بیٹے آگئے، اولاد آگئی، جمع کیے ہوئے ڈھیر سونے چاندی کے لگے ہوئے، یہ آگئے۔ اور عرب کے اندر گھوڑوں کو بہت زینت وفخر اور اپنے دفاع وغیرہ کی ضرورت کے لئے سب سے زیادہ ترجیح وہ گھوڑوں کو دیتے تھے، اس لیے گھوڑے کی محبت کا ذکر آگیا۔ اور پھر چوپایوں کا ذکر آگیا، کیونکہ شہری زندگی اور تمدن اختیار کرنے سے قبل لوگوں کی بدویانہ زندگی میں یہی چوپائے ہی تھے جو گزر اوقات کا ذریعہ تھے، اِن کا دودھ پینا، اور اِن پر سواری کرنا، اور اِن کے چمڑوں اور بالوں سے فائدہ اٹھانا، اِسی کے ساتھ ہی گزر اوقات ہوتا تھا۔ اور آگے کھیتیوں کا ذکر ہے یعنی زمین میں جو کچھ بو کر کاٹ لیتے ہیں۔ یہ چیزیں دُنیا کی مرغوبات ہیں اور اِن کی محبت انسان کے قلب میں پیوست ہے، اور اِن کی محبت میں انسان سب کچھ کرتا ہے، بیوی حاصل کرنے کے لیے، اولاد کی محبت میں، مال و دولت اکٹھا کرنے کے لئے، گھوڑے اور جانور اکٹھے کرنے کے لئے، کھیتوں اور باغات کے لئے، یہی ہے انسان کی محنت اور مشقت، اور پوری صلاحیتیں انسان اِنہی چیزوں کے حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں، دنیوی زندگی کے اندر بڑے بڑے مقاصد انسان کے یہی ہیں، ساری نقل وحرکت اِنہی کی وجہ سے ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: یہ تو دنیوی زندگی کا سامان ہے، جتنی دیر تک تمہیں سانس آرہا ہے اور تمہاری آنکھیں کھلی ہیں اِن چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ اور یہ بھی آپ کے سامنے مشاہدہ ہے کہ جونہی سانس ختم ہوتا ہے اور زندگی ختم ہوتی ہے یہ سب چیزیں جدا ہو جاتی ہیں، نہ بیوی ساتھ جاتی ہے، نہ بیٹے ساتھ جاتے ہیں، نہ سونا چاندی ساتھ جاتا ہے، نہ گھوڑے اور بیل ساتھ جاتے ہیں، نہ باغات اور کھیتی ساتھ جاتی ہے، یہ چند روزہ دنیوی سامان ہے جس کو آپ استعمال کر لیتے ہیں، مرنے کے بعد یہ کام آنے کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔

دُنیا کی چھ چیزیں کے مقابلے میں جنت کی تین نعمتوں کا ذِکر

آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں اس سے ایک اچھی چیز بتاؤں؟ یعنی یہ جو چھ چیزیں آپ کے سامنے شمار کی گئیں ان کے

مقابلے میں اچھی چیز، وہ کن لوگوں کو ملے گی؟ جو تقویٰ اختیار کریں گے، یہ اُس کے حاصل کرنے کا طریقہ بتادیا، اور وہ اچھی چیز ہے کیا؟ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: باغات جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ رہیں گے اُس میں، وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: اور پاک صاف ستھری بیویاں، اور اللہ کی رضا، یہ چیزیں ہیں جن کو اِس سارے سامان کے مقابلے میں بہتر قرار دیا گیا ہے۔ خیال فرمائیے! پیچھے چھ چیزیں شمار کی گئی ہیں، اور یہاں مقابلے میں صرف تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں، باغات، ازواج مطہرہ اور اللہ کی رضا، اور اُن چھ کے مقابلے میں اِن کو بہتر قرار دیا گیا، بہتر کس طرح سے؟ کہ یہاں پہلے تو ذکر آیا تھا نساء کا، یہ تو انسان کے لئے تلذذ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، یہ تو جیسے دنیا میں تلذذ کا ذریعہ ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت میں بھی جنت کے اندر ان کو تلذذ کا ذریعہ بنائے گا، یہ تو ہوں گی، اِس کے بغیر تو انسان کی زندگی کی تکمیل نہیں ہے، انسان اپنی زندگی میں بہت سارا خلا پاتا ہے، تو بیویاں تو خوشحال زندگی کا ایک جزو لازم ہیں، یہ تو بہر حال دونوں جگہ ہیں۔

باقی! دنیا کے اندر جو بیٹوں کی محبت ہے یہ اپنی ایک خاص غرض کے تابع ہے، کہ دنیا میں انسان سمجھتا ہے کہ بیٹے ہوں گے، کاروبار میں میرے ساتھ معاون ہوں گے، میں مر جاؤں گا تو میری جائیداد کو سنبھالیں گے، بوڑھا ہو جاؤں گا تو بڑھاپے کے زمانے میں یہ ہاتھ کی لاٹھی ہیں، انسان کے لئے سہارا بنتے ہیں، اِنہی اغراض کے تحت اِن کی پریشانیاں انسان اٹھاتا ہے، ان کو پالنے کی، اِن کی تربیت کرنے کی، اِن کے اخراجات کی، انسان اپنے بیٹوں کی کتنی فرمائشیں پوری کرتا ہے اور کتنے نخرے برداشت کرتا ہے، وہ اِسی مقصد کے تحت کرتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ مقاصد آخرت میں نہیں ہیں، نہ تو وہاں بوڑھا ہونے کا ڈر ہوگا، کہ بڑھاپے میں ہمیں کوئی چارپائی سے اٹھایا کرے گا اور اٹھا کر ہمارا کوئی کام کرے گا، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی، نہ وہاں کوئی موت کا اندیشہ ہے کہ بعد میں وراثت کا جھگڑا ہوگا کہ کہیں ساری وراثت شریک نہ لے جائیں، گھر میں بیٹا ہوگا تو جائیداد سنبھال لے گا، اِس قسم کی چیزیں وہاں نہیں ہیں، اس لئے اولاد کی چاہت انسان میں نہیں ہوگی۔ اور حدیث شریف میں صراحتاً آتا ہے کہ اگر کسی کے دل میں ایسی تمنا پیدا ہو بھی گئی کہ میرے ہاں بیٹا ہو تو انہی جنت والی بیویوں سے آناً فاناً اولاد بھی اس کے سامنے آجائے گی، لیکن ایسا چاہے گا کوئی نہیں، اگر چاہے گا تو ہو جائے گی،(۱) چونکہ بیٹوں کی محبت اِنہی مقاصد کے تحت ہے، ورنہ اگر یہ مقاصد نہ ہوں تو اتنی مصیبت کوئی نہیں اٹھاتا جتنی اولاد کے لئے اٹھائی جاتی ہے، وہ اِسی وجہ سے اٹھائی جاتی ہے کہ انسان اِن کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتا ہے۔

اور اِسی طرح سونا چاندی بھی بذاتِ خود مقصود نہیں، صرف اس لئے مقصود ہیں کہ اِن کے ذریعے سے ضروریاتِ زندگی مہیا ہوتی ہیں، مثلاً آپ کو کپڑے کی ضرورت ہے تو سونے چاندی سے آپ کو کپڑا ملے گا، آپ کو خوراک کی ضرورت ہے تو سونا چاندی خرچ کر کے آپ اپنے لیے خوراک مہیا کرلیں گے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت ہے تو آپ سونا چاندی خرچ کر کے اپنے لئے مکان مہیا کرلیں گے۔ اور اگر سونے چاندی کو اِن ضروریات میں صرف نہ کیا جائے تو یہ محض رکھا ہوا انسان کے کسی کام کا نہیں، آپ نے مقامات میں پڑھا ہوگا، سروجی نے جو دینار کی مذمت کی تھی اُس میں یہ بھی آیا تھا کہ اِلَّا اِذَا فَرَّ فِرَارَ الْاٰبِقِ جب تک کہ یہ

(۱) مشکوٰۃ ۲/۴۹۹، ۵۰۰ باب صفۃ الجنۃ فصل ثانی عن ابی سعید ؓ / ترمذی ۲/۸۴ باب ما جاء ما لأدنیٰ اھل الجنۃ.

نافرمان غلام کی طرح بھاگ نہ جائے اُس وقت تک یہ کام کا نہیں ہے، یعنی دوست تو وہ ہوتا ہے جو پاس رہنے سے مفید ثابت ہو، اور یہ ایسا ہے کہ جب تک اپنے پاس سے بھاگ نہ جائے اِس کا کوئی فائدہ نہیں، یعنی آپ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ہے اور آپ کو بھوک لگی ہوئی ہے، اب وہ جیب میں پڑا ہوا ہے تو کسی کام کا نہیں، اِس کو نکال کر پھینکو گے تو روٹی مل جائے گی، جب یہ نافرمان غلام کی طرح جاتا ہے تو ہی کام آتا ہے، اور جب تک اِس کو سینے سے لگا کر رکھو گے کسی کام کا نہیں، تو جب یہ سونا چاندی ہیں ہی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے، اور ضروریات آخرت میں خود بخود پوری ہوں گی، خرید وفروخت کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، اس لئے سونا چاندی کی بھی کوئی چاہت نہیں ہوگی۔ ویسے سونا چاندی کی جنت میں کمی بھی نہیں، جیسے حدیث شریف میں ہے کہ مکانات سونے کے ہوں گے، جنت کے درخت جو ہیں کسی کا تنا سونے کا اور کسی کا تنا چاندی کا ہوگا، برتن سونے اور چاندی کے ہوں گے،[1] کنگن پہنا پہنا کر آپ کو زیورات کے ساتھ لد دیا جائے گا، بہرحال وہاں سونا چاندی بہت ہوگا، لیکن انسان کے دل میں اس کی ضرورت اور محبت نہیں ہوگی، کیونکہ جس مقصد کے لئے دنیا میں اس کو چاہا جاتا ہے وہ مقصد وہاں ویسے ہی حاصل ہوگا، لیکن پھر بھی وہاں سونے چاندی کی کثرت ہے۔

اور اسی طرح گھوڑوں کا ذکر آیا تھا، اب گھوڑے سواری کے لئے مطلوب ہیں، کہ ایک جگہ سے سفر کر کے دوسری جگہ جانا ہے، اور دشمن کے مقابلے میں دفاع کے لئے بھی مطلوب ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ جنت میں یہ دونوں باتیں نہیں ہوں گی، نہ دفاع کی ضرورت ہوگی اور نہ ایک جگہ سے دوسری طرف سفر کرنے کے لئے سواری کی ضرورت ہوگی۔ ویسے اِس کے باوجود جنت میں گھوڑے ہوں گے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ اس قسم کے ہوں گے (جیسے میں نے کل آپ کے سامنے متشابہات میں عرض کیا تھا کہ کسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے الفاظ تو ہیں، باقی وہ کیسے ہوں گے ہم نہیں سمجھ سکتے) کہ یاقوتی گھوڑے ہوں گے موتیوں جیسے، انسان ان پر سوار ہوگا، اور جدھر چاہے گا اُس کو اڑا کر لے جائے گا،[2] ایسے گھوڑے ہوں گے، لیکن یہ ہے کہ اُن کی محبت اور اُن کی ضرورت وہاں ختم ہوگی۔ اور ایسے ہی اَنعام اور حرث کا ذکر آیا تھا، تو یہ چوپائے آپ کو دودھ کے لئے مطلوب ہیں، اور جنت میں تو دُودھ کی نہریں چلیں گی، ضرور آپ نے بکریاں پال پال کر ان میں سے دُودھ نکالنا ہے؟ وہاں تو ویسے ہی دُودھ کی نہریں ہیں، اور اس قسم کی دوسری ضرورتیں جتنی ہیں وہ بھی ساری کی ساری پوری ہوں گی۔

تو ساری حقیقت سمٹ کر آگئی ہے تو جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں ساری ضروریاتِ زندگی ہیں، اور عورتوں کے اندر جو بھلائی کا پہلو ہے اُس کو اَزواجِ مطہرہ میں لے لیا گیا، اور دنیا کی عورتوں میں جو مضرت کا پہلو ہے اُس کو مطہرہ کے لفظ سے کاٹ دیا گیا۔ دنیا کی عورتوں کے اندر مضرت کا پہلو بھی ہے، کہ اگر اُن کے اخلاق اچھے نہیں تو ٹھیک ہے کہ ایک وقت آپ کے لئے وہ تلذذ کا

(۱) سونے چاندی کے برتنوں کے لئے دیکھیں بخاری، ۱؍۴۶۰۔ درخت اور مکانات کی اینٹوں کے لئے دیکھیں: ترمذی، ۲؍۷۸، ۷۹۔ مشکوٰۃ ۲؍۴۹۷

(۲) ترمذی، ۲؍۸۰ باب ما جاء فی صفۃ خیل الجنۃ / مشکوٰۃ ۲؍۴۹۸ باب صفۃ الجنۃ۔ فصل ثانی۔

ذریعہ ہیں، لیکن پھر سارا دن پریشانی کا باعث ہوتی ہیں، ایک دن اگر آپ اُن سے تلذذ کرتے ہیں تو مہینہ بھر اُن کی پریشانی اٹھاتے ہیں، اخلاق کی خراب ہوں، شکل وصورت کی اچھی نہ ہوں، یا بیمار ہوجائیں، تو کس طرح انسان کے لئے پریشانی کا باعث ہوتی ہیں، تو یہ پہلو سارے کے سارے کاٹ دیے گئے، کہ اخلاق کی اچھی ہوں گی، شکل کی صاف ستھری ہوں گی، آپ پر اُن کی ضروریات کا کوئی بوجھ نہیں ہوگا، تو یہ سارے کا سارا معاملہ یوں مکمل ہوگیا، اور باغات میں ہر قسم کی نعمتیں ہوں گی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ دنیا کے اندر ایک شخص کو جو اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتا ہے یہ فکر لگا رہتا ہے کہ کہیں اللہ ناراض نہ ہوجائے، اور یہ ناراضگی کا تصور بھی سوہانِ روح ہے، انسان کے لئے پریشانی کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ اِس پریشانی کو بھی دُور کردیں گے۔ اور اللہ کی طرف سے جو رضا کا اعلان ہوگا یہ جنّت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی، اِس کے ملنے سے انسان اتنا خوش ہوگا کہ جب اللہ کی طرف سے اعلان ہوگا کہ میں تمہارے اوپر راضی رہوں گا، ناراض نہیں ہوں گا،[1] تو جنّتی اِس میں اتنا لطف لیں گے کہ جنّت کی کسی نعمت میں اتنا لطف نہیں آئے گا۔ اور پھر اِن نعمتوں کے چھن جانے کا اندیشہ نہیں ہوگا، جس طرح دُنیا کے متعلق کہا تھا کہ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، تو خٰلِدِيْنَ فِيْهَا میں اِس کا بھی ازالہ کردیا۔ گویا انسان کو جس قسم کی عیش مطلوب ہے وہ اکمل طریقے سے اور بہترین طریقے سے مرنے کے بعد جنّت میں نصیب ہوگی، لیکن ہوگی اُن لوگوں کو لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا: جو تقویٰ اختیار کریں گے۔

سامانِ دُنیا کو اِستعمال کرو، لیکن مقصود نہ بناؤ!

اس لئے اِن مشتہیات کے پیچھے اپنے آپ کو خراب نہ کرو، اِن کے ساتھ تو بقدرِ ضرور تعلق رکھو، اِن کو چھوڑنا پھینکنا بھی نہیں ہے، کیونکہ دنیوی زندگی میں اِن کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن دل میں اِن کی محبت غالب آکے اللہ کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنے، اِن کو صرف اپنی زندگی کے لئے ایک وسیلے کے طور پر اختیار کرو، اصل مقصود اللہ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، تب جا کر معاملہ ٹھیک رہے گا۔ جیسے بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ دنیا کا مال، دنیا کا سامان، اور دنیا کے متعلقین، اِن سب کی مثال پانی جیسی ہے، اور انسان کا دل کشتی کی طرح ہے، اگر پانی کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کے سفر میں معاون ہے، اور اگر وہی پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو کشتی کی غرقابی کا ذریعہ ہے، پھر کشتی ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ کے پاس پیسے ہوں گے، مال ہوگا، مکان ہوگا، یہ چیزیں ہوں گی، لیکن دل سے باہر باہر ہوں گی تو یہ اللہ کی عبادت، اطاعت اور فرمانبرداری کا ذریعہ بنیں گی، پیٹ میں روٹی ہو تو انسان اللہ کو اچھی طرح یاد کرسکتا ہے، اور اگر انسان بھوکا ہو یا پریشان ہو تو بسا اوقات اسی پریشانی میں ہی وہ اپنے خیالات کو کھو دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اور اسی طرح دوسری ضروریات اگر پوری نہ ہوں تو انسان اُنہی کی فکر میں گھل گھل کے مرجاتا ہے، اور جب یہ چیزیں مہیا ہوں تو ظاہری اسباب کے اعتبار سے اطمینان ہوتا ہے اور

---

(۱) بخاری ۲/۹۷۰/ مشکوۃ ۲/ ۴۹۷ باب صفۃ الجنۃ۔ ولفظ الحدیث: فَيَقُوْلُ أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِيْ فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهٗ أَبَدًا۔

انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر بقدرِ ضرورت کپڑا ہو، بقدرِ ضرورت کھانا ہو، بقدرِ ضرورت رہائش ہو، اور بقدرِ ضرورت دوسرے اسباب مہیا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کے لئے یہ ذریعہ بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر یہ انسان کے دل میں داخل ہو گئے تو یہ ذرائع مقاصد بن گئے، جب مقاصد بن جائیں گے تو انسان کی زندگی کا رُخ ہی بدل جائے گا، پہلے تو آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ذریعہ بنانا تھا، پھر اپنی ساری زندگی کو آپ جس وقت اِن کی خدمت میں لگا دیں گے تو ساری زندگی اِن کے پیچھے برباد ہوگئی اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسے ہمارے شیخ (سعدیؒ) کہتے ہیں کہ:

خوردن برائے زیستن وذکر کردن ست — تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست

کہ اصل تو اللہ تعالیٰ نے کھانے کا سلسلہ اس لئے بنایا ہے تا کہ تم زندہ رہو اور اللہ کو یاد کرو، اور ہم نے اعتقاد ایسا بنالیا کہ شاید زندگی ہی کھانے پینے کے لئے ملی ہے (گلستان، باب ۳، حکایت ۵)۔ تو زندگی کا رخ بدل گیا، حالانکہ کھانا پینا تو اس لئے تھا تا کہ زندگی باقی رہے اور اللہ کو یاد کریں، اور ہمارا رُخ یہ ہوگیا کہ ساری محنت ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے ہم پیدا ہی کھانے پینے کے لئے ہوئے ہیں، جب دیکھو صبح شام رات دن یہی کمانے کا چکر اور کھانے کا چکر ہے، زندگی بے مقصد ہو کر رہ گئی، کیونکہ کھانا کوئی مقصود نہیں ہے جس کو ہم نے مقصود سمجھ لیا۔ اسی طرح دوسری اشیاء ہیں، کہ اِن کو وسیلے کے طور پر تو استعمال کر سکتے ہو، لیکن اِن کو اگر اپنے دل میں داخل کرلیا تو پھر زندگی کا رخ بدل جاتا ہے، کہ انسان اپنی ساری کی ساری صلاحیت انہی چیزوں کے پیچھے صَرف کر دیتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جو اللہ کی طرف سے ملے گا وہ بہتر ہوگا، اور ملے گا ان لوگوں کو جو تقویٰ اختیار کریں گے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

متقین کی صفات واحوال

اَلَّذِیْنَ اتَّقَوْا سے ہی بدل ہے اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ۔ اور یہ متقین کے احوال بیان کئے ہیں کہ متقین کیسے لوگ ہیں؟ جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! بے شک ہم ایمان لے آئے، ہم نے تیرے احکام کو مان لیا، اب مان لینے کے بعد عملی زندگی میں ہم سے بہت کوتاہیاں ہوں گی، فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا: ہمارے اُن ذنوب کو تو معاف کردے، اور یہ استغفار کا جذبہ انسان میں اسی طرح پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی اِن نعمتوں کا احساس کرنے کے بعد اپنی طاعت اور عبادت سے جب موازنہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہم تو اللہ کی نعمتیں زیادہ استعمال کرتے ہیں، اُس کے مطابق ہم عبادت کر نہیں سکتے، پھر احساس پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا اور استغفار کرنے کا۔ اَلصّٰبِرِیْنَ یہ بھی متقین کی ہی صفت ہے، جو صبر کرنے والے ہیں، صبر کا مفہوم آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا، کہ جو مستقل مزاج ہیں، ثابت قدم ہیں، مصیبت میں بھی نہیں گھبراتے، اور اسی طرح اگر معصیت کی طرف اُن کی توجہ ہوتی ہے تو وہاں بھی اپنے نفس کو روک کر رکھتے ہیں، طاعت سے اگر طبیعت ہٹتی ہے تو بھی اپنی طبیعت کو اُس کے اوپر جماتے ہیں، صبر کی تینوں نوعیں ہیں، مصیبت میں صبر کرنا، معصیت سے صبر کرنا، طاعت پر صبر کرنا، مستقل مزاج ہونے کا معنی یہی ہے کہ طاعت پر جمے رہیے چاہے طبیعت کو ناگوار گزرے، معصیت سے بچے رہیے چاہے طبیعت نہ چاہے، اور معصیت کی طرف طبیعت راغب ہوگی آپ اس کو بچایئے، نفس کے مکروہات پر نفس کو پابند کیجئے جو نفس کو پسند نہیں ہیں، مصیبت کے وقت میں انسان واویلا اور

شکوہ شکایت کرتا ہے تو اپنے آپ کو سنبھالیے، شکوہ شکایت نہ کیجئے، یہ سارے کا سارا صبر کا مفہوم ہے۔ وَالصّٰدِقِیْنَ: جو اپنے قول و عمل کے سچے ہیں، جو کچھ زبان سے کہتے ہیں کردار اور عمل بھی اُس کے ساتھ ہے۔ وَالْقٰنِتِیْنَ: جو اللہ تعالیٰ کے سامنے فروتنی اختیار کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے والے ہیں، اُس کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ وَالْمُنْفِقِیْنَ: اور جو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والے ہیں، مال کی محبت میں اس طرح مبتلا نہیں کہ جمع کرنے کی ہی فکر ہو، بلکہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سب کچھ کرنے کے باوجود پھر صبح کے وقت میں اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے استغفار بھی کرتے ہیں، اپنی کوتاہیاں پھر بھی پیش نظر ہیں۔

رات کے آخری وقت کی اہمیت

اور اِستغفار کے لئے اَسحار کا وقت اس لیے ذکر کیا کہ یہ وقت قبولیت کا سب سے اچھا وقت ہے، اَسحار سَحَر کی جمع ہے، اور یہ رات کے آخری چھٹے حصے کو کہتے ہیں۔ تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت لقمان حکیم کا ایک قول نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: ”یَابُنَیَّ اِلَا یَکُنِ الدِّیْكُ اَکْیَسَ مِنْكَ یُنَادِیْ بِالْاَسْحَارِ وَاَنْتَ نَائِمٌ“ بیٹا! خیال کرنا کہیں مرغا تجھ سے زیادہ ہوشیار ثابت نہ ہوجائے، وہ تو صبح کے وقت اُٹھ کر آوازیں دیتا ہے اور تو سویا رہ جائے یہ مناسب نہیں ہے، مرغا تجھ سے ہوشیار نہ ثابت ہوجائے، کوشش کرنا کہ مرغوں کے بانگیں دینے سے پہلے اُٹھو اور اُٹھ کر اللہ کو یاد کرو، مرغا جاگے اور آوازیں دے اور تو سویا ہوا ہو ایسا نہ ہو، اِس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ مرغا تجھ سے زیادہ ہوشیار ہے۔ تمام انبیاء ﷩ کی تعلیمات میں اور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے تو خاص طور پر اِس وقت کی اہمیت بہت زیادہ بیان کی گئی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ صبح کے وقت اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں کو خود آواز دیتے ہیں کہ کوئی ہے جو مجھ سے دُعا کرے، میں اُس کی دُعا قبول کروں، کوئی ہے جو مجھ سے اِستغفار کرے تو میں اُس کے گناہ معاف کردوں، کوئی ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اُس کی حاجت پوری کروں، اس طرح کہتے رہتے ہیں حتیٰ کہ فجر طلوع ہوجاتی ہے۔[1] جب اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں کو خود بلائیں اور اِستغفار اور دُعا کرنے کی دعوت دیں تو اس سے بڑھ کر اچھا وقت قبولیت کا اور کون سا ہوسکتا ہے؟ اور طبعی طور پر بھی یہ دلجمعی کا وقت ہوتا ہے، کہ صبح کا وقت نہ زیادہ بھوک کا ہوتا ہے، نہ انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے، نہ کسی قسم کی دوسری مشغولیت ہوتی ہے، ساری کی ساری مخلوق ساکن وصامت ہوتی ہے، سکون اور اطمینان کا وقت ہوتا ہے، کسی طرف سے طبیعت میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہوتی، ایسے وقت میں جب اللہ کی طرف انسان توجہ کرتا ہے اور دلجمعی کے ساتھ اِستغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کی زیادہ توقع ہوتی ہے۔ اس لیے متقین کے لئے خاص طور پر اس بات کو ذکر کیا گیا: وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ: جو رات کے آخری حصوں میں اِستغفار کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

---

(۱) مسلم ۱/ ۲۵۸ باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل/ بخاری ۱/ ۱۵۳ باب الدعاء فی الصلاۃ من آخر اللیل/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۰۹ باب التحریض۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

اللہ نے گواہی دی کہ بیشک شان یہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے گواہی دی، اس حال میں

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١٨ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ

کہ اللہ قائم رکھنے والا ہے انصاف کو، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ⑱ مقبول دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک

الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ

اسلام ہے، اور نہیں اختلاف کیا اُن لوگوں نے جو کتاب دیئے گئے مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آگیا،

بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝١٩

(اختلاف کیا) آپس میں ضد کی وجہ سے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرے پس بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں ⑲

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ

پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت بازی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے سپرد کر دیا اپنے آپ کو اللہ کے اور اس شخص نے جس نے

اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ

میری اتباع کی، اور آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کو جو کتاب دیئے گئے اور کہہ دیجئے اُمیوں کو کہ کیا تم اپنے آپ کو سپرد کرتے ہو؟ اگر

اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

وہ بھی اپنے آپ کو سپرد کر دیں تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے، اور اگر انہوں نے پیٹھ پھیری تو سوائے اس کے نہیں کہ آپ کے ذمے تو

الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝٢٠ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ

پہنچانا ہی ہے، اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو ⑳ بے شک وہ لوگ جو انکار کرتے ہیں اللہ کی آیات کا اور قتل کرتے ہیں

النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ

نبیوں کو ناحق، اور قتل کرتے ہیں اُن لوگوں کو جو حکم دیتے ہیں انصاف کا، انہیں درد ناک عذاب کی بشارت

اَلِيْمٍ ۝٢١ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٢٢

دے دیجئے ㉑ یہی لوگ ہیں کہ ان کے اعمال ضائع ہو گئے دنیا میں اور آخرت میں، اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ㉒

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ـ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ نے گواہی دی کہ بیشک شان یہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی، وَالْمَلٰٓئِكَةُ: اور فرشتوں نے گواہی دی، وَاُولُوا الْعِلْمِ: اور علم والوں نے گواہی دی، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ: اس حال میں کہ وہ اللہ قائم رکھنے والا ہے انصاف کو۔ قسط انصاف کو کہتے ہیں تو قَآئِمًا بِالْقِسْطِ کا معنی ہے یہ کہ انصاف کے ساتھ قائم ہے، یا انصاف کو قائم رکھنے والا ہے، ''کوئی معبود نہیں مگر وہی، زبردست ہے حکمت والا ہے۔'' اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ: پسندیدہ دین، مقبول دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے۔ دین کا معنی طور، طریقہ، روش، مذہب، وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: اور نہیں اختلاف کیا اُن لوگوں نے جو کتاب دیے گئے مگر بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آ گیا، اختلاف کیا آپس میں ضد کی وجہ سے، وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرے پس بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں، فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ: پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت بازی کریں، جھگڑا کریں، تو آپ کہہ دیجیے میں نے سپرد کر دیا اپنے چہرے کو اللہ کے لئے، وجہ کا لفظ بول کر اپنی ذات مراد ہے، ''میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا'' وَمَنِ اتَّبَعَنِ: اس کا عطف اَسْلَمْتُ کی تُ ضمیر پر ہے، اور یہ اگرچہ ضمیر مرفوع متصل ہے، لیکن درمیان میں فصل آجانے کی وجہ سے ضمیر منفصل کے ساتھ تاکید لائے بغیر بھی اس پر عطف جائز ہے، اگر درمیان میں فصل نہ ہو تو پھر ضمیر مرفوع متصل پر عطف تب کیا جاتا ہے جب اُس کو ضمیر منفصل کے ساتھ مؤکد کر دیا جائے، اب فصل آجانے کی وجہ سے منفصل لانے کی ضرورت نہیں رہی، ''میں نے سپرد کر دیا اپنے آپ کو اللہ کے، اور اس شخص نے جس نے میری اتباع کی'' یعنی اُس نے بھی اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کر دیا، اللہ کے تابع کر دیا۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ: اور آپ کہہ دیجیے ان لوگوں کو جو کتاب دیے گئے، اور کہہ دیجئے اُمیوں کو، اُمیین، اُمّی کی جمع ہے، اور اُمّی اُمّ کی طرف منسوب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسوں میں داخل ہو کر کسی اُستاذ کے سامنے بیٹھ کر جو تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ ہے اِن لوگوں نے اُس طریقے کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کی ہوئی، جیسے ماں کے بطن سے آئے ویسے کے ویسے ہیں، اَن پڑھ لوگ، ءَاَسْلَمْتُمْ: آپ انہیں کہہ دیجیے کہ کیا تم اپنے آپ کو سپرد کرتے ہو؟ کیا تم اسلام لاتے ہو؟ فَاِنْ اَسْلَمُوْا: اگر وہ بھی اپنے آپ کو سپرد کر دیں، فَقَدِ اهْتَدَوْا: تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے، وَاِنْ تَوَلَّوْا: اور اگر انہوں نے پیٹھ پھیری، فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ: تو سوائے اس کے نہیں کہ آپ کے ذمے تو پہنچا دینا ہے، اگر اُنہوں نے پیٹھ پھیری تو آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں، آپ پر کوئی گرفت نہیں، کوئی ذمہ داری نہیں، ''سوائے اس کے نہیں کہ آپ کے ذمے تو پہنچانا ہی ہے، اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو'' اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: بیشک وہ لوگ جو انکار کرتے ہیں اللہ کی آیات کا اور قتل کرتے ہیں نبیوں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں اُن لوگوں کو جو حکم دیتے ہیں انصاف کا، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: یہی لوگ ہیں کہ اِن کے اعمال ضائع ہو گئے دنیا میں اور آخرت میں، وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ: اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

''توحید'' پر اللہ کی شہادت کے مختلف تین پہلو

سورت کی ابتدا مسئلۂ توحید کے ساتھ کی گئی تھی، جیسا کہ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا کہ اِس کے شانِ نزول میں عیسائیوں کے اُس وفد کی گفتگو سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ مذکور ہے، اور چونکہ اُن کے ساتھ خصوصیت سے گفتگو توحید پر ہی ہوئی تھی، اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل تھے تو اُس کو باطل کیا گیا تھا، اور مختلف پہلوؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے توحید کو نمایاں کیا ہے۔ یہاں سے پھر اُسی توحید کے عقیدے کو دوسرے انداز سے واضح کیا ہے۔ ''اللہ گواہ ہے کہ اُس کے بغیر کوئی معبود نہیں'' اللہ کی اِس بات پر شہادت ہے، اللہ نے شہادت کس طرح سے دی؟ اللہ تعالیٰ کی شہادت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک شہادت آفاقی ہے، کہ دُنیا کا نظام جو چل رہا ہے، زمین وآسمان، سورج چاند ستارے، ہواؤں کا نظم، اِس میں اگر غور کیا جائے تو یہ سارے کا سارا نظام اِس بات پر گواہ ہے کہ اِس کے بنانے والا کوئی موجود ہے، یہ خود بخود موجود نہیں، اس طرح یہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل بنتے ہیں، اور پھر یہ کسی ایک ہی صاحبِ حکمت کی کارفرمائی ہے، اِس کے اندر متعدد ہاتھ متصرف نہیں، اگر متعدد ہاتھ اس کے اندر متصرف ہوتے تو دنیا کا یہ نظم قائم نہ رہ سکتا، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس انداز کے ساتھ بھی توحید کو ثابت فرمایا ہے جیسے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، اور اسی طرح زمین وآسمان کی دوسری چیزیں بیان کر کے، سورج چاند کے چلنے کو ذکر کر کے، ہواؤں کے آنے جانے کو ذکر کر کے، یہ جو ساری کی ساری مخلوق ایک جڑی ہوئی اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یوں مخلوق کا نظم چل رہا ہے، یہ بھی دلیل ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود کی بھی اور اُس کی وحدانیت کی بھی، اِس کو آفاقی دلیل کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود پر اور اپنی توحید پر قائم فرمائی۔

دوسری دلیل اَنفسی ہے، کہ انسان اگر اپنے اندر غور کرے تو وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (سورۂ ذاریات:۲۱)، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل خود تمہارے اندر بھی موجود ہیں، اگر تم غور کرو، اگر تم سوچو تو تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل تمہارے اندر سے بھی سمجھ میں آجائے گی، اپنا وجود دیکھو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس میں کس قسم کی حکمت رکھی ہے، خاص طور پر دل اور دماغ کا اگر آپ مطالعہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے دل کو کیا بنایا ہے، اور اِس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کتنی نمایاں ہے، کہ کیسے کیسے اِس میں متضاد جذبات ہیں، وہی ایک ہی دل ہے جس میں غصہ بھی ہے اور محبت بھی ہے، نفرت بھی ہے اور شوق بھی ہے، اور اِس طرح متضاد صفات اُس کے اندر کیسے اُبھرتی ہیں، اور انسان کا دماغ کیا کمال لئے ہوئے ہے، اور اِسی طرح باقی اعضاء ہیں۔ اور یہ ارادہ جو اللہ نے انسان کے دل میں رکھا ہے، اپنی مشین پر اگر آپ غور کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے، اور اُس کی یکتائیت اور وحدانیت بھی انسان کو سمجھ میں آجاتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے متعدد آیات میں انسان کو اُس کی اپنی خلقت کی طرف بھی متوجہ کیا ہے، اِس سے بھی راہنمائی ملتی ہے اپنے خالق اور مالک کی طرف، اُس کے علم وقدرت کی طرف بھی، اور اُس کی وحدانیت کی طرف بھی۔

اور تیسرے نمبر پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی شہادت وحی کے ذریعے سے بھی ہوئی، کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرورِ کائنات ﷺ تک اللہ نے جتنی وحی اُتاری اُس سب کے اندر اِس مضمون کو واضح کیا کہ اللہ ایک ہے اور اُس کے ساتھ کسی قسم کا کوئی شریک نہیں، جیسے مختلف آیات میں اِس کو بھی ذکر کیا گیا ہے، کہ جو بھی نبی اور جو بھی رسول آیا اُس کی طرف یہی وحی کی گئی لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی شہادت کے یہ مختلف پہلو ہیں، آفاقی دلائل بھی اس نے قائم کیے، انفسی دلائل بھی قائم کیے، اور اسی طرح اپنی طرف سے جو وحی اتاری اس کے اندر بھی اس شہادت کو قائم کیا کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، یہ توحید کا مسئلہ اتنا اہم ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس کو اتنا واضح کیا ہے۔ اللہ کی گواہی کا تو یہ مطلب ہوا۔

''توحید'' پر فرشتوں کی شہادت کا ذِکر اور اس کی وجہ

وَالْمَلٰٓئِكَةُ: اور اللہ کے فرشتے بھی اِس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، اللہ کے فرشتے اپنی تسبیحات میں اور اپنے اذکار میں اِس بات کی گواہی دیتے ہیں، اُن کے اذکار کے اندر بھی ''سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ'' یہ سارے کے سارے کلمات ہیں، گویا کہ اپنی زبان سے بھی وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں، اور اپنے عمل کے ساتھ بھی شہادت دیتے ہیں، کہ وہ صرف ایک ہی ذات کے متبع اور مطیع ہیں، اور اُسی کے حکم کے پابند ہیں، کسی دوسرے کے نہیں۔ ملائکہ کو خاص طور پر ذکر کردیا، اگرچہ اُن کی تسبیح ہم نہیں سنتے، اور اُن کی شہادت ہم اپنے کانوں سے نہیں سن سکتے، ہمارے سامنے نمایاں ہوکر وہ اِس بات پر شہادت نہیں دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر اُن کی شہادت کو ذکر کرکے اُن لوگوں کے عقیدے پر رد کیا ہے جو ملائکہ کو اِس کارخانۂ ہستی میں اللہ کا شریک بناتے ہیں، اور ان کو معبود بنائے ہوئے ہیں اور ان کو پوجتے ہیں، اِن کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں، اُن کے سامنے اِس بات کو نمایاں کردیا کہ جن کو تم اپنا کارساز سمجھتے ہو وہ تو سارے کے سارے خود بھی اپنی زبان کے ساتھ گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، اور اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری کا تعلق اُسی ایک ہی ذات کے ساتھ ہے، تو جو اپنی زبان سے بھی اقرار کریں کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، الٰہ کا لفظ کسی دوسرے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا، اور خود بھی وہ مطیع اور فرمانبردار اُسی ذات کے ہیں، تو کوئی اٹھا کر اُنہی کو ہی اللہ کا شریک کرلے اور اِس کارخانۂ ہستی میں اُن کو حصہ دار بنالے تو اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوسکتی ہے؟

سوال:- فرشتوں اور انسانوں کی گواہی کا ذکر تو صحیح ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو خود اپنے حق میں گواہی دے رہے ہیں، اگر کوئی شخص اعتراض کردے کہ اپنی ذات کے بارے میں تو اپنی گواہی قبول ہی نہیں، تو شَهِدَ اللهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کیسے درست ہے؟

جواب:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم انسان کی طرف آتا ہے، چونکہ ہر صفت کا منبع اللہ ہی ہے، تو انسان کی طرف جو بھی علم آئے گا وہ اللہ کی ذات طرف سے آئے گا، انسان کو علم حاصل ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ تو ہے نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو وجود عطا ہوا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی تمام انسانوں کو یہ صفات حاصل ہوں گی، اب اللہ تعالیٰ اگر بیان نہ کرے تو انسان کے سامنے کسی اور راستے سے علم آ ہی نہیں سکتا، اس لیے سب سے پہلے بیان تو اللہ تعالیٰ ہی دے گا کہ میں اکیلا

ہوں، اسی کے مطابق ہی آپ کو عقیدہ رکھنا ضروری ہوگا، تو اللہ تعالیٰ کی شہادت کا مطلب یہی ہے کہ اُس نے اس بات پر دلائل قائم کیے ہیں کہ میں اکیلا ہوں، میرے ساتھ اِس مخلوق کے اندر کوئی دوسرا شریک نہیں، ابتداء تو وہیں سے ہوگی، جب تک وہ خود نہ بتائے اس وقت تک کسی دوسرے کو کیسے پتا چل سکتا ہے۔ یہ گواہی اُس انداز کی نہیں ہے کہ دو فریق موجود ہیں مدعی اور مدعا علیہ، اور پھر ہم کہیں کہ مدعی کی گواہی اس کے اپنے حق میں معتبر نہیں ہوا کرتی، یہ اُس قسم کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک واقعی بات کو بیان کرنا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہی اللہ کی شہادت ہے، ورنہ یہاں کوئی فریق مخالف نہیں کہ کسی تیسرے سے ہم فیصلہ کروائیں، کہ ایک کہے کہ میں مدعی ہوں کہ میں الٰہ ہوں، اور دوسرا سامنے کھڑا ہے اور وہ کہے کہ میں الٰہ ہوں، اور کسی تیسرے کے سامنے بیان دیے جائیں، یہاں یہ مقدمے کی صورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارِ واقعہ یہ اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے، اور آپ کے ذہن میں وہی مقدمہ آ گیا جو انسانوں میں فریقین کے درمیان ہوا کرتا ہے، یہاں کسی فریق مخالف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مقدمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارِ واقعہ ہے۔

''توحید'' پر اہلِ علم کی شہادت کا ذِکر اور اس کی وجہ

اُولُوا الْعِلْمِ: علم والوں نے گواہی دی یہاں علم سے مراد وہ ہیں جو معرفتِ الٰہی کا علم رکھتے ہیں، وہ سارے کے سارے لوگ بھی یہی شہادت دیتے ہیں، اور اِس علم کے حاملین اوّل نمبر پر انبیاء علیہم السلام ہیں، جتنے نبی دُنیا کے اندر آئے انہوں نے بھی اپنی زبان کے ساتھ یہی گواہی دی کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، اور دوسرے نمبر پر انبیاء علیہم السلام کے متبعین میں سے مصلحین، مجددین، اولیاء اللہ، علماء، جو انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے علوم کو حاصل کرتے ہیں اور اُن کو اپناتے ہیں، اور اُن کے علم کی صحیح سند ہے، وہ سارے کے سارے اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں۔ اور دنیا میں رہتے ہوئے انسانوں نے انسانوں کو جو معبود بنایا ان کے اندر انسانوں کی نظر میں اولیت اُنہی کو حاصل ہے، انبیاء علیہم السلام کو پوجا، اور جو اپنے زمانے کے اندر کوئی بزرگی لئے ہوئے تھے اُن کو پوجا، مشائخ کو، علماء کو، درویشوں کو، حالانکہ اگر اُن کے پاس علم صحیح تھا تو وہ سارے کے سارے اِس بات پر گواہ تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، تو جس طرح فرشتے تو اپنی زبان سے گواہی دیں کہ اللہ ایک ہے اور اس خدائی کے اندر اُس کا کوئی شریک نہیں، اور دنیا اٹھا کر اُنہی کو ہی خدا بنا لے اور اللہ کی الوہیت میں شریک کر لے تو یہ حماقت ہے، اسی طرح صحیح علم رکھنے والے تو اپنی زبان کے ساتھ بھی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، اور اپنے عمل کے ساتھ بھی گواہی دیتے ہیں کہ اطاعت اور فرمانبرداری اُسی کی ہے، اور پھر اگر لوگ اُنہی کو ہی اٹھا کر اللہ کی الوہیت میں شریک کر لیں، خدا کی خدائی میں شریک کر لیں، اِس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اِس ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات بھی آ گئی، حضرت عزیر علیہ السلام کی بھی آ گئی، احبار و رُہبان کی بھی آ گئی، اگر اُن کے پاس صحیح علم ہے تو وہ سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور اُس کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں، تو ایسی صورت میں اُن کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

اور اِس سے علم کا درجہ بھی نمایاں ہو گیا، کہ اہلِ علم کی شہادت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ ذکر کیا ہے، گویا کہ جو صحیح علم کے حامل ہوتے ہیں اُن کا درجہ اِس شہادت کے بعد فرشتوں کی طرح ہے، اِس سے علم کی فضیلت بھی نمایاں ہے۔

اللہ کی ''صفتِ عدل'' کا ذِکر اور اس کا مقصد

قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ: اور اللہ نے اپنی وحدانیت پر ایسے حال میں گواہی دی کہ وہ قائم رکھنے والا ہے انصاف کو، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے کہ وہ ساری کائنات میں انصاف کو قائم رکھے ہوئے ہے، اِس صفت کو ذکر کرنے کے ساتھ عیسائیوں کا شفاعت اور کفارے کا عقیدہ (یعنی وہ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام سولی چڑھ گئے، اب ان کا نام لینے والے جو چاہیں کرتے رہیں اُن پر کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی، ساری کی ساری اُمت کے گناہ عیسیٰ کے سر پر ڈال دیے گئے اور اس کے بدلے میں عیسیٰ سولی چڑھ گئے، اب اُن کی امت کے کسی فرد کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی) یہ جو اُن کا کفارے کا عقیدہ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کے بارے میں جو یہ عقیدہ لیے ہوئے ہیں آپ جانتے ہیں کہ یہ بالکل انصاف کے خلاف ہے، کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی، گناہ کوئی کرے اور سزا کسی کو ہو جائے، یہ انصاف کی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے اندر انصاف کو قائم رکھے ہوئے ہے، عدل اور اعتدال کو قائم رکھے ہوئے ہے، تکوینی طور پر بھی اور تشریعی طور پر بھی، ساری کائنات کے نظم کو آپ دیکھیں گے کہ اگر یہ نقطۂ اعتدال سے ہل جائے تو دنیا قائم نہیں رہ سکتی، سورج کی حرکت ایک نقطۂ اعتدال پر ہے، چاند کی حرکت ایک نقطۂ اعتدال پر ہے، اور اسی طرح جتنے بھی تصرفات دنیا کے اندر چلتے ہیں سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے قائم کئے ہوئے عدل وانصاف اور اعتدال کے ساتھ چلتے ہیں، جس طرح اگر اِن کا عدل ختم ہو جائے اور جو اللہ نے قانونِ عدل ان کو دیا ہوا ہے اگر یہ اُس کو چھوڑ بیٹھیں تو ایک لمحے کے لئے کائنات ٹھیک نہیں رہ سکتی، سارے کا سارا نظام بگڑ جائے گا، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے نظریات وعقائد میں اور عمل میں اپنی تعلیم کے ساتھ لوگوں کو نقطۂ اعتدال بتایا، کہ عقائد کے بارے میں نقطۂ اعتدال یہ ہے، عمل کے بارے میں نقطۂ اعتدال یہ ہے، افراط وتفریط اُس سارے نظم کو خراب کر دینے والی بات ہے، اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے جزا وسزا کے اندر بھی ایک انصاف اور میزان قائم کی ہے، جس قاعدے کی رو سے وہ عدل وانصاف کرے گا اور لوگوں کو جزا وسزا دے گا، احکام میں بھی عدل کو قائم کیے ہوئے ہے، جزا وسزا میں بھی اس کا ایک قانونِ عدل ہے، کائنات کے نظم میں بھی ایک قانونِ عدل ہے، اس لئے اس قسم کے جھوٹے عقیدے جن میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے اور جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ عدل میں نقص پڑتا نظر آتا ہے وہ سارے عقیدے غلط ہیں، اور یہ کفارے کا عقیدہ بالکل عدل کے خلاف ہے، کہ گناہ کوئی کرے اور سزا کسی کو دے دی جائے، یہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا تقاضا نہیں ہے، اس لیے یہاں خصوصیت سے اِس صفت کو ذکر کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ بے اِعتدالی کو برداشت نہیں کرتے

تو تشریعات میں بھی اللہ تعالیٰ آپ سے عدل اور اعتدال کا عمل ہی چاہتا ہے، اور تکوینیات میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس کائنات میں عدل اور اعتدال کو قائم رکھا ہوا ہے، قوموں کی تاریخ بھی اِس بات پر شاہد ہے کہ قوموں سے مطالبہ یہی ہے کہ اس

عدل واعتدال کے مطابق رہیں، لیکن اگر قومیں اِس نقطے کو چھوڑ دیتی ہیں اور بے اعتدالی اختیار کر لیتی ہیں تو اُن کو ڈھیل دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہات آتی ہیں، لیکن اگر وہ باز نہیں آتیں تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی بے اعتدالی اختیار کرنے والی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے، وہ اپنی کائنات کے اندر بے اعتدالی اور بدنظمی کو برداشت نہیں کرتا، انسان کو چونکہ اُس نے مختار بنایا اس لئے عدل کا قانون تو اِن کو دیا ہے اور اس پر چلنے کا مطالبہ کیا ہے، اگر چلتے رہیں تو ٹھیک، اگر نہیں چلتے تو پھر بار بار ان کو تنبیہ کی جاتی ہے اور سمجھایا جاتا ہے کہ سیدھے راستے پر آجاؤ، عدل وانصاف کے راستے پر آجاؤ، لیکن اگر وہ عدل وانصاف کے راستے پر نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ تو قائم بالقسط ہے، اُس نے تو عدل وانصاف کو قائم رکھنا ہے، جو سمجھانے کے باوجود سیدھے نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے، بہرحال وہ اپنی اس کائنات کو رکھنا سیدھا ہی ہے، اگر اپنے ارادے کے ساتھ سیدھے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں رضا حاصل کرلیں گے اور ثواب پائیں گے، اور اگر وہ سیدھے نہیں رہتے تو اُس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ تنبیہات کے ذریعے سے سیدھا کرتا ہے، رسولوں کے ذریعے سے سمجھاتا ہے، مصلحین کے ذریعے سے اُن کو تفہیم کرتا ہے، لیکن اِس کے باوجود اگر وہ نہیں مانتے تو پھر اُس کے عدل قائم کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ یہ سارے کے سارے واقعات جو قوموں میں پیش آئے ہیں وہ اُس کے قائم بالقسط کی ہی گویا کہ ایک صورت ہے اور قائم بالقسط کی صفت کا ہی ظہور ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں اُس کے علاوہ، وہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے، زبردست ہے کہ ہر قسم کی قدرت اُس کو حاصل ہے، اس لئے وہ انصاف کو قائم رکھ سکتا ہے، اور وہ حکیم ہے کہ حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ انصاف کو قائم رکھے۔

''اِسلام'' کی تعریف اور اُس کے مصداق پر دِلنشین گفتگو

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ: مقبول دین، پسندیدہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے، اسلام اَسْلَمَ سے ہے بمعنی اپنے آپ کو سپرد کر دینا، جس طرح ترجمہ لکھا ہوا ہوتا ہے: ''گردن بطاعتِ کسے نہادن'' کسی کی طاعت کے اندر اپنی گردن رکھ دینا، کامل اور مکمل طور پر اطاعت قبول کر لینا اِس کو کہتے ہیں اسلام، ابتدا سے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے، جو نبی آیا وہ اسلام کا ہی مدعی تھا اور اسلام کی ہی اُس نے تعلیم دی۔ اسلام کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آجائے اُس کے سامنے اپنی گردن رکھ دو، اس لئے ہر نبی کا دین اپنے وقت کے اندر اسلام کا مصداق تھا، کیونکہ اُس کی جان یہی ہے کہ نبی جو کچھ اللہ کی طرف سے بیان فرمائے اُس کو قبول کرلو، جیسے نوح علیہ السلام نے کہا تھا اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (سورۂ یونس: ۷۲)، اور ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ جو قرآنِ کریم میں نقل کیے گئے ہیں وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (سورۂ بقرہ: ۱۲۸) وہ سب اِسی مفہوم کے طور پر ہیں، دعوت یہی ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دو، جو حکم آجائے بس اُس کو قبول کرلو، اس لئے ہر وقت میں جو نبی آیا اور اس نے آکر جو دین پیش کیا، جنہوں نے اُس دین کو قبول کر لیا وہ مسلم ہو گئے، اور آخر آخر میں یہ بات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹھہر گئی، اب اسلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی طور وطریق کا نام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس کے علاوہ کوئی دوسرا دین نہیں آیا، اس لیے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو قبول کریں گے وہی مسلم کا صحیح مصداق ہیں اور وہی اسلام کے

حائل ہیں، اب اس کے مقابلے میں بعض خصوصیات قائم کر کے ضد اختیار کر لی جائے، کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین موسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا ہم تو اُسی کو ہی مانیں گے، کسی اور کو ہم نہیں مانتے، تو اب یہ اسلام نہ رہا بلکہ یہ یہودیت بن گئی، جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں اُسی پر ضد اختیار کر لی گئی تو اسلام والا معنی اُس سے ختم ہو گیا، اب وہ یہودیت ہے۔ اسی طرح اگر عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر کوئی اڑ جائے کہ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام ہمارے پیغمبر تھے، جو دین وہ لائے ہم تو وہی قبول کریں گے، کتنی ہی صحیح سند کے ساتھ دوسرا حکم آ جائے ہم اُس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، تو اب اس میں اسلام والا معنی ختم ہو گیا، اب اس میں نصرانیت آ گئی، یہ تعصب اور ضد ہے جس کی بناء پر لوگوں نے اپنے آپ کو ایک ایک طریقے پر پکا کر لیا، اور یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیا حکم آ رہا ہے، اب یہودیت اسلام کا مصداق نہیں، ہاں موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہی اسلام کا مصداق تھی، اسی طرح اب نصرانیت اسلام کا مصداق نہیں، ہاں عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہی اسلام کا مصداق تھی، لیکن جب اِس میں اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ ختم ہو گیا، اور گروہ بندی اور تعصب آ گیا، اور اپنے ایک طریقے پر انسان پختہ ہو گیا، اُس کے مقابلے میں صراحتاً اللہ کا حکم آ جائے تو اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں، تو اب اِن نظریات سے اسلام کا معنی ختم ہو گیا، لہٰذا یہ دین اب مقبول نہیں رہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اب یہ مردود ہو گئے، اور جو بھی اِس دین کو لے کر اللہ کے ہاں جائے گا وہ کوئی اجر و ثواب نہیں پائے گا، کیونکہ اب سوائے ضد اور تعصب کے اِس میں حاصل کچھ نہیں رہا۔ تو اسلام سے مراد ہے کہ ہر وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو قانون آئے اسی کو ماننا، اور اب نتیجۃً سرورِ کائنات ﷺ کے طور طریقے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے، کیونکہ اللہ کی فرمانبرداری کا تقاضا یہی ہے کہ اسی کو قبول کیا جائے، اور اس کے مقابلے میں کسی دوسرے طریقے کو نہیں اپنایا جا سکتا، اب اسلام کا مصداق یہی حضور ﷺ کی شریعت اور آپ کا لایا ہوا دین ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول یہی ہے۔

شَهِدَ اللهُ سے لے کر اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْاِسْلَامُ تک یہ جو آیت ہے اس کے پڑھنے کا ثواب بھی بہت منقول ہے حدیث شریف میں۔ آیت الکرسی، اور یہ آیت، اور اسی طرح اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ، اِن کو نمازوں کے بعد پڑھا جائے تو یہ بہت زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہیں اور دنیا کے اندر عزت حاصل ہونے کا باعث ہیں، روایات میں اِن کی فضیلت آتی ہے۔ دین سے مراد دین مقبول ہے، جیسے پہلے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا، اور دوسری جگہ انہی لفظوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (سورۃ آل عمران: ۸۵) جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے طریقے کو اپنائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو قبول نہیں کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کو کوئی قبولیت حاصل نہیں ہوگی۔

اہلِ کتاب کی ضد

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ: اختلاف نہیں کیا اُن لوگوں نے جو کتاب دیے گئے مگر علم آ جانے کے بعد، ہر چیز کی واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے اختلاف کیا، اور اختلاف کیا کیوں؟ آپس میں ضد کی بناء پر، یہودی اپنے مسلک پر بضد ہیں اور عیسائیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، عیسائی اپنے مسلک پر بضد ہیں اور اسلام کو قبول کرنے

کے لئے تیار نہیں، ہر قسم کی خبر اور علم حاصل ہو جانے کے بعد جب انہوں نے آپس میں اپنی دنیوی جاہ وجلال کی خاطر، دُنیوی عزّت کی خاطر اور اپنے مال دولت کی خاطر یہ تعصب اختیار کرلیا تب یہ اختلافات بر پا ہوئے، اور لوگ اسلام سے پھر کر دوسرے طریقوں کی طرف ہو گئے، یہ ضد ہے جس کی بناء پر انسان اپنے مسلک کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں جس کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح دلیل بھی آ چکی، ''آپس میں ضد کرنے کی وجہ سے، اور جو کوئی انکار کرے گا اللہ کی آیات کا پس بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔''

اہلِ اسلام میں ضد نہیں ہے

فَاِنْ حَآجُّوْكَ: اب یہ نصرانی اور یہودی اگر آپ کے ساتھ حجت بازی اور جھگڑنے کی کوشش کریں تو آپ انہیں صاف کہہ دیجئے کہ ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے ہم تو مان جاتے ہیں، ہم نے تو اُسی کو مان لیا، اور جنہوں نے میری اتباع کی انہوں نے بھی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ وجہ کی طرف نسبت اس لیے کر دی کہ چہرہ سارے بدن میں سے ایک اشرف جزء ہے، جب اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کر دیا تو یوں سمجھو کہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، ہمارے محاورے میں چہرے کے سپرد کرنے کا لفظ اُردو میں نہیں آتا، اردو میں محاورہ ہے سر جھکا دینا، فلاں کے حکم کے سامنے میں نے سر جھکا دیا، تو جس طرح سَر جھکا دینا قبول کرنے اور اطاعت اختیار کرنے سے کنایہ ہوتا ہے اِسی طرح عربی کے اندر اسلام وجہ بھی کسی حکم کے قبول کر لینے اور اپنے آپ کو اس کا مطیع بنا دینے سے کنایہ ہوتا ہے، اگر ہم اپنے محاورے کے طور پر بات کریں گے تو بات اِسی طرح ہوگی کہ میں نے بھی اللہ کے حکم کے سامنے سَر جھکا دیا اور میرے متبعین نے بھی اللہ کے حکم کے سامنے سَر جھکا دیا، ہم تو اللہ کے حکم کے مقابلے میں سر نہیں اُٹھاتے، تم سرکشی کرتے ہو تو کرتے رہو، ہم نے تو اِسی طریقے کو اپنایا ہے کہ جو اللہ کی طرف سے آیا ہم نے تو اُس کے سامنے گردن ڈال دی، ہم نے تو سَر جھکا دیا۔ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ: میں نے اپنا چہرہ سپرد کر دیا اللہ کے اور ان لوگوں نے بھی سپرد کر دیا جنہوں نے میری اتباع کی۔

لفظِ ''اُمّی'' کی تفصیل

''اور آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کو جو کتاب دیئے گئے'' اِس کا مصداق تو یہود ونصاریٰ ہیں۔ وَالْاُمِّيّٖنَ: اس کا مصداق مشرکینِ مکہ ہیں، عربی لوگ، جن کے ہاں تعلیم اور تعلّم کا خاص رواج نہیں تھا، اَن پڑھ قسم کے لوگ، یہ ایک قسم کا لقب ہے بنی اسماعیل کا، یعنی توراۃ وانجیل کے اندر بھی، جو مروج عہد نامے اِن کے ہاں چلتے ہیں اُن کے اندر بھی بنو اسماعیل کا ذِکر اُمّیّین کے لفظ کے ساتھ ہی آیا ہے، کیونکہ اہلِ کتاب کے مقابلے میں اِن کو اُمّی قرار دیا جاتا تھا، اور وہ بھی اپنے لئے بسا اوقات یہی لفظ استعمال کرتے تھے، اور اِس میں وہ لوگ کوئی تحقیر کا پہلو نہیں سمجھتے تھے، جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ ایک مجلس میں فرمایا کہ ''نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ''[1] ہم تو اُمّی قسم کے لوگ ہیں، نہ ہم لکھنا جانتے ہیں نہ حساب جانتے ہیں، ''اَلشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا

(۱) بخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی لا نکتب ولا نحسب/مشکوۃ باب رؤیۃ الهلال فصل اول۔

وَهٰكَذَا ''یوں تین دفعہ اشارہ فرمایا، کہ مہینہ ایسے ہوتا ہے هٰكَذَا یہ دس ہو گئے، هٰكَذَا پھر دس ہو گئے، هٰكَذَا پھر دس ہو گئے، یعنی مہینہ تیس دنوں کا ہوتا ہے، اور کبھی فرمایا کہ هٰكَذَا هٰكَذَا هٰكَذَا اور تیسری مرتبہ ایک انگلی بند کر لی، یعنی کبھی مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی اُنتیس دن کا ہوتا ہے، اس طرح انگلیوں کے ساتھ اشارہ کر کے سمجھایا اور ساتھ یہ فرمایا کہ نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ ہم لکھنا نہیں جانتے، حساب نہیں جانتے، تین دہائیاں پوری ہو جائیں تو کبھی مہینہ پورا ہو جاتا ہے، اور کبھی دو دہائیاں پوری اور نو دن اُوپر ہو جائیں تو مہینہ پورا ہو جاتا ہے، کبھی تیس دن کا ہوگا کبھی اُنتیس دن کا ہوگا۔ نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ کا لفظ حضور ﷺ نے جو استعمال فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لقب کے طور پر اس جماعت کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا، اِس میں کوئی تحقیر کا پہلو نہیں ہے، اور اگر کبھی تحقیر کے طور پر یہودیوں نے نقل کیا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اِن کو جاہل اور اَن پڑھ کہہ کر وہ ذکر کریں، کیونکہ جاہل اور اَن پڑھ کے معنی میں بھی یہ آتا ہے، لیکن بنو اسماعیل کے لئے یہ لفظ بطور لقب کے تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے بھی ''النبی الاُمّی'' کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے، آپ ﷺ کے لئے اِس لفظ میں اعزاز ہے، کہ آپ ﷺ نے جس قسم کے علوم اور معارف ظاہر کیے یہ کسی مدرسے میں پڑھنے کا نتیجہ نہیں، کیونکہ آپ ﷺ تو اُمّی تھے، کسی کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، کسی کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے، کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوئے، کسی اُستاذ سے مار نہیں کھائی، اور علوم و معارف ایسے ذکر کر دیے کہ بڑے بڑے عقلمند سامنے عاجز آ گئے، اس لئے آپ ﷺ کا اُمّی ہونا آپ ﷺ کے لئے ایک شرف ہے، قرآنِ کریم میں بھی آپ ﷺ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور حدیث شریف میں بھی آپ ﷺ کے نام کے ساتھ اُمّی کا لفظ آتا ہے۔

سوال:- جبریل امین پڑھاتے نہیں تھے؟

جواب:- انسانوں سے پڑھنا مراد ہے، ویسے تو اللہ تعالیٰ ہر کسی کو پڑھاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے علوم انبیاء علیہم السلام پر فرشتوں کی وساطت سے اترتے ہیں، لیکن اِس میں کسی انسان کی شاگردی نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی

ءَاَسْلَمْتُمْ: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ تم بھی اپنے آپ کو اللہ کے حکم کے تابع کرتے ہو یا نہیں؟ اِن سے پوچھو، کیا تم مسلمان ہوتے ہو؟ اسلام قبول کرتے ہو؟ جس کا حاصل یہ ہے کہ کیا تمہارا ارادہ ہے کہ تم بھی اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دو اور اپنے آپ کو سپرد کر دو؟ اگر یہ بھی تیار ہو جائیں کہ ٹھیک ہے ہم اللہ کے حکم کو ماننے کے لئے تیار ہیں تو یہ ہدایت یافتہ ہو گئے، پھر جھگڑا کیا رہا؟ یعنی جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ تم اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہو یا نہیں جھکاتے، ہم نے تو جھکا دیا، میں نے بھی جھکا دیا اور جو میرے مسلک پر چلنے والے ہیں انہوں نے بھی اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا، اب تم بتا دو کہ تم سر جھکاتے ہو یا نہیں؟ اگر وہ کہہ دیں کہ ہم اللہ کے سامنے نہیں جھکتے تو پھر اُن کا راستہ اور ہے، تمہارا راستہ اور ہے، پھر آپ کا اِس میں کوئی قصور نہیں، پھر تو اِن کا مقابلہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہوا، اللہ تعالیٰ اِنہیں سنبھال لے گا، آپ نے حکم پہنچا دیا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ۔ اور اگر یہ بھی اِس بات پر تیار ہو جائیں کہ ہاں ہم اللہ کے حکم کو مانتے ہیں اور اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو پھر آپس میں اتفاق ہو گیا، جیسے تم ہدایت یافتہ

ہو یہ بھی ہدایت یافتہ ہیں۔تو ان سے دوٹوک فیصلہ یوں کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے یہ جھکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جھک جائیں تو ہدایت یافتہ ہیں، اور اگر یہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں اور اللہ کا حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے، ہر کسی کا حال اُس کے سامنے ہے۔

قاتلانِ انبیاء کا اِنکار باعثِ تعجب نہیں ہے

آگے اُن کی مذمت ہے، خاص طور پر یہودیوں کی، جو وقت پر انبیاء علیہم السلام اور عدل وانصاف کا حکم دینے والے لوگوں کے خلاف لڑتے رہے اور انہیں قتل بھی کیا۔ ''بیشک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات کا، جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں'' نبیوں کو ناحق قتل کرنا یہودیوں کا کام تھا، کئی نبی انہوں نے قتل کیے، اور یہاں اُن کی مذمت ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ پیٹھ پھیریں اور اللہ کے حکم کو نہ مانیں تو آپ کے لئے یہ چیز کوئی باعث تعجب نہیں ہونی چاہیے، یہ تو نبیوں کے قاتلوں کی اولاد ہے، جنہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کیا، اور نبیوں کو قتل کرتے رہے، اور جو بھی اِن کے سامنے عدل وانصاف کا حکم لے کر آیا اُس کے سامنے سرکشی کرتے رہے، تو ایسے لوگوں سے اگر اس قسم کا رویہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو ماننے کے لیے تیار نہیں تو آپ کے لئے یہ چیز کوئی باعث تعجب نہیں ہونی چاہیے، یہ تو خاندانی طور پر ان صفات کے حامل ہیں، ان کو تو پھر یہی سنا دو کہ اگر تم نے اپنے آباء واجداد کے طریقے پر چلنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی انصاف کا حکم دینے کے لئے آئے اور اللہ کی اطاعت کی طرف بلانے کے لئے آئے تم نے اُس کے مقابلے میں سرکشی کرنی ہے، تو تم اب دنیا اور آخرت میں ذلیل ہو کر رہو گے، اس کے علاوہ تمہارا کوئی انجام نہیں ہے۔ ''اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو انصاف کا حکم دیتے ہیں'' اولیاء اللہ، مجددین، مصلحین سب اِس میں داخل ہو جائیں گے، ''انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے، یہی لوگ ہیں کہ ان کے اعمال برباد ہو گئے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی'' آخرت میں برباد ہونا تو ظاہر ہے کہ اِن کی کارروائیاں جو اِن کے خیال کے مطابق اچھی ہیں، جن کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نیک کام ہیں، اُن کے اوپر آخرت میں کوئی ثواب مرتب نہیں ہوگا، اور دنیا کے اندر بھی ان کی اس نیکی کی کوئی قیمت نہ رہی، اور ایسے ہی اسلام کو مٹانے کے لئے جو وہ کارروائیاں کرتے ہیں دنیا کے اندر سب بے اثر ہو جائیں گی، کسی کے اوپر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، یہ ذلیل ہو کر رہیں گے، ''دنیا اور آخرت میں اِن کے اعمال ضائع ہو گئے، اور نہیں ہیں اِن کے لئے کوئی مددگار'' جب اللہ تعالیٰ کی گرفت اِن پر آئے گی تو کوئی شخص انہیں بچا نہیں سکے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ
کیا آپ نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کی طرف جو دیے گئے کتاب سے ایک حصہ، بلائے جاتے ہیں وہ اللہ کی کتاب کی طرف

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ

تاکہ وہ کتاب فیصلہ کردے اُن کے درمیان، پھر بھی اعراض کرتا ہے ان میں سے ایک فریق، اور وہ ہیں ہی اعراض کرنیوالے ﴿٢٣﴾ یہ

بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ

اس سبب سے ہے کہ بیشک یہ لوگ کہتے ہیں ہرگز نہیں چھوئے گی ہمیں آگ مگر چند گنتی کے دن، اوران کو دھوکے میں ڈال دیا

فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ

ان کے دین کے بارے میں ان باتوں نے جو یہ تراشتے ہیں ﴿٢٤﴾ پھر کیا حال ہوگا ان کا جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے ایسے دن میں

لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۟ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾ قُلِ

جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿٢٥﴾ آپ کہہ دیجئے

اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو دیتا ہے سلطنت جس کو چاہتا ہے اور چھین لیتا ہے سلطنت جس سے چاہتا ہے

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

اور تو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تو ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، بھلائی تیرے قبضے میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر

قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

قدرت رکھنے والا ہے ﴿٢٦﴾ داخل کرتا ہے تو رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن کو رات میں اور تو نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے

وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ

اور تو نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے اور تو رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار ﴿٢٧﴾ مؤمن نہ بنائیں

الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ

کافروں کو دوست مؤمنوں کو چھوڑ کر، اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی سے کسی درجے میں نہیں ہے،

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨﴾

مگر یہ کہ تم ان سے کوئی بچاؤ اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اور اُسی کی طرف ہی لوٹنا ہے ﴿٢٨﴾

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ

آپ فرما دیجئے کہ اگر چھپاؤ تم اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے یا تم اُس کو ظاہر کرو اللہ اس کو جانتا ہے، اور جانتا ہے اللہ تعالیٰ

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ

اُن چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿٢٩﴾ جس دن پائے گا ہر نفس

مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ

اپنے کیے ہوئے اچھے عمل کو حاضر، اور اپنے کیے ہوئے بُرے عمل کو حاضر، وہ نفس چاہے گا کہ کاش! اس نفس کے درمیان اور

بَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٣٠﴾

اس دن کے درمیان لمبی مدت ہوتی، اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے ﴿٣٠﴾

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ

آپ کہہ دیجئے اگر تم محبت کرتے ہو اللہ تعالیٰ سے تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا اور

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣١﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ

تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿٣١﴾ آپ فرما دیجئے کہ تم اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾

پھر اگر وہ اعراض کریں تو اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا ﴿٣٢﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ: کیا آپ نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کی طرف جو دیے گئے کتاب سے ایک حصہ، يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ: بلائے جاتے ہیں وہ اللہ کی کتاب کی طرف، لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ: تا کہ یہ اللہ کی کتاب اُن کے درمیان فیصلہ کردے، ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ: یہ ثُمَّ تعجب میں ڈالنے کے لئے ہے، اظہارِ تعجب کے لئے، جس کا مفہوم یوں ادا کیا جائے گا" پھر بھی پیٹھ پھیرتا ہے اُن میں سے ایک فریق!" یعنی اللہ کی کتاب کا ایک حصہ وہ دیے گئے ہیں، اور ان کو اللہ کی کتاب کی طرف ہی بلایا جاتا ہے تا کہ وہ کتاب فیصلہ کردے، پھر بھی وہ پیٹھ پھیرتے ہیں، یعنی اللہ کی کتاب کا فیصلہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں، وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اور وہ ہیں ہی اعراض کرنے والے۔ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ میں اِس خاص وقت میں ان کی تولی کو ذکر کیا گیا ہے، کہ جب ان کو

بلایا جاتا ہے کہ اللہ کی کتاب تمہارے درمیان فیصلہ کردے تو منہ موڑ کر چل دیتے ہیں، اور وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ میں ان کی دائمی عادت ذکر کی گئی ہے کہ اِن کا تو کام ہی اعراض کرنا ہے، ان کی تو عادت ہی یہی ہے کہ اللہ کے فیصلے کی طرف نہیں آتے، جب بھی کوئی ایسا موقع ہوتا ہے یہ اعراض کر جاتے ہیں، نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ سے توراۃ وانجیل مراد ہے جو تحریفات سے بچی کھچی ان کے ہاتھ آ گئی، اور يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ سے قرآنِ کریم مراد ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا: اور یہ اس سبب سے ہے، یعنی یہ اِن کی تولی اور اِن کا اعراض اس سبب سے ہے کہ بیشک یہ لوگ کہتے ہیں لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ: ہرگز نہیں چھوئے گی ہمیں آگ مگر چند گنتی کے دن، وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: غَرَّ غُرُوْر: دھوکے میں ڈالنا، اور ان کو دھوکے میں ڈال دیا اِن کے دین کے بارے میں اُن باتوں نے جو یہ تراشتے ہیں، مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ، افتراء: اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لینا، اس لیے جھوٹ کو بھی افتراء کہا جاتا ہے، کہ اس میں واقعہ کوئی نہیں ہوتا، بلکہ اپنی طرف سے بنائی ہوئی بات ہوتی ہے۔ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ: پھر کیا حال ہوگا اِن کا جب ہم اِنہیں اکٹھا کریں گے، لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ: ایسے دن کے لئے، یا، ایسے دن میں جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ: اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو، مَّا كَسَبَتْ: جو اُس نے کیا، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ قُلِ: آپ کہہ دیجیے، اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ: اے اللہ! اے سلطنت کے مالک!، تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ: تو دیتا ہے سلطنت جس کو چاہتا ہے، وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ: اور تو چھین لیتا ہے سلطنت، مِمَّنْ تَشَآءُ: جس سے چاہتا ہے، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ: اور تو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ: اور تو ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، بِيَدِكَ الْخَيْرُ: بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرے قبضے میں ہے، اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ: داخل کرتا ہے تو رات کو دن میں، وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ: اور داخل کرتا ہے تو دن کو رات میں، وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ: اور تو نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے، وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ: اور تو نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے، وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: اور تو رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار، بے شمار کا لفظ کثرت سے کنایہ ہوتا ہے، یعنی جس کی تعداد مخلوق میں سے کسی کو معلوم نہیں، چاہے اللہ کے نزدیک اُس کا شمار ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو ہر چیز کا شمار ہے، تو یہ لفظ کثرت سے کنایہ ہوتا ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ بے شمار انسان وہاں کھڑے تھے، یعنی اگر ہم گننا چاہتے تو گننے میں نہ آتے، اتنے زیادہ تھے، ''تو رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار'' اِس کا مفہوم یوں ہو جائے گا، تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ رِزْقًا غَيْرَ قَلِيْلٍ۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ: لَا يَتَّخِذِ نہی ہے، مؤمن نہ بنائیں، ایمان والے لوگ نہ بنائیں کافروں کو دوست، اولیاء ولی کی جمع ہے، مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: مؤمنوں کو چھوڑ کر، مؤمنوں کے علاوہ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ: جو ایسا کرے گا، فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ: لَيْسَ مِنْ وَلَايَةِ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ، وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی سے کسی درجے میں نہیں ہے، یعنی کافروں کے ساتھ دوستی لگائے اور پھر ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کا دعویٰ بھی کرے، تو اللہ کی دوستی میں اُس کا کوئی درجہ نہیں، کسی شمار میں نہیں، ''نہیں ہے وہ اللہ کی دوستی سے کسی شمار میں، کسی شئ میں'' اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً، تُقٰىةً یہ اصل کے اعتبار سے وُقَاة ہے، وَقٰی یَقِیْ اِس کا باب ہے، وُقْیَةٌ مصدر ہے، پھر واؤ کو تاء سے بدل دیا، کلامِ عرب میں اِس کے بہت نمونے موجود ہیں کہ واؤ کو تاء سے بدل دیا جاتا ہے، اور قاف کے بعد جو یاء تھی اُس کو الف سے بدل دیا، تو وُقَاةٌ سے تُقَاةٌ ہو گیا۔ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً: مگر یہ کہ تم بچو بچنا، مگر یہ کہ تم اُن سے کوئی بچاؤ اختیار کرو، یہ اس کا مفہوم ہوگا،

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ: اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ: اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ: آپ فرما دیجئے کہ اگر چھپاؤ تم اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے، اَوْ تُبْدُوْهُ: یا تم اُس کو ظاہر کرو، يَعْلَمْهُ اللّٰهُ: اللہ اُس کو جانتا ہے، وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ: اور جانتا ہے اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں، وَمَا فِي الْاَرْضِ: اور جو زمین میں ہیں، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ: كُلُّ نَفْسٍ یہ تَجِدُ کا فاعل ہے، تَجِدُ واحد مؤنث کا صیغہ ہے، جس دن پائے گا ہر نفس، مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا: مِنْ خَيْرٍ یہ مَا کا بیان ہے، لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ ''جس دن پائے گا ہر نفس اپنے اُس عمل کو جو اس نے کیا اچھائی سے'' مُّحْضَرًا: پائے گا محضر، حاضر کیا ہوا، اور محاورے کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا کہ ''جس دن پائے گا ہر نفس اپنے کیے ہوئے اچھے عمل کو حاضر''، وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ: اور اپنے کیے ہوئے برے عمل کو حاضر، مِنْ سُوْٓءٍ یہ مَا کا بیان ہے، تو حاصل یہ ہوگا کہ اپنے اچھے برے عمل کو حاضر پائے گا، وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ، کا عطف مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ پر ہے، اور مُّحْضَرًا کا تعلق دونوں کے ساتھ ہے، یعنی جو برا عمل اس نے کیا اور جو اچھا عمل اُس نے کیا اُس کو حاضر پائے گا۔ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا: وَدَّ يَوَدُّ: چاہنا، وہ نفس چاہے گا کہ کاش! اُس نفس کے درمیان اور اِس دن کے درمیان لمبی مدت ہوتی، دُور کا فاصلہ ہوتا، یعنی یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا، میرے اور اس کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا، وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ: اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ: اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے۔ قُلْ: آپ کہہ دیجیے، اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ: اگر تم محبت کرتے ہو اللہ تعالیٰ سے، فَاتَّبِعُوْنِيْ: تو میری اتباع کرو، يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا، وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ: اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر وہ اعراض کریں، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ: تو وہ کافر ٹھہرے، اور اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ماقبل سے ربط

شروع سورت سے آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا، کہ ابتدائی آیات زیادہ تر عیسائیوں کے ساتھ جو سرورِ کائنات ﷺ کا مکالمہ ہوا تھا اُسی کے مضمون پر مشتمل ہیں، اِبنیتِ مسیح کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا، اللہ تعالیٰ کی توحید کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا، اور اِسی طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین کا تذکرہ آیا تھا، اِن کی وضاحت آپ کے سامنے پچھلی آیات میں کی گئی، اگلی آیات بھی اِسی سے ہی تعلق رکھتی ہیں جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر یہ لوگ اعراض کریں تو کہہ دو کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں، اور پھر اُن کی خاندانی مذمت کی گئی تھی کہ یہ تو انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے ہیں، اور قسط اور انصاف کا حکم دینے والے انسانوں کو برداشت

نہیں کرتے، یہ آپ پر ایمان کس طرح سے لائیں گے؟ آپ اِن سے کوئی اچھی توقعات وابستہ نہ کریں، اگر یہ نہ مانیں تو یہ ان کی خاندانی صفات ہیں، اور انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دو، دنیا وآخرت میں اِن کے حصے میں اب خسارہ ہے، ان کی کارروائیاں نہ آخرت میں رنگ لائیں گی نہ دنیا کے اندر یہ کسی کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ اِسی مضمون کے متعلق اگلی آیت ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں، خود اپنے آپ کو حاملِ کتاب قرار دیتے ہیں، اور واقعی اِن کے پلے کچھ توراۃ وانجیل کی بچی کھچی آیات ہیں، کچھ تحریف کی نظر ہوگئیں، کچھ ضائع ہوگئیں، بہرحال جتنی موجود ہیں، جن کے یہ حامل ہیں اُس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا فیصلہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، لیکن جب اِن کو اللہ کی کتاب کے فیصلے کی طرف ہی بلایا جاتا ہے تو یہ اعراض کر جاتے ہیں، اللہ کی بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، تو اِن کی عادت یہی ہے کہ جس وقت بھی کوئی مرضی کے خلاف ان کے سامنے بات آئے گی، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو، براہِ راست اللہ کا رسول کہہ رہا ہو، اللہ کی کتاب کے اندر اتری ہوئی ہو، پھر بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

عقیدۂ سفارش کی بناء یہود کی بےفکری پر انکار

اور یہ جو اتنا ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ موقع پر تولّی اختیار کر لیتے ہیں، اعراض اختیار کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بات کے سامنے سرافگندہ نہیں ہوتے، اِن کی اِس سرکشی میں اِن کے بُرے عقیدوں کا اور اِن کے غلط نظریات کا دخل ہے، کہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدۃ:۱۸) ہم اللہ کے لئے بیٹوں کی طرح ہیں اور اس کے محبوب ہیں، اس لئے اوّل تو ہم جہنم میں جائیں گے ہی نہیں، دنیا میں جس طرح سے بھی ہم رہیں آخرت میں ہمارے بڑے ہمیں چھڑالیں گے، بڑوں کی طرف جو ہماری نسبت ہے وہ کام آجائے گی، تو اوّل تو جہنم میں جائیں گے ہی نہیں، نجات پہلے ہی ہو جائے گی، اور اگر بالفرض چلے بھی گئے تو تھوڑی بہت سزا ہوگی، سزا پا کر پھر ہم چھوٹ جائیں گے، تو جب اِنہوں نے اپنے لیے آخرت کی نجات کو رجسٹری کرایا ہوا ہے اپنے خیال کے مطابق، تو پھر اِن کو کیا ضرورت ہے کسی دین کی پابندی کرنے کی اور کیا ضرورت ہے یہ سوچنے کی کہ ہمارے اُوپر کیا ذمہ داریاں آتی ہیں، یہ غلط نظریہ اور یہ غلط عقیدہ انسان کو بدعملی کی طرف لے جاتا ہے، عمل پر برانگیختہ کرنے والی چیز تو یہی ہے کہ انسان یہ سوچے کہ میں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اپنے عملوں کا حساب دینا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہوگا، جب یہ بات ذہن میں بیٹھی ہوئی ہوگی تو پھر انسان پھونک پھونک کر قدم رکھے گا، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی کوشش کرے گا، نافرمانیوں سے بچنے کی کوشش کرے گا۔

آج بھی اگر کسی عدالت کے اندر آپ کی پیشی ہے، اور آپ سمجھتے ہیں کہ عدالت میں انصاف ہوگا، اگر میرا قصور ثابت ہوگیا تو میں پکڑا جاؤں گا، گرفتار ہو جاؤں گا، پھر وہاں نہ رشوت دے کر چھوٹ سکوں گا، نہ وہاں کوئی میرا سفارشی کام آئے گا، تو یقیناً آپ عدالت کے قانون کا احترام کریں گے، اور کوشش کریں گے کہ ہمارے اُوپر کوئی فردِ جرم عائد نہ ہو، لیکن اگر آپ کو یہ سہارا ملا ہوا ہے کہ حاکم وقت رشوت لے کر چھوڑ دیتا ہے، یا آپ کو کسی بڑے آدمی کا سہارا ملا ہوا ہے، کہ اگر پکڑا گیا تو فوراً اُس کا ٹیلی فون

آجائے گا اور حاکم مجھے چھوڑ دے گا، اگر اِس قسم کے سہارے ذہن میں ہیں تو آپ ماحول کے اندر مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ایسا شخص قوانین کا احترام نہیں کیا کرتا، پھر وہ آزادانہ زندگی گزارتا ہے، ظلم کرے گا، قتل کرے گا، لوگوں کو نقصان پہنچائے گا، صرف اِس وجہ سے کہ اُس پر قانون کی حکمرانی نہیں ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ اول تو مجھے کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا، اگر کسی نے پکڑ ہی لیا تو میں رشوت دے کر یا سفارش سے چھوٹ جاؤں گا، تو ایسے وقت میں اُس کے ذہن پر کسی صورت میں بھی قانون کی برتری نہیں قائم ہو سکتی، وہ اپنے اوپر قانون کی گرفت نہیں ہونے دے گا۔

اور اِنہوں نے ایسے ہی عقیدے گھڑ لئے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی عدالت بھی ایسی ہے کہ چونکہ ہم بڑوں کی اولاد ہیں اور بڑوں نے ہمارے لیے بہت کچھ کر رکھا ہے، جب ہم جائیں گے تو چونکہ یہ نسبت ہوگی کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں تو اللہ تعالیٰ کہے گا جاؤ، جنت تو تمہارے لئے ہی ہے، لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (سورۂ بقرۃ:۱۱۱)، اور اگر کسی وجہ سے گرفت میں آ بھی گئے تو ہمارا کوئی بڑا سفارش کر دے گا یا کوئی اور اس قسم کی بات ہو جائے گی، جائیں گے تو بس ایسے ہی برائے نام سی سزا ہوگی اور نکل آئیں گے۔ تو یہ جو اِنہوں نے اپنے دین کے اندر غلط عقیدے گھڑ لئے ہیں اِس نے اِن کو دین کے معاملے میں دھوکے میں ڈال دیا، اب یہ دین کی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے، اِن کی آزادانہ روش اِن کے اِنہی غلط نظریات کا نتیجہ ہے، یہی بات اِس آیت میں کہی گئی، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ: یہ ان کی تولّی اور یہ ان کا اعراض اِس وجہ سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی مگر چند گنتی کے دن، اور مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ کے تحت بھی اِسی قسم کے نظریات اور عقیدے ہیں جن کو سورۂ بقرہ کے اندر تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا، کہ اِن کی بنائی ہوئی خواہشات ہیں، دل کے اندر پکائے ہوئے خیالات ہیں، یہ اِن کے خیالی پلاؤ ہیں جو وقت پر اِن کے کچھ کام نہیں آئیں گے، جو باتیں اِنہوں نے گھڑ لی ہیں وہ دین کے بارے میں اِن کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ فَكَيْفَ کے اندر یہ کہا گیا کہ اِن کا یہ نظریہ غلط ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں جس وقت پیشی ہوگی تو ہر کسی کو اس کا کیا ہوا پورا پورا بھگتنا پڑے گا، وہاں تو نہ نسبتیں کام آئیں گی، نہ سفارشیں کام آئیں گی۔ ''کیا حال ہوگا اِن لوگوں کا'' جو اِس قسم کی بھول بھلیوں میں اپنا وقت گزار رہے ہیں، جو اِس قسم کے خیالی پلاؤ پکا پکا کر خوش ہو رہے ہیں، جنہوں نے ایسی تمنائیں لگا لگا کر اپنے لیے خیالی طور پر سبز باغ بنا رکھے ہیں اِن کا کیا حال ہوگا، ''جس وقت ہم اِن سب کو اکٹھا کریں گے ایسے دن میں جس کے آنے میں کوئی شک نہیں'' یقیناً وہ دن آنے والا ہے، ''ہر نفس کو اُس کا کیا ہوا پورا پورا دے دیا جائے گا اور اِن کی حق تلفی نہیں کی جائے گی'' وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اِن پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یہاں تک تو اُن کے اِس نظریے کی تردید کر کے اُن کے ذہن پر یہ فکر ڈالا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت کو دُنیا کی عدالتوں کی طرح نہ سمجھو، وہاں جانا بھی ضرور ہے، بچ نہیں سکتے، اور پھر جس وقت حساب کتاب ہوگا تو اللہ تعالیٰ قسط اور میزان کیساتھ فیصلہ کرے گا، اور ہر نفس کو اُس کا کیا ہوا پورا دے دیا جائے گا، اور تمہارے یہ نظریات اور گھڑی ہوئی باتیں اُس وقت هَبَاءً مَّنْثُوْرًا ہو جائیں گی اور تمہارے کوئی کام نہیں آئیں گی، اس لئے اِس بے فکری کو چھوڑ دو اور کچھ اپنے دماغ کے اندر اِس بات کا فکر لے آؤ۔

دُعا کے پیرائے میں انتقالِ ریاست کی نشاندہی

پھر سرورِ کائنات ﷺ کے آنے تک ہر قسم کی علمی دینی ریاست اِن کو حاصل تھی، اور اب آگیا تھا اِن کے زوال کا وقت، اب بنی اسرائیل کو چھوڑا جا رہا تھا، گرایا جا رہا تھا، اور وہ اس دنیا کے اندر اپنی اُس خاندانی شرافت اور عزت سے محروم ہو رہے تھے، اور بنی اسماعیل کو اُبھارا جا رہا تھا، اب یہ بنی اسماعیل کی قوم اُبھر رہی تھی، علم بھی اِن کی طرف آ رہا تھا، دینی ریاست بھی اِن کی طرف آ رہی تھی، اور ظاہری حکومت بھی اِن کی طرف آ رہی تھی، اب آگے دعا کے پیرائے میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس بات کو بعید نہ سمجھو کہ ایک قوم کو گرا دیا جائے اور دوسری قوم کو ابھار دیا جائے، ایک سے ملی ہوئی عزت چھین لی جائے اور دوسری قوم کو عزت دے دی جائے، اور ایک فاقہ مست قوم کو بادشاہ بنا دیا جائے اور خزانوں کا مالک بنا دیا جائے، اور بادشاہوں کو فقیر بنا دیا جائے اور خزانے والوں کو گداگر بنا دیا جائے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات کوئی بعید نہیں ہے، اس لئے چلنے والی ہوا کا رخ پہچانو، آنے والے حالات کا کچھ اندازہ کرو، اب یہ عزت تم سے چھن رہی ہے، کسی دوسری قوم کو مل رہی ہے، اور اسی طرح سے علمی ریاست وغیرہ جو تمہیں حاصل تھی وہ اب تمہارے پاس نہیں رہے گی، اب ذلت تمہارا مقدر ہو چکی ہے، اگر تم باز نہیں آؤ گے تو یہی دن تمہیں دیکھنے پڑیں گے، ہاں البتہ اِس نبی کا دامن پکڑ لو، تو جب اِن کو عزت ملے گی تو ساتھ تم بھی باعزت ہو جاؤ گے۔ یہ ربط ہو جائے گا اِس کا ماقبل کے ساتھ، گویا کہ یہ اُسی سلسلے کی آیات ہیں جو یہود و نصاریٰ کو خطاب کیا جا رہا ہے، اور اب انتقالِ اقتدار اور انتقالِ ریاست کی نشاندہی اِس دعا کے پیرائے میں کر دی گئی۔

آیات کا شانِ نزول

ویسے اِن آیات کے شانِ نزول میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے، کہ جس وقت غزوۂ خندق پیش آیا جس کو غزوۂ احزاب کہتے ہیں، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ احزاب میں آئے گی، مشرکین اور عرب کے دیگر قبائل سارے کے سارے اکٹھے ہو کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو گئے تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ اور صحابہ ؓ نے مشورہ کیا تھا کہ اتنے بڑے دشمن کا مقابلہ کھلے میدان میں نکل کر مشکل ہوگا، سلمان فارسی ؓ کے مشورے سے مدینہ منورہ کے اردگرد ایک بہت بڑی خندق کھودی جا رہی تھی تاکہ دشمن مدینہ منورہ میں نہ آ سکے، اس طرح اُس کا دفعیہ ہو جائے گا، بہت لمبی اور بہت گہری خندق کھودی گئی۔ جس وقت وہ خندق کھودی جا رہی تھی تو ایک چٹان سامنے آگئی جو کسی طریقے سے اکھڑتی نہیں تھی، صحابہ کرام ؓ نے سرورِ کائنات ﷺ کو اطلاع دی تو آپ ﷺ کدال لے کر خود نیچے خندق میں اترے، ویسے تو کھودنے میں آپ ابتداء سے ہی شریک تھے لیکن حصے تقسیم کیے ہوئے تھے، دس دس آدمیوں کے حصے میں چالیس چالیس ہاتھ جگہ دی ہوئی تھی کھودنے کے لئے، تو جس فریق کے حصے میں وہ چٹان آئی تھی اُنہوں نے آکر حضور ﷺ کو اطلاع دی، تو آپ وہاں تشریف لے گئے اور خندق میں اتر گئے اور کدال اپنے ہاتھ میں لے لی، جب آپ ﷺ نے اس چٹان پر پورے زور کے ساتھ ایک ضرب لگائی تو چٹان بھی ٹوٹی، اُس کے بھی ٹکڑے ہوئے، اور اُس میں سے آگ کا ایک شعلہ نکلا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں بشارت ہو، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے اندر حیرہ یعنی فارس کے محلات دکھا دیے

ہیں، اور پھر دوسری چوٹ ماری پھر ایک شعلہ نکلا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے رُوم کے محلات دکھادیے ہیں، اور تیسری دفعہ صنعاء یعنی یمن کے علاقے کے متعلق فرمایا کہ مجھے وہاں کے محلات نظر آئے ہیں، اور مجھے امید ہے کہ میری اُمت اِن سب علاقوں پر قبضہ کرے گی، اور تین ہی ضربوں کے ساتھ وہ چٹان بھی ریزہ ریزہ ہوگئی اور کھدائی کا کام پھر جاری ہوگیا، تو منافقین جو مدینہ کے اندر محصور تھے جن کی ہمدردیاں کافروں مشرکوں اور یہودیوں کے ساتھ تھیں، جب انہوں نے یہ بات سنی تو انہوں نے استہزاء کیا اور مذاق اڑایا، کہ عربی قبائل سے ڈر کر مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے والے، اور صبح شام رات دن اس فکر میں گھلنے والے کہ کہیں دشمن مدینے پر نہ چڑھ آئے، فارس اور رُوم کی فتوحات کے خواب دیکھتے ہیں، اِن دشمنوں سے بچنے کے لیے تو رات دن اِن کی ہوش ماری ہوئی ہے اور خندقیں کھود رہے ہیں، اور خواب دیکھ رہے ہیں رُوم اور فارس کو فتح کرنے کے (مظہری)، جب اُنہوں نے اس طرح استہزاء کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ دُعا مسلمانوں کو تلقین کی گئی، اور دُعا کے انداز میں یہ بشارت دی گئی کہ یہ کوئی مشکل نہیں ہے، ٹھیک ہے کہ آج تمہیں یہ کمزور نظر آتے ہیں اور دشمنوں کے مقابلے میں کچھ مغلوب سے نظر آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے اختیار میں سب کچھ ہے، اصل مالکِ مُلک وہ ہے، اس لئے جس کو چاہے سلطنت دے دے، جس کو چاہے دے کر چھین لے، اِس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ اور دُعا کے انداز میں بشارت اس لئے ذکر کی گئی تا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع اور انکسار کو اپنائیں، اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر اللہ سے مانگتے رہیں، اور اِن کے اندر کوئی تکبر اور کوئی بڑائی نہ آئے کہ یہ سمجھیں کہ یہ فتوحات ہمارا استحقاق ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہاتھ پھیلائیں جس طرح ایک محتاج ہاتھ پھیلایا کرتا ہے۔

چنانچہ اس دُعا میں جو کچھ کہا گیا تھا سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں اُس کے آثار بالکل نمایاں ہوگئے، سارا عرب تو حضور ﷺ کے زمانے میں ہی زیرِ نگین آ گیا، اور باقی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رُوم اور فارس کی طاقتیں بھی ٹوٹ گئیں، اور جو بشارت حضور ﷺ نے دی تھی وہ ساری کی ساری لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ تو شانِ نزول کے تحت بھی آیات کا مطلب یہی ہوا، اور جس سلسلے کے اندر یہ آیات رکھی ہوئی ہیں اُس کے تحت بھی یہی پیش گوئی کردی گئی کہ اب یہ باعزت قومیں ذلیل ہوں گی، اور جن کو ذلیل سمجھا جاتا تھا اللہ تعالیٰ اب اِنہیں عزت دے گا، یہ جو بادشاہ قسم کے لوگ تھے اب یہ زوال میں آجائیں گے، اور یہ جو گداگر قسم کے لوگ اور محتاج سمجھے جاتے تھے اللہ تعالیٰ اب اِن کو عزت سے نوازے گا، اس دُعا کے اندر یہ پیش گوئی صاف لفظوں میں آ گئی، اور اِس کا مصداق چند سالوں کے اندر اندر ہی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

قُلِ: آپ کہہ دیجئے اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ: اے اللہ! اے سلطنت کے مالک!، اِس میں ذکر کر دیا کہ اصل مالک سلطنت کا اللہ ہے، تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ: تو جس کو چاہتا ہے سلطنت دے دیتا ہے، سلطنت کسی کا ذاتی حق نہیں، اللہ کے دینے سے ملتی ہے، جس کو چاہے دے دے، وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ: تو جس سے چاہے سلطنت کو چھین لیتا ہے، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ: اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ: جس کو تو چاہتا ہے ذِلت دے دیتا ہے، ''جس کو چاہتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دوسرا رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتا، ورنہ اللہ عزت اُنہی کے متعلق ہی چاہے گا جن کا کردار اچھا ہوگا، جن کے حالات اچھے ہوں گے، اور اللہ ذِلت اُنہی کے متعلق ہی چاہے گا جو اپنے اُصولوں کو چھوڑ بیٹھیں گے اور اللہ کے احکام سے روگردانی کریں گے، مَنْ تَشَآءُ کا مطلب یہ

نہیں کہ ایسے ہی بغیر کسی اصول اور بغیر کسی قاعدے کے، جس میں کوئی عدل وانصاف کالحاظ نہ ہو، جس کو چاہا عزیز بنادیا، جس کو چاہا ذلیل بنادیا، یہ مطلب نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مالک مختار ہے، اللہ کے فیصلے کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

مجموعۂ عالم کے اعتبار سے ہر چیز خیر ہے

بِيَدِكَ الْخَيْرُ: بھلائی تیرے قبضے میں ہی ہے، یہاں خیر کالفظ ہی بولا، ساتھ شر کا لفظ نہیں بولا، اگرچہ عزت کا ملنا خیر ہے اور کسی قوم کو ذِلت نصیب ہوجائے تو بظاہر اس میں شر کا پہلو ہے، اور اسی طرح ملک کا ملنا خیر ہے اور کسی شخص سے سلطنت چھن جائے تو اُس کے حق میں یہ شر کا پہلو ہے، لیکن یہاں شر کو ذکر نہیں کیا گیا، بِيَدِكَ الْخَيْرُ میں صرف خیر کو ذکر کیا گیا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے اندر جو حالات پیش آتے ہیں، شخصی اور انفرادی طور پر یا کسی قوم کی سطح پر اُن کے حق میں چاہے بُرے ہوں لیکن نظامِ عالم کے اعتبار سے وہ خیر ہیں، اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے تحت جو کچھ دُنیا میں پیش آتا ہے وہ مجموعۂ عالم کے اعتبار سے خیر ہی خیر ہے، چاہے شخصی طور پر کسی کے لئے نقصان دِہ ہی کیوں نہ ہو، مجموعۂ عالم کے اعتبار سے خیر ہے، جیسے کہ متنبی میں آپ نے پڑھا ہوگا، متنبی کہتا ہے کہ:

"مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِدُ "(1) کہ کسی قوم کے اُوپر اگر مصیبت آتی ہے تو کسی دُوسری قوم کا اُس میں فائدہ بھی ہوتا ہے، یہ تو نہیں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس میں کلیۃً شر ہی شر ہو اور اُس میں خیر کا پہلو ہو ہی نہیں، مجموعۂ عالم کے اعتبار سے اس میں یقیناً خیر کا پہلو ہوتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو وہی مقصود ہے، اور نظامِ عالم کے اعتبار سے چونکہ اس میں خیر ہی خیر ہے اس لئے اللہ کے ہر فیصلے کو ہم خیر سے تعبیر کریں گے، اللہ کے کسی فیصلے کے اندر شر کا پہلو نہیں ہے، بِيَدِكَ الْخَيْرُ میں صرف خیر کا ذکر اس لیے کردیا گیا کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو وہ مجموعۂ عالم کے اعتبار سے خیر ہے، اُس کو انفرادی حیثیت سے دیکھیں تو چاہے کسی کے حق میں شر ہو، جیسے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مثال دیتے ہیں، کہ خال یعنی جو رخسارے پر سیاہ سا داغ ہوتا ہے، یا اسی طرح بال، اِن کو اگر بدن سے علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو ان میں کوئی حسن معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اِس سیاہ دانے کو اگر علیحدہ کرکے آپ دیکھیں گے تو یہ ایک قابلِ نفرت سی چیز ہے، اور بالوں میں بھی کوئی حسن نمایاں نہیں، لیکن جس وقت یہ مجموعۂ جسد میں جڑے ہوئے اور لگے ہوئے ہوتے ہیں تو حسن وجمال میں اِن کا کتنا دخل ہے اور کتنی خوبصورتی کا باعث ہوتے ہیں، اسی طرح اگر واقعہ کو علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو ممکن ہے اُس میں کوئی خیر کا پہلو آپ کو نظر نہ آئے، لیکن جس وقت اس کو نظامِ عالم کے اندر سیٹ کرکے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دُنیا کے نظام کے اندر اِس کا خیر کا پہلو ہی غالب ہے، اور اِس نظامِ عالم کے اعتبار سے یہ بہت اہم واقعہ ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فیصلہ بھی ہو وہ سارے کا سارا خیر کا پہلو ہی لئے ہوئے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذِکر اور اس کا مقصد

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بیشک تُو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں، تو كُلِّ شَيْءٍ کے اندر

(1) ديوان المتنبي ص ٨٣ بعنوان وقال يمدحه ويذكر هجوم الشتاء الخ.

یہاں خاص طور پر مراد یہی عزّت وذِلّت اور مُلک کا لینا اور مُلک کا دینا ہے، اور آج تو اِس کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں، بالکل کھلی آنکھوں آپ دیکھ سکتے ہیں، شاہِ ایران[1] کی کل کیا حیثیت تھی اور آج کیا حیثیت ہے، یعنی اب تو بادشاہوں کا انجام کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے کہ انسان پناہ مانگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بادشاہ نہ بنائے جو حال اِس وقت سامنے آرہا ہے، تو یہ کل عزّت کے کس مقام پر تھے اور آج ذِلّت کے کس مقام پر ہیں، کہیں ٹکنے کے لئے جگہ نہیں مل رہی، بہر حال اس قسم کے واقعات دُنیا میں پیش آتے رہتے ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی عزّت، ذِلّت، مُلک کا ملنا، مُلک کا چھن جانا، یہ اللہ تعالیٰ کے ہی تصرف کے ساتھ ہوتا ہے، یہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے، تو کوئی قوم یہ ناز نہ کرے کہ اب یہ سلطنت ہمارے پاس ہے تو ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا، یا فلاں قوم کو ہم نے دبایا ہوا ہے وہ کبھی اُبھر نہیں سکتی، یا عزّت ہمارے لئے ہی ہے اور ذِلّت دوسرے کے حق میں مقدر ہے، ایسی بات نہیں ہے، عزّت ذِلّت اور مُلک یہ ساری دُھوپ چھاؤں کی طرح آنے جانے والی چیزیں ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی حکمت اور مشیت کے تحت جس کو چاہتے ہیں سلطنت دے دیتے ہیں، جس سے چاہتے ہیں چھین لیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں عزّت دے دیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں ذِلّت کے طرف دھکیل دیتے ہیں، لیکن اللہ کا چاہنا قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے جو اُس نے اپنی حکمت کے ساتھ متعین کیا ہوا ہے، مشیت کا ذکر صرف اس لئے ہے کہ کوئی دوسرا اللہ کے فیصلوں کے سامنے رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے مزید تصرفات کا ذِکر اور اس کا مقصد

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ: یہ زمانے پر اللہ تعالیٰ کا تصرف کتنا نمایاں ہے، اور دن اور رات کا چکر چونکہ چاند اور سورج وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے تو گویا کہ چاند سورج ستارے زمین آسمان کی گردش چکر جو کچھ ہے سب اللہ کے تصرف کے تحت ہے، اِس میں بھی اُس کی قدرت کا احاطہ معلوم ہوتا ہے۔ "داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں" یعنی کبھی دن آگیا اور کبھی رات آگئی، اور اسی طرح کبھی رات چھوٹی ہوگئی اور دن بڑا ہوگیا، کبھی دن چھوٹا ہوگیا اور رات بڑی ہوگئی۔ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ: یہ اُس کا وہ تصرف ہے جو کہ عالم ارواح میں چلتا ہے، "زندہ کو بے جان سے نکالتا ہے" یعنی اصل بے جان اور اُس میں سے جاندار چیز نکال دی، جیسے پانی کی بوند سے انسان بنا دیا، اور انڈہ بے جان ہے اُس میں سے بچّہ جاندار نکال دیا۔ اور بے جان کو نکالتا ہے زندہ سے، جیسے مرغی جاندار ہے اس میں سے انڈہ بے جان نکال دیا، اور انسان جاندار ہے اس سے پانی کا قطرہ بے جان نکال دیا، یہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات ہیں۔ یہ توحسی طور پر میّت اور حی ہیں، اور اگر اس میّت اور حی کو عام لے لیا جائے تو عالم اور جاہل بھی اس سے مراد ہوسکتے ہیں، کہ عالم کی اولاد جاہل ہوجائے اور جاہل کی اولاد عالم ہوجائے، اسی طرح اچھے آدمی کے گھر بُرا پیدا کردیا جائے اور بُرے کے گھر اچھا پیدا کردیا جائے، آزر کے گھر ابراہیم علیہ السلام آگئے، اور نوح علیہ السلام کے گھر کنعان پیدا ہوگیا، ایسا بھی ہوتا رہتا ہے، اسی طرح باعزّت قوم کی نسل ذلیل ہوگئی، اور ذلیل قوم کی نسل عزّت پاگئی، یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے تصرفات ہیں، توحی اور میّت کو عام بھی رکھا جاسکتا ہے، کہ پہلے بنی اسماعیل ایسے تھے جیسے بے جان ہیں، اِن کا دنیا میں کوئی اثر

(۱) محمد رضا شاہ پہلوی۔ وفات: ۲۷رجولائی ۱۹۸۰ء مطابق رمضان ۱۴۰۰ھ

دُرسوخ ہے ہی نہیں، اور بنی اسرائیل اس طرح تھے کہ علمی سطح پر یہی چمکتے تھے، لیکن اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو میت کی طرح کر دیا اور اِس قوم کو زندہ کر دیا، جو قوم عروج پر تھی وہ ایسے ہوگئی جیسے اُس پہ مردنی چھا گئی اور حیات سے محروم ہوگئی، اور جو قوم اخلاق اور علم کے اعتبار سے ایک مردہ قوم سمجھی جاتی تھی اللہ تعالیٰ نے اب اُن کو زندگی دے دی، تو ایسا بھی ہوتا رہتا ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، اسحاق علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام کی اولاد فلسطین یعنی شام کے علاقے میں پھیلی تھی، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد حجاز کے علاقے میں یعنی عرب میں پھیلی تھی، گویا انہوں نے ایک پودا شام میں لگایا تھا، اور ایک پودا عرب میں لگایا تھا، اب وہ پودا سرسبز ہو کر اپنا وقت گزار چکا اور خشک ہوتا جا رہا ہے، اور یہ جو خشک سرزمین میں لگا تھا اب اِس کے پھلنے پھولنے کا وقت آ گیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس قسم کے تصرف ہوتے رہتے ہیں۔ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: تو دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار، یہاں بھی رزق عام ہے ہر قسم کے لئے، روحانی رزق ہو، جسمانی رزق ہو، جس کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بے شمار دیتا ہے، یہ گویا کہ اُن کے زوال کی طرف اشارہ ہوگیا، اور اِس قوم کے باعزت ہونے کی طرف اشارہ ہوگیا۔

کُفّار کے ساتھ دوستی پر منافقین کو تنبیہ

اگلی بات خاص طور پر منافقین کی تنبیہ کے لئے ہے، جو ظاہری طور پر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے لیکن اُن کی ہمدردیاں اور اُن کا دِلی تعلق یہود کے ساتھ اور کافروں کے ساتھ تھا، اور یہ دوغلا پن اُن کے اندر کیوں آیا ہوا تھا؟ وہ اس احتمال کے تحت تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ آ گئے ہیں، اور انہوں نے یہ شور برپا کر دیا ہے، آج تو یہ کچھ ہیں، لیکن ارد گرد کُفر کی اور یہودیت کی قوتیں اتنی بکھری ہوئی ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ اسلام کا نام لینے والے مٹ جائیں گے، اور دوبارہ اقتدار اُنہی کے ہاتھ ہی آنا ہے، اور ہم آج ان مسلمانوں کے ساتھ اگر وفادار رہیں اور اُن سے بالکل دوستیاں توڑ لیں تو کل کو مصیبت آئے گی، اس لئے وہ ظاہری طور پر تو اِن کے ساتھ بنائے ہوئے تھے، دلی طور پر اُن کے ساتھ تھے، اُن کے ساتھ ہمدردیاں ظاہر کرتے رہتے تھے اس خیال سے کہ اگر کل کو وہ غالب آ گئے تو کم از کم ہم کہہ تو سکیں گے کہ ہماری دوستیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمیشہ اِس قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں جو دل اور دماغ کے اعتبار سے مخلص نہیں ہوتے، جیسے آج اِس حکومت کے ساتھ ظاہری طور پر تعاون کئے ہوئے ہیں، لیکن اندر اندر اُن کی دوستیاں مثال کے طور پر روس کے ساتھ ہوں اس احتمال سے کہ کل کو روس غالب آنے والا ہے، آثار ایسے ہیں کہ وہ غالب آ جائے گا تو پھر ہم کہیں گے کہ دیکھو ہماری دوستیاں تمہارے ساتھ ہوتی تھیں، اس لیے جب وہ آ جائے گا تو ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا، اور ظاہری طور پر اِن کے ساتھ بھی بنائے رکھتے ہیں، ہر زمانے میں ہر قوم کے اندر اس قسم کے افراد ہوا کرتے ہیں جن کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ ہوتا ہے، ظاہری طور پر ایک کے ساتھ وفاداری کا دَم بھر لیا اور باطنی طور پر تعلقات دوسرے کے ساتھ رکھے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب تک ہو سکے اِن سے فائدہ اٹھائیں، جب دوسروں کا دور آ جائے گا تو اُن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ تو یہ منافق اسی خیال کے تحت کہ آخر انہوں نے غالب آنا ہے جو اردگرد اتنی قوتوں والے بیٹھے ہوئے ہیں، اور یہ نحیف اور کمزور مسلمان تھوڑے عرصے کے لئے شور مچا رہے ہیں، پھر یہ ختم ہو جائیں گے اور آگے کامیاب نہیں ہو سکتے، تو ان کی ہمدردیاں یہودیوں اور مشرکوں کے ساتھ

تھیں۔یہاں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب تم سمجھو کہ وہ گھر اجڑ رہے ہیں، اب اُن کے گھروں کے دروازوں پر دربانی کرنے کا تمہیں کوئی فائدہ پہنچنے کا نہیں، یہ عمارت اب بوسیدہ ہوگئی، گرے گی، اور جو اُس کی دیواروں کے سائے کے نیچے آرام کرنا چاہتے ہیں وہ بھی دب جائیں گے، اس لئے تمہاری بھلائی اسی میں ہی ہے کہ اب اِن سے تعلق چھوڑ دو، اپنے دلوں کا تعلق ان سے توڑلو اور مسلمانوں کے حق میں مخلص ہو جاؤ، آنے والے وقت کے اعتبار سے تمہارے لئے یہی مفید ہے، اور اگر تمہاری دلی دوستیاں ان کے ساتھ رہیں اور پھر تم خدا کی محبت کے بھی دعوے بھی کرو تو اِس محبت کا کوئی مقام نہیں ہے۔اس میں ذکر کر دیا گیا کہ مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ کسی کافر کے ساتھ دلی دوستی لگائے، اصول اِس میں سے یہی نکل آیا، کہ اُس کی پوری وفاداریاں مسلمانوں کے ساتھ ہونی چاہئیں، اور کافروں کے ساتھ ایسا تعلق رکھنا جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو ٹھیک نہیں ہے۔

کُفّار کے ساتھ معاملات کی چار قسمیں اور ان کا حکم

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ: مؤمن کافروں کو دوست نہ بنائیں مؤمنوں کو چھوڑ کر، یعنی انہیں چاہیے کہ ان کی دوستی کا تعلق (ولایت کا معنی دِلی محبت) دلی محبت کافروں کے ساتھ رکھنا درست نہیں، دلی محبت اگر لگائی جاسکتی ہے تو مسلمانوں کے ساتھ لگائی جاسکتی ہے، دِلی محبت کے اعتبار سے تو مسئلہ بالکل صاف ہے جس میں کوئی شک شبہ نہیں ہے، البتہ ایک ہوتی ہے موالات، اور ایک ہے مواسات، اور ایک ہے مدارات، اور ایک ہے مداہنت، اِن لفظوں کے مفہوم میں کچھ تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔موالات کہتے ہیں دل سے کسی کو دوست بنالینا، اُس کے ساتھ محبت رکھنا، اُس کو اپنا حمایتی اور کارساز سمجھنا، کہ وقت پر میرے کام آنے والا ہے، دِل سے اُس سے تعلق لگایا۔مواسات کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی کے دکھ تکلیف کے وقت اس کے ساتھ خیر خواہی سے پیش آ گئے، رواداری کرلی، مدد کر دی، کوئی محتاج سامنے آ گیا تو روٹی کھلا دی، ننگا آ گیا تو کپڑا دے دیا، اس قسم کا احسان اور ہمدردی جو دوسرے کے ساتھ کی جاتی ہے اِس کو مواسات کہتے ہیں۔اور مدارات کا معنی ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر خوش اخلاقی سے پیش آ گئے، کوئی سامنے آ گیا تو چاہے دل نہ چاہے لیکن اُس کے سامنے ذرا دانت نکال دیے اور ہونٹ پھیلا دیے، مسکرا کر اس سے بات کرلی، اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آ گئے، یہ مدارات ہے۔اور مداہنت کا ایک خاص مفہوم ہے کہ دین کے معاملے میں نرمی دکھانا، کہ اپنا دنیوی مفاد حاصل کرنے کے لئے حق کو چھپانا۔

مداہنت بہر حال حرام، چاہے مسلمان کے ساتھ ہو چاہے کافر کے ساتھ ہو۔اور موالات یعنی دلی دوستی لگانا بھی کافروں کے ساتھ ممنوع ہے، اور اسی کے حکم میں فاسق اور بدعتی ہے۔مبتدع، فاسق، کافر سب اسی حکم میں ہیں کہ دِلی طور پر اِن سے محبت نہیں لگائی جاسکتی، کیونکہ محبت دوسرے کی عظمت کو چاہتی ہے، اور دوسرے کے ساتھ ایک مناسبت کو چاہتی ہے، اور مسلمان کی مناسبت اور اس کے دِل میں کافر فاسق اور بدعتی کی کسی قسم کی عظمت نہیں ہونی چاہیے، اگر کوئی شخص فاسق، بدعتی یا کافر کے ساتھ اس قسم کی محبت لگاتا ہے تو یہ اُس کے قلب کا گناہ ہے۔البتہ مواسات کافر کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے، یعنی کسی دکھ اور درد کے وقت میں اُس سے تعاون کرلیا جائے، محتاج ہونے کی صورت میں اس کی مدد کر دی جائے، یہ مسئلہ قرآنِ کریم میں ہی دوسری جگہ مذکور ہے

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ (سورۂ ممتحنہ) ان کے ساتھ تم کوئی اچھا برتاؤ کرلو اس سے اللہ نہیں روکتا۔ ہاں البتہ اگر حربی ہے جو آپ کے بالمقابل کھڑا ہے اُس کے ساتھ اچھا برتاؤ ٹھیک نہیں، باقی کافروں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح فاسق اور بدعتی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اور مدارات کا معنی ہوتا ہے کہ خوش اخلاقی سے پیش آگئے، ظاہری طور پر نرمی دکھادی، مسکرا کے بات کرلی، ظاہری طور پر حال چال پوچھ لیا، یہ بھی کافر بدعتی فاسق تینوں کے ساتھ کی جاسکتی ہے، جیسے کوئی مہمان آجائے تو اُس کے ساتھ بھی اکرام کا معاملہ کرنا چاہیے، چاہے وہ فاسق ہو، چاہے بدعتی ہو، جیسا بھی ہو، اور اگر دینی فائدہ مدنظر ہو تو پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہم ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آئیں گے تو ہوسکتا ہے ہم سے متاثر ہو کر ان کے خیالات ٹھیک ہوجائیں، کافر ہے تو مسلمان ہوجائے، بدعتی ہے تو بدعت سے تائب ہوجائے، جس وقت تک یہ فائدہ مدنظر ہو اُس وقت تک تو مدارات بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہاں! البتہ مدارات کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، ایسا نقصان جو آپ سمجھتے ہیں کہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے، تو چاہے پھر دل نہ بھی چاہے، ایسے وقت میں بھی اُس کے ساتھ اگر دوستی اور خوش اخلاقی کا اظہار کردیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے، جیسے اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً میں ذکر کیا گیا کہ اُن کی کسی مضرت سے بچنا مقصود ہے، جیسے حاکم وقت آگیا، ہے تو وہ فاسق، ہے تو وہ برا، اب اگر وہ سامنے سے آتا ہے اور ہم اس کو سلام نہیں کہتے یا اس کے ساتھ مسکرا کر ہم بات نہیں کرتے تو کل کو ہمیں یہ نقصان پہنچادے گا، اس قسم کے نقصان کے اندیشے سے بھی اگر ظاہری خوش اخلاقی اپنالی جائے تو اس کی بھی اسلام میں اجازت ہے۔ اور مداہنت بالکل جائز نہیں کہ انسان یہ سمجھے کہ اگر میں نے حق ظاہر کیا تو مجھے فائدہ نہیں پہنچے گا (نقصان سے بچنا ایک اور چیز ہے، فائدہ حاصل کرنا اور چیز ہے) فائدہ حاصل کرنے کے لئے حق پوشی، اِس کو مداہنت کہتے ہیں، کہ اگر میں نے یہ حق بات اور ٹھیک بات ظاہر کردی تو میرا فلاں مفاد جو اس سے متعلق ہے وہ مجھے نہیں پہنچے گا، نقصان پہنچنے کی بات نہیں، بلکہ آپ اس سے جو فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اُس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس لئے آپ حق کا اظہار نہیں کرتے، اِس کو مداہنت کہتے ہیں۔ یہ ہیں مختلف الفاظ اور اِن کے یہی مختصر سے احکام ہیں، مختلف آیات میں اِن کا ذکر آئے گا، وہاں پھر اس کی تفصیل عرض کرتے جائیں گے۔

''مؤمن نہ بنائیں کافروں کو دوست مؤمنوں کو چھوڑ کر، جو ایسا کرے گا'' یعنی مؤمنوں کے علاوہ اُس کا دِلی تعلق اور دِلی محبت کافروں کے ساتھ ہوگی، ''تو اللہ تعالیٰ کے تعلق میں وہ کسی درجے میں نہیں ہے'' یعنی اللہ کی محبت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں، ''ہاں البتہ اگر کسی نقصان سے بچنے کے لئے ظاہری طور پر اُن سے دوستی کا اظہار کرتے ہو تو اس کی گنجائش ہے''، ''اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت کو اپنے ذہن میں لاؤ، اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو، ''اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''، ''اور آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دلوں میں چھپاؤ کسی چیز کو یا ظاہر کرو، اللہ جانتا ہے'' یعنی اگرچہ دلوں کے جذبات کا دوسرے انسان کو پتہ نہ چلے لیکن اللہ سے مخفی نہیں، اس لئے اگر تمہارے دلوں کے اندر کافروں سے ہمدردی چھپی ہوئی ہوگی یا کافروں کی محبت چھپی ہوئی ہوگی، وہ اللہ کے سامنے ہے۔ ''اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔ ''جس دن پائے گا ہر نفس اپنے اچھے بُرے کیے کو حاضر'' یہ حاصل ترجمہ ہے، یعنی جو اُس نے اچھا کیا

اس کو بھی حاضر پائے گا، اور جو اس نے برا کیا اس کو بھی حاضر پائے گا،'' اور پھر چاہے گا کہ میرے درمیان یعنی اُس نفس کے درمیان (بَيْنَهَا کی ضمیر نفس کی طرف لوٹ رہی ہے) اور اِس دن کے درمیان امدِ بعید ہوتی، بہت دراز مدت ہوتی کہ مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ''اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ شفقت کرنے والا ہے'' اس لئے آنے والے بُرے انجام سے ڈرا رہا ہے، یہ بھی اللہ کی شفقت اور اس کی رأفت کا تقاضا ہے کہ آنے والے خطرے سے آگاہ کردے۔

اللہ کا محبوب بننے کے لئے حضور ﷺ کی اِتباع ضروری ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ: اب دوسری جانب اعلان ہو گیا کہ کافروں سے تو محبت کرنی نہیں، اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے مدعی ہو تو اِس محبت کا معیار بھی یہی ہے کہ اِس رسول کی اتباع کرو جو رسول اِس وقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو'' یعنی اللہ سے محبت کرنے کا تمہارا دعویٰ ہے، تو اُس کا معیار یہ ہے کہ میری اتباع کرو، اور جس وقت میری اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا محبت کا دعویٰ بھی درست ہو گا اور تمہیں پھر یہ نعمت بھی نصیب ہو گی کہ اللہ بھی تمہارے ساتھ محبت کرنے لگ جائے گا، تم اللہ کے محبوب بھی بن جاؤ گے۔ اصل میں یہاں بھی وہی نفسیاتی بات ہے، کہ ذکر تو یہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اور آگے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا، تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب بھی کسی سے محبت کرے (اور اس کا آپ لوگوں کو تجربہ ہے) تو اس کا جی چاہتا ہے کہ دوسرا بھی میرے ساتھ محبت کرے، اور جس وقت انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے تو محبت ہے اور وہ میرے سے محبت نہیں کرتا، تو یہ آپ کے شکوہ شکایت اِسی پر مبنی ہوتے ہیں، انسان دل میں یہ سمجھتا ہے کہ میں تو محبت کرتا ہوں، لیکن میری محبت کے جواب میں وہ شخص میرے ساتھ محبت نہیں کرتا، پھر آپ کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھو! میں اُس پر مرتا پھرتا ہوں، اور وہ میرا خیال ہی نہیں کرتا، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جو مُحب ہوتا ہے وہ اپنے محبوب کی نظروں میں محبوب بھی بننا چاہتا ہے، یہ ایک نفسیاتی تقاضا ہے، اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے فلاں کے ساتھ محبت ہے اور اُسے بھی میرے ساتھ محبت ہے، تو یہ دوطرفی محبت لطف پیدا کرتی ہے اور پھر انسان کو قلبی سکون نصیب ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ خیال ہو کہ مجھے تو ہے اور اُس کو نہیں تو یہ بابِ محبت میں ایک مستقل پریشانی کا باعث ہے۔ تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ یہی بتاتے ہیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو یہ طریقہ اپناؤ، تم میرے محبوب بھی بن جاؤ گے، اور جب اللہ کے مُحب بھی ٹھہرے اور اللہ کے محبوب بھی ٹھہرے تو اور کیا چاہیے۔ لیکن اِس کا طریقہ میری اتباع ہے، میری اتباع کرو گے تو تمہارا محبت کا دعویٰ بھی صحیح تسلیم ہو گا، پھر تم اللہ کے محبوب بھی بن جاؤ گے، اور اِسی اتباع کے نتیجے میں تمہاری غلطیاں بھی معاف ہو جائیں گی، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اطاعتِ رسول سے منہ موڑنا کفر ہے

اور آپ کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں تو اِن کے پیٹھ پھیرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پھر یہ اللہ کے مُحب بھی نہیں بنیں گے، پھر یہ کافر ٹھہرے، اور اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا، پھر اِن کا یہ دعویٰ کہ ہم اللہ کے محب

پس یہ بے کار ہوگا جب اللہ کو اِن سے محبت نہیں ہے۔ تو یہاں حقیقت کے اعتبار سے تولّی عن اطاعۃ الرسول کا ذکر مقصود ہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت چونکہ لازم ملزوم ہیں، کہ اللہ کی اطاعت کوئی کرنا چاہے تو اُس کا طریقہ یہی ہے کہ رسول کی اطاعت کرے، اگر یہ رسول کی اطاعت نہیں کریں گے اور پیٹھ پھیریں گے تو ایسی صورت میں یہ مؤمن نہیں، بلکہ کافر ہیں، پھر اگر یہ اللہ کی محبت کا دعویٰ بھی کریں تو قابل قبول نہیں، پھر اللہ تعالیٰ ایسے کافروں سے محبت نہیں رکھتا، تو کٰفرین کا لفظ استعمال کرنے سے معلوم ہوگیا کہ اطاعتِ رسول سے منہ موڑنا کفر ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ إِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً

بے شک اللہ نے چن لیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو تمام جہانوں پر ﴿۳۳﴾ یہ اولاد ہے

بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّيْ

بعض بعض کی، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۳۴﴾ قابل ذکر ہے وہ وقت جب کہا عمران کی بیوی نے اے میرے رب! بیشک میں نے

نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ إِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ

نذر مانی تیرے لئے اُس چیز کی جو میرے پیٹ میں ہے اس حال میں کہ وہ آزاد کیا ہوا ہے، پس تو میری طرف سے قبول کرلے، بیشک تو سننے والا ہے

الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّيْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ

جاننے والا ہے ﴿۳۵﴾ جب اُس نے اس کو جنا تو کہنے لگی اے میرے رَبّ! میں نے جنا ہے اس کو لڑکی، اور اللہ تعالیٰ

اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ

خوب جاننے والا ہے اُس چیز کو جو اُس نے جنی، اور نہیں ہے لڑکا لڑکی کی طرح، اور بے شک میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا،

وَإِنِّيْ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا

اور بے شک میں اس لڑکی کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے ﴿۳۶﴾ پس قبول کرلیا اُس لڑکی کو

رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ

اُس کے رب نے اچھی طرح سے قبول کرنا، اور بڑھایا اُس کو اچھی طرح سے بڑھانا، اور ذمہ دار ٹھہرا دیا اُس لڑکی کا زکریا کو،

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ

جب کبھی داخل ہوتے اُس لڑکی پر زکریا حجرے میں تو پاتے اُس کے پاس رزق، کہتے اے مریم! یہ کہاں سے ہے تیرے لئے؟

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا

مریم کہتی کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، بیشک اللہ تعالیٰ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب ﴿۳۷﴾ اسی موقع پر دعا کی

زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿۳۸﴾

زکریا نے اپنے رب سے، کہا اے میرے رب! عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد، بیشک تو دعا سننے والا ہے ﴿۳۸﴾

فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَھُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ

آواز دی اُس کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں، کہ بیشک اللہ بشارت دیتا ہے آپ کو

بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا

یحییٰ کی اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ کی جانب سے ایک کلمے کی، اور سردار ہوگا اور اپنے آپ کو بہت روک کے رکھنے والا ہوگا

وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ

اور نبی ہوگا، شائستہ لوگوں میں سے ہوگا ﴿۳۹﴾ زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے پروردگار! کیونکر ہوگا میرے لئے بیٹا، اور تحقیق مجھے پہنچ چکا

الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ

بڑھاپا اور میری بیوی بھی اولاد کے قابل نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے ہی کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے ﴿۴۰﴾ زکریا نے کہا

رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ

کہ اے میرے رَبّ! میرے لئے کوئی نشانی متعین کر دے، اللہ نے کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو نہیں کلام کر سکے گا لوگوں سے تین دن تک

اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع

مگر اشارے سے، اور یاد کر تو اپنے رَبّ کو بہت زیادہ اور تسبیح بیان کر اُس کی شام اور صبح ﴿۴۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓي اٰدَمَ: بیشک اللہ نے چن لیا آدم کو، وَنُوْحًا: اور نوح کو، وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ: اور

ابراہیم کی اولاد کو، وَاٰلَ عِمْرٰنَ: اور عمران کی اولاد کو، عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: تمام جہانوں پر، علیہم السلام، ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ: یہ اولاد ہے بعض بعض کی، ذُرِّيَّةً بدل ہے اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ اور اٰلَ عِمْرٰنَ سے، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے، اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہا عمران کی بیوی نے۔ عمران دو ہیں، ایک عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں، اور ایک عمران مریم کے والد ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے والد، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہماری اصطلاح کے مطابق، تو امراۃ عمران مریم کی والدہ ہے، اور اِس عمران سے مریم کے والد مراد ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے والد مراد نہیں، جیسے کہ آگے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، ''جبکہ کہا عمران کی بیوی نے'' رَبِّ: اے میرے پروردگار! اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ: بیشک میں نے نذر مانی تیرے لیے، مَا فِيْ بَطْنِيْ: اس چیز کی جو میرے پیٹ میں ہے، مُحَرَّرًا: اس حال میں کہ وہ آزاد کیا ہوا ہے، فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ: پس تو میری طرف سے قبول کر لے، اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: بیشک تو سننے والا ہے جاننے والا ہے، فَلَمَّا وَضَعَتْهَا: جس وقت اُس عمران کی بیوی نے مَا فِي بطن کو جنا۔ ھا ضمیر مَا فِی بطن کی طرف لوٹ رہی ہے، چونکہ جننے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ہے تو اِس حیثیت سے مَا فِی بطن کی طرف ضمیر مؤنث کی لوٹ گئی، ''جب اُس عمران کی بیوی نے جنا اُس ما فی بطن کو''، قَالَتْ: کہنے لگی، رَبِّ: اے میرے پروردگار! اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى: میں نے جنا ہے اُس کو لڑکی، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ: اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے اُس چیز کو جو اُس نے جنی، اُس کی فضیلت کو جاننے والا ہے، اُس کی شان کو جاننے والا ہے، وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى: نہیں ہے لڑکا لڑکی کی طرح، یہاں الذَّکَرُ پر الف لام بھی عہد خارج کا ہے، اور الانثٰی پر جو الف لام ہے یہ بھی عہد خارج کا ہے، یعنی جو لڑکا اُس کو مطلوب تھا وہ اس لڑکی کی طرح نہیں جو اس کو دے دی گئی، بلکہ شان کے لحاظ سے یہ لڑکی زیادہ اعلیٰ اور اولیٰ ثابت ہوگی، وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ: اور بیشک میں نے اِس لڑکی کا نام رکھا مریم، سَمَّيْتُهَا کی ھا ضمیر اُسی انثیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے جو اس نے جنی تھی، وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ: اور بیشک میں اِس لڑکی کو پناہ میں دیتی ہوں تیری، وَذُرِّيَّتَهَا: اور اس کی اولاد کو، مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ: مردود شیطان سے، مِن کے مدخول سے بچنا مقصود ہوتا ہے اور باء کے مجرور کی پناہ میں آنا مقصود ہوتا ہے، ''میں اِس لڑکی کو اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے''، فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا: پس قبول کر لیا اُس لڑکی کو اُس کے رب نے، بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ: اچھی طرح سے قبول کرنا، وَّاَنْۢبَتَهَا: اور پرورش کی اُس کی، اُگایا اس کو، بڑھایا اُس کو، نشوونما کیا اس کو، نَبَاتًا حَسَنًا: اچھی طرح سے نشوونما کرنا، بڑھایا اُس کو اچھی طرح سے بڑھانا، وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا: اور ذمہ دار ٹھہرا دیا اُس لڑکی کا زکریا علیہ السلام کو، کفیل بنا دیا اُس لڑکی کا زکریا کو، كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ: جب کبھی داخل ہوتے اُس لڑکی پر زکریا محراب میں، محراب عمدہ جگہ کو کہتے ہیں، اچھا مکان، یہاں سے حجرہ مراد ہے، ویسے یہ لفظ حرب سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہوتا ہے لڑنا، تو محراب عبادت خانے کے لئے بولا جائے گا بایں معنی کہ وہ نفس اور شیطان سے جنگ کی جگہ ہے، اور عمدہ مکان کے لئے بایں مناسبت بولا جاتا ہے کہ اچھی چیزوں پر لوگوں کا ایک قسم کا تصادم اور مقابلہ ہوتا ہے، وہ بھی گویا کہ لڑائی کی جگہ ہے، تو اس کا معنی عبادت خانہ بھی کیا گیا ہے اور عمدہ حجرہ بھی کیا گیا ہے، ''داخل ہوتے زکریا مریم پر محراب میں''، وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا: تو پاتے اس کے پاس رزق، یہ كُلَّمَا کا جواب ہے كُلَّمَا دَخَلَ وَجَدَ جب بھی داخل ہوتے تو پاتے، اِس میں تکرار پایا جاتا ہے، کہ بار بار آنے جانے کے وقت میں وہ دیکھتے تھے، قَالَ: کہتے، يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا: اے مریم! یہ کہاں سے ہے تیرے لیے، اَنّٰى اَیْنَ کے

معنی میں ہے، مِنْ اَیْنَ لَكِ هٰذَا؟ تیرے لیے یہ کہاں سے ہے؟ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ: مریم کہتی کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ: بیشک اللہ تعالیٰ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِیَّا رَبَّهٗ: اسی موقع پر پکارا زکریا نے اپنے رَبّ کو، هُنَالِكَ: وہیں، اُسی موقع پر، یہ زمان کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے اور مکان کی طرف بھی ہوتا ہے، ''اسی موقع پر'' اس کے مفہوم میں دونوں باتیں داخل ہیں، ''اسی موقع پہ دعا کی زکریا نے اپنے رَبّ سے'' قَالَ رَبِّ: کہا زکریا نے اے میرے رَبّ! هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ: عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے، ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً: پاکیزہ اولاد، اِنَّكَ: بیشک تو، سَمِیْعُ الدُّعَآءِ: دُعا سننے والا ہے۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ: آواز دی اُس زکریا کو فرشتوں نے، وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ: اس حال میں کہ زکریا کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں، اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی: کہ بیشک اللہ بشارت دیتا ہے تجھ کو یحییٰ کی، مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ: اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ کی جانب سے ایک کلمے کی، وَسَیِّدًا: سردار ہوگا، وَّحَصُوْرًا: حَصَرَ: روکنا، حصور مبالغے کا صیغہ ہے شکور کی طرح، اپنے آپ کو بہت روک کے رکھنے والے ہوں گے، اپنے نفس پر بڑا ضبط کرنے والے ہوں گے، خواہشاتِ نفس کو روکنے والے ہوں گے، وَّنَبِیًّا: اور نبی ہوں گے، مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ: عمدہ بہترین شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ: زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے پروردگار! کیونکر ہوگا میرے لیے بیٹا، وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ: اور تحقیق مجھے بڑھاپا پہنچ چکا، وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ: اور میری بیوی بھی اولاد کے قابل نہیں، عاقر کہتے ہیں جو اولاد کے قابل نہ ہو، جس کے لئے اُردو میں بانجھ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے ہی کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً: زکریا نے کہا کہ اے میرے رَبّ! میرے لیے کوئی نشانی متعین کردے، قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا: اللہ نے کہا کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تُو نہیں کلام کر سکے گا لوگوں سے تین دن تک مگر اشارے سے، رَمز اشارہ کرنے کو کہتے ہیں، یعنی اشارے کے ساتھ بات کرسکو گے، زبان سے نہیں کرسکو گے، وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا: اور یاد کر تو اپنے رَبّ کو بہت زیادہ، وَّسَبِّحْ: اور تسبیح بیان کر اُس کی، بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ: شام اور صبح۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

عیسیٰ علیہ السلام کا اِجمالی سلسلۂ نسب اور اس کے ذِکر سے مقصد

''اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ'' اس آیت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے، پہلے حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ہے جہاں سے نسل آدم کی ابتداء ہوئی، اور پھر نوح علیہ السلام کا ذکر ہے جو آدم علیہ السلام کے بعد ایک مرکزی شخصیت ہوئیں، بلکہ اکثر روایاتِ تفسیر کے مطابق یہ آدمِ ثانی ہیں، کہ جب سیلاب آیا تھا تو سارے کے سارے انسان اُس طوفانِ نوح میں غرق ہوگئے تھے، صرف حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے بچے تھے جن کی اولاد اِس دنیا میں پھیلی، تو موجودہ سارے کے سارے انسان جس طرح آدم علیہ السلام کی نسل ہیں اسی طرح ثانوی درجے میں نوح علیہ السلام کی اولاد بھی ہیں۔ اور نوح علیہ السلام کے بعد مرکزی شخصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آئی، حضرت

ابراہیم علیہ السلام نامور شخصیت ہیں جن پر بنی آدم نے اتفاق کیا، اور آئندہ جتنی نبوّت آئی وہ انہی کی اولاد میں آئی، اس لئے یہاں ابراہیم علیہ السلام کا نام لے کر ذکر اصل اعتبار سے آلِ ابراہیم کا کیا گیا، کہ آلِ ابراہیم ہی آگے نبوّت کے حامل بنے ہیں، ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں اللہ نے نبوّت ٹھہرائی، اور ابراہیم علیہ السلام کی نبوت معروف ہی ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں دو شاخیں ہوئیں، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق، اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے آلِ عمران کو اللہ نے ممتاز کیا۔ اِس ''عمران'' سے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد مراد ہوں تو ''آلِ عمران'' کے اندر حضرت ہارون اور موسیٰ دونوں آجائیں گے، یہ بنی اسرائیل میں معروف شخصیتیں گزری ہیں۔ اور اگر اس سے مریم کے والد مراد ہیں تو پھر ان کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا کہ آگے اصل کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ حل کرنا مقصود ہے کہ وہ کس طرح پیدا ہوئے؟ اور اُن کے پیدا ہونے میں اللہ کی قدرت کس طرح نمایاں ہوئی؟ اور وہ اللہ کے بندے یا خدا یا ابن خدا ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے کو چونکہ واضح کرنا ہے تو خصوصیت سے ''آلِ عمران'' کا ذکر کر دیا، پھر اِس ''آلِ عمران'' میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام داخل ہوں گے، ویسے برگزیدہ ہونے میں حضرت مریم کا ذکر بھی ہوگا۔ تو اِن کے ذکر کرنے سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نسلِ آدم سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ اُن کا شجرۂ نسب ہے جس کی موٹی موٹی شخصیات بیان کر دی گئیں، تو جیسے باقی انسان ہیں اور انسانوں کی اِس نسل میں اللہ تعالیٰ نے وقت وقت پر بعض شخصیتوں کو ممتاز کیا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ممتاز کیا، وہ مصطفیٰ تو ہیں، چنے ہوئے تو ہیں، لیکن وہ الٰہ نہیں، اِبنِ الٰہ نہیں، ان کی حیثیت انسان اور بندے سے زیادہ نہیں ہے، سلسلۂ نسب اُن کا یہی ہے، جس طرح باقی انبیاء کا ہے اُسی طرح اِن کا ہے۔ یہ اجمالی طور پر سارے سلسلے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہی سنہری لڑی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے برگزیدہ انسانوں کی چلی آرہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اِسی کے ہی ایک فرد ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ دنیا میں ظاہر ہونے کے اعتبار سے اُن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت باقیوں کے مقابلے میں کچھ عجیب انداز سے نمایاں ہوئی، لیکن بہرحال وہ آدمیوں کی فہرست سے باہر نہیں ہیں، آدم علیہ السلام کی نسل ہیں، نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، آلِ ابراہیم میں سے ہیں، آلِ عمران میں سے ہیں، یہی اُن کا شجرۂ نسب ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک انسان ہیں، آدم زاد ہیں، اور اُن کے اندر کوئی اُلوہیت یا اُلوہیت کے ساتھ کوئی دوسرا تعلق جس کو اِبنیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ نہیں پایا جاتا۔

سیدہ مریم کی والدہ کی نذر

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ: اس ''عمران'' سے متعین طور پر حضرت مریم کے والد مراد ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا، اور ''امراۃِ عمران'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ہوئیں۔ یہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے اپنے اُس زمانے کی شریعت کے مطابق نذر مانی، کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اس کو اللہ کے لئے آزاد کر دوں گی۔ اُس زمانے میں اس قسم کی نذر مانی جاتی تھی، ''اللہ کے لئے آزاد کر دوں گی'' کا مطلب یہ ہے کہ صرف مذہب کے لئے ہوگا، دِین کی خدمت کرے گا، بیت المقدس کا مجاور ہوگا، میں اس سے اپنی خدمت نہیں لوں گی، گھر کا کام کاج نہیں کراؤں گی، جس طرح اولاد سے انسان دُنیا کمانے کا کام لیتا

ہے، اپنے لیے رزق مہیا کرنے کے لیے اس کو واسطہ بناتا ہے، میں اس قسم کا کوئی کام نہیں لوں گی، اس بچے کو ہیکل کی خدمت کے لئے یعنی عبادت خانے کی خدمت کے لئے چھوڑ دوں گی، مُحَرَّرًا کا یہ معنی ہے، آزاد کر دوں گی، اپنی خدمت کے لئے اس کو نہیں رکھوں گی، گھر کے کام کاج کے لئے نہیں رکھوں گی، بلکہ وہ اللہ کے دین کے لئے وقف ہوگا اور بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف ہوگا، بیت المقدس کا مجاور ہوگا، فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ: تو اس کو میری طرف سے قبول کر لے۔ تو گویا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی ولادت کا ذکر کیا جارہا ہے، کہ مریم کی والدہ کے کیسے جذبات تھے، اور ابتداء سے ہی اُس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے اور خانۂ خدا کی خدمت کے لئے اُنہوں نے مان لیا تھا۔ اور مریم کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اُلوہیت میں شریک ہیں، ''ثالث ثلاثہ'' جو کہتے تھے کہ اللہ تین میں ایک ہے، تو باقی دو میں کوئی تو عیسیٰ کے ساتھ جبریل کو شمار کرتا ہے، اور کوئی عیسیٰ کے ساتھ مریم کو شمار کرتا ہے، اور یہاں جب مریم کی ولادت کا تذکرہ آ گیا کہ وہ تو پیدا ہی ایسے جذبات کے تحت ہوئی کہ ان کی والدہ نے پہلے ہی نذر مانی تھی کہ وہ اللہ کی عبادت کرے گا، اللہ تعالیٰ کے گھر کی خدمت کرے گا، اُس کا نظریہ یہ تھا کہ جو بچہ میرے بطن سے پیدا ہوگا وہ اس کام کے لئے رکھا جائے گا، وہ تو اللہ کی حکمت تھی کہ لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوگئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کے رواج کے خلاف اِس مریم کو بھی بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کر لیا۔ تو سارے خاندان کی بنیاد ہی عبدیت پر ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی پر ہے، اللہ تعالیٰ کے گھر کی خدمت پر ہے۔ فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ: پس تو میری طرف سے اس کو قبول کر لے، بے شک تُو سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

سیّدہ مریم کی پیدائش پر اُن کی والدہ کا تأثر اور دُعا

اُن کا خیال یہ تھا کہ لڑکا پیدا ہوگا اور اُس کو میں دین کے لئے اس طرح سے وقف کر دوں گی، فَلَمَّا وَضَعَتْهَا: لیکن جب اُس حمل کو جَنا، وضع حمل ہوا، تو وہ لڑکی تھی، تو لڑکی کو دیکھ کر اُن کے اندر ایک قسم کا احساسِ کہتری اُبھرا، کہ میں تو لڑکا سمجھ رہی تھی، کہ لڑکا پیدا ہوگا اور اس کو دین کی خدمت کے لئے چھوڑ دوں گی، کہنے لگی کہ اے اللہ! میں نے تو اِس کو لڑکی جَن دیا۔ یہ ایک تعجب کے اظہار کے طور پر ہے، نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ کو اِطلاع نہیں دی جارہی کہ اللہ کو پتہ نہ ہو، جیسے ہم کہتے ہیں ''یہ کیا ہوگیا؟ میں تو یوں سمجھا تھا، یہ ایسے ہوگیا'' یہ ایک قسم کے تعجب کا اظہار ہے۔ اور آگے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۚ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى: یہاں تک درمیان میں جملہ معترضہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا اُس لڑکی کی شان کو جو اِس نے جنی ہے، اور جو لڑکا مطلوب تھا وہ اِس لڑکی کی طرح نہیں جو دے دی گئی، یعنی اس لڑکی کی شان لڑکوں سے بھی زیادہ ممتاز ہوگی، جب یوں ذکر کیا جائے لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى تو جو ''کاف'' کا مجرور ہوتا ہے اُس کو فضیلت دینا مقصود ہوتا ہے اُس کے اسم پر، تو ''ذَکَر'' مفضول ہوگیا، اور ''اُنثیٰ'' کو فضیلت ہوگئی، مطلب یہ ہوگا کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں بلکہ لڑکی افضل ہے، یہ ہم نے جو لڑکی دی ہے اس کی شان اُس لڑکے کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہوگی جو اِس کے بطن سے پیدا ہوتا۔ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ: یہ پھر امرأۃِ عمران کا قول ہے کہ میں نے اس کا نام ''مریم'' رکھا ہے، اور ''مریم'' کا لفظ سریانی زبان میں ''عابدہ'' کے معنی میں ہے، یعنی نام بھی اس کا ایسا رکھا جس میں اُس کی عبدیت

کی طرف اشارہ ہے، ''مریم'' کا معنی عابدہ، عبادت گزار، عبادت کرنے والی۔ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ: میں اِس لڑکی کو اور اِس کی اولاد کو جب کبھی ہوگی، میں اِس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطانِ رجیم سے، کہ شیطانِ رجیم کے اثرات سے اِس کو بچا کے رکھنا، جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق مختلف قسم کی دُعا کیا کرتے ہیں تو مریم کی والدہ نے بھی جب مریم کو جنا تھا اُسی وقت دُعا کی کہ اے اللہ! اِس کو اور اِس کی اولاد کو شیطانِ رجیم کے اثرات سے بچانا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو بچّہ بھی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو کچوکا لگاتا ہے، اور اس کچوکے کا اثر ہے کہ بچّہ دُنیا میں آتے ہی پہلے چیختا ہے، جب بچّہ باہر آتا ہے تو سب سے پہلا کام یہی کرتا ہے کہ روتا ہے چیختا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بچّے کی چیخ اسی وقت نکلتی ہے جب شیطان جا کے اس کو کچوکا لگاتا ہے، اس طرح سے اس کے ساتھ ربط قائم کرتا ہے، کیونکہ اب وہ اس دُنیا میں آ گیا، جس کے بعد شیطان نے اُس کو شکار کرنے کی کوشش کرنی ہے، ''غَیْرَ مَرْیَمَ وَابْنِهَا'' صرف مریم اور مریم کا بیٹا اِس سے بچا ہے۔[1] تو ممکن ہے اولاد کے لئے انہوں نے دُعا متصل ہی کی ہو اور اُس وقت تک شیطان نے مریم کو ابھی نہیں چھیڑا تھا، کچوکا نہیں لگایا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو پھر بہت بعد میں پیدا ہوئے، تو اِن کے پیدا ہونے کے بعد بھی شیطان نے انہیں کچوکا نہیں لگایا۔ تو مریم کی ماں کی یہ دُعا قبول ہوئی کہ شیطان کا جو ابتدائی اثر ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس سے بھی اِن کو محفوظ رکھا۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ: قبول کرلیا اُس لڑکی کو اُس کے رب نے اچھی طرح سے قبول کرنا، وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا: اور اُس کی اچھی طرح سے پرورش کی، اُس کو بڑھایا، اگایا، نشوونما کیا اچھی طرح سے نشوونما کرنا، صحت وعافیت کے ساتھ، بہت اچھی صلاحیتوں کے ساتھ وہ لڑکی نشوونما پائی۔

سیّدہ مریم کی کفالت کا واقعہ

وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا: اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس بچّی کو یعنی مریم کو لے کر اُس کی والدہ بیت المقدس میں جو مجاور تھے اُن کے پاس گئی، اور وہ حضرت زکریا علیہ السلام کا دور تھا، یعنی بڑے اُس وقت اُن میں یہی تھے، اس لڑکی کو لے جا کر پیش کیا کہ میں نے یہ اللہ کے لئے نذر مانی تھی، آپ اِس کو لے لیجئے، میں تو اب اِس کو اپنے گھر میں نہیں رکھتی، اگرچہ رواج یہ تھا کہ لڑکیوں کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول نہیں کیا جاتا تھا، لیکن اُس وقت کے جو لوگ اہلِ حق موجود تھے جن میں یہ نبی بھی تھے یعنی حضرت زکریا، اِنہوں نے اِس کو قبول کرلیا، تو گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ قبولیت اِن کا خاصہ تھی، ورنہ اس سے پہلے کوئی لڑکی اس طرح سے بیت المقدس کے لئے نہیں لی گئی، تو تَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ کے تحت وہ لڑکی ان کو قبول ہوگئی اور انہوں نے وصول کرلی۔ اور جو مجاور وہاں بیٹھے تھے اب اُن کے اندر آپس میں جھگڑا ہوگیا کہ اس بچّی کو کون اپنے پاس رکھے گا اور اس کی تربیت کون کرے گا؟ جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے قرعہ اندازی کی نوبت آگئی، آپ کے سامنے چند آیات کے بعد آئے گا اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ: اپنی قلمیں ڈال رہے تھے تاکہ معلوم کرلیں کہ مریم کا کفیل کون بنتا ہے؟ اور یہ قلمیں قرعہ اندازی کے لئے ڈال رہے

(۱) بخاری، ۲/۴۸۸، باب قول اللہ تعالیٰ واذکر فی الکتب مریم۔ ۲/۶۵۲، کتاب التفسیر۔ سورۃ آل عمران/ مشکوۃ ۱۸/۱، باب الوسوسہ فصل اول۔

تھے، قرآنِ کریم میں تو الفاظ اتنے ہی ہیں کہ وہ قلمیں ڈال رہے تھے کہ کس کا قرعہ نکلے گا، جس کا قرعہ نکلے گا وہ مریم کو سنبھال لے گا، تفسیری روایات کے اندر ہے کہ اُنہوں نے قرعہ اندازی کی یہ صورت تجویز کی کہ بہتے ہوئے پانی میں قلمیں ڈال دیں جن قلموں کے ساتھ وہ توراۃ وغیرہ لکھتے تھے، کہ جس کی قلم مخالف جانب کو چلی جائے وہ مریم کا کفیل بنے گا، جب بہتے پانی میں قلمیں ڈالی گئیں تو حضرت زکریا کی قلم مخالف سمت کو ہوگئی، تو یہ بھی گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک معجزہ یا کرامت کہہ لیجئے جو حضرت زکریا کے ہاتھ پر نمایاں ہوئی، کہ اُن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مریم کا کفیل بنا دیا، اُن کی قلم جانبِ مخالف کو بہہ گئی، اِس کا ذکر قرآن میں نہیں، یہ تفسیری روایات میں ہے، قرآنِ کریم میں تو صرف یہی ہے کہ انہوں نے اپنی قلمیں ڈالیں تا کہ دیکھیں کہ مریم کا کفیل کون بنتا ہے، یہ قرعہ اندازی کی ایک صورت تھی، تفسیری روایات میں ہے کہ جاری پانی کے اندر قلمیں ڈالی تھیں کہ جس کی قلم مخالف سمت کو چلی جائے گی اُس کو مریم کا کفیل بنا دیا جائے گا، حضرت زکریا کی قلم مخالف سمت کو چلی گئی اور وہی کفیل بن گئے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قبولیت تھی کہ اُس وقت کے سب سے بڑے شخص کو جو نبی تھا، اور اُن کی زبان میں جو کاہنِ اعظم تھا (وہ "عالم" کو اُس وقت "کاہن" کہا کرتے تھے، تو "کاہنِ اعظم" کا لفظ کتابوں کے اندر آتا ہے اُن کی اِصطلاح کے مطابق) حضرت زکریا اُس وقت کے کاہنِ اعظم تھے یعنی سب سے بڑے عالم تھے، اُن کی تربیت میں حضرت مریم دے دی گئیں۔

سیّدہ مریم کی کرامت

اگلے الفاظ سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت زکریا نے مریم کے لئے کوئی حجرہ مخصوص کر دیا جس میں اُن کو ٹھہرا دیا، حضرت مریم وہیں رہتی تھیں، اور وہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگی رہتیں، چونکہ اُن کا کام اور مشغلہ یہی تھا، کسی اور کام کی طرف تو ان کو لگانا ہی نہیں تھا، جب وہ باہوش وحواس ہوگئیں تو وہیں اُس زمانے کے رواج کے مطابق اللہ اللہ کرتیں، اللہ تعالیٰ کو یاد کرتی تھیں، نماز پڑھتی تھیں، حضرت زکریا علیہ السلام اِن کے کفیل تھے، جب وہ کہیں باہر جاتے تو باہر سے تالا لگا جاتے، اور پھر دوسرے وقت میں آتے تو آ کر حضرت مریم کا حال احوال دیکھتے۔ اسی وقت حضرت مریم کی کرامات ظاہر ہونی شروع ہوگئیں، کہ حضرت زکریا جس وقت آتے تو حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل پڑے ہوئے دیکھتے، جن کا موسم بھی نہ ہوتا اور کسی کے آنے جانے کا سوال ہی نہیں تھا، چونکہ باہر سے وہ دروازہ بند کر کے جاتے تھے، جب آتے تو نئی نئی چیزیں مریم کے پاس دیکھتے۔

معجزہ اور کرامت دراصل فعلِ خداوندی ہوتا ہے!

یہ مریم علیہا السلام کی کرامت تھی، اور کرامت کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ کسی نیک آدمی کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا برتاؤ ایسا ہوجائے جو عام عادت کے مطابق نہیں ہے، اس لئے ایسے واقعات کو "خرقِ عادت" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، "خرقِ عادت" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت کچھ اور ہے، اور اِس عادت کو چھوڑ کر کوئی نیا واقعہ پیش آجائے۔ جس کے ہاتھ پر اس قسم کا واقعہ پیش آئے اگر وہ مدعیٔ نبوّت ہے تو اُس کو "معجزہ" کہتے ہیں، اور اگر وہ مدعیٔ نبوّت تو نہیں ہے لیکن کسی نبی کا متبع ہے، شریعت کا پابند ہے، نیک آدمی ہے، صالح ہے، اُس کے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آجائے تو اُس کو "کرامت" کہا جاتا ہے۔ "کرامت" ہو یا

''معجزہ'' دونوں کی حقیقت ایک ہے کہ یہ فعلِ خداوندی ہوتا ہے اور کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اس لئے کرامت میں ولی کی قدرت دخیل نہیں ہوتی، اور معجزے میں نبی کا اختیار دخیل نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے، دونوں کی حقیقت ایک ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے ساتھ وہ واقعہ پیش آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معجزات اور کرامات انبیاء اور اولیاء کے اختیار کی دلیل نہیں ہیں، کیونکہ یہ اُن کے اختیار میں نہیں ہوتے کہ جب چاہیں کرامت دکھادیں اور جب چاہیں معجزہ نمایاں کردیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز دی جاتی ہے تو لوگوں کے سامنے نمایاں ہوتی ہے، ورنہ نبی اور ولی کے اختیار کی بات نہیں۔ قرآنِ کریم کی بیسیوں آیات میں اس قسم کی بات ظاہر کی گئی ہے، کہ لوگ نبی سے معجزہ مانگتے تھے لیکن نبی یہی جواب دیتا ہے کہ میں اس قسم کے اختیار نہیں رکھتا، جب اللہ چاہے گا تو تمہیں کوئی معجزہ دکھادے گا، کوئی نشانی واضح کردے گا، میرے بس کی بات نہیں ہے، ہر نبی کی طرف سے جواب یہی ہوتا ہے۔ اور کرامت کی بھی یہی حقیقت ہے۔ اس لئے کرامت کے واقعات یا معجزات کے واقعات نبی اور ولی کی قدرت یا اُن کے اختیار کی دلیل نہیں ہیں۔

معجزہ یا کرامت کے طور پر کس قسم کا واقعہ ظاہر ہوسکتا ہے؟

اور جو چیز عقلاً ممکن ہو اور شرعاً اُس میں کسی قسم کا امتناع نہ ہو، ہر ایسا واقعہ معجزہ یا کرامت کے ساتھ نمایاں ہوسکتا ہے، جو چیز معجزے کے طور پر واقع ہوسکتی ہے وہی چیز کرامت کے طور پر بھی واقع ہوسکتی ہے۔ ہاں! البتہ جس چیز میں عقلی امتناع ہے وہ نہیں واقع ہوسکتی، نہ معجزے کے طور پر نہ کرامت کے طور پر، اور اسی طرح جس میں شرعی امتناع آجائے کہ شرعاً یہ چیز ممکن نہیں ہے، شریعت نے اعلان کردیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا، تو ایسی چیز بھی نہ بطور معجزے کے آسکتی ہے نہ بطور کرامت کے آسکتی ہے۔ مثلاً شرعی امتناع اِس میں آگیا کہ کوئی شخص کرامت کے طور پر ہی اس کتاب کی مثل لے آئے، اللہ تعالیٰ نے اعلان کردیا کہ اس کتاب کی مثل کوئی نہیں لاسکتا، تو نہ کسی کی کرامت کے طور پر اس کی مثل وجود میں آسکتی ہے نہ کسی اور طریقے سے، کیونکہ اِس کے ساتھ تحدی کردی گئی کہ ایسی کوئی کتاب لے آؤ تو ہم کہیں گے کہ یہ انسانی کلام ہے اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے، اب کرامت کے طور پر بھی کوئی ولی اس قسم کی کتاب نہیں بناسکتا جو قرآنِ کریم کے مماثل ہو۔ باقی جس قسم کے واقعات معجزے کے طور پر ہوئے ہیں اُسی قسم کے واقعات کرامت کے طور پر بھی ظاہر ہوسکتے ہیں، اِس میں کوئی بُعد نہیں ہے۔ جب کرامت کی حقیقت یہ ہوگئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ واقع ہوتی ہے، اور بندے کی قدرت اُس میں دخیل نہیں ہوتی، تو جب کسی واقعہ کو کسی ولی کی کرامت کے طور پر ذکر کیا جائے، کہ یہ فلاں ولی کی کرامت ہے اور ایسا واقعہ پیش آگیا، تو ظاہری طور پر آپ کو کتنا ہی خلافِ اسباب کیوں نہ نظر آئے، اگر اُس واقعہ کی سند صحیح ہے اور اُس کے نقل کرنے والے معتبر لوگ ہیں، ایسے ہی لوگوں نے کوئی جھوٹے قصے کہانیاں نہیں بنالیے، بلکہ اہلِ علم کی وساطت سے واقعہ آیا، معتبر کتب کے اندر مذکور ہے، یا اہلِ حق علماء اُس واقعہ کو ذکر کرتے آرہے ہیں، اِس قسم کے واقعات کے تسلیم کرنے سے انسان کے ذہن میں کوئی اِباء اور انکار نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ واقعہ براہِ راست اللہ کی قدرت سے صادر ہوتا ہے، بندے کی قدرت اُس میں دخیل نہیں ہوتی، اگر ہزاروں واقعات کسی ولی کے ثابت ہوجائیں تو بھی اُس کی عبدیت میں فرق نہیں

آتا، چونکہ عقیدہ اِس میں یہی ہوتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ کسی بندے کو عزت دینے کے لئے اُس کی طرف نسبت کر کے اِس قسم کے واقعہ کو ظاہر کر دیں۔

سیّد احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات آپ کے سامنے آرہے ہیں کہ وہ اندھوں کو دُرست کر دیا کرتے تھے، اور کوڑی صحت یاب ہو جاتے تھے۔ اب ایک واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا سیّد احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا، یہ وقت کے بہت بڑے ولی تھے، کہ اُن کے پاس ایک بڑھیا اپنے نابینا بچے کو لے کر گئی، اور کہنے لگی کہ میرے بچے کو سوانکھا کر دو۔ تو حضرت فرمانے لگے کہ میں کوئی عیسیٰ ہوں جو اِس کو ٹھیک کر دوں؟ اُس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو یہ انکار کر کے اُس مجلس سے اُٹھ کر چل دیئے، یہ کہتے ہوئے کہ میں کوئی عیسیٰ ہوں جو اس کو ٹھیک کر دوں؟ تھوڑی دیر کے بعد واپس آرہے ہیں اور زبان پر یہ الفاظ ہیں کہ مامی کنیم، مامی کنیم، مامی کنیم، اور آکر بچے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور بچہ ٹھیک ہو گیا۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوا کہ ابھی ابھی تو انکار کر رہے تھے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا، میں کوئی عیسیٰ ہوں جو کر دوں؟ اور اب زبان پر ''مامی کنیم، مامی کنیم'' کے الفاظ جاری ہیں تو اِس کا کیا مطلب؟ مریدوں میں سے بعض نے یہ سوال کر لیا تو حضرت نے فرمایا کہ میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کے چلا گیا تھا تنگ ہو کے، کہ یہ میری قدرت اور طاقت میں نہیں، میں کوئی عیسیٰ ہوں جو کر دوں؟ پھر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ نہ عیسیٰ کر سکتا ہے نہ تو کر سکتا ہے، جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں، جاؤ جا کر اُس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرو، جس طرح ہم نے عیسیٰ کے ہاتھ میں برکت رکھی تھی کہ اُس کی وجہ سے بینائی ٹھیک ہو جاتی تھی تو یہاں بھی ہم کر دیں گے، تو ''مامی کنیم'' یہ اللہ کا قول تھا جو وہ نقل کرتے ہوئے آرہے تھے، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کرتے ہیں تم نہیں کر سکتے، سننے والا سمجھا کہ شاید یہ اپنے متعلق کہہ رہے ہیں، لیکن جب انہوں نے وضاحت فرمائی تو حاصل اُس کا یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم کرتے ہیں، تم کون ہو کرنے والے، عیسیٰ کے ہاتھ میں بھی شفا ہم نے رکھی تھی، اور تیرے ہاتھ میں بھی شفا ہم دیں گے۔(1) تو اصل حقیقت یہی ہوا کرتی ہے۔

اس لیے اب اس قسم کا واقعہ اگر صحیح سند کے ساتھ مذکور ہو ہمیں تو ماننے میں کوئی انکار نہیں، کیونکہ جب ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی قدرت کے ساتھ ظاہر ہوا، اللہ چاہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں شفا دے دے، اللہ چاہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں بھی شفا نہ رکھے، اور اگر اللہ چاہے تو کسی دوسرے مقبول بندے کے ہاتھ میں شفا رکھ دے، کہ اُس کے ہاتھ پھیرنے سے برکت ہو جائے اور مریض ٹھیک ہو جائے، جب اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے تو واقعہ پیش آجانے کے بعد، بشرطیکہ وہ صحیح سند کے ساتھ منقول ہو، ہمیں تو اِس قسم کے واقعات کوئی توحید کے خلاف معلوم نہیں ہوتے۔ اسی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کا معجزہ آپ کے سامنے ہے، کہ تھوڑے سے وقت میں اللہ تعالیٰ اُن کو کہاں کہاں لے گیا، کتنا لمبا سفر کروا دیا، کیسی کیسی معلومات دے دیں، اسی طرح اگر کسی ولی کے متعلق اس قسم کا واقعہ آجائے کہ وہ تھوڑے سے وقت میں یہاں سے وہاں پہنچ گئے اور وہاں سے یہ کام کر کے واپس آگئے، اس

---

(1) ملفوظات حکیم الامت ج ۱۸ ص ۱۷۰ / ارواح ثلاثہ ص ۱۲۶، حکایت ۲۱۱ / نفحات الانس مترجم ص ۳۲۸ بعنوان شیخ الاسلام احمد النامقی الجامی رقم: ۴۲۶۔

قسم کا واقعہ اگر کسی صحیح ولی کا کسی صحیح سند کے ساتھ مذکور ہو تو ہمیں اُس کے تسلیم کرنے میں کوئی بُعد نہیں ہے، کیونکہ جب ہم اس کو ''کرامت'' کہتے ہیں تو ''کرامت'' کا تو مطلب یہی ہے کہ بندے کے اختیار میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سب اللہ کی جانب سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، جیسے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر وہ معجزات ظاہر کرتا ہے اِسی طرح اولیاء کے ہاتھ پر وہ کرامت ظاہر کرتا ہے، ''معجزات'' انبیاء علیہم السلام کے بااختیار ہونے کی دلیل نہیں، اور ''کرامات'' اولیاء اللہ کے اللہ کی اُلوہیت میں شریک ہونے کی کوئی دلیل نہیں، جب عنوان معجزے یا کرامت کا آ گیا تو بندے کا اختیار ختم ہو گیا۔

یہ میں نے ایسے ہی مثال کے طور پر بات عرض کر دی، ورنہ عقیدہ اصل میں یہی ہے، کہ کراماتِ اولیاء برحق ہیں، ایسے واقعات جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عام عادت کے خلاف ہوں وہ اولیاء اللہ کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں، لیکن اس میں اولیاء اللہ کی قدرت اور طاقت اور اُن کے عزم اور قصد کا دخل نہیں ہوتا، براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ کرامت اور شرافت اُنہیں دی جاتی ہے کہ اُن کے ہاتھ پر ایسا واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے جو عام آدمیوں سے نہیں ہو سکتا، لیکن اُس میں چونکہ ولی کا اختیار کوئی نہیں ہوتا بلکہ براہِ راست قدرت سے صادر ہوتا ہے، لہٰذا اُس کے ماننے میں کوئی بُعد نہیں ہونا چاہیے، جیسے واقعات انبیاء علیہم السلام سے بطور معجزے کے صادر ہو سکتے ہیں اسی قسم کے واقعات اولیاء اللہ سے بطور کرامت کے صادر ہو سکتے ہیں، اجمالی عقیدہ یہی ہے۔

باقی! اگر کوئی واقعہ بیان کرے کہ فلاں ولی کے ہاتھ پر ایسا ہو گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ واقعی وہ ولی اہلِ حق کے نزدیک ولی ہے، اور پھر اس کے نقل کرنے والے واقعی اہلِ علم اور اچھے لوگ ہیں، اگر یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں تو تسلیم کرنے میں انسان کو کوئی انکار نہیں ہونا چاہیے، اور اِس واقعہ کا تسلیم کرنا توحید کے عقیدے کے ساتھ بالکل نہیں ٹکراتا جبکہ عقیدے میں یہ بات آ گئی کہ یہاں اصل اللہ کی قدرت کا دخل ہے، بندے کے اختیار میں کچھ نہیں، نہ معجزات سے انبیاء میں اُلوہیت ثابت ہوتی ہے، نہ کرامات سے اولیاء میں اُلوہیت ثابت ہوتی ہے، ہاں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ربط اور تعلق معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن کے ہاتھ پر اِس قسم کے واقعات ظاہر کر کے لوگوں کے اندر ان کی کرامت اور شرافت کو نمایاں کر دیا گیا۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت

یہ حضرت مریم کی کرامت تھی، اور ایسی ہی کرامت بخاری شریف میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی آتی ہے، جو مشرکوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے تھے، صحیح بخاری میں روایات موجود ہیں[1] کہ جب وہ مشرکوں کے ہاں بندھے ہوئے تھے، جس کے گھر میں بندھے ہوئے تھے اُس کی لڑکی یہ کہتی ہے، (یہ اُس کی بات ہے اور بخاری میں ہے) کہ ہم نے خبیب کے پاس ایسے موسم میں انگوروں کے تازہ بتازہ خوشے دیکھے جس وقت سارے مکہ میں کہیں یہ پھل موجود نہیں تھا، اور وہ اندر بندھے ہوئے تھے، باہر آ جا بھی نہیں سکتے تھے، تو یہ رزق تھا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُن کو پہنچتا تھا۔ تو جیسی کرامت یہاں حضرت مریم کی قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی ہے، بالکل بعینہٖ ایسی کرامت بخاری شریف میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی نقل کی گئی۔

(۱) بخاری، ۱/ ۴۲۸ باب هل يستاسر الرجل الخ۔ ۲/ ۵۸۵ باب غزوة الرجيع۔ نیز/ ۵۶۸۔ وہ لڑکی حارث بن عامر کی بیٹی تھی، اور حارث بدر میں قتل ہوا تھا۔

اس لیے اگر کسی ولی کے متعلق اس قسم کی بات سن لیں کہ اُس کو حجرے کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی اس قسم کے فروٹ پہنچ جاتے تھے، پھل پہنچ جاتے تھے، اللہ کی طرف سے رزق پہنچ جاتا تھا، ہمیں تو اِس کے قبول کرنے میں بھی کوئی کسی قسم کا بُعد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولیاء اللہ اور مقبول بندوں کے ساتھ اس قسم کے معاملات ہوتے رہتے ہیں، تو کرامات اولیاء برحق ہونے کا یہی معنی ہے، اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ ایسے واقعات جو عام عادت کے خلاف ہیں، عام لوگوں کی طاقت سے ظاہری اسباب کے خلاف ہیں، اور ظاہری اسباب کے طور عام لوگ اُن کو نہیں کر سکتے، اللہ تبارک وتعالیٰ ظاہری اسباب کے خلاف کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر اس قسم کا واقعہ ظاہر کر دے تو ایسا ہوسکتا ہے، اور ہو سکنے کے ساتھ ساتھ ایسے واقعات ہیں جو صحیح سند کے ساتھ منقول ہیں، اور اُن کا تسلیم کرنا اہل سنت والجماعت کے عقیدے میں شامل ہے۔

آیتِ بالا کی دُوسری تفسیر

تو "رزق" سے حسی رزق بھی مراد لیا گیا ہے، اور میری یہ ساری تقریر اسی پہ مبنی ہے۔ اور دُوسری تفسیر بھی کی گئی ہے کہ "رزق" سے یہاں رُوحانی رزق مراد ہے، کہ حضرت زکریا جب جاتے، اور جا کر مریم کے پاس بیٹھتے، اُن کا حال احوال لیتے، تو اُن سے عجیب وغریب قسم کی علم ومعرفت کی باتیں ظاہر ہوتیں، ظاہری طور پر انہوں نے نہ کسی سے پڑھا ہوتا، اور نہ وہ باتیں کتابوں میں موجود ہوتیں، بڑی علم وحکمت کی باتیں کرتی تھیں، تو حضرت زکریا تعجب کے طور پوچھتے کہ مریم! تیرے پاس یہ علوم کہاں سے آگئے؟ ایسی باتیں تجھے کہاں سے مل گئیں؟ یہ سوال بطورِ اظہارِ تعجب کے ہے، ورنہ پتہ تو تھا کہ سب کچھ من جانب اللہ ہے، جیسے آپ میں سے کوئی شخص اچھے اچھے نکتے واضح کرے تو ہم کہتے ہیں کہ تجھے یہ کمال کہاں سے حاصل ہوگیا، ایسا سوال بطورِ تعجب کے ہوا کرتا ہے۔ تو پھر حضرت زکریا کے سوال کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ روحانی علوم، یہ معارف، اور یہ نکات تجھے کہاں سے حاصل ہوگئے؟ وہ کہنے لگیں سب اللہ کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ براہِ راست دماغ میں ڈالتے ہیں۔

زکریا علیہ السلام کے دِل میں دُعا کا داعیہ کیسے پیدا ہوا؟

پھر حضرت زکریا علیہ السلام نے جو آگے دعا کی ہے اِس دعا کا داعیہ کس طرح پیدا ہوا؟ حضرت زکریا علیہ السلام کی اولاد نہیں تھی اور خود بوڑھے ہو چکے تھے، اور اُن کی بیوی بھی اولاد کے قابل نہیں تھی، اس موقع پر حضرت زکریا علیہ السلام کی توجہ ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے کہ اے اللہ! مجھے اولاد دے، یہ داعیہ کیوں پیدا ہوا؟ اگر تو رزق سے مادّی اور حسی رزق مراد ہے کہ بے موسم میوے ملتے تھے، تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ذہن اِدھر گیا کہ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ مریم کو بے موسم پھل دیتے ہیں اسی طرح میں بھی اگرچہ اولاد کے قابل نہیں رہا، اور بیوی کا موسم بھی گزر گیا جس موسم میں اولاد ہوتی ہے، لیکن اِس وقت میں اللہ کی خاص عادت معلوم ہوتی ہے بے موسم پھل دینے کی، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلا دیا کہ جیسے تُو نے بے موقع پھل مریم کو دیا ہے اسی طرح چاہے ظاہری طور پر اُس کا موسم گزر گیا لیکن تیری قدرت میں داخل ہے، اور مریم کو اس بے موقع پھل دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس وقت تیری عادت ہے کہ تو بے موقع دے دیتا ہے، تو ہمیں بھی بے موقع اولاد دے دے، اِس

بوڑھے کی تمنا بھی پوری ہو جائے، اور اس بانجھ عورت کی گود بھی ہری ہو جائے، اس طرح داعیہ پیدا ہوا حضرت زکریا علیہ السلام کے دُعا کرنے کا۔ اگر رزق سے مادّی رزق مراد لیا جائے تو پھر اس دُعا کا ربط اس طرح سے ہو جائے گا۔ اور اگر اِس رزق سے روحانی رزق مراد لیا جائے کہ حضرت مریم کی گفتگو سن کر اُس موقع پر حضرت زکریا علیہ السلام نے دُعا کی، تو پھر داعیہ اس طرح پیدا ہوگا کہ جب دیکھا کہ مریم کیسی اچھی باتیں کرتی ہے، اس کے پاس کیسے کیسے علوم وفنون ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نیک اولاد دے جو اسی طرح عالم بنے، اور آگے علم کی نشر واشاعت کرے، تو اس نیک بچی کو دیکھ کر نیک اولاد حاصل کرنے کا جذبہ اُبھر آیا، تاکہ میرے گھر میں بھی اس قسم کا بچہ پیدا ہو جائے اور وہ بھی نبوت کے علوم کا حامل ہو، ہمارا وارث بنے، آئندہ کے لئے دین کی اشاعت کرے، پھر ربط اس طرح سے ہو جائے گا۔ جیسے آپ کسی کے بچے کو دیکھیں کہ بڑا اچھا قرآن پڑھتا ہے تو آپ کے دل میں آئے گا کہ اللہ ہمیں بچہ دے تو ہم بھی قرآن پڑھائیں، وہ بھی اسی طرح قرآن پڑھے گا، یوں بھی داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا: زکریا علیہ السلام اُس کے پاس رزق پاتے، پوچھتے اے مریم! تیرے لیے یہ کہاں سے ہے؟ وہ کہتیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: یہ جملہ حضرت مریم کا قول بھی ہو سکتا ہے، اور براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے، اس میں بھی دونوں صورتیں ہیں، یا تو مریم نے کہا کہ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دے دیتا ہے، یا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دے دیتا ہے۔ ”اِسی موقع پر زکریا نے دعا کی اپنے رَبّ سے، کہ اے میرے رَبّ! مجھے اپنے پاس سے“ مِنْ لَّدُنْكَ کے لفظ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ ظاہری اسباب میرے پاس نہیں ہیں، جیسے سورۂ مریم کی ابتداء میں آئے گا کہ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا، کہ میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور میرا سر بھی سفیدی کے ساتھ بھڑک اُٹھا، مطلب یہ تھا کہ اب اولاد کا موقع نہیں ہے، لیکن ظاہری اسباب کے خلاف محض اپنی قدرت سے مجھے بھی تو پاکیزہ اولاد عطا کر، اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ: بیشک تُو دُعا کو سننے والا ہے۔

یحییٰ علیہ السلام کی بشارت اور اُن کی صفات

وہ دُعا کچھ ایسے انداز سے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگئی، ”فرشتے نے آواز دی اس حال میں کہ زکریا محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، کہ اللہ تعالیٰ تجھے بشارت دیتا ہے یحییٰ کی“، اب لفظ ”یحییٰ“ سے اشارہ اس بات کی طرف بھی ہو گیا کہ لڑکا ہوگا، اور اُس کا نام بھی پہلے ہی رکھ دیا گیا، یعنی لڑکا ہوگا جس کا نام یحییٰ رکھا جائے گا۔ یحییٰ کی بشارت دیتا ہے اور اُس کی یہ صفات ہوں گی، پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک کلمے کی وہ تصدیق کرے گا، کلمے کا مصداق یہاں عیسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی ایک شخص محض اللہ کے کلمۂ کُن سے ظاہری اسباب کے خلاف پیدا ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو ”کلمۃ اللہ“ کہا جاتا ہے اُس کی وجہ یہی ہے کہ ظاہری اسباب کے خلاف اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلمۂ کُن یعنی اللہ کی قدرت کے ساتھ وہ ظہور پذیر ہوئے، اس لئے ان کا لقب ہی بن گیا ”کلمۃ اللہ“، اللہ کے کلمے سے پیدا ہونے والا، جس طرح اللہ تعالیٰ کے کلمات بے شمار ہیں جو گنتی میں نہیں آسکتے، اور ساری کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلمات کا ہی ظہور ہے، اُن کلمات میں سے ایک کلمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں، تو یحییٰ علیہ السلام اُس کی

تصدیق کریں گے، چنانچہ یحییٰ علیہ السلام کی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے، اور جس طرح ایک نبی دوسرے کی تصدیق کیا کرتا ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی، اور لوگوں کو اُن پر ایمان لانے کے لئے اُبھارا۔ تو پہلی صفت اُن کی یہ ہوگی۔ دُوسری صفت ہے سَیِّدًا: سردار ہوگا، اُس کو اپنے زمانے میں دینی سرداری حاصل ہوگی، اور تیسری صفت ہے حَصُوْرًا: اپنی خواہشات پر بہت پابندی لگانے والا ہوگا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زندگی بہت درویشانہ زندگی گزری ہے، کہ ایسی لذات وخواہشات جن کا پورا کرنا مباح ہے اُنہوں نے اُدھر بھی توجہ نہیں کی، چونکہ اُس وقت یہود میں دُنیاداری اور عیش پرستی بہت آ گئی تھی، تو اُن کا رُخ موڑنے کے لئے حضرت یحییٰ بھی اور حضرت عیسیٰ بھی دونوں کی زندگی بہت ہی درویشانہ اور ترکِ دُنیا کی زندگی تھی، لذات پر بھی پابندی لگائی، اور حضرت یحییٰ نے تو یہاں تک اپنے آپ کو روک کے رکھا کہ شادی بھی نہیں کی جبکہ اُس زمانے میں لوگوں کے اندر اِس قسم کی عیاشی بھی بہت ہوگئی تھی، تو دُنیا کی محبت سے لوگوں کا رُخ موڑنے کے لئے یہ زندگی اپنائی۔

نکاح افضل ہے یا ترکِ نکاح؟

باقی رہا یہ کہ ہمارے ہاں تو نکاح کرنا افضل ہے، عام طور پر علماء جو کہتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی تو اس سے ترکِ نکاح کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی، حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات ایسے تھے جن کا مقتضا یہی تھا کہ وہ نکاح نہ کریں، کہتے ہیں کہ رِقت اور گریہ زاری اُن پر انتہائی طاری رہتی تھی، اور دُنیا کی کسی چیز کی طرف اُن کی توجہ نہیں تھی، اور ایسے حال میں نکاح اور اُس کے جتنے معاملات ہوتے ہیں اُن کا نبھانا بس میں نہیں رہتا، گریہ زاری اِن پر بہت طاری ہوتی تھی، اللہ کے خوف سے بہت روتے تھے، اس لیے ان کی توجہ ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی عبادت کی طرف تھی، اس قسم کے معاملات میں وہ اُلجھے ہی نہیں۔ اور آج ہماری شریعت میں بھی مسئلہ یہی ہے کہ اگر کسی شخص کے حالات ایسے ہوں کہ اُس کو بیوی کی طرف توجہ نہیں، یا اُس کے دماغ کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ دُوسری طرف اتنا متوجہ ہے کہ اس کو ڈر ہے کہ اگر میں نے نکاح کرلیا تو میں اُس کے حقوق ادا نہیں کرسکوں گا، تو ایسے شخص کے لئے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ نکاح عام حالات میں سُنّت ہے، بعض حالات میں فرض بھی ہے، لیکن بعض حالات ایسے بھی ہیں جن کے تحت نکاح کرنا جائز ہی نہیں ہے، اگر اِنسان کے اپنے شخصی حالات اس قسم کے ہوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں بیوی کے حقوق ادا نہیں کرسکوں گا، یا اس قسم کے دھندوں میں لگ کر میں اپنے دِینی فرضِ منصبی کو پوری طرح سے ادا نہیں کرسکوں گا تو پھر ایسے وقت میں نکاح نہ کرنا مناسب ہے۔ ''حصور'' کا یہ مفہوم جو آپ کے سامنے ذکر کیا جارہا ہے اِس کا ایک فرد ہے عورت سے دُور رہنا، حضرتِ شیخ (الہند رحمہ اللہ) نے اُسی کو لے کر ترجمہ کیا ہے کہ ''عورت کے پاس نہ جائے گا۔''

بچے کی بشارت پر زکریا علیہ السلام کا سوال اور نشانی کا مطالبہ

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ: حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ یا اللہ! میرے لئے بچہ کیونکر ہوگا؟ یہ سوال کیفیت طلب کرنے کے لئے ہے کہ ہمیں دوبارہ جوان کیا جائے گا یا کوئی نئی شادی کا حکم دیا جائے گا، کس قسم کی کیفیت ہوگی جس کی

بناء پر بچہ ہوگا؟ ورنہ ظاہری حالات تو سازگار معلوم نہیں ہوتے، حالانکہ مجھے بڑھاپا پہنچ گیا اور میری بیوی بھی اولاد کے قابل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ ایسے ہی، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اُس کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں، وہ چاہے تو پتھروں سے پانی جاری کر دے، حالانکہ پتھر اور پانی میں کیا مناسبت ہے؟ اسی طرح اگر چاہے تو جوانوں کو اولاد نہ دے اور چاہے تو بوڑھوں کو دے دے، اللہ کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں ہے۔ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا کہ یا اللہ! میرے لئے اس کی کوئی نشانی متعین کر دو، جس سے میں پہچان جاؤں کہ واقعی آپ کی طرف سے یہ واقعہ پیش آ گیا، کہ بچہ ماں کے بطن میں آ گیا، تاکہ میں زیادہ شکر گزاری کی طرف متوجہ ہو جاؤں، اور اِس ظاہری علامت کے متعین ہونے سے مجھے یہ بھی یقین ہو جائے گا کہ جو بشارات مل رہی ہیں یہ آپ کی طرف سے ہی ہیں، کیونکہ بسا اوقات دل میں خواہش اُبھرتی ہے تو اسی قسم کی آواز انسان باہر سے بھی سن لیتا ہے، اگرچہ نبی کے لئے کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، لیکن ظاہری اسباب کے خلاف ہونے کی بناء پر اِس بات کا یقین حاصل کرنے کے لئے حضرت زکریا نے نشانی مانگی، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل کی خواہشات ہی زور پکڑ کے اس قسم کی بشارتیں بن کر سامنے آ گئی ہوں، اگرچہ ضعیف سے ضعیف تر احتمال ہو لیکن ایسا ہو تو سکتا ہے جب یہ واقعہ خلاف اسباب پیش آ رہا ہے، تو اُس پر مزید یقین حاصل کرنے کے لئے نشانی مانگی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُس کی نشانی یہی ہے کہ تُو باوجود صحت مند ہونے کے تین دن لوگوں سے بات نہیں کر سکے گا، یعنی جب تُو لوگوں سے کوئی دُنیاداری کی بات کرنا چاہے گا تو اشارہ تو کر سکے گا لیکن تیری زبان نہیں چلے گی، ہاں البتہ ذِکر اذکار پر قادر رہے گا۔ ''اور صبح شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر'' یہ جو حکم دیا گیا ہے اس سے خود ثابت ہو گیا کہ تسبیح وتحمید پر وہ قادر رہیں گے، ''سبحان اللہ، الحمد للہ، لا إلٰه إلا اللہ'' اِس قسم کے کلمات اُن کی زبان پر جاری ہوں گے، اگر یہ بھی جاری نہ ہوں تو پھر حکم دینے کا کیا مطلب؟ اِسی کی طرف دیکھتے ہوئے مطلب یہ نکل آیا کہ تیرے اُوپر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگی کہ تو کسی دوسرے کے ساتھ دُنیاداری کی بات کرنا چاہے گا تو تیری زبان نہیں چلے گی، ہاں البتہ ذِکر کی طرف تو متوجہ رہے گا، ذِکر کے لئے تیری زبان جاری رہے گی، دُوسری باتیں تو اشارے سے کر سکے گا اور زبان سے نہیں کر سکے گا، جب یہ واقعہ پیش آ جائے تو یقین کر لینا کہ اب بچے کی بُنیاد رکھ دی گئی اور وہ بچہ بطنِ مادر میں آ گیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ
قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا اور تجھے صاف ستھرا بنایا اور تجھے چن لیا
عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ
تمام جہان کی عورتوں کے مقابلے میں ﴿۴۲﴾ اے مریم! اطاعت اختیار کر اپنے رَبّ کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں

الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ

کے ساتھ ﴿۴۳﴾ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اور آپ اُن لوگوں کے پاس نہیں تھے جب

يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ

وہ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے کہ مریم کا کفیل کون بنتا ہے، اور آپ اُن کے پاس نہیں تھے جب

يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ

وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے ﴿۴۴﴾ جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ تجھے بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمے کی،

اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ ۙ

جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، باوجاہت ہوگا دنیا میں اور آخرت میں، اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا ﴿۴۵﴾

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ

اور لوگوں سے کلام کرے گا اس حال میں کہ وہ گود میں ہوگا اور بڑی عمر میں، اور اچھے لوگوں میں سے ہوں گے ﴿۴۶﴾ مریم کہنے لگیں

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ

اے میرے پروردگار! میرے لئے بچہ کیسے ہوگا، مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ ہی نہیں لگایا، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ایسے ہی، اللہ

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جس وقت وہ فیصلہ کرے کسی امر کا تو سوائے اس کے نہیں کہ اُس کو کہہ دیتا ہے ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے ﴿۴۷﴾

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ

اور اللہ تعالیٰ اسے تعلیم دے گا کتاب وحکمت کی اور توراۃ وانجیل کی ﴿۴۸﴾ (اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو) رسول بنی اسرائیل کی طرف،

اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ

یہ خبر دینے والے ہوں گے کہ تحقیق میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، کہ بیشک میں بناتا ہوں

لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

تمہارے لیے مٹی سے پرندے جیسی چیز، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں پھر وہ اللہ کی اجازت کے ساتھ واقعی پرندہ بن جاتا ہے،

وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَ

اور میں درست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور برص والے کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردوں کو اللہ کی اجازت کے ساتھ، اور

اُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِكُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمۡ

میں تمہیں بتلا دیتا ہوں وہ چیز جو تم کھاتے ہو اور جو تم ذخیرہ کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں بیشک اس میں البتہ نشانی ہے تمہارے لئے

اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۚ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَلِاُحِلَّ

اگر تم ایمان لانے والے ہو ﴿٤٩﴾ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس چیز کی جو مجھ سے پہلے ہے توراۃ، اور تاکہ میں حلال کر دوں

لَكُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡكُمۡ وَجِئۡتُكُمۡ بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں، اور لایا ہوں میں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، پھر تم اللہ سے ڈرو

وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿٥٠﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیۡ وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿٥١﴾ فَلَمَّاۤ

اور میری اطاعت کرو ﴿٥٠﴾ بیشک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، پس تم اُسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے ﴿٥١﴾ پھر جس وقت

اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ

عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا بنی اسرائیل کی طرف سے کفر کو تو کہا کون ہیں میرے مددگار اس حال میں کہ میں اللہ کی طرف متوجہ ہوں،

قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿٥٢﴾

حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم ایمان لے آئے اللہ پر، اور آپ گواہ ہو جائیں کہ بے شک ہم فرمانبردار ہیں ﴿٥٢﴾

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِیۡنَ ﴿٥٣﴾

اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے اتباع کی رسول کی پس تو ہمیں گواہوں کے ساتھ لکھ لے ﴿٥٣﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ: قابل ذکر ہے وہ وقت جب فرشتوں نے کہا، یٰمَرۡیَمُ: اے مریم!، اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىكِ: بیشک اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا، وَطَهَّرَكِ: اور تجھے صاف ستھرا بنایا، وَاصۡطَفٰىكِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ: اور چن لیا تجھے تمام جہانوں کی عورتوں کے مقابلے میں، پسند کیا تجھ کو تمام جہان کی عورتوں پر، یٰمَرۡیَمُ اقۡنُتِیۡ لِرَبِّكِ: اے مریم! اطاعت اختیار کر اپنے رَبّ کی،

وَاسْجُدِيْ: اور سجدہ کر، وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ: اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ اور قنوت جس طرح اطاعت کے معنی میں آتا ہے اِسی طرح قیام کے معنی میں بھی آتا ہے، اگر یہاں قیام مراد لے لیا جائے تو پھر قیام سجدہ اور رکوع یہ تینوں رکن نماز کے اِس میں آجاتے ہیں، ''اپنے رَبّ کے لئے قیام کر اور اپنے رَبّ کے لئے سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ''۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ: یہ جو کچھ ذکر کیا گیا یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، غیب سے مراد جو آپ ﷺ سے اور آپ کی قوم سے پوشیدہ تھیں، نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم جانتی تھی، مثلاً ماضی کے واقعات جن پر آپ مطلع نہیں تھے، آپ ﷺ کے اعتبار سے یہ غیب ہیں، ورنہ تو جب عالمِ مشاہدہ میں یہ واقعات پیش آئے ہیں تو ساری دُنیا کے لئے تو غیب نہیں ہیں، اُس وقت کچھ انسان حضرت مریم کے حالات کو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کو، حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات کو دیکھنے والے موجود تھے، لیکن جس زمانے میں سرورِ کائنات ﷺ پر یہ بات اُتاری جارہی ہے، آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے یہ ماضی کے واقعات پوشیدہ چیزیں ہیں، نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم''۔ ''یہ غیب کے واقعات سے ہے، غیب کی خبروں سے ہے''، نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ: ہم اِس کو آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ: اور آپ اُن لوگوں کے پاس نہیں تھے، اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ: جبکہ وہ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے، اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ: قلمیں اِس مقصد کے لئے ڈال رہے تھے تاکہ جان لیں کہ مریم کا کفیل کون بنتا ہے، لِيَعْلَمُوْٓا اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ، یا يَنْظُرُوْنَ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ، قلمیں ڈال کر دیکھ رہے تھے کہ مریم کا کفیل کون بنتا ہے، وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ: اور آپ ان کے پاس نہیں تھے، اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ: جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ: بیشک اللہ تعالیٰ تجھے بشارت دیتا ہے، اپنی طرف سے ایک کلمے کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا: دُنیا کے اندر باوجاہت ہوگا، اُس کو دُنیا میں سرداری حاصل ہوگی، عزّت حاصل ہوگی، وَالْاٰخِرَةِ: اور آخرت میں باوجاہت ہوگا، ''وجیہ ہوگا دنیا میں اور آخرت میں''، وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا۔

لفظِ ''مسیح'' کی تحقیق

لفظِ ''مسیح'' کے بارے میں یہاں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ عبرانی لفظ ''ماشیح'' سے معرّب ہے، اصل لفظ ''ماشیح'' یا ''مشیحا'' ہے، اور ''ماشیح'' عبرانی میں ''مبارک'' کو کہتے ہیں، جب اُس سے یہ لفظ معرّب ہوگیا تو یہ بھی ''مبارک'' کے معنی میں ہے، اور ''عیسیٰ'' عبرانی میں ''ایشوع'' کا معرّب ہے، اور عبرانی میں ''ایشوع'' کا ترجمہ ہے سیّد، سردار۔ تو دونوں لفظوں کا معنی ہے ''مبارک سردار''، اور اب یہ لفظ ''مسیح'' ابنِ مریم کا لقب ہے، اور لفظ ''عیسیٰ'' عَلم ہے۔ اور دجال کے لئے بھی لفظِ ''مسیح'' استعمال کیا جاتا ہے، ''مسیح دجال'' کہا جاتا ہے، وہ بالاتفاق عربی لفظ ہے، ''مَسَحَ'' سے ہے، اور مسیح ممسوح کے معنی میں ہے، مٹائی ہوئی چیز، جس کا صفایا کیا ہوا ہو، تو اُس دجال کو ''مسیح'' اس لیے کہیں گے کہ وہ ممسوح الھدایۃ ہوگا، اُس میں ہدایت کا نام ونشان نہیں، یا ممسوح العین ہوگا کہ اس کی ایک آنکھ مٹائی ہوئی ہے، تو یا تو ممسوح العین ہونے کی وجہ سے اس کو ''مسیح'' کہیں گے یا ممسوح الھدایۃ ہونے کی وجہ سے اُس کو ''مسیح'' کہیں گے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام پر بولا جانے والا لفظ ''مسیح''

اگر عربی ہوتو پھر بنی اسرائیل میں یہ ایک رواج چلا آرہاتھا کہ نئے آنے والے نبی کو پچھلا نبی جو موجود ہوتا وہ اُس کے سر پر تیل مل کر اُس کی نبوّت کا اور اس کی سرداری کا اعلان کرتا تھا، تو واقعہ تو باقیوں کے ساتھ بھی پیش آیا ہوگا، لیکن یحییٰ علیہ السلام نے جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور تیل لگا کر اُن کی سرداری کا اعلان کیا تو پھر یہ لفظ اُن کے لئے بطور لقب کے مشہور ہوگیا، تو پھر یہ ''مسیح'' بھی عربی کا لفظ ہوگا ممسوح کے معنی میں، جس کے سر پہ ہاتھ پھیرا ہوا ہے، یعنی یحییٰ علیہ السلام نے جن کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُن کی سرداری کا اعلان کیا۔[1] لیکن پہلا مفہوم زیادہ چسپاں معلوم ہوتا ہے کہ پیش گوئی کے وقت ہی گویا اُس کو مسیح قرار دے کر پیش گوئی کی جارہی ہے، جس میں مبارک والا معنی زیادہ چسپاں ہوتا ہے، ورنہ یہ دوسرا مفہوم بھی اِس کو عربی لفظ قرار دے کر بیان کیا جاسکتا ہے، کہ زندگی میں وہ اس لفظ کے ساتھ مشہور ہوں گے ''مسیح عیسیٰ ابن مریم''، پھر مسیح اس وقت بنیں گے جس وقت حضرت یحییٰ علیہ السلام اُن پر ہاتھ پھیر کر ان کی سرداری کا اعلان کریں گے، تو آنے والے وقت میں چونکہ وہ مسیح بن جائیں گے اِس لیے مایؤول کے اعتبار سے اُن کو مسیح کہہ دیا گیا، اس لیے اگر یہ عربی لفظ ہوتو اِس کا مفہوم یوں ادا کردیا جائے گا۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا: یہ پیدا ہونے سے پہلے پیش گوئی کی جارہی ہے، يُكَلِّمُ النَّاسَ: لوگوں سے کلام کرے گا، فِي الْمَهْدِ، مہد گود کو بھی کہتے ہیں، اور گہوارہ اور پنگھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس میں بچّے کو آرام کے لئے ڈال دیا جاتا ہے، دونوں صورتوں میں مقصد یہی ہے کہ چھوٹی عمر میں جبکہ وہ گود میں ہوگا، گہوارے میں ہوگا، پنگھوڑے میں ہوگا، جس وقت عام طور پر بچّے بولتے نہیں ہیں، بالکل ابتدائی زمانہ بچپن کا، حَالَ كَوْنِهٖ فِي الْمَهْدِ، کلام کرے گا لوگوں سے اس حال میں کہ وہ گود میں ہوگا، وَكَهْلًا: يُكَلِّمُ النَّاسَ كَهْلًا، اور کہل کہتے ہیں بڑی عمر کے انسان کو، کہولت کا زمانہ ہوتا ہے جب جوانی ڈھلتی ہے اور ابھی پوری طرح سے بڑھاپا آتا نہیں، اُس کو کہولت کا زمانہ کہتے ہیں، جس کو ہماری زبان میں کہتے ہیں'' کچھ پختہ عمر کا ہے!'' یعنی نہ تو بوڑھا ہی ہوا ہے، اور نہ اب پورا جوان ہی ہے، ۳۵ سے لے کے ۴۵ تک تقریباً یہ کہولت کا زمانہ کہلاتا ہے، اور اُس کے بعد بڑھاپے کی ابتدا ہوجاتی ہے، تو یہاں یہی معنی ہوگا کہ لوگوں سے کلام کرے گا بڑی عمر میں۔ بچپن میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر میں بھی کلام کرے گا۔ بڑی عمر میں اگرچہ سارے لوگ ہی کلام کیا کرتے ہیں، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیات میں سے نہیں ہے، لیکن یہاں جو دو لفظوں کے طور پر ذکر کردیا فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا، یہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ ان کی کلام بچپن میں ویسی نہیں ہوگی بے ڈھنگی سی، جس طرح سے عام طور پر بچّے اگر بولنے لگ بھی جائیں تو اس میں کوئی علم وحکمت کی بات نہیں ہوتی، ایسے ہی مارتے ہیں بے جوڑ سی، کوئی کدھر کی کوئی کدھر کی، جس کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا، کوئی معنی نہیں ہوتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کلام بچپن کی اور کہولت کی ایک جیسی ہوگی، جس طرح بڑی عمر میں ان کی کلام علم وحکمت پر مشتمل ہوگی بچپن میں بھی بولیں گے تو وہ کلام بالکل ایسی ہوگی جیسے کہولت کے زمانے میں ہوتی ہے، سمجھ داری کی باتیں کریں گے، چنانچہ اُن کی تقریر بالکل بچپن میں گود میں جو انہوں نے کی تھی اُن لوگوں کے سامنے جو ان کی ماں کو متہم کررہے تھے ''قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا'' وہ سورۂ مریم کے اندر آئے گی، وہ

(۱) تفسیر رازی میں ہے: سُمِّيَ مَسِيحًا لِأَنَّهُ كَانَ مَمْسُوحًا بِدُهْنٍ طَاهِرٍ مُبَارَكٍ يُمْسَحُ بِهِ الْأَنْبِيَاءُ، وَلَا يُمْسَحُ بِهِ غَيْرُهُمْ۔ نیز روح المعانی وغیرہ۔ واللہ اعلم!

بالکل ایسی کلام ہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنے مخاطبین سے باتیں کیا کرتے ہیں، تو جیسی بڑی عمر میں جا کر باتیں کرنی تھیں ویسی باتیں انہوں نے بچپن میں کیں۔ دو لفظ بولنے کی یہ وجہ ہے۔ وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اچھے لوگوں میں سے ہوں گے، شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔ یہاں تک فرشتوں نے حضرت مریم کو بشارت دی، قَالَتْ: حضرت مریم کہنے لگیں، رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ: اے میرے پروردگار! میرے لیے بچہ کیسے ہوگا، وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ: بَشَرٌ نکرہ تحت النفی ہے، مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ ہی نہیں لگایا، اس ہاتھ لگانے سے ظاہری ہاتھ لگانا مراد نہیں ہے، ورنہ تو بچپن میں لوگوں نے اُٹھایا بھی تھا، حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی اُٹھایا، دوسروں نے بھی اُٹھایا تھا، بچوں کے ساتھ جس طرح سے پیار کیا کرتے ہیں تو یہاں یہ ہاتھ لگانا مراد نہیں، بلکہ مسِ بشر یہاں جماع سے کنایہ ہے، مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ ہی نہیں لگایا یعنی نہ جائز طریقے سے، نہ ناجائز طریقے سے، نکرہ تحتِ نفی ہے، یہاں چونکہ ایک ہی لفظ آیا ہوا ہے اس لیے اس کا مفہوم ہم عام لے لیں گے، ورنہ دوسری جگہ آئے گا: ''لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا'' (سورۂ مریم: ۲۰) تو وہاں مس سے جائز مس مراد ہوگا، اور ''لَمْ اَكُ بَغِيًّا'' میں دُوسری شق کی نفی ہو جائے گی کہ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ میں بدکارہ ہوں، مطلب یہ ہے کہ کسی طرح سے بھی کوئی آدمی میرے قریب نہیں آیا، تو بچہ کیسے ہوگا؟ قَالَ كَذٰلِكِ: اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ایسے ہی، یعنی بغیر مسِ بشر کے ہی، اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ: اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا: جس وقت وہ فیصلہ کرے کسی امر کا، یعنی یہ طے کرلے کہ اِس کام کو کرنا ہے، فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ: سوائے اس کے نہیں کہ اُس کو کہہ دیتا ہے ہو جا، فَيَكُوْنُ: پس وہ ہو جاتا ہے۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: اور اللہ تعالیٰ اُسے تعلیم دے گا کتاب وحکمت کی، وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: اور تورات وانجیل کی، تورات وانجیل یا تو یہ کتاب وحکمت کا ہی بیان ہے ()۔ یا بعض مفسرین نے ذکر کیا کہ تورات وانجیل کا چونکہ مستقل آگے ذکر ہو گیا اس لیے الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ سے یا تو لکھنا مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو لکھنا سکھائے گا، اور حکمت دے گا یعنی اُن کی وعظ ونصیحت بڑی حکمت پر مبنی ہوا کرے گی، بڑی حکمت اور دانشمندی کی باتیں کریں گے، اور تورات وانجیل کی اللہ تعلیم دے گا (عام تفاسیر)۔ اور یا کتاب وحکمت کا مصداق ہے قرآن وسُنّت (تفسیر عثمانی)، یہ بات بھی پیش گوئی میں آگئی، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آخر عمر میں نازل ہو کر اِس اُمت میں سرداری کرنی ہے، اِمامت سنبھالنی ہے، اور اُس وقت وہ قرآن اور حدیث کے مطابق فیصلہ کریں گے، اور وہ یہاں آ کے قرآن وحدیث کی تعلیم نہیں حاصل کریں گے، کہ صحاح ستہ پڑھیں، کہیں دورۂ حدیث کریں اور پھر پتہ چلے کہ حدیث میں کیا آتا ہے اور قرآنِ کریم کا کیا مطلب ہے، تو وہ یہاں آ کر تعلیم نہیں حاصل کریں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے ہی علم دیا ہوگا۔ تو اُن کے علم کے دو شعبے ہو گئے، تورات وانجیل کا علم بھی انہیں ہوگا، اور قرآن وسُنّت کا علم بھی ہوگا، یہ علیحدہ بات ہے کہ جس وقت یہ پیش گوئی کی جا رہی ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ وضاحت کی جا رہی ہو اُس وقت لوگ اِس کا مصداق نہ سمجھیں اور وہ اِس کو اور معنوں پر ہی محمول کرتے رہیں، لیکن جس وقت واقعہ پیش آئے گا تو پتہ چل جائے گا کہ واقعی یہ قرآن وسُنّت کو بھی جانتے ہیں اور تورات وانجیل کو بھی جانتے ہیں، پھر اِن لفظوں کا مصداق متعین ہو جائے گا، تو ہمارے سامنے چونکہ دلائل قطعیہ کے ساتھ یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قرآن وسُنّت کے مطابق اِس دُنیا میں آ کر امامت کرنی ہے، اس لیے ہم اگر کتاب وحکمت کا مصداق قرآن وسُنّت کو بنا دیں تو اِس میں کوئی اِشکال نہیں ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جامع ہوں گے تورات وانجیل کے بھی اور قرآن

وقت کے بھی، اِن کی پہلی زندگی تورات وانجیل کے مطابق گزرے گی، اور نزول کے بعد ان کی دوسری زندگی کتاب وحکمت کے مطابق گزرے گی، چاہے اُس وقت لوگ اِس کا مصداق نہ سمجھیں لیکن آج دلیل کے ساتھ اس کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: رَسُوْلًا کا عامل محذوف نکالیں گے، یَبْعَثُهٗ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ، اللہ تعالیٰ اُس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر اُٹھائے گا۔ یَبْعَثُهٗ نکال لو، یا یَجْعَلُهٗ نکال لو، اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ اُس کو رسول بنی اسرائیل کی طرف، مُخْبِرًا بِاَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: وہ رسول ہوں گے، اللہ کا پیغام لانے والے ہوں گے اِن لفظوں کے ساتھ، آ کر یوں اعلان کریں گے، اِس حال میں کہ وہ خبر دینے والے ہوں گے کہ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ، (اِس کی ترکیب یوں بھی کرلیا رَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مُخْبِرًا بِاَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ)، یہ اعلان کرنے والے ہوں گے، یہ خبر دینے والے ہوں گے کہ تحقیق میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رَبّ کی طرف سے یعنی اپنی رسالت پر، یہ نہیں کہ میں ایسے ہی دعویٰ کررہا ہوں اور میرے پاس کوئی نشانی نہیں ہے، ''میں تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے ایک نشانی لایا ہوں'' آگے نشانی کا بیان یہ ہے کہ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ: یہ اُس اٰیة کی تفصیل ہے، کہ بیشک میں بناتا ہوں تمہارے لیے مٹی سے پرندے جیسی شکل، كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ، پرندے جیسی چیز بناتا ہوں فَاَنْفُخُ فِیْهِ: پھر میں اُس میں پھونک مارتا ہوں، فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ: پھر وہ اللہ کی اجازت کے ساتھ واقعی پرندہ بن جاتا ہے، یہ ہے نشانی جو معجزہ دکھایا۔ ''خلق'' کا لفظ یہاں صورۃً بنانے پر بولا گیا ہے، معدوم کو موجود کرنا جو حقیقتاً خلق ہے یہ تو اللہ کی شان ہے، لیکن لکڑی یا مٹی وغیرہ کی کوئی چیز بنالی جائے تو اِس کے لئے صورۃً خلق کا لفظ بولا جاسکتا ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک جگہ اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ کہا، (سورۂ مومنون: ۱۴) کہ بنانے والوں میں سے سب سے بہتر اللہ ہے، ''خالقین'' جمع کا صیغہ آیا ہے، تو یہ ظاہری صورت بنانے کے اعتبار سے ہے۔ اور آپ کے ہاں اخبار نویس جو قائداعظم کو ''خالقِ پاکستان'' لکھا کرتے ہیں، یہ لفظ بظاہر قبیح ہے، اس طرح اطلاق کے ساتھ بولنا مناسب نہیں، اگرچہ اِس کو کفر بھی قرار نہیں دیں گے کیونکہ اس میں تاویل ہوسکتی ہے، کہ چونکہ اس نقشے پر پاکستان کے اُبھرنے کا ذریعہ وہ بنا ہے، اس لیے اُس کو بنانے والا اس کو حاصل کرنے والے کے مفہوم میں لے لیں، ورنہ اس طرح اطلاق کے ساتھ اِس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے، تو ''خلق'' کا لفظ ظاہری طور پر کسی چیز کے بنانے کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے۔ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ: اکمہ کہتے ہیں مادرزاد نابینے کو، ایک تو یہ ہے کہ پہلے بینائی تھی لیکن اُس کے بعد کسی وجہ سے بینائی زائل ہوگئی، جیسے ڈاکٹر آنکھ بنادیتے ہیں، بنانے کے بعد بینائی دوبارہ آجاتی ہے، یہ اسباب کے تحت ہے، اور ایک یہ ہے کہ مادرزاد ہی اندھا ہو، اُس کو اکمہ کہتے ہیں، وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ: میں درست کردیتا ہوں، اچھا کردیتا ہوں مادرزاد اندھے کو، وَالْاَبْرَصَ: اور برص والے کو، یعنی جس کو کوڑھ کی بیماری ہو، وَاُحْیِ الْمَوْتٰى: موتی میت کی جمع، اور میں زندہ کرتا ہوں مُردوں کو، بِاِذْنِ اللّٰهِ: اللہ کی اجازت کے ساتھ، بِاِذْنِ اللّٰهِ کا تعلق سب کے ساتھ ہوگا، اندھوں کو سوانکھا کرتا ہوں بِاِذْنِ اللّٰهِ، کوڑھیوں کو ٹھیک کرتا ہوں بِاِذْنِ اللّٰهِ، اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ وَاُنَبِّئُكُمْ: اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں، بتلا دیتا ہوں تمہیں، بِمَا تَاْكُلُوْنَ: وہ چیز جو تم کھاتے ہو اور جو تم ذخیرہ کرکے رکھتے ہو اپنے گھروں میں، میں تمہیں اِس کی اطلاع دے دیتا ہوں، یہ علمی معجزہ ہے، پہلے عملی معجزات کا ذکر ہے اور یہ علمی معجزہ ہے، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ: بیشک اس میں البتہ نشانی ہے تمہارے لیے میری نبوّت پر، میری رسالت پر، اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ: اگرتم ایمان لانے والے ہو۔تو اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ میں جو آیت کا لفظ آیا تھا اَنِّیْٓ اَخْلُقُ سے اُسی کی تفصیل شروع ہوئی تھی، وہی بات پھر کہہ دی کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ: اگرتم ایمان لانے والے ہوتو اِس میں تمہارے لیے نشانی موجود ہے، دلیل موجود ہے۔ وَمُصَدِّقًا: جِئْتُكُمْ مُصَدِّقًا، اور میں آیا ہوں تمہارے پاس اس حال میں کہ میں تصدیق کرنے والا ہوں، لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ: اُس چیز کی جو میرے سامنے ہے، جو مجھ سے پہلے ہے یعنی تورات، مِن بیانیہ ہے، مجھ سے پہلے جو تورات اُتری ہوئی ہے میں اُس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور دوسرا مفہوم بھی اِس کا ذکر کیا جاتا ہے کہ میں اُس کا مصداق بننے والا ہوں، یعنی اس میں جو پیش گوئیاں ذکر کی گئی ہیں اُن پیش گوئیوں کا میں مصداق ہوں۔ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ: اس کا عطف مُصَدِّقًا کے معنی پر ہے، یعنی جِئْتُكُمْ لِاُصَدِّقَ وَلِاُحِلَّ، تاکہ میں تورات کی تصدیق کروں اور تاکہ تمہارے لیے حلال کردوں بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ بعض وہ چیز جو تم پر حرام کی گئی ہے، وَجِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: اور لایا ہوں میں تمہارے پاس نشانی تمہارے رَبّ کی طرف سے، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ: پھر تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ یہاں جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ کا مطلب یہ ہوگا کہ تورات کے جو بعض احکام میں منسوخ کروں گا، جن کی حرمت مذکور ہے اور میں وہ تم پر حلال کروں گا، اِس نسخ کی بھی میرے پاس دلیل ہے، یہ نہیں کہ بلا دلیل ہی کتاب کے اَحکام بدلنے شروع کردوں گا، میری نبوّت کی دلیل بھی موجود ہے اور اِسی طرح اِس نسخ پر بھی میں دلیل رکھتا ہوں، ''میں تمہارے پاس دلیل لایا ہوں تمہارے رَبّ کی طرف سے'' فَاتَّقُوا اللّٰهَ: پھر تم ڈرو اللہ سے، وَاَطِیْعُوْنِ: نون کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے، اَطِیْعُوْنِیْ: میری اطاعت کرو، اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ: بیشک اللہ ہی میرا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے، فَاعْبُدُوْهُ: پس تم اُسی کی عبادت کرو، هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ: یہی سیدھا راستہ ہے۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ: پھر جس وقت عیسیٰ علیہ السلام نے معلوم کیا، محسوس کیا اُن بنی اسرائیل کی طرف سے کُفر کو، قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ: اَنصار ناصر کی جمع یا نصیر کی جمع، مَنْ اَنْصَارِیْ: کون ہیں میرے مددگار، اِلَى اللّٰهِ: مُتَوَجِّهًا اِلَى اللّٰهِ، اس حال میں کہ میں اللہ کی طرف متوجہ ہوں، یا، مُلْتَجِئًا اِلَى اللّٰهِ، میں اللہ کی طرف پناہ لینے والا ہوں، ایسے حال میں میرے مددگار کون ہیں؟

لفظِ ''حواری'' اور لفظِ ''یارِ غار''

قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ: حواریون حوارِی کی جمع ہے، حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، حواری کا لفظ ناصر اور مددگار کے معنی میں ہی آیا ہے، اور یہ لفظ اُسی زبان کا ہے عبرانی کا یا سریانی کا، جس کا معنی ناصر اور مددگار آتا ہے، یہ عربی لفظ نہیں ہے، بعد میں عربی کے اندر بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہونے لگ گیا جیسے حدیث شریف میں یہ لفظ آتا ہے: ''لِكُلِّ نَبِیٍّ حَوَارِیٌّ'' ہر نبی کے لئے کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے، ''وَحَوَارِیِّ الزُّبَیْرُ'' میرا حواری زبیر ہے۔[1] اور اگر یہ لفظ عربی ہو تو پھر اس کا ماخذ حَوَر ہے، حَور کہتے ہیں سفیدی کو، اس لیے حُور جو حَوراء کی جمع ہے گورے رنگ کی عورت، وہ اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے، حَور سفیدی کے معنی میں ہے، تو یہ لوگ جو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے تھے یہ یا تو اپنی سفید پوشی کی وجہ سے حوارِی کہلاتے تھے، یا دلوں کی سفیدی کی

(۱) بخاری ۱۰۷۸/۲، باب بعث النبی الزبیر/ نیز بخاری ۳۹۹/۱، باب فضل الطلیعة/ مشکوٰۃ ۵۶۵/۲، باب مناقب العشرۃ فصل اول۔

وجہ سے، کہ اُن کے دل صاف تھے، یا بعضوں نے کہا ہے کہ ان کا پیشہ تھا کپڑے دھونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پہلے پہلے ایمان لانے والے دھوبی تھے جو کپڑوں کو صاف کرتے تھے، اور دھوبی کو حواری کہتے ہیں کہ وہ کپڑوں کو سفید کرتا ہے یعنی صاف کرتا ہے، پھر چونکہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھی ثابت ہوئے، اس لیے اب لفظِ ''حواری'' مخلص ساتھی کے لئے عنوان ہی بن گیا، اب جب ہم کہیں گے کہ ''فلاں میرا حواری ہے!'' تو یہ لفظ تشبیہاً استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے لیے یہ ایسے ہی مخلص اور جاں نثار ہے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے وہ دھوبی تھے۔ جیسے ''یارِ غار'' کا لفظ جو ہمارے ہاں بولتے ہیں اصل کے اعتبار سے تو یہ لفظ بولا جاتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر جو غار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یار تھا، یہ ''غار'' اور ''یار'' کا مجموعہ اصل کے اعتبار سے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہ صادق آتا ہے، کہ غار کے اندر آپ نے دوستی نمایاں کی، لیکن بعد میں تشبیہاً ''یارِ غار'' کا لفظ مخلص دوست کے لئے بولنے لگ گئے کہ ''فلاں میرا یارِ غار ہے!'' تو اس لفظ کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ میرے لیے یہ ایسے ہی قابلِ اعتماد ہے جیسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ابوبکر تھے، کیونکہ ابوبکر پر اعتماد کا مظاہرہ سب سے زیادہ غار میں ہی ہوا ہے، کہ جب اپنی جان اور دُوسری ہر چیز ابوبکر کے اعتماد میں دے دی گئی، کہ اگر یہ بے وفائی کر جاتے تو کتنا نقصان ہوتا، ایسے موقع پر انسان سب سے زیادہ مخلص اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی کو ساتھ رکھا کرتا ہے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یارِ غار تھے، تو اب جو بھی مخلص دوست ہوتا ہے ہم کہتے ہیں کہ ''فلاں شخص میرا یارِ غار ہے!'' اسی طرح یہاں ''حواری'' کا لفظ ہے، کہ ''حواری'' کا لفظ مخلص دوست اور مددگار کے معنی میں اب اگر کسی جگہ بولا جائے گا تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ میرے لیے یہ ایسے ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے دھوبی تھے۔

حواریون نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم ایمان لے آئے اللہ پر، وَاشْهَدْ: اور تُو گواہ ہو جا، بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ: کہ بیشک ہم فرمانبردار ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنانے کے بعد پھر وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہیں رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے اُس چیز پر جو تُو نے اُتاری، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور دوسرے انبیاء علیہم السلام پر جو تُو نے اُتارا ہم اُس پر ایمان لے آئے، وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ: رسول پر الف لام عہد کا ہے، اور ہم نے اتباع کی رسول کی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی، فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ: پس تو ہمیں گواہوں کے ساتھ لکھ لے یعنی اقرار کرنے والوں کے ساتھ لکھ لے، یہاں شہادت علی النفس اقرار کے معنی میں ہے کہ ہم نے اقرار کرلیا، دل سے ایمان لے آئے، اور زبان سے ہم اقرار کرتے ہیں، تو ہمیں اقرار کرنے والوں کے ساتھ لکھ لے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع کے مضامین

اس رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کی رسالت کا ذکر کیا گیا ہے، مسئلہ پیچھے سے یہی چلا آرہا ہے کہ

عیسائیوں کے ساتھ جو بات مختلف فیہ تھی اصل کے اعتبار سے تو وضاحت اُس کی کرنی تھی، اور پہلی چیزیں جو آپ کے سامنے آرہی ہیں یہ بطور تمہید کے ہیں، اور تمہید بھی ایسے واقعات کے ساتھ اٹھائی گئی جن کے ساتھ آنے والا مسئلہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اُن لوگوں کے لئے اشتباہ کا باعث بن گئی تھی، کہ جب اِن کا باپ کوئی نہیں تو اُنہوں نے جوڑ لگا دیا کہ پھر یہ اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ اِن کا باپ ہے، اور یہ بات غلط تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ واقعات کے تحت یہ ثابت کرتے آرہے ہیں کہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہی خرقِ عادت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اُس زمانے میں یہ سارے کے سارا سلسلہ جو تھا اُس میں اپنی قدرت کا اظہار کیا۔ مریم پیدا ہوئی تو عام عادت کے خلاف اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کر لیا گیا، اور پھر بچپن میں اُن پر ولایت کے آثار جو طاری ہوئے تو یہ خرقِ عادت کا مظاہرہ دیکھا گیا کہ اُن کو بے موسم پھل ملتے تھے، یہ کون سے عادت کے مطابق تھے، یہ بھی تو براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ہی تھے، اور پھر اِس کے ساتھ ہی حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ سنایا گیا، کہ وہ کون سا اسباب کے مطابق تھا، یہ ساری چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کی نشاندہی کرتی ہے، کہ حضرت مریم کو خلافِ اسباب رزق کا مل جانا اور حضرت زکریا کو بے موسم اولاد کا مل جانا یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عام عادت کے خلاف واقعات ہیں، اور یہ سارے کے سارے تمہید ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی، کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بھی عام حالات کے خلاف ہوگئی تو اِس میں کون سی تعجب کی بات ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت جس طرح حضرت مریم کو بے موسم پھل دے رہی تھی اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اِن بوڑھوں کو جو اولاد کے قابل نہیں رہے تھے اولاد دے دی، اسی طرح اگر بن باپ صرف ایک عورت کی وساطت سے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کر دیا تو کوئی اشتباہ کی بات نہیں ہونی چاہیے، اللہ کی قدرت کے تحت ہے جو کچھ بھی ہے، اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، اس طرح ان کو ثابت کیا جائے گا، کہ یہ آدم کی اولاد میں سے ہیں، نوح کی اولاد میں سے ہیں، آلِ ابراہیم میں سے ہیں، آلِ عمران میں سے ہیں، مریم کے بطن سے پیدا ہوئے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے تحت ظاہری اسباب کے خلاف پیدا ہوئے۔ پھر پیدا ہونے کے بعد اُنہوں نے جس قسم کے معجزات کا اظہار کیا ان معجزات کو لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی دلیل بنایا، آگے ان معجزات کی تفصیل آجائے گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے جو آیات واضح کیں اور جو معجزات دکھائے اِن کی کیا حقیقت تھی؟ اور پھر ان سب معجزات کے نمایاں کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مخاطبین کے سامنے اپنی کیا حیثیت بیان کی، اور لوگوں کو کس چیز کی تعلیم دی؟ کیا انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ میں مُردے زندہ کر دیتا ہوں اس لئے مجھے الٰہ کہو؟ کیا انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ میں اندھوں کو ٹھیک کر دیتا ہوں اس لئے مجھے خدا مانو، یا، خدا کا بیٹا مانو، یا، خدا کا ایک حصہ مانو؟ بالکل نہیں، سب کچھ ظاہر کرنے کے بعد انہوں نے اگر اعلان کیا تو یہی کیا کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ: اللہ ہی میرا رَبّ ہے اور اللہ ہی تمہارا رَبّ ہے، اُسی کی عبادت کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔ تو اگر تم صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتے ہو (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، اور ہدایت اصل میں یہی ہے کہ انسان صراطِ مستقیم پر چلے) تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر اعلان یہی ہوا ہے کہ پھر وہی اللہ ہے میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، عبادت اُسی کی کرو، اگر اُس کی عبادت کرو گے تو تم صراطِ مستقیم پر ہو، اور اگر اُس کی عبادت کو چھوڑ دو گے تو صراطِ مستقیم سے بھٹک جاؤ گے۔ تو سارے معجزات ظاہر

کرنے کے بعد بھی اُنہوں نے اُلوہیت کا دعویٰ نہیں کیا، اپنے آپ کو عبدیت سے خارج نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا اعلان کرتے ہوئے اُسی کی عبادت کی دعوت دی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بھی توحید کا اعلان ہوا تو پھر کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ انہی معجزات کو دلیل بنا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اِلٰہ ثابت کرنے کی کوشش کرے؟ اس تفصیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کے اندر جو شبہات پھیل گئے تھے ان کی تردید ہو جائے گی، اور ساتھ ساتھ حضرت مریم کی ولایت کو بھی واضح کیا جائے گا، جس طرح صاف الفاظ میں بھی آئے گا کہ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (سورۂ مائدہ: ۷۵) اُس کی ماں تو صدیقہ تھی، ولیہ تھی، اللہ تعالیٰ کی پیاری بندی تھی، اور یہود نے جو کچھ اُن کے متعلق خرافات بکیں اور اُن کے اوپر تہمتیں لگائیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور اُن کی ماں کو رُسوا اور بدنام کرنے کی کوشش کی، اِن واقعات کے تحت حضرت مریم علیہا السلام کی پوزیشن بھی صاف ہوتی چلی جائے گی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو یہود کے نظریات تھے وہ بھی صاف ہو جائیں گے اور اُن کی غلطی بھی واضح ہو جائے گی، اور عیسائیوں نے جس قسم کے نظریات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قائم کر لیے تھے اس کی بھی وضاحت ہو جائے گی، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے یہ آیات بہت اہم حیثیت کی حامل ہیں۔

غیر نبی کے ساتھ فرشتوں کا کلام

سب سے پہلے حضرت مریم علیہا السلام کو جو فرشتوں نے بشارت دی تھی اُس کا ذکر آ گیا، کہ ”فرشتوں نے مریم سے کہا“ اِس سے معلوم ہو گیا کہ فرشتوں کی گفتگو غیر نبی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے، لیکن بطور وحی کے وہ باتیں جو اَحکام پر مشتمل ہوں ایسی باتیں صرف نبی پر نازل ہوتی ہیں، کسی دوسرے پر اَحکامِ شرعیہ فرشتوں کی وساطت سے نہیں اُتر سکتے، البتہ کسی اور معاملے میں گفتگو ہو جائے اور فرشتہ متشکل ہو کر آ جائے ایسا ہو سکتا ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک کوڑھی تھا، ایک گنجا تھا، اور ایک اندھا تھا، اُن کے پاس بھی فرشتہ آیا اور آ کر گفتگو کی، یہ ایک لمبا واقعہ آتا ہے، مشکوٰۃ شریف میں بھی ہے، بخاری شریف میں بھی ہے،[1] اور ”بہشتی زیور“ کے شروع میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اُردو میں بھی اُسی کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ساتھ بھی فرشتوں کی گفتگو کا ذکر آتا ہے۔[2] اور یہاں مریم علیہا السلام کے ساتھ فرشتوں کی گفتگو جو قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی ہے تو اس سے معلوم ہو گیا کہ غیر نبی کے ساتھ بھی فرشتہ کلام کر لیتا ہے، اور صرف فرشتے کے کلام کرنے کے ساتھ ہی کسی کی نبوّت ثابت نہیں ہوتی، جنات بھی بات کر لیتے ہیں، ملائکہ بھی بات کر لیتے ہیں، عام آدمیوں کو چونکہ یہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی اِس لئے نہ اُن کو احساس ہوتا ہے نہ ان سے گفتگو ہوتی ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کے ساتھ فرشتے کو متشکل کر کے گفتگو کرا دے یا کسی کی رُوح کو اتنی ترقی حاصل ہو جائے کہ عالمِ ملکوت کے ساتھ رابطہ قائم کر کے وہ فرشتوں سے گفتگو کر لے اور فرشتے اُس سے گفتگو کر لیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۹۲ باب حدیث ابرص / مشکوٰۃ ۱/ ۱۶۵ باب الانفاق فصل ثالث۔

(۲) اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى (سورۂ طٰہٰ: ۳۸)، وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى (سورۂ قصص: ۷) ایک قول کے مطابق یہ وحی بواسطہ فرشتہ ہوئی تھی۔

حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت

حضرت مریم کے ساتھ فرشتوں نے گفتگو کی کہ ''اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا'' اللہ نے تجھے فضیلت دی، اور فضیلت بھی ایسے ہی معمولی نہیں، بلکہ تمام جہان کی عورتوں کے مقابلے میں۔ اس فضیلت سے بعض خصوصی فضائل مراد ہیں، جس کو آپ جزوی فضیلت سے ذکر کر سکتے ہیں، جیسے ابتدا سے قبولیت کے آثار، بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول ہو جانا، اور بلا ظاہری اسباب کے رزق کا حاصل ہو جانا، اور آگے جو کچھ حضرت مریم کے ساتھ معاملات ہوں گے یہ ایسے ہیں جو انہی کے ساتھ ہی خاص ہیں، باقی! کُلّی فضیلت کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہو، سب سے زیادہ مرتبہ حاصل ہو، اور آخرت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا قرب سب سے زیادہ حاصل ہو، اِس بارے میں حدیث شریف میں پانچ عورتوں کی تعریف آتی ہے،(۱) دو اُمم سابقہ میں سے ہیں، اور تین موجودہ اُمت میں سے ہیں۔ حضرت مریم اور حضرت آسیہ اِمرأۃِ فرعون یہ پہلی اُمتوں میں سے ہیں، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، یہ اِس اُمت میں سے ہیں، بہرحال یہ پانچ عورتیں تمام دُنیا کی عورتوں کے مقابلے میں افضل ہیں، اور کُلّی فضیلت اِن میں سے کس کو حاصل ہے؟ اِس میں علماء کا کچھ اختلاف ہے، کسی کا رُجحان کدھر ہے اور کسی کا کدھر ہے، اس میں کوئی قطعی بات نہیں ہے۔ اور عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ سے یہ مراد بھی ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں جتنی عورتیں موجود تھیں ان کے مقابلے میں حضرت مریم کو فضیلت کُلّی حاصل تھی، پھر اس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں، جس طرح سے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ جاثیہ:۱۶) اس قسم کے الفاظ جو آتے ہیں تو وہاں یہی توجیہ کی جاتی ہے کہ اُس زمانے میں جو لوگ موجود تھے اُن کے مقابلے میں اِن کو فضیلت حاصل تھی، یا بعض جزوی جزوی واقعات میں ساری دُنیا کے مقابلے میں اِن کو فضیلت حاصل تھی، کہ جیسا برتاؤ اللہ تعالیٰ نے اِن کے ساتھ کیا ایسا برتاؤ کسی دُوسرے کے ساتھ نہیں کیا۔

حضرت مریم علیہا السلام کو نماز کا حکم

''اے مریم! اللہ کی عبادت کر اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ'' یعنی جو لوگ اہتمام کے ساتھ رکوع کرتے ہیں اُن کے ساتھ رکوع کر، جس طرح بعض لوگ غفلت برت جاتے ہیں اور رکوع صحیح نہیں کرتے، ایسے نہ کرنا۔ یا بعضوں نے کہا ہے کہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کر، جس طرح سے دوسرے لوگ پڑھتے ہیں تو تو بھی ساتھ شامل ہو جایا کر، چنانچہ اپنے محراب میں رہتی ہوئی اور اپنے حجرے میں رہتی ہوئی حضرت مریم علیہا السلام دوسروں کے ساتھ مل کر نماز پڑھ لیتی تھیں۔ یا رکوع کا لفظ عاجزی کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، کہ عاجزی کرنے والوں کے ساتھ مل کر عاجزی کر، یہ مفہوم بھی ہوسکتا

---

(۱) لَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ (بخاری، ۱/ ۵۳۲۔ مشکوۃ، ۲/ ۵۰۹) حَسْبُكَ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ مَرْيَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَخَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَآسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ۔ (ترمذی، ۲/ ۲۲۷۔ مشکوۃ، ۲/ ۵۷۳)

ہے۔ بہر حال سجدہ اور رکوع کے ساتھ جو لفظ قنوت ہے اس سے اگر قیام مراد لے لیا جائے تو نماز کے تینوں رکن اِس میں آجاتے ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے اِن کو وقف کیا گیا تھا تو فرشتے اُسی کی تاکید کر رہے ہیں کہ اللہ کی عبادت میں لگی رہ۔

گزشتہ واقعات کا بیان کرنا دلیلِ نبوّت ہے

(ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ) پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جب بھی گزشتہ واقعات میں سے کوئی واقعہ قرآنِ کریم میں بیان کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کی دلیل بنا کر بھی پیش کرتے ہیں، تاریخ کا یہ حصہ جس میں حضرت مریم علیہا السلام کے صحیح حالات، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا صحیح قصہ، یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو بنی اسرائیل مسخ کر بیٹھے تھے، یا بعض حصے ایسے ہیں جن کو وہ ضائع کر بیٹھے تھے، تو اِن اُمیوں کو تو کیا پتہ ہوتا، مکہ مکرمہ میں رہنے والے لوگوں کو تو یہ صحیح حالات کیا معلوم ہوتے، خود بنی اسرائیل کو بھی صحیح حالات معلوم نہیں تھے، اُن کے ذخیرے میں بھی اِس کے متعلق صحیح حالات نہیں تھے، اب اتنی صفائی کے ساتھ اِن حالات کو پیش کر دینا کہ جزئیات بھی سامنے آگئیں، اور اتنے اعتماد کے ساتھ یہ چیزیں بتائی جارہی ہیں کہ جس کا جاننے والا اُس ماحول میں سرے سے ہے ہی کوئی نہیں، بلکہ کتابوں کے ذخیرے بھی اِس سے خالی ہیں، یہ علامت ہے اِس بات کی کہ سرورِ کائنات ﷺ کو علم براہِ راست اللہ کی طرف سے دیا جارہا ہے، اور یہی دلیل ہے آپ کی نبوّت اور رسالت کی، تو آگے اِسی کی طرف متوجہ کیا کہ ''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے'' یعنی یہ ماضی کے حالات ہیں جو آپ کے سامنے نہیں ہیں، ''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو آپ کی طرف ہم وحی کرتے ہیں، آپ اُن کے پاس نہیں تھے جب وہ لوگ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے'' یہ قلموں کا ڈالنا قرعہ اندازی کے لئے تھا کہ مریم کو کون سنبھالے؟ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ، جس کا ذکر کل میں نے آپ کی خدمت میں کر دیا تھا، کہ قرآنِ کریم سے اتنا تو ثابت ہوا کہ مریم کی کفالت کے لئے قرعہ ڈالا گیا اور یہ فیصلہ قرعہ کے ساتھ ہوا، لیکن قرعہ ڈالنے کی صورت کیا تھی؟ یہ بات تفسیری روایات میں ہے (قرآنِ کریم میں اس کا ذکر نہیں) کہ جاری پانی کے اندر قلمیں ڈالی گئیں، اور جس کی قلم مخالف سمت کو چلی اُس کو کامیاب قرار دیا گیا، اور حضرت زکریا کی قلم مخالف سمت کو چل گئی، قرآنِ کریم سے تو اتنا معلوم ہوا کہ قرعہ ڈالا گیا مریم کو سنبھالنے کے لئے، اِس کی صورت جو بھی ہو۔ ''اور نہ آپ اُن کے پاس تھے جب وہ آپس میں اس معاملے میں جھگڑا کر رہے تھے'' یعنی اِسی مریم کی کفالت کے بارے میں، یا، اسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کرنا چاہیے یا نہیں، کیونکہ یہ بات سابقہ روایت کے خلاف تھی، لڑکیوں کو مسجد کی خدمت کے لئے نہیں لیا جاتا تھا، اِس بارے میں اُن کا کوئی اختلاف ہوا ہو، اور آپس میں بحثا بحثی کے ساتھ آخر میں یہ بات طے ہوگئی کہ اِس کو لے لیا جائے، اور لینے کے بعد پھر یہ بات ہوئی کہ اب اس کو سنبھالے کون؟ اور ہر کوئی اِس خیر کو اپنے حصے میں ڈالنا چاہتا تھا، کیونکہ مریم اتنی قبول صورت تھی اور اس طرح سے اُس پر آثار طاری تھے کہ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اِس کو میں سنبھالوں، اور تھی بھی وہ اُن کے بڑے عالم عمران کی لڑکی، جس کو اُس وقت مسجد میں امامت کا درجہ حاصل تھا، لیکن وہ اِن کے پیدا ہونے سے پہلے وفات پا گئے تھے، وہ اُس وقت موجود نہیں تھے ورنہ وہ خود ہی اس کو سنبھالتے، چونکہ وہ مسجد میں امام بھی تھے تو خود سنبھالتے، لیکن وہ وفات پا گئے تھے، اس لیے اس تعلق کی بناء

پر ہر کوئی چاہتا تھا کہ اِس لڑکی کو میں سنبھالوں، تو فیصلہ کرنے کے لئے قرعہ ڈالا گیا۔ جب اُن میں یہ گفتگو جاری تھی اور جھگڑا ہورہا تھا اُس وقت بھی آپ پاس نہیں تھے، اور جب وہ قلمیں ڈال رہے تھے اُس وقت بھی پاس نہیں تھے، اور کتابوں میں صحیح حالات ہیں نہیں، آپ کے علاقے میں اِن کو جاننے والا کوئی نہیں، تو پھر لازماً اِس کا ذریعہ یہی ہے کہ ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، جب آپ پر وحی آتی ہے تو اِس میں آپ کی حیثیت بھی نمایاں ہوگئی کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ تو ایسے واقعات کو حضور ﷺ کی نبوّت کی دلیل کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

حضرت مریم کو بیٹے کی خوشخبری

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ: حضرت مریم کے ابتدائی حالات ذکر ہوئے، اور اس کے بعد جس وقت یہ بالغ ہوگئیں تو انہوں نے غسل کرنے کے لئے علیحدگی اختیار کی، سورۂ مریم کے اندر لفظ آئیں گے اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا، اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں حضرت مریم علیہا السلام کے پاس تشریف لائے، وہیں یہ الفاظ آئیں گے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا: ایک تندرست بشر کی صورت میں تمثّل کیا، صورت اختیار کی، اور حضرت مریم علیہا السلام کو یہ بشارت دی، اور بشارت دی اللہ کی طرف سے ایک کلمے کی۔

عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کیوں کہا گیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے کلمات بے انتہا ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا، سورۂ کہف میں آپ کے سامنے آئے گا کہ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ (آیت:۱۰۹) اگر سمندر کی سیاہی بنادی جائے اور اللہ تعالیٰ کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو یہ سیاہی کا سمندر ختم ہوجائے گا لیکن اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔ اُن کلمات میں سے ایک کلمہ وہ ہے جس کی بشارت حضرت مریم کو دی گئی، گویا کہ ابتدا سے ہی اِس بات کی طرف نشاندہی کر دی گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلمۂ کُن کے ساتھ براہِ راست ہوگی، اِس میں اُس طرح سے اسباب کا دخل نہیں ہوگا جس طرح سے عام طور پر بچّے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کُن کا اثر ہوگا، اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کُن سے پیدا ہونے والے۔ اگرچہ باقی کائنات بھی اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کُن سے بنتی ہے، لیکن اُس کے لئے چونکہ ظاہری اسباب اختیار کئے جاتے ہیں، اور یہ شریعت کا ایک محاورہ ہے کہ جو کام ظاہری اسباب کے طور پر ہو اُس کی نسبت تو ظاہر کی طرف کی جاسکتی ہے، اور جو ظاہری اسباب کے خلاف ہوتا ہے اُس کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے، جیسے قرآنِ کریم میں ہی آپ کے سامنے آئے گا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (سورۂ انفال:۱۷) آپ نے نہیں پھینکا جب آپ نے پھینکا تھا، لیکن اللہ نے پھینکا۔ اب اِذْ رَمَيْتَ میں رمی کی ظاہری نسبت تو حضور ﷺ کی طرف ہے، بدر کے اندر جو آپ نے مٹھی بھر کے کنکریاں پھینکی تھیں، لیکن اُس پر اثر چونکہ ایسا مرتّب ہوا جو عام طور پر ایک مٹھی کنکریوں پر مرتّب نہیں ہوسکتا ظاہری حالت کے اعتبار سے، اس لیے اُس کے آثار کی

طرف دیکھتے ہوئے اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی اور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے اُس نسبت کی نفی کردی گئی چونکہ یہ اثر ظاہری اسباب کے خلاف تھا، کہ اگرچہ ظاہری طور پر وہ کنکریوں کی مٹھی آپ نے پھینکی تھی، لیکن آثار کی طرف دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ مَارَمَیْتَ: آپ نے نہیں پھینکی، لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی: یہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے۔ اسی طرح تلوار کے ساتھ آپ ایک آدمی کو قتل کریں تو نسبت آپ کی طرف کردی جائے گی کہ فلاں شخص کو قتل کردیا، لیکن اگر آپ نے چھوٹی سی کنکری اٹھا کر ماری اور اتفاقاً وہ مرگیا، تو کنکری کے ساتھ چونکہ کسی انسان کا مرجانا عام عادت نہیں ہے، اس لئے جو سنے گا یہی کہے گا کہ بس اللہ کی طرف سے اُس کی موت ہی آئی ہوئی تھی، اللہ نے اُسے ماردیا، ورنہ کنکری میں تو ایسی طاقت نہیں ہوتی کہ انسان کو ماردے۔ تو جو نتیجہ ظاہری اسباب کے خلاف آیا کرتا ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف کردی جاتی ہے، ورنہ جتنی کائنات ہے وہ ساری اللہ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئی ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کلمہ اسی لئے قرار دیا گیا کہ بچوں کے پیدا ہونے کے لئے جو عام طور پر اسباب ہوتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے وہ مکمل اسباب اختیار نہیں کئے گئے۔

بوقتِ بشارت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف کیوں؟

اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ: ان الفاظ کی وضاحت آپ کے سامنے ترجمے میں کردی گئی تھی، لیکن اس میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ولادت سے قبل جب بشارت دی جارہی ہے، تو "ابنِ مریم" کا لفظ ساتھ جوڑا جارہا ہے عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ، ایسے انداز سے اِس کو ذکر کیا جارہا ہے گویا کہ "ابنِ مریم" اُن کے نام کا حصہ ہے، اِس سے بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی نسبت ماں کی طرف ہی ہوگی، ورنہ عام طور پر رواج یہ ہے کہ بچے کی نسبت باپ کی طرف ہوا کرتی ہے، اگر عیسیٰ علیہ السلام کا ظاہری اسباب میں کوئی باپ ہوتا تو نسبت اُس کی طرف ہونی چاہیے تھی، تو پیش گوئی میں بھی انداز ایسا اختیار کیا گیا جس میں نشاندہی کردی گئی کہ ان کی نسبت ماں کی طرف ہی رہے گی، اِس لئے قرآنِ کریم ان کو اکثر و بیشتر ابنِ مریم کے عنوان سے ذکر کرتا ہے، اور پیش گوئی کے اندر بھی عنوان یہی آیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفاتِ حمیدہ

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: اِس لفظ سے حضرت مریم علیہا السلام کے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ نہ خیال کرنا کہ جب اِس بچے کا باپ کوئی نہیں ہوگا اور یہ مریم کا ہی بیٹا ہوگا تو ایسے بچوں کو عموماً معاشرے کے اندر عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، کیونکہ بچوں کو جو عزت ملا کرتی ہے عموماً آبائی خاندان سے ملتی ہے، اور جس بچے کے سر پر کوئی باپ نہ ہو اُس کو معاشرے میں کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، لیکن وہ بچہ ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ اُس کی تحقیر کریں یا دُنیا کے اندر اُس کو عزت نہ ملے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو وجاہت ملے گی دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، ذی وجاہت ہوگا، باعزت ہوگا، اُس کی سرداری والی شان ہوگی دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب وَجِيهًا قرار دیا گیا تو اُس کا یہ مطلب نکل آیا کہ اگر لوگ ان پر کوئی الزام لگائیں گے بھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کی صفائی دیں گے اور صفائی دے کر ان کی عزت کو بحال کریں گے۔ قرآنِ کریم میں وَجِيهًا کا لفظ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی استعمال کیا گیا سورۂ احزاب کے آخری رکوع میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا: اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بری ثابت کیا، یعنی موسیٰ علیہ السلام پر غلط الزام لگا کر تکلیف پہنچائی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی برأت کی، کہ یہ جو عیب موسیٰ علیہ السلام پر لگاتے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام میں نہیں ہے، وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام ذی وجاہت ہیں۔ تو جس طرح وہاں غلط الزام کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وجاہت کو لوگوں کے سامنے نمایاں کیا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی اگر کوئی الزام لگائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس الزام کو دور کر کے اِن کی وجاہت قائم فرمائیں گے۔ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ: دُنیا میں بھی ذی وجاہت ہوں گے اور آخرت میں بھی ذی وجاہت ہوں گے، باوقار، باعزت، سرداری کی شان والے۔ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ: اور اللہ تعالیٰ کے مقربوں میں سے ہوں گے، نیک ہوں گے، مقربین کی شان اُن کے اندر پائی جائے گی۔ وَیُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا: اور اللہ تعالیٰ بچپن سے ہی اُن کو اس قسم کے حالات دیں گے جن سے اُن کی مقبولیت پر صراحتاً استدلال کیا جا سکے گا، کہ عام بچوں کی عادت کے خلاف بالکل چھوٹی عمر میں جبکہ بچے بولتے نہیں ہیں وہ بولے گا، ماں کی گود میں باتیں کرے گا اور بڑی عمر میں بھی باتیں کرے گا، یعنی اُس کی دونوں باتیں بچپن کی اور کہولت کی، ایک ہی شان کی ہوں گی، یہ نہیں کہ بچے اگر باتیں کرنے لگ بھی جائیں تو اُن میں کوئی معنویت نہیں ہوتی، ایسے ہی بے ڈھنگے پن سے باتیں کرتے ہیں، جن کا کوئی مفہوم نہیں بنتا، ایسی باتیں نہیں ہوں گی، بلکہ علم وحکمت پر مبنی باتیں ہوں گی، جیسے بڑی عمر میں بات کریں گے ویسے ہی چھوٹی عمر میں بات کریں گے، اور یہ بھی عام حالات کے خلاف ہے۔ وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ: اور شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔

بیٹے کی بشارت پر حضرت مریم کا سوال اور اس کا مقصد

حضرت مریم کو یہ یقین تو آ گیا کہ یہ بشارت اللہ کی طرف سے ہے، لیکن پہلے کم از کم دو موقعے آپ کے سامنے ایسے گزر چکے ہیں کہ یقین کے باوجود کیفیت کے متعلق سوال ہوتا ہے، پہلے تو سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ آیا تھا: رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى، اللہ تعالیٰ نے پوچھا تھا کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ (آیت: ۲۶۹)، اطمینان قلبی کے لئے کیفیت پوچھی جا رہی ہے۔ اور پھر دوسرے نمبر پر چند آیات پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ آیا تھا کہ جب انہیں یحییٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے بھی یہی سوال کیا کہ رَبِّ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ، چونکہ ظاہری اسباب موجود نہیں تھے، تو سوال کیا کہ یہ بچہ کیونکر ہوگا؟ تو اطمینانِ قلبی کے لئے کیفیت پوچھی جاتی ہے، ورنہ یہ نہیں کہ دل میں یقین نہیں ہے، جب ایک چیز ظاہری اسباب کے خلاف پیش آ رہی ہے تو اس وقت دل میں یہ ایک بات آتی ہے کہ آخر وہ کس طرح ہوگی، اُس کے لئے کیا اسباب اختیار کئے جائیں گے؟ اب حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے پہلے ایسا کوئی نمونہ نہیں ہے کہ کسی عورت کو مرد مس نہ کرے اور معمول کے مطابق اُس کو بچہ ہو جائے، ایسا کوئی نمونہ سامنے نہیں، پھر نیک عورت، پاکدامن عورت، ولیہ، صدیقہ، جتنے اچھے سے اچھے الفاظ آپ اُن کے لئے استعمال کر سکتے ہیں وہ سارے اُن پر صادق آتے ہیں، تو انہوں نے بھی یہی سوال کیا کہ

اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ: میرے لئے بچہ کیسے ہوگا؟ وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ یہ نکرہ تحت النفی ہے، مجھے کسی بشر نے مس نہیں کیا، اور ''مس کرنا'' یہاں جماع سے کنایہ ہے، صرف ہاتھ لگانا مراد نہیں ہے، کیونکہ صرف ہاتھ لگانا کافی نہیں ہوتا، اولاد کے لئے مرد وعورت کا جو سلسلہ ہوا کرتا ہے اُسی طرف اشارہ ہے۔ اور یہاں چونکہ دوسرا لفظ نہیں آیا اس لئے یہ جائز اور ناجائز دونوں کو شامل ہے کہ کسی انسان نے میرے ساتھ مجامعت نہیں کی، کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا، میرے لئے بچہ کیسے ہوگا؟ کیونکہ عام طور پر عادت یہی ہے کہ مرد اور عورت مجامعت کرتے ہیں تبھی جا کر اولاد ہوتی ہے۔ سورۂ مریم کے اندر دو لفظ آئیں گے لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا، تو چونکہ لَمْ اَكُ بَغِيًّا کا لفظ وہاں آیا ہوا ہے کہ میں کوئی بدکارہ بھی نہیں ہوں، اس لیے لَمْ يَمْسَسْنِيْ سے وہاں مراد ہوگا کہ جائز طریقے سے، یعنی جائز طریقے سے بھی میرے پاس کوئی آدمی نہیں آیا، اور میں کوئی بدکارہ بھی نہیں، تو پھر بچہ کس طرح ہو جائے گا؟ قَالَ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا كَذٰلِكِ: انہی حالات میں، یعنی بغیر مسِ بشر کے، اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ: اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ

اور حضرت مریم علیہا السلام کے سوال وجواب کے سلسلے میں یہ بات پوری طرح سے واضح ہوگئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کسی مرد کی طرف نہیں ہے، صرف حضرت مریم کی طرف ہے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت مریم کا پورا قصہ سورۂ مریم کے اندر مذکور ہے، کہ نفخۂ جبریلی کے ساتھ اُن کو حمل ٹھہر گیا، اور پھر وہ آبادی سے کہیں دور چلی گئیں، اکیلی تھیں، طبیعت پر غم کا اثر بھی تھا، کہ ٹھیک ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سب کچھ پیش آ رہا ہے، لیکن کل کو جب میں بچہ لے کر قوم کے پاس جاؤں گی تو قوم مجھے کیا کہے گی، اور پھر میں اکیلی عورت، اکیلی جان، کہاں میں صفائیاں دوں گی اور میری صفائی کون مانے گا، یہ طبعی طور پر اس قسم کے حالات خیالات انسان کے اوپر طاری ہوتے ہیں، اس لئے جب یہ بچہ اُن کے ہاں پیدا ہو رہا تھا تو اُن کے منہ سے یہ الفاظ بھی نکلے جو قرآنِ کریم نے نقل کئے يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (سورۂ مریم: ۲۳) ہائے کاش! کہ میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میں بالکل ہی بھولی بسری ہو جاتی کہ کوئی شخص مجھے جانتا ہی نہ، میں بالکل ہی فراموش ہو جاتی۔ اِس قسم کے حالات کے دباؤ کے تحت انسان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اور یہ انسانی طبیعت کا ایک تقاضا ہے، تو اسی غم اور فکر کی بناء پر اس قسم کے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے۔ اور پھر ہوا بھی ایسے ہی، کہ جس وقت وہ بچے کو لے کر آئیں تو قوم میں شور مچ گیا، سارے کے سارے لوگ اکٹھے ہو کے آ گئے، اور اُنہوں نے آ کر یہی اعتراض کیا جس کی توقع تھی، وہیں (سورۂ مریم میں) آگے یہ الفاظ ہیں: مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا: کہ مریم! یہ کیا کر لیا؟ تیرا تو باپ بھی برا نہیں تھا، تیری تو ماں بھی بدکارہ نہیں تھی۔ مطلب یہ کہ اچھے خاندان کی لڑکی تھی، تُو یہ کیا کر لائی؟ سب کا ذہن اِدھر ہی گیا، اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے صفائی دی، اور پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ جب یہ قوم آئے گی اور اس قسم کا سوال کرے گی تو تُو نے بولنا نہیں ہے، اور اُس شریعت کے اندر خاموشی کا روزہ بھی ہوا کرتا تھا، کہ روزہ رکھ لیا کہ میں بولوں گی نہیں، اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (سورۂ مریم) میں نے رحمٰن کے لئے روزے کی نذر مان رکھی ہے، آج میں کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ تو جب اُنہوں نے سوال کیا تو فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ: بچے کی طرف اشارہ کر دیا، جس کا مطلب یہ

تھا کہ اِسی سے پوچھو۔ وہ کہنے لگے کہ ہم اِس سے کیا پوچھیں؟ یہ تو ابھی چھوٹا سا بچہ ہے، کچھ بتا ہی نہیں سکتا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وعظ شروع کر دی: قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ (سورۂ مریم)۔ تو یُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ سے وہی وعظ مراد ہے جو گود کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی اور اپنی ساری کی ساری حیثیت واضح کر دی۔

اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ: اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے، جس وقت وہ فیصلہ کرتا ہے کسی امر کا سوائے اِس کے نہیں کہ اُس کو کہہ دیتا ہے ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ظاہری اسباب کے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ باقی! وہ بچہ کوئی معمولی نہیں ہوگا، ایسی شان کا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا (اِن لفظوں کی تشریح بھی آپ کے سامنے ترجمے میں کر دی گئی تھی) توراۃ اور انجیل اللہ تعالیٰ سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر اُٹھائے گا یَبْعَثُهٗ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ۔ اور یہ خبر دیتے ہوئے وہ آئیں گے (مُخْبِرًا بِاَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ) میں تمہارے رَبّ کی طرف سے دلیل لے کر آیا ہوں اپنی نبوّت پر اور اپنی رسالت پر، اِس دلیل سے معجزہ مراد ہے جس کے ساتھ حسی طور پر نبی اپنی نبوّت کو ثابت کرتا ہے، اور اُس اٰیۃ کی تفصیل یہ ہے جو اگلے الفاظ میں نقل کر دی گئی۔

عیسیٰ علیہ السلام کے پھونک مارنے والے معجزے کا ذِکر اور اس کا مقصد

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس قسم کے معجزات دیے تھے، کہ مٹی سے ایک پرندے کی شکل بنا لیتے، جس طرح سے تصویر بنائی جاتی ہے، اور ایسی تصویر بنانا اُن کی شریعت کے اندر جائز تھا، کیونکہ جس وقت وہ بناتے تھے تو یہ ایک بُت کی شکل ہی بنتی ہے جیسے چڑیا کی شکل بنالی، کبوتر کی شکل بنالی، کوئی اور شکل بنالی، جب مٹی کی بنائیں گے تو جس وقت تک اُس میں جان نہیں پڑے گی تو وہ ایک قسم کا بے جان بُت ہے، اور اس قسم کی تصویر سازی اُن کی شریعت میں جائز تھی، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرے میں بھی سورۂ سبا میں آئے گا کہ جنات اُن کے لئے تماثیل یعنی تصویریں بنایا کرتے تھے، اور ہماری شریعت میں اِس کی اجازت منسوخ ہوگئی، اور اِس قسم کی چیز کا بنانا چاہے لکڑی کی ہو، ربڑ کی ہو، مٹی کی ہو، پیتل، تانبے، چاندی کی ہو، جیسی بھی ہو، جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے، جائز نہیں ہے، اُن کی شریعت میں جائز تھی۔ تو تصویر بنا لیتے، بنا لینے کے بعد اس میں پھونک مارتے، تو وہ پرندہ بن کر اُڑ جاتا، اور اِس معجزے میں بھی گویا حسی طور پر لوگوں کے ذہن سے اس اِشکال کو دُور کرنا مقصود تھا کہ بغیر ظاہری اسباب کے عیسیٰ علیہ السلام کس طرح پیدا ہوگئے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندے کے ہاتھ پر اِس قدرت کو ظاہر کر دیا، کہ اگر ایک بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ چیز حاصل ہے کہ بے جان چیز میں پھونک مارتا ہے اور وہ پرندہ بن کر اڑ جاتا ہے، تو اگر اِس کی اِس پھونک کے اندر اللہ تعالیٰ نے بے جان چیزوں میں جان ڈالنے کا اثر رکھا ہے تو جس کی یہ مخلوق ہے اور جس کی طرف سے اس کو یہ چیز حاصل ہو رہی ہے اُس کی قدرت کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے؟ کہ اُسی نے جبریل کو بھیجا، جبریل نے پھونک ماری اور مریم کے بطن میں عیسیٰ کا وجود ہوگیا، تو جیسے عیسیٰ کی پھونک کے ساتھ بے جان چیز میں جان پڑتی ہے اسی طرح جبریل کے نفخ کے ساتھ بھی بے جان چیز میں جان پڑگئی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوگئے، گویا کہ یہ معجزہ بھی خود اُن کی ولادت کے لئے ایک حسی دلیل ہے۔ اور پھر

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اثرات دیکھئے، ایک وقت میں تو اُن کے نفخ اور پھونک کے اندر بے جان چیزوں میں جان ڈالنے کی تاثیر رکھ دی، اور دوسرا وقت آئے گا جب آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے یہ اُتریں گے تو سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کافر کو ان کے سانس کا اثر پہنچے گا وہ مرجائے گا،[1] یعنی ایک وقت میں اِسی سانس اور اِسی پھونک کے اندر جان ڈالنے کی تاثیر رکھ دی، اور دُوسرے وقت میں اِسی پھونک کے اندر مارنے کی تاثیر رکھ دی، کہ جہاں تک اُن کی نظر جائے گی وہاں تک اُن کے سانس کا اثر جائے گا، جس کافر کی طرف منہ کرکے پھونک ماریں گے وہ وہیں ختم ہوجائے گا، جیسے بے جان چیزوں میں جان پڑ رہی ہے اِسی طرح جاندار چیز سے جان نکل رہی ہے کہ ایک پھونک کے ساتھ ہی معاملہ ٹھیک ہوجائے گا، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ کوئی بعید نہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کے دیگر معجزات کا ذِکر اور ان کی حقیقت

اور اگلے معجزات کی حالت ایسے ہی ہے کہ اُس زمانے میں طب اور ڈاکٹری کا بہت زور تھا، بڑے بڑے ماہر طبیب اور بڑے بڑے اچھے معالج موجود تھے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت ہے کہ جس وقت کسی نبی کو بھیجتے ہیں تو اُس زمانے میں جس قسم کے کمالات لوگوں کے اندر ہوتے ہیں جن کو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا کمال ہے اللہ تعالیٰ نبی کے ہاتھ سے اُن کو اُسی میدان میں عاجز کرتا ہے، جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ واقعی اِس کا تعلق کسی بڑی ہستی سے ہے اور یہ انسانی بس سے باہر ہے جو کچھ یہ کرکے دکھاتا ہے۔ اب وہ حکیم طبیب اور ڈاکٹر موجود تھے، وہ بھی بیماریوں کا علاج کرتے تھے، لیکن اُن میں سے کسی کے پاس یہ دوا نہیں تھی کہ مادر زاد اندھے کو سوانکھا کردے، اور نہ ہی کوڑھ کا علاج تھا، اور مُردے کو زندہ کرنے کی تو کیا ہی بات ہے، وہ تو کسی میں کیا طاقت ہوسکتی ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزات ایسے دیے جن کے سامنے اُس وقت کے باکمال لوگ عاجز آگئے، اور وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ واقعی یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ کسی بندے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور پھر یہ صحت جو حاصل ہوتی ہے ظاہری اسباب کے خلاف، بغیر ظاہری اسباب کا ارتکاب کرنے کے، کہ ایک اندھا آیا اور اُس کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اُس کی آنکھیں ٹھیک ہوگئیں، اب یہ منہ پر ہاتھ پھیر دینا یا آنکھوں پر ہاتھ پھیر دینا یہ کوئی آنکھیں بنانے والی بات تو نہیں ہے، لیکن اللہ نے اثر رکھ دیا، اِس لئے معجزے میں یہ بات ہوا کرتی ہے کہ اُس میں ظاہری اسباب سے تمسک نہیں ہوا کرتا، بلکہ بغیر ظاہری اسباب کے ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اُس قسم کا کام ظاہری اسباب کے طور پر کرنے پر قادر بھی ہوجائے تو بھی معجزے کے اندر معجزے والی شان باقی رہا کرتی ہے (یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے!) ظاہری اسباب کے طور پر اگر کوئی شخص اس قسم کا کام کرنے پر قادر ہوبھی جائے تو بھی معجزے میں نقص نہیں آتا، کیونکہ نبی جو یہ کام کرکے دکھایا کرتا ہے اُس میں ظاہری اسباب اختیار نہیں کیے جاتے۔ مثال کے طور پر اب اگر ڈاکٹری اتنی ترقی کرجائے کہ مادر زاد نابینا کی آنکھوں کا آپریشن کیا جائے، اور اُس میں کسی دوسرے جانور کا ڈھیلا فٹ کردیا جائے، اور اندر سے رگیں جوڑ دی جائیں، کیونکہ دماغ کے اندر وہ نُور تو بسا اوقات باقی ہوتا ہے، لیکن آگے شیشہ

---

(۱) مسلم، ۲/۴۰۱، باب ذکر الدجال/ مشکوۃ، ۲/ ۴۷۳، باب العلامات۔ ولفظه: فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيحَ نَفَسِهِ إِلَّا مَاتَ وَنَفَسُهُ يَنْتَهِي حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ

خراب ہوتا ہے۔آنکھوں میں دونوں قسم کی بیماریاں ہوتی ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ پیچھے سے نُور تو ہے لیکن آگے سے بلب فیوز ہوگیا، وہ ٹھیک نہیں ہے، اس لیے روشنی نہیں دیتا۔اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ بلب تو ٹھیک ہے، پیچھے سے نُور ختم ہوگیا، تو آنکھوں میں دونوں قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ بسا اوقات پیچھے سے نُورانیت ختم ہوجاتی ہے، ڈھیلا ٹھیک ہوتا ہے، اس لیے کئی لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھ دیکھنے میں بالکل ٹھیک ہوگی لیکن نظر نہیں آئے گا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پیچھے چشمۂ نُور ختم ہوگیا۔اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نُور تو پیچھے ہے لیکن آگے سے آنکھ کا ڈھیلا خراب ہوگیا، ڈھیلا خراب ہونے کی دونوں صورتیں ہیں کہ بلب ٹوٹ گیا یا اس کے اوپر پردہ آگیا، یہ جو سفید موتیے کا آپریشن کرتے ہیں یہ پردہ آیا ہوا ہوتا ہے، پانی آکر ڈھیلے کے سامنے جم جاتا ہے، ڈاکٹر اندر سے پردہ اُٹھا دیتا ہے تو ڈھیلا ٹھیک ہوجاتا ہے اور روشنی بھی ہوجاتی ہے اور ٹھیک نظر آنے لگ جاتا ہے۔اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ڈھیلا ہی بیٹھ جاتا ہے، یہ ایسے ہے جیسے بلب ٹوٹ گیا، اب یہ تجربے آج کل ہورہے ہیں کہ ایسے شخص کی آنکھ میں اگر کسی دوسرے کی آنکھ لگادی جائے، مثلاً ایک آدمی قریب المرگ ہے اور وہ اجازت دے دیتا ہے کہ میری آنکھ نکال لینا (کیونکہ مرنے کے بعد تو پھر کوئی عضو کام نہیں آتا، زندہ زندہ کا نکال لیا جائے تو اُس میں حیات کا اثر ہوتا ہے) اور وہ ڈھیلا نکال کر دُوسرے میں فٹ کردیا جائے، اور اُس کے پیچھے منبعِ نُور ٹھیک ہو، تو ایسے وقت میں نظر آسکتا ہے۔لیکن اب اِس کے لیے آپ جانتے ہیں کہ کتنے اسباب اختیار کئے جائیں گے اور کتنا دھندا کیا جائے گا؟ کتنا اِس میں وقت لگے گا؟ کتنی اِس میں مشقت ہوگی؟ اور ایک یہ ہے کہ نبی آنکھ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور وہ ٹھیک ہوجاتا ہے، تو یہ پھر بھی معجزہ ہے، چاہے ڈاکٹر اس طرح سے تجربہ کرکے کامیاب ہوہی جائیں تو بھی اِس معجزے کے اندر معجزہ ہونے کی حیثیت میں فرق نہیں آتا، کیونکہ اِس میں ظاہری اسباب اختیار نہیں کئے جاتے۔اسی طرح اگر کوڑھ کا علاج دریافت ہوہی جائے، اگرچہ آج بھی اِس کو تقریباً لاعلاج مرض قرار دیا جاتا ہے، الا ماشاء اللہ کسی کو آرام آجائے، ورنہ یہ لاعلاج مرض ہے، لیکن اگر کسی وقت اِس کا علاج دریافت ہوہی جائے کہ یہ بھی اگر ٹھیک ہوجائے، ڈاکٹر اِس کا علاج کرنے میں کامیاب ہوجائیں، تو کتنی مدت تک ٹیکے لگانے پڑیں گے؟ کتنی دیر تک مسہل دینے پڑیں گے؟ کتنی دیر تک مرہمیں استعمال کرنی پڑیں گی؟ تب جاکر یہ ہاتھوں اور پاؤں کے زخم ٹھیک ہوں گے اور خون صاف ہوگا اور بدن کی حیثیت ٹھیک ہوگی (کوڑھ یہ ہوتا ہے کہ جس میں بدن گلنا شروع ہوجاتا ہے، ہر طرف زخم ہی زخم ہوجاتے ہیں، اور پانی بہتا ہے، پیپ بہتی ہے، اِس طرح ہوتا ہے جیسے بدن گلتا جارہا ہے) تو اِس کا علاج اگر ہو بھی جائے تو اس کے لیے بڑی طویل مدت چاہیے، بہت محنت چاہیے، بہت اخراجات چاہئیں، تب جاکر وہ ٹھیک ہوگا۔اور ایک یہ ہے کہ مریض آیا اور ہاتھ پھیرا اور وہ ٹھیک ہوگیا، تو اگر اِس کا علاج دریافت ہو بھی جائے تو بھی اِس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اور اگلا جو اِحیائے موتٰی کا معجزہ ہے اُس کا تو ابھی تک تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، کہ ایک آدمی مرگیا، اور واقعی مرگیا، ڈاکٹروں نے تصدیق کردی کہ مرگیا ہے، اِس کے اندر اَب جان نہیں ہے، اور کوئی آکر کہے کہ قُمْ بِإِذْنِ اللهِ: اُٹھو! اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہوجائے، اِس میں تو جتنا عجز دوسرے کا نمایاں ہے وہ ظاہر ہی ہے۔اب یہ چیزیں جو یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کے طور پر ذکر کی جارہی ہیں یہ اُس وقت کے باکمال لوگوں کو عاجز کرنے والی باتیں ہیں۔جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا زور تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات دیے گئے کہ اُن کے مقابلے میں جادوگر عاجز آگئے۔سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں

لوگوں کو فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا، اور وہ لوگ دوسروں کو اپنے مقابلے میں گونگا سمجھا کرتے تھے، تو یہاں ایسی فصاحت و بلاغت اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی کہ بڑے بڑے فصحاء اور بلغاء کے گھٹنے لگ گئے، تو اللہ تعالیٰ معجزات ہر زمانے میں اُسی حیثیت کے مطابق دیتے ہیں جس قسم کے حالات ہوتے ہیں۔

معجزات اور کرامات کے متعلق مشرک اور موحد کے نظریے میں فرق

اور یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں احیاءِ موتیٰ بھی ذکر کیا گیا ہے، اب آپ جانتے ہیں کہ مردے کو زندہ کرنا، بے جان چیز کے اندر جان ڈال دینا، اصل کے اعتبار سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ خصوصی صفت ہے، مُحْيِي وَمُمِيْت وہی ہے، زندہ کرنے والا وہی، مارنے والا وہی، اور یہاں ہے اُحْيِ الْمَوْتٰى: میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں، تو یہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی طرف کر رہے ہیں، اس میں توحید جو محفوظ رہتی ہے تو بِاِذْنِ اللّٰهِ کے لفظ کے ساتھ محفوظ رہتی ہے، کہ میں یہ جو کچھ کرتا ہوں اللہ کی اجازت سے کرتا ہوں، اللہ کے اِذن سے کرتا ہوں، اللہ اس چیز میں اثر رکھیں گے تو ہوگا، نہیں رکھیں گے تو نہیں ہوگا، مشرک میں اور موحد میں فرق یہی ہوتا ہے۔ خیال فرمائیے......! کرامات کے طور پر بزرگوں کی طرف اِس قسم کی باتیں جو منسوب کر دی جاتی ہیں جو عام طور پر لوگوں میں نہیں پائی جاتیں یا لوگوں کے بس کی نہیں ہوتیں، یا انبیاء علیہم السلام کے معجزات جو کہ صحیح روایات کے اندر آئے ہوئے ہیں، اِن کو ہم بھی مانتے ہیں اور ایک مشرک بھی مانے گا، لیکن مشرک یہ کہے گا کہ اللہ نے اِن کو ایسے طور پر اختیار دے دیا کہ اب یہ کام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت کے محتاج نہیں، اب یہ کر دیتے ہیں، جب چاہیں کر دیتے ہیں، ایک ایک جزئیہ کے لئے یہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اِن کو اختیار دے کے فارغ ہوگیا، اب جو کچھ یہ کریں اپنے طور پر کریں گے، یہ عقیدہ شرک ہے، چاہے بنیادی طور پر اِس بات کو مانتے ہوں کہ دیا ہوا اللہ کا ہے......شرک کے مفہوم کو اچھی طرح سے اپنے ذہن میں لے لیجئے!......شرک یہی ہوتا ہے، یعنی چاہے بنیادی طور پر یہ عقیدہ ہو کہ یہ طاقت اللہ نے دی ہے، لیکن دینے کے بعد اللہ نے اختیار ایسا دے دیا کہ اب یہ جزئیات میں اللہ کے اذن کے محتاج نہیں ہیں، اس لئے ہم اِنہی کے سامنے درخواست کریں گے، اِنہی کی چوکھٹ پہ جا کے جھکیں گے، یہ چاہیں گے تو ہمیں دے دیں گے، اللہ تعالیٰ سے اب اِس معاملے کا کوئی تعلق نہیں، چاہے اللہ اس بات پہ قادر ہے کہ اِن سے یہ اختیار واپس بھی لے لے، لیکن جب دیا ہوا ہے تو دینے کے بعد یہ مختار ہیں، اب جزئیات میں یہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے محتاج نہیں ہیں، اگر یہ عقیدہ ہو تو یہ شرک ہے۔ اچھی طرح سے سمجھ لیجئے، مشرک کے عقیدے میں اور موحد کے عقیدے میں یہی فرق ہے......اور اِس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص کسی بات کی نسبت کسی کی طرف کرتا ہے، لیکن ساتھ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ اُس کے ہاتھ کے اوپر یہ بات ظاہر ہوتی ہے، اللہ چاہے گا تو ظاہر ہوگی، نہیں چاہے گا تو نہیں ظاہر ہوگی، اللہ تعالیٰ کا اِذن ہوگا تو یہ ظاہر ہوگی، اگر اللہ تعالیٰ کا اذن نہیں ہے تو نہیں ظاہر ہوگی، اور وہی بات کر سکتے ہیں اور وہی چیز دکھا سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ آئے گی، اور اللہ تعالیٰ کی اجازت ہوگی، اللہ تعالیٰ دکھائے گا، قدرت اللہ کی ہے، تو اس باذنِ اللہ کی قید کے ساتھ وہ بات جس کی ہم کسی بزرگ کی طرف نسبت کریں گے یا

کسی نبی کی طرف نسبت کریں گے، ایسی صورت میں نسبت تو ہماری طرف سے بھی ہوگی، کہ عیسیٰ علیہ السلام احیائے موتی کرتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے، حالانکہ مُردوں کو زندہ کرنا یہ کام اللہ کا ہے، عزرائیل موت دیتے ہیں، جان نکالتے ہیں، حالانکہ موت دینا اللہ کا کام ہے، حقیقت کے اعتبار سے موت دینے والا اللہ ہے، زندگی دینے والا اللہ ہے، لیکن موت دینے کی نسبت دوسروں کی طرف بھی ہے، جیسے یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ (سورۂ الم سجدہ:۱۱) تمہیں ملک الموت وفات دیتا ہے، تو ملک الموت کی طرف نسبت ہے، عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے ہیں، تو یہ اِحیاء کی نسبت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، یہ شرک نہیں ہے جو ہم کہہ رہے ہیں، کیوں؟ کہ باذنِ اللہ کی قید ہم ساتھ لگاتے ہیں، کہ اللہ کی طرف سے اجازت ہوگی تو وہ جان نکال سکتا ہے، اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ اللہ کا اذن ہے، اور اسی طرح سے اللہ کی طرف سے اِذن ہوگا تو عیسیٰ علیہ السلام کسی مردے میں جان ڈال سکیں گے اور اُس کو زندہ کرسکیں گے، اور اگر اللہ کا اذن نہیں ہوگا تو کچھ بھی نہیں کرسکیں گے، تو اِن صفات کی نسبت ہم جو غیر اللہ کی طرف کرتے ہیں تو باذنِ اللہ کے عقیدے کے ساتھ جب نسبت کریں گے تو اِس کا توحید کے اوپر کوئی کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ اور جہاں یہ کہہ دیا جائے کہ چاہے اختیار دیا اللہ نے ہے اور وہ لے بھی سکتا ہے، لیکن اختیار مل جانے کے بعد جتنی دیر تک اختیار ہے وہ خود مختار ہے، جو چاہے کرے، جزئیات کے اندر اللہ تعالیٰ کے اِذن کا محتاج نہیں، اس قسم کا عقیدہ رکھنا شرک ہے، موحد کے اور مشرک کے عقیدے میں یہی فرق ہوتا ہے، بِاِذْنِ اللّٰہِ کی قید کے ساتھ توحید محفوظ رہتی ہے۔

اور یہ بھی میں نے آپ کی خدمت میں غالباً ذکر کیا تھا کہ جو چیز معجزات کے طور پر واقع ہوسکتی ہے کرامت کے طور پر بھی وہ چیز واقع ہوسکتی ہے، کیونکہ کرامت اور معجزہ دونوں کی حقیقت ایک ہے، کہ اللہ کی قدرت کے ساتھ صادر ہوتی ہے کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر، کرامات کے بارے میں آپ کے سامنے یہی عرض کیا تھا کہ جو چیز بطور معجزہ کے صادر ہوسکتی ہے وہ چیز بطور کرامت کے بھی صادر ہوسکتی ہے، اس لئے اگر کسی اندھے کو سوانکھا کرنا کسی بزرگ سے ثابت ہوجائے، یا کسی بیمار کے اوپر ہاتھ پھیرنے سے اُس کی طرف صحت کی نسبت ہوجائے، یا کوئی شخص کسی کی طرف اِحیائے موتی کی نسبت کردے، لیکن کرتا وہی باذنِ اللہ کی قید کے ساتھ ہے، عقیدہ وہی ہے، تو یہ شرک نہیں ہوگا، چاہے واقعات کو آپ جھوٹا کہہ سکتے ہیں، ایک آدمی آکر کہتا ہے کہ فلاں ولی نے ایک مردے کو آ کے کہا: قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ! تو وہ زندہ ہوگیا، اب یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ غلط کہہ رہا ہے، جھوٹ بول رہا ہے، اِس نے اپنی طرف سے بات بنالی، لیکن ایسا کہنا شرک نہیں ہے جبکہ باذنِ اللہ کی قید ساتھ لگ گئی، واقعات کی صحت پر تو بحث کی جائے گی کہ یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط، اپنی طرف سے بنالیا یا واقعہ ہے، اور اگر راوی معتبر ہے، آپ کے سامنے نقل کرنے والے کئی ہیں تو آپ اگر اُس کو تسلیم بھی کرلیں گے تو یہ بات کوئی توحید کے عقیدے کے خلاف نہیں ہے۔

مُردوں کو زِندہ کرنے کی نسبت دجال کی طرف بھی ہے

قرآنِ کریم میں تو یہ نسبت کردی گئی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف، اور حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے باب ذکر الدجال میں، کہ دجال بھی مُردے زندہ کرکر کے دکھائے گا، ایک آدمی اُس کے سامنے جائے گا اور دجال اُسے کہے گا کہ تو مجھے رَبّ مانتا ہے کہ

نہیں مانتا؟ وہ کہے گا کہ نہیں! میں تو نہیں مانتا۔ وہ آری منگوائے گا، اور اُس کے سر کے اوپر رکھ کر اُس کو چیر دے گا دونوں ٹانگوں میں سے، حتیٰ کہ اُس کے دوٹکڑے ہوجائیں گے، ایک اِدھر گر جائے گا، ایک اِدھر گر جائے گا، اور دجال اُن دونوں ٹکڑوں کے درمیان میں یوں پھرے گا، جیسے فخر کرتا ہوا تکبر کے ساتھ کوئی پھرتا ہے، اور پھرنے کے بعد پھر اُسے کہے گا: ''قُم!'' وہ آدمی اُٹھے گا اور اُٹھ کے ہنستا ہوا پھر متوجہ ہو کے آجائے گا۔ تو دجال یہ کارنامہ دکھائے گا، حدیث شریف میں آتا ہے، جب اس کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کرے گا تو پھر کہے گا کہ اب تو مجھے رَبّ مانتا ہے کہ نہیں مانتا؟ وہ کہے گا: مجھے پہلے سے بھی زیادہ بصیرت حاصل ہوگئی کہ تُو ہی دجال ہے، کہ حضور ﷺ نے تیرے حالات ہمیں ایسے ہی سنائے ہیں۔ تو اُس کا یہی جواب حدیث میں منقول ہے۔[1] اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کسی قوم کے پاس وہ جائے گا اور اُس کو وہ مان لیں گے تو بارشیں ہوں گی، نباتات پیدا ہوں گی، اُن کے جانور موٹے موٹے ہوجائیں گے، دُودھ بہت دیں گے، اور ایک قوم کے پاس جائے گا وہ نہیں مانیں گے تو قحط سالی میں مبتلا ہوجائیں گے، نہ بارش ہوگی نہ زمین سے کچھ پیدا ہوگا، اور وہ بھوکے محتاج ہوجائیں گے،[2] اور ایک آدمی کے پاس جائے گا، جا کے کہے گا کہ اگر میں تیرے باپ کو زندہ کردوں تو پھر تُو مجھے رَبّ مان لے گا؟ وہ کہے گا کہ ہاں مان لوں گا! تو اُس کے باپ کو زندہ کر کے کھڑا کردے گا، چاہے وہ جنات شکل بنالیں، جو بھی صورت ہو، بہرحال حدیث کے اندر زندہ کرنے کا ذکر ہے۔[3] تو دجال کی طرف یہ نسبت خود حدیث شریف میں موجود ہے، اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک اِستدراج ہوگا، لوگوں کے لئے فتنہ اور اِمتحان ہوگا، کہ اِس کے حالات کو دیکھ کر کون اس پر ایمان لاتا ہے اور کون اِس کو نہیں مانتا، تو استدراج کے طور پر اِس قسم کے واقعات ہوں گے۔ اب اِن واقعات کی نسبت غیراللہ کی طرف موجود ہے، قرآنِ کریم کی آیات میں بھی موجود ہے، روایاتِ صحیحہ میں بھی موجود ہے، لیکن مشرک اور موحد کے نظریے میں فرق یہی ہے کہ موحد کہے گا سب اللہ کی جانب سے ہے، اللہ کی اجازت سے ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے، اگر اللہ کی طرف سے اِذن نہ ہو تو کوئی چیز واقع نہیں ہوسکتی، اور مشرک اِنہی چیزوں کو دیکھ کر کہے گا کہ سب کچھ یہی کرتے ہیں۔ تو باِذنِ اللہ کی قید کیساتھ سارے کا سارا معاملہ ٹھیک ہوجاتا ہے۔

کسی کی طرف خفیہ حالات کی اِطلاع کی نسبت بھی شرک نہیں لیکن!

یہ تو عملی معجزات تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کر کے دکھاتے تھے، اور آگے ایک علمی معجزہ ہے، وہ علمی معجزہ کیا ہے؟ اُنَبِّئُكُم: میں تمہیں بتادیتا ہوں جو کچھ تم گھر میں کھاتے ہو اور جو کچھ تم ذخیرہ کر کے رکھتے ہو، یعنی میرے پاس تم آؤ تو میں تمہیں بتادوں گا کہ کیا کھا کر آئے ہو، اور میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کون سی چیز جمع کر کے گھر رکھ کر آئے ہو، یہاں اگرچہ باِذنِ اللہ کی قید نہیں، لیکن یہاں بھی یہ قید ملحوظ ہے کہ اللہ کی طرف سے اطلاع ہوتی ہے، خدا تعالیٰ کی طرف سے علم ملتا ہے، اور اُس کے مطابق ذکر کردیا جاتا

---

(۱) مسلم ۲/۴۰۱۔ ۴۰۳ ولفظہ: ثُمَّ يَقُولُ لَهُ قُمْ فَيَسْتَوِي قَائِمًا۔ نیز مسلم ۲/۴۰۲۔ بخاری ۱/۲۵۳۔ مشکوٰۃ ۲/۴۷۵۔ ولفظہ: فَيَقْتُلُهُ ثُمَّ يُحْيِيهِ.

(۲) مسلم ۲/۴۰۱/ ترمذی ۲/۴۸ باب ما جاء فی فتنۃ الدجال / مشکوٰۃ ۲/۴۷۳ باب العلامات، فصل اول عن النواس.

(۳) فیقول: أرأیت إن أحییت لك أباك وأمك أتشهد أني ربك، فیقول: بلی فیمثل له الشیاطین الخ (مسند احمد، رقم: ۲۷۵۷۹/ مشکوٰۃ ۲/۴۷۷)

ہے، تو ہوگا وہ بھی اللہ کے اذن کے تحت ہی۔ اِس سے معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ کسی کے خفیہ حالات کا فلاں شخص کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا، تو اِس قسم کی نسبت کرنا بھی کوئی شرک نہیں ہے، لیکن یہاں بھی وہی بات ہے کہ اگر کوئی کہے کہ اِن میں اتنی صلاحیت اللہ نے پیدا کردی کہ اب ضرورت ہی نہیں کہ اللہ کی طرف ان کو کوئی احتیاج ہو، جس وقت وہ چاہیں جو چاہیں جان لیتے ہیں، ان کے سامنے ہر چیز پھرتی ہے، جب اِس طرح سے استقلال کے طور پر اِس صفت کو کسی غیر اللہ کی طرف منسوب کروگے تو شرک ہے، لیکن اگر اللہ کی مشیت کے تحت اور اللہ کے اذن کے تحت نسبت کروگے تو کوئی شرک نہیں ہے۔

خواجہ محمد عثمان رحمۃ اللہ علیہ کا کشف اور اُس کے متعلق ضروری وضاحت

آپ حضرات کی معلومات کے لئے عرض کروں، کہ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ واں بھچراں والے، جو مولانا غلام اللہ صاحب اور سیّد عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری کے پیر بھی ہیں اور اُستاذ بھی ہیں۔ مولانا حسین علی اصل کے اعتبار سے خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ موسیٰ زئی والوں کے مرید ہیں (خواجہ عثمانؒ، مولوی داؤد صاحب کے پردادا ہیں جو یہاں پڑھتے تھے)[1] موسیٰ زئی میں اُن کا اب بھی مزار ہے، اور خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ جن کی طرف نسبت کی بناء پر کندیاں والی خانقاہ، ''خانقاہ سراجیہ'' کہلاتی ہے۔ تو مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اصل میں خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں، اور خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اِنتقال ہوا تو پھر ان کا تعلق خواجہ سراج الدین صاحبؒ سے ہوگیا، مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت خواجہ سراج الدین صاحب کی طرف سے ہے،[2] اور کندیاں والے حضرت مولانا احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی خواجہ سراج الدین صاحبؒ کے خلیفہ ہیں۔ تو خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات اور حالات چھپے ہیں، فارسی زبان میں ہیں، اُس وقت کے مرتب ہوئے، پہلے بھی ایک ایڈیشن چھپا تھا، دوبارہ دُوسرا ایڈیشن شائع ہوا، ''فوائدِ عثمانی'' کے نام سے۔ تو اُس میں ایک ملفوظ کہہ لیجئے یا کشف وکرامت کہہ لیجئے، حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقل کیا ہوا ہے، کہ حضرت خواجہ عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ خود حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خطاب کر کے کہا، کہ: ''مولوی صاحب! شابرو در خانہ خود'' مولانا! اپنے گھر چلے جاؤ، اور پھر واپس آئیو، اور آ کر مجھ سے پوچھو، میں ایک ایک واقعہ جو تم کر کے آئے ہو گے تمہیں بتادوں گا۔ ''ہمہ را یک یک مفصل بتو خواہم گفت ان شاء اللہ تعالیٰ دریک امرہم خطا نخواہی یافت'' ایک ایک چیز تجھے بتاؤں گا، اور کسی معاملے میں تم خطا نہیں دیکھو گے۔ (فوائد عثمانیہ، فصل ۴) یہ خود حضرت مولانا حسین علی کو خطاب کر کے کہا، کہ جاؤ، اور جس وقت واپس آ ؤ گے تو میں تمہیں تمہارے اُوپر جو واقعات گزرے ہیں، جو کچھ تم نے کیا ہے، میں ایک ایک کر کے بتادوں گا۔ تو اِس قسم کے واقعات اولیاء اللہ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، لیکن اُن کے متعلق ہمارے عقیدے میں یہ بات ہوگی کہ اِنْ شاءَ الله، بِمَشِيْئَةِ الله، اِس قسم کا علم اگر

---

(۱) مولوی داؤد بن خواجہ محمد عارف بن خواجہ سراج الدین بن خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہم، آپ جامعہ باب العلوم میں زیر تعلیم رہے ہیں، اب وفات پاچکے ہیں۔

(۲) مولانا حسین علی کو اگرچہ سلسلۂ نقشبندیہ میں خلافت خواجہ عثمانؒ سے تھی لیکن دیگر سلاسل سمیت خلافت جامعہ واجازت مطلقہ خواجہ سراجؒ سے ملی۔ (از تحفہ سعدیہ ص ۸۳)

اللہ تعالیٰ اولیاء کو دے دے، اور کسی ولی پر یہ انکشاف ہوجائے، کسی کے حالات کو وہ جان لے، کوئی شخص کسی کی طرف نسبت کردے کہ فلاں شخص یہ جانتا ہے، اس کو یہ پتہ چل جاتا ہے، تو یہ نسبت شرک نہیں ہے بشرطیکہ بمشیئۃ اللہ اور إن شاء اللہ اور اللہ کے إذن کے تحت ہو، اور اگر اللہ کے إذن اور اللہ کی مشیت کی رعایت نہیں رکھی جائے گی، ''إن شاء اللہ'' نہیں ہوگا، اور یہ کہا جائے گا کہ ''نہیں! اب اُن کو ویسے ہی یہ صلاحیت حاصل ہوگئی، کہ جو چاہیں کرلیں اور جو چاہیں جان لیں، اب جزئیات کے اندر بھی اللہ کے إذن اور اللہ کی مشیت کے محتاج نہیں ہیں'' تو پھر یقیناً شرک ہے۔

اس لئے کسی کی کلام کے اندر اِس قسم کی نسبت دیکھ کر، کہ فلاں نے فلاں کی طرف نسبت کی ہے کہ وہ جانتا ہے، یا اُس کو یہ پتہ چل گیا، فوراً انشافٹ شرک کا فتویٰ نہیں لگایا جاتا جب تک اتنی تحقیق نہ کرلی جائے جتنی آپ کے سامنے میں عرض کررہا ہوں، کہ اُس شخص کا کیا نظریہ ہے؟ وہ اللہ کی مشیت اور اللہ کے اذن کے تحت مانتا ہے یا نہیں؟ اگر اللہ کے اذن اور اللہ کی مشیت کے تحت مانتا ہے تو شرک سے نکل گیا، ہاں! البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ تحقیق کریں کہ جو واقعہ یہ بیان کرتا ہے یہ واقعہ پیش بھی آیا ہے یا اپنے طور پر جھوٹا ہی بنالیا؟ کیونکہ لوگ ایسے بھی تو کرتے رہتے ہیں کہ ''پیراں نمے پرند مُریداں مے پَرانند'' کہ پیر اُڑتے تو نہیں ہیں لیکن مرید اُڑا دیتے ہیں۔ ایسے بھی تو ہوتا رہتا ہے، تو ایسا نہ ہو کہ پیر کو وہ بات حاصل تو ہے نہیں لیکن مرید بیٹھا ایسے ہی گل چھرے چھوڑتا رہتا ہے۔ بہرحال جھوٹ بول سکتا ہے، غلط ہوسکتی ہے، لیکن اگر نسبت اس انداز کے ساتھ ہوگی تو ہم اُس کو شرک نہیں کہیں گے، یہ فرق ضروری ہے۔ تو یہ عیسیٰ علیہ السلام کا علمی معجزہ ہے اور اِسی قسم کا علمی معجزہ آپ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی سورۂ یوسف میں آئے گا، اُس کو وہاں ذکر کریں گے۔ ''میں بتادیتا ہوں تمہیں جو تم کھاتے ہو اور جو تم ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں، اِس میں البتہ دلیل ہے تمہارے لیے میری نبوّت کی، میری رسالت کی، اگر تم ایمان لانے والے ہو۔''

یہود کی طرف سے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف پروپیگنڈا

وَمُصَدِّقًا: جِئْتُكُمْ مُصَدِّقًا، اور میں تمہارے پاس آیا ہوں اس حال میں کہ تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو مجھ سے پہلے ہے، اور میں اس لئے آیا ہوں تاکہ تمہارے لئے حلال کردوں بعض وہ چیزیں جو توراۃ کے اندر حرام کی گئی ہیں، یعنی بعض چیزیں جو سزا کے طور پر اُن پر حرام کردی گئی تھیں، جس کا ذکر سورۂ اَنعام میں آئے گا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر توراۃ کے بعض اَحکام کو منسوخ کیا اور اُن حرام اشیاء کو حلال ٹھہرادیا، اور اِسی چیز کو یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کا بہانہ بنایا، اُن کے مفتیوں نے، اُن کے مولویوں نے، اُن کے احبار و رُہبان نے، جو دیکھ رہے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اگر بات مانی گئی تو ہماری دکانداریاں ختم ہوجائیں گی، انہوں نے پروپیگنڈا یہ کیا کہ دیکھو! یہ توراۃ کی تحریف کرتا ہے، توراۃ کی مخالفت کرتا ہے، اور اس طرح اُن کو نعوذ باللہ! بے دین اور بددین ثابت کرنے کی کوشش کی، اور یہی شکایات اُس وقت کے حاکم تک پہنچائیں، جس کے بعد فیصلہ ہوا کہ اُن کو پکڑ کر سُولی چڑھادیا جائے، جس کا آگے ذکر آرہا ہے، تو یہ اِسی قسم کی فتویٰ بازی اور اسی قسم کی مخالفت تھی کہ یہ شخص تو محرِّف توراۃ

ہے، یہ تو تورات کا انکار کرتا ہے، یہ تو تورات کے احکام کو بدلتا ہے، یہ تو بے دِین ہے، یہ تو بددِین ہے، یہ تو دِین کو خراب کر کے رکھ دے گا، اِس قسم کا شور جو اُس وقت کے اَحبار و رُہبان نے مچایا تو اسی کے نتیجے میں عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ نوبت پہنچی کہ وقت کے حاکم کی طرف سے حکم ہوا کہ انہیں پکڑ کر سُولی دے دیا جائے، تو پھر جو واقعہ پیش آیا وہ اگلے رکوع میں آ رہا ہے۔

پروپیگنڈے کا جواب اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے کہ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ: کہ اگر میں کسی حکم کو منسوخ کرتا ہوں تو میرے پاس اُس کی بھی دلیل ہے، کہ میں کس بناء پر اِس کو منسوخ کرتا ہوں، اس لئے تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور میری تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رَبّ ہے اور اللہ ہی تمہارا رَبّ ہے پس تم اُسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ تو رَبّ کا ذکر کیا کہ اللہ میرا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے، اور یہاں مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ملفوظات میں بھی یہی تھا کہ اللہ میرا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے، اور ہوسکتا ہے کہ اُس زمانے میں یہ محاورہ ہو کہ ''رَبّ'' کے لئے لفظ ''اَب'' استعمال کرتے ہوں، جس کا ترجمہ اُردو کے اندر ''باپ'' کر دیا گیا، کہ اللہ میرا بھی باپ ہے اور تمہارا بھی باپ ہے، اس لئے تم اُسی کی عبادت کرو۔ اُردو والی انجیل میں ترجمہ یہی ہے، جہاں بھی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں، اُن کی طرف نسبت کر کے یہی لکھا ہوا ہے کہ اللہ میرا باپ ہے۔ تو ''اللہ میرا بھی باپ ہے تمہارا بھی باپ ہے'' یہ ''میرا بھی رَبّ ہے، تمہارا بھی رَبّ ہے'' کا ترجمہ یوں ہو کے معاملہ خراب ہو گیا، ''رَبّ'' کی بجائے ''اَب'' ہو گیا، اس لئے عیسائی اور یہودی کہتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ (سورۂ مائدہ:۱۸) ہم بھی اللہ کے بیٹے ہیں، اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے کہ وہ بھی اللہ کا بیٹا ہے، یوں گڑبڑ کر لی، اصل لفظ ''رَبّ'' ہے، کہ میرا بھی رَبّ اور تمہارا بھی رَبّ، پالنے والا پیدا کرنے والا وہی ہے، عبادت اُسی کی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

حواریوں کا عیسیٰ علیہ السلام پر اِیمان اور وفا کا عہد

''اور جب عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کی طرف سے کُفر معلوم کیا'' کہ یہ وقت کے چوہدری اور وقت کے جو فتویٰ باز بیٹھے ہوئے ہیں یہ ماننے والے نہیں ہیں، تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام عوام کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ کہا کہ میں تو اللہ کی طرف متوجہ ہوں، میری مدد اس سلسلے میں کون کرے گا؟ مَنْ اَنْصَارِیْ مُتَوَجِّهًا اِلَى اللّٰهِ، تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، یعنی اللہ کے دِین کے مددگار ہیں، اللہ کے رسول کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور تُو گواہ ہو جا کہ بیشک ہم فرمانبردار ہیں۔ اور اس کے بعد اللہ کے سامنے مناجات کرتے ہیں، کہ اے ہمارے رَبّ! ہم ایمان لے آئے اُس چیز پر جو تُو نے اُتاری، اور ہم نے تیرے اس رسول کی اتباع کی (اِس رسول سے معہود رسول مراد ہے، اس پر الف لام عہد خارج کا ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ہم نے تیرے اِس رسول کی اتباع کی، پس تو لکھ لے ہمیں اقرار کرنے والوں کے ساتھ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع اِذْ قَالَ

انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے خفیہ تدبیر کی، اور اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سے بہترین تدبیر کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾ جب

اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ

اللہ تعالیٰ نے کہا اے عیسیٰ! میں تجھے لینے والا ہوں، اور میں تجھے اُٹھانے والا ہوں اپنی طرف، اور میں تجھے صاف ستھرا کرنے والا ہوں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى

کافروں سے، اور میں کرنے والا ہوں ان لوگوں کو جو تیرے تبع ہیں ان لوگوں کے اُوپر جنہوں نے کفر کیا

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ

قیامت کے دن تک، پھر میری طرف تمہارا لوٹنا ہے، پھر میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا، اس بات میں جس میں تم

تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا

اختلاف کرتے ہو ﴿۵۵﴾ پھر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا میں انہیں سخت سزا دوں گا دنیا میں اور آخرت میں، اور اُن کے لئے

لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ

کوئی مددگار نہیں ہوگا ﴿۵۶﴾ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو اللہ تعالیٰ انہیں اُن کے اجر پورے پورے دے گا،

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتے ﴿۵۷﴾ یہ بات، ہم اِس کو پڑھتے ہیں آپ پر، آیات میں سے ہے، اور پُرحکمت نصیحت سے ہے ﴿۵۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ: مکر: خفیہ تدبیر کرنا، اور اس کا اچھا ہونا یا برا ہونا مقصد کے تابع ہوتا ہے، اگر کسی اچھے مقصد کے لئے کی جائے تو اچھی ہوگی، اور اگر کسی بُرے مقصد کے لئے کی جائے تو بُری ہوگی، اُردو زبان میں ''مکر'' کا لفظ فریب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لیے یہاں عربی ''مکر'' مراد ہے، اُردو ''مکر'' مراد نہیں ہے، جیسے ہمارے محاورے میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، یہاں ویسے نہیں، کیونکہ یہاں اِس کی نسبت اللہ کی طرف بھی آ رہی ہے، وَمَكَرُوْا: انہوں نے خفیہ تدبیر کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی، نقصان پہنچانے کی، وَمَكَرَ اللّٰهُ، اور اللہ نے خفیہ تدبیر کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچانے کی اور عزت دینے کی، وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى: یہ اُن کا مکر اور

اللہ کا مکر اُس وقت واقع ہوا جب اللہ تعالیٰ نے کہا عیسیٰ علیہ السلام سے: اے عیسیٰ! اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ: بیشک میں تجھے لینے والا ہوں۔ توَفّی کا لفظ وَفٰی یَفِیْ سے ہے، وَفٰی، اَوْفٰی اِیْفَاء، اِسْتَوْفٰی اِسْتِیْفَاء، یہ لفظ اسی سے استعمال ہوتے ہیں، جس کا معنی ہوتا ہے وصول کرنا، تو توَفّی بھی وصول کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ توَفّی موت کے معنی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے، کیونکہ اُس کے اندر بھی رُوح کی وصولی ہے، ویسے توَفّی کی مختلف صورتیں ہیں، جسد کے بغیر صرف رُوح کو وصول کرلیا جائے جیسے موت کے وقت ہوتا ہے، اور نیند کی حالت میں بھی کسی حد تک چونکہ انسان سے روح کا تعلق منقطع ہوتا ہے تو توَفّی فی النوم بھی ہوتی ہے، اور یہ اصطلاح خود قرآنِ کریم میں مستعمل ہے: اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (سورۂ زمر: ۴۲)، فِیْ مَنَامِهَا یہ یَتَوَفّٰی کے متعلق ہے، کہ اللہ تعالیٰ موت کے وقت بھی جانوں کو وصول کرتا ہے اور جن کو موت نہیں آتی اُن کو نیند میں وصول کرتا ہے، اور اسی طرح توفی روح مع الجسد بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے یہاں متوفی کا ترجمہ کریں گے کہ میں تجھے وصول کرنے والا ہوں، میں تجھے لینے والا ہوں، حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ یہی کیا ہے "میں لے لوں گا"۔ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ: اور میں تجھے اُٹھانے والا ہوں اپنی طرف، وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اور میں تجھے صاف ستھرا کرنے والا ہوں کافروں سے، جس کا معنی یہ ہوگا کہ میں اس ناپاک نجس اور گندے ماحول سے تجھے صاف ستھرے ماحول میں لے جاؤں گا، یا یہ مطلب ہے کہ کافر جو کچھ تیرے اوپر الزام تراشی کرتے ہیں اور تیرے اوپر غلط باتیں ڈال کر گویا دامن کو آلودہ کرتے ہیں، میں اُن الزامات سے اور اُن تہمتوں سے تیرا دامن پاک کرنے والا ہوں، دونوں مفہوم اس میں آسکتے ہیں، وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ: اور میں کرنے والا ہوں اُن لوگوں کو جو تیرے متبع ہیں، تیرے نام لیوا ہیں، جو تجھے ماننے والے ہیں، فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اُن لوگوں کے اُوپر جنہوں نے کُفر کیا، یعنی جنہوں نے تیرے ساتھ کُفر کیا، میں اِن کو اُن کے اوپر کرنے والا ہوں، غالب کرنے والا ہوں، اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ: قیامت تک، یعنی ہمیشہ کے لئے، ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ: پھر میری طرف تمہارا لوٹنا ہے، فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ: پھر میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا، فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: اُس بات میں جس میں تم اختلاف کرتے تھے، فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: پھر وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ: میں انہیں سخت سزا دوں گا دُنیا میں اور آخرت میں، وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ: اور اُن کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا، وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: لیکن جو لوگ ایمان لائے، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور انہوں نے نیک عمل کیے، فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ: تو اللہ تعالیٰ اُنہیں اُن کے اجر پورے پورے دے گا، وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ: اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتے، ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ: یہ بات، ہم اس کو پڑھتے ہیں آپ پر، آیات میں سے ہے، یعنی آپ کے دلائلِ نبوّت میں سے ہے، وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ: اور پُرحکمت نصیحت سے ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

یہود کی طرف سے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں

ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ حال ذکر کیا گیا ہے جو یہودیوں کی عداوت انتہا کو پہنچنے کے بعد آپ پر گزرا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس وقت اپنی نبوت اور رسالت کا اعلان کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات دینی شروع کیں، تو اُس وقت کے موجود یہودی علماء، اُن کے مفتی، اُن کے اَحبار و رُہبان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف ہو گئے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں شروع کر دیں تاکہ اِنہیں ختم کر دیا جائے اور کسی نہ کسی طریقے سے یہ جھگڑا چکا دیا جائے، عوام کے اندر بھی غلط پروپیگنڈے کیے، کہ آپ کی والدہ پر الزامات لگائے، اور آپ کو غیر ثابت النسب قرار دیا، بُرے بُرے الفاظ استعمال کیے، اور حکومت کو بھی غلط رپورٹیں دینی شروع کر دیں، اُس وقت اُس علاقے پر رُومیوں کی حکومت تھی جو بت پرست تھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ توحید کا پرچار کرتے تھے تو غیر اللہ کا دل و دماغ پر تسلط ختم کرنے کے لئے جو اُن کی وعظ و تقریر ہوتی اُس کو اُس وقت کے موجود لوگوں نے حکومت کی مخالفت پر محمول کرتے ہوئے حکومت کو رپورٹیں دینی شروع کر دیں، کہ یہ تو آپ کے خلاف بھڑکاتا ہے، اور محرّف تورات قرار دیا کہ یہ تو بے دین آدمی ہے نعوذ باللہ! جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدل رہا ہے، اور یہ بزرگوں کا مخالف ہے کہ اُن کی طرف سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے اُن کے رسم و رواج کو توڑ رہا ہے، اُن کی غلطیاں نکال رہا ہے، اس طرح سے شور کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک طوفان برپا کر دیا، حکومت کی طرف سے گرفتاری کے آرڈر ہو گئے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی مکان کے اندر موجود تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد جو منافق تھا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کی رپورٹ دیتا تھا اور جاسوسی کرتا تھا، اُس کی جاسوسی کے تحت پتہ چل گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہاں موجود ہیں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے اُس مکان کا محاصرہ کر لیا گیا، تو ایسے وقت میں جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مکان میں بند ہیں اور باہر سے دشمنوں نے محاصرہ کر لیا اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی کے لئے یہ آیات اُن پر اُتاری گئیں اور اُنہیں یہ باتیں کہی گئیں جن کو قرآنِ کریم میں یہاں ذکر کیا گیا ہے، اِس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کچھ وعدے کیے گئے ہیں اور کچھ اطمینان دلایا گیا ہے۔

لفظِ ''خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ'' کا مقصد

یہ اُن کی تدبیر تھی جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہلاک کرنے کے لئے کی، اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُن کے مقابلے میں تدبیر کی (ذرا مضمون کی روش دیکھتے جایئے!) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ قرار دیا، تو اللہ تعالیٰ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ تبھی بنتے ہیں کہ وہ دشمن جس قسم کی تدبیریں کر رہے تھے وہ تدبیریں ناکام جائیں، اور جو مقصد وہ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ پورا نہ ہو، کہ جس کو وہ ذلیل کرنا چاہتے تھے اُس کو عزت مل جائے، اور جس کو وہ مارنا چاہتے تھے وہ زندہ رہ جائے، اور جس کو وہ مغلوب کرنا چاہتے تھے وہ غالب آ جائے، یہ ہے اُن دشمنوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی کامیاب تدبیر۔ اور اگر وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑنے میں اور سُولی چڑھانے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی تدبیر اُن کے مقابلے میں کیا کامیاب ہوئی؟ جو وہ کرنا چاہتے تھے وہ تو اُنہوں نے کر لیا۔ بالکل اسی قسم کی آیت قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے سورۂ انفال میں بھی آئے گی جہاں سرورِ کائنات ﷺ کی ہجرت کا ذکر آئے گا وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۚ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (آیت: ۳۰) کہ کافر لوگ آپ کے خلاف مکر کرتے تھے، تو اسی قسم کے الفاظ وہاں بھی ہیں، کہ انہوں نے بھی تدبیر کی آپ کو قتل کرنے کی، لیکن اللہ

نے بھی تدبیر کی، اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے، تو بالکل بعینہٖ اسی قسم کی صورت وہاں پیش آئی، کہ مشرکین نے حضور ﷺ کے مکان کا نرغہ کیا، آپ کو گھیرے میں لے لیا، اور اُن کا مقصد تھا کہ حضور ﷺ کو قتل کر دیا جائے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی تدبیر کے تحت اُس گندے ماحول سے حضور ﷺ کو کامیابی کے ساتھ نکالا، اور بچاتے ہوئے دوسرے علاقے میں لے جا کر بٹھا دیا، جہاں ہر طرح سے آپ کی عزت ہوئی اور غلبہ ہوا، اور آپ کے مخالفین ذلیل ہوئے، تو مشرکین کی تدبیر کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر وہاں کامیاب رہی اور اُن کی خفیہ تدبیر کامیاب نہ ہوسکی۔

انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کے لئے سُنّت اللہ

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کچھ اسی قسم کا برتاؤ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے جو واقعات نقل کیے گئے ہیں، کہ جہاں بھی کوئی نبی اپنی قوم کو تبلیغ کرتا ہے اور تبلیغ کا حق ادا کر دیتا ہے، لیکن قوم ضد اور عناد کی وجہ سے نہیں مانتی، تو ایسے وقت میں پھر یا تو اُس قوم کو عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا جاتا ہے، جیسے قومِ لوط، قومِ صالح، قومِ ہود اور دوسری قوموں کے ساتھ ہوا، یا پھر اس طرح ہوتا ہے کہ اُس نبی کو اُس علاقے سے نکال لیا جاتا ہے، جب نبی اور اُس کے ماننے والے اس علاقے سے نکل کر چلے جاتے ہیں تو اُس کی صورت پھر ایسے بن جاتی ہے جیسے ایک جسم سے روح نکال لی جائے، اور روح کے نکل جانے کے بعد باقی بدن گلنے سڑنے کے لئے ہوتا ہے پھر وہ کسی طرح سے باقی نہیں رہتا، ایسے ہی جب نبی اپنے متبعین کے ساتھ کسی ماحول سے نکل جاتا ہے تو پھر وہاں کے لوگ امن چین کے ساتھ وقت نہیں گزار سکتے، مختلف قسم کی تکلیفوں سے اور مختلف قسم کے عذابوں سے اُن کی زندگی دُنیا کے اندر ہی جہنم بن جاتی ہے، اور وہ ذلیل وخوار ہو کر آخرکار مغلوب ہوتے ہیں، اگر اتباع قبول کر لیتے ہیں تو جان چھوٹ جاتی ہے، ورنہ اسی طرح وہ مختلف قسم کی مصیبتوں میں گھل گھل کر مر جاتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عادت کچھ اسی طرح سے ہے، آپ کے سامنے اِس کا واضح نمونہ سرورِ کائنات ﷺ کی ہجرت ہے، کہ مکہ معظّمہ سے جب آپ تشریف لے گئے تو پیچھے اہلِ مکہ جو تھے چند سال کے اندر اندر ہی اُن کی حیثیت ختم ہوگئی، وہ اپنی حیثیت کو بحال نہ رکھ سکے، تو جیسے حضور ﷺ کی ہجرت مکہ معظّمہ سے مدینہ منوّرہ کی طرف ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے جو یہ لفظ استعمال کئے گئے ہیں: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ، اِس میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک ہجرت ہی مذکور ہے، جس کے ذریعے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو مقامِ عزت تک پہنچایا اور اُن کے دشمنوں کو مغلوب کیا، وہ رُسوا ہوئے، اور اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔ جب حالات کا نقشہ یوں کھینچا جائے گا تو ہی اللہ تعالیٰ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ثابت ہوتے ہیں، اور اگر وہ یہود کامیاب ہو جائیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑ لیں، پکڑنے کے بعد سُولی چڑھا دیں، تو ایسی صورت میں پھر تدبیر اُن کی کامیاب ہوتی ہے، اللہ کی کامیاب نہیں ہوتی۔

رَفع ونزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا اِثبات اور یہود ونصاریٰ کی تردید

یہود کا عقیدہ یہی ہے کہ اُن کو پکڑا گیا اور پکڑ کر سُولی چڑھایا گیا، عیسائی بھی بعد میں شُبہ کے اندر مبتلا ہو گئے، لیکن وہ یوں کہتے تھے کہ قتل تو ہوئے ہیں، سُولی تو چڑھا دیے گئے، اور یہ اُن کا سُولی چڑھنا باقی قوم کے لئے کفارہ ہو گیا، اب اُن کے متبعین جو

چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں ان کو گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ ساری اُمّت کے گناہ عیسیٰ علیہ السلام اُٹھا کر سُولی پہ چڑھ گئے۔ اُنہوں نے تو یہ کفّارے کا عقیدہ ہی یاد کرلیا، لیکن یہ تھا کہ سُولی چڑھنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کیا، زندہ کرکے پھر اُن کو آسمان کی طرف اُٹھالیا، یہ عیسائیوں کا عقیدہ تھا۔ اور مسلمانوں کا عقیدہ جو کہ دلیلِ قطعی اور تواتر کے ساتھ ثابت ہے، اور اِس کو "ضروریاتِ دین" میں شامل کیا ہوا ہے ("ضروریاتِ دین" وہی باتیں ہوا کرتی ہیں جن میں نہ تاویل کی گنجائش ہو اور نہ اِنکار کی، صراحتاً اُن کا انکار کردیا جائے تو بھی کُفر، اور کسی تاویل کے تحت اُن کا اِنکار کیا جائے تو بھی کُفر) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود کے ہاتھ میں نہیں آئے، پکڑے نہیں گئے، نہ قتل ہوئے اور نہ وہ اُن کو سُولی دے سکے، وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (سورۂ نساء: ۱۵۷) میں یہی بات ذکر کی جائے گی کہ نہ انہوں نے قتل کیا، نہ سُولی چڑھایا، ان کو ایک شُبہ کے اندر مبتلا کردیا گیا۔ وہ شُبہ یہی تھا کہ جو پکڑنے کے لئے اندر گئے تھے اُن میں سے ایک آدمی کے اُوپر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شِبہ ڈال دیا گیا، اس کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہوگئی، اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں پکڑ لیا گیا اور اُسی کو سُولی چڑھادیا گیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبریل اُٹھا کرلے گئے، وہ آسمان پر چلے گئے، اور وہ اُس کو سُولی دے کر یہ سمجھنے لگے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے سُولی چڑھادیا، لیکن پھر بعد میں جس وقت اپنے آدمیوں کو شمار کیا تو کہنے لگے کہ ہمارا ایک آدمی کدھر گیا؟ اگر یہ وہ تھا تو عیسیٰ کدھر گیا؟ اگر یہ عیسیٰ تھا تو ہمارا آدمی کدھر گیا؟ اس طرح سے وہ ایسے اشتباہ میں واقع ہوئے کہ حقیقت اُن سے گم ہوگئی، اِنہی حالات کے اندر وہ مختلف قسم کے شبہات میں پڑ گئے، اور حقیقت وہی ہے کہ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا یہ یقینی بات ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے میں یہ لوگ کامیاب نہیں ہوسکے، شُبِّهَ لَهُمْ: اُن کو شُبہ میں ڈال دیا گیا، اور شُبہ میں ڈالنے کی صورت یہی تھی کہ ایک آدمی کے اُوپر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شِبہ ڈال دیا گیا، یعنی اُن کی مشابہت اُس پر ڈال دی گئی، جس کی بناء پر اُنہوں نے اس کو پکڑا، پکڑنے کے بعد اُس کو سُولی چڑھادیا، لیکن بعد میں تردّد یہ ہوگیا کہ یہ اگر ہمارا آدمی تھا تو عیسیٰ کدھر گیا؟ عیسیٰ تھا تو ہمارا آدمی کدھر گیا؟ اس طرح سے شبہات پیدا ہوگئے، پھر جس کے منہ میں جو آیا اس نے بولا، اور اسی پر باطل عقیدوں کی بنیاد رکھ لی گئی۔ قرآنِ کریم نے یہ عقیدہ صراحتاً ذکر کیا، اسلام میں یہ "ضروریاتِ دین" میں شامل ہے، جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا قائل ہو وہ بھی کافر، اور رَفع الی السماء کا منکر ہو، وہ بھی کافر، اور حیاتِ عیسیٰ کا منکر ہو، وہ بھی کافر، نزولِ عیسیٰ کا منکر ہو، وہ بھی کافر، یہ ضروریات میں شامل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ اُٹھایا گیا، اور اُٹھا کر اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کو آسمان پر لے گئے، وہاں اُن کی طویل حیات ہے، اور اِس اُمّت کے آخری دور میں وہ نازل ہوں گے اور اس اُمّت میں اُن کو اِمامت کا درجہ حاصل ہوگا، حکومت کریں گے، اور اپنے وقت پر اُن کی وفات ہوگی، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس میں دفن کئے جائیں گے، تو یہ رَفع اور نزول کا عقیدہ اُمّت کے اجماع میں شامل ہے۔

اور اللہ تعالیٰ آگے ذکر کریں گے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے، اِسی سورت میں آئے گا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ، تو آدم علیہ السلام کے ساتھ اُن کی مشابہت جیسے اِس بات میں ہے کہ آدم علیہ السلام بھی ظاہری اسباب کے خلاف، جس طرح عام انسان پیدا ہوتے ہیں آدم اس طرح پیدا نہیں ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قدرت کے ساتھ بغیر ماں اور باپ کے واسطے کے بنایا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے واسطے کے بنایا، اس کے لئے ایسے ظاہری اسباب اختیار نہیں

کیے گئے جیسے کہ عام لوگوں کی پیدائش میں اختیار کیے جاتے ہیں، تو اِس میں بھی مشابہت ہے۔ اور آسمانی زندگی میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کے ساتھ مشابہت ہے، کہ آدم علیہ السلام پیدا ہونے کے بعد ہزار ہا سال آسمانوں پر رہے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اُتارا، اور پھر زمین پر اپنی عمر پوری کر کے اُن کا انتقال ہوا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا اگرچہ زمین پر ہوئے لیکن ان کو آسمان میں ہزار ہا سال کے لئے محفوظ کر لیا گیا، اور جب اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کا تقاضا ہوگا نازل ہوں گے، اور نازل ہونے کے بعد اپنی زندگی اِس زمین پر پوری کریں گے، اور پوری کرنے کے بعد پھر ان کا انتقال ہوگا۔

قرآن وحدیث میں عیسیٰ علیہ السلام کے مفصل حالات اور اس کی حکمتیں

اور قرآنِ کریم میں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی وضاحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کی کی ہے اِتنی وضاحت کسی نبی کے حالات کی نہیں کی، آپ کے سامنے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے پیش گوئی قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی، اُن کی والدہ کے حاملہ ہونے کا قصہ ذکر کیا گیا، اُن کی ولادت کا حال ذکر کیا گیا جیسے سورۂ مریم میں ہے، اور اُن کی والدہ کو اُس وقت جو کھانے پینے کی ضرورت تھی تو کھجوروں اور پانی کا انتظام کیا گیا، وقت پر فرشتے نے آکر بشارت دی، پھر قوم کے پاس اُٹھا کر لائیں، قوم نے الزامات لگائے، اللہ تعالیٰ نے صفائی دی، اور اسی طرح پھر یہودیوں کی مخالفت شروع ہوئی، اور پھر یہ قصہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آخر وقت میں کیا گزرا؟ قرآنِ کریم کے اندر یہ چیزیں لفظ بلفظ واضح کر دی گئیں۔ اور اسی طرح حدیث شریف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اُٹھائے جانے کا قصہ، اور پھر آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُترنے کا واقعہ، کہ کہاں اُتریں گے؟ کس حالت میں اُتریں گے؟ مسلمان اُس وقت کس حال میں ہوں گے؟ وہ زمانہ کون سا ہوگا؟ دجال کا زور ہوگا، دجال کے مقابلے میں اِن کو اُتارا جائے گا، اور پھر یہ دجال کو قتل کریں گے، پھر یہ اِمامت کریں گے اور عدل وانصاف کے ساتھ حکومت قائم کریں گے، یہ سارے کے سارے واقعات حتیٰ کہ یہ بھی کہ کس قسم کے لباس میں ہوں گے؟ بالوں کی پوزیشن کیسی ہوگی؟ اُن کے بدن پر کیا حالات نمایاں ہوں گے؟ کس جگہ میں اُتریں گے؟ کس حال میں اُتریں گے؟ کس وقت میں اُتریں گے، کہ مسلمان نماز کے لئے صف بندی کئے ہوئے ہوں گے، اور دمشق کی جامع مسجد کے منارے پر دو فرشتوں پر ہاتھ رکھے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، پھر منارے سے نیچے اُتار لئے جائیں گے، دو چادریں انہوں نے اوڑھی ہوئی ہوں گی، ایسا ہوگا جیسے ابھی تازہ تازہ غسل کر کے آئے ہیں، اور سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں گے، اور جب آئیں گے تو وقت کے اِمام حضرت مہدی کہیں گے کہ آؤ نماز پڑھاؤ! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ نہیں، تمہارا امام تم میں سے ہونا چاہیے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اجازت سے مہدی نماز پڑھائیں گے۔

یہ سارے کے سارے حالات صحیح روایات میں بالتفصیل کیوں بتا دیے گئے؟ اور اِتنی وضاحت ان کے متعلق کیوں کی گئی؟ اسی لئے کی گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، اور اُن کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کے تحت یہ فیصلہ ہے کہ یہ زمین سے اُٹھائے جائیں گے، اور ایک وقت کے بعد اُتارے جائیں گے، اس اُمّت میں اُنہوں نے ایک معاون اور ایک راہنما بن کر

آنا ہے، تو حضور ﷺ نے اِن کی پوری پوری نشانیاں واضح کر دیں، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری اُمت اِن کو پہچاننے میں خطا کر جائے، کیونکہ اگر وہ اللہ کی حکمت کے تحت اُترے اور اُمت نے اُنہیں نہ پہچانا اور اِنکار کر دیا، تو پھر جس طرح اُن کے دورِ نبوت میں اُن کا انکار کُفر تھا تو جب اِس دورِ محمدی میں وہ آئیں گے تو اُن کا انکار اُس وقت بھی ایسے ہی کُفر ہوگا، اور اگر اُمت نے اُنہیں نہ پہچانا تو جس ہدایت کے لئے وہ آئیں گے اُس ہدایت کا مقصد پورا نہیں ہوگا، اس لیے حضور ﷺ نے اِن کی مکمل نشانیاں بتادیں۔ اور یہ مکمل نشانیاں بتانے میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسیح نے اُترنا ہے، اور اُس کے اُترنے کے قرآن اور اشارے آیات کے اندر بھی موجود ہیں، تو ایسی صورت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس سے کوئی غلط آدمی فائدہ اُٹھائے اور غلط آدمی اپنے آپ کو عیسیٰ بنا کر اور مسیح بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کردے اور اپنے اُوپر ایمان لانے کی دعوت دے اور اُمت کے لئے گمراہی کا باعث بن جائے، جیسے آپ کے علاقے (برصغیر) میں مرزے (غلام احمد قادیانی ملعون) نے ایسے ہی کیا، کہ اِنہی پیش گوئیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو اُس نے پیش کر دیا، کہ مسیح موعود میں ہوں، جس نے آنا تھا وہ میں آ گیا، اگر یہ نشانیاں اتنی واضح طور پر بتائی ہوئی نہ ہوتیں جتنی حدیث شریف میں بتادی گئی ہیں تو اِس قسم کے جھوٹوں کی تردید میں بڑی دِقت پیش آتی، تو اللہ اور اللہ کے رسول نے یہ ساری کی ساری باتیں جو واضح کی ہیں تو اِس اُمت کی ہدایت کے لئے کی ہیں، تا کہ اُن کے نزول کے زمانے میں کوئی اِشتباہ نہ ہو، لوگ اُن کو مانیں اور اُن پر ایمان لائیں، اور اُن کی اتباع کر کے اور اُن کی اِقتدا کر کے اپنے دِین اور دُنیا کو سنواریں۔

یہ سارے کے سارے حالات اپنی تفصیل کے ساتھ اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ باقی انبیاء سے علیحدہ ہے، کہ باقی انبیاء علیہم السلام اپنا اپنا وقت گزار کے گئے اور گئے، اُن کی دُنیوی زندگی ختم ہوگئی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اِس طرح سے نہیں کیا گیا، بلکہ اُن کو آسمان پر اُٹھایا گیا، آسمان پر اُٹھانے کے بعد ایک وقت میں پھر اُن کو اُتارا جائے گا، اور اِس اُمت میں وہ ہدایت کا عمل کریں گے اور اُمت ان کی اتباع کرے گی، دُنیا میں جو پریشانیاں آئی ہوئی ہوں گی اور اہلِ باطل چڑھتے آرہے ہوں گے اُن کا مقابلہ کریں گے، اور وقت کا سب سے بڑا باطل دجالِ اکبر اِنہی کے ہاتھوں قتل ہوگا، اور یہودیوں کا نام ونشان مٹ جائے گا، یہ سارے حالات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیش آنے والے تھے جس کی وجہ سے قرآن وحدیث میں اِن کے حالات کو زیادہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ تو وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ میں اِنہی حالات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کرنے والے تھے۔

''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ'' کے دو مفہوم

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے عیسیٰ! اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ: اب اِس کا مطلب دو طرح سے ادا کیا گیا ہے۔ دشمنوں نے محاصرہ کیا ہوا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مکان کے اندر بند ہیں، اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دیتے ہیں، کہ اے عیسیٰ! میں تجھے لینے والا ہوں، کیا مطلب؟ کہ تو ان کے ہاتھ نہیں آئے گا، میں تجھے وصول کرلوں گا، اور اُن کو وصول کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ کہ رَافِعُكَ اِلَيَّ: میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا، جب یہ مفہوم ہوگا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے تسلی ہوگی کہ میں دُشمن کے قبضے میں نہیں آ سکتا، اس لیے متوفی کا وہ ترجمہ کریں گے جو اس کا حقیقی مفہوم ہے کہ میں تجھے پورا پورا لینے والا ہوں۔ لیکن بعض تفاسیر میں اس کا ترجمہ ''موت

دینے والا ہوں'' بھی کیا گیا ہے،''بیان القرآن'' میں یہی ترجمہ اختیار کیا گیا ہے کہ میں تجھے موت دینے والا ہوں، اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اسی معنی کی نسبت کی گئی ہے مُمِیتُكَ کہ میں تجھے موت دینے والا ہوں، تو جہاں اِس کا موت والا معنی لکھا ہوا ہے وہاں تفسیر کے اندر یہ بات صراحتاً لکھی ہوئی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول میں بھی اور ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی نے یہ مفہوم بیان کیا تو اُس میں بھی، کہ متوفی کا معنی پھر یوں ہوگا کہ اے عیسیٰ! تجھے میں موت دینے والا ہوں، اِن دشمنوں کے ہاتھوں تُو نہیں مرے گا، میں تجھے وقت پر موت دوں گا، اور اِس وقت تجھے بچاؤں گا، اور بچانے کی صورت یہ ہے کہ رَافِعُكَ اِلَيَّ میں تجھے اپنی طرف اُٹھالوں گا، یعنی اِس وقت اپنی طرف اُٹھالوں گا اور دوسرے وقت میں موت تیرے اُوپر میں طاری کروں گا، دشمنوں کے ہاتھوں سے تُو نہیں مرے گا، پھر اِس کا مفہوم اس طرح سے ادا کیا ہوا ہے، تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ میں بھی اور اسی طرح جس کتاب میں بھی متوفیك کا ترجمہ مُمِیتُكَ کے ساتھ کیا گیا ہے تو مفہوم یونہی نقل کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو دشمنوں کے ہاتھوں وفات نہیں پائے گا بلکہ تجھے طبعی موت آئے گی، میں تجھے وفات دینے والا ہوں، اور فی الحال تجھے بچانے کے لئے میں اپنی طرف اٹھالینے والا ہوں، لہٰذا اگر موت والا ترجمہ کیا جائے تو پھر اِس کا مفہوم یوں ادا کیا جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اُس کا پورا ہونا

ایک تو یہ وعدہ ہوا کہ میں تجھے موت دوں گا، اور وعدہ پورا ہوگا جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم وحکمت کا تقاضا ہوگا، کہ حضرت اُتریں گے اور اُترنے کے بعد وفات ہوگی، اگر موت والا معنی ہو۔ اور اگر پورا پورا وصول کرلینے اور اللہ کی طرف اُٹھا لینے کا وعدہ ہو تو یہ اُسی وقت پورا ہوگیا۔ وَمُطَهِّرُكَ: اگلا وعدہ یہ ہے، اگر اِس کا معنی یہ ہو کہ کافر تیرے اُوپر جو الزامات لگاتے ہیں میں اُن سے تیرا دامن صاف کروں گا تو یہ وعدہ بایں صورت پورا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان سے اس کی تفصیل کروائی، اپنی کتاب کے اندر مفصل حالات بیان کردیے، جس سے معلوم ہوگیا کہ ان کی والدہ نعوذ باللہ! یہودیوں کے کہنے کی طرح کوئی بدکارہ عورت نہیں تھی، بلکہ اللہ کی ولیہ تھی، صدیقہ تھی، اللہ کی مقبول بندی تھی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی قدرت کے تحت خلافِ اسباب پیدا ہوئے ہیں، جس قسم کے الزام یہودیوں نے لگائے تھے وہ سارے کے سارے رَدّ کردیے گئے، اور ایسے ہی اُن پر محرِّفِ توراۃ ہونے کا، بددِین ہونے کا، بے دِین ہونے کا، اور اسلاف کی روایت کو توڑنے کا جو الزام وہ لگاتے تھے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت نمایاں کرکے اللہ تعالیٰ نے یہ سارے کے سارے الزامات دُور کردیے۔

یہودی ہمیشہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقابلے میں مغلوب رہیں گے

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ: اگلا وعدہ یہ ہے کہ آج تو تُو اور تیرے ساتھی مغلوب نظر آتے ہیں، لیکن میں تیرے نام لیوا لوگوں کو جو تیری اتباع کرتے ہیں، اتباع کرنے کا معنی یہ ہے کہ تیری شخصیت کے معتقد ہیں، جس کا مصداق عیسائی اور مسلمان، یہ دونوں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ اِن کی اتباع کا دعویٰ آخرت میں جاکے کس درجے تک مفید ہوگا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے اور اُن کی اتباع کا دعویٰ کرنے والے، اُن کے نام لیوا، اُن کی جماعت میں اپنے آپ کو

شامل کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں، اُس زمانے میں عیسائی تھے حقیقتاً، اور پھر اسلام کے آجانے کے بعد مسلمان بھی اور عیسائی بھی دونوں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض نے نظریات اِس قسم کے بنالیے کہ آخرت میں نافع نہ ہوں، بہر حال اُن کی شخصیت کے معتقد دونوں ہیں، ''میں اِن کو اُن پر غالب کردوں گا جو تیرا انکار کرنے والے ہیں'' اِس کا مصداق یہودی ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے تھوڑے دنوں بعد ہی آپ کا مسلک پھیلا، پھیلنے کے بعد عیسائی یہودیوں پر غالب آئے، اب سن ۱۹۸۰ء ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام والا سن ہے، سن عیسوی، اس کا مطلب یہ ہے کہ تقریباً دو ہزار سال سے عیسائیوں کو یہودیوں پر غلبہ حاصل ہے، اور اسی طرح جب اسلام آیا تو مسلمانوں کو بھی یہودیوں پر مکمل غلبہ حاصل رہا، پھر عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقابلے میں یہ قوم عزت نہیں پاسکی، اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ ہر جگہ ذلیل رہے، اور ان پر دنیا میں بہت بہت جان گسل قسم کی تکلیفیں اور عذاب آئے، مختلف حکومتوں میں یہ پٹے، قتل ہوئے، ذلیل ہوئے، ہر جگہ اِن کے ساتھ ایسا ہی ہوا، تو یہ وعدہ بھی دنیا نے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا، اور آج بھی اِن کی حیثیت ایسے ہی ہے، کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقابلے میں اِن کی کوئی حیثیت نہیں، یہ جو اسرائیل کی حکومت آپ کے سامنے قائم ہوگئی یہ بظاہر حکومت ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہ امریکہ اور یورپ والوں کا مسلمانوں کے خلاف ایک جنگی اڈا ہے، اگر یہ لوگ اس کی سرپرستی چھوڑ دیں تو مسلمانوں کے مقابلے میں یہ اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے، اور اگر عیسائی اور مسلمان اکٹھے ہوجائیں تو یہود کا نام ونشان ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن حضور ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق دنیا کے آخری حصے میں یہود کی اِس قسم کی حکومت کی نشاندہی ہے جو ایک فتنہ وفساد کی بنیاد بنے گی، اور جہاں اُن کا دجالِ اکبر آئے گا، اور یہی علاقہ ہے جہاں آج کل اسرائیلی حکومت قائم ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اِن یہودیوں سے مقابلہ ہونا ہے، اور دمشق کے آس پاس لڑائی ہوگی اور دجال یہیں قتل کیا جائے گا، تو اِن کا کسی علاقے کے اندر اس قسم کا اجتماع تو قیامت کے علامات میں سے ایک علامت ہے، کہ یہ ایک علاقے میں اکٹھے ہوں گے اور اکٹھے ہوکر مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں گے، اور اِنہی لڑائیوں میں وہ واقعہ پیش آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، اور اِن کا جو بڑا لیڈر ہوگا دجالِ اکبر وہ اُنہی کے ہاتھوں قتل ہوگا، تو اِن روایات کی طرف دیکھتے ہوئے تو اِس سلطنت کا قائم ہوجانا اور اِس طرح اِن یہودیوں کا ایک جگہ میں جمع ہوجانا گویا کہ یہ پیش خیمہ ہے اِس جگہ مسلمانوں کے یہودیوں کے ساتھ مقابلے کے لئے، تو یہ کوئی ایسی معتدبہ حکومت نہیں جس کو ہم کہیں کہ یہود عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقابلے میں غالب آگئے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تو یہ وعدہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پورا ہوا، اور یہ قیامت تک اِسی طرح رہے گا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقابلے میں اِن کی حیثیت مغلوب ہونے کی ہوگی۔

یہود کا انجام

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ: ''پھر تمہارا میری طرف ہی لوٹنا ہے، پھر میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا اُس چیز میں جس میں تم اختلاف کرتے تھے''، یہ آخرت میں عملی فیصلہ ہوگا، کہ مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ عزت دیں گے اور کافروں کو سزا ہوگی، جیسے تفصیل آگے آرہی ہے کہ ''جو لوگ کفر کرتے ہیں میں اُنہیں عذاب دوں گا سخت عذاب دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی'' یعنی مجموعہ آخرت میں

مرتب ہوگا، کہ دنیا کی سزا دنیا میں ہوگئی اور آخرت کی سزا جب آخرت میں ہوگی تو گویا کہ مجموعہ مرتب ہو جائے گا،'' اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا''۔ تو یہ دنیا اور آخرت کا ذکر مجموعے کے اعتبار سے ہے، ورنہ آخرت میں جانے کے بعد دنیا میں سزا دینے کا کوئی مطلب نہیں، دنیا میں تو سزا ہوگئی جو ہوگئی، یہ مصیبتیں تکلیفیں جو بھی آتی ہیں یہ کافر کے لئے عذاب ہیں اور مسلمان کے لئے کفارہ ہیں، تو یہ دُنیا کا عذاب ہے، اور آخرت کا عذاب جب ہوگا تو تکمیل آخرت میں جا کر ہوگی، اس لیے دُنیا اور آخرت کے عذاب کی تکمیل آخرت میں ہے۔'' اور جو ایمان لانے والے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ اُنہیں اُن کے اجر پورے پورے دے گا، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتے۔''

دلیلِ نبوّت

(ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ) درمیان میں پھر دلیلِ نبوّت کے طور پر یہ لفظ ذکر کر دیا گیا، کہ یہ جو کچھ ہم آپ پر پڑھتے ہیں یہ آیاتِ نبوّت میں سے ہے، دلائلِ نبوّت میں سے ہے، اور پُر حکمت نصیحت سے ہے، جس میں یہود کے نظریات کی تردید بھی ہوتی ہے، اور عیسائیوں کے نظریات کی تردید بھی ہوتی ہے، کہ جو اِن کو خدا یا خدا کا بیٹا کہتے تھے تو ایسی کوئی بات نہیں، اِن کی حالت ایک بندے کی ہے جن کے ساتھ اللہ کی نصرت اور اللہ کی تائید شامل تھی۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ
بیشک عیسیٰ علیہ السلام کا حالِ عجیب اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کے حالِ عجیب کی طرح ہے، پیدا کیا اس نے آدم کو مٹی سے پھر کہا اُس کو
كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۶۰ فَمَنْ
ہو جا پس وہ ہو گیا ۝۵۹ یہ سچی بات آپ کے رب کی طرف سے ہے، پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں ۝۶۰ پھر جو شخص
حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا
آپ سے حجت بازی کرے عیسیٰ کے بارے میں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا، تو آپ کہہ دیجئے آؤ تم، ہم بلالیں اپنے بیٹوں کو
وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ
اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے لوگوں کو اور تمہارے لوگوں کو، پھر ہم گڑگڑا کر دُعا کریں پھر ہم کریں
لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ
اللہ کی لعنت جھوٹوں پر ۝۶۱ بیشک یہ البتہ سچا بیان ہے، اور کوئی معبود نہیں اللہ کے علاوہ،

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾

اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿٦٢﴾ پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں تو بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے فساد کرنے والوں کو ﴿٦٣﴾

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ

آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! آجاؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم نہ عبادت کریں

اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ

اللہ کے علاوہ کسی کی اور ہم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہمارا بعض بعض کو اللہ کے علاوہ رب نہ بنائے، پھر اگر

تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ

وہ پیٹھ پھیریں تو تم کہہ دو کہ تم گواہ ہو جاؤ کہ ہم فرمانبردار ہیں ﴿٦٤﴾ اے کتاب والو! کیوں جھگڑا کرتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں،

وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ

اور نہیں اتاری گئی توراۃ اور انجیل مگر ابراہیم کے بعد، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿٦٥﴾ خبردار تم ہی یہ لوگ ہو کہ

حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا

تم نے جھگڑا کیا اس بات کے بارے میں جس کے متعلق تمہیں کچھ علم ہے، پھر تم کیوں جھگڑا کرتے ہو ایسی چیز کے بارے میں

لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا

جس کے متعلق تمہیں کچھ بھی علم نہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿٦٦﴾ نہ تو ابراہیم یہودی تھے نہ

نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى

نصرانی، لیکن وہ مخلص فرمانبردار تھے، اور مشرکوں میں سے نہیں تھے ﴿٦٧﴾ بیشک سب لوگوں سے زیادہ تعلق رکھنے والا

النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَھٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ

ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اُن کے زمانے میں) اُن کی پیروی کی تھی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ

اور اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے ﴿٦٨﴾ اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کر دیں، اور نہیں گمراہی میں ڈالتے وہ

اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

مگر اپنے آپ کو اور وہ جانتے نہیں ﴿۶۹﴾ اے اہل کتاب! کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیات کے ساتھ حالانکہ تم گواہ ہو ﴿۷۰﴾

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَـقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۱﴾

اے کتاب والو! کیوں خلط کرتے ہو تم حق کو باطل کے ساتھ اور کیوں چھپاتے ہو تم حق کو حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۷۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ - اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ : بیشک عیسیٰ علیہ السلام کا حالِ عجیب اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کے حالِ عجیب کی طرح ہے، خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ: پیدا کیا اُس نے آدم کو مٹی سے، ثُمَّ قَالَ لَهٗ: پھر کہا اُس کو، كُنۡ: ہوجا، فَيَكُوۡنُ: پس وہ ہوگیا۔ اَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ: عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ کہا گیا یہ سچی بات آپ کے رب کی طرف سے ہے، فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ: پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں، فَمَنۡ حَآجَّكَ فِيۡهِ: پھر جو شخص آپ سے حجت بازی کرے، جھگڑا کرے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں، مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ: بعد اِس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا، یقینی بات آگئی، فَقُلۡ: تو آپ کہہ دیجیے، تَعَالَوۡا: آؤ تم، تَعَالَوۡا، آؤ کے معنی میں۔ تَعَالَ: اِدھر آ۔ اصل کے اعتبار سے تَعَالٰی يَتَعَالٰی کا لفظ اُونچا ہونے کے معنی میں ہے، جیسے تَعَالٰی شَانُہٗ جو آپ بولا کرتے ہیں، یہ لفظ عُلوّ سے لیا گیا ہے، اور اِس کا استعمال اصل کے اعتبار سے ایسے موقع پر کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی اوپر کھڑا ہو، اونچا ہو، اور دوسرا آدمی نیچے ہو، جیسے آپ چھت پر کھڑے ہیں اور دوسرا آدمی نیچے زمین پر کھڑا ہے تو آپ اسے کہیں: تَعَالَ تَعَالَ: اوپر چڑھ آ! اوپر چڑھ آ! پھر بعد میں اِس کو اوپر والے معنی سے خالی کر کے مطلق بلانے کے لئے اور متوجہ کرنے کے لئے استعمال کرلیا جاتا ہے، تَعَالَ هِنَا: یہاں آؤ۔ تَعَالَوۡا: آؤ، بلایا یا متوجہ کیا، آجاؤ تم، نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا: ہم بلالیں اپنے بیٹوں کو، وَاَبۡنَآءَكُمۡ: اور تمہارے بیٹوں کو، اِس میں اختصار ہے، یعنی آجاؤ، ہم بلالیں اپنے بیٹوں کو، تم بلالو اپنے بیٹوں کو، اور ''ہم'' کے اندر اگر سب کو اکٹھا کرلیا جائے پھر مطلب ہوگا کہ اپنے اور تمہارے بیٹوں کو ہم اکٹھا کرلیں، وَنِسَآءَنَا: اور بلالیں ہم اپنی عورتوں کو، وَنِسَآءَكُمۡ: اور تمہاری عورتوں کو، وَاَنۡفُسَنَا: اور بلالیں ہم اپنے لوگوں کو، وَاَنۡفُسَكُمۡ: اور تم بلالو اپنے لوگوں کو، بلالیں ہم اپنے نفسوں کو، اپنے لوگوں کو، اور تمہارے لوگوں کو، یعنی تم اکٹھا کرلو اپنے لوگوں کو، ہم خود بھی آجائیں اور اپنے متعلقین کو بھی لے آئیں، اور اسی طرح تم خود بھی آجاؤ اور اپنے متعلقین کو بھی لے آؤ، ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ: اِبتِهال: گڑگڑا کر دُعا کرنا، پھر ہم گڑگڑا کر دُعا کریں، فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ: پھر ہم کریں اللہ کی لعنت جھوٹوں پر، یعنی پھر ہم یوں دُعا کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَـقُّ: بیشک یہ البتہ سچا بیان ہے، وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ: اور کوئی معبود نہیں اللہ کے علاوہ، وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ: اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے، فَاِنۡ تَوَلَّوۡا: پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں، فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ: تو بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے فساد کرنے والوں کو۔ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ: آپ کہہ دیجیے اے کتاب والو!، تَعَالَوۡا: آجاؤ، اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ: ایک بات کی طرف جو

ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہونے کے اعتبار سے برابر ہے، یعنی تم بھی اصولی طور پر اُس بات کو مانتے ہو اور ہم بھی مانتے ہیں، آؤ اِس بات پر اکٹھے ہو جائیں، ’’آجاؤ ایک ایسی بات کی طرف، متوجہ ہو جاؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہونے کے اعتبار سے برابر ہے‘‘، وہ بات یہ ہے اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ: کہ ہم نہ عبادت کریں اللہ کے علاوہ کسی کی، وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا: اور ہم اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں، وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور ہمارا بعض بعض کو اللہ کے علاوہ رَبّ نہ بنائے، اَرباب رَبّ کی جمع، فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر وہ پیٹھ پھیریں، فَقُوْلُوا: تو تم کہہ دو، اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ: کہ تم گواہ ہو جاؤ کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے کتاب والو!، لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ: کیوں جھگڑا کرتے ہو تم، کیوں حجت بازی کرتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں، وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ: نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ابراہیم کے بعد، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ عقل سے کام نہیں لیتے؟ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ: خبردار اتم ہی یہ لوگ ہو، حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ: کہ تم نے جھگڑا کیا اُس بات کے بارے میں جس کے متعلق تمہیں کچھ علم ہے، فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ: پھر تم کیوں جھگڑا کرتے ہو، فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ: علم نکرہ تحت نفی ہے، ایسی چیز کے بارے میں جس کے متعلق تمہیں کچھ بھی علم نہیں، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ: اللہ جانتا ہے، وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے ابراہیم کے طریقے کو اور ان کے مسلک کو تم نہیں جانتے، اور اللہ کی طرف سے یہ وضاحت ہے کہ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا: نہ تو ابراہیم یہودی تھے، وَّلَا نَصْرَانِيًّا: نہ نصرانی تھے، وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا: لیکن وہ مخلص فرمانبردار تھے، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ: بیشک سب لوگوں سے زیادہ تعلق رکھنے والا ابراہیم کے ساتھ، لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ: البتہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن کے زمانے میں اُن کی پیروی کی تھی، وَهٰذَا النَّبِيُّ: اور یہ نبی، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا ولی ہے، مددگار ہے، دوست ہے۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے، لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ: لو مصدر یہ ہو تو معنی ہوگا کہ ’’ایک گروہ چاہتا ہے تمہیں گمراہ کرنا‘‘ یا ’’اہل کتاب میں سے ایک طائفہ کی خواہش ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کر دیں‘‘، وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ: اور نہیں گمراہ کرتے وہ، نہیں گمراہی میں ڈالتے وہ مگر اپنے آپ کو، یعنی اس اِضلال کا وبال اُنہی پر پڑے گا، وَمَا يَشْعُرُوْنَ: اور وہ جانتے نہیں۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے اہل کتاب!، لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیات کے ساتھ، وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ: حالانکہ تم گواہ ہو، يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے کتاب والو!، لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: کیوں خلط کرتے ہو تم حق کو باطل کے ساتھ، وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ: اور کیوں چھپاتے ہو تم حق کو، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حالانکہ تم جانتے ہو۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۞ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۞ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

تفسیر

عیسیٰ علیہ السلام کی آدم علیہ السلام سے مماثلت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو بحث چلی آ رہی تھی یہ آیات اُس کے لئے خاتمۂ بحث کی حیثیت رکھتی ہیں، سارے

حالات کی تفصیل کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمہیں یہ جو اشتباہ پیش آیا کہ جب اُن کا کوئی باپ نہیں تو نعوذ باللہ اُن کا باپ اللہ ہے، تمہاری یہ بات غلط ہے، اگر تم اِس کی مثال دیکھنا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ بغیر ظاہری واسطے کے بھی پیدا کر سکتا ہے، تو اِس کے لئے سب سے اچھی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی ہے، آخر آدم علیہ السلام کے متعلق تم بھی جانتے ہو اور تم بھی معتقد ہو کہ نہ اُس کا کوئی باپ نہ اُس کی کوئی ماں، اللہ نے اُس کو مٹی سے بنایا، مٹی سے بنانے کے بعد اُس کو اپنے کلمہ کُن کے ساتھ موجود کر دیا، جاندار کر دیا، اِسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو اگر باپ کے بغیر پیدا کر دیا تو اِس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ تو ایسے ہی حالِ عجیب ہے خرقِ عادت ہونے کے طور پر، جیسے آدم علیہ السلام کا حال تھا، اس لیے اگر باپ نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں اُس پر اُلوہیت کا یا ابن اللہ کا شبہ ہوا تو سب سے پہلے تمہاری یہ بات آدم علیہ السلام کے متعلق ہونی چاہیے تھی، اور جب آدم علیہ السلام کو تم ابن اللہ نہیں مانتے، اور سمجھتے ہو کہ اللہ کی قدرت کے ساتھ براہِ راست وہ پیدا ہوئے ہیں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یونہی سمجھ لیجئے۔ ''بے شک عیسیٰ کا حالِ عجیب اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کے حال کی طرح ہے، آدم کو اللہ نے مٹی سے بنایا پھر اُسے کہہ دیا ہو جا یعنی جاندار ہو جا، ذی روح ہو جا، پس وہ ہو گیا، سچی بات تیرے رَبّ کی طرف سے ہے'' یعنی جو بات اللہ کی طرف سے کہہ دی گئی وہی واقع کے مطابق ہے، فَلَا تَكُنْ: یہ خطاب عام مخاطب کو ہے جو بھی سننے والا ہے، اے سننے والے! اے مخاطب! تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو، اِس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ نے جو وضاحت فرمادی کہ عیسیٰ علیہ السلام نسلِ آدم سے ہیں، نسلِ ابراہیم سے ہیں، نسلِ آلِ عمران سے ہیں، مریم کے بیٹے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ پیدا ہوئے، اور بشر تھے، آدمی تھے، اللہ کے مقبول بندے تھے، اللہ نے اُنہیں رسول بنایا، اور اُن کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے اُنہیں معجزات دیے، بس اِس سے زیادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی بات نہیں، نہ وہ الٰہ ہیں، نہ الٰہ کا حصہ ہیں، نہ الٰہ کی اولاد ہیں، کچھ بھی نہیں ہیں، بس جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح طور پر کہہ دی گئی یہی واقع کے مطابق ہے، فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ: تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

''مباہلہ'' کا مفہوم اور اس کا مقصد

بات تو یہاں ختم ہو گئی، اب اگر ایک مسئلہ مختلف فیہ ہو تو پہلے تو اُس پر بحث دلائل کے ساتھ ہی ہوتی ہے، کہ استدلال کیا جائے، دلائل اُس پر قائم کیے جائیں، اور دلائل کے ساتھ اپنے مدمقابل کو جھوٹا یا غلط کار ثابت کیا جائے، پہلا درجہ تو یہ ہوتا ہے، اور دلائل کے ساتھ بحث ختم ہو جاتی ہے اگر آپ کا مدمقابل منصف مزاج ہے، جب اُس کے سامنے واضح دلیل آجائے گی اور اس کی ہر دلیل کا جواب آجائے گا، اور جو اُس کے مقابلے میں دلیل قائم کی جائے گی اُس کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا، تو اگر وہ منصف مزاج ہوگا تو اُس بات کو مان جائے گا، اپنی ضد چھوڑ دے گا، اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے گا، اصل طریقہ تو یہی ہے انصاف کے مطابق، کہ دلیل واضح ہو جانے کے بعد بحث ختم ہو جانی چاہیے۔ لیکن بسا اوقات مدمقابل ضدی ہوتا ہے، کسی گروہی تعصب میں مبتلا ہوتا ہے، وہ روشن سے روشن دلیل بھی مانتا نہیں، اور اپنی ہر دلیل کا جواب مل جانے کے بعد بھی وہ اقرار نہیں کرتا کہ میرا مسلک

غلط ہے، اور ہم بھی قرائن سے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ضدی ہے، یہ کسی صورت میں نہیں مانے گا، پھر اگلا طریقہ یہ ہے کہ اسے کہا جائے کہ اِس بحث کو ختم کرنے کے لئے مباہلہ کرلو۔ مباہلہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں کہو کہ تم بھی اپنی پارٹی سمیت آجاؤ، اگرچہ اصل تو وہی ہے جس کے ساتھ بحث اور مناظرہ ہو، لیکن اس میں قوت پیدا کرنے کے لئے اُس کے متعلقین کو اور اُس کی جماعت کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے، کہ آجاؤ، ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر دُعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! دونوں فریقوں میں سے جو جھوٹا ہے اُس پر اپنی لعنت کر، اُس کو اپنی رحمت سے محروم کردے، یہ دُعا کرو اور اس کے بعد پھر اس بحث کو ختم کردو، پھر اللہ جانے اور اللہ کا کام جانے، پھر جس طرح سے ہو بہر حال اس طریقے کے ساتھ ہر فریق اپنا اطمینان ظاہر کرسکتا ہے کہ میں صرف اوپر اوپر سے ضد نہیں کررہا بلکہ میں دل کے اندر بھی اپنے موقف کو صحیح سمجھتا ہوں، اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ اگر میرا موقف غلط ہے تو اللہ میرے پر لعنت کرے اور مجھے برباد کردے، آؤ، سامنے آکر یہ بات کہو، مباہلہ کرلو۔ پھر اگر کوئی شخص ضدی ہوتا ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ میرا موقف غلط ہے، لیکن وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہو، تو پھر اُس کا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ اپنے لئے اس طرح سے وہ وبال مانگے اور لعنت مانگے، ایسے وقت میں پھر اُس فریق کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں۔

نجران کے نصاریٰ کو مباہلہ کو چیلنج اور اُس کا نتیجہ

چنانچہ یہاں بھی ایسے ہی ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث دلائل کے ساتھ تو ہوگئی، لیکن نجران کے لوگ جو گفتگو کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے وہ کسی صورت میں مانتے نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب یہ طریقہ بتایا گیا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو مباہلے کا چیلنج دے دیا کہ آجاؤ، اب آخری طریقہ یہی ہے، اگر تم سچے ہو تو آجاؤ، اور ہم بھی آتے ہیں، اور آکر ہم دونوں اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! جو اِس بارے میں جھوٹا ہے اُسے برباد کردے، جو جھوٹا ہے اُس پر اپنی لعنت برسا، آؤ اب اس طرح ہمارے ساتھ دعا کرو۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خود اور اپنے ساتھ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو، حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو خاص عزیز اور اولاد کی جگہ ہیں، جن کی بربادی اور تباہی انسان کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتا، تعلق والے تو دوسرے بھی ہوتے ہیں لیکن جو اپنی نسلی صلبی اولاد ہوتی ہے اس سے زیادہ طبعی تعلق کسی کے ساتھ نہیں ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں سب سے زیادہ پیار اولاد ہونے کی حیثیت سے بیٹی فاطمہ سے تھا، کیونکہ اُس وقت یہی ایک زندہ تھیں، اور پھر بیٹی کی جو اولاد ہوتی ہے یعنی نواسے، وہ بھی بالکل اپنی اولاد کی طرح ہوتے ہیں، انسان کے نزدیک محبوب ترین ہوتے ہیں، اور داماد بھی اولاد کی جگہ ہی ہوتا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِن کو ساتھ لے کر میدان میں نکل آئے، کہ آؤ، میں بھی اپنے اِن بچوں کے لئے بددُعا کرتا ہوں، اور تم بھی اپنی اولاد کے لئے اور اپنے خاندان کے لئے بددعا کرو، کہ اگر ہم جھوٹے ہیں تو اللہ ہمیں برباد کردے، اور میں بھی یہی دُعا کرتا ہوں، جب آپ نے یہ چیلنج دیا تو اُن عیسائیوں کے قدم اُکھڑ گئے، اور وہ آپس میں کہنے لگے کہ بھئی! بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک ہے، اب اگر ایسی صورت میں ہم نے ان سے مباہلہ کرلیا تو ہمارا کچھ نہیں بچے گا، اس لیے اب ان کے ساتھ مصالحت کرلی جائے، یوں پھر وہ مصالحت کے لئے آمادہ ہوگئے اور جزیہ دینا قبول کرلیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ہوگئے، چنانچہ

نجران کے ان عیسائیوں پر جزیہ رکھ دیا گیا تھا اور اِن کی حیثیت ذمیوں کی ہوگئی تھی۔ تو یہ ہے مباہلے کا مطلب، کہ ملیں اور مل کر اس طرح سے دُعا کریں۔

''مباہلہ'' صرف قطعیات میں ہوتا ہے

اب بھی اگر کسی کے ساتھ اختلاف ہوجائے بشرطیکہ آپ کا موقف قطعی ہو، کیونکہ ظنی اور اجتہادی مسائل میں مباہلہ نہیں ہوتا، مثال کے طور پر کوئی غیر مقلد آپ کے ساتھ بحث کرلے کہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی ہے کہ نہیں پڑھنی؟ چونکہ اصولی طور پر دلائل کے ساتھ ہی دونوں طرف حق کا اشتباہ ہے، ہوسکتا ہے اُن کا موقف صحیح ہو، ہوسکتا ہے ہمارا موقف صحیح ہو، ایسے مسائل پر مباہلہ نہیں ہوتا، ایسے مسائل پر تو بحث کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ بھائی! ہمیں دلائل اور قرائن کے ساتھ راجح یوں معلوم ہوتا ہے، آپ کے نزدیک راجح یوں ہے، دونوں باتوں کی گنجائش ہے، اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق جیسے کوئی مجتہد عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پائے گا، اُمت کے اندر پہلے سے ہی دورائیں چلی آرہی ہیں۔ اور مباہلے والا موقف ایسے قطعی سلسلے میں ہوتا ہے جس میں انسان کو اپنے مؤقف کا بالکل اِس طرح یقین ہے جس طرح روزِ روشن میں سورج کا یقین ہوتا ہے، ایسے وقت میں دوسرے کی ضدکو ختم کرنے کے لئے اور اُس کو چپ کرانے کے لئے ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بس بھئی! اور کوئی طریقہ نہیں، اللہ سے دعا کرو کہ جو جھوٹا ہے اللہ اُسے برباد کردے، جب یوں دعا کریں گے تو اُس کے بعد جھگڑا ختم ہوجائے گا، باقی یہ کوئی ضروری نہیں کہ اِس کا نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوجائے، بلکہ وہ اللہ کے سپرد ہے جیسے بھی ہو، چاہے وہ کسی فریق پر وبال ڈال دے، کسی مصیبت میں مبتلا کردے، اور چاہے وہ اِس سارے معاملے کو آخرت میں رکھ لے، یہ اب اُس کا کام ہے، ہم اپنی طرف سے آخری بات یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم جھوٹے ہیں تو ہم پر اللہ کی لعنت، اور اگر تم جھوٹے ہو تو تم پر اللہ کی لعنت، ہم بھی یہ بات کہتے ہیں، تم بھی یہ بات کہہ دو، اُس کے بعد بحث ختم۔ جب انسان پوری پختگی کے ساتھ یہ بات کہتا ہے تو یہ علامت ہوتی ہے کہ یہ دل میں اپنے موقف پر سچا ہے اور اپنے موقف پر اِس کو اطمینان ہے، اور جب یوں بددعا کرنے کے لئے کوئی تیار نہ ہو تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ اُوپر اُوپر سے انکار کررہا ہے، لیکن دل سے یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا موقف صحیح ہے، اور مخالف کا صحیح نہیں ہے۔ یوں پھر انسان کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں، یہ آخری درجہ ہے، اِس کے بعد بحث کو ختم کردیا گیا۔

سوال:- بریلویوں کے ساتھ مباہلہ کرنا جائز ہے؟

جواب:- کس بات پر؟

سوال:- مثلاً علم غیب، مختارِکُل، اور حاضر ناظر کے مسائل پر۔

جواب:- یہ عنوانات تشریح طلب ہیں، کہ وہ علم غیب کی نسبت کسی کی طرف کرتے ہیں تو کس انداز سے کرتے ہیں؟ اور حاضر ناظر کہتے ہیں تو کس وجہ سے کہتے ہیں؟ مثلاً توحید کا مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، ذات وصفات میں منفرد ہے، یہ مسئلہ تو قطعی ہے، باقی! کسی تاویل وغیرہ کے تحت کوئی لفظ استعمال کیا جائے تو اُس کا استعمال بدعت اور غلط ہے، لیکن اِس میں تعبیرات کا بڑا فرق

ہے، لفظ کسی قسم کا ہوتا ہے لیکن مفہوم کسی قسم کا ہوتا ہے، اگر مفہوم ایسا واضح ہو کہ اُس کا بطلان آپ کے نزدیک قطعی اور یقینی ہو تو مباہلہ ہو سکتا ہے۔ ویسے اِن الفاظ میں ہمارے نزدیک تو زیادہ تر ضد کا ہی دخل ہے صرف عنوانات کے طور پر، کہ ایک لفظ وہ بولتے ہیں محض ایک دوسرے کو چڑانے کے لئے، اور پھر ضد کرتے کرتے بہت آگے نکل گئے، لیکن وہ الفاظ اس قسم کے واضح نہیں ہیں کہ ہم یہ کہیں کہ حق اور باطل کی حقیقت بالکل نمایاں ہو کر سامنے آگئی، اُن میں تاویلات کی گنجائش بھی ہوتی ہے، یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے، اِس میں اجمالی تذکرہ نہیں کیا جاسکتا۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علمِ صحیح آگیا، تو آپ کہہ دیجئے کہ آجاؤ، ہم بلا لیتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، یعنی ہم اپنی اولاد کو لے آتے ہیں، تم اپنی اولاد کو لے آؤ، اور ہم اپنی عورتوں کو لے آتے ہیں، تم اپنی عورتوں کو لے آؤ، اس سے خاندان کے افراد مراد ہیں، اور یہ قوت پیدا کرنے کے لئے ہے، ورنہ اصل کے اعتبار سے مباہلے میں وہی ہوتا ہے جو آپ کے ساتھ بحث کرنے والا ہے، باقی! جماعت کو بلا لیا، جماعت کے افراد بلا لیے، گھر کے افراد بلا لیے، یہ اُس میں قوت پیدا کرنے کے لئے ہے، کہ ایک آدمی اپنے لیے تو بربادی مانگ سکتا ہے، اپنے خاندان کے لئے اور اپنے متعلقین کے لئے بسا اوقات بربادی نہیں مانگتا، تو قوت پیدا کرنے کے لئے ایسی بات کہہ دی گئی۔ ہم اپنے آپ کو بلا لیتے ہیں یعنی خود آجاتے ہیں، اسی طرح اپنے متعلقین کو لے آتے ہیں، تم بھی خود آجاؤ اور اپنے متعلقین کو لے آؤ، ثُمَّ نَبْتَهِلْ: پھر ہم آپس میں اکٹھے ہو کر گڑگڑا کر دُعا کرتے ہیں، اور دُعا کا مفہوم یہ ہوگا کہ نَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ: ہم اللہ کی لعنت کرتے ہیں جھوٹوں پر، یعنی یوں دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جھوٹوں پر اپنی لعنت برسائے، اپنی رحمت سے محروم کردے۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ: بیشک یہ بیان سچا ہے اور حاصل اِس کا یہی ہے کہ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ: اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، خصوصیت کے ساتھ یہاں نفی کرنی مقصود ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ کی، جن کے متعلق عیسائیوں نے اُلوہیت کا عقیدہ ایجاد کیا، کہ اِن میں اُلوہیت نہیں ہے، الٰہ صرف اللہ ہے، ذات وصفات میں ایک ہے، ''بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے''۔ اتنا واضح ہونے کے بعد بھی ''اگر وہ پیٹھ پھیریں تو پھر اللہ تعالیٰ اِن مفسدوں کو جانتا ہے'' یعنی پھر یہ مفسد ٹھہرے، پھر یہ اصلاح نہیں چاہتے، یہ مفسد ہیں جو خواہ مخواہ فساد چاہتے ہیں، ''تو پھر اِن فسادیوں کو اللہ خوب جانتا ہے'' اِس کے اندر وعید کا پہلو ہے کہ پھر وقت پر اللہ تعالیٰ اِن کو سزا دے گا۔

اہلِ کتاب کو مسلّم اُصولوں پر اِتفاق کی دعوت

(قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا) یہ آگے تبلیغ کا ایک طرز اختیار کیا گیا، کہ اُنہیں کہو کہ کیوں خواہ مخواہ ضد کرتے ہو، تمہاری کتابوں میں اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں ایک بات مسلّم اُصول کے طور پر ذکر کی ہوئی ہے، اور ہم بھی اُس کو تسلیم کرتے ہیں، بس اُسی پر اتفاق کرلو، اور پھر عقلمندی اور سمجھداری کے ساتھ غور کر کے جو جو تمہارے نظریات اُس مسلّم بات کے خلاف ہیں اُن کو چھوڑ دو، اور ہمارے نظریات میں کسی بات کی نشاندہی کردو، جو اُس مسلّم عقیدے کے خلاف ہوگی ہم چھوڑ دیں گے۔ یہ دعوت کا ایک طریقہ

ہوتا ہے، کہ بھئی! یہ بات تو مسلم ہے کہ تم بھی کہتے ہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، اور اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو رَبّ نہیں بنانا چاہیے، تمہاری کتابوں کی تعلیم بھی یہی ہے، آؤ اِسی پر اتفاق کر لیں، اتفاق کرنے کے بعد پھر غور کرو، جو چیز اِس اصول کے خلاف ہو اُس کو چھوڑ دو، اور ہمارے مسلک کے اندر کوئی نشاندہی کرو جس سے اللہ تعالیٰ کے اِس کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے خلاف لازم آتا ہو، یا ہم یہ جو کہتے ہیں کہ کسی دوسرے کو رب نہیں بنانا چاہیے، اِس کے خلاف کوئی نشاندہی ہمارے مسلک میں کرو ہم چھوڑ دیں گے، تمہارے مسلک میں ہم نشاندہی کرتے ہیں تم چھوڑ دو، اس مسلّم اصول پر سارے اتفاق کرلو، یعنی مسئلہ توحید پر۔ یہ دعوت کے اندر ایک تلطف ہے، نرمی اختیار کرنے والی بات ہے کہ دیکھو! مسلمات پر اتفاق کرلو، جتنے مختلف فیہ مسائل ہیں وہ اِسی اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے حل کرلو، تو آپس میں جوڑ لگ سکتا ہے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اے کتاب والو! آجاؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہونے کے اعتبار سے برابر ہے، وہ یہی ہے کہ اللہ کے علاوہ ہم کسی کی عبادت نہ کریں، اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہمارا بعض بعض کو اللہ کے علاوہ رَبّ نہ بنائے۔'' اور یہ بھی اہلِ کتاب پر ایک الزام قرآن نے لگایا اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ (سورۂ توبہ:۳۱) کہ اِن لوگوں نے اللہ کے علاوہ اپنے علماء کو اور اپنے مشائخ کو رَبّ بنالیا، اَحبار حِبْر کی جمع ہے بمعنی عالم، رُھبان راھب کی جمع ہے بمعنی درویش، تو پیروں کو اور علماء کو، مشائخ کو اور درویشوں کو اور علماء کو، مولویوں کو، مفتیوں کو، صوفیوں کو (اِس کا مفہوم آج کل کے الفاظ میں یہی ہوگا) اِنہوں نے اللہ کے علاوہ رَبّ بنالیا۔ جب عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، (یہ پہلے نصرانی تھے، اور حاتم طائی بھی نصرانی تھا، اور حاتم طائی مسلمان نہیں ہوا، یہ جو سخی مشہور ہے اِس کا بیٹا عدی مسلمان ہوا ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی ہے، اِس سے بہت ساری روایتیں کتابوں میں آتی ہیں) تو اِس عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے یہ کہا تھا کہ یارسول اللہ! قرآن جو عیسائیوں پر الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے اپنے اَحبار و رُہبان کو رَبّ بنالیا، حالانکہ وہ تو اپنے اَحبار و رُہبان کو رَبّ نہیں کہتے، اور وہ چونکہ خود پہلے عیسائی تھے اس لئے حال جانتے تھے، تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ اِشکال کیا کہ عیسائی تو اپنے اَحبار و رُہبان کو رَبّ نہیں کہتے، اور قرآن کہتا ہے کہ اِنہوں نے اُن کو رَبّ بنالیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اِن کا اپنے اَحبار و رُہبان کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہے کہ جس کو وہ حلال کہہ دیں چاہے وہ کتاب اللہ کی تصریحات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اُس کو یہ حلال جانتے ہیں، اور جس چیز کو وہ حرام کہہ دیں چاہے وہ اللہ تعالیٰ کی تصریحات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اُس کو یہ حرام کہتے ہیں، یعنی تحلیل و تحریم کا اختیار اِنہوں نے اپنے اَحبار و رُہبان کو نہیں دے دیا؟ کہ اُنہی کی بات پر مدار رکھتے ہیں چاہے کتاب اللہ کی صراحت کے خلاف ہو، یہ منصب انہوں نے ان کو سونپا نہیں ہے؟ وہ کہنے لگے ہاں جی! یہ بات تو ہے، چلتا تو اُنہی کا ہی فتویٰ ہے، کتاب اللہ کے خلاف بھی فتویٰ دے دیں تو بھی قوم اُنہی کی مانتی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے یہی تو اِتخاذِ رَبّ ہے،[1] کہ کسی کی اطاعت اِس طرح سے کر لی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف بھی اُس کے فتوے کو اہمیت دی جائے، اللہ تعالیٰ صراحتاً ایک بات کو حلال کہتا ہے اور ایک آدمی حرام کہہ دے، اور تم کہو کہ یہ صحیح کہتا ہے، تو تم نے اُس کو رَبّ بنالیا، اللہ ایک چیز کو حرام کہتا ہے اور کوئی دوسرا آدمی کہہ دے کہ حلال ہے اور تم کہو یہ صحیح کہتا ہے تو تم نے اُس شخص کو رَبّ بنالیا، تو

---

(۱) روح المعانی، سورۂ توبہ، آیت ۳۱ / سنن کبریٰ بیہقی ج ۱۰ ص ۱۹۸ / نیز ترمذی ج ۲ ص ۱۴۰ کتاب التفسیر، سورۂ توبہ۔

اُن کی یہ حیثیت تھی۔ تو یہاں مطلب یہ ہوگا کہ اطاعت صرف اللہ کی کی جائے، اللہ کے احکام کے مقابلے میں کسی بندے کے حکم کو ترجیح نہ دی جائے، یہ بھی ایک مسلّم اُصول ہے۔ آؤ دیکھ لو، اِس پر تم چلتے ہو یا ہم؟ جو کمی بیشی اپنے مسلک کے اندر ہے اُس کو ٹھیک کرلیں، اور اِس متفق علیہ اُصول پر آجاؤ، ہم آپس میں اتفاق کر لیتے ہیں۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر یہ پیٹھ پھیریں اور اتنی صاف بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تو انہیں کہہ دو کہ تم گواہ ہو جاؤ، ہم تو فرمانبردار ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے گا ہم تو اُس کو ماننے کے لئے تیار ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ نے جس وقت دوسرے علاقوں کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط لکھے ہیں، تو جو بادشاہ اہلِ کتاب میں سے تھے اُن کو خط لکھتے ہوئے حضور ﷺ آخر میں یہی آیت لکھا کرتے تھے یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ الخ، آپ کے جو خطوط ملے ہیں اُن کے اندر یہ آیت درج ہے۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ملتِ ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ: اب اُنہوں نے اپنی گفتگو میں اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی پر قرار دینے کی کوشش کی، کہ ہمارا مسلک ابراہیمی مسلک ہے، اور ابراہیم ہمارے طریقے پر تھے جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں، ابراہیم علیہ السلام کو یہود اپنی طرف کھینچتے تھے، عیسائی اپنی طرف کھینچتے تھے، اور مشرکینِ مکہ اپنے آپ کو اولادِ ابراہیم قرار دے کر کہتے تھے کہ ملتِ ابراہیمی پر ہم ہیں، اور اِسی سے وہ اپنے مسلک میں وزن پیدا کرتے تھے اور سرورِ کائنات ﷺ کی مخالفت کرتے تھے، کہ انہوں نے ملتِ ابراہیمی کو چھوڑ دیا، یہ ملتِ ابراہیمی کے خلاف چلتے ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کو سارے کے سارے لوگ اپنا بزرگ مانتے تھے، عیسائی بھی، یہودی بھی اور مشرکینِ مکہ بھی۔ اِس مسئلے کی کچھ تفصیل آپ کے سامنے پہلے پارے میں بھی آئی تھی کہ ملتِ ابراہیمی کیا چیز ہے؟ وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، وہاں ملتِ ابراہیمی کی تفصیل ذکر کی گئی تھی، یہاں بھی اُسی کو ذکر کرنا مقصود ہے، ''اے اہلِ کتاب! کیوں جھگڑا کرتے ہو ابراہیم کے مسلک کے بارے میں'' کہ ابراہیم کا کیا طریقہ تھا، ''حالانکہ نہیں اتاری گئی توراۃ و انجیل مگر اُن کے پیچھے''، توراۃ بھی اُن کے بعد اتری، اور یہودیت اس اصول و فروع کے مجموعے کا نام ہے جو توراۃ نے تلقین کیا، اور نصرانیت وہ مسلک ہے جو انجیل سے بنا، جن کے اصول و فروع وہ ہیں جن کی تفصیل انجیل نے کی، تو یہودیت اور نصرانیت دونوں طریقے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کے ہیں، پھر آپ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ یہودیوں والا یا نصرانیوں والا ہی تھا؟ ''نہیں اتاری گئی توراۃ اور انجیل مگر اُن کے بعد، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ سمجھتے نہیں ہو؟'' ''تم ہی یہ لوگ ہو کہ تم نے جھگڑا کیا اُس بارے میں جس کے متعلق تمہیں کچھ علم تھا'' یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور اُن کے خوارقِ عادات جن سے تمہیں شبہ پیدا ہوتا تھا، اِس بارے میں تم نے جھگڑا کیا، کسی درجے میں تمہیں علم تھا کہ اِس قسم کے معجزات اُن سے صادر ہوئے ہیں، اِس قسم کے تصرفات اُن سے صادر ہوئے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک مقدمہ صحیح تھا جس کا تمہیں علم ہے، اور ایک مقدمہ تم نے اپنی جہالت کے ساتھ غلط جوڑ لیا کہ جو اِس قسم کے معجزے دکھائے وہ اللہ ہوتا ہے، جس کے ہاتھ سے اِس قسم کے تصرفات ظاہر ہوں وہ معبود ہوتا ہے، یہ تم نے دوسرا مقدمہ جوڑ لیا جو کہ غلط ہے، تو ایک مقدمہ تمہارے پاس صحیح ہے جس کی بناء پر تم نے جھگڑا کیا،

کچھ معلومات تمہیں تھیں، لیکن ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تو تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں، تو اُن کے بارے میں خواہ مخواہ کیوں جھگڑا کر رہے ہو۔ ''کیوں جھگڑا کرتے ہو اُس چیز کے بارے میں جس کے متعلق تمہیں کچھ بھی علم نہیں ہے، ابراہیم علیہ السلام کے حالات کو اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

صحیح معنی میں ملّتِ اِبراہیمی پر کون ہے؟

اور اللہ کی طرف سے وضاحت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ یہ نہیں تھا جو موجودہ یہودیت ہے، اور نہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ یہ تھا جو موجودہ نصرانیت ہے، ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا اسلام، کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے اُس کو مان لو، اب اللہ کے اَحکام کی جو اتباع کرے گا مسلکِ ابراہیمی پر وہ ہے، اور اگر تم اِسی پر ضد کر کے بیٹھ جاؤ کہ یہودیت ہی ابراہیم کا طریقہ تھا، ہم اُسی پر جمیں رہیں گے، تو یہ بات غلط ہے اور ملت ابراہیمی کے خلاف ہے، کیونکہ ٹھیک ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اِن باتوں کو ماننا ہی مسلکِ ابراہیم تھا، چونکہ مسلکِ ابراہیم ہے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ بقرہ:۱۳۱) یعنی رَبّ العالمین کا کہنا مان لینا، جو حکم اس کی طرف سے آجائے اُس کے سامنے گردن ڈال دینا۔ لیکن جب ایک صحیح دلیل کے ساتھ اُس کا منسوخ ہونا ثابت ہوگیا تو اب وہ ملتِ ابراہیمی نہیں ہے، ملتِ ابراہیمی ہر وقت میں وہی ہے جو اللہ کی طرف سے احکام آجائیں اُنہی کو تسلیم کرو، اُن کا مسلک یہ تھا، نہ وہ متعین طور پر یہودی تھے، نہ متعین طور پر نصرانی تھے، اُن کی ملت اسلام ہے، اللہ کے احکام کو ماننا، تو جو شخص جس وقت میں اللہ کے احکام کو مانے گا وہی ملتِ ابراہیمی پر ہے، متعین طور پر یہودیت یا نصرانیت یہ مجموعہ توراۃ وانجیل سے شروع ہوا ہے، اور یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ''اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے'' اِس لئے مشرکینِ مکہ کا یہ کہنا کہ ابراہیم ہمارے مسلک پر تھے یہ تو بنیادی طور پر ہی غلط ہے، وہ تو موحدِ اعظم تھے، اور شرک گڑھ کے اندر اللہ کی توحید کی تبلیغ کرنے والے تھے، تو یہ مشرک اُن کے مسلک پر کیسے ہوسکتے ہیں؟ ''سب سے زیادہ تعلق رکھنے والا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ البتہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن کے زمانے میں اُن کی اتباع کی، اور موجودہ دور میں یہ نبی اور اِن پر ایمان لانے والے لوگ'' یہ ہیں ملتِ ابراہیمی پر، کہ اللہ کی طرف سے جو تازہ بتازہ احکام آتے ہیں یہ اُن سب کو تسلیم کرتے ہیں، ''اور اللہ تعالیٰ اِنہی مؤمنوں کا دوست ہے۔''

مسلمانوں کو کافروں سے محتاط رہنے کی تلقین اور اہلِ کتاب کو تنبیہ

(وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ الخ) آگے مسلمانوں کو اہل کتاب سے ذرا محتاط رہنے کی تلقین کرنا مقصود ہے، کہ ان کی اس قسم کی شرارتوں سے متاثر نہ ہونا، شبہات میں نہ پڑنا، یہ تو تمہیں گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ''چاہتا ہے اہل کتاب میں سے ایک طائفہ (وَدَّ یَوَدُّ: خواہش کرنا، چاہنا) کہ تمہیں گمراہ کردیں، اور اِس اضلال کا وبال اُنہی کی جانوں پر پڑے گا اور اُن کو پتہ نہیں چلتا۔'' آگے اہل کتاب کو تنبیہ ہے، اور یہ لفظ آپ کے سامنے پہلے بھی گزر چکے ہیں، ''اے اہل کتاب! اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو'' گواہ ہونے کا معنی دو طرح سے کیا جاسکتا ہے، ایک مطلب تو یہ ہے کہ دل سے تم گواہی دیتے ہو کہ یہ باتیں ٹھیک ہیں، لیکن اُوپر اُوپر سے انکار کرتے ہو، جیسے کہ پچھلے حالات میں بات واضح ہوگئی، یا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ اِنہی

احکام اور اِنہی باتوں پر تو اللہ نے تمہیں گواہ بنایا ہے، جیسے ایک واقعہ پیش آیا اور میں نے تمہیں گواہ بنالیا، لیکن بعد میں تم اس واقعہ کے منکر ہوگئے، میں کہتا ہوں کہ بھئی! تم کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم ہی تو گواہ ہو؟ اور یہ گواہ کس طرح ہیں؟ کہ پہلی کتابوں میں اِنہی مضمونوں کا اللہ تعالیٰ نے اِن سے عہد لیا ہوا ہے، اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ [1] اِس قسم کی آیات جتنی بھی ہیں کہ تم نے حق کو ظاہر کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ، اور اسی طرح آنے والے نبیوں پر ایمان لانے کا میثاق ہے۔ تو تم خود ہی تو اِس مضمون کے گواہ ہو، اور پھر تم ہی انکار کیے ہوئے ہو؟ یعنی اصل کے اعتبار سے تو تم واقف ہو اور تمہیں اِس مضمون کا گواہ بنایا گیا ہے، لیکن آج تم انکار کیے بیٹھے ہو، جیسے اگر کسی واقعہ پر آپ کو گواہ بنایا تھا اور بعد میں آپ منکر گئے، تو تمہیں تنبیہ کرتے وقت یہی کہا جائے گا کہ بھئی! تم انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم ہی تو اس واقعہ کے گواہ ہو۔ تو یہ ملامت اُن کو اسی قسم کی ہے، یا یہ ہے کہ دل سے تم جانتے ہو کہ بات صحیح ہے اور اوپر سے انکار کرتے ہو۔ "اے اہل کتاب! حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو" حق سے مراد وہ باتیں جو توراۃ اور انجیل میں آئی ہوئی ہیں، باطل سے مراد وہ تحریفات جو تم نے ساتھ ملالیں، جب حق اور باطل کو آپس میں خلط کیا جائے تو حق چھپ جاتا ہے، پھر حق نمایاں کس طرح سے ہوگا۔ "اور کیوں چھپاتے ہو تم حق کو حالانکہ تم جانتے ہو" کہ یہ جو تم حرکتیں کرتے ہو یہ اچھی بات نہیں ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا، ایمان لے آؤ اُس چیز پر جو اُتاری گئی اُن لوگوں پر جو ایمان لائے

وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

(ایمان لے آؤ) دن کے ابتدائی حصے میں، اور دن کے آخری حصے میں اس کا انکار کردو تاکہ وہ لوٹ آئیں ﴿۷۲﴾

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ

اور تم تصدیق نہ کرو مگر اسی شخص کی جو تمہارے دین کا تابع ہے، آپ کہہ دیجئے کہ بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے

اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ

(کیا تم نے یہ تدبیر اس اندیشے سے کی؟) کہ دیا جائے کوئی شخص مثل اُس چیز کے جو تم دیے گئے یا وہ غالب آجائیں تم پر تمہارے

رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

رَبّ کے سامنے، آپ کہہ دیجئے کہ فضل اللہ کے قبضے میں ہے، دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے ﴿۷۳﴾

---

(۱) پارہ نمبر ۱ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۸۳۔ نیز پارہ نمبر ۴ سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۸۷ میں ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ وَمِنْ اَهْلِ

خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۷۴ اور اہلِ کتاب میں سے

الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ

بعض وہ شخص ہے جس کو اگر تو امین بنادے ایک ڈھیر پر تو وہ اُس ڈھیر کو تیری طرف ادا کردے گا، اور ان میں سے بعض وہ ہے کہ اگر

تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ

تو اُس کو امین بنادے ایک دینار پر تو نہیں ادا کرے گا وہ اس دینار کو تیری طرف، مگر جب تک تو اس پر کھڑا رہے، یہ

بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

اس سبب سے ہے کہ انہوں نے کہا ہم پر اِن اَن پڑھوں کے بارے میں کوئی الزام نہیں، اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

حالانکہ جانتے ہیں۷۵ کیوں نہیں، جو شخص پورا کرے اپنے عہد کو اور تقویٰ اختیار کرے، پس بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں متقین سے۷۶

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ

بیشک وہ لوگ جو خریدتے ہیں اللہ کے عہد کے عوض اور اپنی قسموں کے عوض قلیل ثمن، یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں

فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ

کوئی حصہ نہیں اور اللہ ان سے بولے گا بھی نہیں، اور ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں قیامت کے دن، اور انہیں پاک بھی نہیں کرے گا،

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ

اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۷۷ اور بیشک ان اہل کتاب میں سے البتہ ایک گروہ ہے جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو

بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ

کتاب کے ساتھ تاکہ تم سمجھ لو اس کو کتاب میں سے حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بات

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے، اور یہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۷۸

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا

کسی بشر سے یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب، حکمت اور نبوت دے، پھر وہ کہنے لگ جائے لوگوں کو کہ تم

عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ

میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر لیکن (وہ تو یہی کہے گا کہ) ہو جاؤ تم اللہ والے اس سبب سے کہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو

وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ

اور اس سبب سے کہ تم کتاب پڑھتے ہو ﴿۷۹﴾ اور اس بندے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں حکم دینے لگ جائے کہ بنالو تم فرشتوں

وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع

اور نبیوں کو رب، کیا وہ بشر تمہیں کُفر کا حکم کرے گا؟ بعد اس کے کہ تم (اپنے خیال میں) فرمانبردار ہو ﴿۸۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اہل کتاب میں سے ایک طائفہ نے، ایک گروہ نے کہا، اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: ایمان لے آؤ اس چیز پر جو اتاری گئی اُن لوگوں پر جو ایمان لائے، وَجْهَ النَّهَارِ: اٰمِنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ، ایمان لے آؤ دن کے ابتدائی حصے میں، یعنی صبح کو، وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ: اور دن کے آخری حصے میں یعنی شام کو اُس کا انکار کر دو، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: تا کہ وہ لوٹ آئیں، وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ: اور تم ایمان نہ لاؤ، تصدیق نہ کرو مگر اسی شخص کی جو تمہارے دین کا تابع ہے، قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ: آپ کہہ دیجیے کہ بیشک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے، اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ: دَبَّرْتُمْ هٰذَا مَخَافَةَ اَنْ يُّؤْتٰى (مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ میں چونکہ خطاب آرہا ہے اِس لیے اَنْ يُّؤْتٰٓى سے پہلے مخاطب کا صیغہ مقدر نکالیں گے) اے یہودیو! اے اہل کتاب! کیا تم نے یہ تدبیر اس لیے کی ہے کہ دیا جاتا ہے کوئی شخص مثل اس چیز کے جو تم دیے گئے؟ اس اندیشے سے تم نے یہ تدبیر کی ہے کہ دیا جائے کوئی شخص مثل اُس چیز کے جو تم دیے گئے؟ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ: یا وہ غالب آجائیں تم پر تمہارے رَبّ کے سامنے، قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ: آپ کہہ دیجیے کہ فضل اللہ کے قبضے میں ہے، يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، علم والا ہے، يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ: اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اہل کتاب میں سے بعض وہ شخص ہے مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ: جس کو اگر تو امین بنادے ایک ڈھیر پر، اعتبار کرلے تو اس کا ایک ڈھیر کے بارے میں، يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ: تو وہ اُس ڈھیر کو تیری طرف ادا کر دے گا۔ قنطار ڈھیر کو کہتے ہیں، قناطیر مقنطرۃ کا لفظ آپ کے سامنے گزرا ہے، لگائے ہوئے ڈھیر، اور اِس سے کثیر مال مراد ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ: اور ان اہل کتاب میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اُس کو امین بنادے ایک دینار پر، لَّا يُؤَدِّهٖٓ

اِلَيْكَ: تو نہیں ادا کرے گا وہ اس دینار کو تیری طرف، اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا: مگر جب تک کھڑا رہے تو اُس پر ہمیشہ، مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا: اِس کا مفہوم دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، یا تو یہ ہے کہ وہ ایک دینار تیری طرف ادا نہیں کرے گا مگر یہ کہ تو اُس کے سر پر ہر وقت مسلط رہے، تو آخر تنگ آ کر وہ دے دے گا، یعنی بہت ہی مجبوری کی حالت میں وہ تمہاری طرف ادا کرے گا، ورنہ اس کا ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا، اور دوسرا مفہوم اس طرح سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ لَا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ بَلْ اَنْكَرَهٗ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا، ''بیان القرآن'' میں یہی مفہوم ادا کیا گیا ہے، کہ اگر تو اس کو ایک دینار پر امین بنا دے تو وہ اُس دینار کو تیری طرف ادا نہیں کرے گا، بلکہ اُس کا سرے سے امانت رکھنے کا انکار ہی کر دے گا، مگر یہ کہ تو اُس پر کھڑا رہے، یعنی امانت رکھ کر جتنی دیر تک اس کے پاس کھڑے ہو اتنی دیر تک تو وہ انکار کی جرأت نہیں کرے گا، بس آنکھوں سے غائب ہوئے، پھر آؤ گے تو سرے سے انکار کر دے گا، اَنْكَرَهٗ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا، اُس ایک دینار کے امانت رکھنے کا سرے سے انکار ہی کر دے گا، مگر جب تک تو اُس پر کھڑا رہے، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ: یہ اس سبب سے ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ ہم پر اِن اَن پڑھوں کے بارے میں کوئی الزام نہیں، اُمیین کا مصداق بنی اسماعیل ہیں، اِن بنی اسماعیل کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں، وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ: حالانکہ جانتے ہیں، بَلٰى: کیوں نہیں، مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ: جو شخص پورا کرے اللہ کے عہد کو، یا، جو پورا کرے اپنے عہد کو جو اس نے کیا ہے، وَاتَّقٰى: اور تقویٰ اختیار کرے، فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ: پس بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں متقین سے۔ یعنی جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے وہ اللہ کا محبوب ہے، کیونکہ یہ شخص متقی ہے، پس بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں سے محبت رکھتے ہیں، اِس طرح سے آیت کا مفہوم پورا ہو جائے گا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ: بیشک وہ لوگ جو خریدتے ہیں اللہ کے عہد کے عوض اور اپنی قسموں کے عوض، ثَمَنًا قَلِيْلًا: قلیل ثمن، اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ: یہی لوگ ہیں کہ اِن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ: اور نہ ان سے اللہ تعالیٰ کلام کرے گا، یعنی مہربانی اور شفقت کی کلام نہیں کرے گا، اللہ اِن سے بولے گا نہیں، وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اور نہ اِن پر نظر شفقت کرے گا قیامت کے دن، یعنی اِن کی طرف دیکھے گا بھی نہیں قیامت کے دن، دیکھنے سے مراد یہاں وہی نظر شفقت کے طور پر ہے، ورنہ اللہ کی نظر سے یہ لوگ غائب نہیں ہوں گے، وَلَا يُزَكِّيْهِمْ: اور اللہ اِنہیں صاف نہیں کرے گا، پاک نہیں کرے گا، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا: اور بیشک اِن اہلِ کتاب میں سے البتہ ایک گروہ ہے، يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ: جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ، لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ: یہ ہ ضمیر اُس بات کی طرف لوٹ رہی ہے جس کو زبانیں مروڑ کر اِنہوں نے پڑھا، یعنی کوئی لفظی معنوی تحریف کر لی، کوئی لفظ بگاڑ دیا، بگاڑ کر اس کو پڑھ لیا، اور پڑھتے ایسے لب و لہجے کے ساتھ ہیں لِتَحْسَبُوْهُ، تاکہ اِن کے اُس محرّف کو، تاکہ اِن کے اُس متلوکو، جو زبان موڑ کر اِنہوں نے پڑھا ہے، تم اللہ کی طرف سے سمجھ لو، ''تم سمجھ لو اُس کو کتاب میں سے'' وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ: حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے، وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ: ایک تو اپنے لب و لہجے کے ساتھ تاثر دیتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ سے ہے، اور پھر صراحتاً اپنی زبان سے بھی کہتے ہیں کہ یہ بات اللہ کی جانب سے ہے، وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ: حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے، وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: اور یہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ: حالانکہ جانتے ہیں،

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ: کسی بشر کے لئے یہ مناسب نہیں، کسی بشر کا یہ کام نہیں، کسی بشر سے یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب دے، حکمت دے، اور نبوّت دے، ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ: پھر وہ بشر کہنے لگ جائے لوگوں کو، كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ: کہ تم میرے بندے بن جاؤ، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کو چھوڑ کر، وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ: وَلٰكِنْ يَقُوْلُ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ، لٰكِنْ کے بعد يَقُوْلُ کا لفظ محذوف ہوگا، لیکن وہ تو یہی کہے گا کہ ہو جاؤ تم رَبّ والے، رَبّٰنِيّٖنَ یہ رَبَّانِيٌّ کی جمع ہے، جیسے دوسری جگہ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ آیا ہے (سورۂ آل عمران: ۱۴۶)، تو کبھی الف بڑھا کے نون کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، جیسے حق سے حقّانی بنا لیتے ہیں، اسی طرح رَبّ سے ربانی ہے، نسبت کے طور پر رِبِّيٌّ بھی آتا ہے جیسے رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ (نسفی)، اور رَبَّانِيٌّ بھی آتا ہے، ''لیکن وہ تو یہی کہے گا کہ ہو جاؤ تم اللہ والے'' بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ: اس سبب سے کہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو، وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ: اور اس سبب سے کہ تم کتاب پڑھتے ہو، وَلَا يَاْمُرَكُمْ: اور اُس بندے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں حکم دینے لگ جائے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ میں جو نفی ہے یہ لَا اُسی نفی کی تاکید کے لئے ہے، نہ اُس بندے سے یہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں حکم دینے لگ جائے اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا: کہ بنالو تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رَبّ، اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ: کیا وہ بشر تمہیں کُفر کا حکم کرے گا؟ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: بعد اس کے کہ تم اپنے خیال میں فرمانبردار ہو، مسلم ہو، یعنی تم تو مسلم ہو اور وہ آکر تمہیں شرک کی تلقین کرے، ایسا نہیں ہو سکتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

رُکوع کی پچھلی آیت میں ذکر کیا گیا تھا وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ: اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں راستے سے بھٹکا دے، یعنی یہ تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہے، اب یہاں اُن کے گمراہ کرنے کی ایک تدبیر اور ایک سکیم کا ذکر کیا گیا ہے جو اُن لوگوں نے آپس میں بنائی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُس سے پہلے ہی خبردار کر دیا۔

یہود کی ایک منافقانہ چال اور اس کا مقصد

یہ تدبیر جو انہوں نے اختیار کی تھی اُس کا حاصل ہے ایک منافقانہ چال، بعض لوگوں نے بیٹھ کے آپس میں مشورہ کیا کہ کچھ لوگ ہم میں سے جائیں اور سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لے آئیں، اِس دین کو قبول کر لیں، جو اِس نئی جماعت پر، مؤمنین پر، بنی اسماعیل پر اترا ہے، صبح صبح جائیں اور جا کر قبول کر لیں، مسلمانوں میں شامل ہو جائیں، وہاں دن گزاریں، اُن کی باتیں سنیں، اور سننے کے بعد شام کو وہ یہ ظاہر کر کے کہ بھئی! ہم تو اس کو اچھا دین سمجھ کر آئے تھے، اس میں تو یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے، کچھ نقائص نکال کر شام کو انکار کر کے آجائیں، یہ ایک منافقانہ چال ہے۔ اور اس سے کیا ہوگا؟ دو مقصد حاصل ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ خود یہ مؤمن جو اس دین کو قبول کیے بیٹھے ہیں وہ بھی تردد میں مبتلا ہو جائیں گے، کہ یہ اہل کتاب ہیں، علم والے ہیں، علمی باتوں سے ان کو

مناسبت ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متعصب نہیں بلکہ مخلص ہیں، اگر یہ متعصب ہوتے اور مخلص نہ ہوتے تو صبح ایمان کیوں لاتے، جب انہوں نے ایمان قبول کرلیا تو معلوم ہوگیا کہ ان کے دل میں کوئی جماعتی تعصب نہیں ہے، یہ گروہی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، اور پھر انہوں نے جس وقت باتیں سنیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علمی معیار پر وہ باتیں صحیح نہیں، اس لئے وہ شام کو انکار کرگئے، اس طرح سے جو کمزور عقیدے کے مسلمان ہیں وہ بھی اپنے دین سے پھر جائیں گے، اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ کچھ اِس دین کی طرف متوجہ ہوتے جارہے ہیں، یعنی یہودیوں میں سے بھی بعض لوگ ایمان قبول کرتے جارہے ہیں، وہ رُک جائیں گے، اور وہ یہ سمجھیں گے کہ دیکھو! معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ یہ دین حق ہے یہ بات تحقیق کے خلاف ہے، اگر یہ دین حق ہوتا تو ہمارے فلاں فلاں مولوی صاحب، ہمارے احبار، اور یہ بڑے بڑے عالم جو گئے تھے، اور اندر گھس کر دیکھ آئے، اور جب اندر جاکر تحقیق کی تو یہ بات صحیح نہیں نکلی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں کہ یہ اللہ کا دین ہے اور اللہ کی طرف سے آیا ہے، اس طرح سے اپنے لوگوں کی حفاظت ہوجائے گی۔ تو اِن مقاصد کے تحت انہوں نے یہ سکیم بنائی اور یہ منافقانہ چال چلی کہ لوگوں کو اِس دین سے برگشتہ کیا جائے اور اِس دن کے بارے میں شبہات کے اندر مبتلا کردیا جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں اُن کی اِس سکیم کو کھول دیا، اور پھر ساتھ ہی یہ تنبیہ کردی کہ اہل ایمان کے ساتھ تمہارا یہ بغض اور حسد اس وجہ سے ہے؟ کہ جیسا دین تمہیں ملا تھا، جیسی کتاب تمہیں ملی تھی، جیسے دینی سیادت تمہیں نصیب ہوئی تھی، یہ کسی دوسرے کو کیوں مل رہی ہے؟ اور یہ ساری کی ساری تدبیریں تم اس لئے کررہے ہو؟ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں تمہارے اوپر غالب نہ آجائیں، اور یہ چونکہ غالب آتے جارہے ہیں، حجت کے اندر تمہیں یہ جھوٹا کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہیں جھوٹا کررہے ہیں، اور آخرت میں بھی تمہارے اوپر یہ حجت بازی میں غالب آئیں گے، اِس حسد اور بغض کی بناء پر تم اِس قسم کی تدبیریں کرتے ہو؟ یہ اُن کو تنبیہ ہے۔

اور درمیان میں یہ کہہ دیا کہ یہودیت یا نصرانیت ہی کوئی ہدایت کا عنوان نہیں ہے، بلکہ حقیقی ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، اور اللہ کی طرف سے جو راہنمائی جس زمانے کے اندر آجائے اُس کو قبول کرنا ہی ہدایت یافتہ ہونے کی علامت ہے، تم اپنے طور پر ایک چیز کو متعین کرکے اُس پر اگر جے رہو گے تو یہ جمنا ہدایت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آئے اُس کو قبول کرنا ہی صحیح طور پر صراطِ مستقیم ہے اور اسی کو ہدایت کہتے ہیں۔ تو اُن کی اِس منافقانہ چال کی نشاندہی اِس آیت میں کردی گئی۔

یہودی سازشیں اور یہودی ایجنٹ عبداللہ بن سبا کا کچھ حال

اور یہود کی کچھ عادت ہی ایسے ہے، تاریخ کے اندر یہ بات مذکور ہے اور بہت وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، کہ عیسائیت کو بھی یہودیوں نے اسی قسم کی چالوں کے ساتھ ہی برباد کیا، عیسائیت کے اندر جتنی تحریفات ہوئی ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جس قسم کے عقیدے بنے ہیں وہ سب یہودی سازش کے تحت بنے ہیں۔ اور اسلام کے خلاف بھی ان کی سازشیں حضور ﷺ کے زمانے

میں بھی جاری رہتی تھیں، اور سرورِ کائنات ﷺ کے بعد دین کے اندر یہ جو تحریف کرنے کی کوشش کی گئی اور بہت حد تک وہ اپنے خیال کے مطابق کامیاب بھی ہوئے وہ بھی یہود کی طرف سے کی گئی ہے، کیونکہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا، جو ظاہراً مسلمان ہوا اور مسلمانوں میں آ کر شامل ہوا، سیاسی طور پر بھی اس نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اور مذہبی طور پر بھی نئے نئے عقیدے گھڑ کر اُمت میں انتشار پیدا کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی چونکہ حفاظت تھی، یہاں اہلِ حق کے ایک گروہ نے موجود رہنا تھا، اس لئے دین کو پوری طرح سے مسخ نہیں کیا جاسکا، اور دینِ عیسوی کے متعلق چونکہ اللہ تعالیٰ کا اس قسم کا وعدہ نہیں تھا تو اُس کو پوری طرح سے مسخ کرنے پر یہ قادر ہو گئے، ورنہ یہ عبداللہ بن سبا اور اس کی پارٹی نے کچھ کم نہیں کیا، اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو یہ دین بھی اُسی طرح مسخ ہو جاتا جس طرح نصرانیت مسخ ہوگئی، سازشیں اُنہوں نے خوب کیں، سیاسی طور پر بھی انتشار پیدا کیا، صحابہ کے متعلق اور کتابُ اللہ کے متعلق غلط نظریات کی اشاعت کی، اور اسی طرح اور بہت ساری باتیں ہیں جو دین کے بنیادی اصول کے خلاف ہیں اُنہوں نے اپنے ماننے والوں کے اندر پھیلا دیں، جس سے شیعہ روافض کا فرقہ وجود میں آ گیا، اور انہوں نے ہر ہر چیز کو بدل کے رکھ دیا، یہ ساری کی ساری اصل کے اعتبار سے یہودی سازش ہے۔ اور یہ سازش جس کا آیت میں تذکرہ ہے انہوں نے حضور ﷺ کے زمانے میں کی تھی جس کی نشاندہی یہاں کر دی۔

یہود کی مالی اور مذہبی بددیانتی

اِس تنبیہ کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اِن میں اچھے ہیں، ان کے پاس اگر تم سونے کا ڈھیر بھی امانت رکھ دو تو جس وقت طلب کرو گے وہ تمہاری امانت ادا کر دیں گے، اور یہی دیانت دار قسم کے لوگ تھے جو آہستہ آہستہ ایمان کی طرف آ گئے اور اُنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور بعض تو ان میں سے ایسے ہیں کہ اگر ایک دینار بھی ان کے پاس تم امانت رکھ دو گے تو اُس کو بھی امانت داری کے ساتھ تمہاری طرف ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، ہاں اِن کے سر پر چڑھے رہو، ہر وقت اِن کے پیچھے لگے رہو، اور مجبور کر کے تم اِن کے حلق سے اپنا وہ ایک دینار اُگلوا لو تو یہ تمہاری ہمت ہے، ورنہ ایک دفعہ اِن کے قبضے میں آ جانے کے بعد پھر یہ پیسہ اپنے ہاتھ سے چھوڑتے نہیں ہیں، یہ اس طرح کے خائن ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ جب تم اُن کے پاس ایک دینار رکھو گے تو جس وقت تک اُن کے سر پہ کھڑے رہو گے اُس وقت تک تو وہ اقرار کریں گے کہ ہاں واقعی تم نے دینار ہمارے پاس امانت رکھا ہے، اور جونہی تم ایک طرف ہوئے اور سامنے سے گئے، دوبارہ آ کر پوچھو گے تو سرے سے انکار ہی کر دیں گے، کہ تمہارا کوئی مال ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔

اور اتنی بددیانتی پر یہ کیوں دلیر ہو گئے؟ کہ انہوں نے اپنے طور پر ایک مذہبی عقیدہ بنا لیا کہ جو لوگ اہلِ کتاب نہیں ہیں، خاص طور پر عرب کے رہنے والے جو اُمیین کا مصداق ہیں، اِن کا مال ہمارے لئے مباح ہے، ہم جس طرح سے کھا پی لیں ہم پر کوئی الزام نہیں، مذہبی طور پر انہوں نے اس قسم کا عقیدہ گھڑ لیا جس کی بناء پر یہ دیانت دار نہیں رہے اور بلا تکلف اُمّیین کے مال میں خیانت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ سب جھوٹ بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف یہ جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں،

شریعت موسوی میں یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ جو شخص شریعت موسوی کا قائل نہ ہو اُس کی امانت امانت نہیں، اور اس کے ساتھ کوئی عہد و پیمان کی رعایت نہیں رکھی جاسکے گی، یہ اللہ کا بیان کیا ہوا مسئلہ نہیں ہے، یہ سب اِن لوگوں کی من گھڑت باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا تو اُصول ہے جو اُس نے اپنی کتابوں میں بیان فرمایا، کہ جس سے عہد کرو اُسے پورا کرو، جس کی امانت لو اُس کو ادا کرو، اور جو عہد کی پابندی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہیں وہی متقی ہیں اور ایسے متقی اللہ کو پسند ہیں۔

اس طرح سے اِن کی یہ مالی خیانت واضح کی اور پھر آگے یہ بتایا کہ یہ صرف تمہارے ساتھ ہی دینی اور مالی خیانت نہیں کرتے، بلکہ اِنہوں نے اپنی کتاب کا بھی یہی حال کر رکھا ہے، کہ یہ اہل علم جس وقت کتاب کی تلاوت کرتے ہیں تو زبان مروڑ کے کوئی نہ کوئی اُس میں غلط بات ایسی شامل کر دیں گے کہ لب و لہجے سے بھی معلوم ہوگا کہ یہ اللہ کی کتاب کا حصہ ہے، جیسے کوئی لفظ اُس میں بڑھا دیا یا کوئی لفظ گرا دیا، لیکن لب ولہجہ تلاوت کا وہی رکھا جیسے اللہ کی کتاب کو پڑھا جاتا ہے، زبان کو مروڑ کے لفظ کچھ اور طرح سے پڑھ دیا، اُس کا تلفظ بدل دیا، جس سے مفہوم بدل گیا، تو اپنے اِس تلاوت کے لب و لہجے سے بھی تاثر دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب کا حصہ ہے، اور پھر جب کوئی پوچھے تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ ہاں یہ جو مسئلہ ہم بیان کر رہے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کی جانب سے ہونے کے دو مفہوم ہوتے ہیں، یا تو وہ کہتے کہ کتاب اللہ میں صراحتاً اسی طرح سے آیا ہے، یا اُن کا مقصد تھا کہ کتاب اللہ میں جو اُصول بتائے گئے اُن اصولوں سے یہ مسئلہ صحیح طور پر مستنبط ہے، کیونکہ جب صحیح اصولوں سے مسئلہ مستنبط ہو تو اُس کی نسبت بھی اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف کر دی جاتی ہے، جیسے ہم سے کوئی پوچھے کہ شریعتِ اسلامیہ میں اس مسئلے کا کیا حکم ہے؟ تو ہم اُصولِ صحیحہ کے ساتھ مسئلہ مستنبط کر کے بتائیں گے اور ہم کہیں گے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک اِس کا یہ حکم ہے، لیکن اگر وہ صحیح اُصولوں سے مستنبط ہے تو نسبت صحیح ہے، اور اگر صحیح اُصولوں سے مستنبط نہ ہو اور اپنی طرف سے بنا بنا کر اگر ہم نسبت کریں گے تو وہ بات غلط ہوگی، اسی طرح یہ اپنی زبان سے بھی اپنی من گھڑت باتوں کو ثابت شدہ حقیقت قرار دیتے ہیں، اپنے فتووں کو مستند قرار دیتے ہیں، حالانکہ وہ باتیں اللہ کے نزدیک غلط ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف یہ غلط نسبت کرتے رہتے ہیں۔ تو اپنی کتاب کا بھی اِنہوں نے یہی حال کر رکھا ہے جس قسم کا حال آپ کی کتاب کا کرنا چاہتے ہیں۔

کوئی نبی شرک کی تعلیم نہیں دے سکتا

اور آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بحث کے متعلق آخری بات آگئی، جس میں عیسائیوں کی بھی تردید ہے اور یہودیوں کی بھی تردید ہے، یہود عیسیٰ علیہ السلام پر الزام لگاتے تھے کہ اُنہوں نے شرک کی تعلیم دی اور انہوں نے اپنی عبادت کی طرف بلایا، انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، اور عیسائی کہتے تھے کہ ہمیں یہ ساری تعلیمات خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہیں، اور اسی طرح بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اِس قسم کا الزام لگانے کی کوشش کی، جیسا کہ نصرانیوں نے کہا تھا کہ آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اب آپ کی کرنے لگ جائیں؟ یا بعض مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدے کی اجازت

مانگی تھی تو آپ علیہ السلام نے انکار کیا کہ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے، کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے، تو آگے انبیاء علیہم السلام کا ایک منصب واضح کر دیا جس کے تحت پتہ چل جائے کہ کوئی نبی کبھی بھی کسی مسئلے کی غلط تعلیم نہیں دے سکتا، اُس کا بنیادی مقصد اللہ کی توحید کو بیان کرنا ہوتا ہے، اور ساری کی ساری مخلوق کو اللہ کی طرف جوڑنا ہوتا ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تو انہیں نبوت دے، حکمت دے، اور کتاب دے، اور وہ اللہ سے توڑ کر اپنی ذات کے ساتھ جوڑنے لگ جائیں کہ ہمارے بندے بن جاؤ، یہ کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے جو بات بھی ایسی ہو جس میں شرک کا شائبہ پایا جائے، پھر چاہے کوئی شخص اُس کی نسبت اللہ کے رسول کی طرف کرے کہ ہمیں اللہ کے رسول نے سکھائی ہے وہ بالکل غلط ہو گی، اللہ کا رسول کوئی ایسی بات نہیں سکھا سکتا جس میں شرک کا شائبہ پایا جائے، وہ تو لوگوں کو اللہ کی طرف جوڑنے کے لئے آیا کرتے ہیں، وہ تو یہ کہنے کے لئے آتے ہیں کہ تم رب والے ہو جاؤ، اللہ والے ہو جاؤ، چونکہ تم کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو، تو کتاب پڑھنے پڑھانے کا مقصد یہی ہے کہ اللہ کی تعلیم کو قبول کرو، صحیح بات سمجھو، اور سمجھنے کے بعد لوگوں کو سمجھاؤ، اور مخلوقِ خدا کا رخ اللہ کی طرف موڑو، بندوں کی طرف نہ موڑو، وہ تو آتے ہی اس لئے ہیں۔ اگر نبی شرک کی تعلیم دینے لگ جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ نے جس کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا وہی باغی ہو گیا، اور وہی اللہ تعالیٰ کی منشاء کے خلاف چل پڑا؟ ایسا نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر نبی معصوم ہوتا ہے، خود گناہ سے بچتا ہے اور لوگوں کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، اُس کی ہر ہر بات اللہ کی عبادت کی طرف اور اللہ کی توحید کی طرف دعوت دینے کے لئے ہوتی ہے، کبھی وہ اپنی شخصیت کی طرف بایں طور نہیں بلاتے کہ اللہ سے کاٹ کر اپنے ساتھ جوڑ لیں، نہ اپنے متعلق کہیں گے، نہ فرشتوں کے متعلق کہیں گے، نہ باقی نبیوں کے متعلق کہیں گے، عبادت کسی کی نہیں سوائے اللہ کے، اُن کی ساری کی ساری تعلیم توحید پر مشتمل ہوتی ہے۔ اِس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اگر یہود الزام لگائیں کہ انہوں نے شرک کی تعلیم دی تو یہود کا الزام غلط ہے، اور اگر عیسائی اپنے شرک کے لئے اس طرح سے استناد کریں کہ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے اس قسم کی تعلیم دی ہے تو اُن کا یہ استناد اور ان کی یہ نسبت غلط ہے، اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہو گئی کہ اپنے نبی کے متعلق بھی اس قسم کے جذبات رکھو جو توحید کے خلاف نہیں ہیں، نبی کا یہ منصب نہیں کہ اُس کی ذات کو شرک کا ذریعہ بنا لیا جائے، اِس طرح سے یہ مضمون رکوع کے آخر تک چلا گیا۔

مذکورہ رُکوع پر مزید ایک نظر

ترجمہ ایک دفعہ پھر دیکھ لیجئے!...... اہلِ کتاب میں سے ایک طائفہ نے کہا کہ ایمان لے آؤ اس چیز پر جو اتاری گئی مؤمنوں پر دن کے ابتدائی حصے میں (وَجْهَ النَّهَارِ یہ اٰمِنُوْا کا مفعول فیہ ہے) یعنی صبح کے وقت ایمان لے آؤ، اور شام کے وقت اس کا انکار کر دو، تا کہ یہ لوگ لوٹ آئیں، دین سے کفر کی طرف دوبارہ آ جائیں۔ اور دل سے یقین نہ کرنا مگر اُسی شخص کی بات کا جو تمہارے دین کے تابع ہے، یعنی یہ ایمان ظاہری ظاہری طور پر لانا ہے، دل سے نہیں لانا۔ آگے درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے گروہی تعصب کے اوپر انکار کیا کہ "بیشک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے" اگر تم ہدایت یافتہ ہونا چاہتے ہو تو

اللہ کی طرف سے جوراہنمائی آئی ہے اُسی کو قبول کرو، اپنے طور پر اس قسم کے تعصب کو چھوڑ دو۔ اور پھر اُن کو تنبیہ ہے اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ هٰذَا اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ: کیا تم اس قسم کی تدبیریں اس اندیشے سے کرتے ہو کہ کوئی شخص دے دیا جائے مثل اس چیز کے جو تم دیے گئے ہو، کسی کو یہ علم مل جائے، کسی کو کتاب مل جائے، کسی کو اِس طرح سے دینی سیادت مل جائے، اس اندیشے کے بناء پر ایسی تدبیریں کرتے ہو؟ یا اس اندیشے کی بناء پر کرتے ہو؟ کہ وہ لوگ غالب آ جائیں گے تم پر اللہ تعالیٰ کے سامنے، یعنی دنیا میں بھی اللہ کے دین کے اعتبار سے تم پر غالب آ رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر بھی حجت بازی کے طور پر تمہیں مغلوب کریں گے، اس اندیشے کی بناء پر ایسی تدبیریں کرتے ہو؟ آپ کہہ دیجئے فضل سارا اللہ کے ہاتھ میں ہے، دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا علم والا ہے۔ خاص کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔ آگے اُن کی مالی خیانت کا ذکر ہے، اہل کتاب میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اُس کو امین بنا دے ایک ڈھیر پر تو وہ اس کو ادا کر دے گا تیری طرف، اور ان میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اُس کو امین بنا دے ایک دینار پر، اُس کا اعتبار کر لے ایک دینار کے بارے میں تو وہ تیری طرف اُس کو ادا نہیں کرے گا مگر یہ کہ تو اس کے سر پہ چڑھا رہے، ہمیشہ رہے اُس کے اوپر کھڑا، یعنی اس کا پیچھا نہ چھوڑ، ہر وقت پیچھے لگا رہے، تو شاید تنگ آ کر ادا کر دے، یا وہی ''بیان القرآن'' کی بات، کہ سرے سے منکر ہی ہو جائے گا مگر یہ کہ تو اُس کے پاس کھڑا رہے، جب تک ودیعت اور امانت رکھ کر پاس کھڑا رہے گا اس وقت تک تو وہ انکار کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، اور جونہی آنکھوں سے غائب ہوئے تو بعد میں وہ اقرار ہی نہیں کرے گا۔ اور یہ جرأت اِن کو اس لیے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر اُمّیین کے بارے میں کوئی الزام نہیں (سبیل کا معنی الزام) کہ اگر ہم اِن کا مال کھا جائیں اور اِن کی امانتیں دبا جائیں تو ہمارے لیے جائز ہے، انہوں نے یہ شرعی فتوے مہیا کیے ہوئے ہیں۔ ''اور کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں، کیوں اِن پر الزام نہیں، اللہ تعالیٰ کا تو اُصول یہ ہے کہ جو کوئی شخص اپنے عہد کو پورا کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے پس بیشک اللہ تعالیٰ متقین سے محبت رکھتے ہیں، اور جو اللہ کے عہد کے مقابلے میں اور اپنی قسموں کے مقابلے میں (جو آپس میں معاملات کے اندر قسمیں کھاتے ہیں) ثمنِ قلیل لیتے ہیں، یعنی دنیوی مفاد کی خاطر اللہ کے عہد کی اور آپس میں معاملات کے اندر کھائی ہوئی قسموں کی پروا نہیں کرتے، یہ لوگ ہیں کہ اِن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور اللہ اِن سے بولے گا نہیں، یہ بولنا محبت کا بولنا مراد ہے، یعنی محبت سے بات نہیں کرے گا، باقی! جھڑک دیا جائے یا ڈانٹ ڈپٹ ہو جائے تو اس کو بولنا نہیں کہا جاتا، جیسے ہم کہتے ہیں میری فلاں شخص سے بول چال نہیں ہے، اور آمنے سامنے ہونے کے بعد اگر گالی گلوچ ہو جائے اور اس کو تنبیہ ہو جائے تو اس کو بولنا نہیں کہتے، اس لیے اللہ تعالیٰ اِن کو جو تنبیہات کریں گے اور ڈانٹ ڈپٹ پلائیں گے تو یہ وہ کلام نہیں ہے جس کو یہاں منفی کیا جا رہا ہے، یا یہ ہے کہ وہ کلام فرشتوں کی وساطت سے ہوگی، براہِ راست اللہ کلام نہیں کریں گے، دونوں توجیہیں تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور ایسے ہی آگے جو آیا ہے کہ ''ان کی طرف دیکھیں گے ہی نہیں'' دیکھنے کا بھی یہی معنی ہے، یہ نہیں کہ وہ اللہ کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نظر شفقت کے

ساتھ ان کی طرف نہیں دیکھیں گے،" اور نہ ان کو پاک کریں گے" جیسے اہل ایمان پر اگر گناہ ہوں گے بھی تو تھوڑی سی سزا دے کر پاک صاف کر کے اُن کو جنت میں بھیج دیا جائے گا، لیکن یہ نجس العین لوگ ہیں اِن کو پاک نہیں کیا جائے گا، یہ ہمیشہ کے لئے اُسی طرح نجس رہیں گے اور نجاست کی سزا بھگتیں گے،" اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔ آگے اُن کی اپنے دین کے بارے میں خیانت مذکور ہے، کہ ان میں بعض وہ ہیں جو اپنی زبانوں کو موڑتے ہیں، یعنی لفظ کی تلاوت کرتے وقت زبان دبا کے لفظ غلط پڑھ گئے جس سے معنی بدل گیا، اور تاثر یہ دیتے ہیں کہ یہ بھی کتاب اللہ میں سے ہی ہے، تا کہ تم ان کے پڑھے ہوئے کو (لِتَحْسَبُوْهُ کی ۂ ضمیر اُسی محذوف معلو کی طرف لوٹ رہی ہے، جس کو زبان موڑ کے انہوں نے پڑھا ہے) کتاب سے ہی سمجھ جاؤ حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے، اور پھر اپنے فتووں کو یوں بھی کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہیں، یعنی ہم نے بالکل صحیح بات بتائی ہے جو اللہ کے دین کا تقاضا ہے، اللہ کی کتاب سے ثابت ہے، تو نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے، بلکہ ان کے اپنے من گھڑت اصولوں سے نکلی ہوئی بات ہے،" اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں"،" کسی بشر کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اللہ اس کو کتاب دے، حکم دے، اور نبوت دے" تو بشر سے مراد نبی ہو گیا،" پھر کہے وہ لوگوں کو کہ ہو جاؤ تم میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر، لیکن وہ تو یہی کہے گا کہ ہو جاؤ تم رَبّ والے اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور کتاب پڑھتے ہو" تو کتاب پڑھنے اور کتاب کی تعلیم دینے کا تقاضا یہ ہے کہ تم رَبّ والے ہو جاؤ، اللہ والے ہو جاؤ، اللہ کے احکام کی اطاعت کرو۔" اور کسی بشر سے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ حکم دینے لگ جائے کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رَبّ بنالو اللہ کے علاوہ، کیا وہ حکم دے گا تمہیں کُفر کا بعد اس کے کہ تم اپنے خیال کے اعتبار سے مسلم ہو؟" یا یہ مطلب ہے کہ پہلے ایمان کی دعوت دے کر تمہیں مسلمان بنالیا، اور پھر اپنی عبادت کی دعوت دے کر دوبارہ پھر تمہیں کُفر کی تلقین کرے گا؟ کسی نبی سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ

قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ جو کتاب و حکمت میں تمہیں دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آجائے

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ

جو مصداق بننے والا ہو وہ اس چیز کا جو تمہارے پاس ہے، البتہ ضرور ایمان لاؤ گے تم اُس پر اور البتہ ضرور مدد کرو گے اُس کی،

قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کرلیا؟ اور تم نے اس بات پر میرا عہد لے لیا؟ انبیاء نے کہا کہ ہم نے اقرار کرلیا

قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى

اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس تم گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ﴿۸۱﴾ پھر جو کوئی پیٹھ پھیرے گا

بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ

اس کے بعد، پس وہی لوگ طاعت سے نکلنے والے ہیں ﴿۸۲﴾ کیا پھر یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین طلب کرتے ہیں؟

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ

حالانکہ اسی کے لئے فرمانبردار ہے ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے، اور اسی کی طرف ہی

یُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ

لوٹائے جائیں گے ﴿۸۳﴾ آپ کہہ دیجئے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر اتاری گئی اور جو کچھ اتارا گیا ابراہیمؑ پر

وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَعِیْسٰى وَالنَّبِیُّوْنَ

اور اسماعیلؑ پر اور اسحاقؑ پر اور یعقوبؑ پر اور اولادِ یعقوبؑ پر اور ایمان لائے ہم اس چیز پر جو دیے گئے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور کُل انبیاء

مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ

اپنے ربّ کی جانب سے، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، اور ہم اسی اللہ کے لئے فرمانبردار ہیں ﴿۸۴﴾ اور جو کوئی شخص

یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ

اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو طلب کرے تو وہ اُس کی طرف سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ شخص آخرت میں

الْخٰسِرِیْنَ ﴿۸۵﴾ كَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ

خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا ﴿۸۵﴾ کیسے ہدایت دے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد،

وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۶﴾

اور انہوں نے اقرار کیا کہ رسول حق ہے اور اُن کے پاس بینات آگئے، اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو مقصد تک نہیں پہنچاتا ﴿۸۶﴾

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۸۷﴾ لا

یہ لوگ، ان کا بدلہ یہ ہے کہ بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی، فرشتوں کی، لوگوں کی، سب کی ﴿۸۷﴾

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ

اس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے ﴿۸۸﴾ مگر جو لوگ

تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾ اِنَّ

توبہ کرلیں اس کے بعد اور اپنے حالات کو ٹھیک کرلیں، پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۸۹﴾ بے شک

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد پھر وہ کفر کے اندر بڑھتے رہے، ہرگز ان کی توبہ قبول نہیں

تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا

کی جائے گی، اور یہی لوگ بھٹکے ہوئے ہیں ﴿۹۰﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ مرگئے

وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ

اس حال میں کہ کافر ہیں، ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا اُن میں سے کسی کی طرف سے زمین کا بھراؤ سونا اگرچہ

افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾ ع

وہ اُس سونے کے ساتھ فدیہ ہی دے، ان کے لئے درد ناک عذاب ہے، اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ﴿۹۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے پختہ عہد لیا، لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ: مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ یہ مَا کا بیان ہے، اور مَا موصولہ ہے، تو مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ مَا کے ساتھ مل گیا، جو کتاب وحکمت میں تمہیں دوں، ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ: پھر تمہارے پاس کوئی رسول آجائے، مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ: جو مصداق بننے والا ہو وہ اُس چیز کا جو تمہارے پاس ہے، لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ: البتہ ضرور ایمان لاؤ گے تم اُس پر، وَلَتَنْصُرُنَّهٗ: اور البتہ ضرور مدد کرو گے اُس کی، قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کرلیا؟ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ: اور تم نے اِس بات پر میرا عہد لے لیا؟ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا: اُن انبیاء نے کہا کہ ہم نے اقرار کرلیا، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فَاشْهَدُوْا: پس تم گواہ رہو، وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ: میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں، فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ: پھر جو کوئی پیٹھ پھیرے گا اس کے بعد، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: پس وہی لوگ طاعت سے نکلنے والے ہیں۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ: کیا پھر یہ لوگ اللہ کے دین کا غیر طلب کرتے ہیں؟ یعنی اللہ کے دین کے

علاوہ کوئی اور دین طلب کرتے ہیں؟ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: حالانکہ اُسی کے لئے فرمانبردار ہے ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، طَوْعًا وَّ كَرْهًا: طوع اور کرہ یہ دونوں مصدر ہیں، طائِعِیْن اور کَارِهِیْن کے معنی میں، اس حال میں کہ وہ خوشی سے طاعت قبول کرنے والے ہیں یا ناگواری سے، كَرْهًا کا معنی خوشی کے بغیر، اور طوع کا معنی خوشی کے ساتھ، ''خوشی سے یا لاچاری سے'' طائعین و کارِهین، اس حال میں کہ وہ چاہنے والے ہیں اور اس حال میں کہ نہیں چاہنے والے، یعنی چاہیں یا نہ چاہیں سب کے سب جو زمین و آسمان میں موجود ہیں اللہ کے ہی تابع ہیں، وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ: اور اسی کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے، قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ: آپ کہہ دیجیے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے، وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا: اور ہم اس چیز پر ایمان لے آئے جو ہم پر اتاری گئی، وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ: اور جو کچھ اتارا گیا ابراہیم علیہ السلام پر اور اسماعیل علیہ السلام پر اور اسحاق علیہ السلام پر اور یعقوب علیہ السلام پر اور اولادِ یعقوب پر، اَسباط سَبط کی جمع ہے، سبط اولا د الاولاد کو کہتے ہیں، وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ: اور ایمان لے آئے ہم اس پر جو کچھ دیے گئے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور کُل انبیاء، مِنْ رَّبِّهِمْ: اپنے رَبّ کی جانب سے، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ: ہم اِن میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، تفریق نہیں کرتے، وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: اور ہم اُسی اللہ کے لئے فرمانبردار ہیں۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا: اور جو کوئی شخص اسلام کے علاوہ دین کو طلب کرے، فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ: تو وہ اُس کی طرف سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ، اور وہ شخص آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا: کیسے ہدایت دے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو، كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ: جنہوں نے کُفر کیا اپنے ایمان کے بعد، وَشَهِدُوْٓا: اور انہوں نے اقرار کیا، اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ: کہ رسول حق ہے، وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ: اور اُن کے پاس بینات آ گئے، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو مقصد تک نہیں پہنچاتا۔ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ: یہ لوگ، اِن کا بدلہ یہ ہے کہ بیشک اِن پر لعنت ہے اللہ کی، فرشتوں کی، لوگوں کی، سب کی، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: اُس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، یعنی جہنّم میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، لعنت جہنّم پر دلالت کرتی ہے، لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ: اُن سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا، وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ: نہ وہ مہلت دیے جائیں گے، اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: مگر جو لوگ توبہ کر لیں اِس کے بعد، وَاَصْلَحُوْا: اور اپنے حالات کو ٹھیک کر لیں، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ اِن کی توبہ قبول ہے، یہ آخرت میں ملعون نہیں ہوں گے، عذاب سے بچیں گے، اللہ کی رحمت اور اللہ کی مغفرت کو حاصل کریں گے۔ ''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اپنے ایمان کے بعد''، ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا: پھر وہ کُفر کے اندر بڑھتے رہے، زیادہ ہوتے رہے از روئے کُفر کے، لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ: ہرگز اُن کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ: اور یہی لوگ بھٹکے ہوئے ہیں۔ ''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور وہ مر گئے اس حال میں کہ کافر ہیں'' فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا: ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا اُن میں سے کسی کی طرف سے زمین کا بھراؤ سونا۔ ذَهَبًا تمیز ہے، اور مِّلْءُ الْاَرْضِ: زمین کا بھراؤ، یعنی اتنی چیز جس کے ساتھ زمین بھر

جائے، وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ: اگر چہ وہ اُس سونے کے ساتھ فدیہ ہی دے، فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑانا چاہے، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اِن کے لئے دردناک عذاب ہے، وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ: اوران کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ آل عمران کے اِس حصے میں مرکزی طور پر اہل کتاب کے لئے سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت ہے، نصاریٰ کے خیالات کی بھی تردید آئی اور اُن کو بھی راہِ راست دکھایا گیا، اور اِسی طرح یہود کو بھی دعوت دی گئی، اور اُنہیں کتمانِ حق اور لبسِ حق بالباطل سے روکا گیا، اور پچھلی آیت میں انبیاء ﷤ کا مقام واضح کیا گیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ، کہ انبیاء ﷤ کبھی بھی غلط نظریات کی تلقین نہیں کر سکتے، شرک کی تعلیم نہیں دے سکتے، اس لئے انبیاء ﷤ کی طرف نسبت کر کے اِن لوگوں نے جو ایسی باتیں بنالی ہیں جو صراحتاً شرک ہیں وہ نسبت غلط ہے، کوئی نبی اپنے ماننے والوں کو کسی صورت میں بھی شرک کی تعلیم نہیں دے سکتا، نہ اپنی عبادت کی طرف بلاسکتا ہے، نہ فرشتوں اور دوسرے نبیوں کی عبادت کے متعلق کہہ سکتا ہے۔ اِس آیت میں بھی اہل کتاب کو خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے کی ہی دعوت ہے۔

میثاقِ بنی آدم اور اس کا مقصد

اِس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں مختلف عہد لیے ہیں، ایک عہد تو کُل بنی آدم سے لیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ: کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ جس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا بلیٰ: کیوں نہیں، تو ہمارا رَبّ ہے (الاعراف: ۱۷۲)۔ یہ ایک بنیادی عہد تھا جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے لیا تھا، کیونکہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہر مذہب کی بنیاد ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانا جائے اور اُس کی ربوبیت کا عقیدہ نہ ہو تو آگے مذہب کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا وجود، اُس کی وحدانیت، اس کے متعلق ربوبیت کا عقیدہ بنیادی اینٹ ہے جس پر مذہب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی فطرت کے اندر یہ بیج بویا، اور تمام بنی آدم کی زبان سے اقرار کرایا۔

میثاقِ انبیاء ﷤ کا تذکرہ

اور پھر انبیاء ﷤، یعنی بنی آدم میں سے وہ افراد جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام پہنچانے کے لئے اپنا نمائندہ بنانا تھا، اُن

سے پھر خصوصیت کے ساتھ علیحدہ عہد لیا، جس کا ذکر اِس آیت میں کیا گیا ہے، اُس کا حاصل یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام سے یہ کہا گیا کہ دنیا میں جانے کے بعد میں تمہیں کتاب وحکمت دوں گا، اور پھر جس نبی کی موجودگی میں کوئی دوسرا رسول آجائے جو اُن علامات کا مصداق بنا ہو جو علامات تمہیں پہلے دی گئی ہیں کہ آنے والے نبی کی یہ نشانیاں ہیں، جس پر وہ نشانیاں صادق آجائیں، یعنی اُس کی نبوت ورسالت دلیل کے ساتھ ثابت ہوجائے، توتم میں سے ہر ایک نے اُس پر ایمان بھی لانا ہے اور اُس کی مدد بھی کرنی ہے، یعنی تصدیق بھی کرنی ہے، اُس کا نبوت کا اعلان بھی کرنا ہے اور یہ کہنا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور اسی طرح جہاں تک ہوسکے ظاہری طور پر اُس کے ساتھ تعاون اور اس کی مدد بھی کرنی ہے۔ برملا طور پر اللہ تعالیٰ نے سب سے اقرار لیا، اور اقرار لینے کے بعد یہ کہا کہ دیکھو! اِس واقعہ کا میں بھی گواہ ہوں، اور تم نے بھی اس طرح رہنا ہے جس طرح گواہ اپنی گواہی پر قائم ہوتے ہیں، بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے کہ اقرار کرنے والے کا اپنے اقرار سے پھر جانا چونکہ اُس کی اپنی غرض پر مبنی ہوتا ہے اس لئے یہ اتنا خلاف توقع نہیں جتنا گواہ اپنی گواہی سے پھر جائے، اس لئے وہ اِس آیت کا مفہوم یونہی ذکر کرتے ہیں کہ تم نے اِس اقرار پر اِس طرح ثابت قدم رہنا ہے جس طرح گواہ گواہی پہ ثابت قدم ہوتا ہے، تو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کا خود انبیاء سے عہد لیا گیا، کہ ہر آنے والا نبی جو تمہارے زمانے میں آجائے اس پر ایمان بھی لانا ہے اور اُس کی مدد بھی کرنی ہے، تو جب اِس کو علی العموم مانا جائے تو یہ انبیاء علیہم السلام سے عہد ہے اور انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اُن کی امتوں سے عہد ہے، کیونکہ ہر نبی جب اس بات کا مکلف ہوگا کہ آنے والے نبی کی تصدیق کرنی ہے، تو اپنی جماعت اور اپنی امت کو بھی وہ اپنے ساتھ پابند کرے گا، چنانچہ ایسے ہی ہوتا تھا کہ جو نبی آتا وہ اپنی امت کو کہتا تھا کہ میرے بعد ایسا ایسا پیغمبر آنے والا ہے، میری زندگی میں آگیا تو میں بھی اظہار کروں گا، اُس پر ایمان لاؤں گا اور اُس کی مدد کروں گا، اور اگر میری زندگی میں نہ آئے اور تمہارے سامنے آئے تو تم نے بھی اُس کو ماننا ہے اور اُس پر ایمان لانا ہے، نبی اللہ تبارک وتعالیٰ کا بھی نمائندہ ہوتا ہے بنی آدم کی طرف، اور امت کا بھی نمائندہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے احکام قبول کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد وپیمان کرنے کے لئے، تو انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اُن کی امتوں سے بھی عہد لے لیا گیا۔

بنی اسرائیل میں تو ایسا بارہا ہوا کہ ایک نبی کی موجودگی میں دوسرا نبی آیا، ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی موجود رہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں حضرت ہارون علیہ السلام تھے، اور یحییٰ علیہ السلام کی موجودگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگئے، تو انہوں نے اسی طرح آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کیا اور ایک دوسرے کی نبوت کی تصدیق کی، اسی ترتیب سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا بھی سب سے وعدہ تھا، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اِس دنیا میں جس وقت تشریف لائے تو اُس وقت روئے زمین پر کوئی نبی موجود نہیں تھا، لیکن انبیاء علیہم السلام سے جو عہد لیا ہوا تھا اُس عہد میں آپ کی شخصیت بھی آتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو ظاہر کرنے کے لئے ایک نبی کو بچایا اور اُس کو اپنی جگہ محفوظ کرلیا، اب وہ جس وقت دنیا میں تشریف لائیں گے تو وہ دور دورِ محمدی ہوگا، اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لائیں گے اور آپ کے دین کی نصرت بھی کریں گے، وہ ہوں گے تو نبی ہی، نبوت سے نعوذ باللہ وہ معزول نہیں ہوجائیں گے،

لیکن یہ دورِ نبوّت چونکہ حضور ﷺ کا ہوگا، اس لئے جس وقت تشریف لائیں گے تو نبی ہونے کے باجود اُن کا ایمان بھی حضور ﷺ پر ہوگا، وہ آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے دین کی نصرت کریں گے، اور اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا اور آپ کی زندگی میں آجاتا تو وہ بھی ایمان لانے کا مکلّف ہوتا، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَاوَسِعَهٗ إِلَّا اتِّبَاعِي''(۱) اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے، اِس وقت موجود ہوتے، اور ایک روایت میں لفظ یہ ہے کہ ''وَاَدْرَكَ نُبُوَّتِي''(۲) اور میری نبوّت کا زمانہ پاتے ''لَاتَّبَعَنِي'' تو وہ میری اتباع کرتے، کیونکہ جب ہر آنے والے نبی کے متعلق یہ عہد ہے تو حضور ﷺ کے متعلق بھی عہد ہے، اور اُس میں شرط وہی ہے کہ اُن علامات کا مصداق بنے جو علامات اُن کی کتاب وحکمت میں آئی ہوئی ہیں، اور بار بار بانگ دہل قرآنِ کریم میں دوہرادیا گیا کہ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (سورۂ بقرہ:۱۰۱) اہلِ کتاب کے پاس جو کچھ موجود ہے یہ نبی اُس کا مصدِّق ہے، مصدق کا یہ معنی بھی ہے کہ اس کی تصدیق کرتا ہے، اور اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ اُن علامات کا مصداق بنتا ہے، کیونکہ جو بشارات دی گئی تھیں اور جو علامات بتلائی گئی تھیں اگر اُن کے مطابق کوئی پیغمبر نہ آتا تو وہ ساری بشارات غلط ہوتی ہیں، اِن کے آنے سے وہ بشارات سچی ثابت ہوگئیں، تو اُن کا یہ مصداق بنتا ہے، یعنی وہ علامات اِس کے اوپر صادق آتی ہیں، تو ایسی صورت میں سارے کے سارے بنی اسرائیل ایمان لانے کے مکلّف ہیں۔ اور اُن نبیوں کے عہد میں جو یہ بات آئی کہ ''اِس عہد کے بعد اگر کوئی پھرے گا'' تو نبیوں میں تو پھرنے کا امکان ہی نہیں، یہ ویسے ہی ہے جس طرح جملہ شرطیہ کے طور پر آتا ہے جس میں تحقق ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے ایک جگہ متعدد انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اِن میں سے کوئی شرک کرتا تو ہم اِن کے اعمال ضائع کردیتے (سورۂ انعام:۸۸)، یہ بطور جملہ شرطیہ کے ہوتا ہے، نہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے شرک کا تحقق ہوسکتا ہے اور نہ انبیاء علیہم السلام کے اعمال ضائع ہوں، لیکن اُس میں ایک زور دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ شرک ایک ایسی بُری چیز ہے کہ اگر کوئی نبی بھی کرے تو اُس کے اعمال حبط ہوجائیں گے تا بدیگراں چہ رسد باقیوں کی کیا حیثیت ہے، اگر نبی سے بھی کوئی اِس قسم کی لغزش ہوجائے تو اُس کے بھی اعمال ضائع ہوجائیں گے، اگرچہ یہ واقعہ نہیں ہے، کسی نبی سے شرک نہیں پایا جاسکتا، لیکن ''اگر'' کے ساتھ جو ذکر کیا جاتا ہے تو اِس میں محض مقدم اور تالی کے درمیان ایک لزوم پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جب اِس مقدم کا تحقق ہوگا تالی کا حکم لگ جائے گا۔ تو انبیاء علیہم السلام کو سامنے رکھ کر سنانا اصل میں اُن کی امتوں کو مقصود ہے کہ اِس عہد اور اقرار کے بعد جو انبیاء علیہم السلام نے کیا، اور چونکہ انبیاء اُمت کے بھی نمائندے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہد اور پیمان کے لئے، تو گویا کہ ضمناً اُن اُمتوں نے بھی عہد کرلیا کہ آنے والے پیغمبر پر ہم ایمان لائیں گے، پھر اس عہد سے اگر کوئی پھرے گا، (انبیاء میں تو اِس کا وقوع نہیں ہوسکتا،

---

(۱) مشکوۃ ۱/ ۳۰، باب الاعتصام۔ فصل ثانی۔ عن جابر رضی اللہ عنہ/ نیز مصنف ابن ابی شیبہ ۵/ ۳۱۲، باب من کرہ النظر فی کتب اھل الکتاب/ مسند احمد رقم: ۱۴۶۳۱۔

(۲) سنن دارمی رقم: ۴۴۹، باب ما یتقی من تفسیر حدیث النبی/ مشکوۃ ۱/ ۳۲، عن جابر۔

اُمتوں کے اندر اِس کا وقوع ہو بھی سکتا ہے اور ہوا بھی) کہ جو اس اقرار سے پھر گیا، آنے والے پیغمبر کی اُس نے تصدیق نہیں کی وہ فاسق ہے، اللہ کی طاعت سے نکل گیا، وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار نہیں سمجھا جائے گا۔ فسق کا معنی ہے خروج عن الطاعت، جس کے مختلف درجات ہیں، اَحکام کی خلاف ورزی بھی فسق کہلاتی ہے، اور فقہاء کی اصطلاح میں فاسق ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کافر نہ ہو، نافرمان ہو، اللہ کے احکام کو چھوڑتا ہو، ویسے فسق کی حدود کُفر تک پھیلی ہوئی ہیں، اگر کوئی شخص ضروریاتِ دین کا انکار کردے اور اُن کو بھی تسلیم نہیں کرتا تو وہ فاسق بھی ہے اور کافر بھی ہے، قرآنِ کریم میں شیطان کے متعلق جو کہا گیا فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف:۵۰) کہ اللہ کے حکم سے وہ نافرمان ہوگیا، وہ نافرمانی کُفر تک پہنچی ہوئی تھی، تو نافرمانی کُفر تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بہرحال اِس میں یہ دکھا دیا گیا کہ جو عہد و پیمان تمہارے پیغمبروں نے کیا ہوا ہے اُس کے تحت تم مکلف ہو اِس آنے والے پیغمبر پر ایمان لانے کے جس کی علامات تمہاری کتابوں کے اندر واضح ہیں، اور جس کی خبروں کے آپ ﷺ مصدِّق ہیں، پہلی آیت کے اندر تو یہ بات کہی گئی۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ: جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے میثاق لیا کہ جو کچھ کتاب وحکمت میں تمہیں دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آجائے (اِس کو عام رکھئے، عام کے تحت حضور ﷺ بھی آجائیں گے، کہ جب باقی رسولوں کے متعلق عہد و پیمان لیا تو رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی ہوا ہے) جو مصداق بننے والا ہو اس چیز کا جو تمہارے پاس ہے، البتہ ضرور ایمان لاؤ گے تم اس پر اور البتہ ضرور مدد کرو گے اُس کی، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کرلیا؟ اور اِس بات پر میرا عہد لے لیا؟ انہوں نے کہا ہم نے اقرار کرلیا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ جو کوئی اِس کے بعد پیٹھ پھیرے گا وہ نافرمانوں میں سے ہے۔

اتباعِ ملّتِ اسلامیہ اور ملّتِ ابرٰہیمی کیا ہے؟

اِن سب چیزوں سے ثابت یہی ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو بھی احکام آجائیں اُن کا تسلیم کرنا ضروری ہے، یہی اسلام ہے اور یہی ملّتِ اسلامیہ ہے، یہی ملّتِ ابراہیمی ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام کا دین یہی رہا، اور اِس طریقے کو چھوڑ کر جو کوئی دوسرا طریقہ اپنالے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں، اور دوسرا طریقہ اپنانا عقل کے خلاف ہے، فطرت کے خلاف ہے، انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے خلاف ہے، اور اُن کے مسلک کے خلاف ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ایسی ذات ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب اُس کے احکام کا مطیع ہے یعنی تکوینی طور پر، جو تصرف وہ کرے کرسکتا ہے، پھر انسان سے مطالبہ یہ ہے کہ اختیاری احکام کا بھی مطیع ہوجائے، اگر اختیاری احکام کا مطیع ہوجائے گا تو اِس کی تکوین اور تشریع برابر ہوگئی، کہ شرعی طور پر بھی فرمانبردار ہوگیا، تکوینی طور پر تو ہے ہی، اور اُس کے طریقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے طریقے کی طرف جانا عقل کا تقاضا نہیں ہے، تو اسلام یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اختیار کرنا عقل کا بھی تقاضا ہے، کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب اُسی کے احکام کا پابند ہے، اور ایسے طور پر پابند ہے کہ چاہے اُس کا جی چاہے یا نہ چاہے اللہ تعالیٰ اس میں جو تصرف کرنا چاہے اُس کو تصرف قبول کرنا پڑتا ہے، جس طرح سے

انسان میں بھی اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام چلتے ہیں، جیسے صحت، مرض، موت، حیات، اور دوسری کیفیات جو انسان پر طاری ہوتی ہیں جن میں انسان کو اختیار نہیں ہے، اِن سب چیزوں میں انسان اللہ کے احکام کا پابند ہے، اللہ کے احکام کے خلاف قطعاً نہیں چل سکتا، تو پھر یہ انسان کی نیک بختی ہے کہ اختیاری صورت میں بھی اللہ کے احکام کو قبول کیا جائے اور ان کی پابندی کی جائے، ورنہ اس کو چھوڑ کر کدھر جاؤ گے؟'' کیا اللہ کے دین کے غیر کو یہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ اسی کے فرمانبردار ہیں جو کوئی آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور ناخوشی سے'' یعنی دل چاہے یا نہ چاہے اللہ کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے، وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ: اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اہلِ اسلام کی وسعتِ ظرفی

یہ آیت جو آگے آپ کے سامنے آ رہی ہے (قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا) سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، جس میں سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے اعلان کیا جا رہا ہے کہ ہمارا تو ان چیزوں پر ایمان ہے، اور اس میں یہود و نصاریٰ کے سامنے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہم تمہاری طرح متعصب نہیں ہیں، کہ اپنے پیغمبر کو مانیں اور دوسروں کا انکار کر دیں، اپنے پر اتری ہوئی کتاب کو تسلیم کریں اور دوسری کتابوں کا انکار کر دیں، ایسی بات نہیں، ہمارا تو مسلک صاف ہے، ہم کسی تعصب میں مبتلا نہیں، ہمارا تو اللہ پر بھی ایمان ہے، اور اس چیز پر بھی ایمان ہے جو ہم پر اتاری گئی، اور ہم اُس پر بھی ایمان لے آئے جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اسباط پر اتاری گئی، اسباط سے مراد اولادِ یعقوب، جس میں سارے اسرائیلی پیغمبر آ گئے، خصوصیت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر دیا، کہ جو کچھ یہ دیے گئے، اِن کے معجزات اور اِن کی کتابیں، جو کچھ یہ لے کر آئے ہم سب پر ایمان لاتے ہیں۔ اور علی العموم وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ: جو کچھ بھی نبی دیے گئے اپنے رب کی طرف سے، ہم تو اِن میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، ہم تو اُس اللہ کے فرمانبردار ہیں، اللہ کی طرف سے جو دین آ گیا ہم نے اُس کو قبول کر لیا، مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف سے انصاف ہی انصاف ہے، وسعت ہی وسعت ہے، ہمارے دل میں یہ تنگی نہیں کہ ہم فلاں کو مانیں گے اور فلاں کو نہیں مانیں گے، جس طرح یہود نے ایک حد بندی کر لی یا نصاریٰ نے ایک تعصب اختیار کر لیا، ہم اِس قسم کے تعصب میں مبتلا نہیں ہیں۔

عظمتِ اِسلام اور ضدی کافروں کا انجام

آگے اسلام کی عظمت مذکور ہے، کہ'' جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین چاہے گا'' اسلام کا حاصل آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آ جائے اس کو تسلیم کرنا یہی اسلام ہے، اور ہر نبی کے زمانے میں اُسی کا دین اسلام تھا، اور اب آخر کار سرورِ کائنات ﷺ کا لایا ہوا دین ہی اسلام ہے، اور اس کے نسخ کا بھی کوئی امکان نہیں، پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین بھی اسلام تھا لیکن محدود وقت کے لئے، جب دوسرا نبی آ گیا اور اُس نے آ کر اپنی طرف سے اللہ کے اور احکام ظاہر کیے تو پھر وہ اسلام

قرار پایا، اور آخر کار اب دینِ محمدی کا نام اسلام ہے، ''جو اِس اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین چاہے گا'' فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ: اُس کی طرف سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔

یہ یہود و نصاریٰ دل سے جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ حق ہیں، اور بعض اوقات زبان سے بھی اقرار کر لیتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا، پھر لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے تھے کہ ہدایت یافتہ ہم ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے، ''کیسے ہدایت دے اللہ اِن لوگوں کو'' یعنی یہ جو طریقہ اپنائے بیٹھے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہدایت نہیں ہے، ''کیسے ہدایت دے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد'' ایمان سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام پر وہ ایمان لائے، اُس وقت مؤمن تھے، بعد میں آنے والے پیغمبر کا انکار کیا تو کُفر ہو گیا، ''حالانکہ وہ اقرار کرتے ہیں کہ رسول حق ہے'' اپنی مجلسوں میں بھی کرتے تھے، دل سے بھی شہادت دیتے تھے کہ واقعی علامات حضور ﷺ پہ صادق آتی ہیں، ''اور بینات اِن کے پاس آ گئیں، واضح دلائل آ گئے، ایسے ظالم لوگوں کو اللہ تعالیٰ مقصد تک نہیں پہنچایا کرتا'' لہٰذا اگر یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اپنے مقصد کو پہنچے ہوئے ہیں، ہم نے ہدایت حاصل کی ہوئی ہے، ہمارا طریقہ ہدایت ہے، تو یہ اِن کی غلط فہمی ہے، ایسے لوگ ہدایت یافتہ نہیں ہوا کرتے جو نہ اللہ کے احکام کا حق ادا کریں نہ رسول کے احکام کا حق ادا کریں، نہ عقل کو پہچانیں نہ فطرت کے مطابق چلیں، ہر چیز کو جھٹلا دیتے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں، پھر یہ سمجھیں کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں، یہ غلط ہے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیا کرتا، اِن کا طور طریقہ ہدایت نہیں ہے۔ ''یہ لوگ ہیں کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی، فرشتوں کی، اور سب لوگوں کی'' یہ ملعون ہیں جو اقرار کرنے کے باجود، جاننے کے باوجود، اور بینات آجانے کے باوجود گروہی تعصب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے حق کے منکر ہیں یا کتمانِ حق کرتے ہیں، یہ تو ملعون ہیں، اِن پر اللہ کی لعنت ہے، اللہ کی بھی لعنت، فرشتوں کی بھی اور لوگوں کی بھی، سب کی لعنت ہے اِن پر، خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: اُس لعنت کا اثر یہ ہوگا کہ جہنم میں جائیں گے اور اُس جہنم میں ہمیشہ پڑے رہیں گے، کیونکہ لعنت کا اصل مفہوم ہوتا ہے اللہ کی رحمت سے دوری، اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی رحمت سے محروم کر دے یہ ہے اللہ کی طرف سے لعنت، اور جب اللہ کی رحمت سے کوئی شخص محروم ہو گیا تو اُس کا معنی یہ ہے کہ جہنم میں گیا، تو یہ نار اور دوزخ اور جہنّم جو لعنت کے لفظ سے سمجھی جا رہی ہے فِیْهَا کی ضمیر اُس کی طرف لوٹ رہی ہے، ''ہمیشہ رہیں گے اُس جہنّم میں'' لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ: اِن سے عذاب کو ہلکا نہیں کیا جائے گا یعنی جتنا عذاب اِن کے لئے تجویز ہو جائے گا وہ ہلکا نہیں ہوگا، وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ: اور نہ ان کو کسی مدت تک کی مہلت دی جائے گی۔

توبہ کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: ہاں البتہ اِس ظلم کے بعد جو لوگ توبہ کر لیں، تو توبہ کا دروازہ بند نہیں، جو توبہ کر لیں گے وہ اِس لعنت سے بچ جائیں گے، وَاَصْلَحُوْا: اور اپنے احوال کو درست کر لیں، خاص طور پر دل کی کیفیت بھی ٹھیک ہو، یہ نہیں کہ نفاق کے طور پر ایمان قبول کریں، اِلَّا کا مطلب یہ ہے کہ یہ ملعون نہیں ہوں گے، یہ لعنت سے بچا لیے جائیں گے، پہلے اگر انہوں نے کُفر بھی کیا

ہوگا اور رسول کا انکار بھی کیا ہوگا تو توبہ کرنے کے بعد سب معاف ہوجائے گا،''اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ایمان کے بعد'' یا تو پہلے نبیوں پر ایمان تھا پھر آنے والے پیغمبر کا انکار کر کے کافر ہو گئے، یا پہلے اِسی نبی پر ایمان لائے بعد میں مرتد ہو گئے، یہ لفظ دونوں کو شامل ہے، اہل کتاب اپنے وقت میں نبی پر ایمان لانے کے بعد اگر آنے والے نبی کا انکار کیے ہوئے ہیں تو یہ بھی کفر ہے اور وہ بھی اس کا مصداق ہیں، یا اِسی نبی پر پہلے کوئی ایمان لے آئے اور بعد میں مرتد ہو جائے تو وہ بھی اِس کا مصداق ہے،''پھر وہ کفر میں بڑھتے رہے'' یعنی پھر توبہ نصیب نہیں ہوئی، لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ: ایسے شخص کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی، کیا مطلب؟ کہ کفر میں ہے اور کفر میں ترقی کرتا جارہا ہے، تو کافر ہوتے ہوئے اگر دوسرے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، معصیت سے توبہ کرتا ہے، یہ توبہ اللہ کے ہاں قبول نہیں، کیونکہ توبہ ایک نیک عمل ہے، اس کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے، جب تک ایمان نہ ہو تو توبہ قبول نہیں ہوتی، یا مطلب یہ ہے کہ رسمی طور پر مرتے وقت توبہ توبہ کریں گے یا آخرت کے عذاب کو دیکھ کر توبہ توبہ پکاریں گے، اِس توبہ کا کوئی اثر نہیں ہوگا اگر دنیا کے اندر ایمان نصیب نہیں ہوا۔

اِیمان کی قدر و قیمت

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے اِس حال میں کہ کافر ہیں''، فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا: آخرت میں جس وقت یہ عذاب اِن کے سامنے آئے گا اُس وقت اِن کی یہ کیفیت ہوگی کہ اگر اِن کے پاس زمین کا بھراؤ سونا ہو، اندازہ کر لیجئے! کتنی دولت ہے؟ تولوں کے حساب سے نہیں، چھٹانکوں کے حساب سے نہیں، منوں کے حساب سے نہیں، ٹنوں سے بھی حساب نہیں ہوسکتا، کہ ساری زمین سونے کی بھری ہوئی ہو اور اِن میں سے کسی کے پاس موجود ہو، پھر یہ لجاجت بھی کرے کہ سونا لے لو اور مجھے عذاب سے چھٹکارا دے دو، تب بھی یہ فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، یعنی ایمان کا بدل آخرت میں اتنا سونا بھی نہیں بن سکے گا، بالفرض اگر کسی کے پاس موجود ہو اور وہ دے کر جان چھڑانا چاہے تو فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، اِس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایمان کتنی قدر و قیمت والی چیز ہے، دنیا کے اندر پانچ دس روپے کی خاطر اور چند ٹکوں کی خاطر اگر کوئی شخص ایمان کو خراب کرتا ہے اور ایمان کو برباد کرتا ہے تو اُس کی کتنی جہالت ہے، ایمان کی قدر و قیمت آخرت میں معلوم ہوگی۔ وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ دینا چاہے، لجاجت کرے کہ مجھ سے یہ سونا لے لو اور مجھے چھوڑ دو تو بھی اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا، اور اگر وہ دینا ہی نہ چاہے تو کون پوچھتا ہے؟ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر مشرک سے پوچھے گا جو جہنم میں ڈالا جارہا ہوگا، کہ آج تیرے پاس اگر سونے کی بھری ہوئی زمین ہو تو کیا تو فدیہ دے دے گا؟ وہ کہے گا کہ ہاں جی! میں تو فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑا لوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے تجھ سے بہت چھوٹی سی بات کا مطالبہ کیا تھا، جس کا تیرے اوپر کوئی بوجھ بھی نہیں تھا،(۱) کہ تُو شرک نہ کر، صرف لا إله إلا الله کہہ دے، لیکن اُس وقت تُو لا إله إلا الله کہنے پر بھی تیار نہ ہوا، اور آج اتنا فدیہ

(۱) بخاری ۲/ ۹۶۸، باب من نوقش الحساب/ مسلم ۲/ ۳۷۴، باب فی الکفار/ ولفظه: يُجَاءُ بِالْكَافِرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ لَهُ أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ لَكَ مِلْءُ الْأَرْضِ. الخ.

دے کر بھی اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے کہہ رہے ہو؟ بہر حال اِس سے ایمان کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، کہ ایمان کے ساتھ ہی وہاں نجات حاصل ہو سکے گی، ورنہ سونے کے پہاڑ بھی ہوں گے تو وہاں انسان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔

ایمان کے بغیر کسی کی نسبت اور سفارش بھی مفید نہیں ہوگی

اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ: اور اِن کے لئے دردناک عذاب ہوگا، وَّمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ: اس میں بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے اُس عقیدے کا رَدّ کرنا مقصود ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں، بڑوں کی اولاد ہیں، بڑوں کے ساتھ ہماری نسبت ہے، اور یہ نسبت آخرت میں ہمارے کام آجائے گی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح وہاں سونا چاندی کام آنے والا نہیں اسی طرح جو بڑوں کی طرف تم نسبت کا دعویٰ اور زعم لیے بیٹھے ہو کہ فلاں ہماری مدد کرے گا، فلاں ہمیں چھڑا لے گا، ایسا نہیں ہوگا، اگر ایمان پاس نہ ہوا تو دولت بھی کام نہیں آئے گی، اور اسی طرح اگر ایمان پاس نہ ہوا تو کسی کی سفارش بھی کام نہیں آئے گی، اور کوئی سفارش کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوگا، کتنا ہی کوئی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو، قرآنِ کریم اور حدیث شریف میں انبیاء علیہم السلام کے متعلقین کے واقعات جو بیان کیے گئے ہیں، اُن سب کا حاصل یہی ہے کہ ایمان نہ ہونے کی صورت میں کسی کے ساتھ کوئی نسبت اور کوئی تعلق، چاہے وہ تعلق نسب کا ہو یا کوئی اور تعلق ہو، کام نہیں آئے گا۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ

ہرگز نہیں حاصل کر سکتے تم کامل نیکی جب تک نہ خرچ کرو تم اس چیز میں سے جس کو تم پسند کرتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ

پس بیشک اللہ تعالیٰ اُس کو جاننے والا ہے ﴿۹۲﴾ سب کھانا حلال تھا بنی اسرائیل کے لئے، سوائے اُس کھانے کے جس کو حرام ٹھہرا لیا

اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ ‌ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰٮةِ

اسرائیل نے اپنے نفس پر، (حلال تھا) تورات اتارے جانے سے پہلے، آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تورات

فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ

پھر پڑھو اُس کو اگر تم سچے ہو ﴿۹۳﴾ پھر جو شخص گھڑے اللہ پر جھوٹ اس کے بعد

ذٰلِكَ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ‏ ﴿۹۴﴾ قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ‌ ۚ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ

پس یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں ﴿۹۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ فرمایا، پس پیروی کرو تم ابراہیم کے طریقے کی جو ایک کا ہو رہا تھا،

وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ

اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھا ﴿۹۵﴾ بیشک پہلا گھر جو متعین کیا گیا لوگوں کے لئے البتہ وہی ہے جو مکہ معظمہ میں ہے

مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ‌ۚ ﴿۹۶﴾ فِيۡهِ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ

اس حال میں کہ وہ برکت دیا ہوا ہے، اور جہانوں کے لئے راہنمائی کا ذریعہ ہے ﴿۹۶﴾ اس میں واضح واضح نشانیاں ہیں (جن میں سے

مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ‌ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ

ایک) مقام ابراہیم ہے، اور جو کوئی اس میں داخل ہو جائے تو وہ امن والا ہو جاتا ہے، اور اللہ کے لئے لوگوں کے ذمے ہے بیت اللہ کا

الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ‌ؕ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۷﴾

حج کرنا، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھتا ہے، اور جو کوئی انکار کرے پس بیشک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تمام جہانوں سے ﴿۹۷﴾

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ‌‌ۖ وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ‏ ﴿۹۸﴾

آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۹۸﴾

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا

آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! کیوں روکتے ہو اللہ کے راستے سے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، اس راستے میں تم کجیاں تلاش

عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو، اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۹۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ: نَالَ یَنَالُ نَیْلًا: حاصل کرنا، پہنچنا۔ اَلْبِرّ: اس کا اصل مفہوم ہوتا ہے وفاداری، ادائے حقوق، کسی کے حقوق کو پورا پورا ادا کر دینا، اور وفا کا معنی بھی یہی ہوتا ہے کہ جو دوسرے کے حق آپ کے ذمے ہیں ان کو آپ ادا کریں، بَرّ صفت کا صیغہ ہے وفادار اور حقوق ادا کرنے والے کے معنی میں، جیسے دوسری جگہ ہے بَرًّۢا بِوَالِدَیْهِ، بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ (سورۂ مریم) اس کا معنی یہی ہوا کرتا ہے اپنے ماں باپ کے حقوق ادا کرنے والا، اس کی جمع اَبرار آتی ہے، جیسے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ (سورۂ انفطار)، بَرّ کی جمع ابرار، یعنی وہ لوگ جو اللہ کے حقوق ادا کرنے والے ہیں، اللہ کے وفادار ہیں۔ اور بِر کے مقابلے میں لفظ فجور آتا ہے، اس لیے قرآنِ کریم میں اَبرار کے مقابلے میں لفظ فُجّار ذکر کیا گیا ہے، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ، تو فجور کا معنی ہو جائے گا حقوق کا تلف کرنا، حقوق ادا نہ کرنا، اور جس وقت پورے حقوق کسی کے ادا کر دیے جاتے ہیں تو انسان سبکدوش ہو جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں اپنے فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گیا۔ تو یہاں ''کامل نیکی، کامل ثواب'' یہ بِر کا حاصل ترجمہ ہے، اس کا اصل مفہوم ہوگا کہ اگر تم اللہ کے حقوق کما حقہ ادا کرنا چاہتے ہو، اللہ کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہو تو پھر اپنی محبوب اشیاء میں سے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اور حاصل مفہوم یوں ادا کیا جائے گا کہ ''ہرگز نہیں حاصل کر سکتے تم نیکی کو'' یعنی کامل نیکی کو، کامل ثواب کو، حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ: حتی کے بعد مضارع آ جائے تو اردو کے محاورے کے لحاظ سے اس کا ترجمہ نفی کے ساتھ کیا جاتا ہے، ''جب تک کہ نہ خرچ کرو تم اس چیز میں سے جس کو تم پسند کرتے ہو'' یعنی اپنی محبوب چیز میں سے جب تک خرچ نہیں کرو گے اس وقت تک تم کمالِ نیکی کو نہیں پہنچ سکتے، کمالِ نیکی حاصل نہیں کر سکتے، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ: اور جو کچھ تم خرچ کرو، فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ اُس کو جاننے والا ہے۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: حِل حلال کے معنی میں ہے، سب کھانا حلال تھا بنی اسرائیل کے لئے، اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ: سوائے اس کھانے کے جس کو حرام ٹھہرا لیا اسرائیل نے اپنے نفس پر، مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ: اس کا تعلق حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ کے ساتھ ہے، ''سب طعام حلال تھا بنی اسرائیل کے لئے تورات اتارے جانے سے قبل، سوائے اُس طعام کے جس کو حرام ٹھہرا لیا اسرائیل نے اپنے نفس پر'' اسرائیل سے مراد یعقوب علیہ السلام۔ قُلْ: آپ کہہ دیجیے، فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ: لے آؤ تورات، فَاتْلُوْهَاۤ: پھر پڑھو تم اُس تورات کو، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اگر تم سچے ہو، فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: پھر جو شخص گھڑے اللہ پر جھوٹ، مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: اس کے بعد، یعنی اس وضاحت کے بعد بھی جو اللہ پر جھوٹ گھڑے،

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: پس یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں، بے انصاف ہیں۔قُلْ: آپ کہہ دیجیے، صَدَقَ اللّٰهُ: اللہ نے سچ فرمایا، فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا: پس پیروی کرو تم ابراہیم کے طریقے کی، ایسا ابراہیم جو کہ حنیف تھا، جو ادیانِ باطلہ سے ہٹ کر ایک دِینِ حق کی طرف متوجہ ہونے والا تھا، جو ایک کا ہو رہا تھا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ: بیشک پہلا گھر، وُّضِعَ لِلنَّاسِ: جو متعین کیا گیا لوگوں کے لئے، لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ: البتہ وہی ہے جو مکہ معظمہ میں ہے، بکہ یہ مکہ کا نام ہے، مُبٰرَكًا: اِس حال میں کہ وہ برکت دیا ہوا ہے، وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ: اور جہانوں کے لئے راہنمائی کا ذریعہ ہے، جہانوں کے لئے مرکزِ ہدایت ہے، فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ: اُس میں واضح واضح نشانیاں ہیں، مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ: جن میں سے ایک مقام ابراہیم ہے، فیہ آیاتٌ بیناتٌ منھا مقامُ ابراھیمَ، اُن آیاتِ بینات میں سے مقام ابراہیم ہے، وَمَنْ دَخَلَهٗ: اور جو کوئی اس میں داخل ہو جائے، كَانَ اٰمِنًا: تو وہ امن والا ہو جاتا ہے، بےخوف ہو جاتا ہے، وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ: اور اللہ کے لئے لوگوں کے ذمے، حِجُّ الْبَيْتِ: بیت اللہ کا قصد کرنا ہے، بیت اللہ کا حج کرنا ہے، لیکن سب لوگوں کے ذمے نہیں، مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا: یہ النَّاسِ سے بدلِ بعض ہے، جو اُس بیت کی طرف راستے کی طاقت رکھتا ہے، جو اُس بیت تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے، وَمَنْ كَفَرَ: اور جو کوئی کُفر کرے، انکار کرے، فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ: پس بیشک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تمام جہانوں سے۔قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ: آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو، وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ حاضر ہے، گواہ ہے اُس چیز پر جو تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے، اُن پر گواہ ہے۔قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ: آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ: کیوں روکتے ہو اللہ کے راستے سے اُن لوگوں کو جو ایمان لے آئے، تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: طلب کرتے ہو تم اُس راستے کو ٹیڑھا، اُس راستے میں تم کجیاں تلاش کرتے ہو، عوج کجی کو کہتے ہیں، وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ: حالانکہ تم گواہ ہو، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ بےخبر نہیں اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط اور محبوب چیز کے اِنفاق کی ترغیب

پہلی آیت جس میں اپنی محبوب چیز کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اُس کا تو ماقبل کے ساتھ تعلق یوں لگایا گیا ہے کہ پچھلی آیت میں ذکر کیا گیا تھا کہ آخرت میں کافروں کی طرف سے زمین بھری ہوئی سونا بھی قبول نہیں کیا جائے گا اگر وہ بطور فدیہ کے دینا چاہیں، اور اسی طرح یہ مسئلہ ہے کہ کُفر کی حالت میں دنیا میں بھی اگر کوئی اللہ کے راستے میں سونے کا پہاڑ خرچ کر دے تو بھی قابلِ قبول نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں صدقہ قبول تبھی ہوتا ہے جب کوئی شخص ایمان بھی لائے ہوئے ہو، اور جب تک ایمان نہ لائے اُس وقت تک اُس کے صدقات قبول نہیں ہیں، تو یہ لَنْ تَنَالُوا میں گویا مسلمانوں کو خطاب ہے، کہ تمہارے لئے

یہ موقع ہے کہ اپنی محبوب ترین چیز اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور خرچ کرنے کے بعد کمال درجے کا ثواب اور کمال درجے کی نیکی حاصل کرلو، اور اگر اپنی محبوب ترین چیز تم اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کروگے تو جو بھی خرچ کروگے وہ اللہ کے علم میں ہے، ثواب اُس پر ملے گا، لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ ثواب لینے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے محبوب مال کو اللہ کے راستے میں قربان کیا جائے۔

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

چنانچہ جس وقت یہ آیت اتری ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑھ بڑھ کر اپنی محبوب چیزوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ مدینہ منورہ میں حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ بہت بڑے صاحبِ حیثیت تھے، مسجد نبوی کے سامنے ہی ان کا باغ تھا، جس کا نام تھا بَیْرَحاء، حدیث شریف میں اِس کا ذکر آتا ہے، اُس میں ایک کنواں تھا، بڑا اچھا اور عمدہ اُس کا پانی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے اور اُس کا پانی پیتے تھے، جب یہ آیت اتری تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنا محبوب ترین مال اپنے راستے میں خرچ کرنے کے لئے کہا ہے، اور میرے مال میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب یہی بیرحاء ہے، میں اِس کو اللہ کے راستے میں خیرات کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور یہ کہا کہ یہ تو بہت نفع والی تجارت ہے جو تُو کرنے لگا ہے، اب میرا مشورہ یہ ہے کہ تُو اپنے قریبی رشتے داروں میں اس کو تقسیم کردے، چنانچہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے چچوں کی اولاد میں اُس باغ کو تقسیم کردیا،[1] یعنی اپنے قریبی رشتے دار جو ضرورت مند ہوں اُن میں تقسیم کرنا بھی صدقے کی ایک اعلیٰ قسم ہے، ویسے تو ہر ضرورت مند کو دینا ثواب ہے لیکن اگر اُس کے ساتھ رشتے داری بھی ہے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اُس کو دگنا ثواب ملتا ہے، صلہ رحمی کا بھی اور صدقے کا بھی۔[2] تو ایسے ہی اور بہت سارے واقعات ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی عزیز ترین چیزوں کو اللہ کے راستے میں خیرات کیا یہی کمال ثواب حاصل کرنے کے لئے۔ تو گویا جو مضمون اہلِ کتاب کے متعلق چلا آرہا ہے مسلمانوں کی طرف ایک ہدایت کرنے کے لئے یہ دوسری طرف انتقال ہوگیا، درمیان میں مسلمانوں کو ایک نصیحت کردی، آگے پھر وہی بنی اسرائیل کا قصہ آرہا ہے، اس آیت کی تقریر یوں بھی تفاسیر میں کی گئی ہے۔

پہلی آیت کی دُوسری تفسیر

اور یوں بھی اِس کی تفسیر کی گئی ہے کہ لَنۡ تَنَالُوا کا خطاب اہلِ کتاب کو ہی ہو جن کے متعلق خطاب پہلے سے چلا آرہا ہے، اُنہیں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اپنی محبوب ترین چیزوں کی جب تک قربانی نہیں دوگے اور اللہ کے راستے میں اُن کو خرچ نہیں کروگے اُس وقت تک تم کمالِ ثواب حاصل نہیں کرسکتے، اپنے زعم میں تم سمجھتے ہو کہ ہم اللہ کے بڑے محبوب اور اس کے بڑے مقرب ہیں، اور ہمیں کمال نیکی اور کمال ثواب حاصل ہے، یہ بات غلط ہے۔ اپنی محبوب چیزیں، اپنی مشتہیات، دل کی خواہشات، ان کی قربانی دو، عزیز ترین چیز اللہ کے راستے میں لٹاؤ، تب جا کر تمہیں ایمان نصیب ہوگا اور تم کمال کو حاصل کرسکو گے، تو چونکہ وہ جو حبِ مال اور

(۱) صحیح البخاری ج۱ ص۱۹۷، باب الزکوٰۃ علی الاقارب / مشکوٰۃ ج۱ ص۱۷۲ باب افضل الصدقۃ فصل اول۔

(۲) بخاری ۱/ ۱۹۸ باب الزکاۃ علی الزوج والایتام / مشکوٰۃ ۱/ ۱۷۱ باب فضل الصدقۃ ولفظ الحدیث: نَعَمْ لَهَا اَجْرَانِ اَجْرُ الْقَرَابَةِ وَاَجْرُ الصَّدَقَةِ

حُبِ جاہ میں مبتلا تھے اُس پر انکار کرنا مقصود ہے، کہ جب تک تمہارے اندر قربانی کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا کہ اپنی محبوب ترین چیزوں کی قربانی اللہ کے راستے میں نہیں دوگے اُس وقت تک نہ تمہیں ایمان نصیب ہوسکتا ہے نہ کمالِ ثواب حاصل ہوسکتا ہے، اس لئے یہ قربانی دینا سیکھو، تب جا کے تمہارے لئے ایمان قبول کرنا آسان ہوجائے گا۔ موقع محل کے اعتبار سے اِس کا یہ مقصد بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ویسے یہ الفاظ زیادہ تر چسپاں پہلے مفہوم پر ہی ہیں جو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا، کہ مسلمانوں کو ترغیب دینا مقصود ہے کہ اچھی سے اچھی چیز اللہ کے راستے میں خرچ کریں۔

اُونٹ وغیرہ کی حلت پر یہود کے شُبہ کا جواب

اگلی کلام جو آرہی ہے (کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا) اُس کا صراحتاً تعلق بنی اسرائیل کے ساتھ ہے، پچھلے پارے میں ایک دو رکوع قبل آپ نے ملتِ ابراہیمی کا قصہ پڑھا تھا، کہ یہود ونصاریٰ کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جو طریقہ تھا ہم اُسی طریقے پر ہیں، یہ آیت آئی تھی مَا کَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا، اور اُس میں یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق رکھنے والے یا تو وہ لوگ ہیں جو اُس وقت اُن کے متبع تھے، یا یہ نبی اور اس نبی پر ایمان لانے والے، آج سب سے زیادہ تعلق رکھنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہی لوگ ہیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے مسلک پر یہ لوگ ہیں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طریقے کو ملتِ ابراہیمی قرار دیا، اور قرآنِ کریم میں صراحتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتِ ابراہیمی کی ہی اتباع کا حکم دیا گیا۔ اِس بحث میں اسرائیلیوں کی طرف سے کچھ سوال اٹھائے گئے جن کا تعلق اِس بات کے ساتھ ہے کہ آپ کا ملتِ ابراہیمی پر ہونا مشتبہ ہے، کیونکہ ملتِ ابراہیمی کی چیزیں آپ میں موجود نہیں ہیں، مثلاً یہود نے یہ کہا کہ مسلمان اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں، اونٹنی کا دودھ پیتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ملتِ ابراہیمی میں حرام تھیں، جب ملتِ ابراہیمی میں یہ حرام تھیں تو اِن کو حلال کہنے والا ملتِ ابراہیمی پر کیسے ہوسکتا ہے؟ دوسرے اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بیت المقدس یعنی مسجد اقصیٰ کے ساتھ ہے، جو کہ اہلِ کتاب کا قبلہ تھا، جدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ منورہ آنے کے بعد سولہ مہینے تک منہ کر کے نماز پڑھی تھی، دوسرے پارے کی ابتدا میں یہ قصہ آپ کے سامنے آیا تھا، پھر یہ طریقہ جو چھوڑ دیا کہ بیت المقدس کو ترک کردیا اور کعبہ کی طرف متوجہ ہوگئے، بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوگئے، تو وہ کہنے لگے کہ یہ بھی ملتِ ابراہیمی کے خلاف ہے، وہ کہتے تھے کہ مکہ معظمہ کے ساتھ یا بیت اللہ کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا کوئی تعلق نہیں، چنانچہ یہی مضمون آپ کے سامنے پہلے پارے میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ دوہرائی گئی تھی اُس میں بھی اِس مضمون کو واضح کیا گیا تھا، کہ یہ جگہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آباد کی ہوئی ہے، اور اس کی نسبت بھی اُن کی طرف ہے، ایک بیٹے کو یہاں آباد کیا تھا اور دوسرے کو شام میں آباد کیا تھا، یہ بیت اللہ اُنہی کے ہاتھوں کی تعمیر ہے، اور یہاں واضح واضح علامات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس جگہ کے ساتھ تعلق ہے، تو اُن کے یہ جو شبہات تھے ان کو دور کر کے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کا ملت ابراہیمی ہونا واضح کیا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ: اس میں اسی شبہ کا جواب ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ جو کھانا اس وقت زیرِ بحث

ہے، جن چیزوں کے بارے میں اختلاف ہے (کیونکہ یہودی اور بھی کئی چیزوں کا حرام ٹھہرائے ہوئے تھے جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ انعام میں آئے گی کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ (آیت:۱۴۶)، کئی ساری چیزیں یہود پر اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرائی تھیں، اس کا ذکر سورۂ انعام میں تفصیل کے ساتھ آئے گا) تو یہ سب کی سب چیزیں جو اِس وقت زیر بحث ہیں جن کے متعلق یہودی کہتے ہیں کہ ملتِ ابراہیمی سے حرام چلی آرہی ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں، بنی اسرائیل یعنی اسرائیل کی اولاد، اِن پر بھی حلال تھیں، ابراہیم پر یا ابراہیم سے پہلے انبیاء ﷺ پر تو حرام ہونے کا تو کیا ذکر، خود بنی اسرائیل بھی پر تورات کے اترنے سے پہلے حرام نہیں تھیں، تورات کے اترنے کے بعد اِن پر بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا، تو حرمت کی نسبت تورات کی طرف ہے، تورات سے قبل زمانے میں یہ اشیاء حرام نہیں تھیں۔ ہاں البتہ ایک چیز تھی جس کو اسرائیل نے اپنے نفس کے اُوپر حرام ٹھہرالیا تھا، بعد میں اُس کی حرمت بھی اُن کی اولاد میں چلی آئی، ''اسرائیل'' سے یعقوب علیہ السلام مراد ہیں، تفسیری روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک تکلیف تھی، جس کو عِرْقُ النَّسا کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، یہ ٹانگ کے اندر کوئی رگ ہے جس کے اندر درد بیٹھ جایا کرتا ہے اِس کو عِرق النسا کہتے ہیں، اِس تکلیف کے اندر وہ مبتلا تھے، اور اُنہوں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے دے تو میں اپنی محبوب چیز، یعنی جو کھانے میں سے مجھے محبوب ہے، میں اُس کو ترک کردوں گا، جب شفا ہوگئی تو اُن کو اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ پسند تھا چنانچہ آپ نے اِس نذر کے تحت وہ ترک کردیا، اور اِس قسم کی نذر اُن کی شریعت میں جائز تھی، کہ نذر کے تحت کسی شی کو اپنے اُوپر حرام کرلیا جائے، ہماری شریعت میں نذر کا یہ مفہوم تو ہے کہ ایک مباح چیز کو آپ اپنے اُوپر واجب کرلیں، نذر کے تحت یہ تو ہوجاتا ہے، باقی! حلال چیز کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرانا یہ یمین کے حکم میں ہے، اور اِس قسم کی یمین کی ہمارے ہاں ممانعت ہے کہ کسی حلال چیز کو نذر کے تحت اپنے اُوپر حرام نہیں کیا جاسکتا، اٹھائیسویں پارے میں سورۂ تحریم کے اندر یہی مسئلہ آپ کے سامنے آئے گا يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ: جو چیز اللہ نے آپ کے لئے حلال کی ہے آپ اس کو اپنے اُوپر حرام کیوں ٹھہراتے ہیں؟ وہاں شہد کا مسئلہ ہے، حضور ﷺ نے اُس کو اپنے اُوپر ممنوع ٹھہرالیا تھا، تو تحریمِ حلال یعنی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام ٹھہرانا ہماری شریعت میں منسوخ ہوگیا، اِس قسم کی نذر جائز نہیں ہے، اگر کوئی نذر مان لے تو اُس کا توڑنا ضروری ہے، اور اُس کا کفارہ کفارۂ یمین ہوتا ہے۔ اُن کی شریعت میں جائز تھی، تو اونٹ کی حرمت اور اُس کے دودھ کی حرمت بھی اسرائیل علیہ السلام کی نذر کے تحت ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اِس کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ وضاحت کی گئی کہ جو چیزیں اِس وقت زیر بحث ہیں، جن کو اسرائیلی اپنے اُوپر حرام سمجھتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں حرام نہیں تھیں، اونٹ اسرائیل علیہ السلام کی نذر کے تحت حرام ہوا، اُنہوں نے اپنے نفس پر اِس کو ممنوع قرار دے لیا، اور باقی چیزیں تورات کے اترنے کے بعد حرام ہوئیں، لہٰذا یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِن کو حلال قرار دے دینا یہودیت کے خلاف ہے، اِس کو حلال قرار دینا تورات کے خلاف ہے کہ تورات کا حکم منسوخ ہوتا ہے، باقی یہ کہنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کے خلاف ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں یہ چیزیں حرام تھیں، یہ بات غلط ہے۔ یہ ہے ہمارا دعویٰ، باقی! فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: تم اپنی کتاب تورات ہی لے آؤ، اُس کو پڑھ کے دکھا دو،

اس میں اگر لکھا ہوا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں یہ چیزیں حرام تھیں تو تم سچے اور ہم جھوٹے، اور اگر تورات سے یہ بات تم ثابت نہ کر سکو، اور تورات کی صراحت سے یہی بات نکلے کہ اِن کی حرمت یہودیوں پر بعض جرائم کی سزا کے طور پر کی گئی، یا یہ نذر حضرت یعقوب علیہ السلام نے مانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے بعد، تو پھر تمہارا ان باتوں کو اس بات کی علامت قرار دینا کہ مسلمان ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر نہیں ہیں، یہ بات صحیح نہیں۔ بہر حال اس شبہ کو اس طرح سے زائل کر دیا۔ تو کُلُّ الطَّعَامِ سے ہر وہ کھانا مراد ہے جو اس وقت زیر بحث ہے جس کو یہودی حرام کہتے تھے، "یہ ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا سوائے اس کے جس کو اسرائیل نے اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا، حلال تھا تورات کے اتارے جانے سے قبل" تورات کے اترنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض جرائم کی سزا کے طور پر بعض چیزیں اِن پر حرام ٹھہرا دیں، تو ان کی نسبت تورات کی طرف ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نہیں ہے۔ اور آپ کہہ دیجئے کہ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ: تورات لے آؤ جو اللہ کی کتاب ہے فَاتْلُوهَآ: اُس کو پڑھو، اگر تم سچے ہو تو تورات سے ہی ثابت کر دو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں یہ حرام تھیں، اور اگر تورات کے اندر ہی یہ مذکور ہے کہ اِن کی حرمت کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نہیں ہے تو پھر بات صاف ہو گئی، پھر تمہارے شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور اگر اتنی وضاحت کے بعد بھی تم لوگ یہی بات کہتے چلے جاؤ کہ "نہیں! یہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم پر حرام ٹھہرائی تھیں، اس لئے ابراہیم کے طریقے پر اُسے ہی سمجھا جائے گا جو اِن چیزوں کو حرام سمجھے گا، اور جو اِن کو حرام نہیں سمجھتا اُس کو ابراہیم کے طریقے پہ نہیں سمجھا جائے گا" یہ تمہارا افترا اور جھوٹ ہے جو تم اللہ پر باندھتے ہو، اور اِس سے بڑھ کر کوئی دوسرا ظلم نہیں کہ کوئی انسان اللہ پر جھوٹ باندھتا رہے، اگلے لفظوں کا حاصل یہی ہے، فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ کا مطلب ہے کہ اِس وضاحت کے بعد جو ہم نے آپ کے سامنے کر دی، اِس کے بعد بھی اگر کوئی اللہ پر جھوٹ باندھے گا فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: پس یہی لوگ ظالم ہیں، یہی لوگ بے انصاف ہیں، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کے طریقے کو ملتِ ابراہیمی کے خلاف ثابت کرنے کے لئے انہوں نے جو بعض چیزوں کو حلال قرار دینے سے دلیل پکڑی تھی اُس کی تردید ہو گئی۔

اہلِ اسلام کے قبلے کے متعلق یہود کے شبہ کا جواب

دوسرا شبہ یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس تھا، اگر ملت ابراہیمی پر ہو تو پھر اُسے ہی قبلہ قرار دو، اور مکہ معظمہ سے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کو کاٹتے تھے، توڑتے تھے، آگے اس کو ذکر کیا گیا ہے کہ یہ بیت اللہ جو مکہ معظمہ میں ہے افضل ترین ہے، تمام جگہوں سے افضل ہے، اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت کے لئے یہی گھر متعین کیا گیا تھا، اور اس میں بہت واضح واضح نشانات موجود ہیں جن سے اس کی مقبولیت اور اس کا اشرف المواضع ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد اور اُن کا یہاں آ کر اس کو آباد کرنا، اپنی اولاد کو یہاں بسانا، وہ سارے کا سارا ثابت ہوتا ہے، تواتر کے ساتھ یہ چیزیں آرہی ہیں، تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ اس بیت کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا کوئی تعلق نہیں اور اس کو قبلہ بنا لینا ملتِ ابراہیمی کے خلاف ہے، یہ بات

بھی غلط ہے۔ اِس مضمون کی وضاحت پہلے تحویلِ قبلہ سے قبل بھی ہو چکی، پہلے پارے کے آخر میں۔ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ: یہ بات تو پچھلے مضمون کے ساتھ ہی تعلق رکھتی ہے، آپ کہہ دیجئے اللہ نے سچ فرمادیا، اللہ کی طرف سے وضاحت ہوگئی، واقع کے مطابق بات اللہ نے کہہ دی، فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا: پھر تم پیروی کرو ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی جو کہ حنیف تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ: پہلا گھر جو متعین کیا گیا لوگوں کے لئے، یعنی عبادت کے واسطے، اس لئے حضرت آدم علیہ السلام جس وقت زمین پر آئے ہیں تو آنے کے بعد سب سے پہلے حکم اِن کو یہی ہوا تھا کہ بیت اللہ کی تعمیر کرو، پہلی تعمیر آدم علیہ السلام کے زمانے کی ہے چاہے فرشتوں کی وساطت سے ہوئی ہو یا آدم علیہ السلام نے براہِ راست کی ہو، بہرحال آدم علیہ السلام کے آتے ہی عبادت کے طور پر پہلے اس گھر کو متعین کردیا گیا، یا تو اور گھر ابھی آدم علیہ السلام نے اپنی رہائش کے لئے بھی نہیں بنایا تھا، پھر تو اولیت حقیقی ہوئی ہر گھر کے اعتبار سے، یا مطلب یہ ہے کہ چاہے اپنے رہنے کے لئے کوئی کمرہ یا خیمہ بنا ہی لیا ہو، لیکن عبادت کے طور پر پہلے جگہ یہی متعین کی گئی، تو اول بیت اِس اعتبار سے ہوجائے گا، وُّضِعَ لِلنَّاسِ: جو لوگوں کے لئے متعین کیا گیا، یعنی اولادِ آدم کے لئے، جیسے آدم علیہ السلام اول الناس ہیں تو آدم علیہ السلام کے لئے عبادت کے واسطے جو گھر متعین کیا گیا یہ بھی اول بیت ہے۔

لفظِ ''بکۃ'' کی تحقیق

''یہ وہی ہے جو مکہ میں ہے'' پُرانی کتابوں میں مکہ معظمہ کا نام ''بکہ'' آتا ہے، باء اور میم قریب المخرج ہونے کی بناء پر عربی زبان میں ایک دوسرے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں (آلوسی)، بکہ یہ مکہ کا ہی نام ہے، اور یہ لفظ پہلے کتابوں کے اندر موجود تھا، اور یہود نے اِس لفظ کے اندر بھی تحریف کی ہے، جیسے پیچھے آیا تھا يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ (آل عمران:۷۸) کہ اپنی زبانوں کو مروڑ کے لفظ بگاڑ دیتے ہیں، اور لفظ بگاڑ کر اُس کے مفہوم کو بدل دیتے ہیں، اِس قسم کی تحریف وہ کرتے تھے، تو اِس بکہ کو انہوں نے بُکاء بنادیا، اور وادیٔ بکہ کی بجائے وادیٔ بُکاء بن گیا یعنی رونے کی وادی، اور پھر اُس کی نشاندہی یوں کرتے تھے کہ یہ شام کے علاقے میں بیت المقدس کے پاس کوئی وادی ہے، جس کا نام وادیٔ بکاء ہے، تو لفظ کے بدلنے کے ساتھ مفہوم یوں گڑبڑ کردیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اُس وادی سے لگاتے، اور یہ کہتے کہ اِس وادی سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کو مکہ کہتے ہیں، تو لفظ کے اندر تحریف کرکے یوں اِس کا مفہوم بگاڑ دیا، اس لیے یہاں وضاحت کردی گئی کہ بکہ یہی ہے، ''جو گھر عبادت کے لئے سب سے پہلے متعین کیا گیا تھا یہ وہی ہے جو بکہ میں ہے'' یعنی مکہ معظمہ میں ہے۔

بیت اللہ کی ظاہری و باطنی برکات

مُبٰرَكًا: برکت والا ہے، اس کی ظاہری اور باطنی برکات مشاہدے میں ہیں، باطنی برکت مثلاً یہ ہے کہ یہاں عبادت کرنے میں ثواب بہت بڑھ جاتا ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ گھروں میں عام طور پر جو نماز پڑھتے ہیں تو ایک نماز ہے، محلے کی مسجد میں پڑھو تو اُس میں اور زیادہ ثواب ہوگیا پچیس گنا بڑھ گئی، اور جامع مسجد میں پڑھو جس میں جمعہ ہوتا ہے تو پانچ سو

گنا ہوگئی، اور پھر بیت المقدس اور مسجد نبوی میں اُس سے بھی زیادہ ثواب، اور مسجد حرام میں جو نماز ادا کی جاتی ہے اُس میں ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہو جاتی ہے،[1] یہ باطنی برکت ہے، کہ عبادت کرنے سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ظاہری برکات بھی بالکل مشاہدہ میں ہیں، کہ باوجود اس بات کے کہ چٹیل میدان میں ہے، اور وادیٔ غیر ذِی زرع میں ہے، جس میں کوئی کھیتی نہیں، نباتات نہیں، باغات نہیں، لیکن اس گھر کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے رزق کی اتنی وسعت وہاں کی ہوئی ہے کہ لاکھوں کے حساب سے لوگ جاتے ہیں، اور وہاں علاقے کی پیداوار کچھ بھی نہیں، لیکن کسی کو وہاں رزق کی تنگی محسوس نہیں ہوتی، ہر چیز ہر موسم میں وہاں ملتی ہے، ہر ملک کا پھل وہاں ملتا ہے، آج سے نہیں بلکہ جب سے مکہ آباد ہوا اُس وقت سے یہی حال ہے، یہ ظاہری برکت ہے جو اللہ نے دی۔

هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ: تمام جہانوں کے لئے وہ مرکزِ ہدایت ہے، نماز کا رخ متعین کرنے کے لئے بھی وہ ہادی ہے، اور اسی طرح اللہ کی طرف توجہ کرنے کے لئے بھی وہ ہادی ہے، اور آخری زمانے میں ہدایت کا سرچشمہ بھی اللہ تعالیٰ نے اسی بیت کو بنایا، کہ یہیں سے وہ نبی اٹھایا جو کہ تمام جہانوں کے لئے ہدایت وراہنمائی کا باعث بنا، تو هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام جہانوں کے لئے یہ بیت مرکزِ ہدایت ہے، اسی سے ہدایت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

مقامِ ابراہیم علیہ السلام کا پس منظر اور تاریخ

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ: اِس بیت میں بہت واضح آیات اور نشانیاں ہیں، جس سے اِس کی مقبولیت بھی ثابت ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی اِس کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے، جن میں سے ایک نشانی مقامِ ابراہیم ہے، مقامِ ابراہیم کا ذکر بھی پہلے پارے میں آگیا تھا، کہ اِس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی بناء کی تھی، حضرت اسماعیل پتھر پکڑاتے تھے اور حضرت ابراہیم پکڑ پکڑ کے پتھر اوپر رکھتے تھے، جب وہ دیوار اُونچی ہوگئی تو پھر ضرورت پیش آئی کہ نیچے کوئی چیز رکھی جائے جس کے اوپر کھڑے ہو کر پتھر لگائیں، تو پھر یہ پتھر وہاں دیوار کے پاس رکھا گیا جس کے اُوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے، تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس پتھر میں کچھ ایسی صلاحیت رکھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جتنا اُونچا ہونے کی ضرورت پیش آتی یہ پتھر اتنا ہی اُونچا ہو جاتا تھا، اور جب اس سے اترنا ہوتا تو پتھر نیچا ہو جاتا تھا، اور پھر ایک نشان باقی رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اِس کو موم کی طرح نرم جو کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پاؤں اِس کے اندر دھنس گئے، اور اس وقت تک اُن دونوں پاؤں کا نشان نمایاں ہے، بالکل ایسے جیسے ٹخنے کے برابر تک پاؤں پتھر کے اندر دھنسا ہوا ہے، پُرانی تاریخ سے تواتر کے ساتھ یہ چیز ثابت چلی آرہی تھی کہ یہ پتھر وہی ہے، اور اس کے اُوپر جو نشان ہیں یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشان ہیں، جو علی الاعلان بتاتے ہیں کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم آئے اور یہ نقشِ پا اُنہی کا ہے، اور پھر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اِس کو اُسی طرح محفوظ کر لیا گیا، پہلے یہ بیت اللہ کے دروازے کے پاس پڑا ہوتا تھا، پھر جب یہاں نماز پڑھنے کا

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۰۲، باب ما جاء فی الصلوۃ فی المسجد الجامع/مشکوۃ ج۱ ص ۷۲، باب المساجد عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

حکم آیا کہ اِس کے پاس نماز پڑھوتو اگر وہاں نماز پڑھی جاتی تو طواف کرنے والوں کے لئے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، اس لیے بیت اللہ کے دروازے سے اٹھا کر اِس کو مطاف کے کنارے پر، یعنی جو اُس زمانے میں مطاف تھا اُس کے کنارے پر اِس کو محفوظ کر دیا گیا، اور آج تک یہ پتھر وہیں رکھا ہوا ہے، اور اِس وقت اُس کے اُوپر شیشے کا خول چڑھایا ہوا ہے، شیشے کے مکان میں اُس کو مقفل کیا ہوا ہے، غور سے دیکھیں تو پتھر بھی اندر نظر آتا ہے اور وہ نشان بھی نظر آتے ہیں، اور مسجد حرام کا آپ نے فوٹو دیکھا ہوگا تو بیت اللہ کے دروازے کی طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی سی کھڑی نظر آتی ہے وہی مقام ابراہیم ہے، اُس کے اندر وہ پتھر پڑا ہوا ہے، شیشے میں سے دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے اور قدموں کے نشان بھی نظر آتے ہیں۔ تو یہ ایک حسی علامت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں تک پہنچے، اور تواتر کے ساتھ یہ بات چلی آرہی ہے کہ یہ نقشِ پا اُنہی کا ہی ہے، جس سے اِس جگہ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت ثابت ہوگئی، کہ اگر بیت المقدس میں حضرت ابراہیم کی اولاد آباد ہوئی اور اُن کی اولاد کے لئے وہ مرکزِ توجہ بنا، تو یہ مرکز بھی اُنہی کا ہی ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہے، تو مقامِ ابراہیم سے وہ پتھر مراد ہے۔

اور شرعی نقطہ نظر سے ایک علامت یہ بیان کی کہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا: جو اِس میں داخل ہو جائے امن والا ہو جاتا ہے، اُس کو امن نصیب ہو جاتا ہے، یہ مسئلہ بھی آپ پڑھتے رہتے ہیں، یہ شرعی حکم ہے کہ وہاں داخل ہو جانے کے بعد قتل وقتال جائز نہیں، کسی کو مارنا جائز نہیں ہے، انسانوں کو تو کیا جو حیوانات بھی وہاں چلے جاتے ہیں اُن کو بھی امن حاصل ہے، اس لئے کسی شکاری جانور کو پکڑنا وہاں درست نہیں ہے، یہ تفصیل فقہ کے اندر موجود ہے اور آپ پڑھتے رہتے ہیں۔

ہر دور میں حج صرف بیت اللہ کا ہی ہوا ہے

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ: اور اِس کا یہ شرف بھی پہلے سے نمایاں ہے، سابقہ انبیاء علیہم السلام بھی اِسی کا ہی حج کرتے رہے، حج صرف بیت اللہ کا ہی ہوا ہے، بیت المقدس میں کبھی نہیں ہوا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اعلان کیا تھا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ اعلان سب تک پہنچایا، تو آپ کی اولاد نے اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء نے اِسی بیت اللہ کا ہی حج کیا ہے، یہیں وہ زیارت کے لئے آتے تھے، حدیث شریف میں آتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ سفر میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ یہ کون سی وادی ہے؟ آپ کو اطلاع دی گئی کہ فلاں وادی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایسے دیکھ رہا ہوں جیسے موسیٰ علیہ السلام یہاں سے حج کرنے کے لئے جارہے ہیں اور وہ لبیک لبیک پکارتے ہوئے جارہے ہیں، اسی طرح آپ نے یونس علیہ السلام کو دیکھا کہ بیت اللہ کی طرف حج کے لئے جارہے ہیں، ایک وادی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کا بھی ذکر فرمایا۔[1] تو معلوم ہوتا ہے عالمِ رُوحانیت میں بھی یہی جگہ انبیاء علیہم السلام کے لئے مرکز ہے اور حج وغیرہ کے لئے توجہ اِدھر ہی ہوتی ہے۔ ''لوگوں کے ذِمے ہے اِس بیت اللہ کا حج، اِس کا قصد کرکے جانا''، حج کا لفظی معنیٰ تو ہے قصد کرنا، باقی! قصد کرنے کا خاص طریقہ، خاص وقت، اور خاص ہیئت، وہ ساری تفصیل کتابوں میں موجود ہے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ساتھ اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۹۴ باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم / مشکوۃ ج۲ ص۵۰۸ باب بدء الخلق۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

حج فرض ہونے کی شرائط

لیکن ہر کسی کے ذِمّے نہیں، مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا: جو بیت اللہ تک راستے کی طاقت رکھتا ہے، اُس کو بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت حاصل ہے، چنانچہ حج کی فرضیت کے لئے شرط ہے کہ انسان سفرخرچ برداشت کر سکے، اور جتنی دیر تک اُس نے وہاں رہنا ہے، وقت لگنا ہے، اپنے متعلقین کو جن کا خرچ اُس کے ذمے ہے وہ خرچ دے سکے، تب جا کر اُس پر حج فرض ہوتا ہے، اگر اُس کے پاس اتنے پیسے تو ہیں کہ وہ جا سکتا ہے، لیکن پیچھے متعلقین کے لئے کچھ نہیں بچتا، بیوی بچوں کے لئے کوئی خرچ باقی نہیں رہتا، تو ایسی صورت میں بھی حج فرض نہیں ہے، حج کی فرضیت تبھی ہوتی ہے جب اہل وعیال کو بھی اُتنا خرچ دیا جا سکے جتنے وقت میں یہ واپس آئے گا اتنے وقت میں وہ معمول کے مطابق اپنا وقت گزار لیں، اور آنے جانے کے اور وہاں جتنے دن لگنے ہیں اُتنے اخراجات بھی اِس کے پاس موجود ہوں، گنجائش موجود ہو، تب جا کر حج فرض ہوتا ہے، تو مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا کے اندر یہی ہے۔ اور بدنی صحت بھی ضروری ہے، اگر کوئی لولا لنگڑا ہے، اندھا ہے، یا اتنا بیمار ہے کہ چل پھر نہیں سکتا، تو اُس کو بھی استطاعتِ سبیل حاصل نہیں ہے، لہٰذا اُس پر بھی حج فرض نہیں ہے۔

فریضۂ حج اَدا نہ کرنے پر وعید

وَمَنْ كَفَرَ: اِس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اگر کسی کو استطاعت حاصل ہو، حج اُس پر فرض ہو جائے، پھر وہ حج کرتا نہیں، تو ترکِ حج کو کُفر سے تعبیر کیا ہے، پھر یہ عملی کُفر ہے، جیسے "مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ"[1] کے متعلق آپ کہا کرتے ہیں کہ ترکِ صلوٰۃ کُفر ہے یعنی کافروں والا فعل ہے، عملی کُفر ہے، اسی طرح یہاں ترکِ حج پر بھی کُفر کا اطلاق ہوا ہے۔ جو کُفر کرے یعنی باوجود استطاعت ہونے کے حج نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ کو اُس کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ تو سب سے مستغنی ہے، اِس میں اللہ کا کیا نقصان؟ اِسی کی تفصیل کرتے ہوئے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص پر حج فرض ہو گیا اور اُس کو استطاعت حاصل ہے، پھر بھی حج نہیں کرتا تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے، اللہ کو کوئی پروا نہیں ہے،[2] تو اِس غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ کی تفصیل اُس میں ہے کہ اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ تو كَفَرَ سے ترکِ حج مراد ہوگا اور اِس پر کُفر کا اطلاق ایسے ہی ہے جیسے ترکِ صلوٰۃ پر کُفر کا اطلاق ہے، اِس کو عملی کُفر قرار دیں گے، حقیقی کُفر نہیں۔ اور اگر کوئی اِس کا انکار ہی کرے تو اس صورت میں حقیقی کُفر آ جائے گا اور انسان حقیقتاً کافر بن جاتا ہے۔ اور اگر اِس مَنْ كَفَرَ کا تعلق اہلِ کتاب کے ساتھ ہی لگا دیا جائے تو پھر بھی بات صاف ہے کہ اِس بیت میں آیاتِ بینات موجود ہیں، مقامِ ابراہیم یہ بتاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اِس سے تعلق ہے، اور یہ احکام بھی پہلے سے ملتِ ابراہیمی میں چلے آ رہے ہیں، اور یہ بالکل واضح واضح آیات ہیں، اور اگر پھر بھی تم انکار کرتے ہو اور اِس مرکزِ ہدایت کو ابراہیم علیہ السلام کا مرکز ماننے کے لئے تیار نہیں، اور سمجھتے ہو کہ اِس بیت اللہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اگر تمہارا خیال یہ ہے تو پھر تمہارا یہ عقیدہ کفر ہے اور تم کافر

---

(۱) معجم اوسط ج ۳ ص ۳۴۳ حدیث نمبر ۳۳۴۸۔ نیز ابن ماجه. كتاب اقامة الصلاة باب ما جاء فيمن ترك الصلاة. ولفظه: فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ

(۲) ترمذی ج ۱ ص ۱۶۷ باب ما جاء في التغليظ في ترك الحج / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۲ کتاب المناسک فصل ثانی وثالث۔

ٹھہرے، یعنی آیات بینات ہونے کے باوجود پھر بھی اگر تم نہ مانتے (یہ اہلِ کتاب کو کہا جارہا ہے) تو جو کفر کرتا ہے اللہ کو اُس کی کوئی پروا نہیں، مطلب یہ ہے کہ تم کافر ہو، اِس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں، اللہ کو کسی کی کیا ضرورت ہے۔ یوں کَفَرَ کا تعلق اِس کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، کہ گفتگو کا رجحان چونکہ بنی اسرائیل کی طرف ہے اور اُنہیں بتایا جارہا ہے کہ اِس بیت اللہ کو ابراہیم کا ہی مرکزِ ہدایت سمجھو، اور اتنی وضاحت کے باوجود بھی اگر وہ نہیں مانتے تو کفر کررہے ہیں، اور جو کفر کرے اللہ تعالیٰ کو اُس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

اہلِ کتاب کو تنبیہ

اِس دوسرے معنی کے اعتبار سے پھر اگلی آیتیں بھی اِس مضمون کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے جُڑ جاتی ہیں کہ اِس وضاحت کے بعد پھر ''آپ کہہ دیجئے کہ اے کتاب والو! تم کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیات کا؟'' تو جہاں اللہ کی اور آیات ہوں گی وہاں فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ بھی اِس کا مصداق ہوجائیں گی، یہ آیاتِ بینات جس کی تفصیل آپ کے سامنے کی جارہی ہے یہ بھی اِس کا مصداق ہوجائیں گی، ''اے اہلِ کتاب! کیوں انکار کرتے ہو تم اللہ کی آیات کا، اور اللہ تعالیٰ شہید ہے، مشاہدہ کرنے والا ہے، حاضر ہے، دیکھنے والا ہے تمہارے عملوں کو، گواہ ہے تمہارے عملوں پر۔ اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! کیوں روکتے ہو تم اللہ کے راستے سے اُس شخص کو جو ایمان لاتا ہے، طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی'' یعنی شبہات پیدا کرتے ہو، کجیاں تلاش کرتے ہو، اور اِس طرح ایمان والوں کو روکتے ہو، وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ: حالانکہ تم تو گواہ ہو حق کے، تمہارے ذِمّے لگایا گیا تھا کہ تم نے حق لوگوں کے سامنے واضح کرنا ہے اور حق بات کہنی ہے، تو گواہ ہوکر ہی تم نے اُس کے برخلاف کام کرنا شروع کردیا؟ فرض تو تمہارا تھا کہ ہر حق بات پر شہادت دیتے اور لوگوں کو اُس حق بات کی طرف بلاتے، لیکن اس گواہ ہونے کے باوجود، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مکلف کیا تھا اور تمہیں حق کی وضاحت کا منصب دیا تھا، اِس کے باوجود اگر تم اس قسم کی حرکتیں کرتے ہو تو یہ بہت بُری حرکتیں ہیں، ''اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں ہے'' جس قسم کے عمل تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی قسم کی جزا سزا پاؤ گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ
اے ایمان والو! اگر تم اطاعت کروگے ان لوگوں میں سے جو کتاب دیئے گئے ایک گروہ کی، وہ تمہیں لوٹا دیں گے
بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝١٠٠ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ
تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا کر ۝١٠٠ اور تم کیسے کفر کروگے اور حال یہ ہے کہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی
اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ
جاتی ہیں، اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے، جو کوئی مضبوطی کے ساتھ تھام لے اللہ تعالیٰ کو پس تحقیق وہ ہدایت دیا گیا سیدھے

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ

راستے کی طرف ﴿۱۰۱﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح سے ڈرنے کا حق ہے، اور ہرگز نہ مرنا تم

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا

مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو ﴿۱۰۲﴾ مضبوطی سے تھامو اللہ کی رسی کو سب مل کر، اور آپس میں فرقہ فرقہ نہ بنو، اور یاد کرو

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ

اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے جبکہ تم دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ

پھر ہو گئے تم اللہ کے احسان کی وجہ سے بھائی بھائی، اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس

مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

سے چھڑایا، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات تاکہ تم سیدھا راستہ پاؤ ﴿۱۰۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: اے ایمان والو! اگر اطاعت کرو گے تم اُن لوگوں میں سے جو کتاب دیے گئے ایک گروہ کی، يَرُدُّوْكُمْ: وہ تمہیں لوٹا دیں گے، بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ: تمہارے ایمان کے بعد، كٰفِرِيْنَ: کافر، یعنی وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں لوٹا کے دوبارہ کافر بنا دیں گے، وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ: اور تم کیسے کُفر کرو گے، وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ: اور حال یہ ہے کہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں، وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ: اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے، وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ: جو کوئی مضبوطی کے ساتھ تھام لے اللہ تعالیٰ کو، فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: پس تحقیق وہ ہدایت دیا گیا سیدھے راستے کی طرف۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح سے ڈرنے کا حق ہے، وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: اور ہرگز نہ مرنا تم مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو، صاحبِ اسلام ہو، وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا: اعتصام: مضبوطی سے تھام لینا، مضبوطی سے تھامو اللہ کی رسّی کو سب مل کر، حبل رسّی کو کہتے ہیں، اللہ کی رسّی کو سب مضبوطی سے تھام لو، وَلَا تَفَرَّقُوْا: اور آپس میں جدا جدا نہ ہوؤ، فرقہ فرقہ نہ بنو، وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اور یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے، اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً: جبکہ تم دشمن تھے، فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ: پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی، فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا: پھر ہو گئے تم اللہ کے احسان کی وجہ سے بھائی بھائی، وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ: اور تم جہنم کے گڑھے کے

کنارے پر تھے، فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں اُس سے چھڑایا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ: اِسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تاکہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

مدینہ منوّرہ میں یہود کا سازشی کردار

اِن آیات کے شانِ نزول میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، کہ مدینہ منورہ میں یہ دو قبیلے جو مشرکوں کے تھے اَوس اور خزرج، جو سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کرنے کی وجہ سے ''انصار'' کہلائے، اُن کی زمانۂ جاہلیت میں آپس میں بہت عداوتیں تھیں، جس وقت کوئی جنگ چھڑتی تو کئی سال تک چلتی رہتی تھی، آخری آخری جنگ جو ان کے اندر ہوئی جو اِن دونوں قبیلوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی، اُس کا نام جنگِ بُعاث ہے، وہ تقریباً (جیسے کہ مفسرین نے لکھا ہے) ایک سو بیس سال تک اِن کے درمیان میں رہی، ایک سو بیس سال تک کا مطلب یہ ہے کہ اِن دونوں قبیلوں میں جنگی حالات بحال رہے، گاہے گاہے جھڑپیں ہوتی رہیں، اور آخری جھڑپ سرورِ کائنات ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے سے کچھ دیر پہلے ہوئی جس میں اِن کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، بہت سارا جانی نقصان ہوا، اِس طرح یہ لوگ خانہ جنگی میں ہمیشہ مبتلا رہتے تھے، یعنی ایک واقعہ پر جنگ چھڑ جاتی، پھر کئی کئی سال تک وہی واقعہ جنگ کا باعث بنا رہتا، اور گاہے گاہے اُسی واقعہ کی بناء پر آپس میں جھڑپیں ہوتی رہتیں، تو اسی طرح سے یہ بعاث کی جو لڑائی ہے، یہیں حضرت شیخ الاسلامؒ نے لکھا کہ ''چنانچہ بعاث کی مشہور جنگ ایک سو بیس سال تک رہی''، ایک سو بیس سال کا لفظ ''فوائد عثمانی'' میں ہے، اور اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی واقعہ پر لڑائی ہوئی اور پھر لڑائی کے حالات ہی سو اصدی تک بحال رہے، اور اُسی واقعہ کو بنیاد بنا کر آپس میں گاہے گاہے خونریزی ہوتی تھی، اور حضور ﷺ کے آنے سے پہلے تو بالکل کمر توڑ خونریزی ہوئی جس میں دونوں قبیلوں کی بڑی بڑی قوتیں ختم ہو گئیں، بڑے بڑے آدمی مارے گئے۔ سرورِ کائنات ﷺ تشریف لائے تو آپ کی آمد کی برکت ایسی ہوئی کہ دونوں قبیلوں کی آپس میں صلح ہو گئی اور دونوں اسلام کے رشتے سے جڑ گئے اور وہ جنگی حالت ختم ہو گئی، بھائیوں کی طرح آپس میں رہنے لگ گئے، مدینہ منورہ کے اردگرد جو یہود کے قبیلے آباد تھے، چونکہ قومِ یہود ابتدا سے ہی سازشی اور شرارتی واقع ہوئی ہے، اور یہ لوگ دوسروں پر تسلط قائم کرنے کے لئے ہمیشہ خفیہ طور پر ریشہ دوانیوں سے کام لیتے ہیں، اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ ان قبائل کی جو آپس میں جنگیں تھیں اِن میں بھی یہودیوں کی سازشوں کا دخل ہوتا تھا، وہ ان کو اکٹھے دیکھ نہیں سکتے تھے، اِن کو لڑاتے رہتے تا کہ اِن کی قوت کمزور رہے، اور پھر ان لڑائیوں کی وجہ سے یہ مالی مشکلات میں مبتلا ہوتے، اور پھر یہ یہودیوں سے قرضے لیتے، یہودی اِن کو سود پر قرضے دیتے، اس طرح سے یہودیوں کا مالی تسلط ان کے اوپر قائم رہتا تھا، اور آپس میں لڑنے بھڑنے کی وجہ سے یہودی ان سے امن میں رہتے تھے۔

موجودہ دور میں یہود کا سازشی کردار

مدینہ منورہ کا اُس وقت یہ ماحول تھا، اور اگر آپ غور فرمائیں گے تو آج بھی دنیا کے اندر یہودی ذہن یہی کام کر رہا ہے، کہ جہاں دیکھتا ہے کہ فلاں قوم اگر دوسری قوم کے ساتھ متفق ہوگئی اور اِن کا آپس میں اتفاق ہوگیا تو ہمارے لئے مشکلات پیدا ہوجائیں گی، تو یہ اپنے خفیہ ہاتھوں کے ساتھ مختلف قسم کے شوشے چھوڑ کر اُن کو آپس میں لڑا دیتے ہیں، پھر جب وہ لڑتے ہیں تو چونکہ اسلحہ کی منڈیاں اُنہی کے پاس ہیں، چاہے وہ رُوس ہو چاہے امریکہ ہو، دونوں جگہ قیادت یہودیوں کے ہاتھ میں ہے، تسلط دونوں جگہ یہودیوں کا ہے، رُوس کے اندر بھی جتنی قیادت ہے وہ سب یہودی ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ کارل مارکس جس نے کمیونسٹ والا نظریہ پیش کیا، جس کی وجہ سے اِس نظریے کو مارکس ازم کہتے ہیں، یہ یہودی تھا، اور اس کی زندگی میں اِس کے نظریات پر انقلاب نہیں آیا، اِس کے بعد اُنہی نظریات پر رُوس میں سب سے پہلے لینن انقلاب لایا ہے، اور یہ بھی یہودی تھا، اور لینن کے بعد ان کا سب سے بڑا لیڈر سٹالن ہوا، وہ بھی یہودی تھا، تو یہ کمیونسٹ نظریہ جتنا ہے یہ بھی یہودی ذہن کی پیداوار ہے، اور اس کی قیادت بھی یہود کے ہاتھ میں ہی ہے، یہ بگڑے ہوئے یہودی ہیں جو پھر خدا کے وجود کے بھی منکر ہوگئے، اور عیسائیت سے انتقام لینے کے لئے اِنہوں نے یہ راہ چلی، کیونکہ رُوس میں بھی تسلط عیسائیوں کا تھا، چین میں بھی تسلط عیسائیوں کا تھا، اور عیسائیوں اور یہودیوں کی آمیزش پہلے سے چلی آتی تھی، اِس فتنے کی لپیٹ میں پھر اسلامی ممالک بھی آ گئے، تو جہاں عیسائیت کے خلاف انقلاب آیا اور دہریت پھیلی، اسی طرح اسلام کے خلاف بھی مختلف جگہوں میں ذہن پیدا ہوا اور یہی دہریت مسلمانوں میں بھی پھیلی۔ تو جس وقت یہ دیکھتے ہیں کہ اِن کا آپس میں اتفاق ہو رہا ہے، آپس میں جڑ رہے ہیں، تو کسی نہ کسی طرف سے کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ کر آپس میں لڑا دیں گے، لڑائی کے اندر دو پارٹیاں بنیں گی، ایک روس سے اسلحہ کی خریدار بن جائے گی، دوسری امریکہ سے اسلحہ کی خریدار بن جائے گی، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں پارٹیاں ایک ہی جگہ سے خریدار ہوتی ہیں، اور وہ خوب اِن کو جنگی ہتھیار بیچتے ہیں اور اپنی تجارت چمکاتے ہیں، اور یہ آپس میں لڑتے ہیں اور مرتے ہیں۔ تو تسلط قائم رکھنے کے لئے آج بھی دنیا میں یہودی سازش اسی طرح ہے کہ اِن کو لڑاؤ، لڑا کر اِن کو کمزور رکھو، اور کمزور رکھ کر اِن پر مالی طور پر تسلط حاصل کرو۔ پاکستان اور بھارت کی جو تین جنگیں ہوئیں، جتنی تباہی اِس میں ہوئی ہے، اگر یہ جنگیں آپس میں نہ ہوتیں تو ہم مغربی ممالک کے اتنا مقروض نہ ہوتے، جو کچھ جمع کرتے ہیں پانچ سات سال میں کسی نہ کسی اعتبار سے کوئی نہ کوئی لڑائی ہوجاتی ہے، جو اندوختہ ہوتا ہے سب ختم ہو جاتا ہے، اور ایک ایک دن میں کروڑہا روپے کا اسلحہ برباد ہوتا ہے، آدمی علیحدہ مرتے ہیں، جائیدادیں علیحدہ تباہ ہوتی ہیں، اور منڈیاں اُن کی چمکتی ہیں، وہ لاٹھی اُس کے ہاتھ میں بھی دینے کے لئے تیار کھڑے ہوتے ہیں، اُس کے ہاتھ میں بھی دینے کے لئے تیار کھڑے ہوتے ہیں، تاکہ یہ آپس میں لڑیں، لڑنے کے بعد پھر چوہدراہٹ ہماری چمکے گی، کہ دوڑ کر ہمارے دروازے پر آئیں گے، اور ہوتا اسی طرح سے ہی ہے۔ بالکل بعینہٖ یہی ذہنیت اُس وقت مدینہ کے اردگرد تھی، کہ یہودی قبائل سازشیں کر کے اِن کو آپس میں لڑاتے تھے، لڑانے کے بعد پھر اِن کے اوپر تسلط جماتے تھے، اِن لڑائیوں میں یہود کا ہر طرح سے فائدہ تھا، اس لیے وہ اِن کو اکٹھا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ابتدائی آیات کا شانِ نزول

جب سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے کے بعد اِن کا آپس میں اتفاق ہوگیا تو ایک مجلس میں اوس اور خزرج کے لوگ اکٹھے بیٹھے تھے، اور صدیوں بعد اُن کو یہ چیز نصیب ہوئی تھی کہ آپس میں محبت کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھیں اور آپس میں ہنسیں کھیلیں، تو وہاں ایک یہودی تھا جس کا نام ''شماس بن قیس''[1] لکھا ہے، وہ اِن کا اتفاق اور ان کی آپس میں محبت دیکھ کر برداشت نہ کرسکا، اُس کے اندر کی جلن زور پکڑ گئی، اُس نے اپنے کسی آدمی سے کہہ کر وہ شعر پڑھوانے شروع کردیئے جو آپس میں اختلافات کے دور میں انہوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں کہے تھے، اور شعر وشاعری تو عرب میں آپ جانتے ہیں کہ عروج پر تھی، اور وہ لوگ زبانی طعنوں کو تلوار سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے، اوس نے جو خزرج کو ذلیل کرنے کے لئے شعر کہے اور اپنی مفاخرت قائم کی، اور اُدھر خزرج والوں نے جو اوس کے خلاف شعر کہے اور اپنی مفاخرت اُن کے مقابلے میں قائم کی اور اُن کی توہین وتذلیل کی، جس وقت یہ شعر اُس مجلس میں کسی نے پڑھنے شروع کیے تو پرانی باتیں یاد آگئیں اور اِسی سے آپس میں ''تُوتُو میں میں'' تک نوبت پہنچ گئی، جیسے دو آدمیوں کے درمیان اگر پُرانی لڑائی ہو، لڑائی کے دوران ایک دوسرے کے خلاف انسان بہت کچھ کہہ لیتا ہے، جس میں کچھ صحیح باتیں بھی ہوتی ہیں، کچھ غلط بھی ہوتی ہیں، اور پھر بعد میں اگر اتفاق ہوجائے، اور اتفاق کے بعد پُرانی باتیں بھلادی جائیں پھر تو اُس اتفاق کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے، کہ پُرانی باتوں کو یاد ہی نہ کیا جائے کہ تُو نے یہ کہا تھا اور میں نے یہ کہا تھا، تُو نے یہ کیا تھا اور میں نے یہ کیا تھا، اِن باتوں کا تذکرہ نہ کیا جائے پھر تو اتفاق بحال رہتا ہے، ورنہ اکثر وبیشتر ایسے ہوتا ہے کہ اگر پُرانی باتوں کو اکھیڑنا شروع کردیا جائے تو چاہے اب دونوں کی آپس میں محبت ہوگئی لیکن پھر بھی کسی مجلس میں اگر یہ قصہ چھڑ گیا کہ دیکھو! فلاں وقت تُو نے میرے ساتھ یوں کیا تھا اور میں نے تیرے ساتھ یوں کیا تھا، وہ کہے کہ تُو نے یوں کیا تھا اور میں نے یوں کیا تھا، تو لازماً اُس مجلس میں تلخی آجایا کرتی ہے، تو پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ بھائی! اِن باتوں کو دبادو، مُردوں کو نہ اکھیڑو، جو دفن ہوگئے اُن کو دفن ہی رہنے دو، اب اِن کو اکھیڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، اگر اُن باتوں کو بُھلادو گے اور اپنے ذہن سے فراموش کردو گے تو آپس میں اتفاق بحال رہ جائے گا، ورنہ اگر اُن باتوں کا آپس میں تذکرہ کرو گے یا تیسرا آدمی اُن باتوں کو چھیڑنا شروع کردے گا کہ دیکھ! فلاں وقت اِس نے تجھے یوں کہا تھا، کتنی غلط بات کہی، اور فلاں وقت تُو نے اس کو یوں کہا تھا، دیکھو! کیسی بات کہی تھی، یوں تیسرا آدمی اگر اس قسم کی باتوں کو اُچھالنا شروع کردے گا تو بسا اوقات جذبات کنٹرول میں نہیں رہتے اور فریقین کے اندر دوبارہ وہی بدمزگی ہوجایا کرتی ہے۔ اُس یہودی نے اِسی انسانی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا کہ پُرانے شعر جو ایک دوسرے کے خلاف کہے ہوئے تھے، ایک دوسرے پر طنز تھا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں مفاخرت تھی، جب وہ شعر پڑھنے شروع کیے تو عرب کا گرم خون جوش میں آیا، ''تُوتُو میں میں'' تک نوبت پہنچی، اور دوبارہ پھر ایک دوسرے کے خلاف بہادری دکھانے کے لئے لڑائی کے لئے آمادہ ہوگئے، حتیٰ کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ تاریخ بھی متعین کرلی کہ فلاں دن پھر مقابلہ ہوگا، دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، جس وقت یہ شور ہوا اور

(۱) عمدۃ القاری، مظہری اور آلوسی میں شماس بن قیس لکھا ہے۔ لیکن باقی تمام کتب تفسیر اور کتب سیرت میں شاس بن قیس نام لکھا ہے بغیر میم کے۔ واللہ اعلم

آپس میں بات بڑھی، سرورِ کائنات ﷺ کو پتہ چلا تو آپ اپنے ساتھ مہاجرین کی ایک جماعت لے کر وہاں پہنچے، اور اُن کو کچھ ملامت کی اور انہیں سمجھایا (مظہری وغیرہ) کہ تمہیں کیا ہوگیا، یہ یہود تو تمہیں لڑانا چاہتے ہیں، اِن کی سازشوں کو تم سمجھتے نہیں؟ اور ان کی سازشوں کی بنا پر پہلے تم نے کس طرح بربادی اور تباہی دیکھی ہے، ابھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں؟ اگر تم ان کی باتیں مانو گے اور ان کی باتوں میں آ ؤ گے تو یہ تو دوبارہ تمہیں پھر کافر بنادیں گے، یعنی ایمان سے ہی نکال دیں گے یا یہ ہے کہ عملاً کافر بنادیں گے کہ آپس میں لڑنے لگ جاؤ گے، کیونکہ آپس میں لڑنا عملی کُفر ہے جیسے صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ''سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فِسْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ''(۱) مؤمنوں کا آپس میں گالی دینا فسق ہے، اور آپس میں لڑنا کُفر ہے۔ اسی طرح سرورِ کائنات ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا اُس میں خاص طور پر اس بات پر متنبہ کیا تھا کہ ''لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ كُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ''(۲) میرے بعد کہیں پھر کافر نہ ہو جائیو، کافروں جیسی حرکتیں نہ کرنے لگ جائیو، کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگ جاؤ، وہاں بھی یہی مطلب ہے کہ میرے بعد کہیں لوٹ کر تم پھر کافروں والا کردار نہ ادا کرنا، کہ تم ایک دوسرے کی گردن مارنے لگ جاؤ۔ تو اگر وہ اسلام سے ہی تمہیں نکالنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ کُفرِ حقیقی ہے، اور اگر اِن کی باتوں میں آ کر تم آپس میں لڑ پڑے تو یہ کافرانہ کردار ہے۔ مؤمن کا کام ہے ایک دوسرے سے محبت کرنا، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (سورۂ حجرات: ۱۰) اِن کی تو آپس میں ایمانی رشتے کے ساتھ محبت ہونی چاہیے، آپس میں لڑنا ایمانی بات نہیں ہے، یہ تو کافرانہ کردار ہے۔ تو حضور ﷺ نے ملامت کی اور پھر یہ کہا کہ ابھی اللہ کی آیتیں تمہارے اُوپر اتر رہی ہیں، قرآن تمہارے درمیان پڑھا جا رہا ہے، اللہ کا رسول تمہارے اندر موجود ہے، پھر بھی تم ایسی حرکتیں کرنے لگ گئے؟ کتنے تعجب کی بات ہے کہ تم اس قسم کی باتوں میں آگئے اور آپس میں لڑنے کے لئے تیار ہوگئے اور کُفر کی طرف جانے لگ گئے، جب اس طرح سے ملامت کی تو اوس اور خزرج کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے، وہیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روئے اور ایک دوسرے سے معذرت کی، اور اِس طرح سے یہود کی سازش ناکام کر دی گئی، اور اوس اور خزرج کی آپس میں محبت بحال رہ گئی (مظہری وغیرہ)۔

''قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ...اِلخ'' کی دو تفسیریں

تو یہ آیات اِسی سلسلے کے اندر نازل ہوئیں، پچھلی جو آیتیں کل آپ کے سامنے آئی تھیں قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللهِ، بعض مفسرین کے مطابق تو اِس شانِ نزول کے تحت آیات یہاں سے شروع ہوئی ہیں کہ پہلے اہلِ کتاب کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم باز نہیں آتے؟ باوجود اہلِ کتاب ہونے کے اور سب کچھ جاننے کے اور حق کے گواہ ہونے کے پھر تم لوگوں کے اندر کُفر پھیلاتے ہو؟ اور اس طرح سے لوگوں کو بُرے راستے کی طرف لے جاتے ہو، صحیح راستے کے اندر کجیاں پیدا کرتے ہو؟ پہلے اُن کو سرزنش کی گئی ہے، اور بعد میں مؤمنین کو خطاب کر کے اگلی ہدایات دی گئی ہیں۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا سے آیات اس واقعہ

(۱) مسند احمد، رقم ۴۱۷۸۔ نیز بخاری ص ۱۲ وغیرہ پر الفاظ یوں ہیں: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ

(۲) بخاری ج ۱ ص ۲۳ باب الانصات للعلماء۔ مشکوۃ ج ۲ ص ۳۰۷، عن جریر ؓ۔ باب قتل اهل الردة۔

کے متعلق اُتری ہوں، اور پچھلی آیات پچھلے مضمون سے تعلق رکھتی ہوں، جس طرح کل میں نے آپ کے سامنے تقریر کردی تھی کہ بیت اللہ کے متعلق واضح آیات اور اُس کا مرکزِ ہدایت ہونا ان کو معلوم ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کی اِن آیات کا انکار کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے پیچھے جوڑنا چاہیں تو پیچھے بھی مضمون جڑتا ہے، اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

مؤمنین کو یہود سے ہوشیار رہنے کی نصیحت اور تنبیہ

تو یہ مؤمنین کو نصیحت ہے کہ اگر اہلِ کتاب میں سے تم ایک گروہ کا کہنا مانو گے (دیکھو! قرآنِ کریم جس وقت اہلِ کتاب پر تنقید کرتا ہے تو انصاف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، ہر یہودی یا ہر عیسائی کے جذبات ایسے نہیں تھے، بعض اُن میں منصف مزاج بھی تھے، جو آہستہ آہستہ اسلام کے قریب آگئے اور مسلمان ہوگئے، شرارتی عنصر اُن میں سے کچھ تھا جس کا مصداق فَرِیْقًا کے اندر بیان کردیا گیا، جو اس قسم کے شرارتیں پھیلاتے تھے اُن کو فریق کے ساتھ تعبیر کیا ہے، ہر ہر فرد کے اوپر یہ انکار نہیں کیا) اگر اہلِ کتاب میں سے تم ایک فریق کا کہنا مانو گے یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ: تو یہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد دوبارہ کافر بنادیں گے، لوٹا کے پھر تمہیں کُفر کی طرف لے جائیں گے، اگر تو عقائد کے بارے میں کہنا مان لیا تو حقیقتاً کُفر ہے، اور اگر عقائد کی بجائے دوسری باتوں میں کہنا مان لیا تو پھر وہ کُفر والے دور کی طرف تمہیں دوبارہ لے جائیں گے، جس طرح کافر ہونے کے زمانے میں تم آپس میں لڑتے تھے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے تھے پھر وہی دور آجائے گا۔

''اور تم کافر کیسے ہوسکتے ہو؟'' یہ تعجب کی بات ہے، ''تم کُفر کیسے کرو گے حالانکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیات اترتی ہیں تمہیں راہنمائی کرتی ہیں، ہدایت دیتی ہیں۔ ''اللہ کی آیات پڑھی جارہی ہیں اور تمہارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے'' یہ دو چیزیں تو ایسی ہیں جو تمہیں کُفر سے بچانے والی اور ایمان پر ثابت قدم رکھنے والی ہیں، تو اتنے بڑے داعیوں کی موجودگی میں تم کُفر کیسے کرو گے؟ یعنی اگر اِن کی موجودگی میں کُفر کرو گے تو اِس کا مطلب تو یہ ہے کہ روزِ روشن میں تم اندھا پن اختیار کررہے ہو، جبکہ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے، نُور ہی نُور ہے، کسی قسم کا خفاء نہیں، اللہ کی کتاب اتر رہی ہے، اللہ کی آیات اُتر رہی ہیں، تمہیں سمجھانے کے لئے اللہ کا رسول موجود ہے، تو ایسے وقت میں تمہارا کُفر کرنا بڑے تعجب کی بات ہے!

''وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ'' کا مصداق موجودہ دور میں

وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ کا لفظ اُس موقع کے متعلق ہے جب حقیقتاً سرورِ کائنات ﷺ ظاہری دنیا میں موجود تھے، تو یہ لفظ اُس واقعہ پر بالکل صادق آتے ہیں کہ اللہ کی آیات پڑھی جارہی تھیں اور اللہ کا رسول وہاں موجود تھا، اور اب جس وقت ہم مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کریں گے تو پھر بھی یہی بات ہوگی كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ، اب تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ میں تو کوئی اشتباہ کی بات نہیں ہے، کہ اللہ کی آیات تو پڑھی جاتی ہیں، قرآنِ کریم کی آیات پڑھ کر نصیحت کی جاتی ہے، وعظ کیا جاتا ہے، اور وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ بھی صادق آتا ہے، کہ رسول اپنے رسول ہونے کی حیثیت سے اب بھی ہمارے اندر موجود ہیں، کیونکہ وہ موجود

ہوتے تو اُن کی زبان سے باتیں ہمارے سامنے آجاتیں، اب اگرچہ وہ ظاہراً موجود نہیں لیکن اُن کی ایک ایک نصیحت اور ایک ایک بات ہمارے اندر موجود ہے، اب اِن لکھی ہوئی باتوں کو جو حدیث شریف میں آگئیں، اِن کو ماننا ایسے ہی ہے جیسے رسول کی ہدایت کو مانا جارہا ہے، زندگی میں بھی یہی ہدایات دیتے تھے جو اِس وقت ہدایات موجود ہیں، اس وقت اگر بظاہر بذاتِ خود سرورِ کائنات ﷺ موجود نہیں ہیں تو اُن کی تعلیم موجود ہے، جب اُن کی تعلیم اور اُن کی ہدایات موجود ہیں تو ایسے سمجھو جیسے خود ہی موجود ہیں، وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کا اب اگر ہم وعظ کہیں گے تو اِس انداز سے کہیں گے، کہ تمہارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے یعنی اُن کی تعلیمات، اُن کا طرز وطریق، ان کی سُنن، اُن کی ہدایات ساری کی ساری ہمارے پاس محفوظ ہیں تو یوں سمجھو کہ اللہ کا رسول ہمارے پاس موجود ہے، اور ان کی ہدایات کی ہمیں پابندی کرنی چاہیے، اور اِن کافروں کی سازشوں سے ہمیں بچنا چاہیے، اب بات اِس انداز سے ہوگی، تو اب بھی ہم کہہ سکتے ہیں وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ، کہ اللہ کی آیات پڑھی جارہی ہیں اور اللہ کا رسول تمہارے اندر موجود ہے۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ: اور جو کوئی اللہ کو مضبوطی سے تھام لے گا، اِعْتِصَام۔ اصل میں عَصَمَ يَعْصِمُ سے ہے بمعنی بچانا، جیسے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (سورۂ ہود: ۴۳) آج اللہ کے حکم یعنی اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔ اور اِعْتَصَمَ کا معنی ہے بچنا، اور بچنے کا مفہوم اس طرح ہوتا ہے کہ جیسے ایک آدمی کا پاؤں پھسلنے لگا ہے اور کوئی رسّی لٹک رہی ہے، آپ اُس کو مضبوطی سے پکڑ لیں گے تو یہ مضبوطی سے پکڑنا گرنے سے بچنے کا ذریعہ ہے، کہ جو آدمی اِس قسم کی لٹکی ہوئی رسی کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے تو وہ گرتا نہیں ہے، اور اللہ کو مضبوط تھامنے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کی تعلیم کو، اس کی ہدایت کو، اس کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنا، جیسے کہ آگے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ میں حَبل کا لفظ ظاہر کردیا گیا، تو یہاں بھی وہی مقصود ہے۔ اور پیچھے اِس کو عُروۂ وُثقیٰ کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (سورۂ بقرہ: ۲۵۶) ایسا مضبوط حلقہ اس نے تھام لیا جس کے لئے ٹوٹنا نہیں ہے، اُس حلقے سے بھی یہی مراد ہے، جیسے رسّی کے اندر حلقہ بنا ہوا ہو اور اس میں انسان ہاتھ ڈال لے، اور وہ مضبوط حلقہ ہے جو ٹوٹے گا نہیں، تو جو اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے تھام لے یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کو، اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو، اور اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لے، فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی وہی شخص کیا گیا ہے، ہدایت پر وہی سمجھا جائے گا جو اللہ کی ہدایات کو مضبوطی سے تھامتا ہے۔ یہاں تک تو اُن کے اِس آپس میں اختلاف کرنے پر اور آپس میں جھگڑا ڈالنے پر ملامت تھی۔

دُنیوی حاکم کے مقابلے میں خوفِ خدا کی بُنیاد مضبوط ہے

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جس طرح سے ڈرنے کا حق ہے''، کیا مطلب؟ کہ اللہ تعالیٰ کے جو آپ لوگوں پر حقوق ہیں اُن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گرفت کا اندیشہ ہے کہ اگر تم اُس کے احکام کے خلاف چلو گے تو اللہ تعالیٰ پکڑے گا اور عذاب دے گا اُس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرو۔ پھر ایک ہے دُنیا کی حکومتوں اور دُنیا کے حاکموں کے ساتھ اطاعت کا معاملہ اور اُن سے ڈرنے کی بات، اُس میں کمزوری

ہوتی ہے بایں معنی کہ ضروری نہیں کہ ہماری ہر حرکت کا اُن کو پتہ چل جائے، بلکہ بچنے اور چھپنے کی گنجائش ہوتی ہے، اس لئے حاکمِ وقت کا ڈر کمزور ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے متعلق جب یہ نظریہ ہے کہ ہمارا کوئی جرم اس سے چھپ نہیں سکتا تو ڈرنے کی بنیاد مضبوط ہوگی، تو اللہ سے ڈرو جس طرح سے ڈرنے کا حق ہے کہ خلوت وجلوت میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، دنیا کے حاکم سے خلوت اور جلوت میں فرق پڑ جاتا ہے صرف اس وجہ سے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم علی الاعلان کوئی نافرمانی کریں گے تو گرفت میں آجائیں گے، اگر ہم چھپ چھپا کر کریں گے تو کون پوچھتا ہے؟ اس لئے وہاں اطاعت کا جذبہ کمزور ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو کوئی چیز مخفی نہیں، اللہ ہر چیز جانتے ہیں، تو وہاں ڈرنے کی بنیاد زیادہ مضبوط ہے۔ پھر دُنیا کے حاکم سے ڈرنے میں ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ یہاں سے چھوٹنے کا امکان ہوتا ہے، کہ سفارش سے چھوٹ جاؤ گے، رشوت سے چھوٹ جاؤ گے، بھاگ جاؤ گے، کہیں چھپ جاؤ گے، اُن کی گرفت میں نہیں آؤ گے، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بات بھی نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا تو پھر کسی طرح چھوڑے گا نہیں، اور کہیں بھاگ کر، یا کہیں چھپ کر تم اُس سے چھوٹ نہیں سکتے۔ پھر دُنیا کے حاکم کی سزا کی ایک حد بھی ہے، کہ اگر وہ پکڑ بھی لے گا اور سزا دے گا تو آخر ایک حد ہے کہ اور کچھ نہیں ہوگا تو انسان مر ہی جائے گا اور چھوٹ جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی سزا کی کوئی حد نہیں ہے۔ تو یہ مضبوط بنیادیں ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا سب سے زیادہ ہونا چاہیے، کہ انسان اِتنا کسی سے نہ ڈرے جتنا اللہ سے ڈرتا ہے، اور اگر اس قسم کے مجازی حاکموں سے ڈر کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اختیار کی جائے تو یہ اس وجہ سے حماقت ہے کہ ایک مضبوط ترین حاکم جو اِس دُنیوی حاکم پر بھی حاکم ہے اُس کا تو انسان نافرمان ہو جائے اور ایک کمزور کی پناہ میں آجائے، ایسا نہیں ہونا چاہیے، دُنیا کی کوئی قوت اور طاقت انسان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھیر نہ سکے، حَقَّ تُقٰتِہٖ یہ ہے، اللہ سے اُس طرح ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔

تقویٰ کا حق کب ادا ہوگا؟

دوسری جگہ ایک آیت آئے گی جس میں یہ لفظ ہوگا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (سورۂ تغابن: ۱۶) اللہ سے ڈرو جتنی تم میں طاقت ہے، اپنی طاقت کے مطابق ڈر۔ کیا مطلب؟ کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے میں اپنی پوری قوت اور طاقت صَرف کر دو، تمہاری طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، پوری قوت اور طاقت صرف کر کے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور جس وقت تم اپنی طرف سے پوری قوت اور طاقت صرف کر لو گے تو اللہ کے تقوے کا حق تمہاری طرف سے ادا ہو گیا، اس لئے دونوں لفظوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، کہ اللہ سے اُس طرح ڈرو جس طرح سے اللہ کا حق ہے کہ اُس سے ڈرا جائے، اور دوسری جگہ آگیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اپنی طاقت کے مطابق، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تقوے میں، اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں اپنی پوری استطاعت کو صرف کرو، جتنا تمہارے اندر اختیار اور قوت ہے ساری اللہ تعالیٰ کے احکام کے اندر صرف کرو، جب آپ اپنی قوت اور طاقت کے مطابق اللہ کا تقویٰ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے تقوے کا حق جو آپ کے ذمے تھا وہ ادا ہو گیا، اس لئے دونوں باتوں کے درمیان کوئی کسی قسم کا تعارض نہیں ہوگا۔ اور حَقَّ تُقٰتِہٖ کا مفہوم ادا کرتے ہوئے تفسیروں میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ حَقَّ تُقٰتِہٖ یہ ہے کہ اَن

يُطَاعَ فَلَا يُعْصٰى کہ اُس کی اطاعت کی جائے اور اُس کی نافرمانی نہ کی جائے، وَاَنْ يُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى اُس کو یاد رکھا جائے اور اس کو بھلایا نہ جائے، وَاَنْ يُشْكَرَ فَلَا يُكْفَرَ۔[1] اُس کی شکر گزاری کی جائے اور اُس کے ساتھ ناشکری کا معاملہ نہ کیا جائے، یہ محض ادا کرنے کے لئے عنوانات ہیں، ورنہ اصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار ہر وقت رہے اور اپنی طاقت اور قوت کے مطابق اللہ کے احکام کی اطاعت ہو، کبھی اُس کی نافرمانی نہ ہو۔ اور اُس کی نعمتوں اور احسانات کو یاد رکھ کر اور اُس کی عظمت کو دل میں محسوس کرتے ہوئے اُس کی نافرمانی سے ڈرو، اُس کی یادداشت رہے، نسیان نہ ہو، شکر گزاری ہو، کُفران نہ ہو، اور اُس کی اطاعت ہو، عصیان نہ اختیار کیا جائے، یہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کے سمجھانے کے لئے مختلف الفاظ ہیں۔ تو اِس میں عقائد کے اعتبار سے ڈرنا بھی آجائے گا، اعمال کے اعتبار سے ڈرنا بھی آجائے گا، خیالات وجذبات کے اعتبار سے ڈرنا بھی آجائے گا تو یہ تقویٰ پورے کا پورا انسان کے ظاہر و باطن پر محیط ہو جائے گا۔

ہر لمحہ موت کا خیال رہے تو اِنسان گناہ سے بچ سکتا ہے

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: اِس میں بظاہر نہی موت پر آئی ہوئی ہے کہ تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو، مطلب اِس کا یہ ہے کہ موت جب بھی تمہیں آئے فرمانبرداری کی حالت میں آئے، دوسری طرح سے اِس مفہوم کو ہم یوں ادا کر سکتے ہیں کہ یہ تمہاری فرمانبرداری موت تک جاری رہنی چاہیے، یہ نہیں کہ وقتی طور پر تو کبھی فرمانبرداری اختیار کر لی اور بعد میں نافرمان ہو گئے، اور اگر نافرمانی کی حالت میں موت آگئی تو تمہیں موت اسلام کی حالت میں نہ آئی، ہر لمحہ ہر لحظہ اسلام کے پابند رہو اور فرمانبردار رہو تا کہ جب بھی تمہیں موت آئے تو اسی حال میں آئے، یہ بھی ایک خوف پیدا کرنے والی بات ہے، چونکہ موت کا وقت ہمارے علم کے اعتبار سے کوئی متعین نہیں، اس لئے اگر کبھی انسان کا کسی معصیت کی طرف رُجحان ہو تو شیطان یہ چکما دے گا کہ کوئی بات نہیں، اس طرح سے کر لیتے ہیں، بعد میں توبہ کر لیں گے، ایسا خیال بھی انسان کے دل میں آتا ہے کہ کوئی بات نہیں، یہ معصیت ہو جائے گی، گناہ ہو جائے گا، تو اُس کے بعد توبہ کر لیں گے، لیکن اگر یہ بات انسان کے ذہن میں رہے کہ موت کا وقت تو متعین کوئی نہیں، تمہارے پاس کون سا کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرٹیفکیٹ آیا ہوا ہے کہ تم نے اتنے دن زندہ رہنا ہے، پھر توبہ کی مہلت بھی ملے گی، جب تم اِس معصیت میں مبتلا ہو گے اگر اُسی وقت ہی موت آگئی تو تمہاری یہ موت اسلام پر نہیں ہے، اس لئے یہ خیال اپنے دل میں رکھو، جب بھی کسی گناہ کی طرف رُجحان پیدا ہو تو یہ سوچو کہ شاید یہی آخری عمل نہ ہو، اور اگر یہی آخری عمل ہو گیا تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری موت اسلام پر نہیں آئی۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے[2] سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی ساری زندگی نیکیاں کرتا رہتا ہے اور جنّت کے اتنا قریب چلا جاتا ہے کہ جیسے ایک ذراع کا فاصلہ رہ گیا، کہ مرے گا اور جنّت میں جائے گا، پھر انسان کسی معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور موت معصیت پر آجاتی ہے، اور آخری عمل معصیت کا وہی انسان کو جہنم

---

(۱) الزهد والرقائق لابن المبارك ج ۱ ص ۸ / مصنف ابن ابی شیبة ج ۷ ص ۱۰۶ / السنن الکبریٰ للنسائی ج ۱۰ ص ۴۰۴ / نیز جلالین وابن کثیر وغیرہ۔

(۲) بخاری ۱/ ۴۵۶ باب ذکر الملائکہ۔ نیز ۲/ ۹۷۶-۲/ ۹۷۶ / مشکوٰۃ ص ۲۰ باب الایمان بالقدر۔ فصل اول۔ عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

میں لے جانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔تو اگر انسان کے ذہن میں یہ خیال موجود رہے کہ جب موت کا وقت کوئی متعین نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہ عمل میرا آخری عمل ہو، اور اگر اِس پر موت آگئی تو یہ موت اسلام پر نہیں ہوگی، اور اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اِس عمل کی وجہ سے میں جہنم میں چلا جاؤں گا، تو یہ خیال انسان کو بہت سارے گناہوں سے روکنے کا باعث بن جاتا ہے۔بس غفلت ہے جو اصل میں انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے، اور اگر اس قسم کی یادداشت انسان کے دماغ میں باقی رہے تو انسان گناہ سے بچتا ہے۔اس لیے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرو۔پہلی تو بنیادی بات یہ ہوگئی۔

''اللہ کی رَسّی'' کا مصداق

اور دوسری بات یہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا: اللہ تعالیٰ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو سارے مل کر، ''اللہ کی رسّی'' سے مراد قرآنِ کریم ہے، قرآنِ کریم کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے: حَبْلُ اللهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ یہ اللہ کی رسّی ہے جو آسمان سے زمین کی طرف لٹکائی گئی ہے،(۱) اِس کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم ہے۔اور حبل کا مصداق عہد بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے عہد کو مضبوطی سے تھام لو، اور اللہ کی کتابیں چونکہ اللہ کے ساتھ عہد کا ذریعہ ہیں کہ بندوں کا عہد اللہ تعالیٰ کے ساتھ انہی کتابوں کے ذریعے سے ہوتا ہے، اس لیے ''حبل اللہ'' کا مصداق اللہ کی کتاب ہوسکتی ہے۔

اتفاق کی مضبوط بُنیاد صرف ایک ہے

اس میں گویا اتفاق کی بنیاد مہیا کردی گئی، اتفاق اگر ہوسکتا ہے تو کس چیز پر ہوسکتا ہے؟ آج کل دنیا میں لوگ اپنی قوموں کو اور اپنے ملک کے باشندوں کو اتفاق کی دعوت دیتے ہیں، کس بات پر؟ کوئی سندھی اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ سندھی بولنے والے سب اکٹھے ہوجاؤ، کوئی پنجابی اٹھے اور کہے کہ پنجابی بولنے والے سب اکٹھے ہوجاؤ، جس کو لوگ لسانی وحدت سے تعبیر کرتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے اندر سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں، اگر لسانی وحدت کا نعرہ لگایا جائے تو یہ وحدت نہیں، اصل کے اعتبار سے ساری انسانی برادری کو سینکڑوں ٹکڑوں میں بانٹنے والی بات ہے، سرائیکی بولنے والے ایک طرف ہوجائیں، پنجابی بولنے والے ایک طرف ہوجائیں، اُردو بولنے ایک طرف ہوجائیں، پشتو بولنے والے ایک طرف ہوجائیں، سندھی ایک طرف ہوجائیں، تو یہ وحدت نہیں ہے، یہ تو پارہ پارہ کرنے والی بات ہے، اِس میں بیسیوں ٹکڑے بنتے ہیں۔اور پھر یہ بنیاد ایسی ہے جو اختیاری نہیں، اب ہمارے بس میں نہیں تھا کہ ہم سندھ میں پیدا ہوجاتے اور ہم بھی سندھی بولتے، نہ ہمارے بس میں یہ تھا کہ ہم ریاست بہاولپور میں پیدا ہوجاتے اور سرائیکی بولتے، جس علاقے میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کردیا وہی زبان ہے، تو ایک غیر اختیاری چیز کو بنیاد بنا کر اتفاق کی دعوت کس طرح سے دی جاسکتی ہے؟ اسی طرح وطن کو بنیاد بنا کر اگر کوئی شخص اتفاق کی دعوت دیتا ہے تو یہ بھی اتفاق نہیں، حقیقت کے اعتبار سے انتشار ہے، کوئی کہے کہ ہندی ایک ہوجائیں، پاکستانی ایک ہوجائیں، تو اس قسم کا جو نعرہ ہوگا وہ ہر ملک کو

---

(۱) روح المعانی وابن کثیر بحوالہ طبری/ نیز دیکھیں ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹ باب مناقب اهل البیت / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۹ باب مناقب اهل بیت النبی.

علیحدہ علیحدہ کردے گا، اور آپس میں انسانی برادری کا اتفاق کبھی نہیں ہوسکتا۔ یا جس طرح سے گورے اور کالے ہیں، کہ گورے گورے ہونے کی بناء پر آپس میں اتفاق پیدا کریں، اور کالے کالے ہونے کی بناء پر آپس میں اتفاق پیدا کریں، جیسا کہ افریقہ میں گوروں اور کالوں کا اختلاف آپس میں چل رہا ہے، اور اسی طرح امریکہ میں اختلاف ہے، کہ گورے اور کالے یہ دو برادریاں ہیں، اور اِن کی آپس میں جنگیں ہوتی ہیں اور آپس میں اختلافات ہوتے ہیں، اتنا آپس میں اختلاف ہے کہ گوروں کے بیت الخلا علیحدہ اور کالوں کے علیحدہ، اُن کے فٹ پاتھ علیحدہ اور اُن کے علیحدہ، اُن کے بچوں کے سکول علیحدہ اور اُن کے علیحدہ، دونوں مل کر ایک جگہ رہ ہی نہیں سکتے، یہ جتنی بھی بنیادیں ہیں، خواہ وطنی بنیاد ہو، لسانی بنیاد ہو، رنگ کی بنیاد ہو، یہ غیر اختیاری چیزیں ہیں، اِن کے اوپر کبھی انسانیت کو اکٹھا نہیں کیا جاسکتا، اِس میں وحدت نہیں ہے انتشار ہے، اور جو لوگ اِس کو وحدت کی بنیاد بناتے ہیں اصل کے اعتبار سے وہ انسانی برادری کو سینکڑوں ٹکڑوں میں بانٹتے ہیں۔ وحدت کی بنیاد اگر بن سکتی ہے تو اللہ کی تعلیم اور اللہ کے بیان کردہ اُصول بن سکتے ہیں، اِس سے انسانوں کے اندر صرف دو گروہ بنیں گے، ماننے والے اور نہ ماننے والے، خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (سورۂ تغابن: ۲)، دو پارٹیاں بنیں گی۔ اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے بیان کردہ اُصول ایسے ہوں گے، (چونکہ وہ خالق الکل ہے، اُس کے اندر نہ کسی پارٹی کی حمایت ہے نہ کسی کی مخالفت ہے، نہ خود غرضی ہے نہ کوئی دوسری بات ہے) وہ اُصول ایسے ہوں گے جو اِنسانی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں، انسان کے فائدے کے ہیں، اور یہ بات بھی دماغ میں نہیں آسکتی کہ ہم فلاں کی بات کیوں مانیں؟ فلاں کی کیوں مانیں؟ جب نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی تو ہر کسی کے لئے ماننا بھی آسان ہوگا۔ اس لیے اگر اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اُصولوں پر آپس میں اکٹھے ہوجائیں تو اس سے ایک وحدت قائم ہوسکتی ہے، جس میں پھر یہ بات بھی نہیں ہوگی کہ کوئی اپنی پستی محسوس کرے یا کوئی اپنی بلندی محسوس کرے، لہٰذا اللہ کی تعلیم کو بنیاد بنایا جائے تو یہ اتفاق کی ایک مضبوط بنیاد ہے۔

اللہ کی ظاہری وباطنی نعمتوں کی یاددہانی اور اس کا مقصد

وَلَا تَفَرَّقُوْا: اور آپس میں جدا جدا نہ ہوؤ، فرقے فرقے نہ بنو، آپس میں انتشار نہ پھیلاؤ، وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اور اللہ کے احسان کو یاد کرو جو تم پر ہے اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً: جب تم آپس میں دشمن تھے، اور وہ آپس میں دشمنی اور عداوت کا تازہ تازہ مزہ چکھے ہوئے تھے، فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ: یہ اللہ نے احسان کیا کہ تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی، آپس میں عداوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پھٹکار اور لعنت ہے، دُنیا کے اندر زندگی کو جہنم بنانے والی چیز ہے، اور آپس کی اُلفت دُنیا کے اندر ہی زندگی کو جنت بنانے والی چیز ہے، تو تمہاری عداوت ختم ہوئی، آپس میں اللہ تعالیٰ نے اُلفت پیدا کردی، فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا: تو آپس میں اعداء ہونے کے بعد اللہ کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے، کتنا خوشگوار ماحول تمہارے اندر پیدا ہوگیا۔ یہ تو ایک حسی فائدہ ہوا۔ دُوسرا یہ کہ تم کُفر میں مبتلا تھے، شرک میں مبتلا تھے، جہنم کے کنارے پر کھڑے تھے، کنارے پر کھڑے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ ابھی مرے اور جہنم میں گئے، تمہارا یہ حال تھا، فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس جہنم سے چھٹکارا دیا، کہ اللہ کا رسول آیا، اُس نے تمہیں کُفر سے بچایا اور ایمان کے راستے پر لگایا، تو تم جہنم سے چھوٹ گئے، یہ بھی اللہ کا احسان ہے، اس کو یاد کرو، اور اب اِن

نعمتوں کی بے قدری نہ کرو، کہ بھائی بننے کے بعد دوبارہ دشمن بن جاؤ، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آ جانے کے بعد پھر تم کُفر کی طرف جاؤ تا کہ پھر جہنم میں گرو، یوں اللہ تعالیٰ کے احسان کی نا قدری نہ کرو، بلکہ اللہ کا احسان یاد کرو اور اس کی قدر کرو، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ: اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تا کہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو دعوت دیتی رہے خیر کی طرف، اور معروف کا حکم کرتے رہیں اور روکتے رہیں منکر سے،

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا

یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۱۰۴﴾ اور نہ ہو تم اُن لوگوں کی طرح جو فرقہ فرقہ ہو گئے، اور اختلاف کیا انہوں نے بعد اس کے کہ

جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ

اُن کے پاس واضح دلائل آ گئے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۱۰۵﴾ جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور

تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۚ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ

کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، پھر وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے (انہیں کہا جائے گا) کیا تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد؟

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ

پس چکھو تم عذاب بسبب اس کے کہ تم کفر کرتے تھے ﴿۱۰۶﴾ لیکن وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہو جائیں گے

فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا

پس وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۱۰۷﴾ یہ اللہ کی آیات ہیں، پڑھتے ہیں ہم ان کو

عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ

آپ پر ٹھیک ٹھیک، اور اللہ تعالیٰ عالمین پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ﴿۱۰۸﴾ اور اللہ ہی کے لئے ہے

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور تمام امور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے ﴿۱۰۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ: تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو دعوت دیتی رہے خیر کی طرف، بلاتی رہے خیر کی طرف، یَدۡعُوۡنَ جمع مذکر کا صیغہ آگیا امت کے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے، وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: اور معروف کا حکم کرتے رہیں، وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ: اور منکر سے روکتے رہیں، وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ: اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والے ہیں، مراد پانے والے ہیں، وَلَا تَکُوۡنُوۡا: اور نہ ہو تم، کَالَّذِیۡنَ تَفَرَّقُوۡا: ان لوگوں کی طرح جو فرقہ فرقہ ہوگئے، وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡبَیِّنٰتُ: اور اختلاف کیا انہوں نے بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آگئے، وَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ: اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔ یَّوۡمَ تَبۡیَضُّ وُجُوۡہٌ: اِبۡیَضَّ بیاض سے لیا گیا ہے، بیاض سفیدی کو کہتے ہیں، اور ابۡیَضَّ: سفید ہونا، جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے، یعنی روشن ہوں گے، نورانی ہوں گے، وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡہٌ: اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ: پھر وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہوجائیں گے، یُقَالُ لَہُمۡ اَکَفَرۡتُمۡ: انہیں کہا جائے گا کیا تم نے کفر کیا، بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ: اپنے ایمان کے بعد، یہ استفہام بطور ڈانٹ کے ہے، اور اس سے پہلے یُقَالُ لَہُمۡ کا لفظ مقدر ہے، انہیں کہا جائے گا یعنی یہ ڈانٹ پڑے گی کہ کیا تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد؟ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ: پس چکھو تم عذاب بسبب اس کے کہ تم کفر کرتے تھے، وَاَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ: لیکن وہ لوگ جن کے چہرے پر رونق ہوجائیں گے، سفید ہوجائیں گے، نورانی ہوجائیں گے، فَفِیۡ رَحۡمَۃِ اللّٰہِ: پس وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ: یہ اللہ کی باتیں ہیں، اللہ کی آیات ہیں، پڑھتے ہیں ہم ان کو آپ پر ٹھیک ٹھیک، یعنی یہ سب باتیں واقع کے مطابق ہیں، حق کا معنی یہی ہوتا ہے واقع کے مطابق، یہ جو آیات آپ پر پڑھی جارہی ہیں سب واقع کے مطابق ہیں، حق ہیں، سچ ہیں، وَمَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ: اور اللہ تعالیٰ جہانوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا، وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ: اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ: اور تمام امور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں اعتصام بحبل اللہ کی تاکید کی گئی تھی اور تفرُّق سے نہی ذکر کی گئی تھی، کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، جس کا حاصل یہ تھا کہ تقویٰ اور اتفاق یہ دو چیزیں مسلمانوں کے اندر موجود ہونی چاہئیں، اور آپس میں عداوت اور دشمنیوں کی وجہ سے جو نقصان اٹھا چکے تھے اُس کی طرف متوجہ کیا تھا، اور آپس میں اخوت اور برادری قائم ہوجانے

کی وجہ سے جو برکات حاصل ہو رہی تھیں اور جو سکون اور اطمینان حاصل ہوا تھا اُس کی یاددہانی کرائی تھی، اور دشمنوں کی طرف سے ریشہ دوانیاں اور خفیہ سازشیں مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لئے ہوتی رہتی ہیں، اِس کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ اب اس آیت میں جماعتی طور پر یہ تاکید کی گئی ہے کہ ایک طبقہ ایسا ضرور موجود رہنا چاہیے، کچھ افراد ایسے ضرور موجود ہوں جو اہل ایمان کو خیر کی دعوت دیتے رہیں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں، مسلمانوں کو بھی کریں، اور غیر مسلموں میں اس دین کی اشاعت کا ذریعہ بھی بنیں، دعوت الی الخیر عام ہے، مسلمانوں کو بھی دعوت الی الخیر ہے، کہ جہاں دیکھا کہ حبل اللہ چھوٹنے لگی اور اللہ کے بتائے ہوئے اُصولوں کی مخالفت ہو رہی ہے تو اُن کو یاددہانی کرائیں، کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ کے بیان کیے ہوئے اصولوں پر پابند رہو، تو اُنہیں بھی یاددہانی کرائیں، اور اسی طرح غیر مسلموں کو بھی دعوت دیں، جماعتی طور پر یہ سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ کچھ افراد اس قسم کے موجود ہوں۔

قرآن وسُنّت ''خیر'' کا مصداق ہیں

اس آیت میں جو ''خیر'' کا لفظ استعمال کیا گیا یہ بہت جامع لفظ ہے، خیر کا معنی ہے بھلائی، تو خیر کی طرف دعوت دیں، یعنی اچھی حالت اور بھلائی کی طرف دعوت دیں، اور تفاسیر میں سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ''اَلْخَیْرُ اِتِّبَاعُ الْقُرْاٰنِ وَسُنَّتِیْ'' (مظہری وغیرہ) خیر کا مصداق قرآن اور میری سُنّت کا اتباع ہے، یعنی وہ لوگوں کو دعوت دیتے رہیں کہ قرآنِ کریم کی اتباع کرو، اور لوگوں کو دعوت دیں کہ سرورِ کائنات ﷺ کے طریقے پر چلو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تین درجات

یہ تو ایک عمومی دعوت ہے اتباعِ قرآن وسُنّت، اور پھر آگے صراحت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے، اِس کے آگے درجات ہیں، معروف کا لفظی معنی ہے جانی پہچانی چیز، یعنی جو شریعت میں جانی پہچانی ہے کہ ایسا ہونا چاہیے، اور اسی طرح شرفاء کے عرف میں جو چیز جانی پہچانی ہوئی ہوتی ہے، شرافت کے معیار پر لوگ اُس کو اچھا سمجھتے ہیں وہ بھی معروف کا مصداق ہے، سوسائٹی میں بعض عادتیں اچھی سمجھی جاتی ہیں، وہ بھی درجہ بدرجہ اسی معروف کا مصداق ہوں گی، جن کو شرفاء کے طبقے میں جانا پہچانا ہوا قرار دیا جاتا ہے۔ امر بالمعروف کا مطلب یہ ہے کہ اُس معروف کا امر کریں، پھر اُس کے درجات حدیث شریف میں یہ ذکر کیے گئے ہیں کہ امر بالمعروف ہاتھ کے ساتھ بھی ہوتا ہے، ہاتھ کا مطلب یہ ہے کہ قوت اور طاقت کے ساتھ نیکی کو رائج کیا جائے، اور امر بالمعروف زبان کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کو سمجھایا بھی جائے اور بُرائی کرنے والوں کو زبان سے ٹوکا بھی جائے، اُن کی مذمت کی جائے، اُن کی برائی کی جائے، اُن کے اُوپر انکار کیا جائے، اور نیکی کا حکم زبانی طور پر دیا جائے، ترغیب دی جائے، اور اسی طرح دل کے ساتھ بھی ہوتا ہے، دل کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بُرائی آپ نے دیکھی، آپ کے سامنے ہے، آپ میں اتنی قوت اور طاقت بھی نہیں کہ آپ اپنے ہاتھ کے ساتھ جا کر اُس کو بند کر دیں اور مٹا دیں، اور یہ بھی آپ میں طاقت نہیں کہ آپ زبان سے کہہ سکیں، زبان سے کہہ سکنے کی طاقت نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ گونگے ہیں،

بول نہیں سکتے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان کے ساتھ آپ کے کہنے کے بعد آپ پر کوئی اِس قسم کی مصیبت آئے گی اور پریشانیاں آئیں گی اُن لوگوں کی طرف سے جن کے خلاف آپ اپنی زبان استعمال کریں گے، کہ اِس مصیبت کے دفاع پر آپ قادر نہیں اور اُس کا برداشت کرنا آپ کی قوت میں نہیں ہے، اُس وقت سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص کہنے پر قادر نہیں ہے، جب دوسری طرف سے اس قسم کی مصیبتوں کا اور تکلیفوں کا اندیشہ ہے جن کو انسان اپنے سے دور نہ رکھ سکے اور اُس مصیبت کو ٹال نہ سکے اور برداشت کرنے کی قوت نہ ہو، ایسی صورت میں انسان سمجھتا ہے کہ اب یہ کہنے پر قادر نہیں ہے، تو پھر اُس کے بعد دل کا درجہ ہے، کہ دل میں اُس کو بُرا جاننا اور دل سے اُس کی تغییر کی طرف متوجہ رہنا، دل کے اندر یہ جذبات ہوں کہ یا اللہ! کسی طرح یہ برائی مٹ جائے تو اچھا ہی ہے، کسی طرح یہ نیکی رائج ہوجائے تو اچھا ہی ہے، یہ دل کا جذبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تیسرے نمبر پر ہے، جیسے کوئی معروف مٹی ہوئی ہے اور آپ زبان نہیں کھول سکتے، اپنی قوت اور طاقت کے ساتھ اُس کو جاری نہیں کر سکتے، تو دل میں یہ خیال ہو کہ کوئی ذریعہ میسر آجائے کہ یہ نیکی جاری ہوجائے، دل میں ایک قسم کی تڑپ ہو، اور اُس نیکی کے جاری نہ ہونے کی وجہ سے دل صدمہ محسوس کرے، اور اسی طرح کوئی برائی دنیا کے اندر ہو رہی ہے اور آپ قوت اور طاقت کے ساتھ اُس کو نہیں مٹا سکتے، زبان کے ساتھ اس کے اوپر انکار نہیں کر سکتے، بول نہیں سکتے اُسی اندیشے کے تحت۔ تو دل کے اندر یہ تڑپ ہونی چاہیے کہ یا اللہ! کوئی سبب بنادے جس سے یہ برائی مٹ جائے، اور اُس کو دیکھ کر صدمہ محسوس کرے، دل دکھے، کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کو مٹا دیتا، لیکن کیا کروں میرے بس میں نہیں ہے، اس قسم کے جذبات قلب میں ہوں تو یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قلب کے ساتھ ہے، چنانچہ حدیث شریف میں اِس کے درجات بیان کرنے کے لئے جو لفظ استعمال کئے گئے ہیں وہ یہی ہیں "مَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ"۔[1] حدیث میں "جہاد" کا لفظ ہے، جو اِن کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے، جو اِن کے خلاف زبان سے جہاد کرے، جو اِن کے خلاف دل سے جہاد کرے، آپ جانتے ہیں کہ صرف نفرت کرنا جہاد نہیں کہلاتا، جہاد یہی ہے کہ اپنی قلبی قوتیں اور توجہ اِس معاملے میں صرف کرے، یعنی بُرائی کو مٹانے کے لئے اور نیکی کو جاری کرنے کے لئے۔ اور اسی طرح دوسری روایت میں لفظ ہیں: "مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ" تم میں سے جو کوئی برا کام ہوتا ہوا دیکھے تو اُس کی تغییر اپنے ہاتھ کے ساتھ کرے، "فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ" اگر ہاتھ کے ساتھ تغییر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا "فَبِلِسَانِهٖ" وہ زبان کے ساتھ اُس کی تغییر کرے، "فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ" اور اگر زبان کے ساتھ بھی تغییر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اپنے دل کے ساتھ تغییر کرے اور اس کو پھر اضعف الایمان قرار دیا،[2] جیسے پچھلی روایت میں ہے: "لَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ" اِس کے بعد تو پھر ایمان کا رائی کا دانہ بھی نہیں، یعنی اگر دل میں بھی بُرائی کے خلاف جہاد نہیں ہے اور دل میں بھی تغییر کا جذبہ نہیں ہے، تو یوں سمجھو کہ دل ایمان سے خالی ہے۔ یہ تین درجے بیان کئے گئے ہیں۔ تو جہاد بالقلب یا تغییر بالقلب کا مطلب یہ ہے کہ دل میں تڑپ ہو، اور انسان سوچے اور جو

(۱) صحیح مسلم ۵۲/۱، باب کون النھی عن المنکر من الایمان/ مشکوٰۃ ص۲۹، باب الاعتصام. فصل اول عن ابن مسعودؓ۔
(۲) صحیح مسلم ۵۱/۱، باب کون النھی عن المنکر من الایمان/ مشکوٰۃ ۴۳۶/۲، باب الامر بالمعروف کی پہلی حدیث۔

وقت اُس کے سامنے یہ چیز رہے کہ کوئی ذریعہ ایسا نکل آئے جس کی وجہ سے اس بُرائی کو مٹادیا جائے، مجھے اگر کوئی طاقت مل جائے اور میرے بس میں ہوتو میں اس نیکی کو جاری کردوں اور اس بُرائی کو مٹادوں، یہ جذبات انسان کے قلب میں ہونے چاہئیں، اور اگر یہ جذبات بھی قلب میں نہیں ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کے مٹنے پر اور اس برائی کے جاری رہنے پر انسان مطمئن ہوگیا، اور اُس کے دل میں کوئی حرکت نہیں ہے اِس معاملے میں، اور آپ جانتے ہیں کہ اِس پر اطمینان یعنی نیکی کے مٹنے پر اطمینان اور اِسی طرح بُرائی کے جاری رہنے پر اطمینان یہ ایسے قلب کی خاصیت نہیں ہے جس میں ایمان کا ذرہ ہو، اگر ایمان کا ذرہ بھی ہوتو نیکی کے مٹنے پر دکھ ہوتا ہے، اور بُرائی کے برسرِ بازار ناچنے پر دکھ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر برائی کے مٹانے کا اور نیکی کے جاری کرنے کا جذبہ ہوگا تو تب جا کے کہا جاسکتا ہے کہ اِس کے دل میں ایمان ہے اور ایمان کی قدر ہے، یہ معروف اور منکر میں فرق جانتا ہے، ورنہ اگر معروف اور منکر کا فرق مٹ جائے گا اور انسان اس حالت پر مطمئن ہوجائے گا تو یہ قلب کے مردہ ہونے کی دلیل ہے۔

مذکورہ تین درجات ہرشخص کے لئے نہیں

''اٰمر بالید'' تو وہ شخص کرے گا جس کو قوت اور اقتدار حاصل ہے، جس کے ہاتھ اُٹھانے پر دوسرا شخص آگے سے ہاتھ نہ اُٹھا سکے، اس لئے پہلا فرض تو یہ حکومت کا ہے، چونکہ حکومت کو قوت اور طاقت ہوتی ہے کہ وہ نیکی کو جاری کرسکتی ہے اور بُرائی کو مٹا سکتی ہے، اس کے مقابلے میں کوئی ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا، اور نجی درجے میں جس شخص کو جتنی حکومت حاصل ہے اتنا اس کو ہاتھ اُٹھانے کا حق ہے، والدین کو اپنی اولاد پر، اُستاذ کو اپنے شاگرد پر، شیخ کو اپنے مرید پر، بڑے بھائی کو چھوٹے بہن بھائیوں پر، اور اسی طرح جس کو بھی کسی جزوی علاقے میں یا جزوی جگہ ہی اِس قسم کا اختیار و اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اُس کی تغییر کرے، اُس کو ہاتھ اُٹھانا چاہیے، اور اگر ہاتھ کے ساتھ تغییر نہیں کرے گا تو اپنے فرض میں کوتاہی کرتا ہے۔ اور زبان کے ساتھ انکار کرنا زیادہ تر سمجھ دار اور اہلِ علم کا کام ہوتا ہے، جو یہ درجات سمجھتے ہیں کہ یہ فرض ہے، یہ حرام ہے، یہ واجب ہے، یہ مکروہ ہے، یہ مستحب ہے، یہ مکروہ تنزیہی ہے، یہ خلافِ اَولیٰ ہے، یہ اَولیٰ ہے، کیونکہ ہر چیز کے اُوپر انکار اُس کے درجے کے مطابق کرنا ہوتا ہے، ایسا نہ ہو کہ ایک مستحب چیز ہے اور اُس کے اُوپر ہم اِس طرح زور ڈال دیں جیسے فرض پر ڈالا جاتا ہے، اور ایک چیز مکروہ ہے ہم اُس کے اُوپر اس طرح تشدّد اِختیار کرلیں جیسے حرام کے بارے میں کیا جاتا ہے، اِس کے نتائج بسا اوقات غلط نکلتے ہیں، فرض کے بارے میں تنبیہ سخت ہوتی ہے، اسی طرح حرام کے اِرتکاب کے بارے میں تنبیہ سخت ہوتی ہے، اور مکروہ اور مسنون کے بارے میں وہی درجات کا خیال رکھا جاتا ہے، اور اگر اَولیٰ اور غیر اَولیٰ کا فرق ہے تو وہاں بہت نرم انداز کے ساتھ تفہیم کی جاتی ہے، اور اگر دوسرا اُس کے مطابق عمل نہیں کرتا تو اُس کے اُوپر شدّت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو یہ درجات صحیح طور پر معلوم ہونے چاہئیں۔ اور پھر سمجھانے کے لئے سلیقہ بھی ہو، انسان دیکھ لیتا ہے کہ یہ ایک معزز آدمی ہے، اس کو نرم لب و لہجے کے ساتھ اگر کہیں گے تو متاثر ہوگا، اور اگر اس کے سامنے ہم ذرا اکڑ کر بولے تو یہ آگے سے اکڑ جائے گا، اور اُلٹا ہمارے تشدّد کے نتیجے میں یہ دوسری طرف کو اور زیادہ نکل جائے گا، اور ایک آدمی ایسا ہوتا ہے جس کے متعلق انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اُوپر نرمی کارگر نہیں ہوگی، اس کے اوپر ذرا سخت

لب ولہجہ اختیار کرنا پڑے گا۔ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں چونکہ اتنی چیزوں کی رعایت ضروری ہے اس لئے یہ ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا کہ چند مخصوص افراد اس بارے میں تمہارے اندر موجود رہنے چاہئیں، اگرچہ فرض ساری اُمت پر ہے اِس میں کوئی شک نہیں، اس لئے اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والی کوئی جماعت بھی موجود نہیں ہوگی تو ساری اُمت گناہ گار ہے، لیکن اگر اُمت میں سے کچھ افراد اس قسم کے کھڑے ہوجائیں جو اس فریضے کو ادا کریں تو یہ بوجھ ساری اُمت سے ٹل جائے گا۔

اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے صرف وعظ ونصیحت کافی نہیں

اس سے بھی یہ معلوم ہوگیا کہ اس قسم کی حکومت کا قائم کرنا بھی اُمت کے ذمے فرض ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کرے، کیونکہ معروف کے جاری کرنے کے لئے اور منکر کے مٹانے کے لئے صرف وعظ اور نصیحت کسی دور میں بھی کافی نہیں ہوتا، اگر دلیل کی قوت کے ساتھ کسی کو منوایا جاسکتا، چاہے وہ کتنی ہی جگر سوزی کے ساتھ کیوں نہ ہو، کتنی ہی خلوص کے ساتھ کیوں نہ ہو، کتنی ہی محبت کے ساتھ کیوں نہ ہو، اگر دلیل کے ساتھ ہر کسی کو روکا جاسکتا تو کم از کم انبیاء علیہم السلام کی موجودگی میں کُفر نہ باقی رہتا، انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مضبوط دلیل اپنے مدّعا پر کوئی نہیں دے سکتا، انبیاء علیہم السلام سے زیادہ خیر خواہ اور ہمدرد کوئی نہیں ہوسکتا، انبیاء علیہم السلام سے زیادہ موقع شناس کوئی نہیں ہوسکتا، رِقّت دلسوزی اور جگر سوزی جتنی انبیاء علیہم السلام اپنے مخالفین کے لئے کرتے تھے اتنا کوئی نہیں کرسکتا، اس لئے یہ کہہ دینا کہ رقت اور دل سوزی کے ساتھ، محبت اور پیار کے ساتھ، اور دلائل کی قوت کے ساتھ سمجھانا کافی ہے، اگر یہ کافی ہوتا تو کم از کم انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں کُفر اُن کے سامنے نہ ٹھہرتا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے بہترین سے بہترین دلائل دیئے، بہت اصرار کے ساتھ، تکرار کے ساتھ، خلوت میں، جلوت میں، اجتماعی صورت میں، انفرادی صورت میں، ہر طرح سے اپنے مخالفین کو سمجھایا، لیکن مخالفین نہیں سمجھے، اور اُس کے بعد پھر قوت آیا کرتی ہے، پھر ڈنڈا آتا ہے، جب ڈنڈا ہاتھ میں آتا ہے تو پھر وہ رکاوٹیں دور ہوتی ہیں اور کفر آگے سے بھاگتا ہے، اس لیے دلیل کی قوت بھی ہو، وعظ ونصیحت بھی ہو، اور جو متأثر ہونے والے نہیں ہوتے بلکہ ضدی اور معاند ہوتے ہیں اُن کے ساتھ ساتھ سرین بھی کوٹے جائیں اور کھوپڑیاں بھی توڑی جائیں، تب جاکے خیر اچھی طرح سے پھیلا کرتی ہے، اس لئے اس اُمت کو جو خیر کے پھیلانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر اِس کے ہاتھ میں دلائل کی صورت میں قرآن دیا گیا ہے، تو ایک ہاتھ میں اس کو تلوار پکڑنے کا حکم بھی ہے، اگر تو کوئی دلیل کے ساتھ سمجھ جائے تو بڑی اچھی بات ہے، اُس کی بھی نیک بختی ہے، لیکن اگر کوئی سمجھتا بھی نہیں اور دوسروں کو سمجھنے دیتا بھی نہیں اور درمیان میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے تو پھر اُس کے ساتھ ساتھ جہاد بالسیف ہے، پھر ڈنڈا اُٹھاؤ، اس کے بغیر چارہ نہیں ہے، اور ڈنڈا اور تلوار اُٹھانے کے لئے آپ جانتے ہیں کہ اقتدار اور قوت چاہیے، اس لئے حکومت کی سطح پر بھی اس قسم کا انتظام ہونا ضروری ہے تب جاکے کُفر کا زور توڑا جاسکتا ہے اور اس کو مٹایا جاسکتا ہے۔ نجی مجلسوں اور محفلوں میں بھی اسی طرح ہے، کہ گھروں میں اور دوسری جگہوں میں بھی جہاں کسی کو تھوڑا بہت اقتدار حاصل ہو، ہر دفعہ زبان سے سمجھانا بسا اوقات کافی نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب (نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ

صدر، دار العلوم دیوبند، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاذ، دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر، وہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے چار تو کتابیں اُتاری ہیں، اور اُس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (سورۂ حدید: ۲۵) ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں بأسِ شدید ہے، بہت سخت دبدبہ ہے، وہ فرماتے تھے کہ اِس سے اشارہ اِسی بات کی طرف ہے کہ جو کتابوں کی دلیل سے نہ سمجھے تو اس کو نعل دار جوتے سے سمجھاؤ، ''نعل دار جوتے'' کا معنی ہے جس جوتے کے نیچے لوہے کی میخیں لگی ہوئی ہوں، کہتے ہیں کہ یہ بھی بسا اوقات روشن دماغ ثابت ہوتا ہے، کہ اگر دلیل کے ساتھ کسی کے دماغ کی ظلمت دُور نہ ہو تو پھر نعل دار جوتے سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ [ملفوظات حکیم الامت ۳/ ۱۱۴] تو یہ چیز بھی چلتی رہتی ہے۔ جب تغییر بالید اور جہاد بالید کا بھی حکم ہے تو یہ لازم ہوگا کہ اُمت اِس بات کی مکلف ہے کہ اپنے لئے اتنی قوت اور اتنی طاقت مہیا کر کے رکھے کہ اگر سامنے سے کُفر اپنی ضد نہیں چھوڑتا تو پھر اُس کا سر بھی کُوٹا جا سکے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے علم وحکمت کیوں ضروری ہے؟

حکومت کی سطح تک اس کام کرنا بھی ضروری ہے، اور حکومت کی سطح اگر اِس بات سے خالی ہو جائے، کہ وہ خیر کو پھیلاتی نہیں اور شر کو مٹاتی نہیں، نہی عن المنکر نہیں کرتی اور امر بالمعروف نہیں کرتی، تو پھر نجی طور پر مسلمان مکلف ہیں کہ اپنے طور پر جماعتیں بنائیں اور اپنی وسعت کے مطابق خیر کو پھیلانے کی کوشش کریں، لیکن اِس کے لئے علم اور حکمت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، تا کہ ہر بات کا درجہ بھی معلوم ہو، او وعظ وتقریر کا اور دوسروں کو سمجھانے کا موقع محل بھی انسان سمجھ سکے، تو ایسے افراد موجود ہونے چاہئیں، چونکہ بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے اس لئے ہر شخص اس ذمہ داری کا متحمل نہیں۔ تو اِسی تفصیل کے تحت اس ذمہ داری کو ادا کریں گے، حکام کریں گے، علماء کریں گے، اور عام لوگ اِس جہاد کے لئے اپنے دل میں اس قسم کے جذبات رکھیں کہ کسی عالم کے پیچھے لگ کر یا کسی حاکم کے حکم کے تحت وہ بُرائی کو مٹائیں، ہر شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ جہاں کوئی بُرائی دیکھے جا کر ہاتھ ڈال لے، اِس سے پھر لوگ پھر خانہ جنگی کے اندر مبتلا ہو جائیں گے اور خیر پھیلنے کی بجائے اِس سے شر پھیل جائے گا، مثلاً بازار کے اندر کچھ لوگ سینما کا اعلان کرتے پھرتے ہیں، کس طرح سے ہمارے سامنے شر ناچتا ہے، اور کتنا دندناتا ہوا آتا ہے، کیسی فحش فحش اُس کے اُوپر تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں، لیکن اِس کو چونکہ حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، اور حکومت کے آدمی شہر کے اندر موجود ہیں، اب اگر کوئی شخص اِن کے اُوپر ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کرے گا تو یہ اُس کا منصب نہیں ہے، البتہ حکومت کو کہا جا سکتا ہے، حکومت اِس کو مٹائے گی، کیونکہ ہم اگر ہاتھ اُٹھائیں گے تو مقابلے میں دوسرے آدمی کھڑے ہو جائیں گے، بازار کے اندر ہی لڑائی شروع ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ خیر پھیلنے کی بجائے اُلٹا اثرات خراب ہوتے ہیں، اس لئے عوام کا کام نہیں ہے کہ کسی بُرائی کو دیکھ کر اُس کے اوپر ہاتھ اُٹھائیں اور آپس میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر لیں۔ تو اِس درجے کے ساتھ یہ تبلیغ ضروری ہے، اور مجموعی طور پر اُمت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے، اگر کوئی بھی نہیں کرے گا تو ساری اُمت گناہ گار ہوگی، اور اگر کچھ افراد بھی ایسے موجود ہوں گے تو فرض ساری اُمت سے ادا ہو جائے گا۔ پھر اِس طبقے کو خاص طور پر کہا گیا ہے کہ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہ طبقہ فلاح

پانے والا ہے، کامیاب ہے، جس کو اللہ تعالیٰ خیر کے پھیلانے کا، معروف کے جاری کرنے کا، اور منکر کے روکنے کا ذریعہ بنالے، وہ شخص مفلح ہے، کامیاب ہے۔

کون سا اختلاف مذموم ہے اور کون سا محمود ہے؟

وَلَا تَكُوْنُوْا: پیچھے جو بات کہی گئی تھی کہ حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لو اور تقویٰ اختیار کرو، اس کے لئے یہ ایک تحفظ کی تدبیر بتائی ہے، کہ ہر وقت جو اِس قسم کے افراد موجود ہوں گے تو نگہداشت کریں گے، نگرانی کریں گے، کسی طرف سے تقوے میں بھی خلل نہ واقع ہونے دیں اور لوگوں کو متفق بھی رکھیں اور دشمنوں کی سازشوں پر نظر بھی رکھیں، اِس سے امت کا شیرازہ مجتمع رہے گا۔ آگے پھر اُسی طور پر ممانعت آ گئی جیسے پیچھے وَلَا تَفَرَّقُوْا آیا تھا، کہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جو فرقہ فرقہ ہو گئے اور اختلاف کیا اُنہوں نے واضح دلائل کے آ جانے کے بعد۔ یہ لفظ بھی آپ کے لئے قابل غور ہے، جس اختلاف کی یہاں ممانعت آ رہی ہے وہ ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ، بینات کے آ جانے کے بعد، واضح دلائل آ جانے کے بعد، قطعیات مہیا ہو جانے کے بعد آپس میں اختلاف کر کے اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے آپس میں فرقے بنا لیے۔ مسئلہ اسی طرح ہے کہ اگر کسی چیز پر کوئی واضح دلیل مہیا ہو، قرآنِ کریم میں قطعی دلیل آ گئی، قطعی الدلالۃ قطعی الثبوت، یا اسی طرح حدیث شریف میں ایک بات بہت واضح طور پر کہہ دی گئی جس میں کوئی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے، اُس سے اختلاف کرنا حرام ہے، اور اُس سے اختلاف کرنے کی وجہ سے جو فرقہ بنے گا وہ فرقہ ضالہ ہے اور گمراہ ہے، اور وہ ان کا مصداق ہے جن کا منہ آخرت میں کالا ہوگا، بینات کے آنے کے بعد جو آپس میں اختلاف کیا جائے۔ اور جس مسئلے پر بینات نہیں آئیں، قرآنِ کریم میں کچھ الفاظ آئے ہیں لیکن اُن کی مرادیں مختلف ہو سکتی ہیں، اُن کی دلالت مختلف معنوں پر ہو سکتی ہے، جیسے ''اُصول الشاشی'' کے شروع میں یہی آیت آپ پڑھتے ہیں يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ، اب یہاں قرآنِ کریم میں قروء کا لفظ آ گیا، جو لغوی طور پر حیض پہ بھی صادق آتا ہے اور طہر پہ بھی، تو یہ مسئلہ بینات کے تحت نہیں ہے کہ عدت حیض ہے یا طہر؟ اِس میں دونوں احتمال ہیں، اس قسم کے جہاں الفاظ آ جایا کرتے ہیں اِن میں اختلاف کی گنجائش ہے، اور اِس اختلاف کو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ہے، اور اِس پر جو دو حصے بن جائیں گے کہ کوئی کہے گا طہر اور کوئی کہے گا حیض، تو یہ لَا تَفَرَّقُوْا کے تحت نہیں آتے، بلکہ قرآنِ کریم اور حدیث شریف کی مرادیں مختلف ہونے کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے جتنے مطلب نکل سکتے ہیں اُتنے مطلب لے کر ہی اُمت اُن پر عمل کر رہی ہے، اور حدیث شریف سے جتنے مسئلے ثابت ہو سکتے ہیں اتنے ہی مسئلے لے کر اُمت اُن پر عمل کر رہی ہے، گویا کہ قرآنِ کریم کا کوئی احتمال ایسا نہیں جس پر اُمت کا عمل نہ ہو، اب اگر ہم کہیں کہ ساری اُمت اکٹھی ہو جائے کہ اس سے حیض ہی مراد ہے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کی مراد طہر ہو اور تم حیض پر عمل کرتے رہو، تو ساری اُمت ہی طہر کو چھوڑ کر بیٹھ جائے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اُمت کے اوپر وسعت پیدا کرنے کے لئے بعض مسائل کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا، کہ جیسے کسی کا ذوق اور کسی کا اجتہاد تقاضا کرتا ہے اُس قسم کی تعبیر وہ اختیار کر کے عمل کرے گا، اور یہ کتاب اللہ پر عمل ہے، اس کو کتاب اللہ سے اختلاف نہیں کہیں گے، نہ اس سے

حبل اللہ چھوٹتی ہے۔اس لئے ایسے اختلافات جو بینات کے بعد نہیں ہیں، بلکہ مشتبہ روایات یا متعارض روایات کی موجودگی میں یا ذو احتمالین آیات کی موجودگی میں جو اختلاف ہوتا ہے یہ منکر نہیں، اس لئے اس قسم کے اختلافات کے اُوپر انکار کرنا ٹھیک نہیں ہے، یہ عین قرآن اور حدیث کی منشا کے مطابق ہیں، کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے یہ وسعت اُمت کو دی گئی ہے، جب یہ وسعت دی گئی ہے تو جو اُس احتمال پر عمل کرتا ہے وہ بھی صحیح ہے، جو اُس احتمال پر عمل کرتا ہے وہ بھی صحیح ہے، اس کے اُوپر جھگڑا کرنا یا اس کے اُوپر انکار کرنا یا اِس کو منکر میں داخل کرنا جہالت ہے۔

فروعی مسائل میں پر نکیر کرنا خود منکر ہے

اب مثلاً احادیث کی طرف دیکھتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو رائیں ہوگئیں، کہ نماز پڑھتے وقت امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی ہے یا نہیں، ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنی چاہیے، اور ایسی بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں پڑھنی چاہیے، اس لئے یہ مسئلہ بینات کے تحت نہیں ہے، جب یہ بینات کے تحت نہیں ہے تو ہم پڑھنے والوں کو بُرا نہیں کہہ سکتے، اور پڑھنے والے نہ پڑھنے والوں کو برا نہیں کہہ سکتے، ابتداء امت سے ہی دونوں رائے موجود ہیں، دونوں طبقے ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، اس لئے نہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا منکر ہے اور نہ نہ پڑھنا منکر ہے، تو جب یہ منکر ہے ہی نہیں تو اِس کے اُوپر انکار کرنا اور پڑھنے والوں کو بُرا بھلا کہنا یا نہ پڑھنے والوں کو بُرا بھلا کہنا یہ عمل خود ضلالت ہے، ایسا انکار کرنا اور ضد بازی کرنا یہ خود منکر چیز ہے جس سے روکنے کی ضرورت ہے کہ بھئی! ایسا نہ کرو، دلائل کے تحت دونوں کے لئے گنجائش ہے، جس کے بڑوں کا یہ مسلک ہے کہ پڑھنا چاہیے وہ اُن پر اعتماد کرتے ہوئے پڑھتا رہے، اور جس کے بڑوں کا یہ مسلک ہے کہ نہیں پڑھنا چاہیے وہ اُن پر اعتماد کرتا ہوا نہ پڑھے۔کبھی کسی شافعی نے فتویٰ نہیں دیا کہ حنفی بے نماز ہیں، اور کبھی کسی حنفی نے فتویٰ نہیں دیا کہ شافعی حرام کار ہیں، ۔چونکہ یہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے بیعت کا تعلق، ایک دوسرے سے شاگردی کا تعلق، اور ایک دوسرے سے رشتے ناطے ابتدا سے ہوتے چلے آئے ہیں، اس لئے یہ چیز میں نے آپ کی خدمت میں بارہا عرض کی ہے کہ جو مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مختلف فیہ ہوجائے یا صحابہ کرام کے بعد ائمہ عظام میں مختلف فیہ ہوجائے تو سمجھ لیا کرو کہ یہ بینات سے ثابت نہیں ہے، یعنی اِن کا آپس میں اختلاف ہوجانا علامت ہے کہ یہ مسئلہ بینات کے تحت نہیں آتا، جب وہ بینات کے تحت نہیں آتا تو دونوں رائیوں کی گنجائش ہے اور اُن میں سے کسی پر انکار کرنا ٹھیک نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ انسان اپنا رجحان بیان کرسکتا ہے کہ میرا رُجحان اِدھر ہے، باقی جس کا رجحان دوسری طرف ہے اُس کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فروعی مسائل میں اختلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ہوا ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی لوگوں کے ذوق کے طور پر اس طرح مسائل میں فرق پڑتا تھا، حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے، بخاری شریف میں واقعہ آتا ہے کہ جب غزوۂ احزاب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے اور جبریل علیہ السلام نے آکر اطلاع دی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بنوقریظہ پر حملہ کرو، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنوقریظہ کی طرف چلے اور اعلان کردیا کہ عصر کی نماز بنوقریظہ کے پاس جاکر

پڑھنی ہے، اب جیسے جیسے صحابہ کرام کو اطلاع ملتی گئی ویسے ویسے چلتے گئے، تقریباً اڑھائی تین میل کے فاصلے پر اُن کی گوٹھ (آبادی) تھی جدھر جانا تھا، ایک طائفہ ایسا چل رہا تھا جن کو نماز کا وقت راستے میں آ گیا، اور یہ خیال تھا کہ اگر ہم یہاں نماز نہیں پڑھیں گے اور وہاں جا کر پڑھیں گے تو دیر ہو جائے گی، نماز مکروہ وقت میں چلی جائے گی یا قضاء ہو جائے گی، ایسا حال پیدا ہو گیا۔ اب اُس گروہ میں دو رائیں پیدا ہو گئیں، بعض کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا مقصد تھا کہ جلدی آنا اور وقت پر پہنچ جانا تا کہ عصر کی نماز وہاں پڑھو، یہ مقصد نہیں تھا کہ راستے میں وقت ہو جائے تو بھی نماز نہ پڑھنا، اس لئے ہم تو نماز پڑھتے ہیں، وہاں جاتے جاتے دیر ہو جائے گی، دوسرے کہنے لگے کہ جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ عصر کی نماز وہاں آ کر پڑھنی ہے تو چاہے وقت رہے یا نہ رہے ہم تو وہاں جا کر ہی پڑھیں گے، اب ایک کا ذوق یہ تھا کہ حضور ﷺ کا مقصد تھا کہ جلدی آنا تا کہ وقت پر وہاں پہنچو اور عصر کی نماز وہاں پڑھنا، یہ مقصد نہیں تھا کہ اگر کسی وجہ سے دیر ہو جائے اور راستے کے اندر وقت ہو جائے تو بھی نماز نہیں پڑھنی، تو انہوں نے راستے میں نماز پڑھ لی، دوسرے کہنے لگے کہ جب صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ عصر کی نماز وہاں جا کر پڑھنی ہے، تو ہم تو وہاں جا کر پڑھیں گے چاہے وقت رہے یا نہ رہے، دیکھو! صحابہ کرام کے درمیان دو رائیں پیدا ہو گئیں، اور جس وقت حضور ﷺ کے پاس پہنچے اور دونوں کا حال معلوم ہوا تو ''لَمْ یُعَنِّفْ وَاحِدًا مِنْهُمْ'' حضور ﷺ نے دونوں میں سے کسی پر سختی نہیں کی،[1] درگزر کر گئے، کہ دونوں نے اپنے خیال کے مطابق ٹھیک کیا ہے جو کچھ کیا ہے، دونوں کو برداشت کر لیا، نہ تو اُن کو کچھ کہا کہ جب میں نے کہا تھا کہ عصر کی نماز وہاں پڑھنی ہے تم نے راستے میں کیوں پڑھی؟ کیونکہ وہ بھی ایک خلوص کے جذبے کے ساتھ حضور ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ سمجھے تھے کہ وقت سے پہلے وہاں پہنچنا ہے پھر وہاں نماز پڑھنی ہے، اور اگر کسی وجہ سے دیر ہو جائے تو راستے میں پڑھنے کی ممانعت نہیں ہے، اور دوسرے نے ظاہری لفظوں کی رعایت رکھی تو اُن کو بھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں اتنی عقل نہیں؟ یا تو پہلے آنا چاہیے تھا، اور اگر نہیں آئے تھے تو نماز تو وقت پہ پڑھ لیتے؟ بہرحال دونوں نے خلوص کے ساتھ حضور ﷺ کے الفاظ کا جو مطلب سمجھا اُسی پر انہوں نے عمل کیا، حضور ﷺ نے اُس کو برداشت کیا، یہ واقعات حدیث شریف میں موجود ہیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر الفاظ اس قسم کے ہوں جس سے دو مطلب نکل سکتے ہیں، تو خلوص کے ساتھ اپنی پوری اجتہادی قوت کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوا انسان اُس میں سے جس شق کو بھی اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ کے ہاں ماجور ہو گا، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مجتہد اجتہاد کرتا ہے، کبھی درستی کو بھی پہنچتا ہے اور کبھی خطا بھی کر جاتا ہے، درستی کو پہنچ جائے گا تو اللہ کے ہاں دوہرا ثواب ملے گا، اور اگر وہ خطا بھی کھا جائے تو بھی اللہ تعالیٰ اسے ثواب دے گا۔[2] اور اس قسم کے مسائل جتنے بھی ہیں اُن کی حقیقت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، کہ اس میں حق کیا ہے اور خطا کا احتمال کدھر ہے، قرائن دونوں طرف موجود ہیں، اس قسم کے اختلاف پر زبان نہیں کھولی جایا کرتی اور کسی پر انکار نہیں کیا جایا کرتا،

---

(۱) بخاری ج۱ ص۱۲۹ باب صلاۃ الطالب والمطلوب الخ/ نیز ۲/ ۵۹۱۔

(۲) بخاری ۲/ ۱۰۹۲ باب اجر الحاکم اذا اجتهد فاصاب/ مسلم ۲/ ۷۶ باب بیان اجر الحاکم اذا اجتهد/ مشکوٰۃ ج۲ ص ۳۲۴ باب العمل فی القضاء فصل اول۔

چاہے وہ مسائل فقہ کے ہوں، چاہے اُن کا تعلق نظریات اور خیالات کے ساتھ ہو، جس میں دو احتمال ہوں اور صحابہ کرام کا اختلاف اُس میں ثابت ہو جائے وہ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ کا مصداق نہیں ہے، ورنہ آپ کو کہنا پڑے گا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت (فقہی مسائل میں اختلاف کی صورت میں بھی اور نظریات میں اختلاف کی صورت میں بھی) اس کا مصداق ہے کہ جن کا منہ قیامت کے دن کالا ہوگا، اور آپ جانتے ہیں کہ ہم اِن بزرگوں میں سے کسی کے متعلق اس قسم کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے، یہ سارے روشن چہرے والے ہیں، چاہے کوئی رفع یدین کرتا ہے چاہے نہیں کرتا، چاہے کوئی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتا ہے چاہے نہیں پڑھتا، اس قسم کے اختلافات والے جتنے بھی ہیں وہ اِس کا مصداق قطعاً نہیں ہیں، سب قرآن اور حدیث کے الفاظ کی طرف دیکھتے ہوئے مراد سمجھ کر اُس پر عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں سب ماجور ہیں، اِن میں سے کسی پر انکار کرنا، کسی سے نفرت کرنا اور کسی پر روک ٹوک کرنا قطعاً حکمتِ دینی کے خلاف ہے۔

آج کا المیہ

اور آج طریقہ یہی ہے کہ جو تو متفق علیہ فرض ہیں، مثال کے طور پر نماز، اُس کے چھوڑنے والے سے اتنی نفرت نہیں ہے، اور اُس کے چھوڑنے والے کے خلاف وہ اشتعال انگیزی نہیں ہے، اور اسی طرح جو کام متفق علیہ حرام ہیں جیسے شراب، زنا، جوا، سود، اِس کے لینے والے اور اِس کے ارتکاب کرنے والے سے وہ نفرت نہیں ہے، نہ اُن کے اُوپر وہ انکار ہے، جھگڑا ہوتا ہے تو اِسی پر کہ رفع یدین کرنا ہے یا نہیں کرنا، اور فاتحہ پڑھنی ہے یا نہیں پڑھنی، آمین اونچی کہنی ہے یا نہیں کہنی، جو مسئلے انکار کے تھے ہی نہیں، جھگڑے فساد کے تھے ہی نہیں، اُن کو ہم نے جھگڑے فساد کا ذریعہ بنا لیا، اور جو بینات کے تحت آئے ہوئے مسائل ہیں اُن سے ہم درگزر کر گئے، ہم کتنے بھٹکے ہوئے لوگ ہیں اور کس طرح سے ہم نے راہِ راست کو چھوڑ دیا، حالانکہ لڑائی جھگڑے کی بات تو یہ تھی کہ جو متفق علیہ فاسق اور فاجر ہیں اُن کے خلاف جہاد ہوتا، نماز چھوڑنے والوں کو کہا جاتا کہ نماز پڑھو، وہ اگر کہے کہ میں کیسے پڑھوں رفع یدین کروں یا نہ کروں؟ اگر وہ ٹالنے کے لئے یوں کہتا ہے تو کہو کہ بھئی! چاہے کر چاہے نہ کر، نماز پڑھ۔ وہ کہے میں نماز کیسے پڑھوں؟ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ تو کہو کہ تیری مرضی، فاتحہ پڑھ چاہے نہ پڑھ، نماز پڑھ، یعنی اِس قسم کے اختلافات کو اگر کوئی بہانہ بناتا ہے تو اُس کو جواب یہ دینا چاہیے کہ بھئی! چھوڑو، تیرا جی چاہے تو آمین اونچی کہہ لینا، تیرا جی چاہے تو نیچی کہہ لینا لیکن تو نماز پڑھ، یہ اختلافات نماز چھوڑنے کا بہانہ نہیں ہیں، اور اسی طرح محرمات ہیں، تو اِدھر تو ہماری توجہ ہی نہیں رہی، اور ہماری لڑائی اگر رہ گئی تو ایسی چیزوں میں جن میں تعبیرات کے اختلاف کی اور عمل کے اختلاف کی گنجائش ہے، یہی اُمت کے اندر افتراق اور فرقہ بازی ہوگئی ہے، اِس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی آخری عمر میں پریشانی

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر ہے ''وحدتِ اُمت'' کے عنوان سے، جو فیصل آباد میں عبدالرحیم اشرف

نے شائع کی، اُس کے کچھ اقتباسات ایک رسالے میں آئے تھے، وہ میں نے پڑھے، اور اُس رسالے کو حاصل کرنے کی میں نے کوشش کی، اُن کے ہاں پتہ کیا، وہ کہنے لگے کہ یہاں نہیں ہے، دوسری جگہ ہے، پھر وہ مل نہیں سکا، اُس کا ایک اقتباس رسالے میں آیا تھا، کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ﷫ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں سیّد انور شاہ صاحب کشمیری ﷫ کے پاس گیا، میں نے دیکھا کہ حضرت بہت غمزدہ اور افسردہ بیٹھے ہیں، میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے؟ اتنی افسردگی کیوں ہے؟ آپ غمزدہ کیوں بیٹھے ہیں؟ تو حضرت سیّد انور شاہ صاحب ﷫ فرمانے لگے کہ میں اِس غم میں بیٹھا ہوں کہ ہم نے اپنی ساری زندگی اور ساری محنت اِن اختلافی مسائل کو بیان کرتے ہوئے گنوادی جن کے متعلّق نہ برزخ میں سوال ہونا ہے، اور نہ میدانِ قیامت میں پوچھا جانا ہے، برزخ کے اندر یہ سوال ہی نہیں ہوگا کہ تم رفع یدین کرتے تھے یا نہیں؟ قیامت کے دن یہ سوال ہی نہیں اُٹھے گا کہ تم اِمام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے تھے یا نہیں؟ اِس قسم کے اختلافی مسائل پر ہم نے اپنی ساری صلاحیتیں اور سارا وقت صَرف کردیا، اور جو مسائل توجہ کے قابل تھے اُدھر ہماری توجہ ہی نہیں گئی۔

بے اِعتدالیوں کا نتیجہ!

یعنی حضرتؒ زیادہ تر مرزائیوں کے فتنے سے متأثر تھے، اور آخر عمر میں اُن کا سارا رُجحان مرزائیوں کے خلاف ہوگیا تھا، کہ یہ چیزیں ہیں جن پر ہمیں کوشش کرنی چاہیے، جہاد کرنا چاہیے، اور اپنی صلاحیتیں صرف کرنی چاہئیں، اور ہمارا سارے کا سارا وقت اِنہی فقہی اختلافی مسائل پر گزر گیا جن کے متعلّق نہ برزخ میں سوال ہے نہ حشر میں سوال ہے، اور یہ چیز زیرِ بحث آئے گی ہی نہیں کہ دونوں میں سے کون حق پر تھا اور کون باطل پر تھا، ایسا کرنے والے بھی اللہ کے ہاں چھوٹ جائیں گے، اور ایسا کرنے والے بھی چھوٹ جائیں گے، تو اِن مسائل کا تو درجہ یہ ہے جن پر ہم نے اُلجھنا شروع کردیا، اسی طرح دوسرے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی واضح ہدایت اُن کے متعلّق قرآنِ کریم میں نہیں ہے، عنوانات اور تعبیرات کے اندر مختلف الفاظ بولے جاسکتے ہیں، اور جو قطعی مسائل ہیں اُن کی طرف سے اُمت صَرفِ نظر کرگئی، اور یہ بھی ایک زوال کی علامت ہے اور اُمت کے ایک قسم کے ذہنی اِفلاس کی علامت ہے کہ غلط راستے پر چڑھ کر اپنی صلاحیتیں برباد کررہے ہیں، اور جو چیزیں آپس میں لڑنے کی نہیں تھیں اُن کو آپس میں فرقہ بازی کا ذریعہ بنالیا۔ اب جنازے کے بعد دُعا مانگنی ہے یا نہیں، یہ کون سی بینات کے تحت آئی ہوئی بات ہے؟ نماز پڑھتے وقت تکبیر کے شروع میں کوئی کھڑا ہوجائے تو اس میں کیا بات ہے، بعد میں کھڑا ہوجائے تو اُس میں کیا بات ہے، کھانا سامنے رکھ کر قرآنِ کریم پڑھ لیا تو اُس میں کیا بات ہے، نہ پڑھا تو اُس میں کیا بات ہے، اب ہمارے گھروں میں لڑائیاں تو انہی باتوں کی ہیں، یہ قرآنِ کریم کی کون سی آیت کا ترجمہ ہے کہ کھانا سامنے رکھ کر قرآن نہ پڑھا کرو، ہاں ایک چیز ہے، اگر کسی نے التزام والے نظریے کے ساتھ پڑھ لیا تو ہم کہیں گے کہ حضور ﷺ سے ثابت نہیں، بھئی! یہ نہیں کرنا چاہیے، یہ اس درجے کی بات ہے، زیادہ سے زیادہ آپ اِس کو کہیں گے کہ سُنّت سے ثابت نہیں، سُنّت کے خلاف ہے، باقی اگر کوئی کرتا ہے تو اِس کا وہ درجہ تو نہیں جو نماز چھوڑنے والے کا ہے، اس کا وہ درجہ تو نہیں جو زانی کا ہے، زانی سے تو آپ بغل گیر ہوسکتے ہیں، اور

جنازے کے بعد کوئی دُعا مانگ لے تو آپ کہتے ہیں کہ یہ سلام کے قابل ہی نہیں رہا، یہ بے اعتدالی ہے۔ جنازے کے بعد ہاتھ اُٹھا کے دُعا مانگنا حدیث شریف میں حضور ﷺ سے ثابت نہیں، اور جو اس کو ضروری قرار دیتا ہے تو یہ نظریہ بدعت ہے، لیکن اس کا وہ درجہ نہیں جو زِنا کا اور شراب کا ہے، لیکن تمہارے ذہنوں کے اندر کیا چیز ہے؟ شرابی آجائے تو تم اُس سے نفرت نہیں کرتے، زانی آجائے تو تم اس سے نفرت نہیں کرتے، تارکِ صلوٰۃ آجائے تو تم اس سے نفرت نہیں کرتے، اگر کسی کے متعلق پتہ چل گیا کہ جنازے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی ہے تو ''بدعتی بدعتی بدعتی، اِس کا تو نہ اِکرام جائز، نہ اِس سے سلام جائز!''

سوال:- صرف یہی وجہ تو نہیں ہے اور مسائل بھی ہیں۔

جواب:- اور مسائل بھی جو قطعیات کے تحت ہیں اُن پر تو انکار کیا جائے، اور جو قطعیات کے تحت نہیں ہیں ان میں درگزر کی گنجائش ہے، جو مسئلہ بھی آئے گا اُس میں فرق اس طرح سے ہی کرنا ہے، کہ اگر تو اس کا منکر ہونا بینات کے تحت ہے تو اُس پر انکار کرو، اور اگر بینات کے تحت نہیں تو اپنے ذوق کا اختلاف ہے، کسی نے کیسے کرلیا، کسی نے کیسے کرلیا، اس لیے درجات پہچانو، ایک آدمی مستحب کے خلاف کرتا ہے، ایک سُنّت کے خلاف کرتا ہے، کوئی واجب کا تارک ہے، کوئی فرض کا تارک ہے، اور ایک مکروہ کا ارتکاب کرتا ہے، ایک حرام کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن جس وقت آپ دیکھیں گے تو ہمارے ہاں جو بالکل فروعات اور انتہائی درجے کی مجتہد فیہ چیزیں ہیں، چاہے شریعت کے اندر ان پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں، بزرگوں کے ذوق کا آپس میں اختلاف ہے، یہ ہمارے اندر فرقہ بازی کا باعث بن گئیں، اور جو اصل چیزیں تھیں دلائل اور بینات کے ساتھ مدلل تھیں، جن کو ساری اُمت چھوڑے بیٹھی ہے اُدھر کسی کی زبان نہیں کھلتی۔

سوال:- ہمارے علماء پھر ایسا کیوں کرتے ہیں؟

جواب:- ہمارے سب علماء کا یہی طریقہ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔

سوال:- ہمارے اکابر تو ان کو ''اہلِ باطل'' کہتے ہیں۔

جواب:- ''اہلِ باطل'' تو کہیں گے کہ جب ایک چیز سُنّت کے خلاف ہو تو اس پر انکار اس درجے کا ہوگا کہ یہ طریقہ سُنّت کے خلاف ہے، بس۔

سوال:- جب ایک چیز میں دو احتمال ہو سکتے ہیں۔

جواب:- اگر دو احتمال ہو سکیں گے تو کبھی بھی اہلِ باطل نہیں کہتے، کبھی کسی نے کہا ہے کہ رفع یدین کرنا اہلِ باطل کا کام ہے؟

سوال:- کیا ہمارا ان کے ساتھ بینات میں اختلاف نہیں ہے؟

جواب:- کن کے ساتھ؟

سوال:- بریلویوں کے ساتھ۔

جواب:- بریلویوں کا میں نے نام نہیں لیا، میں تو ویسے کہتا ہوں کہ مسائل دو قسم کے ہیں، ایک وہ ہیں جو بینات سے ثابت ہیں، ان کے خلاف تو جو چلتا ہے اس سے اختلاف کرو، اس میں تو آپس میں فرقہ بازی کرنا بھی جائز ہے، اور جو بینات

سے ثابت نہیں ہیں اُن کے اندر تشدّد کا طریقہ نہیں ہونا چاہیے۔ باقی! نہ میں نے شیعوں کا نام لیا ہے، نہ بریلویوں کا نام لیا ہے، نہ کسی اور کا نام لیا ہے، کیونکہ اِن کے ساتھ ہمارا مختلف فیہ ہر مسئلہ بینات کے تحت نہیں ہے، اور نہ ہی ہم ہر مسئلے کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف ذوق کا اختلاف ہے، کوئی مسئلہ جس وقت سامنے آئے گا تو فیصلہ کیا جاسکے گا کہ یہ بینات کے تحت ہے یا نہیں، جو بینات کے تحت ہوگا اُس میں تشدّد کریں گے، اور جو بینات کے تحت نہیں ہوگا اس میں تشدّد نہیں کریں گے، میں نے تو ایک کلیت کے درجے میں بات کی ہے، بریلویوں کا ہر مسئلہ اس درجے میں نہیں کہ ہمارا اُن سے بینات کا اختلاف ہو، جیسے میں نے مثال دے دی، کہ نماز کے اندر تکبیر شروع ہونے سے پہلے کھڑے ہوگئے یا بعد میں کھڑے ہوگئے، جنازے کے بعد کسی نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگ لی اور کسی نے نہیں مانگی، کھانا سامنے رکھ کر کسی نے فاتحہ پڑھ لی اور کسی نے نہ پڑھی، یہ میں نے مثال دی ہے، اب ان چیزوں کا درجہ وہ نہیں جو نماز کا ہے فرض کے اندر، یا زِنا اور شراب کا ہے حرمت کے اندر، اِن دونوں درجوں میں فرق کرو، کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم بے نمازیوں کو تو خوشدلی سے برداشت کر جاتے ہیں، اور زانیوں اور شرابیوں کے ساتھ تو ہمارے مصافحے اور معانقے ہو سکتے ہیں، لیکن جن کے ساتھ ان مسئلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے ہم ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے، یہ بے اعتدالی نہیں ہے؟ یعنی اِس وقت اگر آپ دیکھیں گے تو جتنا بھی تشدّد ہے وہ سب اس قسم کے مسائل پر ہے جن سے درگزر کرنے کی گنجائش ہے، چاہے آپ اُن کو سنّت کے خلاف کہیں کہ یہ صریح سنّت کے خلاف ہے، بالکل ٹھیک ہے، لیکن آخر ایک تارکِ سنّت ہے یا سنّت کے مطابق اُس کا عمل نہیں، اور ایک قطعی حرام کا مرتکب ہے، دونوں کا درجہ ایک ہے؟

سوال:- بنیاد یہ مسئلے تو نہیں ہیں۔

جواب:- بیٹے! یہ میں ایک مثال دے رہا ہوں، جس وقت کوئی مسئلہ سامنے آئے گا اُس کے بعد دیکھیں گے کہ اِس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ تو میں نے مثال دی ہے، کہ اگر اِس قسم کے مسائل ہیں تو اِن میں تشدّد نہیں کیا جاسکتا، تشدّد کا نتیجہ ہے کہ گھر گھر سر پھوٹے پڑے ہیں جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔

سوال:- تشدّد فقط اِنہی مسائل کی وجہ سے تو نہیں ہے۔

جواب:- بھئی! آپ میری بات پھر نہیں سمجھتے، میں کہہ جو رہا ہوں کہ یہ بطور مثال کے میں کہہ رہا ہوں، جو مسئلہ سامنے آئے گا۔

سوال:- کوئی بھی شخص نہیں ہے جو فقط اِسی وجہ سے تشدّد کرتا ہو۔

جواب:- اگر ایک شخص کہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بشر کہنا کُفر ہے، یہ مسئلہ بینات کے خلاف ہے، لیکن اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ "چاہے بشر ہیں لیکن ہمیں چاہیے نہیں کہ ہم اُنہیں بشر کہیں، کیونکہ بشر کہنے کے ساتھ ایک مساوات سی معلوم ہوتی ہے، گویا کہ ہم جیسے ہیں، چاہے بنی آدم ہونے میں ہم جیسے ہیں، ماں کے بطن سے پیدا ہونے میں ہم جیسے ہیں، غیر خدا ہونے میں ہم جیسے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر اس امتیاز کے بغیر بشر بشر کی آپ رَٹ لگائیں گے تو عام لوگوں کے ذہن میں ایک مساوات سی آتی ہے جس کی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ بشر کہو نہیں، کیونکہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے کمالات اتنے دیے ہیں جس کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا

اور اُن کا درجہ ایک نہیں ہے، اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم جیسے بشر نہیں ہیں"، تو میں کہتا ہوں کہ صرف تعبیر کا فرق ہے! اس میں لڑائی کی کون سی بات ہے؟ اور اگر کوئی کہے کہ میں اُن کو بنی آدم ہی نہیں مانتا، وہ انسانیت کی صف میں ہیں ہی نہیں، وہ سرے سے بشر ہیں ہی نہیں بالکل، یعنی اِبنِ آدم ہی نہیں، آدم زاد ہی نہیں، تو اِس کے کُفر میں کیا شک ہے؟ یہ مسئلہ بینات کے خلاف ہے۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ نہیں جی! اولادِ آدم میں سے ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں، ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، انسان ہیں، لیکن ہم میں اور اُن میں اتنا فرق ہے کہ اگر ہم انسان ہیں تو پھر انہیں انسان نہیں کہنا چاہیے، اگر ہم بشر ہیں تو ہمارے مقابلے میں اُن کے اتنے کمالات ہیں کہ ان کو بشر نہیں کہنا چاہیے، تو یہ بالکل صحیح اور حق کے مطابق نظریہ ہے، انبیاء ﷺ کے متعلق آیا ہے: "هُوَ بَشَرٌ لَا كَالْبَشَرِ بَلْ هُوَ يَاقُوْتٌ بَيْنَ الْحَجَرِ"، کہ بشر تو ہیں لیکن بشروں جیسے نہیں، وہ تو ایسے ہیں جیسے پتھر میں سے یاقوت نکل آتا ہے، اگر اس انداز سے وہ کہتے ہیں کہ بشر نہ کہو، لوگوں کے ذہن میں مساوات سی آتی ہے، تو یہ صرف تعبیر کا فرق ہے، یہ کوئی کُفر کی بات نہیں۔ اور اگر وہ کہتے ہیں کہ سرے سے بشر ہیں ہی نہیں، تو یہ مسئلہ بینات کا ہے، ایسا شخص کافر ہے، صراحتاً فتویٰ دیتا ہوں کہ کافر ہے۔ اِسی طرح میں کہتا ہوں کہ کوئی مثال سامنے آئے پھر تو انسان فرق کرے گا کہ بینات کے تحت یہ بات آتی ہے یا نہیں آتی، کلیت کے طور پر نہ میں بریلویوں کو کافر کہتا ہوں، نہ میں کسی دوسرے کو، جس وقت تک کوئی نظریہ سامنے نہ آئے۔ جب کوئی نظریہ سامنے آئے گا تو پھر ہم فرق کریں گے کہ یہ بات بینات کے تحت آتی ہے کہ نہیں آتی، تو مسئلے کا درجہ متعین کرنے کے بعد تشدّد اور نرمی اُسی انداز سے ہوگی۔ اور اسی طرح مثلاً سماعِ موتیٰ کا مسئلہ ہے! صحابہ کرام سے یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اب جو شخص کہے کہ سماعِ موتیٰ کا قول کرنے والا گمراہ ہے، تو وہ خود گمراہ ہے، اور جو کہے کہ عدمِ سماع کا قول کرنے والا گمراہ ہے تو وہ خود گمراہ ہے، ہم کہیں گے کہ جب صحابہ میں دونوں رائیں ہو گئیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ مسئلہ بینات کے تحت نہیں ہے، اور یہ کُفر و ایمان کا مدار نہیں ہے، ایسی بھی گنجائش ہے کہ سماع کا قول کیا جائے، ایسی بھی گنجائش ہے کہ سماع کا قول نہ کیا جائے، ان دونوں میں سے جس کو کوئی گمراہ کہے گا وہ خود گمراہ ہے، اختلافی مسئلے کی نوعیت یہ ہوتی ہے۔ (کسی کے سوال پر فرمایا:) وہ تاریخی طور پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابی ہیں یا نہیں، (پھر کسی سوال پر فرمایا:) تاریخ کا انکار کرنے سے جتنا انسان کافر ہوتا ہے اتنا سا کافر ہو جائے گا، اگر قرآنِ کریم میں لکھا ہوا ہے کہ فلاں شخص صحابی ہے پھر اس کا کوئی انکار کرے گا تو کافر ہے، اور اگر تاریخ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک شخص کے متعلق اختلاف ہے ایک کہتا ہے کہ اس کی صحابیت ثابت ہے اور دُوسرا کہتا ہے کہ ثابت نہیں، تو جتنا تاریخ کا درجہ ہوتا ہے ویسے اس کا درجہ ہے، جس کا صحابی ہونا قطعیت سے ثابت ہوگا تو جو اس کا انکار کرے گا جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، اِن کا صحابی ہونا قطعی طور پر تواتر کے ساتھ ثابت ہے، اِن کا مسلمان ہونا اور اِن کا امامِ اُمت ہونا تواتر کے ساتھ ثابت ہے، قطعیت کے ساتھ ثابت ہے، اِس کا اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اُس کے کُفر میں کیا شک رہ گیا؟ یہ بہت اہم بات ہے، آج اس کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے کہ اختلاف وہ ممنوع ہے جو بینات کے آنے کے بعد ہو، اور جو بینات کے بعد نہ ہو بلکہ اُس میں اجتہاد کی گنجائش ہے اُس پر نہ یہ فرقہ بازی صادق آتی ہے جس کی یہاں ممانعت آ رہی ہے، اور نہ اُس کے اوپر وہ تشدّد اختیار کیا جا سکتا ہے جو بینات کے مسائل میں ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ اس قسم کے اختلاف کی بناء پر اُن کے تشدّد کو روا رکھتے ہیں تو پھر اگر "اہلِ حدیث" کہلانے

والے تمہیں مشرک کہتے ہیں تو تمہیں تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ اب ان (بریلویوں) کی بات تو آپ کو معلوم ہو جاتی ہے چونکہ لاؤڈ سپیکر پر آواز سنائی دیتی ہے، کہ نانوتوی صاحب ؒ کو یوں کہہ گئے، اشرف علی تھانوی صاحب ؒ کو یوں کہہ گئے، اشرف علی تھانوی ایک ہزار! اور نانوتوی ایک ہزار! ابو حنیفہ کی جوتیوں پر قربان ہیں، اور اُن (غیر مقلدین) سے جا کر پوچھو ابو حنیفہ ؒ کے متعلق وہ کیا کہتے ہیں؟ جن کو بغل میں لے کر اُن کے ساتھ محبتیں کرتے ہو اور آپس میں پیار سے پھرتے ہو، اُن کی کتابیں اُٹھا کر دیکھو، وہ حنفیوں کو سوائے یہودی کے کسی لفظ سے یاد نہیں کرتے، اُن کی کتاب ''نتائج التقلید'' اُٹھا کر دیکھو، تمہاری آنکھیں کھلیں کہ اُن کے کیا نظریات ہیں؟ اس کتاب پر پاکستان کے تمام اہل حدیثوں کے دستخط ہیں اور تصدیق ہے، ایک ایک کا نام لے کر انہوں نے نوچا ہوا ہے، بمع حضرت لاہوری ؒ کے اور بمع مولانا خیر محمد صاحب ؒ خیر المدارس والوں کے، جس وقت کوئی مسئلہ نقل کریں گے تو کہتے ہیں حنفی دُکان کا یہودی دُودھ، وہ کہتے ہیں کہ حنفیت جتنی ہے سب یہودیت ہے۔ یہ اسی قسم کے تشدد کے نتیجے ہیں جنہوں نے اُمت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔

سوال:- ان کے ساتھ تو عقائد میں اختلاف ہے، حاضر ناظر کا مسئلہ ہے، علم غیب کا مسئلہ ہے، مختار کل کا مسئلہ ہے۔

جواب:- بس! جو قطعی مسئلہ ہے اُس کا جو انکار کرے گا کافر ہے۔

سوال:- پھر تو کفر کا فتویٰ دینا چاہیے؟

جواب:- میں تو دے رہا ہوں کہ جو قطعیات کا منکر ہے کافر ہے۔

سوال:- مجمل کیوں کہتے ہیں؟

جواب:- کوئی مسئلہ بتاؤ، میں نے بشر کے مسئلے کی تفصیل نہیں کر دی؟

سوال:- یہ جو حاضر ناظر کا مسئلہ ہے؟

جواب:- حاضر ناظر کے مسئلے میں اگر اُن کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرح ہر جگہ ہر وقت حاضر ناظر ہیں تو یقیناً کافر ہیں، اور اگر وہ کہتے ہیں کہ آتے جاتے رہتے ہیں تو پھر کافر نہیں ہیں۔

سوال:- آپ یہ بتائیں کہ اُن کا عقیدہ کیا ہے؟

جواب:- میں تو مسئلہ بتا سکتا ہوں، باقی! اُن کا عقیدہ کیا ہے؟ اِس کی ذمہ داری پوچھنے والے پر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہر جگہ، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرح وہ حاضر ناظر ہیں تو یقیناً کافر ہے، کوئی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ آتے جاتے رہتے ہیں تو یہ کوئی کفر نہیں ہے، کیونکہ جو آنے جانے والا ہوتا ہے وہ حاضر ناظر نہیں ہوتا، پھر اُن کی تعبیر کی غلطی ہے۔

سوال:- یہ تو ہماری طرف سے تاویل ہے، وہ تو کہتے ہیں ہر جگہ حاضر ناظر ہیں۔

جواب:- اگر کوئی کہے تو وہ کافر ہے۔

سوال:- وہ سب کہتے ہیں۔

جواب:- اس کی ذمہ داری میرے اُوپر نہیں ہے کہ کون کہتا ہے، جو کہے کافر ہے، اس سے زیادہ انصاف کی بات اور

آپ کیا سننا چاہتے ہیں؟ باقی! میں نام لے کر کہوں کہ تو ایسا ہے، فلاں ایسا ہے، میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا، کہ میں یہ ثبوت مہیا کروں کہ واقعی آپ کے نظریات ایسے ہیں اور فلاں کے ایسے ہیں۔

سوال:-نظریات توان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔

جواب:- وہ بھی آپ نے پڑھی ہوں گی، میں نے نہیں پڑھیں۔ یہ تقریریں سُن سُن کر اور اسٹیج کے معاملے دیکھ دیکھ کر طبیعت کے اندر ایسا تشدّد آ گیا کہ سمجھائی ہوئی بات سمجھ میں آتی ہی نہیں، یعنی اتفاق کی طرف تو آنے کی کوئی سوچتا ہی نہیں۔

''کُفر'' کا لفظ کس کس پر صادق آتا ہے؟

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ جس دن بعض چہرے روشن ہوں گے نورانی ہوں گے اور بعض سیاہ ہوں گے، فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ جن کے چہرے اُس دن سیاہ ہوں گے انہیں کہا جائے گا کہ کیا تم نے ایمان کے بعد کُفر کیا، اب دیکھو! یہاں بھی ایمان کے بعد کُفر کا لفظ ہے، مُرتد پر تو یہ بات صراحتاً صادق آتی ہے کہ پہلے وہ ایمان لایا پھر اُس نے کُفر اختیار کر لیا، منافق پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ زبان سے ایمان لایا اور دل سے کُفر اختیار کر لیا، اور مبتدع پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ رسول پر ایمان لا کر اور اِتباعِ سُنّت کا دعویٰ کر کے پھر اُس نے عملاً کُفر اختیار کر لیا، اور اصلی کافر پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ عالم ارواح میں ''بلیٰ'' کہہ کر ایمان لایا اور دُنیا میں آ کر کُفر کر لیا، اور اہلِ کتاب پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ پہلے انبیاء پر ایمان لائے، بعد میں دوسرے نبی کا انکار کر کے کُفر اختیار کر لیا، تو گَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ میں سارے آ سکتے ہیں۔ پھر اللہ کی کتاب کی حکمت دیکھو، کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ عذاب چکھو تم اپنے کُفر کے سبب سے، یہاں خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اور اس قسم کی بات کا ذکر نہیں، چونکہ بعضوں کا عملی کُفر ہوگا وہ بعد میں سزا سے چھوٹ بھی جائیں گے، جیسے ایک آدمی مبتدع ہے اور اُس کا عمل سُنّت کے خلاف ہے تو وہ دائمی جہنمی نہیں بلکہ سزا پا کر ایک دن چھوٹ جائے گا، کیونکہ کُفر عملی بھی ہوتا ہے اور عقیدے کا بھی ہوتا ہے، سب طبقوں پر درجہ بدرجہ یہ بات صادق آئے گی۔ ''اور جن کے چہرے روشن ہو گئے، نورانی ہو گئے'' جس کا مطلب ہے کہ اُن کے دل میں ایمان ہے، اتباعِ سُنّت کا اُن کے اُوپر نُور ہے، ''وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے'' یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو پہلے اللہ کی رحمت میں لے جانے کے بعد پھر کسی وجہ سے نکال دیا جائے، ایسا نہیں، تو پچھلے جملے میں لفظِ کُفر کے اندر تعمیم ہے جو عملی کُفر پر بھی صادق آتا ہے، تو وہاں بعد میں نجات بھی ہو سکتی ہے، لیکن چہرے نُورانی ہو جانے کے بعد، اللہ کی رحمت میں جب چلے جائیں گے تو اُس کے بعد نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، پھر ہمیشہ کے لئے وہیں رہیں گے۔ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ: یہ باتیں جو ہم نے آپ پر پڑھی ہیں سب واقع کے مطابق ہیں، سچّی ہیں، ٹھیک ٹھیک ہیں، ہم آپ پر یہ پڑھتے ہیں، ''اور اللہ تعالیٰ جہانوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا'' کہ اُن کی کوئی حق تلفی کرے، ''اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اُسی کی طرف ہی سب اُمور لوٹائے جائیں گے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم بہترین جماعت ہو جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں کے نفع کے لئے، حکم دیتے ہو تم نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ

اور ایمان لاتے ہو تم اللہ پر، اور اگر کتاب والے ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا، ان میں سے بعض لوگ ایمان لانے والے ہیں

وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ

اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں ﴿۱۱۰﴾ ہرگز یہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر کچھ تکلیف پہنچانا، اور اگر یہ تمہارے ساتھ لڑیں

يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا

تو تمہاری طرف پیٹھیں پھیرلیں گے، پھر یہ مدد نہیں کئے جائیں گے ﴿۱۱۱﴾ تھوپ دی گئی ان کے اوپر ذلت جہاں بھی یہ پائے جائیں

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

مگر اللہ کے سہارے سے اور لوگوں کے سہارے سے اور یہ لوٹے اللہ کے غضب کے ساتھ اور لازم کردی گئی ان کے اوپر

الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ

مسکنت، یہ اس سبب سے ہے کہ بیشک یہ لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ

اور یہ اس سبب سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے نکلتے تھے ﴿۱۱۲﴾ سب اہل کتاب برابر نہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت

قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

سیدھے راستے پر قائم ہونے والی ہے، پڑھتے ہیں وہ اللہ کی آیات کو رات کے حصوں میں اس حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر اور حکم دیتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے

وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ

اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں صالحین میں سے ﴿۱۱۴﴾ جو اچھا کام یہ کریں گے

فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ

اُس کی ناقدری نہیں کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ متقین کو جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہرگز اُن کے کام

عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

نہیں آئیں گے اُن کے اموال اور نہ اُن کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، اور یہ لوگ جہنم والے ہیں،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ

اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۱۶﴾ مثال اُس چیز کی جس کو خرچ کرتے ہیں یہ دنیوی زندگی میں، ایسے ہے جیسے کہ ہوا ہو،

فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ

اس میں پالا (سخت سردی) ہو، پہنچ جائے وہ ہوا ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر پھر وہ ہوا اُس کھیتی کو ہلاک کردے،

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا

اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن یہ لوگ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے ہیں ﴿۱۱۷﴾ اے ایمان والو! تم کسی کو مخلص دوست نہ بنایا کرو

بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ

اپنی جماعت کو چھوڑ کر، یہ کوتاہی نہیں کرتے تمہیں خرابی پہنچانے میں، چاہتے ہیں یہ لوگ تمہارا مشقت میں واقع ہونا، تحقیق

بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا

ظاہر ہوگیا بغض ان کے مونہوں سے، اور جس چیز کو ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بہت بڑی ہے، ہم نے تمہارے لئے

لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ

آیات واضح کردیں اگر تم عقل رکھتے ہو ﴿۱۱۸﴾ خبردار! تم ہی یہ لوگ ہو کہ تم تو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے

وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا

اور تم ساری کتابوں پر ایمان لاتے ہو، اور جس وقت وہ تمہیں ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے، اور جب

خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ

خلوت میں چلے جاتے ہیں تو کاٹتے ہیں تم پر انگلیاں غصے کی وجہ سے، آپ کہہ دیجئے کہ مر جاؤ تم اپنے غصے کی وجہ سے،

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ز
بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کو ﴿۱۱۹﴾ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پہنچتی ہے تو اُن کو وہ غم میں ڈال دیتی ہے،
وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا
اور اگر تمہیں کوئی بُری حالت پہنچتی ہے تو اُس کی وجہ سے وہ خوش ہو جاتے ہیں، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو
لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع
تو ان کا مکر و فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا، بے شک اللہ تعالیٰ اُن کے عملوں کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۲۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ: تم بہترین اُمت ہو، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ: ظاہر کیے گئے ہو لوگوں کے لئے، اُخْرِجَتْ کے اندر مؤنث کی ضمیر آ گئی اُمَّةٍ کے لفظ کی طرف دیکھتے ہوئے، تم ایسی بہترین جماعت ہو جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں کے لئے، لوگوں کے نفع کے لئے، لوگوں کی اصلاح کے لئے، لوگوں کی ہدایت کے لئے، تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ: حکم دیتے ہو تم معروف کا، وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: اور روکتے ہو منکر سے، وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: اور ایمان لاتے ہو تم اللہ پر، وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ: اور اگر کتاب والے ایمان لے آتے، لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: تو ان کے لئے بہتر ہوتا، مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ: ان میں سے بعض لوگ ایمان لانے والے ہیں، وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ: اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں، فاسق فِسق سے لیا گیا ہے، اور فسق کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا خروج عن الطاعة، جو کفر پر بھی صادق آتا ہے، یہاں چونکہ مؤمنون کے مقابلے میں فاسقون کا لفظ آیا ہے، تو یہ فسق کفر کو شامل ہے، یعنی اُن میں سے بعض تو ہیں جو اللہ کی باتوں کو ماننے والے اور ایمان لانے والے ہیں، اور بعض منکر ہیں، تو یہ فاسق مؤمن کے مقابلے میں ہے۔ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ: ہرگز یہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے، اِلَّآ اَذًى: مگر کچھ تکلیف پہنچانا، وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ: اور اگر یہ تمہارے ساتھ لڑیں، يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ: تو تمہاری طرف پیٹھیں پھیر لیں گے، ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ: پھر یہ مدد نہیں کیے جائیں گے، ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ: چمٹا دی گئی ان کے اوپر، لازم کر دی گئی اِن کے اوپر، تھوپ دی گئی ان کے اوپر ذلت، اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا: جہاں بھی یہ پائے جائیں، اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ: مگر اللہ کے سہارے سے، وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ: اور لوگوں کی طرف سے سہارے سے، یعنی دو وجہوں سے یہ ذلت سے بچ سکتے ہیں ایک اللہ کی طرف سے سہارا، اور دوسرا لوگوں کی طرف سے سہارا، وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: اور یہ لوٹے اللہ کے غضب کے ساتھ، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ: اور لازم کر دی گئی اِن کے اوپر مسکنت، مسکینی، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ اس سبب سے کہ بیشک یہ لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ: اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا: اور یہ اس سبب سے کہ انہوں نے نافرمانی کی، وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: اور حد سے نکلتے تھے۔ لَيْسُوْا سَوَآءً: سب اہل کتاب برابر

نہیں، مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ: اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت سیدھے راستے پر قائم ہونے والی ہے، قائمہ مستقیمہ کے معنی میں ہے، اللہ کی طاعت کے ساتھ قائم ہے، اِن میں سے ایک جماعت سیدھی راہ پر کھڑی ہونے والی ہے، یا، اللہ کی طاعت پر قائم رہنے والی ہے، یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ: پڑھتے ہیں وہ لوگ اللہ کی آیات کو، اٰنَآءَ الَّیْلِ: رات کے حصوں میں، وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ: اس حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں، یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: ایمان لاتے ہیں اللہ پر، وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: اور پچھلے دن پر، وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ: اور حکم دیتے ہیں نیکی کا، وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: اور روکتے ہیں برائی سے، منکر سے، وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ: اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں، دوڑتے ہیں اچھے کاموں میں، وَاُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ: یہی لوگ ہیں صالحین میں سے، وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ: جو کچھ یہ لوگ کریں گے، یعنی یہ صالحین، یہ گروہ جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، جو اچھا کام یہ کریں گے، فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ: اُس کی ناقدری نہیں کیے جائیں گے، وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ: اللہ تعالیٰ متقین کو جاننے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا: ہرگز اُن کے کام نہیں آئیں گے اُن کے اموال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، وَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: اور یہ لوگ جہنّم والے ہیں، هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: مثال اُس چیز کی جس کو خرچ کرتے ہیں یہ دُنیوی زندگی میں، كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ: ایسے ہے جیسے کہ ہوا ہو اور اُس میں صِر ہو، صِر کہتے ہیں پالے کو، یہ جو کورا پڑتا ہے فصل پر، ''اُس میں پالا ہو'' اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ: پہنچ جائے وہ ہوا ایسے لوگوں کی کھیتی کو، ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ: جنہوں نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر، فَاَهْلَكَتْهُ: پھر وہ ہوا اس کھیتی کو ہلاک کردے۔ تو مَا یُنْفِقُوْنَ کی مثال حَرْثَ قَوْمٍ ہے، مثال مرکب دی گئی ہے جس میں مشبہ بہ حَرْثَ قَوْمٍ ہے، اِن کے خرچ کیے ہوئے کی مثال ایسی قوم کی کھیتی کی ہے جس کھیتی کے اوپر سرد ہوا آجائے، کورا پڑ جائے، اور وہ ہوا اُس کو ہلاک کردے، وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ نے اِن پر ظلم نہیں کیا، وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ: لیکن یہ لوگ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے ہیں۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ: بطانہ: صاحب سِر، رازدار، قابلِ اعتماد دوست، جس کو انسان اپنے اَسرار ورُموز اور اپنے بھید کی باتوں پر مطلع کرتا ہے اُس کو بطانة کہتے ہیں، یعنی جگری دوست، بطانہ اصل کے اعتبار سے ظِهَارَة کے مقابلے میں ہے، یہ جو کپڑے ہوتے ہیں مثلاً یہ کوٹ ہے، اِس کے اُوپر والا کپڑا ظہارہ کہلاتا ہے، اور اُس کے اندر کا کپڑا جو بدن کے ساتھ متصل ہے وہ بطانہ کہلاتا ہے، اسی طرح لحاف اور رضائی کے اوپر والا کپڑا ظہارہ کہلائے گا اور اُس کے نیچے والا کپڑا بطانہ کہلائے گا، تو دوستوں میں سے بطانہ وہ دوست ہوتا ہے جس کو انسان اپنے دل میں جگہ دیتا ہے، اور اُس کو اپنے خفیہ اُمور میں مشیر بناتا ہے، اس پر اعتماد کرتا ہے، اپنے راز اور بھیدوں سے اُس کو مطلع کرتا ہے، اُس کو کہتے ہیں بطانہ۔ مِّنْ دُوْنِكُمْ: اپنی جماعت کو چھوڑ کر، مؤمنین کو چھوڑ کر کسی کو تم مخلص دوست، صاحب سِر نہ بنایا کرو، کسی پر اعتماد نہ کیا کرو، کسی کو اپنے راز اور بھید نہ دیا کرو، حاصل یہ ہوگا۔ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا: یہ لوگ جو مؤمنین کے علاوہ دوسرے ہیں یہ کوتاہی نہیں کرتے تمہیں خرابی پہنچانے میں، اَلَا یَاْلُوْ: کوتاہی کرنا، خبال: فساد، خرابی، ''تمہیں خرابی پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے''، وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ: عَنِتَ: مشقت میں واقع ہونا، مَا مصدریہ ہے، چاہتے ہیں یہ لوگ تمہارا مشقت میں واقع ہونا، قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ: تحقیق ظاہر ہوگیا بغض ان کے مونہوں سے، یعنی جس وقت یہ باتیں کرتے ہیں تو اِن کی باتوں میں اس قسم کے الفاظ

آ جاتے ہیں جن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اِن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کتنی جلن ہے،'' ظاہر ہو گیا بغض اِن کے مونہوں سے'' یعنی اِن کی زبان سے اوران کی باتوں سے بھی بغض ٹپکتا ہے، وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ: اورجس چیز کو ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بہت بڑی ہے، یعنی جتنا بغض اِن کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے اِن کے دلوں میں اس سے زیادہ بغض بھرا ہوا ہے، قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ: ہم نے تمہارے لیے آیات واضح کردیں، نشانیاں واضح کردیں، اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ: اگرتم عقل رکھتے ہو، اگرتم سوچتے ہو، یعنی اگرتم سوچو تو انہی نشانیوں سے تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ یہ خیرخواہ نہیں ہیں بلکہ تمہارے بدترین قسم کے دشمن ہیں، اور اگرتم انہیں قابلِ اعتماد دوست سمجھو گے اور اپنے اَسرار ورُموز پر اِن کو مطلع کرو گے تو یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے، اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ کا یہی معنی ہے کہ اِن علامات اور اِن نشانیوں سے اِن کی دشمنی کو سمجھ سکتے ہو اگرتم عقل سے استدلال کرواور عقل سے کام لو، ھٰاَنْتُمْ اُولَآءِ: خبردار! تم ہی یہ لوگ ہو، تُحِبُّوْنَھُمْ: یہ خطاب اہلِ ایمان کو ہے، تم تو اِن سے محبت کرتے ہو، وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ: اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے، وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّہٖ: اورتم ساری کی ساری کتابوں پر ایمان لاتے ہو، وَاِذَا لَقُوْکُمْ: اورجس وقت وہ تمہیں ملتے ہیں، قَالُوْٓا اٰمَنَّا: کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے، وَاِذَا خَلَوْا: اورجس وقت خلوت میں چلے جاتے ہیں، عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ: عَضَّ یَعَضُّ: منہ کے ساتھ کاٹنا، انامل اَنْمُلَۃ کی جمع ہے بمعنی سرانگشت، جس کو ہم پورا کہتے ہیں، اور غیظ کا معنی غصہ، جب خلوت میں چلے جاتے ہیں تو کاٹتے ہیں تم پر اُنگلیاں غصے کی وجہ سے، غصے کی بنا پر ہاتھ کاٹنا، یعنی انسان جب غصے میں آتا ہے اور دوسرے پر زور نہیں چلتا تو اپنے ہی ہاتھوں کو کاٹنا شروع کردیتا ہے، اور ہمارے محاورے میں زیادہ تر لفظ آتا ہے دانت پیسنا، آپ دیکھ لینا جب کبھی انسان کو غصہ آیا ہوا ہو تو اس وقت دانت خوب پیستا ہے، یعنی اس سے وہ اظہار یوں کیا کرتا ہے کہ میرا بس چلے تو تجھے یوں چبا جاؤں، اوراس طرح سے دانتوں کے نیچے رکھ کے رگڑ دوں، وہ اپنے جذبات اس سے ظاہر کرتا ہے، اور ہاتھ کاٹنا بھی ایسے ہوتا ہے، وہ بھی اِسی بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر میرا زور چلے تو تجھے کچے کو چبا جاؤں، اور کچے کو چباتا یہ بھی ہماری زبان میں لفظ استعمال ہوتا ہے۔'' جب خلوت میں چلے جاتے ہیں تو تم پر اُنگلیاں کاٹتے ہیں غصے کی وجہ سے'' قُلْ: آپ کہہ دیجیے، مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ: مرجاؤ تم اپنے غصے کی وجہ سے، یعنی اگرتم اس غصے کے اندر مر بھی جاؤ تو بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، تم جو چاہو غصہ کرلو، اِنَّ اللہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، بِاُمُوْرٍ (یا) بِاَقْوَالٍ ذَاتِ الصُّدُوْرِ، جو دِلوں کے اندر تمہارے امور ہیں، تمہارے دِلوں کے اندر جو باتیں چھپی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو بھی جاننے والا ہے۔ اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَۃٌ: اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پہنچتی ہے، تَسُؤْھُمْ: تو اُن کو وہ غم میں ڈال دیتی ہے، وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَۃٌ: اور اگر تمہیں کوئی بری حالت پہنچتی ہے، یَّفْرَحُوْا بِھَا: تو اُس کی وجہ سے وہ خوش ہوجاتے ہیں، وَاِنْ تَصْبِرُوْا: اور اگر تم صبر کرو، وَتَتَّقُوْا: اور تقویٰ اختیار کرو، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرو، اور صبر اور استقامت اختیار کرو، لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا: تو ان کا مکروفریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اِنَّ اللہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ: بیشک اللہ تعالیٰ اِن کے عملوں کا احاطہ کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں یہ لفظ آئے تھے کہ تم میں ایسی جماعت ضرور موجود رہنی چاہیے جو دعوت الی الخیر کا کام کرتی رہے، اور اَمر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے، اس رکوع کی پہلی آیت اسی مضمون کا تتمہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں خیر اُمت بنایا ہے، اور تمہاری خیریت اِسی وجہ سے ہی ہے کہ تمہارے ذِمّے یہ فرض لگایا گیا ہے کہ تم نیکی پھیلاؤ اور بُرائی کو مٹاؤ، اور اللہ پر کامل درجے کا ایمان رکھو۔ پہلی اُمتیں جو گزری ہیں اُن کے مقابلے میں اس اُمت کو جو خیرِ اُمت کہا گیا، اور ان کی خیریت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ لوگوں کا مفاد، لوگوں کی ہدایت، اور لوگوں کی اصلاح تمہارے ذِمّے ہے، اور تم نے اس بات کی نگہداشت کرنی ہے، اور اس فرض کی ادائیگی یعنی لوگوں کی اصلاح اور لوگوں کی ہدایت کا فرض جو تم پر ڈالا گیا اس کی ادائیگی اس صورت میں ہوگی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو خاص طور پر اپناؤ، اور اللہ پر کامل ایمان رکھو۔

اُمتِ محمدیہ افضل کیوں؟

باقی اُمتوں کے مقابلے میں یہ چیز امتیاز اس وجہ سے رکھتی ہے، کہ سرورِ کائنات ﷺ سے پہلے انبیاء ﷺ کا سلسلہ جاری تھا، ایک نبی دُنیا سے تشریف لے جاتے تھے تو فوراً دوسرے نبی آجاتے تھے، اور ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی آئے، اُس وقت زیادہ تر تبلیغ کا فریضہ انبیاء ﷺ کے ہی سپرد تھا، اور وہی وعظ و نصیحت کرتے تھے، لوگوں کے مفاد کی نگرانی کرتے تھے، اور اُمتوں پر اتنا بوجھ نہیں ڈالا گیا تھا، کہ اُن کو دوسرے لوگوں کے لئے مبلغ قرار دیا جائے، اور اس دِین کی اشاعت اُن کے ذِمّے لگائی جائے، براہِ راست اُمتوں پر یہ بوجھ نہیں ڈالا گیا، سرورِ کائنات ﷺ جس وقت تشریف لے آئے تو آپ کے بعد چونکہ انبیاء ﷺ کا سلسلہ ختم ہوگیا، اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک آنے والی مخلوق کی ہدایت اپنے ذمے لی ہوئی ہے کہ اُن کی راہنمائی کرنی ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ کے بعد یہ ذمہ داری مجموعی طور پر اُمت کے کندھوں پر ڈال دی گئی، اس لئے مجموعی طور پر یہ اُمت اُس فرض کی حامل ہے جو فرض گزشتہ اُمتوں میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء ﷺ پر عائد کیا تھا، اس لئے اس دِین کی حفاظت اور اس کی اشاعت کے یہ ایسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے کہ پہلے زمانے میں انبیاء ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے: ''كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ''[1] بنی اسرائیل کی سیاست تو انبیاء ﷺ کے ہاتھ میں تھی (یہ روایت ہے جس میں سیاست کا لفظ آیا ہوا ہے) اُن کی سیاست انبیاء ﷺ کیا کرتے تھے، اور میرے بعد انبیاء تو ہوں گے نہیں، خلفاء ہوں گے، اور وہ بہت زیادہ ہوں گے، تو جو کام بنی اسرائیل کے انبیاء کے ذِمّے لگایا گیا تھا وہ میرے خلفاء کے ذِمّے ہوگا۔ خلفاء کا مصداق اوّل درجے میں تو وہی لوگ ہیں جو اقتدار حاصل کریں گے، اُن کو دینی و دُنیوی دونوں طور پر سرورِ کائنات ﷺ کی نیابت حاصل ہوگی، جیسے کہ خلفائے راشدین کے

---

(۱) بخاری ۱/۴۹۱، باب ماذکر عن بنی اسرائیل۔ مسلم ۲/۱۲۶، باب وجوب الوفاء۔ مشکوٰۃ ص ۳۲۰، کتاب الامارۃ فصل اوّل عن ابی ہریرۃ

دور میں تھا، کہ اُن کی دینی حیثیت بھی تھی اور دُنیوی حیثیت بھی تھی، انتظامِ ملکی اور اُمت کی تنظیم اور اُمت کے دین وعقیدہ اور عمل کی حفاظت اُن لوگوں کے ذمے تھی حضور ﷺ کے نائب ہونے کی بناء پر۔ اور اگر اس قسم کا طبقہ اقتدار پر موجود نہ رہے تو علماء مشائخ اور قاری یہ سارے کے سارے حضور ﷺ کی خلافت میں ہی یہ سارے کام سرانجام دے رہے ہیں، تو انبیاء ﷺ والا کام اِس اُمت پر ڈال دیا گیا، جس کی بناء پر اس اُمت کو باقی اُمتوں کے مقابلے میں خَیْرَ اُمَّۃٍ قرار دیا گیا۔ ''لوگوں کے نفع کے لئے ظاہر کی گئی ہے'' کہ جس طرح انبیاء ﷺ کا وجود رحمت ہوتا ہے، کہ لوگوں کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اچھے کاموں کی تلقین کرتے ہیں، اب یہ ڈیوٹی تمہاری ہے، تم نے اس دین کی اشاعت کرنی ہے اور اس دُنیا میں معروف کو پھیلانا ہے اور منکر کو مٹانا ہے۔

دعوت کب مؤثر ہوتی ہے؟

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: اور تم اللہ پر ایمان لاتے ہو، ظاہری طور پر اگرچہ یہ صیغے بطور خبر کے آئے ہیں کہ تم ایسے ہو، تم ایسے ہو، اور اصل مقصد انشاء ہے کہ تم نے ایسا کرنا ہے، اپنے ایمان کو بھی کامل رکھنا ہے، اور اپنے ایمان کو کامل رکھنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کہ عقیدہ بھی صحیح ہو اور اُن عقائد کے مطابق عمل بھی ہو، تب جا کے کہتے ہیں کہ ایمان کامل ہے، اور اگر عمل کے اندر نقص آجائے تو عمل میں نقص آنے کے ساتھ ایمان میں نقص آتا ہے، ایمان ناقص ہوجاتا ہے۔ تو جس وقت ان ہدایات پر جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، جن کا پھیلانا تمہارے ذمے لگایا ہے، اُن ہدایات پر اگر عمل نہیں ہوگا تو تمہارا اپنا ایمان کامل نہیں ہوگا، پھر کھوکھلے سینوں سے چاہے کتنی زوردار وعظیں کیوں نہ ہوں، اور کتنی اُونچی آوازیں کیوں نہ نکلیں، منبر اور اسٹیج سے اگرچہ اونچی آواز کے ساتھ آپ لوگوں کو دعوت الی الخیر دیں گے لیکن اگر اپنا ایمان کامل نہیں ہے اور اپنے عقائد مضبوط نہیں ہیں تو ان کھوکھلے سینوں سے نکلی ہوئی چیخیں اثر نہیں دکھاسکتیں، ان کے اندر اثر تبھی پیدا ہوتا ہے جب انسان کے اپنے اندر بھی عقیدے کی پوری کی پوری قوت موجود ہو، اور پھر اُس کے مطابق انسان کا عمل بھی ہو، تب جا کے اُس سے خیر پھیلا کرتی ہے، ورنہ پھر حال وہی ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ بقرۃ میں بنی اسرائیل کا ذکر کیا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (آیت: ۴۴) کہ لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ اور جو خود بھولا بیٹھا ہے اور لوگوں کو کہتا ہے کہ میں تو ایسا ہوں یعنی عملاً وہ یوں اظہار کرتا ہے، اور دوسرے کو کہے کہ یہ کام کر، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خود کہنے والے کے دل میں اُس کام کی اہمیت نہیں ہے، جب خود کہنے والے کے دل میں اُس کی اہمیت نہیں تو دوسرا اُس سے کیا متاثر ہوگا؟ اس لئے کامل طور پر تم یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر والا فرض تبھی ادا کرسکو گے کہ تمہارا اپنا ایمان بھی کامل ہو، اور اپنے ایمان کا کمال یہی ہے کہ جو کہو عمل کے ساتھ ثابت کرو کہ ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں، اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ نماز چھوڑنے کے ساتھ دوزخ میں جانا پڑے گا تو خود نماز نہ چھوڑو، تب پتہ چلے گا کہ تمہیں اس دی ہوئی خبر پر یقین ہے، اور تم واقعی سمجھتے ہو کہ ایسے ہی ہے کہ جو نماز نہیں پڑھے گا دوزخ میں جائے گا۔ اگر زبان سے کہتے ہو کہ شراب نہ پیو کیونکہ اس کے اندر بہت ساری خرابیاں ہیں، تو عملاً تم بھی شراب کو ترک کردو، تب پتہ چلے گا کہ تمہیں اپنی بات پر یقین ہے، اور اگر لوگوں کو کہو کہ شراب نہ پیو اور خود شراب پیتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ظاہرداری اور سخن سازی ہے، ورنہ تمہیں خود بھی اپنی بات پر یقین نہیں ہے، اس سے پھر سننے

والے پر کوئی اچھے اثرات نہیں پڑا کرتے، اس لئے جو بھی داعی الی الخیر ہو اس میں ایمان کامل ضروری ہے، اور ایمانِ کامل عقیدہ اور عمل کا مجموعہ ہے۔ تو صورۃً یہاں خبر دی گئی ہے اور معنیً یہ انشاء ہے۔ کُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ میں ماضی کی خبر دینا مقصود نہیں، بلکہ اس میں دوام ہے جیسے کَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا میں آپ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے، اس میں صرف ماضی کے اندر ہی ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس میں دوام ہے، کہ تم ایسے ہو اور تمہارا فرض یہ ہے۔

''خَيۡرَ اُمَّةٍ'' کا منصب نسب سے نہیں، کردار سے ملتا ہے

وَلَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ: اس میں یہ بات کہہ دی گئی کہ پہلے زمانے میں جو اہلِ حق کی جماعت تھی اہلِ کتاب کہتے تھے کہ وہ ہم ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے علمی منصب انہی کے پاس ہی تھا، لیکن جب انہوں نے اُس منصب کو اپنے کردار سے، اپنی مفاد پرستی سے، اپنی دنیاداری سے، اور مال ودولت کی محبت سے ضائع کر دیا، اور یہ مخلوق کے لئے مفید نہ رہے اور حق اِن کی وجہ سے محفوظ نہ رہا، تو اب اس جماعت کو اِس منصب سے معزول کر دیا گیا، اور اب یہ منصب اِن (اُمتِ مسلمہ) کو دے دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خیر نصیب ہوتی ہے اس کا تعلق کسی نسل یا نسب کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ اُن اعمال پر ہے جو ذمے لگائے جاتے ہیں، جب اِن لوگوں نے اُن اعمال کو نہیں سنبھالا تو اِس منصب سے معزول ہو گئے، اگرچہ یہ اسرائیل کی اولاد میں سے ہیں، انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں، لیکن نسل کی بناء پر یہ خیریت اللہ کے ہاں نصیب نہیں ہوتی، خَيۡرَ اُمَّةٍ کا منصب اگر ملتا ہے تو اعمال اور کردار کی بناء پر ملتا ہے، اور جب اِنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی وراثت کو ضائع کر دیا تو یہ اس منصب سے معزول ہو گئے، اب اگر یہ اس منصب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اِن کا طریقہ بھی یہی ہے کہ موجودہ رسول پر ایمان لائیں، اور ایمان لا کر اُن کی ہدایات پر عمل کریں، یہ بھی خَيۡرَ اُمَّةٍ کا مصداق بن جائیں گے، وَلَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ کا یہی مطلب ہے۔

قرآنِ کریم کا طرزِ بیان منصفانہ ہے

مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ: پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یہ قرآنِ کریم کا انصاف ہے کہ جب یہ مخالفین کا ذکر بھی کرتا ہے تو یکسر رگڑا نہیں لگا دیتا، بلکہ اُن میں سے جو معتدل اور اچھے قسم کے لوگ ہوتے ہیں اُن کو ہمیشہ اِس مذمت سے مستثنیٰ کر لیا جاتا ہے، جماعت میں سارے افراد خراب نہیں ہوا کرتے، جماعتی سطح پر اگر کسی کے ساتھ اختلاف ہے تو ہوسکتا ہے کہ اُس میں ایسے افراد بھی ہوں جو کسی وجہ سے اُس جماعت کی طرف منسوب ہیں، لیکن اُن کے خیالات اور اُن کے جذبات اچھے ہیں، تو اُن کو اُس برائی بیان کرنے سے مستثنیٰ کر کے رکھو، اور یہی لوگ ہوتے ہیں کہ جب اُن کو حق سمجھایا جاتا ہے تو جلدی سے سمجھ جاتے ہیں اور سمجھنے کے بعد حق کو قبول کر لیتے ہیں، تو اہلِ کتاب میں جو اس قسم کے منصف لوگ تھے جنہوں نے اُس وقت بھی اپنے ایمان کو سنبھالا ہوا تھا، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت جب اُن کے ہاں پہنچی تو فوراً انہوں نے اُس کو قبول کر لیا، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہودیوں میں سے تھے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی اور حق ان کے سامنے آ گیا، فوراً انہوں نے قبول

کرلیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے بھی کسی درجے میں اپنے ایمان کو سنبھالے ہوئے تھے، دنیا کی محبت اور حُبِ جاہ میں مبتلا ہوکر انہوں نے اپنی صلاحیت کو خراب نہیں کیا تھا، اس لئے جب حق کی آواز اُن کے کان میں آئی تو انہوں نے فوراً لبیک کہہ دیا، اسی طرح نجاشی عیسائیوں میں سے، اور حضرت سلمان فارسیؓ، یہ جتنے لوگ تھے انہوں نے اپنے ایمان کو سنبھالا ہوا تھا، اُن کو فکر تھی، جیسے اُن کو حق معلوم ہوتا تھا اُس کو قبول کرتے تھے، اِسی صلاحیت کی بناء پر سرورِ کائنات ﷺ کی بات جب اُن کے سامنے آئی فوراً انہوں نے قبول کرلی، اِنہی لوگوں کا ذکر ہے کہ اِن میں سے بعض ایمان والے ہیں، اور اکثر ان میں سے نافرمان ہیں، فاسق ہیں، طاعت سے نکلے ہوئے ہیں۔

اہلِ طعن وتشنیع کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا طرزِ عمل

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى: اب چونکہ اُن کو اِس منصب سے معزول کردیا گیا اور صراحتاً یہ منصب بنی اسماعیل یعنی سرورِ کائنات ﷺ کی جماعت کو دے دیا گیا، تو اللہ تعالیٰ مطمئن کرتے ہیں کہ تم اب اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں لگو، یہ یہودی نصرانی اور مشرک جو تمہارے مخالف ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہاں جن اہل کتاب کا ذکر آرہا ہے لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ: یہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اِلَّآ اَذًى: سوائے تکلیف کے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ طعن وتشنیع کرلیں، بلاوجہ تم پر بہتان لگائیں، اِفترا پردازی کریں، فضول قسم کے اعتراضات کریں، جن کو سُن کر تمہارا دِل دُکھے، گالیاں دے لیں، بُرا بھلا کہہ لیں، اِس قسم کی تکلیفیں تو تمہیں پہنچیں گی، اور وہ کوئی ایسا نقصان نہیں جس کو ہم کہیں کہ جماعتی سطح پر نقصان ہے، تم اپنا کام کرتے چلے جاؤ، یہ بولیں گے، بُری زبان استعمال کریں گے، اَذًى سے مراد اِسی قسم کی طعن وتشنیع ہے۔ دوسری جگہ اِسی سورت میں ہی آئے گا وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا (آیت:۱۸۶) البتہ ضرور سنو گے تم، اَذًى كَثِيْرًا کو لَتَسْمَعُنَّ کا مفعول بنایا، اِن اہل کتاب کی طرف سے اور ان مشرکوں کی طرف سے تم اَذائے کثیرہ سنو گے، اور سننے کی چیز باتیں ہی ہوا کرتی ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اَذائے کثیرہ کا مصداق باتیں ہیں، تکلیف دِہ باتیں سنو گے تم اِن کی طرف سے، کبھی تمہیں گالی دیں گے، کبھی تمہارے پیغمبر کو بُرا بھلا کہیں گے، فضول قسم کے تم پر بہتان لگائیں گے، کہیں گے کہ "تم بزرگوں کے منکر ہو، تم بزرگوں کا طریقہ چھوڑ گئے، ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہمارے پاس ہے، انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہمارے پاس ہے"، اور گالیاں دیں گے، بُرا بھلا کہیں گے، بہتان لگائیں گے، اِفترا کریں گے، جیسے اُن کا طریقہ تھا، کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہم ہیں، اور تم لوگ ملتِ ابراہیمی کو چھوڑ گئے ہو، اور انبیاء علیہم السلام ہم میں آئے ہیں اور تم نے ہمارا طریقہ چھوڑ دیا، انبیاء علیہم السلام کا طریقہ چھوڑ دیا، انبیاء علیہم السلام کا قبلہ چھوڑ دیا، اِس قسم کی بہتان طرازی، گالی گلوچ، بُرا بھلا کہنا، یہ اُن کی طرف سے بہت سنو گے، اور وہی اَذًى كَثِيْرًا کا لفظ یہاں آیا ہے، تو یہ کوئی ضرر نہیں ہے، تم صبر کرنا، برداشت کرنا، تمہارا کچھ نقصان نہیں کرسکتے، جیسے کہا کرتے ہیں کہ باتوں سے کوئی پسلیاں نہیں ٹوٹا کرتیں، کسی آدمی نے اپنی زبان سے اگر کسی کو بُرا کہہ دیا تو ذرا تھوڑی سی برداشت کرنے والی بات ہے، ورنہ بات کے ساتھ کسی کی پسلی تو نہیں ٹوٹتی، کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ایسے وقت پر انسان دونوں کان استعمال کرے، کہ ایک کان سے سنا دوسرے سے نکال دیا، کیا ہوتا ہے؟ نہ دل خراب

کرنے کی ضرورت نہ دماغ پریشان کرنے کی ضرورت، ہاں یہ دیکھو! کہ وہ تمہیں نقصان کیا پہنچاتے ہیں؟ اگر کوئی نقصان پہنچاتے ہیں تو اُس کا دفاع ضرور کرو، اور اگر اپنی زبان کے ساتھ بھونکتے ہیں، بولتے ہیں، تو بولتے رہنے دو، تمہارا کیا نقصان کرتے ہیں۔ انبیاء ﷺ کا طریقہ یہی تھا کہ لوگوں کے ساتھ اس قسم کی باتوں میں نہیں اُلجھتے تھے جہاں اپنے دل کا غصہ نکالنے کے لئے انسان غلط زبان استعمال کرتا ہے، بدزبانی کرتا ہے، اس قسم کی چیزوں میں اُلجھنا انبیاء ﷺ کا طریقہ نہیں تھا۔ ہاں البتہ اگر کوئی معقول اعتراض ہے تو اُس کا جواب دو، کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کررہے ہیں تو اُس کا دفاع کرو، باقی! کسی کی زبان انسان نے کیا پکڑ لینی ہے۔ اور آپ خود ہی تو پڑھا کرتے ہیں، آپ بھی پڑھتے ہیں، دوسرے بھی پڑھتے ہیں:

سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سُن کر دُعائیں دِیں

اب اِس حصے کو آپ تقسیم کر لیجئے، اگر ایک طبقے کے حصے میں گالیاں دینا آگیا ہے تو تم دوسری سُنّت اپنالو، دُعائیں دینے والی، اور اگر گالیوں کے جواب میں تم نے بھی گالیاں شروع کر دیں تو ایک ہی سُنّت (طریقے) پر دونوں عامل ہوگئے اور ایک سُنّت دونوں سے ہی چھوٹ گئی، تو اگر ایک طبقہ بدبختی کے ساتھ اس سُنّت کو اپنالے کہ ہم نے تو گالیاں ہی دینی ہیں، اور وہ جب بولے بُرا ہی بولے، جب کسی کا ذکر کرے تو بُرے الفاظ کے ساتھ ہی کرے، تو دوسری سُنّت تم اپنے لیے لے لو، کہ تم اُن کے لئے دعائیں کرو کہ اللہ تمہیں ہدایت دے، اور اچھے الفاظ کے ساتھ تم اُن کے سامنے حق پیش کرو، اگر وہ قبول کریں تو اچھی بات ہے، اور اگر نہیں قبول کرتے تو تمہارا کیا نقصان ہے۔ یہ طرز ہے جو قرآنِ کریم کی طرف دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے، ورنہ اگر وہی طریقہ ہو جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ''اینٹ کا جواب پتھر سے دو، اگر وہ بولتے ہیں تو اُن کے دانت توڑ دو، یا بولتے ہیں تو اُن کی زبان گُدّی سے کھینچ لو'' تو ہم نے نہ آج تک کسی کو دانت توڑتے ہوئے دیکھا ہے، نہ زبان گُدّی سے کھینچتے ہوئے دیکھا ہے، ایسا تو ہوا کہ اُنہوں نے اپنی مجلس کے اندر بکواسات کر کے اپنے نامہ اعمال سیاہ کر لیے، اور دوسرے اپنی مجلس کے اندر بیٹھ کر اُسی لب و لہجے کے ساتھ اُن کے تذکرے کر کے اور ان کا مذاق اڑا کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کرتے ہیں، دانت نہ اِنہوں نے توڑے نہ اُنہوں نے توڑے، زبان نہ اِنہوں نے گُدّی سے کھینچی نہ اُنہوں کھینچی، بس یہ قوم کو اُلو بنانے والی بات ہے۔ ''ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے تمہیں'' اِلَّآ اَذًى: مگر کچھ تکلیف دِہ باتیں، یعنی طعن وتشنیع کریں گے، بُرا بھلا کہیں گے، گالی دیں گے، بہتان لگائیں گے، اِفترا پردازی کریں گے، وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ: اور اگر یہ تم سے لڑ پڑے، اگر کبھی انہوں نے ایسا کر لیا کہ لڑائی میں آگئے يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ: تو تمہاری طرف پیٹھ پھیر کے بھاگ جائیں گے، ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ: پھر یہ مدد نہیں کئے جائیں گے، چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ وہ یہود کے قبائل جو اردگرد موجود تھے، اُن میں نیک بخت لوگ تو ایمان لے آئے، دوسرے لوگوں نے سوائے اس قسم کی بہتان طرازی اور زبان درازی کے اور کوئی شغل نہیں رکھا، تو نتیجہ یہی ہوا کہ ذلیل ہوئے، اور پھر چھیڑ چھاڑ تک نوبت پہنچی تو کچھ قتل ہوئے، کچھ جلاوطن ہوئے، اور یہ سارے کا سارا حال ان کا ہوا اور بالکل برباد ہوگئے، صبر وتقویٰ کے ساتھ ہی ان کو اس بُرے انجام تک پہنچا دیا گیا۔

یہود کی ذِلّت ومسکنت کا ذِکراورایک شُبہ کا اِزالہ

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا: یہ آیات آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں گزری ہیں، سوائے ان لفظوں کے اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ، اور اِسی آیت کا حوالہ دے کر میں نے اس مضمون کی وضاحت وہیں سورۂ بقرہ میں کردی تھی، کہ یہ لوگ ذلت ومسکنت میں مبتلا کردیے گئے، قرآنِ کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کا معنی عبارت النص کے طور پر یہ ہو کہ ان کی حکومت کبھی نہیں بنے گی، البتہ ان لفظوں سے سمجھا گیا ہے کہ جب ان کے اوپر ذلت اور مسکنت لازم کردی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اِن کو دُنیا کے اندر جماعتی طور پر عزت نہیں ملے گی، جس کی وجہ سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی کہیں حکومت نہیں بنے گی، یہ مفسرین کے اقوال ہیں، قرآنِ کریم کے اندر اس قسم کا کوئی لفظ نہیں، کہ ہم کہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا کہ اِن کی کہیں حکومت نہیں بنے گی، یہ بات صراحتاً قرآن میں نہیں ہے، اللہ تو کہتا ہے کہ اِن کو ذلیل اور مسکین بنادیا گیا، ذلیل ہوگئے کہ لوگوں کی نظر میں عزت نہیں رہی، مسکین ہوگئے کہ اِن کے اپنے دل میں بھی حوصلے نہیں رہے، خودغرضی اور مفاد پرستی میں اس طرح مبتلا ہوئے کہ ان میں قربانی اور ایثار کا کوئی جذبہ نہیں رہا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر ان کو کوئی باوقعت اور باعزت حکومت بھی نہیں ملے گی، مفسرین کے ذکر کرنے کے ساتھ یہ صراحت ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں تو ان کی حکومت بن گئی، ٹھیک ہے دوہزار سال کے بعد یہ نوبت آگئی کہ ایک ٹکڑے کے اُوپر یہ حکومت بنا بیٹھے، یہ اسرائیل حکومت بن گئی، تو پھر اس پر اشکال ہوا، اور لوگ پوچھتے یونہی ہیں کہ قرآن میں تو آتا ہے کہ ان کی حکومت نہیں بنے گی جبکہ ان کی حکومت بن گئی؟ حالانکہ قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آتے، آپ کے سامنے ہے، اچھے بھلے لوگوں نے بھی یہ اشکال کیا ہے، کئی مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوا۔ تو اس شبہ کا جواب یہی ہے کہ دیکھو! یہاں استثناء ہے اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ، کہ یا تو اللہ کے ساتھ معاہدے کی وجہ سے ذلت ومسکنت سے بچ سکتے ہیں، یا لوگوں کے ساتھ معاہدے کی وجہ سے اور لوگوں کا سہارا لے کر بچ سکتے ہیں، اللہ کے ساتھ معاہدہ اس طرح کہ یا تو ایمان لے آئیں تب بچ جائیں گے، یا اللہ کے حکم کے تحت جو بعض افراد کو جان ومال کی امان حاصل ہے، کہ جو یہودی نصرانی اپنے عبادت خانوں میں عبادت میں لگے ہوئے ہیں، مسلمانوں کو حکم ہے کہ ان کا خیال کرو، ان سے کوئی تعرض نہیں کرنا، تو اُن کی جان ومال محفوظ ہے، اور اسی طرح عورتیں بچے، اور کمزور بوڑھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے امان دی ہوئی ہے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا تعرض جائز نہیں ہے، اس لئے جہاں جزیہ کی بات آتی ہے کہ ان پر جزیہ رکھا جائے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کے مذہبی آدمی اور نابالغ بچوں اور عورتوں پر جزیہ بھی نہیں رکھا جاتا، ان کو مسلمانوں کی حکومت میں امان حاصل ہے، ان سے تعرض نہیں کیا جاتا، عبادت گزار لوگ، تارک الدنیا، جو اپنے عبادت خانوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس قسم کے سیاسی امور میں کوئی دخل نہیں دیتے، مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ بازی میں نہیں آتے، اُن کی بھی پکڑ دھکڑ نہیں کی جاتی، اور عورتیں بچے، کمزور، بوڑھے، اس قسم کے سب لوگ۔ اور حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے کوئی معاہدہ کرلیں، کوئی مصالحت کرلیں، مسلمانوں سے معاہدے ہوجائیں تو مسلمانوں کے تحفظ میں آجائیں گے، اور یہاں ناس کا لفظ بولا ہے، یعنی عیسائیوں سے کرلیں، دہریوں سے کرلیں، آتش پرستوں

سے کرلیں، کسی سے کرلیں، تو اُن کے سہارے پر بھی یہ لوگ کچھ نہ کچھ اپنی زندگی بچا سکتے ہیں اور کسی درجے میں ذلت اور مسکنت سے نکل سکتے ہیں، چنانچہ آج یہ جو سلطنت ہے یہ بھی حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کا مظہر ہے، کہ اگر یہ دوسری حکومتیں جو اصولاً یہودی نہیں ہیں، یا وہ عیسائی ہیں، یا لا مذہب ہیں، اگر وہ اِن کو سہارا نہ دیں تو نہ اِن کا وجود بنتا اور نہ اِن کا وجود باقی رہے، اس وقت بھی اگر ان کا بقا ہے تو حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے ساتھ ہی ہے، اس لئے اس میں کوئی اِشکال نہیں۔ ''اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے'' یعنی ان کو تعلیم تو ایسی دی گئی تھی کہ اگر یہ اپناتے تو دُنیا اور آخرت میں عزت حاصل کرتے، لیکن اِنہوں نے اُس تعلیم کو چھوڑا تو دُنیا اور آخرت میں ذلیل ہوئے۔ ضُرِبَتْ کا معنی کہ اِن کے اُوپر لازم کردی گئی جیسے کسی دیوار کے اُوپر گارا لیپ دیا جاتا ہے اسی طرح اِن کے اُوپر بھی ذلت اور مسکنت کو لیپ دیا گیا، تھوپ دیا گیا، لازم کردیا گیا۔

تاریخِ یہود کے بدترین جرائم

اور یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، اور انبیاء ﷩ کو ناحق قتل کرتے تھے، اور یہ ان کی تاریخ کے بدترین قسم کے جرائم ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنا اور جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی یاددہانی کے لئے آتے تھے اور ان کو سیدھے راستے کی طرف بلانے کے لئے آتے تھے، یعنی انبیاء ﷩ اور آمرین بالقسط، جیسے دوسری جگہ ہے: يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ (سورۂ آل عمران: ۲۱) انبیاء کو بھی قتل کرتے تھے اور اِسی طرح آمرین بالقسط جو انصاف کا حکم دینے والے تھے اُن کو بھی قتل کرتے تھے، اولیاء اللہ اور انبیاء کے دشمن ہیں، تو جو جماعت اولیاء اللہ اور انبیاء کی دشمن ہوجائے وہ اپنے لئے دنیا اور آخرت میں عزت کیسے پاسکتی ہے؟ اِن کے پلے اگر ذلت نہ پڑے تو اور کیا ہوگا؟ ''ناحق قتل کرتے تھے'' ناحق کا لفظ زور دکھانے کے لئے ہے، ورنہ نبی کا قتل کسی صورت میں بھی حق نہیں ہوسکتا، جو اللہ کا نمائندہ ہے اور اللہ کی بات بتانے کے لئے آتا ہے اس کا قتل کبھی بھی حق نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی بِغَيْرِ حَقٍّ کا لفظ بڑھا کر اُس میں شدت پیدا کردی گئی، کہ ان کا سارے کا سارا اقدام ناحق ہے۔ اور یہ قتلِ انبیاء کی جرأت اور کفر بآیات کی جرأت اس وجہ سے ہوئی کہ ان میں عصیان ہے، سرکشی ہے، نافرمانی ہے، ان میں اطاعت کا جذبہ نہیں، اور جس شخص کے اندر بھی عصیان ہوگا، نافرمانی ہوگی اور گردن کشی ہوگی تو وہ اس کے نتیجے میں انکار بھی کرے گا، اور انبیاء ﷩ جو کہ اُن آیات پر چلانے کے لئے آتے ہیں اور اِن کی خواہشات کے خلاف ان کو حکم دیتے ہیں اُن کے جانی دشمن بھی ہوجائیں گے، ''اور یہ لوگ حد سے بڑھنے کے عادی ہیں'' حد پر یہ رہتے ہی نہیں۔

اہلِ کتاب کے منصف مزاج لوگ

ان کی اتنی زبردست مذمت جماعتی طور پر کی گئی، لیکن پھر وہی استثناء کرلیا گیا لَيْسُوْا سَوَآءً یہ سارے برابر نہیں ہیں، ان اہلِ کتاب میں سے بعض وہ بھی ہیں جو قائم علی الحق ہیں، حق کے اُوپر قائم ہیں، یہی لوگ جو ایمان لے آئے، جس وقت اُن کے سامنے حق کی آواز آئی فوراً انہوں نے اِس کو قبول کیا، يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ: اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں رات کے حصوں میں، رات کے حصوں کا خاص طور پر ذکر کیا، کیونکہ رات کی عبادت ہی اصل میں بے ریاء عبادت ہے، اور جس شخص کو اپنے انجام کا فکر ہوتا

ہے وہ رات کو ہی اللہ کی باتیں یاد کر کے اللہ کے سامنے روتا ہے، دن میں لوگوں کے سامنے رونے کی شکل بنالینا، آنسو بہالینا، یا لوگوں کو دکھانے کے لئے ریا کاری کی نمازیں پڑھ لینا، اِس میں بہت کچھ ہوسکتا ہے، ظاہرداری کے طور پر ایسا تو وہ لوگ بھی کر سکتے ہیں جن کا سرے سے آخرت پر ایمان ہی نہیں ہوتا، لیکن اپنا مطلب اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے نیکی کو ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن رات کی نماز اور خلوت میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور اللہ کے سامنے رونا سوائے اخلاص کے کبھی بھی نہیں ہوتا، اس لئے یہ لوگ آخرت کا فکر کرنے والے ہیں، اور اِس آخرت کے فکر کی وجہ سے رات کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں، اور رات کے مختلف حصوں میں اللہ کے سامنے سجدے کرتے ہیں، یہ ہے بے ریاء کی نماز جو خلوص کی علامت ہے، اور اللہ سے ڈرنے کی علامت ہے، اور آخرت کی فکر کی علامت ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اِس کو ذکر کیا گیا۔ ''اللہ پر ایمان لاتے ہیں، یومِ آخر پر ایمان لاتے ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں، بُرائیوں سے روکتے ہیں، اور نیکیوں میں دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں، یہی لوگ ہیں صالحین''، صالحین کی یہی علامتیں ہیں، جن میں سے خاص طور پر چند چیزوں کو ذکر کیا گیا، رات کو خلوت کی نماز، اللہ کے سامنے سجدہ ریزی، اور آخرت پر یقین پختہ، اللہ پر ایمان، اور نیکی پھیلانے کا جذبہ، برائی مٹانے کا جذبہ، اور جہاں نیکی کے کام آجائیں بھاگ بھاگ کر اور دوڑ دوڑ کر جانے کی عادت، صالحین کی یہی علامت ہے، یہی لوگ نیک ہوتے ہیں، یہی متقی ہیں جس کا ذکر آگے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ کے اندر کیا۔

بغیر ایمان کے نہ نیکی قبول ہے، نہ مال وغیرہ کام آئیں گے

اور جن کے یہ جذبات ہوں، یہ عقائد ہوں، یہ خیالات ہوں، یہ جو بھی نیکی کا کام کریں گے، فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ: اُس کی ناقدری نہیں کی جائے گی، ان کی ہر نیکی اللہ کے ہاں قبول ہوگی، اور اس نیکی پر اللہ تعالیٰ اجر وثواب دیں گے۔ بخلاف اس کے کہ جن کا ایمان صحیح نہیں وہ تو اس طرح سمجھو کہ جیسے کسی درخت کی جڑ کٹ گئی، اب اگر پتوں پر کوئی پانی چھڑکتا رہے، شاخوں کو کوئی سنبھالتا رہے تو یہ چیزیں سنبھالی نہیں جایا کرتیں، پھر پتے اور شاخ کسی کام کے نہیں جب جڑ محفوظ نہیں ہے، اسی طرح یہ دوسرے اہل کتاب کوئی نیکی کریں اُس کی کوئی قدر نہیں، اور یہ لوگ جن کا ایمان صحیح ہے یہ جو نیکی کریں گے اللہ کے ہاں قدر کی جائے گی، اُس کی بے قدری نہیں کی جائے گی، ''اللہ تعالیٰ متقین کو خوب اچھی طرح سے جاننے والا ہے''۔ اور جو کافر ہیں، جو ایمان نہیں لاتے، اور اپنی اس دنیا کی محبت کی وجہ سے، اور اپنے جتھے پر ناز کرنے کی وجہ سے اگر وہ اللہ کے سامنے اکڑے ہوئے ہیں، تو انہیں یہ خبر دے دو کہ ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا ہرگز کام نہیں آئیں گے ان کے اِن کے مال نہ اِن کی اولاد'' نہ ان کے جتھے کام آئیں گے، نہ ان کا مال کام آئے گا، جس مال کی محبت میں مبتلا ہو کر یہ ایمان سے دست بردار ہیں اللہ کے مقابلے میں یہ کچھ بھی کام نہیں آئے گا، ''اور یہ جہنم میں جانے والے ہیں اور اُس کے اندر ہمیشہ رہنے والے ہیں۔'' اور ظاہری طور پر اگر یہ خرچ کرتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیکی کے کام کر رہے ہیں، تو یہ بھی بے کار ہے، اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی ظالم قوم ہو اور اُس کی کھیتی ہے اور وہ کھیتی سرسبز ہے، لیکن اُس کے اُوپر ٹھنڈی ہوا آئی جس میں پالا تھا اور اُس سے کورا پڑ گیا، اور کورا پڑنے کے ساتھ وہ

سائی کی ساری کھیتی بے کار ہوگئی، تو جیسے ان کاشتکاروں کی محنت بے کار جاتی ہے اسی طرح وہ یہود ونصاریٰ جو ایمان نہیں لاتے، ظاہری طور پر اگر یہ خرچ کرتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں تو یہ بھی ایسے ہی بے کار ہے۔

ایک شُبہ کا جواب

تو یہاں مثال دیتے ہوئے حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کا لفظ بولا، کہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو وہ ہوا پہنچ جائے جو اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی کافر ہیں، اب سوال یہ ہے اگر ایسی ٹھنڈی ہوا آجائے جس میں پالا اور کورا ہے، وہ تو کسی ظالم کی کھیتی پر جائے گی تو اُس کو بھی برباد کردے گی، کسی صوفی صاحب کی کھیتی پر جائے گی تو اُس کو بھی برباد کردے گی۔ تو پھر ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کا لفظ کیوں بڑھا دیا؟ کیا نیک لوگوں کی کھیتی پر ایسی ہوا آجائے تو نقصان نہیں ہوتا؟ یقیناً ہوتا ہے، مؤمنوں کی کھیتی پر چلے تو بھی نقصان ہوتا ہے اور کافروں کی کھیتی پر چلے تو بھی نقصان ہوتا ہے۔ مفسرین اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کی قید اس لئے لگائی کہ جو ایمان والے ہیں، ظاہری طور پر اگر اُن کی کھیتیوں اور باغات پر کوئی آفت آ بھی جائے تو یہ اللہ کا امتحان ہوتا ہے، اور اگر وہ ساتھ صبر کرلیں تو اس کا اجر اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت میں دیتے ہیں، تو اُن کی کھیتی پوری طرح برباد نہیں ہوتی، اگر دنیا کے اندر نقصان ہو بھی جائے تو اس مصیبت پر آخرت میں ثواب ملتا ہے، پوری طرح سے کامل مکمل تباہی اگر آتی ہے تو کافر کی کھیتی پر آتی ہے، کہ اُس کو دنیا میں بھی کوئی مفاد حاصل نہ ہوا، اور اس مصیبت کی وجہ سے آخرت میں بھی کوئی اجر حاصل نہیں ہوگا، اس لئے حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کی قید لگادی کہ ہم نے یہاں اس مثال کے ساتھ اُن کے مکمل نقصان کو دکھانا ہے، کہ انہوں نے اللہ کے راستے میں جو مال خرچ کیا وہ دنیا میں بھی اُن کے ہاتھ سے گیا اور آخرت میں بھی اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوگا، تو یہ کامل مکمل مثال تب بنے گی جب کافر کی کھیتی برباد ہونے کا ذکر کیا جائے، ورنہ مؤمن کی کھیتی اگر برباد ہو تو وہ آپ کے سامنے پہلے آچکا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۵۵) کہ ہم آزمائش کریں گے، جو صبر کے ساتھ اس کو برداشت کرجائیں اور اس امتحان میں پورے اتریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو بشارت ہے، اُن کے لئے صلوات ہیں، اُن کے لئے رحمت ہے، بہر حال اُن کی کھیتی کی بربادی مکمل طور پر بربادی نہیں ہے، بلکہ آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کو اجر وثواب دیں گے، اس لئے مثال دیتے ہوئے حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کا ذکر کیا، کہ جو کچھ یہ اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اُس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ہوا ہو جس میں پالا ہے، اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ: پہنچ گئی وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، پھر اُس نے اُس کو ہلاک کردیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن یہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔

مکہ معظّمہ میں نفاق کیوں نہیں تھا؟

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ شروع سورت سے اہل کتاب کے ساتھ گفتگو شروع ہوئی تھی جس کے ضمن میں مختلف مسائل آپ کے سامنے واضح ہوئے۔ یہ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً الخ) اس حصے کی آخری آیات ہیں، جن میں اہل کتاب کے

ساتھ بحث و مباحثے کا جو موضوع شروع ہوا تھا وہ اختتام کو پہنچ رہا ہے، اور اگلے رکوع سے جہاد بالسیف کا تذکرہ ہوگا، غزوۂ احد کا ذکر تفصیل سے آئے گا، غزوۂ بدر کے واقعات کی طرف بھی اشارہ ہوگا، غزوۂ حمراء الاسد کا ذکر بھی آئے گا، یعنی جہاد باللسان کے موضوع کو ختم کرنے کے بعد اب اگلے رکوع سے جہاد بالسیف شروع ہوگا۔ ان چند آیات میں جو رکوع کے آخر میں اس وقت پڑھی گئیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کو خاص ہدایات دی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں سرورِ کائنات ﷺ کی جماعت میں شامل ہونے والے افراد میں کوئی منافق نہیں تھا، سب مخلص تھے، وجہ یہ تھی کہ جو بھی آپ پر ایمان لاتا اُس کو مار کھانی پڑتی تھی، ہڈیاں تڑوانی پڑتی تھیں، ہر چیز سے وہ محروم ہو جاتا تھا، دنیا کی عیش عشرت، حتیٰ کہ برادری کنبہ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بھی موافقت نہیں رہتی تھی، ہر چیز سے جدا ہونا پڑتا تھا، اور یہ بہت سخت امتحان کی بھٹی تھی جس میں انسان کو کلمہ پڑھنے کے بعد چڑھنا پڑتا تھا، تو ایسے وقت میں وہی شخص اپنی جان و مال اور عزت کی بازی لگایا کرتا ہے جو انتہائی درجے کا مخلص ہو، چونکہ بظاہر دُنیا کا اُس وقت کوئی مفاد نہیں ہوتا، سختیاں ہی سختیاں ہوتی ہیں، تو دکھلاوے کے طور پر کسی کے ایمان لانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے اہلِ تاریخ، اہل سیر اور سب لوگ متفق ہیں کہ مکہ معظمہ میں نفاق نہیں تھا۔

مدینہ میں نفاق کیوں آیا؟

اور جس وقت مدینہ منورہ میں سرورِ کائنات ﷺ تشریف لے آئے تو اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی، اور ہر آنے والا دن اُس سلطنت کو مضبوط کرتا چلا گیا، اسلام پھیلتا چلا گیا، حتیٰ کہ مدینہ منورہ کے علاقے میں اسلام کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا، اور مخالفین اپنے لئے مستقبل کے اعتبار سے کچھ خطرات محسوس کرنے لگ گئے، تو پھر یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جس وقت کوئی جماعت اٹھتی ہے، اُس کی مخالفت میں جو لوگ ہوتے ہیں، پہلے پہلے تو اُس کو ہر لحاظ سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ اس طرح سے نہ دبائی جا سکے تو پھر چالاک لوگوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اُس جماعت میں اپنے آدمی شامل کر دیتے ہیں، جو بظاہر اُس جماعت کے ساتھ لگے لپٹے ہوتے ہیں، اور اندر سے اُن کی وفاداریاں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہیں، تو سازش کے طور پر بھی ایسے افراد شامل کر دیے جاتے ہیں، تا کہ اِن کے ذریعے سے اندرونی طور پر فتنہ پردازی کر کے اُس جماعت کو خراب کیا جا سکے، یا اُس کو اپنے مفاد میں موڑ لیا جائے، اور جو سیاسی فوائد اس جماعت کو حاصل ہوں گے ہم اُس میں حصے دار بن جائیں۔ اور بعض لوگ بزدل اور مفاد پرست ہوتے ہیں، وہ بھی دورنگی پالیسی اختیار کر لیتے ہیں، کہ جو جماعت قوت پکڑتی جا رہی ہے اُس کے ساتھ بگاڑنے کی جرأت نہیں ہوتی، ہو سکتا ہے کہ کل کو ہم اِنہی کے محتاج ہو کر رہ جائیں، اگر آج اِن سے بگاڑ لی تو پھر کیا کریں گے، اس لیے بظاہر وہ اُن کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اُن کے دل میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اِن کی جو مخالف جماعت ہے کل کو وہی اقتدار پر آ جائے اور اونٹ اُن کی کروٹ بیٹھ جائے، اگر ہم اُن سے بگاڑیں گے تو کل کو اُن کے سامنے شرمساری ہوگی، پھر وہ ہمارے مفاد کا خیال نہیں رکھیں گے، اس قسم کے مفاد پرست اور دوغلے قسم کے لوگ پھر کچھ یاری اُدھر لگاتے ہیں اور کچھ یاری اُدھر لگاتے ہیں، وہ نکھر کر اور صاف ستھرے ہو کر ایک طرف نہیں ہوتے۔

منافق کی مثال وکیفیت

بلکہ اِن کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی: ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ'' (سورۂ نساء: ۱۴۳) وہ درمیان میں لٹکے ہوئے متردد ہوتے ہیں، نہ پوری طرح اِدھر ہوتے ہیں، نہ پوری طرح اُدھر ہوتے ہیں، یا جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے مثال دے کر سمجھایا کہ ان مفاد پرست لوگوں کی مثال جن کو شرعی اصطلاح میں منافق کہا جاتا ہے، ان کی مثال اُس شہوتی بکری کی طرح ہوتی ہے جو کبھی اِس ریوڑ کی طرف بکرے کی تلاش میں دوڑتی ہے، کبھی اِس ریوڑ کی طرف بکرے کی تلاش میں دوڑتی ہے،[1] تو یہ اُن کی مفاد پرستی اور شہوت پرستی کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اہلِ ایمان کو منافقین سے ہوشیار رہنے کا حکم

مدینہ منورہ میں آنے کی بعد بھی صورت حال یہی پیدا ہوگئی، کہ یہودی اندر گھسے ہوئے تھے، اوس وخزرج کے ساتھ اُن کے جاہلیت کے زمانے کے معاہدے تھے، اور آپس میں دوستیاں تھیں، ایک دوسرے کے حلیف تھے، شخصی اور انفرادی طور پر بھی ایک دوسرے سے تعلقات تھے، اور قبائلی سطح پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ معاہدے تھے، اب جس وقت اوس اور خزرج نے اسلام قبول کرلیا تو یہود حسد میں مبتلا ہوگئے، اس کی وجہ سے پھر وہ آئے دن کوئی نہ کوئی شرارت اور کوئی نہ کوئی سازش کر کے مسلمانوں کو پریشان کرتے تھے۔ پچھلے رکوع میں جو یہودیوں کی طرف سے جنگ برپا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اُسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایات دی تھیں کہ اِن اہل کتاب کی طرف سے ہوشیار رہو، یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ اُسی دور کی طرف لوٹا دیں جس دور سے تم اسلام کی طرف آئے ہو، اُسی سلسلے کی یہ آیات ہیں، کہ اب وقت آگیا ہے کہ دوست اور دشمن کے درمیان واضح لکیر کھینچ دی جائے، اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی جماعت کے ساتھ ہی کامل مکمل تعلق رکھیں، جو لوگ اپنی جماعت میں شامل نہیں ہیں، جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا، اُن کی دوستیوں پر اب اعتماد چھوڑ دیں۔ اور اگر اُن پر بھی اعتماد رکھیں گے، اُن کو بھی اپنے مشوروں میں لیتے رہیں گے اور اُن کے ساتھ میل جول رہے گا تو اول تو اُن کو سازشیں پھیلانے کا اور شرارتیں کرنے کا موقع ملے گا، وہ ایک دوسرے کے خلاف بہکا کر لڑائیں گے، دوسرے یہ ہے کہ تمہارے راز معلوم کریں گے، اور اُن رازوں کو تمہارے دشمنوں تک پہنچائیں گے، اور اس طرح بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، اِس لئے اب ضروری ہے کہ دونوں جماعتوں کو ممتاز کردیا جائے، اور اہلِ ایمان کو ہوشیار کیا جارہا ہے کہ تم اپنے آدمیوں کے علاوہ یعنی جو اپنی جماعت میں شامل ہیں اِن کے علاوہ کسی دوسرے پر اعتماد نہ کیا کرو اور نہ اُن کو اپنے مشوروں میں شریک کیا کرو، نہ انہیں اپنے راز پر آگاہ کرو، یہ پیش بندی کی جارہی ہے تاکہ اِن یہود ونصاریٰ اور دوسرے لوگوں کو مسلمانوں میں فتنہ پھیلانے کا موقع نہ ملے، اور ان کے راز دوسروں تک پہنچ کر قومی اور جماعتی سطح پر نقصان نہ پہنچے۔ یہ حاصل ہے اِن آیات کا جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں۔

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۷۰، کتاب صفات المنافق/ مشکوۃ ۱/ ۱۷، باب الکبائر وعلامات النفاق۔ اس کے مفہوم کے لئے دیکھیں: مرقاۃ ومظاہر حق۔

یہود سے قطع تعلقی کی تاکید اور اُن کی عداوت کا بیان

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ: رکوع کا ترجمہ کرتے ہوئے لفظی تشریح پہلے ہو چکی ہے، اے ایمان والو! اپنی جماعت کے علاوہ کسی کو اپنا رازدار نہ بنایا کرو، کسی کو اپنا مشیر نہ بناؤ، اپنے معاملات میں کسی پر اعتماد نہ کرو، خاص طور پر اس میں یہود کی طرف اشارہ ہے جو مدینہ منورہ میں آس پاس آباد تھے اور جن کے ساتھ اوس اور خزرج کے آپس میں تعلقات تھے، عام طور پر مؤمنین تو ویسے ہی کٹے ہوئے تھے، لیکن مؤمنین میں سے ایک گروہ جو اپنے آپ کو اہل ایمان میں شامل کرتا تھا اور ایمان کا اظہار کرتا تھا، جن کے دل میں نفاق تھا، اور ظاہری طور پر چونکہ مؤمنین میں شامل تھے اور اُن کی دوستیاں اُن کے ساتھ تھیں، خصوصیت کے ساتھ یہاں اُن کے تعلقات کو توڑنا مقصود ہے، جس کے بعد ضروری ہو گیا کہ جو بھی یہود کے ساتھ تعلق رکھے گا تو یہ علامت متعین ہو جائے گی کہ یہ شخص مسلمانوں کے حق میں مخلص نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی مخالفت کرتا ہے، تو اصل کے اعتبار سے تو منافقوں کو سمجھانا مقصود ہے، اور چونکہ وہ اپنے آپ کو کلمہ گو اور مؤمن ہی کہتے تھے، اس لئے خطاب عام رکھا گیا، ''اپنے علاوہ کسی دوسرے کو بطانہ نہ بناؤ'' خاص دوست نہ بناؤ، رازدار نہ بناؤ، لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا: یہ تو پہلی بات بتادی، کہ یہ لوگ تمہارے اندر خرابی پیدا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، جہاں بھی ان کو موقع ملے کہ تمہیں نقصان پہنچائیں تو تمہیں نقصان پہنچائیں گے، یہ تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں، وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ: تمہارا مشقت میں پڑنا ان کو پسند ہے، یہ تمہارے خیر خواہ نہیں، جتنی تمہیں تکلیف پہنچے اُس پر یہ خوش ہوتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ: ان کی گفتگو پر نظر رکھا کرو، جب یہ گفتگو کرتے ہیں تو ان کی گفتگو میں بلا اختیار ایسے الفاظ ٹپک پڑتے ہیں جن سے تم استدلال کر سکتے ہو کہ ان کے دل میں تمہارے خلاف کتنا بغض ہے، اور جو کچھ زبان سے ظاہر ہوتا ہے وہ تو بہت کم ہے، جو کچھ یہ سینوں میں چھپائے بیٹھے ہیں وہ بہت زیادہ ہے۔ اور یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے دل کے اندر کسی کے خلاف بغض ہو تو کتنا ہی احتیاط سے گفتگو کیوں نہ کرے پھر بھی زبان سے ایسے الفاظ ٹپک پڑتے ہیں جس سے انسان سمجھ جاتا ہے کہ اس کے دل کے کیا جذبات ہیں، تو زبان سے اظہار تھوڑا ہوتا ہے، اور دل کے اندر چھپی ہوئی باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، کبھی کبھی ان کے مونہوں سے بغض ظاہر ہو جاتا ہے، یعنی ایسی باتیں یہ اپنی زبان سے نکال بیٹھتے ہیں، یہ لفظ بلا اختیار ان کی زبان سے ٹپک جاتے ہیں، جو دل کے جذبات ہیں وہ الفاظ کی صورت اختیار کر جاتے ہیں، اور اس سے تم سمجھ جایا کرو کہ جو بغض ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے وہ کتنا ہوگا۔ ''ہم نے تمہارے لئے نشانیاں واضح کر دیں اگر تم عقل رکھتے ہو'' عقل کے ساتھ سوچو گے تو تم ان علامات سے پہچان جاؤ گے کہ یہ تمہارے دوست نہیں ہیں۔

نفسیاتی انداز سے اہلِ ایمان کو تفہیم

آگے ایک نفسیاتی بات ہے، چونکہ متنفر کرنا ہی مقصود ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ تم یہ خیال کرو کہ تم تو ان کے ساتھ محبت کی پینگیں چڑھاتے ہو، محبت کا اظہار کرتے ہو، اور وہ تم سے محبت کرتے نہیں، یہ کون سی تمہاری خودداری ہے کہ تم اُن کے پیچھے مرو اور اُن کے ساتھ محبت کرو اور وہ تم سے محبت نہ کریں، حالانکہ اسباب ایسے ہیں کہ انہیں تمہارے ساتھ محبت چاہیے، تمہیں اُن کے

ساتھ نہیں چاہیے، کیونکہ تم سب انبیاء پر ایمان لاتے ہو جن میں اُن کے انبیا بھی ہیں، موسیٰ علیہ السلام کا نام تم احترام سے لیتے ہو، اُن کو اللہ کا پیغمبر مانتے ہو، اُن پر ایمان لاتے ہو، تورات کو اللہ کی کتاب کہتے ہو، تو اُن کا تو جتنا دین ہے تم نے تسلیم کرلیا، اور وہ نہ تمہاری کتاب کو مانیں نہ تمہارے پیغمبر کو مانیں، تو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ تمہیں اچھا سمجھیں اور تمہارے ساتھ محبت رکھیں، چونکہ تم اُن کے پیغمبر کو مانتے ہو اور اُن کی کتاب کو مانتے ہو اور اُس پر ایمان لاتے ہو، اور تمہیں اُن سے نفرت ہو کہ وہ نہ تمہارے نبی کو مانیں، نہ تمہاری کتاب کو مانیں، اور یہاں اُلٹا حساب ہے کہ تمہاری طرف سے اُن کی طرف رجحان ہے اور ان کے دل بغض سے بھرے ہوئے ہیں، هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ: خبردار! تم ہی یہ لوگ ہو جو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے، تو اول تو جو تم سے محبت نہیں کرتا تو تمہیں بھی چاہیے کہ اُن سے محبت نہ کرو، پھر اسباب بھی اِس کے برعکس ہیں، کہ تم ایمان لاتے ہو ساری کتابوں پر (جس میں اُن کی کتاب بھی ہے) اور اُن کے نبیوں پر بھی ایمان لاتے ہو، موسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتے ہو، اور وہ نہ تمہاری کتاب کو مانیں اور نہ تمہارے پیغمبر پہ ایمان لائیں۔

یہود کی منافقانہ چال اور اس پر رَدّ

باقی کبھی کبھی آکر جو اس قسم کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں جس سے تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ ہمارے ساتھی ہیں یہ ان کا نفاق ہے، یہ تمہیں مطمئن کرنے کے لئے ایک سیاسی چال ہے، کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب خلوت میں چلے جاتے ہیں عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ: یہ محاورہ ہے جیسے میں نے آپ کے سامنے ترجمے میں عرض کیا تھا تم پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں غصے کے اظہار کے لئے، کہ جب انسان اپنے غصے کے مطابق عمل نہ کرسکے تو ہاتھوں کو کاٹتا ہے، اور ہمارے ہاں اس کے متعلق محاورہ ہے دانت پیسنا، تو تم پر دانت پیستے ہیں، اور یہ دانت پیسنا اور ہاتھ کاٹنا ان سب سے اشارہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ اگر میرا بس چلے تو میں اِس کو چبا جاؤں، یہ اپنے حلیے اور اپنی شکل کے ساتھ ایک قسم کے دل کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے، "تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں غصے کی وجہ سے" اتنا ان کے دل میں تمہارے خلاف بغض ہے۔ آپ انہیں کہہ دو مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ: کہ تم اپنے غصے میں مرجاؤ، چاہے تمہاری جان نکل جائے غصے کی وجہ سے، ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا، مرجاؤ اپنے غصے میں، ہم تمہارے غصے کی کوئی پروا نہیں کرتے، اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے، یہ جملہ قُلْ کے تحت بھی آسکتا ہے کہ تم یہ کہہ دو کہ مرجاؤ تم اپنے غصے میں، چاہے تم ہمارے سامنے ظاہر نہیں کرتے کہ تمہارے دل میں ہمارے خلاف اتنا بغض ہے، لیکن اللہ تو دل کی باتیں جانتا ہے، اس لئے اُس نے ہمیں بتادیا کہ تم دل سے ہمارے دشمن ہو، اس لئے دونوں باتیں کہنے کا حکم ہے مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، یہ دونوں قُلْ کے نیچے آگئے۔ دوسرا احتمال تفسیروں میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ قُلْ کا مقولہ تو مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ہے، اور آگے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جانتا ہے، اور تمہیں ان کے دل کی جو کیفیتیں بتا رہا ہے وہی صحیح ہیں، اس لئے تمہارے سامنے آکر اگر یہ اِس کے خلاف ظاہر کریں کہ ہمارے دل میں تمہارے متعلق بڑی خیر خواہی ہے، یہ سب ان کا نفاق ہے۔

یہود کی دشمنی کی ایک اور علامت

اور دشمنی کی ایک اور علامت یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ یہ قاعدہ ہے کہ دوست وہ ہوا کرتا ہے جو دوست کی اچھی حالت پر خوش ہو اور تکلیف پر رنجیدہ ہو، لیکن اِن کا معاملہ برعکس ہے، کہ اگر تمہیں اچھی حالت پہنچتی ہے تو یہ غمزدہ ہوجاتے ہیں، اور اگر تمہیں کوئی بری حالت پہنچتی ہے تو یہ خوش ہوجاتے ہیں، یہ بھی ان کی دشمنی کی علامت ہے، یہی کافرانہ ذہنیت، کہ تمہاری اچھی حالت پر یہ کسی صورت میں خوش نہیں ہوتے، جب اچھی حالت تمہیں پہنچتی ہے تو یہ غمزدہ ہوجاتے ہیں، اور اگر تمہیں کوئی بری حالت پہنچ جاتی ہے، کہیں تکلیف پہنچ گئی، شکست ہوگئی، یا کوئی نقصان ہوگیا، تو پھر یہ مجلس میں بیٹھ کر بغلیں بجاتے ہیں کہ اچھا ہوگیا، ان کے ساتھ ایسے ہونا چاہیے تھا، ایسے لوگ بھی دوست ہوتے ہیں؟ اور ایسے لوگوں کی محبت پر بھی اعتماد کیا جاتا ہے؟ اس لئے ان کے ساتھ تعلق توڑ دو۔ اور یہ خطرہ نہ محسوس کرو کہ تعلق توڑنے سے ہمارا کوئی نقصان ہوگا، ''اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو ان کی خفیہ تدبیریں اور مکروفریب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے'' تقوے کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرو، صبر اور استقلال کو اپناؤ، ان کے مکروفریب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کا احاطہ کرنے والا ہے، وہ ان کو اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق سزا دے گا۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ

قابل ذکر ہے وہ وقت جب آپ صبح کو چلے اپنے گھر والوں سے، آپ ٹھہراتے تھے مؤمنین کو لڑائی کے مورچوں پر، اللہ تعالیٰ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۲۱ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ

سننے والا ہے جاننے والا ہے ۝۱۲۱ جب قصد کیا تم میں سے دو گروہوں نے کہ وہ ہمت چھوڑ دیں، اور اللہ

وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۲ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ

اُن دونوں کا ساتھی تھا، اللہ پر ہی چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں ۝۱۲۲ اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی

بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲۳ اِذْ تَقُوْلُ

بدر میں اس حال میں کہ تم کمزور تھے، پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اللہ کا احسان مانو ۝۱۲۳ جب آپ کہہ رہے تھے

لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

مؤمنین سے کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ امداد دے تمہیں تمہارا رب تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ سے

مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰۤى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ

جو اُتارے ہوئے ہوں گے ﴿۱۲۴﴾ کیوں نہیں! اگر تم مستقل مزاج رہے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا اور وہ آجائیں تمہارے پاس

فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

اپنے اسی جوش سے تو مدد دے گا تمہیں تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جو نشان لگانے والے ہوں گے ﴿۱۲۵﴾

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ

نہیں بنایا اللہ نے اس بات کو مگر بشارت تمہارے لئے اور تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اس خبر کے ذریعے سے، اور نہیں ہے مدد

اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ

مگر اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۱۲۶﴾ تاکہ ہلاک کردے اللہ تعالیٰ ایک حصے کو اُن لوگوں میں سے جنہوں

كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ

نے کفر کیا، یا انہیں ذلیل کردے پھر وہ لوٹ جائیں نامراد ہو کر ﴿۱۲۷﴾ آپ کے لیے امر سے کوئی اختیار نہیں یہاں تک کہ

يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے پس بے شک وہ ظلم کرنے والے ہیں ﴿۱۲۸﴾

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ

اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بخشے گا جسے چاہے گا

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

اور عذاب دے گا جسے چاہے گا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ غَدَوْتَ: غدا یغدو: صبح کے وقت چلنا، قابل ذکر ہے وہ وقت جب آپ صبح کو چلے، مِنْ اَهْلِكَ: اپنے گھر والوں سے، یعنی آپ کے چلنے کی ابتدا آپ کے اہل سے ہوئی، گھر سے چلے، تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ: یہ حالِ مقدرہ ہے، تُبَوِّئُ: ٹھکانہ دیتے تھے آپ، ٹھہراتے تھے آپ، جماتے تھے آپ ایمان والوں کو، مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ: مقاعد مَقْعَد کی جمع، بیٹھنے کی

جگہ، پھر اس کو عام معنی میں استعمال کر لیتے ہیں، گھات لگانے کی جگہ، ٹھہرنے کی جگہ، اور یہاں اس کا مفہوم وہی ہے جو آج ہماری اصطلاح میں مورچہ کہلاتا ہے، لِلْقِتَالِ: یہ مقاعد کی صفت بھی ہوسکتی ہے، لڑنے کے لئے ٹھکانے، ''آپ جماتے تھے مؤمنین کو لڑائی کے ٹھکانوں پر'' یوں بھی اس کا مفہوم ادا کیا جاسکتا ہے، ''لڑائی کے مورچوں پر''۔ اور لِلْقِتَالِ یہ تُبَوِّئُ کے متعلق بھی ہوسکتا ہے، ''مقاتلہ کے لئے، لڑائی لڑنے کے لئے آپ مؤمنین کو مختلف مورچوں پر ٹھہراتے تھے'' اس طرح سے بھی مفہوم ہوجائے گا۔ حضرت شیخ (الہندؒ) کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ لِلْقِتَالِ کو مَقَاعِدَ کے ساتھ لگایا گیا ہے، وہ ترجمہ کرتے ہیں ''لڑائی کے ٹھکانوں پر''۔ اور بیان القرآن میں اس کو تُبَوِّئُ کے متعلق کر کے ترجمہ کیا گیا ہے، ''لڑائی کے لئے مختلف ٹھکانوں پر''، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا: فشل کا معنی ہوتا ہے ہمت چھوڑ دینا، حوصلہ ترک کر دینا، کمزور ہوجانا، بے ہمت ہوجانا، جب قصد کیا تم میں سے دو گروہوں نے کہ وہ ہمت چھوڑ دیں، وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا: اللہ اُن دونوں کا ساتھی تھا، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اللہ پر ہی چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں، ایمان والوں کو اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ: اور البتہ تحقیق مدد کی اللہ تعالیٰ نے تمہاری بدر میں، وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ: اَذِلَّةٌ ذلیل کی جمع ہے، یہ لفظ عزیز کے مقابلے میں آتا ہے، عزّت اور ذِلّت یہ دونوں لفظ متقابل ہیں، عزّت کا معنی ہوتا ہے غالب ہونا، یعنی ایسا ہونا جو کسی کے بس میں نہ آئے، زور آور، غالب، طاقتور، مضبوط، جو کسی کے بس میں نہ ہو، اور اس کے مقابلے میں ذِلّت کا لفظ آتا ہے، جس کا معنی کمزور ہونا، مغلوب ہونا، اپنے مخالف کے لئے تر لقمہ بن جانا، اصل مفہوم اِن الفاظ کا یہ ہے، باقی یہ جو ذِلّت کمینگی کے معنی میں آیا کرتا ہے یہ اِس لفظ کا لغوی مفہوم نہیں، یہی وجہ ہے کہ اَذِلّۃ کا لفظ قرآنِ کریم میں مقامِ مدح میں بھی آیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی تعریف کی وہاں لفظ یہ ہیں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (سورۂ مائدہ: ۵۴) مؤمنین کے لئے وہ کمزور ہوں گے، ضعیف ہوں گے، مؤمنین کے سامنے دبنے والے ہوں گے، متواضع ہوں گے، اور کافروں کے لئے اَعِزّہ یعنی غالب ہوں گے، سخت ہوں گے، دشوار ہوں گے، یعنی کافروں کو اُن سے واسطہ پڑے گا تو اُن کو چٹانوں کی طرح ٹھوس پائیں گے، جن کے اندر انگلی نہیں گھس سکتی، لیکن جب مؤمنین کے ساتھ اُن کا معاملہ ہوگا تو ایسے جیسے دبے دبائے، متواضع، عاجز اور کمزور ہوں گے، مؤمنوں کے سامنے وہ سرکش نہیں ہوں گے، یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوب جماعت کی تعریف کی ہے، تو اَذِلَّةٌ کا لفظ اس جماعت کے لئے بطور مدح کے آیا ہے کہ مؤمنین کے لئے وہ ذلیل ہوں گے، یعنی اُن کے سامنے کمزور متواضع ہوں گے، اور یہاں بھی اِس کا یہی مفہوم ہے، وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ: اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی بدر میں اِس حال میں کہ تم کمزور تھے، بے سروسامان تھے، بظاہر تمہیں کوئی قوت اور طاقت حاصل نہیں تھی، فَاتَّقُوا اللّٰهَ: پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم اللہ کا احسان مانو، اللہ تعالیٰ کے شکرگزار رہو۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: جبکہ کہہ رہے تھے آپ مؤمنین سے، اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ: کیا تمہارے لیے کافی نہیں اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ: کہ امداد دے تمہیں تمہارا رَب، بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ: فرشتوں میں سے تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ سے، مُنْزَلِيْنَ: جو اُتارے ہوئے ہوں گے، نازل کیے ہوئے ہوں گے، یعنی خاص طور پر اِسی مقصد کے لئے اتارے ہوئے ہوں گے، بَلٰٓى: کیوں نہیں، یعنی یہ تین ہزار کی امداد بھی کافی ہے، اِنْ تَصْبِرُوْا: اگر تم مستقل مزاج رہے وَتَتَّقُوْا: اور تم نے تقویٰ اختیار کیا، وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا: فَارَ يَفُوْرُ: جوش مارنا،

دوسری جگہ فَارَ التَّنُّوْرُ کالفظ آیا ہوا ہے (ہود: ۴۰، مؤمنون: ۲۷)، اور محاورہ آتا ہے: فَارَتِ الْقِدْرُ: ہانڈی نے جوش مارا، وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا: اور وہ آجائیں تمہارے پاس اپنے اِسی جوش سے، یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ: مدد دے گا تمہیں تمہارا رَبّ، بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ: فرشتوں میں سے پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ، مُسَوِّمِیْنَ: جونشان لگانے والے ہوں گے۔ سُومۃ اور سیمۃ کالفظ علامت کے لئے بولا جاتا ہے، خیلِ مسوّمۃ کالفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آیا تھا، نشان زدہ گھوڑے، تو مُسَوِّمِیْنَ کا معنی ہوگا خاص علامتیں لگانے والے ہوں گے جس سے معلوم ہوگا کہ یہ لڑائی میں شامل ہونے کے لئے آئے ہیں، وَمَا جَعَلَہُ اللہُ: نہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے اس بات کومگر بشارت تمہارے لیے، اور تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوجائیں اِس خبر کے ذریعے سے، اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے جوزبردست ہے حکمت والا ہے۔ لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: تاکہ قطع کردے اللہ تعالیٰ، ہلاک کردے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا ایک حصے کو، طرف سے ایک حصہ مراد ہے، تاکہ ہلاک کردے اللہ تعالیٰ ایک حصے کو اُن لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، اَوْ یَکْبِتَھُمْ: یا انہیں ذلیل کردے، فَیَنْقَلِبُوْا خَآئِبِیْنَ: پھر وہ مڑ جائیں نامراد ہو کر، فَیَنْقَلِبُوْا: پس وہ پھر جائیں، منقلب ہوجائیں، لوٹ جائیں، خَآئِبِیْنَ: اس حال میں کہ وہ بے مراد ہوں، جسے خائب وخاسر کہتے ہیں، لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ: آپ کے لئے امر سے کوئی اختیار نہیں، اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ: اَوْ یہاں اِلٰی اَنْ کے معنی میں ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اُن پر رجوع کرے، اَوْ یُعَذِّبَھُمْ: یا انہیں عذاب دے، فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ: پس بیشک وہ ظلم کرنے والے ہیں۔ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے جوکچھ آسمانوں میں ہے اور جوکچھ زمین میں ہے، یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ: بخشے گا جسے چاہے گا، وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ: اور عذاب دے گا جسے چاہے گا، وَاللہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر وتقویٰ کی تاکید فرمائی تھی، اور یہ کہا تھا کہ صبر وتقویٰ اختیار کروگے تو اِن لوگوں کا مکروفریب تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور یہ آیات جو اِس وقت آپ کے سامنے پڑھی گئیں اِن میں غزوۂ اُحد اور غزوۂ بدر کا ذکر آرہا ہے، یہاں غزوۂ بدر کا ذکر ضمناً ہے اور سورۂ انفال میں تفصیل کے ساتھ آئے گا، زیادہ تر واقعات جو آگے ذکر کئے جارہے ہیں وہ غزوۂ اُحد کے ہیں، اِن واقعات سے اللہ تبارک وتعالیٰ مذکورہ بالا اصول کی تصدیق فرمائیں گے، مثال کے ساتھ یہ بات واضح ہوجائے گی کہ جب تم نے صبر وتقویٰ اختیار کیا تو اللہ کی نصرت کس طرح رہی، کافر تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، اور جہاں تمہارے صبر وتقویٰ کے اندر کسی وجہ سے کمی آئی اُسی وقت ہی تم نے نقصان اٹھایا، اس لئے اگر صبر وتقویٰ کو اختیار کروگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت شامل حال رہے گی اور یہ کافر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، غزوۂ اُحد کا ماقبل کے ساتھ یہ ربط ہے۔

غزوۂ اُحد کا پس منظر

غزوۂ اُحد سرورِ کائنات ﷺ کے غزوات میں سے مشہور غزوہ ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ سترہ رمضان دو ہجری مقام بدر میں مشرکین کا مقابلہ مسلمانوں کے ساتھ ہوا تھا، واقعہ کی تفصیل سورۂ انفال میں آئے گی، اُس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، صحیح روایات کے مطابق تین سو تیرہ تھے، جن میں محض چند ایک گھوڑے تھے اور تھوڑے سے اُونٹ تھے، اکثر لوگ پیدل تھے، چند گنتی کی تلواریں تھیں، اتفاقی طور پر ایک قافلے کا راستہ روکنے کے لئے نکلے تھے، لڑائی کا کوئی خاص اہتمام کر کے نہیں آئے تھے، بہرحال مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں تھے، اور مقابلے میں جو مشرکین مکہ آئے تھے وہ باقاعدہ لڑائی کا ارادہ کر کے پوری طرح سے مسلح ہو کر آئے تھے، تعداد بھی اُن کی ایک ہزار تھی، اور ہر قسم کے جنگی سامان سے وہ لیس تھے، چُن چُن کر سارے جوان اُس کے اندر جمع کئے گئے تھے، اُس میں قریش کی تمام شاخوں کے سردار شامل تھے۔ جب مقابلہ ہوا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت مسلمانوں کے ساتھ ہوئی اور یہ تین سو تیرہ ایک ہزار پر غالب آ گئے، اور یہ بے سروسامان لوگ اُن مسلح لوگوں کو شکست دینے کا باعث بن گئے، جن میں ستر مشرک مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے، اور یہ لڑائی مشرکین مکہ کی کمر توڑ گئی، ذلت بھی ہوئی اور نقصان بھی اٹھایا، تو پھر اُن کے انتقامی جذبات بھڑکے، ابوجہل جو اُن کا قائد تھا وہ تو اس جنگ میں واصل جہنم ہو گیا تھا، اب ابوسفیان نے مشرکین مکہ کی قیادت سنبھالی، جو اُس وقت اس قافلے کو شام سے لے کر آ رہے تھے جو قافلہ اِس لڑائی کا سبب بنا تھا۔ مکہ معظمہ میں پہنچنے کے بعد مشرکین نے یہ طے کیا کہ اِس قافلے میں جتنا مال ہے وہ سارے کا سارا جنگ کے لئے بطور چندے کے جمع کرا دیا جائے تاکہ لڑائی کی تیاری ہو، اور اردگرد قبائل کے بھی جذبات بہت بھڑکائے گئے، چنانچہ صرف ایک سال کے بعد یعنی شوال کے پہلے ہفتے میں سن تین ہجری میں، جیسے مفسرین نے لکھا ہے کہ سات شوال تھی جس وقت سرورِ کائنات ﷺ گھر سے نکلے ہیں، تو شوال کے پہلے ہفتے میں ہی مشرکین اکٹھے ہو کر تین ہزار کی تعداد میں مدینہ منورہ پر چڑھ آئے، قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی، اِس جنگ میں یہ عورتوں کو بھی ساتھ لائے تھے، تاکہ میدان میں وہ جوانوں کو غیرت دلائیں اور بھاگنے سے روکیں اور اُن کے جذبات بھڑکائیں۔

اہلِ اسلام کی مشاورت اور اُحد کی طرف روانگی

سرورِ کائنات ﷺ کو جس وقت پتہ چلا کہ مکہ کے مشرک اتنا بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں (اور اُحد کے قریب دوسرا پہاڑ ہے اُحد کے بالمقابل عَینَین، اُس پہاڑی کے پاس اِنہوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا) حضور ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ لیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے، آپ کی رائے بھی کچھ ادھر تھی کہ مدینہ منورہ میں رہ کر ہم ان کا مقابلہ کریں اور صرف دفاعی لڑائی لڑیں، کہ وہ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوں اور ہم اپنی مورچہ بندی شہر کے اندر کر لیں اور مقابلہ یہیں شہر میں ہو، آپ ﷺ کا رجحان بھی کچھ ادھر تھا، اور اس لڑائی سے پہلے بدر کے بعد عبداللہ بن ابی ابن سلول خزرجی نے بھی ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا تھا، (بدر کے موقع پر تو اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن جب بدر میں مشرکین کو رگڑا لگا اور مسلمانوں کی قوت ابھری تو اس قسم کے لوگ اُس وقت مسلمان

ہوئے ہیں)، اِس کے مسلمان ہونے کے بعد یہ پہلی لڑائی ہے جو مسلمانوں نے لڑی، سرورِ کائنات ﷺ نے اِس سے بھی مشورہ لیا، اِس کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ منورہ کے اندر رہ کر لڑائی لڑی جائے باہر نہ جائیں، لیکن نوجوان مسلمان جن کی اکثریت تھی وہ بدر کی لڑائی کا نقشہ دیکھ کر اور اہلِ بدر کے فضائل سُن کر پورے جوش وخروش میں تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ لڑائی پیش آرہی ہے، ہم اِس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضائل حاصل کرنا چاہتے ہیں جس طرح اہلِ بدر نے حاصل کیے، میدان میں نکل کر لڑنا چاہیے، اگر ہم گھروں میں بیٹھے رہے اور شہر کے اندر ہم نے مورچہ بندی کر لی تو مشرک اِس کو ہماری بزدلی پر محمول کریں گے کہ یہ گھروں سے نہیں نکلے، اس لئے میدان میں نکلنا چاہیے، اکثریت کی رائے یہی تھی، سرورِ کائنات ﷺ نے ان کی یہ رائے قبول کر لی، گھر تشریف لے گئے، اور مسلح ہو کر باہر آئے، پھر بعض بزرگ صحابہ کو یہ خیال آیا کہ ہم نے حضور ﷺ کو آپ کی منشا کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا ہے کہ آپ تو شہر میں رہنا چاہتے تھے، اس لئے آگے بڑھ کر انہوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ! وہ تو ایک ہماری رائے تھی جو ہم نے آپ کے سامنے ظاہر کی، اگر آپ مناسب یہی سمجھتے ہیں تو بیشک شہر میں ٹھہرے رہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب نہیں، ایک نبی کے لئے یہ سزاوار نہیں ہے کہ وہ مسلح ہو کر گھر سے نکلے پھر لڑائی میں شریک ہوئے بغیر ہتھیار اُتار دے، چنانچہ حکم دے دیا کہ اب چلو اُحد کی طرف، ایک ہزار کا لشکر تیار ہوا اور آپ اُس کو لے کر چل دیے۔

عبداللہ بن اُبَی کی بے وفائی

لیکن عبداللہ بن اُبَی تو چونکہ منافق تھا، اِس کو مسلمانوں کے ساتھ تو کوئی ہمدردی نہیں تھی، جب اِس کو معلوم ہوا کہ آگے مشرکوں کا اتنا بڑا لشکر آیا ہوا ہے، تو یہ سمجھا کہ اتنے بڑے لشکر کے مقابلے میں ایک ہزار آدمیوں کا جانا تو ایسے ہی ہے جیسے اپنے آپ کو موت کے منہ میں جھونکنا، ایمان تو تھا نہیں کہ آخرت کی فضیلت حاصل کرنے کا خیال ہو، شہادت کا شوق ہو، مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی کہ ہم اپنی جماعت کے ساتھ مل کر ان کے لئے قوت کا باعث بنیں، تو جب مدینہ منورہ سے باہر نکلے ہیں تو باہر جا کر اِس نے اپنے ساتھیوں کو بہکایا اور تین سو افراد سمیت یہ شخص راستے سے واپس آگیا، جس وقت یہ تین سو واپس ہوئے تو باقی رہ گئے سات سو، اب آپ جانتے ہیں کہ ابتداء سے ہی کوئی لڑائی میں شریک نہ ہو تو یہ اتنا اثر انداز نہیں ہوتا، جب ساتھ شریک ہو کر چل پڑیں اور راستے میں اس طرح سے بزدلی دکھا کر واپس آجائیں تو پھر باقیوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور دل ڈانواں ڈول سا ہو جاتا ہے۔

بنوسلمہ اور بنوحارثہ کا تذکرہ

دو قبیلے ہیں بنوسلمہ اور بنوحارثہ، یہ دو بطن ہیں، اِن میں سے بنوحارثہ اوس میں سے ہیں اور بنوسلمہ خزرج میں سے ہیں، اِن دونوں کے دل بھی کچھ ڈھیلے ہونے لگے، کہ جب اتنے لوگ واپس چلے گئے ہیں تو ہمیں بھی واپس ہو جانا چاہیے، لیکن یہ بات اِن کے دل میں وسوسے کے درجے تک ہی رہی، اُس پر انہوں نے عمل نہیں کیا، جس کا ذکر اس آیت میں آئے گا کہ ''تم میں سے دو طائفے تھے جو ڈھیلے ہونے لگ تھے، کمزور ہونے لگے تھے، لیکن اللہ نے انہیں سنبھال لیا''۔ اُن کو سنبھالنے کا ذکر کرتے ہوئے اللّٰہُ وَلِیُّھُمَا کا جو لفظ آگیا، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ بنوسلمہ اور بنوحارثہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ آیت جو قرآنِ کریم میں

اُتری ہے اِس میں اگرچہ ہماری کچھ شکایت بھی ہے، اَنۡ تَفۡشَلَا میں ہماری کمزوری کی نشاندہی کی گئی ہے، لیکن اس کا اترنا ہمیں زیادہ پسند ہے نہ اترنے کے مقابلے میں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اَللّٰہُ وَلِیُّهُمَا کی بشارت بھی اِس آیت میں ہمیں صراحت کے ساتھ دی ہے، تو اَللّٰہُ وَلِیُّهُمَا کی بشارت جو پہنچ گئی تو اِس لئے اس کا اترنا ہمیں زیادہ محبوب ہے اِس سے کہ یہ آیت نہ اترتی، اگرچہ اِس میں ہماری کمزوری کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، لیکن اَللّٰہُ وَلِیُّهُمَا کی بشارت ہمارے لیے زیادہ قابل قدر ہے۔(۱)

جبلِ رُماۃ پر تیرانداز صحابہ کا تعین

توسرورِ کائنات ﷺ نے اپنے اِن سات سو ساتھیوں کو لے کر اُحد کے دامن میں جا کر ٹھکانہ لگایا، اُحد پہاڑ کو اپنی پشت کی جانب کیا، اور مختلف موقعوں پر صحابہ کرام کی ڈیوٹیاں لگائیں، اُحد کے پاس ہی ایک پہاڑ ہے جس کو آج کل جبل رُماۃ کہتے ہیں، تیراندازوں کا پہاڑ، یہ نام بعد میں بنا، اِس پہاڑی اور مدینہ منورہ کی جانب بہت گہری وادی ہے، اِس وقت تک بھی وہ گہری ہے، یعنی وہ ایسی وادی ہے کہ جہاں حضور ﷺ نے اپنے لشکر کو ٹھہرایا تھا (پہاڑ کی طرف آپ نے پشت کی اور اُس میدان کے اندر آپ ٹھہرے) اگر اُس میدان میں لڑائی ہوتی تو اُس وادی میں سے کوئی لشکر اِس پہاڑ کے اوپر سے آکر حملہ کرے تو اس میدان میں لڑنے والوں کو وہ آنے والے نظر نہیں آتے، کیونکہ وادی اِس میدان کے مقابلے میں اتنی گہری ہے کہ اگر اُدھر سے کچھ مشرک اس وادی کے اندر سے آتے تو مسلمان بالکل محاصرے میں آجاتے، کہ آگے سے بھی مشرک اور پیچھے سے بھی مشرک، اور یوں وہ گھیرا ڈال لیتے، اور اُس وادی میں سے آتے ہوئے میدانِ احد میں کھڑے ہونے والوں لوگوں کو نظر بھی نہ آتے، اس لئے حضور ﷺ نے اُس وادی کے کنارے پر ایک پہاڑی ہے، اُس پر پچاس آدمی متعین کر دیئے، کہ تم نے اِس کی نگرانی کرنی ہے کہ اِس وادی میں سے کوئی شخص آکر ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کرے، کیونکہ مقابلے کا رخ یوں ہوگا، اور اگر وہ پیچھے سے آکر حملہ کردیں گے تو نقصان ہوجائے گا، اُحد سے کوئی پون فرلانگ کے فاصلے پر یہ پہاڑی ہے، اور اس پہاڑی کے متصل سے وہ وادی گزرتی ہے، اب اُس پہاڑی کو جبل رُماۃ کہتے ہیں۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو ان پچاس افراد پر افسر متعین کردیا، اور حضور ﷺ نے تاکید کردی کہ ہم فتح پاجائیں، شکست کھاجائیں، کچھ بھی ہو، تم نے اِس جگہ کو نہیں چھوڑنا جب تک کہ میرا حکم نہ آجائے، اور اسی طرح مورچہ بندی کی، کسی کو کہیں ٹھہرایا، کسی کو کہیں ٹھہرایا، اور اُس پہاڑی کے آس پاس ہی پیدل لوگوں پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو متعین کیا تھا، چنانچہ اُن کی جو شہادت گاہ کا نشان ہے وہ اِس پہاڑی کے بالکل متصل ہے، جہاں اُن کا پہلا مقبرہ بنا ہوا تھا وہ اِسی پہاڑی کے پاس تھا جس کو آج کل جبل رُماۃ کہتے ہیں جہاں عبداللہ بن جبیر کو متعین کیا گیا تھا اسی پہاڑی کے پاس ہی ان کی شہادت گاہ ہے جہاں ان کا پہلا مقبرہ ہے، اب وہ وہاں مدفون نہیں، وہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کئے ہوئے ہیں۔

مشرکینِ مکہ کی شکست اور تیراندازوں کا اختلاف

مختلف جگہوں پر متعین کرنے کے بعد لڑائی کی ابتداء ہوگئی، جب لڑائی کی ابتداء ہوئی تو پہلے حملے میں ہی مسلمانوں نے

(۱) بخاری ۲/۶۵۵، کتاب التفسیر۔سورۃ آل عمران/ نیز ۲/۵۸۰ باب غزوۃ اُحد۔

مشرکوں کو آگے لگالیا، مشرکوں کے قدم اکھڑ گئے اور اُن میں سے بہت سارے لوگ قتل بھی ہوئے، جو میدان لڑائی کے لئے تجویز ہوا تھا جب وہ خالی ہوگیا، اور مشرک جدھر کو ٹھہرے ہوئے تھے ادھر کو بھاگے اور صحابہؓ پیچھا کرنے لگے تو جو لوگ پہاڑی کے اوپر کھڑے تھے ان میں سے بعض کہنے لگے کہ اب ہمارے یہاں کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ لڑائی تو ختم ہوگئی، اب تو سارے مشرک بھاگ گئے، میدان خالی ہے، اب ہمیں اُترنا چاہیے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوکر ان کا مالِ غنیمت اکٹھا کرنا چاہیے۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ کا حکم آیا تھا کہ جب تک میں پیغام نہ بھیجوں اُس وقت تک تم نے اِس پہاڑی کو نہیں چھوڑنا، تو بعض کہنے لگے کہ اِس کا مطلب تو یہ تھا کہ لڑائی کے دوران میں، اب لڑائی کہاں ہے، اب تو وہ بھاگے جارہے ہیں، ہمیں بھی اِن کا پیچھا کرنا چاہیے، اب کون سا خطرہ ہے کہ اِدھر سے آکر وہ حملہ کریں گے، اس طرح سے آپس میں اختلافِ رائے ہوگیا۔

مشرکین کا پہاڑی کی جانب سے اچانک حملہ

اڑتیس آدمی وہاں سے اتر آئے، اور صرف بارہ آدمی عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اور اُن کے کچھ ساتھی تقریباً بارہ آدمی وہاں پہاڑی کے اُوپر قائم رہ گئے، اور مشرکوں کی فوج میں خالد بن ولید بھی تھے، یہ جرنیل قسم کے آدمی اور اُمورِ جنگ کے ماہر تھے، پھر مسلمان ہونے کے بعد اِنہوں نے اپنے جنگی کارنامے سرانجام دیئے ہیں اسی طرح جب مشرکوں میں تھے اُس وقت بھی ان کی بہادری نمایاں تھی، اُنہوں نے جس وقت دیکھا کہ اب یہ پہاڑی خالی ہے تو انہوں نے فوراً یہی تدبیر کی کہ اُسی وادی میں سے ایک لشکر لے کر نیچے نیچے سے آئے، عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی اُن کے اُوپر نظر پڑی، مقابلہ ہوا، لیکن یہ بارہ آدمی تھے، اتنے لشکر کی یلغار کو کیسے روکتے، اور اُدھر سارے مسلمان مشرکین کے خلاف متوجہ تھے اور اُدھر کو نکلے ہوئے تھے، تو خالد بن ولید پیچھے سے آئے اور یہ بارہ آدمی مقابلے میں شہید ہوگئے، اور اِس پہاڑی کے اُوپر سے آکر خالد بن ولید نے پیچھے سے حملہ کیا، سرورِ کائنات ﷺ کو جو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اِدھر سے نہ آجائیں، اور اسی لیے پچاس آدمی متعین کیے گئے تھے، وہی بات سامنے آگئی ان صحابہ کی اس لغزش کی وجہ سے کہ انہوں نے وہ مورچہ چھوڑ دیا، جب پیچھے سے حملہ ہوا اور اُدھر مشرکوں کو بھی احساس ہوا کہ ہمارے آدمی پیچھے پہنچ گئے ہیں، تو اُنہوں نے بھی پیچھے کو منہ کرلیا یعنی واپس لوٹ آئے، تو صحابہ کرام دونوں لشکروں کے درمیان میں آگئے، اور ایک طرف پہاڑ ہے، اِس اچانک حملے کے ساتھ گھبراہٹ جو ہوئی تو مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے، افراتفری پھیل گئی، کوئی آگے کو بھاگا جارہا ہے، کوئی پیچھے کو جارہا ہے، کچھ لوگ پہاڑ کے اُوپر چڑھ کر ادھر کو دوڑ گئے، کوئی مدینہ منورہ کی طرف دوڑ آئے، اکثر و بیشتر حضور ﷺ کے ساتھی اِس میدان میں منتشر ہوگئے۔

رسالت مآب ﷺ کا زخمی ہونا

اتفاق سے کسی نے آواز بلند کردی: ''اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ '': نعوذ باللہ محمد ﷺ بھی قتل کردیے گئے (ابن کثیر وغیرہ)، چونکہ ایک پتھر آپ ﷺ کے منہ پر لگا تھا، جس سے آپ کے دانت زخمی ہوگئے تھے، یہ دو سامنے والے دانت اُوپر والے اور دو نیچے والے جن کو ثنایا کہتے ہیں، ان کے پہلو میں جو دانت ہوتے ہیں (رَباعی)، تو نیچے والے ثنایا کے پہلو میں یہ دائیں طرف والا جو

دانت تھا یہ پتھر لگنے سے شہید ہوگیا، چہرہ مبارک بھی زخمی ہوگیا، اور "خود" بھی ٹوٹ کر گھس گئی، خون ہی خون ہوگیا، تو آپ ﷺ چکر کھا کر گر گئے تھے، جس کی وجہ سے یہ آواز بلند ہوئی کہ "إِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ" پھر جو آپ ﷺ کے ساتھ کچھ تھوڑے سے افراد رہ گئے تھے اُنہوں نے آپ کو سنبھالا اور وہاں سے اٹھا کر لے گئے، اور پہاڑ کے اندر ایک غار ہے اُس غار میں لے جا کر بٹھا دیا، جس میں پردہ تھا، اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ وہاں حفاظت کے لئے کھڑے ہوگئے، اس طرح سے مسلمانوں نے نقصان اٹھایا، اور اکثر بھاگ گئے، جس کی وجہ سے مشرکین کو خیال آیا کہ ہم نے اب میدان فتح کرلیا۔

ابوسفیان کا نعرہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب

ابوسفیان نے ایک جگہ کھڑے ہو کر نعرہ لگایا: "اُعْلُ هُبَلُ!" ھبل بلند ہو، ھبل کی شان بلند ہو، جس کا مسلمانوں نے جواب دیا تھا کہ اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ۔ اس نعرے سے پہلے اُس نے آواز دے کر پوچھا کہ محمد ہے؟ ابوبکر ہے؟ عمر ہے؟ جب کسی نے کوئی جواب نہ دیا، (کیونکہ حضور ﷺ نے منع کر دیا کہ کوئی جواب نہیں دینا) تو وہ کہنے لگا کہ یہ سب قتل ہوگئے، ان میں کوئی باقی نہیں، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا تو پھر اُنہوں نے بلند آواز سے کہا کہ سب زندہ ہیں، اور تجھے ذلیل کرنے کے لئے ابھی یہ باحیات ہیں،[1] تو اس قسم کی آوازیں بھی ایک دوسرے پر کسی گئیں۔

غزوۂ اُحد میں نصرتِ الٰہی کا حیران کُن پہلو

لیکن یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہی ایک نصرت ہے جس پر اہل تاریخ حیران ہیں، اور واقعی حیرانی والی بات ہے کہ مسلمانوں میں افراتفری ہوگئی، حضور ﷺ بھی زخمی ہوگئے، میدان چھوٹ گیا، لیکن اس کے باوجود مشرک خود بخود پسپا ہوگئے، میدان اُنہوں نے چھوڑ دیا اور چل دیے، جس کو فیصلہ کن شکست کہتے ہیں وہ مسلمانوں کو نہ دے سکے، ورنہ وہ موقع ایسا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو مدینہ کی بستی کو اجاڑ سکتے تھے، اگر وہ چاہتے تو بھاگے ہوؤں کے مقابلے میں آ کر اُن کی پکڑ دھکڑ کر سکتے تھے، اور یہ سات آٹھ افراد جو حضور ﷺ کے اردگرد تھے اِن کو بھی وہ نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے قلوب پھیر دیے گئے کہ یہ چیزیں اُن کے ذہن میں نہیں آئیں، اور محض قدرتِ خداوندی کے ساتھ ہی جنگ کا رخ بدلا کہ وہ اِس میدان کو چھوڑ کر واپس آگئے، جب وہ مکہ معظمہ کی طرف آتے ہوئے کئی میل باہر نکل آئے تو پھر اُن کو خیال آیا کہ ہم نے یہ کیا کیا؟ اب تو موقع ایسا ملا تھا کہ ہمیں پوری طرح سے صفائی کر دینی چاہیے تھی، واپس چلتے ہیں، لیکن پھر مرعوب ہوگئے جس کا ذکر آگے غزوہ حمراء الاسد کے عنوان کے ساتھ آئے گا، تو دوبارہ اُن کو اِدھر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

واقعۂ اُحد کا تتمہ

پھر زخمی صحابہ حضور ﷺ کے اردگرد اکٹھے ہوئے، اور شہداء کو اکٹھا کیا گیا، ستر یا پچھتر کے قریب افراد شہید ہوئے، حضرت

(۱) صحیح البخاری ج۲ ص۵۷۹ باب غزوۃ احد۔ نیز ۱/۴۲۶ باب ما یکرہ من التنازع۔

حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اِسی میدان میں ہوئی، اور پھر ان شہداء کو دفن کیا گیا، قبریں کھودی گئیں، ایک ایک قبر کے اندر دو دو تین تین کو لٹایا گیا، چونکہ زخموں کی وجہ سے سارے تھکے ہوئے تھے اور اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ قبر کھودیں، خاص طور پر اُس پہاڑی علاقے میں، اس لیے ایک ایک قبر میں کئی کئی کو لٹایا گیا، اس طرح اُن شہداء کو وہاں دفن کر دیا گیا۔

اور یہ جو لڑائی پیش آئی اِس میں جہاں مسلمانوں کو نقصان پہنچا، اِس کے ساتھ ہی منافقوں، کافروں اور یہودیوں کے کچھ حوصلے بھی بلند ہو گئے، جس طرح بدر کی لڑائی میں اِن کے حوصلے پست ہو گئے تھے، اور وہ سمجھے تھے کہ اب مسلمان کسی کے بس میں نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ منافقانہ طور پر، بہت لوگوں نے اسلام قبول کیا، اور یہود بھی دب گئے اور اُن کی شرارتیں بھی کم ہو گئیں، سب پر رعب طاری ہو گیا، لیکن غزوۂ احد کے بعد اُن کے حوصلے پھر کچھ بلند ہو گئے، اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس کو شکست نہ دی جا سکے، اِن کو شکست بھی دی جا سکتی ہے، اور دشمنوں کے حوصلے بلند ہونے کے بعد پھر کچھ چھیڑ چھاڑ کا دور زیادہ شروع ہو گیا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس غزوے کے مختلف حالات پر یہاں مفصل تبصرہ کیا ہے، اور جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہوا اُس کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں، اور صبر وتقویٰ کے اندر اِن سے جو کچھ لغزش ہوئی اور کمی ہوئی، کہ یہ صبر وتقویٰ کو اُس طرح نہ سنبھال سکے جس طرح سنبھالنا چاہیے تھا، تو اِس پر بھی تنبیہ کی گئی، اور کافروں مشرکوں کے سامنے مسلمانوں کی اِس تکلیف کی حکمتیں واضح کی گئیں، اس لئے یہ واقعہ قرآنِ کریم کے اندر کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ اِس کے مختلف پہلو ہیں جن کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اِبتدائی آیات کا مفہوم

تو یہ ابتدائی آیات ہیں جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں، ترجمہ دیکھیے، ''یاد کیجئے جس وقت آپ چلے صبح کے وقت اپنے گھر سے، ٹھکانہ دیتے تھے آپ ایمان والوں کو، ٹھہراتے تھے آپ ایمان والوں کو لڑائی کے ٹھکانوں پر، لڑائی کے مورچوں میں، یا لڑنے کے لئے آپ مختلف ٹھکانوں پر ٹھہراتے تھے'' یہ وہ ابتدائی قصہ ہے جب حضور ﷺ یہاں مدینہ سے چل کر اُحد میں پہنچے ہیں۔ ''اللہ سننے والا ہے جاننے والا ہے'' موافق مخالف سب کی باتیں اللہ کو معلوم ہیں، حالات معلوم ہیں۔ ''یاد کیجئے جس وقت تم میں سے دو گروہ بزدل ہونے لگے تھے، جب قصد کیا اُنہوں نے کہ بزدل ہو جائیں، ہمت چھوڑ دیں'' یعنی پھر اللہ نے اُنہیں ہمت چھوڑنے نہیں دی، وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا: اللہ اُن کا ولی تھا، اس لئے اُن کو سنبھال لیا، یہی لفظ ہے جس کو وہ دونوں بنوسلمہ اور بنوحارثہ اپنے لئے بشارت قرار دیتے ہیں۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اِس میں اُن کے اُس فعل پر انکار ہے، کہ تم اِس لئے حوصلہ چھوڑ رہے تھے کہ تمہاری تعداد کم ہو گئی، اور بہت سارے افراد تمہیں چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے؟ مؤمنوں کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے، تعداد پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، نہ اپنے زیادہ سامان پر بھروسہ کرنا چاہیے، ایمان والوں کا کام ہے کہ نظر اللہ پر رکھیں، جتنے اسباب اپنے بس میں ہوں اُن کو تو جمع کرنا چاہیے، اُس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، لیکن اسباب کے جمع کرنے کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں قرار دیتے ہوئے اپنی ہمت نہیں ہارنی چاہیے، توکل کا یہی معنی ہوتا ہے، توکل کا یہ معنی نہیں کہ ظاہری اسباب کی بھی رعایت نہ رکھو، ظاہری اسباب کی رعایت

تو تھی کہ حضور ﷺ نے بھی زرہ پہنی، اسلحہ اٹھایا، ساتھی اکٹھے کئے، جماعت بنائی، یہ سب ظاہری اسباب ہیں، لیکن اپنی طاقت کے مطابق اور اپنے وسائل کے مطابق جب ظاہری اسباب جمع ہو جائیں تو پھر یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اسباب کمزور ہیں، ہم ضرور شکست کھا جائیں گے، ہماری تعداد تھوڑی ہے دشمن ہم پر ضرور غالب آ جائے گا، یہ بات نہیں، پھر وہی بات ہے جو طالوت کے ساتھیوں نے کہی تھی کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (پارہ ۲ کا آخر) تو صبر کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت ہوتی ہے، باقی قلت وکثرت پر فتح وشکست کا مدار نہیں، ایمان والوں کا جذبہ یہی ہونا چاہیے کہ اپنی طرف سے ہمت میں کمی نہ کریں، اور اپنی طرف سے ہمت صَرف کر کے اسباب جمع کر کے پھر بھروسہ اللہ پہ کریں کہ فتح وشکست اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو اپنی قلتِ تعداد سے متأثر ہونا اچھی بات نہیں ہے، عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اللہ پر ہی چاہیے کہ ایمان والے توکل کریں۔ اب آگے مثال دے دی کہ پچھلے واقعہ کو دیکھو، اُس وقت تمہاری تعداد زیادہ تھی؟ اُس وقت اسلحہ تمہارے پاس بہت تھا؟ جس وقت اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی اور تمہیں فتح دی تھی، وہاں بھی اللہ کی نصرت کے ساتھ ہی ہوا، تو اب بھی تمہیں چاہیے تھا کہ اللہ کی نصرت پر ہی نظر رکھتے، ''اللہ نے مدد کی تمہاری بدر کے میدان میں اس حال میں کہ تم کمزور تھے، بے سروسامان تھے'' اَذِلَّةٌ کا مفہوم ترجمے میں میں نے واضح کر دیا، ''اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتِ نصرت کے تم شکرگزار رہو'' تقویٰ پر اللہ کی طرف سے جو نصرت آتی ہے اُس کی شکرگزاری یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی مزید پابندی کرو اور مزید تقویٰ اختیار کرو۔

''اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ'' کا تعلق غزوۂ بدر سے ہے یا اُحد سے؟

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: یہ آیات غزوۂ احد سے متعلق ہیں یا غزوۂ بدر سے؟ اِس میں مفسرین کی دونوں رائیں ہیں، بعض حضرات کے نزدیک تو یہ غزوۂ بدر سے متعلق ہیں، کہ غزوۂ بدر میں حضور ﷺ نے مؤمنین کو تسلی دی تھی، اللہ کے سامنے نصرت کی دعا کی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہزار فرشتوں کا وعدہ کیا، جس کا ذکر سورۂ انفال میں آئے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے مزید اطمینان دلانے کے لئے تین ہزار کی بشارت دی، اور پھر جب مسلمانوں کو خبر پہنچی کہ ایک مشرک کُرز بن جابر بہت بڑا لشکر لے کر مشرکوں کی حمایت کے لئے آ رہا ہے، اُس کی وجہ سے ایک بشری تقاضے سے کچھ خوف اور ہراس طبیعتوں میں آیا، تو اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار فرشتوں کا وعدہ کیا، کہ اگر وہ اِسی جوش وخروش کے ساتھ آ جائیں گے تو تمہاری پانچ ہزار کے ساتھ مدد کروں گا، اور یہ خبر جو دی جا رہی ہے محض بشارت اور تمہارے اطمینانِ قلب کے لئے دی جا رہی ہے، ورنہ نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے، بغیر فرشتوں کی وساطت کے بھی اللہ غالب کر سکتا ہے۔ تو یہ آیات بدر کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، کہ مسلمانوں کو بشارت دیتے ہوئے نصرت کا وعدہ کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زبان سے یہ بشارتیں دلوائیں، کہ اللہ کی طرف سے فرشتے بطور مدد کے اُتریں گے (عام تفاسیر)۔ اور بعض مفسرین نے اِس کو غزوۂ احد کے ساتھ بھی لگایا ہے (نسفی، آلوسی) کہ جب منافقین تین سو کی تعداد میں واپس ہو گئے تو مسلمانوں پر طبعی طور پر اِس کا کچھ اثر پڑا، تو سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے اُن کو بشارت دی گئی کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، اگر یہ تین سو واپس ہو گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ تین ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا، اور جیسے مشرکوں کی طرف سے جوش وخروش کی خبریں

آرہی ہیں اگر وہ جوش وخروش کے ساتھ حملہ آور ہو بھی جائیں گے تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا، تین ہزار کی بشارت یوں مناسب ہو جائے گی کہ کفار کا لشکر تین ہزار تھا یا یہ واپس ہونے والے تین سو تھے تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے دس گنا کر کے فرشتے ذکر کر دیے، اور پانچ ہزار کی مناسبت اس طرح ہے کہ بڑے لشکر کے پانچ حصے ہوا کرتے ہیں، اس لئے بڑے لشکر کو خمیس کہتے ہیں، پانچ حصے ہوتے ہیں، مقدمۃ الجیش: یہ جو آگے ہوا کرتے ہیں، اور میمنہ: جو دائیں طرف ہوتے ہیں، میسرہ: جو بائیں طرف ہوتے ہیں، ساقہ: جو سب سے پیچھے ہوتے ہیں، قلب: جو درمیان میں ہوتے ہیں، تو گویا کہ ایک ایک حصے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ہزار ہزار فرشتے بطور مدد کے شامل ہو جائیں گے، تو یہ غزوۂ احد میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کی زبانی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بشارت دی، اِس طرح سے اِس کو غزوۂ اُحد کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے..... ''یاد کیجئے جب آپ کہہ رہے تھے مؤمنوں کو کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ مدد دے تمہیں تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے ہوئے ہوں گے'' یعنی یہ اُن فرشتوں کے علاوہ ہیں جو عام طور پر دوسرے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین پر ٹھہرائے ہوئے ہیں، یہ وہ فرشتے ہوں گے جو جنگ میں شمولیت کے لئے ہی اتارے گئے ہوں گے، ''کیوں نہیں'' یعنی یہ بھی کافی ہیں، لیکن آگے نیا وعدہ ہے کہ ''اگر تم مستقل مزاج رہے، صابر رہے اور متقی رہے، اگر تم نے صبر اختیار کیا اور تقویٰ اختیار کیا، اور وہ لوگ تمہارے پاس اِسی جوش وخروش کے ساتھ آ گئے تو تمہیں تمہارا رب مدد دے گا پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جو نشان لگانے والے ہوں گے'' یعنی اُن پر کوئی خصوصی علامات لگی ہوئی ہوں گی جس سے معلوم ہوگا کہ یہ جنگ میں شرکت کے لئے آئے ہیں، ''اس خبر کو نہیں بنایا اللہ نے تمہارے لئے مگر بشارت اور تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں، اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی جانب سے جو زبردست ہے حکمت والا ہے'' اصل نصرت تو اللہ کی طرف سے ہی ہے، باقی! فرشتوں کی تعداد وغیرہ سن کر دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کیوں اتارے گا؟ یہ مدد تمہیں کیوں دے گا؟ ''تا کہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے اور باقیوں کو خائب وخاسر کر کے واپس لوٹا دے'' یا بدر میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کیوں کی؟ (اگر اس کو بدر کے ساتھ لگائیں) ''تا کہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے، یا اُن کو ذلیل کر دے پھر وہ خائب وخاسر ہو کر واپس لوٹ جائیں۔''

''لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ'' کا شانِ نزول

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ: اس آیت کے شانِ نزول میں بھی دونوں قسم کی باتیں ہیں، یہ آیت غزوۂ اُحد سے متعلق ہے، اور اس کا مطلب یا تو یوں ادا کیا جائے گا کہ یہ جو تین سو منافق واپس لوٹ گئے ہیں آپ ان کی وجہ سے غمزدہ نہ ہوں، اِس معاملے میں آپ کا کوئی اختیار نہیں، آپ نے جہاں تک تبلیغ کرنی تھی اور اُن کو سمجھانا تھا سمجھا لیا، اب اگر سمجھانے کے باوجود وہ راہِ راست پر نہیں آئے اور واپس لوٹ گئے تو اس میں آپ کو غمزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ ساری کی ساری بات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، چاہے آئندہ اِن کی توبہ قبول کر لے، اِن پر رجوع کر لے اور ان کو اچھا بنا دے کہ آئندہ یہ اِس قسم کی لغزش نہ کریں، اور اگر اللہ تعالیٰ مناسب سمجھے تو ان کو عذاب دے کہ اسی نفاق میں مبتلا رکھے اور اسی نفاق پر ان کو موت دے، کہ بے شک یہ ظالم ہیں، ایسا

بھی ہوسکتا ہے، یوں بھی اس کا تعلق قائم کیا گیا ہے، کہ اُن منافقوں کے چلے جانے کی وجہ سے حضور ﷺ کو جو صدمہ ہوا تھا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس معاملے میں آپ کا کوئی اختیار نہیں، آپ کے ذمے تبلیغ تھی، آپ نے سمجھانا تھا سمجھا لیا، اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرو، چاہے آئندہ اللہ تعالیٰ انہیں توبہ کی توفیق دے اور یہ توبہ واستغفار کرلیں اور اللہ ان کی توبہ قبول کرلے، یا ان کو نفاق پر ہی موت دے دے پھر ان کو عذاب میں مبتلا کردے، یہ اللہ کے اختیار میں ہے، جس کو چاہے بخشے یعنی نیکی کی توفیق دے کر، اور جس کو چاہے عذاب دے دے، آپ کا اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے، ہر قسم کا اختیار اللہ کے لئے ہے ()......اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ جب حضور ﷺ کو زخم آ گیا تھا تو اُس وقت آپ نے کافروں کے لئے بددعا کرنی چاہی، یا اس قسم کے الفاظ آپ کی زبان پر آئے کہ وہ قوم کیسے کامیاب ہوسکتی ہے جنہوں نے اپنے نبی کے ساتھ یہ حال کیا، اور اشارہ اپنے دانت کی طرف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُس وقت یہ آیت اُتاری (عام تفاسیر) کہ آپ صبر وتحمل رکھیں، اس معاملے میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے، اللہ کی حکمتیں ہیں، چاہے ان کافروں کو اللہ توبہ کرنے کی توفیق دے دے، اور ان کو نیکی کی توفیق دے دے، ان کے لئے مغفرت کا سامان پیدا کردے، یہ بھی اللہ کے اختیار کی بات ہے، اور چاہے تو یہ اپنے کفر وشرک پر اَڑے رہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت کے اندر عذاب میں مبتلا کردے، یہ بھی اللہ کے اختیار کی بات ہے، آپ اس معاملے میں کوئی دخل نہ دیں۔ تو زخمی ہونے کے بعد حضور ﷺ نے جو بددعا کرنے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت یہ آیت اتری...... دونوں طرح سے اس آیت کا شانِ نزول ذکر کیا گیا ہے، بہرحال یہ آیات غزوۂ اُحد سے متعلق ہیں، غزوۂ بدر سے نہیں، اور فرشتوں کی تعداد وغیرہ کا جو ذکر آیا ہے تو یہاں تفسیروں میں دونوں قسم کے اقوال موجود ہیں کہ غزوۂ اُحد سے متعلق ہے یا غزوۂ بدر سے۔ ''نہیں ہے آپ کے لئے امر سے کچھ بھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے اُوپر رجوع کرے، ان کی توبہ قبول کرے، یا انہیں عذاب دے، پس بیشک یہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بخشے گا جس کو چاہے گا، عذاب دے گا جس کو چاہے گا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا
اے ایمان والو! سود نہ کھایا کرو کئی کئی گنا بڑھایا ہوا، اور اللہ تعالیٰ سے
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝١٣٠ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝١٣١ وَ
ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ ۝١٣٠ بچو تم اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے ۝١٣١ اور

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ

اللہ کا اور رسول کا کہنا مانو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۳۲﴾ دوڑو تم مغفرت کی طرف جو تمہارے رَبّ کی

رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ

طرف سے حاصل ہونے والی ہے اور جنت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین ہیں، تیار کی گئی ہے متقین کے لئے ﴿۱۳۳﴾ جو

يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ

خرچ کرتے ہیں خوشحالی میں اور تکلیف میں اور غصے کو دبانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے

عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا

والے ہیں، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ﴿۱۳۴﴾ وہ لوگ جس وقت کوئی بے حیائی کا کام

فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠

کر لیتے ہیں، یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں تو یاد کرتے ہیں اللہ کو، پھر استغفار کرتے ہیں اپنے گناہوں کے لئے،

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا

اور کون گناہوں کو بخشتا ہے سوائے اللہ کے، اور وہ اصرار نہیں کرتے اُس کام پر جو انہوں نے کیا

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ

حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۱۳۵﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ مغفرت ہے ان کے رَبّ کی طرف سے اور باغات ہیں،

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے ﴿۱۳۶﴾

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا

تحقیق گزر گئے تم سے پہلے بھی واقعات، پس تم زمین میں چلو پھرو پھر تم دیکھو

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى

جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ﴿۱۳۷﴾ یہ لوگوں کے لئے وضاحت ہے اور ہدایت ہے

وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾

اور نصیحت ہے متقین کے لئے ﴿۱۳۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا: سود نہ کھایا کرو، کھانے سے مراد لینا ہے، سود نہ لیا کرو، چونکہ کھانا مال کے منافع میں سے ایک بڑا نفع ہے، اس لیے عموماً جس وقت مال کے لینے کا تذکرہ آتا ہے تو اُس کو کھانے کے ساتھ ہی ذکر کر دیتے ہیں، مراد مطلق لینا ہے، پھر چاہے اُس کو پہننے میں صرف کرو، چاہے اپنے کسی دوسرے کام میں لاؤ، چاہے کھانے کے کام میں لاؤ، اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً: اَضعاف ضِعف کی جمع ہے بمعنی دُگنا، مُضاعفہ: بڑھایا ہوا، اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا معنی کئی کئی گنا بڑھایا ہوا، دُگنے پہ دگنا، یہ حاصل مفہوم ہے اِس کا، ''کئی کئی گنا زیادہ سود نہ کھایا کرو'' وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پا جاؤ، وَاتَّقُوا النَّارَ: بچو تم آگ سے، الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ: ایسی آگ جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے، وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ: اور اللہ کا کہنا مانو، وَالرَّسُوْلَ: اور رسول کا کہنا مانو، لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: تاکہ تم پر رحم کیا جائے، وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: سَارِعُوا مُسارعة باب مفاعلہ، ایک دوسرے کے مقابلے میں جلدی کرنا'' دوڑو'' یہ اِس کا حاصل مفہوم ہے، دوڑنے میں چونکہ ہر شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے جس کو یہاں مسارعۃ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری جگہ استباق کا لفظ ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرۃ:۱۴۸، وغیرہ)۔ اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: دوڑو اپنے ربّ کی طرف سے مغفرت کی طرف، دوڑو تم مغفرت کی طرف جو تمہارے ربّ کی طرف سے حاصل ہونے والی ہے، وَجَنَّةٍ: اور جنّت کی طرف دوڑو، عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں، مغفرت اور جنّت کی طرف دوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اِن کے موجبات کی طرف دوڑو، ایسے کام کرو جن کی بناء پر اللہ کی مغفرت حاصل ہوتی ہے، اور ایسے کام کرو جن کی بناء پر جنّت حاصل ہوتی ہے، ''ایسی جنّت کی طرف جس کی چوڑائی، جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں''، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ: تیار کی گئی ہے متقین کے لئے، الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ: جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی میں، وَالضَّرَّآءِ: اور تکلیف میں، سراء سے مالی خوشحالی مراد ہے اور ضراء سے مالی تنگی مراد ہے، ''جو خوشحالی میں اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں'' وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ: اور غصے کو دبانے والے ہیں، وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ: اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً: وہ لوگ جس وقت کوئی فاحشہ کر لیتے ہیں، کھلا بے حیائی کا کام، کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر لیتے ہیں جو فاحشہ کا مصداق ہے، اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں، ذَكَرُوا اللّٰهَ: تو یاد کرتے ہیں اللہ کو، فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ: پھر استغفار کرتے ہیں اپنے گناہوں کے لئے، وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ: کون گناہوں کو بخشتا ہے سوائے اللہ کے، وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا: اور وہ اصرار نہیں کرتے اُس کام پر جو انہوں نے کیا، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ: حالانکہ وہ جانتے ہیں، اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ اِن کا بدلہ مغفرت ہے اِن کے رب کی طرف سے، وَجَنّٰتٌ: اور باغات ہیں، تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: جاری ہوں گی اُن کے نیچے سے

نہریں، خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ: عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ: تحقیق گزر گئے تم سے پہلے بھی واقعات، سُنَنٌ سُنَّۃٌ کی جمع ہے، سُنّت سے واقعہ مراد ہے، فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ: پس تم زمین میں چلو پھرو، فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ: پھر تم دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا، هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ: یہ لوگوں کے لئے وضاحت ہے، وَهُدًى: اور ہدایت ہے، وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ: اور نصیحت ہے متقین کے لئے، ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ حق اور باطل کو سمجھیں، اور موعظہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مطابق عمل بھی کریں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع میں غزوۂ اُحد کا ذکر آیا تھا، جس کے ضمن میں کچھ بدر کے واقعات کی طرف اشارہ کر دیا گیا تھا، اور یہ آیات جہاں تک ترجمہ کیا گیا ہے اس کے بعد پھر وہی واقعات ہیں جو غزوۂ اُحد سے تعلق رکھتے ہیں، درمیان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ ایمان کو کچھ ہدایات دی ہیں، اور اُن ہدایات کا حاصل یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیجئے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی نہ ہونے پائے، بدر کے اندر صبر وتقویٰ مضبوط تھا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوئی، اور اُحد کے اندر بعض معاملات میں صبر وتقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محرومی ہوئی، تو جب تک تم صبر وتقویٰ کو اختیار کیے رہو گے اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل رہے گی۔ اور اس میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے، چونکہ جہاد کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے، جس طرح جہاد میں جانی قربانی دی جاتی ہے اسی طرح مال کی قربانی بھی دی جاتی ہے، کیونکہ جب تک خرچ نہیں کریں گے اُس وقت تک جہاد کی تیاری نہیں ہوتی، اصل مقصد تو ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دینا۔

سُود کی ممانعت اور اِس موقع پر ممانعت کی حکمت

خرچ کرنے کی ترغیب دینے سے پہلے سود لینے کی ممانعت کر دی، سورۂ بقرہ کے آخری حصے میں آپ کے سامنے گزر چکا کہ سود صدقے کے ساتھ تضاد کا تعلق رکھتا ہے، اللہ کے راستے میں مال وہ شخص خرچ کر سکتا ہے جس کے دل میں مال کی محبت نہ ہو، بلکہ آخرت کی قدر ہو، اور سود خوار انتہائی طور پر مال کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے، کہ اگر کسی کو بوقتِ ضرورت وہ قرض دیتا ہے تو اپنے پیسے واپس لیتا ہے، اور صرف اپنے پیسے ہی واپس نہیں لیتا بلکہ تھوڑا سا وقت جو اُس نے اِس کے مال سے فائدہ اٹھایا ہے اُس کی قیمت بھی وصول کرتا ہے، تو یہ انتہائی بخل اور مال کے ساتھ انتہائی محبت کی علامت ہے، اور جب کوئی شخص مال کی محبت میں اس طرح مبتلا ہو جائے تو پھر وہ مال اللہ کے راستے میں صدقہ خیرات کے طور پر نہیں دے سکتا، اور جب مال کے بارے میں اتنا بخل ہوگا تو جان

کے خرچ کرنے میں بھی بخل کرے گا۔ ایثار اور ہمدردی، اللہ کے راستے میں اپنی جان اور مال کی قربانی، یہ سود کھانے والوں سے ممکن نہیں ہوتی، اور اُس زمانے میں مدینہ منورہ کے اردگرد چونکہ یہود کے قبائل آباد تھے، اور یہود سودی کاروبار بہت کرتے تھے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے قبل اوس وخزرج اور دوسرے قبائل کے بھی اُن کے ساتھ یہی سودی معاملات چلتے رہتے تھے، مدینہ منورہ میں آنے کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کی ممانعت کردی، چونکہ یہ مالی نشیب وفراز بہت زیادہ پیدا کرتا ہے، ایثار اور ہمدردی سے انسان محروم ہوجاتا ہے۔ پھر گزشتہ آیات میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہود کے ساتھ تعلقات چھوڑ دو لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ، اور ان تعلقات کے قطع کرنے کے لئے بھی سود کی ممانعت مفید ہے، کیونکہ جب تک سودی کاروبار چلتے رہیں گے مسلمانوں کے تعلقات یہود کے ساتھ رہیں گے، اور جب سودی معاملات چھوٹ جائیں گے تو یہود کے ساتھ قطع تعلق ہوجائے گا، قرضہ لینا دینا اور پھر اُن کو سود ادا کرنا، اس قسم کی چیزیں یہود کے ساتھ جو مسلمانوں کی تھیں اُن کو بند کرنا مقصود ہے، بہر حال کچھ اسی قسم کے مقاصد کے تحت اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں سود کی ممانعت کی ہے۔

''اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً'' کی قید احترازی نہیں

اور سود کی ممانعت کرتے ہوئے لفظ یہ آئے کہ لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً: کئی کئی گنا سود نہ کھایا کرو، اور اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کی جو قید لگائی گئی ہے یہ احترازی نہیں بلکہ ایک واقعہ کا بیان ہے، اگر احترازی ہوتو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ تھوڑا بہت تو کھالیا کرو، لیکن کئی کئی گنا جو اصل کے مقابلے میں کئی گنا ہوجائے وہ نہ کھایا کرو، اور یہ مطلب غلط ہے، چونکہ قرآنِ کریم میں ہی دوسری آیت میں مطلقاً ربا کی حرمت مذکور ہے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ:۲۷۵)، اور سود کھانے والوں کی مذمت بھی علی الاطلاق کی گئی ہے، تھوڑا کھائیں یا زیادہ کھائیں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کلام پاک میں بھی ایک ایک درہم سود کی مذمت بیان فرمائی ہے، اس لئے سود کی حرمت کا تعلق اس سے نہیں کہ وہ اصل سے بڑھ جائے، بلکہ کم سے کم ہوتو بھی وہ حرام ہے، اُس کی حرمت دوسری آیات اور صحیح روایات سے ثابت ہے، اور یہاں جو اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کی قید لگائی گئی ہے یہ اس کی قباحت کو زیادہ مستحضر کرنے کے لئے ہے، جیسے دوسرے کو نصیحت کرتے ہوئے کوئی شخص یوں کہے کہ بھائی! مسجد میں گالی نہ دو، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مسجد کے باہر گالی دینا جائز ہے، بلکہ گالی کی زیادہ قباحت ظاہر کرنے کے لئے اُس کا ایک نقشہ سامنے حاضر کردیا کہ دیکھو! تم مسجد میں گالی دیتے ہو؟ گالی تو مطلقاً بھی ممنوع ہے، پھر مسجد میں دینا اور بھی زیادہ ممنوع ہے، تو یہ قید واقعہ کے مطابق ہوتی ہے قباحت اور شناعت بڑھانے کے لئے، اس میں احتراز نہیں ہوا کرتا۔ تو اُس وقت بھی لوگوں کے ہاں سود ایسے ہی چلتا تھا، کہ ایک سو روپیہ دیتے اور اُس کے اوپر دس روپے سود لگتا، پھر اگر وقت پر وہ ادا نہ کرسکے تو ایک سو دس کو اصل قرار دے کر پھر اُوپر سود لگادیتے، جس کو سود در سود کہتے ہیں، یعنی سود مرکب، کہ سود کو اصل رقم کے اندر شامل کرکے پھر اُس کے اُوپر سود لگاتے رہتے، جیسے ایک سو روپیہ قرض دے کر ہزاروں روپے یہ بنیے، مہاجن، اور اس قسم کے سود خوار مقروضوں سے وصول کرتے ہیں، تو یہ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، بہت گھناؤنی چیز ہے کہ جتنے پیسے دیے تھے اُس سے کئی کئی گنا تم وصول کرو، کتنی بُری

بات ہے، تو زیادہ قباحت ظاہر کرنے کے لئے یہ قید لگائی گئی ہے، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اگر سود کم ہو تو جائز ہے اور اگر زیادہ ہو تو جائز نہیں ہے۔ ''سود نہ کھایا کرو کئی کئی گنا زیادہ، دگنے پہ دگنا'' یعنی اصل سے بھی جو کئی کئی گنا زیادہ ہو جائے اس قسم کا سود نہ لیا کرو، اِس صورت میں خود اُس کی قباحت زیادہ نمایاں ہے۔ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ'' یعنی آج دنیا کا نظریہ یہ ہے کہ سود لینا اور سودی کاروبار کرنا کامیابی کا ذریعہ ہے، اور لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان مالی مشکلات میں اسی لئے مبتلا ہیں چونکہ یہ سودی کاروبار نہیں کرتے، یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہدایت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان یہ ہے کہ فلاح اسی میں ہے کہ تم سود کو چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرو، اہل ایمان کا جذبہ یہی ہونا چاہیے کہ چاہے دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی ہو، یہ اللہ کے احکام ماننے میں ہے، اللہ کے احکام کی خلاف ورزی میں نہیں ہے، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ میں اِس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا، کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کو قبول کرو۔

جہنّم اصل کے اعتبار سے کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے

وَاتَّقُوا النَّارَ: بچو جہنم سے، الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ: جو کہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ بقرہ کی ابتداء میں بھی آئے تھے، وہاں عرض کر دیا گیا تھا کہ جہنم اصل کے اعتبار سے تو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے، مؤمن کا جہنم سے کوئی کام نہیں، لیکن مؤمن کے اندر جب تک کفر کا کوئی شعبہ نہ پایا جائے اُس وقت تک جہنم میں نہیں جائے گا، کفر دو قسم کا ہے، ایک کفر اعتقادی اور ایک کفر عملی، اگر کفر اعتقادی ہوگا تو جہنم اُسی کے لئے ہے، وہ تو دائماً اُس میں رہے گا، اُس سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا، اور اگر کفر اعتقادی تو نہیں ہے البتہ کوئی کام کافروں والا ہو گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کفر کا شعبہ ہے، اگر کوئی شخص ان نافرمانیوں میں سے کسی نافرمانی کو اختیار کرتا ہے، مثلاً نماز نہیں پڑھتا تو نماز نہ پڑھنا بھی کافروں کا کام ہے، زکوٰۃ نہیں دیتا تو زکوٰۃ نہ دینا بھی کافروں کا کام ہے، حج نہیں کرتا، یا اس طرح سے کوئی بدمعاشی بدکاری فسق فجور کے اندر مبتلا ہوتا ہے، تو یہ ساری کی ساری چیزیں کفر کے شعبے ہیں، یہ ایمان کے شعبے نہیں، جیسے ہر نیکی ایمان کا شعبہ ہے اسی طرح ہر گناہ کفر کا شعبہ ہے۔ تو اگر کوئی شخص عملی طور پر کفر کے شعبے کو اختیار کرتا ہے تو اِس عملی مشابہت کی بناء پر وہ جہنم میں جائے گا، لیکن فرق یہ ہوگا کہ اگر اُس میں صرف عملی کفر تھا اس لیے سزا پائے گا، سزا پانے کے بعد بخشا جائے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی رحمت کے ساتھ ابتداء بھی معاف کر دے، بہر حال گناہ گار آدمی جس کا عقیدہ صحیح ہو وہ دائمی جہنمی نہیں، دائمی جہنمی وہی ہے جو عقیدۃً کافر ہے۔ باقی! مؤمن جو جہنم میں جائے گا تو اِس کفر کی مشابہت کی بناء پر جائے گا، جب وہ عملی طور پر ایسے کام کرنے لگ جائے جو مؤمن کی شان کے لائق نہیں بلکہ کافر کی شان کے لائق ہیں، تو اِس عملی تشبہ کی بناء پر اُس کو بھی جہنم میں بھیجا جا سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ معاف نہ کرے یا کسی کی سفارش کے ساتھ جان نہ چھوٹے تو اِس عملی کفر کی سزا پانے کے لئے وہ جہنم میں جائے گا، اور جب وہ سزا پوری ہو جائے گی اللہ کے علم کے مطابق، تو اُس کو چھوڑ دیا جائے گا اور وہ نجات پا جائے گا، بہر حال مؤمن آخر کار ناجی ہے، نجات پانے والا ہے، اور جہنم اصل میں کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

حجیتِ حدیث

وَاَطِیعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُولَ: اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ: تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یہاں دو لفظ بولے گئے اللہ اور رسول، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، جیسے دوسری آیات میں ہے اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ "(۱) تو اَطِیعُوا کا صیغہ مستقل بھی آیا ہوا ہے، اب اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام صراحتاً اُترتے ہیں، جیسے کتاب اللہ میں آگئے، اِن کو ماننا اللہ کی اطاعت ہے، اور اِس کے علاوہ رسول کا یہ منصب ہے کہ وہ آپ کو ایسے احکام بھی دے سکتا ہے جن کا ذکر صراحتاً کتاب اللہ میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول کا منصب بیان کیا ہے تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت، تو تعلیم کا تعلق اِسی کے ساتھ ہی ہے کہ لفظی ترجمے کے علاوہ اس کا کچھ مفہوم بھی سمجھایا جائے، اور حکمت کے متعلق جس طرح آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ حکمت سے سُنّت بھی مراد لی گئی ہے، دانشمندی اور عقلمندی کی باتیں، رموز و نکات جو کتاب اللہ سے ثابت ہوتے ہیں وہ بھی مراد ہیں، تو جب رسول کا منصب ہے کہ وہ معلم کتاب ہے، اس لئے جو کچھ وہ اِس کتاب کی تعلیم کے تحت کہیں گے، اور اِس کتاب کو سمجھاتے ہوئے جو باتیں بیان فرمائیں گے اُن کا ماننا بھی ضروری ہوا، اب چونکہ وہ صراحتاً تو قرآنِ کریم میں ہوں گی نہیں، نسبت اُن کی رسول کی طرف ہوگی، چاہے حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی اللہ کی بات ہے، جیسے قرآنِ کریم میں آیا کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى (سورۂ نجم) یہ رسول اپنی خواہشِ نفس کے تحت نہیں بولتا، ایسی باتیں نہیں کہتا جو اِس کی خواہشِ نفس سے ناشی ہیں، جو کہتا ہے اللہ کی طرف سے وحی شدہ ہوتی ہیں، چاہے اُس کے الفاظ وحی شدہ ہوں، چاہے کوئی مفہوم وحی شدہ ہو، چاہے اصول وحی ہو گئے ہوں اور اُن سے وہ مستنبط کر کے کہتے ہیں، بہر حال اِن کا بیان کردہ کوئی حکم ہوائے نفس سے ناشی نہیں ہے، ہوتا تو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے:

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

یعنی بظاہر دیکھنے میں اگرچہ وہ اللہ کے بندے کے منہ سے نکل رہا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اللہ کی کہی ہوئی بات ہوتی ہے۔ جب رسول کا منصب یہ ہے تو جو کچھ رسول بیان کرے گا اُس کا ماننا بھی ضروری ہوا، اس لئے اِن کا ذکر علیحدہ کر دیا گیا، اگر رسول نے صرف وہی بات کہنی ہو جو کتاب اللہ میں آئی ہوئی ہے اور اِس کے علاوہ رسول کا کوئی دوسرا منصب نہ ہو تو پھر اَطِیعُوا اللّٰہَ کہنا کافی تھا، وَالرَّسُولَ بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو جگہ بہ جگہ رسول کے اِس منصب کو بیان کیا ہے لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (سورۂ نحل: ۴۴) تاکہ تو واضح کرے لوگوں کے لئے اُس چیز کو جو اُن کی طرف اتاری گئی، اسی طرح مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورۂ حشر: ۷) جو کچھ تمہیں رسول دے وہ لے لیا کرو، اور جس سے روکے اُس سے رک جایا کرو، اِن میں رسول کا یہی منصب بیان کرنا مقصود ہے۔ اور حدیث شریف میں بھی آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ ایک شخص اپنے عیش و عشرت کے ساتھ تکیہ لگائے بیٹھا ہو، اور اُس کے پاس میرا کوئی حکم آئے یا میری کوئی نہی آئے، یعنی

(۱) پارہ نمبر ۷ سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۹۲ / سورۂ نور: ۵۴، ۵۶ / سورہ محمد: ۳۳ / سورہ تغابن: ۱۲۔

ایسی کوئی بات آئے جس کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے میں نے روکا ہے، اور وہ کہے کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے، جو ہم اُس میں پائیں گے ہم اُس کی اتباع کریں گے، تو ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ میں بھی لوگوں کو احکام دیتا ہوں اور اس قسم کے احکام دیتا ہوں جن کی اتباع ضروری ہے، اور وہ قرآنِ کریم میں مذکور نہیں، بلکہ میرے بیان کردہ احکام قرآنِ کریم کے بیان کردہ احکام سے زیادہ ہیں، روایات میں اِس مضمون کو واضح طور پر ذکر کیا گیا۔[1] بہر حال اَلرَّسُوْلَ کا لفظ جو مستقل کر کے ذکر کر دیا گیا تو معلوم ہو گیا کہ رسول کی ایسی بات جو صراحتاً قرآنِ کریم میں مذکور نہیں اُس کا ماننا بھی ضروری ہے، اور اصل کے اعتبار سے اطاعتِ رسول وہی کہلائے گی۔

''اُولِی الْاَمْرِ'' کا مصداق اور ان کی اطاعت کا حکم

جیسے ایک اور آیت آپ کے سامنے آئے گی، جس میں ایک لفظ اور بڑھا ہوا ہو گا اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء:۵۹) اپنے میں سے اولوا الامر کی اطاعت بھی کرو، اب اولوا الامر سے کون مراد ہیں؟ حکام یا علماء؟ اس میں دونوں باتیں ہیں، اطاعتِ رسول اُن باتوں میں ہوگی جو اللہ نے صراحتاً نہیں کہیں، اور اولی الامر کا ذکر جو آ گیا تو اس سے مراد ایسی باتیں ہوں گی جو اللہ اور اللہ کے رسول نے صراحتاً نہیں کہیں، اگر اولی الامر نے بھی وہی بات آپ کو بتانی ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول نے صراحتاً کہی ہے تو پھر اس لفظ کے بڑھانے کی ضرورت نہیں تھی، یہ لفظ جو بڑھایا گیا تو معلوم ہو گیا کہ اولوا الامر کا ایک منصب ایسا بھی ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں کہیں جن کا ذکر صراحتاً قرآنِ کریم میں اور حدیث شریف میں نہیں، تو اُن باتوں کا ماننا بھی ضروری ہے بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اور اللہ کے رسول کی نافرمانی سے تعلق نہ رکھتی ہوں کیونکہ ''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ''[2] خالق کی معصیت جہاں لازم آتی ہو وہاں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاتی۔ اگر تو اُولِی الْاَمْرِ سے مراد حکام ہیں پھر تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے ملکی انتظام کے طور پر جو وہ ہدایات دیں اُن کا ماننا ضروری ہے اور شرعی فرض ہے، اور اگر مراد علماء ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ قرآن اور حدیث کی طرف دیکھتے ہوئے جو احکام وہ مستنبط کرتے ہیں جن کا ذکر صراحتاً قرآن اور حدیث میں نہیں ہے اُن کا ماننا بھی ضروری ہے۔ تو یہ تیسرے لفظ کا بڑھانا اسی لئے ہے کہ صراحتاً وہ بات نہ تو آپ کو اللہ کی کلام میں ملے گی، نہ رسول اللہ ﷺ کی کلام میں ملے گی، اس قسم کے احکام کا ماننا ضروری ہو گا، اور اس قید کو ساتھ ملحوظ رکھنا ہو گا کہ وہ اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے خلاف نہ ہوں، اولوا الامر کا کہنا ماننے میں اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی لازم نہ آئے، اگر اُن کی نافرمانی لازم آئے گی تو پھر اللہ کا حق اور اللہ کے بعد رسول کا حق مقدم ہے اولی الامر سے، اور اگر وہ ایسی بات کہتے ہیں جو اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے ساتھ موافقت رکھتی ہے، چاہے صراحتاً حکم اُن کی کلام میں موجود نہیں ہے تو پھر اُس کا ماننا

---

(۱) ابو داؤد ۲/۲۷۶، باب فی تعشیر الخ۔ ۲/۲۷۶، باب فی لزوم السنۃ/ ترمذی ۲/۹۵/ مشکوۃ ۱/۲۹، باب الاعتصام۔ فصل ثانی۔

(۲) مشکوۃ ۲/۳۲۱، کتاب الامارۃ۔ فصل ثانی عن النواس، بحوالہ شرح السنۃ۔ نیز بخاری ۲/۱۰۷۸ پر ہے: لا طاعۃ فی معصیۃ/ مسلم ۲/۱۲۵ پر ہے: لا طاعۃ فی معصیۃ اللہ۔

واجب ہے، اوراُس کی نافرمانی درست نہیں۔ انتظامی امور میں اس قسم کی چیزیں آجایا کرتی ہیں، جب تک حاکم کی اطاعت کا اصول نہ اپنایا جائے اُس وقت تک دنیا کا نظم ٹھیک نہیں رہ سکتا، اس لئے یہ ہدایت دے دی گئی۔

حجیتِ حدیث کی مزید وضاحت

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: تاکہ تم پر رحم کیا جائے، تو اللہ کی رحمت کو حاصل کرنے کے لئے اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے، تو حجیت حدیث کے لئے یہ لفظ دلیل ہے، کیونکہ حدیث کا مطلب یہاں یہی ہے کہ جو حکم صراحتاً کتاب اللہ میں موجود نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اُس کا ماننا ضروری ہے، چاہے وہ حکم ایسا ہو کہ قرآنِ کریم میں اُس کے متعلق کوئی اشارہ موجود نہیں، چاہے وہ حکم ایسا ہے کہ قرآنِ کریم میں مجمل آیا ہوا ہے اور اُس کی تفصیل اللہ کے رسول نے بیان کردی، جیسے قرآنِ کریم نے کہا کہ نماز قائم کرو، لیکن اس کا کوئی عملی نقشہ کتاب اللہ میں نہیں دکھایا گیا، رکوع سجدے کا ذکر ہے لیکن کوئی پتہ نہیں رکوع کس طرح ہوتا ہے؟ سجدہ کس طرح ہوتا ہے؟ تو نماز اپنی پوری ہیئت کذائیہ کے ساتھ قرآنِ کریم میں مذکور نہیں ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے اُس کے مطابق عمل کر کے دکھادیا، اب اس ہیئت کے ساتھ نماز ادا کرنا، ان اوقات میں، اتنی رکعات، اتنے رکوع اور اتنے سجدے، یہ ساری کی ساری اطاعتِ رسول ہے، تو نماز پڑھنی فرض ہے اور اس طرح سے پڑھنی فرض ہے جس طرح حضور ﷺ نے پڑھ کر دکھائی یا پڑھنے کے لئے سکھائی، اب یہ مجمل لفظ آگیا اُس کی تشریح حضور ﷺ نے کردی۔ اسی طرح زکوۃ ہے، قرآن نے کہا ہے کہ زکوۃ دو، اب کس کس مال میں سے دینی ہے، کتنا مال ہو تو دینی ہے، اور کس مقدار کو ادا کرنا ہے، جانوروں میں کیا اصول ہے، سونے چاندی میں کیا اصول ہے، مالِ تجارت میں کیا اصول ہے، یہ ساری کی ساری وضاحت اللہ کا رسول کرے گا، اِن باتوں کو ماننا اطاعتِ رسول ہے۔

نیکی میں مسابقت کی ترغیب

وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ سَارِعُوْا: بھاگ کر چلو، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو، کیونکہ نیکی میں استباق اور نیکی میں مسارعت مرغوب ہے، ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرو، کوشش کرو کہ میں دوسرے سے زیادہ اللہ کی رحمت حاصل کرلوں، دوسرے سے زیادہ اللہ کی مغفرت حاصل کروں، نیکی کے اندر مقابلہ مطلوب ہے، جیسے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرہ: ۱۴۸، وغیرہ) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو نیکیوں میں۔ ''دوڑو اپنے رَبّ کی طرف سے مغفرت کی طرف'' مغفرت کی طرف دوڑنے کا مطلب ہے موجباتِ مغفرت کی طرف دوڑنا، یعنی وہ کام کرو جن کی بناء پر تمہارے رَبّ کی طرف سے مغفرت حاصل ہوتی ہے، اور اسی طرح وہ کام کرو جن کی وجہ سے جنّت حاصل ہوگی۔

جنّت کی وسعت

اور جنّت کو معمولی نہ سمجھو عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: اگر تو یہ عرض کا لفظ طول کے مقابلے میں ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا

کہ اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، کیونکہ انسان اگر زیادہ سے زیادہ وسعت سوچ سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ اس میں زمین و آسمان سما جائیں اتنی زیادہ کشادہ چیز ہو، تو اس کے مطابق اس بات کو ادا کر دیا گیا کہ اتنی زیادہ کشادہ ہے کہ اس کی چوڑائی اتنی ہے جتنی زمین اور آسمان، باقی! طول کا حال اللہ جانے، اتنی لمبی چوڑی وہ جنت ہے۔ اور عرض سے مراد قیمت بھی لی گئی ہے، کیونکہ عرض اس سامان کو بھی کہتے ہیں جو مقابلے میں پیش کیا جائے، اب مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی قیمتی چیز ہے کہ آسمان اور زمین اس کے مقابلے میں آجائیں تو بھی جنت زیادہ قیمتی ہے، یہ ترجمہ بھی بعض تفاسیر کے اندر کیا گیا ہے (آلوسی) لیکن مشہور ترجمہ وہی ہے کہ عرض سے طول کا مقابل مراد ہے، اور اس میں جنت کی وسعت بیان کرنا مقصود ہے۔

حصولِ جنت کے لئے تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ضروری ہے

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ: یہ تیار کی گئی ہے متقین کے لئے، متقین کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُن کا ایمان صحیح ہو، اور آگے جیسے جیسے عمل میں تقویٰ آئے گا اتنا ہی جنت کی طرف انسان زیادہ قریب ہوتا چلا جائے گا، اور تقوے میں خلل ہوگا تو جہنم کی طرف قریب ہوتا چلا جائے گا، جیسے پہلے آپ کی خدمت میں وضاحت کر دی۔ اور جس شخص کا عقیدہ ہی صحیح نہیں ہے تو اُس میں ادنیٰ درجے کا بھی تقویٰ نہیں، چونکہ عقیدہ صحیح نہ ہو تو اعمال کا کوئی اعتبار نہیں، ایسے شخص کا جنت سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے مؤمن اگر گناہ کرتا ہے تو اُس گناہ کی بناء پر جہنم میں تو اُس کو بھیجا جائے گا اور سزا بھگت کر واپس آ جائے گا، لیکن اگر کافر کوئی نیکی کرتا ہے تو کافر کی اس نیکی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لئے اُس نیکی کی بناء پر وہ جنت کا حقدار نہیں ہوگا، اور اُس کو جنت میں نہیں بھیجا جائے گا، عقیدے کے فساد کے بعد عملی نیکی کا کوئی درجہ نہیں ہوتا، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ: یہ متقین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

متقین کی صفات اور اُن کے ذِکر کا مقصد

اب آگے متقین کی کچھ صفات بیان کر دیں جن کا حاصل کرنا متقی بننے کے لئے ضروری ہوا، اور جب یہ صفات حاصل ہو جائیں گی تو اس کے بعد جو جزا ذکر کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ، اور یہی مغفرت اور جنت ہے جس کی طرف بھاگنے اور دوڑنے کا حکم دیا گیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو آپ کو کہا گیا کہ اللہ کی مغفرت اور جنت حاصل کرنے کی کوشش کرو، آگے اس کا طریق اور راستہ بتا دیا، کہ یہ راستہ ہے جس پر تم چلو گے تو اپنے اس مقصد کو پہنچ جاؤ گے۔ متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو حقوق العباد سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

پہلی صفت: جذبۂ اِنفاق، اور اِنفاق کی صورتیں

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ: متقین وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی میں بھی اور تنگی میں بھی، یعنی اُن کو خرچ کرنے کی عادت ہے، اُن کے پاس تھوڑا ہو اس میں سے خرچ کرتے ہیں، زیادہ ہو اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، اصل یہ ہے کہ

اُن میں اِنفاق کا جذبہ ہوتا ہے، یعنی دوسرے سے لینے کا جذبہ نہیں ہوتا، دینے کا جذبہ ہوتا ہے، اور ایمان کا تقاضا اصل میں یہی ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ ہو، اور پھر اس اِنفاق کو عام ذکر کیا ہے، یہاں اِس کا مفعول مال ذکر نہیں کیا، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی کے پاس مال ہے تو مال خرچ کرے، اور اگر مال خرچ نہیں کرسکتا تو جو چیز بھی اُس کے پاس ہے اُس کو اللہ کے راستے میں لگائے اور مخلوق کو فائدہ پہنچائے، اس لئے اگر مال نہ ہو تو علم کی نشرواشاعت، اور اگر بدنی قوت آپ کو حاصل ہے تو بدنی قوت کا اللہ کے راستے میں صرف کرنا اور لوگوں کو اپنی بدنی خدمت کے ساتھ فائدہ پہنچانا، یہ بھی اِنفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے، جیسے کہ مفسرین نے تعمیم کی ہے، تو یُنفِقُونَ کے بعد اَموَالَهُم ذکر نہیں کیا، بلکہ اس کو عام چھوڑا ہے، تنگی میں، کشادگی میں، جو چیز بھی اللہ کے راستے میں آپ صَرف کرسکتے ہیں صرف کیجئے، مال ہے تو مال کو صرف کیجئے، اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے تو علم کو صرف کیجئے، بدنی قوت دی ہے تو بدنی قوت کو صرف کیجئے، بہر حال اللہ کی رضا کے لئے مخلوق کی خدمت کرنا بھی اِنفاق ہی میں شامل ہے (معارف القرآن)۔

اور سراء اور ضراء دونوں لفظ بول دیئے کیونکہ بسا اوقات کشادگی ہوتی ہے تو انسان اللہ سے غافل ہوجاتا ہے، اور بسا اوقات تنگی ہوتی ہے تو اللہ سے غافل ہوجاتا ہے، تو متقی وہ ہوتا ہے جو نہ تنگی میں اللہ کو بھولتا ہے اور نہ کشادگی میں اللہ کو بھولتا ہے، دونوں ہی صورتوں میں وہ اللہ کے راستے میں اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال سب کچھ صرف کرتا ہے۔

دوسری صفت: غصّے پر کنٹرول

وَالكٰظِمِينَ الغَيظَ: غصّے کو دبانے والے ہیں، یعنی انسان جس وقت اپنی انسانی برادری میں مل جل کر رہتا ہے تو بہت سارے واقعات ایسے ہیں جو طبیعت کے خلاف پیش آتے ہیں، اور پھر تکلیف پہنچانے والے پر غصہ بھی آتا ہے، اور غصہ آنے کے بعد پھر انسان لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتا ہے، دوسرے پر ہاتھ اٹھاتا ہے، اگر وہ شخص جس کو غصہ آیا ہے انتقام لینے پر قادر ہے اور قدرت کے باوجود وہ اپنے غصے کو دبا جائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت محبوب عمل ہے، جیسے کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا اللہ! تیرے بندوں میں سے سب سے محبوب بندہ تجھے کون سا ہے؟ کس بندے سے تجھے زیادہ محبت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَن اِذَا قَدَرَ غَفَرَ: کہ جو قادر ہونے کے باوجود معاف کردے،[1] اگر کوئی شخص انتقام لے ہی نہیں سکتا، جیسے ایک بڑے آدمی نے کسی چھوٹے کو، کمزور کو، اور غریب کو ستایا، اب وہ انتقام لے ہی نہیں سکتا تو صبر تو وہ بھی کرے گا، لیکن اُس کے صبر میں اتنا کمال نہیں ہے جتنا ایسے شخص کے صبر میں کمال ہے جو ہر طرح سے سزا دے سکتا ہے، انتقام لے سکتا ہے، بدلہ لے سکتا ہے، لیکن پھر وہ معاف کردے۔ اور انسانی برادری میں یہ عادت بہت اہم ہے، چونکہ ایک دوسرے سے تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، اگر ہر شخص اپنی تکلیف کا انتقام لینے کی کوشش کرے گا تو کبھی بھی ماحول میں سکون اور اطمینان پیدا نہیں ہوسکتا، غصہ دبانے کی کوشش سکون اور اطمینان پیدا کرتی ہے، کہ اگر کسی بات پر تمہیں غصہ آ بھی جائے تو اُس کو دبا جاؤ، اُس کو ہمیشہ آگے چالو نہ کردیا کرو۔

---

(۱) مشکوۃ ج ۲ ص ۴۳۴ عن ابی ھریرۃؓ، باب الغضب، فصل ثالث / شعب الایمان ج ۱۰ ص ۵۵۰۔

تیسری صفت: عفوودرگزراوراحسان

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ: اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، عفو کا معنی ہے درگزر کرنا، معاف کرنے والے ہیں، کہ اگر کوئی اپنے حق میں کوتاہی ہوگئی یا بدنی طور پر کوئی تکلیف پہنچ گئی یا عزت کو کوئی نقصان پہنچ گیا، دوسرے کی طرف سے کوئی ایسا معاملہ ہوگیا جو باعث تکلیف ہے تو اس سے درگزر کر جاتے ہیں، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: صرف یہی نہیں کہ معاف کردیتے ہیں بلکہ احسان کی صفت اُن میں پائی جاتی ہے، کہ الٹا اپنے ستانے والوں پر احسان کرتے ہیں، اور جو بھی احسان کرنے والا ہو اللہ تعالیٰ اُس سے محبت رکھتا ہے، یہاں بھی وہی بات ہے کہ دوسرے کو بُرائی کا بدلہ بُرائی کے ساتھ نہ دیا جائے یہ بھی خوبی ہے، کہ اُس کو معاف کردیا جائے، لیکن اگر بُرائی کرنے والے کے ساتھ احسان کیا جائے تو اور بھی زیادہ خوبی کی بات ہے، جیسے کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

اگر مردِی اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَا　　　بدی را بدی سہل باشد جزا

کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دینا بہت آسان ہے، یہ تو عام آدمی بھی کرسکتا ہے کہ بُرائی کے بدلے میں بُرائی کرلے، جیسے آپ کہا کرتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے، تو بدی کے مقابلے میں بدی آسان ہے، اگر تو جواں مرد اور بہادر ہے تو احسان کر اُس شخص کے ساتھ جو تیرے ساتھ بُرا برتاؤ کرتا ہے (بوستان، باب ۲، حکایت درحلم)۔ یہی اصول ہے صلہ رحمی میں، کہ اگر کوئی رشتہ دار آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے، آپ مقابلۃً اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں، یہ بھی اچھی بات ہے، لیکن زیادہ قابل تعریف نہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کی صلہ رحمی یہی ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی قطع رحمی سے پیش آئے تو تم اُس کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آؤ،[1] تو یہ ہے احسان کا جذبہ۔ کظمِ غیظ اور عفو کے بعد اِحسان کا درجہ ہے، کہ غصے کو دبا جاؤ، دوسرے کی کوتاہی سے درگزر کر جاؤ، اور پھر اُس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، یہ صفت حاصل کرو گے تو تب جا کر انسان کامل درجے کا مستحق بنتا ہے، اور اِس شخص کے متعلق ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت ایسے شخص کے لئے تیار کی ہے، اور یہی شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ درجے کی مغفرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

چوتھی صفت: گناہ ہوجانے پر اِستغفار

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً: اور متقی وہ لوگ ہیں کہ جس وقت کوئی فاحشہ کرلیتے ہیں، یعنی کوئی ایسا گناہ کرلیتے ہیں جس کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے، اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کے اندر آجائے گا کہ ایسا گناہ کرتے ہیں جس کا اثر معاشرے پر نہیں پڑتا، دوسروں پر نہیں پڑتا، اپنا ہی ذاتی نقصان ہے، جیسے اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کا اپنا ذاتی نقصان ہے، اور اگر کوئی شخص ظلم وستم کرتا ہے تو یہ ایسا گناہ ہے جس میں اِس کا اپنا نقصان بھی ہے اور دوسروں تک بھی یہ نقصان متعدی ہوتا ہے۔ یا فاحشہ سے مراد کھلی بے حیائی ہے، کہ کوئی کھلا گناہ کرلیا نمایاں قسم کا، اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: ایسا گناہ جو عام طور پر لوگوں کے اندر شہرت نہیں رکھتا، فَاحِشَةً اور ظَلَمُوْٓا

(۱) مسند احمد، رقم: ۱۵۲۱۰۔ ولفظ الحدیث: أفضل الفضائل أن تصل من قطعك الخ نیز معجم اوسط طبرانی، رقم: ۱۳ ۵۷د

اَنْفُسَهُمْ میں تمام گناہ آجائیں گے، جب وہ کوئی کھلا گناہ کر بیٹھتے ہیں، فاحشہ یعنی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں، یا مطلب یہ ہے کہ ایسا کام کر بیٹھتے ہیں جس کا نقصان دوسروں تک پہنچتا ہے یا اپنے نفسوں پر ظلم کر لیتے ہیں، ذَكَرُوا اللّٰهَ: اللہ کو یاد کرتے ہیں فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ: پھر اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ جب بھی انسان سے صادر ہوتا ہے اللہ کے ذکر سے غفلت کی بناء پر صادر ہوتا ہے، اور اگر اللہ یاد رہے تو پھر انسان کا نفس اللہ کی معصیت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ تو اگر بشری کمزوری کے تحت کسی وجہ سے گناہ صادر ہو بھی جائے تو فوراً اللہ کو یاد کریں اور پھر اپنے گناہوں کے لئے استغفار کریں، اور آگے فرمایا کہ اللہ کے علاوہ گناہوں کو بخش کون سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بخشتا ہے۔

پانچویں صفت: گناہ پر اصرار نہ کرنا

وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا: اور یہ لوگ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے، اَڑتے نہیں ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں اس بات کو کہ ہم نے گناہ کیا، اور استغفار کرنے سے اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے، اگر نہیں استغفار کریں گے تو اللہ کی طرف سے سزا ہوگی، ان باتوں کو جانتے ہوئے وہ اُس گناہ پر اصرار نہیں کرتے، یہ بھی متقین کی صفت ہے، یعنی انسانی دنیا کے اندر چونکہ لغزشیں ہوتی رہتی ہیں، انسان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی کمزوریاں رکھی ہیں جن کی بناء پر یہ غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، اِس کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، اپنے ماحول سے تاثر کی بناء پر یا نفسی تقاضے سے انسان پھسل جاتا ہے، تو متقی ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُس سے سرے سے گناہ ہی نہ ہو، کہ اعلیٰ درجے کا متقی وہ ہو جس سے سرے سے گناہ ہی نہ ہو، یہ انبیاء علیہم السلام کے بعد دوسرے لوگوں کے لئے مشکل ہے، انبیاء علیہم السلام سے گناہ نہیں ہوتا، وہ ہر طرح سے پاک ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کتنا ہی عظیم انسان کیوں نہ ہو اس معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اُس سے لغزش ہو جاتی ہے اور کبھی نہ کبھی وہ اس قسم کی کوتاہی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کو ہم گناہ کا نام دیتے ہیں، تو پھر یہ ضروری ہے کہ اللہ کو یاد کر کے فوراً اپنے گناہ سے استغفار کر لیا جائے۔ پھر جس قسم کا گناہ ہو اُس کے مطابق توبہ ہونی چاہیے، مثلاً اگر کسی کا مالی نقصان کیا ہے تو یا حق ادا کر دیا اُس سے معاف کرواؤ، پھر اللہ سے استغفار کرو، تب وہ گناہ معاف ہوگا، اسی طرح کوئی فرض چھوٹ گیا ہے جیسے نماز نہیں پڑھی تو پہلے قاعدے کے مطابق اُس کو قضا کرو، پھر اللہ سے استغفار کرو، طریقہ یہی ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا کام ہو گیا کہ شریعت نے اُس کا کفارہ متعین کیا ہے تو کفارہ دو، قضا متعین کی ہے تو قضا دو، اُس گناہ کو مٹانے کا جو طریقہ شریعت نے بتایا ہے وہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو تو اللہ تعالیٰ گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور اگر معلوم ہونے کے باوجود کہ ہم سے غلطی ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ اور استغفار کا یہ طریقہ بتایا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس طریقے پر چلنے سے گناہ کو معاف فرما دیتے ہیں، ان باتوں کے جاننے کے باوجود اگر وہ کام کرتا رہتا ہے تو پھر یہ تقوے کے خلاف ہے، پھر ایسا شخص متقی نہیں ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کو حاصل نہیں کرے گا جو جان بوجھ کر کسی گناہ پر اصرار کرتا ہے۔ ہاں! البتہ اللہ یاد آ گیا، اللہ کا بتایا ہوا طریقہ یاد آ گیا، غفلت دور ہوگئی، اور پھر اللہ تعالیٰ کے بتائے طریقے کے مطابق استغفار کیا جائے تو پھر

اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔''اصرار نہیں کرتے اپنے کیے پر'' وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ: اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں، یعنی علم ہونے کے باوجود اپنے اُس گناہ پر اور اپنے اُس برے کام پر اَڑتے نہیں ہیں، اِصرار کا معنی ہوتا ہے اَڑنا۔ اور آپ پہلے صدقِ دل سے توبہ کر لیجئے تو پچھلا گناہ معاف ہو گیا، اور اگر پھر کسی مجبوری کی بناء پر دوبارہ وہی گناہ ہو گیا تو یہ اِصرار نہیں ہے، اُس کے لئے پھر دوبارہ توبہ کر لیجئے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً''[1] او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام کہ جو آدمی گناہ سے استغفار کر لیتا ہے اس کو مُصِر نہیں کہا جاتا چاہے وہ غلطی ایک دن میں ستر دفعہ کرلے، سو دفعہ کرلے، سینکڑوں دفعہ کرلے، جتنی دفعہ بھی کرلے، یعنی اگر گناہ ہو جانے کے بعد اللہ کو یاد کر کے فوراً وہ توبہ کر لیتا ہے چاہے ایک دن میں ستر دفعہ کرلے، اگر وہ استغفار کر لیتا ہے تو اُس کو مصر نہیں کہا جائے گا۔ اور استغفار کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے پر ندامت ہو اور آئندہ نہ کرنے کا عزم ہو، اگر آپ نے اِس عزم کے تحت اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کر لی کہ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا، لیکن پھر کسی مجبوری سے، ماحول کے تاثر سے، یا غفلت سے اُس گناہ میں مبتلا ہو گئے تو دوبارہ پھر توبہ کرلو، دوبارہ اُس میں مبتلا ہو جانا پچھلی توبہ کو نہیں توڑتا، پچھلی توبہ بحال رہتی ہے، اِصرار تب بنتا ہے کہ جب جانتے ہوئے انسان اُس برے کام کو کرتا بھی رہے اور پھر اس سے توبہ استغفار نہ کرے۔ جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں (اُولٰٓئِكَ کا اشارہ اِدھر ہے) ان کی جزا مغفرت ہے ان کے رَبّ کی طرف سے، اور باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، اور ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں گے، اور عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے۔

مذکورہ صفات کا حاصل

توجس مغفرت اور جنت کو حاصل کرنے کے لئے آپ کو مسارعت کا حکم دیا گیا تھا گویا اب اُس کو حاصل کرنے کا طریقہ بتا دیا، کہ یہ صفتیں اپناؤ، ہر حال میں اللہ کے راستے میں خرچ کرو، اور غصے کو دبایا کرو، لوگوں کی کوتاہیوں سے درگزر کرو، اور مخلوق کے ساتھ احسان سے پیش آؤ، اور اگر کوئی بے حیائی کا کام اور کوئی گناہ کا کام ہو جائے تو اللہ کو یاد کر کے فوراً اپنے گناہ کی معافی مانگو، اور دل میں یہ عقیدہ رکھو کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا گناہ معاف نہیں کر سکتا، اور کبھی بھی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہم سے غلطی ہوگئی اُس کے اُوپر اصرار نہ کرو، ضد اور ہٹ اختیار نہ کرو، جس وقت یہ صفتیں اپناؤ گے تب وہ مغفرت اور جنت حاصل ہوگی جس کے حاصل کرنے کے لئے تمہیں مسارعت کا کہا گیا ہے، کہ بھاگ کر آگے آؤ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور جنت کی طرف۔

گزشتہ تاریخ کا حوالہ

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ: یہ پھر تاریخ کا حوالہ ہے کہ تم سے پہلے بہت واقعات گزر گئے، اُن میں اگر غور کرو گے تو پتہ چلے گا کہ جنہوں نے صبر و تقویٰ کو اپنایا کامیاب وہی رہے، ''بہت سارے واقعات گزر گئے، زمین کے اندر چلو پھرو، پھر دیکھو کہ

---

(۱) ابو داؤد، ج ۱ ص ۲۱۲ باب فی الاستغفار / ترمذی ج ۲ ص ۱۹۶ / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۰۴ باب الاستغفار۔ فصل ثانی۔

جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا'' تمہارے سامنے یہ بات آجائے گی کہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تکذیب کرتے ہیں آخرکار خسارے میں وہی رہتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہیں کامیابی اُنہی کو نصیب ہوتی ہے، سکون اور اطمینان اِس زندگی میں بھی اور آخرت کی کامیابی بھی اُنہی لوگوں کے حصے میں ہے جو صبر وتقویٰ کو مضبوطی سے تھامتے ہیں۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ: یہ لوگوں کے لئے وضاحت کردی گئی اور یہ ہدایت اور موعظت ہے متقین کے لئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اِس بیان کے ذریعے سے حق وباطل کے درمیان فرق کرو، اور پھر اُس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرو، ہدایت اور موعظت کے درمیان فرق یہی ہے، ''راہنمائی ہے'' یعنی حق اور باطل میں امتیاز کرنے والی چیز ہے، ''اور موعظت ہے'' یعنی اُس کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب ہے، تو یہ جو وضاحت آپ کے سامنے کی جارہی ہے اس کے ساتھ حق اور باطل کو سمجھنے کے بعد اُس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیے، متقین کا کام یہی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ

تم ہمت نہ ہارو اور غمزدہ نہ ہوؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم کامل مؤمن ہو ﴿۱۳۹﴾ اگر

يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا

تمہیں زخم پہنچا ہے پس تحقیق پہنچا قوم کو بھی ایسا ہی زخم، یہ ایام ہم ادل بدل کرتے رہتے ہیں

بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ

لوگوں کے درمیان، اور تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور تاکہ اختیار کرلے تم میں سے

شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

شہداء، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کے ساتھ محبت نہیں رکھتا ﴿۱۴۰﴾ اور تاکہ صاف ستھرا کرے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں،

وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ

اور تاکہ کافروں کو مٹادے ﴿۱۴۱﴾ کیا تم نے یہ سمجھ لیا کہ داخل ہوجاؤ گے جنت میں اور ابھی تک نہیں جانا

اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ

اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور نہیں معلوم کیا صابرین کو ﴿۱۴۲﴾ البتہ تحقیق تم موت کی تمنا کیا

الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمَا

کرتے تھے قبل اس کے کہ تم اُس موت کو ملتے، پس تم نے اُس کو دیکھ لیا اس حال میں کہ تم جھانک رہے تھے ﴿۱۴۳﴾ نہیں ہیں

مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ

محمد مگر رسول، تحقیق گزر گئے ان سے پہلے رسول، کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے

انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ

تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر لوٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی شخص لوٹ جائے اپنی ایڑیوں پر پس ہرگز نہیں نقصان پہنچائے گا اللہ کو

شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا

کچھ بھی، عنقریب اللہ تعالیٰ بدلہ دیں گے شکر گزاروں کو ﴿۱۴۴﴾ نہیں ہے کسی نفس کے لئے کہ وہ مرجائے مگر

بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ

اللہ کے اذن کے ساتھ وقت مقررہ پر، اور جو کوئی ارادہ کرتا ہے دنیا کے بدلے کا تو ہم دے دیتے ہیں اُس کو اس دنیا میں سے،

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور جو کوئی ارادہ کرتا ہے آخرت کے ثواب کا تو دے دیتے ہیں ہم اُس کو اس میں سے، ہم عنقریب بدلہ دیں گے شکر گزاروں کو ﴿۱۴۵﴾

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ

کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ مل کر لڑائی لڑی بہت سے اللہ والوں نے، پھر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اُن مصیبتوں کی وجہ سے

اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ

جو اُن کو پہنچیں اللہ کے راستے میں اور نہ اُن کا زور گھٹا اور نہ وہ دبے، اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا

محبت رکھتا ہے ﴿۱۴۶﴾ نہیں تھی اُن کی بات مگر یہی کہ انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار! بخش دے ہمارے لیے ہمارے گناہ

وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

اور ہمارا اپنے معاملے میں حد سے تجاوز کر جانا، اور ہمارے قدموں کو جمادے اور ہماری مدد کر کافر لوگوں کے خلاف ﴿۱۴۷﴾

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع

پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیا کا بدلہ دیا اور آخرت کا اچھا بدلہ دیا، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں ﴿۱۴۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَا تَهِنُوْا: یہ وَھن سے لیا گیا ہے، وَھن کہتے ہیں دل کی کمزوری کو، لَا تَهِنُوْ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمت نہ ہارو، دل نہ چھوڑو، تمہارے دل میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آنی چاہیے، وَھن کا یہ مفہوم ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان کیا کہ ایک وقت آئے گا جب تم ایسے ہوجاؤ گے جیسے سیلاب کے سامنے خس وخاشاک ہوتا ہے اور سیلاب اُس کو بہا کر لے جاتا ہے، اس قسم کی حیثیت تمہاری ہوجائے گی، اور تمہارے اندر وَہن آجائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ،[1] دُنیا کی محبت اور موت سے کراہیت، یعنی موت سے ڈرنے لگ جاؤ گے اور دنیا کی محبت میں مبتلا ہوجاؤ گے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں کیفیتیں، دنیا کی محبت اور موت کا ڈر، یہ قلب سے تعلق رکھتی ہیں، حضور ﷺ نے وہن کا مفہوم یہ بیان کیا۔ تو وہن ایک کیفیت ہے جو دل پر طاری ہوتی ہے، جس میں انسان لڑنے مرنے سے ہمت چھوڑ دیتا ہے، بلکہ اپنے لیے دنیا کی راحت کا طالب ہوجاتا ہے اور موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ہے کیفیت جو قلب پر طاری ہوتی ہے اور اِس کو وہن کہتے ہیں۔ تو لَا تَهِنُوْ کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ہمت نہ چھوڑو، ہمت نہ ہارو، تمہارے دلوں کے اندر کسی قسم کی بزدلی اور ضعف نہیں آنا چاہیے، تو قلبی ضعف کو وہن سے تعبیر کیا گیا ہے، وَلَا تَحْزَنُوْا: اور غمزدہ نہ ہوؤ، یعنی جو پہلے مصیبت آگئی، تکلیف ہوگئی، فتح شکست سے بدل گئی، اِس پر غم نہ کرو، وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ: اَعلون اعلیٰ کی جمع ہے، اور تم ہی غالب رہو گے، تم ہی اعلیٰ ہو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم کامل مؤمن ہو، ایمان کے تقاضوں کو پورا کرو تو تمہیں عُلو نصیب ہوگا، اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ: اگر تمہیں زخم پہنچا ہے، فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ: پس تحقیق پہنچا قوم کو بھی زخم ایسا ہی، قوم سے مراد ہے تمہارے مقابل، حریف، دشمن، یعنی مشرکین مکہ، اُن کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے، وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ: ایام یوم کی جمع بمعنی دن، اور یہاں سے مراد ہوتے ہیں خاص دن جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کسی قوم کے ساتھ خاص برتاؤ ہوتا ہے، جیسے دوسری جگہ لفظ آئے گا ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ (سورۂ ابراہیم:۵)، اللہ کے ایام کے ساتھ اِن کو نصیحت کرو، یاد دلاؤ اِنہیں اللہ کے ایام، یعنی ایسے ایام جن میں کسی قوم کے ساتھ اللہ کا مخصوص برتاؤ ہوا، چاہے ثواب کی صورت میں چاہے عذاب کی صورت میں، تو یہ مخصوص ایام جن میں غلبہ ہوتا ہے یا شکست ہوتی ہے، کسی کو تکلیف پہنچتی ہے یا کسی کو راحت پہنچتی ہے، یہ ایام ہم اِن کو گھماتے رہتے ہیں، ادل بدل کرتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان، وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: وَلِيَعْلَمَ کا معطوف علیہ محذوف نکال لیا جائے، ''تاکہ اللہ تعالیٰ آزمائے تمہیں اور تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے ان لوگوں کو جو

---

(۱) ابوداؤد ۲/۲۳۴ باب فی تداعی الامم / مشکوٰۃ ۲/۴۵۹ باب تغیر الناس فصل ثانی عن ثوبانؓ۔

ایمان لائے ہیں''، اور یہ پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جہاں علم کا لفظ اس طور پر استعمال کیا گیا ہو جس میں بظاہر حدوث کا معنی پیدا ہوتا ہے کہ پہلے معلوم نہیں اب جان لیں، اِس سے مراد ہوتا ہے ظاہری طور پر ممتاز کر لینا، کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں تو ہے، لیکن ظاہری واقعات کے ساتھ امتیاز ہو جائے جس کے ساتھ اللہ کا علم لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ کا علم اس طرح سے ہے، جب تک واقعہ پیش نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کا علم ازلی علم ہے، اور واقعہ پیش آجانے کے بعد وہ علم ظاہر ہو جاتا ہے، اس لیے اِس کو یوں ادا کر لیجیے ''تا کہ ہم ظاہری طور پر جان لیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں'' یعنی ہمارے علم کے مطابق اُن کا ظہور ہو جائے، یا، اِس میں امتیاز والا معنی ہے ''تا کہ ہم مؤمنین کو منافقین سے علیحدہ کر لیں، ممتاز کر لیں'' یہ واقعات اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ اس میں تمہاری آزمائش ہے اور تا کہ مؤمنین مخلصین کو منافقین سے علیحدہ کر لیا جائے، وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: تا کہ جان لے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ: اور تا کہ اختیار کرے تم میں سے شہداء، شہداء شہید کی جمع، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظالموں کے ساتھ محبت نہیں رکھتا۔ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: مَحَّصَ تَمْحِيْص: خالص کرنا، جیسے کہا جاتا ہے مَحَّصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ: سونے کو آگ میں ڈال کر صاف ستھرا کیا، اِس معنی کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، ''تا کہ صاف ستھرا کرے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں'' وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ: اور تا کہ کافروں کو مٹا دے، مَحق مٹانے کو کہتے ہیں، اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: کیا تم نے یہ سمجھ لیا کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں؟ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ: اور ابھی تک نہیں جانا ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا، یعنی اُن لوگوں سے ممتاز کر کے جنہوں نے جہاد نہیں کیا، یہاں بھی علم میں امتیاز والا معنی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ابھی آزمائشیں ڈال کر تم میں سے مجاہدین کو غیر مجاہدین سے ممتاز نہیں کیا، اور لَمَّا کا لفظ اِس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ آئندہ ایسے واقعات پیش آئیں گے جس میں اللہ کے راستے میں جان مال قربان کرنے والے اُن لوگوں سے علیحدہ ہو جائیں گے جو اپنی غرض کے بندے ہیں اور موقع آنے پر جان مال قربان نہیں کر سکتے، ''ابھی تک نہیں معلوم کیا اللہ تعالیٰ نے ظاہری طور پر، یا نہیں ممتاز کیا اللہ تعالیٰ نے'' یہاں بھی علم کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں جیسے وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ذکر کیے ہیں، ''اُن لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا'' وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ، اور نہیں معلوم کیا صابرین کو۔ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ: البتہ تحقیق تم موت کی تمنا کیا کرتے تھے، مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ: قبل اس کے کہ تم اُس موت کو ملتے، موت سے ملاقات کرتے، فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ: پس تم نے اُس موت کو دیکھ لیا، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ: اس حال میں کہ تم جھانک رہے تھے، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ حال مؤکدہ ہے رَاَيْتُمُوْهُ کے فاعل سے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے کھلی آنکھوں اپنے سامنے موت کو دیکھ لیا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ: نہیں ہیں محمد مگر رسول، یہ حصر اضافی ہے، یعنی محمد ﷺ خدا نہیں، رسول ہی ہیں، یہ حصر اضافی ہے، کہ محمد رسول ہی ہے کوئی خدا تو نہیں ہے، معبود تو نہیں ہے، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ: تحقیق گزر گئے اِس سے پہلے رسول، اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ: کیا اگر وہ وفات پا گئے، اگر آپ ﷺ کو موت آگئی، اَوْ قُتِلَ: یا قتل کر دیے گئے، انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ: ہمزہ استفہام کے ساتھ انکار اِس پر کرنا مقصود ہے، کیا تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے؟ لوٹ جاؤ گے تم اپنی ایڑیوں پر؟ ایڑیوں پر پھر جانے کا مطلب ہے کہ سابق حالت کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ جاہلیت کی طرف؟ کفر کی طرف؟ ''اگر محمد ﷺ کو موت آجائے یا اگر آپ قتل کر دے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر

پھر جاؤ گے؟"، وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ: اور جو کوئی شخص مڑ جائے، پھر جائے اپنی ایڑیوں پر، یعنی اپنی سابق حالت کی طرف لوٹ جائے، جاہلیت کی طرف، یا کفر کی طرف، فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا: پس ہرگز نہیں نقصان پہنچائے گا اللہ کو کچھ بھی، وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ: عنقریب اللہ تعالیٰ بدلہ دیں گے شکرگزاروں کو، شکرگزاروں کا یہاں مفہوم یہ ہے کہ جو ایسے واقعات میں بھی نیکی کے کاموں پر ڈٹے رہتے ہیں، اور کسی حادثہ سے متاثر ہو کر کفر اور جاہلیت کی طرف عود نہیں کرتے، ایسے قدردانوں کو اور ایسے شکرگزاروں کو اللہ تعالیٰ عنقریب بدلہ دیں گے۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ: نہیں ہے کسی نفس کے لئے کہ وہ مرجائے، تَمُوْتَ مؤنث کا صیغہ ہے نفس کے لفظ کے اعتبار سے، یعنی کوئی نفس مرسکتا ہی نہیں، اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: مگر اللہ کے اذن کے ساتھ، جب اللہ کی طرف سے حکم آئے تبھی موت آتی ہے، كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا: كُتِبَ الْمَوْتُ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا یہ مفہوم ہے اِن لفظوں کا، "موت لکھی گئی ہے لکھنا وقت متعین کر کے، مؤجل: جس کا وقت متعین کیا گیا ہے، وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا: اور جو کوئی شخص ارادہ کرتا ہے دنیا کے بدلے کا، نُؤْتِهٖ مِنْهَا: ہم دے دیتے ہیں اُس کو اُس دنیا میں سے، وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا: اور جو کوئی ارادہ کرتا ہے آخرت کے ثواب کا، دے دیتے ہیں ہم اس کو اُس میں سے، آخرت میں سے، وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ: ہم عنقریب بدلہ دیں گے شکرگزاروں کو، یہاں شاکرین کا مصداق یہ ہوگا کہ جو اپنے عمل سے آخرت کے ثواب کا ارادہ کرتے ہیں۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ: کتنے ہی نبی، لڑائی لڑی اُن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے، فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا: یہاں تین لفظ آ گئے، وَهن، ضعف، استکانة، وهن کا مفہوم تو آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا کہ اِس کا معنی دل کی کمزوری ہے، اور ضعف کا مصداق ہو جائے گا بدنی قوت کا گھٹ جانا، بدنی قوت کا کمزور ہو جانا، اور اِستکانة کا مطلب ہے دشمن کے سامنے دب جانا، گھٹنے ٹیک دینا، اور ترتیب اِسی طرح ہوتی ہے، کہ پہلے انسان دل چھوڑتا ہے، اُس کے بعد اُس کے ظاہری اعضا ڈھیلے ہو جاتے ہیں، کیونکہ ظاہری اعضا کی قوت دل پر ہی مبنی ہوتی ہے، جب انسان دل چھوڑ دے تو پھر بازو بھی کمزور ہو جاتے ہیں، ٹانگوں میں بھی طاقت نہیں رہتی، بدن کا زور گھٹ جاتا ہے، اور پھر اُس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، دشمن کے سامنے دب جاتے ہیں، تو یہاں اِسی ترتیب کے ساتھ ہی اِن کی نفی کی گئی ہے، فَمَا وَهَنُوْا: اُن اللہ والوں نے ہمت نہیں چھوڑی، ہمت نہیں ہاری ان مصیبتوں کی وجہ سے جو پہنچیں اُن کو اللہ کے راستے میں، "نہ ان کا زور گھٹا" یعنی بدنی طور پر بھی وہ ڈھیلے نہ ہوئے، وَمَا اسْتَكَانُوْا: اور نہ وہ دبے، یعنی دشمن کے سامنے دبے بھی نہیں۔ اِسْتَكَانَ کا لفظ یا تو سَكَنَ سے لیا گیا ہے، اصل میں تھا اِسْتَكَنَ، سکون سے باب افتعال، اور فتح کے اشباع کے ساتھ الف پیدا ہو گیا، اِسْتَكَنَ کو اِسْتَكَانَ بنالیا گیا، جس کا معنی ہوتا ہے کہ اپنے دشمن کے سامنے سکون اختیار کر لیا کہ جس طرح چاہے وہ ہمارے ساتھ کر لے، یا یہ اصل میں اِسْتَكْوَنَ تھا، کَوْن سے باب استفعال، اِس کا بھی مفہوم وہی ہے کہ ہونے کا مطالبہ کرنا، کہ دشمن جس طرح کرنا چاہے اس طرح کر لے، اِس کا مفہوم بھی اُسی طرح نکلے گا، دونوں طرح سے اِس کو ذکر کیا گیا ہے، اس کا ترجمہ ہوگا کہ نہ وہ دبے، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے، صابرین کا معنی ثابت قدم رہنے والے، مستقل مزاج لوگ، اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہیں۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا: دشمنوں کے سامنے دبنا تو کیا تھا، ڈھیلے تو کیا ہونا تھا، اُنہوں نے تو زبان سے بھی کوئی ناموزون بات نہیں نکالی، "نہیں تھی اُن کی بات مگر یہی کہ انہوں نے کہا" یہاں بھی حصر اضافی ہے،

یعنی شکوہ شکایت اور ضعف و کمزوری کی باتیں کرنے کی بجائے ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے، رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا: اے ہمارے پروردگار! بخش دے ہمیں ہمارے گناہ، وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا: اور ہمارا اپنے معاملے میں حد سے تجاوز کر جانا، یعنی ہم اپنے معاملے میں جو حد سے تجاوز کر گئے، ہم سے کوئی اسراف ہو گیا، اور ہم نے حدود کی رعایت نہیں رکھی، اِس اسراف کو اور اِس حد سے تجاوز کرنے کو تو معاف کر دے، وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا: اور ہمارے قدموں کو جما دے، وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: اور ہماری مدد کر کافر لوگوں کے خلاف، فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا: پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیا کا بدلہ دیا، وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ: اور آخرت کا اچھا بدلہ دیا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور واقعہ اُحد پر ایک نظر دوبارہ

یہ آیات غزوۂ اُحد سے تعلق رکھتی ہیں، واقعہ آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کچھ اپنی لغزش کی وجہ سے جو اُنہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کی ہدایات پر پابندی نہیں کی، اور تیراندازوں نے اپنا مورچہ چھوڑ دیا تھا، اُس کی بناء پر فتح شکست سے بدل گئی، ستر کے قریب صحابہ شہید ہو گئے، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ وغیرہ بڑے بڑے صحابہ کی شہادت اِسی غزوے میں ہوئی، اور سرورِ کائنات ﷺ بھی زخمی ہو گئے، اور آپ کا ایک دانت مبارک بھی شہید ہو گیا، سر پر بھی چوٹ لگی، چہرۂ انور زخمی ہوا، اور آپ چکر کھا کے گر گئے تھے، جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ: محمد قتل کر دیے گئے، اس اعلان سے رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی اور قدم اُکھڑ گئے، کچھ مدینہ منورہ کی طرف بھاگ آئے، کچھ اُحد کی طرف چڑھ گئے اور اِدھر اُدھر بھاگ گئے، اور تھوڑے لوگ تھے جو سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ رہ گئے، اور اس افراتفری میں دلوں کے اندر مختلف قسم کے وسوسے آنا شروع ہو گئے، اور کمزور ایمان والے لوگ جن کے دل زیادہ مضبوط نہیں تھے اُنہوں نے کچھ اس قسم کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ جب سرورِ کائنات ﷺ ہی شہید ہو گئے اور موجود نہیں رہے تو پھر ہمیں اِن کافروں سے پناہ لے لینی چاہیے، اِن سے امن لے لیں، صلح کر لیں، اور منافق قسم کے لوگوں نے یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ جب آپ ہی نہیں رہے تو ہمیں اپنا پہلا دین ہی قبول کر لینا چاہیے، پھر ایسے ہی خواہ مخواہ جھگڑے فساد کا کیا فائدہ؟ اور بعض جو مخلص جانباز تھے وہ اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے کہ جب آپ ہی نہیں رہے تو ہمارے رہنے کا کیا فائدہ؟ ہمیں اُس طریق پر چلتے ہوئے جان دے دینی چاہیے جس طریق پر حضور ﷺ چلتے رہے، یہ مختلف قسم کی باتیں لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوئیں، اور بعض نے اِس میدان میں کمزوری کا مظاہرہ کیا، تو یہ واقعہ جو پیش آیا تھا بہت دردناک واقعہ تھا، بدر کے میدان میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت شاملِ حال تھی اور مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی، اُس سے جو حوصلے بڑھے تھے اور مشرکین کے حوصلے ٹوٹے تھے، اب اِس واقعہ سے معاملہ کچھ برعکس سا ہو گیا، کہ مشرکین کا حوصلہ بڑھ گیا، اس لئے جاتے ہوئے اُس میدان میں آخر وقت میں ابوسفیان یہ اعلان کر گیا کہ بدر کے میدان

میں اگلے سال پھر مقابلہ ہوگا، اور مسلمانوں کی طرف سے اُس کو قبول کرلیا گیا، بہر حال اس قسم کی باتیں علامت ہیں کہ مشرکین کے حوصلے بڑھ گئے، اور یہود جو ارد گرد موجود تھے اُن کے حوصلے بھی بڑھ گئے، انہوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف کچھ اس قسم کی باتیں کرنی شروع دیں جیسے دبے ہوئے اور شکست خوردہ لوگوں کے خلاف کی جاتی ہیں۔

مسلمانوں کو تسلی اور شکست میں حکمتیں

تو اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں اِس واقعہ کے بارے میں مسلمانوں کو مختلف باتیں سمجھائی ہیں، کہ ہمت چھوڑنے کی کوئی بات نہیں ہے، ایسے واقعات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قوموں کو پیش آیا کرتے ہیں، اس میں اللہ کی حکمتیں ہیں۔ پہلے تو یہ کہا کہ تم ایمان کے تقاضوں پر پورے رہو تو انجام تمہارے حق میں ہی ہوگا، اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ: غالب تم ہی رہو گے بشرطیکہ ایمان کے اندر پختہ رہو۔ دوسرے نمبر پر یہ بات کہی کہ اس میدان میں اگر تمہیں زخم پہنچ گیا ہے اور تمہارے بہت سارے آدمی شہید ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ آخر تمہارے مدمقابل قوم کو بھی تو زخم پہنچ چکا ہے، اِس میدان میں بھی اُن کے آدمی کام آئے اور پچھلے سال بدر میں انہوں نے کتنا نقصان اٹھایا تھا، وہ اتنا نقصان اٹھا کر پھر بھی جرأت کر کے تمہارے مقابلے میں آگئے اور اُنہوں نے اپنے مسلک پر چلتے ہوئے ہمت نہیں چھوڑی، وہ کُفر میں کتنے پکے ہیں کہ اتنا زخم اور اتنی شکست کھانے کے باوجود اُنہوں نے ہمت نہیں چھوڑی اور پھر تمہارے مقابلے میں آگئے، تو تمہیں خیال کرنا چاہیے کہ اگر تمہیں زخم پہنچ گیا تو تم ہمت کیسے چھوڑتے ہو، اگر کافر شکست کھا کر اور مصیبت اُٹھا کر اپنے کفر سے باز نہیں آتا اور دوبارہ اُسی طرح ڈٹا ہوا ہے تو تمہیں تو بدرجہ اولیٰ ڈٹنا چاہیے، یہ ہمت بڑھانے کے لئے اس قسم کی باتیں کی جایا کرتی ہیں کہ یہ واقعہ صرف تمہارے ساتھ ہی تو پیش نہیں آیا، تمہارے مقابل لوگوں کے ساتھ بھی تو پیش آچکا ہے، جیسے اُنہوں نے ہمت نہیں چھوڑی تمہیں اس سے بڑھ کر ہمت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ باقی! اس قسم کے واقعات اللہ تعالیٰ جو ادل بدل کرتے رہتے ہیں اس میں امتحان مقصود ہوتا ہے، اگر ہمیشہ حق والے فتح ہی پاتے چلے جائیں تو پھر حق قبول کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس قسم کا واقعہ پیش آجاتا ہے جس میں حق والے مغلوب ہوجاتے ہیں، اس میں کمزور لوگ اِس اشتباہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ حق کے لئے فتح کوئی ضروری نہیں، ہوسکتا ہے وہ لوگ ٹھیک ہوں، ہوسکتا ہے یہ لوگ ٹھیک ہوں، اس طرح اشتباہ سا پیدا ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اس اشتباہ کے ساتھ ہی امتحان کرنا مقصود ہے۔ اور اسی طرح اس قسم کی مصیبتوں میں مؤمن مخلص اور منافق کا ظاہری طور پر پتہ چلتا ہے، کیونکہ جب تک کسی امتحان کی بھٹی میں نہ چڑھائے جائیں اُس وقت تک مخلص اور منافق کا پتہ نہیں چلتا، اب اِس واقعہ میں جو کچھ انسان کے باطن میں تھا سب باہر آگیا، ہر ایک نے اپنے دل کے جذبات اُگل دیئے، معلوم ہوگیا کہ اِس کے دل کی کیفیت یہ ہے، اور اِس کے دل کی کیفیت یہ ہے۔ اور مسلمانوں کو اس واقعہ میں یہ سبق بھی ملا کہ اپنی کوتاہیوں پر نظر کریں، اور جس قسم کی لغزشوں کی بناء پر اس شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے آئندہ بچنے کی کوشش کریں۔ تو مصیبتوں میں مؤمن مخلص کے اخلاق نکھرتے ہیں، طبیعت کی کمزوریاں دور ہوتی ہیں، ٹھوکریں کھا کے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں، اس قسم کے مقاصد کے تحت اللہ تبارک وتعالیٰ اس قسم کے واقعات اہلِ حق پر بھی ڈالتے رہتے ہیں۔ اور پھر تم

نے ایمان جو قبول کیا تھا تو یہ سمجھ کر قبول کیا تھا کہ یہ کوئی ٹھنڈی سڑک ہے جس پر چل کر سیدھے ہی فوراً فافٹ جنت میں پہنچ جاؤ گے؟ یہ تو اپنے آپ کو امتحان کی بھٹی میں ڈالنے والی بات ہے، اس لیے ایمان قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو امتحان میں ڈالنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ایسے واقعات تم پر بھیجے گا، جس سے پتہ چلے گا کہ اللہ کا نام لینے والے اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے والے کس طرح سے جانباز ہیں؟ مال اور جان کو کس طرح اللہ کے راستے میں قربان کرتے ہیں؟ اور جو قربان نہیں کرتے اُن کا امتیاز بھی ہو جائے گا، تو ایمان لانا یہ اپنے آپ کو امتحان گاہ میں پیش کرنا ہے، منتظر رہو کہ ابھی اور واقعات بھی اِس قسم کے آئیں گے جن میں مجاہدین اور غیر مجاہدین کا اور صابرین اور غیر صابرین کا امتیاز ہوگا، ظاہری طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کون مستقل مزاج ہے اور کون مستقل مزاج نہیں، ایسے واقعات کے ذریعے سے یہ سب امتیاز ہو جائے گا۔

اور پھر آگے ایک آیت ایسی ہے جیسے کچھ تھوڑی سی ملامت ہوتی ہے، کہ بدر میں جس وقت مسلمان شریک ہوئے تھے اور فتح پا گئے اور اہلِ بدر کی فضیلتیں نازل ہوئیں، تو بعض لوگ جو اس میدان میں شریک نہیں ہو سکے تھے وہ حسرت کے ساتھ کہنے لگے کہ اے کاش! ہم بھی اِس میدان میں ہوتے تو ہم بھی بہادری دکھاتے، اور اب اگر کوئی موقع آیا تو ہم اپنی جان لڑائیں گے، اور اللہ کے راستے میں خوب جہاد کریں گے تاکہ ہم بھی اِس قسم کی فضیلتیں حاصل کر لیں جو شہدائے بدر کو حاصل ہوئی ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ موت سے ملاقات ہونے سے قبل تو تم بھی موت کی تمنا کرتے تھے، کہ کوئی موقع آئے گا تو ہم یوں جانبازی دکھائیں گے، اور اب جب موت آنکھوں کے سامنے آگئی تو پھر ڈر گئے؟ یہ کون سی بہادری کی بات ہے کہ پہلے تو باتیں بناؤ، اور جب موقع آجائے تو اپنی باتوں کے مطابق پورے نہ اترو، جیسے قرآنِ کریم کی اُس آیت کا بھی مفہوم یہی ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (سورۂ صف: ۲) تم ایسی باتیں بولتے کیوں ہو جو تم کام کرتے نہیں، یعنی اگر منہ سے کہتے ہو کہ ہم ایسا کر کے دکھائیں گے تو جب موقع آجائے تو کر کے دکھانا بھی چاہیے، ورنہ ایسی بڑیں مارنے کا کیا فائدہ کہ ہم یوں کر دیں گے، ووں کر دیں گے، لیکن جب موقع آیا تو قدم اکھڑ گئے، اس طرح سے کچھ ملامت بھی کی ہے، کہ تم تو موت کے متمنی تھے اور موت کو تلاش کرتے تھے، کہ موت ملے تو ہم بھی قربانی دیں، اور جس وقت آنکھوں کے سامنے موت آگئی تو اُس وقت پھر تم گھبرا گئے؟ رکوع کی آخری آیت تک مضمون یہ ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا، کہ شکست کی کچھ حکمتوں کی طرف اللہ نے اشارہ فرمایا اور کچھ تسلی دی۔

اِبتدائی آیات کا مفہوم

لَاتَهِنُوْا: سست نہ ہو جاؤ، دل نہ چھوڑو، ہمت نہ چھوڑو، اور جو کچھ ہو گیا اس پر غم نہ کرو، تم ہی غالب آؤ گے اگر تم مؤمن ہو۔ اگر تمہیں زخم پہنچا ہے تو قوم کو بھی تو زخم پہنچ چکا ہے اس جیسا، قوم سے مدمقابل قوم مراد ہے، ''پس تحقیق پہنچا قوم کو زخم ایسا ہی'' ...... ''اور یہ دن'' یعنی فتح وشکست کے دن ''ہم اِن کو پھیرتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان تاکہ ہم آزمالیں، اور تاکہ جان لے اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو منافقوں سے جدا کر کے'' علم کے اندر امتیاز والا معنی ہے، ''اور تاکہ اللہ تعالیٰ تم میں سے شہداء اختیار کرے'' یعنی بعضوں کو شہادت کا مقام دینا تھا۔ باقی رہی یہ بات کہ کافر فتح پا گئے اور غالب آگئے، اس سے یہ استدلال نہ کرنا کہ اِن ظالموں اور

ان کافروں سے اللہ کو محبت ہوگئی ''اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کیا کرتا'' ...... ''اور تا کہ خالص کر لے اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو'' یعنی اِن مصیبتوں کے ساتھ اخلاق کی تطہیر ہو جائے، اپنی نفسانی کمزوریاں دور ہو جائیں، کیونکہ ٹھوکریں کھا کھا کے انسان ہوشیار ہو جاتا ہے اور اپنی کمزوریوں کا ازالہ کر لیتا ہے، اِن واقعات کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے۔ ''اور تا کہ اللہ کافروں کو مٹا دے'' یعنی تم پر جو مصیبت آئی یہ کافروں کو مٹانے کا ذریعہ بنے گی، کافروں کو مٹانے کا ذریعہ اس طرح کہ جتنا وہ پہلے کُفر میں پکے تھے اِس واقعہ کے بعد اُس کُفر میں اور جوشیلے ہو جائیں گے، ظاہری طور پر فتح پانے کے بعد کُفر کے اندر اُن کا قدم اور مضبوط ہوگا، وہ مزید غرور میں مبتلا ہوں گے، اور جتنا کُفر میں زیادہ ترقی کریں گے اور جتنا غرور میں آئیں گے اتنا ہی اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے، اہلِ حق کے ساتھ جتنا ٹکرانے کا جذبہ اُن کے اندر زیادہ پیدا ہوگا اتنا ہی وہ پاش پاش ہوں گے، اس طرح اللہ تعالیٰ اِس قسم کے واقعات کو کافروں کے مٹانے کا ذریعہ بناتا ہے، یعنی ظاہری طور پر جو اُنہوں نے فتح پالی یہ آئندہ کے لئے اُن کے مٹنے کا سبب بنے گی، کہ کُفر کے اندر زیادہ پکے ہو جائیں گے، زیادہ تعلّی اور غرور میں آجائیں گے، اور جب اس قسم کے واقعات ہوں گے تو اللہ کے غضب کا نشانہ جلدی بنیں گے۔ ''کیا تم نے یہ سمجھ لیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ نہیں معلوم کیا اللہ تعالیٰ نے ظاہری طور پر اُن لوگوں کو جو جہاد کرنے والے ہیں تم میں سے'' یعنی اُن لوگوں سے جدا کر کے جو جہاد کرنے والے نہیں ہیں، ''اور نہیں معلوم کیا صبر کرنے والوں کو۔ اور البتہ تحقیق تم تمنا کرتے تھے موت کی قبل اِس کے کہ تم اُسے ملو پس تحقیق تم نے اُس موت کو دیکھ لیا اِس حال میں کہ تم جھانک رہے تھے'' یعنی کھلی آنکھوں تم نے اُس موت کو دیکھ لیا، اب تو چاہیے تھا کہ تم اپنی حسرتیں نکالتے اور اپنی آرزوئیں پوری کرتے، جس طرح پہلے جان دینا چاہتے تھے اور تمہاری خواہش تھی تو اب اِس میدان میں تمہیں ڈٹ جانا چاہیے تھا، لیکن جیسی تمہاری تمنائیں تھیں اُس کے مطابق تم نے اِس میدان میں بہادری اور ثابت قدمی نہیں دکھائی۔

''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ'' کا مفہوم

اگلی آیات (وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ الخ) کا تعلق اُسی واقعہ سے ہے جو شہرت ہوگئی تھی کہ سرورِ کائنات ﷺ قتل کر دیے گئے اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ، اور اُس کے بعد لوگوں کے اندر مختلف قسم کے جذبات اُبھرے تھے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں یہ ہدایات دی ہیں کہ اِس واقعہ کی خبر سن لینے کے بعد تمہارا اِس طرح سے دلوں کو چھوڑ دینا اور ایسی باتوں میں مبتلا ہو جانا کوئی عقلمندی نہیں، محمد ﷺ کوئی خدا تو نہیں کہ جن پر موت ممتنع ہو، کہ ان پر موت آ ہی نہیں سکتی، یا اُنہوں نے کوئی ہمیشہ زندہ رہنا ہے؟ حیّ لا یموت تو اللہ کی شان ہے، اللہ کے علاوہ دوسرا تو کوئی حیّ لا یموت نہیں ہے، محمد ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان ہیں، بنی آدم میں سے ایک ہیں، خدا نہیں، صرف رسول ہی تو ہیں، اِن کے لئے موت کوئی ممتنع نہیں ہے، ایسا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ یہاں تو امکان کے درجے میں بات ہوگئی کہ آپ اپنی طبعی موت سے وفات پا جائیں یا کسی دشمن کے ہاتھ سے قتل ہو جائیں، جس طرح دونوں احتمال انسانوں میں ہوتے ہیں یہاں بھی دونوں احتمال مذکور ہیں، کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کو طبعی موت آ جائے یا آپ قتل کر دیئے جائیں، لیکن تم یہ بتلاؤ کہ اگر آپ ﷺ کو طبعی موت آ جائے یا آپ ﷺ قتل کر دیے جائیں تو پھر کیا تم اِس دین کو چھوڑ دو گے؟

میدانِ جہاد سے بھاگ جاؤ گے؟ اور اپنی جاہلیت کی طرف عود کر جاؤ گے؟ اگر ایسا کرو گے تو ہمارا کیا بگاڑو گے؟ نقصان اپنا کرو گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت تھی کہ سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ جس قسم کے عاشقانہ جذبات صحابہ کرام کے تھے تو آپ ﷺ کی وفات پر اس قسم کے جذبات اُبھر سکتے تھے، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں ہی ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس میں اِن خیالات کے سامنے آجانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آگئی، تاکہ اب اگر آپ کی وفات کا واقعہ پیش آئے تو لوگوں کی راہنمائی کے لئے یہ آیات کافی ہوں، چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ جب سرورِ کائنات ﷺ پر حقیقتاً وفات آئی اور آپ اِس جہان سے رُخصت ہوگئے، اُس وقت بھی صحابہ کرام ﷺ کے دل چھوٹ گئے، اور مختلف قسم کے خیالات لوگوں کے دلوں میں آنے لگے، تو حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے آکر اِنہی آیات کو تلاوت کیا تھا[1] اور اِن کے پڑھنے سے یہ ثابت کیا تھا کہ آپ ﷺ پر موت وغیرہ کا واقعہ پیش آجانا خلافِ عقل نہیں ہے، جس طرح دوسرے رسولوں کو پیش آیا آپ کو بھی پیش آیا، تو اِس آیت میں موت کے ورود کے امکان کی طرف اشارہ کیا، اور پھر واقعہ سامنے آگیا کہ آپ ﷺ پر موت کا ورود ہوگیا، صحابہ کرام ﷺ کہتے ہیں کہ اس سے ہمیں تسلی ہوئی اور یقین آیا کہ واقعی حضور ﷺ کی وفات ہوگئی، پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ شاید حضور ﷺ معراج پر تشریف لے گئے ہیں پھر واپس آئیں گے، اور یقین ہی نہیں آتا تھا کہ آپ پر موت کا ورود ہوگیا، حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے آکر یہ آیات پڑھیں جن میں موت کا امکان ذکر کیا گیا ہے، جیسے کہ قتل کا امکان ذکر کیا گیا، اور پھر یہ واقعہ سامنے ہوا تو یقین آگیا کہ واقعی حضور ﷺ کی وفات ہوگئی۔ تو زندگی میں اس قسم کے واقعہ کی غلط شہرت پر جو جذبات اُبھرے تھے اُن پر جو ہدایات دے دی گئیں تو حقیقتاً واقعہ پیش آجانے کے بعد یہی آیات صحابہ کو سنبھالنے کا ذریعہ بن گئیں۔ ''نہیں ہیں محمد مگر رسول ہی'' یعنی خدا نہیں ہیں کہ جن کے اوپر موت ممتنع ہو، ''آپ سے پہلے بھی بہت سارے رسول گزر چکے'' اور وہ بھی اپنی اپنی عمر گزار کر اِس دنیا سے چلے گئے، اُن پر بھی وفات کا ورود ہوا، موت کا ورود ہوا، کچھ قتل بھی ہوئے، قتل ہونے کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں ہے جیسے يَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ (آلِ عمران: ۲۱) نبیوں کو ان یہودیوں نے قتل بھی کیا، تو نبی کو موت بھی آتی ہے اور نبی پر قتل کا ورود بھی ہوسکتا ہے۔ ''اگر آپ ﷺ وفات پاگئے، اگر آپ ﷺ کو موت آگئی یا آپ ﷺ قتل کردیے گئے تو تم اپنی ایڑیوں پر لوٹ جاؤ گے؟'' یعنی جاہلیت کی طرف عود کر جاؤ گے؟ پھر اس قسم کی جاہلانہ باتیں کرنے لگ جاؤ گے؟ یا اسلام کو چھوڑ دو گے؟ میدانِ جہاد سے بھاگ جاؤ گے؟ اگر ایسا کرو گے تو اِس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں، ''جو پھرے گا اپنی ایڑیوں پر پس وہ ہرگز نقصان نہیں پہنچائے گا اللہ کو کچھ بھی، اور اللہ تعالیٰ بدلہ دیتے ہیں شاکرین کو'' جو اسلام کی نعمت کے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت والی نعمت کے قدردان ہیں، کہ اللہ کے احکام کی پابندی کرتے ہیں اور ایسے واقعات پیش آجانے کے باوجود وہ دل نہیں چھوڑتے، اور جاہلیت کی باتیں نہیں کرتے، اِس قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بدلہ دے گا۔

موت کا وقت متعین ہے.....دُنیا کا مفاد سوچنے والوں کا انجام

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ: موت کی خبر سن کر گھبرانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر نفس کے لئے

---

(۱) بخاری ۱/۱۶۶، باب الدخول علی المیت/ نیز ۱/۵۱۷، ۱/۵۱۸، ۲/۶۴۰۔

مرنے کا جو وقت مقدر ہے اُسی وقت موت آتی ہے، پہلے بھی نہیں آسکتی اور اُس وقت سے ٹل بھی نہیں سکتی، تو مرنا تو ہر کسی نے ہے، پھر اس قسم کے واقعہ کو سن کر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیشہ زندہ تو کسی نے رہنا ہی نہیں، ''کوئی نفس نہیں مرتا مگر اللہ کے اذن کے ساتھ وقت مقررہ پر''۔ ''وقت مقررہ پر'' یہ حاصل مفہوم ہے، یعنی اُس کی موت لکھی گئی ہے وقت مقرر کر کے، ''اور جو کوئی دنیا کے بدلے کا ارادہ کرلے'' کہ ایسے وقت میں دنیوی مفاد سوچنے لگ جائے، کہ ہمیں کافروں سے امن لے لینا چاہیے، اُن سے صلح کر لینی چاہیے، یہ سارے کا سارا مقصد اس لئے ہے تاکہ ہماری دنیوی زندگی تلخ نہ ہو، اور ہمیں دنیا کے اندر راحت ہو جائے، ''جو کوئی دنیوی ثواب کا ارادہ کرتا ہے ہم اُس کو اُس دنیا میں سے دیتے ہیں'' دوسری آیات میں ہے کہ اُتنا دیتے ہیں جتنا ہم چاہتے ہیں (سورۃ بنی اسرائیل: ۱۸)، جو اُس کے لئے مقدر ہے، یہ نہیں کہ اس قسم کی تدبیر اختیار کرنے کے ساتھ وہ حسبِ منشا دُنیا کو حاصل کر لیتا ہے، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اُتنا ہی دیتے ہیں جتنا ہماری منشا ہوتی ہے اور جتنا اس کے لئے مقدر ہوتا ہے۔ ''اور جو کوئی ثوابِ آخرت کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اُس کو آخرت میں سے دیتے ہیں، اور عنقریب بدلہ دیں گے ہم شکر گزاروں کو'' یہاں شکر گزاروں کا مفہوم یہ ہے کہ جو اپنے اعمال کے اندر آخرت کے ثواب کا ارادہ کرتے ہیں۔

ہمت بڑھانے کے لئے اُممِ سابقہ کے مجاہدین کا ذِکر

آگے پھر تاریخی واقعات ذکر کر کے ہمت بڑھائی، کہ جس طرح تمہیں اپنے وقت کے نبی کے ساتھ مل کر کافروں کے ساتھ لڑنے کی نوبت آئی، اسی طرح پہلے بھی بہت سارے نبی گزرے جن کے ساتھ اُن کی جماعت جو اُس وقت رِبیون تھے، اللہ والے تھے، انہوں نے اس نبی کے ساتھ مل کر کافروں کے ساتھ لڑائی کی، اور فتح و شکست بھی ہوتی رہتی ہے، میدانِ جنگ میں مصیبتیں بھی آتی ہیں، لوگ قتل بھی ہوتے ہیں، زخمی بھی ہوتے ہیں، اُن کو بھی اِس قسم کے واقعات پیش آئے، جب اُن کو اِس قسم کے واقعات پیش آئے تو نہ انہوں نے دل چھوڑا، نہ اُن کے بدن ڈھیلے ہوئے، نہ وہ دشمن کے سامنے دبے، تو تمہیں بھی چاہیے تھا کہ اگر اپنے نبی کے ساتھ مل کر کافروں کے ساتھ لڑ رہے ہو تو اِن مصیبتوں کی بناء پر جو اللہ کے راستے میں پیش آ رہی ہیں نہ تمہیں ہمت چھوڑنی چاہیے اور نہ تمہارے بدنوں کا زور گھٹنا چاہیے نہ دشمن کے سامنے دبنا چاہیے، بلکہ مستقل مزاج رہو، اور مستقل مزاج رہنے والوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں۔ اور وہ رِبیون یعنی نبی کے ساتھ مل کر کافروں کے ساتھ جہاد کرنے والے ایسے لوگ تھے کہ اگر کسی وقت وہ مصیبت میں مبتلا ہو ہی گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی ایسا مصیبت کا واقعہ آ گیا، تو اُنہوں نے اس قسم کی ڈھیلی ڈھالی باتیں زبان سے بھی نہیں کہیں، بلکہ اُن کا ذہن ہمیشہ اس بات کی طرف گیا کہ ہماری ہی کوتاہیاں ہیں جن کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اِس امتحان میں ڈال دیا، یہ مصیبت جو ہم پر آئی ہے تو ہماری ہی کسی غلطی کی بناء پر آئی ہے، اُن کا ذہن یہ تھا، اور وہ یوں دُعا کرتے تھے کہ اے اللہ! ہماری غلطیوں کو معاف کردے، اور اس معاملے میں ہم سے کوئی حد سے تجاوز ہو گیا تو اُس سے بھی درگزر کر، اور اللہ سے دُعا کرتے تھے کہ ہمارے قدموں کو ثابت رکھ، اور کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ تو اِن رِبیون کا واقعہ ذکر کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہی نصیحت کرنی مقصود ہے کہ اللہ کے راستے میں مصیبتیں پیش آیا کرتی ہیں اور اللہ والوں کو کثرت

سے پیش آتی ہیں، پہلے انبیاء اور ان کے صحابہ کو بھی اِس قسم کی تکلیفیں پیش آئی تھیں، جیسے انہوں نے ہمت نہیں چھوڑی، کمزور نہیں ہوئے، اور دبے نہیں، اسی طرح تمہیں بھی یونہی مضبوط رہنا چاہیے، اور اپنی کوتاہیوں کو مستحضر کر کے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا چاہیے اور اس سے نصرت مانگنی چاہیے، تمہارے یہ جذبات ہونے چاہئیں، یہ واقعہ پیش کر کے اِسی پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے۔ تو جب وہ لوگ ڈٹے رہے اور اپنی کوتاہیوں کی معافی اللہ سے چاہی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ہمارے قدموں کو مضبوط کردے، اور کافروں کے خلاف مدد کر، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیا کا بدلہ بھی دیا یعنی فتح اور نصرت، اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی دیا یعنی ثواب، اور اللہ تعالیٰ محسنین اور نیکوکاروں کو پسند کرتے ہیں، ان سے محبت رکھتے ہیں، تو تمہیں بھی یہی صفتِ احسان اختیار کرنی چاہیے، یعنی اخلاص، ہر معاملے میں اللہ کی طرف توجہ، اور اس قسم کا واقعہ پیش آجانے کے بعد اپنی کوتاہیوں کا استحضار، اور دلوں کی مضبوطی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف پورا رجحان رکھتے ہوئے مصیبتیں برداشت کرنا، جیسے پہلے انبیاء علیہم السلام کے رفقاء نے کیا تھا تمہیں بھی اسی طرح کرنا چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

اے ایمان والو! اگر تم نے اطاعت کی اُن لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تو وہ لوٹا دیں گے تمہیں تمہاری ایڑیوں پر،

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

پھر پھرو گے تم اس حال میں کہ خسارہ پانے والے ہوگے ﴿۱۴۹﴾ بلکہ اللہ تمہارا دوست ہے، اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے ﴿۱۵۰﴾

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا

عنقریب ڈال دیں گے ہم رعب اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا بسبب شریک ٹھہرانے اُن کے

بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۗ وَبِئْسَ مَثْوَى

اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو کہ اللہ نے اُس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اُتاری، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، ظالموں کا بُرا

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ

ٹھکانہ ہے ﴿۱۵۱﴾ البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے سچا کیا تم سے اپنے وعدے کو جب تم انہیں قتل کر رہے تھے اللہ کے اذن سے،

حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ

حتیٰ کہ جب تم ہی سست پڑ گئے اور امر میں تم نے جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے دکھادی تمہیں

مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ

وہ چیز جو تم چاہتے تھے، تم میں سے بعض وہ تھے جو دنیا کا ارادہ کرتے تھے، اور تم میں سے بعض وہ تھے جو آخرت کا ارادہ کرتے تھے، پھر

صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ

اللہ نے پھیر دیا تمہیں اُن مشرکین سے تا کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے، البتہ تحقیق معاف کر دیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں، اور اللہ تعالیٰ

فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى

مہربانی والے ہیں مؤمنین پر ﴿۱۵۲﴾ جب تم بھاگے جا رہے تھے اور نہیں مُڑتے تھے تم

اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ

کسی پر اور رسول تمہیں پکارتا تھا تمہارے پیچھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں بدلہ دیا غم غم کے ساتھ،

لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ

تا کہ تم غمزدہ نہ ہوؤ اُس چیز پر جو تم سے فوت ہوگئی، اور نہ اُس چیز پر جو تمہیں پہنچی، اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً

اُن کاموں کی جو تم کرتے ہو ﴿۱۵۳﴾ پھر اُتارا اللہ تعالیٰ نے تم پر غم کے بعد چین

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ

یعنی اونگھ جو ڈھانپتی تھی تم سے ایک طائفہ کو، اور ایک گروہ، ان کو غم میں ڈال رکھا تھا

اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ

اُن کی جانوں نے، وہ گمان کرتے تھے اللہ کے متعلق ناحق جاہلیت کا گمان کرنا، کہتے تھے

هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ

کیا ہمارے لئے امر سے کوئی شیٔ ہے؟ آپ فرما دیجئے بے شک امر سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے،

يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ

چھپاتے تھے وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی باتیں جو تیرے لیے ظاہر نہیں کرتے تھے، کہتے تھے اگر

لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ
ہمارے لئے امر سے کوئی شئ ہوتی تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم
بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ
اپنے گھروں میں ہوتے تو البتہ باہر نکل آتے وہ لوگ جن پر قتل ہونا مقدر کیا گیا تھا (نکل آتے) اپنے گرنے کی جگہوں کی طرف،
وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ
تاکہ اللہ تعالیٰ آزمائے اُس چیز کو جو تمہارے سینوں میں ہے، اور نکھار دے اُس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے،
وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ
اور اللہ جاننے والا ہے سینے کی باتوں کو ﴿۱۵۴﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے پیٹھ پھیری تم میں سے
یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ
جس دن کہ دو جماعتوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا، سوائے اس کے نہیں کہ پھسلا لیا اُن کو شیطان نے اُن کے بعض عمل کی وجہ سے،
وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۵۵﴾
البتہ تحقیق اللہ نے اُنہیں معاف کر دیا، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے ﴿۱۵۵﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اے ایمان والو! اگر تم نے اطاعت کی ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا، یَرُدُّوْكُمْ: لوٹا دیں گے تمہیں، عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ: تمہاری ایڑیوں پر، اَعقاب عَقِب کی جمع، فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ: پھر پھر و گے تم اِس حال میں کہ خسارہ پانے والے ہوگے، بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ: بل سے اِضراب ہے ماقبل کی بات سے، کہ یہ کافر لوگ جو تمہارے ساتھ خیرخواہی اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں یہ تمہارے دوست نہیں، بلکہ اللہ تمہارا دوست ہے، مولیٰ دوست کو بھی کہتے ہیں، مددگار کو بھی کہتے ہیں، وَهُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ: اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے، تمام مدد کرنے والوں سے بہتر ہے۔ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ: الرُّعْبَ یہ نُلْقِیْ کا مفعول ہے، عنقریب ڈال دیں گے ہم رُعب اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا، بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا: بسبب شریک ٹھہرانے اُن کے اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو کہ اللہ نے اُس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اتاری، سُلْطٰنًا نکرہ ہے، اور نکرہ تحت النفی عموم کو چاہتا ہے، کوئی دلیل نہیں اتاری، نہ عقلی نہ نقلی، وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ: اِن کا ٹھکانہ جہنم

ہے، وَبِئۡسَ مَثۡوَى الظّٰلِمِيۡنَ: ظالموں کا برا ٹھکانہ ہے۔ وَلَقَدۡ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ: البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے سچا کیا تم سے اپنے وعدے کو، اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ: حَسَّ یَحُسُّ: اچھی طرح سے قتل کرنا، جب تم انہیں قتل کر رہے تھے، بِاِذۡنِهٖ: اللہ کے اذن سے، حَتّٰۤى اِذَا فَشِلۡتُمۡ: حتی سے پہلے یہ مضمون محذوف ہوگا کہ اللہ کی یہ مدد جاری رہی، تمہارا قتل کرنا جاری رہا، غلبہ تمہارا بڑھتا گیا، حَتّٰۤى اِذَا فَشِلۡتُمۡ: حتیٰ کہ جب تم ہی سست پڑ گئے، تمہارے دلوں میں کمزوری آ گئی، وَتَنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ: اور امر میں تم نے جھگڑا کیا، امر سے سرورِ کائنات ﷺ کا امر مراد ہے، اور تنازع سے وہی آپس کا اختلاف مراد ہے جو اُن پچاس آدمیوں کے درمیان ہو گیا تھا جن کو ایک دَرے کی حفاظت کے لئے متعین کیا گیا تھا، "تم نے جھگڑا کیا امر میں"، وَعَصَيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰٮكُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ: اور تم نے نافرمانی کی بعد اِس کے کہ اللہ نے دکھا دی تمہیں وہ چیز جو تم چاہتے تھے، تمہاری محبوب چیز تمہیں دکھا دینے کے بعد، مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا: تم میں سے بعض وہ تھے جو دُنیا کا ارادہ کرتے تھے، ترجمہ جمع کے ساتھ کریں گے چونکہ مَن کا مصداق جمع ہے، اور یُرِیۡدُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے مَن کی طرف لفظوں کے اعتبار سے، وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ: اور تم میں سے بعض وہ تھے جو آخرت کا ارادہ کرتے تھے، ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ: پھر اللہ نے پھیر دیا تمہیں اُن مشرکین سے، یعنی پہلے تم اُن کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے پھر تمہارا رخ پھیر دیا، تم پیچھے کو مڑ آئے، لِيَبۡتَلِيَكُمۡ: تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائش میں ڈالے، وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ: البتہ تحقیق معاف کر دیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں، وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: اللہ تعالیٰ مہربانی والے ہیں مؤمنین پر۔ اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ: جب تم بھاگے جا رہے تھے، چڑھے جا رہے تھے، یعنی کسی طرف مڑ کے نہ دیکھا جائے اور بے تحاشا جس وقت انسان بھاگتا ہے تو اس کو اِصعاد فی الأرض سے تعبیر کرتے ہیں "جب تم بھاگے جا رہے تھے" وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ: اور کسی شخص پر مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے، نہیں مڑتے تھے تم کسی پر، وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ: اور رسول تمہیں پکارتا تھا، فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ: تمہارے پیچھے، فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ بِغَمٍّ: پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں بدلہ دیا غم غم کے ساتھ، ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے، یعنی غم پر غم دیا، مسلسل غم دیا، غَمًّاۢ بِغَمٍّ میں دوسرے غم کے اندر باء تلبس کی ہو جائے گی، یعنی غم دیا جو کہ ایک اور غم کے ساتھ متلبس تھا، پہلے بھی ایک غم تھا اور اس کے اوپر ایک دوسرا غم دیا۔ اور ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے کہ بدلہ دیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں غم، بِغَمٍّ: رسول اللہ ﷺ کے غم کی وجہ سے، یعنی تمہاری وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو غم پیش آیا، اور اس کی وجہ سے اللہ نے تمہیں غم دیا۔ غم: دل کی تنگی، دل کی پریشانی۔ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ: تا کہ تم غمزدہ نہ ہو اُس چیز پر جو تم سے فوت ہو گئی، وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ: اور نہ اُس چیز پر جو تمہیں پہنچی، وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ: اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے اُن کاموں کی جو تم کرتے ہو۔ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً: پھر اتارا اللہ تعالیٰ نے تم پر غم کے بعد چین۔ اَمَنَةً: امن، سکون، چین۔ نُّعَاسًا: یہ اُس سے بدل ہے "یعنی اونگھ"، یعنی نیند بطور امن کے اتار دی، بطور چین کے اتار دی، چین کا مصداق ہی نیند ہے، يَّغۡشٰى طَآئِفَةً مِّنۡكُمۡ: وہ اونگھ ڈھانپتی تھی تم میں سے ایک طائفہ کو، وَطَآئِفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ: اور ایک گروہ، اُن کو غم میں ڈال رکھا تھا اُن کی جانوں نے، يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ: وہ گمان کرتے تھے اللہ کے متعلق ناحق، ظَنَّ الۡجَـاهِلِيَّةِ: جاہلیت کا گمان کرنا، جاہلانہ گمان وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق قائم کرتے تھے، يَقُوۡلُوۡنَ: کہتے تھے، هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَىۡءٍ: کیا ہمارے لیے امر سے کوئی شیٔ ہے؟ ہمارا کسی معاملے میں کوئی اختیار ہے؟ قُلۡ: آپ فرما دیجیے، اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ: بیشک امر سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے، يُخۡفُوۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ: چھپاتے تھے وہ

لوگ اپنے دلوں میں، مَا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ: ایسی باتیں جو تیرے لیے ظاہر نہیں کرتے تھے، یَقُوْلُوْنَ: کہتے تھے، لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ: اگر ہمارے لیے امر سے کوئی شی ہوتی، مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا: ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے، قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے، لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ: البتہ باہر نکل آتے وہ لوگ جن پر قتل ہونا مقدر کیا گیا تھا۔ بَرَزَ: باہر نکلنا۔ البتہ باہر نکل آتے وہ لوگ جن پر لکھا گیا تھا قتل، اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ: باہر نکل آتے اپنے گرنے کی جگہوں کی طرف، مضاجع مضجع کی جمع، وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ: تا کہ اللہ تعالیٰ آزمائے اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے، صدور صدر کی جمع، سینہ، مراد دل ہے، جو تمہارے سینوں میں ہے، جو تمہارے دلوں میں جذبات ہیں اُن کی اللہ تعالیٰ آزمائش کرے، وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ: اور خالص کر دے اس چیز کو جو تمہارے قلوب میں ہے، نکھار دے، صاف ستھرا کر دے اللہ تعالیٰ اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے، وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے سینے کی باتوں کو، بِاُمُوْرِ ذَاتِ الصُّدُوْرِ، بِاَقْوَالِ ذَاتِ الصُّدُوْرِ، دل کے اندر جو اُمور چھپے ہوئے ہیں، سینے میں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو جاننے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے پیٹھ پھیری تم میں سے اُس دن جس دن کہ دو جماعتیں آپس میں ٹکرائی تھیں، الْتَقَى الْجَمْعٰنِ، دو جماعتوں کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی، یہ ملاقات بطور ٹکراؤ کے ہے، بیشک وہ لوگ جنہوں نے پیٹھ پھیری تم میں سے جس دن کہ دو جماعتوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا، اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ: سوائے اس کے نہیں کہ پھسلا لیا اُن کو شیطان نے، لغزش میں ڈال دیا ان کو شیطان نے، بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا: اُن کے بعض عمل کی وجہ سے، جو کچھ انہوں نے کیا اُس میں سے بعض کے سبب سے، وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ: البتہ تحقیق اللہ نے انہیں معاف کر دیا، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

تفسیر

مخالفین کے پروپیگنڈوں سے محتاط رہنے کی تلقین

یہ آیات غزوۂ اُحد سے ہی متعلق ہیں، واقعہ آپ کے سامنے مفصل ذکر کیا جا چکا ہے، اور اِس غزوے میں چونکہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچی تھی، فتح بعد میں شکست کی صورت اختیار کر گئی تھی، اور سرورِ کائنات ﷺ کو بھی تکلیف پہنچی تھی، تو اُن واقعات پر مختلف پہلوؤں سے اللہ تبارک وتعالیٰ ہدایات دے رہے ہیں اور تبصرہ فرما رہے ہیں۔ پہلی آیت کا تعلق تو اُس مضمون سے ہے جو پچھلے رکوع میں گزرا، کہ جب یہ شہرت ہو گئی تھی کہ سرورِ کائنات ﷺ قتل کر دیے گئے تو لوگوں کے اندر مختلف قسم کے خیال پھیل گئے تھے، اس موقع پر بعض منافقین نے یہ مشورہ بھی دینا شروع کر دیا کہ جب حضور ﷺ وفات پا گئے تو ہمیں اپنا پہلا دین ہی قبول کر لینا چاہیے، مشرکین سے امان مانگ لینی چاہیے، اب اس جھگڑے کو یوں ختم کر دینا چاہیے کہ ہم آپس میں ایک ہو جائیں جس طرح پہلے آپس میں اکٹھے تھے، اس قسم کی باتیں جو انہوں نے کرنی شروع کیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مؤمنین کو یہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ

دیکھو! یہ تمہیں کفر کی طرف واپس لے کر جانا چاہتے ہیں، بظاہر چاہے خیر خواہی سے پیش آئیں، دوستی کا اظہار کریں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ تمہارے ایمان کے دشمن ہیں، اِن کی ایسی باتوں پر کان نہ دھرنا، اگر ان سے متاثر ہوگئے تو پھر یہ تمہیں ایمان سے محروم کردیں گے، پہلی آیت کا تعلق تو اُسی مضمون سے ہی ہے کہ ''اے ایمان والو! اگر تم نے کہنا مانا اِن لوگوں کا جنہوں نے کفر کیا'' چاہے وہ علی الاعلان کافر تھے، جیسے یہود جو مدینہ منورہ کے اردگرد آباد تھے، انہوں نے بھی مختلف قسم کے خیالات چھوڑ کر اور وسوسے ڈال کر اور پروپیگنڈے کے ذریعے سے غزوۂ اُحد کے بعد مسلمانوں کو اُن کے دین سے ہٹانے کی کوشش کی، اور منافقین جو در پردہ کافر تھے وہ بھی اس قسم کی باتیں کرتے تھے جو ایمان کے منافی ہیں، تو دونوں ہی اِس کا مصداق ہوسکتے ہیں۔ ''اگر تم نے اطاعت کی اُن لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تو لوٹا دیں گے تمہیں تمہاری ایڑیوں پر'' یعنی جس حالت میں تم پہلے تھے اُدھر ہی لوٹا کر لے جائیں گے، کفر کی طرف اور جہالت کی طرف۔ اور تمہارا یہ پھرنا کوئی کامیابی نہیں ہوگا، بلکہ تم ایسی حالت میں پھرو گے کہ تم خسارے میں جانے والے ہوگے، تمہارا یہ پھرنا اور یہ انقلاب خسارے کا انقلاب ہوگا، نفع کا انقلاب نہیں ہوگا۔ اس میں تو اُن دشمنوں سے چوکنا کردیا کہ اِن کی باتوں میں نہ آنا، اگر اِن کی باتوں میں آگئے تو دولتِ ایمان سے محروم ہوجاؤ گے۔

منافقین مشرکین اور یہود نے اس وقت پروپیگنڈہ بہت کیا تھا۔ بدر کی فتح کے بعد مسلمانوں کے جو حوصلے بڑھ گئے تھے یہ حوصلے گھٹانے کے لئے اور ان کے اندر ضعف اور کمزوری پیدا کرنے کے لئے انہوں نے پروپیگنڈے پر پورا زور لگایا، کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے جیسے کہ تم بدر کے بعد کہتے تھے تو اب یہ شکست کیوں کھا گئے، تم کہتے تھے کہ فرشتوں کی مدد اِن کو حاصل ہے، تو اب وہ فرشتے کہاں چلے گئے؟ یہ اللہ کے محبوب ہیں اور اللہ اِن کو غالب کریں گے تو اب وہ اللہ کے وعدے کہاں چلے گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے ہی باتیں ہیں جو خواہ مخواہ تمہیں بہلانے کے لئے کی گئی ہیں، ورنہ یہ لڑائی عام لڑائیوں کی طرح ہی ہے، اسباب کے تابع ہے، جس کو کچھ اسباب مہیا ہوگئے وہ کامیاب ہوگیا، جس سے کوئی لغزش اور غلطی ہوگئی وہ شکست کھا گیا، جس طرح دنیا میں لڑائیاں ہوا کرتی ہیں ایسے ہی یہ لڑائیاں ہیں، اِن میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں کہ اللہ کی نصرت کسی کے ساتھ ہے، کوئی اللہ کا رسول ہے، اور اللہ نے کامیابی کا وعدہ کیا ہوا ہے، یہ سب اس قسم کی باتیں ہیں جو تمہیں بہلانے کے لئے کی گئی ہیں، ورنہ حقیقت ان میں کچھ نہیں ہے، جیسا کہ ابوسفیان نے اُس میدان میں ہی اعلان کردیا تھا کہ ''اَلْحَرْبُ سِجَالٌ''[1] کہ یہ لڑائی تو ڈانواں ڈول ہے، ڈول بھرنے کی طرح ہے، کبھی تم نے بھر لیا کبھی ہم نے بھر لیا، اِس کا بھی یہی معنیٰ تھا کہ یہ ظاہری اسباب کے طور پر ہوتا ہے، کسی سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو نقصان اٹھالیتا ہے، اور کسی کو کوئی اچھے اسباب مہیا ہوجاتے ہیں تو فتح پالیتا ہے، تو یہ کوئی غیبی نصرت اور اس قسم کی بات نہیں ہے، عام اسباب کی طرح ہی ہے جس طرح باقی لڑائیاں ہوتی ہے۔ اس قسم کے پروپیگنڈے کر کے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی اور اُن کو مختلف قسم کے وسوسوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی، تاکہ بدر کے میدان میں اِن کی جو ہمت بندھی تھی وہ ختم ہوجائے اور یہ مرعوب ہوجائیں، اِسی قسم کے پروپیگنڈے سے محتاط رہنے کی تلقین کی جارہی ہے کہ اِن باتوں میں نہ آنا۔

(۱) بخاری ج۱ ص۴۲۶، کتاب الجہاد والسیر، باب ما یکرہ من التنازع/ نیز بخاری ۲/۵۷۹، باب غزوۂ اُحد۔

نصرتِ الٰہی کا وعدہ اور اُس کا ظہور

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ: یہ آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وعدہ کرلیا، کہ ظاہری طور پر اِس میدان میں جو یہ لوگ غالب آگئے ہیں یہ ایک بہت عارضی سی بات ہے، ہم عنقریب اِن لوگوں کے دلوں میں رُعب ڈال دیں گے، تمہارا رُعب اِن کے دلوں پر طاری ہوجائے گا، کیونکہ یہ مشرک ہیں، اور اِنہوں نے غیر اللہ کے سہارے لے رکھے ہیں، اور غیر اللہ کا سہارا بہت کمزور سہارا ہے، وہ دل کے لئے قوت کا باعث نہیں بن سکتا، ایسی چیزیں جن کے شریک ہونے پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، نہ عقل کے ساتھ اُس پر کوئی دلیل قائم ہے، نہ نقل کے ساتھ قائم ہے، نہ فطرت سے قائم ہے، کسی صورت میں بھی اُن پر کوئی دلیل قائم نہیں، ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کی نحوست یہ پڑے گی کہ اِن کے دلوں پر رعب طاری ہوجائے گا۔ اور یہ واقعہ نقد بہ نقد ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوگیا، پہلے تو اُسی میدان میں ہی باوجود اس بات کے مشرکین غلبہ پاگئے تھے لیکن وہ مسلمانوں کا استیصال نہ کرسکے، اور بغیر کسی ظاہری سبب کے ہی میدان چھوڑ کر چل دیئے، جیسے واقعہ کی تفصیل عرض کرتے ہوئے پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نصرت تھی کہ اتنا غلبہ پاجانے کے باوجود مشرکین اِس جنگ کو آخر نتیجے تک نہ پہنچا سکے، کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کا تعاقب کرتے، تعاقب کرنے کے بعد اُن کو قتل کرنے کی کوشش کرتے، یا مدینہ پر چڑھ جاتے، اور مدینے کو جا کر اجاڑ دیتے، جیسا غلبہ اُن کو حاصل ہوگیا تھا اگر وہ یوں کرنا چاہتے تو اُن کے لئے ظاہری حالات کے اعتبار سے بہت ہی آسان تھا، لیکن یہ بغیر کسی قسم کے ظاہری سبب کے اُس میدان کو چھوڑ کر چل دیئے۔ اور پھر جس وقت چلے گئے، کچھ دور پہنچے، وہاں جا کے خیال ہوا کہ ہم نے تو بڑی غلطی کی، ہمیں تو چاہیے تھا کہ اب اِن کو اچھی طرح سے اُجاڑتے اور برباد کرتے، پھر ارادہ کیا کہ واپس چلیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے اطلاع ہوگئی، آپ نے فوراً اعلان کردیا کہ مشرکین کا تعاقب کرنا ہے، اکٹھے ہوجاؤ، تو وہی زخمی لوگ اکٹھے ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو ساتھ لے کر چلے، مدینہ منورہ سے پانچ چھ میل تک اُن کا تعاقب کیا، حمراء الاسد ایک جگہ ہے، وہاں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈال دیا، تین دن تک وہاں ٹھہرے رہے، لیکن مشرکین کو واپس آنے کی ہمت نہ ہوئی، بلکہ کوئی قافلہ آرہا تھا، اُن کو اُنہوں نے طمع دلائی کہ ہم تمہیں اتنا مال دیں گے، تم مدینہ منورہ میں جا کر ہماری طرف سے خوف و ہراس پھیلاؤ، کہ وہ دوبارہ آرہے ہیں، اُنہوں نے اس طرح سے ساز وسامان اکٹھا کرلیا ہے، اور جس وقت وہ لوگ آئے اور اُنہوں نے آکر اس قسم کی باتیں کرنی شروع کیں تو مسلمانوں نے جواب یہی دیا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ: ہمارے لئے اللہ کافی ہے، اور وہ اچھا کارساز ہے، اگر وہ ساز وسامان کے ساتھ آرہے ہیں تو ہمیں کوئی ڈر نہیں (اور یہ حمراء الاسد کا واقعہ غزوۂ اُحد کے اختتام پر اِسی سورت میں آئے گا) چنانچہ وہ مرعوب ہوگئے، اور پھر واپس آکر دوبارہ حملہ نہ کرسکے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدہ تھا جس کا ظہور فوراً ہوا، کہ ''ہم عنقریب ڈال دیں گے اُن لوگوں کے دلوں میں رُعب جنہوں نے کفر کیا بسبب اس کے کہ اُنہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔'' تو یہ دُنیا میں مرعوب ہوں گے، وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ: اور اِن کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور اِن ظالموں کا بہت بُرا ٹھکانہ ہے، ظالمین سے

یہاں مشرکین مراد ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں آیا کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) شرک ظلم عظیم ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حقوق تلف کرنے کا بھی ذریعہ ہے، اور یہ اپنے نفس پر بھی ظلم ہے کہ انسان جتنا شرک کے ذریعے سے اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے کسی دوسری چیز کے ذریعے سے نہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور باقی کائنات کو اِس کا خادم بنایا ہے، اور جو چیزیں اِس کی خدمت کے لئے تھیں اُنہی کے سامنے انسان اگر جھکنے لگ جائے تو یہ انسانیت کی تذلیل ہے، اس لیے یہ اپنے آپ پر بدترین قسم کا ظلم ہے۔

بعض افراد کی غلطی کا اثر ساری جماعت پر پڑتا ہے

باقی وہ بات کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تو نصرت کا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ وعدہ تو ہم نے سچا کر دیا، کہ جس وقت تم صحیح طریقے پر چلے، نبی کی ہدایات کی تم نے پابندی کی، اور سرورِ کائنات ﷺ کے طریقے کے مطابق تم نے جنگ لڑی تو ہمارا وعدہ سچا تھا، ہم نے سچا کر دکھایا، تم دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، ''اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنے وعدے کو سچا کیا جبکہ تم قتل کرتے تھے اُن کو اللہ کے اذن کے ساتھ، اللہ کی توفیق کے ساتھ'' ہماری طرف سے تو تمہاری نصرت ہو رہی تھی اور تم غلبہ بھی پا رہے تھے، لیکن پھر خرابی تمہاری طرف سے آئی، کہ تم میں فشل آ گیا، کمزوری آ گئی، اور ایک معاملے میں تمہارا آپس میں جھگڑا ہو گیا، کیونکہ جب جماعتی حیثیت سے کوئی کام ہو رہا ہو تو پھر جماعت میں سے کسی ایک فرد کی غلطی کا خمیازہ ساری جماعت کو بھگتنا پڑتا ہے، انفرادی معاملات اور طرح کے ہوتے ہیں، اور جماعتی معاملات اور طرح کے ہوتے ہیں، جماعت کو نقصان پہنچنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر فرد سے کوئی لغزش ہوئی ہو، بلکہ بسا اوقات ایک فرد کی لغزش سب کو نقصان میں مبتلا کر دیتی ہے، اور نسبت جماعت کی طرف ہوتی ہے۔ جیسے ایک کشتی میں آپ سارے بیٹھے سفر کر رہے ہوں، اور آپ محتاط ہیں، کوئی حرکت نہیں کرتے، لیکن بیٹھے بیٹھے آپ میں سے ایک ساتھی اُس کشتی کے اندر چھید کر دے، سوراخ کر دے، پھٹا توڑ دے، اب اُس پھٹے کے ٹوٹنے کے ساتھ جب کشتی میں پانی آئے گا تو غرق تو سارے ہو جائیں گے، اب یہ تو نہیں ہوگا کہ صرف ایک نے چونکہ نقصان کیا ہے تو اُسی کو ہی تکلیف پہنچے اور وہی ڈوبے، بلکہ جب کشتی ڈوبے گی تو ڈوب سارے جائیں گے۔ اسی طرح مثلاً ہم پاکستان کے باشندے ہیں، اگر کسی وقت کسی ملک کے ساتھ لڑائی چھڑ جاتی ہے، ہماری فوج مقابلے میں چلی جاتی ہے، تو بسا اوقات ایک جرنیل کی غلطی ساری قوم کو غلام بنا کے رکھ دیتی ہے، اب اپنے طور پہ باقی قوم کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لیکن جب اُن میں سے بعض افراد غلطی کریں گے تو اُس غلطی کا اثر ساری جماعت پر پڑے گا، اجتماعی کاموں میں اِسی طرح ہوا کرتا ہے۔

جبلِ رُماۃ پر متعین افراد کا اِجتہادی اختلاف

اب یہاں تنازع تو ہوا تھا اُن لوگوں میں جو حضور ﷺ نے اُس جبلِ رُماۃ پر متعین کیے تھے جس کو آج جبلِ رُماۃ کہتے ہیں، وہ پچاس آدمی تھے تاکہ اس درے کی حفاظت کریں کہ کوئی شخص پیچھے سے آ کر حملہ نہ کرے، اور جب مشرکین کو شکست ہوئی تو بعض کہنے لگے کہ اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں، میدان خالی ہو چکا ہے، ہمیں نیچے اترنا چاہیے، اور اپنے دوسرے رفقاء کے

ساتھ مل کر مالِ غنیمت اکٹھا کرنا چاہیے، تو ظاہری طور پر اِن لوگوں کی توجہ مالِ دنیا کی طرف ہوگئی، ظاہری طور پر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس میدان میں مالِ غنیمت جو بھی حاصل ہوتا آپ جانتے ہیں کہ شرعی قواعد کے مطابق وہ صرف اُنہی لوگوں کا نہیں ہوتا جو بالفعل لڑتے ہیں، بلکہ اُس میدان میں جن کی ڈیوٹیاں علیحدہ علیحدہ لگی ہوئی ہوں، جیسے یہی درے کی حفاظت کے لئے کھڑے تھے، تو مالِ غنیمت جو بھی حاصل ہوتا اُس میں یہ برابر کے شریک تھے، حصہ تو اِن کو بہر حال ملنا تھا، یہ نہیں کہ اگر یہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کے لئے نہ اُترتے تو انہیں مالِ غنیمت نہ ملتا، اور یہ اس لئے اتر کر آگئے کہ اگر ہم نہ اترے تو ہمیں یہ مال حاصل نہیں ہوگا، یہ مقصد نہیں تھا، وہ تو اگر اپنی جگہ ڈٹے رہتے تو بھی مالِ غنیمت میں ان کا حصہ باقیوں کے ساتھ برابر ہوتا، مالِ غنیمت سے یہ کسی صورت میں محروم نہ ہوتے، لیکن انہوں نے یہ خیال کر کے کہ اب ہم اگر درے پر کھڑے رہیں گے تو مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعاون نہیں ہے، ہمیں بھی اترنا چاہیے تاکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہم اِس مال کو اکٹھا کروائیں، جس طرح ہم نے پہلے درے کی حفاظت کر کے ثواب لیا ہے، اسی طرح اِن کافروں کا پیچھا کر کے، اِن کا تعاقب کر کے اِن کا مال لوٹ کر جہاد میں اس طرح بھی حصہ لینا چاہیے۔

مقربین جلد زیرِ عتاب آتے ہیں

لیکن ظاہری طور پر اِس میں توجہ مال کے اکٹھا کرنے کی طرف ہوگئی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی اپنی کتاب میں عادت ہے کہ اپنے محبوبوں کی ذرا ذرا سی بات پر گرفت ایسے سخت انداز میں کرتے ہیں جیسے اُن سے کوئی بہت بڑا جرم ہوگیا ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ عادت انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، کہ جب نبی سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو عام لوگوں کی بنسبت زیادہ سخت لب ولہجے کے ساتھ اُن پر گرفت کی جاتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے واقعات اس قسم کے قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، اور یہ اُن کے تقرب کی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہونے کی دلیل ہے کہ مقرباں را بیش بود حیرانی جتنا کوئی شخص مقرب ہوا کرتا ہے اُتنا ہی وہ جلدی زیرِ عتاب بھی آتا ہے، اور اُس کی معمولی معمولی لغزش پر گرفت بھی زیادہ ہوتی ہے، جس سے مقصد ہوتا ہے کہ اِن کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر جانا چاہیے، اور صورۃً خطا جو صادر ہوگئی یہ بھی اِن سے نہیں ہونی چاہیے، تو اللہ تعالیٰ کی یہ گرفت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح اُن کو جو تنبیہ ہوتی ہے یہ مزید اُن کو درجات کی طرف لے جاتی ہے اور آئے دن اُن کے حال کو سدھارتی چلی جاتی ہے۔

اُحد میں شکست کا اصل سبب

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اللہ تعالیٰ کی محبوب شخصیات ہیں، اِن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملے میں آپس میں ایک اجتہادی سا اختلاف ہوا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہاں سے ہلنا نہیں، لیکن اُن کا آپس میں اختلاف ہوا کہ اِس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک جنگ کے آثار ہیں اُس وقت تک نہیں ہلنا چاہیے، اب تو جنگ ختم ہوگئی، اس لیے اب ہمارا یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، ہمیں میدان میں اتر کر اپنے ساتھیوں سے تعاون کرنا چاہیے، لیکن یہ ایک ایسی بات تھی کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں غور فرمایا

جاتا تو یہ عمل اختیار کرنے کی گنجائش بہت کم تھی، کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ جب تک میں پیغام نہ بھیجوں اُس وقت تک تم نے اس درے کونہیں چھوڑنا، بس یہ ڈھول ہوگیا، یہ غلطی تھی، آپس میں تنازع ہوا، اختلاف ہوا، اور اِس امر کی مخالفت ہوگئی، عصیان صادر ہوگیا، تو سرورِ کائنات ﷺ کے حکم کی مخالفت کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نصرت واپس لے لی، جب اپنی نصرت واپس لے لی تو پہلے یہ مشرکین کے پیچھے دوڑے جارہے تھے، اب ان کا رخ بدل گیا، اور خالد بن ولید نے ایک لشکر کو لے کر اُس درے سے حملہ کیا، یہ دس بارہ آدمی جو رہ گئے تھے مدافعت میں شہید ہوگئے، اور پیچھے سے حملہ ہوا تو مسلمان درمیان میں آگئے، جیسے کہ واقعہ کی تفصیل پہلے آپ کے سامنے آچکی۔ تو گویا کہ تمہاری رائے کا اختلاف، حضور ﷺ کے حکم کی مخالفت، اور تنازع فی الامر شکست کا سبب بنے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت اِن وجوہ کی بناء پر واپس لے لی۔

غزوۂ اُحد کی شکست بطورِ سزا کے نہیں تھی

اور یہ جو کچھ پیش ہوا یہ بھی تمہارے لئے بطورِ سزا کے نہیں، بلکہ اس لئے ہے تا کہ تمہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈال کر آئندہ زیادہ سے زیادہ نکھار دیا جائے، یعنی سبب اگر چہ تمہاری لغزش ہے لیکن اُس میں حکمتیں یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں امتحان کی بھٹی میں ڈال کر زیادہ سے زیادہ صاف ستھرا کرنا چاہتا ہے، یعنی اندازہ کیجئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسی لغزش ہوئی جس کا اثر قومی سطح پر بہت شدید پڑا، کہ شکست کا داغ لگ گیا، تاریخِ اسلام میں شکست کا ایک باب درج ہوگیا، حضور ﷺ بھی زخمی ہوگئے، جماعت کے کتنے افراد شہید ہوگئے، مشرکین کے حوصلے بڑھ گئے، یہود کو زبان درازی کا موقع مل گیا، ان چند صحابہ کی لغزش کی وجہ سے اتنا شدید نقصان ہوا، قرآنِ کریم اُس کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ یہ واقعہ اِس لئے پیش آئے کہ تم سے یہ لغزش ہوئی، لیکن ساتھ ساتھ لطف اور مہربانی کا پہلو کتنا ہے کہ تسلیاں بھی دی جارہی ہیں، کہ یہ جو کچھ تمہارے ساتھ پیش آیا یہ میری طرف سے کوئی سزا نہیں، بلکہ تمہارے لئے ایک امتحان بن گیا، آزمائش کی صورت پیش آگئی، تا کہ اِس آزمائش میں تمہیں ڈال کر تمہارے اندر زیادہ سے زیادہ پختگی پیدا کی جائے، کہ یہ ٹھوکریں کھانا آئندہ کے لئے مضبوط ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اور پھر جو صورتِ حال پیش آئی بار بار اُس کے اُوپر معافی کا اعلان بھی کر دیا، اِس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت ثابت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی محبوبیت نمایاں ہوتی ہے، نہ کہ یہ واقعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اُوپر طعن وتشنیع کا سبب ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بات نقل کی تھی کہ یہ میدانِ احد سے بھاگ گئے تھے، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہی جواب دیا تھا کہ تمہیں زبان پر یہ بات نہیں لانی چاہیے، جب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے تو تم کون ہو اعتراض کرنے والے؟[1] تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی کتاب میں صراحتاً معافی آگئی، جس کی وجہ سے اب یہ واقعہ کسی کے لئے طعن وتشنیع کا باعث نہیں بن سکتا۔

حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ: یہ شکست کا سبب ذکر کیا جارہا ہے ”حتیٰ کہ جب تم ہی دل چھوڑ بیٹھے اور امر میں تم نے

(۱) بخاری ج۱ ص ۵۲۳ باب مناقب عثمان / مشکوۃ ج۲ ص ۵۶۲ باب مناقب عثمان، فصل ثالث۔

تنازع کیا" ایک کام میں تمہارا آپس میں جھگڑا ہو گیا، ایک معاملے میں آپس میں جھگڑا ڈال لیا، یا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے حکم کی مراد سمجھنے میں تم نے آپس میں تنازع کیا۔ "اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں تمہاری محبوب چیز دکھا دی تھی" محبوب چیز سے فتح مراد ہے۔ "تم میں سے بعض وہ تھے جو دنیا کا ارادہ کیے ہوئے تھے" ظاہری طور پر اُن کا مال کی طرف جو رجحان ہو گیا تو اُس کو ارادۂ دنیا سے تعبیر کیا ہے، میں نے عرض کر دیا کہ یہاں اُنہیں حقیقتاً دنیا مطلوب نہیں تھی، اگر حقیقتاً دنیا مطلوب ہوتی تو میدان میں اترنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ تو وہاں کھڑے رہتے تو بھی مالِ غنیمت میں اُن کا حصہ تھا، لیکن یہ ظاہری رجحان جو اُس مال کے اکٹھا کرنے کی طرف ہو گیا اس کی بھی مذمت کی جا رہی ہے کہ تمہیں مال کی طرف توجہ ہی نہیں کرنی چاہیے تھی، یہ مال جمع کرنے کا تصور جو تمہارے دماغ کے اندر آیا یہی تمہارے قدم اُکھیڑنے کا باعث بن گیا۔ ورنہ مسئلے کی رو سے (شرعی ضابطہ جو بھی ہے مالِ غنیمت کے بارے میں، جو بدر کی جنگ کے بعد ہی اتر چکا تھا) مجاہدین کا حصہ مالِ غنیمت میں ہوتا ہے، چاہے وہ عملاً جنگ میں شریک ہوں، چاہے اُن کی ڈیوٹی کسی دوسری جگہ لگی ہوئی ہو، وہ سارے کے سارے مالِ غنیمت میں شریک ہوتے ہیں۔ تو یہ لوگ اگر پہاڑ سے نہ اترتے اور اُس درے کو نہ چھوڑتے اور میدان میں نہ آتے تو بھی مالِ غنیمت میں یہ برابر کے شریک تھے، لیکن ظاہری صورت یہ پیدا ہو گئی کہ مال کو دیکھ کر دوڑ پڑے، چاہے اُن کی نیت یہی تھی کہ ہم اس کو اکٹھا کریں تاکہ دشمن کو زیادہ نقصان پہنچے، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعاون ہو، چاہے یہی جذبات ہوں، لیکن بظاہر رجحان مال کے اکٹھا کرنے کی طرف ہے، جس کو قرآن کہتا ہے کہ "تم میں سے بعض تھے جنہوں نے دنیا کا ارادہ کیا، اور تم میں سے بعض وہ تھے جو آخرت کا ارادہ کرتے تھے" اس کا مصداق خاص طور پر وہ لوگ ہو جائیں گے جو اس مال کی طرف نہیں لپکے بلکہ پہاڑ کے اوپر قائم رہے اور اس مال کی طرف اُن کی توجہ نہیں ہوئی، ثُمَّ صَرَفَكُمْ: پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اُن سے پھیر دیا، لِيَبْتَلِيَكُمْ: تاکہ تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ: کتنے صاف لفظوں کے ساتھ معافی کا اعلان ہے، کہ اللہ تعالیٰ تم سے درگزر کر گیا، یہ جو کچھ بھی تم سے تنازع ہوا تھا، عصیان ہوا تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے حکم کی نافرمانی ہوئی، اللہ تم سے درگزر کر گیا، اللہ نے تمہیں معاف کر دیا، وہ مؤمنین پر مہربانی والا ہے۔

غم کے واقعات پیش آنے میں حکمت

إِذْ تُصْعِدُونَ: جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی پر مڑ کے توجہ بھی نہیں کرتے تھے، بھاگے ہی جا رہے تھے، وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ: اور رسول تمہیں آوازیں دے رہا تھا تمہارے پیچھے، فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ: پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں غم پر غم دیا، مسلسل غم دیا، پہلا غم تو یہ تھا کہ فتح شکست سے بدل گئی، دوسرا غم یہ تھا کہ اپنے بہت سارے ساتھی شہید ہو گئے، اور تیسرا غم سرورِ کائنات ﷺ کی وفات کی خبر سے پہنچ گیا، یہ غم تہ بہ تہ آ گئے، ایسی خبریں تمہیں پہنچیں جو موجب غم ہوئیں اور اتنا شدید غم تمہیں دیا اور مسلسل غم دیا، غم پر غم دیا، جس میں مقصد یہ تھا کہ تمہیں غم برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے، کیونکہ زندگی میں اگر کسی شخص کے ساتھ کوئی واقعہ اس قسم کا نہ پیش آیا ہو اور پھر جب بھی تھوڑا بہت واقعہ پیش آئے تو انسان بالکل حوصلہ چھوڑ دیتا ہے اور بہت غمزدہ ہو جاتا ہے، اور جس کو

اِس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں تو اِن واقعات کے پیش آنے کے ساتھ طبیعت میں پختگی پیدا ہوجاتی ہے، پھر اگر کوئی خلافِ طبیعت واقعہ پیش آ بھی جائے تو انسان اُس کو سہار جاتا ہے، اس لیے غم کے واقعات پیش آنا انسان میں پختگی کا باعث ہے، پھر آئندہ کے لئے غم کی کیفیت ہلکی ہوجاتی ہے، خلافِ طبیعت واقعہ پیش آجائے تو انسان اُس کو زیادہ محسوس نہیں کرتا۔ جیسے کہ سنا ہے حضرت مدنی رحمہ اللہ تقریر میں یہ شعر بہت پڑھا کرتے تھے:

عادی ہوا رنج کا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پہ اتنی پڑیں کہ آساں ہوگئیں

کہ جب انسان رنج برداشت کرنے کا عادی ہوجائے تو پھر رنج سرے سے مٹ ہی جاتا ہے، رنج ہوتا ہی نہیں، اور آگے فرمایا کہ ہم اتنی مشکلات میں مبتلا ہوئے کہ اب ہمارے سامنے کوئی مشکل مشکل ہی نہیں ہے، جو بھی مشکل آتی ہے وہ ہمارے لیے آسان ہے، کیونکہ برداشت کرنے کی عادت پڑگئی۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے نفسوں کے اندر یہ پختگی پیدا کرنا چاہتا ہے، تاکہ آئندہ اگر کوئی چیز تم سے فوت ہوجائے، کوئی موقع تمہارے ہاتھ سے چلا جائے، کوئی موقع تم کھو دو، تو ایسی صورت میں تمہیں غم نہ ہو، اور جو مصیبت پہنچے تو اُس پر بھی تمہیں کوئی حزن نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری طبیعت کے اندر یہ پختگی پیدا کرنا چاہتے ہیں اس لئے تمہیں یہ مسلسل غم دیا، ایک مطلب تو یہ ہوا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہاری وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو غم پہنچا، اور اللہ تعالیٰ نے اُس غم کے بدلے میں تمہیں غم دے دیا، یہاں بھی مقصد وہی ہے کہ تاکہ تمہیں غم برداشت کرنے کی عادت ہو، اور آئندہ کے لئے اس قسم کا کوئی خلافِ طبیعت واقعہ پیش آجائے تو تم گھبرانہ جایا کرو، لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ: جو تم سے فوت ہوجائے کوئی اچھا موقع تمہارے ہاتھ سے چلا جائے، کوئی چیز تم فوت کر بیٹھے، اُس پر تم غمزدہ نہ ہوا کرو، اور جو مصیبت تمہیں پہنچے تو اُس پر بھی تمہیں حزن نہ ہوا کرے اس لئے تمہیں یہ غم دیا، ''اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والے ہیں تمہارے عمل کی۔''

مؤمنین پر نیند کا طاری ہونا اور منافقین کا نیند سے محروم ہونا

پھر اللہ نے اتار دیا تم پر غم کے بعد چین۔ اَمَنَةً: چین۔ اطمینان اتار دیا جو نیند کی صورت میں تھا، یعنی میدانِ جنگ میں نیند آجانا منتشر خیالات کو دماغ سے نکال دینے کا باعث بن جاتا ہے اور تھکاوٹ بھی دور ہوجاتی ہے، تو میدانِ اُحد میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صحابہ پر نیند طاری ہوئی جس کی وجہ سے پریشانی کے خیالات ختم ہوگئے، طبیعت کو سکون حاصل ہوگیا، اور بدر کے میدان میں جب گئے تھے تو وہاں بھی لڑائی میں شریک ہونے سے پہلے رات کو اطمینان سے سونے کا موقع دے دیا۔ میدانِ جنگ میں مجاہدین کو سونے کا اور آرام کرنے کا موقع مل جائے اور امن کے ساتھ نیند آجائے یہ بہت بڑی قوت کا باعث ہوتی ہے، اور وقت پر نیند نہ آئے تو یہ پریشانی کا باعث ہوتی ہے، پھر انسان کے حوصلے اور بھی جلدی چھوٹ جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اطمینان نازل کیا گیا، کہ صحابہ پر نیند طاری کردی گئی، جس سے تھکاوٹ بھی دور ہوئی اور منتشر خیالات بھی دور ہوگئے۔ لیکن یہ نیند اُن کو آئی جن کے دلوں میں خلوص تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے دعدوں پر ایمان اور یقین تھا، اور اُن کے عقیدے صحیح تھے۔ اور جو منافق قسم کے لوگ تھے اُن کے دلوں میں پریشانی تھی، اور پریشانی کی حالت میں نیند نہیں آتی، اس لیے اُن کو نیند نہیں

آئی، اُن کو اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ ''وہ نیند ڈھانپتی تھی تم میں سے ایک طائفہ کو'' نُّعَاسًا چونکہ لفظوں میں مذکر ہے، اس لئے یَّغْشٰی میں مذکر کی ضمیر لوٹی، اور نیند کا لفظ اُردو میں مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لئے ترجمہ مؤنث کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ''وہ نیند ڈھانپتی تھی تم میں سے ایک طائفہ کو، اور ایک طائفہ، اُن کو غم میں ڈال رکھا تھا اُن کی جانوں نے'' یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ: وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ناحق گمان پکاتے تھے جاہلیت والے گمان، بُرے بُرے خیالات اُن کے دل میں آتے تھے، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اُن کو یقین نہیں تھا۔

منافقین کی بات کے دو پہلو اور دونوں کا جواب

''اور وہ یوں کہتے تھے کہ کیا ہمارے لئے اِس امر سے کوئی شئ ہے؟'' ہمیں اس امر میں کچھ اختیار ہے؟ اب اِس لفظ (هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ) کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ یہ جو مصیبت اور تکلیف آگئی، بہت سارے رفقاء شہید ہو گئے، تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا کچھ بس نہیں چلتا، ہمارے بس میں کچھ نہیں، ہمارا کوئی اختیار نہیں، اِس بات کی ظاہری سطح تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے سامنے انسان بے بس ہے، جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے، یہ پہلو تو اس کا صحیح ہے، اور اِسی کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہا کہ ہاں انہیں کہہ دیجئے کہ واقعی اختیار سارا اللہ کا ہی ہے، بندے کا کوئی اختیار نہیں۔ لیکن اُن کے دل میں جو بات تھی وہ اور تھی، وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم نے تو مشورہ دیا تھا کہ باہر نکل کر نہیں لڑنا، مدینہ منورہ میں لڑنا ہے، اگر ہمارا کوئی بس چلتا تو ہم مدینہ سے باہر نہ نکلتے، اور یہ ہمارے رفقاء اور ساتھی اور ہمارے خاندان کے لوگ یہاں قتل نہ ہوتے، ہماری چونکہ بات نہیں مانی گئی اس لئے یہ نقصان اٹھایا، اُن کے دل میں یہ بات تھی، ظاہری طور پر جو کہتے تھے کہ ہمارا کچھ بس نہیں، تو مطلب یہ تھا کہ اگر ہمارا بس چلتا اور ہماری تدبیر پر عمل ہوتا تو یہ نقصان نہ اٹھاتے، اللہ تعالیٰ اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں یہ بات ہے۔ ظاہر تو اِس کو اور انداز سے کرتے ہیں جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اِن کا تقدیر پر اعتماد ہے کہ ہمارے بس میں کچھ نہیں، جو ہوتا ہے اللہ کی جانب سے ہوتا ہے، اِن لفظوں کا بظاہر مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تقدیر پر اعتماد کو ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ ان کے دلوں میں یہ بات ہے کہ اپنی تدبیر پر ان کا اعتماد ہے کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی اور ہمارا کوئی بس چلتا تو آج یہ نقصان نہ ہوتا (تفسیر عثمانی)، اِسی کو آگے جا کر کہا کہ یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ: یہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں جو آپ کے لیے ظاہر نہیں کرتے، اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کوئی اختیار ہوتا تو مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا: ہم یہاں قتل نہ ہوتے، یعنی ہماری تدبیر پر عمل نہیں کیا گیا، اگر ہماری تدبیر پر عمل ہو جاتا تو یہ نقصان نہ اٹھاتے۔ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ ہمیشہ تقدیر ہی غالب آیا کرتی ہے، تدبیر کچھ نہیں، اگر تمہاری تدبیر پر عمل ہوتا اور شہر میں بیٹھے رہتے تو بھی جن پر قتل ہونا مقدر کر دیا گیا تھا وہ اپنے مضاجع کی طرف باہر نکل آتے، وہ وہیں مرتے جہاں اُن کے مرنے کی جگہ اللہ کی طرف سے مقدر تھی۔

اور یہ واقعہ جو پیش آیا (اِس میں پھر وہی حکمت بتائی جا رہی ہے) اِس لیے پیش آیا تاکہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اُس کی آزمائش ہو جائے، اور تمہارے جذبات اور تمہارے خیالات کی تطہیر ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جانتا ہے۔

''بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا'' کا مصداق کیا ہے؟(دوقول)

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے پیٹھ پھیری تم میں سے جس دن دونوں جماعتوں کی ٹکر ہوگئی تھی'' اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا: اُن سے پہلے کوئی کام اِس قسم کا ہوا جس کی بناء پر شیطان اُن کو مزید لغزش میں ڈال گیا۔ بعض ما کسبوا یہاں قرآنِ کریم نے مبہم ذکر کیا ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان میں کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، چھوٹی چھوٹی کمزوریاں بعد میں کسی بڑی کمزوری کا باعث بن جاتی ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آخر معصوم تو نہیں تھے، معصوم تو انبیاء علیہم السلام کی ذات ہے، تو بعض چھوٹے موٹے گناہ مزید اُن کو لغزش میں ڈالنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ لفظ اِسی طرح سے مبہم ذکر کیا گیا ہے، ہم بھی اس کو مبہم ہی ذکر کریں گے، باقی! اِس میں کسی ایسے جرم کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی کہ چونکہ اُنہوں نے پہلے یہ جرم کیا تھا تو وہ جرم باعث بن گیا کہ شیطان اُن کو پھر اِس جرم میں مبتلا کر گیا، کچھ اپنی لغزشیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے شیطان کو اور زیادہ بہکانے کا اور پھسلانے کا موقع ملا، جس سے اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح نیکی نیکی کا باعث بنتی ہے، اگر ایک شخص ایک نیکی کرتا ہے تو اُس نیکی کی دنیا کے اندر ایک یہ بھی جزا ہے کہ مزید نیکی کی توفیق ہوجاتی ہے، اور بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی لغزش میں آکے کوئی بُرا کام کربیٹھا، چاہے وہ کسی درجے کا ہو، پھر وہ بُرائی مزید بُرائی کا باعث بن جاتی ہے، یعنی قلب کے اندر اُس کا اثر ایسا پڑتا ہے کہ اس کے بعد دوسری بُرائی کے لئے راستہ اور ہموار ہوجاتا ہے، اسی طرح سے اِن بھاگنے والوں کی کچھ لغزشیں تھیں جن کی بناء پر شیطان اِن کو مزید بہکا گیا۔ کوئی بات نہیں، ایسا ہوتا رہتا ہے، جو کچھ بھی ہوا اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا، جس میں یہ چوکنا کردیا کہ آئندہ کے لئے اپنی زندگی کے اُوپر ہمیشہ نظر رکھا کرو، اپنی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور چھوٹی چھوٹی لغزشوں کی فوراً تلافی کیا کرو، توبہ اور استغفار کیا کرو، تاکہ شیطان اُن کوتاہیوں کو ذریعہ بنا کے تمہیں کسی دوسری کوتاہی کے اندر مبتلا نہ کردے، تو زندگی کو سنوارنے اور زندگی کو صاف ستھرا کرنے کے لئے ایک تنبیہ ہوگئی کہ کبھی کسی لغزش کے بعد یا کوئی گناہ سرزد ہوجانے کے بعد یا کسی غلطی کے صدور کے بعد مطمئن ہو کے نہ بیٹھو، یہ مزید کسی گناہ کا باعث بن جائے گا، بلکہ اُس کو جلدی سے مٹاؤ، توبہ اور استغفار کرو، تاکہ شیطان اُس سے آگے کسی دوسری برائی کے اندر تمہیں مبتلا نہ کردے۔ اور تفاسیر میں بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا کا مصداق بدر کے قیدیوں کے متعلق جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ تھا اُس کو بھی قرار دیا گیا ہے،[1] چونکہ جب قیدیوں کے بارے میں اختیار دیا گیا تھا کہ ان کو قتل کردو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، لیکن اگر فدیہ لے کر چھوڑ دو گے تو پھر تمہارے بھی اِتنے ہی آدمی کسی دوسرے موقع پر قتل کئے جائیں گے، اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فدیہ کو ترجیح دی، اور یہ کہا کہ ہم میں سے قتل ہوجائیں گے تو کوئی ایسی بات نہیں، اِس وقت ضرورت ہے کہ اِن کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اِن سے بھی توقع ہے کہ یہ مسلمان ہوجائیں گے، اور کچھ ہمیں بھی مالی سہارا مل جائے گا، جیسے سورۂ انفال میں اِس کی تفصیل آئے گی، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ جو قیدیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ تھا بعض حضرات نے بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا کا مصداق اِس کو بنایا ہے، کہ یہی آخر سبب بن گیا دوسرے وقت میں کہ تمہارے قدم اُکھڑ گئے۔ بہر حال یہ لفظ مبہم اور مجمل ہے، اِس میں کسی جرم

(۱) تفسیر کشف الرحمٰن از مولانا احمد سعید دہلویؒ۔

کی ایسی نشاندہی نہیں کی جاسکتی کہ ہم کہہ دیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے چونکہ یہ جرم صادر ہوا تھا تو اُس کے بعد پھر شیطان نے اُن کو پھسلا دیا، اجمالی طور پر یہ بات ٹھیک ہے کہ بعض غلطیاں اس قسم کی ہوتی ہیں جو مزید غلطی کا باعث بن جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہاں تنبیہ کی جس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ ہمیشہ اپنی زندگی کا جائزہ لیتے رہا کرو، کوئی کوتاہی، کوئی گناہ، اور کوئی کمی صادر ہوجائے تو اُس پر خاموشی اختیار نہ کیا کرو، بلکہ توبہ اور استغفار کر کے اُس کو صاف کرلیا کرو، ورنہ پھر وہ کسی اور بڑے گناہ کا باعث بن جاتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا بہرحال اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اعلان کردیا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ: اللہ تعالیٰ اِن سب سے درگزر کر گیا جو پھسلنے والے تھے، جو بھاگنے والے تھے، میدان چھوڑنے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے اِن سب کو معاف کردیا، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

غزوۂ اُحد میں شکست کے متعلق اہلِ حق کا نظریہ

غزوۂ اُحد کے واقعات آپ کے سامنے تفصیل سے آرہے ہیں، پہلا بڑا غزوہ جو مسلمانوں نے کفار کے خلاف کیا تھا وہ غزوۂ بدر ہے جو دو ہجری میں پیش آیا تھا، اور اُس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باوجود اس کے کہ تعداد میں کم تھے اور اسلحہ اور سامان بھی کم تھا، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ مشرکین مکہ کے مقابلے میں غالب آئے، یہ غزوہ رمضان شریف میں پیش آیا تھا، اگلا رمضان گزرنے کے بعد شوال میں غزوۂ اُحد پیش آیا، غزوۂ اُحد میں بھی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کا وعدۂ نصرت پورا ہوا، مسلمانوں کو فتح ہوئی اور صحابہ کرام کا غلبہ مشرکین پر نمایاں ہوگیا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں اِس کی تصریح ہے وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ: کہ اللہ نے اپنا وعدہ سچا کردکھایا، جبکہ تم انہیں اللہ کی توفیق کے ساتھ قتل کرتے جارہے تھے، بعد میں یہ فتح شکست کے ساتھ بدلی، کیوں بدلی؟ اِس کا کیا سبب پیش آیا؟ اللہ تعالیٰ کی نصرت کیوں رک گئی؟ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شکست کیوں کھا گئے؟ قرآنِ کریم کے الفاظ میں صراحت ہے کہ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ: کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری محبوب چیز تمہیں دکھادی تھی یعنی فتح، تم کافروں پر فتح پا رہے تھے، اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ تھی، کافروں کو تم قتل کرتے جارہے تھے، لیکن بعد میں تمہارے اندر رائے کی کمزوری پیدا ہوئی اور ایک معاملے میں تم نے آپس میں جھگڑا کیا اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تم نے نافرمانی کی، وَعَصَیْتُمْ: تم نے نافرمانی کی، اِس کا تعلق اس جماعت کے ساتھ ہے جو پہاڑ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درے کی حفاظت کے لئے متعین کی تھی، اور میں نے کل آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ جب ایک کام اجتماعی شکل میں کیا جایا کرتا ہے تو اُس میں سے بعض افراد کی لغزش ساری جماعت کو نقصان پہنچاتی ہے، اور جب اُس واقعہ پر تبصرہ کیا جائے گا تو نسبت ساری جماعت کی طرف ہوگی، کہ تم نے یہ کیا اس لئے نقصان ہوگیا، چاہے کرنے والے بعض افراد ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے جو شکست کی وجہ بیان کی ہے وہ ہے رائے کی کمزوری، کہ اپنے خیال میں وہ ٹھوس نہ رہے، اور اُن میں تنازع پیدا ہوگیا کہ ہمیں یہاں ٹھہرنا چاہیے یا نہیں ٹھہرانا چاہیے، آپس میں اختلاف

ہوا، اور سرورِکائنات ﷺ نے جو حکم دیا تھا کہ تم نے یہیں جمنا ہے، اِس جگہ کو چھوڑنا نہیں ہے، اُس میں اُن سے عصیان ہوگیا، اور یہ عصیان بھی کیوں ہوا؟ آپس میں اِس خیال کی بناء پر کہ اب فتح مکمل ہو چکی ہے، میدان خالی ہوگیا ہے، اب کافر بھاگے جارہے ہیں، اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اِن کافروں کا تعاقب کریں، اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ تعاون کریں، اور مالِ غنیمت اکٹھا کروائیں، تو ظاہری طور پر اُن کی توجہ مالِ غنیمت کی طرف ہوئی، مال کا تصور آ گیا، ورنہ یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر ہم مالِ غنیمت میں شریک نہ ہوئے تو ہمیں حصہ نہیں ملے گا، حرص اور لالچ اگر کہا جا سکتا ہے تو اِس بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ اگر ہم نے مالِ غنیمت جمع کرنے میں شرکت نہ کی تو ہمیں حصہ نہیں ملے گا، اس لئے ہمیں دوڑ کر جانا چاہیے اور مال اکٹھا کروائیں تا کہ ہمیں بھی حصہ ملے، پھر تو ہم کہہ سکتے تھے کہ حرص اور لالچ کی بناء پر اُنہوں نے اپنے مرکز کو چھوڑا، لیکن جب بدر کی غنیمت تقسیم ہونے کے بعد یہ قانون واضح ہوگیا تھا کہ غانمین یعنی غنیمت کے حصہ دار صرف وہی نہیں سمجھے جاتے جو باقاعدہ میدان کے اندر لڑ رہے ہوں، بلکہ جو نگرانی پر کھڑے ہیں اور دوسری خدمات کے لئے متعین ہیں وہ بھی اُسی طرح شریک ہوتے ہیں، اُس قانون کے مطابق اِن جبلِ رُماۃ والوں کو حصہ تو بہرحال ملنا تھا، محروم تو انہوں نے رہنا نہیں تھا، اب اِن کا اترنا اِس اجتہاد کی بناء پر تھا کہ یہاں رہنے کی اب ضرورت ختم ہوگئی، اب کافروں کا تعاقب کرنا چاہیے اور مال اکٹھا کرنے میں اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اس لئے اس میں کوئی حرص ولالچ کی بات نہیں، لیکن ظاہری طور پر چونکہ اُن کی توجہ مال کی طرف ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی انکار فرمایا کہ ''تم میں سے بعض وہ تھے جو دنیا کا ارادہ کئے ہوئے تھے''، ورنہ حقیقتاً حرص تو تب صادق آتی کہ اگر ان کو حصہ نہ ملنا ہوتا اور پھر وہ اکٹھا کرنے کے لئے شریک ہوتے تا کہ حصہ لے لیں، کیونکہ حصہ تو اُن کو بہرصورت ملنا تھا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ اپنے محبوبین کی لغزش کو بھی وہ اس طرح تنبیہ کے انداز میں ذکر کرتے ہیں جیسے ان سے کوئی بہت بڑی بات ہوگئی، انبیاء ؑ کے واقعات اِس بارے میں شاہد ہیں۔ اور پھر اِن سے جو لغزش ہوئی اس کے نتیجے میں جماعت کا نقصان ہوا، سرورِکائنات ﷺ زخمی ہوئے، بہت زیادہ نقصان ہوا، اسلام کے اندر باقاعدہ شکست کا ایک باب قائم ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے اُس کی حکمتیں واضح کیں کہ کوئی بات نہیں، چاہے غلطی تو تم سے ہوئی، لیکن اِس میں دیکھو! یہ فائدہ ہوگیا، یہ فائدہ ہوگیا، مؤمن مخلص کا اور منافق کا امتیاز ہوگیا، اور آئندہ کے لئے تمہیں تجربہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ کو تمہارا امتحان مقصود تھا، باقی! جہاں تک ظاہری طور پر تمہاری طرف عصیان کی نسبت کی گئی، غلطی کی نسبت کی گئی، مرکز کو چھوڑنے کی تم نے غلطی کی، ہم نے سب معاف کر دیں، معافی کا اعلان بار بار کر دیا۔ تو اِن آیات میں بھی (جیسا کہ آپ نے واقعہ سنا) عتاب کے مقابلے میں شفقت زیادہ نمایاں ہے، تسلیاں دی گئی ہیں کہ کوئی بات نہیں، اِس میں یہ حکمت تھی، فتح وشکست کے دن بدلتے رہتے ہیں، اِس میں گھبرانا نہیں چاہیے، اِس میں بڑی حکمتیں ہوتی ہیں، انسان کے دل دماغ کے خیالات ٹھیک ہوتے ہیں، جذبات اچھے ہوتے ہیں، ٹھوکریں کھانے سے انسان پختہ ہوتا ہے، اور تم میں سے بعض کو شہادت دینی تھی، لیکن جو کچھ بھی ہوا بہرحال جس بارے میں بھی تمہاری طرف کوئی نقص کی نسبت ہے ہم نے وہ معاف کر دی۔ دو دفعہ معافی کا اعلان آپ کے سامنے آ چکا۔

مودودی صاحب کا نظریہ

یہ تو ہے قرآنِ کریم کا مضمون، لیکن مودودی صاحب جن کی یہ عادت ہے کہ صحابہ کرام ﷡ پر گرفت کرنے کے لئے بہانے تلاش کرتے ہیں، اور کوئی اس قسم کی بات سامنے آجائے تو اُس کو اُچھالنے کی کوشش کرتے ہیں، دیکھو! ایک ہے میرا اندازِ بیان اکابر کی عبارات کی روشنی میں، کہ ایک ایک بات بھی ذکر کریں لیکن ایسے انداز کے ساتھ کہ صحابہ ﷡ کا دامن صاف ہوتا نظر آئے، اور اگر اُن سے کوئی لغزش ہوئی ہے تو ہلکی سے ہلکی ہوتی ہوئی نظر آئے، تاکہ اُس جماعت کی عظمت بحال رہے، مسلمانوں کے اندر جو اُن کا مقام ہے اُس کی حفاظت ہو، اور مودودی صاحب کا ذہن یہ ہے کہ جس وقت بھی کوئی اس قسم کی بات آجاتی ہے تو اُس کو ایسے سخت انداز سے ذکر کرتے ہیں جس سے وہ معاشرہ آج کل کے ہمارے معاشرے سے گھٹا ہوا ہی معلوم ہوتا ہے بڑھا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ اِنہوں نے شکست کا جو سبب قرار دیا یہی آپ کو سنانا چاہتا ہوں، یہ کہتے ہیں کہ ''سودخواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے اُس کے اندر سودخواری کی وجہ سے دو قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں، سود لینے والوں میں حرص، طمع، بخل اور خودغرضی۔ اور سود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بغض وحسد، اُحد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا''(۱) یعنی بعض سود لینے والے تھے جن کے اندر حرص طمع بخل اور خودغرضی تھی، اور بعض سود دینے والے تھے جن میں نفرت غصہ بغض اور حسد تھا، اور اُحد کی لڑائی میں شکست کے معاملے میں اِن بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا۔ اور ''تفہیم القرآن'' کی یہی عبارت ہے جس پر حضرت بنوری ﷫ نے زبردست گرفت کی ہے، اِسی انداز میں جس طرح میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، یہ اُن کی کتاب ہے ''یتیمۃ البیان'' اِس میں اسی عبارت کا عربی میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے، یہ جو عبارت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، اور اس کا صفحہ ۷۰ ہے، اور صفحہ نمبر ۸۱ پر اس کے اوپر یہی گرفت ہے جو میں نے آپ کے سامنے کی، کہ قرآنِ کریم نے تو شکست کے اسباب کی نشاندہی یہ کی ہے، اور اِنہوں نے معلوم نہیں کہاں سے نکال لی جس میں صحابہ کرام ﷡ کی طرف حرص، طمع، بخل، خودغرضی، اور اسی طرح نفرت غصہ بغض اور حسد کو جو اسباب میں ذکر کیا ہے یہ عبارت صحابہ کرام ﷡ کی عظمت کے خلاف ہے۔

چوہدری افضل حق اور اَحرار کا تعارف

یہ بات تو تھی مودودی صاحب کی، اور اس سے بھی بڑھ کر چوہدری افضل حق صاحب رئیس الاحرار، آپ شاید ان سے متعارف نہیں ہیں، یہ احرار کے لیڈر ہیں، لیکن احرار ایک ایسی جماعت تھی جو انگریز کے خلاف ایک آزادنہ ذہن رکھنے والوں کی جماعت تھی، جو بھی انگریز کے خلاف تھے، آزادی کے متوالے تھے، جانباز قسم کے لوگ، وہ اس اسٹیج پر جمع تھے، باقی کسی عقیدہ یا نظریہ کی بنیاد پر اِس میں اجتماع نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ اِس جماعت میں شیعہ بھی تھے، جیسے مظہر علی اظہر آخر وقت تک اِس میں رہا ہے، وہ شیعہ تھا، اسی طرح شمسی وغیرہ، اور اِس میں غیر مقلد بھی تھے جیسے داؤد غزنوی وغیرہ لاہور کے، یہ بھی اِس میں ہمیشہ شامل رہے ہیں، اور اِس میں بریلوی بھی تھے جیسے فیض الحسن آلومہار شریف والے، یہ ۱۹۵۳ء کی تحریک تک احرار میں شامل رہے ہیں، تو

(۱) ''تفہیم القرآن''، سورۂ آل عمران، حاشیہ نمبر ۹۹۔

اِس طرح علماء اور دوسرے لیڈر قسم کے لوگ جیسے نوابزادہ نصراللہ ہمیشہ احرار میں رہا ہے، تو جانباز قسم کے لوگوں کی ایک جماعت تھی جو انگریز کے خلاف جہاد کا جذبہ رکھتے تھے، باقی ایک عقیدہ اور ایک نظریہ پر اِس کی بنیاد نہیں تھی، ہر مسلک کے لوگ لے لئے جاتے تھے بشرطیکہ اُن میں آزادی کا جذبہ ہو، اور وہ جانباز قسم کے لوگ ہوں جو انگریز کے خلاف ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ اُن میں سے ایک چوہدری افضل حق بھی ہیں، مجاہد قسم کے آدمی ہیں، اچھے صاحب قلم ہیں، لیکن علم میں اِن کا کوئی مقام نہیں ہے، ادیب ہیں، صاحب قلم ہیں، قرآن وحدیث کی تشریح وتفسیر میں اِن کا کوئی مقام نہیں ہے، اس لئے علماء نے کبھی اِن کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایک آدمی کی اگر ایک میدان میں عظمت مان لی جائے تو اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ ہر میدان میں اُس کی عظمت کا اعتراف کیا جائے، اب جیسے مولانا ابوالکلام آزاد تھے، ہم اُن کو سیاسی لیڈر سمجھتے ہیں، وہ سیاسی قائد ہیں، ہمارے اکابر نے ہمیشہ اُن کو سیاست میں امام مانا ہے، باقی فقہی مسائل میں اور قرآن وحدیث کی تشریح میں اُن کی رائے کا کبھی اعتبار نہیں کیا، اس لئے کبھی اِس قسم کے مسائل حل کرنے میں اُن کا حوالہ نہیں دیا جاتا، جو نظریہ اُن کا ہمارے بزرگوں کے خلاف ہے ہم اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور سیاسی اتحاد کے طور پر تو چاہے احرار ہو یا جمعیت علماء ہند ہو، حتیٰ کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں نہرو اور گاندھی کو بھی آگے رکھتے تھے، کیونکہ جو مقصد تھا یعنی ہندوستان کو آزاد کروانا، اُس میں جو بھی مفید تھا وہ اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس لیے اِن کا یہ مقام نہیں ہے کہ مذہبی مسائل میں اور مذہبی نظریات میں اِن کے حوالے دیئے جائیں، یہ تو چونکہ کتاب میرے پاس تھی، اور مودودی صاحب کی عبارت بھی سامنے تھی، تو اُس سے زیادہ سخت عبارت افضل حق چوہدری کی ہے، اُس کو صرف آپ کے سامنے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

غزوۂ اُحد کی شکست کے متعلق چوہدری افضل حق کی غلط بیانی

اِسی غزوۂ اُحد کے متعلق وہ لکھتے ہیں، کہ ''جنگ احد میں نبی کریم ﷺ کے حکم کے خلاف لوٹ کی لالچ میں اپنی جگہ چھوڑ جانے والے بھی سود خوار تھے، انہیں خدا کی راہ میں جان دینے کی بجائے غنیم کا مال اڑا لینے کا خیال تھا، اِن کے اِس لالچ نے نبی برحق کو اُحد میں شکست دلوائی، دانت شہید کروا کر نڈھال کر دیا، جنگ اُحد کی شکست نے ثابت کر دیا کہ سود خواروں کا گروہ اسلام کی لڑائیاں نہیں جیت سکتا، انہیں حُبِّ مال ان کی جان اور ایمان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے''، انہوں نے بالکل ہی بھٹہ بٹھا دیا، اب اس شریف آدمی سے کوئی پوچھے کہ جس وقت تک جبل رُماۃ والوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی اُس سے پہلے تو مسلمانوں نے غلبہ پالیا تھا، اُس وقت کیا اِس معاشرے کے اندر سود خواری نہیں تھی؟ اور اس سے ایک سال قبل بدر کے اندر اِنہی لوگوں نے فتح پائی تھی، بدر میں حضور ﷺ کے ساتھ یہی تو لوگ تھے، کیا اس وقت کوئی دوسرے لوگ تھے جنہوں نے مشرکین کے مقابلے میں فتح پائی تھی؟ اس لیے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو انتہائی درجے کی مجروح کرنے والی بات ہے۔ ابھی تو یہی قابل تحقیق بات ہے کہ غزوۂ اُحد سے پہلے سود حرام بھی ہوا تھا یا نہیں، قطعی طور پر سود کی حرمت کا اعلان حضور ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا ہے، اور سورۂ بقرہ کے آخر میں آپ کے سامنے آیات گزری ہیں، اور وہ مدنی زندگی کے آخری دور کی ہیں، اسی لئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور ابواب ربا میں سے بہت ساری باتیں ایسی رہ گئیں جن کی وضاحت حضور ﷺ

نے ہمارے سامنے نہیں کی۔"[1] (اِس کی تشریح میں نے اُس آیت کے تحت آپ کے سامنے کی تھی) تو قطعی طور پر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت رِبا کی حرمت آ گئی تھی۔ اور پھر بدر کے اندر اِن لوگوں کا غالب آنا اور اُحد کے میدان میں پہلے فتح پانا اور پھر مرکز چھوڑنے کی بناء پر فتح کا شکست سے بدل جانا قرآنِ کریم میں صراحتاً مذکور ہے، تو اِس قسم کے الفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف استعمال کرنا عظمت کے منافی ہے۔

چوہدری افضل حق کی مزید گمراہ کُن عبارات

اور یہ کتاب "دِینِ اسلام" جو میرے ہاتھ میں ہے میں اِس کو "چوہدری افضل حق کا دین اسلام" کہا کرتا ہوں، اِس کتاب سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ سوشلزم سے ضرورت سے زیادہ ہی متاثر ہیں، بہت ساری عبارتیں اِس میں ایسی ہیں، ایک جگہ تو انہوں نے صراحت ہی کی ہے، یہ کہتے ہیں "کسی مذہب کی کتاب کو دیکھنا چاہتے ہو، سب کے اوراق کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ لو، غریبوں کی خدمت، بے کسوں پر مہربانی ہر مذہب کی تعلیم کی جان ہے، مگر اِس کتابی سچائی کو زندگی کی حقیقت یا اسلام نے ابتدائی تیس سال اس حقیقت کو اپنایا ہے، اور یا اب سرخ روس اِن کوششوں میں مصروف ہے" بس! اسلام کے ابتدائی تیس سال اور اُس کے بعد یہ روس کی کوشش، بس یہ دو ہیں جو اِس حقیقت کو اپنا رہے ہیں، باقی! اسلام کے ابتدائی تیس سال چھوڑ کر اس کے بعد تیرہ سو سال کا زمانے میں کسی نے اِس چیز کو نہیں اپنایا، اور یہ تیس سال بھی بڑی مشکل سے اِن کے قلم سے نکل گئے، ورنہ یہ تو اِس سے بھی پیچھے ہٹے ہوئے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ "حضرت عمر تو اچانک شہید ہو گئے، انہوں نے تو امیر معاویہ سے باز پرس شروع کر دی تھی، حضرت عمر کے شہید ہوتے ہی سرمایہ داری کے مارِ آستین نے سر نکالا اور روحِ اسلامی کو ڈس لیا" یعنی تیس سال بھی پورے نہیں ہوتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور ہے، تو اِن کے خیال کے مطابق اُس وقت سرمایہ داری کا زہر معاشرے میں پھیلنے لگ گیا تھا، یعنی ان کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت تک یہ معاملہ تھوڑا سا ٹھیک رہا ہے، اُس کے بعد سرمایہ داری آ گئی، تو یہ تو تیس سال بھی پورے نہیں ہوتے، اس لئے ان کی عبارات کچھ اس قسم کی ہیں جن میں بہت سخت انداز اختیار کیا گیا ہے، اور بعض تو اس قسم کی عبارتیں ہیں کہ اگر ظاہر کو دیکھا جائے تو بہت ہی سخت الفاظ ہیں، میں تو اِس کی اِس کتاب کو پڑھ کر بہت بددل ہوا ہوں، دو چار فقرے آپ کو مزید پڑھ کر سناؤں، انسان جب سوشلزم سے متاثر ہوتا ہے تو اُس کے جذبات کدھر کو جاتے ہیں؟ باوجود اس بات کے کہ یہ اچھے بھلے لیڈر ہیں، لکھتے ہیں کہ "خدا کے نام پر سرمایہ داری کے نظام کو چلانے والوں کی چیرہ دستیوں سے چیخ اٹھنے والی بھوک کی ماری مخلوق سوائے خدا کو کوسنے کے کیا کرے، یعنی اگر یہ اللہ کو گالیاں نہ دے تو اور کیا کرے، جس نے انسان بنا کر اِنہیں حیوان سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر شخصی جائیداد خدا کی طرف سے کوئی مقدس حق ہے تو خدا غریب کے لئے مقدس ہستی نہیں، ہم تو کہتے ہیں کہ شخصی جائیداد مقدس حق ہے، تو یہ شرطیہ جوڑ کر رہے ہیں

---

(۱) مشکوٰۃ ۱/ ۲۴۶، باب الربا فصل ثالث/ ابن ماجہ ۱/ ۱۶۴، باب التغلیظ فی الربا۔ ولفظہ: إن آخر ما نزلت آية الربا وإن رسول الله ﷺ قبض ولم يفسرها لنا۔ نیز دیکھیں بخاری ۲/ ۸۳۷۔ مسلم ۲/ ۴۲۲ ولفظہ: ثَلَاثٌ وَدِدْتُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمْ يُفَارِقْنَا حَتّٰى يَعْهَدَ إِلَيْنَا عَهْدًا الْجَدُّ وَالْكَلَالَةُ وَأَبْوَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الرِّبَا.

تو اگر مقدم صادق آ جائے تو تالی تو خود صادق آ جائے گا اِن کے خیال کے مطابق، ''بلکہ خون آشام سرمایہ داروں کا ساتھی ہے'' یعنی سرمایہ دار جو خون پیتے ہیں خدا اِن کا ساتھی ہے اگر کہا جائے کہ شخصی جائیداد کوئی مقدس حق ہے، اور ہم تو اس مقدم کو مانتے ہیں، ہم تو کہتے ہیں کہ شخصی جائیداد مقدس حق ہے، حلال ذرائع کے ساتھ حاصل کر کے شخصی جائیداد کوئی کتنی ہی بنالے، حقوقِ اسلامی اگر ادا کرتا ہے تو اس کی مقدس چیز ہے، اس میں اُس کی مرضی کے خلاف تصرف نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ کہتے ہیں کہ اگر اِس کو مقدس حق قرار دیا جائے تو پھر غریب کے نزدیک خدا مقدس ہستی نہیں ہے۔ اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''بے زبان غریب کی اگر شخصی سرمایہ کے محافظ خدا کے خلاف زبان کھل جائے تو سچے مسلمان کو خوش ہونا چاہیے، کیونکہ مسلمانوں کا خدا تو انسانوں میں کسی بھی امتیاز کا روادار نہیں'' اب اللہ تعالیٰ کی ہدایات تو ہیں، لیکن واقعہ کیا ہے؟ اگر مسلمانوں کے اندر بھی شخصی سرمایہ ہے اور اللہ نے اُس کو تحفظ دیا ہوا ہے، جائز طریقے کے ساتھ کمائے ہوئے سرمائے کو اسلام نے تحفظ دیا ہوا ہے، خود بخاری شریف میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی جائیداد کا جو حساب آیا ہے، بڑا پیچیدہ سا حساب ہے، اُن کی وراثت قرضے ادا کرنے کے بعد جو تقسیم ہوئی، چھ کروڑ دو لاکھ کی مالیت چھوڑ کر گئے تھے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور جائیداد کا حساب خود بخاری شریف میں آیا ہوا ہے[1] اب یہ شخصی جائیداد ہے، اسلام نے اِس کو تحفظ دیا ہے، اور اِس تحفظ کے بعد اگر انسان اُس کے حقوق ادا کرتا چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تو یہ انداز ایسا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد غریب آدمی کے اندر خواہ مخواہ خدا سے ایک بغاوت پھیلتی ہے، کہ انسان ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں تو حیوانوں جیسا بنا دیا، اور نعوذ باللہ یہ سرمایہ داروں کا حامی ہے جس کی وجہ سے اُس نے سرمایہ داروں کو عیش و عشرت دے رکھی ہے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے ''یہ صورت تو نام نہاد اسلامی سلاطین نے پچیس برس کے بعد ہی ختم کر دی تھی، اور مسلمانوں کے سروں پر زرین تخت بچھا کر شخصی حکومت جاری کر دی تھی''، بہر حال زیادہ سے زیادہ اِس کے قلم میں اگر کوئی احتیاط ہے تو یہی ابتدائی بیس پچیس سال یا تیس سال یا اُس سے پیچھے ہٹ کر صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت تک، باقی آگے معاملہ صاف ہے۔ اور ایسے ہی ابتداء کے اندر انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نماز وغیرہ اردو میں ہونی چاہیے، اور قرآنِ کریم کی تلاوت اُردو میں اگر کی جائے تو اس کو قرآن پڑھنا ہی قرار دیا جائے، یہ مولویوں پر ذمہ داری ہے کہ اس مسئلے کو حل کریں، ورنہ قوم اگر جاہل ہے اور اسلامی جذبات نہیں اپناتی تو اس کی ذمہ داری بھی علماء پر آتی ہے۔ اور کمال اتاترک وغیرہ نے جو عربی ممنوع قرار دے دی تھی ترک کے اندر، اور نماز، اَذان وغیرہ سب عربی میں ممنوع قرار دے دی تھی، اِس کی عبارت سے اُس کی گویا تائید نکلتی ہے، اور جو عربی پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں اور اُن کا ذہن ہے کہ قرآن بھی عربی میں پڑھا جائے اور نماز بھی عربی میں پڑھی جائے، اُن پر یہ اپنی عبارات میں کچھ ناراض سے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس لئے یہ حضرات اِس قابل نہیں کہ اِن کا مطالعہ کیا جائے اور مطالعہ کر کے اِن سے نظریات کو اخذ کیا جائے، یہ چیزیں ہمارے اکابر کی تصریحات کے خلاف ہیں۔

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۴۲ باب برکۃ الغازی۔ ۵ کروڑ ۹۸ لاکھ درہم کل ترکہ تھا، یعنی تقریباً ایک کروڑ ۵۷ لاکھ تولہ چاندی، جو کہ ۷۰۰ روپے تولہ کے حساب سے تقریباً گیارہ ارب بنتے ہیں

ہمارے مذہبی راہنما کون؟

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی مذہبی حیثیت بھی تھی اور سیاسی حیثیت بھی تھی، بلکہ مذہبی حیثیت غالب تھی، اوران کی سیاست مذہبی حیثیت کے تابع تھی، وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرتے تھے جو قرآن وحدیث یا علماء اور فقہاء کی تصریحات کے خلاف ہو، اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے بعد اُن کے صحیح جانشین حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ ہوئے، تقریباً پینتیس سال تک اُنہوں نے دارالعلوم کی مسند پر حدیثِ مصطفیٰ کی اشاعت کی ہے، اوراُن کی تحریرات ''نقش حیات'' اور اِسی طرح ''مکتوبات'' کی چار جلدیں موجود ہیں، اِن کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اِن لوگوں کے ذہن میں اسلامی حدود کی کتنی پابندی ہے، کیا مجال ہے کہ ایک لفظ بھی ان کے قلم سے بے احتیاطی کے ساتھ نکل جائے، اور پھر ان کے پینتیس سال کے شاگرد اِن کے علوم کے حامل ہیں۔ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگردوں میں اُن کے علمی وارث حضرت شیخنا الانور مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ اور ایسے ہی اُن کے معروف شاگرد میاں اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ جو حیاتِ شیخ الہند کے مؤلف ہیں اور میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، یہ سارے حضرات ایسے تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے علوم کی اشاعت کی، اس لیے جہاں مذہبی نقطہ نظر سے دیکھنے کی بات ہوگی کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا مسلک کیا ہے؟ تو علماء دیوبند میں سے اِنہی علماء کی تحریریں دیکھو، اِنہی کی کتابیں اٹھا کر پڑھو، تو تمہیں پتہ چلے گا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی صحیح حکمت کیا تھی، قرآن اور حدیث کی وہ کس طرح عظمت بحال رکھتے تھے؟ کس طرح حدودِ الٰہیہ کی پابندی کرتے تھے؟

مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے متعلق ایک اہم وضاحت

اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد ہیں، حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمہ اللہ ہیں، جو اِس تحریک آزادی میں بہت آگے نکلے جس کی بناء پر اُن کو یہاں سے جلاوطن ہونا پڑا، بائیس سال وہ باہر دُنیا کے اندر چکر لگاتے رہے، اُن کے نظریات میں کچھ سختی آئی، جس وقت وہ واپس ہندوستان میں آئے ہیں تو علمی مقام کے طور پر اُن کے فتاویٰ کو اور ان کے خیالات کو دیوبندی مسلک میں جگہ نہیں ملی، دیوبندی مسلک کی ترجمانی مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس رہی، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ کے پاس رہی، مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ کے پاس رہی، دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے پاس رہی۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سیاسی لیڈر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ ہمارے اکابر میں احترام کی نظر سے دیکھے گئے ہیں لیکن ان کے خیالات کو دیوبندی مسلک کی ترجمانی میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ اور پھر اُن کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی تصانیف کم ہیں، وہ باہر مختلف حلقوں میں جو کچھ بیان کرتے رہے وہ لوگوں نے جمع کر کر کے آج شائع کر دیا، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا مسلک سمجھنے کے لئے اُن کتابوں پر مدار نہیں رکھا جا سکتا جن کے اندر واسطہ اہل علم کا نہیں ہے، بلکہ انگریزی خواں اور اس قسم کے لوگ اُن کے اردگرد جمع تھے، اس لیے جو کتابیں انہوں نے اُن کے اقوال کے طور پر لکھی ہیں اُن کی چھانٹی کی جائے گی، جو باتیں ہمارے اکابر کے خیال کے مطابق ہوں گی ہم اُن کو صحیح قرار دیں گے، اور جو بات ہمارے اکابر کی تحقیق کے خلاف ہوگی ہم راوی کی غلطی بتائیں گے، چونکہ

مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت قابلِ احترام ہے، ہم یہ کہیں گے کہ چونکہ اُن کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی باتیں نہیں ہیں، اُن کے ناقل دوسرے لوگ ہیں، اگر کوئی غلط بات ان کتابوں کے اندر آئے گی تو ہم اس کو ناقل کی غلطی بتائیں گے۔ آپ کے سامنے اور کیا عرض کروں، پچھلے دنوں میں اِس بارے میں میں نے بعض حضرات سے ملاقات کر کے اچھی خاصی توجہ بھی دلائی، اُن کی ایک تفسیر ''الہام الرحمٰن'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اب یہ اُن کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی نہیں، انہوں نے کسی کو پڑھائی اور اس شخص نے وہ اقوال جمع کر لیے، جمع کرنے کے بعد اس کو شائع کر دیا، اب ہم اُس کی کسی بات کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، جو بات اس میں سے صحیح ہوگی اُس کو مولانا کی قرار دیں گے، اور جو بات صحیح نہیں ہے اور ہمارے اکابر کی تحقیق کے خلاف ہے اُس کو غلط کہیں گے، چونکہ مولانا کی شخصیت قابلِ احترام ہے اس لئے مولانا کی طرف نسبت کرنے کی بجائے ہم ناقلین کی غلطی بتائیں گے۔ آپ کتاب اٹھا کر دیکھیں گے تو اُس میں صراحت کے ساتھ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ نہیں ہیں، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل نہیں ہوں گے، اور رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے۔ ''عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پہ اٹھایا گیا، عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ایک وقت میں آئیں گے'' صاف الفاظ میں بغیر کسی تاویل کے اِس کو یہودی داستان قرار دیا ہوا ہے، اور اِس عبارت پر میں نے بہت سارے حضرات کو متوجہ کیا ہے، اور حضرت شاہ صاحب[1] کی وساطت سے حضرت مولانا عبیداللہ صاحب انور رحمہ اللہ تک بھی یہ بات پہنچائی کہ اِس کی تردید کر دو اور اِس کے متعلق بیان دو، تو انہوں نے کہ ہمارے خیالات تو وہی ہیں جو ہمارے اکابر کے ہیں اور ہم تو اِس خیال کے بالکل نہیں ہیں، اور میں اس کی نسبت بھی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی طرف تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں کہتا ہوں یہ ناقلین کی غلطی ہے۔ بہر حال اس قسم کی باتیں اُن کی طرف منسوب کتابوں میں موجود ہیں کہ اگر یہ اُن کی کتاب مان لی جائے اور یہ تصریحات اُن کی تسلیم کر لی جائیں تو لازماً کہنا پڑے گا، کہ آج تک ہمارے اکابر اِن چیزوں کا انکار کرنے والوں کو جو کافر کہتے رہے ہیں تو وہ فتویٰ غلط ہے، اور اگر یہ فتویٰ صحیح ہے تو حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت غلط ہے، لیکن جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت پر تو اعتماد کرتے ہیں اور اُن کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، کہ اِن تحریرات کی ذمہ داری حضرت سندھی پر نہ ڈالی جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ بے دِین قسم کے ناقلین جو اُن کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے انہوں نے اس قسم کی باتیں حضرت سندھی کی طرف منسوب کر دیں، لہٰذا اُن کی جن باتوں میں واسطہ اہلِ علم کا نہیں ہوگا ہم اُن پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا
اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ تم اُن لوگوں کی طرح جو کفر کرتے ہیں، اور اپنے بھائیوں کے متعلق کہتے ہیں جس وقت

(۱) حضرت سید جاوید حسین شاہ صاحب مدظلہ، مدیر و شیخ الحدیث جامعہ عبیدیہ، فیصل آباد۔ آپ اُس وقت جامعہ باب العلوم میں مدرس و مفتی تھے۔

ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ کَانُوْا غُزًّی لَّوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ

وہ (بھائی) زمین میں چلیں یا وہ غازی ہوں، کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے،

لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۗ

نتیجہ ان باتوں کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گمان کو ان کے دلوں میں حسرت بنا دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے،

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۱۵۶﴾ اور اگر تم قتل کر دیے جاؤ اللہ کے راستے میں

اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یا تمہیں موت آجائے تو البتہ بخشش اللہ کی طرف سے اور رحمت بہتر ہے اس چیز سے جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں ﴿۱۵۷﴾

وَلَىِٕنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ

اور اگر تم وفات پا جاؤ یا قتل کر دیے جاؤ تو البتہ اللہ کی طرف ہی تم جمع کیے جاؤ گے ﴿۱۵۸﴾ اللہ کی رحمت کے سبب سے

اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪

آپ ان کے لئے نرم ہو گئے، اور اگر آپ ترش رُو ہوتے اور سخت دل ہوتے تو البتہ یہ لوگ بکھر جاتے آپ کے اردگرد سے،

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا

پس آپ انہیں معاف کر دیں اور ان کے لئے معافی طلب کریں، اور ان کے ساتھ مشورہ کیا کریں معاملات میں، پھر جس وقت

عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ ﴿۱۵۹﴾

آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں ﴿۱۵۹﴾

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ

اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد چھوڑ دے تو اللہ کے سوا کون

یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا

ہے جو تمہاری مدد کرے گا، اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو ﴿۱۶۰﴾ اور نہیں

كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّغُلَّ ۚ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

مناسب کسی نبی کے لئے کہ وہ خیانت کرے، اور جو بھی خیانت کرے گا وہ لے آئے گا اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن،

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ أَفَمَنِ

پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اُس نے کیا ہے اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے ﴿۱۶۱﴾ کیا پھر وہ شخص جو

اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ

اللہ کی رضا کا تابع ہے اُس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کے غضب کا مستحق ہوا؟ اور اس شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے،

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا

اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے ﴿۱۶۲﴾ وہ مختلف درجوں والے ہیں اللہ کے نزدیک، اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اُن کاموں کو جو

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا

یہ لوگ کرتے ہیں ﴿۱۶۳﴾ البتہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر جبکہ اُن میں ایک رسول اٹھایا

مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

انہی میں سے ہی، وہ تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیات کو اور انہیں سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم

وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

دیتا ہے، بے شک یہ لوگ اِس رسول کے آنے سے قبل صریح گمراہی میں تھے ﴿۱۶۴﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ - یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اے ایمان والو، لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: نہ ہو جاؤ تم ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر کیا، وَقَالُوۡا لِاِخۡوَانِہِمۡ: اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، الَّذِیۡنَ کے بعد جو ماضی آیا کرتی ہے اس کا ترجمہ مضارع کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے، اور یہاں مضارع کے ساتھ ترجمہ یوں کریں گے ''اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کفر کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کے متعلق کہتے ہیں''، اِذَا ضَرَبُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ کَانُوۡا غُزًّی: جس وقت وہ بھائی زمین میں چلیں یا وہ غازی ہوں، غُزًّی غازی کی جمع، یا وہ غزوہ کرنے والے ہوں، لَّوۡ کَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا قُتِلُوۡا: یہ قَالُوۡا کا مقولہ ہے، اور اِس سے پہلے ایک بات آپ کو لفظوں میں ادا کرنی ہوگی کہ وہ بھائی جب زمین میں چلتے ہیں یا غازی ہوتے ہیں پھر اُن کو موت آجاتی ہے یا وہ

غزوے میں قتل ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے مَامَاتُوْا: تو نہ مرتے، وَمَا قُتِلُوْا: اور نہ قتل کیے جاتے، اس طرح سے بات پوری ہوگئی،''اے ایمان والو! اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کفر کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کے متعلق کہتے ہیں جب اُن کے بھائی زمین میں سفر کرتے ہیں یا وہ غازی ہوتے ہیں اور پھر اتفاقاً اُن کو موت آجاتی ہے یا قتل ہو جاتے ہیں، تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے'' لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ: یہ لام لام عاقبت ہے، نتیجہ اِن باتوں کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس گمان کو اِن کے دلوں میں حسرت بنا دیتا ہے، باعثِ افسوس بنا دیتا ہے، وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: اور اللہ تعالیٰ ہی زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اگر تم قتل کر دیے جاؤ اللہ کے راستے میں، اَوْ مُتُّمْ: یا تمہیں موت آجائے، یعنی قتل نہیں کیے گئے بلکہ طبعی وفات ہوگئی، فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا تعلق اِس کے ساتھ بھی ہے، لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ: البتہ بخشش اللہ کی طرف سے اور رحمت، خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ: بہتر ہے اس چیز سے جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں، مَا یَجْمَعُوْن میں مَا عام ہے، دنیا کا ساز سامان دولت جو کچھ یہ اکٹھا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمت بہتر ہے، وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ: اور اگر تم وفات پا جاؤ یا قتل کر دیے جاؤ، لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ: البتہ اللہ کی طرف ہی تم جمع کیے جاؤ گے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ: فَبِمَا کے اندر مَا زائدہ ہے، اللہ کی رحمت کے سبب سے آپ اِن کے لئے نرم ہوگئے، لِنْتَ یہ لانَ یلینُ سے ہے، لِین نرمی کو کہتے ہیں، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا: اور اگر آپ فظ ہوتے، فظ: ترش رُو، یعنی چہرے پر سختی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو اُس کو ترش روئی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، فظ ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس کے چہرے پر سختی اور ترشی نمایاں ہو، غَلِيْظَ الْقَلْبِ کا معنی دل کے سخت، اگر آپ ترش رو ہوتے اور سخت دل ہوتے، لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ: تو البتہ یہ لوگ بکھر جاتے، متفرق ہو جاتے آپ کے اردگرد سے، فَاعْفُ عَنْهُمْ: پس آپ انہیں معاف کر دیں، وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ: اور اِن کے لئے معافی طلب کریں، وَشَاوِرْهُمْ: اور اِن کے ساتھ مشورہ کیا کریں، فِي الْاَمْرِ: معاملات میں، امر ہر اہم قول اور فعل کو کہتے ہیں، کوئی اہم کام پیش آجائے تو اُس کے بارے میں اِن سے مشورہ کیا کیجیے، فَاِذَا عَزَمْتَ: پھر جس وقت آپ پختہ قصد کرلیں، پختہ عزم کرلیں، پختہ ارادہ کرلیں، فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: تو پھر آپ اللہ پہ بھروسہ کریں، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ متوکلین کو پسند کرتا ہے۔ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ: اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں، وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ: خَذَلَ يَخْذُلُ: ایسے وقت میں مدد چھوڑ دینا جبکہ مدد کی ضرورت ہو، جیسے انیسویں پارے کی ابتدا میں آئے گا کہ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا: شیطان انسان کو موقع پر جواب دے دینے والا ہے، موقع پر چھوڑ دینے والا ہے، یعنی جب مدد کی ضرورت ہوتی ہے ایسے موقع پر ساتھ چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح آپ خطبے میں پڑھا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ'' اے اللہ! تو اُس کی مدد چھوڑ دے جو دینِ محمد کی مدد نہیں کرتا۔ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ: اگر اللہ تعالیٰ تمہیں نصرت سے محروم کر دے، تمہاری مدد نہ کرے، تمہیں چھوڑ دے، فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ: تو اللہ تعالیٰ کے چھوڑ دینے کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا، یا اللہ کے سوا کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ: غَلَّ يَغُلُّ غُلُوْل: اصل کے اعتبار سے یہ لفظ مالِ غنیمت میں خیانت کرنے پر بولا جاتا ہے، اور اِسی سے ایک لفظ غِلّ بھی آتا ہے

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (سورۂ حشر) غِل کہتے ہیں کینے کو، بغض کو، مخفی عداوت جو دل میں چھپائی جاتی ہے اس کو غِل سے تعبیر کرتے ہیں، اس لیے یہ لفظ مالِ غنیمت میں خیانت کرنے پر، اور پھر مطلقاً خیانت کرنے پر، اور پھر بھی اس کا اطلاق دل میں خلاف ظاہر بات چھپا لینے پر بھی ہوتا ہے، کہ ظاہر کچھ اور کیا اور دل میں کچھ اور چھپالیا، تو پھر یہ لفظ بولا جائے گا اصل کے اعتبار سے نُصح کے مقابلے میں، نُصح کا معنی ہوتا ہے خیر خواہی، کہ دل میں یہ جذبہ ہو کہ میں دوسرے کو فائدہ پہنچاؤں، خیر خواہی کا یہی معنی ہوتا ہے، دوسرے کے متعلق خیر چاہنا، بھلائی چاہنا، یعنی دل میں ایسے جذبات رکھنا کہ ہر وقت دوسرے کو فائدہ پہنچانا مقصود ہو اور غِل اور غِش: دل میں کھوٹ، اس کا مطلب ہوتا ہے کہ دل کے اندر بدخواہی کے جذبات چھپالیے، خیر خواہی نہیں ہے، بہر حال اس پر بھی یہ لفظ بولا جاسکتا ہے، بعد میں تشریح ان کی کروں گا کہ یہاں موقع محل کے مطابق اس کا ترجمہ کیا ہے، ابھی آپ اس کا ترجمہ یونہی یاد رکھیے کہ نہیں مناسب کسی نبی کے لئے کہ وہ خیانت کرے، وَمَنْ يَّغْلُلْ: اور جو بھی خیانت کرے گا يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: لے آئے گا وہ اس چیز کو جو اس نے خیانت کی ہے، اپنی خیانت کو لے آئے گا وہ قیامت کے دن، ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ: پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ: کیا پھر وہ شخص جو اللہ کی رضا کا تابع ہے كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ: اُس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کے غضب کا، اللہ کے سخط کا، اللہ کی ناراضگی کا مستحق ہوا؟ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ: اور اس شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے جو اللہ کی ناراضگی کا مستحق ہوا، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ: اور جو اللہ کی رضا کے متبع ہیں وہ مختلف درجوں والے ہیں اللہ کے نزدیک، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اُن کاموں کو جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: البتہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر، اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: جبکہ اِن میں ایک رسول اٹھایا اِنہی میں سے ہی، يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ: تلاوت کرتا ہے اِن پر اُس کی آیات کو، وَيُزَكِّيْهِمْ: اور اِنہیں سنوارتا ہے، وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: اور اِن کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یہ اِن مخففہ من المثقلہ ہے، اِن شرطیہ نہیں ہے، اصل میں اِنَّ تھا، بیشک یہ لوگ اِس رسول کے آنے سے قبل، اِس رسول کے مبعوث ہونے سے قبل صریح گمراہی میں تھے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضمون

غزوۂ اُحد کے حالات آپ نے تفصیل سے سنے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِن واقعات کی حکمت بیان کرتے ہوئے ایک حکمت یہ بھی بتائی تھی کہ ایسے مصائب کے وقت میں مخلصین اور منافقین کا امتیاز ہوجاتا ہے، جب خوشحالی اور امن چین کے دن ہوتے ہیں تو سارے ہی محبّ اور مخلص ہوتے ہیں، اخلاص کا دعویٰ سارے ہی کرتے ہیں، محبت کا اظہار سارے ہی کرتے ہیں، لیکن اصل کے اعتبار سے دل کی گہرائی میں جو جذبات چھپے ہوئے ہوتے ہیں ہمیشہ وہ اس قسم کے حادثات میں نمایاں ہوا کرتے

ہیں، پھر دل کی گہرائی میں چھپی ہوئی باتیں انسان کی زبان پر آتی ہیں، تو یہاں بھی واقعہ ایسے ہی ہوا کہ مدینہ منورہ میں بہت سارے لوگ ایسے تھے جنہوں نے ظاہری طور پر ایمان کو قبول کیا ہوا تھا، در پردہ اُن کو اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں تھی، بلکہ اُن کی ہمدردیاں یہود اور مشرکین مکہ کے ساتھ تھیں، اور یہی لوگ ہیں جن کو ہم منافقین کے لفظ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اور اِن کا سردار تھا عبداللہ بن اُبَیّ ابن سلول...... اِس کو ''اِبن سلول'' پڑھنا ہے [ابن کے ہمزہ کے ساتھ] کیونکہ سلول اِس کا دادا نہیں بلکہ اِس کی ماں ہے، اور اُبَیّ اس کا باپ ہے، اگر ''اُبَیِّ بْنِ سَلُوْل'' پڑھیں گے تو ''اِبنِ سلول'' اُبَیّ کی صفت ہو جائے گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ عبداللہ بیٹا ہے اُبَیّ کا، اور اُبَیّ بیٹا ہے سلول کا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، سلول اِس کی ماں کا نام ہے، یعنی اُبَیّ کا بیٹا اور سلول کا بیٹا، تو یہ دونوں (ابن اُبَیّ اور اِبنِ سلول) عبداللہ کی صفتیں ہیں...... یہ اُن منافقین کا سردار تھا، چنانچہ جنگِ اُحد کے لئے جب سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ سے نکلے ہیں تو یہ راستے سے اپنے ساتھیوں کو واپس لے گیا تھا، تین سو منافق اِس کے ساتھ واپس چلے گئے تھے، اِنہوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، اور اللہ کی مرضی ایسی ہوئی کہ غزوۂ اُحد میں شکست ہوگئی، تقریباً ستر کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم اِس میدان میں شہید ہوئے، جن میں اکثریت انصار کی تھی اور مہاجر بھی تھے، جس طرح غزوۂ بدر میں بھی چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے، جن میں سے آٹھ انصاری تھے اور چھ مہاجر تھے، اور یہاں بھی شہید ہونے والوں کی اکثریت انصار کی تھی، اور یہ انصار اِن منافقوں کے ہم رشتہ، ہم نسب، اور قبیلے کے لوگ تھے، جس وقت یہ واقعات پیش آ گئے تو اب اِن منافقین کو اپنے نفاق کے ظاہر کرنے کا موقع ملا، اور اِس قسم کی باتیں اِن کی زبان پر آئیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اِن کی دلی ہمدردیاں سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کی جماعت کے ساتھ نہیں ہیں، اِس موقع پر انہوں نے جماعت کے اندر انتشار پھیلانے کی پوری کوشش کی، اور بھی بہت ساری باتیں کہیں، جن میں سے ایک بات خصوصیت کے ساتھ انہوں نے لوگوں کے اندر پروپیگنڈے کے طور پر پھیلائی، تاکہ سرورِ کائنات ﷺ پر اعتماد ختم ہو جائے اور یہاں اِن کے آنے کے بعد جو اِن کو سرداری مل گئی اور ہماری سرداری نہ رہی، ہمیں اقتدار حاصل نہ ہو سکا، تو ممکن ہے کہ اس پروپیگنڈے کے ساتھ اِن کے قدم اکھیڑ دیئے جائیں اور دوبارہ اسی عبداللہ بن اُبَیّ کو سرداری مل جائے، اِس لئے یہ اِس پروپیگنڈے کا سرغنہ تھا، اور اِس کے رفقاء، اور آج کل کی اصطلاح میں اس کے جھولی چک (چاپلوس) اور اس کے چچے کڑ چھے اِن باتوں کو پھیلانے والے تھے۔ اِس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہی کے پروپیگنڈے کا ازالہ کیا ہے۔

منافقین کا پروپیگنڈا اور اس کا مقصد

حاصل کیا ہے؟ اُنہوں نے یوں باتیں کرنی شروع کیں کہ دیکھو! ہم نے مشورہ دیا تھا کہ شہر سے باہر نہ جاؤ، اگر ہمارا مشورہ مان لیا جاتا تو کم از کم یہ خونریزی تو نہ ہوتی، یہ مرتے تو نہ، ہمارے مشورے پر عمل کرتے تو یہ مصیبت نہ آتی، یہ مصیبت اسی لئے آئی کہ ہمارا مشورہ نہیں مانا گیا، ہم نے تو بہت زور لگایا تھا، یہاں تک کہ ہم نے تو ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ ہم باہر نہیں جاتے، شہر میں رہنا چاہیے، لیکن اِنہوں نے اپنی ضد نبھائی، اور اِس ضد میں آ کر ہماری قوم مروا دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ (یعنی حضور ﷺ کے متعلق اِس قسم کے پروپیگنڈے کئے) کہ یہ ہمارے حق میں مخلص نہیں ہیں، اِن کے اپنے جذبات ہیں، اپنی قوم کے

ساتھ اِن کی مخالفت ہے اورقربانیاں ہماری دی جارہی ہیں، مشورے ہمارے نہیں مانتے، جدھر دیکھو بس ہمارے آدمی قتل کروائے جارہے ہیں، ہم نے تو اِن پر اعتماد کرلیا، اِن کے ہاتھ پر بیعت کرلی، اپنا جان مال سب کچھ اِن کے سپرد کردیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے حق میں مخلص نہیں ہیں، یہ اسی طرح ہماری قوم کو تباہ کروائیں گے۔ اس طرح سے منافقین نے مسلمانوں کے اندر پروپیگنڈا کرنا شروع کردیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے دل کی گہرائی میں جو چھپے ہوئے جذبات تھے، یعنی سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ عدمِ عقیدت، حضور ﷺ پر پورا اعتماد نہ کرنا، اِس قسم کے جذبات اُن کے دل کی گہرائی میں جو چھپے ہوئے تھے تو اب ذرا سا رگڑا لگا اور اندر کے سارے داغ نمایاں ہوگئے، اور اگر اس قسم کی مصیبتیں نہ آتیں تو اِن کا یہ نفاق اور اِن کے یہ جذبات جو حضور ﷺ اور آپ کی جماعت کے متعلق تھے یہ نکھر کے سامنے نہ آتے، اور انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اب ایک واقعہ سامنے آگیا، اب یہ پروپیگنڈا عام کرو، جب پروپیگنڈا عام ہوگا تو کم از کم اہل مدینہ کا اعتماد حضور ﷺ سے اُٹھ جائے گا، جب اہل مدینہ کا اعتماد اُٹھ جائے گا تو یہاں سے اِن کے قدم اُکھڑ جائیں گے اور دوبارہ وہی ہماری سرداری پھر آجائے گی جیسے پہلے تھی۔

عبداللہ بن اُبیّ سب سے بڑا منافق کیوں تھا؟

یہود کے ساتھ اِن کے تعلقات تھے، یہود سے اِن کی ہمدردیاں تھیں، وہ بھی اِن کو اس قسم کی پٹیاں پڑھاتے تھے، اور خود بھی یہ لوگ چونکہ اقتدار کے بھوکے تھے، حُبِ جاہ میں مبتلا تھے اور سرورِ کائنات ﷺ کے آجانے کی وجہ سے ان کی یہ تمنا دل ہی دل میں رہ گئی تھی۔ اور یہ بات بخاری شریف[1] میں صراحتاً آتی ہے، کہ جب سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو ایک دفعہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو خزرج کے سردار ہیں (جس قبیلے سے یہ عبداللہ بن اُبیّ ہے) وہ بیمار ہوگئے اور وہ مخلصین میں سے تھے، تو حضور ﷺ اُن کی عیادت اور بیمار پرسی کے لئے چلے، گدھے پر سوار تھے، جب چلے تو سڑک پر ایک کنارے میں (جیسے دیہاتوں میں اور شہروں میں رواج ہوتا ہے کہ لوگ مجلس لگالیتے ہیں، ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں) تو ایک طرف مجلس لگی ہوئی تھی، اور عبداللہ بن اُبیّ بھی وہیں موجود تھا، اِس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، یہ بدر سے پہلے کی بات ہے، اور اُس مجلس کے اندر کچھ مسلمان تھے، کچھ مشرکین تھے، کچھ یہود تھے، مشترکہ سی مجلس تھی، حضور ﷺ تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں جس وقت اُن کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو سواری سے اُترے اور اُتر کر اُن کو سلام کہا، تبلیغ کی، اور اسلام کی باتیں کہیں، تو یہ عبداللہ اُس وقت بولا، کہنے لگا کہ دیکھو جی! جو باتیں آپ کرتے ہیں یہ بڑی اچھی باتیں ہیں، لیکن ہمیں ہماری مجلسوں میں آکر تنگ نہ کیا کرو، اپنی جگہ بیٹھا کرو، جو وہاں آپ کے پاس آجائے اُس کو یہ باتیں سنایا کرو، اور جو آپ کے پاس نہیں آتا تو ہماری مجلسوں میں آکر اِس قسم کی باتیں نہ کیا کرو۔ اور جو درمیان میں وہاں مخلص صحابہ بیٹھے تھے وہ کہنے لگے یارسول اللہ! آپ کا آنا تو ہمارے لئے بڑا خوشی کا باعث ہے، آپ ضرور تشریف لایا کیجئے اور ضرور ہمیں اس قسم کی باتیں کیا کیجئے، اُدھر سے وہ بولے اور اُدھر سے وہ بولے، بات تُوتُو میں میں تک پہنچ

---

(۱) بخاری ۲/۶۵۶، کتاب التفسیر، سورۃ آل عمران/ نیز ۲/۸۴۵، باب عیادۃ المریض/ ۲/۹۱۶، باب کنیۃ المشرک/ ۲/۹۲۴، باب التسلیم فی مجلس فیہ الخ۔

گئی، حضور ﷺ نے سب کو چپ کرایا، پھر آپ سوار ہو کر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے۔ آپ نے وہاں جا کر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی کہ دیکھو! آج ابوحباب نے (یہ عبداللہ بن اُبَیّ کی کنیت تھی) ایسی باتیں کی ہیں، جو اُس کے لئے مناسب نہیں تھیں، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے یا رسول اللہ! اسے معذور سمجھو، آپ کے آنے سے قبل اس طرف کے لوگ یعنی مدینہ منورہ کے لوگ طے کر چکے تھے کہ اوس اور خزرج دونوں مل کر عبداللہ بن اُبَیّ کو اپنا سردار بنالیں، انہوں نے اس کو پہنانے کے لئے تاج تیار کرلیا تھا، اِس کو پگڑی بندھوائی تھی اور اِس کو سردار بنانے والے تھے، اور اِس سے قبل کبھی اوس اور خزرج کا کسی شخص پر اتفاق نہیں ہوا جیسا کہ اب عبداللہ بن اُبَیّ پر ہو رہا تھا، اور آپ کے آنے سے وہ سارا پروگرام درہم برہم ہوگیا، وہاں الفاظ آتے ہیں کہ شَرِقَ بِذَالِکَ یہ بات اِس کے گلے میں اٹکی ہوئی ہے، آپ کے آنے سے یہ جو سارا پروگرام خراب ہوگیا ہے یہ بات اس کے برداشت کی نہیں، اس لئے یہ حسد میں مبتلا ہوگیا ہے، تو آپ اِس کی باتوں پر کان نہ دھریئے، آپ اس سے درگزر کر جایئے۔ تو وہاں سے یہ سارا نقشہ سمجھ میں آتا ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ سب سے بڑا منافق کیوں تھا؟ اور ہر موقع پر وہ حضور ﷺ کو اور مہاجرین کی جماعت کو مدینہ سے نکالنے کے پروگرام کیوں بناتا تھا؟ اور قدم اکھیڑنے کی کوشش کیوں کرتا تھا؟ بہت سارے واقعات ہیں، آپ کے سامنے اِس کا کیا ذکر کروں، غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر بھی اسی نے فتنہ اُٹھایا، ایک انصاری اور ایک مہاجر کی آپس میں کچھ تھوڑی سی بات ہوگئی، اُس کو بہانہ بنا کے اِس نے وہ لفظ بولے تھے جو سورۂ منافقون میں ہیں لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ: اب ہم مدینہ لوٹ کر جائیں گے تو اِن ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے، یہ ہمارا کھاتے ہیں اور پھر ہمارے اوپر ہی غراتے ہیں؟ مہاجرین کے متعلق اِس نے اس قسم کے لفظ بولے تھے، اور اپنے ساتھیوں کو کہا تھا کہ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ یہ جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آئے ہوئے ہیں اِن پر خرچ کرنا بند کردو، یہ سارے خود نکل جائیں گے، تم نے کھلا کھلا کر اِن کو یہاں اکٹھا کرلیا، تم نے قربانیاں دیں، اور آج یہ ہمیں لاتیں مارتے ہیں؟ یہ واقعہ بھی بخاری شریف کے اندر مفصل مذکور ہے، اور قرآنِ کریم کے اندر اِس کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ تو کوئی موقع یہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا، کوشش کرتا تھا کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس کی بناء پر مہاجرین کے قدم اکھیڑ دیے جائیں اور یہ شیرازہ منتشر ہوجائے، اور میں اُسی طرح دوبارہ مدینہ کا سردار بن جاؤں گا جس طرح پہلے تجویز ہوئی تھی۔ یہ بات تھی جس کی بناء پر اس کے دل کی جلن نہیں جاتی تھی، اس لیے ایسے موقع پر انہوں نے بڑا فائدہ اٹھایا، جبکہ نقصان بھی ہوا، بہت سارے لوگ شہید ہوگئے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس کے مشورے کے خلاف یہ بات ہوئی تھی، کہ اس کا مشورہ تھا کہ باہر جا کر نہیں لڑنا، تو انہوں نے پھر پروپیگنڈہ کر کے یوں بددلی پھیلانے کی کوشش کی۔

منافقین کے پروپیگنڈے کا جواب

تو اِن آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہی کہا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرنے والے حقیقت کے اعتبار سے کافر ہیں، اور اِن کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر کوئی اعتماد نہیں ہے، جب بھی کوئی باہر چلا جائے اور باہر جا کے قتل کی نوبت آجائے یا ویسے ہی وفات ہوجائے تو یہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہماری تجویز نہیں مانی گئی تھی، اگر یہ ہمارے پاس ہوتے تو یہ کیوں قتل ہوتے، کیوں مرتے؟ اصل

بات یہ ہے کہ یہ باتیں ان کے لئے حسرت وافسوس کا باعث ہیں، اگر ان کا اللہ پر صحیح اعتماد ہو کہ حیات وموت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو پھر واقعہ پیش آجانے کے بعد یوں کہیں کہ اِس کی زندگی اتنی ہی تھی، ایسے ہی ہونا تھا، جب اس قسم کی بات کی جایا کرتی ہے تو دل کو اطمینان آجاتا ہے، پھر دل کے اندر زیادہ صدمہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی تقدیر کا قائل ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم قدرت اور حکمت پر اُس کا اعتماد ہے، اُس کا بچہ فوت ہوگیا، تو وہ کہتا ہے کہ بس! اللہ کو ایسے ہی منظور تھا، اِسی میں اللہ کی حکمت تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہو بس وہی ہمارے حق میں بہتر ہے، تو طبعی طور پر اگرچہ اُس کو تھوڑا سا صدمہ ہوگا لیکن دو چار دن میں طبیعت صاف ہوجائے گی اور دل کو اطمینان ہوجائے گا۔ اور اگر وہ یوں سوچنے لگے کہ ہائے! اگر فلاں حکیم سے علاج کرواتا تو یہ بچ جاتا، اگر میں اس کو فلاں ہسپتال میں لے جاتا تو یہ بچ جاتا، یہ اس لئے مرگیا کہ میں نے فلاں کا مشورہ نہیں مانا تھا، یہ باتیں جتنی کریں گے اتنی دل کے اندر بے چینی اور تڑپ زیادہ پیدا ہوگی۔ تو یہ باتیں اِن کے لئے اسی طرح بے چینی اور حسرت کا باعث بنی ہوئی ہیں، ورنہ مسلمان کا تو عقیدہ یہ ہے کہ اللّٰهُ يُحْيِ وَيُمِيتُ: حیات وموت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جیسے پیچھے آیا تھا کہ اگر وہ گھروں میں چھپ کر بھی بیٹھے رہتے تو بھی جن کے لئے موت مقدر تھی وہ اپنے گرنے کی جگہوں کی طرف نکل کر ضرور آتے۔ اور اِس رکوع کے آخر میں پھر یہ بات آئے گی کہ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: تم جو چھلانگیں مارتے پھرتے ہو، اچھلتے پھرتے ہو، کہ اگر ہماری تجویز مان لیتے تو نہ مرتے، ذرا تم تو موت سے بچ کر دکھادینا، جب تمہارا وقت آجائے گا تو دیکھیں گے تم موت سے کس طرح بچتے ہو، اگر تمہاری تجویزوں پر عمل کرنے سے کوئی موت سے بچ سکتا ہے تو تمہیں تو بدرجہ اولیٰ بچ جانا چاہیے، لیکن جب تمہیں موت آئے گی دیکھیں گے تم کہاں تک بچتے ہو، یہ سارے کا سارا رکوع اُن کے اِسی پروپیگنڈے کا جواب ہے۔

عظمتِ رِسالت کا ذکر اور اُس کا مقصد

پھر خصوصیت کے ساتھ درمیان میں حضور ﷺ پہ اعتماد ظاہر کیا گیا ہے کہ دل کے اندر خیانت رکھنا اور دل میں کسی کے متعلق غداری کے جذبات رکھنا کسی نبی کی شان نہیں ہے، کہ ظاہری طور پر تو خیرخواہی کا اظہار کریں اور دل میں بدخواہ ہوں یا دل میں کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہو، یہ کسی نبی کی شان نہیں ہے، نہ تو مالی طور پر نبی خیانت کرسکتا ہے کہ مالِ غنیمت میں سے کچھ چھپالے اور باقی قوم کے سامنے ظاہر نہ کرے، اور نہ اِن معاملات میں کسی قسم کی خیانت کرسکتا ہے کہ ظاہری طور پر کچھ ہو اور اندر سے کچھ ہو، نبی کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا اُس کی شان کے منافی ہے، خائنین تو اللہ کے دربار میں رسوا ہوں گے، وہ تو اللہ کی ناراضگی کے ساتھ لوٹیں گے، اور نبی تو متبع رضوانِ اللہ ہوتا ہے، یہ لوگ تو درجات والے ہوتے ہیں، اِن کے متعلق ایسا خیال کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس لئے پھر آگے جاکر یہ بتایا کہ مؤمنوں کو تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا رسول بھیج دیا، ایمان والوں کے جذبات تو شکرگزاری کے ہونے چاہئیں، کہ جس وقت تک یہ نہیں آئے تھے ہم کس طرح اینٹوں کے سامنے جھک رہے تھے، پتھروں کے سامنے جھک رہے تھے، درختوں کے سامنے جھک رہے تھے، آگ پانی کی پوجا کرتے تھے، صراحتاً گمراہی میں پڑے ہوئے تھے،

اِن کے آنے کے ساتھ اللہ نے ہمیں شرف بخشا، تو اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اللہ کے اِس احسان کی قدر کرنی چاہیے جو اللہ کے رسول کی شکل میں آیا، اس لیے آگے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ میں یہ بات بیان فرمائی ہے۔

حضور ﷺ کی نرم رُوِی کا ذکر، اور صحابہ کے لئے اللہ کی ہدایات

اور درمیان میں پھر سرورِ کائنات ﷺ کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات کہی کہ آپ نے جو اِن کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا، کہ باوجود اِن کی اس قسم کی غلطیوں کے جن سے اتنا بڑا نقصان ہوا، اور باوجود اِن کے اس قسم کے طعن وتشنیع کے آپ کے چہرے پر انقباض نہیں آیا، آپ اِن کے ساتھ خوشی سے پیش آتے ہیں، مسکراتے ہوئے پیش آتے ہیں، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اُس نے آپ کا مزاج ایسا بنا دیا، ورنہ اگر آپ ترش رُو ہوتے اور سخت دل ہوتے تو اس وقت یہ فدائیوں کی جماعت جو آپ کے اردگرد اکٹھی ہوئی ہوئی ہے یہ اس طرح سے مجتمع نہ رہتی، بلکہ یہ آپ سے منتشر ہوجاتے اور بھاگ جاتے۔ گویا کہ آئندہ کے لئے بھی تلقین فرمادی کہ اِن کی اس قسم کی غلطیوں پر اسی طرح سے خوش رُو رہنا ہے، ترش روئی نہیں کرنی، سخت دل نہیں ہونا۔ اور جو مصلح ہوتا ہے اور ایک پروگرام لے کر قوم کے سامنے آتا ہے تو اس کے لئے اصل بات یہی ہے کہ اُس کے چہرے پر بھی بشاشت ہو، دل کے اندر بھی نرمی ہو، اُس کی قوم کے لوگ، اُس کے ماننے والے، اور اُس کے متبعین اگر کسی قسم کی غلطی کر بھی جائیں تو اس کو نہایت نرمی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کی جائے، سخت دلی کے ساتھ یا ترش روئی کے ساتھ معاملہ نہ کیا جائے۔ اور پھر ساتھ یہ کہہ دیا کہ جو اِن سے ہوا آپ اِن کو معاف بھی کردیں، اور ترتیب ایسی رکھی کہ پہلے اللہ نے اپنی طرف سے معافی کا اعلان کیا، اور پھر حضور ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ بھی معاف کردیں، اور معاف کرنے ساتھ ساتھ پھر ان کے لئے مجھ سے بھی استغفار کرو، کہ یا اللہ! ان کا گناہ معاف کردو، کیونکہ یہ دل کے زیادہ صاف ہونے کی علامت ہے۔ اور پھر اِن کو اعتماد دلانے کے لئے (کہ آپ نے اِن کو دل سے معاف کردیا اور آپ ان پر ناراض نہیں ہیں) معاملات میں ان سے مشورہ بھی کرتے رہنا، جب آپ اِن سے مشورہ کریں گے اور ان کی بات سنیں گے اور مانیں گے تو اِن کو اور زیادہ اعتماد ہوگا کہ حضور ﷺ دل سے ہمیں معاف کرچکے ہیں، ہم پر خوش ہیں، ناراض نہیں ہیں۔

اور پھر صحابہ مخلصین کو بھی اعتماد دلایا جاسکتا ہے، کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ شاید حضور ﷺ نے اُوپر اُوپر سے معاف کردیا ہو، اور دل میں کوئی غصہ رکھ لیا ہو، اِس قسم کی باتوں کا چھپانا نبی کی شان نہیں ہے (تفسیر عثمانی)، مخلصین کے لئے یہ لفظ (وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ) یوں صادق آسکتا ہے، اور منافقین کے لئے یوں صادق آئے گا کہ دل میں بدخواہی رکھنا اور ظاہری طور پر خیر خواہ بن کر رہنا نبی کی شان نہیں ہے، نبی ہمیشہ خیر خواہ ہوتا ہے اور اس کے اندر کوئی ایسے جذبات نہیں ہوتے جن کو خیانت سے تعبیر کیا جاسکے۔ اس طرح سے آیات کی ترتیب ہے، اور واقعہ اُحد کے پیش آجانے کے بعد جس قسم کے برے اثرات منافقین نے پھیلانے شروع کیے تھے اُن کا ازالہ مقصود ہے۔

سوال:- جب اِس قسم کے لوگوں کو کافر کہا جارہا ہے تو پھر وہ منافق تو نہ رہے، وہ تو کافر ہوگئے؟

جواب:- چونکہ تعیین نہیں کی گئی، منافق ہیں تو کافر ہی، اس میں کوئی شک نہیں، یہ سرورِ کائنات ﷺ نے ایک حکمت

اپنائی تھی کہ جو لوگ بھی کلمہ پڑھتے تھے اور ظاہری طور پر اپنے آپ کو مؤمن کہتے تھے تو اُن کے دنیوی احکام مؤمنوں کی طرح تھے، ورنہ یہ حقیقت تو بارہا نمایاں کی جا چکی تھی کہ یہ لوگ دل سے کافر ہیں اور آخرت میں اِن کا انجام کافروں جیسا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (سورۂ نساء:۱۴۵)، اس لیے منافقوں کا کُفر اگر الفاظ میں بیان کر دیا جائے تو اِس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، یہاں علی الاطلاق کہا کہ جو ایسی باتیں کرتے ہیں حقیقت کے اعتبار سے کافر ہیں، اِن کو اللہ کی تقدیر پر اور اللہ کی حکمت پر کوئی اعتماد نہیں، تو منافق ہیں تو کافر ہی، اِس میں کیا شک ہے۔

سوال:- یہاں مالِ غنیمت میں خیانت کا ذکر ہے جبکہ اُحد میں تو مالِ غنیمت تھا ہی نہیں۔

جواب:- یہ بات بعد میں عرض کرتا ہوں۔

گزشتہ آیات پر مزید ایک نظر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اے ایمان والو! اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کُفر کرتے ہیں، اور اپنے بھائیوں کے متعلق کہتے ہیں (بھائیوں سے مراد ہے اپنے قبیلے کے لوگ، اپنے خاندان کے لوگ، یا ظاہری طور پر چونکہ وہ اپنے آپ کو مسلمان قرار دیتے تھے تو مسلمان ہونے کے اعتبار سے بھائی مراد ہیں، اور یہ ظاہر داری ہے) اپنے بھائیوں کے متعلق کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کرتے ہیں یا غازی ہوتے ہیں، یعنی کہیں غزوہ لڑنے کے لئے چلے جاتے ہیں، اور پھر اُن کو اتفاقاً موت واقع ہو جاتی ہے یا کسی لڑائی میں قتل ہو جاتے ہیں، یہ لفظ درمیان میں محذوف مانیں گے تب جا کر اُن کی اگلی بات ٹھیک بنے گی، یعنی سفر کی حالت میں کہیں اُن کو موت آ گئی یا غزوے میں گئے اور قتل کر دیے گئے، تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ یہ مرتے اور نہ یہ قتل کیے جاتے۔ اور یہ باتیں جو ان کی زبانوں پر جاری ہوتی ہیں اِن کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس بدگمانی کو، یعنی یہ گمان جو انہوں نے اپنے دل میں جما لیا ہے، اور اِس قسم کا خیال جو ان کے دل میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ اِس کو اِن کے قلوب میں حسرت اور افسوس کا باعث بنائے گا، اِس کا انجام یہ ہے، اِس کی عاقبت یہ ہے کہ یہ باتیں ان کے لئے مزید حسرت اور افسوس کا ذریعہ بنیں گی، جیسے کہ میں نے عرض کر دیا کہ جتنا انسان اِس قسم کے تذکرے کرتا ہے دل کے اندر بے چینی اتنی بڑھتی جایا کرتی ہے، باقی! مسلمان کا عقیدہ تو یہ ہے کہ زندگی دینا اور موت دینا اللہ کا کام ہے وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ دیکھنے والا ہے۔ اگر تم اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے یا فی سبیل اللہ تمہارا سفر تھا اُس میں تمہیں موت واقع ہو گئی، تو اِس قتل کو اور موت کو اپنے لیے خسارہ نہ سمجھو جس پر یہ لوگ ہاتھ ملتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو گیا، اللہ کے راستے میں سفر کی صورت میں اگر تمہیں موت آ جائے یا اللہ کے لئے تم سفر کر رہے ہو فی سبیل اللہ، اور تم کسی جہاد کے اندر اور غزوے کے اندر قتل کر دیے گئے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہے، اس موت اور قتل پر جو اللہ کی مغفرت اور رحمت حاصل ہو گی لوگ جتنی دنیا اکٹھی کرتے ہیں اس کے مقابلے میں وہ بہتر ہے، ورنہ جب بھی تمہیں موت آئے گی اور جس طرح بھی تم قتل ہو گے جانا تو اللہ کے پاس ہی ہے، جس کو ہم کہتے ہیں کہ پانی گزرنا تو آخر اِنہی پلوں کے نیچے ہے، بڑھ تو سکتا نہیں، تو مرنا تو ہے ہی، قتل ہو جائیں یا موت آ جائے جانا تو اللہ کے پاس ہے، لیکن اگر فی سبیل اللہ یہ

واقعہ پیش آجائے تو جو رحمت اور مغفرت حاصل ہوگی وہ دنیا کے سارے سامان کے مقابلے میں بہتر ہے، اس لیے اِس موت کو اور اس قتل کو تم معمولی نہ سمجھو۔ ''اور اگر تم مر جاؤ'' کسی صورت میں بھی چاہے فی سبیل اللہ، چاہے جیسے بھی، ''یا قتل ہو جاؤ'' چاہے فی سبیل اللہ یا جیسے بھی، لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ: جانا تو اللہ کے پاس ہے، جب اللہ کے پاس جانا ہے تو یہ موت اور یہ قتل اللہ کے راستے میں واقع ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے، کیونکہ فی سبیل اللہ قتل کی صورت میں اور اللہ کے راستے میں موت آنے کی صورت میں جو مغفرت اور رحمت اللہ کی طرف سے حاصل ہوگی وہ دنیا کے سارے سامان کے مقابلے میں بہتر ہے، ورنہ مر کر اور قتل ہو کر جانا تو آخر اللہ کے پاس ہی ہے، اور تو کوئی ٹھکانہ ہے ہی نہیں۔ آگے حضور ﷺ کے متعلق بات ہے کہ اللہ کی رحمت کے سبب سے ہی آپ ان کے لئے نرم ہو گئے، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ اِن کے لئے نرم ہیں، لان یلین: نرم ہونا، اگر آپ تند خُو ہوتے، آپ کی عادت سخت ہوتی، ترش رو سخت دل والے ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے بکھر جاتے، پھر اس طرح سے اِن پروانوں کا اجتماع نہ ہوتا، اس سے معلوم ہو گیا کہ مصلح کے لئے، یعنی جو شخص ہادی ہے، دوسرے کے لئے راہنمائی کا باعث بننے والا ہے، جو کسی جماعت کا قائد ہے، اس کے لئے فظ اور غلیظ القلب ہونا جماعتی تنظیم کے منافی ہے، اُس کو خوش خلق ہونا چاہیے، ترش رُو نہیں ہونا چاہیے، نرمی کے ساتھ بات کرے۔ اصل نرمی ہے، خوش خلقی ہے، اخلاق ہے، اور سختی جو کرنی پڑتی ہے تو وہ کسی عارض کی بناء پر گاہے گاہے ہوتی ہے، جیسے اصل تو صحت ہے، لیکن بیماری آجائے تو کڑوی دوا بھی دینی پڑتی ہے، اسی طرح عام طور پر تنظیم جو ہوتی ہے وہ تو خوش اخلاقی کی بناء پر ہی ہوتی ہے، لیکن پھر اِس اجتماعی زندگی میں اگر کسی سے کوئی اِس قسم کی غلطی ہوتی ہے جس کا نقصان دوسروں تک پہنچنے والا ہوتا ہے، یا اُس کو اگر سختی کے ساتھ جواب نہ دیا گیا اور اُس کو تنبیہ نہ کی گئی تو باقیوں میں بھی اُس بیماری کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہے، ان عوارض کی بناء پر سختی کی جاتی ہے، اور وہ سختی بھی اُس وقت رحمت کا مصداق ہی ہوتی ہے، جس طرح اگر آپ صحت مند ہیں تو آپ کو لذیذ سے لذیذ غذا ملنی چاہیے، اچھی سے اچھی کھانے پینے کی چیزیں ہوں، اچھی سے اچھی آپ کی زندگی گزرے، لیکن اگر کوئی پھوڑا نکل آیا تو پھر مصلح کا کام ہے کہ اُس میں نشتر بھی لگا دے، اور جو اُس میں پیپ پڑ گئی ہے اس کو نکال دے، چاہے ظاہری طور پر آپ کی چیخ ہی نکلے گی، لیکن یہ نشتر لگانا اور اس میں سے مواد کا نکالنا بھی رحمت ہے، اِس کو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زیادتی ہے، لیکن یہ ہوگا عوارض کے وقت، ورنہ اکثر و بیشتر معاملہ اچھا ہی ہوا کرتا ہے کہ اچھی غذا ہو، وغیرہ وغیرہ، اور جہاں کوئی اس قسم کی بات ہو جائے تو عضو کو کاٹنا بھی پڑتا ہے، اس کو چیرنا بھی پڑتا ہے، اور اُس میں سے گندا مواد نکالنا بھی پڑتا ہے، وہ بھی رحمت کا مصداق ہی ہوتا ہے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ: آپ اِنہیں معاف کر دیں، یعنی ظاہری طور پر بھی اِنہیں کہہ دو کہ میں نے معاف کر دیا جو کچھ تم سے قصور ہوا، ''اور اِن کے لئے استغفار کیجئے'' تاکہ اِن کو مزید اطمینان ہو کہ جب اللہ تعالیٰ سے بھی ہمارے لیے معافی کی درخواست کر رہے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دل بالکل صاف ہے۔

مشورے کی اہمیت اور آداب

''اور آئندہ کے لئے بھی اِن سے مشورہ کرتے رہیے'' امر سے مراد ہے وہ کام جو مہتم بالشان ہو۔ جو معاملات تو ایسے

ہیں جن کے بارے میں اللہ کی طرف سے قطعی ہدایات آجائیں، اُن میں تو کسی کے مشورے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے بعد جس معاملے میں حضور ﷺ کی طرف سے قطعی ہدایات ہیں اُس میں بھی اب مشورے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، ہاں البتہ حکومت کے معاملات اور اپنے شخصی معاملات جن میں کوئی پہلو متعین نہیں، یوں بھی کیا جاسکتا ہے اور یوں بھی کیا جاسکتا ہے، تو یہاں ذی رائے اور سمجھدار لوگوں سے پوچھ لینا اور اُن سے مشورہ کر لینا مطلوب ہے، مشورہ کا مطلب ہوتا ہے آرا معلوم کرنا، اور اِس میں خیر و برکت ہوتی ہے، وہ خیر و برکت اس لئے ہوتی ہے کہ ایک آدمی اکیلا جب کسی معاملے کو سوچنے والا ہوتا ہے تو بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک پہلو پر اُس کی نظر ہے اور دوسرے پہلو پر نظر نہیں ہے، اور جب چار آدمی بیٹھ کر اکٹھے سوچیں گے تو ہر پہلو پر نظر چلی جائے گی، سارے پہلو سامنے آجانے کے بعد پھر انسان جو بات طے کرے گا اُس میں بصیرت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے عام معاملات میں بھی اور حکومت کے معاملات میں بھی جن کے بارے میں قرآن اور حدیث میں قطعی ہدایات نہیں ہیں اب بھی مسئلہ اسی طرح ہے کہ یہ مشورے کے ساتھ طے ہونے چاہئیں، اس لیے اسلام نے جو نظام ہمیں دیا ہے وہ شورائی نظام ہے، جو مشورے کے ساتھ چلتا ہے، اور مشورے کا مطلب یہ ہے کہ جو معاملہ پیش آجائے اُس معاملے کے متعلق سمجھدار لوگ جو بصیرت رکھنے والے ہیں اُن کو اکٹھا کر کے اُن کی رائے معلوم کی جائے، رائے معلوم کرنے کے بعد دلیل کے اعتبار سے جو قوی معلوم ہو اُس کو اپنا لیا جائے۔ اور وقت کا حاکم چونکہ چنا ہوا ہوتا ہے، سمجھدار قسم کا ہوتا ہے، تو سب کی باتیں سن لینے کے بعد اور دلائل دیکھ لینے کے بعد پھر آخری فیصلہ اُس کی رائے پر ہے، اس لئے فرمایا فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ، اور اِس عزم کے اندر یہ ضروری نہیں کہ جو مشورہ دینے والے زیادہ ہیں یا تھوڑے ہیں اِن میں سے کسی کی رائے کو ضرور لیا جائے، بلکہ سب کی بات سن لینے کے بعد اگر انسان حکمت محسوس کرتا ہے کہ یہ رائے اگرچہ قلیل کی ہے لیکن دلیل کے اعتبار سے قوی ہے اور اس کا اختیار کرنا درست ہے تو حاکم وقت کو وہ بھی اختیار کرنی جائز ہے، اکثریت کی اتباع کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، دلیل کی قوت دیکھی جائے، اس لئے سرورِ کائنات ﷺ جتنا اعتماد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ پر کرتے تھے عام لوگوں پر اتنا نہیں کرتے تھے، اور جس بارے میں اِن دونوں کی رائے اکٹھی ہو جاتی تھی حضور ﷺ اُس کی مخالفت نہیں کرتے تھے، اسی کو اپنا لیتے تھے، حدیث شریف میں اِس قسم کے واقعات آتے ہیں۔ شخصی معاملات میں بھی اسی طرح ہے، مثال کے طور پر آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں، تو کسی سمجھدار سے پوچھو کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں اِس میں نفع ہے یا نقصان ہے؟ کروں تو کیسے کروں؟ اور عام معاملات میں بھی اِس کی ترغیب دی گئی ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تمہارے امراء تم میں سے بہتر لوگ ہوں، اور تمہارے مالدار تم میں سے سخی لوگ ہوں، اور تمہارے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوں تو ایسے وقت میں زندگی موت سے بہتر ہے، اور جب تمہارے اُمراء تم میں سے بدتر ہو جائیں اور تمہارا مالدار طبقہ بخیل ہو جائے، اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں، کہ جیسے بیوی نے کہنا ہے ویسے ہی کرنا ہے، کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں، یہ شہوت پرستی کا دور ہوگا کہ عورتیں غالب

آجائیں گی اور انسان اُن کے سامنے اپنے معاملات ڈھیر ہی کردیں گے کہ جس طرح یہ چاہیں کریں، انسان اپنی رائے کو چھوڑ بیٹھے، جب معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو فرمایا کہ ایسے وقت میں موت زندگی سے بہتر ہے۔(۱)

اور مشورے کا اصول یہی ہے کہ جو کام پیش آجائے اُس کے متعلق سمجھدار لوگوں سے پوچھا جائے، اور پھر جس سے مشورہ لیا جائے اُس کو بھی تاکید ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ"(۲) جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین سمجھا ہوا ہوتا ہے، اس لئے جو دل میں صحیح بات آئے وہی بتانی چاہیے، اور اگر دل میں تو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام یوں کرو تو بہتر ہے، لیکن آپ اُس کو ویسے نہیں بتاتے بلکہ کوئی دوسرا راستہ دکھادیتے ہیں تو یہ خیانت ہے، آپ سے اگر کوئی شخص پوچھنے کے لئے آگیا کہ میں یہ کام کیسے کروں، تو اُس کو سننے کے بعد جو رائے آپ کے دل میں صحیح طور پر آئی، یہ اس پوچھنے والی کی امانت ہے جو آپ کو ادا کرنی چاہیے، اگر آپ اُس کو بات ویسے نہیں بتائیں گے جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں، بلکہ اس میں کوئی گڑبڑ کردیں گے اور اس کی بجائے کوئی اور بات کردیں گے تو یہ خیانت ہے، اس لیے مستشار کو بھی پابند کردیا گیا کہ امانتداری کا احساس رکھے، جو دل میں صحیح بات آئے وہی بتائے، اس طرح سے معاملات میں خیر و برکت ہوتی ہے جب انسان آپس میں مشورہ کرکے چلتا ہے۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: پس جس وقت آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر اعتماد کیا کریں، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

"اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں، اور اگر اللہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو کون ہے جو اللہ کے علاوہ تمہاری مدد کرے گا" یعنی فتح کا اصل مدار نصرتِ الٰہیہ پر ہے، اس لیے ایسے اسباب حاصل کرنے کی کوشش کرو جن کی بناء پر اللہ کی نصرت تمہیں حاصل ہو، اور ایسی باتوں سے بچو جن کی بناء پر اللہ کی نصرت ختم ہوجائے "اور اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔"

"وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ" کا مفہوم و مصداق

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ: اگر تو اِس کو مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کے ساتھ لگایا جائے تو تفاسیر میں ایک روایت لکھی ہے کہ بدر کے مالِ غنیمت میں ایک چادر یا کوئی تلوار گم ہوگئی تھی، جس کے متعلق بعض لوگوں نے کہہ دیا کہ شاید حضور ﷺ نے رکھ لی ہو، اب یہ بات اُن کی زبان سے جو نکلی اگرچہ کوئی ایسی اہم نہیں ہے، حضور ﷺ اگر رکھ بھی لیں تو کوئی ایسی بات نہیں، لیکن مالی معاملات میں اس قسم کے خیالات کا لوگوں کے دل میں آجانا کسی درجے میں عظمت کے منافی ہے، اور اگر یہ بات لوگوں کے دل میں جگہ پکڑ جائے کہ حضور ﷺ مال میں سے اس طرح سے رکھ لیتے ہیں اور ہمیں بتاتے نہیں ہیں، تو کسی وقت بھی دل میں شیطان وسوسہ ڈال کر انسان کو حضور ﷺ سے دُور ہٹا سکتا ہے اور بداعتمادی کی فضاء پیدا ہوسکتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "نبی کی شان نہیں کہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے۔" اس تفسیر کے مطابق یہ آیت بدر سے متعلق ہے، اُحد سے متعلق نہیں، لیکن بدر والی بات کو غزوۂ اُحد

(۱) ترمذی ۲/ ۵۲، باب ان رؤیا المؤمن سے پہلے/مشکوٰۃ ۲/ ۴۵۹، باب تغیر الناس۔

(۲) ترمذی ۲/ ۱۰۹، باب ان المستشار/مشکوٰۃ ۲/ ۴۳۰، باب الحذر۔

کے واقعات کے اندر اس لیے رکھ دیا گیا کہ چونکہ اِس میں بھی نبی کی شخصیت نمایاں کرنی مقصود ہے کہ نبی مخلص ہوتا ہے، نبی خائن نہیں ہوتا، تو اِس موقع محل کے مطابق پھر بھی اشارہ اِسی بات کی طرف کرنا مقصود ہوگا۔ بہر حال مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کا مسئلہ ہو تو پھر یہ غزوۂ اُحد سے متعلق نہیں ہے، غزوۂ بدر سے متعلق ہے، لیکن اس کا موقع محل جیسے میں نے واضح کر دیا کہ اصل میں حضور ﷺ کی شخصیت کے متعلق اعتماد دلانا ہے کہ نبی خائن نہیں ہوتا، نہ مالِ غنیمت میں خیانت کرتا ہے اور نہ دوسرے معاملات میں اپنی قوم کے ساتھ خیانت کرتا ہے، کہ اُس کے دل میں خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات نہ ہوں، بلکہ اپنی ضد اور اپنے جذبات میں آ کر قوم کی قربانی دے دے اور اُن کے مفاد کا خیال نہ رکھے، ایسی بات نہیں، نبی مخلص ہوتا ہے، خیر خواہ ہوتا ہے، نبی کی شان نہیں کہ اس کے دل میں کوئی بدخواہی ہو، منافقین اس قسم کی باتیں مشہور کر کے حضور ﷺ پر اعتماد کو جو مجروح کرنا چاہتے تھے تو یہاں اُس کی صفائی دینی مقصود ہے۔ تو پھر یہ لفظ عام ہو جائے گا کہ نبی نہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے، نہ عام مال میں خیانت کرے، اور نہ ظاہر کے خلاف اپنے دل میں کوئی بات چھپا کے رکھے۔ اور مخلصین کو اِس بات کی طرف اشارہ ہو جائے گا کہ جب حضور ﷺ نے زبان سے معاف کر دیا تو سمجھو کہ دل سے بھی معاف کر دیا، یہ نہیں کہ غصے کو چھپا کر رکھیں، ایسا نہیں ہو سکتا، بلکہ دل سے بھی معاف کر دیا۔ اور منافقین جو کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلص نہیں ہیں اور ہمیں قومی طور پر نقصان پہنچا رہے ہیں، ہماری بات مانتے نہیں اور ہمارے بھائیوں کو قتل کروا کے رکھ دیا، اُن کو بھی تنبیہ کی جا رہی ہے کہ نبی مخلص ہوتا ہے، جو کچھ کرتا ہے قوم کی خیر خواہی کے لئے کرتا ہے، نبی کے متعلق اس قسم کے جذبات رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ چونکہ مالِ غنیمت غزوۂ احد میں نہیں تھا، اس لیے اگر اِس آیت کو مالِ غنیمت کے ساتھ لگائیں گے تو پھر یہ آیت بدر سے متعلق ہے، اُحد سے متعلق نہیں ہے، لیکن اِس کو اُحد کے معاملات میں رکھا جا رہا ہے حضور ﷺ کی ذات پر اعتماد دلانے کے لیے۔ ''کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو بھی خیانت کرے گا وہ اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا'' یعنی اُس کی خیانت سب کے سامنے نمایاں ہوگی، اور اُس میں پھر قیامت کے دن رسوائی ہوگی، اور یہ نبی کے متعلق کیسے سوچا جا سکتا ہے۔ ''پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اس نے کیا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ کیا پھر جو شخص اللہ کی رضا کا متبع ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟ جو اللہ کی ناراضگی کا مستحق ہو، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے'' نبی کے متعلق ایسی بات کیسے کی جا سکتی ہے جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو جائے۔ ''یہ لوگ مختلف درجوں والے ہیں اللہ کے نزدیک، اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

آگے پھر حضور ﷺ کی شخصیت کو نمایاں کیا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے جو تم پر ہوا، اس لئے جو لوگ ایمان لانے والے ہیں وہ تو اِس احسان کی قدر کریں، کلمہ پڑھنے والوں کو چاہیے کہ اِس نبی کو اللہ کا بہت بڑا احسان سمجھیں، کہ جو تم میں سے ہی ہے، اور اس نے آ کر تمہیں کس طرح ہدایت کا راستہ دکھایا اور کس طرح گمراہی سے نکالا، یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے، ''احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر جب اٹھایا اِن کے اندر ایک رسول انہی میں سے ہی'' یعنی جن سے مناسبت ہے، جن کے خاندان کو جانتے ہیں، قوم قبیلے کو جانتے ہیں، اور اپنی جنس میں سے ہے، جس سے مؤانست ہے، اٹھنا بیٹھنا ہے، ''پڑھتا ہے ان پر اللہ کی

آیات اور انہیں سنوارتا ہے اور ان کو تعلیم کتاب وحکمت کرتا ہے" یہ آیت پہلے دوفعہ گزر چکی ہے۔ "اور بے شک یہ لوگ تھے اس نبی کے آنے سے قبل صریح گمراہی میں۔"

سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝

اَوَلَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ

جب تمہیں مصیبت پہنچی، اُس سے دوگنی مصیبت تم پہنچا چکے، کیا تم کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آگئی، آپ کہہ دیجیے

هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝۱۶۵ وَمَاۤ

کہ یہ تمہارے اپنے نفسوں کی طرف سے ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۝۱۶۵ جو مصیبت

اَصَابَكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِيَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ ۝۱۶۶

تمہیں پہنچی جس دن دو جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی پس وہ اللہ کے حکم کے ساتھ ہے تا کہ جان لے اللہ تعالیٰ مؤمنین کو ۝۱۶۶

وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا ۚۖ وَقِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ

اور تا کہ جان لے اُن لوگوں کو جنہوں نے نفاق اختیار کیا، اور اُنہیں کہا گیا کہ آؤ، لڑو اللہ کے راستے میں

اللّٰهِ اَوِ ادۡفَعُوۡا ؕ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ

یا دشمن کو دفع کرو، وہ کہنے لگے کہ اگر ہم قتال جانتے تو تمہاری اتباع کرتے، یہ لوگ کفر کی طرف

يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ

زیادہ قریب ہو گئے اُس دن بمقابلہ اُن کے ایمان کی طرف، کہتے ہیں اپنے مونہوں سے وہ بات جو نہیں ہے

فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يَكۡتُمُوۡنَ ۚ ۝۱۶۷ اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ

اُن کے دلوں میں، اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان باتوں کو جو یہ چھپاتے ہیں ۝۱۶۷ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا

وَقَعَدُوۡا لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِكُمُ

اور خود بیٹھ رہے کہ اگر یہ ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کیے جاتے، انہیں کہو کہ تم دور ہٹاؤ اپنے نفسوں سے

الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ

موت کو اگر تم سچے ہو ﴿۱۶۸﴾ ہرگز نہ گمان کر تو اُن لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل

سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ

کیے گئے مرے ہوئے، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں ﴿۱۶۹﴾ خوش ہونے والے ہیں

بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ

اُس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اُن کو دے دی اپنے فضل سے اور خوش ہوتے ہیں اُن لوگوں کے سبب سے جو ان کے ساتھ ملے نہیں

مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ

ان کے پیچھے سے، کہ نہ اُن پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہیں ﴿۱۷۰﴾ اللہ کی نعمت اور فضل

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

کے ساتھ خوش ہوتے ہیں، اور اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ﴿۱۷۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا...... لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ: جب تمہیں مصیبت پہنچی، قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا: اُس سے دوگنا مصیبت تم پہنچا چکے، قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا: شروع میں جو ہمزہ استفہام آیا ہے اِس کا تعلق اِس قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا کے ساتھ ہے، کیا تم کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آ گئی؟ یہ تکلیف ہمیں کیونکر پہنچ گئی؟" کیا جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچی، تم اُس سے دوگنی پہنچا چکے، تم یہ کہتے ہو؟ کہ یہ کہاں سے آ گئی؟" مِنْ اَيْنَ هٰذَا؟ یہ چیز، یہ حال ہمیں کہاں سے پہنچ گیا؟ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ: آپ کہہ دیجیے کہ یہ تمہارے اپنے نفسوں کی طرف سے ہے، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ: جو مصیبت تمہیں پہنچی جس دن کہ دو جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی۔ اِلْتِقَاء: ملنا، لیکن یہاں ملنا بطور عداوت کے ہے، جس کو ہمارے محاورے میں ٹکرانا کہتے ہیں، اور جمعان سے مراد مؤمنین کی جماعت اور مشرکین کی جماعت ہے۔ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا: وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا اور خود بیٹھ رہے، لَوْ اَطَاعُوْنَا: اگر یہ ہمارا کہنا مانتے مَا قُتِلُوْا: تو یہ قتل نہ ہوتے، یہ قتل نہ کیے جاتے۔ قُلْ: آپ کہہ دیجیے فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ: دَرَءَ يَدْرَءُ: دفع کرنا، دُور ہٹانا، اُنہیں کہو کہ تم دُور ہٹاؤ اپنے نفسوں سے موت کو، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا: ہرگز نہ گمان کر تو اُن لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے اَمْوَاتًا: مرے ہوئے، الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ

سَبِيْلِ اللهِ یہ مفعول اول ہے لَا تَحْسَبَنَّ کا، اور اَمْوَاتًا مفعولِ ثانی ہے، اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے لوگوں کو تو اَموات گمان نہ کر، بَلْ اَحْيَآءٌ: بَلْ هُمْ اَحْيَاءٌ، بلکہ وہ زندہ ہیں، عِنْدَ رَبِّهِمْ: اپنے رَبّ کے پاس یُرْزَقُوْنَ: رزق دیے جاتے ہیں، فَرِحِيْنَ: خوش ہونے والے ہیں، بِمَآ اٰتٰهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ: اُس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اُن کو دے دی اپنے فضل سے، وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ: اور خوش ہوتے ہیں اُن لوگوں کے سبب سے جو اِن کے ساتھ ملے نہیں اِن کے پیچھے سے، اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: خوش اِس بات پہ ہوتے ہیں کہ نہ اُن پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہیں، يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ وَفَضْلٍ: اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ خوش ہوتے ہیں، اور اِس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

اُحد میں شریک مخلصین کو کچھ تسلی اور کچھ تنبیہ

اِن آیات کا تعلق بھی غزوۂ اُحد کے حالات سے ہی ہے، پہلی آیت میں تو اہلِ ایمان کے لئے ایک قسم کی تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی، مختلف انداز کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل سے اللہ تعالیٰ نے اِس غم کو ہلکا کیا ہے، اور جو اُن سے لغزش ہوئی تھی اُس کے بارے میں بار بار متنبہ کیا ہے تاکہ آئندہ اس معاملے میں احتیاط برتی جائے، تو یہ جو دلوں میں خیال آتا تھا کہ ہم اہلِ ایمان ہیں، اللہ کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں، اللہ کے دین کے سپاہی ہیں، پھر یہ شکست کیوں ہوگئی؟ ہونی نہیں چاہیے تھی، اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ نصرت کا وعدہ تھا، پھر کیا وجہ ہوگئی کہ ہم شکست کھا گئے؟ دلوں کے اندر اِس قسم کے خیالات بھی اُبھرتے تھے، اِس آیت میں اُسی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ یوں کیوں سوچتے ہو، اگر تمہیں اِس میدان میں تکلیف پہنچ گئی تو کیا ہوگیا، اِس سے پہلے تم اپنے فریقِ مخالف کو دگنی تکلیف پہنچا چکے ہو، جیسے بدر میں اُن کے ستر آدمی مارے گئے تھے اور ستر گرفتار ہوئے تھے، اور یہاں تمہارے اگر ستر مارے گئے تو کم از کم گرفتار تو کوئی نہیں ہوا، اور پھر اِس لڑائی میں بھی اُن کو بہت تکلیف پہنچی، جیسے آیت آئی تھی اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ: کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشرکین میں سے بہت سے آدمیوں کو قتل کیا، جب تم اُن کو دوگنی تکلیف پہنچا چکے ہو تو اِس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ باقی اگر یہ پوچھتے ہو کہ کیوں پہنچی؟ تو اِس کے پہنچنے کا منشا بھی تمہاری اپنی ذات کی طرف سے ہے، قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ میں وہی تنبیہ آگئی، کہ اگر اتنا ہی شوق ہے تمہیں یہ معلوم کرنے کا کہ مصیبت کدھر سے آگئی، تو یہ تمہاری اپنی طرف سے آئی ہے۔ اور اپنی طرف سے کیسے آئی ہے؟ وہ تفصیل آپ کے سامنے آچکی، کہ تم نے صبر وتقویٰ کے اندر خلل ڈالا، اور اُس خلل کی بناء پر اللہ کی نصرت بند ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، جس وقت وہ کسی کی مدد کرنا چاہے تو مدد کرنے پر بھی قادر ہے، اور جس وقت کسی سے مدد روکنا چاہے تو یہ بھی اُس کی قدرت میں ہے، تو اپنی ان باتوں پر غور کرو تاکہ آئندہ کے لئے پھر اس قسم کی لغزش کی نوبت نہ آئے۔ لیکن جو بھی پہنچ گئی اب اِس کو چھوڑو کہ کیوں پہنچی؟ اللہ تعالیٰ کی اِس میں حکمتیں تھیں، اللہ کی اجازت سے

ہوا جو کچھ ہوا، کتنا بڑا فائدہ ہوگیا کہ اس مصیبت کے آنے سے مؤمنین مخلصین اور منافقین علیحدہ علیحدہ ممتاز ہو گئے، اب اِن حکمتوں پر نظر رکھو، جب ان حکمتوں پر نظر رکھو گے تو تمہارا یہ صدمہ ہلکا ہو جائے گا، دلوں کی گہرائیوں میں جو چھپے ہوئے جذبات تھے یہ واقعہ پیش آنے کیساتھ وہ نمایاں ہو گئے، تو یوں اللہ تعالیٰ نے اُسی طرح حکمت کی طرف اشارہ کر دیا۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر منافقین کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا

آگے منافقین کے اُس کردار پر تبصرہ کیا ہے کہ دیکھو! ان کا نفاق کیسے کھل کر سامنے آیا، جس وقت عبداللہ بن اُبیّ اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس ہونے لگا تھا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے آ چکی ہے، اُس وقت لوگوں نے اُسے کہا تھا کہ آؤ اللہ کے راستے میں لڑو، اور اگر تم لڑنا نہیں چاہتے تو ساتھ شامل رہو، تاکہ تمہاری وجہ سے مسلمانوں کی تعداد زیادہ معلوم ہو، تو دشمن دفع ہوگا، تم دفاع ہی کرو۔ دفاع کرنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اتنا سوچ لو کہ اگر مشرکین غالب آ گئے، تو پھر وہ یہ نہیں امتیاز کریں گے کہ یہ مخلص ہے اور یہ مخلص نہیں ہے، یہ دل سے چاہتا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا، وہ پھر رگڑا سب کا نکالیں گے، تو اپنی جان و مال سے دشمن کو دُور ہٹاؤ، اگر اللہ کے راستے میں تمہیں لڑنے کا خیال نہیں ہے تو کم از کم اپنی جان مال سے ہی اُن کا دفاع کرو، کیونکہ اگر دشمن غالب آ جائے گا تو تمہیں بھی نقصان ساتھ ہی پہنچے گا، یہ نہیں کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا، اس لیے دشمن کی مدافعت کرو۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے ساتھ شامل رہ کر کثرتِ تعداد کی بناء پر دشمن کی مدافعت کرو، کہ دشمن پر اس بات کا رعب بیٹھے گا کہ یہ کتنے زیادہ ہیں، اس لیے وہ کچھ ڈرے گا، اور اُس کے حوصلے بلند نہیں ہوں گے۔ جب اُن کے سامنے اس قسم کی بات کہی گئی، یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لئے کہا گیا جس میں ایک ترغیب کا پہلو ہے، اور مدافعت کے لئے کہا گیا جس میں دفعِ مضرت کا پہلو ہے۔ تو انہوں نے آگے سے جواب یہ دیا کہ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ: اس کا مطلب دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، ایک مطلب تو یہ ہے کہ اگر ہمارے علم میں ہوتا کہ یہ قتال ہے تو ہم جاتے، لیکن یہ کوئی لڑائی نہیں ہے، ایک طرف ایک ہزار اور ایک طرف تین ہزار، ایک طرف اتنے اسلحہ کے ساتھ مسلّح لوگ اور دوسری طرف سے بے سروسامان، یہ کوئی لڑائی ہے؟ یہ تو اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے، ہم آنکھوں دیکھتے ہوئے ہلاکت میں کیسے چھلانگ لگا دیں؟ اگر یہ کوئی لڑائی ہوتی تو ہم جاتے، یہ لڑائی نہیں ہے، یہ تو اپنے آپ کو موت کے منہ میں دینے والی بات ہے، یوں کہہ کر وہ موقع پر طوطا چشمی کر گئے، لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ کا ایک مفہوم تو یہ ہے (مظہری)۔ اور اس کا دوسرا مفہوم یوں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کے سامنے تفصیل آئی تھی کہ حضور ﷺ نے اس موقع پر عبداللہ بن اُبیّ سے بھی مشورہ لیا تھا، کہ ہمیں شہر کے اندر رہتے ہوئے لڑنا چاہیے یا شہر سے باہر جا کر لڑنا چاہیے، عبداللہ بن اُبیّ کا مشورہ یہ تھا کہ باہر نہ نکلیں، گھروں میں رہیں، اور اپنے گھروں میں رہ کر دشمن کی مدافعت کریں، لیکن یہ مشورہ مانا نہ گیا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت اس طرف ہو گئی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے، اگر ہم گھروں میں چھپے رہے تو دشمن اِس کو ہماری بزدلی پر محمول کرے گا، سرورِ کائنات ﷺ نے اِسی شق کو اختیار فرمایا اور باہر نکلنے کا حکم دے دیا، تفصیل آپ کے سامنے آ چکی ہے، اب اُس کا دل تو اندر سے بیٹھتا جا رہا تھا، وہ اور اس کی پارٹی حضور ﷺ کی اعانت تو کرنا نہیں چاہتے تھے، اور وہ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان غلبہ پا جائیں، وہ تو کہتا تھا کہ

کوئی موقع ایسا آئے جس میں اِن کی پٹائی ہوجائے اور مدینہ اِن سے خالی ہوجائے، اور دوبارہ مجھے وہی سیادت قیادت حاصل ہوجائے جیسے کہ پہلے تجویز ہوچکی تھی۔ اب باہر تو وہ نکل گیا لیکن پھر یہ بہانہ کر کے واپس آگیا کہ تمہارے خیال کے مطابق ہمیں تو لڑنا آتا ہی نہیں، ہم تو جانتے ہی نہیں کہ لڑائی ہوتی کیا ہے، تمہارے ساتھ جانے کا کیا فائدہ، اگر ہم لڑنا جانتے، قتال اور مقاتلہ کے متعلق اگر ہمیں علم ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ چلے جاتے، تم نے تو ہماری رائے پر اعتماد نہیں کیا، جیسا کہ ہم اناڑی ہوں اور ہمیں پتہ ہی نہ ہو کہ لڑائی کیسے لڑی جاتی ہے، جب میرا مشورہ نہیں مانا گیا تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے انجان قرار دے دیا، کہ یہ لڑائی کے متعلق جانتا ہی کچھ نہیں، جب ہم لڑنا جانتے ہی نہیں تو ہمیں ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے (مظہری، عثمانی)، گویا کہ مشورہ نہ مانے جانے کی وجہ سے اس طرح اپنی ناراضگی کا اظہار کر کے لاتعلق ہو کر واپس آگیا، یعنی اگر تمہارا خیال ہمارے متعلق یہ ہوتا کہ ہم بھی کوئی لڑنا جانتے ہیں تو کم از کم ہماری تجویز مانتے، جب تم نے ہماری تجویز پر اعتماد نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے خیال کے مطابق ہم لڑنا جانتے ہی نہیں، جب ہم قتال کے متعلق جاہل ہیں اور ہمیں یہ طریقہ آتا ہی نہیں کہ کیسے لڑا جاتا ہے تو ہمیں تمہارے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے، اور اگر تمہارا خیال ہے کہ ہم لڑنا جانتے ہیں تو چاہیے تھا کہ ہماری تجویز مانتے، تو گویا کہ مشورہ نہ مانے جانے کو بہانہ بنا کر وہ شخص واپس آگیا، تو لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعۡنٰكُمۡ کا ایک یہ مفہوم بھی ہے۔

جب اُنہوں نے اس قسم کی باتیں کیں اور عین اس موقع پر طوطا چشمی کی تو آج یہ کُفر کی طرف زیادہ قریب ہوگئے بمقابلہ ایمان کے، کہ پہلے کچھ ایمان کی طرف قریب تھے کہ کم از کم کُفر کی باتیں زبان پر نہیں لاتے تھے چاہے دل کے اندر کُفر تھا، تو ظاہری طور پر یہ مؤمنوں کے قریب تھے، اور آج اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے تو کُفر کی طرف زیادہ قریب ہوگئے، ''زیادہ'' اس لئے کہہ دیا کہ جس وقت یہ مؤمنین کی حمایت کی بات کرتے تھے یا مؤمنین کے ساتھ اپنا تعلق جتلاتے تھے تو چونکہ وہ بات دل میں تو ہوتی نہیں تھی، جب انسان اپنے دل کے جذبات کے خلاف زبان سے بات کرتا ہے تو اُس بات میں زور نہیں ہوتا، اور جس وقت دل کے جذبات بھی ساتھ شامل ہوتے ہیں تو پھر وہ بات بڑی وزن دار ہوتی ہے، تو آج اِن کی باتیں زیادہ وزنی ہیں بمقابلہ اِس کے کہ جب وہ ایمان کے متعلق یا مؤمنین کے متعلق باتیں کرتے تھے تو اُن میں اتنا وزن نہیں ہوتا تھا کیونکہ دل کی آواز شامل نہیں تھی، تو یہ آج کھل کر کُفر کی طرف زیادہ قریب ہوگئے، اِتنا یہ ایمان کے قریب نہیں تھے جتنا کُفر کی طرف قریب چلے گئے، تو اِن باتوں نے ان کے نفاق کو ظاہر کر دیا اور دل کے چھپے ہوئے جذبات نمایاں ہوگئے۔

غزوۂ اُحد کے بعد منافقین کی سازش اور اُس کا جواب

پھر آگے اُن کے نفاق کی یہ بات نقل کی، جیسے پہلے بھی آچکا ہے، کہ خود تو جا کے گھروں میں بیٹھ گئے، میدان میں نہیں نکلے، اور جو مخلص صحابہ رضی اللہ عنہم میدان میں آئے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت شہید ہوگئے اُن کے متعلق بیٹھ کر اب یہ باتیں بناتے ہیں کہ دیکھا! ہماری بات نہیں مانی تھی آخر قتل ہوگئے، اگر ہماری بات مان لیتے، ہماری تجویز پر اعتماد کر لیتے، ہمارے مشورے کو قبول کر لیتے، اور ہمارے کہنے کے مطابق جنگ لڑتے تو یہ لوگ قتل نہ ہوتے اور یہ نقصان نہ ہوتا، یہ مضمون پہلے بھی تفصیل کے ساتھ

آپ کے سامنے آچکا ہے، اس طرح سے وہ مؤمنین مخلصین میں بددلی پھیلانا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہاں پھر یہی کہا کہ اِنہیں کہو کہ اگر تمہاری تجویزیں اتنی ہی پختہ ہیں تو تم اپنے آپ کو موت سے بچا کر دکھا دینا، جب اللہ کی طرف سے وقت مقدر آجائے گا، موت کا وقت آجائے گا، پھر تمہاری تجویزیں دھری کی دھری رہ جائیں گی، جب مرنا بہرصورت ہے، تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ اگر ہماری بات مانتے تو یہ نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے یہ نفاق کی بات ہے۔ اسی لئے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اِیَّاکُمْ وَاللَّو کہ لَوْلَوْ کہنے سے بچا کرو، کیونکہ یہ منافقین کا طریقہ ہے۔[1] واقعہ پیش آنے سے پہلے تو تدبیر کرو جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اُس کے مطابق، لیکن جس وقت واقعہ پیش آجائے تو پھر لَوْلَوْ نہ کیا کرو، کہ اگر ہم یوں کرتے تو ایسا ہو جاتا، اگر ہم یوں کرتے تو ایسا ہو جاتا، یہ منافقوں کا طریقہ ہے، واقعہ پیش آجانے کے بعد یہ کہا کرو کہ اللہ تعالیٰ کو یونہی منظور تھا، پھر لَوْلَوْ کرنا اچھی بات نہیں ہے، اب یہ کہنا کہ لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا اگر یہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، ہماری تجویز ایسی تھی کہ اگر اُس پر عمل ہوتا تو یہ لوگ بچ جاتے، اِس قسم کی باتیں نفاق کی علامت ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتماد کرتے ہوئے یوں کہنا چاہیے کہ ہم لاکھ جتن کر لیتے، ہونا اسی طرح تھا جیسے اللہ کو منظور تھا، اور اسی میں حکمت ہے جو پیش آگیا۔ تو یہ آخر میں اُن کی اِس بات پر تبصرہ کیا گیا۔

اور آگے جو بات آئی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اتنے جو ہاتھ مل رہے ہیں کہ یہ قتل کیوں ہو گئے، انہیں پتہ نہیں؟ کہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہوا اگر کوئی شخص قتل ہو جاتا ہے تو وہ حقیقت میں مردہ نہیں، وہ تو زندہ ہے، اگر تمہاری تجویز پر عمل کرتے اور گھروں میں بیٹھے رہتے تو موت سے تو نہ بچتے، البتہ اِس شرف سے محروم ہو جاتے، مرنا تو اپنے وقت پر ہے ہی، لیکن جب بہادری کے ساتھ اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے مریں گے تو ایسی صورت میں وہ موت موت نہیں، حقیقت کے اعتبار سے وہ حیات ہے، اگر اِن منافقین کی بات کو مان لیا جاتا تو اِس شرف سے محرومی ہو جاتی۔ اس لیے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے شہداء کی فضیلت، مقام اور مرتبہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا وہ نمایاں کیا ہے۔

اَوَلَمَّاۤ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ: کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچ گئی، اور تم اُس سے دوگنی پہنچا چکے، تو تم کہتے ہو کہ یہ کیونکر ہو گئی؟ یہ حال کہاں سے آگیا؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ تمہاری طرف سے ہی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ جو تکلیف تمہیں پہنچی جس دن کہ دو جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی، پس وہ اللہ کے اِذن اور اللہ کے حکم کے ساتھ ہے۔ تاکہ جان لے اللہ تعالیٰ مؤمنین کو (اِس کا مطلب کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا، یعنی ظاہری طور پر ممتاز کر لے) اور تاکہ جان لے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جنہوں نے نفاق اختیار کیا، اور اُنہیں کہا گیا کہ آؤ، لڑو اللہ کے راستے میں یا دشمن کو دفع کرو (اس کے دونوں مطلب آپ کی خدمت میں عرض کر دیے گئے) وہ کہنے لگے کہ اگر ہم قتال جانتے تو تمہاری اتباع کرتے، ہمیں تو نظر آرہا ہے کہ یہ قتال نہیں ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ہم تو لڑائی کے معاملے میں ویسے ہی جاہل ہیں، پھر ہمیں ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے، دونوں مطلب آپ کی خدمت میں

(۱) اِيَّاكُمْ وَلَوْ فَاِنَّهٗ مِنْ كَلَامِ الْمُنَافِقِيْنَ (روح البیان)۔ وَاِيَّاكَ وَاللَّوْ فَاِنَّ اللَّوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ (ابن ماجہ ص ۳۰۷)۔ نیز مسلم ۲/۳۳۸، باب القدر کا آخر۔

عرض کردیے گئے۔ یہ لوگ کفر کی طرف زیادہ قریب ہوگئے اُس دن بمقابلہ ان کے ایمان کی طرف۔ کہتے ہیں اپنے مونہوں سے وہ بات جونہیں ہے اُن کے دلوں میں، یعنی دلوں میں تو یہ ہے کہ کسی طرح یہ مسلمان مارکھائیں، اوراوپر سے باتیں اور قسم کی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُن باتوں کو جو یہ چھپاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا اور خود بیٹھ رہے، کہ اگر یہ ہمارا کہنا مان لیتے تو یہ قتل نہ کیے جاتے۔ آپ کہہ دیجئے کہ دور ہٹاؤ تم اپنے نفسوں سے موت کو اگر تم سچے ہو۔

عقیدۂ حیاتِ شہداء کی وضاحت

آگے شہداء کے متعلق بات آگئی، اِس مضمون کی آیت آپ کے سامنے پہلے سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے، وہاں لفظ آیا تھا: ''لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ'' اُس آیت پر بھی اِس آیت کا تذکرہ کردیا گیا تھا، کہ جہاں تک شہید کی موت کا تعلق ہے، تو مَاتَ الشَّهِيْدُ کہنا جائز ہے، اور شہید کو''میّت'' بھی کہا جاسکتا ہے، موت کا اطلاق اُس پر ہوتا ہے، جو موت انسان کے لئے مقدر ہے وہ شہید کو آتی ہے، اس لئے یہاں مطلب یہ ہے کہ دوسرے مُردوں کی طرح انہیں مردہ نہ کہو، اور دوسرے مُردوں کی طرح اُنہیں مُردہ نہ سمجھو، یہ نہیں کہ شہید میّت نہیں، شہید میّت ہے، اور مَاتَ الشَّهِيْدُ اُس پر صادق آتا ہے، بلکہ دوسرے مُردوں کی طرح نہ اُس کو مُردہ کہنا چاہیے اور نہ دوسرے مُردوں کی طرح اُس کو مُردہ سمجھنا چاہیے، یعنی تمہاری زبان پر بھی یہ بات نہ آئے اور تمہارے دلوں میں بھی یہ خیال نہ آئے، لَا تَحْسَبَنَّ کا مطلب یہ ہے کہ دلوں میں یہ خیال نہ آئے، کبھی تمہارے دل میں یہ گمان نہ آئے کہ یہ دوسرے مُردوں کی طرح یہ مرگیا، اور اسی طرح اپنی زبان کے ساتھ بھی یہ نہ کہو، بلکہ یہ لوگ زندہ ہیں۔

تو قرآنِ کریم کا ظاہر یہ ہے کہ شہداء کو جب بھی ذکر کیا جائے اَحیاء کے عنوان سے ذکر کیا جائے، اَموات کا عنوان زبان پر بھی اللہ کو پسند نہیں، اور اسی طرح اَموات کا گمان دل میں بھی اللہ کو پسند نہیں ہے، وہ زندہ ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان کی زندگی کیسی ہے؟ یہ اُس وقت بھی آپ کی خدمت میں کچھ عرض کیا تھا، کہ جہاں تک تو ارواح کا تعلق ہے، تو روح کافر کی بھی زندہ ہوتی ہے، روح کو فنا نہیں آتی، اللہ تعالیٰ نے ارواح کو پیدا کیا ہے، پیدا کرنے کے بعد اِن اجساد کے ساتھ جوڑا تو یہ دنیوی زندگی ہمیں حاصل ہوگئی، اور موت کا مطلب یہ ہے کہ اِس تعلق کو کاٹ دیا جائے گا، اور ہمارا یہ بدن بے حس اور بے حرکت ہوجائے گا، اور اللہ تعالیٰ روح کو یہاں سے نکال لے گا، یہ ہے موت۔ تو جہاں تک روح کی بات ہے وہ زندہ رہتی ہے، وہ موجود ہے، اُس پر فنا نہیں آیا کرتی۔ اور پھر قبر کے اندر برزخ میں جیسے کہ روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ مؤمنین صالحین کے لئے راحت، وہ بھی سب کے لئے ہے، چاہے شہید ہو چاہے شہید نہ ہو، جو بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغفور ہیں جو نیک لوگ ہیں اُن کو قبر میں راحت بھی پہنچتی ہے، اور جو کافر ہیں اور بدکردار ہیں اُن کو قبر میں عذاب بھی ہوتا ہے، یہ بھی ایک واقعہ ہے اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعی عقیدہ ہے جس کا انکار کُفر ہے۔ اِن سب سے بالاتر شہید کے کچھ حالات ایسے ہیں جو عام اَموات سے زائد ہیں، اِن کی روح کو اس طرح سے راحت ہے کہ باقیوں کو اس طرح سے نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن کو رزق دیا جاتا ہے، اور پھر اِن ارواح کا تعلق اپنے بدن کے ساتھ بھی باقی ارواح کے مقابلے میں ممتاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تعلق کا اثر اِس دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ شہید

کی لاش مٹی کے اندر خراب نہیں ہوتی، جیسے کہ صحیح روایات کے اندر شہدائے اُحد کے حالات بیان کئے گئے ہیں، تو وہ حیات کا ایک اثر ہے۔ باقی! اُس کی صحیح کیفیت کہ اُس حیات کی وجہ سے وہ دوسرے مُردوں سے کتنا ممتاز ہوگیا، یہ عالَم غیب سے تعلق رکھنے والی بات ہے جس سے ہم واقف نہیں ہو سکتے، اپنے شعور کے ساتھ اُس کو معلوم نہیں کر سکتے، آنکھوں سے دیکھیں گے تو ہمیں جیسے دوسرے مُردے معلوم ہوں گے ویسے ہی یہ معلوم ہوں گے، جو کیفیت اُن کی ہوگی وہی کیفیت ہمیں اِن کی معلوم ہوگی، شعور کا مطلب یہی ہے کہ ہم اپنے حواس کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتے، پھر ان کی صحیح کیفیت یا وحی کے ذریعے سے معلوم ہوسکتی ہے، یا فراستِ صحیحہ جو کہ وحی کی اتباع کی بناء پر اہلِ رُوحانیت کو حاصل ہوتی ہے اُن کے کشف کے ساتھ یہ کیفیات معلوم کی جاسکتی ہیں۔ بہرحال عام صالحین کے مقابلے میں بھی اِن کے کچھ ایسے حالات ہیں جن کی بناء پر ان پر میت کی بجائے حی کا اطلاق زیادہ انسب ہے، اِس سے زیادہ محتاط مسلک کوئی اور آپ کے سامنے ذکر نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات واضح ہے کہ اِن کی حیات کو ترجیح دینے کی کوشش کرنا اور زبان پر اِن کی حیات کے تذکرے قرآنِ کریم کے عنوان کے زیادہ مطابق ہیں بمقابلہ اِن کی موت کے تذکروں کے۔

عقیدۂ حیاتِ انبیاء علیہم السلام

اور یہاں جو شہداء کا ذکر ہے، انبیاء علیہم السلام کے متعلق اِسی قسم کے الفاظ حدیث شریف میں آئے ہوئے ہیں "اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ"[1] انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور وہاں نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اور جیسے معراج پر جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں موسیٰ علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔[2] اور اُس قبر سے یہی قبر مراد ہے جو زمین پر بنی ہوئی ہوتی ہے، عالمِ بالا مُراد نہیں، کیونکہ آپ اِسی قبر کے پاس سے ہی گزرے تھے، جیسے کہ فرمایا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو میں تمہیں موسیٰ علیہ السلام کی قبر دِکھاتا کہ ایک سرخ ٹیلے کے پہلو میں ہے، یعنی عام طور پر لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا پتہ نہیں، یہودیوں کو بھی معلوم نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہاں مدفون ہیں؟ کیونکہ یہودی اُس وقت وادئ تیہ کے اندر حیران پریشان پھر رہے تھے جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوا تھا، تو اُن کے دفن وغیرہ کی اُن کو کوئی معلومات نہیں کہ ان کو کہاں دفن کیا گیا تھا؟ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرماتے ہیں کہ اگر میں وہاں ہوتا تو تمہیں دِکھاتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر یہ ہے۔ تو جو کچھ اِن روایات کے اندر ذکر کر دیا گیا، رزق کا ملنا، نماز کا پڑھنا، اور خوش ہونا، جنت میں آنا جانا، پھر اِن کی ارواح کا عرش کے نیچے قندیلوں کے اُوپر بیٹھنا، اور بدن کے ساتھ ان کا بمقابلہ دوسرے اموات کے زیادہ تعلق، یہ چیزیں ہیں جن کو ہم اپنی زبان پر لا سکتے ہیں، باقی! اپنی عقل اور اپنے شعور کے ساتھ ہم اِس سے زائد باتیں معلوم نہیں کر سکتے، سب سے زیادہ انسب یہی ہے کہ جو باتیں صحیح روایات میں آگئیں اور جو عنوان قرآنِ کریم کے اندر اختیار کرلیا گیا بس اسی

(۱) مسند ابی یعلی ۶ / ۱۴۷، مسند انس۔ ثابت البنانی عن انس، رقم الحدیث: ۳۴۲۵ / نیز مسند بزار ۱۳ / ۲۹۹۔ وغیرہ۔

(۲) صحیح مسلم ۲ / ۲۶۸ باب من فضائل موسیٰ علیہ السلام / سنن نسائی ۱ / ۱۸۵، کتاب قیام اللیل، باب ذکر صلاۃ نبی اللہ موسیٰ علیہ السلام۔

پر اکتفاء کیا جائے، جیسے جیسے آپ باریکیوں میں پڑو گے تو چونکہ یہ عالم غیب کی چیز ہے جس کا آپ کو مشاہدہ نہیں کروایا جاسکتا، تو عالمِ غیب کی چیز ہونے کی وجہ سے اور مشاہدہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے پھر انسان مختلف قسم کے ذہنی اِشکالات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کر سکتے ہیں تو اولیاء اللہ کے کشف وغیرہ کی حکایات جو وہ قبور پر جا کر مراقبہ وغیرہ کر کے معلوم کرتے ہیں، اولیاء اللہ کے ساتھ عقیدت کی بناء پر کسی درجے میں اُن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ باتیں مدارِ ایمان نہیں ہیں، کیونکہ کشف کتنے ہی بڑے آدمی کا کیوں نہ ہو وہ قطعی نہیں ہوتا، اس لئے اگر اُس کو کوئی مانتا ہے تو ماننے کی بھی گنجائش ہے، اور اگر اُس کا کوئی انکار کرتا ہے تو اس سے بھی کوئی کُفر لازم نہیں آتا، یا پھر وہ عنوان اختیار کیا جاسکتا ہے جو صحیح روایات میں آ گیا، اور اِس سے زائد اپنی طرف سے کھینچا تانی کرنا مناسب نہیں ہوتا۔

انبیاء علیہم السلام پر بھی اموات کا اطلاق ٹھیک ہے، اُن کو بھی میّت کہہ سکتے ہیں، اِس پر بحث نہیں کہ موت آئی یا نہیں، موت یقیناً آئی ہے جس کو بھی آئی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ باقی انبیاء علیہم السلام اپنا وقت گزار کر اس دنیا سے موت کا مزہ چکھ گئے، لیکن موت کا وُرود کن کیفیات کے تحت ہوا؟ اور موت کا ورود ہو جانے کے بعد برزخ میں اُن پر کیا کیفیات طاری ہیں؟ یہ عقل کے ساتھ معلوم کرنے کی باتیں نہیں، بس جو الفاظ روایات میں آ گئے ہم اُن کو اُسی طرح ادا کریں گے، اور اُن کا حقیقی مصداق اور حقیقی حال اللہ کے سپرد کریں گے چونکہ عالمِ غیب کی بات ہے، یہ کیفیات یا وحی کے الفاظ سے کچھ نہ کچھ سمجھی جاسکتی ہیں، یا اصحابِ کشف کے کشف پر اعتماد کر کے اُن کے متعلق کچھ سوچا یا کہا جاسکتا ہے، اِس سے زائد اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اُن کی حیات کو معلوم کرنے کا۔

انبیاء علیہم السلام اور عام لوگوں کی نیند میں بھی فرق ہے

بسا اوقات ظاہری طور پر چیز ایک ہی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، مثلاً نیند ہے، نیند کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اخو الموت'' کہا، کہ یہ بھی موت کی بہن ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ ''اَيَنَامُ اَهْلُ الْجَنَّةِ؟'' جنت والے سوئیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اَلنَّوْمُ اَخُوا الْمَوْتِ وَلَا يَمُوْتُ اَهْلُ الْجَنَّةِ''(1) نیند تو موت کی بہن ہے (اُخ کا ترجمہ بہن کے ساتھ اس لیے کیا ہے کہ اُردو میں نیند کا لفظ مؤنث استعمال ہوتا ہے، اور عربی میں نوم مذکر ہے) فرمایا کہ نیند تو موت کی مثل ہے، ''وَلَا يَمُوْتُ اَهْلُ الْجَنَّةِ'' اور جنت کے اندر موت نہیں، جس کا مطلب یہ ہو گیا کہ جنت میں نیند بھی نہیں، اب نیند کی کیفیت تو ایک ہے: ''نَامَ زَيْدٌ'' بھی کہہ سکتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ''نَامَ'' کا اطلاق ہوگا، اور ''نَامَ الْاَنْبِيَاءُ'' بھی کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء بھی سو گئے، ''نَامَ النَّبِيُّ'' بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی سو گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سونے کا اطلاق ہوتا تھا، لیکن دونوں کی نیند میں زمین وآسمان کا فرق ہے، کہ ہم جس وقت سوتے ہیں تو بالکل غافل ہو جاتے ہیں، نہ دنیا کی خبر نہ آخرت کی، نہ عالمِ بالا سے تعلق نہ عالمِ سفلی سے، ہوا خارج کرتے ہیں، بُو پھیلاتے ہیں، ٹانگ کدھر کو جاتی ہے، بازو کدھر کو جاتا ہے، ہماری نیند کی

(1) مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۰، باب صفۃ الجنۃ کا آخر/ شعب الایمان ج ۶ ص ۳۰۹، رقم الحدیث: ۴۴۱۶۔

کیفیت تو یہ ہوتی ہے، کوئی پتہ ہی نہیں ہوتا۔ لیکن نومِ انبیاء اس قسم کی ہے جیسے حدیث میں ہے کہ ''تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ''[1] کہ نیند کا اثر میری آنکھوں تک ہوتا ہے، باقی! میرا دِل بیدار ہوتا ہے، دل کا تعلق عالم بالا کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی اُسی طرح قطعی ہے جیسے ظاہری وحی ہوتی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ سوئے ہوئے ہوتے تھے تو صحابہ کرام جگانے کی کوشش نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کے دل پر کوئی کیفیت وارد ہو رہی ہو اور ہم درمیان میں خواہ مخواہ خلل ڈال دیں، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کو سونے کی حالت میں بیدار نہیں کیا کرتے تھے صرف اسی وجہ سے کہ معلوم نہیں آپ کا دل کس حال میں ہے؟[2] تو ''تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ'' کے تحت جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نینداور ہماری نیند میں فرق ہے اسی طرح موت دونوں پر وارد ہوتی ہے، انبیاء علیہم السلام پر بھی وارد ہوتی ہے اور دوسروں پر بھی وارد ہوتی ہے، لیکن کیفیت کو ایک ٹھہرانا مناسب نہیں۔ اور مرنے کے بعد برزخ میں کیا کچھ اُن کو ملتا ہے؟ کن حالات میں وہ رہتے ہیں؟ تو جو الفاظ روایت کے اندر آگئے، ہم یونہی کہیں گے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہوتے ہیں، قبروں کے اندر نمازیں پڑھتے ہیں، اُن کو رزق ملتا ہے، بس یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کرسکتے ہیں، اور اُن کی موت ثابت کرنے کے مقابلے میں حیات ثابت کرنا قرآن اور حدیث کے ظاہر کے زیادہ مطابق ہے، لیکن اِس میں ہم اپنی طرف سے اٹکل کے طور پر کوئی بات نہیں کہہ سکتے، اجمال کے ساتھ ہم اتنا عقیدہ رکھ سکتے ہیں کہ شہداء سے بھی اِن کا درجہ فائق ہے، اور اِن کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں ممتاز حیات حاصل ہے، اور اس قسم کی حیات ہے جس قسم کی عام مؤمنین اور صالحین کو حاصل نہیں۔

اور جہاں تک صرف روح کے زندہ ہونے کی بات ہے تو صرف روح تو کافر کی بھی زندہ ہوتی ہے، اِس میں تو مؤمن ہونے کی بھی قید نہیں ہے، لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کی طاعات میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، اللہ کو یاد کرتے ہیں، حتیٰ کہ قبور کے اندر تلاوتِ قرآن تک کے واقعات احادیث میں آتے ہیں، مشکوٰۃ میں بھی ایک واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے کہیں خیمہ لگایا، اور وہاں کوئی قبر تھی، اُس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ قبر ہے، اچانک اُس کے کان میں آواز آنے لگ گئی کہ کوئی شخص زمین کے نیچے سورۂ تبارك الذی پڑھ رہا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کی آواز اس کے کان میں آئی، اُس نے آکر حضور ﷺ کے سامنے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورت مُنْجِیَہ ہے نجات دلانے والی، جو شخص اس کی پابندی کے ساتھ تلاوت کرتا رہتا ہے تو عذاب قبر سے یہ اس کو بچاتی ہے۔[3] بہرحال اِس قسم کے واقعات صالحین کے اور شہداء کے بہت کثرت کے ساتھ روایات میں بھی آئے ہوئے ہیں، اولیاء اللہ کے کشف کے ساتھ بھی معلوم ہیں، لیکن کشف مدارِ ایمان نہیں ہوتا، اگر کوئی تسلیم کرے تو اولیاء اللہ کے ساتھ عقیدت کے تحت اِس کی گنجائش ہے بشرطیکہ کسی ظاہری نص قطعی کے خلاف نہ ہو، اور اگر کوئی نہیں مانتا اور انکار کرتا ہے تو چونکہ یہ کوئی

(۱) بخاری ۱/ ۵۰۴ باب کان النبی تنام عینہ الخ۔ نیز ۱/ ۱۳۹۔ ۱/ ۲۶۹۔ مسلم ۱/ ۲۵۴۔ ولفظ الثلاثۃ الاخیرۃ: إِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِی.

(۲) بخاری ج ۱ ص ۴۹ باب الصعید الطیب۔ ولفظ الحدیث: وَکَانَ النَّبِیُّ ﷺ إِذَا نَامَ لَمْ یُوقَظْ حَتّٰی یَکُونَ هُوَ یَسْتَیْقِظُ لِأَنَّا لَا نَدْرِی مَا یَحْدُثُ لَہٗ فِی نَوْمِہٖ.

(۳) مشکوٰۃ ص ۱۸۸۔ ۱۸۹، کتاب فضائل القرآن فصل ثانی وثالث، عن ابن عباسؓ / ترمذی ۲/ ۱۱۷ باب ما جاء فی فضل سورۃ الملك.

مدارِ ایمان نہیں ہے اس لیے اِس سے کوئی کفر لازم نہیں آتا۔ بہر حال احتیاطی پہلو اس میں یہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ الفاظ اُسی قسم کے استعمال کرو جس قسم کے قرآن اور حدیث میں آئے ہوئے ہیں، باقی! موت کے ورود میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ''مات النبی'' بالکل صحیح ہے، ''مات الشھید'' بالکل صحیح ہے، انبیاء علیہم السلام کو اَموات حقیقت کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے، لیکن باقی مُردوں کی طرح نہیں، اِن کے امتیاز کو اِس طرح بحال رکھنا چاہیے کہ باقیوں کی موت موت ہے اور اِن کی موت حیات ہے، باقی! کیفیات متعین نہیں کی جا سکتیں، چونکہ یہ دوسرے عالم سے تعلق رکھتی ہیں، وحی کے ذریعے سے جو کچھ کہہ دیا جائے اُسی پر ہی اعتماد ضروری ہوتا ہے، اس سے زیادہ محتاط مسلک آپ کے سامنے کوئی نہیں رکھا جا سکتا۔

سوال:- حیات کے بارے میں جمہور صحابہ کا مسلک کیا ہے؟

جواب:- یہی ہے، اِس سے زیادہ روایات میں کوئی بات نہیں آتی، جو آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، سب روایات کا حاصل یہ ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا۔

سوال:- اگر حیات ہوتی تو پھر صحابہ کرام کے ساتھ جو واقعات خوشی کے اور کامیابی کے پیش آتے تھے تو کیا یہ آتا ہے کہ انہوں نے قبر پر جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا ہو؟

جواب:- اِس کا ذکر روایات میں نہیں ہے، میں نے تو پہلے ہی آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ جو کچھ روایات میں آیا ہوا ہے وہی کچھ ہی کہہ سکتا ہوں، چونکہ یہ دوسرے عالم کی بات ہے اور دوسرے عالم کی بات میں اُڑ نگے نہیں لگائے جا سکتے، میں تو اتنا محتاط ہوں، حقیقت ہے مجھے تو اپنے ایمان کی اتنی زیادہ فکر ہے۔

سوال:- جو کچھ صحابہ نے کیا وہ تو ہمارے لیے ایک ہدایت کی راہ ہے، تو کیا ان سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ سمجھ کے کوئی فعل یا کوئی قول کیا ہو؟

جواب:- ''زندہ سمجھ کے'' کا کیا مطلب؟

سوال:- یعنی یہ قول کیا ہو کہ آپ زندہ ہیں، اور خوش ہوتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، اور قبر پر جا کر واقعات سناتے۔

جواب:- تو صحابہ کرام کے بیان کرنے کے ساتھ کوئی زیادہ ثابت ہوتے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے پر آپ کو اعتماد نہیں ہے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء علیہم السلام کے متعلق بیان کر دیا تو حضور کے بیان کرنے کے بعد آپ کو کس چیز کی ضرورت رہ گئی؟ ہم تو کہیں گے کہ صحابہ کا عقیدہ ویسے ہی تھا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، جب صحابہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایتیں نقل کرتے ہیں کہ ''نبی اللہ حیّ یرزق'' ''الأنبیاء احیاء فی قبورھم یصلون'' یہ صحابہ ہی نقل کرنے والے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست تو مجھے نہیں بتایا، تو جب صحابہ یہ روایتیں نقل کرتے ہیں تو صحابہ کا عقیدہ بھی تو اس کے مطابق ہی ہوگا، اس میں کون سی شک کی بات ہے۔

سوال:- مسلم کی روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم معراج پہ گئے تھے، آپ ایک مکان میں جانے لگے تو جبریل نے کہا کہ

ابھی آپ نہیں جاسکتے ، جس وقت آپ دُنیا سے آئیں گے تو اس وقت آپ اس میں داخل ہوں گے"[1] اس کا مطلب تو صاف ہے کہ آپ وفات کے بعد اسی مکان میں گئے ہوں گے، اِس قبر میں کیسے چلے گئے؟ کچھ لوگ اس سے یوں استدلال کرتے ہیں۔

جواب:- رُوح کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ بدن کے اندر حیات کے اثرات ڈالنے کے لئے رُوح کا بدن کے اندر بند ہونا کوئی ضروری نہیں، رُوح اگر پرواز کرجائے، عرش کے نیچے قندیل پر بیٹھی ہو، یا جنّت کے کسی حصے میں پھر رہی ہو تو اس کے باوجود بھی اُس کا بدن کے ساتھ ایسا تعلق رہتا ہے جس کی بنا پر بدن کو اِحساس ہوتا ہے اَلَم کا بھی اور راحت کا بھی، عام مؤمنین کو بھی، اور شہداء کو اُس سے زیادہ، انبیاء علیہم السلام کو اُس سے زیادہ، یہ کسی کا قول نہیں ہے کہ روح کو بھی لازماً قبر میں بند کردیا جاتا ہے، اور یہ نکل کر کہیں جا ہی نہیں سکتی، بلکہ روح کہیں پھرتی رہے، جنّت میں پھرتی رہے، عرش کے نیچے پھرتی رہے، کہیں بھی پھرتی رہے، اُس کا تعلق بدن کے ساتھ بحال ہوتا ہے، اور اِس تعلق کے درجات ہیں، اور اُن درجات کی بنا پر بدن کے اُوپر حیات کے آثار طاری ہوتے ہیں، عام مؤمنین کے بدن پر بھی طاری ہوتے ہیں اور درجہ بدرجہ اسی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں، شہداء پر سب مؤمنوں کے مقابلے میں زیادہ، اور انبیاء علیہم السلام پر اِس سے بھی زیادہ۔ باقی جہاں تک سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کا تعلق ہے وہ کوئی جنّت سے کم نہیں ہے، اور وہاں جنّت میں مع الجسد جانا تو قیامت کے بعد ہوگا، اور اکیلی رُوح کا سیر وتفریح کے لئے چلے جانا یہ تو ایسے ہے جیسے آپ کی رُوح بھی کبھی کبھی مختلف جگہوں میں سیر کے لئے چلی جاتی ہے نیند کی حالت میں، جس کا ذکر خود قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے، اِس کے باوجود کہ آپ کی رُوح دُور دراز تک پھرتی رہتی ہے پھر بھی آپ کے بدن میں حیات باقی رہتی ہے، نیند کی حالت میں بھی قبضِ رُوح کا ذکر صراحتاً قرآنِ کریم میں ہے، تو کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو نیند کی حالت میں بدن سے نکلتی ہے اور وہ دُور دراز علاقوں میں سیر بھی کرتی پھرتی ہے، کھاتی پھرتی رہتی ہے، دوستوں سے ملتی رہتی ہے، سب کچھ کرتی ہے، لیکن تعلق بدن کے ساتھ بھی موجود ہوتا ہے۔ اس کی مثال اگر آپ کے سامنے واضح طور پر دی جاسکتی ہے تو میں اپنے الفاظ میں کیا ادا کروں، آپ سب جانتے ہیں، کہ لیٹے ہوئے تو آپ کمرے میں ہوتے ہیں، رُوح پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتی ہے، اور جو کچھ وہ رُوح کرتی ہے اُس کا اثر بدن پر صبح کو نمایاں ہوتا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ رُوح پر جو بھی حالات طاری ہوتے ہیں جہاں کہیں بھی ہو اُس کا تعلق بدن کے ساتھ بھی رہتا ہے۔ تو روح کو قبر کے اندر بند ماننا یہ کوئی ضروری نہیں، بدن سے نکل کر بھی جہاں کہیں پھرے لیکن اُس کا تعلق بحال ہوتا ہے۔

سوال:- ''حیات النبی'' کا مسئلہ ظنی ہے اور کشف بھی ظنی ہوتا ہے، لہٰذا کشف کو اُس کو تفصیل بنالینا چاہیے۔

جواب:- بات اس طرح سے نہیں، جہاں تک اِن کے اُوپر اَحیاء کا اطلاق ہے یہ قطعی ہے، البتہ اس کی کیفیات ظنی ہیں، اس لیے کیفیات اگر کشف کے ذریعے سے معلوم کی جائیں تو ہوسکتی ہیں، لیکن وہ ہوں گی ظن کے درجے میں جس کا انکار کفر نہیں ہے۔

---

(۱) یہ معراج کا نہیں بلکہ خواب کا واقعہ ہے، اور مسلم میں نہیں بلکہ بخاری میں ہے، ص ۱۸۵، کتاب الجنائز کا تقریباً آخر۔ ولفظہ: بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ الخ.

سوال:- حیات کا انکار کُفر ہے؟

جواب:- حیات کا انکار کُفر ہے، اگر کوئی کہے کہ شہداء زندہ ہی نہیں ہیں، یا کوئی کہے کہ انبیاء زندہ ہی نہیں ہیں، ان کے اوپر اَحیاء کا اطلاق نہیں ہوسکتا، اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو کافر ہے، لیکن ایسا احمق کوئی نہیں ہے دنیا میں، کہ قرآن تو دو جگہ کہے اَحْیَآءٌ: کہ وہ زندہ ہیں، اور دوسرا شخص مقابلے میں کہتا ہے کہ زندہ نہیں، اُس کے کُفر میں کیا شک ہے!

سوال:- ''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۝'' (الزمر: ۳۰) میں تو میّت کا لفظ بولا گیا ہے؟

جواب:- یہ بات تو اپنی جگہ صحیح ہے کہ میّت بھی ہیں، میں نے یہ بات پہلے کی ہے، بات کو اُلجھاؤ نہیں، میّت بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن میّت کہنے کے باوجود ''هُمْ اَحْيَآءٌ'' کہنا ضروری ہے، وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ شہید کو موت آتی ہے، لیکن وہ موت ایسی ہے کہ جو حیات ہے، اس لیے اگر کوئی شخص کہے کہ وہ اَحیاء ہیں ہی نہیں، اُن کے اوپر اَحیاء کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے، ایسا شخص قرآنِ کریم کی کم از کم دو آیتوں کا منکر ہے، اور دو آیتوں کا منکر ہونے کی بناء پر وہ کافر ہے، اور اُس کے کُفر میں کوئی شک نہیں ہے، ہاں البتہ جہاں تک موت اور حیات کے اجتماع کی بات ہے کہ اِدھر ''مَات'' بھی کہو اور اُدھر زِندہ بھی کہو، اِن کے اجتماع کی کیا صورت ہے؟ وہ کیا کیفیات ہیں جن کی بناء پر ان کو اَحیاء کہا جاتا ہے؟ اِس میں اختلاف کی گنجائش ہے، جو تفصیل روایات کے اندر آجائے گی ہم اس کو لیں گے، اٹکل کے ساتھ اس میں کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ تو کیفیات کے اندر تو اختلاف کیا جاسکتا ہے، باقی! اَحیاء کے اِطلاق کا اِنکار کُفر ہے، اس میں کوئی تاویل کی گنجائش نہیں ہے جبکہ دو آیتوں میں قرآنِ کریم نے ''بَل اَحیاء'' کا لفظ استعمال کیا، ''بلکہ وہ زندہ ہیں'' اس لیے اَحیاء کا اطلاق اُن کے اوپر ہوگا، روایاتِ صحیحہ کے تحت انبیاء ﷺ کے اوپر ''حَيّ'' کا اطلاق ہوگا، اَحیاء کا اطلاق ہوگا، اِس لفظ کا انکار کہ یہ اطلاق ہی جائز نہیں، اِن کو اَحیاء نہیں کہنا چاہیے، یہ کُفر ہے اور قرآنِ کریم کی صراحت کا انکار ہے۔ البتہ کیفیات میں اختلاف ہوسکتا ہے، کیفیات قطعی نہیں ہیں، روایات کی طرف دیکھ کر کوئی کیفیت سمجھ میں آجائے وہ کہی جاسکتی ہے، اصحابِ کشف اور اصحابِ ریاضت کے کشف پر اعتماد کر کے اُسی درجے میں بات کہی جاسکتی ہے جتنے درجے میں کشف دلیل ہے، اور اگر اُس کا کوئی انکار کرتا ہے تو یہ کُفر نہیں ہے۔ تو کیفیات میں اختلاف کی گنجائش ہے، اَحیاء کہنے میں تو اختلاف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب قرآنِ کریم میں صاف الفاظ میں دو دفعہ آگیا کہ اِن کو اَموات نہ کہو بلکہ زندہ ہیں، اِن کو اَموات نہ سمجھو بلکہ زندہ ہیں، اب ظاہری لفظ تو ایسے ہی ہیں، اگر اِن میں تاویل نہ کی جائے تو اِن کو اَموات کہنا بھی کُفر ہو جائے گا، لیکن چونکہ دوسری جگہ اِن کے اوپر اَموات کا اطلاق آیا ہوا ہے اس لیے دونوں آیتوں کو اکٹھا کر کے علماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ اِس کا مطلب ہے کہ باقی اموات کی طرح اَموات نہ سمجھو، اور باقی اموات کی طرح اموات نہ کہو۔ ورنہ اگر صرف انہی دو آیتوں کو دیکھا جائے تو اِن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اموات کہنا اور اموات سمجھنا یہ دونوں ہی قرآن کے خلاف ہیں، لیکن دوسری آیتوں کے ساتھ تطبیق دیتے ہوئے یہ بات کی گئی کہ جب ''اِنَّكَ مَيِّتٌ'' کا لفظ آگیا تو حضور ﷺ پر میّت کا اطلاق ہے، اسی طرح ''مَاتَ الشَّهِيد'' کہہ سکتے ہیں، شہید بھی اَموات کے تحت داخل ہے اِس میں کوئی شک نہیں، اس لیے دونوں آیتوں کو جوڑنے کے لئے کہہ دیا گیا کہ اَموات تو ہیں لیکن باقی

اَموات کی طرح نہیں، باقی اموات کی طرح اِن کو اموات نہ کہو اور باقی اموات کی طرح ان کو اموات نہ سمجھو، دونوں صورتوں میں ''بل اَحیاء'' کا اطلاق قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے، یہ تطبیق دینے کی ایک صورت ہے، ورنہ اگر اِس تطبیق کو چھوڑ دیا جائے اور قرآنِ کریم کی اِن آیات کے ظاہر کو لیا جائے تو اِن کو اموات کہنا بھی کُفر اور اِن کو اموات سمجھنا بھی کُفر۔ اور دُوسری جگہ چونکہ آیت ایسی آگئی (اور عقلمندی اور دیانت داری کا تقاضا یہ ہوا کرتا ہے سب دلائل کو سامنے رکھ کر مطلب نکالا جائے) تو اب ہم اُس آیت کو سامنے رکھ کے یوں کہیں گے کہ اموات تو ہیں لیکن عام اموات کی طرح نہیں، اس لیے اِن کے اوپر اموات کی بجائے اَحیاء کا اطلاق زیادہ مناسب ہے۔ تو ہم اس بات کا انکار نہیں کریں گے کہ ان کے اوپر موت نہیں آئی، یہ بات زیرِ بحث نہیں ہے، موت آئی ہے، لیکن اُس کی کیفیت ایسی ہے جس کو ہم متعین نہیں کر سکتے، بہر حال وہ موت کا ورود ایسے ہے کہ جس کے باوجود اِن کو احیاء کہا جائے گا، اور باقی اموات کے متعلق یہ بات نہیں ہے۔

''اَلْمُهَنَّدُ عَلَى الْمُفَنَّدِ'' کا تعارف

یہ میرے ہاتھ میں کتاب ہے ''اَلْمُهَنَّدُ عَلَى الْمُفَنَّدِ'' غالباً اِس کا تعارف میں نے آپ کو پہلے بھی کروایا ہوگا، کہ مولوی احمد رضا خان بریلوی ہمارے اکابر کی عبارات کو توڑ مروڑ کر حرمین شریفین لے گئے تھے، اور وہاں جا کر انہوں نے اُن عبارات پر حرمین شریفین کے علماء سے علمائے دیوبند کے خلاف کُفر کا فتویٰ حاصل کیا، اور وہ جو کچھ مجموعہ تیار کر کے لائے تھے اُس کو ''حسام الحرمین'' کے نام سے ہندوستان میں شائع کیا، ''حسام الحرمین'' کا معنی ہے: ''حرمین کی تلوار''، جس وقت ہندوستان میں اُس کی اشاعت ہوئی تو حضراتِ دیوبند کو اِس کا پتہ چلا، اُدھر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ اُس وقت مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اُن کو اِس بات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے وہاں سارے حالات کی تحقیق کر کے حالات لکھے اور وہاں کے علماء کو اس فتنہ پرداز کے فتنے سے متنبہ کیا، چنانچہ حضرت شیخ مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ کی کتاب جو ''الشهاب الثاقب'' کے نام سے معروف ہے، اور اس کا اصل نام ہے ''رجوم المذنبین علی رؤس الشیاطین'' وہ اُسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے، اور اس میں یہ سارے کے سارے حالات لکھے ہیں کہ یہ کیسے آئے اور کس طرح سے انہوں نے علمائے کرام سے فتاویٰ حاصل کیے۔ جب اہلِ حرمین کو اِس کا پتہ چلا کہ وہ جماعت تو ایسی نہیں ہے جس پر ہم نے کُفر کا فتویٰ دے دیا، تو پھر اُنہوں نے اپنے طور پر ۲۶ سوالات مرتب کر کے بھیجے تھے علمائے دیوبند کے عقائد کی تحقیق کے لئے، کہ علمائے دیوبند کے عقیدے کیا ہیں؟ جو اِشکالات اُن کے قلوب میں پیدا کیے گئے تھے وہ مرتب کیے، مرتب کرنے کے بعد وہ تحریر علمائے دیوبند کے پاس بھیجی، کہ اِن کے جوابات دیئے جائیں تا کہ ہمیں یہ پہچاننے کا موقع ملے کہ مسلک دیوبند رکھنے والے علماء کے کیا خیالات ہیں اور کیا عقائد ہیں؟ تو اِدھر سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ نے جواب لکھا تھا، جو حضرت مولانا شیخ محمد زکریا دامت برکاتہم کے اُستاذ ہیں، اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے خلیفہ ہیں، مظاہر العلوم سہارنپور میں اُن دنوں وہ صدر مدرّس تھے، جواب لکھنے کے بعد اُس وقت جتنے حضرات اکابر موجود تھے اُن سب کی خدمت میں یہ جوابات پیش کیے گئے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب

تھانوی ﷫، اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری ﷫ اُس وقت موجود تھے، یہ بڑے بڑے حضرات تھے، اور باقی بھی جتنے علماء تھے سب کی خدمت میں وہ جوابات پیش کئے گئے اور سب نے اُن کی تصدیق کی، اِس کتاب کے آخر میں اُن سب کے دستخط ہیں، تو گویا کہ یہ علمائے دیوبند کے عقیدے کی دستاویز ہے، پھر اِن دستخطوں کے ساتھ یہ تحریر عرب میں بھیجی گئی تو مدینہ منورہ کے علماء نے بھی اِس پر تصدیق لکھی تھی کہ یہ بالکل صحیح عقیدے ہیں، اور مکہ معظمہ کے علماء نے بھی اس پر تصدیق لکھی کہ یہ بالکل صحیح عقیدے ہیں، اور پھر یہ دستاویز شام، عراق اور مصر کے علماء کے سامنے پیش ہوئی اُنہوں نے بھی تصدیق کی، گویا کہ اِس پر تمام عالمِ اسلام کے علماء کے دستخط ہیں اور اُن کی مہریں بھی لگی ہوئی ہیں۔

عقیدۂ حیاتِ انبیاء ﷩ پر ''المهند'' کی عبارت کی وضاحت

جو سوالات آئے تھے اُن میں سے پانچواں سوال ہے: ''کیا فرماتے ہو جناب رسول اللہ ﷺ کی قبر میں حیات کے متعلق کہ کوئی خاص حیات آپ کو حاصل ہے یا عام مسلمانوں کی طرح برزخی حیات ہے؟''

جواب یہ دیا گیا: ''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، اور آپ کی حیات دُنیا کی سی ہے بلا مکلف ہونے کے، اور یہ حیات مخصوص ہے آنحضرت ﷺ اور تمام انبیاء ﷩ اور شہداء کے ساتھ، برزخی نہیں ہے جو حاصل ہے تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو۔ چنانچہ علامہ سیوطی ﷫ نے اپنے رسالہ ''إنباء الأذكياء بحياة الأنبياء'' میں بہ تصریح لکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علامہ تقی الدین سبکی ﷫ نے فرمایا ہے کہ انبیاء و شہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسی دُنیا میں تھی، اور موسیٰ ﷤ کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اِس کی دلیل ہے، کیونکہ نماز زِندہ جسم کو چاہتی ہے الخ۔ پس اِس سے ثابت ہوا کہ حضرت ﷺ کی حیات دُنیوی ہے، اور اِس معنی پر برزخی بھی ہے کہ عالمِ برزخ میں حاصل ہے، (یعنی اِس معنی پر کہ وہ زمانہ برزخ کا ہے، اُس حیات کو برزخی بھی قرار دیا جاسکتا ہے)۔ اور ہمارے شیخ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا اِس مبحث میں ایک مستقل رسالہ بھی ہے، نہایت دقیق اور انوکھے طرز کا بے مثل، جو طبع ہوکر لوگوں میں شائع ہو چکا ہے اس کا نام آبِ حیات ہے۔''

تو اِن الفاظ کے ساتھ گویا کہ علمائے دیوبند کے عقیدے کو واضح کیا گیا، اور اِس عقیدے پر تمام عالمِ اسلام کے علماء کے دستخط لئے گئے، اس لیے یہ عقیدہ جو اِن الفاظ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے یہی عقیدہ برحق ہے اور اسی کے مطابق ہی ہمیں اپنا عقیدہ رکھنا چاہیے، باقی! تعبیرات اور اس کے اندر کھود کرید کرنے کے بعد جو احتمالات نکلتے رہتے ہیں ان میں مختلف اشکالات بھی ہوسکتے ہیں، لیکن عقیدے کا عنوان یہی ہے جو اِن الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کیا گیا۔ مُھَنَّد کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انبیاء ﷩ کی حیات کو ''برزخی حیات'' بھی کہا جاسکتا ہے، لیکن اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ زمانہ برزخ کا ہے، اور ویسے حیاتِ دُنیوی ہے، دُنیوی حیات کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی اور دیگر انبیاء ﷩ کی اور شہداء کی یہ زندگی اِس ناسوتی بدن سے تعلق رکھتی ہے، بدن پر بھی حیات کے آثار ہوتے ہیں، اسی طرح اگر رزق کے اعتبار سے اور دیگر کمالات کے اعتبار سے اس کو رُوحانی حیات کہا جائے تو اس میں بھی گنجائش ہے، اس لئے نہ تو کسی عبارت میں حیاتِ رُوحانی دیکھ کر بدکنا چاہیے، اور اگر کسی عالم کی تحریر میں آجائے کہ یہ حیات

برزخی ہے تو اِس کو بھی محسوس نہیں کرنا چاہیے، اور اگر اِس کو حیاتِ دُنیوی قرار دیا گیا ہو تو اِس کی بھی گنجائش ہے، تینوں لفظ استعمال کیے جاسکتے ہیں، ''حیاتِ برزخی'' بھی، ''حیاتِ دُنیوی'' بھی، ''حیاتِ رُوحانی'' بھی، لیکن مدار اِس بات پر ہے کہ اِن کی حیات اتنی قوی ہوتی ہے کہ جس قسم کی زندگی دُنیا میں تھی، لیکن بغیر مکلّف ہونے کے، اس لئے ہم کہیں گے تو یہی کہ حیاتِ دُنیوی ہے لیکن اِس کو برزخی کہنے کی گنجائش ہے، کیونکہ موت سے لے کر قیامت تک کا جو زمانہ ہے یہ ''برزخ'' کہلاتا ہے، اور اِس زمانے میں چونکہ یہ حیات حاصل ہے اس لئے اس کو ''حیاتِ برزخی'' بھی کہہ سکتے ہیں، تو تینوں قسم کی حیات کا اطلاق ہوسکتا ہے، تو اگر کسی کلام میں ''حیاتِ برزخی'' کا لفظ آجائے جیسے حضرت تھانویؒ کی وعظوں میں بعض جگہ کلام ہے کہ وہ حضور ﷺ کی حیات کو برزخی قرار دیتے ہیں تو وہ اِس عقیدے کے خلاف نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ

وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور رسول کی بات کو قبول کر لیا بعد اس کے کہ اُن کو زخم پہنچا، اُن لوگوں کے لئے

اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ

جو نیکو کار ہیں ان میں سے اور متقی ہیں اجرِ عظیم ہے ﴿۱۷۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کو کہا لوگوں نے کہ بے شک لوگوں نے

قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ

جمع کیا ہے تمہارے لئے، پس تم ان سے ڈرو، اس بات نے بڑھادیا ان (صحابہ) کو از روئے ایمان کے، اور انہوں نے کہا ہمارے لئے اللہ کافی ہے، اور وہ اچھا

الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ

کارساز ہے ﴿۱۷۳﴾ پھر لوٹے یہ (صحابہ) اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ، اُنہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی،

وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ

اور انہوں نے پیروی کی اللہ کی رضا کی، اور اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم والا ہے ﴿۱۷۴﴾ بے شک یہ شیطان ہے

يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

ڈراتا ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں سے، اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان والے ہو ﴿۱۷۵﴾

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا

آپ کو غم میں نہ ڈالیں وہ لوگ جو بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں کفر میں، بے شک وہ ہرگز اللہ کو کوئی نقصان نہیں

اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ

پہنچا سکتے، اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ نہ کرے ان کے لئے کوئی حصہ آخرت میں، اور ان کے لئے

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ

بڑا عذاب ہے ﴿۱۷۶﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے اختیار کیا کفر کو ایمان کے بدلے یہ ہرگز

يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

نقصان نہیں پہنچائیں گے اللہ کو کچھ بھی، ان کے لئے درد ناک عذاب ہے ﴿۱۷۷﴾ ہرگز نہ سمجھیں وہ لوگ جنہوں نے

كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۗ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا

کفر کیا کہ ہمارا مہلت دینا اُن کو بہتر ہے اُن کے نفسوں کے لئے، سوائے اس کے نہیں کہ ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں، تاکہ وہ گناہوں

اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى

بڑھ جائیں، اور اُن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ﴿۱۷۸﴾ نہیں ہے اللہ کہ چھوڑ دے مؤمنوں کو اسی حالت پر

مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ

جس پر تم ہو جب تک کہ جدا نہ کر دے برے کو اچھے سے، اور نہیں ہے اللہ کہ

لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ

تمہیں مطلع کر دے غیب پر، لیکن اللہ تعالیٰ چنتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی اپنے رسولوں کو،

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر، اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لئے بڑا اجر ہے ﴿۱۷۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ: وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور رسول کی بات کو قبول کرلیا، اِسْتِجَابٌ: قبول کرنا، مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ: بعد اس کے کہ اُن کو زخم پہنچا، اُن کو زخم پہنچنے کے بعد، لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ: اُن لوگوں کے لئے جو نیکوکار ہیں ان میں سے اور متقی ہیں، لِلَّذِيْنَ خبر مقدم ہے اور اَجْرٌ عَظِيْمٌ مبتدا موخر ہے، اجر عظیم ہے اُن لوگوں کے لئے جو ان

میں سے نیکوکار اور متقی ہیں، جنہوں نے احسان اور تقویٰ کو اپنایا، اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ: یہ وہ لوگ ہیں جن کو کہا لوگوں نے اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ: کہ بیشک لوگوں نے جمع کیا ہے تمہارے لیے، جَمَعُوْا کا مفعول یہاں محذوف ہے، یعنی جمع کیا ہے تمہارے لیے سامانِ جنگ، اسلحہ، لشکر اکٹھے کیے ہیں، پہلے النَّاسُ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو مدینہ منورہ کی طرف آرہے تھے اور مشرکینِ مکہ نے اُن کو پروپیگنڈا کرنے پر مامور کیا، وہ وفدِ عبدالقیس کے لوگ تھے، اور اِنَّ النَّاسَ کے اندر ''ناس'' کا مصداق ہیں مشرکینِ مکہ، یعنی آنے والوں نے کہا کہ مشرکینِ مکہ نے تمہارے لیے بہت سارے لشکر اکٹھے کر لیے ہیں، فَاخْشَوْهُمْ: تو تم اُن سے ڈرو، فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا: اس بات نے بڑھا دیا ان صحابہ کو اَز روئے ایمان کے، وَّقَالُوْا: اور کہا صحابہ نے حَسْبُنَا اللّٰهُ: ہمارے لیے اللہ کافی ہے، وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ: اور وہ اچھا کارساز ہے، فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ: پھر لوٹے یہ صحابہ، یہ متقین، یہ محسنین، اللہ تعالیٰ کی نعمت کیساتھ اور فضل کے ساتھ، لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ: سُوْٓءٌ نکرہ تحت النفی ہے، اُنہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ: اور انہوں نے پیروی کی اللہ کی رضا کی، اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم والا ہے۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ: یہ آنے والا جس نے مدینہ منورہ میں آکر مشرکین کے حق میں پروپیگنڈا کیا تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مرعوب کرنے کے لئے ذٰلِكُمْ کا اشارہ ادھر ہے، بیشک یہ اِس قسم کی افواہ پھیلانے والا شیطان ہے يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ: يُخَوِّفُكُمْ اَوْلِيَآءَهٗ وہ اپنے دوستوں سے تمہیں ڈراتا ہے، اولیائے شیطان کا مصداق مشرکینِ مکہ ہیں، ڈراتا ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں سے، فَلَا تَخَافُوْهُمْ: اُن سے مت ڈرو، وَخَافُوْنِ: وَخَافُوْنِيْ اور مجھ سے ڈرتے رہو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان والے ہو۔ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ: كَ میں خطاب حضور ﷺ کو ہے، آپ کو غم میں نہ ڈالیں وہ لوگ جو بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں کفر میں، مسارعۃ: جلدی جلدی دوڑنا، ایک دوسرے سے آگے نکلنا، جو دوڑتے ہیں کفر میں، دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں کفر میں، اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا: بیشک وہ ہرگز اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی اللہ کے دین کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، حزب اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، رسول اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ کے دین کو، اللہ کی جماعت کو، اللہ کے رسول کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ: اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ نہ کرے اِن کے لئے کوئی حصہ آخرت میں، وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور اِن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے اختیار کیا کفر کو ایمان کو چھوڑ کر، ایمان کے بدلے جنہوں نے کفر لیا، یعنی ایمان چھوڑ کر کفر لے لیا، لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا: ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے یہ اللہ کو کچھ بھی، اِن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا یہ لَا يَحْسَبَنَّ کا فاعل ہے، ہرگز نہ سمجھیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ بیشک ہمارا مہلت دینا اُن کو بہتر ہے اُن کے نفسوں کے لئے، یہ خیال نہ کریں، اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا: سوائے اِس کے نہیں کہ ہم اُنہیں ڈھیل دیتے ہیں تاکہ وہ گناہوں میں بڑھ جائیں وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: اور اُن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ: نہیں ہے کہ اللہ چھوڑ دے مؤمنوں کو عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ: اُسی حالت پر جس پر تم ہو، یعنی آپس میں اِسی طرح تمہیں خلط ملط رہنے دے اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا نہیں ہے اللہ کہ چھوڑ دے مؤمنین کو اُسی حال پر جس پر تم ہو، حَتّٰى يَمِيْزَ: جب تک کہ جدا نہ کر دے خبیث کو طیب سے۔ حتیٰ کس چیز کی غایت ہے؟ اِس کا مُغَيّٰا

محذوف نکالا جائے گا، اللہ تعالیٰ تمہیں امتحان میں ڈالتا رہے گا، تم پر مصائب ڈالتا رہے گا، ایسے شدید واقعات تمہارے اوپر آتے رہیں گے حتیٰ کہ جدا کر دے اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے، اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اسی حال پر چھوڑ نا نہیں چاہتا جس حال پر تم ہو، کہ اچھے اور برے سارے خلط ملط رہیں، پتہ نہ چلے کہ مخلص کون ہے اور منافق کون ہے، اللہ تعالیٰ تم پر یہ حادثات ڈالتا رہے گا، یہ مشکلات پیش آتی رہیں گی، تمہیں امتحان کی بھٹی میں چڑھاتا رہے گا حتی کہ جدا کر دے خبیث کو طیب سے، وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ: اور نہیں ہے اللہ کہ تمہیں مطلع کر دے غیب پر، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: لیکن اللہ تعالیٰ چنتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی اپنے رسولوں کو، مِنْ رُّسُلِهٖ میں مِن بیانیہ ہے، جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے یعنی اپنے رسولوں کو، ویسے ترجمہ کریں گے کہ ''اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے غیب کی اطلاع دینے کے لئے'' اس ترجمے میں چونکہ بظاہر تبعیض کا شبہ پڑتا ہے، کہ بعض رسولوں کو چنتا ہے غیب کی اطلاع دینے کے لئے، یہ ترجمہ خلافِ مقصود ہے، رسول جتنے بھی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو غیب کی اطلاع دیتا ہے، اس لیے مِنْ رُّسُلِهٖ بیان ہے، ''اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی اپنے رسولوں کو غیب کی اطلاع دینے کے لئے''، فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ: پس تم ایمان لاؤ اللہ پر، وَرُسُلِهٖ: اور اُس کے رسولوں پر، وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا: اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے، فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ: تو تمہارے لیے اَجرِ عظیم ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

غزوہ حمراء الاسد کا ذِکر

اِس رکوع کی ابتدائی آیات غزوہ حمراء الاسد سے تعلق رکھتی ہیں جس کا ذکر اُحد کے ضمن میں آپ کے سامنے کیا گیا تھا، کہ ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر واپس تو لوٹ گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا منہ پھیر دیا، جب وہ مدینہ منورہ سے باہر مقامِ روحاء پر پہنچا تو وہاں جا کر اُن کو یہ خیال آیا کہ ہم نے تو غلطی کر لی کہ ہم اتنی جلدی واپس آ گئے، اب تو وہ شکست کھا گئے تھے، ہمیں چاہیے تھا کہ اُن کا بالکل صفایا کر دیتے، مدینہ منورہ پر چڑھائی کرتے اور اُس کو اُجاڑ دیتے، اور یہ زخمی جو بھاگے ہوئے تھے ہم اُن کا پیچھا کرتے تاکہ ہمیشہ کے لئے یہ جماعت ختم ہو جاتی، ایسی حالت میں اُن کو چھوڑ آنا ہماری عقلمندی نہیں، یہ خیال اُن کو مدینہ منورہ سے کچھ دُور جا کر آیا، سرورِ کائنات ﷺ کو وحی کے ذریعے سے اطلاع ہو گئی کہ مشرکین دوبارہ واپس آنے کے لئے کچھ سوچ رہے ہیں، تو آپ نے مدینہ منورہ میں اعلان فرما دیا کہ مشرکینِ مکہ کا پیچھا کرنا ہے، تیار ہو جاؤ، اور میرے ساتھ اُنہی لوگوں کو چلنے کی اجازت ہے جو کل اُحد کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے، یہ اعلان اس لئے فرمایا کہ اِس واقعہ کے بعد منافقین، مخلصین سے جدا ہو گئے تھے، اور اَب اُحد کے میدان میں شریک رہنے والے اور زخم اُٹھانے والے سارے کے سارے مخلصین تھے جن میں نفاق کا کوئی شبہ نہیں تھا، تو آپ یہ چاہتے تھے کہ اب مشرکینِ مکہ کا جو ہم نے پیچھا کرنا ہے تو سارے مخلصین ہی ساتھ ہوں، اِن کے اندر دوبارہ کوئی ایسے لوگ نہ

شامل ہوجائیں کہ جو پھر کوئی ایسی حرکت کر کے قدم اُکھیڑیں جس طرح پہلے منافقین نے کی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اعلان سنتے ہی باوجود اِس بات کے کہ زخموں سے چُور تھے اور باوجود اس بات کے کہ شکست کا صدمہ تھا اور اپنے بہت سارے آدمی شہید ہوگئے تھے اور اُن کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا تھا، تازہ بہ تازہ زخم پہنچا ہوا تھا، پھر بھی وہ تیار ہوگئے، اور حضور ﷺ اُن کو لے کر مشرکین کے پیچھے نکل پڑے، مدینہ منورہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک جگہ ہے حمراء الاسد، وہاں جا کر حضور ﷺ نے پڑاؤ ڈال دیا، اور معلوم ہوا کہ مشرکین مرعوب ہو کر مکہ معظمہ کی طرف چلے گئے ہیں، اور مدینہ منورہ کی طرف آنے کا ارادہ انہوں نے ترک کر دیا ہے۔

مشرکینِ مکہ کا پروپیگنڈا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قابلِ رشک جذبہ

اُدھر اُن کو کچھ لوگ مل گئے جو مدینہ منورہ کی طرف آرہے تھے، یہ عبدالقیس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، مشرکین نے ان کو کچھ دے دِلا کر آمادہ کیا کہ تم جا تو رہے ہو، مسلمانوں کو ذرا ڈرانا دھمکانا، تاکہ اُن کے دِلوں میں خوف وہراس پیدا ہوجائے اور اُن کو پریشانی لاحق ہوجائے، اور اُنہیں کہنا کہ ابوسفیان نے بڑے لشکر اکٹھے کر لیے ہیں، بڑا سامان جمع کر لیا ہے اور وہ دوبارہ حملہ کرنا چاہتا ہے، مقصد اُس کا یہ تھا کہ شکست کھانے کے بعد اور زخم خوردہ ہونے کے بعد اُن کی طبیعتوں میں گھبراہٹ تو ہے ہی، جب اِس قسم کا پروپیگنڈا ہوگا تو اُن کے دل اور چھوٹ جائیں گے۔ چنانچہ وہ آئے اور ان کی ملاقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہوئی، اور آکر انہوں نے اِس قسم کا پروپیگنڈا کرنا شروع کیا کہ ابوسفیان تو بڑے لشکر اکٹھے کر رہا ہے، بڑا سامان اکٹھا کر رہا ہے، وہ دوبارہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو اِس خبر کے سننے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طبیعت میں خوف اور گھبراہٹ طاری ہونے کی بجائے جوشِ ایمانی اور بڑھ گیا، وہ کہنے لگے کہ اگر وہ لشکر اکٹھے کر رہا ہے تو کیا حرج ہے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ: ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے، ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے، وکیل کا معنی ہے: ''موکول الیہ الأمر'' جس کے سپرد اپنا معاملہ کر دیا جائے اُس کو ''وکیل'' کہتے ہیں، عدالتوں میں جو آپ مقدمہ لے کر جایا کرتے ہیں اور اس مقدمے میں جو آپ وکیل بنایا کرتے ہیں تو اُس کا بھی حاصل یہی ہوتا ہے کہ آپ اُس کے سپرد کر دیتے ہیں، اب اُس کی جیت ہار آپ کی جیت ہار ہوتی ہے، وکیل کا یہی مفہوم ہوا کرتا ہے۔ تو یہ لفظ انہوں نے بولے اور سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ باقاعدہ مشرکین کا پیچھا کیا، مشرکین واپس نہ آئے، تو وہاں تین دن تک حضور ﷺ ٹھہرے، ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ملاقات ہوگئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کچھ تجارت کی تو ظاہری نفع بھی پایا، اور عزت اور غلبے کے ساتھ کہ زخمی ہونے کے باوجود وہ پیچھے گئے اور مشرکین واپس نہیں آسکے، اِس عزت اور غلبے کے ساتھ اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کر کے واپس آگئے، چونکہ یہ تازہ بتازہ اقدام جو انہوں نے کیا تھا یہ بھی اُن کی جانثاری اور فدائیت کی علامت تھی تو اِن آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طبقے کی تعریف فرمائی ہے۔

سوال:- ابوسفیان نے اُحد سے جاتے ہوئے جو وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال پھر ہمارا مقابلہ ہوگا، تو وہ ایک سال بعد نہیں پیش آیا؟

جواب:- وہ دُوسرا واقعہ ہے، کہ اس نے اعلان کیا تھا کہ اگلے سال پھر بدر کے اندر مقابلہ ہوگا، اِس لیے بعض مفسرین

نے اِن آیات کو بدرِ صغریٰ پر محمول کیا ہے، کہ جب اُس نے اعلان کیا تھا کہ اگلے سال بدر میں دوبارہ مقابلہ ہوگا، رسول اللہ ﷺ اس نے کو قبول کرلیا، تو پھر آپ ان تاریخوں میں جو اُس کی طرف سے طے ہوئی تھیں آپ ﷺ اُس وقت بھی سفر کر کے بدر میں گئے، لیکن مشرکین نہیں آئے اور اسی طرح سے مرعوب ہو کر بیٹھ گئے، اور حضور ﷺ صحابہ کے ساتھ وہاں بدر کے میدان میں ٹھہرے، اور وہاں بھی ایک تجارتی قافلے سے ملاقات ہوگئی تھی، تجارت میں وہاں بھی نفع کمایا، اور یہ واقعہ سال کے بعد پیش آیا ہے، بعض مفسرین نے اِن آیات کو بدرِ صغریٰ پر محمول کیا ہے (جلالین)، لیکن یہ جو مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ کا لفظ ہے کہ اِن کو تازہ زخم پہنچا ہے اِس کی وجہ سے ترجیح اِسی کو دی گئی ہے کہ یہ آیات غزوہ حمراء الاسد کے متعلق ہی ہیں۔ اور وہ دوسرا واقعہ مستقل ہے، اُس میں بھی ایسے ہی حال پیش آیا۔

سوال:- اگر یہ آیات غزوہ حمراء الاسد سے متعلق ہیں تو عبد القیس کو بھیج کر یہ پروپیگنڈا کرنے کا کیا مقصد کہ کفار لشکر اکٹھے کر رہے ہیں؟(۱)

جواب:- یہ ہوتا ہی ہے، کہ جس وقت انسان بھاگ رہا ہو تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ اب جا کر اس قسم کی افواہیں پھیلائی جائیں، جب افواہیں پھیلائیں گے تو مسلمان دل چھوڑ دیں گے، پھر ہمارے مقابلے میں آنے کی کوشش نہیں کریں گے، گھبرا جائیں گے، تو گھبرائے ہوؤں کو زیادہ گھبراہٹ میں ڈالنا اِس قسم کے پروپیگنڈے ہوتے رہا کرتے ہیں، کیونکہ کسی جماعت کے دل کو توڑ دینا اور اُس کے دل کو بٹھا دینا حقیقی اعتبار سے فتح یہ ہوا کرتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب اس قسم کی باتیں سنیں گے کہ ابوسفیان نے بہت اسلحہ جمع کرلیا ہے، بہت لشکر جمع کر رہا ہے اور وہ پھر آ رہا ہے، تو اس سے ذرا ان میں گھبراہٹ طاری ہو جائے گی، پریشانی ہو جائے گی، اور کمزوری نمایاں ہوگی۔

حجیتِ حدیث

''وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو مان لیا'' اب یہاں اللہ کا ذکر بھی ہے اور رسول کا بھی، حالانکہ تمام روایات اِس بات پر متفق ہیں کہ یہ حکم سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی طرف سے دیا تھا، لوگوں کو بُلایا تھا کہ چلو، مشرکین کے مقابلے میں چلنا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے بُلانے کو اپنا بلانا بھی قرار دیا، جس سے معلوم ہوگیا کہ قولِ رسول قولُ اللہ ہی ہوتا ہے، رسول کی ہر بات کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں، اور اُن کی بات مان لینا ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی بات مان لینا، اس لیے حجیتِ حدیث کے لئے اِس قسم کی آیات بطور دلیل کے پیش کی جاسکتی ہیں، کہ یہاں بلایا رسول اللہ ﷺ نے تھا، اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اِس بُلانے پر لبیک کہا اُس کو اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اللہ کی بات مان لی، ''مَنْ اَطَاعَ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ'' کا یہی مفہوم ہے کہ جو رسول کی اطاعت کرتا ہے حقیقت کے اعتبار سے اس نے اللہ کی اطاعت کی ہے۔ (۲)

---

(۱) مظہری، نسفی، رازی، ابن کثیر وغیرہ میں ترجیح اس بات کو دی گئی کہ پہلی آیت حمراء الاسد اور دوسری بدرِ صغریٰ سے متعلق ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) بخاری ۲/۱۰۸۱ پر ہے: مَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا ﷺ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. بخاری ۱/۴۱۵ وغیرہ پر ہے: مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔

''بعد اِس کے کہ ان کو زخم پہنچا'' یعنی زخم پہنچنے کے بعد یہ صورت پیش آئی تھی، لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ: اُن لوگوں کے لئے جو محسنین ہیں اور متقین ہیں اجرِ عظیم ہے، درمیان میں مِنْهُمْ کا لفظ آیا ہوا ہے، یہاں بھی ''مِنْ'' بیانیہ ہے، یعنی یہ لوگ جو محسنین ہیں اور متقین ہیں، یہ ''مِنْ'' تبعیضیہ نہیں ہے، کیونکہ یہ جتنے بھی تھے اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو ماننے والے یہ سارے ہی محسنین اور متقین تھے، جیسے سورۂ فتح کے آخر میں بھی آیت آئے گی وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا: وہاں بھی ''مِنْ'' بیانیہ ہے، کیونکہ جن کا ذکر پیچھے سے آرہا ہے کہ اللہ اُن سے راضی ہوگیا جنہوں نے بیعت کی تھی وہ سارے کے سارے اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا مصداق تھے، اسی طرح یہ بھی سارے کے سارے محسنین اور متقین کا مصداق ہیں۔

اِحسان اور تقویٰ کا مفہوم

اِحسان کا معنی ہوتا ہے ہر کام کو اچھی طرح سے کرنا، تو یہاں اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ وفاداری کا جنہوں نے حق ادا کردیا اَلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا کا مصداق وہ لوگ ہیں، اور وَاتَّقَوْا: میں عام احکام کی پابندی کا ذکر آگیا، اور اِحسان فی العبادۃ کی تفصیل حدیثِ جبریل میں آئی ہوئی ہے کہ ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ'': کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ اللہ آنکھوں کے سامنے ہے، کیونکہ اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے تو اللہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے: ''اِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ'' بہر حال اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ وفاداری اور اُن کے حقوق کو اچھی طرح سے ادا کرنا اور پھر اخلاص فی العبادۃ یہ احسان کا مصداق ہے۔

اور اِتقاء بچنے کو کہتے ہیں، کہ بچ بچ کے چلتے ہیں، اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں، تقویٰ کا مفہوم یہ ہوتا ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ غالباً اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ سوال کیا تھا کہ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ تو اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ اے امیرالمؤمنین! آپ کبھی خارداری وادی میں چلے ہیں؟ یعنی جہاں کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوئے ہوں، اردگرد کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں بار ہا چلا ہوں، وہ کہنے لگے کہ وہاں چلنے کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ تو کہا کہ وہاں چلنے کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان اپنا دامن بھی سنبھالتا ہے کہ اردگرد کانٹوں میں نہ اُلجھ جائے، اور پاؤں بھی دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر رکھتا ہے کہ کہیں پاؤں میں کوئی کانٹا نہ لگ جائے، انسان بہت محتاط ہو کر چلتا ہے، بے فکری کے ساتھ نہیں چلتا جہاں اردگرد سارے کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوئے ہوں اور کانٹے دار جھاڑیاں ہوں۔ فرمایا کہ بس یہی تقویٰ ہے کہ دنیا میں بھی انسان اسی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھے، اردگرد اللہ تعالیٰ کی معصیت کی طرف دعوت دینے والی بہت ساری چیزیں ہیں، گناہوں کے کانٹے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں، سوچ سوچ کر قدم رکھنا اور بچ بچ کر چلنا بس یہی تقویٰ ہے۔[1] تو اَلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا اور اَلَّذِیْنَ اتَّقَوْا یہ دونوں باتیں اُن صحابہ پر صادق آتی تھیں، کہ وفادار بھی تھے اور ہر کام کو اچھی طرح سے کرتے تھے، اور اپنی اِس دنیوی زندگی میں اللہ کے احکام کے مطابق چلتے تھے اور بچ بچ کے چلتے تھے کہ کہیں کوئی معصیت اور نافرمانی نہ ہو جائے، ان کے لئے اجرِ عظیم ہے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی ج۱ ص۱۶۱/ ابن کثیر ج۱ ص۱۴۱ سورہ بقرہ آیت ۲ کے تحت۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بُلند ہمتی اور اللہ پر توکل

آگے (اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ میں) اُن کی تعریف ہے جو انہوں نے مشرکین کے اس نمائندے کا پروپیگنڈا سن کر جو قوتِ ایمانی کا اظہار فرمایا اِس معاملے میں تعریف ہے، ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں کچھ لوگوں نے کہا'' جو کہ مدینہ منورہ کی طرف آرہے تھے، یہ ہو گئے خبر پہنچانے والے، پروپیگنڈا کرنے والے، ''انہوں نے کہا کہ لوگوں نے'' یعنی مشرکینِ مکہ نے، ابوسفیان کی پارٹی نے، ''اکٹھے کئے ہیں تمہارے لئے لشکر، یا جمع کیا ہے تمہارے لئے سامان'' فَاخْشَوْهُمْ: تو تم اُن سے ڈرو، تمہارے اُوپر خوف اور خشیت طاری ہونا چاہیے، ''اِس بات نے اُن کے جوشِ ایمان کو بڑھا دیا اور کہنے لگے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے'' اگر اُن کے پاس اسلحہ ہم سے زیادہ ہے تو کوئی بات نہیں، اگر اُن کے پاس جماعت ہم سے زیادہ ہے تو کوئی بات نہیں، ہمارے لئے اکیلا اللہ کافی ہے، ہمارا اللہ پر اعتماد ہے، جب اللہ تعالیٰ کی نصرت ہمارے ساتھ ہوگی تو نہ کوئی سامانِ جنگ کے ذریعے سے ہم پر غالب آسکتا ہے، نہ لشکر کی کثرت کے ذریعے سے غالب آسکتا ہے۔ تو ایسے خوف وہراس کے وقت میں حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اپنی زبان پر لانا ایمان کا اظہار بھی ہے، اور یہ کلمہ بھی بابرکت ہے کہ بار بار اِس کے تکرار کرنے سے دل کو قوت بھی حاصل ہوتی ہے، اس لئے پریشانی کے وقت میں اکثر اولیاء اللہ اسی کا ورد بتایا کرتے ہیں کہ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (مفرد کے طور پر پڑھو، یا) حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ، اِن الفاظ کو بار بار پڑھنا مشکلات کے حل کے لئے اچھا معاون بنتا ہے اور دل کو قوت حاصل ہوتی ہے، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی لفظ ادا کیے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ ''پھر یہ لوٹے اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ، کوئی تکلیف نہیں پہنچی'' نہ بدنی تکلیف پہنچی، نہ کوئی اور ایسی بات ہوئی، اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، ثواب بھی ملا، اور ظاہری طور پر مالِ تجارت میں نفع بھی پایا، یہ ظاہری فضل بھی ہے، ''اور یہ اللہ کی رضا کے تبع ہو گئے'' گویا کہ اللہ کی رضا بھی اِن کو حاصل ہو گئی، ''اور اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم والے ہیں'' اور اِن کو بڑا فضل دیں گے جنہوں نے ایسے نازک موقع پر اللہ کے رسول کی بات کو مان لیا۔

پروپیگنڈا کرنے والوں کی پروا نہ کرنے کا حکم

اور آگے (اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ میں) اُس کی برائی ہے جس نے آ کر مشرکین کے حق میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے کی کوشش کی تھی، کہ یہ شخص جو اس قسم کی باتیں پھیلاتا ہے یہ عملاً شیطان ہے، یعنی اس کی کارروائی شیطانوں جیسی ہے جو شرارت پھیلایا کرتے ہیں، کیونکہ شیطان ہر سرکش آدمی کو اور شرارت پھیلانے والے کو کہہ دیا جاتا ہے، چاہے وہ مِنَ الْجِنِّ ہو، چاہے مِنَ الْاِنْسِ ہو، جو بھی بُرائی پھیلاتا ہے اور بُرائی کی اشاعت کرتا ہے وہ شیطان کا مصداق ہے، یہ شخص عملاً شیطان ہے، شیطان والا کام کر رہا ہے، اپنے دوستوں سے تمہیں ڈراتا ہے، پہلا مفعول محذوف ہے يُخَوِّفُكُمْ اَوْلِيَآءَهٗ یہ تمہیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، کوئی ضرورت نہیں اِن سے ڈرنے کی، فَلَا تَخَافُوْهُمْ: اِن سے مت ڈرو، وَخَافُوْنِ: مجھ سے ڈرتے رہو کہ میری نافرمانی نہ ہونے پائے اگر تم ایمان والے ہو، ایمان والے کا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے ڈرتا ہے کسی دوسرے سے نہیں ڈرتا، کیونکہ نفع نقصان کا

مالک بھی اللہ ہے، اور فتح وشکست بھی اللہ کے قبضے میں ہے، تو جس کی ہر طرح سے قوت اور قدرت ہے اور جو ہر طرح سے ہمارے اُوپر قابض ہے ڈرنا اُسی سے چاہیے، باقی! دوسرے کے مقابلے میں فتح وشکست بھی اُس کی مشیت سے ہوتی ہے اور نفع ونقصان بھی اُس کی مشیت سے آتا ہے، تو جن کے ہاتھ میں کچھ نہیں اُن سے ڈرنا کوئی عقلمندی نہیں، اور جس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے اُس سے ڈرنا عقل کا تقاضا ہے، اس لیے اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارے اوپر خوف میرا طاری ہونا چاہیے کہ میری نافرمانی نہ ہونے پائے، کسی دوسرے سے خوف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ: یہ آیات سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے لئے ہیں، اور الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ سے منافقین کی جماعت کی طرف اشارہ ہے، کہ جس وقت بھی کوئی ایسا موقع آتا ہے تو یہ کفر کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، اور باتیں کرکر کے کفر میں جا گرتے ہیں، اِن کی وجہ سے آپ کو دُکھ نہ ہو، حزن نہ ہو، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، آپ کا کام اِن کو سمجھانا ہے، جب یہ نہیں سمجھتے اور دوڑ دوڑ کے کفر کی طرف جاتے ہیں تو اس سے آپ کا نقصان کوئی نہیں، اب یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اِن کے متعلق یہی ہے کہ اِن کو آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے، اور یہ عذابِ عظیم میں جائیں۔ لَا یَحْزُنْكَ: آپ کو غم میں نہ ڈالیں وہ لوگ جو کفر میں دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں، یعنی کفر کی باتوں میں جلدی کرنے لگ جاتے ہیں، جب کوئی موقع آتا ہے تو اُن کی زبان پر ایسی باتیں جاری ہو جاتی ہیں جس قسم کی کافروں کی زبان پر جاری ہوا کرتی ہیں، ''بے شک یہ اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے'' یعنی اللہ کی جماعت کو، اللہ کے رسول کو، اللہ کے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اِن کے متعلق اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ اِن کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو، ''اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ نہ کرے اِن کے لئے کوئی حصہ آخرت میں، اور اِن کے لئے بڑا عذاب ہے، بیشک وہ لوگ جنھوں نے کفر کو اختیار کیا ایمان کے بدلے، یہ اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اِن کے لئے دردناک عذاب ہے'' یعنی نقصان اِنہی کا ہی ہے، اللہ کا اور اللہ کی جماعت کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

سوال:- کفر اور نفاق میں یہ تو فرق ہے کہ منافق ظاہری طور پر ایمان لاتے ہیں، اور باطن میں کفر ہوتا ہے، لیکن قباحت کے لحاظ سے اِن دونوں میں کیا فرق ہوگا؟

جواب:- دونوں ہی دائمی جہنمی ہیں، لیکن نفاق اُس میں زیادہ قوت پیدا کر دیتا ہے، نفاق کے ساتھ کفر میں کوئی کمی نہیں آتی، بلکہ اِس دوغلا پن اختیار کرنے کے ساتھ قباحت بڑھ جاتی ہے، اس لیے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵) منافقوں کو جہنم کے نچلے طبقے میں ڈالا جائے گا، تو ان کی قباحت زیادہ ہے جو زبان سے مان جاتے ہیں پھر بھی دل میں کفر اختیار کریں، کبھی مان جاتے ہیں اور کبھی کفر کی باتیں کرنے لگ جائیں، یہ زیادہ بُرے ہیں بمقابلہ اُن لوگوں کے جو ایمان کی بات کرتے ہی نہیں، اِن میں نقصان کا پہلو زیادہ ہوتا ہے۔

سوال:- يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایمان تھا، اب کُفر کی طرف دوڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ تو پہلے ہی کُفر پر تھے؟

جواب:- یہ وہی بات ہے جو چند آیات پہلے آپ کے سامنے آئی تھی کہ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ، اُسی آیت پر یہ بات آپ کے سامنے ذکر کردی گئی تھی، کہ پہلے وہ ظاہری طور پر ایمان کی باتیں کیا کرتے تھے اگرچہ اُن کے دل میں کُفر تھا، لیکن جب یہ واقعہ پیش آیا تو زبان پر بھی ایسے کلمات آنے لگ گئے جن سے اُن کا کُفر زیادہ نمایاں ہوگیا۔

کافر کے لئے دُنیا میں خوش حالی اِستدراج ہے

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ: اب اُن منافقین کو ذرا تنبیہ کی جارہی ہے، کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم زخموں سے بھی بچ گئے، قتل سے بھی بچ گئے، ہمارے لئے بڑی خوشحالی ہے، اپنی اس کارروائی پر تم ناز نہ کرو، اگر یہ دو چار دِن تمہیں عافیت ملی ہوئی ہے تو یہ عافیت اِسی لئے ہے تاکہ تمہاری خباثتیں زیادہ بڑھ جائیں اور پیمانہ بالکل لبریز ہوجائے، پھر جب اللہ پکڑے تو چھوٹنے کی گنجائش نہ ہو، یہ ڈھیل ہے جو تمہیں دی گئی ہے، یہ اللہ کی طرف سے انعام نہیں ہے، اس لئے کافر اور منافق اگر دُنیا کے اندر خوش حال ہے تو یہ اِستدراج ہے، اللہ کی طرف سے رَسّی ڈھیلی ہے، اور آگے کہا جائے گا کہ مؤمنوں پر اگر مصیبتیں آتی ہیں تو اُن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ مصلحت ہے، یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔ ''ہرگز نہ سمجھیں وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا کہ ہم جو ان کو ڈھیل دیتے ہیں وہ ڈھیل دینا ان کے لئے بہتر ہے، سوائے اس کے نہیں کہ ہم اُنہیں ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ وہ بڑھ جائیں ازروئے گناہ کے'' یعنی ہمارے اِس ڈھیل دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے گناہوں میں ترقّی ہوتی جائے گی، جیسے ظاہری طور پر وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ طرزِ عمل دُنیا کے لئے مفید ہے اتنا ہی وہ اس بات میں زیادہ پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور گناہوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، ''اور اِن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''

اہلِ ایمان پر مصائب نازل ہونے میں حکمت

آگے مؤمنوں پر مصیبتیں آنے کی مصلحت کا ذِکر ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ تمہارا معاشرہ اسی طرح رہ جائے، کہ جس میں مخلص مؤمن اور منافق کا امتیاز ہی نہ ہو، کھرے کھوٹے سب ایک جیسے ہی رہ جائیں، اللہ اِن کے درمیان امتیاز کرنا چاہتا ہے، اب ایک تو امتیاز کرنے کی صورت یہ ہے کہ وحی کے ذریعے سے تمہیں بتادیا جائے کہ فلاں بھی منافق، فلاں بھی منافق، یہ اللہ کی عادت نہیں، اللہ تعالیٰ اس قسم کی غیبی باتیں اپنے رسولوں کو تو بتاتا ہے، براہِ راست ہر کسی کو نہیں بتایا کرتا، اور واقعات جب ڈال دیے جائیں گے اور جب یہ چیز نمایاں ہوگی تو تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ یہ اتنا جماعت کا وفادار ہے، یہ اتنا رسول کا مطیع ہے، اور یہ اتنا قربانی دینے والا ہے، اور جب واقعات کے ساتھ امتیاز ہوجائے گا تو پھر تم ہر کسی پر الزام قائم کر سکتے ہو، اور اگر غیبی طور پر ہی تمہیں اطلاع دے دی جائے کہ فلاں منافق ہے تو دوسرے پر الزام قائم کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی، کوئی شخص کہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو، میں تو منافق نہیں ہوں، میں تو مخلص ہوں، پھر اُس کو قائل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ اور

جب واقعات کے ذریعے سے نمایاں کیا جائے گا تو پھر اس کو جھوٹا کیا جا سکتا ہے کہ اگر تُو مخلص ہے تو تُو نے فلاں وقت ایسا کیوں کیا؟ جب تُو نے فلاں وقت یہ کردار اختیار کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ تُو منافق ہے، اس طرح سے بات زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب پر اطلاع براہِ راست اگر دیتا ہے تو اپنے رسولوں کو دیتا ہے، ہر کسی کو غیب پر اطلاع نہیں دیا کرتا، یہ اطلاع علی الغیب ہر رسول کے ساتھ ہوتی ہے، اور رسول کی وساطت سے پھر ہمیں بھی ہو جاتی ہے، جیسے قیامت غیب ہے، جنّت اور دوزخ غیب ہے، دوزخ کے اندر جو واقعات پیش آئیں گے وہ غیب ہیں، جنّت کے اندر جو واقعات پیش آئیں گے وہ غیب ہیں، آنے والے واقعات جو ہمارے سامنے بیان کیے گئے ہیں کہ یوں ہوگا وہ غیب ہیں، ماضی کے واقعات آدم علیہ السلام کے زمانے کے اور دوسرے انبیاء کے زمانے کے یہ ہمارے لئے غیب ہیں، اور اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ہمیں اِس غیب کی اطلاع دیتا ہے، لیکن ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ اس غیب پر مطلع کرے یہ اللہ کی عادت نہیں ہے، ہاں البتہ اپنے رسولوں کو بتلاتا ہے، غیب پر اطلاع دیتا ہے، اور رسولوں کی وساطت سے پھر دوسرے لوگوں کو بھی پتہ چل جایا کرتا ہے، یہ اللہ کی عادت ہے۔ باقی منافق اور مؤمن کو ممتاز کرنے کے لئے اللہ کی حکمت یہ ہے کہ واقعات کے ذریعے سے اِن کو ممتاز کیا جائے تاکہ تم سب لوگ اُن واقعات سے استدلال کر کے دوسرے پر الزام قائم کر سکو کہ دیکھو! یہ واقعہ دلیل ہے کہ تم منافق ہو، اور اگر اس قسم کا واقعہ پیش نہ آئے اور تم صرف غیب پر اطلاع پانے کی بنا پر کہو کہ تم منافق ہو، تو دوسرا آدمی آگے سے انکار کر سکتا ہے اور اَڑ سکتا ہے، وہ کہے گا کہ میں تو مخلص ہوں، تم غلط کہتے ہو، تمہیں یہ اطلاع غلط ملی ہے، یا تم اِس اطلاع کا صحیح مطلب نہیں سمجھے، آگے سے چوں چراں کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن جب واقعات سے امتیاز ہو جائے تو پھر دوسرے پر الزام صحیح ہو جاتا ہے اور استدلال واضح ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر اس قسم کے امتحانات ڈالتا رہے گا، ایسے واقعات تمہارے سامنے پیش آتے رہیں گے تاکہ خبیث اور طیب میں امتیاز ہو جائے۔

''عالم الغیب'' کا اطلاق اللہ کے علاوہ کسی پر نہیں ہو سکتا

''اِطلاع علی الغیب'' تو یقیناً تمام رسولوں کو ہوتی ہے، لیکن اِس کو ''علم غیب'' سے تعبیر نہیں کیا جاتا، اس ''اِطلاع علی الغیب'' کی بناء پر کسی کو ''عالم الغیب'' کہنا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ پھر تو اللہ کی طرف سے اطلاع انبیاء علیہم السلام کو ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اطلاع ہمیں ہوگئی، اگر اِس ''اطلاع علی الغیب'' کی بناء پر کسی کو ''عالم الغیب'' کہہ سکیں تو پھر تو نبی پر ایمان لانے والے جتنے اُمتی ہیں جو نبی سے سُن کر غیب کی باتوں کو جانتے ہیں سب پر یہ لفظ صادق آئے گا، اِس لئے اس پر ''علم غیب'' کا لفظ صادق نہیں آتا، اس کو ''عالم الغیب'' نہیں کہا جا سکتا، اللہ کی طرف سے اطلاع ملنے کے بعد پھر رسول اور اُمتی سب اس غیب میں شریک ہو جاتے ہیں، کمی بیشی کے فرق کی بات علیحدہ ہے کہ اللہ نے رسولوں کو کتنی بتائیں اور اُمتیوں کو کتنی معلوم ہوئیں؟ بہر حال چھپی ہوئی باتوں پر اطلاع انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اُمتیوں کو بھی ہو جاتی ہے، تو اس ''اطلاع علی الغیب'' سے اللہ تعالیٰ کی صفت ''علم غیب'' کے اندر کسی کی شرکت لازم نہیں آتی۔

سوال: غیب سے مراد کیا ہے؟

جواب:- پوشیدہ چیزیں، مخفی باتیں، ماضی کے واقعات، مستقبل کے واقعات، یہ سب "غیب" کا مصداق ہیں جو ہمارے سامنے نمایاں نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی اطلاع اپنے رسولوں کو بھی دیتا ہے اور رسولوں کی وساطت سے عام بندوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے۔

سوال:- "الغیب" کا الف لام استغراق کے لئے ہے؟

جواب:- اگر بالفرض اللہ تعالیٰ تمام مغیبات پر بھی اطلاع دے دے تو بھی دُوسرا "عالم الغیب" نہیں بنتا، کیونکہ "اطلاع علی الغیب" اور چیز ہے، "علم غیب" اور چیز ہے، یہ تو میں نے فرق کر دیا۔ اگر فرض کرلو کہ اللہ تعالیٰ تمام مغیبات پر ہی کسی کو اطلاع دے دیتا ہے تو بھی وہ "عالم الغیب" نہیں ہوگا، کیونکہ یہ "اطلاع علی الغیب" ہے، اِس کو "علم غیب" کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

سوال:- "علم غیب" سے تعبیر کریں یا نہ کریں، یہاں "غیب" سے مراد کیا ہے؟

جواب:- مغیبات مراد ہیں، چھپی ہوئی چیزیں مراد ہیں، باقی کتنی مراد ہیں؟ تو جتنی اللہ چاہے۔ اور یہاں خاص طور پر مراد ہے یہی منافقین کے بارے میں علم کہ فلاں منافق ہے، فلاں منافق ہے، اس قسم کے غیب کی اطلاع اللہ تعالیٰ ہر کسی کو براہِ راست نہیں دیتا۔ اور اگر عام مُراد لیا جائے تو اُس کی حد بندی نہیں کی جاسکتی کہ کتنوں پر رسولوں کو اطلاع دیتا ہے اور کتنوں پہ اطلاع نہیں دیتا، ہمارے پاس اِس کا نہ کوئی میٹر نہ کوئی پیمانہ، جتنوں پر بھی اللہ تعالیٰ اطلاع دے وہ "اطلاع علی الغیب" ہے، اِس کی بناء پر "علم غیب" کا اطلاق لازم نہیں آتا۔

سوال:- مِنْ رُّسُلِهٖ میں مِن تبعیضیہ بن سکتا ہے؟

جواب:- تبعیضیہ نہیں بنایا جاسکتا، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسولوں میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ غیب بتاتا ہے، یہ بات غلط ہے، تمام رسول مطلع علی الغیب ہوتے ہیں۔ (1)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ: نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ چھوڑے مؤمنوں کو ایسے حال پر جس پر تم ہو، اللہ تعالیٰ واقعات بھیجتے رہیں گے، حتیٰ کہ جدا جدا کر دیں گے خبیث کو طیب سے، طیب اور خبیث کے اندر امتیاز کر دیں گے۔ "اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ تمہیں مطلع کرے غیب پر، لیکن اللہ تعالیٰ چُنتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی اپنے رسولوں کو" غیب کی اطلاع دینے کے لئے ان کو چُن لیتا ہے، "پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ" اور اللہ اور اللہ کے رسولوں کے ذریعے سے تمہیں جس غیب کا پتہ چلے اس غیب کو بھی مانو، جو وہ کہیں اُسی پر ایمان لاؤ، تمہیں براہِ راست اطلاع ہو یا نہ ہو، رسولوں کی وساطت سے جو اللہ کی طرف سے اطلاع ملتی ہے بس اُس پر تم ایمان لاؤ، "اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے" فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ: تو تمہارے لیے بڑا اجر ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(1) وقيل: إنها للتبعيض فإن الإطلاع على المغيبات مختص ببعض الرسل وفي بعض الأوقات حسبما تقتضيه مشيئته تعالى، ولا يخفى أن كون ذلك في بعض الأوقات مسلم، وأما كونه مختصا ببعض الرسل ففي القلب منه شيء، ولعل الصواب خلافه. (روح المعاني)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ

ہرگز نہ سمجھیں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اُس چیز کے ساتھ جو اللہ نے ان کو دی اپنے فضل سے کہ وہ بہتر ہے ان کے لئے،

بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

بلکہ یہ اُن کے لئے بُرا ہے، عنقریب طوق پہنائے جائیں گے وہ اس مال کا جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا ہے قیامت کے دن،

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ لَقَدْ

اور اللہ ہی کے لئے زمین و آسمان کی میراث، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۸۰﴾ البتہ تحقیق

سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ

سن لی اللہ تعالیٰ نے بات اُن لوگوں کی جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں، ہم ضرور لکھیں گے

مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

اس بات کو جو انہوں نے کہی اور لکھیں گے ہم اُن کا قتل کرنا انبیاء کو ناحق، اور کہیں گے ہم چکھو تم جلانے والی آگ کا عذاب ﴿۱۸۱﴾

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ

یہ عذاب بسبب اُن کاموں کے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے، اور یہ تو واقعہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے ظلم کرنے والا نہیں ﴿۱۸۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ

جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ نہ لے آئے وہ رسول ہمارے پاس ایسی قربانی

تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ

جس کو آگ کھا جائے، آپ فرما دیجئے کہ تحقیق آئے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے واضح دلائل لے کر اور یہی معجزہ لے کر

قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ

جو تم کہہ رہے ہو پھر تم نے انہیں کیوں قتل کر دیا اگر تم سچے ہو ﴿۱۸۳﴾ پھر اگر یہ آپ کو جھٹلائیں تو تحقیق

كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ

جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے بھی جو واضح دلائل لے کر اور چھوٹے چھوٹے صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر

الۡمُنِیۡرِ ﴿۱۸۳﴾ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَكُمۡ يَوۡمَ

آئے تھے ﴿۱۸۳﴾ ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے، اور سوائے اس کے نہیں کہ تم پورے پورے دے دیے جاؤ گے اپنے اجر قیامت

الۡقِيٰمَةِ ؕ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ ؕ وَمَا

کے دن، پھر جو شخص دور ہٹا دیا گیا آگ سے اور جنت میں داخل کر دیا گیا پس تحقیق وہ کامیاب ہوگیا، اور نہیں ہے

الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَآ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبۡلَوُنَّ فِىۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ۟

دنیوی زندگی مگر دھوکے کا سامان ﴿۱۸۵﴾ البتہ ضرور آزمائے جاؤ گے تم اپنے مالوں اور جانوں کے بارے میں،

وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا

اور البتہ ضرور سنو گے تم اُن لوگوں کی طرف سے جو کتاب دیئے گئے تم سے پہلے اور اُن لوگوں کی طرف سے جنہوں نے شرک کیا

اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾

(سنو گے) بہت ساری تکلیف دِہ باتیں، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بیشک یہ تاکیدی احکام میں سے ہے ﴿۱۸۶﴾

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ

یاد کیجئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے لیا پختہ عہد ان لوگوں سے جو کتاب دیے گئے کہ البتہ ضرور بیان کرو گے تم اس کتاب کو لوگوں کے لئے

وَلَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ ز فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا

اور تم اس کتاب کو چھپاؤ گے نہیں، پس پھینک دیا ان لوگوں نے اس عہد کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور حاصل کیا اُس کے بدلے میں بہت کم

قَلِيۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡرَحُوۡنَ

قیمت، بُری ہے چیز جس کو یہ حاصل کرتے ہیں ﴿۱۸۷﴾ ہرگز گمان نہ کر اُن لوگوں کو جو خوش ہوتے ہیں

بِمَاۤ اَتَوۡا وَّيُحِبُّوۡنَ اَنۡ يُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ يَفۡعَلُوۡا فَلَا تَحۡسَبَنَّهُمۡ

اپنے کیے پر اور پسند کرتے ہیں کہ اُن کی تعریف کی جائے ایسے کاموں کے بدلے جو انہوں نے کئے نہیں پس ہرگز نہ سمجھ تو انہیں

بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ ج وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ

عذاب سے چھٹکارے میں، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۸۸﴾ اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

آسمانوں کی اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۸۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ۔ اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ یہ یَحْسَبَنَّ کا فاعل ہے۔ خَیْرًا لَّهُمْ یہ مفعول ہے۔ ہرگز نہ سمجھیں گے وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اُس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اُن کو دی اپنے فضل سے۔ مِنْ فَضْلِهٖ کو مَا کا بیان بنالیجیے، ترجمہ اکٹھا ہوسکتا ہے،''جو بخل کرتے ہیں اللہ کے اُس فضل کے ساتھ جو اللہ نے اُنہیں دیا ہے، ہرگز نہ سمجھیں کہ وہ اُن کے لئے بہتر ہے'' بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ: بلکہ یہ بخل کرنا اُن کے لئے برا ہے، سَیُطَوَّقُوْنَ: عنقریب طوق پہنائے جائیں گے وہ، مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: اس مال کا جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا ہے، جس چیز کے ساتھ انہوں نے بخل کیا اُس چیز کا وہ طوق پہنائے جائیں گے قیامت کے دن۔ طوق کہتے ہیں جو گلے کے اندر چیز ڈالی جائے۔ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: میراث مصدر ہے میعاد کے وزن پر، وَرِثَ یَرِثُ سے، اور یہاں میراث سے مراد وہ چیز ہے جو پیچھے چھوڑی جائے،''اللہ ہی کے لئے ہے زمین وآسمان کی میراث'' وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ: اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا: البتہ تحقیق، یعنی یہ بات پکی ہے، مضبوط ہے، ٹھیک ہے، کہ سن لی اللہ تعالیٰ نے بات اُن لوگوں کی جنہوں نے کہا، اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ: کہ بیشک اللہ محتاج ہے، وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ: اور ہم مالدار ہیں، اغنیاء غنی کی جمع ہے بمعنی مالدار، اور فقیر کا معنی محتاج۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا: ہم ضرور لکھیں گے، سین تاکید کے لئے، ہم عنقریب لکھیں گے، یا، ہم ضرور لکھیں گے اُس بات کو جو انہوں نے کہی، وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ: اور لکھیں گے ہم اِن کے قتل کرنے کو، اِن کا قتل کرنا انبیاء کو، قَتْلَهُمْ میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اِن کا قتل کرنا، الْاَنْۢبِیَآءَ قَتْل کا مفعول ہے، انبیاء کو، بِغَیْرِ حَقٍّ: ناحق، وَّنَقُوْلُ: اور کہیں گے ہم ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ: حریق مُحْرِقَة کے معنی میں، النارُ المُحرِقة، جلانے والی آگ، چکھو تم جلانے والی آگ کا عذاب، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ: اور یہ عذاب بسبب ان کاموں کے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ: یہ خبر ہے، مبتدأ محذوف ہے''الامر'' یہ تو واقعہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے ظلم کرنے والا نہیں۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَاۤ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا ہے، اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ: کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں، حَتّٰى یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ: جب تک کہ نہ لے آئے وہ رسول ہمارے پاس ایسی قربانی جس کو آگ کھا جائے۔ قُربان: مَا یُتَقَرَّبُ بِهٖ، جس کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے۔ قُلْ: آپ فرما دیجیے، قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ: تحقیق آئے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے، بِالْبَیِّنٰتِ: واضح دلائل لے کر، وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ: اور یہی معجزہ لے کر جو تم کہہ رہے ہو، یہی چیز لے کر جو تم نے کہی، فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ: پھر تم نے اُنہیں کیوں قتل کر دیا، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اگر تم سچے ہو۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ: پھر اگر یہ آپ کو جھوٹا بتلائیں، آپ کی تکذیب کریں، فَقَدْ

كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ: اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ غم نہ کریں، جزا محذوف ہے اور اگلے الفاظ اس جزا کے اوپر دلالت کرنے والے ہیں، اگر یہ آپ کو جھوٹا کہیں، آپ کو جھوٹا بتلائیں، آپ کی تکذیب کریں تو آپ غم نہ کریں، تحقیق جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے بھی، جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ: جو واضح دلائل لے کر آئے تھے، وَالزُّبُرِ: یہ زَبور کی جمع ہے، چھوٹے چھوٹے صحیفے لے کر آئے تھے، وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ: اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ بینات زُبر اور کتاب منیر کے ساتھ پہلے رسول آئے تھے اُن کو بھی جھٹلایا گیا، اس لیے اگر آپ کو جھٹلایا جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور آپ اِس پر کوئی غم اور حزن نہ کریں۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے، وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اور سوائے اس کے نہیں کہ تم پورے پورے دے دیے جاؤ گے اپنے اَجر قیامت کے دن، قیامت کے دن تم اپنے اجر پورے پورے دے دیے جاؤ گے، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ: پھر جو شخص دور ہٹادیا گیا آگ سے، وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ: اور جنت میں داخل کر دیا گیا، فَقَدْ فَازَ: پس تحقیق وہ کامیاب ہوگیا۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ: اور نہیں ہے دنیوی زندگی، اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ: مگر دھوکے کا سامان، غرور دھوکے کو کہتے ہیں، متاع: برتنے کی چیز۔ لَتُبْلَوُنَّ: البتہ ضرور آزمائے جاؤ گے تم، فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ: اپنے مالوں کے بارے میں اور جانوں کے بارے میں، وَلَتَسْمَعُنَّ: اور البتہ ضرور سنو گے تم، مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ: ان لوگوں کی طرف سے جو کتاب دیے گئے تم سے پہلے، وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا: اور ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے شرک کیا، البتہ ضرور سنو گے تم اَذًى كَثِيْرًا: بہت تکلیف، اَذیٰ سے یہاں اقوال موذیہ مراد ہیں، چونکہ سماع کا تعلق اقوال کے ساتھ ہوتا ہے، ''بہت ساری تکلیف دِہ باتیں ان لوگوں کی طرف سے سنو گے''، وَاِنْ تَصْبِرُوْا: اور اگر تم صبر کرو، وَتَتَّقُوْا: اور تقویٰ اختیار کرو، فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ: جزا محذوف ہے اور اگلے الفاظ دال بر جزا ہیں، اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ عین مطلوب ہے، فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ: مِنَ الامورِ المعزُومَۃ، یہ اُن کاموں میں سے ہے جن کاموں کا عزم کیا جاتا ہے، جس کا حاصل ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے، ایسے کاموں میں سے ہے جس کا انسان کو عزم کرنا چاہیے، ''یہ تاکیدی احکام میں سے ہے'' اس طرح سے بھی کہہ سکتے ہیں، من الامور المعزومۃ...... مِنْ معزوماتِ الامور، یہ اُمور میں سے معزومات ہیں، معزومات: جن کا عزم کیا جاتا ہے، تو دونوں طرح سے اِس کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے کہ یہ ہمت کے کام ہیں، یہ ان کاموں سے ہیں جن کی انسان کو ہمت کرنی چاہیے اور عزم کرنا چاہیے، یا یہ تاکیدی اُمور میں سے ہیں۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: یاد کیجیے جبکہ اللہ تعالیٰ نے لیا پختہ عہد ان لوگوں سے جو کتاب دیے گئے، لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ: یہ اُس عہد کا بیان ہے، البتہ ضرور بیان کرو گے تم اِس کتاب کو لوگوں کے لئے، وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ: اور تم اِس کتاب کو چھپاؤ گے نہیں، فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ: پھینک دیا اِن لوگوں نے اُس عہد کو پشتوں کے پیچھے، یعنی ایسے کر دیا جیسے کوئی چیز پشت کے پیچھے ڈال دی گئی ہو، پرواہی کوئی نہیں، ''پھینک دیا اس کو اِن لوگوں نے اپنی پشتوں کے پیچھے'' وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اور حاصل کیا اُس کے بدلے میں ثمن قلیل، بہت کم قیمت، فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ: بُری ہے وہ چیز جس کو یہ خریدتے ہیں، جس کو یہ حاصل کرتے ہیں۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا: ہرگز گمان نہ کر ان لوگوں کو جو خوش ہوتے ہیں اپنے کیے پر، جو اپنے کردار پر خوش ہیں، وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا: اور پسند کرتے ہیں کہ

ان کی تعریف کی جائے بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا: ایسے کاموں کے ساتھ جو انہوں نے کیے نہیں، فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ: پس ہرگز نہ سمجھ تو انہیں عذاب سے چھٹکارے میں، مَفَازَة: کامیاب ہونے کی جگہ، چھٹکارے کی جگہ، اِن کو عذاب سے چھٹکارے میں نہ سمجھ، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اور اِن کے لئے دردناک عذاب ہے، وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

غزوۂ اُحد کے واقعات جو آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ گزرے اُن میں منافقین کی طرف سے اللہ کے راستے میں جہاد کے بارے میں کوتاہی کھل کر سامنے آگئی، تو جس طرح یہ لوگ اللہ کے راستے میں اپنی جان قربان کرنے سے دریغ کرتے تھے اور بزدلی کی بناء پر جہاد کو چھوڑ کر گھروں میں گھستے تھے اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو تو مال خرچ کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتے تھے، جب کوئی موقع آتا تو مخلصین صحابہ تو اپنے گھر تک لٹا دیتے تھے، جو کچھ گھر میں سامان ہوتا سب اللہ کے راستے میں دے دیتے، اور یہ لوگ بخل کرتے تھے، تو جیسے اُس جہاد میں کوتاہی کرنے کی بنا پر اُن کی مذمت کی گئی اِن آیات میں اُن کے بخل کی مذمت کی گئی ہے، جیسے وہاں کہا گیا تھا کہ یہ جو چھپتے پھرتے ہیں تو موت سے بچیں گے نہیں، موت تو آخر ایک وقت آنی ہے، لیکن جہاد چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شرف والی موت سے انسان محروم ہو جاتا ہے، اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے جو موت آتی ہے وہ برائے نام موت ہے حقیقت میں زندگی ہے۔

مال سنبھال کر رکھنے کے متعلق غلط نظریہ

اسی طرح یہاں کہا جائے گا کہ جس مال کو یہ سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے سنبھال کر رکھنا ہمارے مستقبل کے لئے مفید ہے اور یہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں، دوسرے وقت میں یہ مال ہمارے کام آئے گا، اِن کا یہ نظریہ غلط ہے، مستقبل کے لئے مفید یہی ہے کہ اللہ کے راستے میں زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جائے، اس کے ساتھ دُنیا میں بھی امن وعافیت نصیب ہوتی ہے، مثلاً اُس وقت اگر یہ لوگ سارے کے سارے ہی اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرتے اور جہاد کی تیاری نہ کرتے تو دنیا بھی برباد ہوتی کہ کافر غالب آتے، جیسے لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ:۱۹۵) کے تحت ذکر کیا گیا تھا کہ یہ خرچ نہ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اور آخرت تو برباد ہے ہی۔ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے جہاں جہاد کی تیاری ہوگی، دُنیا کے اندر دشمن پر غلبہ حاصل ہوگا، دُنیا کی عزت اور دُنیا کا غلبہ نصیب ہوگا تو آخرت کا ثواب بھی ملے گا، اور یہ سنبھال کر جو رکھ رہے ہیں کہ یہ چیز ہمارے مستقبل کے لئے مفید ہے وہ اِن کے پاس رہنے کی ہے نہیں، ایک دن اللہ تعالیٰ نے اِن سے لے تو لینی ہے، یہ

مرجائیں گے اور ساری کی ساری جائیداد اور مال جو بھی ہے پیچھے رہ جائے گا، آخر یہ چیز واپس اللہ کی طرف ہی جانے والی ہے، جب یہ چیز آخرکار لوٹ کر اللہ کی طرف جانی ہے تو تم اپنے ہاتھ کے ساتھ اللہ کے راستے میں اپنی خوشی سے خرچ کروگے تو چیز تو پھر بھی جائے گی، لیکن تمہارے لئے اجروثواب کا باعث بنے گی۔ جیسے وہاں تھا کہ مرنا تو بہرصورت ہے، لیکن اگر اللہ کے راستے میں موت آجائے گی تو اللہ کی مغفرت اور فضل حاصل ہوجائے گا، ورنہ یہ نہیں کہ اگر تم اللہ کے راستے میں نہیں نکلو گے تو موت سے بچ جاؤ گے، اسی طرح اِس مال نے لوٹ پوٹ کر جانا تو اللہ کے پاس ہے، ساری دنیا مرجائے گی، زمین وآسمان پیچھے رہ جائیں گے، سوائے اللہ کے اِن کا کون وارث ہے، لیکن جولوگ اپنے اختیار کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے خرچ کرتے ہیں وہ اللہ کے ہاں اجروثواب پالیں گے۔

''صدقہ'' کو لفظِ ''قرض'' سے تعبیر کرنے میں حکمت

صدقے کی ترغیب دیتے ہوئے قرآنِ کریم میں بار بار اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں: ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا''(۱) کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسن دے؟ ''قرض'' کے لفظ کا استعمال کرنا صدقے کے لئے ترغیب کا باعث ہے، ترغیب اس اعتبار سے ہے کہ جب کسی کو قرضہ دیا جاتا ہے تو قرضہ لینے والا اَخلاقاً اپنے ذِمّے سمجھتا ہے کہ میں نے یہ واپس ضرور کرنا ہے، اگر اُس کے پاس گنجائش ہو، وہ تنگدست نہیں ہے، اور اُس کو حق کے ادا کرنے کا فکر ہے، وہ کسی کی حق تلفی کرنے والا نہیں ہے تو قرضے کو کوئی دبایا نہیں کرتا، شرفاء کے اندر عُرف یہی ہے، جب انسان قرض کسی ایسے آدمی کو دیتا ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ مفلس نہیں کہ واپس نہیں کرسکے گا، اور یہ ظالم بھی نہیں کہ دبالے گا، تو اِس اعتماد پر دیا کرتا ہے کہ لازماً یہ واپس آئے گا، تو اللہ تعالیٰ اِس ''صدقے'' کو اپنے لئے ''قرض'' قرار دیتے ہیں، اور پھر جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کی ترغیب دیتے ہیں، صبح کے وقت طلوعِ فجر سے قبل اللہ تعالیٰ جس وقت اپنی مغفرت اور رحمت کی طرف بُلاتے ہیں، تو حدیث شریف(۲) میں آتا ہے کہ یہ اعلان کرنے کے بعد کہ مجھ سے مانگو میں دینے کے لئے تیار ہوں، مجھ سے استغفار کرو میں تمہارے گناہ معاف کروں، دُعا کرو میں تمہاری دُعا قبول کروں، صبح کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے، اُس کے بعد حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتے ہیں: ''مَنْ یُقْرِضُ غَیْرَ عَدُوْمٍ وَلَا ظَلُوْمٍ'' کوئی ہے جو ایسے کو قرض دے جو مفلس بھی نہیں اور جو ظالم بھی نہیں، یہ دو لفظ اسی لئے بولے گئے کہ مفلس کو قرض دیتا ہوا انسان ڈرتا ہے کہ اِس کے پاس تو ہے ہی کچھ نہیں، دے گا کہاں سے؟ اور ظالم کو دیتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ اِس کو تو حق دبانے کی عادت ہے، ہمارا حق بھی دبا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ ظلوم بھی نہیں اور عدوم بھی نہیں، تو اِس میں ترغیب کا پہلو ہے کہ اللہ کے نام پر جب دو تو تمہارے دِل میں اِس کی واپسی کا اتنا خیال ہونا چاہیے کہ جیسے تم کسی اچھے بھلے آدمی کو قرض دیتے ہو تو تمہارے دِل میں اعتماد ہوتا ہے کہ یہ ضائع نہیں ہوگا اور دوسرے وقت میں لوٹ کر آئے گا، اس پہلو سے ترغیب دیتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''قرض'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

---

(۱) پارہ نمبر ۲ سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۴۵ / پارہ نمبر ۲۷ سورۃ الحدید آیت نمبر ۱۱۔

(۲) مسلم ج۱ ص۲۵۸ باب الترغیب فی قیام رمضان سے پہلے / مشکوٰۃ ص۱۰۹ عن ابی ہریرۃؓ باب التحریض، فصل اول۔

لفظِ ''قرض'' پر یہود اور منافقین کا مذاق اور اللہ کی طرف سے تنبیہ

یہود نے اِس لفظ کا مذاق اُڑایا، باوجود اس بات کے کہ وہ اللہ کے قائل تھے، اور اُن کی کتابوں میں بھی اس قسم کے عنوانات تھے، لیکن جب آپس میں ضد ہو جاتی ہے تو پھر اس قسم کی باتیں مذاق میں اور اِستہزا میں آجاتی ہیں دوسرے کو تنگ کرنے کے لئے، اور منافقین چونکہ یہود سے ہی متأثر تھے، اِنہوں نے بھی اس لفظ کا اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر مذاق اُڑایا کہ (نعوذ باللہ، خاکم بدہن، نقلِ کفر، کفر نباشد) وہ یوں کہتے تھے کہ ''لو جی! آج کل اللہ تعالیٰ محتاج ہو گیا، فقیر ہے، ہم سے قرضہ مانگتا ہے، اِس کا مطلب ہے کہ ہم مال دار ہیں اور اللہ فقیر ہے!'' یہود بھی اِس لفظ کا مذاق اُڑاتے تھے، اور منافقین نے بھی اپنی مجلسوں میں اس قسم کا مذاق اُڑایا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو تنبیہ کی ہے، اور تنبیہ میں یہ بات نہیں کہی کہ میں جو صدقے کی ترغیب دیتا ہوں اور ''قرض'' کا لفظ جو استعمال کرتا ہوں تو کس معنی پر کرتا ہوں، یہ وضاحت نہیں کی، کیونکہ یہ بات تو واضح تھی، اِس میں تو کوئی خفاء ہے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کے متعلق فقیر ہونے کا تصور کوئی جاہل سے جاہل بھی نہیں کر سکتا، اور اگر اللہ تعالیٰ نے ''قرض'' کے لفظ کے ساتھ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے تو کوئی جاہل بھی نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہو گیا اِس لئے ہم سے قرض مانگتا ہے، یہ تو اُس کی شفقت ہے کہ دیا ہوا اُس کا ہے، پھر تم سے خرچ کرواتا ہے، خرچ کروانے کے بعد کہتا ہے کہ یہ ایسے ہے جیسے تم نے مجھے قرض دیا، میں اِس کا اجر ضرور واپس کروں گا۔ تو اُن کو دھمکایا ہے کہ یہ باتیں ہم سُن رہے ہیں اور تمہارے نامۂ اعمال میں اِن باتوں کو لکھ کر رکھیں گے، اور جس طرح سے تمہارے دوسرے جرائم ہیں (خاص طور پر یہودیوں کو تنبیہ ہے) کہ جماعتی سطح پر تم نے جو جرم کیے ہوئے ہیں، انبیاء ﷩ کا قتل کرنا، اہلِ حق کی مخالفت، جو فہرست جرائم کی ہے اُس فہرست میں تمہاری اِس بات کے ساتھ ایک جرم کا اضافہ ہو گیا، اور قیامت کے دِن ساری کی ساری چیزیں سامنے آئیں گی، اُس وقت ہم کہیں گے کہ جس طرح تم یہ باتیں کر کر کے اہل اللہ کا دِل جلایا کرتے تھے، آج جلنے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہاں اُن کو تنبیہ کرتے ہوئے اُن کے بڑوں کا کردار بھی سامنے لایا گیا ہے، کہ وہ انبیاء ﷩ کو قتل کیا کرتے تھے، کیونکہ یہ اِن حرکتوں کو جاننے کے باوجود اپنے بڑوں کے اِس کردار پر انکار نہیں کرتے تھے، تو انکار نہ کرنے کی بناء پر وہ جرم جماعتی سطح پر اِن کے سر پر بھی آتا ہے، تو جیسے تمہارے یہ بڑے بڑے جرائم پہلے فہرست میں آئے ہوئے ہیں، اُن جرائم میں ایک جرم تمہارا یہ بھی شریک ہو گیا، اِس طرح یہ یہود کو تنبیہ ہو گئی، اور یہود سے متأثر ہو کر منافقین جو اس قسم کی باتیں کرتے تھے تو ان کو بھی تنبیہ ہو گئی۔ ابتدائی آیات تو یہ ہیں۔

خرچ کرنے سے مال بڑھنے کی حسی مثال

''ہرگز گمان نہ کریں وہ لوگ جو اللہ کے دیے ہوئے فضل کے ساتھ بخل کرتے کے ساتھ بخل کرتے ہیں'' یعنی دیا ہوا اللہ کا ہے، اللہ نے اپنی مہربانی اور اپنے فضل کے ساتھ جو کچھ دیا جو اُس کو خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں، ''وہ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں'' اُن کا جذبہ یہی تھا کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں، کہ مال کو محفوظ رکھیں گے، دوسرے وقت میں کام آئے گا، حالانکہ یہی بات اُن کے حق میں بُری ہے۔ اِس کو اگر آپ ایک حسی مثال کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ غلہ آپ کے گھر میں

پڑا ہے، فصل بونے کا وقت آگیا، اب ایک آدمی گندم کی بوری اُٹھاتا ہے اور لے جاکر مٹی میں بکھیر دیتا ہے، اور ایک آدمی اُس بوری کو سنبھال کے رکھتا ہے کہ نہ بھائی! ہم اس کو مٹی میں کیوں ڈالیں، ایسا نہ ہو کہ یہ ضائع ہوجائے، کل کو ہمارے ہاں بھوک ہوگی تو ہم کیا کریں گے۔ اب یہ مثال آپ کے سامنے جس طرح سے دونوں شخصیتوں کو لاتی ہے، کہ ایک آدمی مٹی میں غلے کو بکھیر دیتا ہے اللہ کی عادت پر اعتماد کرتا ہوا کہ اللہ کی عادت یہی ہے کہ جب موسم پر اُس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق دانے بکھیر دیے جاتے ہیں تو دوسرے وقت میں بیسیوں گنا زائد ہو کر واپس آتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی اِس عادت پر اعتماد کرتا ہے اور اعتماد کر کے وہ دانے مٹی میں بکھیر دیتا ہے، چند دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق جو اس نے اپنی عادت کے تحت مخلوق کے ساتھ ایک قسم کا کیا ہوا ہے، اُس کے تحت وہ فصل جو آتی ہے تو ایک بوری بکھیری تھی تیس چالیس بوریاں آجاتی ہیں، تو ایک دانے کا چالیس دانہ بن گیا، اتنا اتنا اضافہ ہوجاتا ہے، لیکن اگر ایک بے وقوف یہ کہے کہ کیا پتہ، یہ دانے اُگیں گے یا نہیں، ہوسکتا ہے اس کو کیڑا ہی لگ جائے، ہوسکتا ہے فصل برباد ہوجائے، تو ہمارے گھر جو دانے پڑے ہوئے ہیں ہم اِن کو کیوں برباد کریں، ہم اِن کو سنبھال کے رکھیں گے، دوسرے وقت میں ہمارے کام آئیں گے، اب ظاہری طور پر اس کی بات کتنی ہی بھلی کیوں نہ معلوم ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت کے تحت اِس شخص کا اپنے آپ پر یہ ظلم ہے، کیونکہ جو اس نے تھوڑا بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے یہ رہے گا تو نہیں، کھالے گا تو بھی ختم ہوجائے گا، اور اگر نہیں کھائے گا تو گھن لگ جائے گا، ختم تو اِس نے ہوجانا ہے، اور اگر طریقے کے مطابق اِس کو آگے صرف کرتا تو یہ بڑھتا بھی اور محفوظ بھی ہوتا۔ جس طرح یہ رزق کے بڑھنے کی حسی مثال ہے کہ خرچ کرنے کے ساتھ بڑھتا ہے اور لوٹ لوٹ کے انسان کی طرف آتا ہے، بالکل یہی حساب ہے معنوی طور پر کہ جب اللہ کے نام پہ دیا جاتا ہے تو یہ رزق کے اندر اضافہ کا باعث بنتا ہے، حضور ﷺ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ صدقہ دینے سے کسی کا مال گھٹتا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ برکت دیتے ہیں،"[1] اور دوسرے راستے سے لوٹ لوٹ کے وہی آتا ہے، اور زراعت اور زمین کے اندر بونا اِس کی ایک حسی مثال ہے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ اِن کے حق میں بہتر نہیں ہے بلکہ اِن کے حق میں بُرا ہے جو اس طرح کرتے ہیں۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اِن لفظوں کی تشریح حدیث شریف میں موجود ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں قیامت کے دن یہ مال دار لوگ جو اپنے مال میں سے اللہ کے نام پر خرچ نہیں کرتے تھے، حقوقِ واجبہ ادا نہیں کرتے تھے، اِن کا وہ مال اور اِن کا وہ خزانہ ایک سانپ کی شکل میں تبدیل کردیا جائے گا، اور پھر وہ سانپ اِن کے گلے کا ہار بنا دیا جائے گا، اور وہ سانپ اِن کی باچھیں اور اِن کے منہ کو کاٹے گا اور ساتھ یہ بھی کہے گا کہ: "اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ"[2] اِن کے گلے کے اندر پڑا ہوا کاٹے گا بھی، اور ساتھ یہ بھی کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں، تو گویا طوق بنا کر گلے میں ڈالنے کا مطلب حدیث

(۱) ترمذی ۵۸/۲ باب ما جاء مثل الدنیا مثل اربعة نفر/مشکوۃ ۴۵۱/۲ باب استحباب المال فصل اول۔ ولفظ الحدیث: ثلاث اقسم علیهن الخ
(۲) صحیح البخاری ج ۱ ص ۱۸۸ باب اثم مانع الزکاۃ۔ نیز ۶۵۵/۲۔ ۱۰۲۹/۲ / مشکوۃ ص ۱۵۵، کتاب الزکوۃ فصل اول عن ابی هریرةؓ۔

شریف میں یہ ذکر کیا گیا کہ اُس خزانے کو اور اُس مال کو سانپ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا، پھر وہ سانپ اِن کے گلے کا ہار بنا دیا جائے گا، اور پھر وہ اِن کو کاٹے گا بھی اور یاد بھی دلائے گا کہ میں تیرا وہی مال ہوں جس کو تو سنبھال سنبھال کے رکھتا تھا۔ ''عنقریب طوق ڈالے جائیں گے یہ اُس مال کا جس کے ساتھ یہ بخل کرتے ہیں قیامت کے دن۔''

''وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کا مفہوم

وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یہ وہی بات کہہ دی، کہ آخر جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے اس نے جانا تو لوٹ پوٹ کے اللہ کے پاس ہی ہے، تم مر جاؤ گے پیچھے چھوڑ جاؤ گے، جس طرح سے دنیا کے اندر ایک آدمی مرتا ہے پیچھے مال چھوڑ جاتا ہے، تو اُس کو وِرثے سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو یہاں بھی جب ساری مخلوق مر جائے گی، سارے زمین و آسمان اللہ ہی کے لئے باقی رہ جائیں گے، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے ظاہری طور پر ایک وارث ہوتا ہے، تو پیچھے بچا ہوا سب اللہ کے قبضے میں ہوگا، مطلب یہ ہوا کہ لوٹ پوٹ کے یہ چیز جانی تو اللہ کے پاس ہی ہے، پھر اگر تم اپنے ہاتھوں سے خرچ نہیں کرو گے تو بھی تمہارے پاس رہے گی نہیں، جانی پھر بھی اللہ کے پاس ہے، تو بہتر ہے کہ تم اپنے ہاتھوں سے خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر لو۔ جیسے موت کے مسئلے میں کہا گیا ہے کہ موت آنی تو یقینا ہے، وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ (سورۂ نساء: ۷۸) چونا گچ قلعوں کے اندر بند ہو جاؤ مرنا تو تب بھی ہے، لیکن اس طرح چھپ چھپ کے اور ڈر ڈر کے مرو گے تو اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بھی بنو گے، اور اگر اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے مرو گے موت تو پھر بھی آنی ہے، لیکن وہ رحمت اور مغفرت کو لیے ہوئے ہوگی۔

یہود کے اِستہزا پر اِنکار

آگے (لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوٓا میں) اِس بات کے اوپر انکار ہے جو اُنہوں نے اِستہزا کیا تھا کہ ''تحقیق سُن لی بات اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم مال دار ہیں، ضرور لکھیں گے ہم اِن کی اِس کہی ہوئی بات کو، اور اِن کے انبیاء کو قتل کرنے کو'' جو انبیاء ﷺ کو یہ ناحق قتل کرتے تھے، ''اور ہم کہیں گے کہ جلنے والی آگ کا عذاب چکھو، اور پھر ساتھ یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے''، انسان کے اعمال جتنے ہیں اُن سب کی نسبت ہاتھوں کی طرف ہی ہوتی ہے، چاہے وہ زبان سے ہوں جیسے بھی ہوں، مطلب یہ ہے کہ تیرے اپنے کئے ہوئے اعمال کا یہ بدلہ ہے، ''اور یہ تو واقعہ ہے کہ اللہ بندوں پر زیادتی نہیں کرتا''، جو کچھ بھی ہے تمہارا اپنا کیا ہوا سامنے آ رہا ہے، جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے، اگر تم نے اپنے کھیتوں کے اندر کانٹے ہی بکھیرے ہیں تو کل کو اگر کانٹے دار جھاڑیاں اُگیں گی جو تمہارے پاؤں کو کانا کریں گی، تمہارے دامن میں اُلجھیں گی، اور تمہارے کپڑے پھاڑیں گی، تو اپنا بویا ہوا ہوگا، کوئی اچھی چیز بو دو تو اچھا انجام سامنے آ جائے گا، یہ تو تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

سوال:۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ، قتل انبیاء کا واقعہ تو پہلے ہو چکا، پھر یہ جو کہا ''سَنَكْتُبُ'' کہ لکھیں گے اِس کا کیا مطلب؟

جواب:- یہ بات تو میں نے پہلے اپنی تقریر کے اندر واضح کردی، کہ جماعتی سطح پر جس قسم کے جرائم تمہارے سرپر پہلے ہیں یہ بھی ایک جرم کا اضافہ ہوگیا۔ بڑوں کی حرکت اِن کو یاد دلائی کیونکہ وہ اپنے بڑوں کے اِن کرتوتوں پر انکار نہیں کرتے تھے، گویا کہ ذہنی طور پر یہ بھی قاتلِ انبیاء ہیں، جب ایک انسان خود گناہ نہیں کرتا لیکن گناہ کرنے والوں پر خوش ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ بھی انہی کے حکم میں ہوتا ہے۔تو یہ اُن کے جماعتی جرائم کی نشاندہی ہے کہ جس طرح تمہاری جماعت کے یہ جرائم ہیں اُن میں ایک یہ بات بھی ہے، اور لکھ رکھنا یہ تنبیہ ہوتی ہے کہ یہ بات بھلانے کی نہیں، ہم اِس کو بھولیں گے نہیں، یہ لکھی ہوئی ہمارے پاس پڑی ہوئی ہے، دوسرے وقت میں تمہیں یاد دلائیں گے۔

اِیمان نہ لانے کے لئے یہود کے حیلے بہانے

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَآ: یہ دُوسری بات اُن کے سامنے ذکر کی جارہی ہے کہ یہود کو جس وقت حضور ﷺ پر ایمان لانے کے لئے کہا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ ہم اِس نبی پر ایمان نہیں لاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ عہد کیا ہوا ہے کہ ہم ایسے نبی پر ایمان لائیں گے جو ہمارے سامنے یہ معجزہ ظاہر کرے کہ اللہ کے نام پر کوئی قربانی پیش کرے اور آسمان سے آگ آئے جو اُس قربانی کو جلا جائے، جب تک یہ معجزہ نہیں دکھایا جائے گا اُس وقت تک ہم نہیں مانیں گے، اور یہ اُن کا اِفترا اور بہتان تھا، یہ ٹھیک ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا کہ اُنہوں نے قربانی کے طور پر کوئی چیز پیش کی اور آسمان سے آگ آئی اور اس کو کھا گئی، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جب تک کوئی نبی اِس معجزے کو نہ دِکھائے اُس کو نبی نہیں مانیں گے، نہ اُن کی کتاب میں یہ بات مذکور ہے، یہ ''خوئے بدرا بہانہ بسیار!'' کے طور پر گویا حضور ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لئے وہ اس قسم کے بہانے تراشتے تھے، چونکہ یہ بات بالکل ہی خلاف واقع تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے ساتھ کوئی عہد و پیمان نہیں تھا کہ جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھائے اُس وقت تک اُس کو نہیں ماننا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن کو الزام دیا ہے کہ یہ بات جو یہ کرتے ہیں یہ بھی محض دفع الوقتی کے طور پر ہے، ایمان نہ لانے کے لئے ایک بہانے کے طور پر ہے، ورنہ اِن سے پوچھو کہ اگر یہ اتنے ہی عہد کے پکے ہیں تو جو نبی آئے تھے اور اُنہوں نے یہ معجزہ دکھایا تھا اُن کے ساتھ اِنہوں نے کیا کیا، اُن کو بھی قتل کردیا، اُن کو بھی نہیں مانا، تو پھر یہ کیسے کہتے ہیں کہ جو ایسا معجزہ دکھائے ہم اُس کو مان لیتے ہیں، ایسا معجزہ دکھانے والوں کا بھی اِنہوں نے یہی حال کیا ہے، تو اصل یہ ہے کہ ماننا تو ہے نہیں، اور نہ ماننے کے لئے مختلف قسم کے بہانے ہیں، فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ میں یہی بات ہے، کہ جو پہلے معجزے لے کر آئے تھے اور یہ معجزہ بھی لے کر آئے تھے جو تم کہہ رہے ہو، پھر اُن کو تم نے کیوں قتل کردیا، اگر تم اپنے اِس وعدے میں سچے ہو کہ اللہ کا ہمارے ساتھ عہد ہے کہ جو بھی ایسا معجزہ لائے گا ہم اس کو مانیں گے، تو پہلے لانے والوں کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ اِس میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اِن کی یہ بات محض بغض اور عناد کے طریقے سے ہے ورنہ حقیقت میں اِن کا ماننے کا ارادہ نہیں ہے، ''یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم نہیں ایمان لائیں گے کسی رسول پر جب تک کہ نہ لے آئے ہمارے پاس قربان'' قربان کا معنی مَا یُتَقَرَّبُ بِهٖ، جس کے ساتھ قربانی دی جاتی ہے، جس کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے، ''جب تک وہ ایسی

قربانی نہ لائے جس کو آگ کھا جائے۔آپ کہہ دیجئے کہ تحقیق آئے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے واضح دلائل لے کر اور یہ معجزہ لے کر بھی جو تم نے کہا، پھر تم نے کیوں قتل کیا اُن کو اگر تم سچے ہو؟''

سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کے ورثاء کے لئے تسلی

آگے (فَاِنْ كَذَّبُوْكَ میں) حضور ﷺ کے لئے تسلی ہے، کہ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو اِس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ ان کی پُرانی عادت ہے،اور رسولوں کے ساتھ یونہی ہوتا آیا ہے، جب اِن کی پرانی عادت ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، جب رسولوں کے ساتھ پہلے بھی ایسے ہوتا آیا ہے تو آپ کو تسلی رکھنی چاہیے،آپ کے لئے کوئی غم کی بات نہیں ہے۔جیسے کہا کرتے ہیں کہ جس جماعت میں انسان شامل ہو اُس جماعت کی خصوصیات اپنانی پڑتی ہیں،اور جیسے ہمارے شیخ (سعدی ﷫) کہتے ہیں کہ:

یا مکن با پیل باناں دوستی　　　یا بنا کن خانۂ درخورِ پیل

کہ یا تو ہاتھی والوں سے یاری نہ لگایا کرو، اور اگر ہاتھی والوں سے یاری لگائی ہے تو پھر دروازے بڑے بڑے رکھو، کیونکہ جب ہاتھی والے آئیں گے تو ان کو اندر گھسنے کی گنجائش تو ہو (گلستاں، باب ۸)۔اس لیے جن کے ساتھ دوستی ہو تو پھر اُن کے لوازمات کی رعایت رکھی جاتی ہے،آپ رسولوں کی جماعت کے فرد ہیں،اور رسولوں کے ساتھ ہمیشہ لوگوں نے ایسے ہی کیا ہے، جب ایسے ہی کیا ہے اور آپ جب اِس جماعت میں شامل ہیں تو آپ کو بھی حوصلہ رکھنا چاہیے،لوگ یونہی کریں گے، برداشت کرو۔جیسے آپ کی خدمت میں عرض کیا کرتا ہوں کہ آج بسا اوقات بچے گھبرا جاتے ہیں، کہ لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، مولویوں کے ساتھ اِستہزا کرتے ہیں،ان کی ہنسی کرتے ہیں، مخول کرتے ہیں، جب کوئی اس قسم کی بات ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ بھائی تعلق کس جماعت سے رکھتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو رسول اللہ ﷺ کو کہتا ہے: وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ (سورۂ رعد: ۳۲) کہ اگر یہ آپ کا اِستہزا کرتے ہیں تو کیا ہو گیا، پہلے رسولوں کا بھی تو لوگوں نے ایسے ہی اِستہزا کیا، تو جب رسولوں کے ساتھ بھی یہی ہوا اور تم ورثائے انبیاء ہو، رسولوں کے وارث بنے بیٹھے ہو، تو وراثت میں جہاں فوائد آیا کرتے ہیں ذمہ داریاں بھی تو آیا کرتی ہیں، یہ تو نہیں کہ صرف فوائد حاصل کرلو اور ذمہ داریوں سے جان چھڑاؤ، بلکہ اُن ذمہ داریوں کے ساتھ اس قسم کی باتیں بھی آئیں گی، کہ جیسے رسولوں کو لوگوں نے پتھر بھی مارے، اِستہزا بھی کیا، اُن کی تکذیب بھی کی، اسی طرح تم بھی اپنے لئے برداشت کرو، اور اگر تم یہ اِستہزا اور یہ تکذیب برداشت نہیں کرنا چاہتے تو پھر اس جماعت میں رہنے کا کیا مطلب، جب اس جماعت میں شامل ہو گے تو اس قسم کے واقعات تو پیش آئیں گے، آپ کو ٹھنڈے دل سے سننے پڑیں گے اور برداشت کرنے پڑیں گے۔''اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو کوئی تعجب نہیں' فَلَا عَجَبَ! یا، اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو فَلَا تَحْزَنْ کوئی غم نہ کیجئے، آپ سے پہلے بھی بہت سارے رسولوں کی اسی طرح تکذیب کی گئی، وہ بڑے واضح دلائل اور معجزات لے کر آئے تھے، صحیفے لے کر آئے تھے، کتابِ منیر لے کر آئے تھے، کتاب منیر کا مصداق خاص طور پر تورات ہے، کیونکہ حضور ﷺ سے پہلے جو کتابیں اتریں اُن میں سب سے واضح کتاب تورات ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر آئے ہیں وہ سارے اِسی کتاب کے حامل تھے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: یہ بھی تسلی کی بات ہے کہ کوئی

بات نہیں، وندناتے ہیں، اہلِ حق کی مخالفت کرتے ہیں، طعنے دیتے ہیں، باتیں کر کے دل جلاتے ہیں، آخر ایک دن مرنا ہے، جب مرنا ہے تو پھر آنا تو ہمارے پاس ہی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ ''آخر پانی گزرنا تو انہی پلوں کے نیچے سے ہے، جانا کدھر ہے'' تو آ گئے تو آخر اِدھر ہی، كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ: ''ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور قیامت کے دن تمہارے اجر پورے پورے دے دیئے جائیں گے، پھر جو شخص جہنّم سے دُور ہٹا دیا گیا اور جنّت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔''

دُنیوی زندگی دھوکے کا سامان کیسے ہے؟

''اور دُنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے'' دھوکے کے سامان کا کیا مطلب؟ اِس کو یوں سمجھئے جس طرح ایک خوبصورت لیبل لگا ہوا بہترین ڈبہ ہو، اور اُس کے اندر کوئی رڈی سے رڈی چیز ڈال دی جائے، تو ظاہری شکل دیکھ کر انسان مست ہو کر بہت سارے پیسے دے کر خرید کے لے آئے، گھر آ کر کھول کے دیکھا تو اندر سے چیز رڈی نکلی، تو کہتے ہیں کہ ڈبہ کیسا خوبصورت ہے اور اندر سے چیز رڈی۔ تو دھوکے کا سامان یہ ہوتا ہے، اِسی طرح یہاں دُنیا کی زیب و زینت پر اور آرائش و زیبائش پر انسان ریجھتا ہے، اور اِس کی طرف رغبت کرتا ہے، حالانکہ یہ بالکل فانی ہے اور چند دنوں کے بعد اِس کا نتیجہ جو سامنے آتا ہے وہ خطرناک ہے۔ یا اِس کی مثال اگر آپ سمجھنا چاہیں تو اِس طرح سمجھ لیجئے جیسے سانپ تو آپ حضرات نے دیکھے ہی ہوں گے، بعض سانپ ایسے ہوتے ہیں جن پر بڑا نقش و نگار ہوتا ہے اور بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، دیکھ کر بڑے پیارے لگتے ہیں، اگر انسان خوبصورت سمجھ کے اور نرم سا دیکھ کے اُس کو اٹھائے اور اُٹھا کے جیب میں ڈال لے کہ یہ تو بڑی اچھی چیز ہے، لیکن جس وقت وہ ڈنک مارے گا اور اُس کی زہر پھیلے گی تب آپ کو پتہ چلے گا کہ اِس مارِ منقش کے اندر جو زہر تھی وہ کتنی مہلک ہے؟ یا یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کے سامنے کوئی حلوہ پیش کر دے بڑا الذیذ سا بنا ہوا، اور اُس کے اندر سنکھیا ملا دے، جس وقت آپ کھائیں گے تو مزہ بہت آئے گا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب آنتڑیاں کٹنے لگیں گی پھر آپ کہیں گے یہ تو دھوکے کا مال تھا، کہ اِس کا ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ ہے۔ اسی طرح دُنیا کی لذّات پرستی اور دُنیا کی آرائش ظاہری طور پر انسان کو اچھی لگتی ہے کہ کشش کرتی ہے، اور جب انسان اِس کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، شہوت پرستی میں پڑ جاتا ہے، لذّات اُٹھانے لگ جاتا ہے، تو تھوڑے سے وقت کے بعد ہی اس کا نتیجہ نہایت ہی خطرناک شکل میں سامنے آتا ہے، تو اِس کو دھوکے کا سامان نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ جو شخص بھی اِس کے دھوکے میں آ گیا اور اِس کو مطلوب بنا کر اِس کے پیچھے پڑ گیا، آخر وہ اپنی آخرت برباد کر بیٹھا، اِس سے زیادہ دھوکا کسی کے ساتھ اور کیا ہوگا، اس لیے تمہیں متنبہ کر کے یہی کہا جا رہا ہے کہ اِس کا لیبل دیکھ کر اور اِس کے ظاہری نقش و نگار کو دیکھ کر اِس پر مرو نہیں، یہ اندر سے بڑی خطرناک چیز ہے، اِس کو اتنا ہی لوجتنا تمہارے لئے ضروری ہے، اور باقی فکر اپنی آخرت کی کرو۔

یہود اور منافقین کی تکلیف دِہ باتوں پر مسلمانوں کو ہدایات

لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ: اب اِس قسم کی باتیں سُن کر جیسے یہ منافق اور یہودی کرتے تھے، مسلمانوں کو بڑا دُکھ ہوتا تھا، بلکہ تفسیروں میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے، غالباً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی یہودی نے ایسی بات کر دی اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ

اَذًى كَثِيرًا، جس طرح سے پیچھے بات گزری ہے، اُن کو جو غصہ آیا تو اُس کو تھپڑ مارا، حضور ﷺ کے پاس واقعہ پہنچا تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں (مظہری وغیرہ)، جن میں یہ بتایا گیا کہ یہ کیا بات ہے؟ اِس سے بھی بڑی بڑی باتیں سنو گے، صبر کرو، بس اللہ کے اَحکام کی پابندی کرو، ایسے اقوالِ موذیہ اور تکلیف دِہ باتیں اِن کی طرف سے سنتے ہی رہو گے، کس کس بات پر ان کے ساتھ اُلجھو گے؟ جتنا اُلجھنے کی کوشش کرو گے اتنا یہ اور چڑائیں گے اور تمہارا وقت ضائع کریں گے، ساری توجہ اس طرف ہو جائے گی، اور باقی کام چھوٹ جائیں گے، جیسے دُنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے کی بات پر چڑنے لگ جائے تو دُوسرا اُس کو اور زیادہ چڑاتا ہے، پھر بات بات پر اُس سے اُلجھو گے تو اپنے بہت سارے کام چھوڑ بیٹھو گے۔ اور طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس قسم کی بدتمیزی اور بدتہذیبی کی بات کرتا ہے تو اَن سنی کر دو، گویا کہ سنی ہی نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُشمن خود ناکام ہو جائے گا، تمہارا وقت ضائع نہیں کر سکے گا، تمہیں پریشان نہیں کر سکے گا، اور تمہارے اپنے کام بھی ہوتے رہیں گے، اس لئے صبر و استقلال کو اپناؤ، تقویٰ کو اپناؤ کہ اللہ کے اَحکام کی خلاف ورزی نہ ہو پائے، باقی! مشرکوں کی طرف سے، یہودیوں کی طرف سے اور منافقوں کی طرف سے تو تکلیف دِہ باتیں تم سنتے ہی رہو گے، اور بہت ساری سنو گے، یہ کیا ہے، اس لئے ہر ہر بات پر اشتعال میں اور غصے میں نہیں آ جانا چاہیے۔ ''البتہ ضرور آزمائے جاؤ گے تم اپنے مالوں کے بارے میں اور جانوں کے بارے میں، اور البتہ ضرور سنو گے تم ان لوگوں کی طرف سے جو کتاب دیے گئے تم سے قبل، اور ان لوگوں کی طرف سے جو شرک کرتے ہیں، سنو گے تم اَذًى كَثِيرًا'' یعنی اقوالِ موذیہ کثیرہ، بہت ساری تکلیف دِہ باتیں اِن کی طرف سے سنو گے، ''اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہی تمہاری کامیابی ہے، اور یہی تاکیدی احکام میں سے ہے، ہمت کے کاموں میں سے ہے'' ہمت کر کے صبر و تقویٰ کو اپنانا چاہیے، اور اگر کسی بات پر کوئی شخص تمہیں اشتعال دلانے کی کوشش کرتا ہے تو جلدی سے مشتعل نہ ہو جایا کرو، اشتعال میں آنے کے ساتھ انسان اپنا وقت ضائع کرتا ہے اور بہت سارے ضروری کاموں سے محروم ہو جاتا ہے، اپنے ضروری کاموں کی طرف توجہ رکھو، دوسرا کوئی بکتا ہے، بولتا ہے، بھونکتا ہے تو اس کو بھونکنے دو۔ تو انسان کا تعمیری کردار اِسی طرح بنا کرتا ہے، اور اگر دوسرے کی ایک ایک بات پر اس کے ساتھ اُلجھنا شروع کر دے تو اپنے بہت سارے ضروری کاموں سے انسان محروم رہ جاتا ہے۔

یہود اور منافقین کی بدکرداری پر اُن کو تنبیہ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: یہ بھی انہیں ایک تنبیہ ہے، کہ یہ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں، یہ تو ان کی بکواس ہے، خرافات ہیں، اور ان کے افتراءات ہیں، جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، عہد تو ان سے یہ لیا گیا تھا کہ اللہ کی کتاب کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا ہے، اللہ کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا ہے، اِس کتاب کو چھپانا نہیں۔ جو عہد لیا گیا تھا اُس کو پس پشت ڈال دیا، اور ساری کی ساری کتاب مسخ کر کے رکھ دی، محرف کر کے رکھ دی، اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر اللہ کی باتیں چھپالیں۔ تو جو عہد لیا گیا اُس کی پابندی نہیں کرتے، اور جو نہیں لیا گیا اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم سے عہد ہے، یہ بھی اُن کی ایک بدتمیزی تھی۔ ''جن کو کتاب دی گئی ان سے یہ پختہ لیا گیا تھا کہ وہ اِس کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور اِس کتاب کو

چھپا کرنہیں رکھیں گے، اِس عہد کوانہوں نے پس پشت پھینک دیا' پس پشت پھینک دینالا پروائی سے کنایہ ہوتا ہے، یعنی جس بات کی طرف توجہ نہ کی جائے تواُس کو کہتے ہیں کہ اِس بات کوپس پشت ڈال دیا، وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اور اِس کو پس پشت ڈال کر اِس کے بدلے میں دُنیا کا سامان، ثمن قلیل اختیار کیا، یعنی اپنے دُنیوی مفاد کو مقدم رکھا،'' حاصل کیا ثمن قلیل'' فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ: بُری ہے وہ بات جس کو یہ حاصل کرتے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ: اِس میں بھی منافقوں اور یہودیوں کے اوپر مشترکہ انکار ہے، جو آدمی چالباز اور دھوکے باز ہوا کرتا ہے وہ بسا اوقات دوسرے کودھوکا دے کرخوش ہوتا ہے کہ دیکھو! میں نے کیسے ہاتھ کی صفائی کے ساتھ اپنا کام نکال لیا اور اُن کو پتا بھی نہیں لگنے دیا، اور بسا اوقات چالباز آدمی شرارت کرتا ہے اور اُس شرارت کے ساتھ دوسرے کو پریشان کردیتا ہے، اور دوسرے کو پریشان دیکھ کر پھرخوش ہوتا ہے کہ دیکھو! ہم نے کیسی کارروائی کی کہ وہ اب کس طرح پریشان پھر رہے ہیں، یہ دُنیا کے اندر ہوتا رہتا ہے، تو منافق بھی کرتے تھے اور یہودی بھی کرتے تھے، اور عام معاشرے میں بھی شرارت پسند لوگ اسی طرح شرارتیں کر کے بعد میں خوش ہوتے ہیں کہ'' دیکھو! ہمارا کیسا شاندار تیر ٹھکانے لگا، کہ ہم نے فلاں کو پریشان کردیا اور پتا بھی نہیں چلا کہ کس نے کیا؟ اور ہم نے یہ بات یوں کردی اور خود الزام سے بھی بچ گئے!'' یہ ہمارے معاشرے میں بھی اس قسم کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، شرارت پسند لوگ اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں، کہ کریں گے بُرا کام، پھیلائیں گے شرارت، اور پھر خود جو بچ جائیں گے اور اپنی صفائی دے کر خود اچھے ثابت ہو جائیں گے، تو پھر بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں کہ'' دیکھو! ہم نے یوں کر بھی لیا اور اپنے اُوپر الزام بھی نہیں آنے دیا، اور وہ ہمیں اچھا اور قابلِ اعتماد ہی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ شرارت ہم نے کی ہے!'' اس قسم کے کردار پر منافق بھی خوش ہوتے تھے، کہ جب جہاد کا موقع آتا گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے جیسے سورۂ براءۃ میں اِس کی تفصیل زیادہ آئے گی، اور جب حضور ﷺ واپس تشریف لاتے تو جا کر قسمیں کھا کے، جھوٹے عُذر کردیتے، کہ یہ واقعہ پیش آ گیا تھا ورنہ ہم نے ضرور چلنا تھا، حضور ﷺ معاف کردیتے، پھر وہ لوگ خوش ہوتے کہ دیکھو! ہم جہاد میں بھی نہیں گئے اور انہیں خوش بھی کرلیا، دونوں کام ہی ہوگئے، تو اپنے اِس کردار پر وہ خوش ہوتے تھے۔ اور پھر جو کام انہوں نے نہیں کیے ہوتے تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کاموں کی بنا پر ہماری تعریف کی جائے، مثلاً یہود حق بیان تو نہیں کرتے تھے، لیکن اِن کا دل یہ چاہتا تھا کہ ہمیں حق پرست کہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ بڑے حق گو ہیں، بڑے متقی ہیں، بڑے پرہیزگار ہیں، بڑے اللہ والے ہیں، یہ باتیں سننا چاہتے تھے، اور منافقین کے دل میں بھی یہی جذبہ تھا کہ کرتے کراتے تو کچھ نہیں لیکن ہمیں'' مجاہدِ ملت'' کہا جائے، کہ یہ تو بڑے خادمِ دین ہیں، بڑے عاشقِ رسول ہیں، بڑے مجاہدِ ملت ہیں، اس قسم کی تعریفیں سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتے، کیے کرائے بغیر ہی۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن کے یہ جذبات ہیں کہ اختیار تو کرتے ہیں بُرا کردار، اور پھر خوش ہوتے ہیں کہ دیکھو! ہم نے کیا کرلیا، اور اسی طرح کام تو کرتے نہیں اور اس قسم کے حالات پیدا کر کے اپنی تعریف کروانا چاہتے ہیں، یہ اپنے آپ کو کامیاب نہ سمجھیں۔'' کامیاب نہ سمجھیں'' یہ انکار ہے اُس کے ذہن پر کہ انسان اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ دیکھو! میں نے کیسی چابکدستی کی کہ اپنا مقصد حاصل کرلیا، اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا یہ کامیاب رویہ ہے کہ میں نے کیا کرایا کچھ نہیں اور تعریف کروالی، یا میں نے کیا کرایا تھا اور میرا پتا نہیں چلا اور میں بچ گیا،

شرارت بھی کرلی اور پریشان بھی کرلیا اور اپنے پہ الزام بھی نہیں آنے دیا، اللہ فرماتے ہیں یہ کوئی کامیابی نہیں ہے، ان کو آخرت میں جاکر جس وقت ان سب چیزوں کا سامنا کرنا ہوگا اور دردناک عذاب ان کو پہنچے گا تب پتہ چلے گا کہ ان کے جذبات کتنے غلط تھے؟ تو منافقین اور یہود دونوں کے اوپر یہ مشترکہ انکار ہے،'' ہرگز نہ سمجھ تو اُن لوگوں کو جو خوش ہوتے ہیں اپنے کیے پر، اور پسند کرتے ہیں کہ تعریف کئے جائیں وہ ایسے کاموں کے ذریعے سے جو انہوں نے کیے نہیں'' فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ: ان کو عذاب سے چھٹکارے میں نہ سمجھ، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے اختلاف میں البتہ نشانیاں ہیں عقل

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ

والوں کے لئے ﴿۱۹۰﴾ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے ہونے کی حالت میں اور بیٹھے کی حالت میں اور اپنی کروٹوں پر لیٹنے کی حالت میں

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ

اور غور وفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، (کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے اس مخلوق کو بیکار پیدا نہیں کیا،

سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ

تو ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، پس بچا تو ہمیں جہنم کے عذاب سے ﴿۱۹۱﴾ اے ہمارے پروردگار! بے شک جس کو

النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ

تو نے داخل کر دیا جہنم میں پس تو نے اسے رسوا کر دیا، اور نہیں ہے ظالموں کے لئے کوئی مددگار ﴿۱۹۲﴾ اے ہمارے پالنے والے!

اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ

بیشک ہم نے سنا ایک آواز دینے والے کو جو آواز دے رہا تھا ایمان کے لئے کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ، پھر ہم ایمان لے آئے،

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا

اے ہمارے پالنے والے! ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری کوتاہیوں کو دور کردے اور ہمیں وفات دے

مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ

نیکوں میں شامل کر کے ﴿۱۹۳﴾ اے ہمارے رب! تو دے ہمیں وہ چیز جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اپنے رسولوں کی زبان پر

وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ

اور ہمیں رسوا نہ کرنا قیامت کے دن، بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا ﴿۱۹۴﴾ پس قبول کرلی

لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ

اُن کی دعا کو اُن کے رَبّ نے، (کیونکہ میری عادت یہ ہے) کہ میں نہیں ضائع کرتا کسی کام کرنے والے کے کام کو تم میں سے، چاہے مرد ہو یا

اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

عورت، تم بعض بعض سے ہو، پس وہ لوگ جنہوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا اور وہ اپنے گھروں سے نکال دیے گئے

وَاُوْذُوْا فِىْ سَبِيْلِىْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

اور تکلیف پہنچائے گئے میرے راستے میں اور انہوں نے لڑائی لڑی اور قتل ہوئے البتہ ضرور دور ہٹادوں گا میں اُن سے

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ

اُن کے گناہ اور البتہ ضرور داخل کروں گا میں انہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی،

ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

وہ بدلہ دیے گئے اللہ کی جانب سے، اور اللہ کے پاس بہت اچھا بدلہ ہے ﴿۱۹۵﴾

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِى الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ

اے مخاطب! شہروں میں کافروں کا چلنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈالے ﴿۱۹۶﴾ یہ بہت تھوڑا سا فائدہ ہے،

ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا

پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے ﴿۱۹۷﴾ لیکن وہ لوگ جو اپنے رَبّ سے

رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

ڈرتے ہیں اُن کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے

نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ

یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے نیک لوگوں کے لئے ﴿۱۹۸﴾

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ

اہل کتاب میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو تمہاری طرف اتاری گئی

وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ

اور اس چیز پر جو ان کی طرف اتاری گئی اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں، نہیں لیتے وہ اللہ کی آیات کے بدلے

ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ

ثمن قلیل، یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب

الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۫ قف

لینے والے ہیں ﴿۱۹۹﴾ اے ایمان والو! صبر کرو اور (دشمن کے مقابلے میں) ڈٹ جاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کرو،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع

اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۲۰۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ: بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے اختلاف میں البتہ نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ اَلباب لُب کی جمع ہے، اور لُب کسی چیز کے مغز اور خلاصے کو کہتے ہیں، جیسے آپ کسی مسئلے پر بحث کرتے ہیں تو ساری بحث کے بعد کہتے ہیں کہ اس بحث کا لبِ لباب یہ ہے، یعنی اس کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے، تو اس کا مصداق عقل بھی ہے، لُب: خالص عقل، اولی الالباب: عقل والے، اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ: قیام قائم کی جمع، اور قعود قاعد کی جمع، عَلٰی جُنُوْبِهِمْ یہ متعلق ہے مُضْطَجِعِیْنَ کے، اِضْطِجَاع: لیٹنا، جنوب جنب کی جمع ہے۔ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوتے ہیں اور اس حال میں کہ وہ بیٹھے ہوتے ہیں اور اس حال میں کہ وہ اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوتے ہیں، یعنی کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں اور لیٹنے کی حالت میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور ان تینوں حالتوں کو ذکر کر کے عموم مراد ہے یعنی ہر وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں، کیونکہ اکثر و بیشتر انسان کی حالتیں یہی ہوتی ہیں، یا کھڑا ہوگا یا بیٹھا ہوگا یا لیٹا ہوگا۔ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور غور و فکر کرتے ہیں

آسمانوں اورزمین کے پیدا کرنے میں، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا: اِس سے پہلے یقولون کالفظ محذوف ہے، یتفکرون یقولون ربنا یعنی غوروفکر کرنے کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کہنے لگ جاتے ہیں اے ہمارے رَبّ! مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا: هٰذَا سے مذکورمراد ہےیعنی زمین وآسمان، یہ اشارہ مجموعہ کی طرف ہوگا، اے ہمارے پروردگار! تو نے اِس مخلوق کو بےکار پیدانہیں کیا۔هٰذَا کا اشارہ مخلوق کے اعتبار سے آسمان وزمین کی طرف ہوجائے گا۔سُبْحٰنَكَ: توہرقسم کے عیب سے پاک ہے، اور باطل کام کا کرنا بھی مستقل عیب ہے، اس لیے کوئی عبث، کوئی بیکار، اور کوئی بے فائدہ کام تیری طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا،''توپاک ہے'' فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ: پس توبچاہمیں جہنم کے عذاب سے۔قِ امر کا صیغہ ہے، اور نَا: مفعول ہے۔وَقٰی یَقِیْ وِقَایَۃً: بچانا، بچاتوہمیں جہنم کے عذاب سے، رَبَّنَآ: اے ہمارے پروردگار! اے ہمارے پالنے والے! اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ: بیشک تو نے جس کوداخل کردیا جہنم میں پس تُو نے اُسے رُسوا کردیا، وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ: اورنہیں ہے ظالموں کے لئے کوئی مددگار۔رَبَّنَآ: اے ہمارے پالنے والے! اِنَّنَا سَمِعْنَا: بے شک ہم نے سُنا، مُنَادِيًا يُّنَادِيْ: ایک آواز دینے والے کو جوآوازیں دے رہا تھا، لِلْاِيْمَانِ: ایمان کے لئے، پکاررہاتھاایمان کے لئے، اَنْ اٰمِنُوْا: یہ کہہ رہاتھا، اَنْ تفسیر یہ ہے، جیسے نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ (سورۂ صافات) تو یہ اَن نداء کی تفسیر ہے، وہ یہ کہہ رہاتھااَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا: اے لوگو! تم اپنے رَبّ پر ایمان لے آؤ، فَاٰمَنَّا: ہم نے اس کی پکارسنی، پھرہم ایمان لے آئے، رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا: اے ہمارے پالنے والے! ہمارے گناہ بخش دے، وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا: اور ہماری کوتاہیوں کودُور کردے، وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ: اَبرار برّ کی جمع ہے، بَرّ نیک کو کہتے ہیں، اورہمیں وفات دے نیکوں میں شامل کرکے، اصل کے اعتبار سے بَرّ کا مفہوم ہوتا ہے وفادار، جودوسرے کے حقوق کوادا کرنے والا ہے، اور دُوسرے کے ساتھ جیسا کہ چاہئے ویسابرتاؤ کرنے والا ہے، پہلے بھی یہ لفظ آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا بِرُّالْوَالِدَيْنِ۔ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ، وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ (سورۂ مریم:۳۲)، لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (سورۂ بقرہ:۱۷۷) یہ لفظ بہت دفعہ گزرچکا ہے، اصل میں ادائے حقوق کامفہوم اِس میں ہوتا ہے، جو تیرے وفادار ہیں، جوتیرے حقوق ادا کرنے والے ہیں، نیک لوگ ہیں، ہمیں اُن کے ساتھ وفات دے، یعنی ان میں شامل رکھ کے، جب ہماری وفات ہوتو ہماراشمار اَبرار میں ہو، رَبَّنَا وَاٰتِنَا: اے ہمارے ربّ! ''اٰتِ'' اَمر کا صیغہ ہے، ''نَا'' مفعول ہے، دےتوہمیں، مَا وَعَدْتَّنَا: وہ چیزجس کاتُونے ہم سے وعدہ کیا ہے عَلٰى رُسُلِكَ: عَلٰۤى اَلْسِنَةِ رُسُلِكَ اپنے رسولوں کی زبان پر، اپنے رسولوں کی زبانی جوتُو نے ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں دےدے، وَلَا تُخْزِنَا: لَا تُخْزِ نہی، ''نَا'' مفعول، اورہمیں رُسوانہ کرنا، يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: قیامت کے دن، اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: بیشک تووعدے کے خلاف نہیں کرتا۔فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ: پس قبول کرلیااُن کے لئے ان کے رَبّ نے اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ: اِس وجہ سے کہ میری عادت یہ ہے کہ میں نہیں ضائع کرتاکسی کام کرنے والے کے کام کو، اُن کی پکارکوقبول کرلیا، اُن کی دُعاکو قبول کرلیا، کیونکہ میری عادت یہ ہے: عَادَتِيْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ۔''عَادَتِيْ'' مبتدا ہوگا، اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ خبر۔میری عادت یہ ہے کہ میں نہیں ضائع کرتاکسی کام کرنے والے کے کام کوتم میں سے، مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى: مذکرہویامؤنث ہو، مردہویاعورت ہومیں کسی کام کرنے والے کے کام کوضائع نہیں کرتا، فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا: پھروہ لوگ جنہوں نے اپنے گھربارکوچھوڑا، وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ: اوروہ اپنے گھروں سے نکال دیے گئے وَاُوْذُوْا: اوروہ تکلیف پہنچائے گئے فِيْ سَبِيْلِيْ: میرے راستے میں۔فِيْ سَبِيْلِيْ کاتعلق تینوں کے ساتھ

ہے، فَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ، اُخْرِجُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ، اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ، تنازُع فعلین کے اصول سے، میرے راستے میں انہوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا، وطن کو چھوڑا، اور چھوڑا بھی خوشی کے ساتھ اور سیر سیاحت کے لئے نہیں اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ: نکال دیے گئے تنگ کر کے وہ اپنے گھروں سے، وَاُوْذُوْا: اور وہ تکلیف پہنچائے گئے، وَقٰتَلُوْا: اور اُنہوں نے لڑائی لڑی وَقُتِلُوْا: اور قتل ہوئے لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ: البتہ ضرور ضرور دور ہٹادوں گا میں اُن سے ان کے گناہ، یہاں سیئات عام ہے چھوٹے بڑے سب گناہوں کو شامل ہے، وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ: اور البتہ ضرور داخل کروں گا میں انہیں جَنّٰتٍ: باغات میں تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ: اس حال میں کہ یہ بدلہ ہے اللہ کی جانب سے، ثَوَابًا منصوب ہوگا یا تو حال کے طور پر، یا: اُثِيْبُوْا ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ: دیے گئے وہ بدلہ اللہ کی جانب سے، وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ: اور اللہ کے پاس بہت اچھا بدلہ ہے۔ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ: بلاد، بلد کی جمع، بلد شہر کو کہتے ہیں، ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے تجھے چلنا پھرنا کافروں کا شہروں میں، تَقَلُّب: چلنا پھرنا کاروبار کے لئے، سیر و سیاحت کے لئے، ''شہروں میں کافروں کا چلنا پھرنا اے مخاطب! تجھے دھوکے میں نہ ڈالے'' مَتَاعٌ قَلِيْلٌ: یہ بہت تھوڑا سا سامان ہے، فائدہ اٹھانے کی چیز ہے بہت کم، ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، وَبِئْسَ الْمِهَادُ: اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا: لیکن وہ لوگ جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ: نزیل کہتے ہیں مہمان کو، اور نُزُل کہتے ہیں اس کھانے کو جو مہمان کے لئے تیار کیا جاتا ہے، تو چونکہ وہ کھانا جو مہمان کے لئے تیار کیا جاتا ہے میزبان اپنی حیثیت کے مطابق تیار کرتا ہے، مہمان کا اعزاز کرتے ہوئے اچھی سے چیز تیار کرتا ہے، تو جنتیوں کے لئے اللہ تعالیٰ یہ ساری چیزیں ایسے طور پر تیار کر رہے ہیں گویا کہ جنتی اللہ کے مہمان ہیں، نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ: یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، یہ جو کچھ اُن کو دیا جائے گا یہ مہمانی ہے اللہ کی جانب سے، وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ: اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اَبرار کے لئے۔ ''اَبرار'' کا معنی پہلے آپ کے سامنے آ گیا، نیک لوگ، بَر کی جمع ہے۔ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ: يُؤْمِنُ مفرد کا صیغہ ہے مَن کے لفظوں کی طرف دیکھتے ہوئے، اہلِ کتاب میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف اُتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف اُتاری گئی، خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ: اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں، لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا: نہیں لیتے وہ اللہ کی آیات کے بدلے ثمن قلیل، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے اجر ہے اِن کے رَبّ کے پاس، اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو!، اصْبِرُوْا: صبر کرو، وَصَابِرُوْا: دشمنوں کے مقابلے میں بھی ڈٹ جاؤ، صَابِرُوْا باب مفاعلہ ہے، مصابرۃ: دُوسرے کے مقابلے میں صبر کرنا، تو عام حالات میں بھی صبر کرو اور دشمن کے مقابلے میں بھی مستقل رہو، ڈٹ جاؤ، وَرَابِطُوْا: رَابِطُوْا مُرَابَطَة، باب مفاعلہ کا مصدر، اس کا ماخذ رَبط ہے، ربط کا معنی باندھنا، اور رَابِطُوْا رِبَاط قتال کے وزن پر بھی مصدر آتا ہے، مرابطہ مقاتلہ کے وزن پر، اس کا معنی دو طرح سے کیا گیا ہے ''جو نیک اعمال تمہیں بتائے گئے ہیں اُن کے اوپر جم جاؤ، اپنے آپ کو اُن پر پابند رکھو'' تومداومت علی الاعمال الصالحہ یہ بھی مرابطہ کا مفہوم ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیک اعمال پر دوام اختیار

کرو، اپنے آپ کو باندھ کے رکھو اِن نیک اعمال کے لئے جو تمہیں بتائے گئے ہیں، اس لئے حضرت شیخ (الہندؒ) کا ترجمہ اسی مفہوم کے مطابق ہے وہ کہتے ہیں کہ ''مقابلے میں مضبوط رہو (یہ صابروا کا مفہوم ہے) اور لگے رہو'' مسلسل عمل اختیار کرو، مرابطہ کا یہی مفہوم ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کرر ہا ہوں۔ اور مرابطہ کا دوسرا مفہوم ہوتا ہے کہ سرحد پر گھوڑے باندھ کے رکھو، دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہو، تو سرحد کی حفاظت یہ بھی رباط کا مفہوم ہے، پھر رَابِطُوْا کا مطلب یہ ہوگا کہ سرحدوں کی مضبوطی سے حفاظت کرو، دشمن تمہاری غفلت سے فائدہ نہ اُٹھانے پائے، ''سرحدوں کی حفاظت کرو'' وَاتَّقُوا اللهَ: اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع کا مضمون

یہ سورۂ آلِ عمران کا آخری رُکوع ہے، جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے آخر میں ایمان لانے والوں کی تعریف فرمائی اور اُن کو کچھ دُعاؤں کی تلقین کی کہ وہ یوں دُعائیں کرتے ہیں، اور پھر اُن دُعاؤں کے قبول کرنے کا ذکر فرمایا، اسی طرح آلِ عمران کے آخر میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ایمان والوں کا، توحید اختیار کرنے والوں کا، اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والوں کا ذکر کیا، اور پھر اُن کی زبان سے کچھ دُعائیں ذکر کی ہیں کہ وہ یوں دُعائیں کرتے ہیں، اور پھر اپنی طرف سے اُن کے قبول کرنے کا ذکر فرمایا، اور پھر خصوصیت کے ساتھ اُن لوگوں کا ذکر کیا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مہاجرین کے عنوان سے ذکر کیے جاتے تھے، مکہ معظمہ سے اور اردگرد کے علاقوں سے اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ منورہ میں اکٹھے ہوئے تھے، انہوں نے اللہ کے راستے میں بہت تکلیفیں اُٹھائی تھیں، اس لیے پھر خصوصیت سے اُن کا ذکر کیا، کہ میں کسی کے عمل کو بھی ضائع نہیں کرتا، لیکن میرے راستے میں جو تکلیفیں اُٹھانے والے ہیں، اور اپنے گھر بار کو چھوڑ کر آنے والے ہیں، میرے راستے میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں، اِن کے عمل کو میں نے کیا ضائع کرنا ہے؟ ان کو ثواب دوں گا۔ پھر یہ ذکر کیا کہ یہ کافر لوگ اگر عارضی طور پر دندناتے پھرتے ہیں، تم اِن کی چہل پہل دیکھتے ہو کہ سیر و سیاحت کے لئے اور کاروبار کے لئے یہ چلتے پھرتے ہیں، تو اِس سے کسی دھوکے میں نہ پڑ جانا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عارضی سی چیز ہے جو انہیں دی گئی ہے، ان کا آخر ٹھکانہ جہنم ہے، حقیقی کامیابی اگر انسان کو نصیب ہوتی ہے تو تقویٰ کے ساتھ اور بِر اختیار کرنے کے ساتھ ہوتی ہے، وہ اللہ کے مہمان ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اُن پر اس طرح انعام کرے گا جیسے انسان مہمان کی خدمت کیا کرتا ہے، مہمان کو اپنی حیثیت کے مطابق کھلاتا پلاتا ہے اور راحت اور آرام پہنچاتا ہے، تو اس قسم کے لوگ جنت میں اللہ کے مہمان ہوں گے۔ پھر آپ نے دیکھا کہ ساری سورت میں ابتدا سے ہی اہلِ کتاب کے ساتھ خاص طور پر گفتگو رہی ہے، بلکہ سورت کی ابتدا میں جو مسئلہ توحید کو شروع کیا گیا تھا وہ اہلِ کتاب کی وجہ سے ہی شروع کیا گیا تھا کہ نصاریٰ حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے لئے آئے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تذکرہ ہوا تو توحید کا مضمون آیا تھا، اس لیے

آخر میں جا کے اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کی تعریف کردی جو اپنی کتابوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اِس نئی کتاب کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں، اور دوسرے دُنیادار یہود ونصاریٰ کی طرح حق کو چھپا کر دُنیا کا فائدہ حاصل نہیں کرتے، تو جو اپنی کتابوں کو بھی مانتے ہیں اور جو کتاب تمہاری طرف اُتاری گئی اُس کو بھی مانتے ہیں اس قسم کے لوگوں کے لئے قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ بھی دُو اجروں کا وعدہ کیا گیا ہے تو اُن کی تعریف کردی۔ اور آخری آیت میں مسلمانوں کو چند ایک نصیحتیں کی گئی ہیں، اور اُن پر پابندی کے لئے کہا گیا ہے، یہ مضمون ہے اِس رُکوع کا جو آپ کے سامنے پڑھا گیا۔

آخری رُکوع کی فضیلت

ان آیات کی حدیث شریف میں بھی خصوصیت کے ساتھ فضیلت آتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی فضیلت ہے، اُن کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص سورۂ بقرۃ کی آخری دو آیتیں رات کو پڑھ لے، تو وہاں لفظ ہیں کہ یہ آیتیں اُس کے لئے کافی ہوجاتی ہیں،[1] یعنی اگر کوئی شخص رات کو کوئی اور وِرد وظیفہ نہ بھی کرسکے تو اُس کو غافل نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اُن آیات کے پڑھنے کی وجہ سے قرآنِ کریم کا جو حق اُس کے ذِمّے آتا ہے وہ ادا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اِن آیات کے متعلق آتا ہے کہ اِن آیات کی اگر کوئی شخص رات کو تلاوت کرتا ہے تو اس کو قیامِ لیل کا ثواب ملتا ہے۔[2] تہجد کی روایات میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت منقول ہے کہ آپ جس وقت اُٹھا کرتے تھے تو اُٹھتے ہی پہلے اِن آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے، اِن آیات کی تلاوت کرنے کے بعد پھر وضو وغیرہ کرکے نماز پڑھتے تھے، بہت ساری روایات میں اِس کو ذکر کیا گیا ہے، بعض روایات میں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ سے لے کر اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ تک مذکور ہے، اور بعض میں ہے: حَتّٰی خَتَمَ السُّوْرَۃَ یہاں تک کہ سورت کو ختم کردیتے تھے،[3] یعنی پورا رُکوع پڑھنے کا ذِکر ہے، اور اِس پڑھنے پر قیامِ لیل کے ثواب کا وعدہ ہے۔

نظامِ کائنات اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی دلیل کیسے ہے؟

اِس میں جو مضمون ذکر کیا گیا ہے وہ آسان ہے، کہ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے اندر بھی توحید مذکور تھی، آگے اِسی مناسبت سے توحید کے مضمون کی طرف انتقال ہے۔ ''زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں اور دِن اور رات کے اختلاف میں'' یہ لفظ پہلے بھی گزر چکے، لَاٰیٰتٍ: علامات ہیں عقل والوں کے لئے، کہ عقل کے ساتھ اگر سوچنا شروع کریں، زمین کی پیدائش میں غور کریں اور آسمان کی پیدائش میں غور کریں، کہ یہ کس طرح سے بنائے گئے، کتنی عظیم الشان چیزیں ہیں، کیسا

---

(۱) بخاری ۲/ ۷۵۳، باب من لم یر بأسا ان یقول الخ وغیرہ/ مسلم ۱/ ۲۷۱، باب فضل الفاتحۃ/ مشکوٰۃ ص ۱۸۵، کتاب فضائل القرآن، فصل اول، عن ابی مسعود۔

(۲) عن عثمان قال من قرء آخر آل عمران فی لیلۃ کتب لہ قیام لیلۃ. (دارمی، باب فضل آل عمران، رقم ۳۴۳۹/ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۸۹ کتاب فضائل القرآن، فصل ثالث)۔

(۳) مسلم ۱/ ۲۶۱ باب صلاۃ النبی ودعاؤہ باللیل، اور مشکوٰۃ ۱/ ۱۰۶ پر حتی ختم السورۃ ہے۔ نسائی ۱/ ۱۸۵ اور مشکوٰۃ ۱/ ۱۰۷ پر انک لا تخلف المیعاد تک ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس میں نظم قائم کیا ہے؟ بلندی کی جانب آسمان آ گیا، پستی کی جانب زمین آ گئی، تو دونوں طرف ذکر کرنے کے ساتھ گویا کہ جانبین کا احاطہ ہو گیا، جو کچھ بھی ہمارے سامنے آتا ہے جانب بالا میں اور جانب سفلی میں سب کا ذکر آ گیا، تو زمین وآسمان میں غور کریں گے کہ اِس کے اندر ستارے ہیں، سیارے ہیں، سورج ہے، چاند ہے اور فضا کے اندر ہواؤں کا چلنا، یہ کچھ بھی ہے، اِن سب میں جس وقت غور کیا جائے گا تو غور کرتے ہوئے انسان اِس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ نہ تو اس میں کسی انسان کی عقل کام کر رہی ہے، اور نہ یہ ساری کی ساری چیزیں خود بخود چل رہی ہیں، کیونکہ خود بخود کوئی چیز اتنے نظم ونسق کے ساتھ اور اتنے فوائد پر مشتمل ہو کر اپنا وقت نہیں گزار سکتی۔ اور انسان کی عقل بھی اِس میں دخیل نہیں ہے کہ کوئی انسان اس کو چلانے والا ہو، کیونکہ ہمارے سامنے یہ تجربہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اسباب مہیا ہو جانے کے بعد اور اپنی کامل عقل کو استعمال کرنے کے بعد انسان ایک چیز بناتا ہے، اور یہ روزمرہ کے مشاہدے ہیں کہ وہ چیز بھی انسان کی منشاء کے مطابق نہیں چلتی، جیسے انسان نے ہوائی جہاز بنایا تو وہ بھی کبھی کبھی ایسے گرتا ہے کہ اُس میں بیٹھنے والوں اور اس کو چلانے والوں کا نام ونشان نہیں ملتا، اسی طرح انسان موٹریں اور کاریں بناتا ہے تو کتنی ہی احتیاط کے ساتھ ان کو بنائے اور کتنی ہی احتیاط کے ساتھ چلانے کی کوشش کرے لیکن آئے دن یہ ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور انسان حادثات کا شکار ہوتا رہتا ہے، اسی طرح ریل گاڑیاں ہیں، سمندری جہاز ہیں، بڑی سے بڑی چیزیں انسان کی ایجاد ہیں جن کے اندر پورے کے پورے وسائل استعمال کیے گئے ہیں، پوری کی پوری احتیاط رکھی جاتی ہے، لیکن سمندری جہاز بھی آئے دن سمندر میں غوطے کھاتے رہتے ہیں اور ڈوبتے رہتے ہیں، اور ریل گاڑیاں بھی آئے دن پٹڑی سے اترتی رہتی ہیں اور آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں، الغرض انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز جو انسان کے اختیار کے ساتھ چلتی ہے وہ انسان کے لئے امن کا پیغام نہیں ہے، آئے دن اُس کے اندر حادثات پیش آ کے انسان کے لئے خطرات پیدا ہوتے رہتے ہیں، جب یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان کتنی ہی کامل عقل استعمال کر کے کوئی چیز بنائے اُس کا نظم ونسق انسان کی منشاء کے مطابق نہیں رہتا، اور یہ زمین وآسمان اللہ نے بنائے، کب سے بنائے، اور کتنی طویل مدت سے چلے آتے ہیں، اور اِن کے اندر کیسا نظم ونسق اللہ نے قائم کیا ہے کہ ساری دُنیا مل کر بھی اگر اِس کے اندر کوئی تغیر برپا کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی، دن رات اپنے وقت پر آئیں گے، سورج چاند اپنے وقت پر چڑھیں گے، اور جو اُن کی متعین مسافت ہے اُسی پر جائیں گے، اللہ نے موسم جس طرح بنا دیئے آتے جاتے ہیں اور بغیر انسان کے اختیار کے آتے جاتے ہیں، تو ضرور اِس کے اوپر کوئی غیبی قدرت ہے جو کنٹرول کیے ہوئے ہے، اس طرح وہ اِن کے خالق پر اور ان کے مالک پر استدلال کر کے وہاں تک اپنے عقیدے کو لے جاتے ہیں، اور اللہ کے وجود کے قائل ہوتے ہیں، اور اُس کی قدرت اور اُس کی حکمت کے قائل ہوتے ہیں اِس غور وفکر کے ذریعے سے۔ آیات سے یہاں ایسی آیات مراد ہیں جو اللہ کے وجود پر اور اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والی ہیں، جیسا کہ عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں کہ:

ہر گیاہے کہ از زمیں روید وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید

اُس کا بھی یہی معنی ہے کہ اگر گھاس کے پتے میں بھی آپ غور کرنا شروع کر دیں تو اُس سے بھی اللہ کے وجود کا اور اس کی وحدانیت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

عقل والے کون ہیں؟

تو عقل والوں کا کام یہی ہے کہ ان کے اندر غور وفکر کر کے ان کے پیدا کرنے والے کو سمجھیں، اور اگر عقل سے اتنا ہی کام لیا کہ یہ چیزیں جو پیدا ہوگئی ہیں اِس میں یہ نہیں سوچا کہ پیدا کرنے والا کون ہے؟ بس ہر وقت اِن کو استعمال کرنے کی کوشش کی، ان کو اپنی شہوات میں اور اپنے تعیش میں استعمال کیا، تو یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے، یہ تو بالکل ایک سفلی رجحان ہے جس کا انسان مظاہرہ کرتا ہے، کہ وقتی طور پر اِن سے فائدہ اُٹھایا، باقی! یہ سوچا ہی نہیں کہ اِس کے پس پردہ کیا چیز ہے؟ پیدا کرنے والے نے اِن کو کیوں پیدا کیا؟ اِس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے؟ اِس پر اگر غور نہ کیا جائے تو یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ اس لیے عقلمندی یہی ہے کہ ان چیزوں کے اندر غور کر کے اِن سے آیات اور نشانیاں اخذ کر کے اللہ کے وجود تک اور اللہ کی وحدانیت تک انسان پہنچے، اور پھر اُس کو اپنا خالق اور مالک مانتا ہوا اور اپنا محسن اور منعم مانتا ہوا ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اُس کو یاد کرے۔

کثرتِ ذکر کی تلقین

اس لئے عقل مندوں کا معیار یہ ذکر کیا گیا کہ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ: ہر وقت وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور ہر وقت کی تعمیم کے لئے تین قسم کے لفظ بول دیے، کہ کھڑے ہوں تو بھی اُن کو اللہ یاد ہے، بیٹھے ہوں تو بھی اُن کو اللہ یاد ہے، لیٹے ہوں تو بھی اُن کو اللہ یاد ہے، زبان پر بھی اللہ کا نام مختلف اوقات میں جاری کیا جائے جیسے ''سبحان الله، الحمد لله، لا اله الا الله، الله اكبر''، اور حدیث شریف میں جو مختلف اوقات میں مختلف دُعائیں پڑھنے کا تذکرہ آیا ہوا ہے اگر کوئی شخص اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، آتے جاتے اُن دُعاؤں کو پڑھتا رہے تو وہ بھی اِس کا مصداق بن جاتا ہے کہ اِس کو ہر وقت اللہ یاد ہے، کسی وقت اللہ سے غفلت نہیں ہے۔ اِس آیت میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا چاہیے، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں صراحتاً یہ حکم آیا ہوا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ (سورۂ احزاب: ۴۱) کہ اللہ تعالیٰ کو بہت کثرت کے ساتھ یاد کرو، اور صبح شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

آسمان وزمین کی تخلیق میں تفکر کیسے کیا جائے؟

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں غور کرتے ہیں، تفکر کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد مخلوق کے اندر سوچ وبچار کر کے معرفت میں ترقی حاصل کرتے ہیں، سوچ وبچار کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ ایک چیز آپ کے سامنے آگئی، اُس میں غور وفکر کیا اور اُس سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کی، جیسے انسان دنیا کی چیزوں کو دیکھتا ہے، کہ اِن کا وجود بھی آپ کے سامنے ہے، پھر اِن کا فنا ہونا بھی آپ کے سامنے ہے، ایک انسان پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے، ساری زندگی کوشش کر کے جائیداد بناتا ہے، محلات تعمیر کرتا ہے، لیکن آپ کے سامنے وہ مرتا ہے اور اُس کا جنازہ اُٹھ جاتا ہے، آپ اِس میں غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی دنیا کی اِن چیزوں کے ساتھ انسان کا تعلق بہت عارضی ہے، اور جس نے

اپنی زندگی کا حاصل انہی چیزوں کو بنایا ہے تو آخر وہ تہی دست اِس دنیا سے جاتا ہے، جب یہ ایک دِن چھوٹنے والی ہیں تو پھر ان کی محبت میں انسان گرفتار کیوں ہو؟ تفکر کا طریقہ یہ ہوا کرتا ہے۔ مثلاً آج کل آپ کے سامنے شاہِ ایران[1] ایک داستان بنا ہوا ہے، یعنی دُنیا کے اندر اُونچے سے اُونچا مرتبہ اگر کوئی شخص سوچ سکتا ہے تو وہ بادشاہت ہی ہے، اِس سے اُوپر تو کوئی درجہ نہیں ہے، اقتدار کے لحاظ سے اگر انسان سوچ سکتا ہے تو کسی علاقے کی بادشاہت اُس کے لئے ایک اُونچے سے اُونچا درجہ ہے، اور اِس بادشاہت کے نتیجے میں اُس کے ساتھ کیا ہوا، دُنیا کے اندر اَب اُس بیچارے کو ایک بالشت جگہ نہیں ملتی جہاں امن چین کے ساتھ وہ اپنا وقت گزار لے، دولت اُس کے پاس اتنی ہے جس کا حساب کوئی نہیں، لیکن امن چین سے وہ محروم ہے، اور اُس کی پریشانی کے قصے آئے دِن آپ سنتے رہتے ہیں۔ تو اِس میں غور کر کے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ واقعی یہ مال دولت اور یہ بادشاہت اور یہ اقتدار انسان کو کامیاب زندگی کی طرف نہیں لے جاتا، یہ خطرات سے بھری ہوئی چیزیں ہیں اور بہت عارضی ہیں، اور انسان کے لئے مصیبت بنتی ہیں۔ اس کی بجائے اللہ تعالیٰ اگر ضرورت کے مطابق دے اور امن و عافیت عنایت فرمائے اور سکون اور اطمینان کی زندگی دے دے تو یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ ایک غریب اگر اپنی کٹیا میں روکھا سوکھا کھا کر امن کے ساتھ سو جاتا ہے اور اس کو کوئی فکر نہیں، اور صبح وہ اُٹھتا ہے تو فارغ البال ہوتا ہے، اس کا دل کسی قسم کی بے چینی میں مبتلا نہیں ہوتا، وہ اس کروڑ پتی سے بہتر ہے جس کو اپنے محلات کے اندر رات کو چین کے ساتھ نیند نہیں آتی، اور صبح اٹھتا ہے تو کروڑ ہا فکر اس کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں، نہ کھانے میں مزہ، نہ سونے میں مزہ، نہ کسی دوسری چیز میں۔ یہی چیزیں ہیں جو انسان تفکر کے بعد اخذ کرتا ہے کہ اصل چیز اللہ کی رضا، آخرت کی کامیابی، اور دنیا کے اندر رہتے ہوئے امن سکون کی زندگی ہے، یہ چیزیں اگر حاصل ہو جائیں تو پھر کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں ہے، تفکر یہی ہوتا ہے، کہ غور کر کے انسان نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے پھر وہ جذبات اپنے دل میں لاتا ہے، دنیا کی چیزوں میں غور کر کے اِن کا فناء ہونا سمجھو، اور اسی طرح دوسری چیزیں ہیں۔ تو اللہ کی آیات میں اور اللہ کی مخلوقات میں غور کرنے کے بعد اپنے دل میں نورِ ایمان کو داخل کرو، اِس سے یہی مقصود ہے۔

تفکر کرتے ہوئے آخرت کی طرف انتقال

''غور کرتے ہیں وہ زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں'' اور غور کرنے کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''اے ہمارے پروردگار! تُو نے اِن چیزوں کو بے کار پیدا نہیں کیا'' بلکہ ہر کام میں تیری حکمت ہے، اور یہ اتنا بڑا کارخانہ تو نے جو قائم کر دیا اگر اِس کا کوئی نتیجہ بھی نکلنے والا نہیں تو یہ ایک عبث اور بے کار اور کھیل تماشا ہے، اور عبث اور بے کار کام کرنے سے تو پاک ہے، تیری ذات کی طرف ہم ایسی نسبت نہیں کر سکتے کہ تُو نے لایعنی اور بلا کسی مقصد کے اِس کو بنا کے رکھ دیا ہو، جس طرح بچے آپس میں کھیلتے ہیں، کھیلنے کے لئے گھر بنا لیتے ہیں، آخر میں اُس کو ڈھا دیتے ہیں، خالق کا یہ درجہ نہیں، جس کام میں کوئی حکمت نہ ہو وہ کام تیری طرف

(۱) محمد رضا پہلوی، م: ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ء بمطابق رمضان ۱۴۰۰ھ۔

منسوب نہیں کیا جاسکتا، تیرا جو بھی کام ہے وہ پُر حکمت ہے، یہ جو دنیا تو نے بنائی ہے اور زمین وآسمان تو نے آباد کیے ہیں اِس کا لازماً ایک نتیجہ نکلنے والا ہے، اس طرح مخلوق میں غور کرتے ہوئے وہ آخرت تک اپنے ذہن کو لے جاتے ہیں کہ نتیجہ یہی سامنے آئے گا کہ اللہ تعالیٰ حق اور باطل میں امتیاز کریں گے، جنہوں نے اِس دنیا میں رہتے ہوئے حق کو پہچانا ہے اُن کا انجام اچھا ہوگا، اور جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا اُن کا انجام خراب ہوگا، یہاں سے اُن کا ذہن آخرت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، بالکل اس طرح جس طرح ایک کاشتکار کھیتی بوتا ہے، بونے کے بعد اُس کی پرورش کرتا ہے، وہ آباد ہوتی ہے، پکتی ہے، آخر ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ انتہا پر پہنچتی ہے تو اُس کو کاٹ لیا جاتا ہے، کاٹنے کے بعد پھر اُس کو توڑ پھوڑ کر اور اُس کو گاہ کر اُس میں سے غلے کو علیحدہ کیا جاتا ہے اور بھوسے کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے، تو جس طرح کھیتی کے پکنے کے بعد اُس کے اجزاء بکھیر کر اُس میں سے مقصود اور غیر مقصود کو علیحدہ کر دیتے ہیں، اِسی طرح یوں سمجھئے کہ جس وقت یہ دنیا اپنے کمال کو پہنچ جائے گی تو اللہ تعالیٰ اِس کو بھی توڑے پھوڑے گا، اور نتیجے کے طور پر اس میں سے بھی اہلِ حق کا اہلِ باطل سے امتیاز کیا جائے گا۔ تو اِن چیزوں میں غور کرتے ہوئے ان کا ذہن آخرت تک چلا جاتا ہے۔

سوال:- یہاں آیا کہ زمین وآسمان میں غور کرتے کرتے آخرت کی طرف ان کا ذہن جاتا ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے آخرت کی اطلاع دے دی تو پھر اس میں غور کر کے آخرت کو معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب:- غور کرنے کے ساتھ انسان کی بصیرت بڑھتی ہے، دل کے اندر یقین زیادہ پیدا ہوتا ہے، کہ عقلی استدلال کے ساتھ بھی اِن باتوں کو سمجھئے، اور نقلی استدلال کے ساتھ بھی، جس طرح سے آگے ذکر آرہا ہے۔

چند دُعاؤں کا ذِکر اور ماقبل سے ربط

پھر آخرت کے عذاب سے بچنے کی وہ فکر کرتے ہیں، اور اللہ کے سامنے پھر اس طرح سے دُعائیں کرتے ہیں، یوں ربط ہوجائے گا مابعد کی طرف، کہ غور کرتے کرتے وہ آخرت کی طرف اپنے ذہن کو لے جاتے ہیں، اور پھر آخرت کی کامیابی کے لئے اور آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعائیں کرتے ہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ: اے اللہ! تُو ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے پروردگار! بے شک تُو جس کو جہنم میں داخل کر دے گا تُو نے اُس کو رُسوا کر دیا، یعنی اصل رُسوائی یہی ہے کہ کوئی جہنم میں داخل کر دیا جائے۔ اور اِن ظالموں کے لئے جن کے لئے جہنم تجویز ہوگئی اُن کی بدکرداری کی بنا پر، اُن کا کوئی مددگار نہیں، یعنی جس کو تُو جہنم میں ڈالنا چاہے اس کو بچا کوئی نہیں سکتا، اور جس کو تُو جہنم میں ہمیشہ کے لئے رکھنا چاہے اُس کو وہاں سے چھڑا کوئی نہیں سکتا، ہاں البتہ ایسا ہوگا کہ اگر تُو نے عارضی طور پر کسی کو جہنم میں بھیج دیا، پھر تیرا ہی ارادہ اُس کو چھوڑنے کا ہے، تو تیری اجازت کے ساتھ جو سفارش ہوگی وہ اصل کے اعتبار سے رحمت تیری ہی ہے، اس لیے اِن آیات کے ساتھ سفارش اور شفاعت کی نفی نہیں نکالی جاسکتی، کیونکہ وہ جو کچھ ہوگا اللہ کی اجازت سے ہوگا، اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ تو اُن کا عقلی استدلال کے طور پر ایمان لانا ہے، اور آگے نقلی استدلال آگیا کہ ''اے ہمارے پروردگار! بے شک ہم نے ایک بُلانے والے

کوسنا، آواز دینے والے کوسنا جوآواز دے رہا تھا ایمان کے لئے'' اس سے مراد سرورِ کائنات ﷺ ہیں، اوراُن کی آواز ہم سنتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ، کہ صحابہ کرام ﷺ کے زمانے کے لوگ جو حضور ﷺ کے سامنے موجود تھے اُنہوں نے بلاواسطہ آپ کی اس دعوت کوسنا، اور ہم بالواسطہ سُن رہے ہیں، وہی باتیں نقل ہوکر ہم تک آگئیں، تو گویا کہ توحید کے بعد رسالت پر ایمان کا ذکر بھی آگیا،'' آوازیں دے رہا تھا ایمان کے لئے کہ ایمان لے آؤ اپنے پروردگار پر، ہم اُس کی دعوت پر اعتماد کرتے ہوئے بھی ایمان لے آئے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اس ایمان کی برکت سے ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور ہماری کوتاہیوں کو دور کردے اور ہمیں نیکوں میں شامل کر کے وفات دے'' نیکوں کے ساتھ وفات دینے کا یہ مطلب نہیں کہ نیکوں کی جماعت مرے تو ہم بھی ساتھ ہی مرجائیں، مطلب یہ ہے کہ وفات تک ہم اَبرار میں شامل رہیں، جس وقت ہماری وفات ہوتو ہم اَبرار میں شمار ہوں، نیکی پر ہمیں موت آئے، جب نیکی پر موت آئے گی تو ہم بھی 'بَرّ'' کا مصداق ہوں گے اور ہماری شمولیت ابرار کے ساتھ ہوگی۔ ''اے ہمارے پروردگار! دے ہمیں وہ چیز جس کا تُو نے ہم سے وعدہ کیا اپنے رسولوں کی زبان پر'' کہ ایمان لانے کی برکت سے میں یہ نعمتیں دوں گا، وہ چیزیں ہمیں عطا فرما،'' اور ہمیں قیامت کے دِن رُسوا نہ کرنا'' کہ ہمیں تُو عذاب دے،'' بے شک تُو تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا'' ہم جو تیرے سامنے اِلتجا کر رہے ہیں تو اس لئے کر رہے ہیں کہ ہمارے اُوپر کوئی ایسا حال طاری نہ ہو جائے کہ ہم تیرے اِس وعدے کے اہل نہ رہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو وعدہ خلافی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے اُس کے مطابق کرے گا، ہماری یہ جو درخواست کہ ہمارے ساتھ آخرت میں یوں ہو، اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم آخر وقت تک تیرے اِس وعدے کے اہل رہیں، ہمیں ایمان پر ثابت قدم رکھ، اور ہمارا خاتمہ نیکوں کے ساتھ کر، تا کہ ہم تیرے وعدے سے فائدہ اُٹھانے کے اہل رہ جائیں، ورنہ تُو تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ تو اِس دُعا میں دفعِ مضرّت اور جلبِ منفعت دونوں باتیں آگئیں، عذاب سے بچنے کے لئے جو دُعا کی گئی ہے یہ دَفعِ مضرّت ہے، اور آخرت کا ثواب حاصل ہونے کی جو دُعا کی گئی ہے وہ جلبِ منفعت ہے، اس لیے یہ جامع دُعا ہے۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ: جس وقت وہ یوں اپنے دِل کی بصیرت اور معرفت کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں (بار بار: ''رَبَّنَآ رَبَّنَآ'' کہنا یہ اِلحاح وزاری کے لئے ہے، کہ دُعا کرتے وقت بار بار اس قسم کے الفاظ کہے جائیں یا اللہ! یا رَبّ! اس طرح سے جو بار بار ندا کی جاتی ہے اس سے اِلحاح اور زاری پیدا ہوتی ہے جو دُعا کے اندر مطلوب ہے اور اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہے)، جب وہ یوں دُعائیں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی دُعا کو قبول کر لیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تو اپنی عادت قرار دے دی کہ میں تو کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، چاہے مرد ہو چاہے عورت ہو، جو بھی نیک عمل کرے گا میں اُس کے عمل کا اسے بدلہ دُوں گا، بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: تم بعض بعض سے ہو، یعنی تم ایک ہی چیز ہو آدم کی اولاد، نیک عمل کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، نیکی دونوں کی نیکی ہے، اور دونوں اللہ کے ہاں اجر وثواب پائیں گے، مرد ہو یا عورت ہو،'' بعض تم بعض سے ہو'' یعنی تم سارے ایک ہی چیز ہو، ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہو، اس لئے میرا برتاؤ دونوں کے ساتھ مرد ہو یا عورت ہو ایک جیسا ہوگا، جو بھی نیکی کا کام کر کے آئے گا میں اُس کو اجر دوں گا، چاہے وہ مرد ہے چاہے وہ عورت ہے۔

مہاجرین صحابہؓ کا اِخلاص اور ان کی قربانیاں

پھر خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کا ذِکر کر دیا،'' جنہوں نے میرے راستے میں اپنے گھر بار کو چھوڑا، ہجرت کی'' (''میرے راستے میں'' یہ ترجمہ ''فی سبیلی'' کے تعلق کے ساتھ کر رہا ہوں) اور چھوڑا بھی خوشی کے ساتھ اور سیر و سیاحت کے لئے نہیں، بلکہ میرا نام لینے کی وجہ سے اُن کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اور وہ گھروں سے نکال دیئے گئے، اِس میں دیکھو! مہاجرین کی کتنی قدر اُفزائی ہے، کہ اللہ تعالیٰ جس وقت یہ اِظہار کرے کہ میرے لئے اِن کے ساتھ سب کچھ ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں جنہوں نے یہ کام کیا ہے، اپنے گھر بار کو چھوڑا ہے، گھروں سے نکالے گئے، مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھائیں، اللہ کہتا ہے کہ اِنہوں نے سب کچھ میرے لئے کیا، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جتنے مہاجرین تھے، جتنے گھر بار کو چھوڑ کر آئے تھے، اُن کا خلوص اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل قبول ہے، کہ اللہ اقرار کرتا ہے کہ اِنہوں نے جو کچھ کیا میرے لئے کیا، اِن کے سامنے اپنی کوئی دُنیوی غرض یا حرص و لالچ ایسی کوئی بات نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ جمہور اُمت کا یہ فیصلہ ہے کہ مکہ معظمہ میں ایمان قبول کرنے والوں میں منافق کوئی نہیں تھا، کہ جس نے ظاہری طور پر کسی غرضِ فاسد کے تحت ایمان قبول کیا ہو، مہاجرین میں ایسا کوئی نہیں تھا، کیونکہ منافق تو اپنا مقصد اور مطلب حاصل کرنے کے لئے کلمہ پڑھتے تھے، اور اَندر اَندر سے کُفر ہوتا تھا، اور مکہ معظمہ میں تو ایمان لانا اپنے آپ کو مصیبتوں کی دعوت دینا تھا، تو جو مطلب پرست لوگ ہوا کرتے ہیں وہ ایسے وقت میں کہاں کلمہ پڑھتے ہیں اور کہاں ایمان لاتے ہیں؟ نفاق جتنا آیا مدینہ منورہ میں جانے کے بعد آیا، جب اسلام کو اِقتدار حاصل ہو گیا تھا، اس لیے ظاہری طور پر اِسلام قبول کر کے وہ مسلمانوں والے مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اَندر اَندر سے کافروں کے ساتھ ہمدردیاں رکھ کے اُن سے بھی مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے، مکہ معظمہ میں تو اِیمان لانے سے انسان پٹتا تھا، لٹتا تھا، گھر بار سے محروم ہوتا تھا، تو خود غرض اور لالچی اور حریص قسم کے لوگ ایسے وقت میں کلمہ نہیں پڑھا کرتے، اس لیے یہ جتنے گھر بار کو چھوڑ کر آنے والے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فِیْ سَبِیْلِیْ: اِنہوں نے جو کچھ کیا میرے لئے کیا، اس لئے اِن کے اندر منافق کوئی نہیں تھا، مکہ معظمہ میں جنہوں نے ایمان قبول کیا وہ سارے کے سارے مخلص تھے، اور جو کچھ انہوں نے کیا سب اللہ کی رضا کے لئے کیا۔ قٰتَلُوْا: لڑائی لڑی، قُتِلُوْا: قتل بھی کئے گئے، یعنی اُن میں سے بعض۔ ''ضرور دُور ہٹادوں گا میں اُن سے اُن کے گناہوں کو، اور ضرور داخل کروں گا اُنہیں باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے، اور اللہ کے پاس بہت اچھا بدلہ ہے۔'' یہ تو پٹنے والوں اور لٹنے والوں کی فضیلت آ گئی۔

کُفار کی عیش و عشرت اور مؤمنین کی تکالیف میں حکمت

اور اِس کے مقابلے میں اِن کو پیٹنے والے اور ان کو گھر بار سے نکالنے والے، جو سمجھتے تھے کہ ہم غالب ہیں اور ہم ان پر ہر طرح سے حاوی ہیں، اور وہ خوش ہو رہے تھے اس بات پر کہ ہم نے ان کو نکال دیا، اور تجارت کرتے ہوئے شہروں کے اندر دندناتے پھرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی حالت کو دیکھ کر کہیں دھوکے میں نہ آ جائیو کہ شاید یہ کوئی کامیاب ہیں یا یہ کوئی

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول یا محبوب ہیں، ایسی بات نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول تو وہ ہیں جو اُس کے راستے میں پٹتے ہیں، لٹتے ہیں، مرتے ہیں، ماریں کھاتے ہیں، یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب۔ اور یہ جو کھاتے پیتے اور زیب وزینت کے ساتھ دندناتے پھرتے ہیں اِن کو دیکھ کر دھوکے میں نہ آجائیو، یہ بہت عارضی سی حالت ہے جو اِن کے سامنے ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی پھانسی کی کوٹھڑی میں ہو اور پھانسی کا فیصلہ ہو گیا ہو، تو حکومت کی طرف سے اُس کو مراعات دی جاتی ہیں، کہ کسی سے ملنا چاہتے ہو تو مل لو، جو کھانا چاہتے ہو کھالو، اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ پتہ تو ہے کہ چند دنوں کے بعد اس کو لٹکا دینا ہے، جو کچھ کھانا چاہتا ہے کھا لینے دو۔ اور ایک آدمی ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اُس کا بڑا اس کی تربیت کرنا چاہتا ہے، تو تربیت کے لئے اور اُس کو باکمال بنانے کے لئے بسا اوقات اُس کو فاقہ بھی کراتا ہے، اور بسا اوقات اس کو دوسری قسم کی ظاہری طور پر سزا اور مار دھاڑ بھی ہوتی ہے جس طرح بچوں کے ساتھ کرتے ہیں، اساتذہ مارتے ہیں، والدین تنبیہ کرتے ہیں، تو یہ بظاہر پٹتے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ اچھے انجام کے لئے ہے، اور جن کو ظاہری طور پر کھلایا پلایا جاتا ہے وہ اس لئے کھلایا پلایا جاتا ہے تاکہ چند دنوں کے بعد جب اُس کو لٹکائیں تو پچھلا معاملہ سارے کا سارا خود ہی بے باق ہو جائے۔ تو یہ حالتیں دُنیا کے اندر بھی ایسے ہوتی رہتی ہیں کہ بظاہر ایک آدمی پر سختی اس لیے کی جاتی ہے کہ اُس کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے کہ سختی کا انجام اچھا ہونے والا ہے، اور ایک آدمی کو کھلایا پلایا اس لیے جاتا ہے تاکہ یہ زیادہ برباد ہو، تو اللہ تعالیٰ یہی فرماتے ہیں کہ اِن کافروں کے حال کو دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ جائیو۔ ''ہرگز دھوکے میں نہ ڈال تجھے اِن کافروں کا چلنا پھرنا شہروں میں، یہ بہت تھوڑا سا فائدہ ہے جو یہ اُٹھا رہے ہیں، پھر اِن کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ لیکن جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں اِن کے لئے باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُس میں، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اَبرار کے لئے بہتر ہے۔''

اہلِ کتاب میں سے اِیمان لانے والوں کا تعریف

آگے (وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ میں) اُن اہلِ کتاب کی تعریف آ گئی جو قرآنِ کریم پر اور سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے والے ہیں۔ ''اہلِ کتاب میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف اُتاری گئی، اور اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو اُن کی طرف اتاری گئی، اللہ سے ڈرتے ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے وہ ثمنِ قلیل کو حاصل نہیں کرتے'' یعنی دوسرے یہود ونصاریٰ کی طرح نہیں جو حق پوشی کرتے ہیں، اور غلط مسئلے بیان کرکے دُنیا کا مفاد حاصل کرتے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں۔ ''یہی لوگ ہیں کہ اِن کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، بے شک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے'' یعنی قیامت جلدی آنے والی ہے، یا مطلب یہ ہے کہ جب حساب شروع ہوگا تو اللہ تعالیٰ سب کو جلدی فارغ کر دے گا، دیر نہیں لگے گی۔

''صبر'' کا مفہوم اور اس کی اقسام

آخری آیت میں یہ نصیحت آ گئی کہ ''اے ایمان والو! صبر کرو'' صبر کا مفہوم آپ کے سامنے بارہا ذکر کیا جا چکا، کہ یہ ایک

بہت جامع خُلق ہے، اس میں اصل ہوتا ہے استقلالِ مزاج، کہ انسان مستقل مزاج ہو، مصیبت آجائے تو اس کو برداشت کرنے کی کوشش کرے، اُس میں واویلا نہ کرے، چیخ وپکار نہ کرے، شکوہ شکایت نہ ہو، یہ ''صبر علی المصیبة'' ہے۔ اور نیکی کے کام کے وقت اپنے نفس کو اس کے اُوپر جمائے، اگر نیک کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تو بھی اپنے آپ کو مجبور کرکے نیکی کے کاموں میں لگائے، یہ ''صبر علی الطاعة'' ہے۔ اور اگر معصیت کی طرف رُجحان ہے تو اپنے آپ پر دباؤ ڈال کر انسان اپنے آپ کو معصیت سے روکنے کی کوشش کرے یہ ''صبر عَنِ المعصية'' ہے۔ تو ''صبر'' کا مفہوم سب کو شامل ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ نفس میں پختگی ہونی چاہیے، اگر خلافِ طبیعت کوئی واقعہ پیش آجائے جس کو ''مصیبت'' کہتے ہیں تو اس کو برداشت کرو، اور نیکی کا کام آجائے تو اپنے آپ کو اُس پر پابند کرو، معصیت کی طرف رُجحان ہو تو اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کرو، یہ جو اِستقلال والی قوت انسان کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اِس کو ''صبر'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آگے صَابِرُوْا باب مفاعلہ ہے، یعنی پہلا صبر تو اپنے ذاتی حالات میں ہے، اور صَابِرُوْا کا مطلب یہ ہے کہ دُوسرے کے مقابلے میں بھی، کہ اگر دُشمن کے ساتھ مقابلہ ہوجائے تو وہاں بھی ثابت قدم رہو، وہاں بھی ڈٹ جاؤ، اور مقابلے کے اندر مضبوط اور ثابت رہو۔

''رِباط'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

رَابِطُوْا: نیک اعمال پر دوام اختیار کرو، یہ بھی اس کا مفہوم ہے، اور یہ بھی مفہوم ہے کہ ہمیشہ اپنی سرحدوں کی نگرانی رکھو کہ تمہاری غفلت سے دُشمن فائدہ نہ اُٹھائے، ان دونوں قسم کے اعمال کے فضائل حدیث شریف میں آتے ہیں، مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص وضو اچھی طرح سے کرتا ہے، باوجود اِس بات کے کہ ناگواریاں ہیں، اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وضو پوری طرح سے کرتا ہے باوجود ناگواریوں کے، اور پھر کثرت کے ساتھ مسجد کی طرف آتا جاتا ہے، اور پھر ایک نماز پڑھنے کے بعد دُوسری نماز کے انتظار میں لگا رہتا ہے، فرمایا: ''ذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ''[1] یہ بھی رباط کا مصداق ہے، کیونکہ جو شخص اس قسم کے مستحبات کی پابندی کرتا ہے تو یوں سمجھئے کہ وہ اپنے سارے دِین کو محفوظ کرلیتا ہے۔ کوتاہی تب شروع ہوا کرتی ہے (اس بات کو یاد رکھئے!) کہ پہلے انسان مستحبات میں غفلت برتتا ہے، جب مستحبات سے غفلت برتی تو آپ کے دِین کی حدود سمٹ کر اب سنتوں پر آگئیں، پھر اگر سنتوں کی آپ پابندی نہیں کریں گے اور ان میں غفلت برتیں گے تو سنّت والا معاملہ بھی گویا کہ آپ کے قبضے سے نکل گیا، اب آپ واجبات پر پہنچ گئے، یہ حدود اِتنی سمٹ کے آگئیں، اب اگر واجبات کی پابندی بھی آپ نہیں کریں گے، اور اِن کو بھی آپ نے ضائع کرلیا تو اَب آگے آپ کا معاملہ فرض تک پہنچ گیا، اور ایسا شخص پھر آہستہ آہستہ فرض کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے، وہ پھر فرض کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اور اگر کوئی شخص یہ تہیہ کرلے کہ میں نے کسی مستحب کے بھی خلاف نہیں کرنا، جب وہ مستحب کی پابندی کرے گا تو سنّت کی یقیناً کرے گا، واجب کی اُس سے زیادہ کرے گا، اور فرض کی اُس سے زیادہ کرے گا۔ تو مستحبات کی پابندی کرنے والے سے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ فرض چھوٹ جائے، جس نے نماز باجماعت ترک نہیں کرنی وہ کبھی نماز کو چھوڑ سکتا ہے؟ نماز باجماعت پڑھنے والا کبھی نماز کو نہیں چھوڑ سکتا، اگر وہ التزام کرلے کہ میں نے جماعت کی

پابندی کرنی ہے تو فرض تو لازماً ادا کرے گا، اور اگر جماعت کی پابندی نہیں کی، کبھی جماعت کے ساتھ پڑھ لی، کبھی جماعت کو چھوڑ دیا، تو ایسا ہوسکتا ہے کہ یہ شخص وقت پر نماز پڑھنے میں بھی کوتاہی کر جائے گا، تو "رِباط" کا یہاں یہی معنی ہے کہ ان مستحبات کی نگرانی کرو، جب مستحبات کی نگرانی کروگے تو تمہارا سارے کا سارا دین محفوظ رہ جائے گا، اور اگر اس میں کوتاہی کرنا شروع کردو گے تو آہستہ آہستہ سرے تک معاملہ پہنچ جائے گا۔ اسی طرح گناہ سے بچنے کے لئے مکروہات سے بچنے کی کوشش کرو، جو شخص مکروہات سے بچنے کی کوشش کرے گا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ حرام کے اندر واقع ہوجائے، پہلے انسان مکروہات کے اندر غفلت برتتا ہے پھر وہ حرام کی سرحد کے قریب آجاتا ہے، پھر یہ غفلت اور لاپروائی کی عادت آہستہ آہستہ اس کو حرام میں مبتلا کردیتی ہے۔ تو معنوی طور پر اپنے دِین کی سرحد کی حفاظت اسی صورت میں ہوتی ہے کہ انسان آخری کنارے کی نگرانی کرے، آخری کنارہ یہی ہے کہ مامورات کے اندر جو مستحب اور اَولیٰ کام ہیں ان کی بھی پابندی کرو، اور منہیات کے اندر جو مکروہ اور خلافِ اَولیٰ کام ہیں ان سے بھی بچنے کی کوشش کرو، تو سارے کا سارا دِین محفوظ رہ جائے گا، ورنہ اگر اِس سرحد کی حفاظت چھوڑ دو گے تو آہستہ آہستہ اہم چیزیں بھی چھوٹتی چلی جائیں گی، اور آپ کے سارے دِین کو نقصان پہنچ جائے گا۔ اور ظاہری طور پر بھی اسی طرح ہے، کہ ملک کا جو آخری کنارہ ہوتا ہے، چاہے وہاں ویرانہ ہے، پہاڑ ہے، کوئی آبادی نہیں ہے، وہاں کوئی پیداوار نہیں ہے، اُس کی نگرانی کروگے تو تمہارا ملک محفوظ رہے گا، اور اگر سرحد سے غفلت برتو گے تو دُشمن تمہاری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر تم پر حملہ کردے گا اور ملک ہاتھ سے چھن جائے گا۔ تو رَابِطُوْا کے اندر یہی بات آگئی کہ سرحدوں کی نگرانی کرو، نیک اعمال پر مداومت اختیار کرو۔ اور آگے فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ تقویٰ تمام نیکیوں کے لئے قوت کا باعث بنتا ہے، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔
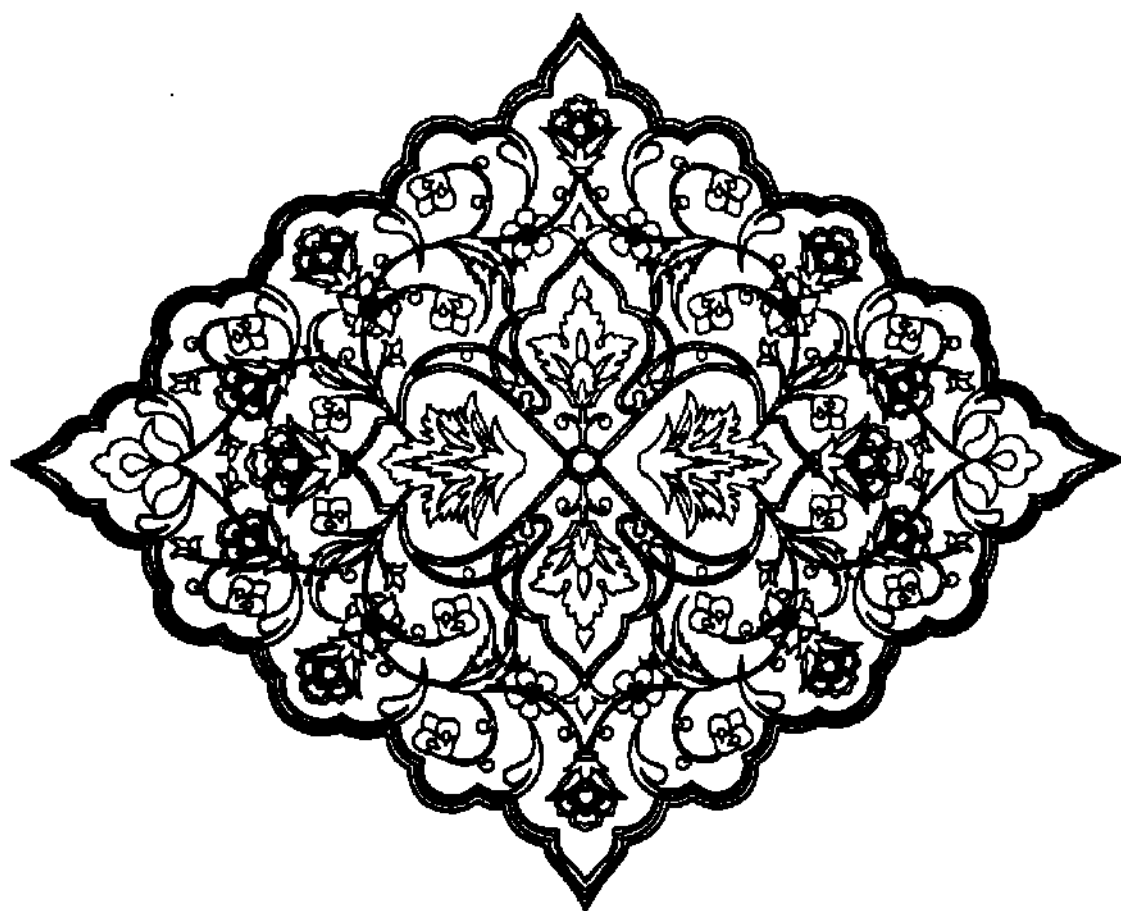
سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(۱) مسلم ۱/۱۲۷، باب فضل اسباغ الوضوء۔ مشکوٰۃ ۱/۳۸، کتاب الطہارۃ کی دوسری حدیث۔

سورة النساء

آیاتها ۱۷۶ ۔ ۴ سُوْرَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۲ ۔ رکوعاتها ۲۴

سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ۱۷۶ آیتیں ہیں چوبیس رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے شروع کرتا ہوں

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ

اے لوگو! ڈرو اپنے ربّ سے جس نے تمہیں پیدا کیا ایک نفس سے

وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

اور پیدا کیا اس نفس سے اُس کی زوجہ کو اور پھیلایا ان دونوں سے بہت سے مردوں کو اور بہت سی عورتوں کو،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے جس کے واسطے سے تم آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور ڈرو اَرحام سے، بیشک اللہ تعالیٰ

كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ① وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا

تم پر نگہبان ہے ① یتیم بچوں کو ان کے مال دے دیا کرو، نہ بدلا

الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ

کرو ردّی مال کو عمدہ مال کے ساتھ، اور نہ کھایا کرو اُن کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر، بے شک یہ

حُوْبًا كَبِيْرًا ② وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا

بہت بڑا گناہ ہے ② اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کرسکو گے یتیموں کے بارے میں تو نکاح کرلیا کرو

مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ

اپنی پسندیدہ حلال عورتوں سے، دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے، اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ

اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا

تم برابری نہیں کر سکو گے تو ایک پر ہی اکتفاء کرو یا اپنی باندی پر اکتفاء کرو، یہ بات زیادہ قریب ہے

تَعُولُوا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِہِنَّ نِحْلَۃً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ

کہ تم ظلم نہیں کروگے ③ دے دیا کرو عورتوں کو اُن کے مہر خوشی کے ساتھ، پھر اگر وہ خوش ہو جائیں تمہارے لیے

عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ۝۴ وَلَا تُؤْتُوا

اس مہر میں سے کسی چیز سے از روئے دل کے تو اس کو کھالیا کرو اس حال میں کہ خوشگوار ہے لذیذ ہے ④ اور نہ دیا کرو

السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ

نادانوں کو اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے لیے گزران کا ذریعہ بنایا ہے، اور کھلاتے رہا کرو ان نادانوں کو

فِيْھَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى

ان مالوں میں سے اور انہیں پہناتے رہا کرو اور انہیں اچھی بات کہا کرو ⑤ اور یتیموں کی کو آزماتے رہا کرو

حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْھِمْ

حتیٰ کہ جس وقت وہ نکاح کی استعداد کو پہنچ جائیں، پھر اگر محسوس کرو تم اُن کی طرف سے سمجھداری تو سپرد کردیا کرو اُن کی طرف

اَمْوَالَھُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْھَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ

ان کے مال، اور نہ کھاجایا کرو ان کو اسراف کرتے ہوئے اور اس بات سے سبقت لے جاتے ہوئے کہ وہ بڑے ہوجائیں گے

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ

اور جو کوئی مالدار ہو تو وہ بچ کے رہے، اور جو کوئی محتاج ہو وہ اچھے طریقے سے

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ فَاَشْهِدُوْا

کھاسکتا ہے، جب تم اُن کی طرف اُن کے مال سپرد کرو تو گواہ بنالیا کرو

عَلَيْھِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ

اُن پر، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے حساب لینے والا ⑥ مردوں کے لیے حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو چھوڑ جائیں

الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ

ماں باپ اور قریبی رشتے دار، اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اُس چیز میں سے جس کو چھوڑ جائیں ماں باپ

وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۞ وَاِذَا

اور قریبی رشتے دار، اس مال میں سے جو تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، یہ متعین کیا ہوا حصہ ہے ⑦ اور جب

حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ

حاضر ہوں تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم بچے اور مسکین تو ان کو دیا کرو

مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۞ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا

اس مال میں سے اور کہا کرو انہیں اچھی بات ⑧ اور چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ جو اگر چھوڑ جائیں

مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ

اپنے پیچھے کمزور بچے تو وہ اُن پر اندیشہ کریں گے، ان کو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں

وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى

اور چاہیے کہ وہ درست بات کہیں ⑨ بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں

ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۞ ع

ناحق، اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، اور وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوں گے ⑩

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ۱۷۷ آیتیں ہیں اور ۲۴ رکوع ہیں۔ اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے شروع کرتا ہوں، يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ: اے لوگو! اتَّقُوْا رَبَّكُمُ: ڈرو تم اپنے رب سے الَّذِيْ خَلَقَكُمْ: جس نے تمہیں پیدا کیا مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: ایک نفس سے وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا: اور پیدا کیا اُس نفس سے اس کی زوجہ کو، وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً: اور پھیلایا اُن دونوں سے بہت سے مردوں کو اور عورتوں کو، رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً كَثِيْرًا، بہت سارے مردوں کو اور بہت ساری عورتیں کو پھیلایا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ: اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے جس کے واسطے سے تم آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، تَسَآءَلُوْنَ: ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، وَالْاَرْحَامَ: اور ڈرو اَرحام سے، ارحام جمع رِحم کی، رِحم اصل کے اعتبار سے تو عورت کے اس عضو کو کہتے ہیں جس میں بچہ بنتا ہے جس کو ہم بچہ دانی کہتے ہیں، لیکن بعد میں اس سے مراد رشتہ، تعلق ہوتا ہے، خاندانی اور نسبی تعلقات جن کے ساتھ ہوا کرتے ہیں اُن کو کہا جاتا ہے کہ ''ان سے رِحم کا تعلق ہے''، اور وَاتَّقُوا الْاَرْحَامَ کا مطلب یہ ہے کہ وَاتَّقُوْا قَطْعَ الْاَرْحَامِ رشتہ داریوں کو قطع کرنے سے بچو، یعنی رشتہ داریوں کا لحاظ رکھو اور ان کے

تعلق کوخراب نہ کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا: بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے۔ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى: یتامیٰ یتیم کی جمع ہے، مذکر مؤنث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے، یتیم وہ نابالغ بچّہ ہوتا ہے جس کا باپ مرجائے، اور بالغ ہوجانے کے بعد پھراُس کو یتیم نہیں کہتے، حدیث شریف میں آتا ہے: ''لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ ''(۱) احتلام کے بعد پھر یُتم باقی نہیں رہتا، وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ: یتیم بچوں کو اُن کے مال دے دیا کرو، وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ: اور طیب کے ساتھ ردّی کو نہ بدلا کرو، نہ بدلا کرو ردّی کوطیب کے ساتھ، خبیث سے یہاں ردّی اور بُرا مال مراد ہے، طیب سے عمدہ مال مراد ہے، وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ: اور نہ کھایا کرو ان کے مالوں کو اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ: اپنے مالوں کے ساتھ ملاکر، اپنے مالوں کے ساتھ ملاکراُن کے مال نہ کھاجایا کرو، اِلیٰ کا متعلق محذوف نکال لیں گے مَضْمُوْمَةً اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ، یاجیسے آپ نے شرح مائۃ عامل میں پڑھا تھا کہ اِلیٰ مع کے معنی میں ہے، پھر بھی وہی بات ہے، اپنے مالوں کے ساتھ ملاکراُن کے مال نہ کھاجایا کرو، اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا: بے شک اس طرح سے اُن کے مال کو کھا جانا، یا، ردّی کوطیب کے ساتھ بدل لینا یہ بہت بڑا گناہ ہے، حُوب گناہ کو کہتے ہیں، ''ہٗ'' ضمیر مذکور کی طرف لوٹے گی، یعنی یہ جو ذکر کیا گیا کہ اُن کے مال کھائے جائیں، یا، ان کے اچھے مال لے لیے جائیں اوران کی جگہ ردّی رکھ دیے جائیں یہ مذکور کی تاویل سے ''ہٗ'' کا مرجع ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا: اور اگر تمہیں اندیشہ ہوکہ تم انصاف نہیں کرسکو گے یتیموں کے بارے میں فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ: تو نکاح کرلیا کرواُن عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، مِّنَ النِّسَآءِ یہ مَا کا بیان ہے، اور طَابَ کے مفہوم میں اُن کا حلال ہونا بھی داخل ہے اور پسندیدہ ہونا بھی داخل ہے، یعنی جو تمہارے لیے عمدہ ہیں شرعاً، عرفاً، طبعاً، اپنی پسندیدہ حلال عورتوں سے نکاح کرلیا کرو دودو سے تین تین سے اور چار چار سے، مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یہ حال واقع ہورہا ہے، اس حال میں کہ وہ دودو ہوں، تین تین ہوں، اور چار چار ہوں، فَاِنْ خِفْتُمْ: اور اگر تمہیں اندیشہ ہو اَلَّا تَعْدِلُوْا: کہ تم برابری نہیں کرسکو گے فَوَاحِدَةً: فَاكْتَفُوا وَاحِدَةً تو پھر ایک پر ہی اکتفاء کرو، اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: یا اپنی باندی پر اکتفاء کرو، مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: وہ عورت جس کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ، اِس سے باندیاں مراد ہیں، ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا: یہ بات زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم نہیں کرو گے، ظلم نہ کرنے کے زیادہ قریب ہے، یعنی ایک پر اکتفاء کرنا یا باندی پر اکتفاء کرنا۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً: صدُقات صَدُقَة کی جمع، صدُقۃ مہر کو کہتے ہیں، اور نِحلۃ نَحَلَ يَنْحَلُ سے ہے بمعنی عطیہ دینا، خوشی کے ساتھ کوئی چیز دینا، اور یہاں یہ اٰتُوا کا مفعول مطلق ہے، ''دے دیا کرو عورتوں کو اُن کے مہر خوشی کے ساتھ دینا، رغبت کے ساتھ، خوشی کے ساتھ اُن کے مہراُن کو دیا کرو، فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ: پھر اگر وہ خوش ہوجائیں تمہارے لئے عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ: اُس مہر میں سے کسی چیز سے، یعنی کُل مہر تمہیں واپس دے دیں، معاف کردیں، یا اُس کا کوئی حصہ واپس دے دیں، معاف کردیں، نَفْسًا: ازروئے نفس کے، خوش ہوجائیں ازروئے دل کے، ''پھر اگر وہ خوش ہوجائیں تمہارے لئے اُس مہر میں سے کسی شیٔ سے ازروئے دل کے'' یعنی دل سے خوش ہوجائیں، فَكُلُوْهُ: تو اُس کو کھالیا کرو، یعنی ان کے چھوڑے ہوئے مہر کو، واپس کیے ہوئے مہر کو کھالیا کرو، هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا: لذیذ اور خوشگوار۔ هنيئ: مَا يَلَذُّهُ الانسانُ جس کو انسان کھانے میں لذیذ سمجھتا ہے۔ مَرِيئ: جو اچھی عاقبت والا ہو، مَا يُحْمَدُ عاقِبَتُهٗ یعنی انجام اس کا اچھا ہو، کھانے کے بعد اُس میں کوئی کسی قسم کی گرانی نہ ہو، اُس کو کہتے ہیں کہ

(۱) ابوداؤد ۲ر۳۱، باب ما جاء متى ينقطع اليتم/ مشکوۃ ۲ر ۲۸۴، باب الخلع فصل ثانی۔

یہ طعام هنیئ مری ہے، کھانے میں بھی لذیذ ہے، ہضم بھی اچھا ہو گیا، بعد میں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تو یہاں مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو دُنیا میں اُس پر کوئی گرفت اور اس کا تاوان ہے، اور نہ آخرت میں تمہیں کسی قسم کا گناہ ہے، مزے سے کھا جایا کرو جو مہر عورتیں واپس کردیں یا جو چھوڑ دیں، کھا جایا کرو اُس کو هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا: اِس حال میں کہ وہ خوشگوار ہے لذیذ ہے، حضرت شیخ (الہندؒ) نے جو ترجمہ کیا ہے رچتا پچتا، تو اُس کا بھی یہی معنی ہے۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ: اور نہ دیا کرو تم نادانوں کو اپنے مال، اموال مال کی جمع، سفہاء سفیہ کی جمع، کم عقل لوگ، کم عقل لوگوں کو اپنے مال نہ دیا کرو ایسے مال جو اللہ نے تمہارے لئے گزران کا ذریعہ بنائے ہیں، جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا: تمہارے لئے قیام کا ذریعہ ہیں، تمہارا زندگی کا قوام ہیں، مایہ زندگی ہیں، تمہاری زندگی گزارنے کا ذریعہ ہیں، ایسے مال تم نادانوں کو سپرد نہ کیا کرو، وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا: فی یہاں مِن کے معنی میں ہے، اور رزق دیا کرو اُن سفہاء کو ان مالوں میں سے، وَاكْسُوْهُمْ: اور انہیں پہناتے رہا کرو، لباس دیا کرو۔ كَسَا يَكْسُوْ: کپڑے پہنانا، وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا: اور انہیں اچھی بات کہا کرو، کہا کرو انہیں قولِ معروف، اچھی بات، وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى: اور یتیموں کو آزماتے رہا کرو، حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ: حتّٰی کہ جس وقت وہ نکاح کی استعداد کو پہنچ جائیں، یعنی بالغ ہو جائیں، فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا: پھر اگر محسوس کرو تم اُن کی طرف سے سمجھداری، فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: تو سپرد کر دیا کرو ان کی طرف اُن کے مال، وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا: اور نہ کھا جایا کرو اِسراف کرتے ہوئے اور اِس بات سے سبقت لے جاتے ہوئے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے، اُن کے بڑے ہونے سے جلدی مچاتے ہوئے۔ بِدار مبادرۃ کے معنی میں ہے، اُن کے بڑے ہونے سے مبادرت کرتے ہوئے، یعنی ان کے بڑے ہونے سے سبقت لے جاتے ہوئے اور جلدی مچاتے ہوئے اُن مالوں کو کھانہ جایا کرو۔ اِسراف کا معنی ہے ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، اور بِدار کا معنی ہے قبل از وقت خرچ کرنا، ''اِس اندیشے سے کہ کہیں وہ بڑے ہو کر اپنے مال لے نہ لیں''۔ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا: اور جو کوئی مال دار ہو، فَلْيَسْتَعْفِفْ: وہ بچ کے رہے، وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا: اور جو کوئی محتاج ہو، فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ: وہ اچھے طریقے سے کھا سکتا ہے، فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: جب تم اُن کی طرف اُن کے مال سپرد کرو، فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ: تو گواہ بنا لیا کرو اُن پر، وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا: اللہ تعالیٰ کافی ہے حساب لینے والا۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ: مردوں کے لئے حصہ ہے اُس مال میں سے جس کو چھوڑ جائیں والدین، یعنی ماں اور باپ، وَالْاَقْرَبُوْنَ: اور جو چیز چھوڑ جائیں قریبی رشتہ دار، اقرب: جو سب سے زیادہ قریبی ہے، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ: اور عورتوں کے لئے حصہ ہے، مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ: اُس چیز میں سے جس کو چھوڑ جائیں ماں باپ، وَالْاَقْرَبُوْنَ: اور قریبی رشتہ دار، مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ: اُس مال میں سے جو قلیل ہو یا کثیر ہو، یعنی تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، اُس میں سے مردوں کے لئے بھی حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے، نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: اس حال میں کہ وہ متعین کیا ہوا حصہ ہے، مفروض: متعین کیا ہوا، من جانب اللہ متعین ہے، مقرر ہے۔ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى: اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت، تقسیم میں حاضر ہو جائیں رشتہ دار، وَالْيَتٰمٰى: اور یتیم بچے، وَالْمَسٰكِيْنُ: اور مسکین، فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ: تو ان کو دیا کرو اُس مال میں سے، وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا: اور کہا کرو اُنہیں اچھی بات، عرف کے مطابق بات، وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا: چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ جو اگر چھوڑ جائیں اپنے پیچھے کمزور بچے، خَافُوْا عَلَيْهِمْ: تو وہ اُن پر اندیشہ کریں گے، فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ: اُن کو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں، وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا: اور چاہیے کہ وہ

دُرست بات کہیں، اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى: بیشک وہ لوگ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں ظُلْمًا: ناحق، اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کھاتے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ، اور اس کو ہم اپنے محاورے میں یوں ادا کریں گے کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا: اور وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

آلِ عمران کا اختتام وَاتَّقُوا اللّٰهَ پر، یعنی اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے متعلق حکم دینے پر ہوا تھا، اور سورۂ نساء کی اِبتدا بھی اِسی حکم سے ہورہی ہے۔ آلِ عمران میں زیادہ تر اُن باتوں کا ذکر آیا تھا جو مخالف طبقے سے تعلق رکھنے والی ہیں، پہلے حصے میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ گفتگو تھی اور اُن کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق خصوصیت کے ساتھ وضاحت کی گئی تھی، اور آخری حصے میں مشرکین کے ساتھ جہاد کا تذکرہ تھا، اور اِسی قسم کے مضامین کی تفصیل آئی جس میں جہاد بالسنان تھا، اور پہلا حصہ جہاد باللسان تھا۔ سورۂ نساء میں زیادہ تر باتیں مسلمانوں کے آپس میں معاملات سے متعلق ہیں، جس کو آپ اصلاحِ معاشرہ کا عنوان دے سکتے ہیں، یعنی جس وقت اکٹھے زندگی گزاریں گے تو اپنے حالات کو سنوارنے اور سدھارنے کے لئے جن باتوں کی رعایت رکھنے کی ضرورت ہے اِس سورت میں زیادہ تر اُن کی تلقین کی گئی ہے، جیسے یتیموں کے متعلق احکام، عورتوں کے متعلق احکام، وراثت کی تقسیم کے اصول اور اِسی طرح بہت ساری باتیں۔

اِس سورت کی اِبتدا جس آیت سے کی گئی ہے اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انسانوں کی خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ تم سب ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ہو، کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو، جب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو آپس میں جذبات بھی اسی قسم کے ہونے چاہئیں جس قسم کے بھائیوں کے بھائیوں کے ساتھ ہوا کرتے ہیں، معاملات کو آپس میں طے کرنے کا اصول ایسا ہونا چاہیے جیسے آپس میں بھائی کرتے ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ: اے لوگو! یہ خطاب صرف اہل ایمان کو نہیں، بلکہ تمام لوگوں کو ہے، اتَّقُوْا رَبَّكُمْ: اپنے ربّ سے ڈرتے رہو، ڈرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اُس کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے، الَّذِىْ خَلَقَكُمْ: ایسا ربّ کہ جس نے تمہیں پیدا کیا، مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: ایک نفس سے، اِس نفسِ واحدہ کا مصداق حضرت آدم علیہ السلام ہیں، تو گویا کہ جتنے بھی انسان ہیں وہ سارے کے سارے آدم علیہ السلام کی نسل ہوئی۔

حضرت حوّا کی تخلیق کیسے ہوئی؟ علماء کی آرا

وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا: اور پیدا کیا اُسی نفس سے اُس کی زوجہ کو، زوج: جوڑا، اِس کا مصداق حضرت حوا ہیں۔ مِنْهَا کا کیا مطلب ہے؟ عام طور پر مشہور اِس لفظ کی تشریح یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تو براہِ راست مٹی سے بنایا، مٹی سے اُن کا

پتلا تیار کرنے کے بعد اُس میں نفخِ رُوح کیا، جیسے کہ اس کی وضاحت قرآنِ کریم میں موجود ہے، اور حوا ؑ کی جو بنیاد اُٹھائی وہ آدم ؑ کی پسلی سے کوئی مادّہ لے کر اُس سے حضرت حوّا کو پیدا کیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اِس لئے عورت میں کچھ نہ کچھ کجی اور ٹیڑھ ہے جس طرح پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے، تو اِس کو ٹیڑھی رکھتے ہوئے ہی اِس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرو، اور اگر تم اِسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو یہ ٹوٹ جائے گی، یا تم اِسے توڑ دوگے، اور توڑنا اِس کا یہی ہے کہ تم اِس کو گھر سے نکال دوگے، طلاق دے دوگے۔[1] تو عورت کی فطرت میں کچھ نہ کچھ کجی مرد کے مقابلے میں ہے، اس لئے میل جول کے اندر اِس کی طبیعت مرد کے ساتھ پوری طرح سے موافقت نہیں رکھتی، گاہے گاہے بلاوجہ ہی آپس میں اختلاف کرلیتی ہے، اور اَڑی اور ضد کا مظاہرہ کرتی ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اِس کو اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور سمجھتے ہوئے درگزر کرجایا کرو، اور اگر یہ چاہوگے کہ بالکل تمہارے موافق ہوجائے بالکل سیدھی ہوکر رہے تو یہ اِس کی فطرت کے خلاف ہے، بالکل سیدھی ہوکر نہیں رہے گی، اس کو کج رکھتے ہوئے ہی اس سے استمتاع کرو، اِس سے فائدہ اُٹھاؤ، زیادہ سیدھی کرنے کی کوشش کروگے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹوٹ جائے گی۔ یہ اِس کی فطرت کو بیان کرتے ہوئے سرورِ کائنات ﷺ نے بیان فرمایا، اِس روایت کے تحت بھی شراحِ حدیث نے اور اِس آیت کے تحت مفسرین نے صراحت کی ہے، کہ آدم ؑ کی پسلی سے مادّہ لے کر حضرت حوا ؑ کی بنیاد اُٹھائی گئی تھی، گویا کہ حضرت حوّا کے پیدا ہونے میں آدم ؑ واسطہ ہوئے، لیکن پیدا ہونا اِس معروف طریقے سے نہ ہوا، بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ آدم کو مٹی سے بنایا، تو حوّا کو آدم کا ایک جزء لے کر اُس سے بنایا، تو مِنۡهَا زَوۡجَهَا کا مفہوم یہ ہے۔ لیکن ایک دوسری رائے بھی ہے کہ مِنۡهَا کا یہ معنی نہیں کہ آدم سے بنایا اُس کی زوجہ کو، بلکہ مِنۡهَا کا معنی ہے آدم کی جنس سے، یعنی جیسے آدم ویسے ہی حوّا، تو مِنۡهَا سے مِنۡ جنسِها مراد ہوجائے گا، اُس نفس کی جنس سے ہی اُس کے لئے زوجہ کو بنایا، تو حوّا کی خلقت بھی آدم کی طرح مستقل ہے، آدم کے جزء سے نہیں بنائی گئی، یہ قول نقل کرنے کے بعد صاحب ''روح المعانی'' نے تو اِس کی تردید کی ہے کہ یہ ٹھیک نہیں، لیکن صاحبِ ''قصص القرآن'' مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری ؒ نے اِسی رائے کو اَرجح قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں یہ مِنۡ کا محاورہ دوسری جگہ بھی مذکور ہے، یہاں تو آدم ؑ کے متعلق آیا کہ آدم سے اُس کی زوجہ کو بنایا، اور دوسری جگہ ہے سب انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: ''خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا'' (سورۂ روم: ۲۱) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے تمہاری بیویاں بنائیں، تو جیسے وہاں مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا کا معنی یہ ہے کہ تمہاری جنس سے، کہ جیسے تم ہو ویسے ہی تمہیں بیویاں بنا کردیں، وہاں مِّنۡ کا یہ معنی نہیں کہ وہ اَنۡفُسِكُمۡ کا جزء ہیں، اِسی طرح یہاں بھی مِنۡهَا کا مطلب یہ ہے کہ جیسے آدم ؑ تھے تو آدم کی جنس سے ہی، اُس نفسِ واحدہ کی جنس سے ہی اللہ تعالیٰ نے اُس کی بیوی کو بنایا۔ ''قصص القرآن'' میں اِسی رائے کو ترجیح دی گئی ہے، اور شراحِ حدیث میں سے موجودہ دور کے قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ والے، انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے ''الہام الباری'' بخاری شریف کی روایات کے متعلق کچھ انہوں نے تشریح کی ہے، اُس میں انہوں نے بھی اِس روایت کے تحت جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اِس کے تحت

---

(۱) مسلم ۱/ ۴۷۵ باب الوصیۃ بالنساء۔ مشکوۃ ۲/ ۲۸۰ باب عشرۃ النساء، فصل اول/ نیز بخاری ۱/ ۴۶۹، کتاب احادیث الانبیاء کا پہلا باب۔

انہوں نے اسی رائے کا اظہار فرمایا کہ یہاں تشبیہ دینا مقصود ہے کہ جنسِ عورت پسلی کی طرح کجی والی ہے، ورنہ یہ بتلانا مقصود نہیں کہ پسلی سے ہی کوئی مادّہ لے کر اِس کو پیدا کیا گیا، وہ کہتے ہیں کہ اس کی طبیعت کے اندر جو پسلی کی طرح کجی ہے اسلاعوجاج کو بیان کرنے کے لئے سرورِ کائنات ﷺ نے یہ تعبیر اختیار کی ہے، گویا کہ اُنہوں نے بھی اِسی رائے کا اظہار کیا کہ آدم علیہ السلام کی پسلی سے حوا کو پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ جنسِ مرأة کی کجی کو بیان کرنے کے لئے یہ ایک تشبیہ ہے، تشبیہ کے طور پر اس کو ذکر کیا گیا ہے، اور اِس کی بھی تائید قرآنِ کریم کے ایک محاورے سے ہوسکتی ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (سورۂ انبیاء: ۳۷) انسان عجل سے پیدا کیا گیا، جلد بازی سے پیدا کیا گیا، یعنی اِس کی فطرت کے اندر جلد بازی ہے، تو جس طرح جلد بازی انسان کی طبیعت میں ظاہر کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال ہوئے ہیں اسی طرح عورت کی فطرت میں کجی ظاہر کرنے کے لئے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ دونوں رائیں ہیں، ''بیان القرآن'' میں تو اِسی پہلی رائے پر ہی زور دیا گیا ہے کہ حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادّہ لے کر پیدا کیا گیا، اور ''رُوح المعانی'' میں بھی اِسی قول کو ترجیح دی گئی ہے، اور دوسرے قول کو مردود ٹھہرایا ہے۔

سوال:- آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب:- میں تو صرف ناقل ہوں، محاورات سے دونوں کی تائید ہوتی ہے، لیکن ہمارے جو قریبی اکابر ہیں، اکابرین دیوبند، وہ پہلی رائے کو ترجیح دیتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی پسلی سے مادّہ لے کر ہی حوا کو پیدا کیا گیا۔ اس قسم کی جو چیزیں ہوتی ہیں جو قرآنِ کریم کے اندر پوری وضاحت کے ساتھ ذکر نہیں کی گئیں اور محاورات کے تحت اُن کے دونوں مطلب بن سکتے ہیں، تو اِس میں کوئی ایسے اختلاف کی بات نہیں ہوا کرتی، اور نہ یہ چیزیں کوئی مدارِ ایمان ہوتی ہیں۔ بہرحال آدم علیہ السلام کو براہِ راست مٹی سے بنایا گیا، حوا کی پیدائش اُس طرح سے نہیں ہوئی جس طرح موجودہ انسانوں کی ہوتی ہے، یا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی براہِ راست مٹی سے بنایا، یا اُن کی بنیاد آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی جزء لے کر رکھی گئی، دونوں رائیوں کی گنجائش ہے۔

نسلِ اِنسانی کی بنیاد آسمانی مذاہب کی روشنی میں

اب یہ جوڑا تیار ہوگیا، جوڑا تیار ہونے کے بعد وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً: پھر ان دونوں سے بہت سارے مردوں اور بہت ساری عورتوں کو پھیلایا، آگے نسلِ انسانی اسی طرح سے چلی، کہ اِس جوڑے سے آگے مرد اور عورت پیدا ہوتے چلے گئے اور یوں خاندان آباد ہوگئے۔ تو انسان کی بنیاد یہی ہے، تمام ادیانِ سماویہ کے تحت، یعنی اِس نظریے میں کسی دِینِ سماوی نے اختلاف نہیں کیا کہ نسلِ انسانی کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام سے اور آدم علیہ السلام کی بیوی حوا سے شروع ہوئی ہے، اسی سے آگے پھر نسل چلی، پیدائش کے طور پر گویا کہ سارے کے سارے انسان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، تو رشتہ داری سب سے ہوئی، کسی سے قریب کی، کسی سے دور کی۔

آپس میں ہمدردی کی تاکید

تو اصلاحِ معاشرہ کی بنیاد اِس اُصول پر رکھی گئی کہ انسان سارے کے سارے بھائی بھائی ہیں، اور آپس میں معاملات

یوں ملے کیا کرو جیسے بھائی بھائیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔اور سرورِ کائنات ﷺ نے حدیث شریف میں بھی اسی بات پر زور دیا: ''لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ''[1] اُس وقت تک کوئی شخص کامل مؤمن نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، یعنی معاملات کے اندر ہمیشہ دوسرے کے معاملے کو اپنی طرح سمجھو، جس طرح تم اپنے ساتھ برتاؤ پسند کرتے ہو اسی طرح دوسرے بھائی کے ساتھ برتاؤ کیا کرو، تم چاہتے ہو کہ تمہاری عزت کی جائے، تمہاری عزت کو نقصان نہ پہنچایا جائے، مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے، جان کو نقصان نہ پہنچایا جائے، اپنے ساتھ تم دوسرے کو ہمدرد اور خیر خواہ دیکھنا چاہتے ہو، تو اپنی طرف سے دوسروں کے ساتھ بھی انہی جذبات کا مظاہرہ کرو، کمالِ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے، اور انسانی برادری سے تعلق رکھنے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سب کے معاملات کو اسی طرح سے سوچو۔

دوبارہ تقوے کی تاکید

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ : پھر دوبارہ تقوے کا حکم آ گیا، کہ تعلق اگرچہ واضح کردیا گیا کہ تم سب ایک خاندان کے ہو، لیکن اس قسم کے قواعد وضوابط کی رعایت رکھنا، اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈریں گے اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی رعایت رکھیں گے تبھی جا کر یہ معاشرہ صحیح ہوسکتا ہے، ''ڈرو اللہ تعالیٰ سے جس کے واسطے سے تم آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو'' یعنی جب تمہارا کوئی معاملہ کسی دوسرے سے اٹک جاتا ہے، یا تمہارا کوئی حق دوسرے کے ذمے لگ جاتا ہے، تو تم اُسے کہتے ہو کہ اللہ سے ڈر اور میرا حق ادا کر، تو جب دوسرے کو اللہ کا ڈر سناتے ہو تو خود بھی تو اللہ سے ڈرو، اور خود اللہ سے ڈر کے دوسرے کا حق ادا کرو، اگر تقویٰ اور خوفِ خدا عام ہو جائے تو دوسرا آپ کے حقوق ادا کرنے میں اِس کی رعایت کرے گا، اور آپ اُس کے حقوق ادا کرنے میں رعایت کریں گے، معاملہ سیدھا رہ جائے گا۔اس لیے جیسے دوسروں سے اپنا حق مانگتے وقت اللہ یاد دلاتے ہو، تم بھی دوسروں کا حق ادا کرتے وقت اللہ کو یاد رکھا کرو۔

صلہ رحمی کی تاکید

وَالْاَرْحَامَ: اَرحام رِحم کی جمع ہے، رحم اصل کے اعتبار سے تو بچہ دانی کو کہتے ہیں، لیکن پھر ولادت کے اعتبار سے جس کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے اُس کو کہا جاتا ہے کہ ''یہ میرا ذی رَحم ہے''، ذِی رَحم اور ذِی رِحم دونوں طرح سے یہ لفظ بولا جاتا ہے، تو یہ رشتے داری اور قرابت کے معنی میں ہے۔ ''اور قرابت سے ڈرو'' یعنی قطع رحم سے بچو، رشتہ داریوں کے تعلق کا ٹانہ کرو، صلہ رحمی کو اختیار کرو۔ یہ دوسری بنیاد ہے اصلاحِ معاشرہ کے لئے صلہ رحمی، کہ قطع رحمی سے بچو۔عمومی تعلق تمام انسانوں سے ہوا، اُس کے بعد پھر خصوصی تعلق ہو گیا اپنے قریبی رشتہ داروں سے، تو جتنا جتنا کوئی قریبی رشتہ دار ہوتا چلا جائے گا اتنے اُس کے حقوق بڑھتے جاتے ہیں، مثلاً والدین بلاواسطہ آپ کے رشتہ دار ہیں، اور اسی طرح آپ کے بہن بھائی والدین کی وساطت سے آ گئے، اور دادا باپ کی وساطت سے آ گیا، چچے دادا کی وساطت سے آ گئے، اور آگے چچوں کی اولاد ہو گئی، اِدھر ماں کی وساطت سے نانا نانی ہو گئے، اور پھر

---

(۱) صحیح البخاری ج ۱ ص ۶/مشکوٰۃ ۲/۴۲۲ باب الشفقۃ، فصل اول۔

نانا نانی کی وساطت سے ماموں اور خالائیں ہوگئیں، اس طرح پھر دونوں طرف سے یہ رشتہ پھیلتا چلا جاتا ہے، درجہ بدرجہ ان کی رعایت رکھی جاتی ہے۔ اِس کی تاکید بھی حدیث شریف میں بہت زیادہ آئی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ قاطع الرحم جنت میں نہیں جائے گا،[1] جو رشتے داروں کے اندر رشتہ داری کی رعایت نہیں رکھتا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور جس قوم کے اندر کوئی قاطع الرحم موجود ہو وہ ساری کی ساری قوم ہی اللہ کی رحمت سے محروم ہوجاتی ہے۔[2] اور صلہ رحمی کی تاکید کی ہے کہ جو صلہ رحمی کرے، رشتہ داروں کو اپنے ساتھ ملا کر رکھے اللہ تعالیٰ اسے اپنے ساتھ ملائے گا، جو رشتہ داروں کو اپنے سے کاٹتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے اپنے سے کاٹ دے گا۔[3] بہرحال صلہ رحمی کی تاکید بہت زیادہ ہے، اور قطع رحمی کو حرام قرار دیا ہے، رزق میں برکت، مال میں اضافہ، عمر میں اضافہ، حضور ﷺ نے یہ صلہ رحمی کے فوائد بتائے ہیں۔ اور جتنا انسان قطع رحمی کی طرف جاتا ہے، رشتہ داروں سے کٹتا ہے، رشتہ داروں سے دُور ہوتا ہے، تو رزق میں بھی بے برکتی ہوتی ہے، عمر میں بھی بے برکتی ہوتی ہے۔ مستقل ابواب کُتبِ حدیث کے اندر اِس مسئلے پر ہیں جن میں صلہ رحمی کی تاکید کی گئی ہے۔

اور صلہ رحمی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ خصوصیت سے ہمدردی کا اظہار کرو، اُن کے دُکھ میں کام آؤ، ان کی تکلیف میں کام آؤ، وہ مالی تنگی میں مبتلا ہیں تو ان کے ساتھ معاونت کرو، اُن کو آپ کی بدنی معاونت کی ضرورت ہے تو اُن کی معاونت کرو، اُن کے پاس آؤ جاؤ، اُن کے حالات کی خبر رکھو، خوشی میں خوشی کا اظہار کرو، غمی میں غمی کا اظہار کرو، دنیا کے اندر جس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہوتا ہے، تو عام انسانی برادری کے مقابلے میں جن کے ساتھ جتنی جتنی رشتہ داری ہوتی چلی جائے گی اتنا اُن کے ساتھ معاونت رکھنا، آپس میں ملنا جلنا، گاہے گاہے ہدیے تحفے دینا، دعوت کرنا، اُن کے پاس جانا، اور اسی طرح بوقتِ ضرورت اُن کی اعانت کرنا، یہ ساری کی ساری چیزیں صلہ رحمی میں داخل ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا: بیشک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے اور تمہارا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں رہے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت رکھتے ہوئے انسانی حقوق ایک دوسرے کے ادا کرو، خصوصیت کے ساتھ اپنی رشتہ داریوں کا خیال رکھو، معاشرے کی اصلاح کے یہی بنیادی اصول ہیں۔

یتیموں کے متعلق ہدایات

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَھُمْ: اب آگے جزوی اَحکام آگئے۔ جاہلیت میں سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عورتیں اور یتیم بہت مظلوم تھے، لوگ اِن کے حقوق کی رعایت نہیں رکھتے تھے، کوئی نابالغ بچہ جس کا باپ مرجاتا اور دوسرا کوئی متولی بنتا تو اُس کا مال اُڑا جاتے تھے، جائیدادوں پر قبضہ کرلیتے تھے اور ان کی رعایت نہیں رکھتے تھے، اسی طرح عورتوں کو نہ وراثت میں سے حصہ دیا جاتا تھا، نہ معاشرے کے اندر اِن کا کوئی اور حق پہچانا جاتا تھا، یہ بھی بہت مظلوم تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اِن کے متعلق تاکید فرمائی۔ وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَھُمْ: یتیموں کو اُن کے مال دیتے رہا کرو، یعنی بطور خرچ کے دیتے رہا کرو، اور کلیۃً سپرد

---

(۱) بخاری ۸۸۵/۲، باب اثم القاطع / مسلم ۳۱۵/۲، باب صلۃ الرحم / مشکوٰۃ ۴۱۹/۲، باب البر والصلۃ۔ عن جبیر بن مطعم۔

(۲) شعب الایمان، رقم: ۷۵۹۰ / مشکوٰۃ ۴۲۰/۲، باب البر فصل ثانی، ولفظ الحدیث: لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلٰی قَوْمٍ فِیْهِمْ قَاطِعُ رَحِمٍ۔

(۳) بخاری ۷۱۶/۲۔ ۸۸۵/۲ / مسلم ۳۱۵/۲، / مشکوٰۃ ۴۱۹/۲، باب البر والصلۃ۔ عن ابی ھریرۃ۔

تب کرنے ہیں جب وہ سمجھ دار ہوجائیں گے اور آپ لوگوں کا خیال یہ ہوگا کہ اب یہ مال کو سنبھال لیں گے، اور ضائع نہیں کریں گے۔آگے آرہا ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ: جب وہ سمجھدار ہوجائیں اور تمہیں خیال ہوجائے کہ اب یہ اپنے مالوں کو سنبھال سکتے ہیں، تب اُن کی طرف اُن کا مال سپرد کیا کرو، تو یہاں مراد ہوگا کہ بوقتِ ضرورت اُن کو دیتے رہو۔ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ: اب اِن مالوں میں جس قسم کی لوگ گڑبڑ کرتے تھے اُس کا ذکر ہے، یتیم کے متولّی ہوجاتے، اُس کے مال میں کوئی اچھی چیز ہوتی اور اپنے پاس بھی وہی چیز ہوتی لیکن گھٹیا درجے کی، تو گھٹیا درجے کی چیز اُدھر رکھ دی جاتی اور اچھی لے لی جاتی، یہ بھی یتیموں کے مال سے ایک ناجائز فائدہ اُٹھانے کی صورت تھی کہ اپنے گھر کی گھٹیا چیز اُس کے مال میں ڈال دی اور اُس کی اچھی چیز اپنے ساتھ کرلی۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ یتیم کے مال کو اپنے مال میں خلط ملط کرلیتے، اور اِس خلط ملط کو بہانہ بنا کر یتیم کا مال کھا جاتے، یعنی ملاتے تو اس لئے کہ جب ہم اکٹھے رہتے ہیں تو اکٹھے کھائیں گے، لیکن اپنا مال برائے نام ڈالا اور اُس کا زیادہ ڈال لیا اور اس بہانے سے کھا گئے، اس لئے پہلے پہلے ممانعت کردی گئی تھی کہ یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کیا ہی نہ کرو، سورۂ بقرہ میں اِس کی تفصیل آئی تھی، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے مشکلات پیش آئیں اور اس کے متعلق پوچھا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی کہ اصل مقصد تو اصلاح ہے قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ: اِن کی مصلحت کی رعایت رکھی جائے، اور اگر اِن کو اپنے ساتھ خلط کر کے رکھنے میں مصلحت ہے تو خلط بھی کر سکتے ہو، إِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ (سورۂ بقرہ: ۲۲۰) اگر تم اِن کو اپنے ساتھ خلط ملط کرلو تو تمہارے بھائی ہیں، لیکن مفسد اور مصلح کو اللہ جانتا ہے، کہ کون تو مصلحت کی رعایت رکھتا ہے اور کون مصلحت کی رعایت نہیں رکھتا، تو یہ تفصیل وہاں بھی آئی تھی، اور یہاں بھی یہی کہا جارہا ہے کہ اپنے مالوں میں اُن کے مال خلط ملط کر کے بھی نہ کھا جایا کرو، اور اُن کے مالوں میں سے اچھی چیز لے کر اُس کے بدلے رَدّی چیز اُن کی طرف نہ رکھ دیا کرو۔ یہ کوتاہیاں تھیں جو اُس دور میں ہوتی تھیں، اور آج بھی اللہ تعالیٰ کے دِین سے غافل لوگ، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہیں، خوفِ خدا اُن میں نہیں ہے، تو یتیموں کے مال میں آج بھی لوگ اسی قسم کا خلط ملط کرتے ہیں۔ ''نہ بدلا کرو رَدّی کو طیب کے ساتھ'' یعنی اپنی رَدّی چیز اُدھر ڈال دی اور اُدھر سے اچھی چیز لے لی، ایسا نہ کیا کرو۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ: اور اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر ان کے مال نہ کھا جایا کرو، یعنی مخالطت اِس نیت کے ساتھ نہ کیا کرو کہ اِس بہانے کے ساتھ ہم یتیموں کا مال کھا جائیں گے۔ اور ایک مطلب اِس کا یہ بھی ہے جیسا کہ ''بیان القرآن'' میں ظاہر کیا گیا، کہ جس وقت تک تمہارے پاس اپنے مال موجود ہیں اُس وقت تک یتیموں کا مال نہ کھایا کرو، ہاں البتہ اگر تمہارے پاس اپنا مال ہے نہیں اور تم یتیم کے متولّی ہو تو پھر حق الخدمت لے سکتے ہو، جیسے آگے صراحتاً آئے گا: وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ، فقیر کا معنی محتاج، کہ تمہارے پاس تمہارا اپنا مال موجود نہیں ہے، تم محتاج ہوگئے، اور یتیم کی خدمت تمہیں کرنی پڑتی ہے، اُس کے مال کو سنبھالنا پڑتا ہے، تمہارا وقت اُس پر خرچ ہوتا ہے، تو ایسے وقت میں اگر حق الخدمت کے طور پر تم یتیم کے مال میں سے لے لو اور کھالو تو تمہیں اجازت ہے بقدرِ ضرورت، تو إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ میں یہ ہوگا کہ جب تک تمہارے اپنے مال موجود ہیں اُس وقت تک اپنے مالوں

کے ساتھ ملا کر اُن کے مال نہ کھاؤ، البتہ تمہارے پاس اپنا مال نہ رہے اور تم محتاج ہو جاؤ تو پھر تم یتیم کا مال کھا سکتے ہو، اور وہ کھانا پھر اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھانا نہ ہوا، ضرورت کے وقت حق الخدمت لیا جا سکتا ہے۔

سوال:- جس طرح مدارس میں زکوٰۃ کا پیسہ آتا ہے، اور بجلی کا بل وغیرہ مثلاً زکوٰۃ میں سے ادا کیا جاتا ہے تو جو زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہیں فائدہ تو وہ بھی اُٹھاتے ہیں بجلی سے۔

جواب:- یہ مسئلے ہیں تو پیچیدہ، بہر حال مدرسوں کے اندر جو مال آتا ہے وہ بھی آتا تو آپ لوگوں کے لئے ہے، مساکین کے لئے آتا ہے، یعنی وہ مستحق سمجھ کر ہی دیتے ہیں، اور وہ صَرف جو کیا جاتا ہے تو اصل کے اعتبار سے تو آپ کے لئے کیا جاتا ہے، باقی اگر کوئی باہر کا آدمی آکر فائدہ اُٹھا لیتا ہے تو عُرف کے تحت اتنی سی اجازت تو ہوتی ہے کہ اگر ایک یتیم کے لئے مثال کے طور پر بتی جلائی ہوئی ہے اور دُوسرا کوئی آکر بیٹھ جائے تو اِس میں بظاہر کوئی ایسا حرج تو معلوم نہیں ہوتا، اِس قسم کی سختی اِن معاملات کے اندر بہت مشکل ہے۔ تو اصل تو وہ آپ حضرات کے لئے ہے، دوسرے اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں کہ نہیں اُٹھا سکتے؟ تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ لوگوں کے خدام تو فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، جیسے ایک یتیم بچہ ہو اور اُس کی روٹی پکانے کے لئے کوئی باورچی نوکر رکھ دیا جائے تو باورچی کو تنخواہ اُسی یتیم کے مال میں سے دی جائے گی، اور اسی طرح اُس کے نائی کو پیسے اُسی میں سے دیے جائیں گے، اور اُس کے لئے کوئی ماسٹر متعین کر دیا جائے ٹیوشن پڑھانے کے لئے تو اس کو جو معاوضہ دیا جائے گا وہ اُسی یتیم کے مال میں سے دیا جائے گا، اور دیگر ضروریات جتنی ہوا کرتی ہیں سارے کا سارا سلسلہ جو یتیم کے لئے ہے وہ یتیم کے مال میں سے ہی ہوتا ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ: یتیموں کو اُن کا مال دے دیا کرو اور خبیث کو طیب کے ساتھ بدلا نہ کرو، وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ: اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھا جایا کرو، اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا: اُن کے طیب کو لے کر ردّی رکھ دینا یا اُن کے مالوں کو اپنے ساتھ ملا کر اِس بہانے سے کھا جانا بہت بڑا گناہ ہے۔

یتیم بچی سے نکاح کے متعلق ہدایات

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى: اب یہ دوسرا مسئلہ آ گیا، یہ بھی ایک خرابی تھی اُس دور میں، کہ بسا اوقات ایک یتیم بچی ہوتی، وہ کسی کی کفالت میں ہے، اور وہ کفیل ایسا ہے جس کا اُس بچی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر آپ کی تولیت میں آپ کے چچے کی بیٹی آ گئی، خالہ کی لڑکی آ گئی، پھوپھی کی لڑکی آ گئی، یتیم ہونے کی وجہ سے آپ کی کفالت میں آ گئی، اب اُس کے پاس کچھ نہ کچھ مال بھی ہوتا اور خوبصورت بھی ہوتی، تو متولی کو اُدھر رغبت ہوتی اور اُس سے نکاح کر لیتا، اور پھر نکاح کرنے کے بعد اُس کے حقوق ادا نہ کرتا، اس وجہ سے کہ کوئی دوسرا اُس کے متعلق پوچھنے والا ہے ہی نہیں، آپ ہی اُس کے متولی تھے اور آپ نے نکاح کر لیا، مرضی کے ساتھ تھوڑا بہت اُس کو مہر دیا، اور نہ چاہا تو نہ دیا، اور اسی طرح اُس کے مال پر قبضہ کر لیا جاتا، اور یوں اُس یتیم بچی کے حقوق تلف ہوتے اگر متولی خود اُس کو اپنے نکاح میں لے لیتا، چونکہ دوسرا کوئی شخص اُس کے متعلق پوچھ گچھ کرنے والا ہوتا نہیں تھا۔ اور اگر اِسی لڑکی کی شادی دوسری جگہ کر دی جاتی اور آپ اُس کے متولی رہتے، تو آپ اُس کے حقوق کا مطالبہ کر سکتے تھے،

کہ اگر اُس کا خاوند اُس کو مہر ادا نہ کرتا تو آپ مہر دلوا سکتے تھے، اُس کو نفقہ پورا نہ دیتا تو آپ اُس کو نفقہ دلوا سکتے تھے، اس لئے یہ منع کیا گیا کہ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچیوں کے حقوق ادا نہیں کر سکو گے تو ایسی صورت میں تم ان سے نکاح کیا ہی نہ کرو، اپنے نفس کے لئے یہ بہانہ مہیا ہی نہ کرو، بلکہ اِن کی شادی کسی دوسری جگہ کر دو اور اِن کے حقوق کی نگہداشت کرو، اور خود اور عورتوں سے شادی کرلو جو تمہیں پسند ہوں، جو تمہارے لئے حلال ہیں، اللہ تعالیٰ نے قاعدہ بنا دیا، دو دو کر سکتے ہو، تین تین کر سکتے ہو، چار چار کر سکتے ہو، تو اور عورتیں بہت ہیں، اس لیے اِن یتیم بچیوں سے شادی نہ کیا کرو کیونکہ اِن کے ساتھ شادی کرنے کے بعد ان کے حقوق جب ادا نہیں ہوں گے تو پھر وہ مظلوم بن جائیں گی اور تم ظالم بن جاؤ گے، تو بہتر یہ ہے کہ اِن کا نکاح کسی دوسری جگہ کر کے خود ان کے حقوق کی نگہداشت کرو۔

بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی: اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ یتیم بچیوں کے بارے میں تم انصاف نہیں کر سکو گے فَانْکِحُوْا: تو نکاح کر لیا کرو، مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ: جو تمہیں پسند ہیں، طَابَ حلال ہونے کے معنی میں بھی ہے اور طبعاً پسند ہونے کے معنی میں بھی ہے، جو تمہیں پسند ہیں عورتوں سے دو دو، تین تین، چار چار کر لیا کرو تمہیں اجازت ہے، اور یہ اِجماعِ اُمت ہے کہ چار سے زیادہ شادی کرنا کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں ہے، یعنی بیک وقت چار بیویاں رکھی جا سکتی ہیں، چار سے زائد نہیں رکھی جا سکتیں، چوتھی اگر مر جائے یا طلاق دے دی جائے تو پھر اور بھی کی جا سکتی ہے، یعنی نکاح تو چار سے زائد بھی ہو سکتے ہیں، لیکن بیک وقت بیویاں چار ہی رہ سکتی ہیں، ایک کو طلاق دے دو یا مر جائے تو اس کے بعد اور کر سکتے ہو، اِس بات پر اِجماع ہے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ کے نکاح میں بیک وقت چار سے زائد بیویاں رہیں، اور حضور ﷺ نے ہر اُس شخص کو جو مسلمان ہوا اور اُس کے پاس زائد بیویاں تھیں تو اُس کو پابند کیا کہ چار رکھے اور باقیوں کو چھوڑ دے۔

تعدّدِ نکاح کے جواز کی شرط

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا: لیکن یہ جو دو دو، تین تین، چار چار کرنے کی تمہیں اجازت دی جا رہی ہے یہ بھی تب کرنا جب تمہیں اپنے پر اعتماد ہو کہ تم اِن سب کے حقوق ادا کر سکتے ہو، اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم حقوق کے اندر اِن کے درمیان برابری نہیں کر سکو گے، اِن کے ساتھ عدل اور انصاف کا معاملہ نہیں کر سکو گے، تو پھر ایک پر ہی اکتفاء کیا کرو یا باندی پر اکتفاء کرو، کیونکہ باندی کے ایسے خاص حقوق نہیں ہوتے، اور اسی طرح ایک ہوگی تو برابری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر تو وہ ایک ہی ہے، اُس کا کسی دوسری کے ساتھ حقوق میں مقابلہ نہیں ہے، تو عدل بین النساء بھی فرض ہے، اور متعدد بیویاں کرنے کی تب اجازت ہے جب تمہیں اپنے اوپر اعتماد ہو کہ ہم عدل کریں گے، اور اگر اپنے اوپر اعتماد نہ ہوں اور متعدد بیویاں کر لو گے تو نکاح تو پھر بھی ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں گناہ گار ہو گے، جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ دونوں کے

درمیان برابری نہ کرتا ہو تو قیامت کے دن ایسے حال میں آئے گا کہ اُس کے ایک پہلو پر فالج گرا ہوا ہوگا۔[1] اور سرورِ کائنات ﷺ تمام بیویوں کے درمیان باوجود اس بات کے کہ آپ پر مساوات فرض نہیں تھی، لیکن پھر بھی آپ سب کے حقوق برابر ادا کرتے تھے۔ اور حق کے اندر نفقہ تو ہے ہی، اور ایک دوسرا حق ہوتا ہے شب باشی کا، کہ ایک رات اُس کے پاس گزاری ہے تو ایک رات اُس کے پاس بھی گزارو، باقی! آپس میں جو مجامعت ہے اِس میں مساوات ضروری نہیں ہوتی، کیونکہ یہ نشاطِ طبع پر مبنی ہے کہ کسی دن طبیعت میں رغبت ہوتی ہے اور کسی دن نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح قلبی محبت اور قلبی رُجحان بھی انسان کے اختیار میں نہیں، جیسے حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ: ''اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيمَا أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ''[2] اے اللہ! جو میرے اختیار میں تھا وہ تو میں نے تقسیم کر دیا، اور جو میرے اختیار میں نہیں بلکہ تیرے اختیار میں ہے اُس معاملے میں میرے پہ ملامت نہ کرنا۔ اِس سے حضور ﷺ کا اشارہ میلانِ قلبی کی طرف ہوتا تھا، کہ دل کا میلان کسی بیوی کی طرف زیادہ ہو تو اِس میں جرم نہیں ہے۔ تو ظاہری حقوق میں برابری ہونی چاہیے کہ وقت دونوں کو برابر دیا جائے، اور حیثیت کے مطابق نفقے میں دونوں کی رعایت رکھی جائے۔ اگر عدل نہیں کرو گے تو آخرت میں گناہ گار ہو گے، اور اِس بے انصافی کو دور کرنے کے لئے حکومت مداخلت بھی کر سکتی ہے، کہ اگر کسی بیوی کے حقوق ادا نہ کیے جائیں تو حکومت آپ کو مجبور کرے گی، اور اگر آپ ادا نہ کریں تو حاکم تفریق کر سکتا ہے، لیکن نکاح کر لینے کی صورت میں نکاح ہو جائے گا اور وہ بیوی بن جائے گی۔ فَوَاحِدَةً: فَالْزَمُوْا وَاحِدَةً، یا فَاخْتَارُوْا وَاحِدَةً، (نسفی) پھر تم ایک کو ہی لازم پکڑو، یا ایک کو ہی اختیار کرو، یا ایک پر ہی اکتفاء کرو، اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: یا اپنی باندیوں پر اکتفاء کرو۔

تعدّدِ نکاح پر اِعتراض کا تسلی بخش جواب

سوال:- یہ جو آتا ہے: ''لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ''؟ (سورۂ نساء: ۱۲۹)

جواب:- جی ہاں! قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ آیت آتی ہے کہ تم سے ہو ہی نہیں سکتا کہ تم عورتوں کے درمیان برابری کرو، اسی لئے آج کل جو متجدّدین ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے متعدّد شادیاں کرنے کی اجازت تب دی ہے جب انسان عدل کر سکے اور یہ اندیشہ نہ ہو کہ میں عدل نہیں کر سکوں گا، اور دُوسری جگہ اللہ نے صاف فیصلہ دے دیا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر متعدّد شادیاں ہونی ہی نہیں چاہئیں، اور شادی صرف ایک ہی ہونی چاہیے، دونوں آیتوں کو جوڑ کر یہ نتیجہ نکال لیا۔ اور یہ بات اِجماعِ اُمت کے خلاف ہے اور قرآنِ کریم کے فہم کے بھی خلاف ہے، اگر ایسی بات ہوتی کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے تو پھر صاف کہہ دیا جاتا کہ ایک ہی کر سکتے ہو، ایک سے زیادہ کرنے کی اجازت ہی نہیں، پھر پہلے یہ کہنا کہ دو دو، تین تین، اور چار چار کر لیا کرو اگر تمہیں یہ خیال ہے کہ تم عدل کر سکتے ہو، اور پھر دوسری جگہ جا کر کہہ دیا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں دو تین چار کرنی ہی نہیں چاہئیں، تو یہ پیچ دار معاملہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ صاف کہہ دیا جاتا

---

(۱) سنن الترمذی ۲۱۷/۱، باب ما جاء فی التسویۃ بین الضرائر/ مشکوٰۃ ۲۷۹/۲، باب القسم، فصل ثانی، عن ابی ھریرۃؓ

(۲) سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۹۰، باب فی القسم بین النساء/ مشکوٰۃ، ج ۲ ص ۲۷۹، باب القسم، فصل ثانی، عن عائشہؓ

کہ چونکہ تم عدل کرنہیں سکتے لہٰذا ایک ہی شادی کی اجازت ہے، دوسری کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں جو کہا گیا ہے کہ: ''لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ '' اُس کے آگے لفظ ہیں: ''فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ '' تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم عورتوں کے درمیان میں ہر لحاظ سے برابری کرو، لیکن پھر تم پوری طرح سے ایک طرف ہی نہ ڈھلک جایا کرو کہ دوسری کو لٹکی ہوئی چھوڑ دو، اب اِن لفظوں کے اندر غور کرو تو بات خود نکل آئے گی کہ ظاہراً و باطناً برابری تم سے ممکن نہیں ہے، جیسے حضور ﷺ نے بھی فرمایا کہ میلانِ قلبی اختیار میں نہیں، لیکن تم پورے کے پورے اس طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ جیسے دل ایک کی طرف مائل ہے تو تم ظاہری طور پر بھی اُس کی طرف ہی مائل ہو جاؤ، اور دوسری کو لٹکی ہوئی چھوڑ دو کہ نہ وہ بے خاوند سمجھی جائے نہ خاوند والی سمجھی جائے، اگر دل کے اندر میلان ایک کی طرف ہے تو اِس میں کوئی حرج نہیں، لیکن ظاہری طور پر میلان ایک طرف ہو جانا اور ایک ہی طرف کو ڈھلک جانا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے، ظاہری برابری تم کر سکتے ہو کہ ایک رات اُس کے پاس گزاری ہے تو ایک رات اس کے پاس بھی گزارو، نفقہ اُس کو دیتے ہو تو اُس کو بھی دے دو، اس لیے ظاہری حقوق یہاں مراد نہیں ہیں کہ تم ان کے درمیان میں برابری نہیں کر سکتے، ورنہ تو یہ بداہت کے خلاف ہے، یعنی اگر ایک شخص کی دو بیویاں ہیں تو اگر ایک رات وہ ایک مکان میں جا کر سو جائے تو دوسری رات وہ دوسرے مکان میں جا کر کیوں نہیں سو سکتا، کیا وہ عاجز آ گیا ہے؟ دوسرے مکان میں سونا اس کے اختیار میں نہیں ہے؟ جب اُس نے ایک رات ایک کمرے میں گزاری ہے تو کیا وہ دوسری رات دوسرے کمرے میں جا کر نہیں سو سکتا؟ تو پھر ہم کیسے کہیں کہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم برابری نہیں کر سکتے، برابری تو ہو گئی، اور اگر تم ایک کو پچاس روپے خرچ دیتے ہو تو دوسری کو کیوں نہیں دے سکتے، اور اگر تمہارے پاس ہیں ہی پچاس روپے تو تم پچیس پچیس تقسیم کیوں نہیں کر سکتے، یہ تو ساری کی ساری باتیں اختیار میں ہیں، تو عدمِ استطاعت اِن میں مراد نہیں ہے، اگر عدمِ استطاعت ان میں مراد ہو تو پھر تو یہ بداہت کے خلاف ہے، کہ تم برابری کر ہی نہیں سکتے، کہ اگر ایک دن ایک چارپائی پر گئے ہو تو دوسرے دن دوسری چارپائی پر جا ہی نہیں سکتے، ایک کو اگر روٹی کپڑا دیتے ہو تو دوسری کو دے ہی نہیں سکتے، یہ بات تو بداہت کے خلاف ہے، کیونکہ یہ دونوں باتیں تو انسان کے اختیار میں ہیں۔ اس لیے یہاں برابری اِن میں مراد نہیں، جس کو عدمِ استطاعت کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے یہ دل کا میلان ہے، کہ اگر تم یہ چاہو کہ ظاہراً و باطناً پوری طرح سے عورتوں میں برابری رکھو یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، لیکن تم ایسے طور پر ایک طرف نہ ڈھلک جایا کرو کہ دوسری کو بالکل ہی لٹکی ہوئی چھوڑ دو، اگر تم ظاہری طور پر بھی اُسی کے ہو کر رہ جاؤ گے اور باطنی طور پر بھی اُسی کے ہو کر رہ جاؤ گے تو اب دوسری بیوی كَالْمُعَلَّقَةِ ہو گئی، اور اگر دل کے اندر تو برابری نہیں ہے، میلانِ قلبی تو ایک طرف کم اور ایک طرف زیادہ ہے، لیکن ظاہری طور پر تمہیں ایک طرف ڈھلکنے کی اجازت نہیں، ظاہری طور پر برابری رکھا کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔ بہر حال اگلے لفظ خود اِس مراد کو واضح کر دیتے ہیں، باقی! یہ کہنا کہ ظاہری حقوق کے اندر عدل ممکن نہیں، یہ بات بداہت کے خلاف ہے، کیوں ممکن نہیں؟ آخر انسان کو طاقت ہے، قدرت ہے، وہ رات اُس کے پاس بھی گزار سکتا ہے اور اُس کے پاس بھی گزار سکتا ہے، نفقہ اُسے بھی دے سکتا ہے اور اُسے بھی دے سکتا ہے، لہٰذا وہ آیت ظاہری حقوق کے اندر برابری میں عدمِ استطاعت کو ذکر نہیں کر رہی۔ یہ آج کل کے لوگوں کا اس قسم کا استدلال جس کی بناء پر وہ دوسری شادی کو ممنوع قرار دیتے ہیں، یہ غلط ہے، اصل مقصد

شریعت کا ہے حقوق کی حفاظت، کہ حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے، اُس میں اللہ کا خوف دلا کر بھی تمہیں برانگیختہ کیا جارہا ہے، اور اس میں حکومت دست اندازی بھی کرسکتی ہے، کہ اگر کوئی عورت جا کر عدالت میں دعویٰ کر دیتی ہے کہ میرا نکاح اس کے ساتھ ہے لیکن یہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا تو حاکم مجبور کرے گا، اور اگر پھر بھی وہ سیدھا نہیں ہوتا تو حاکم تفریق کر دے گا، اور یہ حقوق کا تلف کرنا جیسے متعدد بیویوں میں ہوسکتا ہے ایک بیوی میں بھی ہوسکتا ہے، اِس میں کون سی بات ہے؟

تعدّدِ ازواج کی حکمتیں

اور تعدّدِ ازواج شریعت کی ایک ایسی حکمت ہے کہ اس کے ساتھ زِنا اور بدکاری پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے، لازمی بات ہے کہ جب ایک بیوی ہوگی تو ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ کافی کافی دیر تک وہ بیوی خاوند کے لئے کارآمد نہیں ہوتی، جیسے بیمار ہونے کی صورت میں، وضعِ حمل کی صورت میں، ماہواریوں کی صورت میں، اور آدمی بسا اوقات مغلوب الشہوۃ ہوتا ہے، اور اگر اُس کو اتنا ناغہ کرنا پڑ جائے تو اندیشہ ہے کہ کسی بدکاری میں مبتلا ہوجائے گا، تو اس کا تحفظ اسی میں ہے کہ اُس کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی جائے، یہی وجہ ہے کہ جہاں تعدّدِ ازواج نہیں ہے اور دوسری شادی پر پابندی ہے کہ دوسری شادی نہیں کی جاسکتی، تو وہاں ناجائز طور پر دہائیوں کے حساب سے بھی لوگ برتتے ہیں، اور وہاں کسی قسم کی پابندی نہیں، پھر زِنا اور عیاشی فحاشی عام ہوجاتی ہے، ایک بات تو یہ ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ قدرۃً عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ عورت کی پیدائش مرد کے مقابلے میں زیادہ ہے، اب اگر دوسری شادی کی اجازت نہ ہو تو بہت ساری عورتیں بغیر شوہر کے رہ جائیں گی، اور اِس مسئلے کو اگر حل کیا جاسکتا ہے تو تعدّدِ ازواج کے ساتھ ہی حل کیا جاسکتا ہے کہ ایک خاوند کو کئی بیویاں کرنے کی اجازت ہو۔ تو اِس کے ساتھ دُنیا کا نظم بھی ٹھیک رہ جائے گا اور اسی طرح فحاشی بدمعاشی پر بھی کنٹرول ہوجائے گا۔ اس لیے اِس کی حکمتوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا، جہاں بھی دوسری شادی پر پابندی ہوگی وہاں زنا اور فحاشی زیادہ پائی جائے گی، تو یہ مجمع علیہ مسئلہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں، دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے، البتہ حکومت اتنا کنٹرول کرسکتی ہے کہ اگر اُس کے نوٹس میں آجائے کہ یہ حقوق ادا نہیں کرتا تو اُس کو مجبور کرے گی، اور اگر اس کے باوجود بھی حقوق ادا نہیں کرتا تو حاکم تفریق کرسکتا ہے۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا: یہ ایک پر اکتفاء کرنا زیادہ قریب ہے اِس بات کے کہ تم ظلم نہیں کرو گے، یعنی ترغیب اِسی کی ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ حقوق ادا نہیں کرسکتے تو ایسی صورت میں پھر اکتفاء ایک پر کیا کرو، بلکہ اِس سے بڑھ کر روایات سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک کے متعلق بھی حقوق ادا کرنے کی انسان میں استطاعت نہیں ہے، بدنی صحت کے لحاظ سے یا دوسرے احوال کے اعتبار سے وہ سمجھتا ہے کہ میں نے شادی کرلی تو میں بیوی کے حقوق ادا نہیں کرسکتا، تو اُس کو ایک بھی کرنے کی اجازت نہیں، تو ایک بھی تبھی کرنی ہے جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس ایک کے حقوق ادا کرسکتا ہوں، ورنہ پھر ویسے ہی احتیاط کی جائے۔

بیوی سے مہر معاف کروانے کا مسئلہ

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً: اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی کے ساتھ دیا کرو، رغبت کے ساتھ۔ نِحلَ: خوشی کے ساتھ کوئی

چیز دینا، صَدُقات صَدُقَه کی جمع ہے، ’’عورتوں کو اُن کے مہر خوشی کے ساتھ دیا کرو‘‘، نکاح میں جو مہر متعین کیا جاتا ہے یہ عورت کا قرض ہوتا ہے جو خاوند کے ذِمّے لگتا ہے، اور عام طور پر آج یہی رواج ہوگیا ہے کہ لوگ ادانہیں کرتے، رسماً معاف کروالیتے ہیں، اور یہ معافی جو رِواج کے دباؤ سے ہے یادوسرے خارجی حالات کے دباؤ سے ہے یہ کوئی معتبر نہیں ہے، خاوند کے ذِمّے یہ قرض ہوتا ہے، ادا کرنا چاہیے، اُس کو ادا کرنے کے بعد پھر وہ عورت خوشی کے ساتھ واپس کردے تو پھر کوئی شک شبہ نہیں، اور خارجی حالات کے دباؤ کے بغیر اگر از خود خوشی کے ساتھ ویسے ہی معاف کردیتی ہے کہ میں لیتی نہیں تو بھی ٹھیک ہے، لیکن دباؤ دے کر اس سے معاف کروانا، چاہے وہ دباؤ رِواج کے تحت دلایا جائے یا کسی دوسری چیز کے تحت، یہ معافی معتبر نہیں۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا: اگر خوش ہوجائیں تمہارے لئے وہ اُس مہر میں سے کسی شَے سے از روئے دل کے، یعنی دل سے خوش ہوجائیں، کیونکہ طیبِ نفس کے ساتھ ہی دوسرے کا مال حلال ہوسکتا ہے، کئی دفعہ یہ مسئلہ آپ کے سامنے آیا: ’’اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِهٖ‘‘[1] کہ دل کی خوشی کے بغیر دوسرے کے مال سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا، اس لئے آپ زبردستی جو دوسروں کی چیزیں لے لیتے ہیں یا مجبور کرکے دوسرے سے دعوت منوائی جاتی ہے یہ ٹھیک نہیں ہے، دل کی خوشی کے تحت ہی ایک دوسرے کو عطیہ دیا جائے، ہدیہ دیا جائے، دعوت کی جائے، وہی بہتر ہوتی ہے، جہاں دل کی کراہت آجائے گی اور جبر والی بات آجائے گی وہاں پھر کھانا پینا جائز نہیں ہوتا۔ تو اگر وہ دل کی خوشی سے کوئی چیز چھوڑ دیں فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا: تو اُس کو لذیذ سمجھ کر اور خوشگوار سمجھ کر کھا جایا کرو، ’’کھا جایا کرو اس کو اس حال میں کہ وہ لذیذ ہے، خوشگوار ہے۔‘‘

نادان بچّوں کو مال دینے کا حکم

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا: نادان بچّوں کو، بے سمجھ بچّوں کو اپنے مال نہ دیا کرو، ایسے مال جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے قیام بنایا ہے، یعنی تمہاری زندگی کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں، یہ مال کی اہمیت بتائی ہے، یعنی مال کوئی ایسے ہی ضائع کرنے والی چیز نہیں، بلکہ انسان کی گزران کا باعث ہے، مایۂ زندگی ہے، اِس کے ساتھ انسان کا وقت اچھا گزرتا ہے، آج تو یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ اگر مال ضائع ہوجائے اور مال کے اعتبار سے انسان محتاج ہوجائے تو نہ عزت رہتی ہے نہ وقار، اور انسان بہت جلدی اپنے دِین سے ہاتھ دھولیتا ہے، پھر کھانے کمانے کے لئے انسان حرام ذرائع اختیار کرتا ہے اور اپنے دِین کو بیچتا ہے۔ پہلے دور سے ہی یہ بات اِسی طرح سے چلی آرہی ہے، حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول مشکوٰۃ شریف میں مذکور ہے، فرمایا کرتے تھے کہ جس کے پاس دراہم وغیرہ ہوں وہ اِن کو سنبھال کے رکھے، کیونکہ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ اگر انسان محتاج ہوجائے تو سب سے پہلے اپنے دِین کو خرچ کرتا ہے، روٹی کمانے کے لئے اپنے دِین کو برباد کرتا ہے۔[2] تو یہ کوئی ضائع کرنے والی چیز نہیں، انسان کی عزّت کا تحفظ بھی مال کے ساتھ ہوتا ہے اور دِین کا تحفظ بھی مال کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے اگر کسی کے پاس مال ہو تو اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، یہ قابلِ قدر چیز ہے، مایۂ زندگی ہے۔ تو اگر بے سمجھ لوگوں کے ہاتھ میں دے دو گے وہ ضائع کردیں گے، اس

(۱) سنن دار قطنی ج ۳ ص ۴۲۴، رقم: ۲۸۸۵/ نیز مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵۵ باب الغصب فصل ثانی۔

(۲) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۵۱ عن سفیان الثوری باب استحباب المال فصل ثالث۔

لیے نادان بچوں کو اُن کے مال نہ دیا کرو، اپنے مال تم نادانوں کے سپرد نہ کیا کرو، ایسے مال جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے گزران کا باعث بنایا ہے۔ ہاں البتہ اِن سفہاء کو اُس میں سے کھانے کے لئے دیتے رہا کرو، اِن کے کپڑے اور خوراک کا اُس میں سے انتظام کرو، وَاكْسُوْهُمْ: اور اِنہیں لباس پہناؤ، اور اِنہیں اچھی بات کہتے رہو کہ اگر یہ مانگیں بھی کہ یہ میرے پیسے ہیں تو کہو کہ ہاں! آپ کے ہی ہیں، لیکن ہم آپ پر خرچ کریں گے، بقدرِ ضرورت آپ کو دیں گے، ہم آپ کے مفاد میں ہی کر رہے ہیں جو کچھ کر رہے ہیں، اس طرح نرمی کے ساتھ ان کو سمجھاؤ۔

یتیموں کے مال کے متعلق ہدایات

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى: اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہا کرو، یعنی کبھی کبھی اُن کو کچھ خریدنے کے لئے بھیج دیا کرو، بیچنے کے لئے بھیج دیا کرو، اُن کی سمجھداری کی آزمائش کرو، حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، بالغ ہو جائیں، پھر اگر وہ تمہیں سمجھدار معلوم ہوں فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا: اگر تم ان سے رُشد معلوم کرو، سمجھدار معلوم ہو جائیں فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ تو پھر اُن کے مال ان کے سپرد کر دیا کرو۔ البتہ اگر وہ اُسی طرح سے سفیہ ہیں، نادان ہیں، مغلوب العقل ہیں، معتوہ ہیں، تو پھر چاہے بالغ ہو جائیں مال اُن کے سپرد نہ کیا کرو۔ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا: ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہوئے یتیموں کے مالوں کو نہ کھا جایا کرو، اور اِس بات سے سبقت لے جاتے ہوئے نہ کھا جایا کرو کہ بڑے ہو کر مال ہم سے لے لیں گے، اُن کے بڑے ہونے سے سبقت لے جاتے ہوئے، کہ تم جلدی جلدی اس کے اندر تصرف کر دو تا کہ وہ بالغ ہو کر کہیں ہم سے یہ مال لے نہ لیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ بقدرِ ضرورت خرچ کرو اور مناسب اندازی کے ساتھ خرچ کرو، اگر تمہارے دل میں یہ جذبہ ہو کہ ہم جلدی جلدی اِس میں تصرف کر لیں، ورنہ یہ بالغ ہو جائے گا اور بالغ ہونے کے بعد اپنا مال ہم سے لے لے گا، یہ بھی ایک مجرمانہ کوشش ہے۔ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا: جو کوئی شخص غنی ہے، اُس کی اپنی ضرورت گھر سے پوری ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو کھانے پینے کے لئے دے رکھا ہے، پھر اگر وہ یتیم کی خدمت بھی کرتا ہے تو اُس کو یتیم کے مال میں سے نہیں لینا چاہیے، فَلْيَسْتَعْفِفْ: پھر وہ بچ کے رہے، وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا: اور اگر وہ محتاج ہے، ضرورت مند ہے، تو پھر وہ جو یتیم کی خدمت کرتا ہے اُس خدمت کے عوض میں وہ یتیم کا مال معروف طریقے سے کھا سکتا ہے، معروف کا معنی ہے کہ جس قسم کا دستور ہے، عقل مندوں کے نزدیک اور شرفاء کے طبقے میں جو دستور ہے کہ اتنا لے سکتے ہیں، یعنی یہ دیکھ لیا جائے کہ اپنا معیارِ زندگی یہ ہے اور یتیم کے مال کی نوعیت یہ ہے، یہ نہ ہو کہ یتیم کے پاس تو مثال کے طور پر پیسے تھوڑے سے ہیں، اور متولی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ وقت گزارتا ہوا اس بہانے سے یتیم کا مال کھا جائے، یہ درست نہیں، بلکہ یتیم کی نوعیت، اُس کے مال کی نوعیت اور اُس کی خدمت کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے عرف کے مطابق اُس کا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: اور جب تم اُن کی طرف ان کے مال سپرد کرو، فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ: تو گواہ بنا لیا کرو، یتیم کی جائیداد اُس کے سپرد کرتے ہوئے گواہ بنا لو تا کہ کل کو کسی قسم کا نزاع نہ پیدا ہو جائے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا: اصل تو اللہ تعالیٰ حساب لینے والا کافی ہے، لیکن پھر بھی ظاہری طور پر حساب صاف رکھو، اور مال ان کے سپرد کرتے وقت گواہ بنا لیا کرو۔

وراثت کی تقسیم کا مدار اقربیت پر ہے

آگے وِرثے کے مسئلے کی بنیاد اُٹھائی جا رہی ہے، پہلے زمانے میں سرورِ کائنات ﷺ سے پہلے وراثت اکثر و بیشتر بالغ لڑکے ہی سنبھال لیتے تھے، بالغ لڑکا نہ ہوتا تو جو بھی خاندان کے اندر بڑا ہوتا وہی قبضہ کر لیتا تھا، نہ عورتوں کو حصہ دیتے تھے اور نہ بچیوں اور بچوں کو دیتے تھے، اس لیے یہاں وہ حصے متعین کئے جا رہے ہیں کہ جو شخص بھی مال وغیرہ چھوڑ کر جائے تو اُس کو کس اصول سے تقسیم کرنا ہے؟ ''مردوں کے لئے حصہ ہے اس چیز سے جس کو والدان چھوڑ جائیں اور اقربون چھوڑ جائیں''، تو مرد بھی حصے میں شریک، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ: اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اُس چیز میں سے جس کو والدان چھوڑ جائیں اور اقربون چھوڑ جائیں، یعنی ماں باپ کے چھوڑے ہوئے میں لڑکے بھی شریک ہیں اور لڑکیاں بھی شریک ہیں، اور اقربون کے چھوڑے ہوئے میں لڑکے بھی شریک ہیں اور لڑکیاں بھی شریک ہیں۔ یہاں اَقرب کا لفظ بولا، جیسے کہ آپ کے سامنے آئے گا کہ وراثت کی تقسیم کا مدار اقربیت پر ہے، جو زیادہ قریب ہو وہ حقدار ہے اور جو اس کے مقابلے میں ابعد ہو وہ حقدار نہیں ہے۔

پچھلے دنوں میں آپ نے سنا ہوگا کہ یہ بحث بھی اچھی خاصی چلی ہوئی تھی کہ دادے کے فوت ہونے کی صورت میں پوتا وارث ہے یا نہیں؟ یہ بھی اِجماعِ اُمت کے ساتھ طے شدہ مسئلہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کہ ایک آدمی کے مثال کے طور پر دو لڑکے تھے، ایک لڑکے کی آگے اولاد موجود ہے اور خود وہ فوت ہو گیا، اور یہ آدمی (دادا) خود بعد میں فوت ہوتا ہے، تو اِس کا ایک لڑکا موجود ہے اور دوسرے پوتے پوتیاں موجود ہیں، تو لڑکا چونکہ اَقرب ہے اس لیے وراثت اِس کو ملے گی، اَبعد کو وراثت نہیں ملے گی، یہ متفق علیہ اُصول ہے اِجماعِ اُمت کے ساتھ، جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہاں البتہ اِن پوتے پوتیوں کے لئے انسان اپنی زندگی میں جو چاہے انتظام کر دے، یعنی اگر اِن کا باپ زندہ ہوتا تو اِن کو آدھی جائیداد ملنی تھی، اور اب دادے کو اپنی زندگی میں اختیار ہے چاہے آدھی سے بھی زیادہ دے دے، اسی طرح اِن کے لئے وصیت کر سکتا ہے، اور اپنی زندگی میں اس قسم کے انتظامات کئے جا سکتے ہیں، لیکن جب وراثت تقسیم ہوگی تو وراثت کے اندر اَقربیت کا اُصول مدنظر رکھا جائے گا، کہ اَقرب کی موجودگی میں اَبعد محروم ہوگا۔ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ: چھوڑا ہوا مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، اُس میں مرد بھی شریک ہیں اور عورتیں بھی شریک ہیں، نَصِيبًا مَّفْرُوضًا: اور یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کئے ہوئے ہیں۔

تقسیمِ وراثت کے وقت غیر ورثاء کے متعلق ہدایات

اور اگر وراثت کے تقسیم کرتے وقت ایسے رشتے دار آجائیں جو وراثت میں حصے دار نہیں ہیں یا کوئی اور مساکین آجائیں تو اُن کو ویسے ہی عطیے کے طور پر تھوڑا بہت بطور خیرات کے دے دیا کرو، اور اچھی بات کہہ کر ٹال دیا کرو۔ لیکن یہ بطور خیرات کے جو کچھ دینا ہے یہ بھی بالغ ورثاء اپنے حصے میں سے دیں گے، نابالغ کے حصے میں سے دینے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ نابالغ اگر اجازت بھی دے دے تو اُس کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں ہے، اگر کچھ ورثاء بالغ ہیں اور کچھ نابالغ ہیں تو بالغین اپنے حصے میں سے بطور صدقہ خیرات کے دے سکتے ہیں، نابالغ کے حصے کی میراث میں سے بطور صدقہ خیرات کے بھی کوئی چیز نہیں دی جا سکتی، مرنے

والے کے لئے ایصالِ ثواب کے طور پر بھی کھانا کھلانا ہو تو نابالغ کے مال میں سے نہیں کھلایا جاسکتا، اور مرتے ہی سارے کا سارا مال وراثت میں چلا جاتا ہے، اس لئے جب تک وراثت تقسیم نہ ہو مرنے والے کے گھر سے عام طور پر مہمانی کا کھانا کھانے میں بھی احتیاط کرنی چاہیے اگر اُس میں یتیم بچے شامل ہیں۔ ''جب حاضر ہوں تقسیم میں رشتے دار اور یتیم اور مسکین تو اُنہیں اس میں سے کچھ دے دیا کرو، اور اُنہیں اچھی بات کہہ دیا کرو'' یعنی اچھی بات اور نرم بات کہہ کر اُن کو ٹال دیا کرو، کہ تمہارا حصہ نہیں ہے، یا یہ ورثہ نابالغوں کا ہے، جس میں سے ہم بطور صدقہ خیرات کے بھی کچھ نہیں دے سکتے، اس طرح سے نرم گفتگو کر کے ٹال دیا کرو۔

یتیموں کی خیر خواہی کی تاکید نفسیاتی اُصول کے ذریعے

اگلی آیت میں پھر یتیموں کا خیال رکھنے کے لئے کہا گیا ہے، اور اس میں اِس نفسیاتی اصول کو برتا گیا ہے، کہ کہا جا رہا ہے کہ تم یہ سوچو کہ اگر تم مرجاؤ اور پیچھے یتیم بچے چھوڑ جاؤ تو تمہارے جذبات کیا ہیں کہ تمہارے بچوں کے ساتھ لوگ کس طرح سے پیش آئیں؟ تو جیسے تم اپنے بچوں کے متعلق سوچتے ہو، کہ مرجانے کے بعد تمہارے بچوں کے متعلق یہ جذبات ہوں، تو دوسروں کے بچے اگر اس طرح یتیم ہو گئے ہیں تو ان کے ساتھ بھی انسان کو ایسے ہی جذبات رکھنے چاہئیں۔ ''چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑ جائیں وہ اپنے پیچھے کمزور بچے تو اُن کے متعلق اندیشہ کریں گے، پس چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور درست بات کہا کریں'' اچھی بات کہیں اور نرمی کے ساتھ ان کو سمجھائیں، بات درست کہیں اور نرم کہیں، اور ایسے خیال کریں کہ اگر ہمارے یہ بچے ہوتے تو ہم اِن کے ساتھ برتاؤ کیسا چاہتے؟ ''بے شک وہ لوگ جو یتیموں کے مال کو کھاتے ہیں ناحق'' حق کے ساتھ تو کھانا درست ہے جیسے پیچھے آیا، جو ناحق اموالِ یتامیٰ کھاتے ہیں ''سوائے اس کے نہیں کہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں'' یعنی آج یہ کھانا لذیذ معلوم ہو رہا ہے، کل کو یہی کھانا آگ کی صورت اختیار کر جائے گا، وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا: اور عنقریب داخل ہوں گے وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

يُوْصِيْكُمُ	اللّٰهُ	فِيْٓ	اَوْلَادِكُمْ	لِلذَّكَرِ	مِثْلُ	حَظِّ	الْاُنْثَيَيْنِ

اللہ وصیت کرتا ہے تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں، مذکر کے لیے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے

فَاِنْ	كُنَّ	نِسَآءً	فَوْقَ	اثْنَتَيْنِ	فَلَهُنَّ	ثُلُثَا	مَا	تَرَكَ ۚ وَاِنْ

اور اگر وہ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں دو سے زیادہ تو ان کے لئے دو تہائی حصہ ہے اُس مال کا جو مرنے والے نے چھوڑا ہے، اور اگر

كَانَتْ	وَاحِدَةً	فَلَهَا	النِّصْفُ ۭ	وَلِاَبَوَيْهِ	لِكُلِّ	وَاحِدٍ	مِّنْهُمَا

لڑکی ایک ہی ہو تو اس کے لیے آدھا حصہ ہے، مرنے والے کے والدین کے لئے یعنی ان میں سے ہر ایک کے لیے

السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ

چھٹا حصہ ہے اس مال میں سے جو اُس نے چھوڑا ہے اگر مرنے والے کی اولاد ہو، اور اگر مرنے والے کی اولاد نہ ہو

وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ

اور اُس کے وارث صرف اُس کے والدین ہی ہوں تو اُس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے، اور اگر مرنے والے کے بہن بھائی ہوں تو

فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ اٰبَآؤُكُمْ

اُس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے، وصیت کے بعد جو مرنے والا کرتا ہے یا قرض کے بعد، تمہارے ماں باپ

وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۗ فَرِيْضَةً مِّنَ

اور تمہارے بیٹے، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون زیادہ قریب ہے تمہارے لیے از روئے نفع کے، یہ اللہ کی طرف سے متعین

اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ

کیے ہوئے حصے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے⑪ تمہارے لیے آدھا حصہ ہے اس مال کا جو چھوڑ جائیں

اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ

تمہاری بیویاں اگر ان بیویوں کی اولاد نہ ہو، اور اگر ان کی اولاد ہو تو پھر تمہارے لیے

الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ

چوتھا حصہ ہے اس مال میں سے جس کو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں، وصیت کے بعد جو وہ کریں یا قرضے کے بعد،

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ

اور بیویوں کے لئے چوتھا حصہ ہے اُس مال میں سے جو تم چھوڑ جاؤ اگر تمہاری اولاد نہ ہو، اگر

لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ

تمہاری اولاد ہو تو پھر ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اُس مال میں سے جو تم چھوڑ جاؤ، وصیت کے بعد

تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ

جو تم کرو یا قرضے کے بعد، اگر وہ آدمی جس کی میراث ہے کلالہ ہو یا

امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ

عورت کلالہ ہو اور اُس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصّہ ہے، اور اگر وہ

كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِی الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِهَاۤ

ایک سے زیادہ ہوں تو یہ تیسرے حصے میں شریک ہوں گے، وصیت کے بعد جو کی جائے

اَوْ دَیْنٍ ۙ غَیْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِیَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

یا قرضے کے بعد اس حال میں کہ وصیت کرنے والا نقصان پہنچانے والا نہ ہو، اللہ تمہیں یہ تاکیدی حکم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ

عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

علم والا ہے بُردبار ہے ﴿۱۲﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، اور جو شخص بھی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا

یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ

اللہ تعالیٰ داخل کرے گا انہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے،

وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ

اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۳﴾ اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اس کی باندھی ہوئی حدوں سے

حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۱۴﴾

تجاوز کرے گا تو داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں، پڑا رہے گا وہ اس میں، اور اُس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ﴿۱۴﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ پچھلے رکوع میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ والدان اور اقربون جو کچھ چھوڑ جائیں تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اُس میں مرد و عورت شریک ہیں، اور وہ مال اُن میں تقسیم ہوتا ہے، اِس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض ورثاء کے حصے متعین کیے ہیں، آیات کا مطلب چونکہ صاف صاف ہے اس لئے ترجمے کے ساتھ ہی مطلب ادا کرتے جائیں گے۔

ورثاء کی تین قسمیں

ورثاء تین قسم کے ہیں، جیسے کہ میراث کی کتابوں میں آپ کے سامنے تفصیل ذکر کی جاتی ہے، بعض تو ''اصحابِ فرائض''

ہیں۔ ''اصحابِ فرائض'' انہیں کہا جاتا ہے جن کے حصے قرآنِ کریم میں متعین کردیئے گئے، کہ ان کو مال میں سے اتنا دینا ہے (فرائض، فریضہ کی جمع بمعنی متعین کیا ہوا حصہ، اس لئے ''علم المیراث'' کو ''علم الفرائض'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان حصوں کو ذکر کرتے ہوئے فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ فرمایا، کہ یہ اللہ کی طرف سے متعین کئے ہوئے ہیں، اس لیے علم المیراث، علم الفرائض کہلاتا ہے)۔ اور بعض ''عصبات'' ہیں۔ ''عصبات'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُن کا حصہ کوئی متعین نہیں، ''اصحابِ فرائض'' کو اَدا کرنے کے بعد جو بچ جائے وہ اُنہیں دے دیا جاتا ہے۔ اور تیسرے نمبر پر ''اُولوا الارحام'' ہیں۔ ''اُولوا الارحام'' اُنہیں کہا جاتا ہے کہ جو بواسطۂ اُنثیٰ میت کے رشتے دار ہیں، یعنی جن کے واسطے میں مؤنث آتی ہے مذکر نہیں آتا، جیسے نواسے، بھانجے، ماموں، اور اسی طرح نانا، یہ آخری درجے میں ہیں، کہ جب ''اصحابِ فرائض'' میں سے بھی کوئی نہ ہو، اور ''عصبات'' میں سے بھی کوئی نہ ہو تو پھر اِن میں سے بعض کو میراث دی جاتی ہے، جس کی تفصیل ''سراجی'' میں مذکور ہے۔ یہاں کچھ اَحکام آئیں گے، باقی اَحکام روایات میں ہیں، یا فقہاء نے روایات وآیات کی طرف دیکھ کر مستنبط کئے ہیں، اور پورے فن کے طور پر یہ چیز مدوّن ہے۔

موانعِ اِرث کی وضاحت

ورثاء جو یہاں ذکر کئے جائیں گے اِن میں سے اگر کوئی شخص مرنے والے کے ساتھ اختلافِ دین رکھتا ہو، یعنی مرنے والا مسلمان ہے لیکن کوئی وارث کافر ہے، یا مرنے والا کافر ہے اور وارث مسلمان ہے، تو اس صورت میں بھی انسان وراثت سے محروم ہوتا ہے، مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا، اور اسی طرح کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا،[1] وارثت کے پانے کے لئے اتحادِ دین شرط ہے۔ اور اسی طرح اگر ان ورثاء میں سے کوئی وارث قاتل ہو، یعنی اپنے مورِث کو قتل کردے تو مقتول کی وراثت سے قاتل بھی محروم ہوتا ہے، یہ حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے۔[2]

ترکے کے متعلق اَحکام کی ترتیب

اور پھر جس وقت انسان مرتا ہے تو اُس کی جائیداد میں تصرف کرنے کی ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے اُس کے متروکہ مال میں سے کفن دفن کا خرچ نکالا جائے گا، کفن دفن کے خرچ سے فارغ ہونے کے بعد پھر دیکھا جائے گا کہ اِس کے ذمے کوئی قرض تو نہیں، اگر اِس کے ذمے کوئی قرض ہے تو پہلے اس کی متروکہ جائیداد میں سے قرض ادا کیا جائے گا، منقولہ ہو یا غیر منقولہ، حتیٰ کہ اگر مکان ہو تو وہ بھی بیچ دیا جائے گا، زمین ہو تو وہ بھی بیچ دی جائے گی اور قرض ادا کیا جائے گا، اگر سارا ترکہ قرضے میں چلا جائے تو ورثاء کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور قرضہ ادا کرنے کے بعد پھر جو بچ جائے تو دیکھیں گے کہ مرنے والے نے کوئی وصیت تو نہیں کی، اگر وصیت کی ہو تو ثلث کے اندر اندر وہ نافذ ہوگی، یعنی تیسرے حصے تک، اور اگر تیسرے حصے سے زائد کی وصیت کی ہے تو وہ تو زائد میں نافذ نہیں ہوگی، اور اسی طرح وصیت وارث کے بارے میں بھی نافذ نہیں ہوگی، مرنے والا اگر اپنے وارث کے بارے میں کوئی

---

(۱) بخاری ۱۰۰۱/۲ باب لا یرث المسلم الکافر/مشکوۃ ۲۶۳/۱، کتاب الفرائض۔

(۲) ترمذی ۳۱/۲ باب ما جاء فی ابطال میراث القاتل/ابن ماجہ ۱۹۰/۱ باب القاتل لا یرث/ابوداؤد ۲۷۲/۲ باب دیات الاعضاء/مشکوۃ ۲۶۳/۱

وصیت کرجائے تو وارث کو ورثہ چونکہ شریعت کی وصیت کے تحت ہی مل جائے گا اس لیے مرنے والے کی وصیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ تو ثلث کے اندر وصیت نافذ کی جائے گی، پھر ثلث نکال لینے کے بعد، یا اگر وصیت نہ ہو تو قرضہ ادا کرنے کے بعد جو بچے گا وہ ان حصوں کے مطابق اُن ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا جو ورثاء آپ کے سامنے ذکر کیے جارہے ہیں۔

وصیت کو قرض سے پہلے ذِکر کیوں کیا گیا؟

یہاں جو آیات آپ کے سامنے آئیں گی اِن میں وصیت کا ذکر پہلے آئے گا، اور دَین کا ذکر بعد میں آئے گا مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ، لیکن باجماعِ اُمّت جس وقت وراثت کو تقسیم کرنا ہے تو دَین وصیت سے مقدم ہے، یعنی پہلے دَین کا حساب لگائیں گے، اُس کے بعد وصیت کا۔ اور وصیت کو مقدم کرکے ذکر اس لئے کردیا کہ وصیت کا بسا اوقات مُوصیٰ لهٗ کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ میرے متعلق کوئی وصیت کرگیا ہے، ایسے وقت میں اندیشہ ہوتا ہے کہ ورثاء کہیں دبا نہ جائیں، اس لیے اُن کو تاکید کردی، کیونکہ قرضہ لینے والے تو خود پیچھا کرلیں گے، اور یہ پتا ہوتا ہے کہ فلاں سے قرضہ لیا ہوا ہے، ان کے پاس کوئی ثبوت ہوگا، دلیل ہوگی، وہ تو خود مطالبہ کرلیں گے، اور وصیت چونکہ ایک مخفی سی چیز ہے، بسا اوقات یہ پتا نہیں ہوتا کہ کی بھی ہے یا نہیں؟ کی ہے تو کس کے لئے کی ہے؟ کتنے مال کی کی ہے؟ یہ چیز بہت مخفی سی ہے، اس لئے ورثاء کو تاکید کی گئی ہے کہ وصیت کی رعایت رکھیں، وصیت نافذ کرنا ضروری ہے، ورنہ ترتیب کے لحاظ سے قرضے کی ادائیگی مقدم ہے۔ یہ ہیں وراثت کے کچھ موٹے موٹے اُصول، اب آگے حصے داروں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

وراثت میں اولاد کے مختلف اَحوال

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ: اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں، وصیت کرتا ہے تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں، "اولاد" کا لفظ یہاں عام ہے مذکر ہو یا مؤنث، اولاد وَلَد کی جمع ہے۔ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ: اُنثیین دو لڑکیاں ہوگئیں، اور ذَکَر سے مذکر مراد ہے، لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، یعنی وراثت تقسیم کرتے وقت لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا ہے، شریعت نے لڑکی کو کم حصہ دیا اور لڑکے کو زیادہ دیا، اور یہ عین حکمت کے مطابق ہے، کیونکہ لڑکی اپنی معاشی ذمہ داریوں سے بَری ہوتی ہے، اُس پر کسی کی معاشی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں، جس وقت اُس کا نکاح ہوجائے گا تو اُس کا نان نفقہ لباس اور سکنیٰ جو کچھ ہے سب خاوند کے ذِمّے ہے، پھر جو اُس کی اولاد پیدا ہوگی اُس کا بوجھ بھی ماں پر نہیں ہوتا بلکہ اُس کا بھی کل نفقہ اُن کے باپ کے ذِمّے ہوتا ہے، تو اِس اصول کے تحت لڑکی لڑکے کے مقابلے میں آدھی میراث لے کر بھی لڑکے سے زیادہ خوشحال ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ جو اس کی زائد آمدنی ہوگی اُس کو اپنے آرام پر، آرائش پر، زیبائش پر، اور اپنی دوسری خواہشات کے مطابق اُس کو خرچ کرسکتی ہے، اور جہاں تک نفقے کا تعلق ہے وہ خاوند کے ذمے ہے، اور جہاں تک اولاد کا بوجھ ہے وہ بھی خاوند کے ذِمّے ہے، عورت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ: اور اگر وہ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں دو سے زیادہ، فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ: پھر اِن لڑکیوں کے لئے جو دو یا دو سے زیادہ ہیں، کیونکہ میراث میں آپ پڑھیں گے کہ تثنیہ پر ہی جمع کا حکم لگ

جاتا ہے، دولڑکیاں ہوں یا دو سے زیادہ ہوں، (دو کا حصہ تو چونکہ واضح ہے اس لئے دو سے زیادہ کا عنوان اختیار کرلیا گیا) اِن کے لئے مَاتَرَكَ کا دوثلث ہے، یعنی دوتہائی اِن کو دے دیا جائے گا۔ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً: اوراگرلڑکی ایک ہی ہو، فَلَهَا النِّصْفُ: تو اس کوکُل میراث کا نصف دے دیا جائے گا۔ گویا کہ یہاں تین صورتیں ذکر کردی گئیں، اگر تو مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں مشترک ہیں پھر تو تقسیم یوں کریں گے کہ ایک لڑکا دولڑکیوں کے قائم مقام، یا دولڑکیاں ایک لڑکے کے قائم مقام، اس طرح حصے تقسیم کردیے جائیں گے۔ اوراگر صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں ایک سے زیادہ، یعنی دو یا دو سے زیادہ، ایسی صورت میں کُل میراث کا دوثلث لے کران لڑکیوں پر تقسیم کردیا جائے گا۔ اوراگرلڑکی صرف ایک ہی ہے، نہ اُس کے ساتھ کوئی دوسری لڑکا ہے نہ لڑکی، ایسی صورت میں وہ اپنے باپ کی نصف جائیداد کی حصے دار ہوگی۔ اولاد کا حصہ ختم ہوا۔

وراثت میں والدین کے اَحوال

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ: مرنے والے کے والدین کے لئے یعنی ان دونوں میں سے ہرایک کے لئے چھٹا حصہ ہے مِمَّا تَرَكَ: اُس مال میں سے جواُس نے چھوڑا ہے اگر مرنے والے کی اولاد ہو۔ اگر مرنے والے کی اولاد ہو، لڑکا یالڑکی کوئی ہو، ایسی صورت میں ماں باپ چھٹے چھٹے حصے کے وارث ہیں، چھٹا حصہ ماں کو دیا جائے گا اور چھٹا حصہ باپ کو دیا جائے گا، فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ: اوراگر مرنے والے کی اولاد نہیں وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ: اوراُس کے وارث صرف اُس کے والدین ہی ہیں، فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ: تو ایسی صورت میں اُس کی ماں کو تیسرا حصہ دے دیں گے اور باقی دو حصے باپ کے ہوں گے، کیونکہ پچھلے لفظوں میں آ گیا کہ اُس کے وارث صرف اُس کے والدین ہیں، جب کل ورثہ والدین کو ملنا ہے تو اُس میں سے والدہ کا حصہ متعین کردیا گیا ثلث، تو باقی دوثلث باپ کے لئے ہوئے۔ اس لیے اگر مرنے والے کی اولاد نہیں ہے اور ماں باپ زندہ ہیں تو تیسرا حصہ ماں کو دے دو اور دو حصے باپ کو دے دو۔ لیکن یہ تیسرا حصہ ماں کو تب دینا ہے کہ اگر مرنے والے کے بہن بھائی موجود نہ ہوں، اور اگر مرنے والے کے دو یا زیادہ بہن بھائی موجود ہیں چاہے وہ حقیقی بہن بھائی ہیں یعنی ماں باپ دونوں میں شریک ہیں، اور چاہے وہ علاتی بہن بھائی ہیں یعنی صرف باپ میں شریک ہیں، اور چاہے وہ اخیافی بہن بھائی ہیں یعنی صرف ماں میں شریک ہیں، اگر یہ بہن بھائی موجود ہوں تو ایسی صورت میں ماں کا حصہ ثلث کی بجائے سدس ہوجائے گا یعنی چھٹا حصہ، اور باقی سارا مال باپ کا ہوگا، بہن بھائیوں کو ملے گا کچھ نہیں، یعنی اگر بہن بھائی موجود ہوں تو ماں کے حصے کو گھٹا دیتے ہیں، باقی! باپ کی موجودگی میں بہن بھائی خود وارث نہیں ہوتے، یہی مسئلہ آگے ذکر کیا گیا ہے فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ: اگر اس مرنے والے کے بہن بھائی ہیں، اخوۃ سے مراد ہے ایک سے زائد، جیسے میں نے عرض کیا کہ اس میراث کے مسئلے میں تثنیہ پر جمع کا حکم لگ جاتا ہے، فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ: تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ: بعد وصیت کے جو کہ یہ مرنے والا کرتا ہے اور بعد دَین کے، یعنی قرضہ اور وصیت ادا کرنے کے بعد یہ حصص ہیں جو ذکر کیے گئے ہیں۔ اور ترتیب کی تفصیل پہلے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کردی ہے۔ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ: تمہارے آباء اور تمہارے اَبناء، تمہارے ماں باپ اور تمہارے بیٹے لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا: تم نہیں جانتے کہ

اِن میں سے کون زیادہ قریب ہے تمہارے لئے از روئے نفع کے، دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے اِن میں سے کون زیادہ مفید ہے تمہیں نہیں پتا۔ فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ: یہ اللہ کی طرف سے متعین کیے ہوئے حصے ہیں، اِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ علم وحکمت والا ہے، اِس لئے اُس نے میراث کے اندر جو حصے متعین کردیئے علم کا تقاضا بھی یہی ہے اور حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اور اگر کسی شخص کو اِن متعین کئے ہوئے حصوں پر کوئی اعتراض ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت پر اعتماد نہیں ہے، اور اگر یہ تمہاری مرضی پر چھوڑ دیئے جاتے کہ تم جس طرح چاہو تقسیم کرلو تو تم یوں سوچتے کہ اپنے لئے جس کو زیادہ مفید پاتے اُس کو زیادہ دیتے، اور جس کے متعلق تمہیں یہ خیال ہوتا کہ یہ ہمارے کوئی کام نہیں آتا اور ہمارے لئے مفید نہیں ہے تو اُس کو تھوڑا دیتے یا بالکل محروم کردیتے، اور اِس کا جان لینا کہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے کون مفید ہے اور کون مفید نہیں ہے، یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ مثلاً آج ایک لڑکے کے متعلق ماں باپ کا خیال ہوتا ہے کہ بڑا خدمت گزار ہے، دوسرے کے متعلق خیال ہے کہ نافرمان ہے، آج ساری وراثت اِس کو دے دیں اور اُس کو محروم کردیں، اور کل کو حالات بدل جائیں کہ جو نافرمان تھا وہ خدمت گزار بن گیا اور جو خدمت گزار تھا وہ نافرمان ہوگیا، تو پھر کیا کروگے؟ تو دنیا میں کون مفید ہے اور آخرت میں کون مفید ہے، یہ اللہ جانتا ہے، اس لئے اللہ کے علم وحکمت پر اعتماد کرتے ہوئے جو حصے اُس نے متعین کردیے ہیں دلجمعی کے ساتھ اسی طرح وراثت کو تقسیم کرو، اپنے جذبات کے تحت یا اپنے منطقی دلائل کے تحت یا اپنے فلسفے کے تحت اِس میں کسی قسم کے تغیر وتبدل کی کوشش کروگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت پر تمہیں اعتماد نہیں۔ اولاد اور والدین کی بات ختم ہوئی۔

شوہر کے مختلف اَحوال

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ: تمہارے لئے آدھا ہے اس چیز کا جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں اگر اُن بیویوں کی اولاد نہ ہو۔ یعنی عورت مرگئی اور اُس کی اولاد نہیں ہے، چاہے اِس خاوند سے، چاہے کسی دوسرے خاوند سے، مطلب یہ ہے کہ اِس کے پیٹ سے پیدا شدہ اولاد موجود نہیں، ایسی صورت میں خاوند کو آدھا ملے گا۔ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ: اور اگر اُن بیویوں کے لئے اولاد ہے چاہے موجودہ خاوند کی، چاہے کسی پہلے خاوند کی، یعنی اُس کے بطن سے پیدا شدہ اولاد موجود ہے فَلَكُمُ الرُّبُعُ: پھر تمہارے لئے چوتھا حصہ ہے مِمَّا تَرَكْنَ: اُس مال میں سے جس کو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ: بعد وصیت کے جو وہ عورتیں کریں یا قرضے کے بعد، یعنی بیویوں کا قرضہ ادا کرنے کے بعد، اور اگر انہوں نے وصیت کی ہے تو وصیت کے نافذ کرنے کے بعد جو بچے گا اب دو حال سے خالی نہیں، کہ مرنے والی تمہاری بیوی کی کوئی اولاد موجود ہے یا نہیں، چاہے وہ اولاد تمہاری ہو چاہے پہلے خاوند کی ہو، اگر اُس مرنے والی عورت کی اولاد موجود ہے تو تمہارے لئے چوتھا حصہ، اور اگر اُس کی اولاد موجود نہیں ہے تو نصف حصہ ہے۔

بیوی کے اَحوال

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ: اور اُن بیویوں کے لئے چوتھا حصہ ہے اُس مال میں سے جو تم چھوڑ جاؤ، اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ: اگر

تمہارے لئے اولاد نہ ہو، فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ: اور اگر تمہارے لئے اولاد ہے چاہے اِسی بیوی کے بطن سے، چاہے کسی دوسری بیوی کے بطن سے، فَلَهُنَّ الثُّمُنُ: تو پھر ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے مِمَّا تَرَكْتُمْ: اُس مال میں سے جو تم چھوڑ جاؤ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ: بعد وصیت کے جو تم کرو یا قرضے کے بعد۔ یعنی خاوند مر گیا تو دیکھیں گے کہ خاوند کی اولاد موجود ہے یا نہیں، چاہے اِس موجودہ بیوی سے چاہے کسی دوسری بیوی سے، اگر اس کی اولاد موجود ہے تو پھر بیوی کے لئے آٹھواں حصہ ہے، اگر ایک بیوی ہے تو بھی آٹھواں حصہ، اور دو تین یا چار ہیں تو ایک آٹھواں حصہ لے کر سب پر تقسیم کریں گے، بیویوں کا حصہ آٹھویں حصے سے زیادہ نہیں ہوگا، یعنی ایک ہو تو اُس کو آٹھواں حصہ کُل مِل جائے گا، اور اگر دو ہیں تو اس آٹھویں حصے کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے، تین ہیں تو آٹھویں حصے کو تین حصوں میں تقسیم کریں گے، اور اگر چار ہیں تو چار حصوں میں تقسیم کریں گے، آئے گا بہرحال آٹھواں حصہ۔ اور اگر تمہاری اولاد موجود نہیں ہے، نہ اِس بیوی سے نہ کسی دوسری بیوی سے، تو ایسی صورت میں چھوڑے ہوئے مال کا چوتھا حصہ بیویوں کے لئے ہوتا ہے، اور وصیت اور دَین کی رعایت رکھنی ہے۔

''کلالہ'' کی تعریف اور اُس کی وراثت

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً: كَلَالَةً اصل کے اعتبار سے تو مصدر ہے، تھکنے کے معنی میں، كَلَال تھکنے کو کہتے ہیں، اور پھر کلالہ اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے اُصول وفروع موجود نہ ہوں، یعنی نہ ماں باپ موجود ہیں (اور باپ کی عدم موجودگی میں دادا باپ کے حکم میں ہوتا ہے، یہ تفصیل تو اپنی جگہ ہوگی) یعنی اُصول کی طرف کوئی موجود نہیں، نہ ماں باپ موجود ہیں نہ دادا وغیرہ موجود ہے، اور فروع میں بھی کوئی موجود نہیں، نہ صلبی اولاد نہ اولادُ الاولاد، جس کے اُصول وفروع موجود نہ ہوں اُس مرنے والے کو بھی کلالہ کہتے ہیں، اسی طرح جو رشتے دار اُصول وفروع کے علاوہ ہیں جیسے بھائی، بھتیجے، اِس قسم کے رشتے داروں کو بھی کلالہ کہتے ہیں، تو اصل کے اعتبار سے مفہوم ہوتا ہے ذُو کلالہ: ضعف والا، کمزوری والا، یعنی ایسا رشتہ جو اُصول وفروع کے علاوہ ہو، چونکہ وہ کمزور ہوتا ہے اس لئے اُس کو ذُو کلالہ سے تعبیر کردیتے ہیں، اور مرنے والا جس کے یہ قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں وہ بھی ایک قسم کا عاجز اور کمزور ہوتا ہے جس کی بناء پر اُس کو بھی ذُو کلالہ کہہ دیتے ہیں، تو کلالہ کا مفہوم اصل میں ذو کلالہ ہے، اور پھر بعض دفعہ جو مال ایسا شخص چھوڑ کر جائے جس کے اُصول وفروع موجود نہیں اُس چھوڑے ہوئے مال کو بھی کلالہ سے تعبیر کردیتے ہیں۔ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً: اگر ہو وہ آدمی جس کا وِرثہ چلایا جارہا ہے، یعنی مرنے والا آدمی، رَجُلِ موروث، جس کا وِرثہ چلایا جارہا ہے، ''اگر ہو وہ آدمی جس کی میراث ہے، جس کے وارث بنائے جارہے ہیں، اگر وہ آدمی کلالہ ہے یا وہ عورت کلالہ ہے'' یعنی کلالہ دونوں طرح سے ہے، مرد ہو یا عورت ہو، اُس کے اُصول وفروع اگر موجود نہیں ہیں وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ: اور اُس کا ایک بھائی موجود ہے یا ایک بہن موجود ہے، اور بالاجماع یہاں اَخ اور اُخت سے اخیافی مراد ہیں یعنی ماں شریک، کیونکہ جو باپ شریک ہیں اُن کا مسئلہ اِس سورت کے آخر میں آئے گا، وہ بالکل اولاد کے حکم میں ہوتے ہیں، اُن پر میراث تقسیم ہوتی ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ کے طور پر اگر بہن

بھائی دونوں موجود ہوں، اور اگر ایک بہن موجود ہو تو نصف، اگر دو بہنیں موجود ہوں تو ثُلُثَا مَا تَرَكَ: چھوڑے ہوئے کے دوثلث، اور اگر اکیلا بھائی موجود ہے تو وہی سارے کا وارث ہوتا ہے، تو جو درجہ اولاد کا ہے وہی درجہ حقیقی بہن بھائیوں کا ہوتا ہے جب ماں باپ بھی موجود نہ ہوں اور اولاد بھی موجود نہ ہو، یہ مسئلہ اِس سورت کے آخر میں آئے گا، اور بالاجماع یہاں اَخ سے اَخ اخیافی مراد ہے، اور اُخت سے بھی اُخت اخیافی مراد ہے یعنی جو ماں شریک ہیں۔ ''اگر اُس کے لئے بھائی اخیافی ہے یا بہن'' یعنی اِن دونوں میں سے ایک ہے فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ: تو پھر اِن میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے، یعنی ایک بھائی موجود ہو تو وہ چھٹا حصہ لے لے گا، اور اگر ایک بہن موجود ہے تو وہ چھٹا حصہ لے لے گی، یہاں مرد وعورت کا حصہ برابر ہے۔ فَإِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ: اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہیں، مثلاً دو بھائی اخیافی ہیں یا دو بہنیں اخیافی ہیں، یا ایک بھائی ہے اور ایک بہن ہے، اگر ایک سے زیادہ ہوگئے تو اِن سب صورتوں میں فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ: یہ تیسرے حصے میں شریک ہیں، یعنی مال کا تیسرا حصہ لے کر اِن اُخیافی بہن بھائیوں پر برابر تقسیم کردیا جائے گا، یہاں مرد وعورت کے حصے کا کوئی فرق نہیں ہے، جتنا بھائی کو ملنا ہے اُتنا ہی بہن کو ملنا ہے، مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ: بعد وصیت کے جو کی جائے، اَوْ دَيْنٍ: یا قرضے کے بعد۔

وصیت کب نافذ ہوگی اور کب نافذ نہ ہوگی؟

غَيْرَ مُضَآرٍّ: اِس حال میں کہ وصیت کرنے والا نقصان پہنچانے والا نہ ہو، اگر وہ نقصان پہنچائے تو ایسی صورت میں وہ گناہ گار ہے، اور اگر وہ ورثاء کو نقصان پہنچانے کے لئے ثلث سے زیادہ وصیت کرجائے تو وہ وصیت زائد میں سرے سے نافذ ہی نہیں ہوتی، اور اگر وارث کے لئے وصیت کرگیا ہے تو چونکہ اِس میں دوسرے ورثاء کا نقصان ہے اِس وارث کے مقابلے میں، اس لیے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہے، ورثاء اجازت دیں گے تو دوسرے وارث کے لئے وصیت پر عمل ہوسکتا ہے ورنہ نہیں، یہ غیر مضار کے ساتھ تاکید لگ گئی، اگرچہ یہ لفظ یہیں آیا ہے، لیکن ہر جگہ وصیت کے اندر اِس کا اعتبار ہے کہ وصیت کرنے والا نقصان پہنچانے کے جذبات پر نہ ہو، یعنی کسی کو نقصان پہنچانے کا جذبہ اُس میں نہ ہو، اگر نقصان پہنچانے کے لئے ایسا کرے گا تو بعض صورتوں میں اُس کی وصیت نافذ ہی نہیں ہوگی، اور بعض صورتوں میں اگر نافذ ہوگی تو آخرت میں گناہگار ہوگا، ''نہ نقصان پہنچانے والا ہو وہ''، وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ وَصِيَّةً اللہ تعالیٰ تمہیں یہ تاکیدی حکم دیتا ہے، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے، کہ اِن متعین حقوق میں اگر کسی قسم کا کوئی خلل ڈالو گے تو اللہ کے علم میں ہے، اور اگر اِس خلل ڈالنے کے بعد تمہیں وہ جلد سزا نہ دے تو سمجھ لینا کہ یہ اللہ کا حلم اور بردباری ہے، ورنہ یہ نہیں کہ تم سزا سے بچ جاؤ گے، ایسی بات نہیں ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: یہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے ضابطے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، جن کے اندر کسی قسم کا تغیر تبدل نہیں کرنا چاہیے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور جو شخص بھی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا، يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: اللہ تعالیٰ داخل کرے گا اُنہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہیں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: اُس میں ہمیشہ رہنے والے

ہوں گے وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کرے گا، وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ: اور اُس کی باندھی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے گا، يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا: داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں، پڑا رہے گا وہ اُس آگ میں، وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: اور اُس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

سوال:- والدین اپنے کسی بچے کو میراث سے محروم کرسکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- یہ مسئلہ شریعت کے اندر بالکل واضح طور پر مذکور ہے کہ میراث اِضطراری حق ہے، یعنی اگر وارث کہے کہ میں وارث نہیں بننا چاہتا تو بھی اپنے مورث کے مرنے کے بعد وہ چیز اُس کی ملکیت میں آجاتی ہے، اسی طرح اگر مرنے والا کہہ جائے کہ میرا فلاں بیٹا وارث نہیں ہے یا زندگی میں وصیت کردے کہ میرے فلاں بیٹے کو وراثت نہ دینا، یہ اُس کو کوئی حق نہیں ہے، تو پھر بھی وہ مرنے کے بعد وارث ہے، کسی وارث کو محروم کرنے کا حق کسی شخص کو نہیں ہے، وراثت اِضطراری ملکیت ہے، اختیاری ملکیت نہیں ہے، اگر وارث اپنی زبان سے نفی کردے کہ میں وارث نہیں تو بھی وہ وارث ہے، اگر مرنے والا کہہ دے کہ فلاں لڑکا میرا وارث نہیں ہے تو بھی وہ وارث ہے۔ ہاں! البتہ محروم کرنے کی ایک صورت ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں (جبکہ مرضِ موت کے اندر بھی مبتلا نہیں ہے) اپنے اختیار کے ساتھ اپنی جائیداد کسی دوسرے کے نام منتقل کردے اور اُس کو قبضہ دے دے، جب مرے تو اُس کے پلّے ہو ہی کچھ نہ، پھر ورثاء محروم ہی محروم ہیں۔ پھر اگر یہ شخص اس نیت سے کر رہا ہے تاکہ میرے ورثاء کو نہ پہنچے تو یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ گار ہے، البتہ قانونِ شریعت کے اندر دوسرا شخص مالک ہوجائے گا اور وارث محروم ہوجائیں گے۔ ورنہ اگر مرتے وقت اِس کی ملکیت میں کوئی چیز ہوئی تو جو قانونی طور پر اِس کے وارث ہیں وہ چیز اُنہی کی ملکیت میں آئے گی، اور اِس کے منع کرنے کے ساتھ وہ منع نہیں ہوگی، یہ ملکیت اِضطراری ہے اِختیاری نہیں ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ
جو عورتیں اِرتکاب کریں بے حیائی کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ بنایا کرو ان پر اپنے میں سے چار آدمی،
فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ
پھر اگر یہ چار آدمی گواہی دے دیں تو روک رکھا کرو ان عورتوں کو گھروں میں حتیٰ کہ موت ان کو وفات دے دے یا اللہ تعالیٰ
يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ
ان کے لئے کوئی اور راستہ بنادے ⑮ اور جو دو شخص اس بے حیائی کا ارتکاب کریں تم میں سے پس ان دونوں کو تکلیف پہنچایا کرو،

فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا

پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنے حالات ٹھیک کرلیں تو تم ان سے اِعراض کرجایا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا

رَّحِيۡمًا ⑯ اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ

رحم کرنے والا ہے ⑯ سوائے اس کے نہیں، توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذِمّے ان لوگوں کے لئے ہے جو بُرا کام کرتے ہیں

السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ

نادانی سے پھر وہ جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں پس یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کرتا ہے،

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ⑰ وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ

اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ⑰ اور نہیں ہے توبہ ان لوگوں کے لئے جو بُرائیاں کرتے رہتے ہیں

حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ

حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے میں اب توبہ کرتا ہوں، اور نہ ان لوگوں کے لئے توبہ ہے

يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ⑱ يٰۤاَيُّهَا

جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تیار کر رکھا ہے ان کے لئے درد ناک عذاب ⑱ اے

الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ

ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں کہ تم زبردستی وارث ہو جایا کرو عورتوں کے، اور ان عورتوں کو روکا نہ کرو

لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ

تاکہ لے جاؤ تم اُس مال کا بعض جو تم نے انہیں دیا ہے مگر یہ کہ ارتکاب کریں وہ کسی صریح بے حیائی کا،

وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔا

اچھے طریقے کے ساتھ ان سے معاملہ رکھا کرو، اگر وہ عورتیں تمہیں طبعاً پسند نہیں تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو

وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ⑲ وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ

اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر خیر کثیر کر دے ⑲ اور اگر تم ارادہ کرو تبدیل کرنے کا ایک بیوی کو دوسری بیوی

زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـًٔا‌ ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ

کی جگہ، اور دے چکے ہوتم ان میں سے کسی عورت کو ڈھیروں مال تو اس مال میں سے کچھ بھی نہ لیا کرو، کیا تم اس مال کو لوگے

بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى

از روئے بہتان لگانے کے اور صریح گناہ کرنے کے؟ ⑳ اور کیسے لے سکتے ہوتم اُس مال کو حالانکہ پہنچ چکا ہے تمہارا بعض

بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ

بعض کی طرف اور ان عورتوں نے تم سے پختہ عہد لیا ہے ㉑ نکاح نہ کیا کرو ان عورتوں کے ساتھ جن کے ساتھ نکاح کیا تمہارے آباء نے

النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ﴿۲۲﴾

مگر جو ہو چکا سو ہو چکا، بیشک یہ بے حیائی کی بات ہے اور نفرت کی بات ہے، اور بہت بُرا طریقہ ہے ㉒

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ وَالّٰتِىۡ يَاۡتِيۡنَ الۡفَاحِشَةَ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ: جو عورتیں ارتکاب کریں بے حیائی کا تمہاری عورتوں میں سے، اِتیانِ فاحشۃ کا معنی بے حیائی کا ارتکاب کرنا، جو بے حیائی کے کام کو آجائیں یعنی اُس کا ارتکاب کر بیٹھیں، فَاسۡتَشۡهِدُوۡا: تو گواہ بنایا کرو، عَلَيۡهِنَّ: اُن پر، اَرۡبَعَةً مِّنۡكُمۡ: اپنے میں سے چار آدمی، فَاِنۡ شَهِدُوۡا: پھر اگر یہ چار آدمی گواہی دے دیں، فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ: تو روک رکھا کرو اُن عورتوں کو، فِى الۡبُيُوۡتِ: گھروں میں، حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ يَجۡعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيۡلًا: حتی کہ موت اُن کو وفات دے دے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راستہ بنادے۔ وَالَّذٰنِ يَاۡتِيٰنِهَا مِنۡكُمۡ: الَّذٰنِ اسم موصول کا تثنیہ مذکر کا صیغہ کا ہے، اس لیے یہاں مترجمین نے ترجمے کے اندر اختلاف کیا ہے، بعض نے الَّذٰنِ سے دو مرد ہی مراد لیے ہیں جیسے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے میں یہ مذکور ہے ''اور جو دو مرد''، اور بعضوں نے ایک مرد اور ایک عورت مراد لیا ہے اور اُن کے نزدیک مذکر کا صیغہ تغلیباً استعمال کیا گیا ہے، دونوں طرح سے بات صحیح ہے، تفسیر میں آپ کے سامنے بات آجائی گی، ''اور جو دو شخص اس بے حیائی کا ارتکاب کریں تم میں سے''، فَاٰذُوۡهُمَا: پس اُن دونوں کو تکلیف پہنچایا کرو، فَاِنۡ تَابَا: پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں، وَاَصۡلَحَا: اور اپنے حالات ٹھیک کرلیں، فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا: تو پھر تم اُن دونوں سے اِعراض کرجایا کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا: بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ: سوائے اس کے نہیں کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمے اُن لوگوں کے لئے ہے جو بُرا کام کرتے ہیں نادانی سے، ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ: پھر وہ جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ: پس یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کرتا ہے، ان پر توجہ فرماتا ہے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا: اور اللہ تعالیٰ علم والا

ہے حکمت والا ہے۔ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ: اور نہیں ہے توبہ ان لوگوں کے لئے (یعنی قبولیت توبہ کا وعدہ اُن لوگوں کے لئے نہیں) جو بُرائیاں کرتے رہتے ہیں، حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ: حتّٰی کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ: تو وہ کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں، وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ: اور نہ ان لوگوں کے لئے توبہ ہے جو مرجاتے ہیں اس حال میں کہ کافر ہوتے ہیں، اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تیار کیا ہے اِن کے لئے دردناک عذاب۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو، لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا: كَرْهًا یہ مصدر ہے اور کارِھات کے معنی میں ہو کر نساء سے حال واقع ہورہا ہے، تمہارے لیے حلال نہیں کہ تم وارث ہوجایا کرو عورتوں کے اِس حال میں کہ وہ عورتیں ناگوار سمجھنے والی ہوں، اور حاصل ترجمہ اس کا ہوگا کہ ''زبردستی وارث نہ ہوجایا کرو عورتوں کے'' یعنی اُن کی رضا کے بغیر، وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ: اور اُن عورتوں کو روکا نہ کرو، لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ: تاکہ لے جاؤ تم اُس مال کا بعض جو تم نے اُنہیں دیا ہے، یعنی جو کچھ تم اُنہیں دے چکے ہو اُس میں سے بعض مال کو حاصل کرنے کے لئے اُن عورتوں کو روکا نہ کرو، منع نہ کیا کرو، اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: مگر یہ کہ ارتکاب کریں وہ کسی صریح بے حیائی کا، وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: اور اچھے طریقے کے ساتھ ان سے معاملہ رکھا کرو، گزارہ کیا کرو اُن کے ساتھ اچھے طریقے سے، معاشرت کا معنی ہوتا ہے آپس میں مل جُل کے رہنا، اچھے طریقے کے ساتھ ان سے مل جُل کے رہا کرو، فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ: پھر اگر تم اُن عورتوں کو مکروہ جانتے ہو، تمہیں وہ طبعاً پسند نہیں ہیں، فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا: اِن کی جزاء محذوف ہوگی، اگر وہ عورتیں تمہیں طبعی طور پر پسند نہیں تو بھی اُنہیں صبر کے ساتھ برداشت کرو، صبر کیا کرو، ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا: اور اللہ تعالیٰ اُس کے اندر خیر کثیر کردے، وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ: اور اگر تم ارادہ کرو تبدیل کرنے کا ایک بیوی کو دوسری بیوی کی جگہ، وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا: قنطار کہتے ہیں ڈھیر کو، قناطیر مقنطرۃ کا لفظ پہلے گزرا تھا (آل عمران: ۱۴)، اور دے چکے ہو تم اِن عورتوں میں سے کسی عورت کو ڈھیروں مال، بہت کثیر مال دے چکے ہو، فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا: تو اُس مال میں سے کچھ بھی نہ لیا کرو، اَتَاْخُذُوْنَهٗ: کیا تم اُس مال کو لوگے بُهْتَانًا: ازروئے بہتان لگانے کے وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا: اور صریح گناہ کرنے کے؟ یعنی اُس مال کا لینا بہتان اور صریح گناہ کے ارتکاب کے بغیر کیسے کرسکو گے، یا تو عورت پر بہتان لگاؤ گے کہ یہ بدکردار ہے اس لیے ہم اس کو نہیں رکھنا چاہتے، یا اُس پر ظلم کرو گے اور خواہ مخواہ اس کا مال چھینو گے، وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ: اور کیسے لے سکتے ہو تم اُس مال کو، وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ: حالانکہ پہنچ چکا ہے تمہارا بعض بعض کی طرف، یعنی خلوت صحیحہ ہوگئی، آپس میں ملاقات ہوگئی جس ملاقات کے بعد مہر مؤکد ہوجایا کرتا ہے، عورت کا بہرحال حق بن جاتا ہے جو دینا پڑتا ہے، ایسی صورت میں تم وہ مال کیسے واپس لے سکتے ہو؟ اَفْضٰى پہنچنے کے معنی میں، بے حجابانہ ایک دوسرے تک پہنچ چکے ہو، وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا: اور اُن عورتوں نے تم سے ایک گاڑھا عہد لیا ہے، میثاق غلیظ: پختہ عہد لیا ہے، اس پختہ عہد سے نکاح اور نکاح کے ضمن میں جو آپس میں نان نفقے کا اور مہر کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے، میثاق غلیظ کا مصداق وہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ثبوتِ زِنا کے لئے سخت قیود اور اس کی وجہ

ان آیات میں بھی کچھ اصلاحِ معاشرہ کے اُصول ذکر کئے گئے ہیں، خاص طور پر عورتوں کے اُوپر جو ظلم وستم ہوتا تھا اُس کی تلافی آخری آیات میں کی گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ اگر تمہاری عورتوں میں سے یعنی مسلمان عورتوں میں سے کوئی عورت بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھے، اِس ''بے حیائی'' سے مراد مفسرین کے نزدیک ''زِنا'' ہے، اور یہ آیات اُس وقت اُتری تھیں جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ابھی تک زِنا کے بارے میں کوئی حد متعین نہیں ہوئی تھی، تو یہ ذِکر کیا گیا کہ پہلے تو زِنا کے ثبوت کے لئے چار گواہ طلب کیا کرو، جب تک چار گواہ نہ ہوں اس وقت تک کسی پر زِنا کا ثبوت نہیں ہوتا، اور یہ سخت پابندی اس لئے لگادی گئی کہ زِنا ایک بہت بڑا اہم معاملہ ہے، جس میں صرف عورت کی ہی عزّت نہیں جاتی بلکہ سارا خاندان رُسوا ہوتا ہے، اور اس کے بہت بُرے اثرات واقع ہوتے ہیں، اس لیے اجازت نہیں دی گئی کہ بغیر اہم ثبوت کے کوئی شخص کسی عورت کی طرف یا کسی مرد کی طرف اِس جرم کو منسوب کرے، ورنہ لوگوں کی عادت ہے کہ غصّے میں اور ضد میں آکر ایک دوسرے کی طرف اس قسم کی بے حیائی کے کاموں کو منسوب کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں جھگڑے فساد آئے دن ہوتے رہتے ہیں، جیسے آج کل اس بے احتیاطی کے نتیجے میں کتنا بگاڑ ہے، جس پر چاہا تہمت لگادی، جس کے متعلق چاہا بُرا لفظ نکال دیا، تو یہ عزّت کا معاملہ ہے اور یہ بہت گھناؤنا جرم ہے، نسب پر بھی اثر پڑتا ہے اور خاندانوں کی عزتیں بھی برباد ہوجاتی ہیں، اس لیے اجازت نہیں ہے کہ بغیر اہم ثبوت کے کوئی شخص زبان سے اس قسم کی بات نکالے۔ سورۂ نُور کی تفسیر میں آپ کے سامنے آئے گا کہ اگر بلاوجہ کوئی شخص کسی دوسرے پر اس قسم کی تہمت لگادیتا ہے، اور اُس کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہیں کرسکتا، چاہے وہ قسمیں کھاتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو بھی اُس کو ۸۰ دُرّے لگادیئے جائیں گے، جب تک شہادتیں نہ ہوں اس وقت تک کسی کو اپنی زبان سے اس قسم کے لفظ نکالنے کی اجازت نہیں ہے۔ پہلے تو چار گواہ طلب کیا کرو، اور پھر چار گواہ تم میں سے ہوں یعنی مسلمان ہونے چاہئیں، مرد ہونے چاہئیں، حدود کے معاملے میں عورت کی شہادت قبول نہیں ہے، اور غیر مسلم کی شہادت مسلمان کے خلاف تو ہوتی ہی نہیں کسی معاملے میں بھی۔ تو حدود میں یہ بھی ایک احتیاط ہے کہ اس میں عورت کو گواہ نہیں بنایا جاتا۔

حدِّ زِنا کی تفصیل اور اِختلاف بین الفقہاء

پھر چار آدمی اگر گواہ ہوجائیں تو ان عورتوں کو بطورِ سزا کے گھروں میں روک رکھو، اُن کو باہر نہ نکلنے دو، دوسرے لوگوں کے ساتھ اُن کا اختلاط ختم کردو، یہ روکنا بطورِ سزا کے ہے۔ اور انتظار کرو، کہ یا تو اِسی حالت میں مرجائیں یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکال دے۔ بعد میں جب حدود نازل ہوئیں تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''خُذُوْا عَنِّی، خُذُوْا عَنِّی، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا'' مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو، اللہ نے اِن عورتوں کے لئے سبیل بنادیا، تو گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن حدود کو اِس سبیل کا

مصداق بنایا، فرمایا کہ اب اگر اس قسم کا جرم پایا جائے تو اگر وہ غیر شادی شدہ ہے، بکر ہے، تو اُس کو سو دُرّے لگاؤ، اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو رجم کردو، ''اَلْجَلْدُ لِلْبِكْرِ وَالرَّجْمُ لِلثَّيِّبِ'' یہ حضور ﷺ نے سبیل کا یہ مصداق بنایا۔[1] اُس روایت کے اندر ''تغریبُ عامٍ'' کا ذکر بھی ہے، کہ سال بھر کے لئے اس کو جیل میں بھیج دیا جائے، اپنے علاقے سے نکال دیا جائے، جلاوطن کردیا جائے، لیکن اِس جلاوطنی کے اضافے کو حد کے اندر شامل کیا گیا ہے یا نہیں؟ یہ فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ مسئلہ ہے، اَحناف کے نزدیک سو دُرّہ تو حد ہے، جس کے معاف کرنے کا حاکم کو کوئی حق نہیں ہے، ثبوت ہوجانے کے بعد اس سزا کا معاف کرنا حاکم کے اختیارات سے باہر ہے۔ اور سال بھر کے لئے علاقے سے نکال دینا، جلاوطن کردینا (یا جیل میں بھیج دینا، یہ بھی تغریب کا مصداق ہے) یہ سیاست ہے اگر حاکم مناسب سمجھے تو یہ سزا دے دے، اگر مناسب نہ سمجھے تو نہ دے، فقہ حنفی میں آپ اِس کی تفصیل یہی پڑھیں گے۔ اور شوافع کے نزدیک یہ بھی حد کا حصہ ہے کہ سو دُرّے بھی لگانے پڑیں گے اور سال بھر کے لئے اُس علاقے سے اُس کو باہر نکالنا پڑے گا، کسی دوسرے علاقے میں بھیج دیا جائے، چاہے اُس کو جیل میں بھیج دیا جائے۔ بہرحال فقہاء کے نزدیک ''تغریبُ عامٍ'' کے متعلق اختلاف ہے، اور سو دُرّہ قرآنِ کریم میں صراحتاً آیا ہوا ہے۔ رَجم کا ذِکر اگرچہ اِس وقت قرآنِ کریم میں موجود نہیں، لیکن روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ حکم ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ نے اپنے سامنے بعض زانیوں کو رَجم کروایا، اور اِجماعِ اُمت کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ شادی شدہ کو رجم کیا جاتا ہے اور غیر شادی شدہ کو دُرّے مارے جاتے ہیں، اِس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، قرآنِ کریم میں اگرچہ وہ پڑھا نہیں جاتا، لیکن وہ ایسے ہی قطعی ہے جیسے قرآنِ کریم کی آیت ہوتی ہے، تو یہ سبیل کا مصداق ہے۔ پھر جس وقت سزا دے دی جائے گی تو وہ حبس والی بات ختم ہوگئی، ثبوت مہیا ہوجانے کے بعد حاکم اُس پر سزا جاری کردے گا۔ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ: اپنے میں سے چار گواہ طلب کیا کرو، فَاِنْ شَهِدُوْا: پھر اگر وہ گواہی دے دیں فَاَمْسِكُوْهُنَّ: تو انہیں روک رکھا کرو بطور سزا کے، یعنی باہر نہ آنے جانے دو، لوگوں سے اُن کا اختلاط ختم کردو، حتیٰ کہ انہیں موت وفات دے دے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راستہ متعین کردے، اور وہ راستہ متعین ہوگیا۔

''وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا'' کا مصداق

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا: یہ لفظ چونکہ مذکر کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، اس لئے بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی کہ ''جو دو مرد تم میں سے اس بے حیائی کا ارتکاب کرلیں'' جب یہ ترجمہ کیا جائے گا تو پھر اس کا مصداق ہے قضائے شہوت بالجنس، جس کو آج کل ''لواطت'' کے عنوان سے ذِکر کیا جاتا ہے، یعنی مرد، مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرے، تو پھر وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ کا مصداق یہ دونوں ہوں گے۔ اور اگر اِس کو تغلیبا کیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ اُوپر ذِکر صرف عورتوں کا ہوا ہے، اور آگے تعمیم کردی کہ یہ حکم صرف عورتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے کہ سزا انہیں دینی ہے، بلکہ جو دو شخص بھی یعنی مرد و عورت اِس کا ارتکاب کر بیٹھیں تو دونوں کو

---

(۱) بخاری ۲/ ۶۵۷، کتاب التفسیر، سورۂ نساء کے شروع میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول لکھا ہے: يَعْنِي الرَّجْمَ لِلثَّيِّبِ وَالْجَلْدَ لِلْبِكْرِ نوٹ: مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں مرفوعاً یہ الفاظ ہیں: خُذُوا عَنِّي خُذُوا عَنِّي قَدْ جَعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيلًا اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ۔ لیکن ثیب کے حق میں کوڑوں کا حکم منسوخ ہے اور بکر کے حق میں جلاوطنی کا حکم سیاسۃً ہے۔ مزید تفصیل دیکھئے طحاوی، جلد دوم، باب حد البکر، و باب حد الزانی المحصن۔

تکلیف پہنچاؤ، دونوں کو تکلیف پہنچانے کی عورتوں کے لئے تو وہ صورت ہوگئی کہ ان کو گھر میں بند رکھو، باہر آنے جانے نہ دو، مرد کو گھر میں تو بند نہیں رکھا جائے گا، باہر چل پھر سکتا ہے، لیکن اُس کو دوسری طرح سے تکلیف پہنچاؤ، کہ ملامت کرو، جُوتے مارو، سزا دو جس طرح سے بھی ہو، اور جب حد نازل ہوگئی تو پھر اُس کے لئے بھی ایذا کی صورت متعین ہوگئی، کہ مرد ہو تو اس کو بھی وہی سزا دی جائے گی جو حدِ زِنا کے اندر ذِکر کر دی گئی۔ اور اگر دو مرد مُراد لئے جائیں تو پھر یہ ایذا گویا کہ لواطت کی سزا کے طور پر ذکر کی گئی، کہ اِن دونوں کو تکلیف پہنچایا کرو، پھر اس تکلیف کا مصداق صراحتاً شریعت میں مذکور نہیں ہے، اس لئے فقہاء کے نزدیک یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

''لواطت'' غیر فطری فعل کیسے ہے؟

یہ فعل جس کو ''لواطت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ زِنا کے مقابلے میں زیادہ غلیظ اور زیادہ بُرا ہے، اسی لئے اِس کو کتابوں میں ''غیر فطری فعل'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، ''غیر فطری'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ فطرت کا تقاضا نہیں، یہ فطرت سے بغاوت ہے، فطرت کا تقاضا ہے کہ مذکر کا رُجحان مؤنث کی طرف ہو، اللہ تعالیٰ نے حیوان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ نر کا رُجحان مادّہ کی طرف ہے، تمام انواعِ حیوانات میں یہ بات ہے کہ نر، مادّہ کے ساتھ قضائے شہوت کرتا ہے، لیکن نر، نر کے ساتھ قضائے شہوت کرے یہ بات اللہ تعالیٰ نے حیوانات کے اندر نہیں رکھی، حیوان کی فطرت کے خلاف ہے، یہی وجہ ہے کہ جتنے حیوانات آپ کے سامنے پھرتے ہیں، کتّے، بلیوں سے لے کر پرندوں تک، بڑے چھوٹے جانور جتنے بھی ہیں، ان میں سے کبھی آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی نَر، نَر کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، نمونہ کوئی موجود نہیں، البتہ ایک کتاب کے اندر نظر سے گزرا ہے وہ ہمیشہ میں ذِکر کیا کرتا ہوں، سیرت کی کتاب ہے ''انسان العیون'' جو ''سیرتِ حلبیہ'' کے نام سے مشہور ہے، اُس میں ایک جملہ ہے کہ ''لَا یَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ مِنَ الْحَیَوَانِ اِلَّا الْحِمَارُ وَالْخِنْزِیْرُ '' (ج ا ص ۳۳) یہ لواطت والا عمل حیوانات میں صرف گدھوں اور خنزیروں میں پایا جاتا ہے، باقی حیوانوں میں سے کسی حیوان میں نہیں ہے۔ تو میں بار ہا دریافت کیا کرتا ہوں کہ ہمارے چاروں طرف گدھے تو ہیں ہی، اور یہ ہر علاقے میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں، لیکن آج تک ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملا کہ کسی شخص نے گدھے کو گدھے پر یوں چڑھے ہوئے پایا ہو کہ اِدخال الفرج فی الفرج ہو جائے، ویسے مستیاں کرتے ہوئے لڑتے بھڑتے ہوئے ٹانگ کسی کے اُوپر رکھ لی، اس طرح چھیڑ چھاڑ تو کرتے رہتے ہیں، باقی ایسے فعل کا اِرتکاب کرتے ہوئے کسی کو دیکھا ہو جس کو ''قضائے شہوت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ایسا نمونہ ہمیں آج تک نہیں ملا۔ باقی! خنازیر کے ریوڑ ہم نے دیکھے نہیں ہیں، جو لوگ ان کو گھروں میں رکھتے ہیں اُن کے سامنے کوئی نمونہ ہو تو بیشک ہو، بہرحال حیوان کی تاریخ اس بات سے خالی ہے کہ نَر، نَر کے ساتھ قضائے شہوت کرے، جس سے معلوم ہوگیا کہ یہ فطرتِ حیوانی نہیں، یہ فطرت سے بغاوت ہے، کوئی شخص اگر ایسا اِرتکاب کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ حیوانیت کی حدود سے باہر ہے، اس لئے یہ جرم زیادہ گھناؤنا ہے۔ اور مذکر کا رُجحان مؤنث کی طرف یہ فطرت کا تقاضا ہے، یہ بات ہر حیوان میں پائی جاتی ہے، لیکن آگے پھر حیوان میں اور انسان میں فرق یوں ہو جائے گا کہ اگر کسی قاعدے اور قانون کا پابند ہے تو انسان ہے، اور اگر وہ قاعدے اور قانون کا پابند نہیں، بلکہ جس طرح باقی حیوانات میں ہے کہ نہ ماں کی تمیز ہے، نہ بیٹی کی تمیز ہے، نہ بہن کی تمیز

ہے، جس کو دیکھا اُس کے ساتھ تقاضائے شہوت کرلی، اگر یہ صورتِ حال پیش آجائے تو زیادہ سے زیادہ آپ اس کو حیوانیت کہیں گے، بہرحال یہ بات حیوانی فطرت سے باہر نہیں، قاعدے اور قانون کا پابند ہونا انسانیت ہے، انسان اس قاعدے اور قانون کا پابند ہے کہ فلاں حلال ہے اور فلاں حرام ہے، اِس صورت میں حلال ہے اور اِس صورت میں حرام ہے، اور حیوان اس چیز کا پابند نہیں ہے۔ تو "لواطت" غیر فطری فعل ہے، اس لئے شریعت میں بھی اس پر وعید زیادہ ہے۔

فعلِ لواطت کی تاریخ اور اس کا پس منظر

قرآنِ کریم نے مستقل ایک قوم کا ذکر کیا ہے جس کو اِسی جرم کے نتیجے میں تباہ و برباد کردیا گیا، وہ قومِ لوط ہے، لوط علیہ السلام اللہ کے پیارے پیغمبر ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، اِن کو ایک بستی سدُوم میں متعین کیا گیا تھا، اور اُس کے ساتھ دوسری ملحق بستیاں تھیں جن میں یہ قوم آباد تھی، اُن میں کفر و شرک کے علاوہ اِس قسم کا فعل بھی پایا جاتا تھا، کہ مرد عورت کی طرف رُجحان کرنے کی بجائے مرد، مرد کی طرف رُجحان رکھتا تھا۔ اور یہ کام انہی سے شروع ہوا، اُس سے پہلے انسانی معاشرے میں یہ چیز موجود نہیں تھی، جیسے کہ قرآنِ کریم نے ذکر کیا کہ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ عنکبوت: ۲۸) تمام جہانوں میں سے اس حرکت کے ساتھ تم سے کوئی شخص سبقت نہیں لے گیا، اِس فعل کی ایجاد بھی اُنہی کی ہے، یہ شروع بھی اُن میں ہی ہوا۔ باقی! یہ غیر فطری فعل اُن میں کیسے شروع ہوگیا؟ اِس بارے میں کوئی واضح ثبوت تو ہے نہیں، اسرائیلی روایات اور قصے کہانیوں کی جو کتابیں ہیں اُن میں اس قسم کی باتیں آتی ہیں، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں اِس بات کو ذکر فرمایا کہ اِس فعل کی اِبتدا کس طرح ہوئی؟ وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کا باغ تھا، اور شیطان انسان کو اِس غیر فطری فعل میں مبتلا کرنا چاہتا تھا بربادی لانے کے لئے، تاکہ اِس کی نسل منقطع ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بدترین قسم کے جرم کا مرتکب ہوجائے، کیونکہ اِس فعل کے نتیجے میں نسل بھی منقطع ہوجاتی ہے، جب عورتوں کی طرف رُجحان نہیں ہوگا تو آگے اولاد کیسے ہوگی؟ تو شیطان ایک خوبصورت لونڈے کی شکل میں اُس باغ میں گیا، اور جاکر پھل توڑنے اور خراب کرنے شروع کردیئے، باغ والے نے اُس کو پکڑ لیا، پکڑ کے مارنا شروع کردیا، بہت پیٹا اور اُس کو باغ سے نکال دیا، اگلے دن وہ پھر آگیا، اور آکر اُس نے اِسی طرح حرکتیں شروع کردیں، باغ والے نے پھر پکڑ لیا، اُس کو سزا دی اور نکال دیا، اگلے دن پھر وہ آگیا، حتیٰ کہ باغ والا اُس کو پیٹتا پیٹتا عاجز آگیا، لیکن اُس لونڈے نے اپنی حرکت نہ چھوڑی، باغ میں آتا اور بربادی لاتا، آخر وہ باغ والا مجبور ہوکر پوچھتا ہے کہ تو کسی طرح یہاں سے رُک بھی سکتا ہے؟ مار، مار کے تو میں نے دیکھ لیا، وہ کہنے لگا: ہاں! ایک کام اگر کرو تو پھر میں رُک جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ کیا؟ تو اس نے کہا کہ میرے ساتھ یوں کرو! جب اُس باغ والے کو اپنے ساتھ مبتلا کرلیا، اب یہ ایک قدرتی سی بات ہے کہ اُس کو اُس میں لذّت زیادہ آئی، وہاں سے اُس کو جو عادت پڑی، تو دوسرے کو نشاندہی کی، تیسرے کو نشاندہی کی، اس طرح کرتے کرتے سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آگیا۔ (دیکھئے خطباتِ حکیم الامت ۱۷۳/۳)، تو حضرت لوط علیہ السلام کے ذمے خاص طور پر اِس فاحشہ کو مٹانے کا کام لگایا گیا تھا، اور انہوں نے بہت کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، حتیٰ کہ جو فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اُن کو بھی حاصل کرنے کی انہوں نے پوری کوشش کی، جس کی تفصیل

قرآنِ کریم میں ہے، تو یوں اِس قوم سے یہ رسم بد اِنسانی معاشرے میں آئی، اب چونکہ یہ کام حضرت لوط علیہ السلام کی قوم سے شروع ہوا تو اِس کی نسبت بھی اُدھر ہی ہوگئی۔

لفظ ''لواطت'' محدَث لفظ ہے

حدیث شریف میں جو عنوان ذکر کیا گیا ہے اس فعل کو نقل کرتے ہوئے وہ یہ ہے: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ'' اتنی لمبی ترکیب حضور ﷺ استعمال فرماتے ہیں، کہ جو شخص قومِ لوط جیسا عمل کرے، ''فَاقْتُلُوْا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ''(۱) تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا کرو۔ یا ایک رِوایت میں آتا ہے کہ: ''مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ''(۲) جو قومِ لوط والا عمل کرے وہ ملعون ہے، اس پر لعنت ہے۔ اور اسی طرح اور روایتوں میں بھی اتنی لمبی ترکیب نقل کی گئی ہے: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ'' لیکن بعد میں ایک لفظ مستحدث ہوگیا، نیا لفظ بنالیا گیا، اب بن گیا اور چل گیا، تو فقہ کی کتابوں میں بھی آتا ہے، تفسیر کی کتابوں میں بھی آتا ہے، شارحینِ حدیث بھی اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں، لیکن ذخیرۂ حدیث میں یہ لفظ نہیں ہے، یعنی لفظِ ''لواطت'' نہ قرآنِ کریم میں ہے نہ حدیث شریف میں ہے، حدیث شریف میں جہاں ذکر کیا گیا ہے اتنی لمبی ترکیب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ'' اب یہ لفظ مستحدث ہے، نیا بنالیا گیا، اور جس نے بھی بنایا ہے اور اس لفظ کو ایجاد کیا ہے اللہ تعالیٰ اُسے معاف کرے، یہ بہت درجے میں زیادتی ہے، اب اس سے لَاطَ یَلُوْطُ فعل استعمال ہوتا ہے، گویا کہ اُس نبی کے نام سے اِس فعل کو اَخذ کرلیا گیا، حالانکہ اُس نبی کا اِس سے کیا تعلق تھا؟ حرکت تو قوم کی تھی، اب حضرت لوط علیہ السلام کا نام اِس درجے میں آگیا کہ کوئی شخص ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتا ہوا ''ابراہیمی'' کہلائے گا، عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتا ہوا ''عیسوی'' کہلائے گا، موسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتا ہوا ''موسوی'' کہلائے گا، محمد ﷺ کی طرف نسبت رکھتا ہوا ''محمدی'' کہلائے گا، لیکن حضرت لوط علیہ السلام کی طرف نسبت کرکے کوئی ''لوطی'' کہلانے کے لئے تیار نہیں ہے، کیونکہ جہاں ''لوطی'' کا لفظ آیا تو نسبت اگرچہ ظاہری طور پر حضرت لوط علیہ السلام کی طرف ہے، لیکن فوراً ذہن اِس بُرے کام کی طرف چلا جاتا ہے، تو ایک نبی کے نام سے اِس کو اَخذ کرلیا گیا، اب تو اَخذ ہوگیا، اب تو مفسرین بھی نقل کرتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں بھی آتا ہے، ادب کی کتابوں میں بھی آتا ہے، لَاطَ یَلُوْطُ فعل بن گیا، لیکن اس کی اِبتدا اچھی نہیں ہے، کہ اِس میں نبی کا نام آگیا۔ (خطبات حکیم الامت، ۳/ ۱۷۴) ورنہ حدیث شریف میں سرورِ کائنات ﷺ نے جو نقل کیا ہے تو اس کو اِسی انداز سے ساتھ ہی نقل کیا ہے کہ ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ'' قومِ لوط والا جو کوئی شخص عمل کرے، اتنی لمبی ترکیب کے ساتھ اس کو ذکر کیا گیا ہے۔

فعلِ لواطت کی سزا اور اِختلاف بین الفقہاء

اس کی سزا شریعت میں کیا ہے؟ قرآنِ کریم میں صرف یہی لفظ آیا: ''فَاٰذُوْهُمَا'' یا قومِ لوط کو جو سزا دی گئی تھی کہ اُن کے

---

(۱) مسند بزار، رقم: ۹۰۷۹۔ نیز ترمذی، ۱/ ۲۷۰ باب ما جاء فی حد اللوطی ،۱/ ابوداؤد وابن ماجہ میں الفاظ یہ ہیں: مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ الخ۔

(۲) مشکوٰۃ، ۲/ ۳۱۳، کتاب الحدود فصل ثالثہ عن ابن عباسؓ وعن ابی ہریرہؓ۔ مسند احمد، رقم: ۲۹۱۳۔ نیز ترمذی ۱/ ۲۷۰

اُو پر سنگباری کی گئی اور اُن کے اس علاقے کو الٹ دیا گیا، زمین کے نیچے دبا کر ان کو ہلاک کر دیا گیا، لیکن ہماری شریعت میں متعین طور پر اس کی کوئی متفق علیہ سزا نہیں ہے، صحابہ کرامؓ کے اندر اس بارے میں اختلاف ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ہشام بن عبدالملک جو اُموی خلیفہ ہوا ہے، ان چاروں خلیفوں کے زمانے میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ کوئی شخص اِس فعل کا مرتکب پایا گیا تو انہوں نے اُس کو زندہ آگ میں جلایا،[1] اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ اُس کو کسی دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اُس کے اُوپر دیوار گراؤ تا کہ قومِ لوط والا نمونہ آ جائے، بعض کا قول یہ ہے کہ کسی بلند سے بلند عمارت پر لے جا کر سر کے بل اُس کو زمین پر گرا کے اُس کو ہلاک کرو، یا پہاڑ کی چوٹی سے دھکا دے کر گرا کے اُس کو ہلاک کرو۔ اور بعضوں کا قول یہ ہے کہ قتل کر دیا جائے۔ اور بعضوں کا قول یہ ہے کہ جس طرح زِنا کی حد ہے ویسے ہی اِس کو سزا دی جائے۔ اور فقہاء میں بھی اِسی وجہ سے اختلاف ہے کہ بعض اس کو زِنا کی تعریف میں شامل کرتے ہیں، وہ تو اِس کے اُوپر زِنا والی سزا دیں گے، اور بعض اس کو زِنا کی تعریف میں شامل نہیں کرتے، بلکہ فاحشہ کا مرتکب قرار دے کر اس کے لئے حاکم کو تعزیر کا اختیار دیتے ہیں، چاہے وہ دُرّے لگا دے۔ اور اگر بار بار سمجھانے کے باوجود باز نہیں آتا تو اُس کو قتل بھی کروا سکتا ہے، اور اِس کے علاوہ کوئی دوسری سزا دینا چاہے تو وہ بھی دے سکتا ہے، اس کی حدود کو وسیع کر دیا گیا۔ صاحبین کے نزدیک یہ زِنا کے حکم میں ہے، اور حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اِس میں تعزیر ہے جو حاکم کے اختیار میں ہے، اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ زِنا کے حکم میں ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اِس کی سزا کے متعلق اختلاف نہ ہوتا، کیونکہ زِنا کی حد تو قرآنِ کریم میں متعین ذکر کر دی گئی، اِس میں تو اختلاف کی گنجائش ہی نہیں، جب اِس کی سزا میں اختلاف کیا گیا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ زِنا کی تعریف میں داخل نہیں ہے، البتہ اِس کی سزا سخت ہے۔ بہر حال مرد، مرد کے ساتھ یہ جرم کرے تب بھی یہی بات ہے، اور مرد عورت کے ساتھ دُبر میں اس قسم کی حرکت کرے تو بھی وہی بات ہے، کہ یہ فعل حرام ہے، چاہے اپنی بیوی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، اس کی اجازت نہیں ہے، وہاں بھی اِس کو ''غیر فطری'' ہی قرار دیا جائے گا۔ تو ''فَاٰذُوْهُمَا'' کی تفسیر کے تحت یہ بات آ گئی، کہ اُن کو اِیذا پہنچاؤ، اور اُس ایذا کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت دونوں مراد لئے جائیں تو ایذا کا مصداق حدِ زِنا ہے، اور اگر دو مرد مُراد لئے جائیں تو اُس میں یہ تفصیل ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئی۔ بہر حال عقلاً، عرفاً، شرعاً، ہر طریقے سے زِنا کے مقابلے میں یہ فعل زیادہ قبیح ہے۔ فَاِنْ تَابَا: پھر اگر یہ دونوں توبہ کر لیں، یہاں بھی اُسی طرح تفصیل ہے کہ دونوں مرد مُراد ہیں، یا مرد و عورت مراد ہیں اور مذکر کا صیغہ تغلیباً استعمال ہوا ہے، وَاَصْلَحَا: اور اپنے فعل کو دُرست کر لیں، فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا: پھر اُن کا پیچھا چھوڑ دیا کرو، پھر ہر وقت ان کے پیچھے لگے رہنا، ملامت کرنا اور طعنے دینا مناسب نہیں ہے، اُن کے توبہ کر لینے کے بعد اور اصلاح کے بعد پھر ان کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی، سورۃ اعراف: ۸۰ کے تحت/ الترغیب للمنذری، ۱۹۸/۳، رقم ۳۶۵۷/ شعب الایمان، رقم ۵۰۰۵۔

''توبہ'' کی حقیقت اور آداب وشرائط

آگے پھر ''توبہ'' کے متعلق کچھ آداب ذکر کر دیئے گئے، چونکہ یہاں فَاِنْ تَابَا میں توبہ کا ذکر آ گیا، تو اس کی مناسبت سے آگے توبہ کا مسئلہ ذکر کر دیا گیا۔ ''توبہ'' کی حقیقت جیسے کہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ''اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ''[1] اپنے کیے پر پشیمان ہونا توبہ ہے، اور اِس پشیمانی کا تعلق قلب کے ساتھ ہے، کہ دل میں انسان نادم ہو جائے، شرمسار ہو جائے، پشیمان ہو جائے، کہ میں نے یہ کام کیوں کر لیا، مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا، دل پر یہ کیفیت طاری ہو جائے، یہ حقیقتِ توبہ ہے۔ اور ''اِستغفار'' کا لفظ جو ہم بولا کرتے ہیں اُس کا تعلق زبان کے ساتھ ہے، توبہ و اِستغفار دونوں لفظ آ جائیں گے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں پشیمان ہو اور زبان سے اِس توبہ کے الفاظ کو ادا کرے، تو یہ توبہ اور اِستغفار کی شکل میں آ جائیں گے، جیسے ایمان کی ایک حقیقت قلب سے تعلق رکھتی ہے، اور ایک زبان کے ساتھ یعنی اقرار باللسان، اسی طرح توبہ کا ایک تعلق قلب کے ساتھ ہے کہ دِل میں ندامت اور پشیمانی ہو، اور اِس کا دوسرا تعلق زبان کے ساتھ ہے کہ زبان سے اقرار بھی کرے کہ مجھ سے یہ غلطی ہو گئی، آئندہ میں اِس قسم کی حرکت نہیں کروں گا، یہ تو توبہ کی حقیقت ہے۔ اور اگر دل کے اندر ندامت نہ ہو، بلکہ دل میں تو اُسی طرح شوق ہے اور پتا بھی ہے کہ دوسرے موقع پر میں نے اسی طرح ہی کرنا ہے، اور انسان اس فعل سے باز نہیں آتا، تو زبان کے ساتھ اگر لاکھ دفعہ بھی توبہ اور اِستغفار ادا کرے گا تو اِس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ بے حقیقت توبہ ہے۔ جیسے فارسی کا ایک شعر آتا ہے کہ:

سبحہ بر کف، توبہ بر لب، دِل پُر اَز ذوقِ گناہ — معصیت را خندہ می آید بر اِستغفارِ ما

کہ ہاتھ میں تو تسبیح پکڑی ہوئی ہے، زبان پر توبہ توبہ ہے، دل اُسی طرح گناہ کے شوق کے ساتھ بھرا ہوا ہے، تو گناہ کھڑا ہنستا ہے ہمارے اِستغفار پر، کہ تیرا یہ اِستغفار مجھے مٹا نہیں سکتا، یہ مجھے دفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ تو اِس کی قبولیت کے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ قلب کے اندر ندامت آئے، جب تک انسان دلی طور پر شرمسار نہ ہو اُس وقت تک توبہ کی حقیقت مہیا نہیں ہوتی۔ اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لئے رُکنے کا عزم ہو، کہ پچھلے کے اُوپر پشیمانی ظاہر کرے اور آئندہ کے لئے تہیہ کرے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، توبہ کرتے وقت یہ عزم ہو کہ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا، میں بچ کے رہوں گا، تو پھر توبہ صحیح ہو گئی، لیکن اگر پھر جذبات سے مغلوب ہو کر، ماحول سے متاثر ہو کر، نفسانی شرارت سے، یا شیطان کے اُکسانے بہکانے سے دوبارہ پھر اِس جرم کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے تو اِس کا پہلی توبہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ مستقل فعل ہے، اِس کے لئے مستقل توبہ چاہیے، دوبارہ پھر توبہ کر لی جائے، پہلی توبہ اپنی جگہ بحال ہے، جو اِس سے پہلے گناہ کیا ہوا تھا وہ مٹ گیا، اب اِس نئے گناہ کے لئے دوبارہ توبہ کرو، جتنی دفعہ بھی یہ فعل ہوتا جائے، بشرطیکہ توبہ کرتے وقت دل میں دوبارہ اُس کام کے کرنے کا ارادہ نہ ہو، تو پھر توبہ کرنے کے ساتھ گناہ معاف ہو سکتا ہے، اِس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ'' جو اِستغفار کر لے وہ مُصِر نہیں سمجھا جاتا، اِس کو اَڑنے والا قرار نہیں دیا جاتا کہ یہ معصیت پر اَڑا ہوا ہے، ''وَاِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً''[2] اگرچہ ایک دن میں وہ اُس فعل کا ارتکاب ستر دفعہ

(۱) ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۱۳ باب ذکر التوبہ مرفوعاً / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۰۶ باب الاستغفار کا آخر موقوفاً۔

(۲) سنن ابی داؤد ۱/ ۲۱۲ باب فی الاستغفار / مشکوٰۃ ص ۲۰۴ باب الاستغفار فصل ثانی، عن ابی بکر الصدیقؓ

کرے، ستر دفعہ بھی اُس سے اُس فعل کا ارتکاب ہوجاتا ہے تو بھی اُس کو مصر نہیں سمجھا جائے گا اگر وہ شخص صدقِ دل کے ساتھ توبہ کرلے، مطلب یہی ہے کہ توبہ کرتے وقت یہ ارادہ ہو کہ میں نے دوبارہ یہ کام نہیں کرنا، لیکن اگر پھر کسی وجہ سے پھسل گیا تو ایسی صورت میں پھر توبہ کی گنجائش ہے، توبہ کا تو دروازہ بند نہیں ہے، جیسے ایک فارسی شاعر اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اِس کا بھی یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہوا ہے، جو کچھ بھی تم ہو ایک دفعہ اللہ کے سامنے آجاؤ، کافر ہو، آتش پرست ہو، بُت پرست ہو، جو کچھ بھی ہو آجاؤ، اس درگاہ میں نااُمیدی نہیں ہے، اگر سو دفعہ بھی توبہ کرکر کے توڑ چکے ہو تو بھی تمہارے لیے گنجائش ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پھر آکر توبہ کرلو، اللہ تعالیٰ پھر بھی گناہ معاف کردیں گے۔ بہر حال توبہ کرتے وقت یہ عزم ہونا چاہیے کہ ہم دوبارہ اس کام کو نہیں کریں گے، اور اور پھر بعد میں اگر ہو بھی جائے تو بھی اسی طرح بات ہے کہ پھر توبہ کرلی جائے۔

توبہ کا موقع ملنا بہت بڑا انعامِ خداوندی ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ توبہ کا مسئلہ جو ذکر فرمایا یہ انسانی دُنیا پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان ہے، کیونکہ گناہ ہو ہی نہ، یہ یا تو فرشتوں کی حالت ہے کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (سورۂ تحریم:۶) یہ فرشتوں کا مقام ہے کہ اُن سے کوئی معصیت نہ ہو، اُن کی اللہ تعالیٰ نے فطرت ہی ایسی رکھی ہے کہ وہ اللہ کے اَحکام کے مطابق چلتے ہیں، نافرمانی کر ہی نہیں سکتے، یا انسانی طبقات میں سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء ﷵ کو یہ شرف دیا ہے کہ اُن سے معصیت صادر نہیں ہوتی، وہ بھی اللہ کی نافرمانی پر ایک قسم کے قادر ہی نہیں ہوتے، یہ عصمتِ انبیاء ﷵ کا مسئلہ پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا جا چکا ہے، انبیاء ﷵ کو چھوڑ کر باقی انسانی معاشرہ جتنا بھی ہے، نیک ہو بد ہو، ولی ہو غیر ولی ہو، عالم ہو جاہل ہو، اِس دنیا کے اندر رہتے ہوئے قدم پھسل جاتے ہیں، گناہ کے اسباب جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، کہیں آنکھ خطا کر جاتی ہے، کہیں کان بہک جاتا ہے، اور کہیں دل بھٹک جاتا ہے، کہیں قدم کو لغزش ہوجاتی ہے، اس قسم کے حالات ہوتے رہتے ہیں، ''چوں گِل بسیار شد پیلاں بلغزند'' (گلستان، باب ۵، حکایت ۱۷) جب کیچڑ زیادہ ہوتا ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں، تو دنیا میں اس طرح سے ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر اِس میں توبہ کی بات نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ اس کے اِزالے کی کوئی تدبیر نہ بتاتے تو کوئی شخص بھی اپنے نامۂ اَعمال کو صاف نہ رکھ سکتا۔ ہاں البتہ معصیت کے بعد اُس پر اَڑ جانا اور ندامت کا اظہار نہ کرنا شیاطین کا کام ہے، اور بنی آدم کی بات یہی ہے جیسے حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''کُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ'' کہ آدم ﷤ کے بچے جتنے ہیں سب خطا کار ہیں، ''وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ''(۱) لیکن اِن خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، اس لئے غلطی اور لغزش ہوجانے کے بعد اللہ کے سامنے رو پڑنا اور اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ دینا اور

---

(۱) ترمذی ۷۶/۲ / ابن ماجہ ص ۳۱۳ باب ذکر التوبۃ / مشکوٰۃ ۲۰۴/۱ باب الاستغفار فصل ثانی، عن انسؓ۔

ندامت کا اظہار کرنا یہ اصل میں آدمیت ہے، آدمی ہونے کا تقاضا یہی ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے کہ اس غلطی اور اس نقص کے تدارک کا اُس نے طریقہ بتادیا۔

”بِجَهَالَةٍ“ اور ”مِنْ قَرِيْبٍ“ اِتفاقی قیود ہیں یا اِحترازی؟

آگے قبولیتِ توبہ کے لئے ایک ضابطہ ذکر کیا جارہا ہے، اور بِجَهَالَةٍ کا لفظ جو آیا ہوا ہے اِس جہالت سے یہاں کیا مراد ہے؟ اِس میں بھی دونوں رائیں ہیں، یا تو یہاں جہالت سے مطلقاً بدعملی مراد ہے، کہ جو شخص بھی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ جاہل ہے، یوں سمجھو کہ اس نے علم کے تقاضے چھوڑ دیئے، اگر اُس کو اِس گناہ کی شناعت مستحضر ہوتی اور اِس کی سزا پر اُس کو کامل طریقے سے یقین ہوتا تو ایسی حرکت نہ کرتا، مثلاً آپ کو یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے، تو آپ اس کو اُٹھا کر اپنی گود میں نہیں رکھتے، اپنے ہاتھ میں انگارے کو نہیں لیتے، کیونکہ آپ کو یقین ہے کہ یہ جلاتا ہے، اور اگر کوئی شخص جہالت کرے اور اُٹھا کر انگارے کو گود میں رکھ لے تو کہیں گے کہ دیکھو! یہ نادان ہے، اِس نے حماقت کرلی، اِس نے جہالت کرلی، کیونکہ اُس نے اپنے علم کے تقاضے کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح آپ کو پتا ہے کہ بچھو یہ ڈنگ مارتا ہے، اور ڈنگ کے بعد درد ہوتا ہے، تو کوئی شخص اُس کو ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا، اور اگر اُس کو کوئی ہاتھ لگائے اور وہ ڈنگ ماردے اور درد ہوجائے تو سارے کہیں گے کہ جاہل! نادان! تُو نے ایسا کیوں کیا؟ تجھے پتا نہیں تھا کہ یہ ڈنگ مارتا ہے اور درد ہوتا ہے؟ تو جب کوئی شخص اُس تقاضے کو پورا نہیں کرتا جو علم کا تقاضا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ جاہل ہے، اس لئے ہر بدعملی جہالت کا مصداق ہے، تو یہ قید احترازی نہیں بلکہ واقعی ہے، کہ نادانی کے ساتھ، حماقت کے ساتھ، بے وقوفی سے اگر کوئی شخص گناہ کرلے، اور جو بھی گناہ کرتا ہے وہ نادانی سے، بے وقوفی سے اور حماقت سے کرتا ہے، ورنہ اُس گناہ کا جو نتیجہ ہے کہ قلیل لذت کے لئے کثیر عذاب جو برداشت کرنا پڑے گا، یا دو چار منٹ کی لذت کے لئے ہمیشہ کی جو رسوائی برداشت کرنا پڑے گی، اگر اِس کا استحضار ہو تو پھر کوئی شخص گناہ کے قریب نہیں جاتا، تو ایسا کرنا گویا کہ جہالت ہے۔ اور دوسری قید یہ آئے گی کہ توبہ جلدی کرلے، اب جلدی کا کیا مصداق ہے؟ ایک تو یہ ہے کہ جب تنبہ ہوا فوراً ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلی، اور ایک یہ ہے کہ مرنے سے پہلے پہلے یعنی غرغرہ کی کیفیت سے پہلے پہلے توبہ کرلی جائے، تو روایات کی طرف دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مِنْ قَرِيْبٍ کا مصداق ہے، ہاں! البتہ جس وقت جان کنی شروع ہوجائے گی اور آخرت منکشف ہوجائے گی، ایسے وقت میں پھر توبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تو مِنْ قَرِيْبٍ کی قید یہ موت سے قبل قبل پر صادق آگئی، اور بِجَهَالَةٍ ہر غلط کار پر صادق آگیا، تو ایسی صورت میں توبہ یوں وسعت اختیار کرگئی۔

اور اگر ان دونوں لفظوں کو احتراز کے لئے بنایا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ بسا اوقات تو گناہ ہوتا ہے، کہ انسان جذبات میں یوں مغلوب ہوجاتا ہے کہ اُس کی عقل کام کی نہیں رہتی، جہالت سے یہی جذبات کی مغلوبیت مراد ہے، کیونکہ جہالت جس طرح علم کے مقابلے میں آتی ہے اسی طرح حلم کے مقابلے میں بھی آتی ہے، کہ انسان سے برداشت کا دامن چھوٹ جائے اُس کو بھی جہالت کہتے ہیں، جیسے حماسہ میں آپ نے پڑھا، ”بَعْضُ الْحِلْمِ عِنْدَ الْجَهْلِ لِلذِّلَّةِ إِذْعَانٌ“ کہ بعض بعض برداشت دوسرے کی

طرف سے جہالت کے مقابلے میں، یہ اپنی ذلت کا یقین ہوتا ہے، کہ دوسرے کی طرف سے تو جذباتی معاملہ ہو رہا ہو اور آپ اُس کو آگے سے برداشت کرتے رہیں، اب یہاں حلم اور جہالت کا آپس میں مقابلہ ہے، تو جہالت کے مقابلے میں جیسے علم آیا کرتا ہے اِسی طرح حلم بھی آتا ہے۔ بہر حال جذبات سے مغلوب ہو گئے اور مغلوب ہو کر گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے، تنبہ ہوتے ہی فوراً توبہ کر لی، تو یہ توبہ ایسی ہے جس کے قبول کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اور ایک ہے کہ مغلوب نہیں ہوئے، بالکل اچھی طرح سے ہوش حواس قائم ہیں، سوچتے سوچتے قدم اُٹھاتے ہو اور اس گناہ میں مبتلا ہوتے ہو، تو یہ گناہ بِجَهَالَةٍ نہیں ہے، اور پھر گناہ کرنے کے بعد متنبہ ہو کر فوراً توبہ نہیں کرتے، اور اِس معاملے کو ملتوی کر دیتے ہو، سستی کر جاتے ہو، تو یہ مِنْ قَرِيبٍ نہیں ہے، ایسی توبہ کی قبولیت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ نہیں ہے، ہاں اپنی رحمت سے اگر معاف کرے تو کر دے، ورنہ وعدہ اُسی کا ہی ہے کہ کسی وجہ سے جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ میں مبتلا ہو گئے اور تنبہ ہوتے ہی فوراً توبہ کر لی اس توبہ کی قبولیت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے۔

جیسا گناہ ہوگا توبہ ویسی کرنی پڑے گی

پھر جیسا گناہ ہوتا ہے ویسی توبہ ہوتی ہے، اگر گناہ مخفی تو اُس کی توبہ بھی مخفی، اور اگر کوئی گناہ علی الاعلان کیا ہے تو اس کی توبہ بھی علی الاعلان کرنی پڑتی ہے، اور اگر اُس گناہ کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ ہے تو وہ یا ادا کرنے پڑتے ہیں یا معاف کروانے پڑتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کے فرائض کے ساتھ ہے تو اگر کسی کی قضا ہے تو قضا دینی پڑتی ہے، اور کفارہ ہے تو کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے، وہ ساری تفصیل آپ اپنی کتابوں میں پڑھیں گے کہ توبہ کے قبول ہونے کے لئے اِن سب چیزوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر ترکِ صلوۃ کا آپ نے گناہ کیا ہے تو اُس کی توبہ یہ نہیں کہ آپ توبہ و استغفار کر لیں، بلکہ اُس کو قضا کریں، قضا کرنے کے بعد پھر اپنے قصور کی معافی مانگیں۔ اسی طرح کسی کی عزت کو آپ نے کوئی نقصان پہنچایا ہے یا مال کو نقصان پہنچایا ہے تو یا اُس کا تاوان دیں یا اُس سے معاف کروائیں، تب جا کر اللہ تعالیٰ کے ہاں توبہ قبول ہوگی۔ اور اگر لوگوں پر ظلم کرتے رہو، اُن کا مال کھاتے رہو، اور حق دباتے رہو، تو زبان سے توبہ اِستغفار ادا کرنے کے ساتھ گناہ معاف نہیں ہوا کرتے۔ یہ ساری تفصیل اپنی جگہ موجود ہے۔ تو بِجَهَالَةٍ مِنْ قَرِيبٍ کو واقعی قیدیں بھی بنایا جا سکتا ہے، کہ گناہ جب بھی ہوگا جہالت کے ساتھ ہوگا، اور موت سے پہلے جو توبہ ہو وہ مِنْ قَرِيبٍ ہے، تو پھر یہ آیت ساری زندگی پر پھیل گئی۔ اور اگر احترازی بنایا جائے تو بِجَهَالَةٍ کا مطلب یہ ہوگا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر غلطی کر بیٹھے، اور مِنْ قَرِيبٍ کا مطلب ہو گیا کہ تنبہ ہوتے ہی فوراً توبہ کر لی۔ ''سوائے اس کے نہیں کہ قبولیتِ توبہ اللہ کے ذِمے ان لوگوں کے لئے ہے جو بُرا کام کرتے ہیں نادانی سے، پھر توبہ کر لیتے ہیں جلدی ہی، پس یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِن کے اُوپر توجہ فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔''

شخصی اور عالمی طور پر توبہ کے وقت کی اِنتہا

''نہیں ہے توبہ ان لوگوں کے لئے جو بُرائیاں کرتے رہتے ہیں'' یعنی گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، تنبہ ہونے کے باوجود باز نہیں آتے، ''حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے'' یعنی موت کی کیفیت طاری ہو گئی، غرغرہ کی کیفیت طاری ہو گئی،

عالمِ آخرت منکشف ہوگیا، اللہ کا عذاب سامنے آگیا، ''تو اُس وقت کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں''، اب توبہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ توبہ کا وقت دو طرح سے ختم ہوتا ہے ایک تو سارے عالم کے لئے ختم ہوگا جب مغرب کی طرف سے سورج طلوع کر آئے گا، پھر توبہ کا کوئی وقت نہیں رہے گا، اور شخصی طور پر توبہ کا وقت اُس وقت ختم ہوجاتا ہے جب نزع کا عالم طاری ہوجائے، غرغرے کی کیفیت طاری ہوجائے، اور عالمِ آخرت منکشف ہوجائے، اب توبہ کا وقت ختم ہوگیا، اُس سے پہلے پہلے چاہے مایوسی ہوجائے، یعنی اتنا بیمار ہوگیا کہ اب اندازہ ہے کہ یہ بچے گا نہیں، لیکن ابھی تک نزع کی کیفیت نہیں آئی، اُس وقت تک توبہ کی گنجائش ہے، البتہ نزع کی کیفیت آجانے کے بعد جب عالمِ آخرت منکشف ہوجائے اور فرشتے نظر آنے لگ جائیں تو ایسی صورت میں توبہ قبول نہیں ہوتی، نہ کسی کا ایمان لانا معتبر اور نہ گناہ سے توبہ کرنا معتبر، جیسے طلوع الشمس من المغرب کے بعد نہ کسی کا ایمان لانا معتبر اور نہ گناہوں سے توبہ کرنا معتبر۔ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ: کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ: اور نہ توبہ ان لوگوں کے لئے ہے جو کُفر کی حالت میں مرجائیں، وہ مرتے وقت کُفر سے توبہ کریں، یا اُن کی وفات کُفر پر ہوگئی، اور زندگی میں جو گناہوں سے توبہ کرتے رہے وہ بھی قبول نہیں ہے، کیونکہ قبولیتِ توبہ کے لئے ایمان شرط ہے۔ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا: یہی لوگ ہیں کہ ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

کچھ رُسومِ جاہلیت کی تردید

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا: اِن آیات میں پھر جاہلیت کی بعض رسومِ قبیحہ کی تردید کی گئی ہے، عورتوں کے بارے میں جاہلیت میں بہت ظلم وستم کے طریقے تھے، مثلاً ایک شخص کی بیوی ہوتی، جس وقت وہ شخص فوت ہوجاتا تو اُس کے ورثاء جس طرح مال کے مالک بنتے تھے اِسی طرح اُس کی بیوی پر بھی قبضہ کرلیتے تھے، حتیٰ کہ سوتیلی اولاد اپنے باپ کی منکوحہ کے ساتھ نکاح بھی کرلیتی، اور اگر نکاح نہ بھی کرتے تو اُس کو اپنے گھر میں زبردستی روک رکھتے، مقصد یہ ہوتا کہ جو کچھ اِس کے پاس ہے وہ ہمیں دے کر جان چھڑائے، یا ہم اپنی مرضی کے ساتھ اِس کا کسی دوسری جگہ نکاح کریں گے، وہاں سے کوئی فائدہ اُٹھائیں گے، اور اِسی طرح وراثت دینے کا رواج تھا ہی نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اِنہی بُرے طریقوں کی تردید کی ہے، کہ ''اے ایمان والو! تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جایا کرو''، زبردستی کی قید واقعہ کا بیان ہے، کہ اُس وقت واقعہ ایسے ہی تھا کہ عورت چاہے یا نہ چاہے، ورثاء مرنے والے کی عورتوں پر بھی یونہی قبضہ کرلیا کرتے تھے۔ ''اُنہیں روکا نہ کرو'' عضل شدت کے ساتھ منع کرنے کو کہتے ہیں، ''اُنہیں روکا نہ کرو اِس نیت سے کہ جو کچھ تم اُن کو دے چکے ہو، یا، تمہارا مورث جو اُنہیں دے چکا ہے اُس کا بعض حصہ تم لے لو''۔ بیویوں کے ساتھ بھی لوگ ایسے ہی کرتے تھے کہ اُن کے ساتھ نہ تو وہ زوجیت والا تعلق رکھتے اور نہ اُن کو طلاق دے کر فارغ کرتے، بلکہ گھروں میں بٹھا رکھتے، مختلف طریقوں سے تنگ کرتے، تاکہ یہ ہمارا مہر واپس کردے پھر ہم اُس کو اپنے گھر سے نکالیں گے اور طلاق دیں گے، دیا ہوا مہر واپس لینے کے لئے اور اِسی طرح کوئی اور مالی فوائد حاصل کرنے کے لئے لوگ اپنی بیویوں کو بھی تنگ کرتے تھے، اِس لئے مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ کا مخاطب اَزواج بھی ہوسکتے ہیں، کہ جو

کچھ تم نے اپنی بیویوں کو دیا ہے اُس میں سے بعض حصے کو وصول کرنے کے لئے اُن کو روک کر گھروں میں نہ بٹھالیا کرو۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو تمہارے مورث نے دیا ہے جو مرگیا، اُس کے دیئے ہوئے میں سے کچھ وصول کرنے کے لئے تم ان کو گھروں میں نہ روک رکھا کرو۔

بیوی کا مہر کن صورتوں میں واپس لیا جاسکتا ہے؟

اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ: مگر یہ کہ وہ عورتیں کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں، صریح بے حیائی کے ارتکاب میں یہ بھی ہے کہ ہیں تو تمہاری بیویاں، لیکن وہ نافرمان ہیں، اور وہ تمہارے ساتھ خود نبھا نہیں کرنا چاہتیں، مرد کا قصور نہیں ہے بلکہ قصوروار عورت ہے، تو ایسی صورت میں مرد کے لئے جائز ہے کہ عورت کو کچھ لئے بغیر طلاق نہ دے، اور دیا ہوا مہر واپس لے لے پھر طلاق دے دے بشرطیکہ نشوز اور نافرمانی بیوی کی طرف سے ہو، جس کو ہم خلع کے ساتھ یا طلاق علی المال کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، کہ جب نافرمانی ہے ہی عورت کی طرف سے، مرد اُس کو بسانا چاہتا ہے لیکن وہ نہیں بستی، موافقت نہیں کرتی، تو ایسے وقت میں اُس کی جان نہ چھوڑی جائے جب تک کہ وہ لیا ہوا مہر واپس نہ کردے یا اُس کا کوئی حصہ واپس نہ کردے، اِس صورت میں خاوند کے لئے دیا ہوا مال واپس لینا جائز ہے۔ یا اِس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ زنا کا ارتکاب کرے، تو حضرت تھانوی ﷫ کے لکھنے کے مطابق پہلے یہ جائز تھا کہ اگر بیوی زنا وغیرہ کا ارتکاب کرلیتی ہے تو خاوند اپنا دیا ہوا مال واپس لے کر اُس کو گھر سے نکال دے اور طلاق دے دے لیکن اب مسئلہ اسی طرح ہے کہ بیوی کے زانی ہونے کی صورت میں بھی مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوتا اور اس کا واپس لینا درست نہیں ہے، اُس کی جو شرعی حد متعین ہوگئی وہی اُس کو سزا دی جاسکتی ہے اور دیا ہوا مال واپس نہیں لیا جاسکتا۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: عورتوں کے ساتھ معاملہ اچھا رکھا کرو، اُن کے ساتھ برتاؤ اچھا رکھا کرو، تمہاری معاشرت اُن کے ساتھ معروف طریقے کے مطابق ہونی چاہیے۔

معمولی طبعی ناگواری کی وجہ سے عورتوں کو گھروں سے نہیں نکالنا چاہیے

اور کبھی ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ نکاح تو کرلیا، لیکن بعد میں وہ عورت شکل وصورت کے اعتبار سے یا کسی اعتبار سے پسندیدہ نہیں ہے، اور اُس میں اخلاقی سقم کوئی نہیں، صرف شکل وصورت کی بات ہے، بسا اوقات انسان کا دل اُس پہ نہیں ٹکتا، تو قرآن اِس بارے میں یہ سمجھاتا ہے کہ تمہیں صبر سے کام لینا چاہیے، صرف اپنی طبعی پسند اور ناپسندیدگی پر مدار رکھ کر عورت کو علیحدہ نہیں کرنا چاہیے، بسا اوقات طبعاً ایک چیز پسند نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ اُس کو خیر کثیر کا ذریعہ بنا دیتا ہے، مثلاً وہ تمہاری خدمت گزار ہو، فرمانبردار ہو، گھر کو سنبھالنے والی ہو، تو اگر وہ خوبصورت نہیں ہے یا دل کو نہیں بھاتی تو اُس کے مقابلے میں یہ فوائد بہت ہیں، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اُس سے اولاد ایسی حاصل ہوجائے جو تمہارے لئے دنیا اور آخرت میں مفید ہو، جیسے کوئی بچہ پیدا ہوا اور بچپن میں فوت ہوجائے تو آخرت کے لئے مفید ہوگیا، اسی طرح بچے پیدا ہوئے، جوان ہوگئے، دُنیا میں بھی خدمت گزار ہوسکتے ہیں اور آخرت کے لئے بھی مفید ہوسکتے ہیں، تو معمولی سی طبعی ناگواری کی بناء پر عورتوں کو گھر سے نکالنے کی کوشش نہ کیا کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی

رحمت سے اُمید رکھا کرو کہ یہ عورت دنیا اور آخرت میں خیر کثیر کا باعث بن سکتی ہے، یوں سوچ کے صبر کر لیا کرو۔ ''اگر تمہیں وہ عورتیں ناپسند ہوں'' تو صبر کیا کرو، تو بھی برداشت کیا کرو، ''ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اُس میں خیر کثیر کر دے۔''

بیوی کو دِیا ہوا مال واپس لینے کی ممانعت

''اور اگر تم ارادہ کرو ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کو بدلنے کا'' یعنی نکاح اور کرنا چاہتے ہو لیکن بیک وقت دو رکھ نہیں سکتے، اس لئے خیال ہے کہ پہلی کو فارغ کر دیا جائے، اگر اس طرح کی کوئی تبدیلی کا ارادہ ہے تو بھی دیا ہوا مال لینا تمہارے لئے جائز نہیں ہے، چاہے تم کتنا مال ہی کیوں نہیں دے چکے۔ ''اگر ارادہ کرو تم بیوی کو بدلنے کا دوسری بیوی کی جگہ، اور دے چکے ہو تم اُن میں سے کسی کو ڈھیروں مال''، قِنطار مالِ کثیر کو کہتے ہیں، جس کی مقدار یہاں متعین نہیں ہے، یعنی جتنا بھی تم دے چکے، بطور مہر کے دے چکے یا بطور ہدیہ کے، فقہ کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا کہ زوجین اگر آپس میں ایک دوسرے کو بطور ہدیہ کے کوئی چیز دے دیں پھر بھی اُس کا واپس لینا ٹھیک نہیں ہے، زوجیت کا تعلق ہبہ اور ہدیہ کو واپس لینے سے بھی مانع ہے، اور مہر بھی لازم ہوتا ہے اُس کی ادائیگی بھی ضروری ہے، تو مہر کے طور پر جو تم دے چکے یا ہدیہ تحفہ اور ہبہ کے طور پر کوئی چیز دے چکے ہو، کتنا ہی مال دے چکے ہو، تو اُس میں سے کچھ واپس نہ لیا کرو۔ اُس وقت واقعہ یہی تھا کہ لوگ ایسے موقع پر اپنی بیوی سے دیا ہوا مال واپس کرنے کے لئے اُس پر مختلف قسم کے بہتان لگاتے، اُس پر ظلم وستم کرتے، تاکہ تنگ آ کر یہ مہر واپس کر دے، تو اللہ تعالیٰ اُسی پر ہی انکار کرتے ہیں کہ ''کیا تم اُس مال کو لو گے ازروئے بہتان کے اور صریح گناہ کے؟'' یہ بھی اُس وقت ایک واقعہ تھا جس کی تردید کی جا رہی ہے، کہ تم اُس پر بہتان لگاؤ تو یہ کتنی بُری بات ہے، اُس پر مختلف قسم کے ظلم وستم کر کے گناہ کا ارتکاب کرو تو کتنی بُری بات ہے، اس طرح سے مال واپس لینے کی کوشش نہ کیا کرو۔ وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ: تم اس دیے ہوئے مال کو کیسے واپس لے سکتے ہو، جبکہ تمہارا بعض بعض کی طرف بے حجاب ہو چکا، وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا: اور وہ عورتیں تم سے میثاقِ غلیظ لے چکیں۔ میثاقِ غلیظ یعنی پختہ عہد، اس سے مراد نکاح ہے، نکاح زوجین کے درمیان میں ایک پختہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ کی شہادت کے تحت قائم ہوتا ہے، اور اُس میں ایک دوسرے کے حقوق لازم ہوتے ہیں، تو یہ عقد بھی ہو گیا، نکاح بھی ہو گیا، پختہ عہد بھی ہو گیا، اور پھر جو نکاح سے مقصود ہے یعنی ایک دوسرے سے استمتاع وہ بھی ہو گیا، تو جس وقت خاوند نے بیوی سے فائدہ اٹھا لیا، ایک دوسرے کے سامنے بے حجاب ہو گئے، تو وہ مال عورت کا حق بن گیا، اب اُس دیئے ہوئے مال کو تم کس طرح سے واپس لے سکتے ہو۔ اور اگر یہ اِفضاء والی صورت نہ پائی جائے، ایک دوسرے تک پہنچنے کی صورت نہ ہو، یعنی نہ خلوتِ صحیحہ ہوئی ہے نہ مجامعت کا موقع ملا ہے، تو ایسی صورت میں قرآنِ کریم میں ہی دوسری جگہ مذکور ہے، سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے وہ آیت گزر چکی کہ آدھا مہر واپس لیا جا سکتا ہے قانونی حیثیت سے، لیکن اگر اِفضاء کی نوبت آ گئی اور ایک دوسرے تک پہنچ گئے تو پھر پورے کا پورا مہر دینا خاوند کے ذمے ہے اور اُس میں سے کچھ واپس نہیں لیا جا سکتا۔

باپ کی منکوحہ اور موطوءۃ سے نکاح کی حرمت

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ: پہلے تو اُن معاملات کی اصلاح کی گئی تھی جو زوجین کے آپس میں نکاح ہونے کے بعد پیش آتے ہیں، اور اب محرمات کی تفصیل کی جارہی ہے، کہ کن عورتوں سے نکاح کرنا ٹھیک ہے اور کن سے ٹھیک نہیں ہے، اور اس کے متعلق بھی جاہلیت میں بڑی گڑبڑتھی، جیسے پہلے اشارہ آپ کے سامنے گزرا کہ اپنے باپ کی منکوحہ کے ساتھ بھی سوتیلی اولاد نکاح کرلیا کرتی تھی، سوتیلی اولاد کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کی حقیقی والدہ نہ ہوتی، باپ کی منکوحہ ہوتی، اُس کو بھی نکاح میں لے لیتے تھے، اور اِسی طرح دو حقیقی بہنوں کے ساتھ بھی نکاح کر لیتے تھے، ایسی بعض محرمات اُن لوگوں نے حلال کر رکھی تھیں تو یہاں اُس کی تفصیل کرنا مقصود ہے۔ ''نکاح نہ کیا کرو اُن عورتوں کے ساتھ (مِنَ النِّسَآءِ یہ مَا کا بیان ہے) جن کے ساتھ نکاح کیا تمہارے آباء نے'' آباء کے اندر باپ بھی داخل ہے، دادا بھی داخل ہے اور نانا بھی، یہاں اُصول مراد ہیں، اگر شرعی طور پر نکاح ہوگیا یعنی ایجاب وقبول ہوگیا، اگرچہ رُخصتی کی نوبت نہ آئی تو بھی وہ اولاد کے لئے حرام ہے، یعنی باپ کا کسی عورت کے ساتھ صرف شرعی عقد ہوا ہے، رُخصتی کی نوبت نہیں آئی، عقد ہوتے ہی اولاد کے لئے وہ ماں کے قائم مقام ہوگئی اور اُس کے ساتھ نکاح کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور اَحناف ﷭ کے نزدیک خصوصیت سے، باقی اَئمہ کے نزدیک نہیں، باپ اگر کسی عورت کے ساتھ لغوی نکاح کرلے، لغوی نکاح سے مراد ہے وطی، یعنی باپ نے کسی عورت کے ساتھ وطی کرلی، عام اِس سے کہ جائز طریقے سے ہے یا ناجائز طریقے سے، جائز طریقے سے ہو تو پھر تو منکوحہ بن گئی جس کا ذکر پہلے ہوگیا، اور اگر ناجائز طریقے سے بھی ہو جس کو زِنا کہا جاتا ہے تو مزنیۂ اَب بھی اولاد کے لئے حرام ہوتی ہے، حرمتِ مصاہرت کی بناء پر وہ بھی اولاد کے لئے جائز نہیں ہے، مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ میں یہ تعمیم ہے، گویا کہ باپ کی منکوحہ ہو تو بھی جائز نہیں، اور باپ کی موطوءۃ ہو تو بھی جائز نہیں، موطوءۃ جائز طریقے سے ہو یا ناجائز طریقے سے ہو، جیسے بھی ہو، اولاد کے لئے وہ عورت حرام ہوجائے گی جس کے ساتھ اُس کے اصول نے اِس قسم کا معاملہ کیا ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: مگر جو ہو چکا سو ہو چکا، یعنی اُس پر گرفت نہیں ہے، وہ اللہ کی طرف سے معاف ہے جو جاہلیت کے زمانے میں کر گزرے، پچھلے معاملات پر گرفت نہیں، اب اِس آیت کے اتر آنے کے بعد تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم اپنی منکوحۂ اَب کے ساتھ نکاح کرو، اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً: اپنی منکوحۂ اَب کے ساتھ نکاح کرنا بے حیائی کی بات ہے، وَمَقْتًا: اور نفرت کی بات ہے، وَسَآءَ سَبِيْلًا: اور بہت بُرا طریقہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَخٰلٰتُكُمْ	وَعَمّٰتُكُمْ	وَاَخَوٰتُكُمْ	وَبَنٰتُكُمْ	اُمَّهٰتُكُمْ	عَلَيْكُمْ	حُرِّمَتْ
اور تمہاری خالائیں	اور تمہاری پھوپھیاں	اور تمہاری بہنیں	اور تمہاری بیٹیاں	تمہاری مائیں	تم پر	حرام کردی گئیں

وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ

اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور اس دودھ پینے کی وجہ سے جو

الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ

تمہاری بہنیں ہیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری وہ پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں ان بیویوں کی طرف سے

الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ٘

جن کے ساتھ تم نے دخول کرلیا ہے، اور اگر تم نے ان عورتوں کے ساتھ دخول نہیں کیا تو پھر تم پر کوئی حرج نہیں ہے،

وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ

اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو بیٹے تمہاری پشتوں سے ہیں، اور (حرام کیا گیا) یہ کہ تم دو بہنوں

الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۲۳﴾

کو جمع کرو مگر جو ہو چکا سو ہو چکا، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۲۳﴾

تفسیر

محرماتِ نسبیہ

حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ: حرام کردی گئیں تم پر تمہاری مائیں، یعنی اِن کا نکاح حرام کردیا گیا، اُمہات سے بھی وہ عورتیں مراد ہیں جو اُصول میں شامل ہیں، جس میں ماں بھی آگئی، نانی بھی آگئی، دادی بھی آگئی، اُصول میں جو عورتیں آتی ہیں وہ ساری کی ساری یہاں مراد ہیں، وَبَنٰتُكُمْ: اور تمہاری بیٹیاں، بیٹیوں سے فروع مراد ہیں، اپنی بیٹی ہو، یا بیٹے کی بیٹی ہو جس کو ہم پوتی کہتے ہیں، یا بیٹی کی بیٹی ہو جس کو ہم نواسی کہتے ہیں، نیچے کی طرف جتنا چلتے چلے جائیں گے، جو آپ کے فروع میں آگئیں وہ بھی حرام ہیں، وَاَخَوٰتُكُمْ: اور حرام کردی گئیں تم پر تمہاری بہنیں، بہنوں کے اندر بھی تعمیم ہے، خواہ حقیقی بہن ہو جو ماں باپ دونوں میں آپ کے ساتھ شریک ہے، یا علاتی بہن ہو جو صرف باپ میں شریک ہے، یا اخیافی بہن ہو جو صرف ماں میں شریک ہے، اِن سب بہنوں کے ساتھ نکاح حرام ہے، وَعَمّٰتُكُمْ: اور حرام کردی گئیں تم پر تمہاری پھوپھیاں، عمّہ کہتے ہیں پھوپھی کو یعنی باپ کی بہن، اِس میں بھی اسی طرح سے تعمیم ہے کہ باپ کی حقیقی بہن ہو، یا باپ کی باپ شریک بہن ہو، یا باپ کی ماں شریک بہن ہو، یعنی حقیقی پھوپھی، علاتی پھوپھی اور اخیافی پھوپھی سب اس میں شامل ہیں، وَخٰلٰتُكُمْ: اور تمہاری خالات، خالات خالہ کی جمع ہے جس کو آپ پنجابی میں ماسی کہتے ہیں، ماسیاں بھی تم پر حرام کردی گئیں، یہاں بھی وہی تعمیم ہے کہ تمہاری ماں کی حقیقی بہن ہو، یا علاتی بہن ہو، یا اخیافی بہن ہو، یہ

سب حرام ہیں۔ وَبَنٰتُ الْاَخِ: اور بھتیجی، یعنی بھائی کی بیٹی بھی حرام کردی گئی، اِس میں بھی تعمیم ہے کہ آپ کا بھائی حقیقی ہے تو بھی اُس کی بیٹی حرام، آپ کا بھائی علاتی ہے تو بھی اُس کی بیٹی حرام، اور آپ کا بھائی اخیافی ہے تو بھی اُس کی بیٹی حرام، اور پھر بیٹی بھی حرام، پوتی اورنواسی بھی حرام۔ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ: اور بہن کی بیٹیاں تم پر حرام کردی گئیں، بہن میں بھی یہاں وہی تعمیم ہے کہ آپ کی حقیقی بہن کی بیٹی ہو، علاتی بہن کی بیٹی ہو، یا اخیافی بہن کی بیٹی ہو، یہ سب حرام ہیں، اور بیٹی سے فرع مراد ہے، خواہ بیٹی ہو، پوتی ہو، یا نواسی ہو۔ یہ ہیں محرماتِ نسبیہ جن کے ساتھ نسبی تعلق کی بناء پر حرمت آگئی۔

محرماتِ رضاعیہ

آگے محرماتِ رضاعیہ کا ذِکر آ گیا یعنی دُودھ پلانے کی بناء پر جن کی حرمت آتی ہے، جس کو ہم حرمتِ رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں، وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ: اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دُودھ پلایا، خواہ تھوڑا پلایا ہو یا زیادہ پلایا ہو، بشرطیکہ دُودھ پینے کی مدت میں پلایا ہو، جو مفتیٰ بہ قول کے مطابق دوسال ہے، حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول اڑھائی سال ہے، لیکن فقہِ حنفی میں بھی فتویٰ دوسال پر ہے، تو بچہ دوسال کا ہونے کے اندر اندر اگر وہ کسی عورت کا دُودھ پی لے تو رضاعت کا رشتہ قائم ہوگا، اور اگر بڑی عمر میں کسی عورت کا دُودھ پی لیا جائے تو ایسی صورت میں رضاعت نہیں آیا کرتی۔ پھر دُودھ تھوڑا پلایا ہو یا زیادہ پلایا ہو، جن عورتوں نے تمہیں دُودھ پلایا ہے وہ تمہاری مائیں بن گئیں اور وہ بھی تم پر حرام۔ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ: اور اِس دُودھ پینے کی وجہ سے جو تمہاری بہنیں ہیں وہ بھی حرام، جس کو ہم ''رضاعی بہن'' سے تعبیر کرتے ہیں، اِس کی دوصورتیں ہوتی ہیں، کسی لڑکی کی حقیقی ماں کا آپ نے دُودھ پی لیا تو بھی وہ آپ کی رضاعی بہن بن گئی، یا کسی لڑکی نے اور آپ نے مل کر کسی تیسری عورت کا دُودھ پی لیا، یعنی وہ اُس کی بھی نسبی ماں نہیں ہے اور آپ کی بھی نسبی ماں نہیں ہے، تو وہ بھی رضاعی بہن بن گئی، آپ کی ماں کا کوئی لڑکی دُودھ پی لے وہ بھی آپ کی رضاعی بہن ہے، یا آپ کسی لڑکی کی ماں کا دُودھ پی لیں وہ بھی آپ کی رضاعی بہن ہے، یا لڑکا اور لڑکی دونوں مل کر کسی تیسری عورت کا دُودھ پی لیں وہ بھی آپس میں رضاعی بہن بھائی ہوگئے۔ یہاں ذکر اگرچہ صرف ماؤں کا اور بہنوں کا ہے لیکن بالاجماع روایاتِ صحیحہ کے مطابق اِس میں تعمیم ہے، کہ جتنے رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوا کرتے ہیں اتنے رشتے ہی رضاعت کی وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں: ''يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ''(۱) نسب کی وجہ سے جتنے رشتے حرام ہیں اتنے رشتے ہی رضاعت کی وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس عورت کا آپ نے دُودھ پیا وہ آپ کی ماں بن گئی، اور جو اُس کا شوہر ہے وہ باپ بن گیا، اس لئے اگر لڑکی دُودھ پینے والی ہو تو اُس عورت کا شوہر بھی اُس سے شادی نہیں کرسکتا، اور اس عورت کی بہنیں آپ کی خالائیں بن گئیں، اور اُس شوہر کی بہنیں آپ کی پھوپھیاں بن گئیں، اور اس شوہر کے بھائی آپ کے لئے چچے ہوگئے، اور جتنی اس کی آگے اولاد ہوگی وہ سارے کے سارے بہن بھائی بھتیجے بھانجے جس طرح نسبی طور پر سلسلہ چلتا ہے تو وہاں بھی اِسی طرح سلسلہ چلے گا، اور نسب کی وجہ سے جتنے رشتے حرام ہوا کرتے ہیں اتنے رشتے ہی رضاعت کی وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں، اور یہ تعمیم اجماعی ہے اور روایاتِ صحیحہ میں اس کا ذکر آیا ہوا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۴۶۷ کتاب الرضاع / نیز بخاری ۱/ ۳۶۰ باب الشهادة على الانساب ولفظه: يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب۔

حرمتِ مصاہرت کا ذکر

وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ: اس میں حرمتِ مصاہرت کا ذکر آ گیا، یعنی عقد نکاح کی بناء پر جن کے ساتھ حرمت آتی ہے، ''تمہاری بیویوں کی مائیں'' یعنی جس لڑکی کے ساتھ آپ کا نکاح ہو گیا اُس کی جو ماں ہے جس کو ہم ساس کہتے ہیں تو وہ بھی حرام ہے، نکاح ہوتے ہی ساس حرام ہو جاتی ہے، پھر اُس کے بعد نکاح نہیں ہو سکتا، یعنی چاہے اپنی بیوی کے ساتھ تم نے خلوت کی ہے یا نہیں کی، اُس کی ماں بہر حال آپ کی ماں کے حکم میں آ گئی، اور اُس کے ساتھ اب نکاح نہیں ہو سکے گا، وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ: ربائب ربیبہ کی جمع ہے، بمعنی پالی ہوئی، لیکن یہاں سے مراد ہوتی ہیں پچھلگ بچیاں، کہ ایک عورت ہے، اس کی اولاد ہے، وہ کہیں سے بیوہ ہو گئی یا مطلقہ ہو گئی، آپ نے اُس عورت کے ساتھ نکاح کر لیا اور وہ اپنی اولاد کو ساتھ لے آئی، تو یہ لڑکیاں جو اپنی ماں کے ساتھ آئی ہیں وہ بھی آپ کے لئے حرام ہیں، لیکن یہاں حرمت کی ایک قید ہے کہ بشرطیکہ تم اپنی اُن بیویوں سے مجامعت کر لو تب اُن کی اولاد آپ پر حرام ہو گی، یعنی بیوی کی ماں تو بہر صورت حرام ہو گئی نکاح ہوتے ہی، چاہے بیوی کے ساتھ آپ کو ملنے کا موقع ملا چاہے نہیں ملا، لیکن بیوی کی بیٹی جو دوسرے خاوند سے ہو وہ حرام تب ہو گی جبکہ آپ بیوی کے ساتھ زوجیت والا تعلق قائم کر لیں گے، اگر زوجیت والا تعلق ابھی قائم نہیں ہوا تو ایسی صورت میں اُس بیوی کی بیٹی آپ پر حلال ہے، اور الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ والی قید اتفاقی ہے، وہ تمہاری پالی ہوئی بچیاں جو تمہاری گود میں ہیں، گود میں ہوں یا نہ ہوں حکم ایک ہے، یعنی پہلے خاوند کے پاس ہی اگر اولاد رہ گئی تو بھی اُن کا یہی حکم ہے کہ جس وقت آپ نے اپنی بیویوں کے ساتھ مجامعت کر لی تو اُن کی اولاد چاہے وہ آپ کی پرورش میں ہے اور چاہے آپ کی پرورش میں نہیں، اپنے پہلے باپ کے پاس ہیں یا کسی دوسری جگہ ہیں، وہ آپ کے لئے حرام ہو جائیں گی۔ یہی قید آگے لگائی گئی ہے، ''تمہاری وہ پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں اُن بیویوں کی طرف سے جن کے ساتھ تم نے دُخول کر لیا ہے، اور اگر تم نے اُن عورتوں کے ساتھ دُخول نہیں کیا'' فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ: تو پھر اُن بچیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے، تو گویا کہ مدخولہ بیوی کی لڑکی حرام ہوتی ہے، غیر مدخولہ کی حرام نہیں ہوتی، اور بیوی کی ماں بہر صورت حرام ہے چاہے اُس کے ساتھ دُخول ہوا ہو چاہے نہ ہوا ہو۔

حقیقی بیٹے کی بیوی اور متبنّٰی کی بیوی کا حکم

وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ: اَصلاب صُلب کی جمع، حلائل حلیلہ کی جمع، حلیلہ سے بیوی مراد ہے، ''تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو بیٹے تمہاری پشت سے ہیں'' یعنی تمہارے نسبی بیٹے، ان کی جو بیوی ہے وہ بھی تمہارے لئے حرام ہے، جس کو ہمارے ہاں نہوں کہتے ہیں لیکن بہو، تو اپنے لڑکے کی بیوی بھی اپنے سسر پر حرام ہے، یعنی اپنے خاوند کا باپ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اپنا باپ، اِن کا بھی آپس میں رشتہ نہیں ہو سکتا۔ مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید جو لگائی ہے یہ متبنّٰی کو نکالنے کے لئے ہے، کہ اگر کوئی منہ بولا بیٹا رکھا ہوا ہے، حقیقی بیٹا نہیں ہے، ویسے ہی بیٹا بنا کر اُس کو رکھ لیا، جاہلیت میں ایسے بیٹے کی بیوی کو بھی حرام قرار دیتے تھے، اور یہ مسئلہ غلط ہے، متبنّٰی کی بیوی حرام نہیں ہے، وہ غیر محرم ہے، اگر وہ متبنّٰی طلاق دے دے یا وہ فوت ہو جائے تو اُس کی بیوی کے

ساتھ نکاح ہوسکتا ہے، جیسے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے زید بن حارثہ جو آپ کے متبنّیٰ تھے، اُن کی بیوی حضرت زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح کیا جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اُن کو طلاق دے دی تھی، اِس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے سورۂ احزاب میں آئے گا۔ تو مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید لگا کر متبنّیٰ کو نکالنا مقصود ہے، رَضاعی بیٹے کو نکالنا مقصود نہیں ہے، رضاعی بیٹے کی بیوی بروئے حدیث اور باجماعِ اُمت حرام ہے، یعنی آپ کی بیوی نے کسی بچّے کو دُودھ پلایا، وہ آپ کا رضاعی بیٹا بن گیا، اگرچہ وہ آپ کا نسلی بیٹا نہیں ہے، آپ کی صلب سے نہیں ہے، آپ کا رضاعی بیٹا ہے، لیکن اُس کی بیوی بھی آپ کے لئے حرام ہے، جس طرح سے رضاعت کے مسئلے کی تفصیل کے تحت آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا۔ اس لیے یہاں مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید سے رضاعی بیٹوں کو نکال دینا مقصود نہیں، کیونکہ اُن کی بیویاں حرام ہیں از روئے حدیث اور از روئے اجماعِ اُمت، یہاں متبنّیٰ کو مقصود ہے، متبنّیٰ کی بیوی نصِ قرآنی کے تحت جائز ہے، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ احزاب میں آئے گی۔

کن عورتوں کو بیک وقت میں جمع نہیں کیا جاسکتا؟

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ: اور یہ بھی حرام کردیا گیا تم پر کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: مگر جو ہو چکا سو ہو چکا، یعنی پہلے جو کچھ ہوگیا اب اس پر گرفت نہیں ہے۔ تو بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، اور یہاں بھی اِسی طرح سے حدیث شریف کی طرف دیکھتے ہوئے تعمیم ہے اور وہ تعمیم اجماعی ہے، کہ ہر وہ دو عورتیں جن میں سے اگر ایک کو مرد فرض کرلیا جائے تو دوسری کے ساتھ نکاح نہ ہوسکے اِن دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، یہ بھی دو بہنوں کے حکم میں ہیں، مثلاً بیوی اور اُس کی خالہ، بیوی اور اُس کی پھوپھی، بیوی اور اُس کی بھتیجی، بیوی اور اُس کی بھانجی، جن میں سے اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری کے ساتھ نکاح نہ ہوسکے، جن کا آپس میں اِس قسم کا رشتہ ہو تو ایسی دو عورتوں کو نکاح میں جمع نہیں کیا جاسکتا، یہ بھی حرام ہے، یہ تعمیم بھی حدیث شریف کی طرف دیکھتے ہوئے اجماعی ہے۔ اور اِس سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، اُس پر گرفت نہیں ہے۔ چنانچہ سرورِ کائنات ﷺ کے پاس جس وقت لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے آیا کرتے تھے تو اگر کسی کے نکاح میں اِس قسم کی کوئی عورت ہوتی جن کو یہاں حرام ٹھہرایا گیا ہے، یا بیک وقت نکاح میں دو بہنیں ہوتی تو آپ ان کی علیحدگی کروادیا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اِن میں سے ایک کو رکھو اور ایک کو چھوڑ دو، حتیٰ کہ اگر ایک بہن آپ کے نکاح میں ہے اور آپ نے اُس کو طلاق دے دی تو اُس کی عدت کے اندر بھی اس کی دُوسری بہن سے نکاح نہیں ہوسکتا، البتہ عدت ختم ہونے کے بعد نکاح کیا جاسکتا ہے، کیونکہ عدت کے اندر بھی نکاح کے کچھ نہ کچھ اَحکام باقی ہوتے ہیں، تو اگر دوسری بہن سے نکاح کرلیا جائے تو من وجہٖ اِجتماع لازم آتا ہے۔ لیکن یہ حرمت عارضی ہے، یعنی بیوی کی زندگی میں آپ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح نہیں کیا جاسکتا، اگر بیوی مرجائے یا اُس کو طلاق دے دی جائے تو دوسرے وقت میں اس سالی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے، اس لئے سالی غیر محرم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا کا مطلب یہ ہوا کہ جو پہلے ہو چکا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہے، اس پر کوئی گرفت نہیں، اور اِس آیت کے اترنے کے بعد پھر یہ صورت درست نہیں ہے کہ بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرلیا جائے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ

اور حرام کر دی گئیں تم پر وہ عورتیں جو کسی دوسرے کی بیویاں ہیں مگر جو تمہاری باندیاں بن جائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم لکھا

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ

ہوا ہے تم پر، اور حلال کر دی گئیں تمہارے لیے ان کے علاوہ باقی عورتیں، یہ کہ طلب کر لیا کرو تم اپنے مالوں کے ساتھ

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ

اس حال میں کہ تم ان کو قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے، پھر تم ان میں سے جس عورت کے ساتھ استمتاع کر لو

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ

تو ان کو ان کے اُجور دے دیا کرو اس حال میں کہ وہ متعین کیے ہوئے ہیں، اور کوئی گناہ نہیں تم پر اُس چیز میں جس کے ساتھ تم

بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ

آپس میں راضی ہو جاؤ فریضہ کے بعد، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۲۴﴾ اور جو شخص

لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا

تم میں سے طاقت نہ رکھے اس بات کی کہ نکاح کرے وہ مؤمن آزاد عورتوں سے تو وہ حاصل کر لیا کرے ان عورتوں میں سے

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ

جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ یعنی تمہاری وہ باندیاں جو ایمان والی ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے ایمان کو

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ

تم سب ایک دوسرے کے برابر ہو، پس نکاح کر لیا کرو ان کے ساتھ ان کے مالکوں کی اجازت سے اور اچھے طریقے کے ساتھ ان کو

اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ

ان کے مہر ادا کر دیا کرو اس حال میں کہ وہ عورتیں قیدِ نکاح میں لائی جائیں نہ کہ مستی نکالنے والی ہوں اور نہ وہ بنانے والی ہوں

اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ

خفیہ دوست، پھر جس وقت یہ باندیاں قیدِ نکاح میں لے لی جائیں پھر اگر یہ زنا کا ارتکاب کر لیں تو ان پر

نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ

نصف ہے اس عذاب کا جو آزاد عورتوں پر ہے، یہ اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے اُوپر مشقت کا اندیشہ رکھتا ہے

الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

تم میں سے، اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لیے، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۲۵﴾

تفسیر

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ: اور ایسے ہی حرام کردی گئیں تم پر وہ عورتیں جو شادی شدہ ہیں، اَحْصَنَ اِحْصَان عفیف ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی پاکدامن ہونا، اور نکاح کرنے کے معنی بھی آتا ہے، یہاں نکاح کرنے والا معنی مراد ہے، محصنات: جن کا نکاح ہو یا ہوا ہے، ''جو کسی دوسرے کی بیویاں ہیں وہ بھی تم پر حرام ہیں'' یعنی ایک عورت جب کسی کے نکاح میں موجود ہو تو دوسرا آدمی اس کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتا۔ یہ حرمت بھی عارضی ہے، جب اُدھر سے نکاح ختم ہوجائے گا تو پھر اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے، یعنی منکوحہ عورت دوسرے مرد کے لئے حرام ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ عورت میں کسی صورت میں بھی شریعت کو اِشتراک گوارا نہیں ہے۔

باندیوں سے نکاح اور وطی کے اَحکام

ہاں البتہ محصنات کے اندر ایک استثناء ہے اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: مگر جو تمہاری باندیاں بن جائیں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ دارالحرب میں ایک عورت شادی شدہ ہے، اور جہاد ہوا، جہاد کے دوران وہ پکڑی گئی، اور اُس کا خاوند دارالحرب میں رہ گیا، اور وہ عورت باندی بن کر مسلمانوں کے ہاں آگئی، ایسی صورت میں اس کا پچھلا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، جس مجاہد کے حصے میں وہ باندی بن کر آجائے، تو ''استبراء'' کے بعد یعنی ایک حیض گزرنے کے بعد (''استبراء'' ایک حیض کے ساتھ ہوتا ہے) پھر اُس کے ساتھ وہی تعلق قائم کیا جاسکتا ہے جو دُوسری باندیوں سے ہوتا ہے۔ اور اگر دارالاسلام میں کوئی باندی ہے اور وہ منکوحہ ہے یعنی پہلے آقا نے اُس باندی کا کسی دوسرے سے نکاح کیا ہوا ہے، اور پھر آپ نے اُس کو خرید لیا اور وہ آپ کی باندی بن گئی تو وہ آپ پر ویسے ہی حرام رہے گی جیسے پہلے حرام تھی، یعنی باندی کے اندر بھی اِشتراک درست نہیں ہے، اس حلت کی یہ صورت متعین ہے کہ اُن کے شوہر دارالحرب میں رہ گئے، اور وہ عورتیں پکڑی ہوئیں دارالاسلام میں آگئیں، تو باندی بننے کی صورت میں اِن کا پچھلا نکاح ختم ہوجائے گا، چاہے اُن کے خاوند زندہ ہیں، چاہے اُنہوں نے طلاق نہیں دی، لیکن اُن کا باندی بن جانا پہلے نکاح کو ختم کرنے کا ذریعہ ہے، ایسی صورت میں وہ تمہارے لئے حلال ہوجائیں گی، بشرطیکہ وہ باندیاں اسلام قبول کرلیں یا وہ اہل کتاب میں سے ہوں، اور اگر وہ باندی مشرکہ ہے تو جب تک وہ مسلمان نہیں ہوگی اس وقت وہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے، جس طرح منکوحہ ہونے کے لئے

ضروری ہے کہ وہ عورت مسلمان ہو یا اہلِ کتاب میں سے ہو اسی طرح باندی بھی وہی حلال ہوا کرتی ہے جو مسلمان ہو جائے یا اہلِ کتاب میں سے ہو، اور اگر وہ مشرکہ ہو تو پھر حلال نہیں ہے۔ تو پہلے خاوند اُن کے خاوند نہیں سمجھے جائیں گے اور یہ نکاح اُن کا ٹوٹ جائے گا، اس لئے وہ خاوند اگر مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آ جائے تو بھی وہ اس عورت پر حق نہیں رکھے گا۔ ہاں البتہ اگر یہ عورت حاملہ ہو تو اِس کا حمل ثابت النسب ہے، اور یہ بچہ اُسی کی طرف منسوب ہوگا جو اُس کا پہلا شوہر ہے، اور جس وقت تک وہ حمل کو وضع نہیں کر دے گی اُس وقت تک اُس کے ساتھ خاوند بیوی والا تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا، یہ تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: یہ اللہ تعالیٰ کا حکم لکھا ہوا ہے تم پر۔

حلال عورتوں ذِکر اور نکاح کا اسلامی طریقہ

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ: یہ جتنی عورتیں ذکر کی گئی ہیں، جو صراحتاً الفاظ میں مذکور ہو گئیں یا احادیث کی روشنی میں جو تعمیم کر دی گئی، جس طرح سے میں آپ کی خدمت میں تفصیل عرض کیے آرہا ہوں، تو ان کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، ''حلال کر دی گئیں تمہارے لئے ان کے علاوہ باقی عورتیں''، اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ: حلال کر دیا گیا کہ تم ان کو طلب کر لیا کرو اپنے مالوں کے ساتھ، ابتغاء بالمال: مال سے یہاں مہر مراد ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ کوئی نکاح مال سے خالی نہیں ہونا چاہیے، نکاح کے اندر مال لازماً آتا ہے، چاہے عقد کرتے وقت مہر کا ذکر ہو چاہے نہ ہو، تقدیراً مال یقیناً ثابت ہوتا ہے۔ دوسری بات اس لفظ سے یہ ثابت ہوئی کہ مہر وہی چیز ہوتی ہے جو مال بن سکے، جو مال کہلائے، جو مال کا مصداق ہو، اور جو چیز مال نہیں وہ مہر نہیں بن سکتی، اس لئے ہمارے ہاں تعلیم قرآن وغیرہ کو مہر نہیں متعین کیا جا سکتا، چونکہ یہ مال کا مصداق نہیں ہے۔ ''یہ کہ طلب کر لیا کرو تم اپنے مالوں کے ساتھ''، اَنْ تَبْتَغُوْا یہ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ سے بدل اشتمال ہے، ''اِن کے علاوہ عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں یعنی اُن کا طلب کرنا حلال کر دیا گیا اپنے مالوں کے ذریعے سے'' مال خرچ کر کے ان کو طلب کر لیا کرو، اور اس میں یہ قید ہوگی کہ چار سے زائد نہ ہوں، اور یہ دوسری آیت سے ثابت ہے جو آپ کے سامنے پہلے ذکر ہو چکی، یعنی جتنی بھی اِن کے علاوہ ہیں سب عورتیں حلال ہیں، لیکن بیک وقت نکاح چار سے کر سکتے ہو، چار سے زائد سے نہیں۔

نکاح کا اصل مقصد

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: طلب کر لیا کرو اِن کو اس حال میں کہ تم ان کو قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے ہو۔ مُسٰفِحِيْنَ کا لفظ سَفْح سے لیا گیا ہے، سَفْح گرانے کو کہتے ہیں، سَفْحُ الْمَاءِ: پانی گرانا۔ یعنی وقتی طور پر شہوت رانی کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ عفت طلب کرنا مقصود ہو اور اُن کو قیدِ نکاح میں رکھنا مقصود ہو، اس لئے نکاح شرعی طور پر وہی معتبر ہے کہ کرتے وقت انسان اسی جذبے کے تحت ہی کرے کہ میں نے اِس کے ساتھ زندگی بھر نبھانا ہے، اگر صراحتاً وقت متعین کر دیا جائے کہ ایک مہینے کے لئے کیا جا رہا ہے یا پندرہ دن کے لئے کیا جا رہا ہے تو یہ نکاح باطل ہے، اور اگر دل کے اندر ارادہ یہ ہے تو اس میں کراہت ہے، اگرچہ فقہی طور پر نکاح ہو جائے گا، مثلاً دل میں ارادہ یہ ہے کہ میں نکاح کر رہا ہوں اور دس دن کے بعد میں نے چھوڑ دینا

ہے، لیکن یہ ذکر میں نہیں آیا، تو بھی یہ بُری بات ہے اگرچہ نکاح فقہی طور پر ہو جائے گا۔ نکاح کی اصل حکمت یہی ہے کہ جس کے ساتھ تعلق کرو زندگی بھر نبھانے کی نیت سے کرو، اور عفت حاصل کرنا مقصود ہو، پاکدامنی حاصل کرنا مقصود ہو، اور عورت کو نکاح میں رکھنا مقصود ہو، صرف وقتی طور پر پانی گرانا مقصود نہ ہو، شہوت رانی مقصود نہ ہو، اب اگر شہوت زور مارے اور انسان خیال کرے کہ چلو وقت گزرتا ہے، جیسے متعہ میں ہوتا ہے، کہ وقتی طور پر تعلق قائم کر لیا جاتا ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے پیشاب نے زور مارا اور کسی پیشاب خانے میں چلے گئے اور مثانہ ہلکا کر آئے، اس قسم کی بے حیائی کی حرکتیں شریعت میں جائز نہیں ہیں، کہ جس میں وقتی طور پر ہی اپنا بوجھ اُتارنا مقصود ہے اور اُس عورت کو قیدِ نکاح میں رکھنا مقصود نہیں ہے۔ یہ قید اس لئے لگا دی کہ عفت کے تقاضے کے مطابق یہ قید ضروری ہے، وقتی مستی نکالنی مقصود نہیں ہے، غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: اس حال میں کہ تم شہوت رانی کرنے والے نہیں، وقتی طور پر پانی گرانے والے نہیں، یہ مفہوم ہے اِس کا، قیدِ نکاح میں رکھنے والے ہو نہ کہ وقتی طور پر مستی کرنے والے ہو۔

سوال:- اگر عورت چند دِنوں کی شرط لگا دے تو؟

جواب:- عورت کی طرف سے ہو تو بھی ایسے ہے، مرد جب قبول کرے گا تو گویا کہ وقتی طور پر اس کو قبول کر رہا ہے تو وہ اسی حکم میں ہے۔

ادائیگی مہر سے متعلّق اَحکام

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ: مِنْهُنَّ یہ مَا کا بیان ہے، پھر تم اِن عورتوں میں سے جس عورت کے ساتھ استمتاع کر لو، یعنی اُس سے فائدہ اُٹھا لو، فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ: تو پھر اُن کو اُن کے اُجور دے دیا کرو، اُجور اَجر کی جمع، اس کا مصداق مہر ہے، پھر اُن کے اُجور ان کو دے دیا کرو جو کہ متعین کئے جا چکے ہیں، فَرِيْضَةً: اِس حال میں کہ وہ متعین کئے ہوئے ہیں۔ اور جس سے استمتاع کا موقع نہ ملے، صرف نکاح ہوا ہو، تو وہاں پورا اجر نہیں دیا جاتا، بلکہ نصف دیا جاتا ہے، دوسری آیات کو طرف دیکھتے ہوئے مطلب واضح ہے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ: کوئی گناہ نہیں تم پر اُس چیز میں جس کے ساتھ تم آپس میں راضی ہو جاؤ فریضہ کے بعد، مطلب یہ ہے کہ نکاح کے اندر اگر مہر متعین ہو گیا (جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ استمتاع کے بعد وہ عورت کی طرف ادا کر دینا چاہیے) لیکن یہ تعیین ایسی نہیں کہ جس میں تغیر تبدل نہ ہو سکے، بلکہ نکاح کے بعد زوجین اپنی رضامندی کے ساتھ اُس میں تغیر تبدل بھی کر سکتے ہیں، مثلاً عورت اُس کا کچھ حصہ معاف کر دے، یا مرد کی طرف سے اُس میں اضافہ ہو جائے، یعنی مہر متعین تو پانچ سو ہوا تھا، لیکن مرد خوشی کے ساتھ ایک ہزار دے دے، یا مہر متعین تو پانچ سو ہوا تھا اور عورت اُس کو معاف ہی کر دے یا خوشی کے ساتھ آدھا چھوڑ دے، اس قسم کا تغیر تبدل تراضی طرفین یعنی زوجین کی رضامندی کے ساتھ ہو سکتا ہے، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے، ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت کو جو ذکر فرماتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو اَحکام تمہیں دیئے جا رہے ہیں یہ اللہ کے علم اور اللہ کی حکمت کے تقاضے سے ہیں، اس کے خلاف جو کام تم کرو گے، جیسے محرمات کی تفصیل بتا دی گئی یا عورتوں کے حقوق وغیرہ کا تذکرہ ہو گیا، اس کے خلاف جو کچھ کرو گے وہ سب جہالت ہو گی، اور وہ

بات حکمت اور دانشمندی کے خلاف ہوگی۔ اور اگر یہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو بھی اللہ کے علم وحکمت پر اعتماد کرو، اور اپنے علم اور اپنی حکمت کو اللہ کے علم وحکمت کے ساتھ ٹکرانے نہ دو، کیونکہ اگر تمہارا علم ٹکراتا ہے تو پھر وہ حقیقتاً علم نہیں بلکہ جہالت ہے، اللہ کا علم بھی صحیح ہے اور اللہ کی حکمت بھی صحیح ہے، اس لیے اپنے عقلی دلائل کے ساتھ اِس قسم کی چیزوں میں تغیر تبدل کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ غیر دانش مندانہ حرکت ہوگی اور جہالت ہوگی۔

باندی سے نکاح کے متعلّق اَحکام

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا: اور جو شخص تم میں سے طاقت نہ رکھے، طَول بھی طاقت کو کہتے ہیں، اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ: یہاں محصنات سے آزاد عورتیں مراد ہیں، طاقت نہ رکھے اِس بات کی کہ نکاح کرے وہ مؤمن آزاد عورتوں سے فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: تو پھر وہ لے لیا کرے، حاصل کرلیا کرے اُن عورتوں میں سے جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ، مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ: یہ مَا مَلَكَتْ کا بیان ہے، یعنی تمہاری وہ باندیاں جو ایمان والی ہیں۔ ایک شخص آزاد مؤمن عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور طبیعت میں نکاح کا تقاضا ہے، اور وہ اندیشہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں نے نکاح نہ کیا تو کسی بُرائی میں مبتلا ہوجاؤں گا، تو اِس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ پھر کسی مؤمن باندی سے نکاح کرلیا کرے۔ اب یہاں محصنات کے ساتھ جو مؤمنات کی قید لگائی ہے یہ بھی ترغیب کے لئے ہے، احترازی نہیں، اس لئے اگر آزاد عورت مؤمنات میں سے نہ ہو، اہلِ کتاب میں سے ہو، پھر بھی یہی بات ہے۔ اور فتیات کے ساتھ مؤمنات کی جو قید ہے یہ بھی ترغیب کے لئے ہے کہ کوشش کرو کہ باندی بھی ہو تو مؤمنہ ہو، ورنہ اگر مؤمنہ باندی نہ ہو، اہلِ کتاب میں سے ہو، تو بھی ٹھیک ہے۔ اور محصنات پر قدرت کے باوجود باندی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے، لیکن اگر پہلے کوئی محصنہ عورت یعنی آزاد عورت نکاح میں آچکی ہو تو اُس کے بعد پھر باندی سے نکاح نہیں ہوسکتا، پہلے باندی نکاح میں ہو تو اُس کے اوپر آزاد عورت سے نکاح ہوسکتا ہے، لیکن اگر پہلے آزاد عورت نکاح میں ہے تو ایسی صورت میں باندی کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا، حُرّہ پر اَمہ نہیں آسکتی، اَمہ پر حُرّہ آسکتی ہے۔ اور اگر آپ کو قدرت تو ہے کہ محصنہ مؤمنہ سے نکاح کرسکتے ہیں یا محصنہ اہلِ کتاب سے نکاح کرسکتے ہیں، اس کے باوجود بھی اگر آپ اس آزاد عورت سے نکاح نہ کریں اور باندی سے کرنا چاہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ تو یہ قیود احترازی نہیں ہیں، کہ اگر طاقت نہ ہو تو نکاح کرنا جائز ہے اور اگر طاقت ہو تو نکاح جائز نہیں، ایسی بات نہیں، بلکہ طاقت ہو لیکن اگر آپ نے کسی آزاد عورت سے نکاح نہیں کیا، تو بھی آپ کسی باندی سے نکاح کرسکتے ہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ: اس میں یہ بتایا جارہا ہے کہ انسان ہونے کے اعتبار سے تو آزاد اور غلام سب برابر ہیں، اور شرعی نقطۂ نظر سے اصل فضیلت ایمان کی وجہ سے ہے، اور وہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس میں ایمان کتنا ہے اور کس میں کتنا ہے، ہوسکتا ہے کہ باندی کا ایمان تم سے اچھا ہو اور اللہ کے ہاں زیادہ قبول ہو، اس لیے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نکاح کرلیا کرو، جنس بھی تمہاری ایک ہی ہے کہ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: سارے آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اور اصل شرافت ایمان ہے، وہ بھی اللہ جانتا ہے کہ کس کا ایمان کیسا ہے؟ تو بوقتِ ضرورت اس میں ہچکچانے کی کوئی بات نہیں ہے، نکاح کرسکتے ہو۔ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ: نکاح کرلیا کرو اُن کے

ساتھ اُن کے مالکوں کی اجازت سے، یہ مسئلہ فقہ کے اندر واضح کیا گیا ہے کہ باندی اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی جب تک آقا کی طرف سے اجازت نہ ہو، باندی کے ساتھ نکاح اُس کے آقا کی اجازت سے ہوسکتا ہے، جس طرح ایک آزاد عورت اپنا نکاح خود باندھ سکتی ہے اور اس طرح نکاح ہوسکتا ہے، باندی کا نکاح اس طرح نہیں ہوسکتا، بلکہ اُس کے مولیٰ کی اجازت ضروری ہے۔

نکاح میں اِعلان شرط ہے

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: اور اچھے طریقے کے ساتھ اُن کو ان کے اجر یعنی ان کے مہر ادا کر دیا کرو، یہاں بھی وہی بات ہے کہ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ: اس حال میں کہ وہ عورتیں قیدِ نکاح میں لائی جائیں نہ کہ مستی نکالنے والی ہوں، یعنی اُن کے ساتھ بھی تعلق وقتی استمتاع کے طور پر نہ ہو کہ صرف بوجھ ہلکا کیا، ایسا نہ ہو، بلکہ وہاں بھی اگر نکاح کرو تو اسی طرح کرنا ہے کہ ان کو قیدِ نکاح میں رکھنے والے ہو، وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ: اَخدان خَدَن کی جمع ہے، اور خدن خفیہ دوست کو کہتے ہیں، اور وہ نہ بنانے والی ہوں خفیہ دوست، یعنی خفیہ طور پر بھی یاری آشنائی نہ لگاؤ، اسی لیے نکاح میں اعلان شرط ہے جس میں کم از کم دو آدمیوں کا یا ایک آدمی اور دو عورتوں کا موجود ہونا ضروری ہے، اتنا اشتہار اور اتنا اعلان نکاح میں ضروری ہے، اگر کوئی شخص دو آدمیوں کی موجودگی میں نکاح کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ یہ اِتخاذِ اَخْدَانٍ نہیں ہے، اور اگر وہاں گواہ موجود ہی نہیں، یعنی دو گواہ موجود نہیں ہیں یا ایک مرد اور دو عورتیں موجود نہیں ہیں، تو پھر چاہے آپس میں نکاح کا لفظ بولا گیا اور ایجاب وقبول ہوا ہے، لیکن یہ نکاح شرعی طور پر نکاح نہیں، بلکہ یہ خفیہ آشنائی ہے جس کو شریعت حرام ٹھہراتی ہے۔ اس لیے اِس کا اعلان اور اظہار ضروری ہے، جس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ وہاں ایجاب وقبول کے وقت میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں موجود ہوں، اگر اتنا بھی اعلان نہیں ہوا تو ایسی صورت میں وہ خفیہ آشنائی کہلائے گی۔ ''خفیہ آشنائی لگانے والی نہ ہوں، خفیہ یار اختیار کرنے والی نہ ہوں۔''

باندی کے لئے حدِ زِنا

فَاِذَآ اُحْصِنَّ: پھر جس وقت یہ باندیاں قیدِ نکاح میں لے لی جائیں، یہ منکوحہ بن گئیں، فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ: پھر اگر یہ زِنا کا ارتکاب کریں فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ: تو پھر آزاد عورتوں کو جتنی سزا ہے اِن باندیوں کو اُس سے نصف ہوگی، کیونکہ باندیوں میں اُتنا تحفظ نہیں ہوتا جتنا آزاد عورتوں میں ہوتا ہے، کہ انہوں نے اپنے مولیٰ اور آقا کی خدمت کے لئے باہر چلنا پھرنا بھی ہوتا ہے، تو اس میں چونکہ اُتنا تحفظ نہیں جس کی بناء پر اِن کی سزا بھی تھوڑی رکھی گئی ہے، اور جب نصف کا ذکر آ گیا تو معلوم ہوگیا کہ ان کے اوپر رَجم بالکل نہیں ہے، کیونکہ رجم کی تنصیف نہیں ہوسکتی، رجم کا تو مطلب یہ ہے کہ ان کو اتنا مارو کہ جان نکل جائے، اب اِس کو آدھا کس طرح کریں کہ آدھی جان نکلے اور آدھی رہ جائے، اس لئے باندیوں پر رجم نہیں آیا کرتا، باندیوں کی سزا صرف دُرّے لگانا ہے، نصف کے لفظ سے یہ بات نکل آئے گی، کیونکہ رجم کی تنصیف نہیں ہوسکتی۔ مِنَ الْعَذَابِ یہ مَا کا بیان ہے۔ ''اُن پر نصف ہے اُس عذاب کا جو آزاد عورتوں پر ہے۔''

صبر کرنا باندیوں کے ساتھ نکاح سے بہتر ہے

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ: یہ جو باندیوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دی گئی ہے یا ترغیب دی گئی ہے، یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے اوپر مشقت کا اندیشہ رکھتا ہے تم میں سے۔عنت سے یہاں زِنا مراد ہے، یعنی اُس کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں نکاح نہیں کروں گا تو کسی زِنا میں واقع ہو جاؤں گا، اُس کو تو نکاح کر لینا چاہیے، باز رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، وہ بھی انسان ہیں جس طرح تم انسان ہو، جس طرح تم مؤمن ہو ان کو بھی ایمان حاصل ہے، حقیقت اللہ جانتا ہے کہ کس کا ایمان کیسا ہے اور کیسا نہیں، تو اُس کو تو کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے، نکاح کر لینا چاہیے، البتہ جو اپنے پر قابو رکھ سکے اور اُس کو مشقت میں واقع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اُس کے لئے بہتر یہی ہے کہ آزاد عورت ملے تو نکاح کرلے، باندیوں سے کرنے کوشش نہ کرے، کیونکہ باندیوں کے ساتھ نکاح کی صورت میں پھر کئی ساری مشکلات پیش آتی ہیں، جیسے فقہ کے اندر آپ پڑھتے ہیں کہ مولیٰ پابند نہیں ہے کہ اُس باندی کو آپ کے گھر بھیجے، بلکہ وہ اپنی خدمت میں اُس کو رکھ سکتا ہے، اور خاوند کا صرف اتنا کام ہوگا کہ جب کبھی اُس کو موقع ملے ملاقات کرلے، پھر وہ مولیٰ کی خدمت کرے گی، مولیٰ کے مہمانوں کی خدمت کرے گی، اُس کے کام کاج کے لئے باہر آئے جائے گی، تو بسا اوقات یہ چیزیں انسان کے لئے بدمزگی کا باعث بن جاتی ہیں، اور نکاح سے جو مقصد ہے کہ مرد اور عورت کی زندگی پُرلطف گزرے اس میں یہ رُکاوٹیں پڑتی ہیں، تو پھر بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھو۔ لیکن اگر اس قسم کا اندیشہ ہے کہ بُرائی میں مبتلا ہو جاؤ گے تو پھر نکاح کر لینا چاہیے، پھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ''یہ اُس شخص کے لئے ہے جو تم میں سے اپنے اُوپر عنت کا اندیشہ رکھے، تکلیف میں پڑ جانے کا اور مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ رکھے'' یعنی زِنا وغیرہ میں واقع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: اور صبر کرنا تمہارا بہتر ہے تمہارے لئے، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ واضح کرے تمہارے لیے اور راہنمائی کرے تمہاری اُن لوگوں کے طریقوں کی طرف جو تم سے پہلے
وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٢٦ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ
گزرے ہیں اور اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم پر توجہ فرمائے، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ۲۶ اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم پر
عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا
متوجہ ہو، اور ارادہ کرتے ہیں وہ لوگ جو خواہشات کی اتباع کرتے ہیں کہ تم مائل ہو جاؤ مائل ہونا

عَظِیْمًا ﴿۲۷﴾ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ

بہت بڑا ﴿۲۷﴾ اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے، اور انسان کمزور پیدا کیا

ضَعِیْفًا ﴿۲۸﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

گیا ہے ﴿۲۸﴾ اے ایمان والو! نہ کھایا کرو تم آپس میں ایک دوسرے کے مال غلط طریقے سے

اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫

مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت ہو جو آپس میں رضامندی سے صادر ہو،

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ یَّفْعَلْ

اور اپنے لوگوں کو قتل بھی نہ کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تم پر مہربانی کرنے والا ہے ﴿۲۹﴾ اور جو کوئی شخص یہ کام

ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ

کرے گا حد سے بڑھتا ہوا اور ظلم کرتا ہوا تو ہم عنقریب اُس کو جہنّم میں داخل کریں گے، اور یہ اللہ پر

یَسِیْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ

آسان ہے ﴿۳۰﴾ جن گناہوں سے تمہیں روکا گیا ہے اگر اُن میں سے بڑے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہو تو دُور ہٹا دیں گے ہم

عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا

تم سے تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزّت والی جگہ میں ﴿۳۱﴾ تمنّا نہ کیا کرو

مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ

اُس چیز کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مَردوں کے لیے حصّہ ہے

مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْــَٔلُوا اللّٰهَ

اُس میں سے جو انہوں نے کیا، اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے اس میں سے جو انہوں کیا، اللہ سے اس کا فضل مانگتے

مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا

رہا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾ اور ہر کسی کے لیے ہم نے وارث بنائے

مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ

ہیں اُس مال کے جس کو چھوڑ جائیں والدین اور قریبی رشتہ دار، اور وہ لوگ جن کے عہد کو تمہاری قسموں نے مضبوط کیا ہے

فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ؀۳۳ؑ

اُن کو اُن کا حصہ دے دیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے ۳۳

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ: اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ واضح کرے تمہارے لئے۔ لَكُمْ میں لام نفع کا ہے، تمہارے نفع کے لئے۔ لِيُبَيِّنَ کا مفعول محذوف ہے، اَحکام۔ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے نفع کے لئے اَحکام واضح کرے، وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: اور ہدایت دے تمہیں، راہنمائی کرے تمہاری ان لوگوں کے طریقوں کی طرف جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ سُنَنَ سُنّت کی جمع بمعنی طریقہ۔ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے مراد انبیاء، صالحین، یعنی جو پہلے گزرے ہیں اُن کے طریقے تمہیں بتلائے، وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ: اور اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم پر توجہ فرمائے، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا: اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم پر متوجہ ہو، اور ارادہ کرتے ہیں وہ لوگ جو خواہشات کی اتباع کرتے ہیں کہ تم مائل ہو جاؤ مائل ہونا بہت بڑا۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ: اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے، تم سے تخفیف کرے، وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا: اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ: نہ کھایا کرو تم آپس میں ایک دوسرے کے مال غلط طریقے سے اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً: تَكُوْنَ کی ضمیر جہتِ اَکل کی طرف لوٹے گی، مگر یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال کھانا تجارت کے طور پر ہو، عَنْ تَرَاضٍ: ایسی تجارت جو آپس میں رضامندی سے صادر ہو، تَرَاضٍ باب تفاعل ہے جو مشارکت کو چاہتا ہے، جو تمہاری طرف سے رضامندی سے صادر ہو۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اور اپنے لوگوں کو قتل بھی نہ کیا کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرنے والا ہے۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا: اور جو کوئی شخص یہ کام کرے گا حد سے بڑھتا ہوا اور ظلم کرتا ہوا، عدوان وظلم کے طور پر، عُدوان: حد سے تعدی کرنا، حد سے بڑھ جانا، تجاوز کر جانا، اور ظلم کا اصل مفہوم ہوتا ہے دوسرے کی حق تلفی، اور یہ دو لفظ یا تو اس لیے بول دیے گئے کہ تعدی ہو اور قصداً ہو، خطأً اور نسیاناً نہ ہو، کیونکہ جو خطا اور نسیان ہو وہ شرعاً ظلم کی تعریف میں نہیں آتا، اُس پر وہ وعید آخرت میں نہیں ہے، یا یہ دو شقیں یوں ہو جائیں گی کہ کسی دوسرے پر ظلم کر کے اس سے چیز چھین لینا، یہ عدوان ہے، اور جو کسی کا حق آپ کے ذمے لگا ہوا ہے وہ دبا لینا اور نہ ادا کرنا یہ ظلم ہے، فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا: تو ہم عنقریب اُس کو جہنم میں داخل کریں گے، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: اور یہ جہنم میں داخل کر دینا اللہ پر آسان ہے۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ- مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ: جن کاموں سے تمہیں

روکا گیا ہے، یعنی منہیات، کَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ: جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ہے ان میں سے بڑے بڑے کام۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ: جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ہے اُن میں سے بڑے بڑے کاموں سے اگر تم بچتے رہو، جن گناہوں سے تمہیں روکا گیا ہے اُن میں سے بڑے بڑے گناہوں سے اگر تم بچتے رہو، نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ: تو دُور ہٹادیں گے ہم تم سے تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ، وَنُدْخِلْكُمْ: اور ہم داخل کریں گے تمہیں، مُّدْخَلًا كَرِيْمًا: عزت والی جگہ میں۔ مُّدْخَلًا ظرف کا صیغہ ہے، كَرِيْمًا اُس کی صفت ہے، "عزت کی جگہ میں ہم تمہیں داخل کریں گے" وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ: تمنا نہ کیا کرو اس چیز کی جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا: مردوں کے لئے حصہ ہے اُس میں سے جو انہوں نے کیا، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ: اور عورتیں کے لئے حصہ ہے اُس میں سے جو انہوں نے کیا، وَسْــَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ: اللہ تعالیٰ سے اُس کا فضل مانگتے رہا کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ: موالی مولیٰ کی جمع، یہاں مولیٰ سے وارث مراد ہے، اور ہر کسی کے لئے ہم نے وارث بنائے ہیں اُس مال کے جس کو چھوڑ جائیں والدین اور قریبی رشتہ دار، وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ: اور وہ لوگ جن کے ساتھ تمہاری قسمیں واقع ہوئی ہیں، یا، جن کے ساتھ تمہارے عہد کو تمہارے قسموں نے باندھا ہے، اُن کے عہود کو تمہارے قسموں نے مضبوط کیا ہے، فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ: اُن کو اُن کا حصہ دے دیا کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ماقبل سے ربط

سورۂ نساء کی ابتداء سے اصلاحِ معاشرہ کے اُصول بیان ہوتے چلے آرہے ہیں، اُس کی بنیاد اِس بات سے اُٹھائی گئی تھی کہ انسان جتنے بھی ہیں وہ سب ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں، لہٰذا اِن کے معاملات کو اِس جذبے کے ساتھ ادا کرنا چاہیے جس طرح آپس میں بھائی معاملات طے کیا کرتے ہیں، انسانی برادری کی یکسانیت ذکر کر کے برادرانہ جذبات کو انگیخت کیا گیا تھا۔ پھر اُس کی تفصیل آگے کی گئی تھی کہ یتیموں پر زیادتی نہ کرو، اُن کے مال کی نگہداشت کرو، ہر معاملے میں اُن کی اصلاح کا خیال رکھو، اسی طرح عورتوں کے بارے میں جس قسم کی زیادتیاں لوگ کرتے تھے ان کی اصلاح کی گئی تھی، اور درمیان میں کچھ اخلاقی اصلاح کے ضابطے بھی بیان کئے گئے تھے، اور پھر اِس رکوع سے متصل آیات میں کچھ نکاح کے احکام، محرمات کا بیان، اور عورت کے ساتھ دوسرے برتاؤ کے طریقے واضح کئے گئے تھے، اِس رکوع میں ابتدائی دو تین آیتوں میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی عظمت بیان کی ہے، تاکہ مؤمنین کے دل اُس عظمت کو محسوس کرتے ہوئے اُن اَحکام کی پابندی کریں، اور ساتھ ساتھ ایک فتنے کی نشاندہی کی ہے۔

اِسلامی اَحکام کے سامنے مفاد پرستوں کی رُکاوٹیں اور اُن کا سدِّباب

اُس قصّے کا حاصل یہ ہے کہ جس وقت بھی یہ اصلاحی اُصول لوگوں کے سامنے واضح کئے جائیں گے تو جن لوگوں کی زندگیاں اِن اُصولوں کے مطابق نہیں ہیں وہ مزاحمت کے لئے میدان میں اُتریں گے، یہ ہمیشہ دُنیا کا دستور ہے کہ جب لوگ کھانے کمانے کے لئے کچھ غلط طریقے اختیار کرلیتے ہیں تو ان کے سامنے جس وقت کوئی اِصلاحی پروگرام رکھا جائے جس میں بظاہر وہ اپنا نقصان سمجھتے ہیں تو وہ اپنے منطقی فلسفی دلائل لے کر میدان میں آتے ہیں، اور اِس اصلاحی اسکیم کو فیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً آج کل جو سُودی نظام چل رہا ہے تو سرمایہ دار طبقہ جتنا بھی ہے اِس سُودی نظام میں اُن کا مفاد ہے، اب اگر آپ یہ قانون بنانے کی کوشش کریں کہ سُود کو ترک کردیا جائے تو وہ لوگ اپنے ان دلائل کے ساتھ جن کو وہ دلائل قرار دیئے ہوئے ہیں، منطقی دلائل، عقلی دلائل، اُن کے ساتھ وہ مقابلے میں آتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ سُود اگر نہیں لیا جائے گا تو یوں بربادی آجائے گی، یوں تباہی آجائے گی، تجارت تباہ ہوجائے گی، صنعت ٹھیک نہیں رہے گی، ہمارا دوسرے ملکوں کے ساتھ لین دین کس طرح ہوگا، تو اس میں ہزاروں فائدے بتائیں گے اور اس کے چھوڑنے میں ہزاروں نقصانات واضح کریں گے، مقصد یہ ہوگا کہ معاشی اصلاح کے لئے یہ اچھا اُصول جو بیان کیا جارہا ہے اِس کو ناکام کردیا جائے اور ہمارا مفاد محفوظ رہ جائے۔ اسی طرح اُس معاشرے میں لوگ یتیموں کا مال کھانے کے عادی تھے، یتیموں کے مال کے بارے میں بے احتیاطیاں جاری تھیں، عورتوں کے اُوپر وہ لوگ ناجائز قبضے جماتے تھے، اُن کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح نہیں کرنے دیتے تھے، اپنی مرضی کے مطابق اُن کے اپنے مالوں میں تصرف نہیں کرنے دیتے تھے، تو جن لوگوں نے یہ طریقے اپنا رکھے تھے اور اُن کو یہ حرام کھانے کی عادت پڑی ہوئی تھی، اور ایسے ہی بعض محرمات کے ساتھ نکاح کرنے کی عادت تھی، جیسے تفصیل آپ کے سامنے آچکی کہ اپنی منکوحۂ اَب کے ساتھ بھی نکاح کرلیتے تھے، دودو بہنوں کو اپنے نکاح میں لیے بیٹھے تھے، اور چار سے زیادہ دس دس پندرہ پندرہ بیس بیس عورتوں سے نکاح کیے بیٹھے تھے، تو جب یہ قاعدے ان کے سامنے واضح کئے جائیں گے تو وہ لوگ اپنے مفاد کے خلاف سمجھیں گے، اور پھر تمہارے ساتھ وہ مزاحمت کریں گے، ٹکرا لیں گے، تمہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ یہ جو باپ دادے کی طرف سے طریقہ چلا آرہا ہے، اور ہمارے بڑوں سے ہمیں ورثے کے طور پر جو ایک طرزِ زندگی ملا ہے یہی ہمارے لئے مفید ہے، اور اِس کے ترک کرنے میں یہ نقصان ہے یہ نقصان ہے، ہمیں اپنے باپ دادے کے طریقے کو بدلنا نہیں چاہیے، اس طرح سے وہ ذہنی طور پر ٹکرا لیں گے، اپنی طرف سے دلائل واضح کریں گے، اور تمہیں اس راستے سے ہٹانے کی اور پھسلانے کی کوشش کریں گے، لہٰذا اِس بات سے خبردار رہیو کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ بیان کرتا ہے اس میں تمہارا فائدہ ہے اور یہ شہوت پرست لوگ، خواہشات کے بندے، نفس پرور لوگ، یہ تمہیں سیدھے راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں، اس لیے جس وقت بھی وہ تمہارے سامنے اس قسم کے دلائل لے کر آئیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہوں تو سمجھ جایا کرو کہ یہ دین ودنیا کے دُشمن ہیں، اِن کی بات پہ کان نہیں رکھنا، اِس طرح سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ترغیب دی جارہی ہے کہ اللہ کے احکام کے مقابلے میں کسی دوسرے کی بات پر کان نہ دھریں، وہ لوگ متبع شہوات ہیں، خواہشات کے بندے ہیں،

نفس پرور ہیں، پیٹ کے پجاری ہیں، وہ جس وقت اپنے مفاد پر زد پڑتی ہوئی دیکھیں گے تو یقیناً تمہیں راستے سے بھٹکانے کی کوشش کریں گے، اِن سے ہوشیار رہنا، تو دنیا کے اندر اس طرح سے ہوتا ہے کہ جس وقت بھی معاشرے کے اندر غلط کار لوگ قابض ہوجائیں تو ان کے قبضے کے چھڑانے کے لئے کتنی اچھی سے اچھی سکیم کیوں نہ واضح کی جائے بہرحال وہ اپنے مفاد کی خاطر اُس کی مخالفت کرتے ہیں۔تو یہاں دو چیزیں ملحوظ رکھنی پڑتی ہیں، اللہ کی طرف سے جو حکم آئے اُس کی عظمت محسوس کرو، اُس کو دین ودُنیا کے لئے مفید سمجھو، اور اُس پر کاربند ہوجاؤ، اور اگر اُس کی مخالفت میں تمہیں بہکانے اور اُکسانے کے لئے اور اُس راستے سے ہٹانے کے لئے لوگ آئیں اور کیسے ہی دلائل سے مسلح ہوکر آئیں اُن کی بات پر کان نہیں دھرنا۔ پہلی آیتوں کے اندر تو یہ تاکید کی ہے، آگے پھر اَحکام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

اِن الفاظ کو دیکھ لیجئے، ''اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے لئے اپنے اَحکام کو واضح کرے'' اور اِن اَحکام کی تبیین میں فائدہ تمہارا ہے، لَکُمْ میں لامِ انتفاع کے لئے ہے، تمہارے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے اَحکام اور اپنے قواعد تمہیں بتاتا ہے۔ ''اور تمہیں اِن آیات کے ذریعے سے اُن لوگوں کے واقعات اور اُن لوگوں کے طریقے جتلاتا ہے جو پہلے گزرے ہیں'' یعنی انبیاء علیہم السلام کے طریقے، صالحین کے طریقے، اللہ کے مقبولین کے طریقے، اُن کے واقعات، تاکہ اُن واقعات کے ساتھ اور ان صالحین کے طریقے کے ساتھ بھی تمہارے دل میں اِن قوانین کی عظمت آئے، ''بتلاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ طریقے اُن لوگوں کے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، اور اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی رحمت کے ساتھ تم پر توجہ کرے، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے'' اس لئے جو کچھ اللہ تعالیٰ بیان کریں گے وہ علم وحکمت پر مبنی ہوگا، اور اُس کے خلاف جو کچھ آئے گا وہ سب جہالت اور غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا، جب اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور حکیم بھی ہے تو جو کچھ وہ بتلائے گا علم کا تقاضا بھی وہی ہے، اور جو قاعدہ وہ بنائے گا حکمت کا تقاضا بھی وہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف جو کوئی بھی آپ کے سامنے آئے گا اگر اللہ کے حکم کے خلاف کسی طریقے کو وہ لائے گا تو وہ علم کے بھی خلاف ہوگا اور حکمت کے بھی خلاف ہوگا، وہ جاہلانہ طریقہ ہوگا، غیر دانشمندانہ طریقہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی اِن صفات کے ذکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ احکام کی عظمت ہی بیان کرنا مقصود ہے۔ اور اللہ تو ارادہ کرتا ہے تم پر توجہ کرنے کا، کہ تم پر رحمت سے متوجہ ہو، اور جو لوگ شہوات کے متبع ہیں، جو خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں، لذات کے پیچھے مرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے سے ایک طرف مائل ہوجاؤ، وہ تمہیں سیدھے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں، ''مائل ہوجاؤ تم ایک طرف مائل ہونا'' یعنی تم سیدھے نہ رہو، سیدھے راستے پر نہ چلو، بلکہ ایک طرف کو ڈھلک جاؤ۔

رَسم ورِواج کی شکل میں معاشی وذہنی بوجھ اوراس کے کچھ نمونے

''اللہ ارادہ کرتا ہے تم پر تخفیف کا، بوجھ ہلکا کرنے کا'' کہ یہ جاہلیت کی رسمیں جو تمہارے سر پر ایک بوجھ بنی ہوئی ہیں، تمہارے گلے کے اندر آباء واجداد کے طریقے جو طوق کی طرح پڑے ہوئے ہیں، جس نے تمہاری دُنیا کی زندگیاں بھی تلخ کر رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ تم سے اِن بوجھوں کو ہٹانا چاہتا ہے، یہ ناجائز پابندیاں اپنے سے دور کردو جو جاہلیت میں تمہارے اوپر عائد کی گئیں،

بہت ساری ایسی چیزیں جن کو انسان رسم ورواج کے طور پر اپنائے ہوئے ہوتا ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک معاشی بوجھ بھی ہوتی ہیں اور ذہنی بوجھ بھی ہوتی ہیں، لیکن اُن کو ہٹانے کی جرأت نہیں ہوتی، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا سہارا لے کر اگر انسان اُن کو کاٹنا چاہے تو اِس قسم کے طوق کاٹے جاسکتے ہیں اور اس قسم کے بوجھ گرائے جاسکتے ہیں۔ اچھی طرح سے اس بات کو سمجھنے کے لئے آپ اپنے معاشرے کی طرف ذرا دھیان لے جائیے، کہ ہمارے ہاں آج کل بیاہ شادیوں کا طریقہ عام طور پر جو آپ دیکھتے ہیں اُس میں بچوں والوں پر اس قسم کے اِخراجات پڑ جاتے ہیں کہ اگر دو چار عقل مندل کر بیٹھیں گے تو وہ بھی سمجھیں گے کہ یہ خواہ مخواہ کا ناجائز بوجھ ہے، برادری کی روٹیاں، برادری کو ہدیے تحفے دینے، اور بارات کی پابندی، جہیز کی پابندی، یہ اس قسم کے بوجھ ہیں جو رَسم ورِواج نے ہمارے سروں پر ڈالے ہوئے ہیں، اور ہر شخص اِن سے تنگ ہے، رسم ورواج کے طور پر جتنا معیار اُونچا کر لیا گیا اتنا نبھانے کی گنجائش نہیں ہے، لوگ قرضے لیتے ہیں، زندگی بھر کی محنت سے بنائی ہوئی جائیدادیں اس قسم کے کاموں میں برباد ہو جاتی ہیں، لیکن کسی شخص کے اندر جرأت نہیں کہ اِس بوجھ کو اُتار کر پھینک دے، اور انسان یہ کہے کہ اِس بوجھ کو اُٹھانے کے لئے ہم تیار نہیں، یہ رَسم ورِواج نے خواہ مخواہ ہمارے سر پر ڈالا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف اگر دھیان کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تخفیف ہی تخفیف کا حکم دیتا ہے، اللہ کی طرف سے کوئی پابندی اِس قسم کی نہیں کہ جب تک تم اتنے آدمی نہیں جاؤ گے نکاح صحیح نہیں ہے، جب تک لڑکی کے لئے اتنا جہیز نہیں ہوگا نکاح درست نہیں ہے، اور جب تک تم ساری بارات کو دیگیں اُتار اُتار کر نہیں کھلاؤ گے نکاح درست نہیں ہے، اللہ کی طرف سے یہ کوئی حکم نہیں ہے، اللہ نے تو سب تخفیف ہی تخفیف کی ہوئی ہے۔ اسی طرح موت کے وقت میں ہوتا ہے، یعنی ایک بوڑھا بیچارہ مرتا تو ہے لیکن پچھلوں کے لئے مصیبت بنا جاتا ہے کہ ساری برادری کی دعوتیں کرو، اور مُلّاں ٹیکس علیحدہ ادا کرو، مولوی ٹیکس علیحدہ ادا کرو، فلاں کا ٹیکس علیحدہ دو، یعنی مرنے کے بعد ایک لمبا چوڑا دھندا اس قسم کا پیچھے لگ جاتا ہے کہ انسان کو اُس قسم کی ذمہ داریاں ادا کرنی مشکل ہو جاتی ہیں، آپ حضرات کے سامنے ہیں، برادری آتی ہے، کھا پی جاتی ہے، اور انسان کا دیوالیہ کر جاتی ہے، ایک تو اُس کا فرد مر گیا، وہ تو ایک جانی نقصان ہوا، اور دوسرے یہ لوگ مال کو چٹ کر جاتے ہیں، یہ سارے کے سارے بوجھ ایسے ہیں جو رَسم ورِواج نے ہمارے سروں پر ڈالے ہوئے ہیں، یہ جاہلانہ رَسم ورِواج ہیں، اللہ تعالیٰ اِس قسم کا بوجھ انسانوں پر نہیں ڈالتا، اللہ تعالیٰ کے سامنے انسان کی کمزوری ہے کہ جیسے اس نے پیدا کیا ہے اس کو معلوم ہے کہ یہ کمزور مخلوق ہے، اِس پر ایسے بوجھ نہیں ڈالنے چاہئیں جن کو یہ برداشت نہ کر سکے، ہم نے اپنے اُوپر اس قسم کے بوجھ جو ڈال دیے ہیں، ہمارے بڑوں کے رَسم ورِواج کے طور پر ہمارے خاندان میں یہ چیزیں جو آ گئی ہیں، اللہ کے اَحکام سب اس کے خلاف ہیں اور تم پر تخفیف کا ارادہ کرنے کے ہیں۔ تو تمہیں چاہیے کہ اس قسم کی برادری کی رسموں کو کاٹ دو، اور یہ جو بوجھ تمہارے اُوپر بلاوجہ پڑے ہوئے ہیں اِن کو گرا دو، اللہ تعالیٰ تمہاری خِلقت سے واقف ہے، وہ ذمہ داری اتنی ہی ڈالتا ہے جس کو تم برداشت کر سکتے ہو، اللہ تو تخفیف کا ارادہ کرتا ہے۔ ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے'' تو انسان کی اس کمزوری سے اللہ واقف ہے، وہ اس کے اُوپر ذمہ داریاں اتنی ہی ڈالتا ہے جن کو یہ برداشت کر سکے۔

دُوسرے کے مال سے فائدہ اُٹھانے کے جائز اور ناجائز طریقے

آگے پھر اَحکام کا سلسلہ ہے، "اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقے سے نہ کھایا کرو، ہاں البتہ کھانے کا طریقہ تجارت ہے، اور وہ بھی وہ جو تمہاری طرف سے رضامندی سے صادر ہو" یہاں صرف ایک طریقہ بتایا گیا ہے تجارت، اور اُس کے ساتھ رضامندی کی قید لگادی گئی، چونکہ عام طور پر دوسرے کے مال سے فائدہ اٹھانے کا معروف طریقہ یہی ہے، ورنہ شریعت میں بہت ساری تفصیل موجود ہے، آپ یوں سمجھئے کہ آپ کے "ہدایہ" کی "کتاب البیوع" وہ ساری اِسی آیت کی تفسیر ہے، انسان دوسرے کے مال سے فائدہ "عاریت" کے طور پر بھی اُٹھاسکتا ہے، "باب العاریۃ" مستقل شریعت میں ہے، حدیث کی کتابوں میں بھی ہے، "ہبہ" بھی ایک طریقہ ہے دوسرے کے مال سے فائدہ اُٹھانے کا، کہ خوشی کے ساتھ ایک آدمی دوسرے کو دے دے اور بدلے میں کچھ نہ لے، "وراثت" کے طور پر بھی ایک کا مال دوسرے کو پہنچتا ہے، اور اسی طرح اور بھی جائز طریقے ہیں، "دعوت" کے طور پر آپ کو کوئی کھلادے، "ہدیہ" اور "تحفہ" کے طور پر آپ کو کوئی دے دے، آپ "عاریت" کے طور پر لے لیں، "قرض" کے طور پر لے کر آپ اُس سے فائدہ اُٹھالیں، "کرائے" پر لے لیں، یہ صورتیں بھی ہیں، لیکن عموم کے ساتھ جو چیز واقع ہوتی ہے وہ ہے "مبادلہ"، "تجارت" کہ ایک چیز لی جاتی ہے اور دوسری چیز دی جاتی ہے، اور اِس مبادلے کے اندر مال کا مبادلہ مال کے ساتھ ہو جو عام طور پر تجارت ہوتی ہے یہ بھی ہے، اور یہاں مفسرین نے تصریح کی ہے کہ کسی کے گھر میں ملازمت اختیار کر کے اُس سے تنخواہ لے کر اُس کے مال سے فائدہ اُٹھانا، یا اِسی طرح اِجارے کے طور پر منافع کے ساتھ جو مال کا مبادلہ ہوتا ہے وہ بھی سب اِس میں شامل ہیں، حقیقت کے اعتبار سے تجارت اِن پر بھی صادق آتی ہے، ایک تو ہے کہ دونوں طرف سے مال ہو جس کو ہم اپنے عُرف کے طور پر تجارت قرار دیتے ہیں، اور ایک ہے کہ ایک طرف سے مال ہو اور دوسری طرف سے منافع ہوں، جیسے آپ کسی کے گھر جاکے کام کیجئے اور اپنے بدنی منافع اس کو دیجئے اور اس کا مال لیجئے اور مال لے کر فائدہ اٹھائیں، اسی طرح آپ کسی کو کوئی چیز کرائے پر دے دیں، آپ کی چیز کے منافع اس کے لئے چلے گئے، اور آپ اُس سے پیسے لے لیں، آپ کسی کا مکان کرائے پر لے لیتے ہیں تو منافع اُس سے لیتے ہیں اور اُس کے مقابلے میں مال دیتے ہیں، یہ سب "تجارت" میں شامل ہے، تو محنت کر کے کسی کے مال سے فائدہ اُٹھایا جائے جس کو ہم "تنخواہ" کہتے ہیں وہ بھی اِس میں آجاتی ہے، اور "اِجارہ" وغیرہ کے ذریعے سے جو فائدہ اُٹھایا جاتا ہے وہ بھی اِس میں آجاتا ہے، گویا کہ ایک دوسرے کے مال کو حاصل کرنے کے جائز طریقے یہ ہیں، کہ مبادلہ مال کا مال کے ساتھ ہو، یا مبادلہ مال کا منافع کے ساتھ ہو، یہ جائز طریقہ ہے دوسرے کے مال سے فائدہ اُٹھانے کا۔ اور اِس کے علاوہ "غصب" کے طور پر، کہ کسی کا مال لے لیا اور دیا اُس کو کچھ نہیں اور اُس کی رضامندی کے بغیر لے لیا، اسی طرح چوری کے طور پر، رشوت کے طور پر، سود کے طور پر، دھوکا اور فریب کے ذریعے سے ایک دوسرے کے مال سے فائدہ نہ اُٹھایا کرو، یہ طریقے اگر تم جاری کردو گے بغیر کسی محنت کے دوسرے کے مال سے فائدہ اٹھانے کے، جس طرح آج لوگ چاہتے ہیں کہ کرنا کچھ نہ پڑے اور بیٹھے بیٹھے سرمایہ دار ہو جائیں، یہ طریقے اگر جاری ہوں گے تو تمہارا اپنا مالی نظام تباہ ہو جائے گا، پریشانیاں تمہیں ہوں

گی۔ اور اگر رضامندی سے ایک دوسرے کے ساتھ مال کا مبادلہ کرتے رہو گے اور لیتے دیتے رہو گے تو سارے سکھ اور چین سے رہو گے۔ اَمْوَالَكُمْ: اپنے مالوں کو، یعنی اپنے بھائیوں کے مالوں کو، آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو غلط طریقے سے کھایا نہ کرو، اور غلط طریقے کے اندر ہر وہ طریقہ آ گیا جس کو شریعت نے ناجائز اور حرام ٹھہرایا ہے، جیسے چوری، غصب، دھوکا، فریب، رشوت، سود، اور اسی طرح جتنے بھی عقودِ باطلہ اور عقودِ فاسدہ ہیں وہ سب اِس میں آ جائیں گے، اور کثیر الوقوع ہونے کی وجہ سے ''تجارت'' کو ذکر کر دیا، ورنہ شریعت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے مال سے فائدہ اُٹھانے کے اس کے علاوہ دوسرے طریقے بھی ہیں، جیسے تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی۔

''تجارت'' میں طرفین کی رضامندی کی شرط اور اس کی تفصیل

تراضی کی قید معتبر ہے، جبری بیع نہ ہو، جیسے سرمایہ دار ایک مال کو اسٹاک کر کے رکھ لیتا ہے، جب وہ بازار سے ناپید ہو جاتا ہے، اور اب لوگ خریدنے کے لئے جاتے ہیں تو وہ منہ مانگی قیمت لیتا ہے، اور پھر ساتھ ساتھ اپنے دل کو یہ تسلی بھی دیتا ہے کہ لوگ اپنی رضامندی سے خریدتے ہیں، میں کون سا اُن کو مجبور کرتا ہوں، اس لیے جتنے پیسے لے لوں میرے لئے جائز ہے، یہ بات غلط ہے، یہ رضا جبری ہے، کہ جب ایک انسان مجبور اور مضطر ہو گیا، جب وہ چیز اُس کو کسی اور جگہ سے ملتی ہی نہیں تو اِس لئے اگر وہ منہ مانگی رقم دیتا ہے تو یہ رضا جبری ہے، اِس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، دیکھا جایا کرتا ہے کہ عام عرف کے اعتبار سے وہ چیز کتنی قیمت کی ہے، اُس سے زائد قیمت لینا کسی کے اِضطرار اور کسی کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، یہ بھی اکل بالباطل ہے کہ انسان کو کسی حال کے اعتبار سے مجبور کر دیا جائے، جیسے حاکم رشوت دینے پر مجبور کر دے، اب وہ رشوت دے کر جو جائے گا تو لوگ کہتے ہیں کہ اپنی مرضی سے دے کر گئے ہیں، اگر تم اُن کا کام صحیح طریقے سے کرتے تو وہ اپنی مرضی سے رشوت کیوں دیتے، تو یہ حالات کی مجبوری ہے، اور اِس حالات کی مجبوری کے تحت اگرچہ دینے والا بظاہر راضی ہی ہو، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ راضی نہیں ہے، اس لئے اِس قسم کی رضا معتبر نہیں، اُس مال کے حلال ہونے کے لئے طرفین کی رضا ضروری ہے۔ تو مضطر اور مجبور کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، آپ کو پتا ہے کہ اِس نے خریدنا ضرور ہے، اِس کے بغیر یہ رہ نہیں سکتا، اور آپ معروف طریقے سے زائد پیسے مانگتے ہیں، تو آپ اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جو زائد پیسے آپ لیں گے وہ اکل بالباطل ہے۔

''قتل'' کی ممانعت اور یہاں اس کی مناسبت

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: یہ تو مال کی حفاظت مذکور تھی، اور اس کے ساتھ ہی یہ آ گیا کہ اپنے لوگوں کو قتل بھی نہ کیا کرو۔ اور دونوں باتوں میں بڑا جوڑ ہے، جس وقت انسان مال کی حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے، جائز اور ناجائز طریقے سے مال اکٹھا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو لازماً اُس کے نتیجے میں شر اور فساد ہوتا ہے، پھر قتل تک نوبت بھی پہنچتی ہے۔ اگر مالی نظام کو ٹھیک کر دیا جائے، اور مالی نظام صحیح طور پر چلتا رہے، لوگ ایک دوسرے کے مال پر دست درازی نہ کریں، تو اکثر و بیشتر قتل و قتال کی نوبت ہی نہیں آئے گی، جانیں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔ آپ جس وقت غور کریں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آئے گی کہ یہ لڑائی بھڑائی اور قتل و قتال تک عموماً اسی

حرص اور لالچ کی بناء پر نوبت آتی ہے، کوئی کسی کی جائیداد اینٹھنے کے لئے اُس کو قتل کر دیتا ہے، اور کوئی چوری ڈاکے کے لئے جاتا ہے تو اُس کو جان سے مار دیتا ہے، اور اسی طرح اور بھی فسادات۔ تو مال کے لئے بھی قواعد بتادیئے کہ غلط طریقے سے نہ کھایا کرو، اور حرص سے بچو، اور ایک دوسرے کی جان کی بھی حفاظت کرو۔

اَحکام کے بعد ترغیب وترہیب

''بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربانی کرنے والا ہے'' یہ اُس کی رحمت کے تقاضے ہیں کہ تمہیں یہ بتا رہا ہے، اور اگر اِن قاعدوں کے خلاف چلو گے تو چاہے تم اُس میں اپنے لئے کتنے فائدے ہی کیوں نہ سوچو حقیقت کے اعتبار سے وہ ظلم کے راستے ہیں، رحمت کے راستے نہیں ہیں، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تمہیں اس قسم کے قاعدے بتا رہا ہے۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا، کسی دوسرے پر ظلم اور زیادتی کرے گا، یعنی غلط طریقے سے مال کھائے گا یا کسی کی جان کو نقصان پہنچائے گا، تو دنیا کی سزائیں بھی اپنی جگہ اللہ نے بتائی ہوئی ہیں کہ اُن کو یہ سزا دی جائے گی اور یہ سزا دی جائے گی، وہ بھی دوسری آیات میں واضح ہیں، لیکن اگر دنیا کی سزا سے کسی وجہ سے کوئی شخص بچ بھی جائے گا تو آخرت میں تو ہم اُس کو جہنم میں ڈالیں گے ہی، وہاں سے تو چھوٹنے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اب یہ ظالم کو جہنم میں ڈال دینا یا ظالم کو سزا دے دینا بھی اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے، کیونکہ اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ مظلوم کی حمایت کرے اور ظالم کی گردن کو توڑے، ورنہ اگر اللہ تعالیٰ ظالم کے اوپر کسی قسم کی گرفت نہیں کرے گا تو دنیا کا نظام برباد ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کی جان اور مال کی حفاظت کرے، تو جو حد سے تجاوز کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو سزا کا ملنا یہ بھی اُس کی رحمت کا تقاضا ہے۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: اور جہنم کے اندر ڈال دینا اللہ پر آسان ہے، اللہ کو اس کے لئے کوئی ایسے انتظام نہیں کرنے پڑتے جس کی بناء پر کوئی مشکل پیش آئے، اور تم یہ چاہو کہ جب ہم اتنے سارے ہوں گے تو انتظام ہی نہیں ہو سکے گا، تو سزا کیسے ہو جائے گی؟ ایسی بات نہیں ہے، اللہ کے لئے سب کام آسان ہیں، یہ وعید ہے، جیسے پہلے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا میں ترغیب کا پہلو تھا کہ یہ سارے قاعدے رحمت کے ہیں، اب اِس میں وعید کا پہلو آ گیا۔

گناہِ کبیرہ اور صغیرہ کا معیار علماء کی آرا کی روشنی میں

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ: جن چیزوں سے تمہیں روکا گیا ہے اگر اُن میں سے بڑی بڑی چیزوں سے تم بچتے رہو تو چھوٹے موٹے گناہ ہم اپنی رحمت کے ساتھ ویسے ہی معاف کرتے جائیں گے، یہ بھی ایک ترغیب کا پہلو ہے، کہ بڑی بڑی غلطیوں سے بچو، اور چھوٹے چھوٹے قصور جو ہو جاتے ہیں ہم اپنی رحمت کے ساتھ تمہیں معاف کر دیں گے۔ اِس میں گناہوں کی تقسیم معلوم ہوتی ہے کبائر اور سیئات کی طرف، جس کو ہم کبائر اور صغائر سے تعبیر کرتے ہیں، کہ بعض گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور بعض گناہ صغیرہ ہوتے ہیں۔ کبیرہ اور صغیرہ کا معیار کیا ہے؟ اس کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو گناہ کی حقیقت اللہ کی نافرمانی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے حقوق کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی کوئی نافرمانی چھوٹی نہیں، ہر نافرمانی بڑی ہے، اور یہ بندہ کی بندگی کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے، اس لئے بعض حضرات کا قول یہ

بھی آتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی جو بھی ہے وہ سب کبیرہ ہی ہے، اور یہ کبائر اور صغائر کا لفظ جو بولا جاتا ہے یہ اضافی ہے ''كُلُّ ذَنْبٍ كَبِيْرَةٌ بِالنَّظْرِ اِلٰى مَا تَحْتَهٗ وَكُلُّ ذَنْبٍ صَغِيْرَةٌ بِالنَّظْرِ اِلٰى مَا فَوْقَهٗ ''(۱) کہ نچلے گناہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہر گناہ بڑا ہے اور اُوپر والے گناہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہر گناہ چھوٹا ہے، چونکہ درجات کا فرق تو یقیناً ہے کہ کسی میں نقصان کم ہوتا ہے اور کسی میں زیادہ، اعمال کے اندر درجات کا فرق تو یقیناً ہے، ایک ہے کسی کو جان سے مار دینا یہ بھی گناہ ہے، اور ایک ہے کہ راستے کے اندر کانٹے ڈال دیے کہ چلنے والوں کے پاؤں میں چبھیں یہ بھی گناہ ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جس طرح نیکیوں میں فرق ہے کہ ایک نماز پڑھنا ہے، جہاد کرنا ہے، ہجرت کرنا ہے، اور ایک راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو اٹھا دینا ہے، نیکیاں تو دونوں ہیں، لیکن درجات کا یقیناً فرق ہے، تو نافرمانی ہونے کے اعتبار سے تو کوئی گناہ ہلکا نہیں، اس لئے سرورِ کائنات ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایک دفعہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ ''(۲) یعنی جن گناہوں کو چھوٹے چھوٹے سمجھا جاتا ہے اُن سے بھی بچا کرو، کیونکہ اللہ کی طرف سے اُس پر بھی مطالبہ ہو سکتا ہے، اگر پکڑنا چاہے تو وہ اُس پر بھی پکڑ سکتا ہے۔ حسی طور پر اس کی مثال علماء یہ دیا کرتے ہیں کہ گناہ ایسے ہیں جیسے آگ، ایک بڑا انگارہ ہے اور ایک چھوٹا انگارہ ہے، تو بڑے انگارے سے آگ ذرا جلدی لگ جاتی ہے، اور اگر چھوٹا انگارہ اُٹھا کر اپنے کپڑوں میں رکھ لو گے تو کپڑے جلا تو وہ بھی دے گا، چاہے اتنا نقصان نہ ہو جتنا بڑے انگارے سے ہوا ہے، تو جیسے انسان بڑے انگارے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے چھوٹے انگارے سے بھی بچنے کی ایسی ہی کوشش چاہیے، اس لئے گناہ ہونے کے اعتبار سے اور اللہ کی نافرمانی ہونے کے اعتبار سے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور بعض حضرات کے نزدیک کبائر اور صغائر کی تقسیم حقیقی ہے، کہ بالتعیین بعض گناہ صغیرہ ہیں اور بعض گناہ کبیرہ ہیں، ان کے نزدیک کبیرہ کی تعریف یہ ہے کہ (اور اَصح قول بھی یہی ہے) ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس کے اوپر اللہ تعالیٰ نے لعنت کا ذکر کیا، غضب کا ذکر کیا، یا اُس کے اُوپر نارِ جہنّم کی وعید سنائی، یا وہ اپنے نقصان اور اثرات کے اعتبار سے اِن گناہوں میں سے کسی گناہ کے برابر ہو جن کے اُوپر لعنت، غضب یا نارِ جہنّم کی وعید آئی ہوئی ہے، یہ تو کبیرہ کی تعریف ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دوسرے گناہ صغیرہ ہیں۔ تو شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ کا ارتکاب کرے تو یہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتا، اُس کا اِزالہ توبہ اور اِستغفار کے ساتھ کرنا پڑتا ہے، اور جو صغیرہ گناہ ہیں وہ اللہ تعالیٰ عام نیکیوں کی برکت سے بھی معاف فرما دیتے ہیں، جیسے وضو کیا تو گناہ معاف ہو گئے، نماز پڑھی گناہ معاف ہو گئے، تو چھوٹے موٹے صغائر جتنے ہیں وہ ان عبادات کی برکت سے بھی معاف ہوتے رہتے ہیں۔

اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اِسی آیت کی تفسیر میں یہاں کبیرہ اور صغیرہ کا ایک اور معیار بیان فرمایا ہے، حاصل اُس تقریر کا یہ ہے جو فوائد (تفسیرِ عثمانی) میں لکھی ہوئی ہے، کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو مقاصد کے درجے میں ہوتے ہیں، اور بعض کام ایسے ہیں جو اُن مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بطور ذریعہ کے اختیار کئے جاتے ہیں، مثال کے طور پر شہوت پرستی میں مقصد کے درجے میں گناہ وہ ہے جس کو ہم زنا کہتے ہیں، جس کا مفہوم ہے قضائے شہوت، اِدخال الفرج فی الفرج یہ زنا کی صورتِ واقعی ہے، لیکن اس مقصد کو

(۱) المحصول للرازی ۴/ ۲۲۷ پر ہے: من الناس من قال لا صغیر علی الاطلاق بل کل ذنب فھو صغیر بالنسبة الی ما فوقه کبیر بالنسبة الی ما تحته.

(۲) سنن ابن ماجه ص ۳۱۳ باب ذکر الذنوب/ مشکوٰۃ، ج ۲ ص ۴۵۸ عن عائشة "باب البکاء" فصل ثالث۔

حاصل کرنے کے لئے بہت لمبا چوڑا میدان انسان کو طے کرنا پڑتا ہے، پہلے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے، انسان سوچنا شروع کرتا ہے، اور پھر اُس محل کی طرف جہاں یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے قدموں سے چل کر جاتا ہے، پھر زبان کے ساتھ بہکانے پھسلانے کی کوشش کرتا ہے، نگاہ اُس کے اُوپر ڈال کر اِستلذاذ کرتا ہے، ہاتھ اُس کی طرف بڑھ جاتا ہے، بدن بدن کے ساتھ لگاتا ہے، اور پھر کہیں جا کر اس مقصد تک پہنچتا ہے جس کو ادخال الفرج فی الفرج سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مقصد کے درجے میں چیز ہے یہ کبیرہ ہے، اور اِس کو حاصل کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے ہیں یہ اُس وقت تک صغیرہ ہیں جب تک انسان اس مقصد تک نہیں پہنچتا، اور اگر اس مقصد تک پہنچ گیا تو اس مقصد تک پہنچنے کے بعد جب سے اِس نے سوچنا شروع کیا تھا، اور اس مقصد کے لئے اپنے بدن کو حرکت دی تھی، وہاں سے لے کر اِس قضائے شہوت تک یہ سارا عمل زنا کی صفت میں آ گیا، یہ سارا ہی کبیرہ ہے، اب کسی نیکی کی برکت سے اِس میں سے کوئی چیز معاف نہیں ہوگی، نہ ہاتھ کا گناہ معاف ہوگا، نہ آنکھ کا گناہ معاف ہوگا، نہ کان کا گناہ معاف ہوگا، نہ قدموں کا معاف ہوگا، نہ دل کا معاف ہوگا، جب تک کہ توبہ کر کے اصل زنا سے معافی نہ لے لے۔ اور اسی طرح قتل کے سلسلے میں کسی کو جان سے مار دینا یہ مقصد کے درجے میں ہے، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے ہیں وہ سارے کے سارے جو ذرائع ہیں وہ صغائر ہیں، اگر تو یہ بڑے گناہ سے بچ گیا تو جو صغائر ہیں یہ اللہ تعالیٰ عبادات کی برکت سے بھی معاف کر دیں گے، لیکن اگر قتل تک نوبت آ گئی تو اب یہ جو صغائر تھے یہ صغائر نہیں رہے بلکہ کبائر ہو گئے، لہٰذا اب اِن کی معافی نیکیوں کی برکت سے نہیں ہوگی، جس وقت تک قتل کا گناہ معاف نہیں ہوگا تو اُس کے ذریعے کے طور پر جو چھوٹی چھوٹی حرکتیں ہوئی تھیں وہ بھی معاف نہیں ہوں گی۔ تو پھر یہ بات لفظوں کے بھی عین مطابق ہو جاتی ہے کہ کبیرہ سے بچو گے تو تمہارے صغائر معاف کئے جائیں گے، اگر تم کبیرہ سے نہیں بچو گے تو صغائر بھی معاف نہیں ہوں گے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر لفظوں کے بہت مطابق ہے۔ پھر اس آیت میں صغائر اُسی سلسلے کے مراد ہوں گے جس سلسلے کا کبیرہ ہے، کہ جو گناہ مقاصد کے درجے میں ہیں اُن سے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے گناہ معاف کر دیں گے، اور اگر مقصد تک پہنچ گئے اور تم نے اُس معصیت کو اِنتہا تک پہنچا دیا تو پھر اُس سلسلے کے جتنے چھوٹے موٹے گناہ ہیں پھر وہ بھی معاف نہیں ہوں گے بلکہ وہ سارا ہی سلسلہ کبیرہ بن گیا، اب کبیرہ سے توبہ کر کے کبیرہ کی معافی ہوگی تو صغائر بھی معاف ہوں گے ورنہ صغائر بھی معاف نہیں ہوں گے۔ بہر حال اس میں دو درجے نکل آئے، اور اصل اہمیت جو واضح کی گئی وہ ہے کبیرہ سے بچنے کی، کہ بڑے بڑے گناہوں سے بچو، اور چھوٹے موٹے گناہ اللہ تعالیٰ عبادات کی برکت سے بھی معاف کر دیں گے، اور ویسے عادت بھی یہی ہے کہ جو آدمی بڑے گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ چھوٹوں سے بھی بچ جاتا ہے، اور جو بڑے گناہ سے بچنے کی کوشش نہ کرے تو چھوٹوں کا سلسلہ تو پھر دراز چلتا ہی رہتا ہے۔

''کلا بی تقویٰ''

اور اگر کوئی شخص چھوٹے گناہوں سے تو بچنے کی کوشش کرتا ہے، معمولی معمولی چیزوں کا تو اہتمام کرتا ہے، کہتا ہے کہ ادب

کے بھی خلاف نہ ہو، مسجد میں داخل ہوتے وقت اگر کسی کو دیکھ لے کہ اس نے بایاں پاؤں پہلے رکھ دیا ہے تو اُس پر تو وہ ناک منہ چڑھاتا ہے، اعتراض کرتا ہے، ادب آداب کی تو انتہائی پابندی کرتا ہے، لیکن بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب نہیں کرتا، حسد میں مبتلا ہے، کبر میں مبتلا ہے، ریا میں مبتلا ہے، مالی خیانتوں میں مبتلا ہے، نفسانی خیانتوں میں مبتلا ہے، لیکن ظاہر داری کے طور پر وہ ادب تک کی پابندی کرتا ہے، یہ تو بالکل ہی حماقت اور بالکل ہی پگلا پن ہے، اِس کی مثال تو یوں سمجھئے جیسے انسان مچھر کو چھانے اور اُونٹ کو نگل جائے، یا جیسے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ایک وعظ میں مثال دی[1] کہ ایک حاکم تھا بڑا وظیفہ جی، وظیفے بڑے پڑھا کرتا تھا، نوافل کی بڑی پابندی کرتا تھا، کہتے ہیں فجر کی نماز کے بعد مصلے پر بیٹھ جاتا، جب تک اشراق نہ پڑھتا، اُٹھتا نہیں تھا، اور یہی وقت ہوتا تھا اہلِ مقدمہ کے ساتھ معاملہ طے کرنے کا، کہ جس وقت وہ آتے اور آ کر کوئی بات چیت ہوتی تو بولنا تو وظیفے میں منع ہے، اس لیے بولتا نہیں تھا کہ ذکر کا تسلسل نہ ٹوٹے، جب وہ مقدمے والے آتے تو اشارے سے کہتا کہ دو سو روپیہ دے دو، اُنگلیوں سے معاملہ طے کرتا، بولتا نہیں تھا کہ وظیفہ خراب نہ ہو جائے، مصلیٰ اُوپر کو اُٹھا دیتا تھا، اور لوگ پیسے نیچے رکھ دیا کرتے تھے، تو جس وقت وہ اُٹھتے تو مصلے کے نیچے سے برکت ہی برکت، رحمت ہی رحمت ملتی، نوٹ ہی نوٹ ہوتے، بولتے نہیں تھے کہ وظیفے میں بولنا ادب کے خلاف ہے۔ اِس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعضوں بعضوں کا تقویٰ ''کلابی تقویٰ'' ہوتا ہے، ''کِلاب'' کلب کی جمع ہے، کلب کتے کو کہتے ہیں، کہتے ہیں کُتا بڑا پرہیزگار ہے، جس وقت پیشاب کرنے لگے تو ٹانگ اُٹھالیتا ہے کہ کہیں چھینٹے نہ پڑ جائیں، اور پاخانہ مل جائے تو سارا کھا جاتا ہے، تو جیسے اِس کا تقویٰ ہے کہ منہ کو تو بچاتا نہیں، ٹانگ کو بچاتا ہے، اسی طرح بعض لوگ ادب آداب کی تو اتنی پابندی کرتے ہیں کہ وہ مستحب اور اَولیٰ چیزوں کے پیچھے تو یوں پڑیں گے کہ بالکل خط سنوار کے رکھیں گے، لیکن جہاں حرام کاموں کا تذکرہ آجائے گا تو پرواہ کوئی نہیں، یہ ''کلابی تقویٰ'' ہے۔ یہ اس آیت کی حکمت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطالبہ بڑے بڑے گناہوں سے بچنے کا ہے، چھوٹی موٹی غلطیاں اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے، لیکن اگر کوئی چھوٹی موٹی غلطیوں سے تو بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے، جیسے ہمارے اُستاذ نے ایک دفعہ ایک لطیفہ سنایا تھا، کہنے لگے کہ ایک آدمی نے کسی عورت کے ساتھ بُرا کام کر لیا، زنا کر لیا، اور حمل ٹھہر گیا، جس کی وجہ سے وہ فعل ظاہر ہو گیا، بعد میں رُسوائی ہوئی، تو کسی نے اُسے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! تُو نے منہ کالا کیا ہی تھا اور اس قسم کی بدمعاشی تُو نے کی ہی تھی تو کم از کم عزل کر لیتا تا کہ حمل نہ ٹھہرتا۔ ''عزل'' کا مطلب ہے کہ نطفہ باہر گرا دیتا تا کہ حمل نہ ٹھہرتا، تو یہ رُسوائی تو نہ ہوتی۔ وہ کہنے لگا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا لیکن پھر یاد آیا کہ فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے۔ اِس قسم کا تقویٰ شریعت کو مطلوب نہیں، کہ ظاہر داری میں تو تم اتنے پختہ معلوم ہو کہ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ کبھی ادب کے بھی خلاف نہیں کرتے، اور جہاں معاملہ حرام کاری کا آجائے، مالی خیانت کا آجائے، کسی کا حق دبانے کی بات آجائے، کسی کا قرض دبانے کی بات آجائے، کسی کے مال سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی بات آجائے، تو وہاں کوئی پرواہ ہی نہیں، اور اسی طرح حسد میں مبتلا ہیں، بغض میں مبتلا ہیں، کبر میں مبتلا ہیں، مسلمان کی غیبت کرتے ہیں، بہتان لگاتے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، لیکن جس وقت مسواک کی

---

(۱) خطبات حکیم الامت ج ۲۹ ص ۴۲ خطبہ بعنوان الرحیل الی الخلیل۔

نوبت آئے گی تو کوشش کریں گے کہ پگڑی اُسی طرح جائے جس طرح فقہاء نے لکھا ہے، یہ نہ ہو کہ اُنگلیاں ساری اُوپر آجائیں یا کوئی نیچے آجائے، اتنی موٹی ہو، اتنی لمبی ہو، اِس کی پابندی یوں کریں گے جس طرح فرائض کی جاتی ہے، شریعت کا یہ مقصد نہیں ہے۔

شریعت کو کون سا تقویٰ مطلوب ہے؟

آداب اپنی جگہ، وہ بھی مطلوب، مکروہات اپنی جگہ، اُن سے بچنا بھی ضروری، لیکن اصل مقصد ہے کہ کبائر سے بچو، فرائض کا ترک بھی کبیرہ کے حکم میں ہے، فرائض کی پابندی کرو، محرمات سے بچو، فرائض کو ترک نہ کرو، پھر جتنی ترقی کرتے چلے جاؤ اتنا بہتر ہے کہ اولیٰ کی بھی پابندی کرو، افضل کی بھی پابندی کرو، آداب کی بھی پابندی کرو، تو ترتیب یہ ہے، یہ نہیں کہ فرائض کو چھوڑ کر اور محرمات کا ارتکاب کرکے پھر آداب کی پابندی یہ برعکس تقویٰ ہے، کلابی تقویٰ ہے، یہ مطلوب نہیں ہے، فرائض کی پابندی اور محرمات سے بچنا ضروری ہے، پھر آگے ترقی کرتے چلے جاؤ، فرائض کے بعد واجبات کی پابندی کرو، سنن کی پابندی کرو، اور سنن کے بعد مستحبات کی پابندی کرو، آداب کی پابندی کرو، اب تم نے اِس فعل کی لائن کو پورا کرلیا۔ اسی طرح حرام سے بچو، مکروہات سے بچو، خلاف اولیٰ چیزوں سے بچو، اور جو چیزیں شریعت کے خلاف لے جانے والی ہیں اُن سے دور رہو، مطلوب اِس طریقے سے ہے۔ اور اگر ظاہر داری کی تو پابندی ہو لیکن فرائض سے انسان غفلت برتے یہ شریعت کی حکمت کے خلاف ہے۔

تو بڑے بڑے کاموں سے تم بچو، تمہاری چھوٹی موٹی غلطیاں ہم معاف کرتے چلے جائیں گے، وَّنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا: اور تمہیں عزت والی جگہ کے اندر داخل کریں گے۔

غیر اِختیاری چیزوں میں تمنا کی ممانعت

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ: اِس میں بھی ایک حکمت بتلائی، کہ آپس میں حسد کے اندر مبتلا ہونا بھی بہت سارے فساد کا ذریعہ بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں ہم بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں، اور اُس چیز کا حاصل کرلینا تمہارے اختیار میں نہیں ہوتا، جیسے ایک آدمی خوبصورت ہے اور دوسرے کو اللہ نے بدصورت پیدا کردیا، اب بدصورت اگر کہے کہ میں بھی خوبصورت بن جاؤں تو یہ اُس کے بس کی بات نہیں ہے، ایک کو اللہ تعالیٰ نے عقل فہم زیادہ دیا ہے، دوسرے کا عقل فہم کمزور ہے، تو یہ کمزور عقل فہم والا چاہے کہ میں بھی اسی طرح عقل فہم حاصل کرلوں تو یہ اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ اور اُونچے خاندان میں پیدا کردیا اور ایک کو اللہ تعالیٰ نے کسی درجے میں کم خاندان میں پیدا کردیا، تو اپنی قومیت بدل لینا یا دوسرے خاندان میں پیدا ہوجانا یہ بھی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بدنی صلاحیتیں، عقلی صلاحیتیں، اور اسی طرح نسبی اور خاندانی صلاحیتیں علیحدہ علیحدہ ہوا کرتی ہیں، یہ اس قسم کی چیزیں ہیں کہ جس کو مل جائیں اللہ کی نعمت ہے، لیکن کوئی دوسرا اِن کو حاصل کرنا چاہے تو اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مالی نشیب وفراز بھی اسی طرح ہوتا ہے، جائیداد کے اعتبار سے نشیب وفراز بھی ایسے ہی ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس چیز میں ہم بعض کو بعض پر فضیلت دے دیں تم اُس کی تمنا نہ کیا کرو، یہاں غیر اِختیاری اُمور میں تمنا کرنے کی ممانعت کرنا مقصود ہے، کیونکہ اِس کے نتیجے میں سوائے اس کے کہ تم حسد میں مبتلا

ہو جاؤ اور اپنے آپ کو پریشانی میں ڈال لو اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اگر تم دوسرے کی چیز دیکھ دیکھ کر جلو گے کہ میں بھی ایسا ہوتا، یہ کیوں ایسا ہے؟ تو اس سے پریشانی علیحدہ، اور اِس حسد میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے اپنی نیکیوں کو علیحدہ برباد کرو گے۔ اسی طرح کوئی عورت تمنا کرے کہ میں مرد ہوتی، یا کسی مرد کے دل میں تمنا پیدا ہو جائے کہ میں عورت ہوتی، اب اس قسم کی تمنائیں سوائے پریشانی کے اور کیا ہیں؟ اِن کا کچھ حاصل نہیں ہے! ایسی چیزوں کے پیچھے نہ پڑا کرو، یہاں تو تقدیر پر شاکر رہو، کہ جیسے اللہ نے بنا دیا ٹھیک ہے، ہمارے لئے یہی مصلحت ہے۔

اِختیاری فضائل میں مسابقت کی ترغیب

اور ایک ہیں اُمورِ اختیاریہ، فضائل، کہ جن کے کرنے پر اللہ تعالیٰ ثواب دیتے ہیں، یہ مسابقت کا میدان ہے، یہاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، مرد جو کام کریں گے اُن کو ثواب ملے گا، عورتیں جو کام کریں گی اُن کو ثواب ملے گا، اپنی صلاحیتیں اِس میدان میں صَرف کرو، اور آج حُبِّ جاہ میں مبتلا ہو کر لوگ جو ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں یا دوسرے کے حال پر رشک اور حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اِس میں پریشانیاں ہیں۔ مسابقت، دوڑ، ایک دوسرے سے آگے نکلنا، یہ نیکی کے میدان ہیں، جتنی نیکی کرو گے اتنا اللہ سے ثواب لے لو گے، یہ میدان وسیع ہے، اپنی صلاحیتیں یہاں صرف کرو، اپنی محنت یہاں لگاؤ۔

اللہ سے فضل مانگنے کی ترغیب اور فضل کی مختلف صورتیں

اور ویسے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت اُس کا فضل مانگتے رہا کرو، فضل کی تعیین کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے، دُعا اللہ سے یہی کرو کہ اے اللہ! ہم پر فضل فرما، جو ہمارے حق میں بہتر چیز ہے وہ ہمیں عطا فرما، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور مہربانی کے ساتھ جس حال میں تمہیں رکھے اس پر شکر گزار رہو، اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعائیں کرو، اللہ سے اس کا فضل مانگو، اس کی رحمت مانگو۔ پھر فضل کبھی تو تم پر مال کی صورت میں آئے گا، اگر اللہ کے علم وحکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں مال دیا جائے تو تمہارے حق میں اچھا ہے، اور فقر وفاقہ میں مبتلا کر دیا جائے تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اللہ کا فضل مال کی صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہی ہے کہ تم پر مہربانی کا تقاضا یہی ہے کہ تمہیں زیادہ مال نہ دیا جائے، ورنہ اگر تمہیں مال دے دیا گیا تو تم سرکش ہو جاؤ گے، باغی ہو جاؤ گے، مختلف قسم کے گناہوں میں مبتلا ہو جاؤ گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں مال سے محروم کر دے گا، اور یہ بھی اس کا فضل ہو گا، پھر تم اِسی پر ہی شاکر رہو۔ اسی طرح دوسری چیزیں ہیں۔ تو اپنے لئے خود تجویز کرنا کہ فلاں چیز مجھے ضرور مل جائے یہ مناسب نہیں، کیونکہ انسان اپنے مستقبل سے غافل ہے، اِس کو کوئی پتا نہیں کہ اِس میں کتنا نفع کا پہلو ہے اور کتنا نقصان کا پہلو ہے، یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اس لئے عافیت اور اللہ کا فضل اُس سے طلب کرو، پھر جس حال میں اللہ تعالیٰ رکھے اُسی پر شاکر رہو۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ: تمنا نہ کیا کرو اُس چیز کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ''مردوں کے لئے حصہ ہے اُن کی کمائی سے'' یہاں کسب واکتساب کا ذکر ہے، یعنی اپنے اختیاری اعمال، یہ جتنا کرو گے مردوں کو اُن کا حصہ ملے گا اور عورتوں کو اُن کا حصہ ملے گا: ''عورتوں کے لئے حصہ ہے اُس چیز میں سے جس کو وہ کرتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے اُس کا فضل مانگتے رہا

کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے'' اور اپنے علم کے مطابق وہ تمہیں اپنا فضل دے گا جو اُس کے علم وحکمت کا تقاضا ہوگا، پھر جو برتاؤ اللہ کی طرف سے تمہارے ساتھ ہو اُسی پر شکر گزار رہو۔

وراثت میں ''مولیٰ موالات'' کا حصّہ

آخر میں پھر ایک مالی حکم ذکر کر دیا گیا، کہ پہلے زمانے میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عقد معاہدہ کر لیتے تھے جس کو ''مولیٰ موالات'' کہتے ہیں، میراث کی کتابوں میں آپ پڑھتے ہیں ''مولیٰ موالات'' وہ وارث ہو جایا کرتا تھا، اور حقیقی وارثوں کو محروم کر دیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب اس طریقے کو چھوڑ دو، جو ہم نے وارث متعین کر دیئے ہیں چھوڑا ہوا مال اُنہی کو ملنا چاہیے، باقی! اگر کسی کے ساتھ تم نے عقد کیا ہوا ہے، مرنے والا وصیت اگر کر جائے تو اُس کو اُس کا حصہ دے دیا جائے، ورنہ اُس کا حصہ ختم۔ اصل وارث اگر موجود ہوں تو پھر ''مولیٰ موالات'' کو کچھ نہیں ملا کرتا۔ اور حضرت تھانوی ﷫ کے بیان کے مطابق جیسے ''بیان القرآن'' میں انہوں نے لکھا، کہ پہلے ''مولیٰ موالات'' وارث ہوتا تھا، پھر اُس کا حصہ منسوخ کر دیا گیا، کہ وارث مکمل تو نہیں ہوگا البتہ چھٹا حصہ اُس کے لئے متعین کر دیا گیا، اور پھر بعد میں جب یہ آیت اتری وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (الانفال:۷۵) اُس کے بعد اس کا حصہ بالکل ختم کر دیا گیا، تو اُنہوں نے یہاں نصیب سے چھٹا حصہ مراد لیا ہے، یعنی ان کو ان کا حصہ دے دیا کرو جو کہ اُس وقت چھٹا حصہ تھا۔ اور دوسرے مفسرین نے اِس کو وصیت پر محمول کیا ہے، کہ اگر وہ وصیت کر جائے تو ان کا حصہ ان کو دے دیا جائے، باقی! اگر کوئی وصیت نہ کر کے جائے تو پھر جو اصل وارث ہیں مال اُنہی کو ملے گا، اور جن کے ساتھ دوستی کا عقد ہو جائے جن کو ''مولیٰ موالات'' بنا لیا جائے اُن کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔ گویا کہ یہ تتمہ ہے وراثت کے اس حکم کا جو پیچھے آپ کے سامنے تفصیل سے آچکا ہے۔ ''ہر کسی کے لئے ہم نے وارث بنا دیئے ہیں اُس مال سے جس کو والدین چھوڑ کے جائیں اور اقربون چھوڑ کے جائیں، اور جن کے ساتھ تمہاری قسمیں واقع ہوئی ہیں، یا، جن کے ساتھ تمہارے عہدوں کو تمہاری قسموں نے مضبوط کیا ہے، اُن کو اُن کا حصہ دے دیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَلرِّجَالُ	قَوّٰمُوْنَ	عَلَى	النِّسَآءِ	بِمَا	فَضَّلَ	اللّٰهُ	بَعْضَهُمْ	عَلٰى	بَعْضٍ
مرد	حاکم ہیں	عورتوں	پر	بسبب	فضیلت دینے	اللہ تعالیٰ	کے بعض	کو	بعض پر

وَّبِمَآ	اَنْفَقُوْا	مِنْ	اَمْوَالِهِمْ ؕ	فَالصّٰلِحٰتُ	قٰنِتٰتٌ	حٰفِظٰتٌ
اور بسبب	خرچ کرنے	مردوں کے	اپنے مالوں کو،	پس نیک عورتیں	فرمانبرداری کرنے والی ہیں	حفاظت کرنے والی ہیں

لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ

خاوندوں کی عدم موجودگی میں بحفاظتِ الٰہی، اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی کا تمہیں اندیشہ ہو تو انہیں نصیحت کیا کرو

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا

اور ان کو بستروں میں تنہا چھوڑ دیا کرو اور انہیں مارا کرو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کر لیں تو تم ان پر الزام نہ

عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ

تلاش کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ بلندی والا ہے کبریائی والا ہے ﴿۳۴﴾ اے مسلمانو! اگر تمہیں اندیشہ ہو زوجین کے

بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ

درمیان ضد کا تو بھیج دیا کرو ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان میں سے، اگر دونوں حالات درست

یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ﴿۳۵﴾

کرنے کا ارادہ کریں گے تو اللہ زوجین کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے خبر والا ہے ﴿۳۵﴾

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

اللہ کی عبادت کرو اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو

وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی

اور قرابت والے کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اور قریب والے پڑوسی کے ساتھ

وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ

اور دُور والے پڑوسی کے ساتھ اور پہلو میں بیٹھنے والے ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ، اور ان کے ساتھ جن کے مالک ہیں

اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾ ۙ الَّذِیْنَ

تمہارے دائیں ہاتھ، بے شک اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتا اس شخص سے جو اکڑنے والا ہے فخر کرنے والا ہے ﴿۳۶﴾ جو لوگ

یَّبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ

بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور چھپاتے ہیں اُس چیز کو جو اللہ نے ان کو دی

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۚ﴿۳۷﴾

اپنے فضل سے، اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ﴿۳۷﴾

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ

اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ایمان لاتے

بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا

اللہ پر اور یوم آخر پر، اور وہ شخص کہ شیطان اس کا ساتھی بن جائے

فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

پس وہ بہت بُرا ساتھی ہے ﴿۳۸﴾ اور کیا ہے ان پر؟ اگر یہ لوگ اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لے آئیں

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِیْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ

اور خرچ کریں اُس میں سے جو اللہ نے انہیں دیا، اللہ تعالیٰ ان کے متعلق علم رکھنے والا ہے ﴿۳۹﴾ بے شک اللہ تعالیٰ

لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَیُؤْتِ

نہیں ظلم کرے گا ذرہ برابر، اور اگر وہ عمل نیکی ہوا تو اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھائے گا اور دے گا

مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ

اپنے پاس سے اجرِ عظیم ﴿۴۰﴾ پس کیا حال ہوگا جس وقت لائیں گے ہم ہر اُمت سے

بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا ؕ﴿۴۱﴾ یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

گواہ، اور لائیں گے ہم آپ کو اِن لوگوں پر گواہ ﴿۴۱﴾ اس دن چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور

وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا ۠﴿۴۲﴾

رسول کی نافرمانی کی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ برابر کر دی جائے ان کے ساتھ زمین، وہ نہیں چھپا سکیں گے اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو ﴿۴۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ: قَوّٰام قَامَ سے لیا گیا ہے بمعنی کھڑا ہونا، اور جب اِس کا صلہ علیٰ

آجاتا ہے قَامَ علیہ تو کفیل ہونا، ذمہ دار ہونا، منتظم ہونا اِس کے مفہوم میں داخل ہوجاتا ہے۔ قَوَّام قَيِّم قَيُّوم: سنبھالنے والا، کنٹرول کرنے والا، ذِمّے دار، اِس قسم کے مفہوم کو یہ لفظ ادا کرتے ہیں۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ: مرد حاکم ہیں عورتوں پر، مرد عورتوں کو سنبھالنے والے ہیں، یا، مرد عورتوں پر کنٹرول کرنے والے ہیں، عورتوں کے ذمے دار ہیں، عورتوں کے کفیل ہیں، یہ سب مفہوم اِس لفظ میں ہیں۔ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: مَا مصدریہ ہے، بسبب فضیلت دینے اللہ تعالیٰ کے بعض کو بعض پر، وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ: یہ مَا بھی مصدریہ ہے، اور بسبب خرچ کرنے مردوں کے اپنے مالوں کو، فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ: پس نیک عورتیں فرمانبرداری کرنے والی ہیں، حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ: لِلْغَيْبِ کا ترجمہ ہے وَقْتَ غَيْبِ اَزْوَاجِهِنَّ، اپنے خاوندوں کی غیر حاضری میں حفاظت کرنے والی ہیں، کس چیز کی حفاظت کرنے والی ہیں؟ اِس کا مفعول محذوف ہے، عزّت کی، ناموس کی، اموال کی، گھربار کی، بال بچّے کی۔ اپنے خاوندوں کی عدم موجودگی میں عزّت، مال، اہل وعیال اور گھر بار کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ: بحفاظتِ الٰہی، اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ۔ تو حٰفِظٰتٌ کا مفعول محذوف نکال لیا گیا، اور لِلْغَيْبِ کو وقتَ الْغَيْبِ کے معنی میں لے لیا گیا۔ اور اگر غیب سے مغیبات مراد لے لی جائیں تو پھر ترجمہ یوں ہوجائے گا ''نیک عورتیں فرمانبرداری کرنے والی ہیں اور چھپی ہوئی چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہیں''، بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ: اللہ کی حفاظت کیساتھ، بحفاظتِ الٰہی۔ اور ''چھپی ہوئی چیزوں'' سے مراد خاوند کے راز، اُس کے بھید، اُس کے اَسرار۔ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ: اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی کا، ناموافقت کا تمہیں اندیشہ ہو۔ نُشوز مصدر ہے، ناموافقت، سرکشی، اور بغاوت کے مفہوم میں آتا ہے، ''جن کی سرکشی کا تمہیں اندیشہ ہو'' فَعِظُوْهُنَّ: تو تم اُنہیں نصیحت کیا کرو، عِظُوْا اَمر کا صیغہ ہے وعظ سے، وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ: مضاجع مَضْجَع کی جمع لیٹنے کی جگہ، بستر، ''چھوڑ دیا کرو اُن عورتوں کو''، فِي الْمَضَاجِعِ: مُنْفَرِدَاتٍ فِي الْمَضَاجِعِ، اِس حال میں کہ وہ بستروں میں تنہا ہوں، اُن کو بستروں میں تنہا چھوڑ دیا کرو، وَاضْرِبُوْهُنَّ: اور اُنہیں مارا کرو، فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ: پھر اگر وہ عورتیں تمہاری اطاعت کرلیں، فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا: تو تم اُن پر الزام نہ تلاش کیا کرو، ان پر راستے نہ تلاش کیا کرو، یعنی ان کو مارنے کے لئے اور اُن کو تنگ کرنے کے لئے راستے تلاش نہ کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا: بے شک اللہ تعالیٰ علوّ والا ہے اور کبریائی والا ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا: اے مسلمانو! اگر تمہیں اندیشہ ہو زوجین کے درمیان ضد کا، آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کا، فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ: تو بھیج دیا کرو ایک حَکَم مرد کے خاندان سے، حَکَم: فیصلہ کرنے والا، منصف، وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا: اور ایک حَکَم عورت کے خاندان میں سے، اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا: اگر یہ حَکَمین، یہ دونوں حاکم اگر حالات درست کرنے کا ارادہ کریں گے، يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا: تو اللہ تعالیٰ زوجین کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ يُّرِيْدَآ کی ضمیر عام طور پر مفسرین نے حَکَمین کی طرف لوٹائی ہے، کہ اگر یہ حَکَمین نیک نیّت کے ساتھ ارادہ کریں تو زوجین کے درمیان موافقت پیدا ہوجائے گی۔ اور يُّرِيْدَآ کی ضمیر زوجین کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ زوجین اگر حالات درست کرنے کا ارادہ کرلیں اور حَکَمین کے سامنے اپنے حالات ذکر کرکے جو وہ مشورہ دیں اُس کو قبول کریں تو اللہ تعالیٰ موافقت پیدا کردے گا، اور یہ مفہوم زیادہ چسپاں ہے بایں معنی کہ اگر حَکَمین چلے بھی جائیں لیکن زوجین ہی سدھرنا نہیں چاہتے تو حَکَمین کا فیصلہ کیا کرے گا، اگر زوجین سدھرنا نہ چاہیں تو اُن کی اصلاحی تدابیر ناکام ہوجائیں گی، اور اگر اُن کا ارادہ سدھرنے کا ہو تو پھر حَکَمین کے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ

ان کے درمیان موافقت پیدا کردے گا، کہ ان کے مشورے پر عمل کریں اور ان کی اصلاحی تدبیر کو قبول کریں تو حالات درست ہوجائیں گے، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا: بیشک اللہ تعالیٰ علم والا ہے خبر والا ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰہَ: اللہ کی عبادت کرو، وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا: اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا: اَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا: اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، وَبِذِی الْقُرْبٰی: اور قرابت والے کے ساتھ، قربیٰ مصدر ہے قرابت کے معنی میں، یعنی رشتے دار کے ساتھ، وَالْیَتٰمٰی: اور یتیموں کے ساتھ، وَالْمَسٰکِیْنِ: اور مسکینوں کے ساتھ، وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی: جار: پڑوسی، ذی القربیٰ: ذی قرابت، اور یہاں قرابت سے نسبی قرابت بھی مراد ہوسکتی ہے اور مکانی قرابت بھی، نسبی قرابت کا مطلب ہوگا رشتے دار پڑوسی، اور اور مکانی قرابت کا مطلب ہوگا قریب والا پڑوسی، وَالْجَارِ الْجُنُبِ: اِس میں بھی دونوں مفہوم ہیں، جنب کا معنی اجنبی یعنی جو آپ کا رشتہ دار نہیں ہے، یا، جُنُب کا معنی ہے کہ جو دُور ہے قریب نہیں ہے، ''اور اُس پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو جو تمہارا رشتے دار ہے اور اُس پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو جو اجنبی ہے'' یا ''جو بالکل گھر کے قریب ہے اُس کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو، اور جو کچھ دُور ہے اُس کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو''، کیونکہ جوار کا مفہوم عام ہے کہ دیوار کے ساتھ دیوار لگتی ہے، دروازے کے سامنے دروازہ ہے، اور اسی طرح اہلِ محلہ بھی کسی درجے میں پڑوسی ہوتے ہیں، اور اس طرح سے تعمیم ہوتی چلی جائے گی، کہ باقی لوگوں کے مقابلے میں اپنے شہر والے اور اپنے گاؤں والے بھی ایک درجے میں پڑوسی ہی ہوتے ہیں، لیکن قُرب وبُعد کے اعتبار سے فرق پڑے گا، جو زیادہ قریب ہے اس کا حق زیادہ ہے، جو کچھ دُور ہے اس کا حق کم ہے، اسی طرح اگر وہ رشتے دار ہے تو اس کا حق زیادہ ہے کہ پڑوسی بھی ہوا اور رشتہ دار بھی ہوا، اور اگر وہ رشتے دار نہیں ہے تو رشتے دار کے مقابلے میں اُس کا حق کم ہے۔ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ: جنب پہلو کو کہتے ہیں، پہلو کا ساتھی، ساتھ بیٹھنے والا، ہم نشین، یہ عارضی پڑوسی ہے، جیسے سفر میں جاتے ہوئے بس میں ایک سیٹ پر بیٹھ گئے، یا عارضی طور پر جس طرح طلبہ ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں، درسگاہ کے اندر آپس میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، تو عارضی طور پر جس کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوجائے اُس کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو، ''پہلو میں بیٹھنے والا ساتھی''، وَابْنِ السَّبِیْلِ: اور مسافر کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ: اور ان کے ساتھ احسان کرو جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ، یعنی غلام اور لونڈیاں، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا: بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا، محبت نہیں رکھتا اُن لوگوں سے جو اکڑنے والے ہیں فخر کرنے والے ہیں، مَن چونکہ معنیً جمع ہے اس لیے ترجمہ جمع کے ساتھ کیا جائے گا، مفرد کے ساتھ ترجمہ کرنا چاہیں تو بھی ٹھیک ہے، ''نہیں محبت رکھتا اللہ تعالیٰ اس شخص سے جو کہ اکڑنے والا ہے اور فخر کرنے والا ہے''، اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ: یہ معنی کے اعتبار سے جمع آ گیا، جو لوگ بخل کرتے ہیں، وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ: اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں، وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ: اور چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے ان کو دی اپنے فضل سے، وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا: اور تیار کیا ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب، وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ: اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لئے، رِئَآءَ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، رَاٰی یُرَائِیْ رِئَآءً۔ قِتَالًا کی طرح، جو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: اور نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یومِ آخر پر، وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَہٗ قَرِیْنًا: اور وہ شخص کہ شیطان اُس کا ساتھی بن جائے فَسَآءَ قَرِیْنًا: پس وہ

بہت بُرا ساتھی ہے۔ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ: کیا ہے اِن پر؟ یعنی اِن پر کیا مصیبت آ جائے گی؟ اِن کا کیا نقصان ہوگا؟ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ: اگر یہ لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں، وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اور پچھلے دن پر ایمان لے آئیں، وَاَنْفَقُوْا: اور خرچ کریں مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ: اس میں سے جو اللہ نے انہیں دیا، وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا: اللہ تعالیٰ ان کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ: بیشک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر، مثقال وزن کو کہتے ہیں، اور ذرۃ: چھوٹی سے چھوٹی چیز، روشندان میں سے دُھوپ اندر آ رہی ہو تو آپ اس میں دیکھیں گے تو غیر محسوس ذرّات اُس میں حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ذرّہ کا مصداق وہ ہے، یا ذرّۃ چیونٹی کے بچے کو کہتے ہیں، بہر حال یہاں شئ قلیل مراد ہے، ''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرے گا ذرہ برابر'' وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً: اور اگر وہ عمل نیکی ہوا، يُّضٰعِفْهَا: تو اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھائے گا، وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا: اور دے گا اپنے پاس سے اجرِ عظیم۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ: پس کیا حال ہوگا جس وقت لائیں گے ہم ہر اُمّت سے گواہ، وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا: اور لائیں گے ہم آپ کو ان لوگوں پر گواہ، يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یومَ اِذْ کانَ کذا، جب معاملہ اس طرح ہوگا، جب یہ حال پیش آئے گا اُس دن چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ: اور جنہوں نے اللہ کے رسول کی نافرمانی کی، چاہیں گے کہ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ: کیا ہی اچھا ہو کہ اُن کے ساتھ زمین برابر کر دی جائے، یعنی اُن کو مٹی کر کے، مٹی کے اندر ملا کر زمین کے ساتھ ان کو برابر کر دیا جائے، ''برابر کر دی جائے اُن کے ساتھ زمین''، وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: نہیں چھپا سکیں گے اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

ماقبل سے ربط

شروعِ سورت سے اصلاحِ معاشرہ کے متعلق اَحکام چلے آ رہے ہیں، اور آپس میں حالات کو سدھارنے کے لئے ہدایات دی جا رہی ہیں، ہر کسی کے حقوق کا تحفظ کیا جا رہا ہے، تفصیل آپ کے سامنے آ چکی۔ زیادہ تر احکام مرد و عورت کے معاملات کے متعلق ہی دیے گئے، اِس رکوع کی ابتدائی آیات بھی اِنہی حالات سے ہی متعلق ہیں۔ پہلے آپ کے سامنے اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق بھی مردوں کے ذمے لگائے ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمے لگائے ہیں، وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (سورۂ بقرہ:۲۲۸) عورتوں کے لئے بھی حقوق ہیں مردوں کے ذمے، جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمے ہیں، جاہلیت کی طرح یہ نہیں کہ عورتوں کا کوئی حق ہی نہیں، اور ان کو اس طرح استعمال کیا جائے جس طرح باقی حیوانات ہوتے ہیں، اور ان کا کوئی مقام اور کوئی حق نہ پہچانا جائے، یہ بات غلط ہے، انسانی برادری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے عورت کو بھی انسانی حقوق حاصل ہیں۔ اور مرد کے ساتھ جس وقت نکاح کا معاہدہ ہوتا ہے تو اس میں جس طرح مرد کے

حقوق عورت پر آتے ہیں اسی طرح عورت کی کچھ ذمہ داریاں مرد پر بھی ڈالی جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض چیزوں میں مرد کو اللہ تعالیٰ نے فوقیت دی ہے، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کا لفظ پہلے بھی آیا تھا، اور یہاں بھی یہی بات کہی جارہی ہے۔

خاندانی نظم کے لئے مرد اور عورت کی ذمہ داری کا تعین

خاندانی اُمور کو دُرست رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس خاندان کا کوئی نہ کوئی سربراہ ہو، ویسے بھی اجتماعی زندگی کا اُصول ہے کہ اگر کچھ لوگ مل کر وقت گزارنا چاہتے ہیں تو جب تک اُن میں سے ایک کو مُطاع اور حاکم قرار نہیں دیا جائے گا اور باقی لوگ اُس کے اَحکام کی پابندی نہیں کریں گے تو کسی طرح بھی اجتماعی زندگی نبھ نہیں سکتی، ملکوں کے لئے بادشاہ اور صدر اسی فلسفے کے تحت ہیں، قبیلوں کے سردار اسی فلسفے کے تحت ہیں، تو یہ گھریلو زندگی میں خاندان بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہوتی ہے جس میں چند افراد مل کر وقت گزارتے ہیں، تو جب تک اِس میں کسی کو سربراہ متعین نہ کیا جائے، اور اُس کو یہ حق نہ دیا جائے کہ باقی لوگ اِس کی ہدایات کی پابندی کریں گے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے، اُس وقت تک یہ خاندانی نظام بھی درست نہیں رہ سکتا، جیسے ریاستوں کا، ملکوں کا، اور جماعتوں کا نظام درست نہیں ہوتا جب تک اُن میں کوئی امیر نہ ہو، اسی طرح خاندان کے نظم کے لئے بھی کسی ایک کو سربراہ متعین کرنا ضروری ہے۔ اب وہ سربراہ کس کو متعین کیا جائے، مرد کو یا عورت کو؟ اِن میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نشاندہی یہ فرماتے ہیں کہ خاندان کی سربراہی کے لئے مرد موزوں ہیں عورتیں موزوں نہیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ یوں تقسیم کردیا گیا کہ خاندان کی سربراہی مرد کے لئے اور گھریلو ذمہ داریاں اور مرد کے اَحکام کی پابندی یہ عورت کے ذِمّے، یہ تقسیمِ کار ہوگیا، جیسے سربراہِ مملکت ایک ہوتا ہے اور باقی چھوٹے چھوٹے اندرونِ ملک نظام سنبھالنے کے لئے متعین کردیئے جاتے ہیں، یا جیسے ملکوں کے لئے ایک وزیر خارجہ ہوتا ہے اور ایک وزیر داخلہ ہوتا ہے، تو عورت کی حیثیت اپنے خاندان کے اندر وزیر داخلہ کی ہے، گھر کے نظم کو درست رکھنا اُس کے ذِمّے ہے، بچوں کی نگہداشت اور گھر بار کی حفاظت یہ تو عورت کرے، تاکہ اندرونِ خانہ زندگی سے مرد بےفکر ہو، اُس کی طبیعت میں کسی قسم کی تشویش نہ ہو، کہ میں نے بچوں کو کپڑے پہنانے ہیں، بچوں کا منہ دھونا ہے، اِن کو کھانا کھلانا ہے، اِن کو سلانا ہے، اور گھر کی صفائی کرنی ہے، سامان سنبھالنا ہے، اِدھر سے یہ بےفکر ہو۔ اور باہر کے معاملات جتنے ہیں، کمانے کے اور کاروبار کے، اور باہر کی ذمہ داریاں، وہ ساری کی ساری مرد کے ذِمّے ہیں۔ جب اس طرح تقسیم ہوجائے گی تو معاملہ سکون اور وقار کے ساتھ ہوتا چلا جائے گا اور خاندانی سکون نصیب ہوجائے گا۔ اور اگر ذمہ داریاں یوں تقسیم نہ کی جائیں، بلکہ عورت کہے کہ میں بھی مرد کے برابر ہوں، اور ہر میدان میں برابری ہے، کاروبار میں بھی ساتھ شریک، ملازمت میں بھی ساتھ شریک، اور باہر کی ذمہ داریاں بھی عورت اپنے اوپر لینے کی کوشش کرے، اور مرد کو کہے کہ اندر کی ذمہ داریوں میں تو بھی ساتھ شریک ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کا نظام خراب ہوجائے گا، باہر کی ذمہ داریاں عورت نہیں نبھاسکے گی، اور اگر باہر کی ذمہ داریاں نبھائے گی تو اندر کی نہیں نبھاسکتی، اور مرد اندر کی ذمہ درایاں قبول کرلے گا تو باہر کی ذمہ داریاں نہیں نبھاسکتا، اگر اُس نے باورچی خانے میں بیٹھنا ہو اور بچوں کو سنبھالنا ہو تو باہر دُکانداری، کاروبار، ملازمت اور آنا جانا

کس طرح ہوسکے گا؟ اور بعض کام ایسے ہیں جن میں قدرتی طور پر مرد عورت کے ساتھ شریک ہو ہی نہیں سکتا، مثلاً عورت اور مرد آپس میں معاہدہ کریں کہ ہر معاملے میں مساوات ہے، بالکل برابر سرابر، ایک بچہ تُو جنا کر اور ایک میں جنا کروں گی، اور اسی طرح باقی معاملات میں بھی برابری کرنے کی کوشش کریں تو یہ فطرت سے جنگ ہے، اور کیا ہوگا؟ بعض چیزیں اس طرح اللہ تعالیٰ نے تقسیم کردی ہیں، اب عورت جس وقت بچہ جننے کے لئے مشغول ہوجاتی ہے تو اس کو جس قسم کی تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے اور جس قسم کی اُس پر باتیں گزرتی ہیں مرد اُس میں شریک ہوسکتا ہے؟ مرد تو پانچ منٹ میں اس سے فارغ ہوگیا اور اس کو دو سال کے لئے مشغول کردیا، اب لازماً عورت کو کچھ مراعات اِس قسم کی دینی پڑیں گی کہ وہ کمانے سے بےفکر ہو، باہر کے اُلجھاؤ سے بےفکر ہو، باہر کی لڑائی بھڑائی سے بچی ہوئی ہو، معاشی ذمہ داریاں اُس کے اُوپر نہ ہوں، یہ سارے بوجھ مرد اُٹھائے، تب جا کے گھر کا انتظام ٹھیک رہ سکتا ہے، یہی فلسفہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں واضح فرمایا کہ مرد عورتوں کے اُوپر نگہبان ہیں، کنٹرولر ہیں، اُن کو سنبھالنے والے ہیں، اُن کے کفیل ہیں، اُن کے ذمہ دار ہیں، ان کے اُوپر حاکم ہیں، قوّام کے اندر یہ سارے مفہوم ہیں، اِس میں مردوں کا مقام عورتوں کے مقابلے میں متعین کردیا گیا کہ یہ ذمہ داری ان پر ہے۔

مرد کو خاندان کا سربراہ بنانے کی وجوہات

اِن پر ذمہ داری کیوں ڈالی گئی؟ یہ بھی ایسے نہیں کہ بلاوجہ ہی ایک کو حاکم اور حاکم اور دوسرے کو محکوم بنادیا، بلکہ یہاں عورتوں پر مردوں کو فوقیت کی دو وجہیں بیان کردیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، بعض کو فضیلت دی ہے اِس سے مراد مرد ہیں، اور بعض پر فضیلت دی ہے اس سے مراد عورتیں ہیں، یہ فضیلت غیر اختیاری ہے جس کو ہم خلقی فضیلت کہہ سکتے ہیں، مرد میں بدنی قوت زیادہ، دفاع کی صلاحیت زیادہ، علمی اور عملی قوتیں عورت کی بنسبت اِس میں بہت زیادہ ہیں، یعنی آپ اندازہ کرتے رہتے ہیں کہ عورت اکیلی سفر پر جائے تو ہر کسی کا دِل دھڑکتا ہے، وہ دو اور تین بھی مل جائیں تو یونہی کہتے ہیں کہ "لو جی! لڑکیاں اکٹھی ہوکر اکیلی چلی گئیں!" تو وہ "اکیلی" ہی ہوتی ہیں بےشک دس ہی کیوں نہ ہوں! اور اگر اُن کے ساتھ ایک مرد ہوتا ہے تو وہ اکیلی نہیں سمجھی جاتیں، اور مرد اکیلا پھرتا رہے تو کوئی نہیں کہتا کہ خطرہ ہے، اکیلا ہی سفر پر چلا گیا، اُس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے اندر دِفاع کی قوت نہیں ہے، اگر اِس پر کوئی ہاتھ ڈالنا چاہے تو یہ اپنا بچاؤ نہیں کرسکتی، اور مرد کے اندر دِفاع کی قوت ہے۔ اسی طرح بدنی طاقت اور زور، کہ جس قسم کے محنت اور مشقت کے کام مرد کرسکتا ہے عورت نہیں کرسکتی، اگر آپ نظر ڈالیں گے تو بداہۃً آپ کو یہ فرق معلوم ہوگا کہ عورتوں کی حیثیت مردوں کے مقابلے میں اس طرح ہے جیسے پھول اور کلیوں کی ہوتی ہے، کہ انسان اگر مسلنا چاہے تو مسل کر رکھ دے، تو یہ جو اللہ تعالیٰ نے مرد کو بڑھوتری دی ہے کہ بدنی قوت زیادہ ہے، علمی صلاحیت زیادہ ہے، دماغی صلاحیتیں زیادہ ہیں، مشکلات برداشت کرنے کا جذبہ زیادہ ہے، یہ تو خلقی فضیلت ہے جو اللہ نے مردوں کو عورتوں پر دی ہے، یہ فضائل بھی تقاضا کرتے ہیں کہ سربراہی مرد کے سپرد کی جائے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاشی ذمہ داریاں عورت پر نہیں ڈالیں، مرد پر ڈالی ہیں، اور جو خرچ کیا کرتا ہے وہ بالادست ہوتا ہے، اور جس پر خرچ کیا جائے وہ زیردست ہوتا ہے، یہ ایک

اختیاری بات ہے کہ جس وقت مرد نے معاشی ذمہ داریاں قبول کرلیں تو اب سربراہی اُسی کے پاس ہی ہونی چاہیے، وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ: جو وہ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، تو یہ جو معاشی ذمہ داریاں ان پر ہیں وہ بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ حاکمیت مَردوں کی ہو۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ معاشی ذمہ داریوں میں عورت مرد کے ساتھ شریک نہیں ہے، اُس کا پورے کا پورا خرچ مرد کے سر پر ہے، جس وقت تک وہ شادی شدہ نہیں ہوتی تو باپ اُس کا کفیل ہے، اور جس وقت اس کی شادی ہوگئی تو خاوند کفیل ہے تو کمانا عورت کا کام نہیں، مرد کا کام ہے، اور بدءِ فطرت سے یعنی شروع سے ہی یہ بات ہے، سورۂ طٰہٰ میں آپ کے سامنے آئے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت میں آدم اور حوا کو ٹھہرایا، اور ٹھہرانے کے بعد خبردار کیا کہ ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں بہکا دے اور جنت سے نکال دے، وہاں ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس قسم کے الفاظ بیان فرمائے ہیں: لَا یُخۡرِجَنَّكُمَا مِنَ الۡجَنَّةِ فَتَشۡقٰى: تمہیں شیطان نکال نہ دے، تَشۡقٰى یہ آگے مفرد کا صیغہ آگیا، تم دونوں کو نہ نکال دے شیطان، فَتَشۡقٰى: پھر مشقت میں تُو پڑ جائے گا، یعنی نکلیں گے دونوں اور مشقت میں تُو پڑ جائے گا، مشقت میں تُو کیسے پڑ جائے گا؟ آگے لفظ ہیں کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَلَا تَعۡرٰى: یہاں بھوک نہیں لگتی، تم ننگے نہیں ہوتے، وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰى (آیت: ۱۱۷ تا ۱۱۹) اور نہ پیاسے ہوتے ہو، نہ دُھوپ لگتی ہے۔ لَا یُخۡرِجَنَّكُمَا: شیطان تم دونوں کو نہ نکال دے، اب نکلنا دونوں نے ہے، آدم اور حوا نے، لیکن آگے ذکر کیا ہے تَشۡقٰى کہ مشقت میں تُو پڑ جائے گا، کون سی مشقت؟ بھوک کی مشقت، پیاس کی مشقت، اور لباس کی مشقت، اور دُھوپ کی مشقت، بھوک لگے گی تو روٹی کی فکر تجھے ہوگی، پیاس لگے گی تو پانی کی فکر تجھے ہوگی، ننگے ہوگے تو کپڑے کی فکر تجھے ہوگی، دُھوپ لگے گی تو مکان کی فکر تجھے ہوگی، یعنی جنت میں اللہ تعالیٰ نے جو ضرورتیں پوری کی تھیں یہی کھانا پینا، رہنا سہنا ہی تھا، روٹی، کپڑا، مکان یہ تین بنیادی ضرورتیں ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ نے مرد کے اُوپر ڈال دیں، ورنہ جنت سے باہر تو دونوں نے نکلنا تھا، تو پھر مشقت اگر آتی تو دونوں پر آتی، ایسے نہیں، بلکہ فرمایا کہ مشقت ساری تیرے پہ آئے گی، روٹی کا انتظام تجھے کرنا پڑے گا، کپڑے کا انتظام تجھے کرنا پڑے گا، مکان کا انتظام تجھے کرنا پڑے گا، تو وہاں (سورۂ طٰہٰ) سے معلوم ہوتا ہے کہ بدءِ فطرت سے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِن چیزوں کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے، کہ مشقت مرد اُٹھاتا ہے عورت نہیں اُٹھاتی، یہ فوقیت کی ایک وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِنفاق مرد کے ذِمّے لگایا ہے۔ یہ تو مَردوں کا کام ہوا۔

نیک عورتوں کی صفات

اب یہ بتایا جارہا ہے کہ نیک عورتیں، اللہ تعالیٰ کو پسند عورتیں کون سی ہوتی ہیں؟ فَالصّٰلِحٰتُ: پس نیک عورتیں وہ ہوتی ہیں جو خاوند کی فرمانبردار ہوتی ہیں، خاوند کی فرمانبرداری کرنے والی، تو یہ عورتوں کا کام ہے، قٰنِتٰتٌ: اطاعت کرنے والی ہیں، حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ: اور نیک عورتیں وہ ہوا کرتی ہیں جو خاوندوں کے اَسرار کی حفاظت کرنے والی ہیں، یہ بھی عورت پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، کیونکہ خاوند کے ساتھ اُس کی بیوی زندگی میں اس طرح شریک ہوتی ہے کہ نہ تو گھر کا کوئی راز اُس سے چھپا ہوا ہوتا ہے، کہ مال ودولت کہاں رکھا ہوا ہے اور کتنا گھر میں ہے، اور اسی طرح خاوند کی مخفی سے مخفی کمزوریوں سے وہ واقف ہوتی ہے، اس لئے اگر

عورت مرد کی پردہ دار نہ ہوتو مرد کبھی باعزت نہیں رہ سکتا، اور کبھی اپنے جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتا، عورت راز دار ہونی چاہیے، وہ گھر کی بھید کی بات کسی کو نہ بتائے، اُس کی حفاظت کرے، جو چھپانے کی چیزیں ہیں اُن کو چھپا کر رکھے، مرد کی خامیاں لوگوں کے سامنے نمایاں نہ کرے، اور گھر کے راز جس قسم کے ہوا کرتے ہیں وہ لوگوں کے سامنے نہ کھولے، عورت کی ذمہ داری ہے اِن چیزوں کی حفاظت کرنا، نیک عورت وہ ہوا کرتی ہے جو راز دار ہو، جو خاوند کے اور گھر کے اُسرار کو چھپانے والی ہو، اُن کی نگہداشت کرنے والی ہو، ورنہ اگر عورت ہی جاسوس بن کر گھر میں بیٹھی ہوئی ہو اور اندر کی باتیں باہر نکالنے والی ہو تو ہر تیسرے دن آدمی لُٹ جائے، اور اپنی کمزوریوں کی بناء پر روزانہ لوگوں سے پٹے، کوئی خامی خاوند کی ایسی نہیں ہوتی جس پر بیوی مطلع نہ ہو، ہر خامی سے واقف ہوتی ہے، اسی لئے تو جس کی بیوی اُس کی معتقد ہو جائے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ وہ بہت اچھا شخص ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے جو کمالات ذکر کئے جاتے ہیں اُن میں بنیادی طور پر اس بات کو ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی بہت مداح تھیں، اور انہوں نے جو حضور ﷺ کا نقشہ کھینچا ہے اُس وقت جب حضور ﷺ غار سے آئے تھے اور آ کر کہا تھا کہ مجھے تو اپنی جان کا اندیشہ ہو گیا، اِس قسم کے حالات میرے سامنے آ گئے ہیں، تو بہت بنیادی اخلاق ہیں جو ایک اچھے سے اچھے انسان کے اندر پائے جاسکتے ہیں، اور شہادت بیوی نے دی ہے، یہ آپ کے بہت بڑے باکمال ہونے کی ایک بنیادی شہادت ہے جو بیوی نے دی۔ تو حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ میں یہ بات ہو جائے گی۔ اور دوسرا ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ جب خاوند گھر میں موجود نہ ہو تو وہ عزت کی حفاظت کرتی ہے، خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہے، اُس کے بال بچوں کی حفاظت کرتی ہے، اور وقتِ غیبوبت کو اس لئے ذکر کر دیا کہ جب خاوند گھر میں موجود ہوتا ہے تو اُس وقت تو عموماً عورتیں اس قسم کی حفاظت کر لیتی ہیں، اور خاوند کی موجودگی میں کسی خلل کا اندیشہ نہیں ہوتا، عزت و ناموس کا خود خیال رکھتی ہیں، لیکن اصل حفاظت کا پتا چلتا ہے جب خاوند گھر میں موجود نہ ہو، اگر اس وقت وہ کوئی شرارت کرنا چاہیں، مال یا عزت کو نقصان پہنچانا چاہیں تو ایسا کر سکتی ہیں، لیکن نیک بیویاں وہ ہوں گی جو خاوندوں کی عدم موجودگی میں ہر قسم کی نگہداشت کرتی ہیں، بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ: اللہ کی حفاظت کے ساتھ، بتوفیقِ الٰہی، بحفاظتِ الٰہی وہ خاوندوں کے پشت پیچھے حفاظت کرنے والی ہیں ہر قابلِ حفاظت چیز کی۔ تو عورتوں کے لئے یہ معیار ذکر کر دیا گیا کہ اچھی عورتیں یہ ہیں۔

بیوی کی اِصلاح کے لئے پہلا درجہ

اب جس وقت مَردوں کو حاکم بنا دیا گیا اور عورتوں کو محکوم بنا دیا گیا، تو پھر طبعی طور پر کبھی کبھی حاکم کو اپنے محکوم کی اصلاح کی ضرورت بھی پیش آ جاتی ہے، اب اگر تو وہ اپنے منصب سے ہٹنے کی کوشش کرے، کہ محکوم تو ہے لیکن وہ حکومت قبول نہیں کرتا، اور ہدایات کی پابندی نہیں کرتا، ایسا بھی ہوسکتا ہے، تو پھر اگر حاکم کے پاس اصلاح کی کوئی قوت نہ ہو تو تب بھی معاملہ گڑبڑ ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسی تدبیر کو بتاتے ہیں کہ اگر اس قسم کا تمہیں اندیشہ پیدا ہو جائے کہ ہدایات کی پابندی نہیں کریں گی، اُن کی طرف سے نشوز ہے، اُن کی طرف سے ناموافقت ہے، سرکشی ہے، تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اُن کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ، اُنہیں وعظ کرو، نفع نقصان سمجھاؤ کہ دیکھو جس طریقے پر تم چلنے لگی ہو اور یہ کہتی ہو کہ ''میرا بھی اسی طرح حق ہے کہ میں بھی آزاد پھروں جس طرح تو آزاد پھرتا

ہے، اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم تو گھر میں پابند رہیں اور تُو سارا دن باہر پھرتا رہے، ہم بھی اسی طرح سے پھریں گی، اور جس قسم کی ذمہ داریاں ہم پر ڈال دی گئی ہیں یہ ہم پر ظلم ہے، یہ زیادتی ہے، ہم اِن ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں" حالانکہ عقدِ نکاح ہو جانے کے بعد قبول تو کر لیں، اُصولاً محکوم تو بن گئیں، لیکن اب وہ ان ذمہ داریوں سے اگر کتراتی ہیں تو پہلے اُنہیں سمجھاؤ کہ یہ نیک عورتوں کا کام نہیں ہے، اور یہ خاندانی زندگی کو برباد کرنے والی بات ہے، سکون نہیں رہے گا، سکون اسی صورت میں ہے کہ تم گھر میں رہو اور مرد کی محکوم ہو کے رہو، اِس طرح اُن کو نفع نقصان سمجھاؤ، اللہ کا خوف دلاؤ، خاوند کی فرمانبرداری پر رسول اللہ کے ذریعے سے جو اللہ تعالیٰ نے وعدے کیے ہیں وہ انہیں یاد دلاؤ، حدیث شریف میں بہت ساری روایات آتی ہیں۔ اگر وہ اس طرح سے ٹھیک ہو جائیں تو بہت اچھی بات ہے، کہ وعظ ونصیحت سے ہی کام چل گیا۔

دُوسرا درجہ

اور اگر وہ وعظ ونصیحت سے متاثر نہیں ہوتیں تو پھر دوسرے نمبر پر تنبیہ ہے، کہ ان کے پاس لیٹنا چھوڑ دو، یعنی رہو گھر کے اندر ہی، گھر سے باہر نہ جاؤ، لیکن اِعراض اتنا سا نمایاں ہو جائے کہ اُن کا بستر علیحدہ کر دو، اُن کی چارپائی علیحدہ کر دو، تو یہ عورت کے لئے ایک بہت بڑی تنبیہ ہے، تنبیہ اس اعتبار سے ہے کہ عورت اگر اپنے ماں باپ کا پیار چھوڑ کر اور بہن بھائیوں کی ہمدردی چھوڑ کر خاوند کے گھر آیا کرتی ہے تو وہ کوئی روٹی کے لئے نہیں آیا کرتی، کپڑے کے لئے نہیں آیا کرتی، روٹی کپڑا تو ہو سکتا ہے کہ اُس کو ماں باپ کے گھر آپ کے گھر سے بھی اچھا ملتا ہو، وہاں وہ زیادہ ناز نخرے کے ساتھ رہتی ہے، کھانے کو بھی اچھا ملتا ہے، پہننے کو بھی اچھا ملتا ہے، سارے اُس کے ساتھ محبت بھی کرتے ہیں، تو یہ خاوند کے ساتھ عورت کا جو تعلق ہے اُس میں اصل نوعیت ادائے حقوق والی ہے یعنی یہ زوجیت والا تعلق، اور اگر خاوند اُس سے اعراض کر لے اور اُس کے ساتھ بیویوں والا پیار نہ کرے تو یہ عورت کے لئے بدترین قسم کی ذہنی سزا ہے، اور کوئی شریف عورت اِس بات کو برداشت نہیں کر سکتی، اکثر وبیشتر اِن کے پیچ اور اِن کے بَل اِس اعراض کے ساتھ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو تبھی ہو سکے گا کہ جب مرد اپنی حاکمیت کو بچائے ہوئے ہو، اور اپنے آپ کو وہ سمجھتا ہو کہ میں بالادست ہوں، اور اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہو، ورنہ اگر عورت ذہن پر مسلط ہو جائے تو عورت دھمکی دیتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ میں قریب نہیں آنے دُوں گی، پھر یوں مطالبے منوالیتی ہے، اُلٹا حساب ہو جاتا ہے، یعنی دھمکی تو مرد کی طرف سے ہونی چاہیے تھی، لیکن اب یوں ہوتا ہے کہ عورت دھمکی دیتی ہے، اور جب وقت آتا ہے تو مطالبے سامنے رکھ دیتی ہے کہ پہلے یہ مانو یہ مانو تو پھر یہ ہوگا، اِس کا مطلب یہ ہے کہ مرد اپنے منصب سے ہٹ گیا اور یہ غالب ہونے کی بجائے مغلوب ہو گیا، مرد نے جہاں اور بہت سارے کام کرنے ہیں اُس کو اپنی شہوت پر بھی اتنا کنٹرول ہونا چاہیے کہ عورت اُس کے اِس جذبے سے فائدہ نہ اُٹھا سکے، اور اگر یہ اُس کو اِس طرح سے دل دے بیٹھا اور شہوت سے اتنا مغلوب ہے تو یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے، اللہ تو کہتا ہے کہ تم اُنہیں چھوڑ دو، لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ عورتیں اپنا مطالبہ منوانے کے لئے مرد کو چھوڑتی ہیں، اور قریب نہیں آنے دیتیں جب تک ان کا مطالبہ نہ مان لیا جائے، یہاں پھر معاملہ گڑ بڑ ہو جاتا ہے۔ تو اس حکم کی حکمت یہی ہے کہ مرد اپنی حاکمیت کی شان بحال رکھے، وہ اپنے اِن

جذبات کے تحت عورت کے سامنے نیچا نہ ہو، بلکہ عورت کو بتائے کہ میں تیرے بغیر گزارہ کرسکتا ہوں، اس لئے اگر تُو سیدھی نہیں ہوتی تو چل! وہ تیرا بستر اور یہ میرا بستر، اور یہ عورت کے لئے ایک بہت بڑی تنبیہ ہے۔

تیسرا درجہ

اگر اِس کے ساتھ بھی معاملہ ٹھیک نہ ہو، کہ وہ کوئی زیادہ سخت واقع ہورہی ہے، تو پھر آگے ضَرَبَ یَضْرِبُ کے باب (یعنی مارنے) کی بھی اجازت ہے۔ قرآنِ کریم میں تو اتنا ہی آیا ہے کہ وَاضْرِبُوْهُنَّ: انہیں مارلیا کرو، لیکن سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسے طور پر مارو کہ ''ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ''(۱) جو بدن پر نشان نہ چھوڑے، مطلب یہ ہے کہ جس میں کھڑکا زیادہ ہو اور چوٹ کم لگے، کھڑکا زیادہ ہونے کے ساتھ ذرا ذہن پہ رُعب پڑتا ہے، اور بدن پر نشان نہ پڑے، کوئی ہڈی نہ ٹوٹے، یہ حضور ﷺ نے بیان فرمایا، لیکن ساتھ یہ کہا کہ اچھے لوگ یہاں تک نہیں پہنچتے، عورتوں کو مارا نہیں کرتے، بہت ہی مجبوری اگر ہوجائے تو ہاتھ اُٹھانے کی اجازت ہے، تو اپنے زیردستوں کو سیدھا رکھنے کے لئے اس قسم کی چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اِس کی بھی اجازت دی ہے۔

عورتوں کے ساتھ سلوک کرتے ہوئے اللہ کی کبریائی کو مستحضر رکھیں

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ: پھر اگر اس طرح کرنے کرانے سے وہ تمہاری فرمانبردار ہوجائیں تو پھر پچھلی باتیں بھلا دیا کرو، پھر خواہ مخواہ اُن کے اُوپر الزام کے لئے راستے نہ تلاش کرو، کہ اِنہیں پھر مارنے کا یا اِنہیں تنگ کرنے کا کوئی بہانہ ملے، یہ تمہارے لئے بھی اچھی بات نہیں ہے، پہلے جو بات ہوگئی اُس کو فراموش کردو، پھر سیدھے ہو کر رہو اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے نبھا کرو۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ علوّ والا ہے کبریائی والا ہے'' اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے اِن عورتوں پر بلندی دی ہے تو تم پر بھی کوئی بلند ہے، اُس کے علوّ اور کبریائی کو مستحضر رکھو، آج یہ تمہاری زیردست ہیں، اگر اِن کے حقوق تلف کروگے اور اپنے زیردستوں کا خیال نہیں کروگے تو کوئی زبردست تمہارے اُوپر بھی ہے، اور یہ ایک ایسا تصوّر ہے جو اِنسان کو ادائے حقوق کے لئے پابند کرتا ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی اپنے کسی غلام کو مار رہے تھے، اور پیچھے سے حضور ﷺ نے آواز دی ''اِعْلَمْ اَبَا مَسْعُوْدٍ! لَلّٰهُ اَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ''(۲) اے ابومسعود! اللہ تعالیٰ تیرے اُوپر زیادہ قدرت رکھنے والا ہے بمقابلہ تیرے اِس پر، جتنی تجھے اِس پر قدرت حاصل ہے، اللہ تیرے اُوپر زیادہ قدرت رکھنے والا ہے، یعنی اگر یہ عارضی طور پر تمہارے غلام بن گئے اور زیردست آگئے تو تم بھی کسی کے ماتحت ہو، اِس بات کا خیال رکھا کرو، اپنے ساتھ بڑوں کی طرف سے جیسا برتاؤ چاہتے ہو، اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کرو، اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے علوّ اور کبریائی کو یاد دلا دیا۔

---

(۱) مسلم ۱/۳۹۷ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم/ مشکوٰۃ، ج۱ ص۲۲۵ باب قصۃ حجۃ الوداع کی پہلی حدیث۔
(۲) مسلم ۲/۵۱ باب صحبۃ الممالیک/ مشکوٰۃ، ج۲ ص۲۹۱ باب النفقات، عن ابی مسعود الانصاریؓ

بیوی کی اِصلاح کے لئے چوتھا درجہ

پھر اگر خاندانی حالات خاوند خود ٹھیک نہ رکھ سکے، کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیوی ایسی پلّے پڑ گئی کہ نہ تو وعظ ونصیحت سے مانتی ہے، اور نہ ہی اِس قسم کی ہجران وغیرہ کی دھمکی سے وہ ٹھیک ہوتی ہے، اور مار کر بھی دیکھ لیا تو بھی وہ ٹھیک نہیں ہوتی، تو چونکہ خاندانی تعلقات کی شریعت میں اہمیت بہت زیادہ ہے، کہ یہ گھر کا فساد خاندانوں تک پہنچتا ہے، خاندانوں کا فساد پھر آگے سرایت کرتا ہے، حالات بہت زیادہ خراب ہوجاتے ہیں، اس لیے زوجین اگر خود اپنے حالات کو نہ سدھار سکیں تو بھی اِس کو جلدی سے ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، پھر اگر بات گھر سے باہر نکل آئے، رشتہ داروں میں آجائے، اپنے دوست احباب میں آجائے، تو کچھ لوگ خاوند کے ہمدرد ہوا کرتے ہیں اور کچھ بیوی کے ہمدرد ہوتے ہیں، پھر اگلی اصلاحی اسکیم یہ ہے کہ ایک آدمی تو وہ لے لو جو خاوند کا ہمدرد ہے، اِس کے خاندان میں سے لے لو، جو سمجھدار ہو، حَکَم کے لفظ میں اِس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ وہ آدمی بات سمجھ سکتا ہو، فیصلہ کرسکتا ہو، قوتِ فیصلہ اُس کے اندر موجود ہے، اتنا سمجھ دار ہے، معاملات کو وہ سمجھتا ہے، ایسا آدمی مرد کے ہمدردوں یعنی اس کے خاندان سے لے لو، اور ایک آدمی عورت کے خاندان سے لے لو، یہ دونوں جائیں، جانے کے بعد حالات کا جائزہ لیں، نیک نیتی کے ساتھ وجہِ اختلاف معلوم کریں، جس کی زیادتی ہے اُسے بتائیں کہ تیری یہ زیادتی ہے تو یوں نہ کیا کر، اگر یہ دونوں نیک نیتی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ موافقت پیدا کردے گا، اگر یُّرِیْدَآ کی ضمیر حَکَمین کی طرف لوٹائیں تو پھر ایک شرط زائد لگانی پڑے گی کہ بشرطیکہ زوجین بھی اُن کے فیصلے کو قبول کرلیں، ورنہ اگر یہ اپنے طور پر اچھی سے اچھی تدبیر بتاتے ہیں لیکن زوجین ہی اِن کے فیصلے کو قبول نہیں کرتے تو اصلاح کیسے ہوگی؟ اس لئے اگر اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا کی ضمیر کو زوجین کی طرف لوٹا لیا جائے تو پھر ایک زائد قید لگانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اِن کا ارادہ اگر اصلاح کا ہوگا تو حالات ٹھیک ہوجائیں گے، اور اگر اِن کا ہی ارادہ درست ہونے کا نہیں ہے، خاوند اپنی ضد پہ اڑا ہوا ہے اور وہ کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا، اور بیوی اپنی ضد پہ اَڑی ہوئی ہے، تو حَکَمین جو کچھ کہتے رہیں پھر اصلاح کیسے ہوگی؟ تو اِن حَکَمین کا کام یہی ہے وجہِ اِختلاف معلوم کرکے ہدایات دینا، اور زوجین کا کام ہے کہ اگر وہ اصلاح چاہتے ہیں تو اُن ہدایات کو قبول کریں۔ ہاں! البتہ اگلی بات بھی ہے کہ اگر زوجین اُن کو فیصلے کا اختیار دے دیں تو طلاق تک کا اختیار بھی انہیں دیا جاسکتا ہے، کہ حَکَمین کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر تمہیں معلوم ہو کہ نبھا نہیں ہوتا تو خاوند کہہ دے کہ میری طرف سے اجازت ہے، اور عورت کہہ دے کہ میری طرف سے تمہیں خلع کرنے کی اجازت ہے، تو پھر یہ اختیارات اِن حَکَمین کو حاصل ہوجائیں گے، ورنہ اِن کی اصل پوزیشن یہی ہے کہ حالات معلوم کرکے اُنہیں کوئی اصلاحی تدبیر بتادیں، اگر زوجین میں نیک نیتی ہوئی کہ واقعی وہ حالات کو سدھارنا چاہتے ہیں، تو اگر آپس میں نشاندہی نہیں کرسکے کہ کس کی زیادتی ہے اور کس کو بدلنا چاہیے تو حَکَمین کا فیصلہ قبول کرلینا چاہیے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا: بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے خبر والا ہے۔

حقوق کا بیان جس وقت شروع ہوا تھا تو وہاں بھی اللہ سے ڈرنے کی تاکید کی گئی تھی، اب یہ باب اگلی آیات پر ختم ہو رہا ہے تو اِس میں پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے تقویٰ کی تاکید آ رہی ہے، اور اجمالی طور پر سب کے حقوق ادا کرنے کا ذِکر آ رہا ہے۔

ادائیگیٔ حقوق میں رُکاوٹ بننے والی چیزیں

پھر حقوق کے ادا کرنے میں جو رُکاوٹیں پڑتی ہیں تو بسا اوقات غرور اور فخر باعث ہوتا ہے کہ انسان حقوق ادا نہیں کر پاتا، کہ صاحبِ حق کی اُس کے دل میں کوئی عزت نہیں، اُس کو کوئی وقعت نہیں دیتا، اُس کی تحقیر کرتا ہے، اُس کا کوئی حق نہیں پہچانتا، تو ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر اور ایک دوسرے کے مقابلے میں اکڑ، یہ حقوق کے ادا کرنے میں مانع ہوتی ہے۔ اور اسی طرح حقوق کے ادا کرنے میں بخل مانع ہوتا ہے کہ انسان پیسے خرچ نہیں کرتا، اور جو کچھ اللہ نے اُسے دے رکھا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھتا ہے، ظاہر یہ کرتا ہے کہ میرے پاس ہے ہی کچھ نہیں، یا حقوق کے ادا نہ کرنے میں آخرت کے عقیدے کا ضعف رُکاوٹ بن جاتا ہے، کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ کیا ہے، مجھے کون پوچھنے والا ہے؟ اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی عظمت دل میں نہیں ہوتی، تو آخری آیات میں یہی چیز ذکر کی جائے گی، کچھ آخرت کا خوف دلایا جائے گا، اور بخل کی مذمت کی جائے گی، فخر اور اختیال یعنی تکبر کی مذمت کی جائے گی۔ اور بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی میں دکھلاوے کا جذبہ ہے، کہ جہاں دکھلاوا ہوتا ہو وہاں تو کچھ کر کرا لیتا ہے، جہاں دکھلاوا نہیں ہوتا وہاں کچھ کوتاہی کر جاتا ہے، اس لئے رِیا کی مذمت آئے گی، اس طرح سے اِس باب کو یہاں مکمل کیا جا رہا ہے، اور اگلے رکوع سے کلام کسی اور مضمون کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

حقوق العباد کی ادائیگی کی تاکید

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ: اللہ کی عبادت کیا کرو، وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا: اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا کرو، وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرو۔ "اچھا برتاؤ" کیا ہوتا ہے؟ اِس کی تفصیل آپ کے سامنے ہوتی رہتی ہے کہ مالی خدمت، بدنی خدمت، گفتگو کے آداب کی رعایت رکھتے ہوئے اُن کو خوش رکھنا، اور ان کے دِل کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا، یہ سب احسان میں داخل ہیں، جیسے آگے آئے گا: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ (سورۂ اسراء: ۲۳) کہ والدین کے سامنے ایسے طور پر نہ بولا کرو جس سے اُنہیں تکلیف ہو، اُنہیں اُف بھی نہ کہا کرو، تو گفتگو کے آداب کی بھی رعایت رکھی جائے۔ اور رشتے داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، پڑوسی گویا کہ تین قسم کے ذکر کر دیے گئے، رشتے دار، غیر رشتے دار، اور بالکل عارضی پڑوسی جو کچھ وقت کے لئے انسان کے ساتھ ہم نشین ہو جائے، یا یہ مطلب ہے کہ قریب والا اور دُور والا، کہ جس کا گھر قریب ہے اور جس کا گھر کچھ دُور ہے، اور بالکل عارضی رفیق، اِن سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اِن سب کے متعلق روایات میں تاکید آتی ہے اور حضور ﷺ نے وضاحت کے ساتھ اِن کے حقوق بیان فرمائے ہیں، حدیث شریف میں آپ پڑھتے رہتے ہیں۔

پڑوسی کے حقوق کے متعلّق سخت تاکیدات

پڑوسی کے متعلق تو اتنی تاکید فرمائی، کہ ایک آدمی حضور ﷺ سے پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ! مجھے کیسے پتا چلے کہ میں اچھا ہوں یا بُرا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ تُو اپنے پڑوسیوں کی بات سُن لیا کر، اگر وہ تجھے اچھا کہتے ہیں تو تُو اچھا ہے، اگر وہ تجھے بُرا کہتے

ہیں تو تُو بُرا ہے۔ یعنی اچھے بُرے ہونے کا معیار یہی ہے کہ پڑوسیوں کی نظر میں انسان اچھا ہے یا بُرا؟[1] اور فرمایا کہ مجھے جبریل علیہ السلام نے پڑوسی کے بارے میں اتنی تاکید کی ہے کہ مجھے تو یہ اندیشہ ہوگیا کہ شاید یہ پڑوسی کو وارث ہی بنادے گا۔[2] اتنی تاکید ہے۔ اور وہ تو آپ سنتے ہی رہتے ہیں، عام طور پر لوگ پڑھتے ہیں: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ'' جنت میں داخل نہیں ہوگا، ''مَنْ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ''[3] وہ شخص جس کی تکلیفوں سے اُس کا پڑوسی امن میں نہ ہو، اور یہ بھی روایت ہے کہ کوئی خود سیر ہو کر کھائے اور اُس کا پڑوسی بھوکا ہو ایسا شخص مؤمن نہیں۔[4] ان سب میں پڑوسیوں کے حقوق ذکر کئے گئے ہیں۔

اور وَابْنِ السَّبِیْلِ میں مسافر کا ذکر آ گیا، یعنی اجنبی ہے، چلتا چلتا عارضی طور پر کہیں آٹھہرا ہے، تو اُس کا بھی حق ادا کرو، اُس کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو، روٹی کی ضرورت ہے تو اُسے روٹی دو، ٹھہرنے کی ضرورت ہے تو اُسے جگہ دو، جتنا اس کے ساتھ تعاون کر سکتے ہو کرو۔ اور اپنے غلام اور باندیوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو۔

فخر، بخل اور ریا کی مذمّت

''بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس شخص کو جو اکڑنے والا فخر کرنے والا ہے'' جو دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اس لئے دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی طرف اُس کی توجہ نہیں ہے، اُسے اپنی برتری کا احساس ہے اور وہ دوسرے پر توجہ نہیں کرتا، ایسے لوگ اللہ کو اچھے نہیں لگتے۔ ''اور جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل حکم دیتے ہیں''، لوگوں کو بخل کا حکم دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو عملاً، کہ جب یہ بخل کریں گے تو دوسرا بھی اِن کی ریس کرے گا، دوسرا بھی اِن کی طرف دیکھ کر بخل کرے گا، یا ہمیشہ یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جو شخص بخیل ہو اور وہ مال خرچ نہ کرتا ہو تو وہ کوشش کیا کرتا ہے کہ دوسرے بھی میری طرح بخل کریں، جیسے میں پیسہ بچاتا ہوں دوسرے بھی خرچ نہ کریں اور بچائیں، کیونکہ اگر سارے ہی یوں کرنے لگ جائیں گے تو پھر اس کو بُرا کوئی نہیں کہے گا، اور اگر باقی خرچ کرنے والے ہوں گے اور ایک یہ درمیان میں بخل کرنے والا ہوگا تو پھر سارے اِس کو بُری نگاہ سے دیکھیں گے، اس لیے اس کی کوشش یہی ہوتی ہے۔ بزدل آدمی دوسروں کو بزدل بنانے کی کوشش کرتا ہے، بخیل آدمی دوسروں کو خرچ کرتا ہوا دیکھ نہیں سکتا، بلکہ انہیں بھی کہتا ہے کہ یہاں خرچ نہ کرو، پیسے بچا کر رکھو۔ ایک آدمی اگر ناک کٹا ہو تو دوسرا کوئی ناک والا ہوگا تو لوگ اِس کو ناک کٹا کہیں گے، اور اگر سارے ہی ناک کٹے ہوں تو پھر اِس کو طعن کون دے گا؟ اسی طرح جس کا ناک کٹ گیا وہ کوشش کرتا ہے کہ باقیوں کا بھی کٹا ہوا ہی ہو، تاکہ میرا یہ کٹا ہوا محسوس نہ ہو۔ تو بخیل آدمی باقیوں کو بھی کہے گا کہ یوں پیسے خرچ نہ کرو، اِس طرح نہ کرو، پیسے بچا کر رکھنے چاہئیں، کام آئیں گے، مقصد اُس کا یہ ہے کہ اگر یہ بھی روک رکھیں گے تو مجھے بُرا کوئی نہیں کہے گا، ورنہ اگر باقی لوگ خرچ کرتے رہے تو میرا بخل ہر کسی کو محسوس ہوگا، اور بزدل آدمی دوسروں کے متعلق بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ بزدلی کریں تاکہ ہم

(۱) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۳ باب الشفقة، فصل ثانی، عن ابن مسعود/ ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۱۱ باب الثناء الحسن۔
(۲) بخاری ۲/ ۸۸۹ باب الوصاة بالجار/ مشکوٰۃ، ج ۲ ص ۴۲۲ باب الشفقة، فصل اول، عن عائشہ رضی اللہ عنہا و ابن عمر رضی اللہ عنہ۔
(۳) صحیح مسلم ج ۱ ص ۵۰ باب بیان تحریم ایذاء الجار/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۲، باب الشفقة عن انس رضی اللہ عنہ۔
(۴) مشکوٰۃ ۲/ ۴۲۴ باب الشفقة، فصل ثالث/ شعب الایمان، رقم: ۳۱۱۷

سب ایک جیسے ہو جائیں، ورنہ اگر باقی لوگ بہادری کا مظاہرہ کریں گے اور ایک یہ بزدل ہوگا تو ہر کسی کو محسوس ہوگا۔ بہر حال اپنی باتوں سے اور اپنے عمل سے بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔ ''اور جو کچھ اللہ نے اُن کو دے رکھا ہے اُس کو چھپاتے ہیں'' یعنی پیسے ہیں تو سہی لیکن ظاہر نہیں کرتے تاکہ دوسرا آدمی مطالبہ نہ کر لے، کہ جب تیرے پاس پیسے ہیں تو ہمیں دے، عادت اسی طرح ہوتی ہے کہ جب آدمی کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتا تو طریقہ یہی ہوتا ہے کہ جب گفتگو کرے گا تو کہے گا جی! کیا کریں، فلاں خرچ سر پر پڑ گیا، فلاں جگہ سے گھاٹا آ گیا، فلاں جگہ سے آمدنی نہیں ہوئی، فلاں کو اتنا دینا پڑ گیا، مطلب یہ ہے کہ ظاہر یہ کرنا چاہتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں، اس لئے اگر میں تمہیں نہیں دیتا تو یہ وجہ ہے، کوئی گداگر آ جائے تو اس کے سامنے بھی انسان بسا اوقات یوں باتیں کرنے لگ جاتا ہے، کوئی صاحبِ حق آ جاتا ہے تو اُس کے سامنے بھی اس قسم کی باتیں کرتا ہے، اور جو کچھ اللہ نے اُسے دے رکھا ہے اور جو اس کے پاس جمع ہے اُس کو چھپاتا ہے تاکہ کوئی دوسرا آدمی مطالبہ نہ کرے، یہ اُنہی کی مذمت ہے۔ ''ہم نے ایسے لوگوں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے'' جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپاتے ہیں، ناشکری کرتے ہیں، اور صاحبِ حق کا حق ادا نہیں کرتے۔ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ: اور ایسے ہی وہ لوگ بھی اللہ کو اچھے نہیں لگتے جو دکھلاوے کے لئے مال خرچ کرتے ہیں، کیونکہ جس میں دکھلاوے کا جذبہ ہو وہ بھی صحیح طور پر حق ادا نہیں کر سکتا، جہاں اسے شہرت کی اُمید ہوگی وہاں تو کچھ خرچ کرے گا، اور جہاں دکھلاوا اور شہرت نہیں ہوگی وہاں خرچ نہیں کرے گا۔

اور عقیدے کی کمزوری بھی بسا اوقات حقوق میں خلل ڈالنے کا باعث بن جاتی ہے اس لیے یہاں اُن کی مذمت بھی آ گئی ''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کے دکھانے کے لئے اور نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یومِ آخر پر، اور جس شخص کا شیطان ساتھی بن گیا'' یعنی یہ بُری عادتیں سکھانا شیطان کا کام ہے، یہ شیطانی جذبات ہیں، ''پس وہ بہت بُرا ساتھی ہے۔''

ایمان و اِنفاق کی ترغیب

''کیا نقصان ہے اِن کا اگر یہ ایمان لے آئیں اللہ پر'' یہ ترغیب ہے، ''اگر یہ ایمان لے آئیں اللہ پر اور یوم آخر پر، اور خرچ کریں اُس مال میں سے جو اللہ نے انہیں دیا ہے''، اِن کا کیا نقصان ہے؟ کیا مصیبت اِن پہ آ جائے گی؟ فائدہ ہی فائدہ ہے، ایمان میں بھی فائدہ ہے، اِنفاق میں بھی فائدہ ہے، بخل میں اور روک رکھنے میں فائدہ نہیں، یہ انسان کی ذہنی غلطی ہے، خرچ کرنے میں فائدہ ہے، جیسے پانی جس وقت تک جاری رہتا ہے صاف ستھرا رہتا ہے، اور جہاں رُک کر کھڑا ہو جائے تو بدبودار ہو جاتا ہے، بالکل یہی حیثیت مال کی ہے، اور ویسے بھی کنویں سے اگر پانی نکالتے چلے جاؤ تو نیچے سے اور آتا چلا جائے گا، فائدہ اُٹھاتے چلے جاؤ تو نیچے سے اور جمع ہوتا چلا جائے گا، اور جب نکالنا بند کر دیا جائے تو پانی ایک حد پہ ٹھہر جاتا ہے، پھر وہ مفید نہیں رہتا، بلکہ نقصان دِہ ہو جاتا ہے، اسی طرح تجربے کی بات یہی ہے کہ مال جتنا خرچ کرو گے اتنا ہی اس میں برکت ہوتی ہے، اور اِس کے نقصانات کم ہو جاتے ہیں، فوائد زیادہ ہوتے ہیں، اگر روک کے رکھنا شروع کر دو تو ایسے ہی ہے جیسے پانی سیرابی کا باعث تھا، حیات کا باعث تھا، نباتات کا باعث تھا، لیکن تالابوں میں بند ہونے کے بعد جس طرح بے کار ہو گیا اسی طرح مال کو بھی اگر روک کے رکھ لیا

جائے تو یہ بھی بے کار ہوجاتا ہے، اِس سے پھر کوئی استفادہ نہیں ہوتا، اصل یہی ہے کہ اِس کو حرکت میں رہنا چاہیے، جب حرکت میں رہے گا تو فائدہ ہوگا۔'' اور اللہ تعالیٰ اِن کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرے گا، اگر تمہاری خصلت کوئی نیکی ہے تو اس کو بڑھائے گا اور اپنے پاس سے اجرِ عظیم دے گا۔''

منکرین کے لئے ترہیب

آگے ترہیب ہے ''کیا حال ہوگا جس وقت کہ ہم ہر اُمت سے ایک گواہ لائیں گے؟'' اِس گواہ کا مصداق اُس اُمت کا نبی ہے جو آکر بتائے گا کہ یا اللہ! میں نے تو دِین پورا پورا پہنچایا ہے، باقی اگر اِنہوں نے عمل نہیں کیا تو قصور اِن کا ہے۔ انبیاء ﷺ اُمت کے خلاف گواہی دیں گے۔ ''اور ہم آپ کو بھی اِن لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے'' تو نبی کی شہادت تو ہو جائے گی کہ میں نے سارے کا سارا دِین پہنچادیا، اب اگر دِین قبول نہیں کرو گے اور اُس پر عمل نہیں کرو گے تو پھنس جاؤ گے، پکڑے جاؤ گے۔ ''اور وہ دِن ایسا ہوگا'' جس دن یہ شہادتیں ہوں گی، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے، ''تو کافر لوگ اور رسول کے نافرمان چاہیں گے کہ ان کے ساتھ زمین کو برابر کردیا جائے'' زمین کو برابر کردینے کا مطلب یہ ہے کہ اِن کو مٹی کر کے زمین میں ملا دیا جائے جیسے دوسری جگہ ہے: يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (سورۃ نبا) کافر کہے گا: ہائے کاش! کہ میں مٹی ہوتا اور اِس زمین کے اندر خلط ملط ہوجاتا، اور مجھے کسی قسم کا حساب نہ دینا پڑتا اور عذاب نہ ہوتا۔ تو پھر مٹی بننا چاہیں گے، وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: اور اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو چھپا نہیں سکیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا
اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جایا کرو اس حال میں کہ تم نشے میں ہو جب تک کہ تم جاننے نہ لگ جاؤ اس بات کو جو تم منہ سے
تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى
بولتے ہو، اور نہ قریب جایا کرو نماز کے جنبی ہونے کی حالت میں مگر اس حال میں کہ تم راستے کو عبور کرنے والے ہو جب تک
تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ
کہ تم غسل نہ کرلو، اور اگر تم بیمار ہوؤ یا تم سفر پر ہوؤ یا تم میں سے کوئی آیا ہو جائے ضرورت سے
اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا
یا تم نے عورتوں سے مجامعت کی ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو قصد کیا کرو پاک مٹی کا

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

پھر تم مسح کرلیا کرو اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا، بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے بخشنے والا ہے ﴿۴۳﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ

کیا آپ نے دیکھا نہیں ان لوگوں کی طرف جو کتاب سے ایک حصہ دیئے گئے، وہ اختیار کرتے ہیں گمراہی کو

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ

اور وہ ارادہ کرتے ہیں کہ تم راستے سے بھٹک جاؤ ﴿۴۴﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے،

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا

کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز، اور کافی ہے اللہ مددگار ﴿۴۵﴾ ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے بعض لوگ ایسے ہیں

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ

جو پھیرتے ہیں باتوں کو ان کی جگہوں سے، اور کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا اور نہ مانا، اور تُو سُن اس حال میں کہ تُو

غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ

سنایا ہوا نہیں ہے، اور وہ کہتے ہیں راعنا، اپنی زبانوں کو موڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے، اور اگر

اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا

یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سُن لیا اور مان لیا اور تُو سُن اور تُو ہمارا خیال کر تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا

لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

اور زیادہ درست ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ان کے کُفر کی وجہ سے پس یہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم ﴿۴۶﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا

اے وہ لوگو جو کتاب دیئے گئے! ایمان لے آؤ اُس چیز پر جو ہم نے اُتاری اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے

لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ

اس بات کی جو تمہارے ساتھ ہے (ایمان لے آؤ) قبل اس کے کہ ہم مٹادیں چہروں کو پھر لوٹا دیں ان کو ان کی گدیوں کی ہیئت پر

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

یا قبل اس کے کہ ہم ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا حکم ہو کر رہتا ہے ﴿۴۷﴾

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ

بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور بخش دے گا اس کے علاوہ جس کے لیے

يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ

چاہے گا، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو بیشک گھڑا اُس نے گناہِ عظیم ﴿۴۸﴾ کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف

يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

جو اپنے آپ کو پاک صاف قرار دیتے ہیں، بلکہ اللہ پاک صاف قرار دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور یہ لوگ ظلم نہیں کیے جائیں گے

فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾

تاگا برابر بھی ﴿۴۹﴾ دیکھ تو، کیسے یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، اور کافی ہے یہی بات از روئے صریح گناہ ہونے کے ﴿۵۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ: اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جایا کرو، وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى: اس حال میں کہ تم نشے میں ہو۔ سُکٰرٰی سَکْرَان کی جمع ہے، نشے میں مست، نشے میں دُھت۔ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ: حتّٰی کے بعد محاورۂ نفی کا ترجمہ ہوتا ہے، جب تک کہ تم جاننے نہ لگ جاؤ اُس بات کو جو تم منہ سے بولتے ہو، یعنی نشے کی حالت میں اُس وقت تک نماز کے قریب نہ جایا کرو جب تک کہ تمہیں معلوم نہ ہونے لگ جائے کہ تم منہ سے کیا کہہ رہے ہو، وَلَا جُنُبًا: یہ بھی حال واقع ہو رہا ہے اور اِس کا عطف اَنْتُمْ سُکٰرٰی پر ہے، اور لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ میں جو نفی آئی ہوئی ہے یہ لَا جُنُبًا کا لَا اسی کی تاکید ہے، ''اور نہ قریب جایا کرو نماز کے جنبی ہونے کی حالت میں''۔ اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ: مگر اس حال میں تم راستے کو عبور کرنے والے ہو، عَابِرِیْ اصل میں عابرین تھا، اضافت کی وجہ سے نون گر گیا، اور یہ بھی حال واقع ہو رہا ہے، عابرینِ سبیل سے مراد مسافرین، اور سفر کی حالت میں جنبی ہونے کی حالت میں بھی بعض صورتوں میں نماز پڑھی جاسکتی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا: اس کا تعلق جُنُبًا کے ساتھ ہے، لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ جُنُبًا حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا، جنبی ہونے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو جب تک کہ تم غسل نہ کرلو، حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا: حتّٰی کے بعد وہی محاورۂ نفی کا ترجمہ! ''جب تک کہ تم نہا نہ لو، غسل نہ کرلو''۔ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى: مَرْضٰی مریض کی جمع، اگر تم بیمار ہو، اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: یا تم سفر پر ہو، اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ: غائط کا لفظی معنی ہے پست زمین، یعنی یہ گڑھے وغیرہ جو

ہوتے ہیں، عام طور پر چونکہ عادت یہی ہے کہ انسان قضائے حاجت کے لئے پست زمین کو اور گڑھے کو تلاش کرتا ہے تاکہ دوسری طرف سے کسی آدمی کی نظر نہ پڑے، تو اُب غائط کا لفظ بول کر کنایہ ہوتا ہے قضائے حاجت سے، ''تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے آیا ہو'' یعنی پیشاب پاخانے سے فارغ ہو کر آیا ہو، جس کے ساتھ حدثِ اصغر لاحق ہو جاتا ہے، وضو کی ضرورت پیش آجاتی ہے، ''یا تم نے عورتوں سے ملامست کی ہو'' ملامست مجامعت کے معنی میں ہے، جس سے انسان جنبی ہو جاتا ہے اور غسل کی ضرورت پیش آتی ہے، ''یا تم نے عورتوں سے مجامعت کی ہے'' فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً: پھر تم پانی نہ پاؤ، فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا: تو قصد کیا کرو پاک مٹی کا۔ صعید وجہ الارض کو کہتے ہیں، یعنی زمین کی سطح۔ اور طیب کا معنی پاک۔ ''پاک مٹی کا قصد کیا کرو''، اور پاک مٹی سے طہارت حاصل کرنے کے لئے قرآنِ کریم میں چونکہ تیمموا کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لیے اصطلاحِ فقہاء میں اب اِس طریقۂ طہارت کو تیمم سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے، تیمم کا اِصطلاحی معنی ہے مٹی سے طہارت حاصل کرنا، ورنہ اِس کا لفظی معنی قصد کرنا ہے، آپ کے سامنے پہلے گزر چکا: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (سورۂ بقرہ: ۲۶۷) کہ مال میں سے تم ردّی مال کا قصد نہ کیا کرو خرچ کرنے کے لئے۔ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ: پھر تم مسح کر لیا کرو اپنے چہروں کا، وَاَيْدِيْكُمْ: اور اپنے ہاتھوں کا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا: بیشک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا ہے، معاف کرنے والا ہے، بخشنے والا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ: کیا آپ نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کی طرف جو کتاب سے ایک حصہ دیے گئے، يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ: اختیار کرتے ہیں وہ گمراہی کو، وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ: اور وہ ارادہ کرتے ہیں کہ تم راستے سے بھٹکے جاؤ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ: اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا: کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز، وَكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا: اور کافی ہے اللہ مددگار۔ بِاللّٰهِ پر باء زائدہ ہے اور اللہ، كَفٰى کا فاعل ہے۔ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے بعض لوگ ایسے ہیں، مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا فریقٌ، یا، مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا رِجالٌ، اُن لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے کچھ لوگ ایسے ہیں يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: جو بدلتے ہیں، پھیرتے ہیں باتوں کو اُن کی جگہوں سے، مواضع موضِع کی جمع، کلمات کو اُن کی جگہوں سے ہلا دیتے ہیں، پھیر دیتے ہیں، تحریف پھیرنے کو اور موڑنے کو کہتے ہیں، یعنی لفظ جس معنی پر محمول ہوتا ہے اُس پر اُس کو محمول نہیں کرتے بلکہ اُس کا مطلب کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں، وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا: اور کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا، وَعَصَيْنَا: اور ہم نے نافرمانی کی، ہم نے سُن لیا اور نہ مانا، وَاسْمَعْ: اور تُو سُن، غَيْرَ مُسْمَعٍ: اس حال میں کہ تُو سنایا ہوا نہیں ہے، وَّرَاعِنَا: اور وہ کہتے ہیں رَاعِنَا۔ لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ: اپنی زبانوں کو موڑتے ہوئے، وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ: اور دین میں طعن کرتے ہوئے، لَيًّا مصدر ہے، لَوٰى يَلْوِيْ لَيًّا: موڑنا۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا: اور اگر یہ لوگ کہتے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا: ہم نے سُن لیا اور مان لیا، وَاسْمَعْ: اور تُو سُن وَانْظُرْنَا: اور تُو ہمارا خیال کر، لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا، وَاَقْوَمَ: اور زیادہ درست ہوتا، وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ: لیکن اللہ تعالیٰ نے اِن کے اوپر لعنت کی اِن کے کُفر کی وجہ سے فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: پس یہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: اے وہ لوگو! جو کتاب دیے گئے اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: ایمان لے آؤ اُس چیز پر جو ہم نے اُتاری اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے اس بات کی جو تمہارے ساتھ ہے مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا: ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم مٹا دیں چہروں کو۔ طَمس: مٹا دینا، کسی چیز کے آثار، علامات، نشانات مٹا دینا۔ قبل اِس کے کہ ہم مٹا دیں

چہروں کو، فَنَرُدَّهَا: پھر لوٹا دیں اُن چہروں کو، عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ: علیٰ هَيْئَةِ اَدْبَارِهَا، اَدبار دُبر کی جمع ہے، ''اُن چہروں کی پچھلی جانب کی ہیئت پر'' پچھلی جانب سے مراد گدی کی جانب، یعنی جس طرح تمہاری گدی کی طرف کسی چیز کا کوئی نشان نہیں ہے اسی طرح ہم اگلا حصہ بھی مسخ کر کے، یہ نشانات مٹا کر اس کو ایسے ہی کر دیں جیسے پچھلا حصہ ہے، ''قبل اس کے کہ مٹا دیں ہم چہروں کو پھر لوٹا دیں اُن کو اُن کی گدیوں کی ہیئت پر'' اَوْ نَلْعَنَهُمْ: یا قبل اس کے کہ ہم اُن پر لعنت کریں، كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ: جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی۔ سبت: ہفتہ۔ ہفتے میں جنہوں نے شکار کرنا شروع کر دیا تھا، سورۂ اعراف میں یہ قصہ آئے گا۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا: اللہ تعالیٰ کا حکم ہو کر رہتا ہے، اللہ تعالیٰ جس بات کا حکم دے دیں وہ ہو کر رہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ: اور بخش دے گا اس کے علاوہ جس کے لئے چاہے گا۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ: اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا: بے شک اس نے گناہِ عظیم گھڑا، اِفترا کیا اس نے، گھڑا اس نے گناہِ عظیم۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو اپنے آپ کو پاک صاف قرار دیتے ہیں، بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ: اپنے آپ کو پاک صاف قرار دینے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اللہ پاک صاف قرار دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا: اور یہ لوگ ظلم نہیں کیے جائیں گے تاگا برابر۔ فَتْل بٹنے کو کہتے ہیں، فتیل: بٹی ہوئی چیز۔ اور مُراد قلیل ہے، جس سے نفی کرنا مقصود ہوا کرتا ہے، تاگے برابر بھی اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: دیکھو تو! کیسے یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا: کافی ہے یہی بات از روئے صریح گناہ ہونے کے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

مابعد کا قبل سے ربط

شروع سورت سے آپ کے سامنے اصلاحِ معاشرہ کی باتیں ذکر کی جارہی تھیں، اور مختلف قسم کے اَحکام واضح کئے گئے، اسی سلسلے میں ایک آیت آپ کے سامنے آئی تھی وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۟ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا۔ اور یہ رکوع جو ابھی تلاوت کیا گیا اس کی ابتدائی آیت پر اَحکام کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے، آگے ذِکر شروع ہو رہا ہے یہود کا، پھر منافقین کا اور مشرکین کا، اور یہ اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی نشاندہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس آیت کے اندر کی تھی کہ جو لوگ متبعِ شہوات ہیں وہ تمہیں موڑنا چاہتے ہیں، وہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ تم میلان اختیار کر جاؤ، یعنی سیدھے راستے سے کسی دوسری طرف کو ہٹ جاؤ، تو اِن متبعینِ شہوات کی تفصیل بیان کی جائے گی اور اِن سے محتاط رہنے کی تلقین کی جائے گی، اِن کی مذمت کی جارہی ہے، چونکہ مسلمانوں کے معاشرے میں اُس وقت یہود کی کثرت تھی، مدینہ منورہ کے اردگرد یہود کے قبیلے آباد تھے، اور انصار کی اُن سے دوستیاں تھیں، جاہلیت کے زمانے سے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اِن کے معاہدے تھے، میل جول تھا، اور وہ لوگ مختلف قسم کے شبہات مسلمانوں میں پھیلاتے رہتے تھے، تو جس وقت تک اُن سے اعتماد ختم نہ کیا جائے اور اُن کو دوست کی بجائے

دشمن نہ سمجھا جائے اُس وقت تک کُفر کے وسوسے اور کُفر کی تلقین ختم نہیں ہوتی اور ذہنی یکسوئی نصیب نہیں ہوتی، تو گویا کہ اب یہ واضح کیا جائے گا کہ یہ اچھے اچھے اَحکام جو تمہیں دیئے جارہے ہیں اِن کے اُوپر پابند ہوجاؤ، اور یہ شیطانوں کے گروہ جو تمہارے ساتھ خلط ملط ہیں ان کو اپنا دُشمن سمجھو، اگر یہ تمہارے ساتھ دوستی کا اظہار بھی کرتے ہیں تو ان کے اس اظہار پر اعتماد نہ کرو، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ: تمہارے دشمنوں کو اللہ خوب جانتا ہے، حقیقت کے اعتبار سے یہ دُشمن ہیں۔ اِس مناسبت سے آگے کلام منتقل ہوجائے گی اِن اہلِ کتاب کی طرف، کیونکہ مسلمانوں کے معاشرے میں یہ خلط ملط تھے، اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اَحکام سے بددل کرنے کے لئے اور کُفر کی طرف مائل کرنے کے لئے وہ آئے دِن کوشش کرتے رہتے تھے، تو اُن کی مذمت کی جائے گی۔

مسئلۂ نماز کا ماقبل سے ربط

پہلی آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی اِس میں ذِکر آیا ہے نماز کے مسئلے کا، اور اس کے ساتھ طہارت کا، اِس کی مناسبت اُس حکم کے ساتھ ہے جو گزشتہ رُکوع میں آیا تھا: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا: اللہ کی عبادت کرو اور اُس کیساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، تو عبادت میں سے چونکہ نماز ایک بہت اہم عبادت ہے، اِس کے متعلق ایک حکم ذِکر کیا جارہا ہے۔

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

اِس کے شانِ نزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنے رفقاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعوت کی ہوئی تھی، اُس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، تو اُس دعوت کے اندر مے نوشی کا انتظام بھی کیا گیا، کھانے کے بعد شراب بھی پی گئی، جیسے کہ اُس وقت عادت تھی، اور اِسی شغل میں لگے ہوئے تھے کہ مغرب کا وقت ہوگیا، اِمامت کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھڑا کردیا گیا، اُنہوں نے سورت قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی، نشے کی حالت میں تھے، پتا نہیں تھا منہ سے کیا نکل رہا ہے، لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ کی بجائے اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ گئے، لَاۤ چھوٹ گیا (نسفی وغیرہ)، اب آپ جانتے ہیں کہ جب لَاۤ چھوٹ گیا تو معنی شرک والا پیدا ہوگیا، مفہوم یہ بن گیا کہ میں پُوجتا ہوں اُس چیز کو جس کی تم پُوجا کرتے ہو، تو گویا کہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کے نتیجے میں یہ شرکیہ کلمہ زبان پر جاری ہوگیا، اور شراب کے متعلق پہلے یہ بات آچکی تھی کہ اس کے نقصانات زیادہ ہیں اور منافع کم ہیں، وہ ابتدائی بات تھی جو شراب کے متعلق قرآنِ کریم میں آئی، جس کا ذِکر آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں گزرا ہے۔ اب اِس عادت کو ختم کرنے کے لئے یہ دُوسرا قدم اُٹھایا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو، یعنی تم اللہ کی عبادت کرنا چاہتے ہو اور نشے کی حالت میں عبادت کے مفہوم سے انسان غافل ہوتا ہے، اور زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اللہ کی عبادت کے خلاف ہوتی ہیں، ایسے کلمات نکل سکتے ہیں جو شرک کے معنی پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے جب تک تم پوری طرح سے ہوش نہ سنبھال لو، تمہیں پتا نہ لگنے لگ جائے کہ تمہاری زبان سے کیا نکل رہا ہے، اُس وقت تک نماز کے قریب نہ جایا کرو۔

شراب کو تدریجاً ختم کیا گیا ہے

اب بظاہر تو نہی کی جارہی ہے نماز کے قریب جانے سے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ نماز کا تو وقت پر پڑھنا فرض ہے، نماز تو

وقت پر پڑھنی ہے، تو اصل کے اعتبار سے نہی ہوگی کہ نماز کے اوقات میں نشہ نہ کیا کرو، یہ مطلب نہیں ہے کہ نشہ پینے کے لئے تو آزادی دے دی گئی کہ جب چاہو پیو، جتنا چاہو پیو، ہوش آجائے تو نماز پڑھ لیا کرو، نہ ہوش آئے تو نہ سہی، کہ شراب کے بارے میں تو چھٹی دے دی جائے اور نماز کے بارے میں یہ تسہیل کردی جائے کہ ہوش آگئی تو پڑھ لی، نہ آئے تو نہ سہی، نشے کی حالت میں نہ پڑھا کرو، یہ مقصد نہیں ہے، نماز تو وقت پر پڑھنی فرض ہے، اُس کو تو اپنے وقت سے مؤخر نہیں جا سکتا، تو اب اِس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایسے وقت میں شراب نہ پیا کرو کہ نماز کے وقت تک وہ نشہ باقی رہے، اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ظہر کے بعد عصر کی نماز جلدی آجاتی ہے، تو اِس حکم کے آنے کے بعد ظہر کے بعد شراب پینے کی گنجائش نہیں رہے گی، اسی طرح عصر کے بعد مغرب کا وقت جلدی آجاتا ہے تو عصر کے بعد شراب پینے کی گنجائش نہیں رہے گی، مغرب کے بعد عشاء کا وقت جلدی آجاتا ہے تو مغرب کے بعد شراب پینے کی گنجائش نہ رہی، اب اگر کوئی گنجائش رہی تو صرف یہ کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد پی لی جائے کیونکہ ظہر کا وقت بہت دیر سے آتا ہے، یا عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد پی لی جائے کیونکہ فجر کا وقت بہت دیر سے آتا ہے، باقی اوقات میں پابندی لگ گئی کہ ان اوقات میں شراب نہ پیا کرو، اِس سے اُس عادت میں کمی آجائے گی۔ اور پھر اس کے بعد سورۂ مائدہ میں حکم آئے گا جس میں اِس کو رِجس قرار دے کر مطلقاً بچنے کا حکم دے دیا گیا۔ تو یہ شراب نوشی جو عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اور نشے کی عادت ان کی طبیعت کے لئے بالکل ایک لازمہ بنی ہوئی تھی، اُس کو اس طرح تدریجاً ختم کر دیا گیا۔ تو گویا کہ شراب کے سلسلے کی یہ دوسری آیت ہے۔ اِس کی مناسبت اس طرح واضح ہوگئی کہ چونکہ واقعہ ایسا پیش آیا کہ نماز پڑھی گئی، جب نشے کی حالت میں پڑھی گئی تو اُس میں وہ خشوع وخضوع بھی نہیں ہوسکتا، کلمات بھی زبان پر ایسے جاری ہوگئے جن میں شرک والا مفہوم ہے، اور یہ بات وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ کے خلاف ہے جس کی بنا پر شراب سے ممانعت کردی گئی، تو یہاں اصل میں نماز سے روکنا مقصود نہیں، نشہ کرنے سے روکنا مقصود ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ: نماز کے قریب نہ جایا کرو اس حال میں کہ تم نشے میں ہو جب تک کہ تم جان نہ لو کہ تم کیا بول رہے ہو، اتنی ہوش تمہیں ہونی چاہیے کہ زبان سے نکلتے ہوئے الفاظ تمہیں معلوم ہوں کہ صحیح نکل رہے ہیں یا غلط نکل رہے ہیں۔

دماغ مستحضر نہ ہو تو نماز پڑھنا اور دُعا کرنا ممنوع ہے

اب مدار چونکہ اِس پر رکھا گیا ہے کہ نشے کی حالت میں پتا نہیں چلتا کہ انسان منہ سے کیا نکال رہا ہے، غلط باتیں نکل سکتی ہیں، کفریہ باتیں نکل سکتی ہیں، شرکیہ کلمات نکل سکتے ہیں، تو اب اگرچہ شراب نہ پی ہوئی ہو، کوئی دوسرا نشہ کیا ہوا ہو جس میں انسان کے حواس ٹھیک نہیں ہیں تو بھی مسئلہ یہی ہے، یا نشہ نہیں پیا ہوا لیکن غشی کی کیفیت ہے، یا اسی طرح جیسے فقہاء لکھتے ہیں اور روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیند کا اتنا غلبہ ہو کہ انسان کا دماغ حاضر نہیں ہے، اور اُس کو پتا نہیں چل رہا کہ میں منہ سے کیا بول رہا ہوں، تو ایسے وقت میں بھی نماز پڑھنے کی اور دُعا کرنے کی روایات میں ممانعت ہے،[1] وہاں بھی وجہ یہی ذکر کی گئی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق دُعا کرتا ہے، لیکن وہ کر بیٹھے گا اپنے لئے بددُعا، جس طرح دُعائیہ کلمات میں بھی لَا چھوٹ جائے تو مفہوم غلط

---

(۱) بخاری، ج ۱ ص ۳۴ باب الوضوء من النوم / مشکوٰۃ، ج ۱ ص ۱۱۰ باب القصد فی العمل، فصل اول۔ ولفظہ: إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّي فَلْيَرْقُدْ ا لخ

ہوجائے گا، یالَا نہیں تھا اور آپ نے بڑھادیا تو مفہوم غلط ہوجائے گا، مثلاً آپ دُعا کرتے ہیں کہ "اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ": اے اللہ! ہمیں حق حق سمجھا اور اُس کو قبول کرنے کی توفیق دے، اتباع کی توفیق دے، اور ہمیں باطل کا باطل ہونا سمجھادے اور اُس سے بچنے کی توفیق دے، یہ بہت صحیح دُعا ہے، لیکن نشے کی حالت میں جب انسان پڑھے تو ہوسکتا ہے کہ لفظ ادل بدل ہوجائیں کہ "اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ" تو اُلٹا معاملہ ہوجائے گا کہ اے اللہ! حق ہمیں حق دِکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے، اور باطل ہمیں باطل دِکھا اور اس کی اتباع کی توفیق دے، مفہوم بالکل غلط ہوجائے گا، اسی طرح "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ" کی بجائے کوئی کہہ دے "اَللّٰهُمَّ اعْفِرْلِیْ" "غ" کی بجائے "ع" پڑھ لیا، تو مطلب یہ ہوجائے گا کہ اے اللہ! مجھے مٹی میں ملادے، مجھے ذلیل کردے، تو ایک نقطے کے بدلنے سے، یا کسی لفظ کے بڑھنے سے، یا کسی لفظ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے بددُعا کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیے اگر اس طرح نیند کا غلبہ ہے کہ انسان کو پتا نہیں کہ میں اپنے منہ سے کیا نکال رہا ہوں، ایسی صورت میں نماز پڑھنے کی اور دُعا کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ شراب پی ہوئی ہو، کوئی دوسرا نشہ کیا ہوا ہو، یا کسی وجہ سے دماغ حاضر نہیں ہے، تو ایسے وقت میں نماز سے احتیاط کرنی چاہیے۔

حالتِ جنابت میں نماز پڑھنے کی ممانعت

وَلَا جُنُبًا: جنابت کا مسئلہ ساتھ ذکر کردیا جس میں گویا شراب کی ایک قباحت کی طرف ہی اشارہ ہے، کہ شراب کی حالت میں انسان نماز کے لائق ایسے ہی نہیں جیسے جنبی نماز کے لائق نہیں، اور آگے جاکر جب اِس کو نجس قرار دے دیا جائے گا تو بالکل ہی مشابہت ہوجائے گی۔ "نماز کے قریب نہ جایا کرو جنبی ہونے کی حالت میں" جنابت کی حالت بھی ایک ایسی حالت ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے بُعد ہوتا ہے اور شیطان کی طرف قُرب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس مکان کے اندر جنبی موجود ہو، جو سستی کی بناء پر غسل نہیں کررہا، تو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، جس طرح تصویر اور کتّے کی موجودگی میں نہیں آتے، اسی طرح جنبی کا ذکر بھی ایک روایت میں ہے[1] کہ اس کے قریب بھی رحمت کے فرشتے نہیں آتے، "جنبی ہونے کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جایا کرو جب تک کہ تم غسل نہ کرلو"، جنابت سے غسل کرنا فرض ہے۔

گزشتہ حکم کی اِستثنائی صورت

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ: مگر اس حال میں کہ تم راستہ عبور کررہے ہو، یعنی سفر کی حالت میں ہو، اُس کا حکم آگے ذکر کیا جارہا ہے، تو سفر میں چونکہ زیادہ رُکاوٹ پیش آتی ہے کہ پانی نہیں ملتا، یا بسا اوقات پانی موجود ہوتا ہے لیکن انسان اس کے استعمال کرنے پر قادر نہیں ہوتا، یا سردی بہت ہے اور سردی سے بچاؤ کا سامان انسان کو حاصل نہیں، یا ریل میں ہے اور پانی اگرچہ اردگرد نظر آرہا ہے لیکن اُتر کر اِستعمال کرنے پر قادر نہیں، یا جہاز کے سفر میں ہے، ایسے حالات پیش آسکتے ہیں، اور سفر میں زیادہ پیش آتے ہیں، اس

(۱) ابوداؤد، ج۱ص۳۰ باب فی الجنب یؤخر الغسل/مشکوۃ، ج۱ص۵۰ باب مخالطۃ الجنب فصل ثانی۔

لئے اِس حالت کو مستثنیٰ کردیا، کہ یہ جو کہا جارہا ہے کہ جنبی ہونے کی حالت میں بغیر نہائے نماز کے قریب نہ جایا کرو، اِس سے سفر کی حالت مستثنیٰ ہے، اُس کا حکم آگے واضح کیا جارہا ہے۔

تیمم کن صورتوں میں جائز ہے؟

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى: اور اگر تم بیمار ہو، بیماری سے ایسی بیماری مراد ہے جس میں پانی کا استعمال نقصان دیتا ہے، ہر بیماری مراد نہیں، اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: یا تم سفر پر ہو، اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ: یہ دونوں حالتیں عام ہیں، یعنی تم بیمار بھی نہیں اور سفر پر بھی نہیں، لیکن حالت ایسی پیش آگئی کہ تم پیشاب کر آئے یا ایسی حرکت کرلی جس کے بعد غسل فرض ہے، اور پانی نہیں ملا، بیماری کی حالت ہو تو پانی کا نہ ملنا یہ ہے کہ پانی کے استعمال کرنے پر قدرت نہیں، سفر کی حالت میں ہو اور پانی نہیں ملا، یا پانی ہے لیکن استعمال کرنے پر قدرت نہیں، یا عام حالات میں بھی اگر تمہارا وضو ٹوٹ گیا یا تم پر غسل واجب ہوگیا اور پھر پانی نہیں مل رہا یا پانی استعمال کرنے پر قادر نہیں ہو، چاہے اِصطلاحاً تم مسافر بھی نہیں اور تمہیں اس قسم کی کوئی بیماری بھی نہیں لگی ہوئی جس میں پانی کا استعمال نقصان دیتا ہے، عام حالات میں بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے، تو پھر تم اِن سب صورتوں میں پاک مٹی کا قصد کرلیا کرو، اُس زمین کا پاک ہونا ضروری ہے جہاں سے طہارت حاصل کی جاتی ہے، قصد کرلیا کرو طہارت حاصل کرنے کے لئے، اس کو اصطلاحِ فقہاء میں اب ''تیمم'' ہی کہا جاتا ہے، اور یہ اِس اُمت کی خصوصیات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو بھی ہمارے لئے طہارت کا ذریعہ بنادیا۔[1]

تیمم اور وضو میں مسح کا طریقہ

اور پھر طہارت حاصل کرنے کا طریقہ دونوں قسم کے تیمم میں، چاہے جنابت سے ہو، چاہے حدثِ اصغر سے ہو، طریقہ ایک ہی ہے، فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ: تم اپنے چہروں کا مسح کیا کرو، یعنی پاک مٹی کے ذریعے سے، یعنی پاک مٹی پر ہاتھ مارا جائے اور پھر وہ اپنے چہرے کے اُوپر پھیر لیا جائے، وَاَيْدِيْكُمْ: اور اپنے ہاتھوں کا مسح کیا کرو۔ حدیث شریف میں جو تفصیل ذکر کی گئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم کرنے کے لئے دو ضربیں ضروری ہیں، ایک دفعہ زمین پر ہاتھ ماریں اور اُس کے ذریعے سے چہرے کا مسح کرلیں، دوسری دفعہ زمین پر ہاتھ مار کر بازوؤں کا مسح کرلیں وہاں تک جہاں تک وضو میں دھوئے جاتے ہیں، یعنی کہنیوں تک۔ بغلوں تک ہاتھ نہیں پھیرنا بلکہ اتنے حصے پر ہی جتنے حصے میں وضو کے اندر پانی بہایا جاتا ہے، اتنے حصے پر مسح کرلیجئے، اِس سے طہارت حاصل ہوگئی اور پانی پر قدرت ہونے تک اسی طہارت کے ساتھ آپ عبادات کرسکتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا: بے شک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے۔

یہود سے تعلق کاٹنے کا حکم

یہاں اَحکام کا سلسلہ ختم ہوگیا، آگے کلام منتقل ہوگئی اُن لوگوں کی طرف جو اللہ تعالیٰ کے اِن اَحکام کے خلاف سازشیں

---

(۱) بخاری، ۱/۳۸۸، کتاب التیمم۔ ولفظ الحدیث: أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا ...الخ۔

کرتے تھے اور اِس اِصلاحی سکیم میں رُکاوٹیں ڈالتے تھے اور مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے دِلوں میں کُفر کی طرف میلان پیدا کرتے تھے، آگے اُن کی نشاندہی اور اُن کی مذمت کی جارہی ہے، تاکہ اہلِ ایمان اِن سے متاثر نہ ہوں اور اِن کو اپنا دِینی و دُنیوی دُشمن سمجھیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ: کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جو کتاب کا ایک حصہ دیے گئے، اِس سے مراد توراۃ ہے، توراۃ کی بچی کھچی کافی آیات اُن کے پاس موجود تھیں کہ جن کو اگر وہ چاہتے تو ہدایت کا ذریعہ بنا سکتے تھے، یا مطلب یہ ہے کہ اُن کو کتاب کے فہم کا ایک اچھا خاصہ حصہ ملا تھا۔ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ: وہ اختیار کرتے ہیں گمراہی کو، وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ: اور تمہارے متعلق بھی اُن کا ارادہ یہ ہے کہ تم بھی سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ، تو گویا کہ تمہارے دینی دُشمن ہیں، یہ خود بھی گمراہ ہیں اور تمہیں بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں، اور بظاہر تمہارے ساتھ محبت اور دوستی کا اظہار کرتے ہیں، اِن پر اعتماد نہ کرنا، اللہ تعالیٰ جو اظہار کر رہا ہے کہ یہ دُشمن ہیں یہی بات صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے دُشمنوں کو خوب جانتا ہے، بمقابلہ تمہارے زیادہ جانتا ہے، اس لیے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نشاندہی کردے کہ یہ تمہارا دُشمن ہے، اسے دُشمن ہی سمجھو، اِن کو اپنا خیر خواہ اور ہمدرد نہ سمجھو۔ اور پھر جب اِن سے تم دُشمنی کا اظہار کرو گے اور تعلق توڑو گے تو پہلے سے جو تمہارے اِن کے ساتھ تعلقات ہیں اور تمہاری ضروریات میں یہ کام آتے ہیں اور وقت پر تم اِن سے مدد لیتے ہو تو یہ خیال نہ کرنا کہ اگر ہم اِن سے تعلق توڑ دیں گے اور علیحدگی اختیار کرلیں گے تو پھر ہمارے کوئی کام اٹک جائیں گے، ہمیں کوئی نقصان پہنچے گا، نہیں! اللہ پر اعتماد کرو۔ ''اللہ تعالیٰ کافی ہے ولی، اور کافی ہے مددگار'' کارساز ہونے کے اعتبار سے بھی اللہ کافی ہے، اور مددگار ہونے کے اعتبار سے بھی اللہ کافی ہے، اِن یہودیوں سے تعلقات کاٹنے کی صورت میں تمہیں زندگی میں کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں گی، بسا اوقات یہ خیال آتا ہے کہ دیکھو! ہماری دُنیوی کتنی ضرورتیں اِن کے ساتھ متعلق ہیں، وقت پر اِن سے قرضے لیتے ہیں، وقت پر اِن سے فلاں کام لیتے ہیں، اگر ہم اِن سے تعلقات کاٹ لیں گے تو ہمارے کام کیسے چلیں گے، دوسری قوموں کے ساتھ اس قسم کے روابط دُنیوی مفاد کے تحت قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں، کہ اُن کے کاٹنے سے انسان سمجھتا ہے کہ میری زندگی میں مشکلات پیش آجائیں گی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ وہم بھی دماغ سے نکال دو۔

دِل کی بھڑاس نکالنے کے لئے یہود کے مختلف حربے

مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ: یہودیوں میں بعض لوگ ایسے ہیں جو باتوں کو اُن کی جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں، کلمات کو اُن کی جگہ سے ہلا دیتے ہیں، کلام کے مفہوم بدل دیتے ہیں، لفظ بھی تبدیل کر دیتے تھے اور مفہوم بھی بدل دیتے تھے، اور آگے اُن کی وہ کمینی خصلت بیان کی گئی ہے جس کا کچھ ذکر آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا کے تحت آیا تھا، کہ وہ حضور ﷺ کی مجلس میں آتے تو مجلس میں آکر باتیں کچھ اس قسم کی کیا کرتے تھے جس میں ان کے کمینے جذبات ہوتے، اور وہ اس قسم کی باتیں کرکے دِل کی بھڑاس نکالتے، حضور ﷺ کی تحقیر کرتے، دین میں طعنے دیتے، اور لفظ ایسے بولتے جو ذو احتمالین ہوتے، اور ان کا ارادہ غلط مطلب کا ہوتا، اور سننے والے مسلمان بسا اوقات یہ سمجھ لیتے تھے کہ یہ کسی صحیح مطلب کے تحت اِس لفظ کو استعمال کر رہے

ہیں۔ جس وقت انسان کسی بڑے کے سامنے مجلس میں بیٹھا ہوتا ہے تو گفتگو کے اندر یہ بات آیا کرتی ہے کہ سامنے بیٹھنے والے اپنی زبان سے اس قسم کے الفاظ بولتے ہیں جس سے بڑے کی بات کی قدر و عظمت اور احترام کا اظہار مقصود ہوتا ہے، مثلاً بڑا آدمی مجلس میں بیٹھا ہوا ایک بات کرتا ہے تو سننے والے کہتے ہیں ''ہاں جی! بالکل ٹھیک ہے، آپ نے صحیح فرمایا، بجا ارشاد ہے، یہ بات تسلیم کے قابل ہے، ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں، سرِ تسلیم خم!'' اور جب انسان اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو کہتا ہے ''ہمارا لحاظ فرمائیے، ہماری رعایت کر لیجئے، اس بات کو دوبارہ کہہ دیجئے، یہ بات ہمیں سمجھ میں نہیں آئی، ذرا دوبارہ سمجھا دیجئے!'' اور ایسے ہی بات سن کر دُعائیہ کلمات ادا کرنے کی بھی عادت ہوتی ہے، ''اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی دشمن کی بات نہ سنائے، کوئی ایسی بات آپ کے کان میں نہ پڑے جو آپ کے لئے طبعاً ناگوار ہو، میں آپ سے ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں اللہ کرے کہ وہ بات آپ کے لئے گوارا ہو، آپ کے لئے ناگواری کا باعث نہ بنے'' اس قسم کے لفظ گفتگو کے اندر آیا کرتے ہیں، کہ جب انسان کسی بڑے کی بات سن رہا ہوتا ہے تو جواباً اس قسم کے لفظ بولتا ہے، عرب میں بھی رواج تھا۔ تو اصل رواج تو یہ تھا کہ سننے والا یوں کہے: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، آپ کوئی بات ذکر کریں تو سننے والا کہے ''ہاں جی! ہم نے سن لیا، مان لیا، سرِ تسلیم خم ہے، جو آپ نے فرمایا بجا ہے!'' یہ ہے نیاز مندی۔ اور یہود آتے، آ کر مجلس میں بیٹھتے، اب دِل میں تو چونکہ حضور ﷺ کی قدر و منزلت نہیں ہوتی تھی، دِل میں تو مخالفت اور عداوت تھی، مجلس میں آ کر بیٹھتے، جس وقت گفتگو سنتے تو ایسے انداز کے ساتھ وہ جوابی کارروائی کرتے کہ بظاہر دیکھنے والا تو سمجھتا کہ شاید یہ اُسی طرح سے آدابِ مجلس کے طور پر یہ لفظ ادا کر رہے ہیں، حالانکہ اِس کا مفہوم وہ غلط لے لیتے، کہتے: ''سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا'' اور ''اَطَعْنَا'' کے لفظ کو کچھ اس طرح زبان موڑ کر ادا کرتے کہ اس کا مفہوم ''عَصَیْنَا'' والا بن جاتا، یا دِل میں تو اِستہزا اور مذاق اُڑاتے تھے لیکن ظاہری طور پر اپنا لب و لہجہ ایسا بدل لیتے جس سے معلوم ہوتا کہ یہ بطورِ توقیر کے ادا کرتے ہیں، یا اُونچی آواز سے تو ''سَمِعْنَا'' کہہ دیتے اور پھر آہستہ سے کہتے ''عَصَیْنَا'' یعنی سن تو لیا، مانیں گے نہیں، یا ''اَطَعْنَا'' کی ادائیگی ایسے طور پر کرتے کہ اپنے نزدیک اس کو ''عَصَیْنَا'' بنا دیتے، لیکن اگر سننے والا کوئی گرفت کرے تو کہہ سکیں کہ ہم نے ''عَصَیْنَا'' نہیں کہا، بلکہ ہم تو ''اَطَعْنَا'' کہہ رہے ہیں، کسی کی گرفت کی صورت میں یہ تاویل کی جا سکے، اور یونہی کبھی حضور ﷺ کو خطاب کرنا پڑتا تو کہتے: ''وَاسْمَعْ'': ہماری بات سنئے! ''غَیْرَ مُسْمَعٍ'': اس حال میں کہ آپ سنائے ہوئے نہیں ہیں، اِس کا صحیح مفہوم تو یہ تھا کہ آپ کے کان میں کوئی غیر مناسب بات نہ پڑے، لیکن وہ اِس سے مراد لیتے کہ آپ بہرے ہو جائیں، آپ کے کان میں کوئی بات نہ جائے، یا ایک مفہوم یہ بھی ادا کیا گیا ہے کہ ''اِسْمَعْ'' کا لفظ وہ مجلس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو کہتے، جس طرح ہم کہا کرتے ہیں، ایک آدمی بات کر رہا ہو اور دوسرا اپنے ساتھی کو متوجہ کرے کہ ''سن! کیسی پیاری بات ہے، خیال کرو، کتنا عجیب نکتہ بیان کیا ہے، آج ہم نے اَن سنی بات سنی ہے جو پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی تھی، ایسی پیاری بات بتائی'' یہ آپس میں ایک دوسرے کو خطاب کرتے ہوئے بسا اوقات انسان تقریر، وعظ اور درس کی مجلس میں بیٹھا ہوا، جب کوئی عجیب اور پسندیدہ بات سنتا ہے تو اس طرح بھی کہتا ہے۔ تو وہ اس طرح سے کہتے ''وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ'' یعنی سنو اَن سنی بات، اور ان کے دل میں ہوتا کہ سن لو، ایسی بات بھی کہیں آپ نے سنی ہو گی جو آج سن رہے ہیں، اور

یہی بات بظاہر تو وہ کہتے توقیر کے لہجے سے، لیکن دل میں استہزا ہوتا، کہ کیسی باتیں کر رہے ہیں جو کبھی سننے میں نہیں آئیں، اب لفظ ایک جیسا ہی ہے، لیکن مفہوم میں فرق پڑ گیا۔ اور ایسے وہ ''رَاعِنَا'' کہتے، ''رَاعِنَا'' کا مطلب پہلے آپ کے سامنے گزر چکا کہ رَاعِ امر کا صیغہ ہے مراعاۃ سے، اور ''نا'' مفعول ہے، اگر یہ معنی لیا جائے تو اس کا معنی ہے ہماری رعایت کیجئے۔ لیکن وہ زبان میں ذرا لچک پیدا کر لیتے اور ''رَاعِنَا'' کی بجائے ''رَاعِیْنَا'' بنا لیتے، یعنی ہمارا چرواہا۔ یا ''رَاعِنَا'' رعونت سے لے کر بے وقوف والا معنی مراد لیتے، اور حضور ﷺ کے سامنے اس لفظ کو استعمال کرتے، تو بظاہر ایسا لفظ استعمال کرتے تھے جو توقیر والا ہے لیکن مقصود تحقیر ہوتی۔ کمزور، بزدل اور کمینہ خصلت آدمی بسا اوقات اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اس قسم کی شرارتوں کا سہارا لیا کرتا ہے، کہ چاہے اس سے دوسرے کا بگڑتا کچھ نہیں لیکن اس قسم کی بات اپنی زبان سے نکال کر انسان خوش ہو جاتا ہے، یہاں اسی کی نشاندہی کی جا رہی ہے، کہ یہ کہتے ہیں: ''سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا'' اور اسی طرح کہتے ہیں: ''وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'' اور ''رَاعِنَا'' کا لفظ کہتے ہیں، زبانوں کو موڑتے ہوئے اور دین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے، طعنہ زنی اصل کے اعتبار سے تو پیغمبر پر ہے، لیکن پیغمبر چونکہ مجسمۂ دین ہوتا ہے، اس لئے اللہ کے رسول پر کوئی نشتر چلانا اور طعنہ زنی کرنا حقیقت کے اعتبار سے دین کا استہزا ہے، روایات میں جس طرح تفصیل آتی ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں جب وہ آتے تو ''السلام علیکم'' جو ایک مجلسی لفظ ہے کہ آتے ہی ''السلام علیکم'' کہو، جس میں دعا ہے کہ تم پہ سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں ہر قسم کی آفت اور مصیبت سے محفوظ رکھے، ہماری طرف سے آپ سلامتی میں رہیں، ہمارا ارادہ آپ کے متعلق سلامتی کا ہے، اس لفظ کا یہ مفہوم ہے، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب وہ آتے تو ''السلام علیکم'' کی جگہ لام کو دبا جاتے اور جلدی سے کہہ جاتے ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ ''(۱) لام زبان پر نہ آتا، اور سام موت کو کہتے ہیں، تو ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ '' کا مفہوم بددعا والا ہو گیا کہ تم پر موت پڑے، اس طرح وہ اپنے دل کا غبار نکالتے، پھر باہر نکل کر بغلیں بجاتے کہ دیکھو! ہم نے یوں کہا اور انہیں پتا ہی نہیں چلا، اور اگر یہ اللہ کے پیغمبر ہوتے تو اس قسم کی باتوں پر ہم پہ گرفت کیوں نہیں ہوتی؟ اٹھائیسویں پارے میں یہ بات آئے گی: ''وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ يَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ''(سورۂ مجادلہ: ۸) جب یہ آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو آپ کو سلام ایسے طریقے سے کرتے ہیں جیسے اللہ نے سلام نہیں کیا، اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ یوں پھر باہر نکل کر وہ اپنی ان باتوں پر خوش ہوتے تھے، کہ ہم نے ایسی باتیں کر لیں اور انہیں پتا ہی نہیں چلا، دیکھو! اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے تو ہم پر فوراً گرفت ہو جاتی۔

تو یہ اُن کے طریقے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا: اگر یہ صرف ''سَمِعْنَا'' کہتے اور صرف ''اَطَعْنَا'' کا لفظ استعمال کرتے اور صرف ''وَاسْمَعْ'' کہتے، اور ''رَاعِنَا'' کی بجائے ''اُنْظُرْنَا'' کہہ دیتے، کیونکہ ''اُنْظُرْنَا'' کے اندر اس قسم کی خرابی کا اندیشہ نہیں جس قسم کی خرابی وہ لفظ ''رَاعِنَا'' میں پیدا کر لیتے تھے، مفہوم اس کا وہی ہے ''رَاعِنَا'' والا، کہ ہمارا خیال کیجئے، ہم پر نظر

(۱) صحیح البخاری، ۲/ ۸۹۰، باب الرفق فی الامر کلہ/ صحیح مسلم، ۲/ ۲۱۳، باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام/ مشکوۃ، ۲/ ۳۹۸، باب السلام عن عائشہؓ۔

کیجئے، ہم پر شفقت فرمائیے، یہ بات دوبارہ سمجھا دیں، دوبارہ کہہ دیں، تو اس قسم کے موقع پر ''اُنْظُرْنَا'' کا لفظ استعمال کرلیا جائے، لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی اور زیادہ درست ہوتی۔ لیکن یہ لعنتی ہیں، ان پر لعنت ہوچکی، یہ پھٹکارے گئے، اس لئے ان کو شرارتیں سوجھتی ہیں، کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کرتے، وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ: لیکن اللہ تعالیٰ نے اِن پر لعنت کی ان کے کفر کی وجہ سے، فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: پس یہ نہیں مانیں گے مگر تھوڑے سے، ان میں سے کچھ لوگ ہوں گے جن میں ایمان کی صلاحیت ہے، جو اس قسم کی شرارتوں سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے، باقی جتنے بھی ہیں جب ان پر لعنت اور پھٹکار ہوگئی، تو ان کی طبیعت کا میلان شرارتوں کی طرف اور بری باتوں کی طرف تو ہوگا، صحیح بات کی طرف نہیں آئیں گے، یہ ملعون ہونے کا اثر ہے۔

اہلِ کتاب کے لئے وعید

''اے وہ لوگو جو کتاب دیئے گئے! ایمان لے آؤ اس بات پر جو ہم نے اتاری اِس حال میں کہ وہ مصداق بننے والی ہے اس کتاب کا جو تمہارے ساتھ ہے، یا، تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے، ایمان لے آؤ قبل اِس کے کہ مٹادیں ہم چہروں کو، پھر لوٹا دیں ہم اُن کو اُن کی گُدیوں کی ہیئت پر، یا قبل اس کے کہ ہم ان پہ لعنت کریں جیسے کہ ہم نے اصحابِ سبت پہ لعنت کی تھی، اور اللہ کا حکم ہوکر رہتا ہے۔'' یہ وعید ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا نہ کردے، اللہ نے تمہیں آنکھ کی نعمت دی ہے، ناک کی نعمت دی ہے، کانوں کی نعمت دی ہے، ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھاؤ، صحیح بات دیکھو، صحیح بات سنو، صحیح بات سمجھو، زبان سے صحیح الفاظ نکالو، اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی شکرگزاری نہیں کرتے تو تمہیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ اللہ یہ نعمتیں واپس لے لے، اور تمہاری آنکھ ناک اور کان مٹا کر ایسے ہی کردے جس طرح پچھلا گُدی کا حصہ ہے، یہ وعید ہے کہ انسان کو یہ احتمال ہونا چاہیے کہ اللہ کہیں ایسا نہ بنادے، باقی اُ دنیا کے اندر اُس کا وقوع ضروری نہیں۔

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو!

جیسے سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں: ''اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ'' پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، ''شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ'': اپنی جوانی کو غنیمت سمجھو بڑھاپے سے قبل، یعنی یہ احتمال ہے کہ جوانی کے بعد بڑھاپا آجائے گا، تو جوانی کی قدر کرلو، لیکن ضروری نہیں کہ جوانی کے بعد بڑھاپا آئے، کوئی آدمی جوانی میں بھی تو مرسکتا ہے، ''وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ'': اپنے غنا کو غنیمت جانو فقر سے پہلے پہلے، محتاج ہونے سے پہلے پہلے اپنی دولت سے فائدہ اُٹھالو، یعنی ہر وقت تمہارے دل میں یہ احتمال ہونا چاہیے کہ آج تو ہمارے پاس پیسے ہیں، آج ہم نیکی کا کام کرلیں اچھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو ہم محتاج ہوجائیں، باقی یہ ضروری نہیں کہ غنا کے بعد فقر ضرور ہوگا، یہ احتمال کافی ہے کہ غنا کے بعد کہیں فقر نہ آجائے، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی مرنے تک بالکل غنی رہتا ہے اور اس پر فقر آتا ہی نہیں، لیکن احتمال ہر وقت ہے، جب احتمال ہے تو تم اپنے غنا سے فائدہ اُٹھاؤ۔ اسی طرح ''صِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ'' اپنی صحت کو غنیمت جانو بیماری سے قبل، تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی تندرست ہی رہتا ہے، اور تندرستی میں

یکدم مرجاتا ہے، بیمار ہوتا ہی نہیں، لیکن احتمال ہر وقت رہتا ہے کہ آج تو صحت ہے، اور ہوسکتا ہے کہ کل کو یہ صحت نہ رہے، اس لئے آج صحت سے فائدہ اُٹھالو۔[1] جیسے حدیث میں اس احتمال کے ذریعے سے محتاط کرنا مقصود ہے تو یہاں بھی یہی بات ہے کہ تمہیں ناک، کان اللہ نے دیے ہیں، آنکھیں دی ہیں، ان اعضاء سے فائدہ اُٹھاؤ، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دی ہوئی نعمتیں واپس لے لے اور پھر تمہارے چہروں کا اگلا حصہ ایسے ہی ہو جائے گا جیسے کہ پچھلا حصہ ہے، گدی کی طرح ہو جائے گا، یہ نعمتیں چھن جائیں گی، یا ہم لعنت کریں گے جس سے باطنی مسخ آجائے گا، جیسے کہ ہم پہلے اصحابِ سبت پہ لعنت کر چکے ہیں، اور وہ باطنی مسخ پھر ظاہری مسخ بھی بنا، کہ بندر کی شکل ہو گئی، كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (الاعراف:۱۶۶)، تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تمہاری صورتیں ایسے مسخ کردی جائیں جیسے اصحابِ سبت کی کردی گئی تھیں، جیسے لعنت کا اثر ان پر اِس صورت میں ظاہر ہوا، تم پر بھی ہوسکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں، اللہ تعالیٰ جو حکم دے دیں وہ ہو کے رہتا ہے۔

مشرک کی بالکل بخشش نہیں ہوگی

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ: یہ بھی اُنہی کے لئے ایک وعید ہے، کیونکہ وہ بھی شرک میں مبتلا ہو گئے تھے، اور مسلمانوں کے مقابلے میں مشرکین کی حمایت کرتے تھے، اور مشرکین کی حمایت میں بھی شرک پرستی پائی جاتی ہے، تو اب شرک کے اُوپر یہ وعید ہے، ''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اِس بات کو کہ اُس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے'' نہیں بخشے گا یعنی سزا دے کر بھی نہیں بخشے گا، ''اور اس شرک کے علاوہ جو کچھ ہے اللہ بخش دے گا جس کے لئے چاہے گا'' چاہے بِلا سزا، چاہے سزا دے کر، اور سزا ہو جانے کے بعد اُس کا بخشا جانا یقینی ہے اللہ کے وعدے کے تحت، یعنی ایک آدمی مؤمن ہو کر دُنیا سے گیا اور وہ مشرک نہیں ہے، اور اس نے بہت بڑے بڑے گناہ کئے ہوئے ہیں، تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر سزا کے معاف کردے، اور اگر اللہ نے سزا دینے کا ارادہ کرلیا تو سزا کے بعد تو معاف ہو جانا یقینی ہے، آیات وروایات کے اندر یہ بات واضح کردی گئی، تو جب بڑے بڑے گناہ سزا کے بعد یقیناً معاف ہو جائیں گے اور شرک معاف نہیں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسا جرم ہے جو سزا کے ساتھ بھی ختم نہیں ہوگا، اس کی سزا دائمی ہے، شرک میں کُفر بھی داخل ہے، یعنی ہر وہ کیفیت جو ایمان کے منافی ہے اِس میں داخل ہوگی۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اُس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے، اور بخش دے گا اس کے علاوہ جس کے لئے چاہے گا'' یعنی بغیر سزا کے، اور شرک نہیں بخشے گا سزا دے کر بھی، ورنہ اگر کوئی آدمی مشرک نہیں، مؤمن ہے، اور اُس کے ذِمّے کچھ گناہ ہیں، وہاں دونوں باتیں ہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ویسے ہی معاف کردے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ سزا ہونے کے بعد معافی مل جائے، سزا ہونے کے بعد مؤمن کے لئے معافی یقینی ہے، ''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا، بہت بڑا گناہ اس نے کیا۔''

---

(۱) مشکوٰۃ، ج۲ ص۴۴۱، کتاب الرقاق، فصل ثانی، عن عمرو بن میمون / مصنف ابن ابی شیبۃ، ج۷ ص۷۷، باب ما ذکر عن نبینا فی الزھد۔

خباثتوں میں مبتلا یہود کی ذہنیت

''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو اپنی تعریف خود کرتے ہیں''یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ اپنے آپ کو پاک صاف قرار دیتے ہیں، یعنی ہیں تو یہ مشرک، اور ہیں تو یہ بد باطن خبیث ملعون، اور اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ ہم بڑے پاک صاف ہیں، ہم تو جائیں گے ہی جنت میں، جہنم سے ہمارا کیا کام؟ اپنے آپ کو بڑا پاک قرار دیتے ہیں، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے شرک کفر اور خباثت کو اختیار کرنے کے بعد بھی وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے محبوب ہیں، تو ان چیزوں کو گویا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مردود قرار نہیں دیتے، بلکہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ قرار دیتے ہیں، یہی جھوٹ ہے جو مشرک ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ ہم بخشے جائیں گے، یہ اللہ پہ افترا کرتے ہیں، اپنی تعریف کرتے ہیں، اپنے آپ کو پاک صاف قرار دیتے ہیں، یہ ذہن تھا اُن یہود کا، کہ ہر قسم کی خباثتوں میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ کہتے تھے کہ چونکہ ہم بڑوں کی اولاد ہیں، لہٰذا جو کچھ بھی کرتے رہیں ہم تو بخشے بخشائے ہیں، سَیُغْفَرُلَنَا (الاعراف:۱۶۹) جو کچھ بھی کیا جائے ہمیں تو بخشا ہی جائے گا، گویا کہ اپنا تزکیہ کرتے ہیں، اپنے آپ کو پاک صاف قرار دیتے ہیں، مجرم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مجرم نہیں سمجھتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے محبوب ہیں، کیا نہیں دیکھا ان کی طرف جو اپنے آپ کو پاک قرار دیتے ہیں؟ آگے یہ بات آگئی کہ خود اپنے آپ کو پاک قرار دینے سے انسان پاک نہیں ہوتا،'' بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے پاک قرار دیتا ہے، اور یہ لوگ تاگا برابر بھی ظلم نہیں کئے جائیں گے''اِن کے کردار کی ان کو پوری پوری سزا ہوگی، کوئی کام کیا نہ ہو اور اس کی سزا دے دی جائے ایسا نہیں ہوگا۔'' دیکھ! کیسے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں''یعنی اِن حرکتوں کے باوجود اپنے آپ کو مغفور قرار دینا اور اپنے آپ کو پاک صاف قرار دینا، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کفر اور شرک اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے، دیکھو! کیسا جھوٹ باندھتے ہیں اللہ پر، وَکَفٰی بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا: اِن کی یہی بات صریح گناہ ہونے کے اعتبار سے کافی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو دیئے گئے کتاب کا ایک حصہ، وہ ایمان لاتے ہیں بتوں پر اور شیطان پر،

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور کہتے ہیں ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کفر کیا کہ یہ لوگ زیادہ ہدایت پانے والے راستے کی بمقابلہ ان لوگوں کے جو

سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ

ایمان لے آئے ﴿۵۱﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ نے لعنت کی، اور جس شخص پر اللہ تعالیٰ لعنت کردے

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ

تو اُس کے لیے مددگار نہیں پائے گا ﴿۵۲﴾ کیا ان کے لیے سلطنت میں سے کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا بات ہوتی تو یہ نہ دیتے

النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

لوگوں کو کچھ بھی ﴿۵۳﴾ یا یہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں؟ اُس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دے دی،

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

پس تحقیق ہم نے دے دی ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت اور انہیں بڑی سلطنت دے دی ﴿۵۴﴾

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ

ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس سے رُکتے ہیں، اور کافی ہے جہنم از روئے

سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ

بھڑکنے والی آگ کے ﴿۵۵﴾ بیشک وہ لوگ جو ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں ہم ان کو عنقریب داخل کریں گے آگ میں،

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ

جب بھی جل جائیں گی ان کی کھالیں تو ہم ان کو بدل دیں گے ان کھالوں کے علاوہ اور کھالیں تاکہ چکھتے رہیں عذاب،

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۵۶﴾ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ

ضرور داخل کریں گے ہم انہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان

اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

باغات میں، ان کے لیے اُن باغات میں صاف ستھری بیویاں ہوں گی، اور ہم انہیں داخل کریں گے گھنے سائے میں ﴿۵۷﴾

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ادا کرو امانات اُن کے اہل کی طرف، اور جب تم فیصلہ کرو

بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ
لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کیا کرو عدل کے ساتھ، بیشک اللہ تعالیٰ جس چیز کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے وہ چیز بہت اچھی ہے،

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ
بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے﴿۵۸﴾ اے ایمان والو! اللہ کا کہنا مانو

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ
اور رسول کا کہنا مانو اور اپنے میں سے اُمر والوں کا کہنا مانو، پھر اگر تمہارا آپس میں کسی معاملے میں جھگڑا

شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
ہو جائے تو رَدّ کر دیا کرو اس بات کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ ع
اور پچھلے دن پر، یہ بہتر ہے اور بہت اچھا ہے از روئے انجام کے﴿۵۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ: کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جو دیئے گئے کتاب کا ایک حصہ، جن کو کتاب میں سے ایک حصہ ملا، يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ: ایمان لاتے ہیں جبت پر اور طاغوت پر، جِبت کا معنی عام طور پر مترجمین نے بتوں کے ساتھ کیا ہے، ''ایمان لاتے ہیں بتوں پر''، اور طاغوت کا معنی ہے سرکش، شیطان، جیسے طاغوت کا معنی کیا گیا: ''كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ذکر کیا گیا تھا، اسی طرح جِبت کا معنی بھی ''كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کے ساتھ کیا گیا ہے، اللہ کے علاوہ جس چیز کی عبادت کی جائے وہ جبت اور طاغوت کا مصداق ہے، اور جبت کا معنی جادو بھی کیا گیا ہے، اعمالِ سفلیہ، کہانت، شگون، رمل، جفر، تطیر، اِس قسم کی چیزیں جو عرب میں مروّج تھیں، اوہام پرستی کے مفہوم میں، تو جبت کا معنی ہو جائے گا بے حقیقت چیزیں، اوہام کا مجموعہ، ''وہم پرستیوں پر ایمان لاتے ہیں، اعمالِ سفلیہ پر ایمان لاتے ہیں، اور شیطان پر ایمان لاتے ہیں'' طاغوت کا مصداق شیطان بھی ہو سکتا ہے۔ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور کہتے ہیں اُن لوگوں کے متعلق جنہوں نے کفر کیا، هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ لوگ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں بمقابلہ اُن لوگوں کے جو ایمان لے آئے سَبِيْلًا: زیادہ ہدایت یافتہ ہیں از روئے راستے کے، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا مصداق سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے والے، اور الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا مصداق مشرکینِ مکہ ہیں، ''کہتے ہیں یہ مشرکینِ مکہ کے متعلق کہ یہ لوگ مؤمنین کے مقابلے میں زیادہ راہ پانے والے ہیں'' یہ مفہوم

ہوا اِن لفظوں کا، اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ: یہی لوگ ہیں کہ اِن کے اوپر اللہ نے لعنت کی، وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا: اور جس شخص پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے تو اس کے لئے مددگار نہیں پائے گا، اَمْ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ: کیا اِن کے لئے سلطنت میں سے کوئی حصہ ہے؟ فَاِذًا لَّا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا: اگر ان کے لئے سلطنت میں کوئی حصہ ہوتا، اِذًا کے اُوپر جو تنوین ہے یہ مضاف الیہ کے عوض ہے، اِذَا كَانَ كَذَا، اگر ایسی بات ہوتی، سلطنت میں سے اِن کا کوئی حصہ ہوتا، تو یہ نہ دیتے لوگوں کو کچھ بھی۔ نقیر کا معنی کیا جاتا ہے اَلنُّقْرَةُ فِیْ ظَهْرِ النَّوَاةِ کھجور کی گٹھلی کی پشت پر آپ دیکھتے ہیں چھوٹا سا گڑھا بنا ہوا ہوتا ہے، جیسے ایک داغ پڑا ہوا ہو، یہ پشت کی جانب ہوتا ہے، ایک طرف تو لمبی لکیر ہوتی ہے اور دوسری جانب اگر آپ دیکھیں گے تو معمولی سا سوراخ اور گڑھا سا ہوتا ہے اس کو نقیر کہتے ہیں، تو شئ قلیل کی مثال دینی ہو تو جس طرح ہمارے ہاں تل برابر، تاگے برابر، ذرہ برابر کا لفظ بول دیتے ہیں تو یہ لفظ ایسے ہی موقع پہ استعمال ہوتا ہے، ''تو یہ لوگوں کو کچھ بھی نہ دیتے، ذرہ برابر چیز نہ دیتے'' ویسے اِس نقیر کا مصداق وہ گڑھا ہے جو گٹھلی کی پشت پہ ہوتا ہے۔ اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ: یا یہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں؟ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: اُس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنے فضل سے دے دی، فَقَدْ اٰتَیْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ: پس تحقیق ہم نے دے دی ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت، وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا: اور اُنہیں بڑی سلطنت دے دی، فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ: اِن میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بِہٖ کی ضمیر کتاب وحکمت کی طرف لوٹے گی المذکور کی تاویل سے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ: اور ان میں سے بعض ہیں جو اس سے رکتے ہیں۔ صَدّ کا مصدر اگر صُدُوْدًا ہو جیسے یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا کچھ آیات کے بعد آئے گا، تو پھر یہ لازم کا مفہوم ادا کرتا ہے، آپ سے رُکتے ہیں رُکنا۔ اور صَدَّ صَدًّا اگر ہو، باب وہی ہے صَدَّ یَصُدُّ، تو پھر روکنے کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (الاعراف: ۴۵) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اور یہاں یہ لازم ہے، ''اِن میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اِس سے رُک گئے'' وَكَفٰی بِجَهَنَّمَ سَعِیْرًا: بِجَهَنَّمَ میں باء زائدہ ہے، اور جہنم کفٰی کا فاعل ہے، کافی ہے جہنم از روئے بھڑکنے والی آگ کے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا: بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا: ہم اِن کو عنقریب داخل کریں گے آگ میں، كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ جب کبھی جل جائیں گی اِن کی کھالیں، بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا: تو ہم اُن کو بدل دیں گے اِن کھالوں کے علاوہ اور کھالیں، لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ: یہ لِیَذُوْقُوْا دوام کے بیان کرنے کے لئے ہے، تاکہ چکھتے رہیں عذاب، تاکہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں، کیونکہ جلنے کے بعد بے حسی پیدا ہو جائے تو عذاب کا مزہ نہیں آئے گا، تو ہم ان کی کھالیں تبدیل کرتے رہیں گے تازہ بہ تازہ، تاکہ یہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا: بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ضرور داخل کریں گے ہم اُنہیں باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُن باغات میں، لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: ان کے لئے اُن باغات میں صاف ستھری بیویاں ہوں گی، وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا: اور ہم اُنہیں داخل کریں گے گھنے سائے میں، ظِلّ: سایہ، اور ظلیل اُسی کی تاکید ہے، جیسے لَیْلٌ لَیِّلٌ عربی کے اندر محاورہ آتا ہے، یعنی سخت تاریک رات، اسی طرح یہاں ہے ظِلٌّ ظَلِیْلٌ یعنی گھنا سایہ۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا: بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم

دیتا ہے کہ تم ادا کرو اَمانات اہلِ اَمانات کی طرف، اَمانات سے مراد حقوقِ واجبہ مراد ہیں، جو بھی حق ذمے میں لگا ہوا ہو اُس کو اَمانت کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، ''اَمانات کو ان کے اہل کی طرف ادا کرو''۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ: اور اللہ تعالیٰ تمہیں یہ بھی حکم دیتا ہے کہ جب تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان، اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ: تو فیصلہ کیا کرو عدل کے ساتھ، انصاف کے ساتھ، برابری کے ساتھ، اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ: نِعِمَّا اصل میں تھا نِعْمَ مَا۔ مَا شیئًا کے معنی میں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ جس چیز کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے وہ چیز بہت اچھی ہے، بہت اچھی ہے وہ شی جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا: بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: اے ایمان والو! اَطِیْعُوا اللّٰهَ: اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کا کہنا مانو، وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ: اور رسول کی اطاعت کرو، رسول کا کہنا مانو، وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ: اور اپنے میں سے اُولی الامر کا کہنا مانو، جو اَمر والے ہیں، اَمر سے یہاں حکم مراد ہے، جو حکم والے ہیں، جن کا تمہارے اندر حکم چلتا ہے، حاکم لوگ، جو تمہارے اُوپر حکومت کرتے ہیں، تم پر اِقتدار رکھتے ہیں، اُن کا کہنا مانو۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ: پھر اگر تمہارا آپس میں کسی معاملے میں جھگڑا ہو جائے، فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ: پس ردّ کر دیا کرو اس بات کو، اُس شی کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف، اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور پچھلے دِن پر، ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا: یہ جو کچھ تمہیں کہا جا رہا ہے، اللہ کی اطاعت، اللہ کے رسول کی اطاعت، اور اِس سے پہلے اَمانات کا ادا کرنا، لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا، اور جھگڑے کے وقت اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف بات کو لوٹا دینا، یہ بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اَزروئے انجام کے، تأویل کا معنی ہوتا ہے کسی بات کو اس کے انجام کی طرف لوٹا دینا، یعنی یہ بات اپنے انجام کے اعتبار سے بڑی اچھی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رُکوع میں اَحکام کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد کلام یہودیوں کی طرف منتقل ہو گئی تھی، اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ یہاں سے یہودیوں کا تذکرہ شروع ہوا تھا، کہ ان لوگوں کو اللہ نے کتاب کا حصہ دیا ہے، کتاب کا فہم انہیں کچھ حاصل ہے، بچی کھچی کتاب لیکن ہدایت کے لئے کافی ہے، وہ اِن کے حصے میں آئی، لیکن یہ گمراہی کو اختیار کرتے ہیں، ہدایت کو اِختیار نہیں کرتے، پھر نہ صرف یہ کہ خود گمراہ ہیں بلکہ تمہیں بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں، اس سے نشاندہی کی گئی تھی ان دشمنوں کی جو دِینی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے دشمن تھے، اور دُنیوی طور پر بھی نقصان پہنچانا چاہتے تھے، وہی سلسلہ کلام آگے چلا آ رہا ہے۔ پچھلے رُکوع کی آخری آیات میں بھی اُنہی کے کرتوت مذکور تھے، خاص طور پر شرک کی مذمت تھی، کہ یہود جو کہ حاملِ کتاب ہیں، اور عقیدۂ توحید ہر کتاب کی جان ہے، بلکہ ہر دِین کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے، جو شخص اِس عقیدے کو محفوظ رکھتا ہے

وہ اپنے دین کی کسی نہ کسی درجے میں حفاظت کرلیتا ہے، چاہے اُس سے دیگر احکام کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہوجائے، گویا کہ دین کا اصل اُس کے پاس محفوظ ہوتا ہے جس کی بناء پر آخرت میں اُس کی مغفرت ہوجائے گی، اور دیگر گناہ اللہ تعالیٰ سزا دے کر یا بے سزا معاف کردیں گے، لیکن جو شخص دین کی اِس جڑ کو ہی کاٹ دے، اور اِس عقیدۂ توحید کو محفوظ نہ رکھے، بلکہ شرک میں مبتلا ہوجائے، اُس نے اپنے دین کی جڑ کاٹ دی، اب اگر ظاہری طور پر وہ کچھ نیکیاں کرے بھی تو وہ نیکیاں بے حقیقت ہیں، اُن کا کوئی اعتبار نہیں ہے، تو شرک کی مذمت کی تھی، چونکہ یہود بھی شرک میں مبتلا ہوگئے تھے، اور پھر شرک میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ اپنی زبان سے اپنی تعریفیں کرتے رہتے تھے، اور یوں سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ بزرگوں کی اولاد ہیں، اللہ کے مقبولین کی اولاد ہیں، لہٰذا ہم تو پاک ہی پاک ہیں، صاف ہی صاف ہیں، جیسے بھی ہم ہوں بخشے جائیں گے، اُن کی اِس بات کی مذمت کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ یہ اللہ پر اِفترا باندھتے ہیں، مشرک اللہ کا محبوب نہیں ہوسکتا، اور کوئی شخص بھی اپنی نسل اور نسب کے اعتبار سے بخشا نہیں جاسکتا اگر اُس کے پلے میں توحید نہیں ہے تو۔ اب اگلی آیات اِسی مضمون سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

شانِ نزول

اِن کے شانِ نزول میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد یہود میں سے حُیی بن اخطب اور کعب بن اشرف جو بنو نضیر سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دونوں مکہ معظمہ مشرکین کے پاس گئے تاکہ مسلمانوں کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم کرلیا جائے، مشرکین کے پاس جاکر اِنہوں نے اُن کو بہکایا یا اُکسایا، اب چونکہ اُن کو اپنے ساتھ ملانا تھا، سیاسی اغراض سامنے تھیں، اور جس وقت سیاسی اغراض سامنے ہوتی ہیں تو بُرے سے بُرا آدمی بھی اچھا لگتا ہے، اور جو اپنے سیاسی مفاد کے مطابق نہ ہو تو اچھے سے اچھا بھی بُرا لگنے لگ جاتا ہے، اب باوجود اس کے کہ یہ اہلِ کتاب تھے، توحید کے مدعی تھے، آخرت کے قائل تھے، اور اپنی زبان کے ساتھ شرک کی مذمت کرتے تھے کہ شرک جائز نہیں ہے، تو چاہیے تو یہ تھا کہ حق کا اظہار کرتے، جہاں کوئی عقیدے کی بات آتی تو مشرکین کی حمایت نہ کرتے، بلکہ مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کو اچھا کہتے، لیکن یہاں مشرکوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں جاکر انہوں نے مشرکین کی تعریف کی، اور کہا کہ تمہارا طریقہ بڑا اچھا ہے ان لوگوں کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کرتے ہیں، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں کو خوش کرنے کے لئے اِنہوں نے اُن کے بتوں کو سجدے بھی کئے، تاکہ یہ ظاہر کردیا جائے کہ ہم آپ کی طرف قریب ہیں، اور مسلمانوں کی مخالفت پر مشرکوں کو بہکایا اور بھڑکایا جائے، تو انہوں نے مسلمانوں کی ضد میں آکر اِس قسم کے شرک کا اِرتکاب کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے شرک کی مذمت کی، اور آگے یہ نشاندہی کی کہ دیکھو! ہیں تو یہ کتاب کے حامل، کتاب اِن کو ملی ہوئی ہے، لیکن حال اِن کا یہ ہے کہ بتوں پر اور شیطانوں پر اِیمان لاتے ہیں، اب اگر یہ حاملِ کتاب ہیں اور کتاب اِن کے پاس موجود ہے تو اُس کتاب کا کیا فائدہ؟ جب کتاب کے مندرجات کے مطابق عقیدہ نہ رکھا جائے اور اُس کے مطابق عمل نہ کیا جائے تو اُس وقت اُس کتاب کا کیا فائدہ؟ اِس لئے جو علم وہدایت کی وراثت اِن کے پاس چلی آرہی تھی

انہوں نے وہ ضائع کردی۔ تو جبت وطاغوت کا معنی یہ ہو گیا کہ بتوں پہ ایمان لاتے ہیں اور شیطان پہ ایمان لاتے ہیں، چونکہ جو بت پرستی ہے وہ سب شیطان کی طرف ہی منسوب ہے، جیسے آگے بھی اِس کی وضاحت ہوگی۔ یہ آیت تو خاص واقعے سے متعلق ہوگئی، کہ انہوں نے ایسا کیا تھا اور باوجود اہل کتاب ہونے کے مشرکوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیا تھا۔

مذکورہ شانِ نزول سے قطع نظر آیتِ بالا کی ایک اور تفسیر

اور اس کے علاوہ آپ کے سامنے پہلے پارے میں گزرا تھا، کہ یہود میں جادو کا چرچا بھی بہت ہو گیا تھا، وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا: اُس آیت کے اندر ذکر کیا گیا تھا کہ یہودی کتاب اللہ کو چھوڑ کر جادو، ٹونے ٹوٹکوں، اور بدشگونیوں کے پیچھے پڑ گئے تھے، اس قسم کی اوہام پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے، اور جو بھی شخص جادو کرتا ہے یا جادو میں مہارت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُس کو جنات کے ساتھ اور ارواحِ خبیثہ کے ساتھ مناسبت پیدا کرنی پڑتی ہے، جس میں شرکیہ اعمال، ان کے نام کے وظیفے پڑھنا، اُن کے نام پہ چڑھاوے دینا، اور ایسے گندے طریقے اختیار کرنا جن کے ساتھ ارواحِ خبیثہ کے ساتھ مناسبت پیدا ہو تو اُن کے ٹونے ٹوٹکوں کے اندر اثرات پیدا ہوتے ہیں، سحر کی یہ خاصیت ہے، چونکہ اِس میں زیادہ تر تعلق خبیث جنوں کے ساتھ ہوتا ہے تو خبیث حرکتیں کرنی پڑتی ہیں، تو باوجود اس بات کے کہ یہ کتاب کے حامل تھے، لیکن یہ کتاب کے متبع نہ رہے بلکہ ان کی ساری توجہ اس جادو کی طرف، ٹونے ٹوٹکوں کی طرف، بدشگونی کی طرف، رمل جفر کی طرف، اور ستارہ شناسی کی طرف ہوگئی، اور وہ اِس قسم کی اوہام پرستی میں مبتلا ہو گئے، اور اس اوہام پرستی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کا تعلق طاغوت کے ساتھ ہو گیا، شیطان کے ساتھ ہو گیا۔ اگر اس طرح سے اِس کا مطلب بیان کیا جائے گا، تو پھر اُس خاص واقعہ سے یہ بات متعلق نہیں رہتی، بلکہ یہودیوں کے عمومی کردار کی نشاندہی ہے، کہ کتاب پر تو یہ عامل نہ رہے اور اس کے تو متبع نہ رہے، بلکہ اس قسم کی خبیث حرکتوں میں مبتلا ہو گئے، اور ارواحِ خبیثہ کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کے لئے شرکیہ عمال میں مبتلا ہو گئے، تو ان کو جو دِینِ الٰہی کا حامل بنایا گیا تھا اور کتاب اللہ کا امین ان کو بنایا گیا تھا، اب یہ اس قابل ہی نہیں رہے کہ یہ امانت اِن کے پاس رہے، اس لئے اب یہ امانت اِن سے منتقل کی جارہی ہے بنواسماعیل کی طرف، اور جب ان کے کرتوتوں کی بناء پر اِس امانت کو ان سے چھین لیا گیا اور ان کو ہر قسم کی دینی عزت سے محروم کر دیا گیا، تو اب مسلمانوں کے ساتھ یہ ضد رکھتے ہیں، اور مشرکوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ان کی مخالفت کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو یہ فضل کیوں حاصل ہو رہا ہے، یہ علم وحکمت کی امانت ان کی طرف کیوں منتقل ہو رہی ہے، اس حسد کی بناء پر پھر یہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ تو اُس جماعت کا جو عمومی کردار تھا ان آیات کے اندر وہ دکھایا جارہا ہے۔

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جو کتاب کا ایک حصہ دیے گئے، ایمان لاتے ہیں جبت پر'' جبت سے مراد بُت، یا جبت سے مراد اُمورِ وہمیہ جن کے پیچھے وہ لگے ہوئے تھے، جس میں جادو بھی داخل ہے، اور کہانت بدشگونی یہ ساری چیزیں داخل ہیں جو اُس قوم کے اندر رواج پکڑ گئی تھیں، ''اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں'' شیطان کی پُوجا کرتے ہیں، شیطان پر ایمان لاتے ہیں، کیونکہ جادو ٹونے ٹوٹکے وغیرہ جب کیے جاتے ہیں تو بھی شیطان سے استعانت ہوتی ہے، اَرواحِ خبیثہ سے استعانت

ہوتی ہے، اس لئے جادو کُفر ہے، ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (سورۂ بقرہ: ۱۰۲) میں یہ بات ذکر کی گئی تھی، جس میں غیراللہ سے اِستعانت کی جاتی ہے، تو اِس اعتبار سے بھی اُن کا طاغوت پر ایمان ہے، اور مشرکوں کے سامنے جو انہوں نے جا کر بتوں کو سجدہ کیا یا بتوں کے ساتھ عقیدت ظاہر کی تو یہ بھی در پردہ شیطان پر ایمان ہے۔ ''اور کہتے ہیں ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کُفر کیا'' اِس کا مصداق مشرکینِ مکہ ہیں'' کہ یہ لوگ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، زیادہ ہدایت پانے والے ہیں راستے کی بمقابلہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے''، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا مصداق حضور ﷺ کی جماعت ہے، یعنی اُن مشرکین کو جا کر کہتے ہیں کہ مؤمنین کے مقابلے میں تم لوگ زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔

''لعنت'' کا مفہوم اور یہود کے ملعون ہونے کی وجہ

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ: یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، اللہ نے پھٹکار کی، یہ ملعون لوگ ہیں، مردود، دھتکارے ہوئے، پھٹکارے ہوئے ہیں، کہ اللہ کی کتاب اِن کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمدردیاں مشرکوں کے ساتھ ہیں، توحید کے مدّعی ہیں اور تعریف مشرکوں کی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مندرجات کو چھوڑ کر جادو کے پیچھے پڑتے ہیں، تو یہ لوگ ملعون ہیں، اللہ کی لعنت کا یہ اثر ہے کہ اب صحیح بات اِن کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ ''لعنت'' کا مفہوم ہوتا ہے رحمت سے دُور کردینا، جب اللہ کسی پر لعنت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُس کو اپنی رحمت سے دُور کردیا، اور اللہ کی رحمت یہی ہے جو اِنسان کے لئے خیر اور سعادت کا ذریعہ بنتی ہے، جب اُس کو خیر و سعادت سے محروم کردیا گیا تو پھر شقاوت اور سوائے نارِ جہنّم کے اُس کے پلّے کیا رہے گا؟ اور جب کوئی انسان کسی دوسرے پر لعنت کرتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بددُعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِسے اپنی رحمت سے محروم کردے، اور جب کسی کے متعلق یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ملعون ہے، تو گویا کہ ہم اپنی طرف سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ کی رحمت سے دُور ہٹا دیا گیا۔

کسی پر لعنت کرنا بہت بڑی ذمہ داری ہے

اور اس لفظ کی حقیقت کی طرف دیکھتے ہوئے آپ سمجھ سکتے ہیں، کہ کسی پر لعنت کرنا کتنی بڑی ذمہ داری ہے! اللہ کی رحمت کا کوئی انسان ٹھیکے دار نہیں ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِکائنات ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں دو شخص تھے، ایک بڑا زاہد، پرہیزگار، صوفی، نیک آدمی تھا اپنے خیال میں، اور ایک تھا بیچارہ عامی سا آدمی، جس وقت اُس سے کوئی غلطی ہوتی تو یہ نیک، زاہد، صوفی اُس کو ملامت کرتا، اور وہ گناہ گار آگے سے کہتا کہ مُذنِبٌ، بھائی! میں گناہ گار ہوں، غلطی ہوگئی۔ ایک دفعہ کہیں اُس شخص کو کوئی گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا جس کو اِس صوفی نے بہت بڑا جانا کہ یہ تو اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے، اور لگا اس کو ملامت کرنے، ملامت کرتے ہوئے اُس کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ اللہ کی قسم اللہ تجھے جنّت میں داخل نہیں کرے گا، یا یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے بخشے گا نہیں، جب یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی، چونکہ یہ ایک فاخرانہ بات تھی، جس میں در پردہ اپنے اچھے ہونے کا دعویٰ تھا، تو دل میں وہی تکبّر کے جذبات آگئے، دونوں کی رُوح قبض ہوئی، دونوں مرے، اللہ کے ہاں پیش ہوئے، اُس گناہ گار کو اللہ نے کہا

کہ چل! میری رحمت سے جنّت میں چلا جا، اور اُس دوسرے سے کہا کہ تجھے کس نے اجازت دی تھی میری رحمت پر پابندی لگانے کی؟ کہ میں اس پر رحم نہیں کروں گا اور میں اس کو بخشوں گا نہیں، کس نے اجازت دی تھی؟ تو جو قسمیں کھاتا تھا کہ اللہ نہیں بخشے گا، فرشتوں کو حکم دیا کہ گھسیٹ کر جہنّم میں پھینک دو۔[1] یہ حضور ﷺ نے دو اسرائیلیوں کا واقعہ بیان فرمایا۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی کے بارے میں کہا کہ اللہ کی قسم اللہ اس کو نہیں بخشے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ''مَنْ ھٰذَا الَّذِیْ یَتَاَلّٰی عَلَیَّ'': کون ہے یہ شخص جو میرے بارے میں قسمیں کھاتا ہے کہ میں اس کو نہیں بخشوں گا؟ میں نے اُس کو معاف کر دیا اور تیرے اعمال ضائع کر دیے۔[2] اس میں یہ بات ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ کی رحمت کس پر ہے اور کس پر نہیں؟ اللہ کس کو بخشے گا اور کس کو نہیں بخشے گا؟ یہ فیصلہ کرنا کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لئے شرعی حکم یہ ہے کہ متعین طور پر کسی کے اُوپر لعنت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کا قطعی کافر ہونا معلوم ہو، اور قطعی طور پر پتا ہو کہ کُفر پہ اس کی موت آئی ہے، جیسے ابولہب، ابوجہل، اس قسم کے مشرک جن کی موت علی الکفر یقینی اور قطعی ہے، اُن کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ملعون ہیں، اور جن کی موت کُفر پر یقینی اور قطعی نہیں، گناہ گار قسم کے تھے، وہاں متعین کر کے کسی کو ملعون قرار نہیں دیا جا سکتا اور کسی پر لعنت نہیں کی جا سکتی، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس وقت کوئی شخص کسی دوسرے پر لعنت کرتا ہے، اگر وہ شخص اس لعنت کے قابل ہوا تو وہ لعنت اُس پر جا پڑے گی، اور اگر وہ شخص اس قابل نہ ہوا تو لوٹ کر یہی لعنت کرنے والا ملعون ہو جائے گا، یہ خود اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا۔[3] اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو صدیق ہوتے ہیں وہ لعان نہیں ہوتے، لعنتیں نہیں کیا کرتے۔[4] اور فرمایا کہ جو لوگ کثرت سے دُوسروں پر لعنتیں کرتے ہیں یہ بخشے بھی گئے تو اللہ تعالیٰ ان کو مقامِ شفاعت پر نہیں لائے گا، یہ کسی کی سفارش کرنے کے حقدار نہیں ہوں گے، ان کو اس شرف سے محروم کر دیا جائے گا۔[5]

عورتیں جہنّم میں بکثرت کیوں ہوں گی؟

اور ایک دفعہ عورتوں کو صدقے کی ترغیب دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا: ''اُرِیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَھْلِ النَّارِ'' کہ مجھے دکھایا گیا ہے کہ جہنمیوں میں زیادہ تر عورتیں ہوں گی، عورتیں جہنّم میں کثرت سے جائیں گی، تو عورتوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! عورتیں جہنّم میں کیوں جائیں گی؟ کس وجہ سے جائیں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ''[6] تمہارے اندر دو خرابیاں ایسی ہیں، ایک تو تم لعنت بہت کثرت سے کرتی ہو، زبان کے اُوپر لعنت کے لفظ بہت چڑھے ہوئے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا جس وقت یہ لعنت کرتی ہیں تو پھر وہ ایک نہیں کرتیں، ان کی زبان پہ لفظ ہوتا ہے ''لکھ لعنت'' یعنی ایک ہی لفظ میں لاکھ، یہ عام

(۱) ابوداؤد، ۳۱۵/۲، باب فی النہی عن البغی/ مسند احمد، رقم: ۸۲۹۲ ــ واللفظ لہ/ مشکوٰۃ، ۲۰۵/۱، باب الاستغفار، فصل ثانی۔

(۲) مسلم، ۳۲۹/۲، باب النہی عن تقنیط الانسان/ مشکوٰۃ، ۲۰۴/۱، باب الاستغفار، فصل اول۔

(۳) ابوداؤد، ۳۱۶/۲، باب فی اللعن/ مشکوٰۃ، ۴۱۳/۲، باب حفظ اللسان، فصل ثالث۔

(۴) ابوداؤد، ج ۲ ص ۳۱۶، باب فی اللعن/ مشکوٰۃ، ج ۲ ص ۴۱۳، باب حفظ اللسان، فصل ثالث

(۵) مسلم، ۳۲۳/۲، باب النہی عن لعن الدواب/ مشکوٰۃ، ۴۱۱/۲، باب حفظ اللسان. ولفظ الحدیث: لاینبغی لصدیق ان یکون لعانا۔ نیز ۴۱۵/۲۔

(۶) بخاری، ۴۴/۱، باب ترك الحائض الصوم/ مشکوٰۃ، ج ۱ ص ۱۳، کتاب الایمان.

زبانوں پر چڑھا ہوا ہوتا ہے، ''پھٹے منہ، لکھ لعنت'' یہ اِن کا تکیہ کلام ہے، تو جب دوسروں پہ کثرت کے ساتھ لعنت کرتی ہیں، یعنی یہ کہتی ہیں کہ یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے، تو اُسی قاعدے کے مطابق جب دوسرا شخص ملعون نہیں ہوتا اور اللہ کی رحمت سے محروم نہیں ہوتا تو ان کی یہ بددُعا اپنے آپ کو آلگتی ہے، یہ خود ملعون ہو جائیں گی اور خود اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائیں گی۔ اور دوسری خرابی یہ ذکر کی کہ تم خاوند کی بڑی ناشکری ہوتی ہو، اُس کی شکرگزار نہیں ہوتی، (جیسے دوسری روایت میں اس قسم کے الفاظ ہیں، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان عورتوں میں سے کسی ایک کی طرف زندگی بھر احسان کرو، اور اِن کو ہمیشہ اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ، اچھی طرح سے رکھو، خوش رکھو، لیکن ایک واقعہ بھی ان کی طبیعت کے خلاف اگر پیش آ گیا تو پھر یہ کہتی ہیں کہ ''مَا رَاَیْتُ مِنْكَ خَیْرًا قَطُّ ''[1] میں نے تو کبھی تیری طرف سے کوئی خیر دیکھی ہی نہیں، یعنی جس کو ہم اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہیں اور یہی الفاظ ہوتے ہیں اِن عورتوں کے کہ ''جدوں دی تیرے گھر آئی آں، ایہی حال اے'' یعنی جب سے تیرے گھر آئی ہوں ایسے ہی گزر رہی ہے، ساری زندگی کے احسانات کو ایک ہی بات کے عوض میں ختم کر کے رکھ دیتی ہیں)۔ ''تَكْفُرْنَ الْعَشِیْرَ'': تمہاری یہ دو عادتیں ہیں جو تمہیں جہنم میں لے جائیں گی۔ اور پھر ساتھ یہ بھی فرمایا: ''مَا رَاَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِیْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدَاكُنَّ '' کہ خود تو ناقصات العقل والدِّین ہو اور اچھے بھلے ہوشیار آدمی کی عقل چاٹ جائے، ایسا میں نے تمہارے مقابلے میں کوئی نہیں دیکھا، اچھے بھلے عقلمند آدمی کی عقل کو لے جاتی ہو، باوجود اس بات کے کہ تمہیں نہ عقل ہے نہ دِین، تمہارا دِین بھی ناقص اور عقل بھی ناقص، عقل ناقص ہونے کی تو یہ علامت ذکر فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے گواہی میں دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام قرار دیا، اور دِین کا نقص یہ ذکر کیا کہ تمہیں جو ماہواری آتی ہے یعنی اَیامِ حیض میں نہ تم نماز پڑھ سکتی ہو، نہ روزے رکھ سکتی ہو، تو تمہاری نماز اور روزے کی مقدار مَردوں کے مقابلے میں کم ہے، جس کی بنا پر تمہارا دِین بھی کم اور تمہاری عقل بھی تھوڑی، لیکن یہ عجیب قصہ ہے کہ ناقصات العقل والدِّین ہونے کے باوجود اچھے بھلے ہوشیار آدمی کی عقل کو لے اُڑتی ہو، یہ ایسا غلبہ پاتی ہیں۔ بہرحال ان کی کثرتِ لعنت جہنم میں جانے کا باعث ہے جو حضور ﷺ نے ذکر فرمایا۔

کسی صفت پر اور کسی کی ذات پر لعنت کرنے میں فرق

بعض لوگ اِس معاملے میں بے احتیاطی کرتے ہیں، متعین کر کے کسی آدمی پر لعنت کرنا بہت ذمہ داری کی بات ہے، ہاں! البتہ کسی عمل کو ذِکر کر کے اس کے اُوپر لعنت کی جا سکتی ہے، جیسے ''جھوٹوں پہ اللہ کی لعنت!''، ''ظالموں پہ اللہ کی لعنت!''، یا جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو عورتیں مَردوں جیسا لباس پہنتی ہیں، مُتَرَجِّلات، بہ تکلف مَرد بننے والی ہیں اُن پر اللہ کی لعنت، جو مَرد ہو کر عورتوں جیسی ہیئت اختیار کرتے ہیں، عورتوں کے ساتھ تشبہ پیدا کرتے ہیں، اُن پر اللہ کی لعنت، یا فرمایا کہ جو عورتیں اپنے چہرے سے اور اپنے ابروؤں سے بال چُن چُن کر زیب و زینت کرتی ہیں، اللہ کی خلق کو بگاڑتی ہیں، اُن پر لعنت۔ بدن گدوانے والی، بدن پہ پھول بوٹے نکلوانے والی، جس طرح رِواج ہے کہ سیاہی بھر کے پھول بوٹے بناتی ہیں، جسے عربی میں ''وشم'' کہتے

---

(۱) بخاری، ج۱ ص۹۔ مشکوٰۃ ۱ر۱۳۰ باب صلاۃ الخسوف۔

ہیں تو ایسا کرنے والی اور کروانے والی دونوں پہ لعنت، اپنے بالوں کے اندر دوسرے بال ملانے والی یعنی بالوں میں اضافہ کرنے والی ہو واصلات وموستوصلات، جو یہ ملانے کا کام کرتی ہیں یا جو ملواتی ہیں، اپنے بالوں میں دوسروں کے بال ملا کر اپنے بال زیادہ ظاہر کرتی ہیں اُن کے اوپر لعنت فرمائی، تقدیر کے جھٹلانے والے پہ لعنت فرمائی، سُود خور پہ لعنت فرمائی، رشوت لینے والے پہ لعنت فرمائی، چور پہ لعنت کی مَنۡ عَمِلَ عَمَلَ قَوۡمِ لُوۡطٍ پر لعنت فرمائی، کہ مَلۡعُوۡنٌ مَنۡ عَمِلَ عَمَلَ قَوۡمِ لُوۡطٍ، قوم لوط والا جو کردار اختیار کرتا ہے اس پہ لعنت، اسی طرح تارکِ سُنّت پہ لعنت فرمائی: اَلتَّارِكُ لِسُنَّتِيۡ، اور بھی ایسی بہت ساری چیزیں ہیں جن کے بارے میں قرآن و یا حدیث میں لعنت کا ذکر آیا ہے، تو عمل کو ذکر کر کے کہ جو ایسے عمل والا ہے اُس پہ لعنت، جو یہ کام کرے اُس پہ لعنت، یہ عنوان اختیار کرنا ٹھیک ہے۔ اور متعین طور پر کسی شخص کا نام لے کر کہ فلاں ملعون ہے، یا فلاں پہ لعنت ہے، یہ بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے، اگر وہ اس قسم کا نہ ہوا تو وہی لعنت لوٹ کر آپ کی طرف آ جائے گی، اس لیے ہمارے سب بزرگ لکھتے ہیں کہ لعنِ یزید جائز نہیں ہے، یزید پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ کسی شخص کے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں کہ اُس کا خاتمہ کُفر پر ہوا اور وہ مؤمن نہیں تھا، ویسے کہو کہ فاسقوں پر اللہ کی لعنت، کافروں پر اللہ کی لعنت، اللہ کے علم میں جو بھی ایسا ہوگا وہ اِس کا مصداق بن جائے گا، باقی کسی آدمی کو متعین کر کے تم اس قسم کا حکم لگاؤ تو کسی کے فسق اور کُفر کا خاتمے کے وقت معلوم کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بارے میں احتیاط کرنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو ملعون کہتے کہتے خود ہی ملعون بن کے بیٹھ جائیں، اس لیے کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ یزید پر لعنت کرنا جائز ہے؟ تو فرمانے لگے کہ ہاں! مرنے کے بعد قبر میں جا کے جائز ہے جب تمہیں پتا چل جائے گا کہ تمہارا انجام یزید سے اچھا ہے، ایسا نہ ہو کہ یہاں تو اُس پر لعنت کرتے رہو، اور وہاں جانے کے بعد اُس سے بھی زیادہ ملعون تم ثابت ہو جاؤ، جب مر جاؤ گے اور اپنا ایمان صحیح سالم لے جاؤ گے اور وہاں جا کر تمہیں پتا چل جائے گا کہ ہم یزید سے اچھے ہیں تو پھر لعنت کر لینا، ورنہ ذرا اس بات سے، ہوسکتا ہے تمہارا انجام اُس سے بھی خراب ہو۔ اُن لوگوں کو جو زیادہ بدنام کیا گیا اور اُن کے بارے میں جس قسم کے پروپیگنڈے کیے گئے اِس میں کسی درجے میں سیاسی اختلافات کا دخل ہے، اور سیاسی اختلافات میں جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں اُن کے نمونے آپ بھی دیکھتے رہتے ہیں، وہ زمانہ بھی یاد کرلو جب مولانا غلام غوث ہزاروی کے ساتھ آپ لوگوں کو عقیدت تھی، اُس وقت مولانا ہزاروی کی کیا پوزیشن تھی، اور جب اُن کے ساتھ اختلاف ہو گیا تو ان کا کیا مقام ہو گیا، اِسی سے آپ اندازہ کرلیں کہ سیاسی نشیب وفراز میں کتنی بے احتیاطیاں ہوتی ہیں۔

اب یہود کی جڑ کٹ چکی ہے

''یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی'' گویا کہ یہ ایسے عالم تھے جن کے پاس علم تھا لیکن اپنی سیاسی اغراض کے تحت اور اپنے دُنیوی مفاد حاصل کرنے کے لئے، اپنی سرداریاں بچانے کے لئے، اپنی گدیوں کی حفاظت کرنے کے لئے انہوں نے مشرکین کا ساتھ دیا اور مؤمنین کے مقابلے میں اُن کو اچھا کہا۔ ''یہ پھٹکارے ہوئے لوگ ہیں، اِن پر اللہ کی لعنت ہے، اور جس پر

اللہ لعنت کرے اس کے لئے کون مددگار ہو سکتا ہے؟" وہ تو دُنیا اور آخرت میں برباد ہو گیا، اس کی تو جڑ کٹ گئی جس پہ اللہ نے لعنت کردی، اب ان کی بھی جڑ کٹ چکی، یہ اب سرسبز نہیں ہوں گے، ان کا حال یہی ہے جیسے کسی درخت کی جڑ کٹ جائے، اب یہ ہزار کوشش کریں یہ پھلنے پھولنے کے نہیں ہیں، اب اِن کا وقت ختم ہو گیا۔

یہود کا حسد اور حسد کی مذمت اور اس کا علاج

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ: کیا اِن کا کوئی اللہ کے ملک میں حصہ ہے؟ یہ کوئی اللہ کی سلطنت میں حصے دار ہیں؟ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا: اگر یہ اللہ کی سلطنت میں حصے دار ہوتے تو یہ تو کسی کو بھی کچھ نہ دیتے، اگر سلطنت اِن کے پاس ہوتی تو یہ تو کسی کو کچھ نہ دیتے، یہاں النَّاس کا لفظ اگرچہ عام رکھا گیا ہے لیکن مراد اس سے بنی اسماعیل ہیں جن کے ساتھ اِن کا مقابلہ تھا، کہ اگر ان کے اختیار کی بات ہوتی تو یہ بنی اسماعیل کو کچھ ملنے دیتے؟ کچھ بھی نہیں۔ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: سلطنت میں تو ان کا حصہ نہیں، تو پھر یہ پیچ وتاب کیوں کھاتے پھرتے ہیں، اِن کو حسد ہے اِن لوگوں پر (یہاں سے وہی بنی اسماعیل مراد ہیں) اللہ تعالیٰ اِن کو جو اپنے فضل سے دے رہا ہے، علم وحکمت اِن کی طرف منتقل کر رہا ہے، دُنیوی جاہ وجلال اب اِن کی طرف آ رہا ہے، اِس پر یہ لوگ حسد کرتے ہیں، اور "حسد" کا معنی ہوتا ہے تمنّیٔ زوالِ نعمت، کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملے تو اُس کے زوال کی تمنا کرنا "حسد" ہے، جس کو آپ اپنے لفظوں میں ذکر کرتے ہیں کہ دوسرے کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلنا، یہ "حسد" کہلاتا ہے، اور یہ بھی شریعت میں کبیرہ گناہ ہے، اور یہ دِل کی بیماریوں میں سے بہت بڑی بیماری ہے، کیونکہ اس میں براہِ راست اللہ کی تقدیر پر اِعتراض ہوتا ہے کہ اللہ اس کو یہ نعمت کیوں دے رہا ہے؟ یہ اس کے پاس نہیں ہونی چاہیے، یہ اللہ کی تقسیم پر اعتراض ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ تقدیر کے ساتھ پنجہ آزمائی کر کے کبھی کوئی شخص کامیاب نہیں ہوا کرتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو کسی کو دینا ہے وہ تو دینا ہی ہے، اور حسد کرنے والا جلتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو برباد کر کے بیٹھ جاتا ہے، ورنہ اِس کے جلنے سے اُس نعمت کو اللہ تعالیٰ واپس نہیں لے لیں گے کہ اِس کو چونکہ اس تقسیم پر اعتراض ہے، اس لیے چلو! میں اس سے واپس لے لیتا ہوں، اللہ تعالیٰ کسی کے جلنے کی بناء پر دی ہوئی نعمت واپس نہیں لیتے، جلنے والا اپنا نقصان کر کے بیٹھ جاتا ہے، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اَلْحَسَدُ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ" حسد حاسد کی نیکیوں کو کھا جاتا ہے "كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"(۱) جس طرح آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے۔ یہ بدترین قسم کی بیماری ہے، جس کا دُنیوی نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کو ہر وقت بے چینی رہتی ہے، کسی وقت بھی اس کو قلبی سکون نہیں آتا، خیال کر کر کے انسان جلتا رہتا ہے کہ فلاں کو یہ نعمت کیوں مل گئی؟ اور اِس شخص کا اللہ کی تقدیر کے ساتھ براہِ راست ٹکراؤ ہوتا ہے، اور اللہ کی تقدیر سے پنجہ آزمائی کر کے نہ آج تک کوئی جیتا ہے نہ ہی جیت سکتے ہیں، تو یہ حسد ہے جس کی بنا پر یہ ساری کی ساری حرکتیں کر رہے ہیں۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھیو!، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "احیاء العلوم" میں ہر طبقے کی مخصوص مخصوص بیماریوں کا ذکر

---

(۱) ابن ماجہ، ص ۳۱۰، باب الحسد۔ واللفظ لہ/مشکوۃ ۲/۴۲۸، باب ما ینھی عنہ الخ فصل ثانی، عن ابی ھریرۃ۔

کہا ہے، کہ فلاں طبقہ اِس قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے، اور فلاں طبقہ اس قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے، اور علماء کی مخصوص بیماری انہوں نے ''حسد'' ہی بیان کی ہے، کہ یہ ایک دوسرے کی عزت، ایک دوسرے کا وقار، اور ایک دوسرے کی قابلیت برداشت نہیں کرسکتے، ایک دوسرے پر بڑا جلتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس مرض سے محفوظ رکھے، اس سے بچنے کا سب سے اچھا طریقہ ایک تو اللہ کی تقدیر پر اِعتماد ہے، اور اگر خصوصیت کے ساتھ کسی کے ساتھ اس قسم کا قلبی تعلق ہوجائے کہ انسان اس کے حال کو دیکھ کر جلتا ہے، تو اولیاء اللہ تدبیر لکھا کرتے ہیں (کیونکہ ان بیماریوں کا علاج خانقاہی مطب سے ملتا ہے، اور وضو کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے؟ نماز کن چیزوں سے خراب ہوتی ہے؟ یہ مدرسوں سے اور دارالافتاء سے پتا چلتا ہے، اور دِل کی کیفیات کونسی اچھی ہیں اور کونسی بُری ہیں؟ یہ خانقاہوں سے پتا چلتا ہے، یہ خانقاہی نظام ہے، اور اُنہی سے یہ تدابیر پوچھی جاتی ہیں کہ اس بیماری کا کیا علاج ہے؟) کہ اِس کا بہت زود اثر علاج یہ ہے کہ اپنے محسود کے لئے اُسی نعمت میں ترقی کی دُعا شروع کردو جس کو دیکھ دیکھ کر تم جلتے ہو، جی تو نہیں چاہے گا اُس کے لئے دُعا کرنے کو، زبان پر تو اس کے لئے بددُعا کے الفاظ آئیں گے، لیکن اپنی طبیعت پہ جبر کرکے جس نعمت کی طرف دیکھ کر جل رہے ہو اُس نعمت میں ترقی کی اس کے لئے دُعا کرو، چند دِن یہ مجاہدہ کروگے تو یہ کیفیت دُور ہوجائے گی اِنْ شَاءَ اللہ فَلْيُجَرِّبْ! تجربہ شدہ چیز ہے، اور اِس کو آزماؤ تو تمہیں پتا چلے گا کہ دوسرے کے لئے ترقی کی دُعا کرنا اپنے دِل میں حاسدانہ جذبات کو ختم کردیتا ہے۔ ''یا یہ حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس چیز پر جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دے دی۔''

''آلِ اِبراہیم'' کا مصداق اور اُن کو ''آلِ اِبراہیم'' کہنے کی وجہ

یہ حسد کرتے ہیں تو کرتے رہیں، فَقَدْ اٰتَيْنَآ سے پہلے یہ عبارت مقدر ہوگی کہ یہ حسد کرتے ہیں تو کرتے رہیں، ''ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب وحکمت دے دی اور مُلکِ عظیم بھی دے دیا'' اور یہاں ''آلِ ابراہیم'' سے بھی خصوصیت کے ساتھ ''بنی اسماعیل'' مُراد ہیں، کیونکہ بنی اسرائیل کے تو پہلے ملعون ہونے کا ذکر آگیا کہ اُن کو تو کتاب دی گئی تھی لیکن ان نالائقوں نے قدر نہیں کی، بلکہ اس کو بھی تحریف کرکے رکھ دیا، ان سے میثاق لیے گئے تھے لیکن انہوں نے وہ میثاق توڑ دیے، ان کو لوگوں کے لئے ایک قسم کا نگہبان بنایا گیا تھا کہ ان کی ہدایت کے ذمہ دار ہیں تو انہوں نے اپنی اِن ذمہ داریوں کے اندر بھی خیانت کی، اور قومی اور نسلی فخر میں مبتلا ہوکر یہ اُمیین کے بارے میں کہتے تھے کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آل عمران:۷۵) اُمیین کے بارے میں تو ہم پر کوئی الزام ہے ہی نہیں، چاہے ان کا مال لوٹ کھسوٹ کر کیسے ہی کھا جائیں، تو یہ خائن ہیں اور یہ اِن حقوق کے چور ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے محرف ہیں، اور بدعمل ہیں، بدعقیدہ ہیں، ملعون ہیں، اس لیے یہاں ''آلِ ابراہیم'' سے ''اسرائیلی'' مراد نہیں کیونکہ اُن کی تو مذمت چلی آرہی ہے، یہاں ''آلِ ابراہیم'' سے ''آلِ اسماعیل'' مراد ہیں، اور ان کو ''آلِ ابراہیم'' کے لفظ سے ذکر کرنے میں یہ فائدہ ہوا کہ اُن اسرائیلیوں کو کہا جارہا ہے کہ اب بھی نبوّت، کتاب وحکمت اور سلطنت شاہی خاندان سے باہر نہیں ہے، آخر تم بھی ''آلِ ابراہیم'' میں تھے، ایک وقت تم لیے ہوئے تھے، تو اَب بھی تو اُسی خاندان میں ہی ہے، کہیں باہر تو نکل کے

نہیں چلی گئی، یہ ''بنی اسماعیل'' بھی تو آخر ''آلِ ابراہیم'' ہی ہیں، اگر تمہیں خاندانی شرافت اور خاندانی فخر حاصل ہے تو وہ فخر تو ان کو بھی حاصل ہے، اس لیے اگر ابراہیمی اولاد میں سے ایک شاخ اس کی رعایت نہیں رکھ سکی تو اَب دوسری شاخ کو ہم نے دے دی۔ ''حسد کرتے رہو، حسد میں جلتے رہو، ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب وحکمت دے دی اور اُن کو مُلکِ عظیم دے دیا''

آخرت کا فیصلہ ایمان کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ نسل کی بنیاد

اور اِن میں سے بھی بعض یعنی بنو اسماعیل میں سے بھی بعض ایمان لائے ہیں اور بعض رُکے ہوئے ہیں، اور جو رُکنے والے ہیں ان کے لئے جہنم کافی ہے، اور جو اس کتاب وحکمت پر ایمان نہیں لاتے، کُفر کرتے ہیں، ہم اِنہیں جہنم میں داخل کریں گے، آگ میں ڈالیں گے، اور آگ میں پڑنے کے بعد پھر وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایک دفعہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے تو عذاب ختم ہو جائے گا، نہیں! جب ان کی کھالیں جلیں گی، ان کے چمڑے جلیں گے، ہم ان کو اور چمڑے بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں، عذاب کا احساس ختم نہیں ہونے دیں گے، تو جو اس کے منکر ہیں اُن کا تو یہ حال ہوگا۔ اور جو اِس کتاب وحکمت کو قبول کریں گے ان کے لئے آگے بشارت ذکر کردی کہ ''جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ہم انہیں داخل کریں گے باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں گے، اور ان کے لئے صاف ستھری بیویاں ہیں، اور ہم انہیں گھنے سائے میں داخل کریں گے''، تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ بنی اسرائیل نے جس طرح سمجھ لیا تھا کہ جو اسرائیلی ہے اور جو نبیوں کی اولاد میں سے ہے وہ بہرحال بخشا بخشایا ہے وہ جنت میں جائے گا، اِس عقیدے نے اُن کو عملی ذمہ داریوں سے سبکدوش کردیا، اور ان کے ہاں عمل کی اہمیت نہ رہی، بنی اسماعیل کو سمجھایا جارہا ہے کہ تم اس وہم میں مبتلا نہ ہوجائیو، اللہ کے ہاں جو فیصلے ہوں گے وہ کسی نسل اور نسب کی بنا پر نہیں ہوں گے، یہاں تو ایمان لانے اور ایمان نہ لانے پر فیصلہ ہوگا، جو مانیں گے ان کا انجام اچھا ہوگا اور جو نہیں مانیں گے ان کا انجام بُرا ہوگا، چاہے وہ بنی اسرائیل میں سے ہو چاہے بنی اسماعیل میں سے ہو، نسل کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلے نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں جو فیصلے ہوں گے وہ ایمان اور کُفر کی بنا پر ہوں گے، عملِ صالح اور عملِ بد کی بنا پر ہوں گے، یہ نہیں کہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ بخشا ہی جائے۔ اور یہ جلدوں کا بدلنا، چمڑوں کا بدلنا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں، اللہ تعالیٰ عزیز ہے حکیم ہے۔ تو یہ آیات بشارت پر بھی مشتمل ہیں اور وعید پر بھی مشتمل ہیں، ماننے والوں کے لئے بشارت ہوگئی اور نہ ماننے والوں کے لئے وعید ہوگئی۔

''امانت'' کا مصداق، اَدائے امانت کی تاکید اور اس کی اہمیت

اِنَّ اللهَ يَاْمُرُكُمْ: كُمْ کا خطاب بنی اسماعیل کو ہے جن کو کتاب وحکمت اور ملک عظیم کے دینے کا ذکر آیا، کہ اب سلطنت تمہیں مل رہی ہے، علم وہدایت کا حامل تمہیں بنایا جارہا ہے، خطاب مجموعی طور پر اُمت کو ہے، لیکن اِس کا اصل مصداق ہوں گے وہ افراد جن کو حکومت اور اِقتدار حاصل ہے، اے مسلمانو! تم یوں کرنا، تو کرنا اُن لوگوں نے ہے جن کو کرنے کا اختیار حاصل ہے، جو

اقتدار پر آئیں گے، جو ظاہری طور پر اس سلطنت کے مالک سمجھے جائیں گے۔'' بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ادا کرو امانات اُن کے اہل کی طرف'' جس طرح بنی اسرائیل نے خیانتیں کی ہیں ایسے خیانت نہ کرنا، لوگوں کے حقوق ادا کرو، امانت سے حقِ واجب مراد ہے، اور یہی جذبہ جو اللہ تعالیٰ نے قلوب میں ڈالا ہے دُوسرے کے حقوق کو اَدا کرنے کا، اِسی کو دوسری جگہ ''امانت'' سے تعبیر کیا گیا: إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ (سورۂ اَحزاب: ۷۲) اور آگے لفظ ہے: وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ: انسان نے اس کو اُٹھایا۔ اور حدیث شریف میں بھی آتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا[1] کہ: ''إِنَّ الْأَمَانَةَ نَزَلَتْ فِي جَذْرِ قُلُوبِ الرِّجَالِ''، لوگوں کے دِلوں کے وسط میں امانت کا جذبہ اللہ نے اُتارا، پھر بعد میں کتاب وسُنّت کے ساتھ اس کی تفصیلات لوگوں کو سمجھائیں، حقوق اور فرائض کو اَدا کرنے کی یہ عمومی ذمہ داری جو ڈالی گئی ہے اِس کو ''امانت'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ صرف مالی امانت کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ جب کبھی خطبہ دیتے تھے تو اُس خطبے میں یہ بات ضرور بیان فرمایا کرتے تھے: ''لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ''[2] جس شخص کے پاس امانت نہیں، جو اَمانت دار نہیں، اس کے لئے کوئی ایمان نہیں ہے، اور جو شخص اپنے عہد کا پابند نہیں اس کے لئے کوئی دِین نہیں، دِین دار وہی ہے جو عہد کا پابند ہے، ایمان والا وہی ہے جو اَمانت دار ہے۔ اور اِس ادائے امانت کے جذبے پر ہی دُنیا کا نظام قائم ہے، اور اِسی ادائے امانت کے جذبے سے ہی جماعتوں وغیرہ کا نظام قائم رہتا ہے، اور جب یہ ادائے امانت کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے تو پھر فساد ہی فساد ہوتا ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے کسی نے سوال کیا کہ ''مَتَى السَّاعَةُ؟'' قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''إِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ''، جب امانت ضائع کردی جائے گی تو ''فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ!'' قیامت کا انتظار کرنا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ ''كَيْفَ إِضَاعَتُهَا؟'' امانت کی اضاعت کیسے ہوگی؟ امانت ضائع کیسے ہوجائے گی؟ فرمایا کہ ''إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ!''[3] جس وقت کام نااہلوں کے سپرد ہونے شروع ہوجائیں تو اس وقت قیامت کا انتظار کرنا، گویا کہ کام کوئی بھی ہو اگر کسی نااہل کے سپرد کردیا جائے تو یہ بھی اضاعتِ امانت ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ کام کو اس کے اہل کے سپرد کرنا یہ امانت کی ادائیگی ہے۔ تو یہ لفظ کتنا عام ہے، اہلِ حکومت کو چاہیے، جو برسرِ اقتدار ہے اسے چاہیے کہ کوئی عہدہ اور کوئی منصب کسی کو سفارش کے طور پر نہ دے، رشوت کے ساتھ نہ دے، کنبہ پروری اور اَقربانوازی کے جذبے کے ساتھ نہ دے، بلکہ جو منصب ہے اُس کے لئے اہل تلاش کرے، اگر یہ حکومت کے عہدے اہلوں کو دیے جائیں گے تو حکومت کا نظم ٹھیک رہے گا اور دُنیا کا نظام بھی ٹھیک رہے گا، اور جس وقت یہ عہدے اَقربانوازی کے طور پر اور کنبہ پروَری کے طور پر تقسیم ہونے لگ جائیں، رشوت کے ساتھ یہ عہدے حاصل ہونے لگ جائیں، یا سفارشوں کے ساتھ یہ عہدے ملنے لگ جائیں، تو پھر دُنیا میں نظام کا جو حال ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، نااہل حاکم جس وقت آجائیں گے تو وہ امانت کس طرح ادا کریں گے؟ وہ جذبہ تو ان میں ہوگا نہیں، پھر آپ کے سامنے ہے کہ اگر

---

(۱) بخاری ۲/۹۶۱ باب رفع الامانة۔ مشکوٰۃ ۲/۴۶۱، کتاب الفتن، فصل اول۔

(۲) مسند احمد، رقم ۱۲۳۸۳ وغیرہ۔ مشکوٰۃ ۱/۱۵، کتاب الایمان، فصل ثانی کا آخر۔

(۳) بخاری، ج ۱ ص ۱۴/مشکوٰۃ ۲/۴۶۹ باب اشراط الساعة، فصل اول۔

حاکم نیک نیت بھی ہو تو جب کام اُس نے اپنے انہی ہاتھ پیروں سے لینا ہے جو نالائق جمع ہوئے ہوئے ہیں، تو وہ نیک نیت ہو کر بھی نظام کو ٹھیک نہیں کر سکے گا جب تک اُس کے کارندے حاملِ امانت نہیں ہوں گے اور ان کے اندر اَدائے حقوق کا جذبہ نہیں ہوگا، اس لیے یہ عہدے اور منصب جتنے ہیں سب اہلیت کی بنا پر تقسیم ہونے چاہئیں، اس کے علاوہ کسی دوسرے جذبے کے تحت اگر تقسیم کیے جائیں گے تو یہ اِضاعتِ امانت ہے۔ اور شارحین نے لکھا کہ ایسے ہی باقی چیزوں کے متعلق ہے، جیسے اِفتاء، درس، اِمامت اور دوسری ذمہ داریاں ہیں، جب تک یہ اہلوں کے سپرد رہیں گی نظام ٹھیک رہے گا، اور جب یہ نااہلوں کے سپرد ہونی شروع ہو جائیں گی کام خراب ہو جائے گا۔ اس کو اس طرح سے سمجھ لیجیے کہ ایک بس ہے، اُس کو چلانے کے لئے ڈرائیور کی ضرورت ہے، اگر تو آپ نے اُس پر ڈرائیور وہ بٹھا دیا جس میں بس چلانے کی اہلیت ہے، اپنے فن کا وہ ماہر ہے، تو بس ٹھیک چلتی رہے گی، اور اگر آپ نے لحاظ کرتے ہوئے اپنے کسی رشتے دار کو اور کسی سفارشی کو اس کی اہلیت دیکھے بغیر اُس بس کے اوپر بٹھا دیا تو بس کی تو قیامت آگئی، جب اس کو چلائے گا تو کہیں نا کہیں اس کو تباہ کر دے گا۔ اسی طرح جماعتوں کی قیادت ہے، اِداروں کی قیادت ہے، مُلک کی قیادت ہے، اگر نا اہل کے ہاتھ میں آئے گی تو اس کا وہی حال ہوگا جو اناڑی ڈرائیور بس کا کر دیتا ہے، جیسے بس پہ قیامت آجاتی ہے اسی طرح اُس جماعت پہ قیامت آجائے گی، اُس اِدارے پہ قیامت آجائے گی، اُس ملک پہ قیامت آجائے گی جس میں قیادت نااہلوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی، اور جب ساری دُنیا میں عمومی طور پر اس قسم کے حالات آجائیں گے تو ساری دُنیا میں قیامت آجائے گی، تو جب یہ امانت ضائع کر دی جائے تو پھر حالات کبھی ٹھیک نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اِن لوگوں کو جن کو اب کتاب وحکمت کا وارث بنایا جا رہا ہے، جن کو مُلکِ عظیم دیا جا رہا ہے، اب اِنہیں کہا جا رہا ہے کہ تم نے بنیادی طور پر اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی ہے کہ امانات اُن کے اہل کو اَدا کرنی ہیں، یہ حکم حکام کو ہے، اور جس درجے کی حکومت ہوگی اُسی درجے میں حکم ہوگا، ''کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ''[1] تم میں سے ہر کوئی راعی ہے، اپنی اپنی جگہ حاکم ہے، اور ہر کسی سے اُس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا، جتنا کسی کو اِختیار ہے، جتنا کسی کے اُوپر ذمہ داری ہے، اتنا وہ مکلف ہے کہ اہل اور نااہل کا فرق کر کے وہ اپنی اُس ذمہ داری کو ادا کرے۔

شانِ نزول

ویسے اس آیت کے شانِ نزول میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے، کہ بیت اللہ کی خدمات مشرکین نے بھی تقسیم کر رکھی تھیں، کہ ''سقایہ'' یعنی حاجیوں کو پانی پلانا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذمے تھا، زمزم کا کنٹرول یہ کرتے تھے، اسی طرح بیت اللہ کی چابی عثمان بن طلحہ کے پاس تھی، چابی بردار یہ سمجھے جاتے تھے، اِنہی کا کام ہوتا تھا کہ بیت اللہ کھولیں، یہ اجازت دیتے تھے تو کوئی اندر جا سکتا تھا، جب تک یہ اجازت نہیں دیتے تھے کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا، ہجرت سے پہلے ایک دفعہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ میں داخل ہونا چاہا، تو عثمان بن طلحہ چونکہ مشرک تھا، اس نے ترش رُوئی کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رُکاوٹ ڈالی، خوشی کے ساتھ آپ کو اندر جانے

---

(۱) بخاری، ۱/ ۱۲۲ باب الجمعۃ فی القری والمدن/ مشکوۃ، ۲/ ۳۲۰، کتاب الامارۃ فصل اول۔

کی اجازت نہ دی، اُس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "عثمان! اُس وقت کیا حال ہوگا جب یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جس کو چاہوں گا دُوں گا!" یہ بات آپ ﷺ نے اُس وقت فرمائی ہجرت سے پہلے، بعد میں جس وقت مکہ فتح ہوگیا تو آپ نے عثمان بن طلحہ کو بُلایا اور اس سے چابی لی، چابی لے کر بیت اللہ کو کھولا گیا، بیت اللہ کے اندر حضور ﷺ تشریف لے گئے، نماز پڑھی، باہر نکلے، جس وقت باہر نکلے ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی زبان پر یہ آیت تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تلقین کی کہ یہ امانت اُسی کے سپرد کرو جس کی تھی، عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگیا تھا، تو آپ ﷺ نے باہر نکل کر وہ چابی اس کے ہاتھ میں دی، اور یہ کہا کہ اس کو لے لو، اب یہ ہمیشہ تیرے خاندان میں رہے گی، تم سے یہ چابی وہی شخص لے گا جو ظالم ہوگا (مظہری)، یعنی تم سے یہ چابی لینا ظلم ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حق تمہارا قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ آج تک چاہے کتنی حکومتیں بدلی ہیں، جو کچھ بھی ہے، بیت اللہ کی چابی اسی خاندان کے ہاتھ میں چلی آرہی ہے، یعنی عثمان بن طلحہ کے خاندان میں، اور بیت اللہ کی چابی جس کے سپرد ہوتی ہے اس کی بڑی عزّت اور منزلت بہر حال ہے۔ اب بھی بادشاہ آئے یا کوئی اور آئے تو اُسی خاندان کا فرد آئے گا جو اس چابی کا امین ہے، اور وہی آکر بیت اللہ کھولے گا تو کوئی دوسرا اندر داخل ہوسکتا ہے، گویا کہ قیامت تک کے لئے اُن کا یہ حق محفوظ کرلیا گیا۔ تو وہ خاص واقعہ بھی اِس کا مصداق ہے، اور ویسے لفظ اِس میں عام آگئے۔

فیصلے میں امیر غریب اور مؤمن کافر کا فرق نہیں ہونا چاہیے

اور دُوسری بات اللہ تعالیٰ تمہیں یہ کہتا ہے اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ: کہ جس وقت تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو فیصلہ عدل کے ساتھ کرنا ہے۔ عدل کا معنی ہوتا ہے برابری، برابری کا مطلب یہ ہے کہ جو قاعدہ اور قانون تمہیں دے دیا گیا اُس کے اوپر سب کو برابر پرکھو، قانون کا فیصلہ یکساں ہونا چاہیے، فیصلے کے اندر غریب امیر کا فرق نہیں، گورے کالے کا فرق نہیں، وطنی غیر وطنی کا فرق نہیں، حتیٰ کہ کافر مؤمن کا فرق نہیں ہے، قانون کی زد میں جو آجائے گا فیصلہ سب کے متعلق ایک ہی ہونا چاہیے، اِس کو کہتے ہیں عدل۔ اگر فیصلہ کرتے وقت امیر کے لئے اور ضابطہ ہے اور غریب کے لئے اور ضابطہ ہے تو برابری نہ ہوئی، گورے کالے کا فرق کردیا تو برابری نہ ہوئی، اور وطنی غیر وطنی کا فرق کردیا تو برابری نہ ہوئی، حتیٰ کہ معاملات کے اندر اگر کوئی معاملہ حکومت کے پاس آجائے، مقدمہ عدالت میں آجائے، تو فیصلہ کرتے وقت کسی کے کُفر اور ایمان کا اعتبار بھی نہیں کرنا، قانون کے مطابق فیصلہ ٹھیک کرنا ہے، اگر زیادتی مؤمن کی ہوگی تو اس کے خلاف فیصلہ دیا جائے گا، اور کافر اگر اُس معاملے میں حق پر ہوگا تو اُس کے حق میں فیصلہ دیا جائے گا۔ "لوگوں کے درمیان فیصلے عدل کے ساتھ کرو" اور یہ عدل کی صفت بھی نظامِ عالم کی ذمہ دار ہے، اور اہلِ کتاب نے نسلی امتیاز سے فیصلے کرنے شروع کردیے تھے، اس لیے غیر اہلِ کتاب کے متعلق ان کا معیار اور ضابطہ اور تھا، اور اہلِ کتاب کے متعلق اور تھا، تم نے سب لوگوں کے درمیان فیصلے عدل وانصاف کے ساتھ کرنے ہیں۔ "بیشک یہ باتیں بڑی اچھی ہیں جن کے ساتھ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے" جب تم ان باتوں کی پابندی کروگے تو اسی کے ساتھ ہی اُس علم وحکمت کا حق ادا ہوگا، اور اسی کے ساتھ ہی اُس مُلکِ عظیم والی نعمت کا شکریہ ادا ہوگا، لوگوں کے درمیان اگر انصاف سے معاملہ کروگے اور اسی طرح حقوق اہلِ حقوق کی

طرف ادا کرو گے تو ملک عظیم بھی ٹھیک رہے گا، اس کی شکر گزاری بھی ہوگی، حکومتیں بھی قائم رہیں گی، اور علم وحکمت کا حق بھی ادا ہوگیا۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا: بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

اے ایمان والو! کہنا مانو اللہ کا اور کہنا مانو رسول کا اور اپنے میں سے امر والوں کا، پھر اگر تمہارا آپس میں جھگڑا ہو جائے کسی

فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ

شئی کے بارے میں تو اس شئی کو لوٹایا کرو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور یوم آخر پر، یہ بہتر ہے اور

وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝٥٩ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ

زیادہ اچھا ہے از روئے انجام کے (۵۹) کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف؟ جو گمان کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس چیز پر

اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ

جو اُتاری گئی آپ کی طرف اور اس چیز پر جو اُتاری گئی آپ سے پہلے، ارادہ کرتے ہیں وہ لوگ کہ فیصلہ لے جائیں طاغوت کی طرف،

وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝٦٠ وَاِذَا

حالانکہ وہ حکم دیے گئے ہیں کہ وہ طاغوت کا انکار کریں، اور ارادہ کرتا ہے شیطان کہ بھٹکا دے انہیں بھٹکانا دُور کا (۶۰) اور جب

قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ

انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اُتارا، اور آؤ رسول کی طرف، تو دیکھتا ہے تو منافقین کو کہ کتراتے ہیں آپ سے

صُدُوْدًا ۝٦١ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ

کترانا (۶۱) پھر کیا حال ہوتا ہے جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے بسبب اس عمل کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا، پھر

جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝٦٢

آتے ہیں وہ لوگ آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے، اللہ کی قسم نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کرنے کا اور موافقت پیدا کرنے کا (۶۲)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ

یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان باتوں کو جو ان کے دلوں میں ہیں، آپ ان سے اعراض کر جایئے، اور انہیں نصیحت کیجیے،

وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

اور انہیں کہیے ان کے نفسوں کے بارے میں مؤثر بات ﴿٦٣﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، کہنا مانو اللہ کا اور کہنا مانو رسول کا، وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ: اور اپنے میں سے امر والوں کا، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ: پھر اگر تمہارا آپس میں جھگڑا ہو جائے کسی شئ کے بارے میں۔ تنازع فی الامر، تنازع فی الشیء: کسی معاملے میں اختلاف رائے ہو جانا۔ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ: تو اُس شئ کو لوٹایا کرو اللہ کی طرف، وَالرَّسُوْلِ: اور رسول کی طرف، اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور یوم آخر پر، ذٰلِكَ خَيْرٌ: یہ بہتر ہے، وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا: اور زیادہ اچھا ہے از روئے انجام کے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جو گمان کرتے ہیں، جو سمجھتے ہیں، جن کا زعم ہے، کہ وہ ایمان لائے اس چیز پر جو اُتاری گئی آپ کی طرف اور اس چیز پر جو اُتاری گئی آپ سے پہلے، يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ: ارادہ کرتے ہیں وہ لوگ، چاہتے ہیں وہ لوگ، کہ فیصلہ لے جائیں طاغوت کی طرف، یعنی جھگڑا ہونے کی صورت میں فیصلہ لے جائیں شیطان کی طرف، طاغوت سرکش کو کہتے ہیں، وَقَدْ اُمِرُوْٓا: حالانکہ وہ حکم دیے گئے ہیں، اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ: کہ وہ کفر کریں طاغوت کے ساتھ، طاغوت کا انکار کریں، وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: اور ارادہ کرتا ہے شیطان کہ بھٹکا دے انہیں بھٹکانا دور کا۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ: اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس حکم کی طرف جو اللہ نے اُتارا، اور آؤ رسول کی طرف، رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ: دیکھتا ہے تو منافقوں کو، يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا: رُکتے ہیں آپ سے رُکنا، اعراض کرتے ہیں آپ سے اعراض کرنا، کتراتے ہیں آپ سے کترانا، فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ: پھر کیا حال ہوتا ہے جب اُنہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے، یا کیا حال ہوگا جب اُنہیں کوئی مصیبت پہنچے گی، بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ: بسبب اس عمل کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ "کیا حال ہوا اُن کا (ماضی کے ساتھ بھی ترجمہ ٹھیک ہے، جیسے کہ واقعے پر اس کا انطباق کریں گے) جب ان کو مصیبت پہنچی" بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ: بسبب ان کاموں کے جو انہوں نے کیے، "پھر آتے ہیں وہ آپ کے پاس" یا "پھر آئے وہ آپ کے پاس" جیسے چاہیں ادا کرلیں، اِذَا چونکہ پیچھے آیا ہوا اس لیے ماضی مضارع کا معنی بھی ادا کرتی ہے۔ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ: پھر آتے ہیں وہ لوگ آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے، بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا: اللہ کی قسم، نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کرنے کا اور موافقت پیدا کرنے کا، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان باتوں کو جو ان کے

دلوں میں ہیں، فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: آپ اِن سے اِعراض کر جائیے، وَعِظْهُمْ: اور اِنہیں نصیحت کیجیے، وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: اور اِنہیں کہیے اِن کے نفسوں کے بارے میں، قَوْلًۢا بَلِيْغًا: مؤثر بات، ایسی بات جو ان کے دِلوں تک پہنچنے والی ہو، یا قولِ بلیغ کا معنیٰ ہے کافی بات، یعنی جو اِن کی اصلاح کے لئے کافی ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی'' اللہ کی اطاعت، اور اللہ کے رسول کی اطاعت، اور اپنے میں سے اُولی الامر کی اطاعت، یہاں تین باتوں کو ذکر کیا گیا ہے، پہلے خطاب اجتماعی شکل میں تھا کہ امانات کو اور حقوق کو اہلِ حقوق کی طرف ادا کرو، اور مقصد تھا حکام کو سمجھانا، خطاب اگرچہ جماعتی حیثیت سے سب مسلمانوں کو ہے، لیکن اس کا اصل مصداق حکام ہوں گے جن کے ذمے حقوق لگے ہوئے ہیں، جن پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، درجہ بدرجہ سب اس کا مصداق ہیں۔ اور یہ حکم تھا کہ فیصلہ کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان میں عدل کی رعایت رکھو، یعنی فیصلہ کرتے وقت فریقین کو برابر سمجھو، اور قانون کا جو تقاضا ہے اس کو پورا کرو۔ اب جماعتی حیثیت سے ہی سب اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ کے احکام مانو اور اللہ کے رسول کے احکام مانو اور اپنے میں سے اُولی الامر کی اطاعت کرو۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کا مصداق

''اللہ کے اَحکام مانو'' یہ بات وہاں صادق آئے گی جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَحکام اُس کی کتاب میں واضح کردیے گئے ہیں، اُن اَحکام کی نسبت براہِ راست اللہ کی طرف ہوگی، اور ان کا تسلیم کرنا براہِ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت کہلائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو، اب نماز پڑھنا اللہ کی اطاعت ہے، نماز کو فرض جاننا اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اسی طرح دیگر اَحکام۔ اور اگلے نمبر پر آ گیا اطاعتِ رسول، اطاعتِ رسول کے اندر وہ باتیں آئیں گی جو صراحتاً قرآنِ کریم میں مذکور نہیں ہیں، اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی وضاحت کے طور پر اُن کو بیان فرمایا، یا اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہیں کی اور اپنے طور پر کچھ اَحکام صادر فرمائے، تو چونکہ اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کی مرضی کی وضاحت کرنے کے لئے ہوتا ہے، حقیقت کے اعتبار سے وہ بات اللہ ہی کی ہوتی ہے جو اللہ کا رسول کہتا ہے، کیونکہ اللہ نے اپنے رسول کو اپنے اَحکام کے لئے مُبیِّن بنا کر بھیجا، اور مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورۂ نساء: ۸۰) یہ تمغہ بھی ملا ہوا ہے، کہ اللہ کے رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، جو اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف سفیر ہوتے ہیں، اور جو اِن کی بات ہوتی ہے وہ اللہ کی بات ہوتی ہے، لیکن جو احکام اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں صراحتاً بیان نہیں فرمائے اُن احکام کو ماننا اطاعتِ رسول کہلاتا ہے، جیسے نماز

فرض تو ہوگئی اللہ کے حکم کے تحت، باقی اُس کی تفصیلات، کہ کس طرح پڑھنی ہے؟ کس وقت پڑھنی ہے؟ کتنی رکعت ادا کرنی ہیں؟ رُکوع سجدے میں کیا ترتیب ہے؟ کس طرح ادا کرنے ہیں؟ اِن باتوں کا اپنانا اطاعتِ رسول ہے۔

''اُولی الامر'' کا مصداق اوران کی اِطاعت کی حیثیت

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ: یہاں اَطِیْعُوا کا لفظ نہیں بڑھایا گیا، بلکہ اِس کا عطف ڈالا گیا ہے، جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تیسرا نمبر جو اُولی الامر کا ذکر کیا جارہا ہے، یہ مستقل مُطاع نہیں ہیں، بلکہ اِن کی اطاعت اللہ اور اللہ کے رسول کے اَحکام کے تحت ہے، یہ مستقل نمبر نہیں ہے اُحکام کے جاری کرنے کا۔ ''اُولی الامر'' سے کون مراد ہیں؟ اِس کا لفظی معنی ہے: اَمر والے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو اِجتماعی زندگی میں اپنے معاشرے میں نظم و انتظام کے اختیارات حاصل ہیں۔ ''اُولی الامر'' کا مصداق وہ لوگ ہیں، جس کی تعبیر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں حکام کے ساتھ کی گئی ہے، کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ حکام ہیں اُن کی اطاعت کرو، اگر تو اِسلامی معاشرہ اسلامی حکومت کے تحت قائم ہے، پھر تو خلیفہ اور خلیفہ کے متعین کیے ہوئے حکام مراد ہوں گے، اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی: ''اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ کَاَنَّ رَأْسَهٗ زَبِیْبَةٌ''[1] اَحکام سنا کرو، اُن کو مانا کرو، اگر چہ تمہارے اُوپر اَمیر ایسا شخص بنا دیا جائے جو حبشی غلام ہے اور اُس کا سر ایسے ہے جیسے منقیٰ ہوتی ہے، چھوٹا سا ہے، یعنی کم سے کم درجے کا آدمی بھی اگر تمہارے اُوپر حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے، خلیفہ کی طرف سے اَمیر متعین کر دیا جائے، تو اُس کی بات بھی سنو اور اُس کی بات بھی مانو۔ اطاعتِ اَمیر انتظامی شکل میں شریعت کا مستقل حکم ہے۔ تو اِس کا مصداق حکام بن جائیں گے، کہ اسلامی معاشرے میں جو خلیفہ کی طرف سے انتظام کے لئے متعین ہوتے ہیں اُن کا کہنا بھی مانو۔ اور اگر حکومت اسلامی نہ ہو اور خلیفہ کی طرف سے انتظام کے لئے اِس قسم کا آدمی متعین نہیں، تو ایسی صورت میں اس معاشرے کے اندر جو سمجھدار طبقہ ہے، علماء کا، فقہاء کا، تو پھر ''اُولی الامر'' کا مصداق وہ ہوں گے، کہ جو حکم تمہیں قرآنِ کریم میں صراحتاً مل جائے اللہ کی اطاعت کے جذبے کے ساتھ اُس کو مانو، اور جو حکم تمہیں حدیث شریف میں صراحتاً مل جائے اطاعتِ رسول کے جذبے کے تحت اُس کو مانو، اور اگر کوئی حکم کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ میں صراحتاً موجود نہ ہو تو پھر فقہاء اور علماء سے پوچھ کر اس کے مطابق اپنی زندگی گزارو، تو پھر تیسرے نمبر پر یہ بات آجائے گی جس وقت ''اُولی الامر'' کا مصداق فقہاء اور علماء کو بنا لیا جائے گا۔ تو اِن کی اطاعت اللہ اور اللہ کے رسول کے تحت کر کے ذکر کی گئی، جس میں اس بات کو مدِّنظر رکھنا ضروری ہے کہ حاکم وقت کا کوئی حکم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو، اُس بات میں حاکم کی بات مانی جائے گی، اور اگر وہ ایسا حکم دے دے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہے، اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف ہے، تو یہ حاکم اپنی حد سے تجاوز کر گیا، کیونکہ یہ حاکم بھی اللہ کا اور اللہ کے رسول کا مطیع ہے، اور جب یہ اللہ اور اللہ کے رسول کا باغی ہو جائے گا اور اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف احکام جاری کرے گا تو جب یہ اپنے سے اُوپر والے کا حکم نہیں مانتا تو پھر جو اس کے ماتحت ہیں اُن کو بھی حکم ہے کہ اِس کا حکم نہ مانو، اس لیے اگر یہ خود اللہ اور اللہ کے

(۱) مشکوۃ ۳۱۹/۲، کتاب الامارۃ، فصل اول۔ بخاری ۱۰۵۷/۲، باب السمع والطاعۃ۔ نیز ۹۶/۱، باب امامۃ العبد۔

رسول کا مطیع رہے گا تو پھر اس کا جو حکم آئے گا ہم یہ دیکھیں گے کہ اللہ کے حکم کے خلاف تو نہیں، اگر چہ صراحتاً وہ حکم موجود نہ ہو، کیونکہ اِس نے حکم تو وہی دینا ہے جو صراحتاً اللہ نے اور اللہ کے رسول نے نہیں دیا، اِس کا تعلق ہوگا مباحات کے ساتھ، انتظامی امور کے ساتھ، جب اِس کا حکم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف نہیں ہوگا تو پھر اُس حکم کا ماننا شرعی واجب کے طور پر ضروری ہے، مباحات حکم حاکم کے تحت واجب ہوجاتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی کرنا شرعی گناہ ہے، اس کا تعلق ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظام سے تعلق رکھتی ہیں، مثلاً شریعت نے اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا کہ آپ تجارت کس دن کریں اور کس دن نہ کریں، اسی طرح دیگر جو معاملات ہیں، اس قسم کے حکم میں اگر وقت کی حکومت کوئی ضابطہ نافذ کرتی ہے کہ فلاں دن فلاں کاروبار کرنے کی اجازت نہیں، تو لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ اُس کو تسلیم کریں، اور اس میں حکومت کی مخالفت جائز نہیں ہے، یا آپ کے سامنے اِس دور میں اس کی واضح مثال ذکر کردوں، کہ جانور کا ذبح کرنا کس دن ضروری ہے اور کس دن ضروری نہیں، یہ شریعت کا کوئی حکم نہیں ہے، اور حکومت نے اپنی مصلحت کے طور پر ایک قاعدہ بنادیا کہ منگل اور بدھ کو جانور ذبح نہ کیے جائیں، ایک انتظامی اَمر کے تحت یہ ایک قاعدہ نافذ کردیا ہے، اب آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ پاکستان میں کبھی کسی مفتی نے فتویٰ دیا ہو کہ حکومت کا یہ قانون خلافِ شریعت ہے، اس لیے اس کی خلاف ورزی کرنی ضروری ہے، اور قصائیوں کو ترغیب دی ہو کہ تم مخالفت کرتے ہوئے منگل اور بدھ کے دن جانور ضرور ذبح کیا کرو، کبھی آج تک اِس پر اعتراض نہیں سنا گیا، اس لیے انتظامی طور پر اس کا قبول کرنا ضروری ہے، اسی طرح سکولوں کے اندر سربراہ ضابطہ بنادیتے ہیں کہ فلاں وقت سکول شروع ہوگا اور فلاں وقت بند ہوگا، یا کام تقسیم کردیا جاتا ہے کہ فلاں گھنٹے میں یہ سبق پڑھنا ہے اور فلاں گھنٹے میں یہ سبق پڑھنا ہے، اِن کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، شرعی حکم کے طور پر اس کا ماننا ضروری ہے، نظم اور انتظام کے تحت حاکم کا حکم مباحات کو واجب کردیتا ہے۔ ہاں! البتہ جہاں حکم شریعت سے ٹکرا جائے گا، وہاں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، جیسے ایک آدمی نے منگل کے دن بکرا ذبح کرلیا، اب اس کا یہ تو قصور ہے کہ اس نے حکم حاکم کے خلاف کیا ہے، اس کو اس کی سزا دی جاسکتی ہے، لیکن جب بکری اپنی ملکیت ہے اور بسم اللہ پڑھ کر ذبح کی گئی ہے تو اگر کوئی حاکم حکم دے کہ اب یہ حرام ہے، حلال نہیں ہے، تو یہ شرعی حکم کی خلاف ورزی ہے، اس لیے اس کو نہیں مانا جائے گا، یہ شخص مجرم تو ہے، سزا پاسکتا ہے، اِس کو جرمانہ کیا جاسکتا ہے، جو بھی مناسب سزا فتوے کے تحت آجائے اس کو دی جاسکتی ہے، تنبیہ کی جاسکتی ہے، لیکن اگر بسم اللہ پڑھ کر کوئی ذبح کرے گا تو جانور حلال ہے، اُس کا کھانا جائز ہے، اب اس کو حرام ٹھہرانا حکم شریعت کے خلاف ہے، اِس میں اطاعت نہیں کی جائے گی۔ تو حکومت کے جتنے انتظام ہوا کرتے ہیں جس میں حاکم اپنی صوابدید کے مطابق بعض قاعدے جاری کرتا ہے، جس کا تعلق انتظام کے ساتھ ہے، اُس کی اطاعت ضروری ہے، اور حدیث شریف میں یہ واضح کردیا گیا، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ''[1] جہاں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو وہاں مخلوق میں سے

(۱) مشکوۃ، ۲/۳۲۱، کتاب الامارۃ، فصل ثانی بحوالہ شرح السنۃ/ نیز بخاری، ۲/۱۰۷۸ پر ہے: لا طاعة فی معصية/ مسلم، ۲/۱۲۵ پر ہے: لا طاعة فی معصية الله

کسی کا کہنا نہیں مانا جائے گا، وجہ میں نے آپ کی خدمت میں ذکر کردی کہ جب حاکم اپنے سے بالا حاکم کا کہنا نہیں مانتا، اللہ اور اللہ کے رسول کی وہ اطاعت نہیں کرتا، تو یہ اپنے بڑوں کا باغی ہوگیا، جب یہ اپنے بڑوں کا باغی ہوگیا تو پھر چھوٹے بھی اس کے حکم کے پابند نہیں رہیں گے، وہ اُسی کی اطاعت کریں گے جس کا یہ بھی مطیع ہے، یعنی اللہ اور اللہ کے رسول کی۔ تو حکام کی اطاعت کے اُوپر یہ پابندی ہے۔ قرآنِ کریم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر جوآتا ہے وہ والدین کا ہے، والدین کی اطاعت بھی ضروری ہے، حدیث شریف میں حضور ﷺ نے والدین کو انسان کی جنت اور دوزخ قرار دیا ہے[1] کہ اگر کوئی شخص اپنے والدین کو خدمت کرکے خوش رکھے گا تو اس کے لئے جنت ہے، اور اگر والدین کو ناراض کرے گا، ان کی خدمت نہیں کرے گا اور ان کے حقوق ادا نہیں کرے گا تو اس کے لئے دوزخ ہے، لیکن قرآنِ کریم میں جہاں اِن کے حق کو ذکر کیا گیا وہاں ساتھ ایک قید لگا دی گئی: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ: اگر تجھے یہ مجبور کریں کہ میرے ساتھ شریک ٹھہرا کسی ایسی چیز کو جس کے شریک ہونے کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں ہے، فَلَا تُطِعْهُمَا: تو پھر ان کا کہنا نہیں ماننا، اور آگے جا کر کہا کہ: وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (سورۂ لقمان: ۱۵) پھر والدین کو چھوڑ کر اُس شخص کی اتباع کرو جس کا رُجوع میری طرف ہے، جو میری طرف رُجوع کیے ہوئے ہے اُس کا کہنا مانو، پھر ایسی بات میں والدین کا کہنا نہیں ماننا۔ اس لیے مخلوق کی طرف سے جو حکم بھی آئے اس میں یہ دیکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے خلاف تو نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے خلاف ہوگا تو پھر اُس کا تسلیم کرنا ٹھیک نہیں۔

اختلاف کی صورت میں کیا کیا جائے؟

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ: تَنَازَعْتُمْ کے اندر یہ بات آگئی کہ ایک حاکم حکم دیتا ہے، اور حکام اور ان کی رعایا کے درمیان یہ بات مختلف فیہ ہوگئی کہ یہ حکم شریعت کے خلاف ہے یا نہیں ہے، یہ جھگڑا ہوگیا، اور اُولی الامر کا آپس میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے کہ یہ حکم جو ہم دے رہے ہیں یہ شریعت کے خلاف ہے یا نہیں، اختلافِ رائے ہوگیا، اس قسم کے اختلافِ رائے ہوجانے کے بعد اُس کے سلجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس شی کو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف لوٹا دیا کرو، اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف لوٹانے کا کیا مطلب؟ اب یہ بات تو واضح ہے کہ جھگڑا اسی بارے میں ہوسکتا ہے اور اختلافِ رائے اسی حکم کے بارے میں ہوسکتا ہے جو کتاب اللہ میں صراحتاً نہیں ہے، جو اَحکام قرآن اور حدیث میں صراحتاً آئے ہوئے ہیں اُن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اختلاف ہوگا تو کسی ایسی بات میں ہوگا جو قرآن وحدیث میں صراحتاً مذکور نہیں، پھر اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کو قرآن پر پیش کرو، سنت پر پیش کرو، اور قیاس اور اِجتہاد کے ذریعے سے اس کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کرو، پھر جو حکم قیاس و اِجتہاد کے ساتھ ثابت ہوجائے اس کی اتباع کرو، حاکم بھی اس کو مانے اور رعایا بھی مانے۔

---

(۱) ابن ماجہ ص ۲۶۰ باب بر الوالدین / مشکوۃ ۲ / ۴۲۱ باب البر فصل ثالث ۔ ولفظ الحدیث: هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ

کیا ہر آدمی کو قیاس و اجتہاد کی اجازت ہے؟

اب قیاس اور اجتہاد کس نے کرنا ہے؟ اس کی ہر کسی کو تو اجازت نہیں، ہر کسی کو تو اتنی عقل نہیں ہوتی کہ واقعات کو ان کے نظائر پر منطبق کر لے، کہ قرآن اور حدیث میں جو واقعات ذکر کیے گئے ہیں، اَحکام ذکر کیے گئے ہیں، اُن کی علتیں یہ ہیں، اُن کی وجوہ یہ ہیں، اور یہ علت یہاں صادق آتی ہے، اس لیے اس پر بھی وہی حکم لگے گا، جو قیاس کا طریقہ ہے، یہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اگر ہر شخص کو اجازت دے دی جائے تو پھر تو یہ ایک کھلونا بن جائے گا، جس کا فہم جدھر کو جائے گا اس کے مطابق وہ قرآن وحدیث کو سمجھے گا، اس کے مطابق ہی عمل کرے گا جیسے کسی کی عقل کا تقاضا ہوگا، اب ایک جاہل آدمی کو کس طرح حق دیا جاسکتا ہے قرآن اور حدیث میں اجتہاد کا یا استنباط کا، کہ وہ نکال سکے کہ اس کا حکم قرآن سے یوں معلوم ہوتا ہے اور سُنّت سے یوں معلوم ہوتا ہے، ہر کسی کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ بعض بعض لوگ بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بوجھ بجھکو ہوتے ہیں، وہ جس وقت قیاس و اجتہاد کریں گے تو ان کا قیاس و اجتہاد بھی ایسا ہی ہوگا، جیسے وہ ایک مثال دیا کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ ایک شخص کسی اونچے درخت پہ چڑھ گیا، اب چڑھنا تو اُسے آتا تھا، چڑھ گیا، جب اُوپر بلندی پہ چلا گیا، تو اَب اس کو اُترنا آتا نہیں، اُتر سکتا نہیں، وہ اُوپر بیٹھا چیختا ہے، وہاں کے لوگ اکٹھے ہوگئے کہ اس کو درخت پر سے اُتاریں، اب کسی کو اس کی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کس طرح اُتاریں، تو اُس علاقے کے اندر ایک شخص تھا بوجھ بجھکو بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے، مشورہ ہوا کہ اُس کو لایا جائے کیونکہ وہ سمجھ دار آدمی ہے، اُس سے پوچھیں کہ اِس کو کس طرح اُتارا جائے، اس کو بُلایا گیا، وہ اوپر دیکھتا ہے، غور کرتا ہے، غور کرنے کے بعد کہتا ہے کہ تدبیر سمجھ میں آگئی، ایک رَسّا لاؤ، وہ رَسّا لے آئے، کہنے لگا کہ اب کسی طریقے سے یہ رَسّا اُس تک پہنچادو، رَسّا وہاں تک پہنچا دیا گیا، تو یہ بوجھ بجھکو صاحب فتویٰ دیتے ہیں کہ اِس رَسّے کو کمر سے باندھ لو، اس شخص نے کمر سے باندھ لیا، نچلوں کو حکم دیا کہ اِس کو کھینچو، جب وہ کھینچا تو وہ دھڑام کرتا ہوا زمین پر جو گرا تو گرتے ہی مرگیا، وہ اُتر تو گیا لیکن مرگیا، تو لوگوں نے پوچھا کہ بوجھ بجھکو صاحب! یہ تو مرگیا؟ وہ کہتا ہے کہ اس کی قسمت، ورنہ ہم نے تو بہت دفعہ اس طرح سے آدمی کنویں سے نکالے ہیں، اُس وقت تو کوئی نہیں مرا، اب اگر یہ مرگیا تو اس کی قسمت۔ یعنی کنویں سے نکالنے پر درخت پر سے کھینچنے کو قیاس کر لینا، یہ بھی تو اُس بوجھ بجھکڑ کا قیاس ہی تھا، اب اگر اس قسم کے قیاس شروع ہوجائیں تو پھر جو دین کا حال ہوگا وہ آپ جانتے ہی ہیں، اس لیے لازماً یہ بات آپ کو کہنی پڑے گی کہ رَدّ کرتے وقت اُن لوگوں کی رائے معلوم کی جائے گی جو قرآن اور حدیث میں مہارت رکھتے ہیں، اور ماہرین کون ہوتے ہیں؟ فقہاء، علماء، جن کو اللہ تعالیٰ نے مہارت دی ہے، وہ قرآن اور حدیث کو سمجھتے ہیں، علم کو جانتے ہیں، اور اس کے ساتھ وہ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ واقعہ کس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اس کے اُوپر کیا حکم لگایا جائے، جیسے کہ قرآنِ کریم میں ''اُولی الامر'' کا لفظ دوسری جگہ آیا ہے تو اس میں یہ الفاظ ہیں: وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (سورۂ نساء: ۸۳) اس میں اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کی شکایت کرتے ہیں، کہ جب ان کے پاس کوئی بات آجاتی ہے، چاہے اس کا تعلق امن سے ہے یا خوف سے، تو اس کو ایسے ہی بلا سوچے سمجھے مشہور کر دیتے ہیں، خبریں اُڑا دیتے ہیں، افواہیں پھیلا

دیتے ہیں، اگر یہ لوگ اُس خبر کو جواُن تک پہنچی ہے، چاہے وہ امن کی ہے چاہے خطرے کی ہے، اللہ کے رسول کی طرف لے جایا کریں جب وہ موجود ہیں، اوراُولی الامر یعنی اس معاشرے کے اندر جو سمجھدار لوگ ہیں ان کے پاس لے جایا کریں تو البتہ جان لیں گے اس خبر کی حقیقت کو وہ لوگ جو اُس کا اِستنباط کرسکتے ہیں، جو تحقیق کرسکتے ہیں، تو الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ: اِستنباط کی قوت جن کے اندر موجود ہوتی ہے اُن کے پاس یہ لے جایا کریں، تو وہ اِستنباط اور اِجتہاد کے ساتھ اُس خبر کی حقیقت کو معلوم کریں گے، اگر اشاعت کے قابل ہوگی تو وہ اجازت دیں گے کہ اس کو مشہور کردو، اگر اشاعت کے قابل نہیں ہوگی تو روک دیں گے کہ اس کو مشہور نہ کرو، یہ مصلحت کے خلاف ہے۔ اب یہاں لفظ ''اِستنباط'' کا آیا ہے، ''اِستنباط'' کا معنی ہوتا ہے کہ تحقیق کرکے کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کرلینا، تو جو تحقیق کرکے کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کریں گے اُن کے پاس اُس بات کو لے کر جائیں گے، پھر جو فتویٰ وہ دے دیں اور جو مسئلہ وہ بتادیں حاکموں کو چاہیے کہ وہ بھی اس کی پابندی کریں، اور رعایا کو چاہیے کہ وہ بھی اس کی پابندی کریں۔ تو اگر ''اُولی الامر'' سے علماء مراد نہ لیے جائیں، حکام ہی مراد ہوں، تو پھر علماء اور فقہاء کا مطاع ہونا، فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کے تحت ثابت ہوجائے گا، کہ حاکم ہو یا رعایا ہوایسے مجتہد فیہ احکام میں وہ علماء اور فقہاء کے مطیع ہیں، کہ اُن سے پوچھنا ضروری ہے، اور جو فتویٰ وہ دیں اس پر حاکم کو بھی پابند ہوجانا چاہیے اور رعایا کو بھی پابند ہوجانا چاہیے، اور اگر وقت کے اُولوالامر خود فقیہ ہیں، خود سمجھ دار ہیں، اور وہ دیانت داری کے ساتھ اِجتہاد کرتے ہیں اور اُن کو اتنا سلیقہ حاصل ہے اور ساری شرطیں ان کے اندر پائی جاتی ہیں جو علمائے اُمت مجتہدین کے لئے لگائی ہیں، جن کی تفصیل اُصولِ فقہ کے اندر موجود ہے، تو پھر اُولی الامر کا اِستنباط کیا ہوا اور اِجتہاد کیا ہوا حکم بھی اسی طرح ہے۔

''تقلید'' کا ثبوت

پھر جب ایک حکم اِجتہاد اور اِستنباط کے ذریعے سے نکالا جائے گا تو ہر شخص کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ اس کی وجہ بھی سمجھ سکے، پھر اس کو چاہیے کہ اعتماد کرکے مان لے، اور جب اُولی الامر پر یا فقہاء پر اعتماد کرکے اس بات کو مانے گا تو اسی کو اِصطلاحاً ''تقلید'' کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو اَحکام اللہ کی کتاب میں اور حدیث شریف میں صراحتاً موجود نہیں وہاں عوام کا کام ہے علماء اور فقہاء کی تقلید، اور پھر ہر دفعہ نئے سرے سے اِستنباط ضروری نہیں، اگر کسی زمانے کے علماء اور فقہاء نے اِستنباط کرکے وہ ذخیرہ جمع کردیا ہے تو پچھلے لوگ اس سے استدلال کرکے اُس کے مطابق عمل کرسکتے ہیں۔ بہرحال ''اُولی الامر'' سے حکام مراد لیے جائیں تو بھی علماء اور فقہاء کا مطاع ہونا اس آیت سے نکل آتا ہے، اور اگر اس سے مراد ہی علماء اور فقہاء ہوں تو بھی یہ بات صاف ہوجاتی ہے۔

شریعت کے چار اُصول

فقہ کے اُصول میں آپ یہ پڑھتے رہتے ہیں کہ اَحکام کے ثابت ہونے کے ہمارے ہاں چار اُصول ہیں، پہلے ہے کتاب اللہ، کہ جب بھی کوئی حکم سامنے آئے تو دیکھا جائے گا کہ اللہ کی کتاب اِس کے بارے میں کیا کہتی ہے، اگر اللہ کی کتاب میں وہ حکم موجود نہ ہو تو پھر دیکھا جاتا ہے حدیث شریف کو، سُنتِ رسول اللہ کو، کہ اس میں اس چیز کا حکم ذکر کیا گیا ہے یا نہیں، اگر اس

میں حکم ثابت ہوجائے تو کافی ہے، اور اگر سُنّت میں بھی اُس کا حکم موجود نہیں تو پھر تیسرے نمبر پر ذکر کیا جاتا ہے اِجماعِ اُمّت، اُصولِ فقہ کے اندر تیسرا نمبر اِجماعِ اُمّت کا ہے، اور اِجماع کا حاصل بھی یہی ہے کہ اُمّت کے سمجھ دار لوگ کسی بات پر متفق ہوجائیں، جب وہ کسی بات پر متفق ہوجائیں گے تو پھر اُس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے، مجمع علیہ امر کی خلاف ورزی جائز نہیں چاہے اُس کی دلیل آپ کو معلوم نہ ہی ہو، اور یہ اِجماع والا اُصول قرآنِ کریم کی اس آیت سے اَخذ کیا گیا ہے جو اِسی سورت میں آپ کے سامنے آئے گی کہ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ (آیت:۱۱۵) یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو بھی اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اُس کے لئے ہدایت واضح ہوگئی، اور مؤمنین کے طریقے کو چھوڑ کر غیر طریقے پر چلے گا، تو ہم اُس کو پھیر دیں گے اُدھر جدھر وہ پھرنا چاہتا ہے، پھر اس کو جہنّم میں ڈال دیں گے۔تو جس طرح رسول کے ساتھ ضد کرنا اور اُس کے ساتھ مخالفت کا معاملہ کرنا جہنّم میں پہنچانے کا ذریعہ ہے، اس آیت میں مؤمنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کے اختیار کرنے کو بھی جہنّم میں جانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے، اس لیے مؤمنین جس بات پر اتفاق کرلیں وہ مسئلہ بھی حق ہوتا ہے، شریعت کا حکم ہے، اُس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا: ”لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِيْ عَلٰى ضَلَالَةٍ“[1] میری اُمّت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، اُمّت جس مسلک کو اِختیار کرلے تو سمجھ لیجیے کہ اللہ کے نزدیک بھی مسلک ایسے ہی ہے، اور وہ حق ہے، اُس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔اور یہاں بھی اسی طرح آجائے گا کہ جب کسی بات پر اُولوالامر اِتفاق کرلیں گے، علماء فقہاء اتفاق کرلیں گے تو پھر اُس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔اور اگر وہ مسئلہ مجمع علیہ بھی نہیں تو پھر چوتھا نمبر ہے قیاس، اِستنباط اور اِجتہاد کا، تو اُس میں اگر آپس میں اختلاف بھی ہوجائے تو مجتہد فیہ امور کے اندر اختلاف کوئی خاص اہمیت نہیں رکھا کرتا، اگر تو اُن میں سے کوئی ایک شق لے کر حاکم تعیین کردے کہ بات اس طرح ہے تو پھر اس طرح کرنا ضروری ہے، پھر دوسری طرف جانا جائز نہیں ہے، اور اگر حاکم کی طرف سے تعیین بھی نہیں تو پھر اپنی رائے ہوتی ہے کہ جدھر آپ کا رجحان ہے، جن علماء پر آپ کا اعتماد ہے، اُن کی رائے لے کر آپ اس کے مطابق عمل کرسکتے ہیں، قیاسی اَحکام کا پھر یہ درجہ ہوا کرتا ہے۔بہرحال اَحکام کے ثابت ہونے کے یہ چاروں اُصول قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، اور حدیث شریف میں بھی اِن کا صراحتاً ذکر آتا ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب حضور ﷺ یمن کی طرف بھیج رہے تھے تو پوچھا کہ تو فیصلہ کس طرح سے کرے گا؟ جب تیرے سامنے کوئی معاملہ آجائے گا۔وہ کہنے لگے کہ پہلے میں اللہ کی کتاب کو دیکھوں گا، اور اگر اللہ کی کتاب میں نہ ملا تو پھر سُنّتِ رسول اللہ میں دیکھوں گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر سُنّت میں بھی اُس کے متعلق کچھ موجود نہ ہو؟ تو کہنے لگے کہ ”أَجْتَهِدُ رَأْيِيْ“ پھر میں اپنی رائے کے ساتھ اجتہاد کروں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے رسول کو اُس بات کی توفیق دے دی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔[2] تو طریقہ یہی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد سُنّتِ رسول اللہ، اور سُنّتِ رسول اللہ کے بعد پھر اِجتہاد کا درجہ شروع ہوجاتا ہے، لیکن مجتہدین اگر اِتفاق کرلیں تو اُس میں قوت آگئی، اُس کی خلاف ورزی جائز نہیں، اگر مجتہدین کا آپس میں اتفاق نہ

---

(۱) الکنی والاسماء للدولابی ۲/۵۱۵، رقم:۹۳۷ / نیز ترمذی ۳۹/۲۔مشکوٰۃ ۱/۳۰ پر الفاظ یہ ہیں: إِنَّ اللهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِيْ أَوْ قَالَ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ ﷺ عَلٰى ضَلَالَةٍ.

(۲) ترمذی ۱/۲۴۷ باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی / ابوداؤد ۲/۱۴۹ باب اجتہاد الرأی / مشکوٰۃ ۲/۳۲۴ باب العمل فی القضاء۔

ہوتو پھر اُن مختلف فیہ اُمور میں سے ہر اُمر کا اختیار کرنا جائز ہے، جس عالم پر اعتماد ہو اُس کی رائے کو لے لیجیے، لیکن حکم حاکم کے تحت پھر بھی ایک شق متعین ہوجایا کرتی ہے، کہ مختلف فیہ اُمر میں قضاءِ قاضی کے بعد وہ شق متعین ہوجایا کرتی ہے، یہ فقہ کا اُصول ہے، پھر اس کی خلاف ورزی دُرست نہیں۔تو "اُولی الامر" کے تحت آپ کے سامنے یہ تفصیل ہوئی۔ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اگر تمہارا اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان ہے تو پھر تمہیں یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے، یہی بہتر ہے، اور انجام کے اعتبار سے یہی بات اچھی ہے، اس میں تو تاکید ہوگئی اللہ کے اَحکام کو ماننے کی۔

شانِ نزول

اب آگے اُن لوگوں کی مذمت ہے جو اللہ کے حکم کو چھوڑ کر دوسرے حکموں کی طرف رجوع کرتے ہیں، یہ آیات جن کا ترجمہ کیا گیا ہے، اِن کے شانِ نزول میں ایک واقعہ مذکور ہے، مدینہ منورہ میں ایک منافق تھا جس کا نام بشر لکھا ہے، یہ منافق تھا، اور اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا، اتفاق کی بات ہے کہ یہودی حق پر تھا اور یہ منافق ظالم تھا، جب آپس میں جھگڑا ہوگیا تو یہودی تو کہتا ہے کہ حضور ﷺ کے پاس چل، وہاں سے فیصلہ کرواتے ہیں، کیونکہ یہودی کو یقین تھا کہ چاہے میں اُن کے مسلک پر نہیں ہوں، اُن پر ایمان نہیں رکھتا، لیکن جب فیصلہ اُن کے سامنے جائے گا تو اللہ کے حکم کے تحت چونکہ عدل کے ساتھ ہی وہ فیصلہ کرتے ہیں، تو میرا حق ہے، مجھے دلوادیں گے، یہودی کو اعتماد تھا کہ فیصلہ انصاف کے ساتھ کریں گے، لیکن بشر جو بظاہر کلمہ پڑھتا تھا اور حقیقت میں منافق تھا، وہ حضور ﷺ کی عدالت میں آنے سے گھبراتا تھا، وہ کہنے لگا کہ نہیں، کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں، اور کعب بن اشرف یہود میں سے ایک طاغوت شیطان تھا، بہت شرارتی تھا، اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو اُکساتا بہکاتا بھی رہتا تھا، بنو قریظہ میں سے تھا، اور منافق کا مقصد تھا کہ وہاں تو کوئی مغالطہ بھی دیا جاسکتا ہے، رشوت وغیرہ لے کر بھی احکام میں تبدیلی ہوجاتی ہے، اگر وہاں جاؤں تو وہاں تو میری دال گل سکتی ہے، اور اگر حضور ﷺ کی عدالت میں مقدمہ چلا گیا تو وہاں تو فیصلہ حق کے مطابق ہوگا، وہاں تو میری دال نہیں گلے گی، اُس کے دل میں چور تھا، لیکن کچھ دباؤ پڑا تو وہ یہودی اس کو لے کر حضور ﷺ کی مجلس میں آگیا، جس وقت واقعہ آپ ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ نے بات سننے کے بعد فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا اور بشر کو ظالم قرار دیا، وہاں سے نکلے، تو جب دل میں چور ہوتا ہے تو انسان کوئی نہ کوئی بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ اَڑیل قسم کا آدمی تھا، وہ پھر یہودی کو کہتا ہے کہ ٹھیک ہے انہوں نے فیصلہ تو کردیا ہے، لیکن اگر آپ اور اچھا فیصلہ چاہتے ہیں تو عمر کے پاس چلیں، وہاں جا کے فیصلہ کرواتے ہیں، یہودی چونکہ جانتا تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ بھلے اپنی طبیعت میں سخت ہیں لیکن ان کی سختی بھی حق کے لئے ہی ہے، کہ میرا معاملہ اتنا واضح ہے کہ جس طرح بھی یہ مانے میں کرنے کے لئے تیار ہوں، تو چلو! عمر کے پاس چلتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ عمر بھی فیصلہ میرے حق میں دے گا، تو کہنے لگا چل بھائی! تجھے اگر اس طرح اطمینان ہوتا ہے تو عمر کے پاس ہی چلے جاتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے کے چلا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ سنا، یہودی نے یہ بھی بتادیا کہ حضور ﷺ کے پاس گئے تھے اور آپ ﷺ نے فیصلہ یوں کیا ہے لیکن یہ مطمئن نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ ذرا ٹھہرو، میں اندر ہو کر آتا ہوں، اندر گئے،

تلوار لے آئے، اور آتے ہی اُس منافق کی گردن اُڑا دی، اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ جو حضور ﷺ کے فیصلے پر مطمئن نہیں عمر کے ہاں اُس کا یہ فیصلہ ہے، جب وہ قتل ہو گیا تو اس کے خاندان کے لوگ مقدمہ لے کر حضور ﷺ کے پاس آ گئے کہ ہمارے شخص کو ایسے ہی قتل کر دیا، وہ تو وہاں اگر گیا تھا تو آپ ﷺ کے حکم پر اعتراض کی وجہ سے نہیں، یہ نہیں کہ اُس کا ایمان نہیں تھا، وہ تو چاہتا تھا کہ قانونی فیصلہ اگرچہ یہ ہو گیا ہے، لیکن مصالحت کی گنجائش ہوتی ہے، آپس میں کوئی موافقت کروا دیں گے، کوئی کہہ سن کر تصفیہ کروا دیں گے، وہ تو اس قسم کے جذبات کے تحت گیا تھا، ورنہ وہ کوئی دین کا منکر نہیں تھا، آپ ﷺ کی بات کا منکر نہیں تھا، وہ مرتد نہیں تھا، اُس پر زیادتی ہوئی جو عمر نے اس کو قتل کر دیا، اس طرح ان لوگوں نے آ کر حضور ﷺ کے سامنے بات کی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں اس واقعہ کی حقیقت ظاہر کر دی، جس میں عمر رضی اللہ عنہ کو حق پر قرار دیا گیا، اور ان کی خباثتِ باطنی کو نمایاں کیا گیا، کہ ان کی دِلی ہمدردیاں طاغوتوں کے ساتھ ہیں۔ اس سے یہ بات نکل آئی کہ حکمِ شریعت پر اطمینان نہ ہو اور غیر شرعی حکم کی طرف انسان جائے تو یہ کُفر ہے، تو کُفر ونفاق کی ایک قسم اِس میں واضح ہو گئی، تو اِن آیات کے اندر ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اللہ کے حکم کے مقابلے میں دوسروں کے فیصلے کو ترجیح دیتے ہیں، یا ان کا قلبی رُجحان اُس طرف کو ہوتا ہے۔

منافقین کی بدکرداری پھر ان کی غلط تاویلیں اور جھوٹی قسمیں

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ: ''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ایمان ہے اس چیز پر جو آپ کی طرف اُتاری گئی''، یہ اُن کا زعم ہے، یعنی اپنے خیال کے مطابق وہ اپنے آپ کو مؤمن سمجھتے ہیں، ''ان کا ایمان ہے اس چیز پر جو آپ کی طرف اُتاری گئی اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے اُتاری گئی، ارادہ کرتے ہیں کہ فیصلہ لے جائیں طاغوت کی طرف'' جھگڑے کے وقت میں فیصلہ اُن کی طرف لے جانا چاہتے ہیں یعنی ان سے فیصلہ کروانا چاہتے ہیں، طاغوت کا مصداق کیا ہے؟ شانِ نزول میں اگرچہ ایک واقعہ خاص ہوتا ہے لیکن آیات اپنے الفاظ کے اعتبار سے عام ہوتی ہیں، یہاں طاغوت کا مصداق ہر وہ عدالت ہوگی جس میں فیصلے غیر شرعی ہوتے ہیں، کسی ایسے شخص کے پاس فیصلہ لے جانا جو شریعت کے اُصولوں کی رعایت نہیں رکھتا، تو اُدھر فیصلہ لے جانا طاغوت کی طرف فیصلہ لے جانا ہے، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ جس وقت کوئی جھگڑا ہو تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف لوٹا کریں، طاغوتوں شیطانوں اور باطل پرستوں کی طرف اپنے فیصلہ نہ لے کے جایا کریں، عمومِ الفاظ کے طور پر یہ حکم ثابت ہوگا۔ ''فیصلہ لے جاتے ہیں طاغوت کی طرف، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اُس طاغوت کا انکار کریں، اور شیطان بھٹکانا چاہتا ہے ان کو بھٹکانا بہت دُور کا، اور جب اِنہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اُتاری اور آؤ رسول کی طرف، تو دیکھتے ہیں آپ منافقین کو کہ آپ سے کتراتے ہیں'' آپ کے سامنے نہیں آتے، آپ کی مجلس میں آنے سے کتراتے ہیں، رکتے ہیں، کیونکہ ان کو پتا ہے کہ حضور ﷺ کی مجلس میں جانے کے بعد فیصلہ حق کے مطابق ہوگا، اور خود یہ باطل پر ہوتے ہیں۔ ''پھر کیسا حال ہوگا ان کا، یا کیسا حال ہوا ان کا، جب اِن کو کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے'' اور اس مصیبت سے مراد خاص طور پر وہ قتل بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا تھا، ''جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے ان کے عمل کے سبب سے، پھر آتے ہیں آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے''،

یعنی اس کے ورثاء آئے اُس واقعہ میں، وہ منافق آئے جن کا آدمی قتل ہوا تھا، "قسمیں کھاتے ہیں کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر احسان وتوفیق کا" کہ ہم تو چاہتے تھے کہ کوئی بھلی صورت پیدا ہو جائے، آپس میں کوئی موافقت پیدا ہو جائے، وہ تو اس لیے ادھر جانا ہوا تھا، ورنہ کوئی آپ کے حکم کا انکار نہیں تھا۔

منافق ٹولہ نتیجۃً ذِلت ہی اُٹھاتا ہے

اور اس شانِ نزول سے قطع نظر کرتے ہوئے عمومی الفاظ میں یہ بات آجائے گی کہ اس میں منافقین کو تنبیہ کرنی مقصود ہے، جو اللہ کے رسول پر مطمئن نہیں تھے، بلکہ ان کی دلی ہمدردیاں یہود کے ساتھ تھیں، اور اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے تھے، اور ان کو بار بار کہا جاتا تھا کہ تعلقات چھوڑ دو، جھگڑا فساد کے اندر تم فیصلے اُن سے نہ کروایا کرو، اللہ اور اللہ کے رسول کے فیصلے پر مطمئن رہا کرو، اور وہ باز نہیں آتے تھے، پھر جس وقت اسلام کا غلبہ ہوگا اور اِن کا نفاق اچھی طرح سے کھل جائے گا، پھر یہ آکر معذرتیں کریں گے، کہ ہمیں ان کے ساتھ کوئی دلی تعلق تو نہیں تھا، ہماری ہمدردیاں یہود کے ساتھ نہیں تھیں، بلکہ ہم تو چاہتے تھے کہ آپس میں اختلاف کی خلیج زیادہ وسیع نہ ہو، آپس میں کوئی احسان کا معاملہ ہو، آپس میں کوئی موافقت رہے، ہمارا آنا جانا تو اس لیے تھا، ورنہ یہ نہیں کہ ہم آپ کے احکام پر مطمئن نہیں تھے، تو جس وقت یہ ذلت اور رسوائی اِن کے سامنے آئے گی پھر ان کا کیا حال ہوگا، پھر یہ الفاظ پیش گوئی پر محمول ہوں گے، چنانچہ واقعہ ایسے ہی ہوا، کہ جب یہ یہود سارے کے سارے مغلوب ہو گئے، کچھ قتل ہو گئے، کچھ جلاوطن ہو گئے، تو اِن منافقین کا مدینہ منورہ کے اردگرد جو سہارا تھا وہ ختم ہو گیا، جب ختم ہو گیا اور ان کا نفاق اچھی طرح سے کھل گیا، اب جو ایسے افراد ہوا کرتے ہیں جو اپنی جماعت پر مطمئن نہیں، اور ان کے دل میں چور ہوتا ہے، وہ دوسروں سے بھی در پردہ دوستیاں رکھتے ہیں اس جذبے کے تحت کہ ہوسکتا ہے کہ غلبہ اِن دوسروں کو ہو جائے۔ مثال کے ساتھ اگر بات سمجھاؤں تو یوں سمجھ لیجیے! جیسے آج کل ہماری حکومت کا روس کے ساتھ تنازعہ چل رہا ہے، دوسری قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ دوستی لگانا اور دشمنی ڈالنا برسرِ اقتدار طبقے کا کام ہوتا ہے، اور ہم اُن کے پابند ہیں، جن کے ساتھ ان کی لڑائی ہے ان کے ساتھ ہماری لڑائی ہے، جن کے ساتھ ان کی دوستی ہے ان کے ساتھ ہماری دوستی ہے، آخر ایک ملک کے اندر حکومت کے تحت رہنے والے اس چیز کے پابند ہوتے ہیں کہ جن سے حکومت کی مخالفت اور لڑائی ہے تو رعایا اور پبلک کی بھی لڑائی ہے، اور جن کے ساتھ حکومت کی دوستی ہے تو رعایا اور پبلک کی بھی دوستی ہے، اگر رُوس کے تنازع کے اندر ملک میں کوئی جماعت ایسی موجود ہو یا کچھ افراد ایسے موجود ہوں جو در پردہ حکومت سے چوری چوری رُوس کے ساتھ تعلقات قائم کریں، اور اگر کوئی شخص انہیں ملامت کرے تو ملامت کرنے کی صورت میں وہ مختلف بہانے بنائیں، پھر جس وقت یہ رُوس شکست کھا جائے اور اِن کی ذلت اچھی طرح سے نمایاں ہو جائے اور حکومت اپنے معاملات پر پوری طرح سے کنٹرول کر لے، تو یہ رُوسی ذہن کے جو لوگ ہیں ان کی طرف پھر سب کی نگاہیں اُٹھیں گی، کہ تمہاری ہمدردیاں اِن کے ساتھ تھیں، تمہاری خیر خواہیاں ان کے ساتھ تھیں، پھر وہ کہیں کہ نہیں، ہمارا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ذرا میل جول رہے، اور آپس

میں اختلافات زیادہ نہ ہوں، معاملے کو سلجھانے سمجھانے کی کوشش کی جائے، تو وہ صرف ذلّت اور رُسوائی سے بچنے کے لئے اس قسم کے بہانے کرتے ہیں، لیکن پھر اس قسم کے بہانے ذلّت اور رُسوائی سے بچنے کے لئے کافی نہیں ہوا کرتے، پھر ایسے طبقے پر دوسرا شخص اعتماد نہیں کیا کرتا، اصل طریقہ زندگی گزارنے کا یہی ہے کہ بیرونی دنیا کے ساتھ یا متحارب قوتوں کے ساتھ صلح اور لڑائی حکام کی ہوتی ہے، پبلک کو چاہیے کہ اُن پر اعتماد رکھیں، تو اس قسم کا جوٹولہ ہوتا ہے کہ اِدھر بھی ہاتھ رکھا اور اُدھر بھی ہاتھ رکھا، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر ہمیں بھی ساتھ ہی عزت حاصل ہو جائے گی، اور اگر اُن کی مرضی کے مطابق غلبہ حاصل نہ ہو تو پھر ذلّت ورُسوائی ہوتی ہے، منافقین کے ساتھ ایسے ہوا، کہ وہ یہود کے ساتھ ہمدردیاں اس لیے رکھتے تھے کہ ہو سکتا ہے کبھی یہودی غالب آجائیں تو پھر ہمیں بھی چوہدراہٹ مل جائے گی، لیکن جب وہ مرکز اجڑ گئے اور ان کے سہارے ختم ہو گئے تو پھر یہ اس قسم کی معذرتیں کرتے تھے کہ ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ موافقت رہے، زیادہ اختلافات نہ ہوں، لیکن یہ چیزیں پھر ذلّت ورُسوائی سے بچانے کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ تو طریقہ اصل میں یہی ہوا کرتا ہے کہ قیادت پر اعتماد کیا جائے، دوسروں کے ساتھ رَوابط قیادت کی وساطت سے کیے جایا کرتے ہیں، تو پھر فتح ہوگی تو سب کی ہوگی، شکست ہوگی تو سب کی ہوگی، اور یہ دوغلا پن جو ہوتا ہے کہ کچھ ادھر کو اور کچھ ادھر کو، یہ پھر انسان کے لئے ذلّت ورُسوائی کا باعث بنتا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں جس طرح مسلمان اور دوسرے لوگ انگریزوں کے ساتھ ٹکرائے ہوئے تھے، انگریز مسلمانوں کے مقابلے میں ایک متحارب قوت تھی، تو اس وقت بھی ایک ایسا طبقہ تھا جو اِدھر مسلمانوں میں بھی شامل تھا، اور اُدھر انگریزوں کے ساتھ بھی ہمدردیاں تھیں، اور مقصد ان کا یہ تھا اگر اِن کو اقتدار حاصل ہو گیا تو ہم اِن کے بھی ہیں، اُن کو حاصل ہو گیا تو ہم اُن کے بھی ہیں، لیکن جب آزادی حاصل ہوگئی اور انگریز پسپا ہو گیا، تو پھر اس قسم کے لوگ دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہوئے۔ عمومی الفاظ کے طور پر دیکھیں گے تو اس سے یہ ہدایات نکلیں گی کہ اس قسم کے لوگ اُس وقت کو یاد کریں کہ جب اسلام کو غلبہ ہو جائے گا اور یہود کی قوت ختم ہو جائے گی، تو ایسے وقت میں پھر ذلّت ورُسوائی کے علاوہ اِن کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

''کیا حال ہوگا اِن کا جب ان کو مصیبت پہنچے گی بسبب اس عمل کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا، پھر وہ آئیں گے آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے کہ اللہ کی قسم، نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا اور موافقت پیدا کرنے کا، یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِن کے دلوں کے جذبات کو جانتا ہے، آپ اِن سے اِعراض کر جایئے'' اِن کے اوپر زیادہ گرفت کرنے کی ضرورت نہیں، نصیحت کرتے رہیے، وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا: اور اِن کی ذات کے بارے میں اِن کو کافی بات کہیے جو ان پر مؤثر ثابت ہو اور ان کی اصلاح کے لئے کافی ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اسی لیے تا کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اِذن کے ساتھ، اور جب انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ

کیا تھا اگر وہ آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے، اور ان کے لئے رسول بھی استغفار کرتا، البتہ پاتے وہ اللہ تعالیٰ کو

تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ

توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ﴿۶۴﴾ آپ کے رب کی قسم، یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کو فیصل نہ ٹھہرائیں

فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا

اس معاملے میں جو ان کے درمیان مختلف ہو جائے، پھر نہ پائیں وہ اپنے دلوں میں تنگی آپ کے فیصلے سے، اور تسلیم کریں اچھی

تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ

طرح سے تسلیم کر لینا ﴿۶۵﴾ اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو یا تم نکلو اپنے گھروں سے تو اس کام کو نہ کرتے

اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ

مگر ان میں سے کچھ لوگ، اور اگر وہ لوگ کریں وہ کام جس کے ساتھ وہ نصیحت کیے جاتے ہیں تو ان کے لئے بہتر ہو اور زیادہ مضبوط ہو

تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

از روئے ثابت قدم رکھنے کے ﴿۶۶﴾ اور تب البتہ دیں ہم انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم ﴿۶۷﴾ اور البتہ چلائیں ہم انہیں سیدھے راستے پر ﴿۶۸﴾

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ

اور جو کوئی شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی پس یہی لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی

النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ لوگ از روئے رفیق ہونے کے بہت اچھے ہیں ﴿۶۹﴾

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے علم رکھنے والا ﴿۷۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ: نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اسی لیے تا کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن کے ساتھ، وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: اور اگر وہ لوگ، جب انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا، جَآءُوْكَ: لَوْ اَنَّهُمْ جَآءُوْكَ، اگر وہ لوگ آپ کے پاس آجاتے، فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ: پھر اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کرتے، وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ: اور ان کے لئے رسول بھی اِستغفار کرتا، لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا: البتہ پاتے وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا۔ فَلَا وَرَبِّكَ: لا زائدہ ہے، قسم کے شروع میں عام طور پر محاورۃً اِس کو استعمال کیا جاتا ہے، جیسے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ، لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ وَرَبِّكَ: آپ کے رَبّ کی قسم، لَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ: جب تک کہ آپ کو فیصل نہ ٹھہرائیں، حَکَّمَ تحکیمًا: کسی کو حَکَم قرار دینا، ایمان نہیں لائیں گے یعنی اِن کا ایمان لانا معتبر نہیں جب تک کہ آپ کو فیصل نہ ٹھہرائیں فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ: شَجَرَ اِختلف کے معنی میں، شَجَرَ کی ضمیر مَا کی طرف لوٹ رہی ہے، اُس امر میں جو اِن کے درمیان مختلف ہوجائے، جب تک آپ کو فیصل نہیں ٹھہرائیں گے اُس معاملے میں جو اِن کے درمیان مختلف ہوجائے، ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: پھر نہ پائیں وہ اپنے دلوں میں حَرَجًا: تنگی، مِّمَّا قَضَيْتَ: آپ کے فیصلے سے، اُس چیز سے جو آپ فیصلہ کردیں، وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا: اور تسلیم کرلیں اچھی طرح سے تسلیم کرلینا۔ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ: اور اگر ہم ان پر لکھ دیتے، فرض کردیتے، اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو، اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ: یا تم نکلو اپنے گھروں سے، مَّا فَعَلُوْهُ: تو اس کام کو نہ کرتے اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ: مگر ان میں سے کچھ لوگ، وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا: اور اگر وہ لوگ کریں وہ کام، مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ: جس کے ساتھ وہ نصیحت کیے جاتے ہیں، لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: تو ان کے لئے بہتر ہو، وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا: اور زیادہ مضبوط ہو ازروئے ثابت قدم رکھنے کے، یعنی اُس امر پر عمل کرنا اُن کو دین وایمان پر ثابت قدم رکھنے کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہو، جتنی طاعت اختیار کریں گے اُتنا ایمان پر مضبوطی حاصل ہوگی، ''البتہ اِن کے لئے بہتر ہو اور زیادہ سخت ہو، زیادہ مضبوط ہو ازروئے ثابت قدم رکھنے کے'' یعنی دین وایمان پر۔ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا: اور تب البتہ دیں ہم انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم، وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: اور البتہ چلائیں ہم انہیں صراط مستقیم پر۔ یہ بھی اِذًا کے تحت ہی داخل ہے، جب یہ لوگ وہ کام کریں جس کے ساتھ نصیحت کیے جاتے ہیں تو ہم اِن کو اپنے پاس سے اجر عظیم دیں اور انہیں چلائیں سیدھے راستے پر۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ: اور جو کوئی شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی، فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: پس یہی لوگ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ: یہ مِن بیانیہ ہے، یعنی نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے، وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا: اور یہ لوگ ازروئے رفیق ہونے کے بہت اچھے ہیں، رفیق کا لفظ واحد جمع سب پر بولا جاتا ہے۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ: اِن لوگوں کی رفاقت کا نصیب ہوجانا اللہ کا فضل ہے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا: اللہ تعالیٰ کافی ہے علم رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

یہ آیات اُسی سلسلہ سے تعلق رکھتی ہیں جو شروع رکوع سے چلا آ رہا ہے، جس میں طاغوت کی طرف فیصلہ لے جانے کی ممانعت کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کی تاکید کی گئی تھی، اور اس ضمن میں آپ کے سامنے اس منافق کا واقعہ ذکر کیا گیا تھا جو سرورِ کائنات ﷺ کے فیصلے پر مطمئن نہ ہوا، اور پھر وہ فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا، جس کے نتیجے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وہ قتل ہو گیا۔

رسول صرف مرکزِ عقیدت نہیں، بلکہ مرکزِ اطاعت بھی ہوتا ہے

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رسول بھیجنے سے مقصد یہی ہے کہ لوگ اُس کی اطاعت کریں، ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کے متعلق یہی حکم تھا کہ لوگ اس کی اطاعت کریں، اللہ کا حکم یہی ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ رسول پر ایمان لانا معتبر وہی ہے کہ جس کے ساتھ اطاعت بھی ہو، رسول لوگوں کے لئے صرف مرکزِ عقیدت ہی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ عقیدت قائم کر لی، بس مقصدِ رسالت حاصل ہو گیا، ایسا نہیں، وہ مرکزِ عقیدت ہونے کے ساتھ ساتھ مرکزِ اطاعت بھی ہوتا ہے، صرف زبان سے ”محمد رسول اللہ“ کہہ لینا ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک کہ اطاعت کا التزام نہ ہو، اسی لیے آپ ایمان کے مباحث میں پڑھیں گے کہ ایمان جاننے کا نام نہیں ہے بلکہ ماننے کا نام ہے، اگر کوئی شخص یہ جان لے کہ اللہ ایک ہے لیکن اس کو مانتا نہیں، اگر کوئی شخص جانتا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہے لیکن مانتا نہیں، تو ایسا شخص مؤمن نہیں، التزامِ طاعت ایمان کے لئے شرط ہے، اور منافقین کے اندر یہی بات نہیں پائی جاتی تھی، جب یہ نہیں پائی جاتی تھی تو پھر اُن کا ایمان معتبر بھی نہیں۔

منافقین کو چاہیے تھا کہ تاویلات کی بجائے غلطی کا اعتراف کر لیتے

پھر اگر اُن سے ایسی غلطی ہو ہی گئی تھی تو اپنے ساتھی کی اور اپنے بھائی کی اس حرکت کی تاویلات کرنے کی بجائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس قسم کا مقدمہ کرنے کی بجائے اُن کو چاہیے تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دربار میں آ جاتے اور آ کے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور آئندہ کے لئے اطاعت کا وعدہ کرتے، پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے، گناہوں کی معافی مانگتے، پھر اللہ کا رسول بھی اُن کے لئے گناہوں کی معافی مانگتا، تو اللہ معاف کر دیتا، لیکن اب یہ لوگ جو مختلف تاویلیں کرتے ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے، تو ایسی صورت میں اِن کا گناہ معاف نہیں ہوگا، سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آ جاتے اور آپ ﷺ بھی ان کے لئے استغفار کرتے، یہ بات جو یہاں ذکر کی گئی ہے یہ موقع محل کے عین مطابق ہے، ان لوگوں سے جو غلطی ہوئی تھی وہ رسول کے دربار سے اعراض کی تھی، کہ حضور ﷺ کے فیصلے پر وہ مطمئن نہ ہوئے، بلکہ وہاں سے اعراض کر کے دوسری طرف چلے گئے، یا تحاکم الی الطاغوت کا جذبہ تھا جو اصل اِن کا قصور تھا، تو اب حضور ﷺ کے دربار میں آئیں گے تو وہ اعراض توجہ سے بدل جائے

گا، رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے۔ تو آپ سے اِعراض کرنے کی صورت میں اور دوسری طرف جانے کی صورت میں آپ ﷺ کے دِل کو جو تکلیف ہوسکتی ہے اُس کا ازالہ بھی ہوجائے گا، پھر آکے غلطی کا اعتراف کریں، طاعت کا وعدہ کریں، یعنی صحیح طور پر ایمان لے آئیں، تو پھر اللہ تعالیٰ اِن کی توبہ قبول کرلے گا، اور اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا ہے توبہ قبول کرنے والا ہے۔

منافق تکبّر کی وجہ سے غلطی کا اِعتراف نہیں کرتے

اور منافق اِسی چیز کو گوارا نہیں کرتے تھے جیسے کہ سورۂ منافقین میں بھی آپ کے سامنے قصہ آئے گا، وہاں بھی اِن کی طرف سے ایسی حرکتیں ہوئی تھیں، اور ایسے الفاظ اِن کے منہ سے نکلے تھے جو دل آزاری کے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ ذکر کیے ہیں، کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کی طرف واپس لوٹ کے جائیں گے تو وہاں سے عزّت والے ذلیل لوگوں کو نکال دیں گے، وہ اپنے آپ کو عزّت والے کہتے ہیں اور مؤمنین کو ذلیل کہتے ہیں، اور اسی طرح ان میں سے بعض منافقین نے اپنے بھائیوں کو یہ بات کہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جو مؤمن ہیں اِن پر خرچ کرنا چھوڑ دو، جب تم انہیں خرچ نہیں دو گے تو یہ خود بھاگ جائیں گے، یہ دل آزار فقرے اُن کی زبان سے نکلے تھے، پھر جب اُن کی غلطی ظاہر ہوگئی اور اُنہیں یہ کہا گیا کہ آؤ اللہ کے رسول کی طرف تاکہ وہ تمہارے لیے اِستغفار کریں، اُس وقت بھی وہ اعراض کرگئے، قرآنِ کریم میں وہ قصہ آئے گا وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (سورۂ منافقون) تکبّر کرتے ہوئے وہ اِعراض کرجاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر اِستغفار کی درخواست نہیں کرتے، تو ایسی صورت میں اِن کی غلطی معاف نہیں ہے اور اِن کا قصور اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔ ''نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اسی لیے تاکہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اِذن کے ساتھ'' یعنی اللہ کے حکم کے تحت۔ ''اگر یہ لوگ، جب اِنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کرلیا تھا'' یعنی ایسی غلطی کربیٹھے جس میں نقصان اِنہی کا تھا، ''آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کرتے'' یعنی آپ کے پاس آنے کے بعد اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آئندہ کے لیے صحیح طور پر ایمان لے آتے، کیونکہ اِستغفار کے اندر یہ بات بھی ہے کہ پچھلے سے توبہ کرو اور آئندہ کے لئے عہد کرو کہ ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے، تو پھر وہ ایمان صحیح ہوجاتا، طاعت کا التزام ہوجاتا، ''پھر اللہ کا رسول بھی خوش ہوکر اِن کے لئے اِستغفار کرتا تو اللہ تعالیٰ کو تواب اور رحیم پاتے۔''

روضۂ اقدس پر اِستشفاع کا عقیدہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ''معارف القرآن'' میں لکھا ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی خدمت میں آکر اِستغفار کرنے پر اور حضور ﷺ سے اِستغفار کی درخواست کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ قبول کرنے کا وعدہ ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات حضور ﷺ کی زندگی کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی صالحین کا یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ حضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر اِستغفار کی درخواست کرتے ہیں، اور عقیدہ یہی ہے کہ ایسی صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی خدمت میں حضور ﷺ سفارش فرمائیں تو گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اب معمول یہی ہے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ نے جہاں

سماعِ موتی کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کوئی اختلاف نہیں،(۱) کیونکہ اُمت کا معمول چلا آرہا ہے روضۂ اقدس کے اُوپر حاضر ہوکر اِستشفاع کا اور اِستغفار کا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت طلب کی جائے، کہ یارسول اللہ! ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں سفارش کیجیے، ہمارے لیے اِستغفار کیجیے، یہ چونکہ اُمت کا معمول چلا آرہا ہے، تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بہرحال ''معارف القرآن'' کے اندر انہوں نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ آج بھی قبولیتِ توبہ کے لئے یہ ایک بہترین صورت ہے کہ روضۂ اقدس پر حاضری دے کر، براہِ راست اللہ تعالیٰ سے بھی اِستغفار کیا جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دُعا کی درخواست کی جائے کہ آپ ہمارے لیے دُعا کیجیے، اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کیجیے، اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے اِستغفار کیجیے، اس قسم کی درخواست روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر کرنا اُمت کے اندر معمول چلا آرہا ہے، اور اس سے بھی گناہوں کی معافی کی زیادہ توقع ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی اہمیت

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ: اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کو واشگاف الفاظ میں واضح کردیا گیا، کہ جس وقت تک آپ کے ساتھ طاعت کا تعلق نہیں ہوگا اور طاعت کا التزام نہیں ہوگا کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا، پہلے تو عام ضابطے کے تحت ذکر کیا گیا تھا کہ ہر رسول کا منصب یہی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور اگر رسول کی اطاعت نہ کی جائے اور اطاعت کا التزام نہ کیا جائے تو ایمان معتبر نہیں، اب آگے اور واشگاف الفاظ میں ذکر کیا جارہا ہے۔ ''آپ کے ربّ کی قسم'' لَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی اِن کا ایمان لانا معتبر نہیں جب تک کہ وہ یہ کام نہ کریں جس کا آگے ذکر ہے، کہ اگر کوئی بات اِن میں مختلف فیہ ہوجائے تو آپ کو فیصل ٹھہرائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصل ہونا اور حاکم ہونا اِن کے ٹھہرانے پہ موقوف نہیں ہے، وہ تو اللہ کی طرف سے حاکم اور فیصل ہیں، یہاں مقصد یہ ہے کہ اس کو آپ کے دربار میں لے کر آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر فیصلہ چاہیں، کہ ہمارے درمیان میں یہ فیصلہ کردیا جائے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی طرف رُجوع، یہ ایمان کے لئے شرط ہے، اب اگر ہمارے درمیان کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہوجائے، چاہے وہ عقائد سے تعلق رکھتا ہو، چاہے عمل سے تعلق رکھتا ہو، نظریات سے تعلق رکھتا ہو، جیسا کیسا بھی ہو، دو آدمیوں کے درمیان مسئلہ مختلف فیہ ہوگیا، تو احسن طریقہ یہی ہے کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی طرف لوٹایا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دِین کے اندر غور کیا جائے، جو بات وہاں سے سمجھ میں آئے اُسی کو اختیار کیا جائے، ایمان یہی ہے۔ ''جب تک کہ یہ لوگ اپنے مختلف فیہ امر میں آپ کو فیصل نہ ٹھہرائیں'' یعنی آپ کے پاس فیصلہ نہ لے کر آئیں، آپ کو حَکم نہ مانیں۔ اور پھر جس وقت آپ فیصلہ فرمادیں، فیصلہ فرمانے کے بعد پھر اِن کے جذبات یہ ہوں کہ آپ کے کیے ہوئے فیصلے کی طرف سے اپنے دل کے اندر کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ خوشدلی کے ساتھ، ٹھنڈے دل سے اس کو قبول کریں، يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا: اچھی طرح سے اس کو تسلیم کرلیں، تب جاکے یہ مؤمن قرار پائیں گے، ورنہ یہ مؤمن نہیں۔

---

(۱) دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص ۶۹ تا ص ۷۰، بعنوان زندوں کا مردوں سے مانگنا۔

نبوی فیصلہ قبول نہ کرنے کے تین درجے اوران کا شرعی حکم

اب یہاں ایمان کے لئے جوشرط ذکر کی گئی ہے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفصیل کے مطابق اِس میں تین درجے نکلیں گے، ایک قلبی، ایک لسانی، اور ایک عملی۔ قلبی درجہ تو یہ ہے کہ دل سے تسلیم کرے کہ آپ حاکم برحق ہیں اور آپ کا فیصلہ صحیح ہے، اور دلی طور پر وہ اِس بات کو تسلیم کرے کہ میرے ذِمّے یہ فرض ہے کہ میں حضور ﷺ کے فیصلے کو تسلیم کروں، قلب کے اندر اس بات کا ہونا یہ تو عقیدہ ہے، جس کو ہم تصدیق بالقلب کہتے ہیں، اگر یہ بھی کسی شخص کے اندر موجود نہیں تو وہ شخص سرے سے مؤمن نہیں، عقیدے کا درجہ یعنی قلبی درجہ تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے، جو بھی اپنے آپ کو مؤمن بنانا چاہتا ہے، اپنے آپ کو مؤمن قرار دینا چاہتا ہے، تو اس کے لئے تصدیق بالقلب شرط ہے، کہ حضور ﷺ کے فیصلے کو صحیح سمجھے، اور یہ سمجھے کہ میرے ذِمّے ہے کہ میں اس فیصلے کو تسلیم کروں۔ اور پھر دوسرا درجہ ہے زبان سے اقرار کرنے کا، کہ زبان سے اقرار بھی کرے کہ آپ کا فیصلہ برحق ہے اور میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ اور پھر تیسرا درجہ ہے اُس کے مطابق عمل کرنے کا، اب اگر کوئی شخص دل سے مان لے اور زبان سے اقرار لے تو فقہی نقطۂ نظر سے یہ مؤمن ہو گیا، اقرار بالّلسان اور تصدیق بالقلب کے ساتھ اِس کا ایمان معتبر ہے، پھر اگر اس کے مطابق اس کا عمل نہیں تو پھر فقہاء کی تفصیل کے مطابق یہ فاسق ہے، کافر نہیں۔ زندگی کے اندر جو معاملات بھی پیش آئیں سب کا درجہ یہی ہے، اگر کوئی جھگڑا ہو گیا اور دونوں فریقوں میں سے ایک شخص دوسرے کو کہے کہ یہ مسئلہ لکھ کر، صورتِ واقعہ لکھ کر شریعت میں پیش کر دی جائے، مفتیانِ شریعت کے سامنے اِس کو پیش کر دیا جائے، جو فیصلہ وہ شرعی نقطۂ نظر سے کریں وہ ہم قبول کر لیں، ایک شخص تو یہ کہتا ہے، اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! میں شریعت سے فیصلہ نہیں کرواتا، میں تو عدالت میں جاتا ہوں، جو عدالت فیصلہ کرے گی جو ملک کا قانون ہے میں تو اس کے مطابق اِس معاملے کو طے کروں گا، اس طرح اگر یہ شخص کہتا ہے تو یہ شخص فتوے کی رُو سے بھی کافر ہے، یہ نہیں کہ اِس میں کمالِ ایمان نہیں، بلکہ اب یہ صراحتاً کافر ہے۔ یا یہ کہتا ہے کہ میں تو رَسم ورواج کے مطابق کام کروں گا، میں نہیں جانتا شریعت کا کیا حکم ہے؟ جس طرح پچھلے زمانے میں انگریزوں کے دور میں حکومت کا یہ قانون تھا کہ لڑکیوں کو وراثت نہیں ملتی، اور اُس وقت بڑے بڑے زمینداروں میں عام طور پر یہ بات پائی جاتی تھی کہ اگر ان کو سمجھایا جاتا کہ بھئی! لڑکیاں بھی وارث ہیں، لڑکیوں کو حصہ دیا کرو، وہ کہتے کہ ہم تو ملک کے قانون کے مطابق چلیں گے، تو شریعت کا حکم سامنے آجانے کے بعد ملک کے قانون کا حوالہ دے کر اُس طرزِ عمل کو اختیار کرنا، یا یہ کہنا کہ جو رَسم ورواج ہمارا آبائی چلا آرہا ہے ہم تو اسی کے مطابق ہی چلیں گے، ہم نہیں جانتے شریعت کا کیا حکم ہے، اس قسم کے لفظ اگر زبان پر آگئے تو یہ شخص فتوے کی رُو سے بھی کافر ہے۔ اور اگر زبان سے تو ایسی بات نہیں کہتا، دل کے اندر جذبات اسی قسم کے ہیں، تو ہم اس کو کافر نہیں کہیں گے، کیونکہ دل کے جذبات کا ہمیں پتا نہیں ہے، ہم نے تو ظاہر پر مدار رکھنا ہے، ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ کسی کے دل کے جذبات کو جان لیں، لیکن وہ شخص عند اللہ منافق ہے، آخرت میں اُس کا درجہ کافروں والا ہوگا، چاہے دنیا کے اندر ہم اس کو کافر قرار دے کر اُس کے ساتھ کافروں والا معاملہ نہیں کریں گے۔ اور اگر زبان سے مانتا بھی ہے اور دل سے اقرار بھی کرتا ہے، لیکن عملی زندگی کے اندر کوتاہی کر جاتا ہے، جب عمل کا وقت آتا ہے تو

خلاف شریعت کام کرلیتا ہے، تو اُس کو فاسق کہتے ہیں، یہ کافر نہیں ہے۔ اور یہ سارے کے سارے درجے اختیاری معتبر ہیں، اگر شریعت کا کوئی فیصلہ سامنے آجانے کے بعد دل میں بغیر اختیار کے تنگی پیدا ہوجائے، لیکن عقیدے کے طور پر نہیں، بلکہ طبعی طور پر اپنے خلاف فیصلہ ہونے کی صورت میں دل میں کوئی گرانی محسوس ہو تو وہ معاف ہے، غیر اختیاری صفات زیر بحث نہیں ہوا کرتیں۔

تو مؤمنین کے سامنے یہ ایک معیار رکھ دیا گیا، کہ صحیح مؤمن وہی ہے جو حضور ﷺ کے فیصلے کو دل سے تسلیم کرے، بغیر کسی قسم کی اعتقادی تنگی کے کامل طریقے سے سرِ تسلیم خم کردیتا ہے، اور زبان سے بھی اس کو تسلیم کرتا ہے، جو بھی جھگڑے کی بات آجائے اس کو حضور ﷺ کی شریعت پر پیش کرکے اس سے فیصلہ کرواتا ہے، کامل درجے کا مؤمن یہی ہے، اسی کی تشریح کے طور پر سرورِ کائنات ﷺ کا فرمان حدیث شریف میں آیا ہے: "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ"[1] تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوگا جب تک وہ اپنی خواہشات کو اُس دین کے تابع نہیں کردیتا جس دین کو میں لے کر آیا ہوں۔

اَحکام اگر مشکل آجاتے تو بہت کم لوگ ان کو بجالاتے

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو احکام ہی آسان آسان سے دیے ہیں، اگر ہم اِن لوگوں پر یعنی عام لوگوں پر ہم یہ فرض کردیتے کہ اپنے آپ کو قتل کریں، خودکشی کریں، اللہ کے راستے میں جان اس طرح سے دے دیں، یا ہم اِن پر اَحکامِ مقصودہ کے طور پر فرض کردیتے کہ گھروں سے نکل جائیں، تبھی تمہارا ایمان معتبر ہے، تو بہت کم لوگ اس حکم کو بجالاتے، اور اِن کم لوگوں میں وہی مخلص مؤمن شامل ہوتے، عام طور پر لوگ اِس سے بدک جاتے، اور وہ سمجھتے کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اور اب جہاد جو فرض ہے اور ہجرت جو فرض ہے یہ اَحکامِ مقصودہ کے طور پر نہیں، بلکہ یہاں اصل مقصود ہے اپنے دین کی حفاظت اور اعلائے کلمۃ اللہ، جہاں ضرورت ہوگی وہاں جہاد اور ہجرت کا حکم آئے گا، جہاں ضرورت نہیں ہے وہاں نہیں، تو یہ اَحکامِ مقصودہ کے طور پر نہیں ہے، اور اگر یوں شرط لگادی جاتی کہ مؤمن تبھی بنوگے کہ گھروں سے نکل جاؤ، اور مؤمن بننے کے لئے ضروری ہوتا کہ اپنی قربانی دے دو، خودکشی کرلو، ایسے شدید احکام اگر اللہ کی طرف سے آجاتے تو بہت کم لوگ اُن کو تسلیم کرتے اور ان کے مطابق عمل کرتے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا اِخلاص اور اُن کی قُربانی

اور اِس قلیل کے مصداق میں وہی مخلصین ہیں، جیسے وقت پر جہاد اور ہجرت کا حکم آیا تو مخلصین نے اُس کے مطابق عمل کرکے دِکھایا، "اپنے آپ کو قتل کرو" اپنے رشتے داروں کو قتل کرو، اپنے لوگوں کو قتل کرو، اِس کا مفہوم عام ہے، تو جہاد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تلوار اُٹھائی، بھانجے نے ماموں کے خلاف اُٹھائی، ماموں نے بھانجے کے خلاف اُٹھائی، چچے نے بھتیجے کے خلاف اُٹھائی، بھتیجے نے چچے کے خلاف اُٹھائی، اپنی برادری کے خلاف اُٹھائی، اور یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہیں ہے، یہ اپنی قربانی دینے کی طرح ہی ہے کہ انسان دِین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خاطر اپنے رشتے داروں کی پروانہ کرے۔ اور گھر بار سے نکل

(۱) مشکوۃ ۱؍۳۰ باب الاعتصام، فصل ثانی، عن عبد اللہ بن عمرو/ شرح السنۃ ۱؍۲۱۳، رقم الحدیث: ۱۰۴

جاتا بھی مہاجرین کے اندر پایا گیا، کہ انہوں نے ایسا کر کے دکھایا، لیکن یہ اَحکامِ مقصودہ کے طور پر نہیں، جب کہیں موقع ہو تو اِس قسم کا حکم متوجہ ہوتا ہے۔

اِیمان میں مضبوطی کیسے آئے گی؟

جیسا حکم اللہ کی طرف سے آجائے اس کو تسلیم کرنا ہی انسان کو دِین اور اِیمان پر ثابت رکھنے کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہوتا ہے، کہ اَحکام کی جتنی اتباع کرو گے اتنی ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایمان میں مضبوطی ہوتی چلی جاتی ہے، یہی بات آگے کہی جارہی ہے کہ ''اگر ہم اِن پر لکھ دیتے'' یہ ضمیر عام ہے، مؤمنین منافقین سب کی طرف لوٹتی ہے، ''کہ قتل کرو تم اپنے نفسوں کو، یا، اپنے لوگوں کو، یا نکل جاؤ تم اپنے گھروں سے، تو نہ کرتے یہ کام مگر اِن میں سے تھوڑے۔ اگر یہ کرتے وہ کام جس کے ساتھ اِن کو نصیحت کی جاتی ہے تو اِن کے لئے بہتر ہوتا اور زیادہ سخت ہوتا ان کے قدم جمانے کے لئے''، یعنی دین کے اندر اِن کے قدم زیادہ جمتے اگر یہ لوگ اُس پر عمل کرتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن کو نصیحت کی جاتی ہے۔ تب یعنی جب یہ نصیحت کئے ہوئے امر پر پابندی کرتے تب ہم اِنہیں اپنے پاس سے اَجرِ عظیم دیتے، اور انہیں سیدھے راستے پر چلاتے، اِن کو جنّت کے راستے پر چلاتے اور جنّت میں پہنچادیتے، اگر یہ ایسا کریں تو اِن کو سیدھا راستہ نصیب ہوجائے گا اور ہماری طرف سے اَجرِ عظیم بھی مل جائے گا۔ آگے اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرنے والوں کے لئے بشارت ہے، ''جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے'' یہاں اطاعت میں وہی درجات نکلیں گے، ایک درجہ اطاعت کا تو وہ ہے جس کے بغیر انسان مؤمن نہیں ہوتا، اور ایک درجہ اطاعت کا وہ ہے جس کے بغیر انسان مؤمن صالح نہیں بنتا بلکہ فاسق ہوتا ہے، تو جیسے جیسے اطاعت میں درجات ہوں گے ویسی ویسی آگے بشارت ہوگی۔

جس سے محبت ہوگی حشر اُسی کے ساتھ ہوگا

''اللہ اور اللہ کے رسول کی جو شخص اطاعت کرے گا تو یہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے''، یعنی منعم علیہم کی رفاقت نصیب ہوگی ان لوگوں کو جو اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، منعم علیہم میں کون کون لوگ شامل ہیں؟ پہلے درجے پر تو انبیاء علیہم السلام ہیں، اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں انبیاء علیہم السلام کی رفاقت نصیب ہوجائے تو اُس کا طریقہ بھی اطاعت ہے، کہ اللہ کے احکام کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کے احکام کی اطاعت کرو جتنی تمہارے بس میں ہے، تو اُسی درجے کے مطابق نبیوں کی رفاقت نصیب ہوجائے گی، جنت میں اُن کے ساتھ رہنا نصیب ہوجائے گا۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ سے بہت محبت ہے، اور یہاں دُنیا میں رہتے ہوئے اگر میں کبھی آپ کو نہ دیکھوں تو مجھے بے چینی ہوتی ہے، اب یہ سوچ کر میں پریشان ہورہا ہوں کہ دُنیا میں تو ہم آپ کی زیارت کرلیتے ہیں، مل لیتے ہیں، لیکن آخرت میں آپ تو ہوں گے انبیاء علیہم السلام کے درجات میں، اور ہم پتا نہیں کہاں ہوں گے، اور وہاں پھر آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہوگی، تو پھر اِس بے چینی کا کیا علاج ہوگا؟ آپ کی زیارت کے بغیر تو ہمارا گزارہ مشکل ہوگا۔ یہ اُس نے سوال کیا، تو اِس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)۔ جیسے ایک موقع پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' کہ انسان

اسی کے ساتھ ہی ہوگا جس کے ساتھ اُس کو محبت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے سننے کے بعد مسلمانوں کو جتنی خوشی ہوئی ایمان حاصل ہوجانے کے بعد شاید اتنی خوشی کسی دوسری بات پر نہ ہوئی ہو؛[1] کیونکہ اُس وقت جو مؤمن موجود تھے اُن کو سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے ساتھ تھی، اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر محبت کے نتیجے میں رفاقت آئے گی تو ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوجائے گی۔ اور ایک روایت میں خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمارے لئے بڑی بشارت ہے کہ مجھے سب سے زیادہ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور ابوبکر و عمر کے ساتھ ہے (ان دو کا اضافہ بھی کیا) تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آخرت میں مجھے ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔[2] اور ایک روایت میں اس قسم کا مضمون بھی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ تیاری تو کوئی نہیں کی، بس اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں بھی یہی فرمایا: ''أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ'' (حوالہ مذکورہ) تو اسی کے ساتھ ہی ہوگا جس کے ساتھ تجھے محبت ہے، گویا کہ قیامت کی تیاری کے لئے اللہ کے رسول کی محبت بھی بہت بڑا سرمایہ ہے۔

معیارِ محبت کی وضاحت

اور محبت کا معیار یہی ہے کہ جو محبّ ہوا کرتا ہے حتی الوسع وہ محبوب کی اطاعت کرتا ہے، لیکن یہاں اطاعت کا یہ مطلب نہیں کہ پورے کے پورے اَحکام، فرائض واجبات مستحبات اور اَولیٰ کام جتنے ہیں سب کی پابندی کرو تو محبت کا معیار پورا ہوگا، اور اسی طرح مکروہات اور خلافِ اَولیٰ سب سے بچو تو محبت کا معیار پورا ہوگا، اگر یہ شرط ٹھہرا دی جائے تو پھر ایسا کرنے والا انسان خود صالحین شہداء اور صدیقین میں شامل ہوگیا، اور یہاں جو رِفاقت ذکر کی جارہی ہے رِفاقت کا تو مطلب یہ ہے کہ عمل میں اُس درجے کا نہ بھی ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اِس اطاعت کی برکت سے اُن کی رِفاقت نصیب کردیں گے، تو مقصد یہاں یہ ہے کہ حتی الوسع اَحکام کو ماننے اور اطاعت سے رُوگردانی نہ کرے، پھر عمل کے اندر اُس معیار پر نہ بھی ہوا تو بھی اللہ تعالیٰ محبت کے صدقے، محبت والے عمل کے صدقے، اُس عملی کوتاہی کو پورا کردیں گے جو عام طور پر عوام الناس میں ہوجایا کرتی ہے، وہ عوام الناس جو صلحاء یا اولیاء کے درجے کے نہیں ہوتے محبت کی برکت سے اُن کو رِفاقت نصیب ہوجائے گی، چنانچہ یہ مضمون بھی صراحتاً حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک آدمی کسی قوم سے محبت رکھتا ہے ''وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِمْ'' لیکن اُن کے ساتھ لاحق نہیں ہے، یعنی عمل کے اعتبار سے اُن جیسا نہیں ہے، البتہ محبت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھی یہی جواب دیا: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ''[3] کہ انسان اُسی کے ساتھ ہی ہوگا جس کے ساتھ محبت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ محبت عملی کوتاہی کی تلافی کردیتی ہے بشرطیکہ

---

(۱) سنن الترمذی ۲/ ۶۳ باب ما جاء ان المرء مع من احب/ نیز مسلم ۲/ ۳۳۲ باب المرء مع من احب/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۲۶ باب الحب فی اللہ۔

(۲) بخاری ۱/ ۵۲۱ باب مناقب عمر/ مسلم ۲/ ۳۳۱ باب المرء مع من احب

(۳) بخاری ج ۲ ص ۹۱۱ باب علامۃ حب اللہ/ مسلم ۲/ ۳۳۲/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۶ باب الحب فی اللہ۔

انسان عام طور پر اطاعت کو اختیار کیے ہوئے ہو اور فسق وفجور کے اندر زیادہ مشغول نہ ہو، تو پھر اگر اُس درجے کا نہ بھی ہو جس کو صلحاء یا اولیاء کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، تو بھی محبت رکھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اُن کی رفاقت دے دیں گے، تو نبیین کی رفاقت حاصل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ ایک اور روایت بھی ہے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کے ساتھ تھے کسی سفر میں، غالباً ربیعہ بن کعب ان کا نام ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں بھی روایت گزری ہے، رات کو حضور ﷺ تہجد کے لئے اُٹھے تو انہوں نے وضو کا جو سامان ہوتا ہے لوٹا، پانی، مسواک اس قسم کی چیزیں پیش کیں، تو رسول اللہ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا کہ مانگو کیا مانگتے ہو، سوال کرو کیا چاہتے ہو؟ وہ کہنے لگا: ''اَسْئَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ!'' میں جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ اور؟ وہ کہنے لگا: نہیں جی! بس جنت میں آپ کی مرافقت چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ بہت اچھا! میری مدد کرنا اپنے پر کثرتِ سجود کے ساتھ۔[1] یعنی میں بھی کوشش کروں گا اور تُو بھی اس سلسلے میں میری اعانت کرنا، اِعانت اس طرح کہ اللہ کو سجدے کثرت سے کیا کرو، یعنی نماز کثرت سے پڑھا کرنا، نوافل کثرت سے پڑھا کرنا، تو رِفاقت نصیب ہوجائے گی۔ تو اِطاعت جو ہے یہی رفاقت کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور محبت کو جو رِفاقت کا ذریعہ بنایا گیا تو محبت اور طاعت تقریباً تقریباً دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں، کہ جب کسی کے ساتھ محبت ہوجایا کرتی ہے تو پھر اِنسان دِل سے اس کے اَحکام کو تسلیم کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے اپنے محبوب کو خوش کرنے کی اور اس کے اَحکام کے مطابق چلنے کی۔ منعم علیہم کا پہلا درجہ تو نبیین ہیں، اور دوسرا درجہ صدیقین ہیں، صدیق: زیادہ سچا آدمی، قول وفعل کا سچا، یہ اعلیٰ درجے کے مؤمنین ہوگئے۔ اور شہداء تیسرے نمبر پر آگئے، جو کہ عمل کے ساتھ اپنے ایمان پر شہادت دیتے ہیں، اور اپنی جان قربان کرکے اپنے عقائد کی صحت کی شہادت دیتے ہیں، گویا کہ اللہ اور اللہ کے رسول پر جو اُن کا ایمان ہے اپنی جان قربان کرکے اُس کی تصدیق کردیتے ہیں۔ اور صالحین کا مصداق اولیاء ہیں جن پر صالحیت کے آثار نمایاں ہوں اور فسق وفجور کی کوئی علامت ان پر نہیں پائی جاتی، عام اولیاء اللہ جن کو کہہ دیا جاتا ہے، عام دِین دار نیک قسم کے لوگ، صالحین کا مصداق یہ ہیں۔

''صالحین'' کا عنوان عام ہے

لیکن یہ جو چار درجے ذکر کیے گئے ہیں تو نبی سب سے اَخص ہے، اور صالحین سب سے اَعم ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اَخص کے ہر فرد پر اَعم صادق آیا کرتا ہے، لیکن اَعم کے ہر فرد پر اَخص صادق نہیں آیا کرتا، جیسے منطق میں آپ تفصیل پڑھا کرتے ہیں کہ انسان اَخص ہے اور حیوان اَعم ہے، تو ''کُلُّ اِنسانٍ حیوانٌ'' تو ٹھیک ہے کہ انسان کے ہر فرد پر حیوان صادق آتا ہے، لیکن حیوان کے ہر فرد پر انسان صادق نہیں آتا، اسی طرح نبی کا لفظ اَخص ہے اور صدیق اُس سے اَعم ہے، نبی جو بھی ہوگا وہ صدیق ہوتا ہے، صِدِّيقًا نَّبِيًّا (سورۂ مریم: ۴۱، ۵۶) قرآنِ کریم میں کئی جگہ آپ نے پڑھا، تو ہر نبی صدیق ہے لیکن ہر صدیق نبی نہیں ہوتا، اور شہداء صدیق سے اَعم ہیں، کہ ہر صدیق شہید ہوسکتا ہے ''کُلُّ صِدِّيقٍ شَهِيدٌ'' کہہ سکتے ہیں بایں معنی کہ اپنے عمل کے ساتھ، اپنے

(۱) صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۳ باب فضل السجود/ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۴ باب السجود وفضلہ، فصل اول۔

قول کے ساتھ، اپنی مالی جانی قربانی کے ساتھ وہ اپنے عقائد کی صحت پر گواہی دیتا ہے، اللہ کے دین پر گواہی دیتا ہے، جس کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ میدان میں جان قربان ہو جائے، لیکن ہر شہید صدیق نہیں ہوتا، اور اسی طرح ہر شہید صالح ہوگا، اُس پر صالح کا لفظ صادق آئے گا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر صالح شہید ہو۔ تو صالحین سب سے اَعم ہیں، اس لیے جب صالحین کا عنوان اختیار کرلیا جائے تو اس کے ضمن میں نبی بھی آجاتے ہیں، صدیق بھی آجاتے ہیں، شہداء بھی آجاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو تو تمہیں صالحین کی رِفاقت نصیب ہوگی، اولیاء اللہ کے ساتھ رہنا نصیب ہوگا، اور اولیاء اللہ کے افراد میں یہ سارے شامل ہیں۔

اولیاء اللہ کی رِفاقت بہت بڑی نعمت ہے

تو یہ بہت بڑا انعام ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اولیاء اللہ کی رِفاقت، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، دُنیا میں بھی کسی کو ایسا ماحول نصیب ہو جائے، ان لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا نصیب ہو جائے، ان کے ساتھ رہنا سہنا نصیب ہو جائے تو یہ دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ اِسی معیت اور اِسی رفاقت کے ساتھ انسان میں نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، صحبت کے اثر کے ساتھ انسان میں بھی صالحیت آتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص فساق اور فجار کے مجمع میں گھر جائے، اور اس کے رُفقاء دُنیوی زندگی میں فاسق فاجر قسم کے آدمی ہوں، تو اگر دل میں ایمانی حس موجود ہو تو انسان اس ماحول کو اپنے لئے جہنم سمجھتا ہے، زندگی میں پریشانی کی بات ہوتی ہے، دُنیا میں بھی انسان اطمینان کی زندگی نہیں گزار سکتا اگر اُس کو صالحین کا ماحول نہیں ملا بلکہ وہ فساق فجار کے ماحول میں پھنسا ہوا ہے، اور اسی طرح آخرت میں صالحین کا ماحول مل جائے تو پھر کیا ہی کہنا، اور اگر آخرت میں جاکر انسان فساق فجار کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی بدبختی نہیں ہے۔

''صراطِ مستقیم'' کی واضح پہچان

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں دُعا تلقین کی ہے وہ یہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا، تو گویا کہ منعم علیہم کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، اور اِس کے اُوپر چلنے کے لئے ہمیں دُعا تلقین کی گئی کہ تم یہ دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں منعم علیہم کے راستے پر چلائے، اور منعم علیہم وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہ تو مغضوب ہوتے ہیں اور نہ ضالین ہوتے ہیں، اِن دونوں لفظوں کا مفہوم بھی آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ ضالین کا مطلب تو یہ ہے کہ جہالت کی وجہ سے بھٹکتے پھریں، اور مغضوب کا مطلب یہ ہے کہ جاننے کے باوجود بدعملی میں مبتلا ہوں، تو منعم علیہم وہ لوگ ہوئے جن کو علم صحیح حاصل ہے اور اُن کا علمِ صحیح کے مطابق عمل بھی ہے، وہ ہوں گے منعم علیہم۔ اور علمِ صحیح والے اور عملِ صحیح والے، اس کا اعلیٰ درجہ نبی، دوسرا درجہ صدیق، تیسرا درجہ شہداء، چوتھا درجہ صالحین، اور عام مفہوم لے لیا جائے تو صالحین سب پر صادق آگیا، جس سے یہ معلوم ہوگیا کہ صالحین اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جن کو علم صحیح حاصل ہوتا ہے، قرآن اور حدیث کو وہ صحیح سمجھتے ہیں، اور پھر سمجھنے کے ساتھ اُس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں، اور ان دونوں باتوں کو

جوڑنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر تم صراطِ مستقیم پہچاننا چاہتے ہو تو صراطِ مستقیم یہی صالحین کا راستہ ہے۔ اس لیے وہ لوگ جن کو عام طور پر مقبولین کہا جاتا ہے، اُن کے ہم زمانہ اہلِ علم نے اُن کے اچھے ہونے پر شہادت دی ہو، اور اُمّت کے اندر وہ مقبولین میں شمار ہوتے آئے ہوں، اُن لوگوں کا راستہ ہی صحیح معنی میں صراطِ مستقیم ہے، اس لئے اُن کے احوال دیکھنے کے بعد اور ان کے اقوال دیکھنے کے بعد اُن کا جو طرزِ عمل سمجھ میں آئے صراطِ مستقیم کا مصداق وہی ہے، اِن اولیاء اللہ کے طریقوں کے خلاف اگر تمہیں کوئی طریقہ سمجھاتا ہے، چاہے اپنے طور پر وہ کتنے ہی قوی دلائل کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن وہ طریقہ اختیار کرنے کے قابل نہیں (اِس نکتے کو ذہن میں بٹھالو، زندگی میں یہ کام آنے والی بات ہے) فہم کے اندر انسان غلطی کرسکتا ہے، دلائل میں اُلجھ کر انسان کسی صحیح بات کو غلط سمجھ سکتا ہے اور غلط بات کو صحیح سمجھ سکتا ہے، لیکن اگر آپ اس راستے کے اوپر چلنا چاہتے ہیں جو اللہ تک پہنچاتا ہے، جس کو "صراطِ مستقیم" کہتے ہیں، تو یہاں اِن اولیاء اللہ کے نقشِ قدم پہچانو، جس راستے پر آپ کو یہ مقبولین چلتے ہوئے نظر آئیں آنکھیں بند کر کے اس راستے کے اوپر چلتے چلے جاؤ، اولیاء اللہ کے طریق کو اپناؤ، اُن کا طرزِ زندگی اختیار کرو، یہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول طریقہ ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے جو انسان کو جنّت تک پہنچاتا ہے۔ تو صالحین کی رفاقت، اولیاء اللہ کی دوستی اور ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا دُنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی اِس چیز کا حاصل ہوجانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جیسے آگے ذکر کیا جارہا ہے وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا: یہ رفیق ہونے کے اعتبار سے بڑے اچھے لوگ ہیں، اور اِن کی رفاقت کا نصیب ہوجانا اللہ کا فضل ہے، اللہ کے فضل سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے، تو اللہ کا فضل جس وقت آپ مانگیں، اللہ تعالیٰ سے جس وقت طلب کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا فضل نصیب کرے، تو اُس میں یہ بات بھی ہے کہ خود نیکی کی توفیق دے اور نیکوں کی رفاقت نصیب فرمائے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا: اللہ تعالیٰ جاننے والا کافی ہے، یعنی کسی کی کوئی بات اللہ سے مخفی نہیں، جس درجے کی طاعت ہوگی اُسی درجے کا اللہ تعالیٰ اجر دے گا اور اسی درجے کی اِن صالحین کی رفاقت نصیب ہوگی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا
اے ایمان والو! اپنی احتیاط اختیار کرو پس کُوچ کیا کرو چھوٹی جماعتوں کی صورت میں یا کُوچ کیا کرو
جَمِيْعًا ۝۷۱ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ
سارے اکٹھے ۝۷۱ بے شک تم میں سے البتہ وہ شخص ہے جو سستی کرتا ہے، پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے تحقیق
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝۷۲ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ
اللہ نے مجھ پر انعام کیا جبکہ میں اِن لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں تھا ۝۷۲ اور اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فضل پہنچ

مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ

جاتا ہے تو البتہ ضرور کہے گا وہ شخص، گویا کہ تمہارے اور اُس کے درمیان میں کوئی محبت کا تعلق ہی نہیں، ہائے کاش! میں ان کے

مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ

ساتھ ہوتا پھر میں کامیاب ہو جاتا بڑا کامیاب ہونا ﴿۷۳﴾ چاہیے کہ قتال کریں اللہ کے راستے میں وہ لوگ

يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ

جو بیچتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے، اور جو کوئی شخص قتال کرے اللہ کے

اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

راستے میں پھر وہ مقتول ہوجائے یا غالب آجائے پس عنقریب ہم اُسے دیں گے اجر عظیم ﴿۷۴﴾

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ

تمہیں کیا ہوگیا کہ تم لڑائی نہیں کرتے اللہ کے راستے میں اور کمزور لوگوں کو چھڑانے کی خاطر، مردوں

الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا

میں سے اور عورتوں میں سے اور بچوں میں سے، جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! نکال ہمیں

مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ

اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی حمایتی،

وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ

اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار ﴿۷۵﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کے راستے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ

میں لڑتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کے راستے میں لڑائی کرتے ہیں

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ ع

پس تم لڑائی لڑو شیطان کے دوستوں کے ساتھ، بیشک شیطان کی تدبیر کمزور ہوتی ہے ﴿۷۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ- یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ: اے ایمان والو! اپنی احتیاط اختیار کرو، حِذر: بچاؤ، اور اسی طرح یہ اُس سامان پر بھی بولا جاتا ہے جو انسان کے لئے بچاؤ کا ذریعہ بنتا ہے، سپر ڈھال اور زرہ وغیرہ، جس کو انسان اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کرتا ہے، پھر مطلقاً اِس کا اطلاق اسلحہ جنگ پر بھی ہو جاتا ہے، اس لئے حِذر کا مفہوم لفظ ہتھیار کے ساتھ بھی واضح کیا جاسکتا ہے، اور حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے حذر کا ترجمہ ہتھیار کے ساتھ ہی کیا ہے، ''اے ایمان والو! اپنے ہتھیار اختیار کرو، اپنا بچاؤ اختیار کرو''، اور یہ حاصل مفہوم ہے جو میں نے اپنے لفظوں میں ادا کیا کہ اپنی احتیاط اختیار کرو، جس میں یہ بات بھی آگئی کہ دشمن تمہیں نقصان نہ پہنچانے پائے، اور اِس میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ ہر وقت اس طرح سے مسلح رہو کہ دشمن پر غلبہ پانے کا کوئی موقع تمہارے ہاتھ سے نہ چوکے۔ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا: ثُبات ثُبَةٌ کی جمع ہے، ثُبَة کہتے ہیں جماعت کو، چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، چھوٹی چھوٹی جماعتیں، فَانْفِرُوْا: پس کوچ کیا کرو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں یا کوچ کیا کرو سارے اکٹھے، وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ: بَطَّأَ: تاخیر کرنا، سست پڑ جانا، یہ اس کا لازم مفہوم ہے، اور سست کر دینا یہ متعدی مفہوم ہے، یہ لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے، جیسے حدیث شریف میں ایک جملہ آتا ہے: ''مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ''(۱) جس کو اس کا عمل سستی میں ڈال دے یا پیچھے ہٹا دے اُس کا نسب اس کو تیز نہیں چلا سکتا، نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ ''بیشک تم میں سے البتہ وہ شخص ہے جو سستی کرتا ہے، تاخیر کرتا ہے، پیچھے ہٹتا ہے، ڈھیلا پڑ جاتا ہے''، فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ: پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے، قَالَ: تو یہی پیچھے ہٹنے والا شخص کہتا ہے: قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ: تحقیق اللہ نے میرے پہ انعام کیا، اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِیْدًا: جبکہ میں اِن لوگوں کے ساتھ لڑائی میں حاضر نہیں تھا، شہید کے معنی حاضر، وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ: اور اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فضل پہنچ جاتا ہے، یعنی تم فتح یا غنیمت حاصل کر لیتے ہو، لَیَقُوْلَنَّ: البتہ ضرور کہے گا یہ شخص، كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ یّٰلَیْتَنِیْ: لَیَقُوْلَنَّ یٰلَیْتَنِیْ۔ یٰلَیْتَنِیْ اور اس کے بعد والے الفاظ لَیَقُوْلَنَّ کا مقولہ ہیں، البتہ ضرور کہے گا وہ شخص کہ ہائے کاش! كُنْتُ مَعَهُمْ: میں اِن کے ساتھ ہوتا، فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا: پھر میں کامیاب ہو جاتا بڑا کامیاب ہونا، حاصل کرتا میں بڑی کامیابی، یہ بات وہ کہے گا، كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ یہ درمیان میں معترضہ ہے، یعنی وہ ایسے طور پر کہے گا گویا کہ تمہارے اور اُس کے درمیان میں کوئی محبت کا تعلق ہی نہیں، جیسے اجنبیت ہوتی ہے، تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی محبت نہیں ہے، ایسے طور پر وہ کہے گا، کہ ہائے کاش! میں اِن کے ساتھ ہوتا پھر میں بھی بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ: یہاں مفسرین نے دو طرح سے ترکیب کی ہے، الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ یہ فَلْیُقَاتِلْ کا فاعل ہے یا مفعول؟ اگر ہم اِس کو فَلْیُقَاتِلْ کا فاعل بنائیں تو پھر یَشْرُوْنَ کا ترجمہ بیچنے کے ساتھ کرنا ہے، شَرٰی یَشْرِیْ خریدنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور بیچنے کے

(۱) مسلم ۲/۳۴۵، کتاب الذکر باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن/ مشکوۃ ۱/۳۲، کتاب العلم الفصل اول۔

معنی میں بھی آتا ہے، سورۂ یوسف میں آپ یہ لفظ پڑھیں گے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ: بیچ دیا اُن بھائیوں نے اُس یوسف کو گھٹیا پونجی کے بدلے جو چند دِرہم تھے، اُن کو یوسف میں کوئی رغبت نہیں تھی، اُن کے نزدیک یوسف کوئی قیمتی سامان نہیں تھا، اُس کی طرف سے یہ بے رغبت تھے، اِس لیے گھٹیا پونجی کے بدلے بیچ دیا، تو وہاں شَرٰی بیچنے کے معنی میں ہے، اور اسی طرح سے شَرٰی یَشْرِیْ خریدنے کے معنی میں بھی آتا ہے، مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ (سورۂ بقرہ: ۲۰۷) جو اپنے نفس کو خریدتا ہے۔ تو پھر جب یہ بیچنے کے معنی میں ہوگا تو ترجمہ یوں ہوگا ''چاہیے کہ قتال کریں اللہ کے راستے میں، چاہیے کہ لڑیں اللہ کے راستے میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں دُنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے، جو آخرت لینا چاہتے ہیں اور دُنیوی زندگی چھوڑنا چاہتے ہیں، دُنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں، آخرت کو اختیار کرتے ہیں اُنہیں چاہیے کہ اللہ کے راستے میں قتال کریں، اِس ترجمے میں الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ یہ فَلْيُقَاتِلْ کا فاعل بن گیا۔ اور اگر اِس کو مفعول بنایا جائے تو پھر يَشْرُوْنَ کا ترجمہ خریدنے کے ساتھ کرنا ہے، اور فَلْيُقَاتِلْ کی ضمیر لوٹے گی پچھلے شخص کی طرف جو کہتا تھا يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا، اس شخص کو چاہیے جو آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے جو فوزِ عظیم چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اللہ کے راستے میں لڑے اُن لوگوں کے ساتھ جو کہ خریدتے ہیں دُنیوی زندگی کو آخرت کی بدلے، یہ خریدنے والے لوگ کافر ہیں، اِن کافروں کے ساتھ اُس شخص کو قتال کرنا چاہیے جو کہ فوزِ عظیم کی تمنا رکھتا ہے، کامیاب حاصل ہونے کی جو تمنا کرتا ہے، جو کہتا ہے يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا، اُسے چاہیے کہ اُن لوگوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں لڑے جو دُنیوی زندگی کو اِختیار کرتے ہیں آخرت کے بدلے میں، یعنی کافروں کے ساتھ۔ فاعل بنا کر ترجمہ کیا ہے حضرت شیخ (الہندؒ) نے، اور مفعول بنا کر ترجمہ کیا ہے حضرت تھانوی ؒ نے۔ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور جو کوئی شخص قتال کرے اللہ کے راستے میں، فَيُقْتَلْ: پھر وہ مقتول ہوجائے، اَوْ يَغْلِبْ: یا غالب آجائے، فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا: پس عنقریب ہم اُسے دیں گے اَجرِ عظیم۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: تمہیں کیا ہوگیا، تمہیں کیا عذر ہے کہ تم لڑائی نہیں کرتے اللہ کے راستے میں، وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ: وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ کا عطف ہے سَبِيْلِ اللّٰهِ پر، یہ بھی فِيْ کا مجرور ہے، اور مستضعفین کے اُوپر مضاف محذوف نکال لیں گے فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَفِيْ خَلَاصِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ، تمہیں کیا ہوگیا کہ تم لڑائی نہیں کرتے اللہ کے راستے میں اور کمزور لوگوں کو چھڑانے کی خاطر، الْمُسْتَضْعَفِيْنَ: کمزور سمجھے ہوئے، کمزور لوگوں کے چھڑانے کی خاطر، اور وہ کمزور لوگ مرد ہیں، عورتیں ہیں، بچے ہیں، مِنَ الرِّجَالِ: یہ مِن بیانیہ ہے، مردوں میں سے، وَالنِّسَآءِ: عورتوں میں سے وَالْوِلْدَانِ: اور بچوں میں سے، یعنی مستضعفین جو کہ مرد بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں، بچے بھی ہیں، تم اِن کے چھڑانے کے لئے لڑائی کیوں نہیں کرتے؟ اِن کی خلاصی کے لئے تم اللہ کے راستے میں کیوں نہیں لڑتے؟ ''اِن کی خاطر'' یہ مفہوم بھی ادا کرسکتے ہیں، اللہ کے راستے میں اور مستضعفین کی خاطر، اپنی زبان میں اِس مفہوم کو اِس لفظ کے ساتھ بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ: ایسے مستضعفین جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! نکال ہمیں اِس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، الظَّالِمِ اَهْلُهَا: جس بستی کے رہنے والے ظالم ہیں اِس بستی سے ہمیں نکال، وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا: اور بنادے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی،

وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا: اور بنادے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جولوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ: اور جولوگ کافر ہیں وہ شیطان کے راستے میں لڑائی کرتے ہیں، فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ: قَاتِلُوْا کا خطاب اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کو ہے جواولیاء الشیطان کے مقابلے میں اولیاء اللہ کہلانے کے حقدار ہیں، جیسے کہ قرآنِ کریم میں ہی اِن ایمان والوں کو حِزْبُ اللہ کے ساتھ تعبیر کیا، اوردوسروں کو حِزْبُ الشَّيْطٰنِ کے ساتھ تعبیر کیا، کہ ایک شیطان کا گروہ ہے اور ایک اللہ کا گروہ ہے، یہاں اولیاء الشیطان کافر ہیں، اوران کے مقابلے میں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ اولیاء الرحمٰن ہیں۔ ''اے اللہ کے دوستو! لڑائی لڑو شیطان کے دوستوں کے ساتھ، اے ایمان والو! اے اللہ کے اولیاء! اے اولیاء الرحمٰن! لڑائی لڑو شیطان کے اولیاء کے ساتھ، شیطان کے دوستوں کے ساتھ''، اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا: بیشک شیطان کا مکر، شیطان کی تدبیر کمزور ہوتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

دوقسم کی جنگیں اسلام میں جائز ہیں

مختلف قسم کے اَحکام چلے آرہے ہیں، اور اِس رکوع میں خصوصیت کے ساتھ جہاد کا تذکرہ ہے، مدینہ منورہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس وقت سرورِ کائنات ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو جہاد کی اجازت دی تو سرورِ کائنات ﷺ نے جہاد کی کارروائیاں شروع فرمائیں، اور یہ جو جہاد ہے، لڑائی، اِس کے دو انداز ہیں، ایک انداز ہے کہ بڑی فوج لے کر جائیں بھرپور فوج، ''لشکرِ جرار'' جسے کہتے ہیں، اور دشمنوں کے مقابلے میں باقاعدہ صف بندی کر کے میدان کے اندر لڑائی لڑی جائے، ایک تو یہ جنگ ہے، اور ایک ہے جس کو آج کل ''گوریلا وَار'' کہتے ہیں، چھاپہ مار جنگ، چھاپہ مار جنگ میں یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے سامنے بالمقابل ہوکر صف بندی کر کے تو مقابلہ نہیں ہوتا بلکہ چھپ چھپا کر موقع پاکر دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کو عربی کے اندر تَبْيِيْت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، تبییت: رات کو چھاپہ مارنا، اور انگریزی میں اس کے لئے ''گوریلا وَار'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، گوریلا وَار کا یہی معنی ہے، گوریلا جنگ یعنی چھاپہ مار جنگ، کہ مجاہد اِکا دُکا، دو دو چار چار مل کر چھپتے چھپاتے رہیں، اور جہاں دشمن کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع آیا تو اُس دشمن کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر حملہ کر دیا اور اُس کو نقصان پہنچا دیا، اور یہ دونوں قسم کی جنگیں اسلام کے اندر جائز ہیں اور سرورِ کائنات ﷺ نے دونوں ہی طریقے اختیار فرمائے ہیں، آپ سیرت کی کتابیں پڑھیں گے تو اُن میں یہ بات آئے گی کہ حضور ﷺ صحابہ کرام کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو، تیس تیس آدمی، چالیس چالیس آدمی، پچاس پچاس آدمی، بیس بیس آدمی بھی مختلف اطراف میں بھیجے ہیں، جنہوں نے جا کر مشرکین کے قافلوں کو نقصان پہنچایا، ان کے تجارتی قافلوں کے راستے روکے، اور اسی طرح سے موقع محل پا کر کافروں کو نقصان پہنچایا، تو یہ چھاپہ مار جنگیں تھی جن کو ''سَرایا'' کے ساتھ

تعبیر کیا جاتا ہے، کہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں حضور ﷺ بھیجا کرتے تھے، اور بڑی جماعت کی شکل میں بھی آپ ﷺ تشریف لے گئے، بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ بھی تشریف لے گئے، اور دشمنوں کے ساتھ اُس طرح سے بھی مقابلہ کیا جیسے کھلے میدان میں جنگ ہوتی ہے، بدر میں ایسے ہوا، اُحد میں ایسے ہوا، اَحزاب میں ایسے ہوا، مکہ میں ایسے ہوا فتح مکہ کے موقع پر، حنین میں ایسے ہوا، غزوۂ تبوک میں اِسی طرح سے ہوا، کہ بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ حضور ﷺ خود تشریف لے گئے۔

جنگ میں اِحتیاطی تدابیر اِختیار کرنے کا حکم

تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہی بات سمجھائی جارہی ہے، کہ اے ایمان والو! اپنی احتیاط اختیار کرو، غافل نہ ہوؤ، جب دشمن کے ساتھ ٹکراؤ ہوجائے تو غافل نہیں ہونا چاہیے کہ دشمن تمہاری غفلت سے فائدہ اُٹھالے اور تمہیں نقصان پہنچائے، ہر وقت چوکنے رہو، محتاط رہو، اِس میں یہ بھی آ گیا کہ جنگ کی تدبیر سے بھی غافل نہ ہوؤ، اور اِس میں یہ بھی آ گیا کہ اپنے بچاؤ کا سامان بھی اختیار کر کے رکھو، جیسے خود ہوگئی، یہ سر کے اُوپر جو لوہے کی ٹوپی پہنی جاتی ہے، ڈھال ہوگئی جس کے ساتھ دوسرے کا وار روکا جاتا ہے، زرہ ہوگئی جو سینے کے اُوپر پہن لیتے ہیں، اس قسم کی چیزیں اختیار کرنا یہ بھی اَخذِ حِذر ہے۔ اور ایسے ہی اپنے آپ کو مضبوط کر کے رکھنا، قوت جمع کر کے رکھنا، ہتھیار جمع کر کے رکھنا تاکہ دشمن کے اُوپر رُعب رہے، اور ان کو پتا ہو کہ یہ قوم بڑی مسلح ہے، اور اِن کے پاس اتنی قوت ہے کہ اگر ہم نے اِن کو چھیڑا تو ان کا پنجہ کمزور پنجہ نہیں ہے، آہنی پنجہ ہے کہ اگر ہم نے اِن کے ساتھ پنجہ ڈالا تو یہ ہمارا بازو مروڑ دیں گے، اس طرح سے دشمن کے اُوپر رُعب ڈال کے رکھنا یہ بھی ایک احتیاطی پہلو ہے، اگر اپنی کمزوری دشمن کے سامنے نمایاں ہو تو دشمن دلیر ہوجاتا ہے، اُس کے حوصلے بڑھتے ہیں، اور اگر اپنا زورِ جنگ نمایاں کر کے رکھا جائے تو دشمن کے اُوپر رُعب پڑتا ہے، اور اِس سے بھی انسان بچتا ہے، یہ بھی ایک بچاؤ کی تدبیر ہے، تو خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے اندر یہ ساری باتیں آ گئیں، کہ اپنی احتیاط اختیار کرو، اپنا بچاؤ اختیار کرو، اپنے تحفظ کی تدبیر سے غافل نہ بنو۔ آگے تمہیں دونوں طرح سے اجازت ہے، اگر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں، چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں کسی طرف جانے کا موقع محل ہو تو اس کی بھی اجازت ہے فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ: چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں جاؤ، اَوِانْفِرُوْا جَمِيْعًا: اور اگر اکٹھے جانے کا کوئی موقع ہو تو سارے جمع ہو کر لشکر کی شکل میں جاؤ، دونوں باتوں کی اجازت دے دی گئی، امامِ وقت جس طرح سے مصلحت سمجھے اُس طرح سے کُفر کے مقابلے میں جہاد کے لئے مسلمانوں کو روانہ کرسکتا ہے، اگر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں، گوریلا وار اور چھاپہ مار جنگ کرنی ہو، اِس میں مصلحت ہو تو یوں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور اعلان کر کے باقاعدہ لشکروں کی شکل میں بالمقابل ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے کا موقع ہو تو ایسا بھی کیا جاسکتا ہے۔

خودغرض اور مفاد پرست لوگوں پر کڑی نظر رکھنے کی تاکید

جس وقت جہاد کا حکم آ گیا، اور یہ حکم مدینہ منورہ میں آیا تھا، تو ہر شخص کا مزاج ایک جیسا نہیں ہوتا، بعضوں کے دل کمزور ہوتے ہیں، بعضوں کے قوی ہوتے ہیں، بعضوں میں اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے، اور بعضوں میں اخلاص کی کمی ہوتی ہے،

اور مدینہ منورہ میں تو واقع کے مطابق بعض منافق بھی تھے جو صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتے تھے، اور ان کو جماعتی مصلحت، مذہبی فائدہ، اسلام کی بالادستی، اِس قسم کی چیزوں سے کوئی غرض نہیں تھی، اور آپ کے سامنے تفصیل آئے گی خاص طور پر سورۂ براءت میں، کہ وہ لوگ جہاد سے جان چھڑانے کی کوشش کس کس طرح سے کرتے تھے، اِس کی پوری تفصیل آپ کے سامنے سورۂ براءت میں آئے گی، اللہ تعالیٰ یہاں بھی اشارہ فرماتے ہیں، اور نسبت ہے تمام مؤمنین کی طرف جماعتی حیثیت سے، کیونکہ جب کسی جماعت کے اندر ایک دو فرد بھی ایسے ہوں تو اُن کی تعیین کر کے کہنے کی بجائے یونہی کہا جاتا ہے کہ تم میں بعضے لوگ ایسے بھی ہیں، بعضے ایسے بھی ہیں، بعضے ایسے بھی ہیں، تو جن کے اندر یہ بیماری ہوگی خود سمجھ جائیں گے کہ یہ ہماری نشاندہی کی جارہی ہے، تو نسبت جماعت کی طرف ہی ہوگی کہ تمہاری جماعت میں ایسے لوگ ہیں، ایسے نہیں ہونے چاہئیں، تمہاری جماعت میں ایسے لوگ ہیں، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں، اِن کے ایسے جذبات ہیں، تو جب یوں تبصرہ کیا جائے گا تو جس کے اس قسم کے جذبات ہوں گے اُس کو اپنے دل کا چور خود ہی معلوم ہو جائے گا، اور وہ سمجھ جائے گا کہ اِن آیات میں میرا تذکرہ ہو رہا ہے، اور ویسے کلیۃً ساری جماعت محتاط ہو جائے گی کہ ہمارے اندر ایسے لوگ بھی ہیں جو خود غرض قسم کے ہیں، اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہیں، تو پھر اُن پر کڑی نظر رکھی جائے تاکہ کسی موقع پر اپنے مفاد کی خاطر ہمیں نقصان نہ پہنچادیں، اِس قسم کے لوگوں کو پہچان کر رکھنا اور ان کے اُوپر نگرانی کرنا یہ بھی ایک جنگی مصلحت ہے، تو یہاں اِسی اُصول کے تحت جماعت کی طرف نسبت کر کے ذکر کیا جارہا ہے کہ تم میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو پیچھے کو ہٹتے ہیں، جب جہاد کا موقع آتا ہے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، مختلف قسم کے عذر کر کے گھروں میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں، لڑائی میں حوصلے کے ساتھ شریک نہیں ہوتے، اُن کے جذبات لڑنے مرنے کے نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے راستے میں وہ جان فدا نہیں کر سکتے، جب کوئی موقع آتا ہے تو ڈھیلے ہو جائیں گے، سست ہو جائیں گے، پیچھے کو ہٹ جائیں گے، آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

خودغرض لوگوں کی پہچان

اور پھر ڈر کے گھر میں دبک تو گئے، بیٹھ گئے، لڑائی کے لئے نہیں نکلے، اب آگے دو حال ہیں، کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو جماعت جہاد پہ گئی تھی وہاں کوئی تکلیف اُٹھا کر آگئی، ایسا بھی ہوسکتا ہے، مالِ غنیمت حاصل نہیں ہوا اور بدنی تکلیف پہنچ گئی، لڑائی میں تو ایسے ہوتا ہی ہے، جس طرح سے روایات میں آتا ہے: ''اَلْحَرْبُ سِجَالٌ''(1) کہ لڑائی کا معاملہ تو ڈانواں ڈول ہی ہوتا ہے، کبھی کسی نے ڈول بھر لیا کبھی کسی نے بھر لیا، کبھی کسی کو تکلیف ہوگئی، کبھی کسی کو فائدہ پہنچ گیا، تو یہ معاملہ ڈانواں ڈول ہی ہوتا ہے، تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو جماعت جہاد پر جائے اور وہ کوئی نقصان اُٹھا کر آجائے، مالِ غنیمت حاصل نہ ہو، تو ایسا موقع جس وقت آتا ہے تو پھر یہ لوگ جن کے دل کے اندر اپنی مفاد پرستی ہے، مذہب کے لئے لڑنا مرنا وہ نہیں جانتے، ہر وقت اپنے فائدے کو سوچتے ہیں، تو پھر وہ بغلیں بجاتے ہیں، کہتے ہیں دیکھا! ہم کیسے ہوشیار نکلے کہ پیچھے رہ گئے، اگر ہم ساتھ ہوتے تو یہی مصیبت ہمیں بھی پہنچ جاتی،

---

(1) غزوۂ اُحد کے موقع ابوسفیان نے یہ جملہ کہا تھا۔ بخاری ۲/ ۵۷۹ باب غزوۃ اُحد۔ وغیرہ۔

ایسے موقع پر اپنے پیچھے ہٹنے پر اور پیچھے رہنے پر وہ خوشیاں مانتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا اتفاق ہو جائے کہ جو جماعت گئی تھی وہ بغیر کسی نقصان اُٹھانے کے کامیاب ہو کر آ گئی، انہوں نے فتح پالی، مالِ غنیمت حاصل ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے کامیابی دے دی، تو جب یہ حال پیش آتا ہے تو پھر ان کو اپنے پیچھے رہنے پر افسوس ہوتا ہے، کہ بڑی غلطی ہوئی، ضرور جانا چاہیے تھا، دیکھو! تکلیف تو ہوئی نہیں اور اِن لوگوں کو اتنا مال مل گیا، کیونکہ جو غنیمت آتی تھی وہ حضور ﷺ غانمین میں تقسیم کرتے تھے، تو پھر ہاتھ ملتے ہیں، افسوس کرتے ہیں کہ بڑی غلطی ہوئی، ہمیں ساتھ چلنا چاہیے تھا، دیکھو! بالکل کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور اتنا فائدہ ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اُن کی یہ باتیں ایسے انداز میں ہوتی ہیں جیسے ان کا تمہارے ساتھ کوئی محبت کا معاملہ ہے ہی نہیں، ان کی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں ہی نہیں، وہ تمہیں اپنا سمجھتے ہی نہیں۔ کیونکہ جب کسی کے ساتھ محبت کا معاملہ ہوتا ہے، شخصی طور پر یا جماعتی طور پر دونوں طرح سے ہی، تو جب اُس شخص کو جس کے ساتھ ہمارا محبت کا معاملہ ہے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو انسان خوش ہونے کی بجائے اُس کی تکلیف میں شریک ہوتا ہے، اُسی طرح سے رنجیدہ ہوتا ہے، غم کرتا ہے، افسوس کرتا ہے کہ میرے دوست کو یا میری جماعت کو یہ نقصان پہنچ گیا ہے، اُس کا دل اسی طرح سے ٹوٹتا ہے گویا کہ اُس کا شخصی معاملہ ہے، شکست جماعت نے کھائی ہے لیکن یہ دکھ ایسے ہی محسوس کرتا ہے کہ جیسے اِس نے خود شکست کھائی ہے، زخمی اس کا بھائی ہوا، میدان کے اندر مارا گیا اس کا بھائی، لیکن اس کو تکلیف اس طرح سے ہے جیسے یہ خود زخمی ہو کر آیا ہے اور اس کی جان چلی گئی۔ جب محبت کا معاملہ ہوتا ہے تو انسان دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہے، جو مخلص لوگ ہوا کرتے ہیں جماعت کو نقصان پہنچنے کی صورت میں ان کو ایسے ہی صدمہ ہوتا ہے اور افسوس ہوتا ہے جیسے کہ ان کا ذاتی نقصان ہو گیا، اور اگر وہ کامیاب ہو جائیں اور میدان کو جیت لیں، مالِ غنیمت حاصل ہو جائے، چاہے بظاہر کامیاب وہی ہوئے ہیں لیکن ہم اُس کو جماعتی کامیابی قرار دیتے ہوئے اپنی کامیابی قرار دیں گے، اور اسی طرح سے خوشیاں منائیں گے جس طرح سے ذاتی فتح پانے والوں نے خوشی منائی، جب محبت کا معاملہ ہوتا ہے تو محبت کے آثار یہ ہیں کہ دوست دوست کی تکلیف میں شریک ہوتا ہے، راحت میں شریک ہوتا ہے، اُس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہے، اُس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے، اور یہ کوئی دوستی نہیں کہ دوسرے کی تکلیف پر خوشی منائی جائے کہ اچھا ہوا کہ اس کا رگڑا نکلا اور میں بچ گیا، اور اگر اُس کو کوئی کامیابی حاصل ہو جائے فائدہ حاصل ہو جائے تو انسان حسد میں مبتلا ہو کہ یہ کامیاب کیوں ہو گیا، اس میں تو میری شرکت چاہیے تھی، مجھے فائدہ پہنچنا چاہیے تھا، یہ جذبات اگر کسی شخص کے اندر پاؤ تو پہچان جایا کرو کہ یہ خود غرض ہے، اس کو اپنے مفاد سے غرض ہے، اِس کا تمہارے ساتھ کوئی محبت کا برتاؤ نہیں، محبت کے آداب میں سے یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ اپنی غرض کو سامنے رکھو، تم بچ گئے تو تم اس پر خوش ہو، چاہے دوسرا زخمی ہو جائے، اور تمہیں کچھ نہیں ملا تو تمہیں افسوس ہے، چاہے دوسرے کو کتنی فتح حاصل ہو جائے، ایسے موقعوں پر غمی خوشی کے ساتھ شریک نہ ہونا یہ دوستی کے آداب کے خلاف ہے، ایسے لوگوں کو تاڑ کے رکھنا چاہیے، یہ مطلب پرست ہوتے ہیں، خود غرض ہوتے ہیں، آج کل کے محاورے کے مطابق یہ دُودھ پینے والے مجنوں ہوتے ہیں، خون دینے والے مجنوں نہیں ہوتے، تو ایسے مجنوں ہمیشہ اپنے ہی مطلب کی سوچتے ہیں، ان کو دوسرے سے کوئی غرض نہیں ہے۔

خودغرضوں کی نشاندہی سے مقصود

تو اللہ تعالیٰ جماعت کے اندر ایسے افراد کی نشاندہی کرتا ہے کہ تمہارے اندر ایسے لوگ بھی موجود ہیں، تو ایک تو جن کے یہ جذبات ہیں ان کی اصلاح ہو جائے گی کہ یہ تو ہمارے دل کا چور پکڑا گیا، ہم نے تو اپنے دل کے جذبات کسی کو بتائے نہیں ہیں، لیکن دیکھو! قرآنِ کریم میں یہ بات آ گئی اللہ کی کلام ہے، اللہ علیم بذات الصدور ہے، اور ہمارے دل کے چور کی نشاندہی ہو گئی، اس سے ان کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے، اور اپنی غلطی پر وہ متنبہ ہو سکتے ہیں۔ اور اگر وہ متنبہ نہیں ہوں گے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چوکنا کر دیا گیا کہ تم بے خبر نہ ہو، تمہاری جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں، اور ان کو تاڑ کر رکھا کرو، یہ اپنے مفاد کی خاطر کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچا دیں، تو اس قسم کے لوگوں کو تاڑ کے رکھنا اور ان کی نگرانی کرنا یہ بھی ایک جنگی مصلحت ہے، ورنہ اس قسم کے لوگ اپنے مفاد کی خاطر پوری کی پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں، تو یہ نشاندہی یہاں کی گئی ہے۔

وَاِنَّ مِنْكُمْ: کم کا خطاب جماعت کو ہے کہ جماعت کے اندر اس قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ''بے شک تم میں سے بعض البتہ وہ ہیں'' مَنْ چونکہ لفظوں کے اندر مفرد ہے اس لئے لَیُبَطِّئَنَّ مفرد کا صیغہ آ گیا، اور معنیٰ اس کا کوئی ایک فرد متعین نہیں ہے، جمع ہے، اس لئے ترجمہ جمع کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ''تم میں سے بعض وہ لوگ بھی ہیں جو جہاد کا حکم آ جانے کے موقع پر سستی کرتے ہیں، پیچھے کو ہٹتے ہیں، ڈھیلے پڑ جاتے ہیں'' یا ''تم میں سے کوئی ایسا شخص بھی ہے جو ایسا کرتا ہے'' مفرد کے ساتھ بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ''پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے تو کہتا ہے کہ اللہ نے میرے پہ انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ حاضر نہیں تھا'' میں جہاد میں نہیں گیا، میدان میں نہیں گیا، ورنہ یہ نقصان مجھے بھی پہنچتا، گویا کہ اس کا اپنا تکلیف سے بچ جانا اس کے لئے خوشی کا باعث ہے، اور تمہیں جو تکلیف پہنچ گئی اس کا اسے کوئی رنج نہیں ہے، خوشی اس بات پر ہے کہ میں وہاں نہیں تھا ورنہ میرا بھی رگڑا نکل جاتا، تو تمہاری غمی میں شریک نہیں، تمہاری مصیبت کو اپنی مصیبت نہیں سمجھتا ''اور اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فضل مل جاتا ہے'' مال غنیمت حاصل ہو گیا، فتح ہو گئی، اللہ نے عزت اور دولت عطا فرما دی، ''تو پھر وہ کہتا ہے کہ ہائے کاش!'' یعنی پھر وہ حسرت کے ساتھ اپنے ہاتھ کاٹتا ہے کہ میں ساتھ کیوں نہ گیا، مجھے ساتھ جانا چاہیے تھا تاکہ میں بھی کامیابی حاصل کر لیتا، اور یہ باتیں اس کی اس انداز کی ہیں گویا کہ تمہارے اور اُس کے درمیان کوئی محبت کا رشتہ ہے ہی نہیں، کوئی ہمدردی نہیں تمہارے ساتھ، کوئی خیر خواہی نہیں، اگر محبت کا رشتہ ہوتا، محبت کا تعلق ہوتا تو وہ تمہاری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا، اور تمہاری فتح کو اور تمہاری خوشی کو یہ اپنی فتح اور اپنی خوشی سمجھتا، محبت کا رشتہ ہو تو جذبات ایسے ہوتے ہیں، اور یہ ساری کی ساری باتیں اس کی خودغرضی کی وجہ سے ہیں، آپس میں محبت کا رشتہ نہیں ہے۔

جہاد کی فضیلت، ترغیب اور مقصد

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ دونوں طرح سے اس کا ترجمہ ہے، کہ یہ کامیابی صرف تمناؤں سے حاصل نہیں ہوا کرتی، گھر بیٹھے تمنا کرتے رہو کہ میں بھی کامیابی حاصل کر لیتا، میں بھی کامیاب ہو جاؤں، تمناؤں سے کامیابی نہیں حاصل ہوا کرتی، جو کامیابی حاصل کرنے کا متمنی ہے اُسے چاہیے کہ اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے ساتھ لڑے جو دُنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں

اختیار کرتے ہیں، اس سے مراد کافر ہیں، اس کو کافروں کے ساتھ اللہ کے راستے میں لڑنا چاہیے، اللہ کی رضا کے لئے لڑنا چاہیے، تب جا کے کامیابی حاصل ہوگی، کامیابی گھر بیٹھ کر تمنا کرنے سے نہیں ملا کرتی، جب وہ کافروں سے لڑے گا تو اس لڑنے کی صورت میں فوزِ عظیم حاصل ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے، اللہ نے یہ قاعدہ قانون بنا دیا ہے کہ جو بھی اللہ کے راستے میں لڑتا ہے، یعنی اللہ کی رضا کے لئے، کیونکہ اللہ کے راستے میں لڑائی وہی ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہے، اللہ کی بات کو اُونچا کرنے کے لئے، اللہ کو خوش کرنے کے لئے ہو، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کوئی شخص تو بہادری دکھانے کے لئے لڑتا ہے، کوئی شہرت حاصل کرنے کے لئے لڑتا ہے، کوئی جماعتی عصبیت کی بنا پر لڑتا ہے، اُس کی طبیعت میں یہی بات ہے کہ چونکہ ہماری جماعت لڑ رہی ہے لہٰذا ہم بھی لڑ رہے ہیں، ان میں سے فی سبیل اللہ کون سی لڑائی ہے؟ ''مشکوۃ شریف'' کتاب الجہاد میں یہ روایت موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ''[1] جو شخص اس جذبے کے تحت لڑتا ہے تاکہ اللہ کی بات اُونچی ہو جائے، دینِ حق کے غلبے کی نیت کے ساتھ لڑتا ہے یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، بہادری دکھانے کے لئے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے اور اس قسم کے مقاصد کے تحت جو لڑائیاں ہوا کرتی ہیں یہ فی سبیل اللہ نہیں ہیں، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے لڑو اور دین کی بالا دستی کے لئے لڑو۔ جو بھی اللہ کے دین کے لئے لڑے گا، اللہ کے راستے میں لڑے گا، اللہ کی بات کو اُونچا کرنے کے لیے لڑے گا پھر آگے دونوں صورتیں ہی ہیں، کہ چاہے وہ میدان میں مقتول ہو جائے، جس کو بظاہر دیکھنے والے دُنیا کے اندر ناکامی سمجھتے ہیں، اور چاہے وہ غالب آ جائے جس کو دُنیا والے بھی کامیابی سمجھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اِس مجاہد کی دونوں صورتیں ہی کامیابی کی ہیں، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے میدان میں چلا جائے، جس وقت میدان میں چلا گیا اب آگے دونوں صورتیں ہیں، چاہے مقتول ہو جائے چاہے غالب آ جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے اجرِ عظیم حاصل کرنے کے لئے میدان میں غالب آنا ہی ضروری نہیں، نیک نیتی کے ساتھ میدان میں پہنچ جانا ضروری ہے، کسی شاعر نے اپنے اُردو کے شعر میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

بنیں ہم نہ ہندی نہ ترکی نہ قاضی — بنا لیں بس اپنے کو سچا حجازی
ہی پھر بہر حال لے جائیں بازی — مریں تو شہید اور ماریں تو غازی

کہ اگر مر گئے تو شہید اور مار آئے تو غازی، پھر بازی بہر حال ہماری ہے۔ تو یہاں یہی بات ہے دونوں صورتیں ذکر کر دیں، فَيُقْتَلْ مقتول ہو جائے اَوْ يَغْلِبْ: یا غلبہ پالے فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا: دونوں صورتوں میں ہم اسے اَجرِ عظیم دیں گے، تو کامیابی ہی کامیابی ہے، پھر اس راستے میں ناکامی نہیں بشرطیکہ اللہ کی رضا کے لئے انسان میدان میں اتر آئے۔

یہ تو ترجمہ کیا میں نے آپ کے سامنے اَلَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ کو مفعول بنا کر، اور ''بیان القرآن'' میں یہی ترجمہ اختیار کیا گیا ہے۔ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو فاعل بنایا ہے، تو پھر يَشْرُونَ بیچنے کے معنی میں ہوگا، ''پس چاہیے کہ لڑیں اللہ کے راستے میں وہ لوگ جو دُنیوی زندگی کو بیچتے ہیں آخرت کے بدلے'' جن میں یہ جذبہ ہے کہ ہم دُنیوی زندگی کو قربان کر کے

---

(۱) بخاری ۱۱۱۱/۲ باب قول اللہ ولقد سبقت الخ۔ نیز ۲۳/۱ وغیرہ/مشکوۃ ۳۳۱/۲، کتاب الجہاد فصل اول۔ نیز ترمذی ۲۹۳/۱۔

آخرت حاصل کریں، جو آخرت کے طالب ہیں، ان کو چاہیے کہ اللہ کے راستے میں لڑائی لڑیں، اللہ کے راستے میں جہاد کریں، آخرت کو طلب کرنے کا یہی ایک سیدھا راستہ ہے، جن کو آخرت مطلوب ہے ان کو چاہئے کہ اللہ کے راستے میں لڑیں، ''اور جو بھی اللہ کے راستے میں لڑے گا پھر مقتول ہو جائے یا غالب آجائے پس عنقریب ہم اُس کو اَجرِ عظیم دیں گے۔''

اگلی آیت ترغیب جہاد کے لئے ہے۔ وَمَا لَكُمْ: تمہیں کیا ہو گیا؟ یعنی تمہیں کیا مانع ہے، تمہیں کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہیں کرتے حالانکہ داعیہ موجود ہے۔ وہ کیا؟ خاص طور پر مکہ معظمہ میں، اور ایسے ہی بعض دوسری بستیوں میں بھی بعض لوگ ایمان لے آتے اور ہجرت نہ کر سکتے یا تو اس لیے کہ ان کے پاس ہجرت کا سامان نہیں، یا اس لئے کہ کافروں نے پکڑ کر گرفتار کر لیا، باندھ کر ڈال دیا، پٹائی ہوتی ہے، ظلم ہوتا ہے، مار پڑتی ہے، جیسے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں آپ پڑھتے ہیں، مکہ معظمہ میں جو کچھ ہوتا تھا، جیسے بچے اور عورتیں ہیں، وہ اکیلے ہجرت کرنے پر قادر نہیں ہیں، ان کو اَسباب مہیا نہیں ہیں، وہ بھی کافروں کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، اور اسی طرح بالغ مرد چاہے وہ قوت والے ہیں، لیکن کافروں نے ان کو پکڑ لیا گرفتار کر لیا اور باندھ لیا، یہ اللہ کے نام پر ان بستیوں میں ماریں کھا رہے ہیں، جن میں بالغ مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں اور نابالغ بچے بھی ہیں، ان کو چھڑانے کا طریقہ تمہارے پاس سوائے جہاد کے کیا ہے؟ اس لیے جہاد کرو، کافروں پر غلبہ پاؤ، ان ظالموں کا پنجہ مروڑ دو جو صبح شام ان کمزوروں پر ظلم کر رہے ہیں، اور ان کو ان کے ظلم سے چھڑاؤ، جب تمہارے ہی بھائی اور اللہ کے نام لیوا ہیں، جن کے ساتھ تمہارا مذہبی رشتہ ہے، جب تمہیں پتا ہے کہ بستیوں میں ان پر ظلم ہو رہا ہے، تو یہ ایک قسم کی بہت بڑی کمزوری کی علامت ہے کہ تم اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہو اور انہیں اس ظلم وستم سے چھڑانے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جہاد ایک یہ بھی ہے کہ کمزوروں کی مدد کی جائے اور کمزوروں کو ظالموں کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی جائے، یہ بھی جہاد کا ایک داعیہ ہے، جیسے اگر کوئی شخص تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو اپنا دِفاع کرنا یہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے، تمہیں کوئی جان سے مارنا چاہتا ہے تو تم اس سے بچنے کے لئے اس سے لڑتے ہو اپنی جان بچانے کے لئے، یا تم سے کوئی مال چھیننا چاہتا ہے تو تم اپنے مال کو بچانے کے لئے اس سے لڑتے ہو، یا تمہیں کوئی دِین بدلنے پر مجبور کرتا ہے تو تم اپنے دِین کو بچانے کے لئے اُس سے لڑتے ہو، یہ تمام صورتیں جہاد کی ہیں، اور ان میں اگر انسان اپنی جان دے بیٹھے تو اللہ کے ہاں شہید ہے، جیسے حدیث میں ہے: ''مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ''[1] اپنا دِین بچانے کے لئے لڑتے ہوئے مر جاؤ تو بھی تم شہید، اپنی جان بچانے کے لئے لڑتے ہوئے مر جاؤ تو بھی شہید، اور اپنا مال بچانے کے لئے لڑتے ہوئے مر جاؤ تو بھی شہید، یہ ساری شہادت کی صورتیں ہیں، اسی طرح کمزور مسلمانوں کی امداد کے لئے کافروں سے لڑنا تاکہ ان کمزور مسلمانوں کو کافروں سے چھڑا لیا جائے یہ بھی جہاد ہے، اور اُس وقت یہ قوی داعیہ موجود تھا کہ تم مدینہ منورہ میں پُر امن بیٹھے رہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، جہاد کرو تاکہ اردگرد کے کمزور مسلمان ان ظالموں سے نجات پائیں۔ ''تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کے راستے میں نہیں لڑتے، اور ان کمزور کو چھڑانے کے لئے نہیں لڑتے، وہ کمزور مرد بھی

(۱) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۰۶ باب ما یضمن من الجنایات، فصل ثانی، عن سعید بن زیدؓ۔ واللفظ لہ / ترمذی ۲۶۱/۱ باب ما جاء فیمن قتل دون مالہ۔

ہیں، عورتیں بھی ہیں، بچے بھی ہیں، جو یوں اللہ کے سامنے فریاد کررہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔"

ایمان کی خاطر وطن بھی قُربان کیا جاسکتا ہے

اب یہاں دیکھئے، قریۃ کا اصل مصداق مکہ معظمہ ہے، اور اسی کے حکم میں ہوں گی وہ بستیاں جو اردگرد تھیں اور ان میں کوئی بھی ایمان والا کافروں کے ہاتھ میں مظلوم تھا وہ بھی اسی کے حکم میں ہوں گی، مکہ معظمہ جیسا شہر جس میں اللہ کا گھر موجود ہے، اور ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق بھی مضبوط ہوتا ہے، اس لئے اہل ایمان کے نزدیک مکہ معظمہ محبوب ترین شہر تھا، سرورِ کائنات ﷺ نے جس وقت ہجرت کی ہے، فضائل مکہ معظمہ کے اندر یہ روایت حدیث شریف میں آتی ہے، کہ حضور ﷺ نے باہر نکل کر ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مکہ معظمہ کی طرف دیکھا اور اس کو خطاب کر کے کہا کہ تو سب شہروں سے اچھا شہر ہے اور تو تمام شہروں سے مجھے زیادہ محبوب ہے، اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں تیرے علاوہ کسی دوسرے شہر میں رہنا گوارا نہ کرتا۔[1] اس سے کتنا قوی تعلق معلوم ہوتا ہے اس شہر کے ساتھ، اور ویسے بھی لوگ کہا کرتے ہیں: "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ" وطن کی محبت بھی ایمان کی علامت ہے، اور طبعی طور پر انسان کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے، انسان جہاں کی پیداوار ہوتا ہے اور جہاں کھا پی کر جوان ہوتا ہے تو اپنے علاقے کے درو دیوار سے محبت ہوتی ہے، سفر میں آپ چلے جائیں تو باہر آپ پھرتے رہیں، کتنے اچھے اور کتنے ہی خوبصورت شہر ہوں گے، لیکن جس وقت لوٹ کر آپ اپنی کچی بستی میں آئیں گے تو اس وقت آپ کو طبیعت میں ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا ہے، لیکن جس وقت انسان ایمان قبول کر لیتا ہے تو اولیت ایمان کو حاصل ہے، ایمان کی خاطر وطن قربان کیا جاسکتا ہے، وطن کی خاطر ایمان کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔

جذبۂ وطنیت کا فتنہ اور اِسلام کی تعلیم

اس لئے جذبۂ وطنیت جذبۂ ایمان کے تابع ہونا چاہیے تب تو ہے اسلام، اور اگر جذبۂ اسلام وطنیت کے تابع ہو گیا اور وطنیت اصل قرار پاگئی تو پھر یہ اسلام نہیں بلکہ یہ کُفر کا شعبہ ہے، اور آج سب سے بڑی خرابی جو آرہی ہے مسلمانوں میں بھی وہ یہی جذبۂ وطنیت ہے، کہ اس جذبۂ وطنیت کے تحت اپنے ہم وطنوں کو ترجیح دیتے ہیں چاہے کافر ہی کیوں نہ ہوں، اور جو اپنے ہم وطن نہیں ہیں چاہے مؤمن ہی کیوں نہ ہوں ان کو ترجیح نہیں دیتے، بنگلہ دیش میں کیا ہوا؟ جس وقت بنگلہ دیش کی تحریک چلی تھی، آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ مسلمان بنگالیوں کے نزدیک بنگالی ہندو قابلِ قدر تھا، اور غیر بنگالی مسلمان کا خون بہادیا، کتنے بہاری مارے گئے اور کتنے ہی لوگ تھے دوسرے صوبوں کے رہنے والے جن کو قتل کردیا صرف اس وجہ سے کہ وہ بنگالی نہیں ہیں، یہ ہے جس کو جذبۂ وطنیت کہتے ہیں، اور آج سب سے بڑا فتنہ یہی جذبۂ وطنیت ہے کہ بنگالی ہونے کی صورت میں بنگالی ہندو کو تو گوارا کریں گے،

(۱) ترمذی ۲/ ۲۳۰، باب فی فضل مکۃ/ مشکوۃ ۱/ ۲۳۸، باب حرم مکۃ، فصل ثانی۔ ولفظہ: مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكِ إِلَيَّ وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ... الخ.

وہ توان کا بھائی ہے،"وطنی بھائی"، لیکن جن کے ساتھ اسلامی رشتہ ہے یہ بات مؤخر ہوگئی، اور یہی جذبات سندھ میں نشوونما پار ہے ہیں کہ سندھیوں کے نزدیک ہندو سندھی قابلِ قدر ہے، اس کی جان مال اور عزّت کی حفاظت وہ کریں گے، اس کو اپنا سمجھتے ہیں، اور غیر سندھی مسلمان بھی ہو تو ان کے نزدیک واجب القتل ہے، جب فساد ہوتا ہے اسی حیثیت سے ہوتا ہے، یہ ہے ایک مشرکانہ جذبہ، یعنی وطن کو اتنی اہمیت دے دی کہ اس کے مقابلے میں ایمان والا رِشتہ کوئی رشتہ نہ رہا۔ اور اسلام نے جو تعلیم دی ہے وہ یہ ہے کہ اصل رشتہ ایمانی رشتہ ہے، اور اصل چیز دِین اور ایمان ہے، وطن کے ساتھ اس وقت تک تعلق رکھا جاسکتا ہے جس وقت تک کہ اپنا عقیدہ اور اپنا ایمان محفوظ ہے، اور اگر ایمان محفوظ نہ ہو تو وطن چاہے کتنی نسلوں اور پشتوں سے کیوں نہ چلا آرہا ہو پھر وطن ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی درندوں کی بستی ہے، یہاں رہنے کے لئے ہمارے پاس کوئی گنجائش نہیں، پھر انسان بیتاب ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ کسی طریقے سے میں یہاں سے نکل جاؤں، اور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں جا کر میرا ایمان اور عقیدہ محفوظ رہ جائے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ کلمہ پڑھنے والوں کے دل میں وطنیت کی کیا قدر تھی اپنے دین اور ایمان کو بچانے کے لئے، کہ اپنا وہی وطن جو محبوب ترین شہر ہے وہ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا معلوم ہوتا ہے، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی کے رہنے والے تو درندے ہیں، یہاں رہنے کا فائدہ کیا؟ یہاں تو ہم رہ سکتے ہی نہیں، اور چیختے ہیں کہ یا اللہ! کوئی اسباب ایسے مہیا کردے کہ ہم یہاں سے نکل کر بھاگ جائیں، تو اس عقیدۂ ایمان کے تحت وطنیت مغلوب ہوگئی، اور یہی اصل کے اعتبار سے اسلام کی تعلیم ہے کہ مقصود ایمان ہے، اور اصل رشتہ ہمارا انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو ہمارے ایمانی بھائی ہیں، وطن کوئی چیز نہیں ہے، کوئی حبشہ سے آگیا وہ بھی ہمارا بھائی ہے، کوئی رُدم سے آگیا وہ بھی ہمارا بھائی ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی تھے اور ان کو وہی قدر و قیمت حاصل تھی جو مکہ والوں کو حاصل تھی، اور اسی طرح جو دوسرے علاقوں سے آگئے ان کو وہی اہمیت حاصل ہوتی تھی جو مدینہ کے رہنے والوں کو حاصل تھی۔ وطنیت کی بناء پر کسی سے نفرت کرنا اور عقیدے کو بنیاد نہ بنانا اسلام کی تعلیم نہیں ہے، اور عرب کے اندر کیا ہوا؟ ترکوں کے ساتھ جو لڑائیاں ہوئیں، ترکوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں، انگریز عیسائیوں نے اسی چیز کو تو ہوا دی تھی، وطنی جذبہ، کہ عرب کے اُوپر غیر عرب حکومت کیوں کرے؟ اور اسی سے سب جگہ بغاوت کرادی، اور خلافت کا معاملہ سارے کا سارا درہم برہم کر کے رکھ دیا، تو یہ توڑ پھوڑ کرنے والی چیز ہے، مسلمانوں کی جماعت کبھی منظم نہیں رہ سکتی اگر اس کے اندر وطنی جذبہ پیدا ہو جائے، بلکہ جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ جن کے ساتھ کلمے اور ایمان کا رِشتہ ہے وہ ہمارے بھائی ہیں، چاہے کسی وطن کے رہنے والے ہوں، اور رہنے کے قابل وطن وہی ہے جس میں ایمان اور عقیدہ محفوظ ہو، جس میں ایمان اور عقیدہ محفوظ نہیں ہے وہ رہنے کے قابل نہیں ہے، کتنی نسلوں سے کیوں نہ چلا آرہا ہو وہ تَرک کرنے کے قابل ہے۔ یہاں وہی جذبہ نمایاں ہے،" کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! نکال ہمیں اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں" وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا: یہ بھی دیکھو! ان کی مجبوری مِنْ لَّدُنْكَ یعنی ظاہری طور پر تو کوئی اسباب نہیں ہیں، لیکن تو اپنے پاس سے خاص طور پر ہمارا کوئی حمایتی پیدا کردے، اور ہمارے لئے کوئی اپنے پاس سے مددگار پیدا کر، یہ ظاہری اسباب کی طلب ہے کہ ظاہری طور پر کوئی ہمارے حمایتی کھڑے کردے، ہمارے لئے مددگار کھڑے کردے، جو ہمیں ان ظالموں سے بچالیں۔ تو یہ ترغیب دی جارہی ہے ان اہلِ ایمان کو جو مدینہ منورہ میں تھے اور ان کو کچھ امن کی زندگی حاصل تھی، کہ وہ مدد کے لئے پکار رہے

ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ولی اور نصیر مانگ رہے ہیں، تو اللہ کے سپاہی تو دنیا میں تم ہی ہو، چلو اٹھو ان کی مدد کے لئے، اور ان کو کافروں کے پنجے سے چھڑاؤ۔

اولیائے رحمٰن اور اولیائے شیطان

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: ایمان والے اللہ کے راستے میں لڑا کرتے ہیں، لڑائی کرتے ہیں وہ اللہ کے راستے میں، اللہ کی رضا کے لئے، اور کافر لڑتے ہیں شیطان کے راستے میں، یہاں طاغوت سے شیطان مراد ہے، یہ بھی ایک ترغیب کا پہلو ہے کہ کافر شیطانی فوج ہے، وہ حزب الشیطان ہے اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (المجادلہ:۱۹) اور مؤمن جو ہیں یہ اللہ کی فوج ہے، فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ: اے اولیاء اللہ! اے اولیاء رحمٰن! تم شیطان کے اولیاء کے ساتھ لڑو، اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا: جب ایک طرف اللہ کی جماعت ہے تو اس کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوگی، دوسری طرف شیطان کی جماعت ہے تو شیطان انہیں بھی تدبیریں سجھائے گا، انہیں بھی تدبیریں بتلائے گا، لیکن یاد رکھو! شیطان کی تدبیریں کمزور ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے مقابلے میں کام نہیں آسکیں گی، اس لئے حوصلے کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے سپاہی سمجھتے ہوئے شیطان کے سپاہیوں کے خلاف لڑائی لڑو، اور یقین کرلو کہ شیطان کی تدبیریں کمزور ہیں، جس وقت تم نیک نیتی کے ساتھ دین کے غلبے کے لئے یا مظلوموں کی حمایت کے لئے مقابلے میں جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہیں حاصل ہوگی اور اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی دے گا۔

سب سے بڑا مکر عورت کا مکر ہے

یہاں دیکھئے! اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (یہ بات بطور لطیفے کے عرض کر رہا ہوں) شیطان کا کید کمزور ہے، اور دوسری جگہ قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (سورۂ یوسف:۲۸) كُنَّ کی ضمیر عورتوں کی طرف لوٹ رہی ہے کہ تمہاری تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے، تم بہت بڑی مکار ہوتی ہو، تو شیطان کی تدبیر کو قرآنِ کریم نے ضعیف کہا، اور كَيْدَكُنَّ کو عظیم کہا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جو ہیں جس طرح حدیث شریف[1] میں ذکر کیا گیا ہے کہ "حَبَائِلُ الشَّيْطَان" ہیں، یہ شیطان کے جال ہیں اور انہی کے ذریعے سے یہ انسانوں کو پھسلاتا ہے، گمراہی کی طرف لاتا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑا فتنہ مردوں کے لئے کوئی نہیں چھوڑا جو مردوں کے لئے نقصان دِہ ہو۔[2] تو جس طرح انسان ہر وقت شیطان کی مکاریوں سے ہوشیار رہتا ہے کہ شیطان کسی مکر اور فریب کے ساتھ ہمیں کسی فتنے میں مبتلا نہ کردے، اسی طرح عورتوں کے معاملات میں بھی انسان کو محتاط رہنا چاہیے، کہ یہ انسان کو بہت جلدی گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں، اور بہت جلدی غلط راستے پر ڈال دیتی ہیں، تو ان کی کید کو قرآنِ کریم میں عظیم کہا گیا جبکہ شیطان کی کید کو ضعیف کہا گیا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر نظر کریں گے تو یوں بھی آپ کہہ سکتے

---

(۱) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۴۴، کتاب الرقاق، فصل ثالث بحوالہ رزین۔

(۲) بخاری ۲/ ۷۶۳ باب مایتقی من شؤم المرأۃ/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۶۷، کتاب النکاح فصل اول

ہیں کہ یہاں کید شیطان کو ضعیف کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی کید اور تدبیر کے مقابلے میں، اور وہاں جو کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ کہا گیا ہے وہ ہے مردوں کی مکاریوں کے مقابلے میں، کہ مکار تو مرد بھی ہوتے ہیں لیکن عورت مکار زیادہ ہوتی ہے اور اس کی تدبیریں زیادہ قوی ہوتی ہیں، تو وہاں مقابلہ مردوں کے ساتھ ہے، اور یہاں مقابلہ شیطان کا اللہ کے ساتھ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جن سے کہا جاتا تھا کہ تم اپنے ہاتھوں کو روک کے رکھو اور نماز قائم کرو

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

اور زکوۃ دیتے رہو پھر جب ان پر لڑنا فرض کردیا گیا تو اچانک ان میں سے ایک فریق

يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا

لوگوں سے ڈرتا ہے جیسے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا، اور انہوں نے کہا اے ہمارے رب!

لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ

کیوں فرض کر دی تو نے ہم پر لڑائی؟ کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں قریب وقت تک؟

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۗ

آپ کہہ دیجئے کہ دُنیا کا سامان تھوڑا ہے، اور آخرت بہتر ہے اُس شخص کے لئے جو تقویٰ اختیار کرے،

وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ

اور نہیں ظلم کیے جاؤ تم تاگا برابر ﴿۷۷﴾ جہاں کہیں تم ہوگے تمہیں موت پالے گی اگرچہ تم

فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ

مضبوط قلعوں میں ہو، اگر پہنچتی ہے انہیں اچھی حالت تو کہتے ہیں کہ یہ

عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۗ

اللہ کی جانب سے ہے، اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی بری حالت تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی جانب سے ہے،

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ

آپ کہہ دیجئے کہ ہر چیز ہی اللہ کی جانب سے ہے، پس کیا ہوگیا ان لوگوں کو یہ بات سمجھنے کے قریب

يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ؗ وَمَآ

بھی نہیں جاتے ﴿۷۸﴾ جو اچھی حالت تجھے پہنچتی ہے پس وہ اللہ کی جانب سے ہے، اور جو

اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ

تجھے بُری حالت پہنچتی ہے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے، اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے،

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

اور اللہ گواہ کافی ہے ﴿۷۹﴾ جو کوئی شخص اطاعت کرے رسول کی پس تحقیق اُس نے اللہ کی اطاعت کی،

وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ؕ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ز

اور جس نے پیٹھ پھیری پس نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر ﴿۸۰﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام تو ماننا ہے،

فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ

جب آپ کے پاس سے باہر نکل جاتے ہیں تو ان میں سے ایک طائفہ خفیہ طور پر مشورہ کرتا ہے سوائے اُس کے جو

تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى

وہ کہہ کر آتا ہے، اللہ تعالیٰ لکھتا ہے ان باتوں کو جو وہ خفیہ طور پر کرتے ہیں، پس آپ ان سے اِعراض کر جایئے اور اللہ پر

اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ

بھروسہ کیجئے، اور اللہ کارساز کافی ہے ﴿۸۱﴾ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ قرآن

مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ

اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے ﴿۸۲﴾ جب ان کے پاس کوئی امر آجاتا ہے

اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ

امن سے یا خوف سے تو اس کو مشہور کردیتے ہیں، اگر لوٹا دیتے یہ اُس امر کو رسول کی طرف

وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ

اور اپنے میں سے صاحبِ امر لوگوں کی طرف تو البتہ جان لیتے اُس امر کو وہ لوگ جو اس کی تحقیق کر لیتے ہیں ان میں سے،

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا

اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے سوائے

قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ

کچھ لوگوں کے ﴿۸۳﴾ پس آپ لڑائی کریں اللہ کے راستے میں، آپ تکلیف نہیں دیے جاتے مگر اپنی جان کی، اور مؤمنوں کو

الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ

برانگیختہ کریں، اُمید ہے کہ روک دے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی لڑائی کو جنہوں نے کُفر کیا، اور اللہ

اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ

زیادہ سخت ہے از روئے لڑائی کے اور زیادہ سخت ہے از روئے سزا دینے کے ﴿۸۴﴾ جو کوئی اچھی سفارش کرے

لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ

تو اُس کے لئے حصّہ ہوگا اُس میں سے، اور جو کوئی بُری سفارش کرے تو اُس کے لئے حصّہ ہوگا

مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا

اُس میں سے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۸۵﴾ جب تم دُعا دیے جاؤ کوئی دُعا تو دُعا دیا کرو

بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

اُس سے اچھے لفظ کے ساتھ یا اسی کو لوٹا دیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محاسب ہے ﴿۸۶﴾

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، البتہ ضرور اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دن کی طرف، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں،

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع

اور کون زیادہ سچا ہے اللہ کے مقابلے میں از روئے بات کے ﴿۸۷﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْۤا اَیْدِیَکُمْ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جن سے کہا جاتا تھا کُفُّوْۤا اَیْدِیَکُمْ: یہ قِیْلَ کا مقولہ ہے، جن سے کہا جاتا تھا کہ تم اپنے ہاتھوں کو روک کے رکھو، کُفُّوْا: امر کا صیغہ ہے، کَفَّ یَکُفُّ: روکنا۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ: اور نماز قائم کرو، وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ: اور زکوٰۃ دیتے رہو، فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ: پھر جب ان پر لڑنا لکھ دیا گیا، فرض کر دیا گیا، اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ: تو اچانک اُن میں سے ایک فریق، یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ: لوگوں سے ڈرتا ہے جیسے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً: یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا، وَقَالُوْا: اور انہوں نے کہا۔ قَالَ کا لفظ جس طرح زبان سے کہنے پر بولا جاتا ہے دل میں خیال آنے پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے، اور یہاں اُن کے جذبات کی ترجمانی ہے، ضروری نہیں کہ یہ بات زبان سے کہی ہو۔ قَالُوْا: کہا انہوں نے، رَبَّنَا: اے ہمارے رَبّ! لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ: کیوں فرض کر دی تو نے ہم پر لڑائی؟ لڑنا ہم پر فرض کیوں کر دیا؟ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ: کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں قریب وقت تک، تھوڑی مدت تک؟ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ: آپ کہہ دیجئے کہ دُنیا کا سامان تھوڑا ہے، وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی: اور آخرت بہتر ہے اس شخص کے لئے جو تقویٰ اختیار کرے۔ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا: فتیل تاگے کو کہتے ہیں، اور تاگا بول کر شئ قلیل مراد ہے، نہیں ظلم کیے جاؤ گے تم تاگا برابر، یعنی کچھ بھی ظلم نہیں کیے جاؤ گے۔ فَتَلَ بٹنے کو کہتے ہیں۔ فتیل: بٹی ہوئی چیز، جیسے رَسّی اور تاگا ہوتا ہے۔ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ: جہاں کہیں تم ہو گے تمہیں موت پالے گی وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ: بروج بُرج کی جمع ہے اور مضبوط اور اُونچی عمارت کے لئے برج کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے قلعہ۔ مُشَیَّدَۃٍ یہ تَشْیِیْد سے ہے، چونا گچ کیا ہوا، مضبوط کیا ہوا۔ شَید یا شِید چونے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمارت کو جوڑا جاتا ہے، جس کی جگہ آج کل ہمارے ہاں سیمنٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ: اگر پہنچتی ہے انہیں اچھی حالت یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ: تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ: اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی بُری حالت یَّقُوْلُوْا: تو کہتے ہیں: ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ: یہ آپ کی جانب سے ہے۔ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ: آپ کہہ دیجئے کہ ہر چیز ہی اللہ کی جانب سے ہے فَمَالِ ھٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ: پس کیا ہو گیا ان لوگوں کو لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا: یہ بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے، نہیں قریب ہوتے کہ سمجھیں بات، مَاۤ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ: جو اچھی حالت تجھے پہنچتی ہے فَمِنَ اللّٰہِ: پس وہ اللہ کی جانب سے ہے، وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ: اور جو تجھے بُری حالت پہنچتی ہے، فَمِنْ نَّفْسِکَ: وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے، وَاَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا: اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے، وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا: اللہ گواہ کافی ہے، بِاللّٰہِ میں باء زائدہ ہے اور اللہ کَفٰی کا فاعل ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ: جو کوئی شخص اطاعت کرے رسول کی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ: پس تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی وَمَنْ تَوَلّٰی: جس نے پیٹھ پھیری فَمَاۤ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظًا: پس نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر، محافظ بنا کر۔ وَیَقُوْلُوْنَ طَاعَۃٌ: اور یہ لوگ کہتے ہیں، طَاعَۃٌ یہ خبر ہے مبتدا محذوف ہے اَمْرُنَا طَاعَۃٌ ہمارا کام تو ماننا ہے، فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِکَ: جب آپ کے پاس سے باہر نکل جاتے ہیں۔ بَرَزَ

بُروز: باہر نکلنا، بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ: بَيَّتَ تَبْيِيْت: رات کو کوئی کام کرنا، اس لیے رات کو چھپ کر مشورے کیے جائیں تو اس کو بھی تبییت سے تعبیر کردیا جاتا ہے، لڑائی کے معاملے میں تبییت کا ذکر آئے تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے شب خون مارنا، رات کو چھپ کر حملہ کرنا، اور پھر رات والے معنی سے اس کو خالی کر کے خفیہ طور پر کسی کام کے کرنے کو بھی تبییت سے تعبیر کردیا جاتا ہے، ماخذ سے اس کو خالی کردیا جاتا ہے، رات والا معنیٰ اس میں چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اَب اس کا مفہوم ہوگا ''ان میں سے ایک طائفہ خفیہ طور پر مشورہ کرتا ہے سوائے اس کے جو وہ طائفہ کہتا تھا''۔ تَقُوْلُ: کی ضمیر طائفہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی آپ کی مجلس میں جو کچھ وہ طائفہ کہہ کر آتا ہے پھر خفیہ مجلسوں میں بیٹھ کر اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، اس کا یہ مفہوم ہے، یعنی مجلس میں تو کہہ کر آئے تھے اَمْرُنَا طَاعَةٌ ہمارا کام تو ماننا ہے، ہم تو فرمانبردار ہیں، سرِ تسلیم خم، جو آپ فرمائیں گے ہمیں تسلیم ہے، ہمیں قبول ہے مجلس میں تو یہ کہہ کر آتے ہیں، اور پھر جب آپ کی مجلس سے اُٹھ کر آتے ہیں تو خفیہ طور پر اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، ''خفیہ طور پر مشورہ کرتا ہے ان میں سے ایک طائفہ غیر اُس کا جو وہ طائفہ کہہ کر آیا ہے'' یعنی اُس بات کے بغیر اور بات کرتے ہیں خفیہ طور پر، وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ: اللہ تعالیٰ لکھتا ہے ان باتوں کو جو وہ خفیہ طور پر کرتے ہیں فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: پس آپ ان سے اِعراض کرجائیے، وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اور اللہ پر بھروسہ کیجئے وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: اللہ کارساز کافی ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ: کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ تدبر کا معنیٰ ہوتا ہے کسی بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ: اگر یہ قرآن اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا، لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا: تو پاتے اِس قرآن میں اختلاف کثیر، بہت اختلاف پاتے۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ: جب ان کے پاس کوئی امر آجاتا ہے امن سے یا خوف سے، یعنی کوئی بات ان کے پاس پہنچتی ہے چاہے وہ بات امن سے متعلق ہو چاہے خوف سے متعلق ہو، اَذَاعُوْا بِهٖ: تو اس کی اشاعت کردیتے ہیں۔ اَذَاعُوْا اِذَاعَة سے لیا گیا ہے اشاعت کے معنیٰ میں۔ ''اس کی اشاعت کردیتے ہیں، اس کو مشہور کردیتے ہیں''۔ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ: اگر رَدّ کردیں وہ اس اَمر کو رسول کی طرف وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ: اور اپنے میں سے اَمر والوں کی طرف، صاحبِ اَمر لوگوں کی طرف، جن کا حکم چلتا ہے، جن کا مشورہ چلتا ہے، اُولِي الْاَمْرِ سے یہاں مراد معاشرے میں ممتاز قسم کے لوگ جن کی رائے پر عام آدمی عمل کرتا ہے، جو معاملات کے اندر صاحبِ رائے سمجھے جاتے ہیں اُولی الامر سے یہاں وہ مراد ہیں، ''اگر لوٹا دیتے یہ اس بات کو رسول کی طرف اور اپنے میں سے صاحبِ اَمر لوگوں کی طرف'' لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ: البتہ جان لیتے اُس امر کو وہ لوگ جو کہ اس کی تحقیق کرلیتے ہیں اُن میں سے، اُن میں سے جو لوگ اس امر کی تحقیق کرلیتے ہیں جن میں تحقیق کا سلیقہ ہے وہ اس کو معلوم کرلیتے کہ یہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں، سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ استنباط کا لفظ اصل کے اعتبار سے کنواں کھود کر پانی نکالنے کے لئے بولا جاتا ہے، جب کنواں کھودا جائے اور نیچے سے پانی نکل آئے تو اس پانی کو کہتے ہیں ماءِ مُستَنبَط۔ اب یہ لفظ اُس معنی سے عام ہوگیا، مختلف باتوں میں غور کرنے کے بعد جو بات سمجھی جاتی ہے اس کو بھی قولِ مستنبط کہا جاتا ہے، یعنی باتوں میں سے نکالی ہوئی بات۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا: تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے سوائے کچھ لوگوں کے، سوائے

کچھ لوگوں کے تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: پس آپ لڑائی کریں اللہ کے راستے میں لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ: آپ تکلیف نہیں دیے جاتے مگر اپنی جان کی وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور مؤمنوں کو برانگیختہ کریں، ترغیب دیں، عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اُمید ہے کہ روک دے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی لڑائی کو جنہوں نے کفر کیا، وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا: اور اللہ زیادہ سخت ہے اَزروئے لڑائی کے وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا: اور زیادہ سخت ہے ازروئے سزا دینے کے۔ نکال سزا کو کہتے ہیں، اور تنکیل: سزا دینا۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً: شفاعة یہ شَفَعَ سے لیا گیا ہے، شَفَعَ جوڑنے کو کہتے ہیں، اس لیے یہ دو رکعت نفل جو آپ پڑھا کرتے ہیں تو اس کو شفعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے مقابلے میں وتر آتا ہے جو دو پر تقسیم نہ ہو، جو کسی کے ساتھ جڑا ہوا نہ ہو اس کو وتر کہتے ہیں، اور جو جڑا ہوا ہو اس کو شفع کہتے ہیں، اب یہ لفظ تائید کرنے پر اور سفارش کرنے پر بھی بولا جاتا ہے، کیونکہ اس میں بھی انسان دوسرے کی رائے کے ساتھ اپنی رائے کو جوڑ کر اس کو قوت پہنچاتا ہے، تائید کا معنی بھی قوت پہنچانا ہوتا ہے، مضبوط کرنا، دوسرے کی رائے کے ساتھ اپنی رائے جو جوڑ دی تو اس کے جڑنے کے ساتھ قوت پیدا ہوگئی، تو اپنی رائے کو دوسری رائے کے ساتھ ملا دینا، کسی کمزور کی حمایت کرنا اور اس کو قوت پہنچانا یہ شفاعت ہے۔ ''جو کوئی اچھی سفارش کرے'' يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا: اس کے لئے حصہ ہوگا اس کے ثواب میں سے، اس کے اجر میں سے، نصیب حصے کو کہتے ہیں۔ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً: اور جو کوئی بُری سفارش کرے يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا: تو اس کے لئے حصہ ہوگا اس میں سے، کِفل بھی حصے کو کہتے ہیں، کِفل اور نصیب ایک ہی چیز ہے، دوسری جگہ بھی یہ لفظ آئے گا: يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (الحدید:۲۸) اپنی رحمت سے دو حصے اللہ دے گا۔ اور مِن کو سببیہ بنا لیا جائے تو ترجمہ ہوگا ''اُس شفاعت حسنہ کے سبب سے اُس کو نصیب ملے گا، اور شفاعت سیئہ کے سبب سے اِس کو حصہ ملے گا''، پہلے نصیب سے مراد نصیب من الأجر اور دوسرے کِفل سے مراد نصیب من الوِزر یعنی گناہ میں سے حصہ ملے گا، وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا: مقیت: مقتدر، قدرت رکھنے والا، اور یہ محافظ اور نگہبان کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، محافظ اور نگہبان ہے۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ: تحیۃ اصل میں تھا: تَحْيِيَة یہ باب تفعیل کا مصدر ہے حَیّٰ یُحَیِّیْ تَحْیِیَةً: کسی کو زندگی کی دُعا دینا، یوں کہنا: حَيَّاكَ اللّٰه، اللہ تعالیٰ تجھے زندہ رکھے، اصل کے اعتبار سے اس لفظ کا یہی معنیٰ ہے، پھر یہ مطلق دُعا کے لئے استعمال ہونے لگ گیا، کسی کو دُعا دینا، اور السلام علیکم کہنا یہ بھی ایک دُعا ہے جس کی بناء پر تحیہ کا لفظ اب سلام کہنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، ''جب تم دُعا دیے جاؤ کوئی دُعا'' جس میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہیں کوئی السلام علیکم کہے، فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ: تو دُعا دیا کرو اس سے اچھے لفظ کے ساتھ اَوْ رُدُّوْهَا: یا اسی کو لوٹا دیا کرو، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محاسب ہے، حساب لینے والا ہے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: البتہ ضرور اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دن کی طرف، جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن کی طرف، یعنی جمع کرے گا تمہیں ہانکتے ہوئے قیامت کے دن کی طرف، یعنی لے جائے گا، لے جا کر سب کو اکٹھا کر دے گا، لَا رَيْبَ فِيْهِ: جس دن کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، کوئی تردّد نہیں، (فِیْهِ کی ضمیر يَوْمِ الْقِيٰمَةِ کی طرف لوٹ رہی ہے) جس کے آنے میں، جس کے واقع ہونے میں کوئی ریب اور تردّد نہیں ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ

حَدِیْثًا: اور اللہ کے مقابلے بات کے اعتبار سے کون زیادہ سچا ہوسکتا ہے، یعنی سب سے زیادہ سچا اللہ ہے، کون زیادہ سچا ہے اللہ کے مقابلے میں از روئے بات کے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

اِبتدائی دورِ اسلام میں کمزور مسلمانوں پر ظلم اور اہلِ اِسلام کا جذبۂ جہاد

مکہ معظمہ میں کُفار کی طرف سے ظلم وستم انتہائی تھا، اور اس ظلم وستم کے موقع پر اہلِ ایمان کے دل میں بھی ولولہ آتا تھا، جوش اُٹھتا تھا، اور وہ بھی چاہتے تھے کہ ہمیں اجازت مل جائے تو ہم ان کُفّار کے مقابلے میں ہاتھ اُٹھائیں، انسان کمزور بھی ہو تو چپ کر کے پِٹنا بڑا مشکل ہوتا ہے، اندر سے ولولہ اُٹھتا ہے، جب کوئی دُوسرا انسان مارے، زیادتی کرے، ظلم کرے تو آگے سے ہاتھ اُٹھانے کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے، کہ ہم بھی ہاتھ اُٹھائیں اور مقابلہ کریں، چلو دوسرا چار مارے گا تو ہم بھی ایک لگالیں گے، بہرحال کمزور سے کمزور انسان کے دل میں بھی یہ ولولہ پیدا ہوتا ہے، اپنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ رہے اور دوسرا آزادی کے ساتھ پیٹتا رہے اور ظلم وستم کرتا رہے، اس کا برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر مکہ معظمہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے وہ سارے کمزور بھی نہیں تھے، ان میں مضبوط ترین لوگ بھی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے حضرات، جو بعد میں بڑے بڑے جرنیل ثابت ہوئے، ایسے لوگ بھی تھے، اور ان کے جوش کا تو کیا ہی کہنا کہ جب دوسروں کی طرف سے زیادتی ہوتی ہوگی تو ان کو بھی ولولہ تو اُٹھتا ہوگا کہ ہم بھی ہاتھ اُٹھائیں، لیکن اُس وقت مقابلے میں ہاتھ اُٹھانا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق نہیں تھا، اس لیے جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس قسم کی بات ہوتی تو آپ یہی کہتے کہ بھائی! اپنے ہاتھ روک کے رکھو اور ابھی تم اپنے تعمیرِ نفس کی طرف متوجہ رہو، نماز پڑھو، اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو، صبر اور تحمل اختیار کرو، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے موقع آئے گا تو پھر تمہیں لڑائی کی اجازت بھی مل جائے گی، اس طرح سے ان کو کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روک کے رکھو، ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ مکہ معظمہ میں بھی یونہی ہوا، اور مدینہ منورہ میں آجانے کے بعد پھر ایک جماعت بھی تشکیل پا گئی، تو جب اردگرد سے خبریں ملتیں کہ مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہا ہے، عورتوں اور بچوں کو پریشان کیا جا رہا ہے، تو پھر اہلِ مدینہ کے دل میں بھی ایسے ہی ولولہ اُٹھتا کہ ہمیں اجازت ملے تا کہ ہم اس شر کو کسی طریقے سے دفع کریں، مدینہ منورہ میں بھی اِبتداء، اِبتداء میں جہاد کی اجازت نہیں تھی، اُس وقت بھی لوگوں کی خبریں سُن کر اس قسم کے ولولے اُٹھتے تھے، وہاں مدینہ میں اگرچہ اب ان پر کوئی زیادتی نہیں کرتا تھا، اور نہ کرسکتا تھا کیونکہ وہاں اپنی تھوڑی سی حکومت بن گئی، اور جماعت کچھ مضبوط ہوگئی، لیکن اردگرد سے جب عورتوں اور بچوں پر ظلم کی خبریں آتی جیسے پچھلے رکوع میں آیا وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ، ان کے قصے جس وقت پہنچتے، خبریں پہنچتیں کہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے ساتھ یوں ہو رہا ہے، عورتوں اور بچوں کو یوں ستایا جا رہا ہے، تو پھر دل میں ولولہ

اُٹھتا اور سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں جہاد کے تذکرے ہوتے۔ اب ایک اور صورت بھی پیدا ہوگئی کہ مدینہ منورہ میں چونکہ بعض لوگ نفاق کے طور پر بھی اسلام قبول کرنے والے تھے، اُن کے دلوں میں مضبوطی نہیں تھی، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی نے ایمان تو خلوص کے ساتھ ہی قبول کرلیا لیکن دل اتنے مضبوط نہیں تھے جتنے اہل مکہ کے تھے، کیونکہ ماریں کھا کھا کر وہ تو پختہ ہوگئے تھے، اور ان کو ابھی اس قسم کی بھٹی سے گزرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، جس طرح مکہ والے پٹ پٹا کے امتحان کی بھٹی میں سے گزر کر مضبوط ہوگئے تھے، مدینہ میں ایمان قبول کرنے والوں کے قلوب ابھی اتنے مضبوط نہیں ہوئے تھے، نہ ان کے اندر وہ جوش اور ولولہ ہوسکتا تھا جو ایک مظلوم میں اور مار کھائے ہوئے انسان میں ہوتا ہے، لیکن جب حضور ﷺ کی مجلس میں اس قسم کا تذکرہ ہوتا تو بڑھ چڑھ کر وہ بھی باتیں کرتے کہ ہاں جی! ہمیں اجازت ملنی چاہیے، ہم یہ کردیں گے، ہم وہ کردیں گے۔ اور منافقین بھی باتیں بناتے۔

منافقین کی لاف زنی اور اس کی وجہ

اور یہ ایک نفسیاتی اُصول ہے کہ ایک شخص اگر باطنی طور پر کمزوری میں مبتلا ہو تو وہ کچھ احساسِ کہتری میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن اپنے اس نقص اور عیب کو چھپانے کے لئے مجلس کے اندر بیٹھ کر لاف زنی اور بڑیں سب سے زیادہ وہی مارا کرتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میں باتوں باتوں میں بہادری ظاہر کردوں تاکہ میرے اندر کی کمزوری چھپی رہے اور کوئی یہ نہ کہے کہ یہ بزدل ہے، باتیں سب سے زیادہ وہی کیا کرتا ہے، اور جب کام کا موقع آتا ہے تو پھر وہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے، بڑیں مارنا اکثر و بیشتر ایسے لوگوں کا کام ہوتا ہے جو باطنی طور پر اس کمزوری میں مبتلا ہوتے ہیں جس کو ہم احساسِ کہتری سے تعبیر کرتے ہیں، اور آج آپ اس کو اس لفظ سے بھی ادا کرسکتے ہیں کہ جو کردار کے غازی نہیں ہوتے وہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں، یا جو باتونی ہوا کرتے ہیں اور جو قوّال ہوتے ہیں یعنی زیادہ گفتگو کرنے والے وہ فعال نہیں ہوتے، زیادہ بولنے والے اکثر و بیشتر کردار کے کمزور ہوتے ہیں، جیسے ڈاکٹر اقبال کا بھی شعر ہے اپنے متعلق (بانگِ درا میں) کہ:

اقبال بڑا اُپدیشک ہے مَن باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

تو قوّال جو ہوتے ہیں وہ اکثر فعال نہیں ہوتے، اس لئے شاعر قسم کے لوگ اکثر بدعمل ہوتے ہیں، اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے لفظی طور پر تو باتیں خوب کریں گے، بڑیں ماریں گے، ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں گے کہ "میں یوں کردوں گا، ایسا موقع آگیا تو میں یہ کردوں گا، زبان گُدی سے کھینچ لوں گا، ٹانگیں توڑ دوں گا، یہ کردوں گا" اس قسم کی باتیں زبان پر چڑھی ہوئی ہوتی ہیں، لیکن جب موقع آجاتا ہے تو پھر ہوا بہت جلدی خارج ہوجاتی ہے۔ اسی طرح وہ منافق قسم کے لوگ جو تھے، جن کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ پختہ نہیں تھا، وہ حضور ﷺ کی مجلس میں تو باتیں خوب کرتے، اور حضور ﷺ انہیں سمجھاتے کہ ابھی اپنے نفس کی تعمیر کرو، اللہ کی طرف سے جب تک حکم نہیں آتا ہاتھ کو روک کے رکھو، ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے، نمازیں پڑھو، اللہ کے راستے میں خرچ کرو تاکہ عمل کی قوت پیدا ہو، جب جہاد کا موقع آجائے گا اور اللہ کا حکم آجائے گا تو پھر جہاد بھی کرلیں گے۔

خوفِ عقلی اور خوفِ طبعی میں فرق

اور پھر کچھ دنوں کے بعد اللہ کی طرف سے اجازت آگئی اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (سورۂ حج:۳۹) کہ جن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جارہی ہے، اب ان کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی، حکم آگیا کہ اب لڑو، جس وقت حکم آگیا تو اب دل بیٹھنا شروع ہو گئے، اور اس طرح کافروں کا خوف اُو پر مسلط ہو گیا اور ڈرنے لگ گیا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ، اس سے زیادہ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف عقلی ہے اور عقلی خوف پر وہ آثار طاری نہیں ہوا کرتے، اور دشمن سے خوف طبعی ہے اور طبعی خوف کے اثرات فوراً طبیعت پر نمایاں ہو جاتے ہیں، آپ اس وقت اللہ تعالیٰ کا تصور کریں، اللہ تعالیٰ کی جہنم کا تصور کریں، گناہ کرتے وقت بھی انسان کو آخر خیال آتا ہے، لیکن انسان کانپتا نہیں، اس کا رنگ نہیں اُڑتا اللہ تعالیٰ کا تصور کر کے، حالانکہ ایمانی طور پر اور عقلی طور پر آپ جانتے ہیں کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے اور جہنم ناقابلِ برداشت ہے، دُنیا کی جیل اس کے مقابلے میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی، لیکن اس کے باوجود آپ کے رونگٹے نہیں کھڑے ہوتے، آپ کانپتے نہیں ہیں، آپ کا رنگ نہیں اُڑتا، بدحواسی آپ پر طاری نہیں ہوتی، لیکن جب پولیس کی طرف سے گرفت کا خطرہ ہو جائے تو کس طرح ٹانگیں کانپنے لگ جاتی ہیں، انسان کا رنگ اُڑ جاتا ہے، اور دُنیا کی جیل کے تصور سے انسان کی کیا حالت ہو جاتی ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خوف طبعی ہے، اور طبعی خوف کے اثرات جلدی طاری ہو جاتے ہیں، عقلی خوف کے اثرات ایسے نمایاں نہیں ہوا کرتے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے اگر ڈر ہے تو اُس کی رحمت سے اُمید بھی ہے، اور دشمن سے ڈر ہی ڈر ہوتا ہے، اس سے رحمت کی اُمید نہیں ہوتی، اس کی بناء پر بھی اُس کے اثرات زیادہ سخت ہوتے ہیں۔

کمزور طبقے کی نشاندہی

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا، لڑنا فرض کر دیا گیا، تو ان کے اُوپر اس طرح ہیبت طاری ہوگئی، جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے اس سے بھی زیادہ لوگوں سے ڈرنے لگ گئے، اب یہ نسبت تو جماعت کی طرف ہے، جیسے کل میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی حکمت یہی ہے کہ کسی کی تعیین کر کے وہ بُرائی نہیں کرتا، جماعت کے اندر جب اس قسم کے افراد موجود ہوتے ہیں تو اُن افراد کی موجودگی میں جماعت کی طرف نسبت کر کے کہا جاتا ہے کہ تم میں سے بعض ایسے ہیں اور بعض ایسے ہیں، جس کے دل میں چور ہوگا وہ خود سمجھ جائے گا کہ یہ میرے متعلق کہا جا رہا ہے، اور اجمالی طور پر سب کو محتاط کر دیا جائے گا کہ تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کے جذبات ایسے ہیں، ان کا خیال رکھو۔ دوسری جگہ قرآنِ کریم میں اسی قسم کے جذبات کو ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ (سورۂ محمد:۲۰) وہ جب جہاد کا حکم آیا تو آپ کی طرف یہ یوں جھانکتے ہیں جیسے کسی کے اوپر موت کی غشی طاری ہو رہی ہو، اور موت کی غشی جب طاری ہوتی ہے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں، اور جب انسان ہیبت زدہ ہو جاتا ہے تو اس وقت کہتے ہیں کہ اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، تو جہاد کا حکم آجانے کے بعد آپ کی طرف ایسے جھانکتے ہیں جیسے ایسا شخص جھانکا کرتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو جاتی ہے، یہ بھی اسی

کمزور طبقے کی نشاندہی ہے، منافق ہوں تو بھی، اور منافق نہ بھی ہوں خلوص کے ساتھ ایمان قبول کیا ہو لیکن چونکہ ابھی وہ ظلم کی چکی میں پسے نہیں تھے، نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، کافروں کی طرف سے انہوں نے چھیڑ چھاڑ کو دیکھا نہیں تھا، تو ان کی طبیعت میں ولولہ نہیں تھا، ایک قسم کی کمزوری تھی، تو ان کمزوروں کی حالت کا نقشہ ان الفاظ سے کھینچا گیا ہے۔

جہاد پر دِلوں کو مضبوط کرنے کے لئے کچھ اُصولی باتیں

اللہ تعالیٰ اب ان کے دِلوں کو مضبوط کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ انہیں آپ کہہ دیجئے کہ یہ جو تمہارے دِل میں ولولے اُٹھتے ہیں، کہ کچھ دیر اور مہلت ملتی، ہم امن چین کے ساتھ اپنا وقت گزار لیتے، انہیں کہہ دو کہ دُنیا کا ساز و سامان بہت کم ہے، تم جہاد سے جو جی چُراتے ہو، لڑنے مرنے کو جو تمہارا جی نہیں چاہتا، یہ دُنیا کا مفاد پیشِ نظر ہے، تو آخرت کے مقابلے میں دُنیا کا مفاد کوئی چیز نہیں، اور آخرت کی نعمتیں ان کو حاصل ہوں گی جو تقویٰ اختیار کریں گے، تقویٰ کا مطلب ہے کہ اللہ کے احکام کی پابندی کرو۔ تو اوّل بات تو یہ ہوئی کہ دُنیا کی نعمتوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے جہاد کی مشقت سے جی چُرانا یہ بھی گھاٹے کا سودا ہے، دُنیا اور آخرت کا کوئی مقابلہ نہیں، جہاد سے ہٹو گے تو بظاہر تم دُنیا سے فائدہ اُٹھاؤ گے لیکن یہ فائدہ بہت کم ہے اور آخرت کے فائدے سے محروم ہو جاؤ گے، ایک بات تو یہ ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہو کہ جہاد میں جائیں گے تو مر جائیں گے، اس لئے تم موت سے ڈرتے ہوئے جہاد میں نہیں جاتے، تو یہ بات اپنے دل میں راسخ کر لو کہ موت سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا، نہ موت وقت سے ٹلتی ہے، اگر تم بڑے بڑے اُونچے اُونچے محل بنا کر، مضبوط اور چونا گچ کر کے، ان کو سنگِ مرمر کے بنالو، تہہ خانے بنالو، یا اُونچے مکان بنالو، جہاں کہیں بھی چھپ جاؤ موت تمہیں تلاش کر لے گی، موت سے تم بچ نہیں سکتے، جان بچانے کے لئے اس قسم کی تدبیریں اختیار کرنے سے انسان بزدل مشہور ہو کر دُنیا اور آخرت کا نقصان تو اُٹھا سکتا ہے، باقی اس قسم کی چیزوں کے ساتھ موت کا لقمہ بننے سے نہیں بچ سکتا، اس عقیدے کو جتنا مضبوط کیا جائے گا اتنا ہی جہاد کے اندر انسان بہادری دکھائے گا اور اُس کے اندر قوت پیدا ہوگی، اور یہ ایک واقعہ ہے اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جو جہاد میں جاتے ہیں سارے مر نہیں جاتے، اور جو گھروں میں چھپ کر رہتے ہیں وہ بچ نہیں جاتے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ساری زندگی لڑائیوں میں رہے، وفات مدینہ منورہ میں گھر ہوئی[1] اور آخر وقت میں کہتے تھے کہ میرے بدن کی ایک بالشت جگہ بھی خالی نہیں ہے جس میں تیر، تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو، لیکن آج میں گھر میں ایڑیاں رگڑ کر جان دے رہا ہوں، فَلَا نَامَتْ اَعْيُنُ الْجُبَنَاءِ (ابن کثیر وغیرہ)، بزدلوں کی آنکھیں کھل جائیں، بزدلوں کو نیند نہ آئے، مقصد یہ تھا کہ میری حالت دیکھ کر بزدلوں کو چاہیے کہ عبرت حاصل کریں کہ میدان میں جانا کوئی موت کا باعث نہیں ہے، اور گھر میں چھپنے والے جھونپڑیوں میں ہیں تو وہاں سے بھی جنازے اُٹھتے ہیں، کچے مکانوں میں ہیں تو وہاں سے بھی جنازے اُٹھتے ہیں، محلات میں ہیں تو وہاں سے بھی جنازے اُٹھتے ہیں، اور ایک ایک ہزار آدمی پہرے کے اُوپر کھڑا ہو اور وہ کوٹھیوں کے اندر بیٹھے ہوئے ہوں تو وہاں سے بھی جنازے نکلتے ہیں، دولت کے انبار لگے ہوئے ہوں تو بھی جنازے نکلتے ہیں،

---

(۱) یہ ایک قول ہے، اور دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ان کی وفات حمص میں ہوئی، دیکھئے کتب رجال۔

فقیر اور فاقہ مست ہو تو بھی جنازے اُٹھتے ہیں، تو کون سی ایسی کیفیت ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکیں کہ فلاں کیفیت اختیار کرنے سے انسان بچ جاتا ہے، جب موت نے وقت پر آنا ہے اور لازماً آنا ہے تو پھر جان بچانے کی اور چھپنے چھپانے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ موت نے آنا ہے، وقت پر آنا ہے، میدان میں نکل کر بہادروں کی طرح جان دو گے تو اللہ کے ہاں اجر پاؤ گے، ورنہ یہ جائے گی تو ضرور۔ اس طرح اِن پہلی آیات میں اُن افراد کے دلوں کو مضبوط کیا جا رہا ہے۔

تعمیرِ نفس کی اہمیت

''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روک کے رکھو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو'' اس میں وہی تعمیرِ نفس ہے کہ پہلے اپنی تربیت کرلو، اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلنے اور مضبوط رہنے کی عادت ڈالو، جب یہ پختگی پیدا ہو جائے گی تو اس کے بعد پھر جہاد کا حکم آئے گا، کیونکہ ثمرات تبھی حاصل ہو سکتے ہیں کہ جب انسان کی طبیعت میں خلوص آجائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کی عادت پڑ جائے، پھر جو جہاد اللہ کے حکم کے تحت اور خلوص کے ساتھ ہوگا اس کے اُوپر اچھے اثرات مرتّب ہوں گے، اور جب تک انسان نے اپنے نفس کی اصلاح نہ کی ہوئی ہو تو بظاہر یہ جہاد ہوتا ہے، اور حقیقت کے اعتبار سے خلوص نہ ہونے کی وجہ سے یہ فساد کی صورت اختیار کر جاتا ہے، اور ہماری کوششوں پر اچھے اثرات اس لئے مرتّب نہیں ہوتے کہ ہمارے نفس کی تعمیر نہیں ہے، جیسے اکبر الٰہ آبادیؒ کہتے ہیں کہ۔

خدا کی قدرت دیکھئے، کیا پیچھے ہے، کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

کہ حضور ﷺ کو پہلے غارِ حرا میں بٹھایا گیا، وہاں آپ سے مجاہدے کرائے گئے، ریاضت کرائی گئی، اور اس مجاہدے اور ریاضت کے نتیجے میں پھر بدر کے میدان میں پہنچایا گیا، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اصلاحِ نفس اور اُس کے بعد پھر میدانی زندگی ہے، اور ہمارے ہاں ترتیب اُلٹی ہوگئی کہ اصلاحِ نفس کی طرف تو توجہ ہی نہیں، قانونِ اسلام کے اجرا کے لئے جو لوگ اسٹیجوں پر جہاد کرتے پھرتے ہیں وہ نماز تک کے پابند نہیں ہیں، اسلام اسلام زبانوں پر ہوگا، لیکن اخلاق سارے کے سارے برباد اور تباہ، اور نجی زندگی بالکل ہی معصیت سے آلودہ ہوگی، تو ایسے لوگوں کی کوشش سے پھر اسلام بھی تو ایسے ہی آئے گا۔ اور اگر پہلے اپنی اصلاح کی ہوئی ہو، اور خود اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے پابند ہوں تو پھر جو بات زبان سے نکلے گی اس میں بھی اثر ہوگا، اور کوشش کا نتیجہ بھی اچھا نکلے گا، تو یہی تربیت تھی جو صحابہ ؓ کی کی گئی، کہ پہلے ان کو اِقامتِ صلوٰۃ اور اِیتائے زکوٰۃ پر پختہ کیا گیا، اور کہا گیا کہ لوگوں کے ظلم برداشت کرو پھر بعد میں جہاد کا حکم نازل ہوا۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ: جب ان کے اُوپر لڑنا فرض کر دیا گیا تو اچانک ان میں سے ایک فریق ڈرتا ہے لوگوں سے مثل ڈرنے اللہ سے، اللہ سے ڈرنے کی طرح (كَخَشْيَةِ اللهِ کے اندر مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے) یا اس سے بھی زیادہ سخت ڈرنا۔ ''اور کہنے لگ گئے'' یعنی ان کے دلوں میں ایسے وسوسے آنے لگ گئے، دلوں میں خیالات آنے لگ گئے، زبان سے کہنا مراد نہیں ہے، کہ ''اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر لڑنا کیوں فرض کر دیا، کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں قریب وقت تک'' یعنی

تھوڑی سی اور مہلت دے دیتا تا کہ امن چین سے وقت گزر جاتا'' آپ کہہ دیجئے کہ دُنیا کا سامان بہت قلیل ہے، بہت تھوڑا ہے'' یعنی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں، ''اور آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کریں، اور تم کچھ بھی ظلم نہیں کئے جاؤ گے'' تمہاری حق تلفی نہیں کی جائے گی، اللہ کے حکم کے تحت جو تقویٰ اختیار کرو گے اُس کا اجر پورا پورا ملے گا، اور جان بچانے کا جو جذبہ تمہارے دل میں ہے تو یہ بھی سُن لو کہ ''جہاں کہیں بھی تم ہو گے موت تمہیں پالے گی اگر چہ تم مضبوط محلات میں ہو، مضبوط قلعوں میں ہو'' یہ تو ہو گئی اس گروہ کی اصلاح جن کے دلوں میں اس قسم کے وسوسے آتے تھے۔

نفع اور نقصان کے وقت منافقین کا نظریہ اور اسلام کی تعلیم

اب اگلی بات جو کہی جارہی ہے اس میں بھی منافقین کے طبقے کی اصلاح کرنی مقصود ہے بغیر ان کا عنوان قائم کئے، منافقین کے دل میں چونکہ سرورِ کائنات ﷺ کی عظمت تو تھی نہیں، اور وہ آپ ﷺ کو اللہ کا رسول دل کے عقیدے کے تحت تو مانتے نہیں تھے، وہ تو یوں سمجھتے تھے کہ اللہ کی طرف نسبت کر کے خواہ مخواہ ایک اپنی شان بنالی ہے، ورنہ جس طرح دُنیا کے اندر عام لیڈر اور راہنما ہوا کرتے ہیں اور اپنا اقتدار چاہتے ہیں، اسی طرح انہوں نے بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا، منافقین کے جذبات تو ایسے ہی تھے، ہر بات پر تنقید کرنا اور ہر بات کو ناقدانہ نگاہ کے ساتھ دیکھنا ان لوگوں کا کام تھا، اگر کسی جگہ سرورِ کائنات ﷺ کے ارشاد کے مطابق عمل کرنے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا، جیسے بدر میں فتح ہو گئی یا اسی طرح دوسرے بعض مواقع، تو یہ لوگ کہتے کہ بس یہ تو من جانب اللہ چیز نصیب ہو گئی ورنہ اس میں تمہارا تو کوئی کمال نہیں ہے، تم نے تو بدنظمی میں کوئی کمی نہیں کی تھی، لیکن بس اللہ کی طرف سے قدرتی طور پر اچھا نتیجہ نکل آیا، تو اس وقت اس کو اللہ کی قدرت کی طرف منسوب کرتے تھے، اور اگر کوئی نقصان ہو جاتا اور آپ ﷺ کی بات پر عمل کرنے کے نتیجے میں کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اس کو حضور ﷺ کی بے تدبیری کا نتیجہ بتاتے، جیسے اُحد میں جس وقت شکست ہو گئی تھی تو ان کی زبانیں جو کھلیں، تو اس میں یہی بات تھی کہ ہماری بات نہیں مانی گئی، اپنی رائے پر عمل کیا، اس لیے یہ نقصان اُٹھالیا، اگر ہماری بات مان لیتے تو نقصان کیوں ہوتا؟ تو پھر وہ اس طرح سے زبان کے نشتر چلاتے کہ یہ ان کی بے تدبیری اور بے انتظامی کا نتیجہ ہے کہ یہ نقصان ہو گیا۔ اگر فتح ہو جاتی تو آپ کی عقل کا یا آپ کی رائے کا کمال نہ بتاتے، بلکہ یہ کہتے کہ قدرتی طور پر ہو گیا، ورنہ ان کا تو کوئی کمال نہیں تھا، اور نقصان ہوتا تو ذمہ داری آپ پر ڈالتے۔

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ان بے سمجھوں سے کہو کہ نفع ہو یا نقصان، حقیقت کے اعتبار سے تو اللہ کی جانب سے ہے، جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کی مشیت کے تحت ہی ہوتا ہے، اس میں تو کوئی شک نہیں، لیکن اس کے باوجود جو تمہیں خیر اور فضل پہنچے اور جو تمہیں بھلائی پہنچ جائے تو سمجھا کرو کہ یہ اللہ کے فضل سے اور اللہ کی رحمت سے حاصل ہوئی ہے، کیوں؟ کہ جب بھی انسان کو کوئی اچھی حالت پہنچتی ہے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس حالت کے مطابق اُس کا عمل نہیں ہوگا، اگر حساب لگایا جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں جو ہر وقت ہم استعمال کرتے ہیں، ہمارے اچھے سے اچھے عمل اس کا معاوضہ نہیں ادا کر سکتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں نعمتیں نصیب ہیں، تو ہمارے اعمال اور ہماری کوشش کتنی اچھی کیوں نہ ہو، یہ تو کھائی پی ہوئی نعمتوں کا معاوضہ بھی نہیں بن سکتا، تو اس کو ہم مزید فوائد بھی

حاصل کرنے کا ذریعہ کیسے سمجھ لیں؟ اس لئے جو اچھی حالت ہمیں ملتی ہے وہ ہماری کوشش کی بجائے زیادہ تر اللہ کے فضل کے نتیجے میں ہے، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنّت میں نہیں جائے گا: ''لَنْ یُدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ''[1] صحابہ نے پوچھ لیا: یارسول اللہ! وَلَا اَنْتَ آپ بھی اپنے عمل کے سبب سے نہیں جائیں گے؟ فرمایا: ''وَلَا اَنَا!'' میں بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنّت میں نہیں جا سکتا، ''اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ'' مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ لے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ نیک اعمال تو ان نعمتوں کا معاوضہ بھی نہیں بن سکتے جتنی نعمتیں ہم اللہ تعالیٰ کی دنیا میں کھائے بیٹھے ہیں، پھر جو نیکی کی توفیق ہوتی ہے وہ مستقل اللہ کا احسان ہے۔ ہاں! البتہ جس وقت ہمارے سامنے کوئی بُری حالت آتی ہے، کوئی بُرا نتیجہ نکلتا ہے، اگر غور کریں گے تو یقیناً اپنی کوتاہی کسی نہ کسی درجے میں سامنے ہوتی ہے، چاہے ہوتی وہ بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، لیکن ظاہری نسبت اُس کی ہماری طرف ہوگی کہ ہم نے اپنے ارادے کو استعمال کیا، یا جو ہم پر چیز لازم تھی ہم نے اُس کی رعایت نہیں رکھی، اس لیے اب اس حقیقت کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ اصل بات تو یہ ہے کہ نفع ہو یا نقصان ہو یہ من جانب اللہ ہے، لیکن اس ظاہری سطح کی طرف دیکھتے ہوئے اچھی حالت کو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھو، اور جو کوئی بُری حالت تمہیں پہنچ جائے تو وہ تمہارے اپنے نفس کی کسی کمی کوتاہی کی بناء پر ہوتی ہے، جیسے بدر میں فتح ہوگئی تو حقیقت کے اعتبار سے بھی اللہ کا فضل ہے، ظاہری طور پر بھی اللہ کی رحمت ہے، ورنہ ہمارے پاس اتنے اسباب نہیں تھے، اور اُحد میں اگر شکست ہوگئی تو چاہے ہوئی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، لیکن ظاہری سبب اُس کا تمہاری کوتاہی بنی، کہ تم نے حضور ﷺ کی ہدایات کی پابندی نہیں کی، یہ تو ہے سمجھ داری کی بات کہ حقیقت اللہ کی طرف منسوب کرنے کے باوجود انسان کسی بُری حالت کو اپنے عمل کی کوتاہی کا نتیجہ سمجھے، اور جو اچھی حالت آجائے اُس کو اللہ کا فضل ہی قرار دے، سمجھ داری یہ ہے۔ لیکن یہ ایسے بے سمجھ لوگ ہیں کہ یہ سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے کہ ان کو کوئی بات سمجھائی جائے، بس اپنی رَٹ لگائے جاتے ہیں۔ کوئی اچھی حالت آجائے تو اُس کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں، بایں معنیٰ کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں، تمہاری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے، اور اگر کوئی بُری حالت پہنچ جاتی ہے تو ذمہ داری آپ پر ڈالتے ہیں، حاصل ان سب باتوں کا یہ ہے کہ ان کے دل میں عظمت نہیں، اور آپ ان کی باتوں سے کوئی دُکھ محسوس نہ کریں، ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اور یہ نہیں مانتے تو کوئی بات نہیں، اللہ اس بات پر گواہ ہے۔ اس طرح سے منافقین کی جو ایک نفسانی شرارت تھی اور جس قسم کی باتیں کر کے وہ حضور ﷺ کی عظمت کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے، اِن الفاظ میں اُس کی اصلاح کی گئی ہے۔

''اگر ان کو اچھی حالت پہنچ جاتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے'' یعنی اس میں آپ کا کوئی کمال نہیں، قدرتی طور پر یہ نتیجہ سامنے آگیا۔ ''اور اگر ان کو کوئی بُری حالت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے'' یعنی آپ کی بدانتظامی اور بے تدبیری کا نتیجہ ہے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ حقیقت کے اعتبار سے سب اللہ کی جانب سے ہے، ان لوگوں کو کیا ہوگیا کہ بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے''۔ اور ظاہری اسباب کے اعتبار سے ''جو تمہیں اچھی حالت پہنچے وہ تو اللہ کی جانب سے ہی ہے'' ورنہ

(۱) بخاری ج ۲ ص ۸۴۷ باب تمنی المریض الموت. واللفظ لہ / مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۷ باب سعۃ رحمۃ اللہ فصل اول۔

تمہارے عمل یا تمہاری تدبیر اس درجے کی نہیں ہوتی جو اُس کامیابی کو حاصل کر لے،'' اور جو کوئی بری حالت پہنچے'' تو یہ ہر انسان سے کہا جارہا ہے کہ'' تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے'' غور کر کے دیکھو گے تو اپنی کوئی نہ کوئی کوتاہی سامنے آجائے گی جس کے نتیجے میں وہ نقصان ہوا، مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ میں خطاب عام لوگوں کو ہے۔

عظمتِ رسول وتسلیۂ رسول

اور آگے خصوصیت سے حضور ﷺ کو کہا جارہا ہے، کیونکہ جب مخاطب سارے بیٹھے ہوں تو اس طرح سے ضمیریں جولوٹائی جایا کرتی ہیں، تو سننے والے موقع محل کے مطابق ان کا مرجع خود سمجھ جایا کرتے ہیں کہ کس کے متعلق کہا جارہا ہے، تو جب یہ بات کہی جائے گی کہ'' لوگوں کی طرف ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے'' تو متعین ہے کہ ک کا خطاب حضور ﷺ کو ہے، اور اوپر والے ک کا خطاب عام ہے، ہر کسی مخاطب کو۔'' اور اللہ گواہ کافی ہے''۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ: جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اس میں یہ بات بتائی گئی کہ رسول جو کچھ کہتے ہیں اللہ کے اَحکام کے تحت کہتے ہیں، اللہ کے اشارے کے تحت کہتے ہیں، اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتے، رسول کا حکم ماننا ایسے ہی ہے جیسے اللہ کا حکم مان لیا۔ وَمَنْ تَوَلّٰى: اور جو شخص پیٹھ پھیرے اور آپ ﷺ کا حکم نہ مانے تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں، ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، کہ آپ ﷺ ذمہ دار ہیں اور آپ ان کو صحیح راستے پر ضرور چلائیں، یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

منافقین کی ایک اور شرارت کا ذِکر اور اس کا مقصد

يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ: جب آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو اُس وقت تو باتیں ایسی کرتے ہیں جیسے یہ انتہائی فرمانبردار ہیں، اصل ترکیب کے لحاظ سے جملہ یوں بنتا ہے: اَمْرُنَا طَاعَةٌ، ہمارا کام تو ماننا ہی ہے، ہمارا کام تو طاعت کرنا ہی ہے، جس کو ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ سَرِ تسلیم خم، جو مزاجِ یار میں آئے، سامنے بیٹھ کر تو ایسے ہی کہتے ہیں کہ جو فرمایا ہمیں قبول ہے، ہمارا تو کام ہی یہ ہے کہ آپ حکم دیں اور ہم اُس پر عمل کریں، ہم تو فرمانبردار ہیں، ہم تو پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں آپ کا کہنا ماننے کے لئے، اگر آپ کا کہنا نہیں مانیں گے تو ہم یہاں کس لئے آئے ہیں۔ سامنے بیٹھ کر تو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، بڑا جاں نثاری کا ثبوت دیتے ہیں، یہ بھی نفاق کا ایک شعبہ ہے کہ مجلس میں بیٹھ کر تو اس قسم کی باتیں کیں، جب وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے پھر جا کر ان باتوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، لو جی! فلاں بات ایسی کر دی، یہ کوئی کرنے کی بات تھی؟ یہ بھلا کوئی کام کرنے کا ہے جو کرنے کے لئے کہہ دیا کہ ایسے کرلو، اگر اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی طرف سے مدد آتی ہے تو فلاں جگہ مار کیوں کھالی؟ پھر مجلسوں میں بیٹھ کر اس قسم کا مذاق اُڑاتے ہیں، تو یہ بھی ایک نفاق کا شعبہ ہے کہ سامنے بیٹھ کر تو سَرِ تسلیم خم، اور پس پشت جا کر انہی باتوں پر تبصرے اور مذاق اُڑانا۔ اور یہ جو حالات ذکر کئے جارہے ہیں اس میں ان لوگوں کو تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اپنے کردار پر نظرِ ثانی کرو، تمہارا کردار ہم سے کوئی چھپا ہوا نہیں ہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس طرح کرنا یہ بھی نفاق کا ایک شعبہ ہے، تو حضور ﷺ کی مجلس میں جس طرح سے لوگ یوں کرتے تھے، ہر زمانے میں اور ہر دور میں اسی قسم کے لوگ جماعتوں میں ہوا کرتے ہیں، کہ جب اپنے بڑے کے سامنے بیٹھتے ہیں

تو حال کچھ اور ہوتا ہے، اور جب اُٹھ کر پس پشت چلے جاتے ہیں تو حال کچھ اور ہوتا ہے، یہ بھی ایک قسم کا نفاق ہے جو جماعت کے اندر بدنظمی پیدا کرتا ہے، اور دِل آپس میں جڑے ہوئے نہ ہونے کی وجہ سے پھر اس کام کے اندر کوئی برکت نہیں ہوتی۔'' کہتے ہیں کہ ہمارا کام تو قبول کرنا ہی ہے، ہمارا کام تو ماننا ہی ہے، جب آپ سے اُٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں تو ان میں سے ایک طائفہ باتیں کرتا ہے غیر اس کے جو وہ کہہ کر آتا ہے'' یعنی مجلس میں آ کر جس قسم کی فرمانبرداری کا اظہار کر کے آتا ہے، مجلس سے نکلنے کے بعد پھر ان کے جذبات فرمانبرداری والے نہیں ہوتے، اُس کے خلاف مشورے کرتے ہیں، اُس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، جیسے بَیَّتَ کا مفہوم آپ کے سامنے ذِکر کر دیا کہ خفیہ طور پر بات کرنے کو بھی تبییت سے تعبیر کیا جاتا ہے، چاہے رات کو نہ ہی ہو، ورنہ اصل کے اعتبار سے رات کو چھپ کر کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں، جیسے لڑائی جو رات کو چھپ چھپا کے کی جائے تو اُس کو تبییت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کو آج کل ''شب خون مارنا'' کہتے ہیں۔

منافقین کو وَعید اور حضور ﷺ کو ان سے اِعراض کا حکم

وہ یہ نہ سمجھیں کہ مجلس میں جا کر جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ ہم سے چھپی رہ جائیں گی وَاللّٰہُ یَکْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ: اللہ لکھتا ہے ان باتوں کو جو خفیہ طور پر یہ کرتے ہیں۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: یہ بڑوں کو بڑوں والی بات سمجھائی جارہی ہے کہ آپ اِن سے اعراض کر جائیں، آپ ان کے پیچھے نہ پڑا کریں، ذرا ذرا سی بات معلوم ہو جائے تو آپ احساس کریں، افسردہ ہو جائیں، غمزدہ ہو جائیں، ایسا نہ کریں، بلکہ ان سے اعراض کر جاؤ، ان سے منہ موڑ جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، ان سے بنے گا کچھ نہیں، یہ کچھ بگاڑ نہیں سکتے، کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتے، نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قائد کو اس قسم کی صفات کا حامل ہونا چاہیے کہ جماعت کے اندر اس قسم کے افراد موجود بھی ہوں، تو بس ان سے لاپروائی برتے، اگر کبھی اس قسم کی باتوں کا پتا چل بھی جائے تو چھوٹی چھوٹی بات کو محسوس کرنا اور اس کے پیچھے پڑ جانا اچھی بات نہیں ہوتی، اللہ پر بھروسہ کر کے اپنے صحیح اصولوں پر چلتے رہو، اور اگر کچھ افراد جماعت میں ایسے موجود ہوں جن کا آگا کچھ اور پیچھا کچھ ہے، اور سامنے کچھ ہیں اور گھر جانے کے بعد کچھ ہیں، تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، اپنے طور پر صحیح اصولوں پر چلو۔ اور ساتھ اُن کو تنبیہ کی جارہی ہے جن کے ایسے حالات ہیں کہ وہ اپنے حالات کو ٹھیک کر لیں۔

حقّانیتِ قرآن کا ذِکر اور اس کا مقصد

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ: یہ لوگ جو آپ کو رسول نہیں سمجھتے، اور ان کے دل میں آپ کے رسول ہونے کی عظمت نہیں ہے، تو کیا یہ قرآنِ کریم میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ غور کریں تو انہیں پتا چل جائے کہ یہ اللہ کی کلام ہے، اور جب یہ اللہ کی کلام ہے تو جس پر اُتری وہ اللہ کا رسول ہے، اور جب رسول اس کلام کے اشارات کی اتباع کرتا ہوا کوئی کام کرتا ہے تو اس میں اچھا نتیجہ سامنے آجائے یا بُرا نتیجہ سامنے آجائے، جو کچھ بھی ہو رسول کو ملامت نہیں کی جاسکتی، اگر یہ قرآنِ کریم میں تدبر کرتے تو یہ بات ان کی سمجھ میں آجاتی، کہ اگر یہ اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے، لیکن قرآنِ کریم میں اوّل سے لے کر آخر تک غور

کرو گے تو اس میں کسی قسم کا اختلاف نظر نہیں آئے گا، ایک ہی جیسی کلام فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے، احکام کے اعتبار سے بچی تلی، کوئی حکم مصلحت کے خلاف نہیں، واقعات کے اعتبار سے ٹھیک، کوئی واقعہ ایسا نہیں جس کو آپ جھوٹا یا غلط کہہ سکیں، کہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا اور قرآن نے یوں کہہ دیا، انسان کی کلام ہو تو اس میں آپ کو مختلف چیزیں نظر آئیں گی، غصے کی حالت میں اس کی کلام اور طرح کی ہوتی ہے، پیار اور محبت میں اس کی کلام اور طرح کی ہوتی ہے، غصہ آیا ہوا ہو تو بھی انسان اعتدال پر نہیں رہتا، اور محبت کا جذبہ ہو تو بھی انسان اعتدال پر نہیں رہتا، غصے کی حالت میں کلام ہو رہی ہو اور درمیان میں اُس کا کوئی دوست بھی آجائے تو اُس کو بھی تلخ لب ولہجے کے ساتھ جواب دے گا، چنانچہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یار! موڈ ہی خراب تھا جس وقت ہم گئے تھے، اس لئے انہوں نے بات اُلٹی کی ہے۔ اور جس وقت غصے کی کیفیت اُتر جاتی ہے تو پھر انسان بات صحیح طریقے سے کرتا ہے، اور اگر محبت کے جذبات میں بیٹھا ہو تو بسا اوقات دشمن بھی آجائے تو انسان اُس کے حق میں نرم ہوتا ہے، اس قسم کے نشیب و فراز انسان کی کلام میں بہت ہوتے ہیں، لیکن قرآن کو اوّل سے لے کر آخر تک پڑھتے جاؤ اس قسم کا آپ کو کہیں بھی نشیب و فراز معلوم نہیں ہوگا، نہ غصے میں بات اعتدال سے ہٹتی ہے، نہ محبت میں بات اعتدال سے ہٹتی ہے، عین غصے کی حالت میں اگر نیکوں کا ذکر آ گیا تو اسی طرح محبت سے ہو رہا ہے، اور عین اس حالت میں جب نیکوں کا ذکر محبت سے ہو رہا ہے اور درمیان میں کافروں کا ذکر آ گیا تو اس میں وہی چیز ہوگی، کسی قسم کا کوئی اختلاف نظر نہیں آتا، تو ایسی جڑی ہوئی کلام کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات ہیں، اس سے عقائد پیدا ہو رہے ہیں جس طرح سے اُصول ہوتے ہیں، اور اس سے احکام نکل رہے ہیں جس طرح سے درخت سے شاخیں نکل رہی ہیں، اُس کے اُوپر ان کے ثمرات ذکر کیے جا رہے ہیں جس طرح سے درخت کے اُوپر پھل آتا ہے، تو اول سے لے کر آخر تک ایک منظم سی زندگی نظر آتی ہے، اگر اس کے اندر کسی دوسرے کا ذہن کارفرما ہوتا اور یہ اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا تو اس طرح سے نظم بھی اس میں معلوم نہ ہوتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری کائنات میں بھی یہی دلیل دی ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۂ انبیاء: ۲۲) اگر اللہ کے علاوہ اس میں کوئی اور آلہہ ہوتے تو اس میں فساد ہوتا، یہ نظم نہ قائم رہ سکتا، اب باوجود اس بات کے کہ چیزیں مختلف ہیں لیکن ان میں کس طرح سے اتحاد ہے، آگ، پانی، مٹی، ہوا، یہ آپس میں اتحاد کی صورت میں اس دُنیا کے نظم کا باعث بنے ہوئے ہیں، زمین اور چیز ہے، آسمان اور چیز ہے، لیکن دونوں کا آپس میں ربط ہے جس کی بناء پر دیکھو! کس قسم کے ثمرات ظاہر ہو رہے ہیں؟ سورج چاند اور اسی طرح باقی ساری چیزیں اپنے نظم کے تحت چلتی ہیں اور ان کے اثرات کس طرح متفق علیہ ظاہر ہوتے ہیں، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ساری کائنات کا نظم کسی ایک کے ہاتھ میں ہی ہے، اگر اللہ کے کسی غیر کے ہاتھ میں ہوتا تو اس طرح یہ نظم بحال نہ رہ سکتا، بلکہ فسادات برپا ہو جاتے۔ یہی حال اس کائنات کا ہے جو قرآنِ کریم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کلام ہے اور ایک کی جانب سے یہ آئی ہوئی ہے، اگر اس میں کسی دوسرے کا دخل ہوتا تو اس طرح سے اس کا نظم قائم نہ رہ سکتا جس طرح اب نظم ہے، اور پھر انسانوں کی کلام ہوتی تو کتنے اختلافات اس میں نمایاں ہوتے، فصاحت کے اعتبار سے، بلاغت کے اعتبار سے، واقعات کے اعتبار سے، احکام کے اعتبار سے، اور اسی طرح دوسری چیزوں کے اعتبار سے، لیکن یہاں کسی ایک شوشے کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، فصاحت بلاغت کا ایک ہی معیار ہے، احکام جتنے ہیں سب اعتدال پر مبنی ہیں، واقعات جتنے ہیں سب

صحت پر مبنی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اس طرح جچے تلے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں کہ جس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ تو اگر غور کرتے تو اس سے ان کو معلوم ہوتا کہ یہ اللہ کی کلام ہے، اور اللہ کی کلام ہونے کے بعد آپ کی رسالت کا عقیدہ بنتا، اور رسالت کا عقیدہ بننے سے پھر آپ کی عظمت ان کے قلب میں آتی، اور آپ کی اطاعت اس طرح کرتے جس طرح اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے۔

بلاتحقیق بات آگے پھیلانے کی ممانعت

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ: یہ ان کی انتظامی طور پر بدعنوانی کا ذکر ہے، کہ یہ اس قسم کے ہلکے پھلکے لوگ ہیں کہ کوئی خبر پہنچ جائے، تحقیق کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، ایسے ہی مشہور کر دیتے ہیں، جس طرح سے لوگوں کو پروپیگنڈا کرنے کا بڑا سلیقہ ہوتا ہے، بات ایک ہاتھ آگئی فوراً اُڑا دی، تحقیق کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط، اور بسا اوقات اس قسم کی افواہیں پھیلا دینا نقصان دِہ ثابت ہوتا ہے۔ امن کا مطلب یہ ہے کہ خبر ایسی آگئی جس میں خوشی ہے، امن کی خبر ہے، اس کو سن کر انسان مطمئن ہو کے بیٹھ جائے، اور خوف کا مطلب یہ ہے کہ کسی دشمن کی طرف سے چڑھائی کا اندیشہ ہے، تو بلاوجہ ہی اس طرح خوف وہراس پھیلا دینا، مثلاً جب کوئی فوج باہر گئی ہوئی ہے تو ایسے ہی مشہور کر دینا کہ وہ فتح پا گئے، یوں ہو گئے، اور کبھی ایسے مشہور کر دینا کہ ان کو شکست ہوگئی، یہ ذہنی پریشانی کی چیزیں ہوتی ہیں، اسی لئے خاص طور پر جنگ کے دوران میں ہر ملک میں افواہیں پھیلانے پر سخت پابندی لگی ہوئی ہوتی ہے، کیونکہ افواہوں کے ساتھ بسا اوقات بہت خراب نتائج نکلتے ہیں، لوگوں کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، یا بلاوجہ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں نقصان سامنے آتا ہے۔ آپ حضرات کے سامنے شاید ۱۹۶۵ء والی جنگ کا نقشہ تو نہ ہو، لیکن جو ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی اُس میں بھی آپ نے ریڈیو پر سنا ہوگا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد باقاعدہ یہ اعلان ہوتا تھا کہ افواہیں نہ پھیلایئے، افواہیں پھیلانے والوں کی نشاندہی کریں، ایسے لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھریں، تو افواہیں پھیلانا ہمیشہ ملک میں ایک بدنظمی کا باعث بن جایا کرتا ہے، تو یہ ان کی بدنظمی ہے، ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، اگر کوئی خبر آئے تو یہ لے کے آیا کریں اللہ کے رسول کے پاس یا اس معاشرے میں جو صاحبِ اختیار لوگ ہیں، سمجھدار قسم کے لوگ، جو بات کی تحقیق کر کے یہ جان سکتے ہوں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ پھر اگر وہ صحیح کہہ دیں اور پھیلانے کی ہو تو اُس کو پھیلایا جائے، نہ پھیلانے کی ہو تو نہ پھیلایا جائے۔ بلاتحقیق بات کو سننا اور سن کر آگے مشہور کر دینا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں اس کی بہت سخت ممانعت آئی ہے، حدیث شریف میں الفاظ آتے ہیں: ''كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ''(۱) کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو آگے نقل کر دیا کرے، جس کی یہ عادت ہو کہ سنی ہوئی بات کو آگے نقل کر دے آخر وہ جھوٹوں میں شمار ہو جائے گا۔ ''جب ان کے پاس کوئی اَمر آتا ہے امن سے یا خوف سے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں'' یہ اسی کمزور جماعت کی انتظامی بدعنوانی ہے۔

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۸ باب النھی عن الحدیث بکل ما سمع/ مشکوٰۃ ص۲۸ باب الاعتصام۔ عن ابی ہریرۃؓ

''اگر اس کو لوٹا دیا کریں رسول کی طرف اور اپنے میں سے سمجھدار لوگوں کی طرف''، ''اُولی الامر'' کا لفظ جیسے حکام پر بولا جاتا ہے، علماء، فقہاء اور سمجھدار لوگوں پر بھی بولا جاتا ہے، سمجھدار لوگ ہر معاشرے میں مطاع ہوا کرتے ہیں، چاہے ان کو حکومت کے اعتبار سے کوئی اقتدار نہ بھی حاصل ہو تو بھی عام لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ان سے بات پوچھ کر اُس پر عمل کرتے ہیں، ایسا سمجھدار طبقہ بھی معاشرے میں ''اُولی الامر'' کا مصداق ہوتا ہے، فقہاء، علماء، صاحب رائے لوگ۔ ''تو جان لیتے اس بات کو وہ لوگ جو اس کی تحقیق کر لیتے ہیں ان میں سے'' یعنی جن کو تحقیق کی عادت ہے وہ جان لیتے، جاننے کے بعد پھر وہ بتاتے کہ یہ اشاعت کے قابل ہے یا نہیں؟ ''اگر یوں کیا کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے مگر تھوڑے سے'' یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے سلیم الطبع بنایا ہے اور جن کی عقل سلیم ہے وہ بچ جاتے، ورنہ اکثر و بیشتر شیطان کے طریقے پر چل جاتے، یہ اللہ کا فضل و رحمت ہے کہ اُس نے رسول بھیجا، کتاب نازل کی، موقع بموقع تمہیں ہدایات دی جا رہی ہیں، تو اللہ کے اس فضل و رحمت کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے، اور ان اَحکام کی پابندی کرنی چاہیے، اسی میں تمہارا فائدہ ہے، اگر اللہ کی طرف سے اس طرح سے راہنمائی نہ ہوتی تو تم سب لوگ خسارے میں پڑ جاتے، شیطانی طریقہ اختیار کر لیتے، جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم یا طبیعت اچھی دی ہے تو وہ کچھ بچ بھی جاتے، ورنہ اکثریت ایسی ہوتی جو شیطان کی متبع ہو جاتی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ترغیبِ جہاد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: شروع رکوع میں بعض لوگوں کا ذکر آیا تھا جو جہاد کے بارے میں اپنے دلوں میں کچھ کمزوری رکھے ہوئے تھے، اور اسی کی مناسبت سے کچھ آگے مضامین ذکر کر دیئے گئے تھے، اس آیت میں پھر رجوع ہے اسی مضمونِ جہاد کی طرف، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ اللہ کے راستے میں لڑائی لڑیں، یہ سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب ہے، ''آپ قتال کریں اللہ کے راستے میں، نہیں تکلیف دیے جاتے آپ مگر اپنی جان کی'' یعنی آپ اپنے نفس کے مکلف ہیں، ''اور مؤمنین کو ترغیب دیتے رہیں'' اگر آپ کے ترغیب دینے سے کوئی شخص جہاد پر آمادہ ہو جائے اور جہاد میں شریک ہو جائے تو اُس کی سعادت ہے، اور اگر آپ کے ترغیب دینے سے کوئی مائل نہیں ہوتا یا اس جہاد کے معاملے میں کوتاہی کرتا ہے تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، اگر آپ اکیلے بھی اللہ کے راستے میں لڑنے کے لئے نکل جائیں گے تو اللہ کی نصرت آپ کے ساتھ ہوگی، اللہ آپ کو فتح دے گا، ''اُمید ہے، قریب ہے'' یعنی اُمید کی جا سکتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کی اُمید دِلائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہوتا ہے، ''یہ بات قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ روک دے ان لوگوں کی لڑائی کو جنہوں نے کُفر کیا، اللہ تعالیٰ سخت لڑائی والا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔''

سفارش کی فضیلت وآداب

آگے شفاعت کا مسئلہ ذکر کیا جا رہا ہے، شفاعت کا مفہوم آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا کہ شَفَعَ جوڑنے کو کہتے

ہیں، اس لئے نفل کی دو رکعت شفع کہلاتی ہیں، جس کے مقابلے میں لفظِ وتر آیا کرتا ہے، اور یہ جو معروف شفاعت ہے جس کو ہم سفارش کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کی رائے کے ساتھ اپنی رائے جوڑ دی، اور اُس کی قوت کے ساتھ اپنی قوت شامل کر دی، جس سے دوسرے کا کام بن جاتا ہے، اس کو تائید حاصل ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اگر کوئی اچھی سفارش کرے تو اُس کی وجہ سے اُس کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور اگر کوئی بُری سفارش کرتا ہے تو اُس کی وجہ سے اُس کو گناہ کا حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔'' ماقبل کے ساتھ مناسبت اس کی بایں معنی ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی تھی، اور یہ دلالت علی الخیر ہے، نیکی پر راہنمائی ہے، اور یہ اُصول بتایا گیا ہے کہ ''اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ''[1] اگر کوئی شخص کسی نیکی پر دلالت کرتا ہے تو وہ اُس کے کرنے والے کی طرح ہوتا ہے، جیسے نیکی کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اسی طرح اُس نیکی کی راہنمائی کرنے والے کو اور نیکی پر دلالت کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے۔ اور سفارش میں بھی یہی بات ہے کہ ایک شخص کو نیکی کی ترغیب دی جاتی ہے، نیکی کے لئے راہنمائی کی جاتی ہے، تو جیسے نیکی کرنے والے کو ثواب ملے گا اِس کو بھی ملے گا۔ سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں کوئی سائل آجاتا تو آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے کہ تم اس کی سفارش کر دو، تمہیں اجر ملے گا، باقی! اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان پر جو جاری کرنا چاہے گا جاری کر دے گا،[2] یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ رسول اللہ ﷺ تو جو فیصلہ فرمائیں گے فرمائیں گے، تمہیں سفارش کرنے کا ثواب بہرحال مل جائے گا۔ اس میں بھی یہی ترغیب دینا مقصود ہے کہ کسی مسکین اور محتاج کی سفارش کر دینا اور اُس کا کام بنوانے کی کوشش کرنا نیکی کا کام ہے، یہ دلالت علی الخیر ہے، اس سے انسان کو اَجر ملتا ہے۔ لیکن شفاعت کے ساتھ حسنہ کی قید لگا دی، یعنی اچھی سفارش، اچھی سفارش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے سفارش کی جائے وہ مقصد بھی اچھا ہو، اور اُس سفارش کرنے کے لئے طریقہ کار بھی جائز اور اچھا اختیار کیا جائے، اگر مقصد اچھا نہیں تو ایسی صورت میں بھی اس شفاعت کو شفاعتِ حسنہ نہیں کہیں گے، اور اگر مقصد تو اچھا ہے لیکن اُس کے لئے طریقہ کار غلط اختیار کیا گیا تو ایسی صورت میں بھی شفاعتِ حسنہ نہیں ہوگی، بلکہ شفاعتِ سیئہ میں شامل ہو جائے گی۔ اچھا مقصد تو یوں کہ ایک واقعی ضرورت مند ہے یا مظلوم ہے، اور وہ کسی سے اپنا حق طلب کرتا ہے یا کسی سے کوئی امداد چاہتا ہے، اور آپ مناسب طریقے سے سفارش کریں کہ دوسرے پر کوئی رُعب ڈالنا اور وجاہت کا اثر ڈالنا مقصود نہیں ہے، کہ وہ آپ کے سامنے مجبور ہو جائے آپ کی بات ماننے پر، اور دِل کے تقاضے کے مطابق وہ عمل نہ کر سکے، تو یہ سفارش باعثِ ثواب ہے، ورنہ اگر سفارش کرنے والا اُس کو مجبور کرے اور اسی طرح اُس پر کوئی وجاہت کا اثر ڈالے اور وہ شخص بطیبِ خاطر اس مسکین کی امداد نہ کرے، شرما شرمی کرے، یا آپ کے رُعب میں آ کر امداد کر دے، تو آپ کے سامنے پہلے یہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ'' کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہوتا مگر اس کے دل کی خوشی کے ساتھ،[3] تو یوں دباؤ ڈال کر، رُعب ڈال کر اور وجاہت کا اثر ڈال کر اُس کی

(۱) سنن الترمذی ۲/ ۹۵، باب ماجاء الدال علی الخیر/ مسند البزار ج۵ ص۱۵۰/ الادب المفرد ج۱ ص۱۲۷/ مسند احمد ج۷ ص۱۳۲۔

(۲) بخاری ۱/ ۱۹۲، باب التحریض علی الصدقة والشفاعة/ مشکوٰۃ ص۴۲۲، باب الشفقة، فصل اول، عن ابی موسیٰ۔

(۳) سنن دار قطنی ۳/ ۴۲۴، رقم: ۲۸۸۵۔ نیز مشکوٰۃ ۱/ ۲۵۵، باب الغصب پر الفاظ یہ ہیں: الا لا یحل مال امرئٍ الا بطیب نفس منه۔

مرضی کے خلاف اس سے پیسے نکلوا کرکسی مسکین کی امداد کروادی جائے تو یہ اچھی بات نہیں ہے، مقصد چاہے نیک تھا لیکن طریقۂ کار اچھا اختیار نہیں کیا گیا، یا مدرسے کا چندہ کرنے کے لئے کوئی ناجائز ذریعہ اختیار کیا جائے اور اُس ناجائز ذریعے کے ساتھ امداد وہاں پہنچائی جائے، یہ ساری کی ساری صورتیں شفاعتِ حسنہ کے خلاف ہیں۔

سفارش کا ماننا ضروری نہیں ہوتا...... حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

پھر شفاعتِ حسنہ کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ آپ سفارش کردیں، متوجہ کردیں، ترغیب دے دیں، دوسرے کے لیے اس کا ماننا ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا مان بھی لے، اور اگر وہ نہ مانے تو سفارش کرنے والے کے لئے کوئی ناراضگی نہیں ہونی چاہیے، سفارش کا یہ درجہ ہے، اور اگر سفارش کرنے والا ناراض ہوجائے کہ میری سفارش کیوں نہیں مانی گئی، تو یہ سفارش نہیں، یہ حکم ہے، حکم اور سفارش کے درمیان فرق ہوتا ہے، ایک ہے کہ ایک بڑا چھوٹے کو حکم دے دے کہ یوں کام کر، اس میں تو اس کے درجے کے مطابق تعمیل ضروری ہے، اور ایک ہے مشورہ اور سفارش، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی رائے ظاہر کردی جائے، باقی! دوسرے کو عمل کا اختیار ہے کہ قبول کرے یا نہ کرے، اور اگر وہ قبول نہیں کرتا تو سفارش کرنے والے کو کوئی ناراضگی نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ حدیث شریف میں واقعہ موجود ہے، جس وقت بریرہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کردیا گیا، یہ باندی تھیں اور منکوحہ تھیں، ان کا نکاح ہوچکا تھا، ان کے شوہر کا نام مغیث ہے، وہ پہلے غلام تھا، بعد میں آزاد ہوگیا، جب بریرہ رضی اللہ عنہا کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے آزاد کیا گیا تو ان کا شوہر ان سے پہلے آزاد ہوچکا تھا، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شرعی مسئلے کو واضح کرتے ہوئے بریرہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا کہ تجھے اختیار ہے، چاہے تو مغیث رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح باقی رکھ اور چاہے نہ رکھ، جس کو آپ ''خیارِ عتق'' سے تعبیر کرتے ہیں کہ جب کوئی باندی آزاد ہوجائے تو اُس کو اجازت ہے کہ پہلا نکاح جو اس کے مولیٰ کے زمانے میں ہوا ہے اُس کو باقی رکھے یا توڑ دے، اس کو ''خیارِ عتق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس طرح ''خیارِ بلوغ'' کا ذکر آپ کی کتابوں میں آتا ہے، کہ اگر باپ اور دادے کے علاوہ کسی دوسرے متولی نے نابالغ لڑکی کا نکاح کردیا تو بالغ ہوتے ہی اُس کو اعتراض کرکے اپنا نکاح تڑوانے کا حق ہے، اس کو ''خیارِ بلوغ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگر باپ یا دادے کا کیا ہوا نکاح ہو تو اُس کے خلاف اپیل نہیں ہوسکتی، ہاں البتہ اگر ان کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہے، جیسے چچا نے کیا ہے، چچا کے بیٹے نے کیا ہے، بھائی نے کیا ہے، ان میں سے کسی نے اگر نابالغ لڑکی کا نکاح کردیا تو یہ مسئلہ ہے کہ بالغ ہوتے ہی وہ کہہ دے کہ مجھے یہ نکاح منظور نہیں ہے، تو ایسی صورت میں وہ نکاح فسخ ہوسکتا ہے۔ تو جیسے ''خیارِ بلوغ'' ہے اسی طرح ''خیارِ عتق'' بھی ہے۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''خیارِ عتق'' کا مسئلہ واضح فرمایا، بریرہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا کہ تیری مرضی تُو اس نکاح کو باقی رکھ یا توڑ دے، بریرہ رضی اللہ عنہا اس نکاح کو توڑنے کے لئے آمادہ ہوگئی، اس نے نکاح فسخ کردیا، مغیث رضی اللہ عنہ کو بریرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بہت محبت تھی، وہ بیچارہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں بریرہ کے پیچھے پیچھے روتا پھرتا تھا، اور بریرہ اس کی طرف جھانکتی بھی نہیں تھی، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عباس! دیکھو مغیث کو بریرہ کے ساتھ کتنی محبت ہے، اور بریرہ کو مغیث کے ساتھ کس قدر بغض ہے! تو اس مغیث کا حال دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش کی اور کہا کہ بریرہ! کیا ہی

اچھا ہو کہ تُو اس کی طرف رُجوع کر لے۔ بریرہؓ باوجود اس بات کے کہ باندی تھی لیکن اتنی سمجھ اُس کو ہو چکی تھی ایک اسلامی معاشرے میں رہنے کی وجہ سے، کہ مشورے میں اور حکم میں فرق ہوتا ہے، وہ پوچھتی ہے کہ یارسول اللہ! اگر حکم ہے تو سرآنکھوں پر، آپ ﷺ نے فرمایا کہ حکم نہیں، مشورہ ہے، تو کہنے لگی پھر مجھے ضرورت نہیں، مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[1] جب شارع علیہ السلام کے مشورے کو بھی کوئی اپنی صوابدید کے مطابق رَدّ کر دے تو یہ نہ کوئی معصیت ہے اور نہ اس میں کوئی ناراضگی کی بات ہے، تو کسی دوسرے کا درجہ کیا ہو سکتا ہے!

مشورہ، سفارش اور حکم میں فرق

اس لئے مشورے میں سفارش میں اور حکم میں فرق ہوتا ہے، حکم کی مخالفت نہیں کی جاسکتی بشرطیکہ حکم دینے والا آپ پر کوئی حق رکھتا ہو حکم دینے کا، جس درجے کی اطاعت واجب ہے اُس درجے کا حکم ماننا ضروری ہے، اور اگر مشورہ دیا جائے تو چاہے بڑے کی طرف سے ہو، چاہے چھوٹے کی طرف سے ہو، اسی طرح اگر سفارش کی جائے چاہے بڑے کی طرف سے ہو چاہے چھوٹے کی طرف سے ہو، پھر انسان اپنی صوابدید کے مطابق اس کو قبول بھی کر سکتا ہے اور رد بھی کر سکتا ہے، اُس کی یہ شرعی حیثیت نہیں کہ اُس کو ضرور مانو، اور اُس کے رد کرنے کی صورت میں سفارش کرنے والے کو ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ اگر یہ ناراض ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہ سفارش کا مفہوم نہیں سمجھتا، یا یہ سفارش نہیں بلکہ حکم ہے۔ تو شفاعتِ حسنہ کے اندر یہ بات ہوا کرتی ہے کہ مقصد اچھا ہو، اس کے لئے طریقہ کار اچھا ہو، اور سفارش کرنے والا اپنی رائے ظاہر کر کے فارغ ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد اس کا منوانا یا دوسرے کا ماننا کوئی ضروری نہیں ہوتا۔

بُری سفارش اور اس پر ایک واقعہ

اور اس کے مقابلے میں شفاعتِ سیئہ ہے، یعنی بُری سفارش، کہ غلط مقصد کے لئے کی جائے، جیسے ایک مجرم پکڑا گیا اور اُس پر شرعی سزا جاری ہو رہی ہے، اور آپ اُس کو بچانے کے لئے سفارش کرتے ہیں، ظالم کی سفارش کرتے ہیں تاکہ اُس کو سزا نہ ہو تو یہ بُرا مقصد ہے اور یہ شفاعت شفاعتِ سیئہ ہے۔ اس کے مطابق بھی واقعہ ایک حدیث شریف میں آتا ہے، کہ فتح مکہ کے موقع پر جب حضور ﷺ مکہ معظمہ میں تشریف لائے تھے، اور آپ کے اختیارات وہاں قائم ہو چکے تھے، اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی، قریش کا ایک خاندان تھا بنومخزوم، ان کی ایک لڑکی تھی فاطمہ نامی، مالیات کے بارے میں کچھ اُس کی عادت خراب تھی، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اُس کی عادت تھی کہ ''تَسْتَعِيْرُ الْمَتَاعَ ثُمَّ تَجْحَدُهٗ'': لوگوں سے مانگ کر کوئی چیز لیتی، بعد میں انکار کر دیتی کہ میں نے تو لی ہی نہیں ہے، لوگوں کا مال منگوا لیتی جو استعمال کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، پھر بعد میں دبا لیتی، تو مالیات کے بارے میں کچھ غیر محتاط تھی، اور وہ چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی، سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں مقدمہ پیش ہو گیا اور چوری کا ثبوت ہو گیا، تو یہ مسئلہ ہے کہ جب حاکمِ وقت کے سامنے حدِ شرعی کا ثبوت مہیا ہو جائے تو پھر اُس حد کے معاف کرنے کا اختیار حاکم کو بھی نہیں ہے، یہ

(۱) صحیح البخاری ۲/ ۷۹۵ باب شفاعة النبی ﷺ / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۶ باب المباشرۃ سے اگلا باب عن ابن عباسؓ۔

حق اللہ ہے، اِس کو حاکم معاف نہیں کرسکتا، ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ کسی چور کو پکڑ لیں اور اُس کو وہیں معاف کر دیں، اپنا سامان اس سے لے لیں یا سامان بھی چھوڑ دیں، اور مقدمہ عدالت میں نہ لے کر جائیں ایسا ہو سکتا ہے، یعنی صلح چور کے ساتھ ہو سکتی ہے، عدالت میں جانے سے پہلے پہلے آپ کو صلح کرنے کا شرعی حق ہے، آپ اپنا حق معاف کر دیں، چور کے اوپر گرفت نہ کریں، یا مال اُس سے واپس لے لیں، اور اُس کی کوتاہی پر اُس کو معافی دے دیں، آپس میں مل جل کر اس قسم کی کارروائی کر لی جائے اس کا شرعی حق ہے، لیکن جس وقت حاکم کے سامنے جرم پہنچ جائے اور اُس پر شہادت ہو جائے پھر اِس کے معاف کرنے کا اختیار حاکم کو نہیں ہے، یہ حد حق اللہ ہے، حق العبد نہیں ہے، ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد اس کو کوئی شخص معاف نہیں کرسکتا۔ جب حضور ﷺ کے سامنے اُس کی چوری پر شہادت ہوگئی تو آپ ﷺ نے قطع ید کا فیصلہ فرمادیا کہ اِس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اب وہ خاندان چونکہ بہت معزز تھا، یہ لڑکی قریش میں سے تھی، بہت فکر مند ہوئے کہ اس میں تو بڑی رسوائی ہے کہ ہماری لڑکی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، لیکن ڈرتا ہوا سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے سفارش کے لئے کوئی نہیں جاتا، سوچنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ حِبُّ رسولِ اللہ، یہ حضور ﷺ کے سامنے سفارش کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، کیونکہ اُسامہ رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کو بہت محبت تھی، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا متبنّیٰ بنالیا تھا، جو ''زید بن محمد'' کہلاتے تھے اور پھر سورۂ اَحزاب کی آیات اُترنے کے بعد اس نسبت کو ختم کیا گیا اور یہ ''زید بن حارثہ'' کہلائے، ورنہ متبنّیٰ بننے کے بعد وہ ''زید بن محمد'' کہلاتے تھے، ان سے بھی حضور ﷺ کو بہت محبت تھی، اور پھر ان کے بیٹے اُسامہ، یہ اُمِّ اَیمن رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے ہیں، اُمِّ اَیمن جو حضور ﷺ کے والد کی باندی تھی، اور جس نے حضور ﷺ کی بھی خدمت کی تھی بچپن میں، تو اس اُمِّ اَیمن کی شادی آپ ﷺ نے زید سے کردی تھی اور اُس سے اُسامہ پیدا ہوئے، تو گویا کہ دونوں نسبتوں سے حضور ﷺ ان کو عزیز رکھتے تھے، زید رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بھی اور اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا کی نسبت سے بھی، ان کے ساتھ بہت محبت تھی، اس لئے حدیث شریف میں جب ان کا ذکر آتا ہے تو ان کو ''حِبُّ رسولِ اللہ'' کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کے محبوب، حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کی طرح حضور ﷺ ان کے ساتھ پیار کرتے تھے۔ انہیں کہا تو یہ سفارش کرنے کے لئے تیار ہوگئے، سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اور اس سلسلے میں بات کی تو یہ بات سنتے ہی حضور ﷺ کو انتہائی غصہ آگیا، چہرۂ مبارک سُرخ ہوگیا، اور فرمانے لگے: ''اَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللهِ'': اللہ تعالیٰ کی حدوں میں سے کسی حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ پہلی اُمتیں اسی لئے ہلاک ہوگئیں کہ جب ان کے اندر کوئی بڑا شخص چوری کرتا تھا تو اُس کو چھوڑ دیتے تھے، اور کوئی غریب آدمی چوری کر لیتا تھا تو اُس پر سزا جاری کر دیتے تھے، اور تم ہم سے بھی یہی چاہتے ہو کہ چونکہ یہ قریش کی لڑکی ہے اور بڑے خاندان کی ہے اس لئے اس کو سزا نہ دی جائے؟ اور اگر کسی غریب خاندان اور غریب گھر کی لڑکی ہوتی تو کوئی اُس کو بچانے کی کوشش نہ کرتا، پہلی اُمتوں پر بربادی اسی راستے سے آئی ہے کہ بڑوں پر قانون کو جاری نہیں کرتے تھے اور چھوٹوں کا رگڑا نکالتے تھے، اُس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا'': کہ تم اس فاطمہ بنی مخزوم کی بات کرتے ہو، اگر میری بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔[1] اب اس قسم کی سفارش جو کسی مجرم کی کی جائے اور اس

(۱) بخاری ۱/ ۴۹۴ باب حدیث الغار، نیز ج ۲ ص ۶۱۶/ مسلم ۲/ ۶۴ باب قطع السارق الخ/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۱۴ باب الشفاعة فی الحدود عن عائشة۔

کو شرعی قانون کے لاگو ہونے سے بچانے کی کوشش کی جائے، کہ ظالم کسی گرفت میں آ گیا اور اس ظالم کو بچانے کے لئے جو سفارش کی جائے گی یہ شفاعت سیئہ ہے، یہ شفاعت حسنہ نہیں، یہ تو برے مقصد کے لئے ہوئی۔ یا اسی طرح مقصد اچھا ہے لیکن طریقہ کار برا اختیار کیا گیا ہے، جیسے پہلے میں نے آپ کی خدمت میں مثال دے دی، یہ شفاعت سیئہ ہے، اس کا گناہ ہوگا۔ ''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے'' یہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو ذکر فرمایا کرتے ہیں احکام کی اہمیت کو بڑھانے کے لئے، تا کہ ان پر عمل کی فکر انسان کے دل میں پیدا ہو جائے۔

مختلف قوموں کے استقبالیہ الفاظ اور اسلام کی تعلیم

آگے ''تحیہ'' کا مسئلہ آ گیا، جب دو شخصوں کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے تو اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں بھی کچھ ایسے الفاظ مروّج تھے جو ایک دوسرے کے سامنے اِستقبال کے طور پر تطییبِ خاطر کے لئے بولے جاتے تھے، جیسے عرب میں رواج تھا: ''اَهْلًا وَّسَهْلًا وَّمَرْحَبًا'' یہ الفاظ کہنے کا، یا کسی سے ملاقات ہوتی تو اسے کہتے: ''حَیَّاكَ اللهُ اَنْعِمْ صَبَاحًا، اَنْعَمَ اللهُ بِكَ عَیْنًا''، صبح کے وقت تو خوش ہو جا، اللہ تعالیٰ تیری آنکھیں ٹھنڈی کرے، اس قسم کے الفاظ ملاقات کے وقت کہے جاتے تھے، یا جیسے انگریزی میں الفاظ ہیں، لوگ جس وقت آپس میں ملتے ہیں تو ''گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ، گڈ نائٹ''، صبح اچھی ہو، شام اچھی ہو، رات اچھی ہو، اس قسم کے لفظ ملاقات کے وقت بولتے ہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ رواج تھا، لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے کا جو طریقہ بتایا ملاقات کے وقت آپس میں الفاظ بولنے کا، ایسے الفاظ بولنے کی بھی اجازت ہے جس کے اندر کوئی کفر، شرک کا معنی نہ پایا جاتا ہو اور کسی کافر قوم کا شعار نہ ہو، ایسے دُعائیہ الفاظ بھی بولے جا سکتے ہیں، لیکن اِبتدا لفظِ ''سلام'' سے ہونی چاہیے ''السلام علیکم''۔

سلام کی اہمیت وفضیلت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا تھا تو آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد آدم علیہ السلام سے کہا تھا فرشتوں کی ایک جماعت کے متعلق کہ ان کو جا کر کہو السلام علیکم، پھر سنو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں، آدم علیہ السلام نے جا کر السلام علیکم کہا، فرشتوں نے ''وَعَلَیْكُمُ السَّلَامُ'' کے ساتھ جواب دیا[1] تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم! یہی سلام ہے تیرا اور تیری اولاد کا آپس میں۔ گویا کہ اِس سلام کی تعلیم اللہ کی طرف سے ہوئی اور آدم علیہ السلام سے اس کو شروع کیا گیا، بنی آدم کے اندر اسی طریقے کو اللہ کی طرف سے پسند کیا گیا، کہ جب آپس میں ملاقات ہو تو ایک دوسرے کو کہو السلام علیکم، اور لفظ سلام اصل کے اعتبار سے آپس میں تعلق اور محبت کی علامت قرار پایا۔ جب آپس میں تعلق اور محبت ہوتا ہے تو بھی آپس میں السلام علیکم کہا جاتا ہے، اور جہاں محبت پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے وہاں بھی السلام علیکم کہا جاتا ہے، حدیث شریف میں ترغیب اسی طرح آئی ہے، مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے کتاب الآداب باب السلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی

(۱) ابن حبان، رقم: ۶۱۶۷۔ نوٹ: فرشتوں کے جواب کے دیگر الفاظ بھی مروی ہیں جیسے السلام علیک ورحمۃ اللہ (بخاری) وغیرہ۔

شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؛ أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ!"[1] او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام ،تم ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک کہ تم ایمان نہ لاؤ، اور تم کامل مؤمن نہیں سمجھے جاؤ گے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو، جب تک آپس میں محبت سے نہ رہو اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہیں ہے، اور کیا میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتادوں کہ جب تم کیا کرو گے تو آپس میں محبت پیدا ہوجائے گی، أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ آپس میں سلام کو ظاہر کیا کرو، جب تم دوسرے کو السلام علیکم کہو گے اور دوسرا وعلیکم السلام کہے گا تو ان الفاظ کی یہ تاثیر ہے کہ جس کے ساتھ اس طرح علیک سلیک ہوجائے تو آپس میں تعلق بھی ہوجاتا ہے اور محبت بھی ہوجاتی ہے۔ اس لئے کثرت کے ساتھ سلام کہنے کی ترغیب دی گئی کہ چاہے کسی کو پہچانو چاہے کسی کو نہ پہچانو سلام کہا کرو، بلکہ سلام معرفت کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا گیا ہے، جس طرح آج کل عام طور پر سلام کہتے ہیں اس کو سلامِ معرفت کہا جاتا ہے، کہ کوئی جان پہچان والا سامنے آگیا تو السلام علیکم، اور اگر کسی کے ساتھ جان پہچان نہیں ہے تو توجہ ہی نہیں، اس کو کہتے ہیں سلامِ معرفت، اور یہ علاماتِ قیامت میں ہے کہ لوگوں کے اندر یہی سلام جاری ہوگا، کہ جان پہچان ہوگی تو السلام علیکم کہیں گے، جان پہچان نہیں ہوگی تو السلام علیکم بھی نہیں کہیں گے،[2] حالانکہ صراحت کے ساتھ حدیث شریف میں ترغیب دی گئی ہے کہ چاہے کسی کو پہچانو چاہے کسی کو نہ پہچانو سلام کہا کرو: "عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ"[3] جس کو پہچانتے ہو اس کو بھی سلام کہو اور جس کو نہیں پہچانتے اس کو بھی سلام کہو، ابتداءً سلام کہنے والا اللہ کا محبوب ہے اور جو پہلے سلام کہے اس کو افضل قرار دیا گیا بمقابلہ اس کے جو سلام کا جواب دیتا ہے،[4] تو سلام کہنا سنت ہے اور اس کی کثرت مطلوب ہے، یہاں تک ہے کہ گھر جاتے ہو تو گھر میں بھی سلام کہہ کے داخل ہو، کسی مجلس میں گئے ہو تو مجلس میں جا کر بیٹھو تو سلام کہہ کر بیٹھو، اٹھ کر آؤ تو سلام کہہ کر آؤ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بازار میں اسی نیت کے ساتھ جایا کرتے تھے، کہ وہاں لوگوں کے ساتھ ملاقات کثرت سے ہوتی ہے تو ہم کثرت سے السلام علیکم کہیں گے، حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اسی غرض سے بازار جاتے تھے، انہوں نے یہی بتایا کہ ہم تو اس لئے جاتے ہیں کہ لوگوں سے ملاقات ہوگی اور ہم السلام علیکم کہیں گے۔[5]

کفار کو سلام کہنے اور جواب دینے کے متعلق مسائل

البتہ کافر کو ابتداءً بالسلام نہیں کرنی چاہیے، اور اگر کوئی کافر السلام علیکم کہہ دے پھر اگر آپ کو یہ مغالطہ لگ جائے یا تحقیق ہوجائے کہ اس نے السلام علیکم لفظ صحیح نہیں ادا کیا، بلکہ یہودیوں کی طرح السام علیکم کہہ دیا ہے اور لام کھا گیا ہے، جیسے یہودی سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آیا کرتے تھے تو السلام علیکم کی بجائے السام علیکم کہتے تھے، لام کو حذف کر جاتے تھے، اور یہ دُعا

---

(۱) صحیح مسلم ۱/ ۵۴ باب بیان انہ لایدخل الجنۃ/مشکوۃ ۲/ ۳۹۷ باب السلام، فصل اول، عن ابی ھریرۃؓ۔

(۲) مسند احمد، رقم: ۳۶۶۴ ولفظہ: إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ إِذَا كَانَتِ التَّحِيَّةُ عَلَى الْمَعْرِفَةِ/ نیز مسند احمد، رقم: ۳۸۴۸/ مستدرک حاکم، رقم: ۷۹۸۳۔

(۳) بخاری ج ۱ ص ۶۔ مشکوۃ ۲/ ۳۹۷ باب السلام، فصل اول۔

(۴) ابوداؤد ۲/ ۳۵۰، باب فی فضل من بدأ بالسلام/ نیز بخاری ۲/ ۸۹۷، باب الھجر الخ/ مسلم ۲/ ۳۱۶، باب تحریم الھجر/ مشکوۃ ۲/ ۴۲۷، باب ما ینھی...الخ

(۵) مشکوۃ ص ۴۰۰ باب السلام، فصل ثالث، عن الطفیل/ موطا امام مالک ج ۲ ص ۹۶۱۔

کی بجائے بددُعا بن جاتی، سام موت کو کہتے ہیں، کہ تم پر موت ہو۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں ایک یہودی آیا اور اُس نے اسی طرح سلام کہا تو آپ رضی اللہ عنہا نے اُس کو بُرا بھلا کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سختی نہ کرو، نرم زبان استعمال کرو، وہ کہنے لگیں: یا رسول اللہ! آپ نے سنا نہیں کہ اس نے کیا کہا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے سُن لیا ہے، میں نے بھی علیکم کہہ دیا ہے، یعنی علیکم کا مطلب یہ ہے کہ تم پر یہ ہو، ان کی بددُعا میرے لئے قبول نہیں ہوگی، میری بددُعا ان کے لئے قبول ہوجائے گی۔[1] تو چونکہ یہود اس قسم کی شرارت کیا کرتے تھے اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی کہ اگر کوئی یہودی سلام کہے تو اس کو علیکم کے ساتھ جواب دے دیا کرو، اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، بعض روایتوں میں علیکم ہے اور بعض روایتوں میں وعلیکم ہے، بہرحال آگے سلام کا لفظ نہیں ہے، لیکن ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ صراحتاً لکھا ہے کہ اگر کسی کافر نے شرارت نہیں کی اور صحیح طور پر السلام علیکم کہا ہے تو اُس کے جواب میں صرف وعلیکم کہہ دیا جائے تو بھی گنجائش ہے، اور وعلیکم السلام کہہ دیا جائے تو بھی گنجائش ہے، بلکہ اگر کوئی مصلحت ہو اس کو مانوس کرنے کی یا اسی طرح دفعِ ضرر یا کسی اور مصلحت کے تحت ابتداءً بھی کافر کو سلام کہا جائے تو ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کی اجازت ہے۔

''سلام'' کے متعلق مزید کچھ مسائل

اور سلام کہتے وقت آپس میں بھی موقع محل کو دیکھنا چاہیے، جیسے کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کو سلام نہ کہیں، کوئی پیشاب پاخانے میں مشغول ہے تو اُس کو سلام نہ کہیں، توجہ کے ساتھ کوئی کھانا کھا رہا ہے یا مطالعے کے اندر مشغول ہے سلام کہنے سے اس کی توجہ ہٹے گی تو اس کو بھی سلام نہ کہیں، اور ایسے مواقع پر اگر سلام کہہ دیا جائے تو جواب واجب نہیں ہے، عام حالات میں جس وقت سلام کہا جائے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ اس کے دیگر احکام حدیث شریف میں آتے رہتے ہیں، موٹی موٹی باتیں یہی ہیں جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئیں۔ بہرحال اس میں کثرت مطلوب ہے، جب بھی ملاقات ہو ایک دوسرے کو السلام علیکم کہو، یہاں تک کہ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دو آدمی آپس میں مل کر چلے جا رہے ہوں، اور جاتے جاتے راستے میں درخت آ گیا اور ایک اِدھر سے ہو گیا اور ایک اُدھر سے ہو گیا، یہ ایک لمحے کے لئے جو آپس میں غیوبت ہوئی ہے، پھر بھی جب آمنا سامنا ہو تو السلام علیکم کہو۔[2] اس لیے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ابھی تو ملے تھے ابھی پھر السلام علیکم؟، بلکہ جب بھی غیوبت کے بعد آمنا سامنا ہو تو کلام کی ابتدا السلام علیکم کے ساتھ ہونی چاہیے۔

سلام کی حقیقت...... ذِکر، دُعا اور پیغامِ امن

''اَلسَّلَامُ'' اللہ کے اسماء میں داخل ہے، اور ویسے اس کا معنی ہے سلامتی، تو جب ہم السلام علیکم کہیں گے تو اس میں اللہ کا ذکر بھی آ گیا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ چونکہ سلام ہے، سلامتی دینے والا ہے، وہ تمہیں سلامتی نصیب فرمائے، اس میں دُعا کا

(۱) بخاری ۸۹۱/۲ باب لم یکن النبی فاحشا/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۹۸، باب السلام فصل اول، عن عائشۃؓ۔

(۲) سنن ابی داؤد ۳۵۱/۲ باب فی الرجل یفارق الرجل ثم یلقاہ ایسلم علیہ/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۹۹ باب السلام فصل ثانی، عن ابی ہریرہؓ۔

مفہوم بھی ہے، اور اس سلامتی کی دعا میں دنیا کی آفات اور آخرت کی آفات سے سلامتی ہے، تو یہ اللہ کا ذکر بھی ہے اور دُعا بھی ہے، اور پھر ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے لئے امن کا پیغام بھی ہے کہ جب آپ کسی کو السلام علیکم کہہ دیں گے تو گویا کہ آپ نے اُس کو مطمئن کر دیا کہ میری طرف سے آپ کے لئے سلامتی ہے، جان مال اور عزت کا کوئی نقصان آپ میری طرف سے محسوس نہ کریں، میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا، اور جب وہ بھی کہہ دے گا وعلیکم السلام تو ایسی صورت میں اُس کی طرف سے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار ہو گیا، تو ایک دوسرے کے لئے گویا کہ امن اور سلامتی کا پیغام ہے، اور یہی پھر ذریعہ بنتا ہے محبت کے پیدا ہونے کا۔ بہر حال یہ الفاظ اُن تمام الفاظ سے اچھے ہیں جو مختلف قسم کے لوگوں کے درمیان رائج تھے۔

''السلام علیکم'' پر اِضافے کے متعلق تفصیل

اور یہ کہا گیا کہ جو تمہیں سلام کہے تم کوشش کیا کرو اُس سے اچھا جواب دینے کی، مثلاً اگر کسی نے ''السلام علیکم'' کہا تو آپ ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' کہہ لیجئے، اور اگر کسی نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہا تو آپ ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہہ دیجئے، اور اگر اس نے بھی ''برکاتہ'' کا لفظ بڑھا دیا تو ''برکاتہ'' پر اضافہ سُنّت نہیں ہے، اگرچہ مشکوٰۃ شریف کی ایک روایت میں ''ومغفرتہ'' کا اضافہ بھی ہے لیکن عام روایات میں ''مغفرتہ'' کا اضافہ نہیں بلکہ صرف ''برکاتہ'' تک ہے، اس لئے مفسرین نے لکھا ہے کہ سُنّت یہاں تک ہی ہے، اگرچہ ''مغفرتہ'' کا اضافہ جائز ہے، اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس قدر یہ لفظ بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر نیکیوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، ''السلام علیکم'' کہو تو دس نیکیاں، ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہو تو بیس نیکیاں، اور اگر ''برکاتہ'' کا اضافہ کر لو تو تیس نیکیاں،[1] اور جس روایت میں ''مغفرتہ'' کا اضافہ آیا ہوا ہے کہ ایک کہنے والے نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے لئے چالیس نیکیاں ہیں، مشکوٰۃ شریف میں یہ روایت موجود ہے (حوالہ مذکورہ)۔ بہر حال جواب دیتے وقت اس سے اچھا جواب دو کہ جیسے اس نے سلام کہا ہے ویسے سلام کہو یا اس سے اچھے الفاظ استعمال کرو، لیکن اگر اُس نے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور تم کم لفظ استعمال کرو تو بالاجماع یہ بھی جائز ہے، مثلاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے والے کے جواب میں صرف وعلیکم السلام کہہ دیا جائے یہ بھی کافی ہے، وجوب اس کے ساتھ ادا ہو جاتا ہے، جذبات اچھے ہونے چاہئیں اور الفاظ میں وسعت ہونی چاہیے، یہ زیادہ مطلوب ہے۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ: اور جس وقت تمہیں کوئی دُعا دی جائے، لفظی معنی تو یہی ہے، لیکن مراد یہاں یہ ہے کہ سلام کہا جائے، کیونکہ ''تحیہ'' اب عُرفِ شرع میں سلام کے ساتھ مخصوص ہو گیا، فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ: تو تم سلام کہا کرو اس سے اچھے تحیہ کے ساتھ، تم تحیہ کیا کرو اس کو اس سے اچھے تحیہ کے ساتھ، اُس کو دُعا دیا کرو اس سے اچھے الفاظ کے ساتھ، اَوْ رُدُّوْهَا: یا اُسی کو لوٹا دیا کرو۔ تو لوٹانا واجب ہے، اور اِبتداءً سلام کہنا سُنّت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محاسب ہے، حساب لینے والا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/ ۳۵۰ باب کیف السلام / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۹۸ باب السلام، فصل ثانی۔

عورتوں کو سلام کرنے کے متعلق تفصیل

سوال:-عورت کو سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ مسئلہ کچھ تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے، عورت سے کیا مراد ہے؟ ماں بھی عورت ہے، بہن بھی عورت ہے، بیٹی بھی عورت ہے، بیوی بھی عورت ہے، ماں کو سلام کہو یہ بالکل ٹھیک ہے، بہن کو کہو، بیٹی کو کہو، بیوی کو کہو اور سلام کے ساتھ ساتھ ان سے مصافحہ بھی کیا جا سکتا ہے، محارم کے ساتھ مصافحہ درست ہے، اور اگر وہ عوت اس درجے کی ہے کہ اگر چہ وہ آپ کی قانوناً محارم نہیں ہے، لیکن ہے محرموں کی طرح۔ قانوناً محرم جیسے پھوپھی قانوناً محرم ہے، خالہ محرم ہے، ان کے علاوہ محلے کی کچھ عورتیں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا احترام انسان اسی طرح کرتا ہے جس طرح ماؤں بہنوں کا کرتا ہے، چچے کی بیٹیاں ہیں، چچی ہے، ممانی ہے یعنی ماموں کی گھر والی، اگر چہ یہ قانوناً محرم نہیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ معاملہ ایسے ہوا کرتا ہے جیسے محرموں کے ساتھ ہے، آپس میں موانست ہوتی ہے، اگر کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی عورتوں کو بھی السلام علیکم کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح متعدد عورتیں بیٹھی ہوں جن میں فتنے اور شرارت کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو ایسی صورت میں بھی السلام علیکم کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ممانعت صرف ایک صورت میں ہوگی کہ عورت اجنبی ہے اور سلام کو کسی فتنے کی بنیاد بنا لینے کا اندیشہ ہو، یا وہ عورت ایسی ہے جس کے ساتھ آپ کا کسی قسم کا اُنس نہیں اور آپس میں کوئی واقفیت بھی نہیں، آپ اُس کو السلام علیکم کہیں گے تو خطرہ ہے کہ اُس کو شرارت نہ سمجھ لے اور سڑک پر ہی جوتا اُتار کر نہ کھڑی ہو جائے، ایسی صورت میں سلام نہیں کہنا چاہیے۔ جہاں فتنے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کو کسی فتنے کی بنیاد نہ سمجھا جائے ایسی صورتوں میں عورتوں کو سلام کہہ سکتے ہیں چاہے وہ محرَم ہوں چاہے وہ غیر محرَم ہوں، محرموں میں تو فتنے کی گنجائش نہیں ہوتی، لہٰذا وہاں تو سلام کہنے کی ترغیب ہے، اور غیر محرموں کی تفصیل یہی ہے کہ جہاں فتنے کی بنیاد بننے کا اندیشہ ہو وہاں السلام علیکم نہ کہیں، اور جہاں فتنے کی بنیاد نہ ہو وہاں سلام کہہ سکتے ہیں، اسی طرح چھوٹی بچیوں کو کہہ سکتے ہیں، بوڑھیوں کو کہہ سکتے ہیں، جن کے ساتھ آپس میں موانست ہے، بہن بھائیوں کی طرح محلے میں رہنے والی لڑکیاں ہیں، اپنے خاندان کی لڑکیاں ہیں، سب کو معلوم ہے کہ آپس میں ایسے تعلقات ہیں جیسے بہن بھائیوں کے ہوتے ہیں، بوڑھی ہے، اُتاں ہے، اُتاں کے درجے کی ہے، تو ایسی صورت میں سلام کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ کہنا چاہیے۔

سوال:-اگر کوئی اجنبی عورت از خود سلام کرے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب:- جواب دِل میں دے دے یا آہستہ دے دے، ایسے طور پر نہ ہو جو آپس میں وجہِ ربط بن جائے، اگر کوئی ایسی عورت سلام کہہ ہی دے تو انسان جواب ایسے انداز سے دے جس میں کوئی محبت کا اظہار نہ ہو جو فتنے کی بنیاد بن جائے، دبی زبان سے کہہ لے، یا رُخ دُوسری طرف کر کے جواب دے دے، یعنی اس کو ربط کی بنیاد نہ بنایا جائے، اصل میں بچنا اسی سے مقصود ہے کہ یہ سلام آپس میں کسی فتنے کا دروازہ نہ کھول دے، بلکہ محض ایک اسلامی معاشرے کے شعار کے طور پر اور سُنّت کے طور پر اس کو اپنایا جائے اور اس کو کسی فتنے کی بنیاد نہ بنایا جائے، یہ تفصیل ہے عورت کو سلام کہنے کے بارے میں۔ حدیث شریف میں آیا ہے

کہ ایک صحابیہ کہتی ہیں کہ ہم عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، حضور ﷺ پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے السلام علیکم کہا،(۱) تو کہنے والا اگر بزرگ آدمی ہے جس کے دل میں اس قسم کی کوئی بات نہیں، وہ کہے تو بھی ٹھیک ہے، اور عورت کہنے والی ایسی ہے جس کے متعلق پتا ہے کہ یہ محض ایک اسلامی طریقے کے مطابق سلام کر رہی ہے، اس کے دل میں کسی قسم کی ایسی بات نہیں ہے تو سلام کا جواب دیا جاسکتا ہے، مطلقاً عورت کے لئے سلام ممنوع نہیں ہے، اس میں یہی تفصیل ہے کہ جہاں فتنے کا اندیشہ ہو اور اس کو شرارت کی بنیاد بنائے جانے کا احتمال ہو وہاں احتراز کرنا چاہیے۔

مصافحہ، معانقہ، تقبیل

اور پھر "تَمَامُ تَحِيَّاتِكُمْ بَيْنَكُمُ الْمُصَافَحَةُ"(۲) سلام کی تکمیل مصافحہ کے ساتھ ہوتی ہے، تو عام طور پر سلام کے ساتھ مصافحہ بھی ہوتا ہے، اس میں مزید محبت کا اظہار ہے، اور آگے معانقہ یا تقبیل درجہ بدرجہ جیسے حدیث شریف میں الفاظ آتے ہیں کہ معانقہ بھی کیا جاسکتا ہے، اور اسی طرح آپس میں جیسے محبت کا اظہار ہوتا ہے، اپنے درجے کے ساتھ روایات کے اندر ان کا ذکر بھی ہے، لیکن لفظ سلام عام طور پر استعمال کرنا چاہیے، اور اس کے ساتھ ساتھ مصافحہ یہ سلام کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔

ترغیب وترہیب

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، البتہ ضرور جمع کرے گا وہ تمہیں قیامت کے دن کی طرف" یعنی قیامت کے دن کی طرف چلاتا ہوا تمہیں اکٹھا کرلے گا، لَا رَيْبَ فِيْهِ جس کے آنے میں کوئی کسی قسم کا تردد نہیں، اور بات کے اعتبار سے اللہ کے مقابلے میں کون زیادہ سچا ہے؟ یعنی کوئی سچا نہیں اللہ کے مقابلے میں، اللہ سب سے سچا ہے، لہٰذا اُس نے یہ جو بات کہی ہے کہ قیامت آئے گی اور قیامت کے دن تم سب کو اکٹھا کیا جائے گا، یہ بالکل سچی بات ہے اور مطابق للواقع ہے، اس میں کوئی تردّد کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اَحکام ذکر کرنے کے بعد اس قسم کی آیات کا آجانا ترغیب وترہیب پر مشتمل ہوتا ہے، تاکہ اُن احکام کے ماننے اور ان پر عمل کرنے کی رغبت انسان کے دل میں پیدا ہو۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ

کیا ہو گیا تمہیں کہ منافقین کے بارے میں تم دو جماعتیں ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو لوٹا دیا ان کی پہلی حالت کی طرف ان کے کردار کے سبب سے، کیا تم ارادہ کرتے ہو

اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

کہ تم ہدایت دو ایسے شخص کو جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا، اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تو اُس کے لئے ہرگز راستہ نہیں پائے گا ﴿۸۸﴾

(۱) مشکوٰۃ، ج ۲ ص ۳۹۹ باب السلام، فصل ثانی، عن جریرؓ / مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۵ ص ۲۵۱ / مسند ابی یعلیٰ ج ۱۳ ص ۳۹۵۔

(۲) ترمذی ج ۲ ص ۱۰۲ باب ما جاء فی المصافحۃ / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۰۲ باب المصافحۃ۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ جیسے انہوں نے کفر کیا پھر ہو جاؤ تم سب برابر، پس نہ بناؤ ان میں سے

اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ

دوست جب تک وہ اللہ کے راستے میں ہجرت نہ کریں، پھر اگر وہ پیٹھ پھیریں تو تم انہیں پکڑلو

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا

اور انہیں قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ، اور نہ بناؤ ان میں سے کوئی حمایتی

وَّلَا نَصِيْرًا ۟ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ

اور نہ کوئی مددگار ۸۹ مگر وہ لوگ جو مل جائیں ان لوگوں کی طرف کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان

مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ

عہد ہے، یا آئیں وہ تمہارے پاس اس حال میں کہ ان کے دل تنگ ہوتے ہوں اس بات سے کہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی لڑیں یا

يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ

لڑائی لڑیں وہ اپنی قوم کے ساتھ، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تمہارے اُوپر مسلط کردیتا پھر وہ تم سے لڑتے، پس اگر

اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ

وہ لوگ تم سے جدا رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور ڈالیں وہ تمہاری طرف صلح تو نہیں بنایا

اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۟ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ

اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ ۹۰ عنقریب پاؤ گے تم کچھ اور لوگوں کو جو ارادہ کرتے ہیں کہ

يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ

تم سے بےخوف ہوجائیں اور اپنی قوم سے بےخوف ہوجائیں، جب کبھی ان کو فتنہ کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو وہ اس میں لوٹا دیئے

فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ

جاتے ہیں، پس اگر یہ لوگ تم سے جدا نہ رہیں اور تمہاری طرف صلح نہ ڈالیں اور تم سے اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں

فَخُذُوْهُمْ	وَاقْتُلُوْهُمْ	حَيْثُ	ثَقِفْتُمُوْهُمْ ط	وَاُولٰٓئِكُمْ	جَعَلْنَا	لَكُمْ
تو انہیں پکڑ لو اور انہیں قتل کر دو جہاں بھی تم انہیں پاؤ، یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے						
عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾						
ان کے خلاف سلطانِ مبین بنا دیا ﴿۹۱﴾						

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ: کیا ہو گیا تمہیں، منافقین کے بارے میں تم دو جماعتیں ہو گئے، مَا لَكُمْ تَفَرَّقْتُمْ فِي الْمُنَافِقِيْنَ فِئَتَيْنِ، اس کا یہ مفہوم ہوگا، تمہیں کیا ہو گیا کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے، وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا: رَكَسَ اَرْكَسَ: رَدُّ الشَّيْءِ مَقْلُوْبًا، کسی چیز کو اس کی پہلی حالت کی طرف لوٹا دینا، ''اللہ تعالیٰ نے ان کو لوٹا دیا اُن کی پہلی حالت کی طرف'' بِمَا كَسَبُوْا: ان کے کسب کے سبب سے، یعنی ان کے کردار کے سبب سے، اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ: کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم ہدایت دو ایسے شخص کو جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا، وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ: اور جس کو اللہ بھٹکا دے، گمراہ کر دے، فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا: تو اس کے لئے ہرگز راستہ نہیں پائے گا، وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ، كَمَا كَفَرُوْا: جیسے انہوں نے کفر کیا، فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً: پھر ہو جاؤ تم سب برابر، فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ: پس نہ بناؤ ان میں سے دوست حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جب تک کہ اللہ کے راستے میں وہ ہجرت نہ کریں۔ ھجرت اور مھاجرۃ: گھر بار کو چھوڑ دینا۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پس اگر وہ پیٹھ پھیریں، یعنی اس ہجرت والے حکم کو قبول نہیں کرتے، فَخُذُوْهُمْ: تو تم انہیں پکڑ لو، وَاقْتُلُوْهُمْ: اور انہیں قتل کرو، حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ: جہاں بھی تم انہیں پاؤ، وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: اور نہ بناؤ ان میں سے کوئی یار اور نہ کوئی مددگار، ان میں سے کسی کو حمایتی اور کسی کو مددگار نہ اختیار کرو، اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ: وَصَلَ يَصِلُ: ملنا۔ مگر وہ لوگ جو مل جائیں ان لوگوں کی طرف کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان عہد ہے، یعنی معاہد قوم کے ساتھ وہ لوگ جا کے مل جائیں، معاہدین کے ساتھ شامل ہو جائیں، اَوْ جَآءُوْكُمْ: یا آئیں وہ تمہارے پاس، حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ: اس حال میں کہ ان کے دل تنگ ہوتے ہوں اس بات سے کہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی لڑیں یا لڑائی لڑیں وہ اپنی قوم کے ساتھ، یعنی ان کے دل تنگ ہوتے ہیں تمہارے ساتھ لڑنے میں بھی اور اپنی قوم کے ساتھ لڑنے میں بھی، یعنی نہ وہ اپنی قوم کے ساتھ مل کر تم سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم سے لڑنا چاہتے ہیں، غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں، اس طرح کے لوگ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا، لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ: تو اُن کو تمہارے اُوپر مسلط کر دیتا، فَلَقٰتَلُوْكُمْ: پھر وہ تم سے لڑتے، فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ: پس اگر وہ لوگ تم سے جدا رہیں، جدا رہنے کا مطلب یہ ہے کہ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ: تم سے وہ لڑتے نہیں، وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ: سَلَم: سلامتی، اور اِلقاءِ سَلم کا معنی ہوتا ہے کسی کے سامنے ہتھیار ڈال دینا، سپر ڈال دینا، صلح اور صفائی کا پیغام دے دینا کہ ہم آپ کے ساتھ صلح کرتے ہیں، ''ڈالیں وہ تمہاری طرف صلح'' فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا: پس نہیں بنایا اللہ تعالیٰ

نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ، ان کے خلاف تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں ہے کہ تم ان کے خلاف کوئی کارروائی کرو۔ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ: عنقریب پاؤ گے تم کچھ اور لوگوں کو، يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ: جو ارادہ کرتے ہیں کہ تم سے بے خوف ہو جائیں، وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ: اور ارادہ کرتے ہیں کہ اپنی قوم سے بے خوف ہو جائیں، كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ: جب کبھی ان کو فتنہ کی طرف، شرارت کی طرف لوٹایا جاتا ہے، اُرْكِسُوْا فِيْهَا: تو وہ اس میں ڈال دیے جاتے ہیں، لوٹا دیے جاتے ہیں، فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ: پس اگر یہ لوگ تم سے جدا نہ رہیں، وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ: یہ يُلْقُوْٓا بھی لَمْ کے نیچے داخل ہے، اور تمہاری طرف وہ صلح نہ ڈالیں، صلح کا اظہار نہ کریں، وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ: اور تم سے اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں۔ یہ يَكُفُّوْٓا بھی لَمْ کے نیچے داخل ہے۔ فَخُذُوْهُمْ: تو انہیں پکڑلو، وَاقْتُلُوْهُمْ: اور انہیں قتل کردو، حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ: جہاں بھی تم انہیں پاؤ، وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تمہارے لیے ان کے خلاف سلطانِ مبین بنادیا، سلطان واضح حجت کو بھی کہتے ہیں اور اختیار اور اقتدار کو بھی کہتے ہیں، کہ ہم نے تمہارا اختیار اور اقتدار اِن کے اوپر قائم کردیا، یا اِن کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ہم نے تمہارے لیے واضح حجت بنادی، تمہارے لیے دلیل اور سلطان واضح ہے، جس کی بناء پر تم اِن کے خلاف کارروائی کرسکتے ہو۔

تفسیر

مدینہ آنے کے بعد پھر واپس مکہ جانے والوں کا شرعی حکم

اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تین قسم کے لوگوں کا حکم واضح فرمایا ہے، روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگ مکہ معظمہ سے اسلام کا اظہار کرکے مدینہ منورہ میں آگئے، چند دِن ٹھہرنے کے بعد پھر وہ واپس مکہ معظمہ چلے گئے، اور جا کر مشرکین کے ساتھ مل گئے، اس بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دو قسم کے گروہ پیدا ہوگئے، بعض کہتے تھے کہ وہ مسلمان ہیں، اگر کسی مجبوری کی بناء پر چلے گئے تو کوئی بات نہیں، انہیں مسلمان ہی سمجھنا چاہیے، بعض کہتے تھے کہ جب وہ واپس چلے گئے ہیں تو جیسے پہلے مشرک تھے ویسے اب مشرک ہیں، وہ مرتد ہوگئے، اس لئے ہمیں ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو مرتدوں کے ساتھ ہوتا ہے، ایک گروہ تو یہ تھا جس کا ذکر پہلی آیت میں کیا گیا، کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہیں اختلافِ رائے نہیں کرنا چاہیے، وہ پہلی حالت کی طرف لوٹ گئے، اور جب وہ آئے تھے تو بھی انہوں نے خلوص کے ساتھ ایمان قبول نہیں کیا تھا، بلکہ منافق تھے، اور اب ان کے واپس لوٹ جانے کے بعد اگر پھر بھی تم ان کو ہدایت یافتہ سمجھو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو اللہ نے گمراہ کردیا تم ان کو ہدایت یافتہ قرار دیتے ہو، اللہ کے گمراہ کرنے کے بعد پھر کوئی شخص کسی دوسرے کو سیدھے راستے پر نہیں لاسکتا، تمہارے ہدایت یافتہ کہنے سے وہ ہدایت یافتہ نہیں ہوجائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سابق حالت کی طرف لوٹا دیا۔ پہلے تو ان لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ مرتد ہوگئے اور پہلی حالت کی طرف لوٹ گئے تو اب تم انہیں کافر ہی سمجھو، اور اگر کسی جگہ وہ تمہارے ہاتھ آجائیں تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو عام کافروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس جگہ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ پہلے پہلے ہجرت اقرار باللسان کے قائم مقام تھی، کہ اگر کوئی شخص ایمان لے آئے اور اُس کو ہجرت کرنے سے کوئی عذر نہ ہو

پھر بھی اگر وہ ہجرت کر کے نہیں آتا تو ایسی صورت میں اُس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، ضروری ہے کہ اپنے علاقے کو چھوڑ کر ہجرت کر کے آئے، جب ہجرت کر کے آئے گا تب سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح سچا اور پکا مسلمان ہے، تو جب انہوں نے پہلے ہجرت کی، ظاہری طور پر چھوڑ کر آئے، لیکن جب بعد میں واپس چلے گئے تو گویا کہ انہوں نے اقرار باللسان سے انحراف کر لیا اور جا کر مشرکین کے ساتھ مل گئے، تو اب ان کا حکم مسلمانوں والا نہیں، اور منافقین کا لفظ استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا، کہ جب وہ آئے تھے تب بھی وہ خلوص کے ساتھ نہیں آئے تھے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ: تمہیں کیا ہو گیا کہ تم منافقین کے بارے میں دو ٹکڑے ہو گئے، دو گروہ ہو گئے؟ اللہ نے انہیں رڈ کر دیا ان کے کردار کے سبب سے، ان کے کسب کے سبب سے، کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم ہدایت دو اس شخص کو جس کو اللہ نے بھٹکا دیا؟ یعنی تم اگر ان کو مسلمان سمجھو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کو گمراہی میں ڈال دیا تم ان کو ہدایت یافتہ قرار دے رہے ہو، ''جس کو اللہ بھٹکا دے تو اُس کے لئے ہرگز راستہ نہیں پائے گا''۔ آگے فرمایا کہ تم انہیں مؤمن سمجھتے ہو؟ وہ مؤمن نہیں، وہ کافر ہیں، وہ تو اس درجے کے کافر ہیں کہ اُلٹا تمہیں کافر بنانا چاہتے ہیں، وَدُّوْا: چاہتے ہیں کہ تم کُفر کرو جیسے انہوں نے کُفر کیا پھر تم برابر ہو جاؤ، پس نہ بناؤ ان میں سے کسی کو دوست جب تک کہ وہ اللہ کے راستے میں ہجرت کر کے نہ آئیں، اور اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں، اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نہ آئیں، تو انہیں پکڑ لو، اور انہیں قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ، یعنی پھر ان کا حکم باقی کافروں کی طرح ہے، نہ ان کو اپنے حمایتی سمجھو نہ ان کو اپنے مددگار سمجھو، ''نہ اختیار کرو ان میں سے کوئی یار نہ کوئی مددگار۔''

معاہد کُفّار کا شرعی حکم

ہاں البتہ بعض قومیں ایسی ہیں کہ جنہوں نے تمہارے ساتھ صراحتاً ترکِ جنگ کا معاہدہ کر لیا، مصالحت کر لی، اور وہ تم سے لڑنا نہیں چاہتے، پھر جو لوگ ان کے معاہد ہو جائیں وہ بھی تمہاری صلح کی ضمن میں آ جائیں گے، ان کے ساتھ بھی پھر تمہیں لڑنا نہیں چاہیے، یعنی ایک قبیلے کے ساتھ تو ہو گئی ہماری صراحتاً صلح، حضور ﷺ کے زمانے میں ایسا واقعہ پیش آیا، غالباً قبیلہ بنو مُدلج لکھا ہے، کہ انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ صلح کی تھی، اور اس صلح کے اندر یہ دفعہ بھی رکھی تھی کہ جو ہمارے معاہد ہوں گے وہ بھی اس صلح میں شامل سمجھے جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ جو تمہارے معاہد ہوں وہ بھی، اور جو معاہد قوم کے ساتھ مل جائیں وہ بھی، ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی تمہاری طرف سے نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ تم سے صلح رکھیں اور تمہارے خلاف ہاتھوں کو روکے رکھیں، اعتزال یعنی جدائی اختیار کریں، کہ مقابلے میں نہ آئیں، جب وہ اپنے عہد کے اوپر پکے ہیں تو تم بھی اپنے عہد پر پکے رہو۔

عہد شکنی کرنے والے کُفّار کا حکم

اور تیسرے نمبر پر ذکر کیا دھوکے باز لوگوں کا، کہ وہ بظاہر تمہارے پاس آتے ہیں اور باتیں اس قسم کی کرتے ہیں جس سے وہ تمہاری طرف سے بھی بے خوف ہونا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی بے خوف ہونا چاہتے ہیں، دوغلا پن جسے کہتے ہیں، لیکن اگر ان کو کوئی شرارت پر برانگیختہ کرنے کے لئے آ جائے تو وہ شرارت پر برانگیختہ ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کے

عہد معاہدے اور صلح کا کوئی اعتبار نہیں ہے، چاہے ان کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو یا ہوا ہے، لیکن اگر وہ کہیں فتنے میں پڑ جائیں اور تمہارے مقابلے میں ہاتھ اُٹھالیں تو تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں ہے اس معاہدے کی رعایت رکھنے کی، بلکہ جہاں ملیں پکڑو اور انہیں قتل کرو، ان کا حکم بھی عام کافروں کی طرح ہوگا۔ ''مگر وہ لوگ جو مل جائیں ایسی قوم کی طرف'' یہ استثناء ہے اس سے کہ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ: ''مگر وہ لوگ جو مل جائیں ایسے لوگوں کی طرف کہ اُن کے اور تمہارے درمیان آپس میں میثاق ہے، تو جب ملنے والوں کو پکڑنا اور قتل کرنا جائز نہیں، تو جن کا خود میثاق ہے اور عہد کیا ہوا ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ مستثنیٰ ہو گئے۔

غیر جانب دار رہنے والے کُفّار کا حکم

''یا وہ تمہارے پاس آتے ہیں اور ان کے دل تنگ ہوتے ہیں تمہارے ساتھ لڑنے سے بھی اور اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے بھی'' یعنی وہ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں، اور آ کر کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ یوں رہیں گے کہ نہ تو ہم آپ کے ساتھ مل کر اپنی قوم کے خلاف لڑیں گے، اور نہ اپنی قوم کے ساتھ مل کر ہم تمہارے خلاف لڑیں گے، ان کو بھی امن دے دو اور ان کی بھی صلح ہے۔ یہاں حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کی قدر کرو جو اس طرح سے غیر جانبدار ہی ہو جائیں، ورنہ اگر اللہ چاہتا تو انہیں جرأت دلا کر تمہارے خلاف مسلط کر دیتا اور یہ تمہارے لئے مصیبت بنتے، یعنی ایسے دور میں جبکہ اردگرد کے سب قبائل تمہارے ساتھ برسرِ پیکار ہیں، جنگ میں مبتلا ہیں، تو اگر کچھ لوگ غیر جانبدار بھی رہنا چاہیں تو ان کی رعایت رکھو، انہیں غیر جانبدار ہی رہنے دو، ''اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا'' یعنی ان کی جرأت اتنی ہوتی کہ تمہارے خلاف لڑنے کے لئے نکل آتے: ''پھر یہ تم سے لڑتے، پس اگر یہ تم سے جدا رہیں'' جدا رہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سے لڑتے نہیں اور تمہاری طرف سلامت روی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، صلح ڈالتے ہیں تمہاری طرف، سلامتی کا پیغام بھیجتے ہیں، فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں بنایا، لہٰذا ان کی پکڑ دھکڑ جائز نہیں ہے، ان کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا، اپنے اس عہد کی رعایت رکھنی ہے۔

دو غلے کُفّار کا حکم

''کچھ لوگ اور بھی ایسے آئیں گے جو ارادہ کریں گے تم سے بے خوف ہونے کا، اور اپنی قوم سے بے خوف ہونے کا'' یعنی دو غلے، تمہارے ساتھ بھی کوئی ایسی باتیں کریں گے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور قوم کے پاس جائیں گے تو وہاں باتیں کریں گے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور جب ان کو کوئی شرارت پر برانگیختہ کرے تو فوراً برانگیختہ ہو جاتے ہیں، ''جب ان کو لوٹایا جائے فتنے کی طرف، شرارت کی طرف'' فتنے سے مراد یہاں مسلمانوں کے خلاف شرارتیں برپا کرنا، ان کو دین اور مذہب سے روکنے کی کوشش کرنا، اُرْكِسُوْا فِيْهَا: تو وہ اس فتنے میں لوٹا دیے جاتے ہیں، یعنی جب بھی کوئی ان کو آ کر بھڑکائے تو یہ بھڑک جاتے ہیں اور فتنے میں واقع ہو جاتے ہیں، یہ لوگ اگر تم سے جدا نہ رہیں، اعتزال اختیار نہ کریں، اور تمہاری طرف سلامت روی نہ اختیار کریں، تمہاری طرف صلح نہ ڈالیں، اور اپنے ہاتھوں کو روک کر نہ رکھیں، بلکہ مقابلے میں تمہیں نظر آ جائیں کہ یہ بھی انہی حرکتوں میں شامل

ہیں، تو ان کی اُن زبانی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں، پھر ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ" "یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے ان کے خلاف واضح دلیل قائم کردی، یا، تمہیں ان کے اُوپر اختیار دے دیا ہے اس قسم کی کارروائی کرنے کا"

خلاصہ رکوع

تو یہ مختلف قسم کے کافر تھے جن کے جذبات مختلف تھے، تو ان تین درجے کے لوگوں کا یہاں حکم بیان کر دیا گیا، کہ جو نفاق کے طور پر آئے تھے اور بعد میں لوٹ کر چلے گئے تو ان کے آنے کا اور آکر اسلام ظاہر کرنے کا کوئی اعتبار نہیں، یہ بھی محارب کافروں کی طرح ہیں۔ اور جو تمہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں، تمہارے پاس آکر اِدھر کی باتیں کرتے ہیں، اپنی قوم کے پاس جاتے ہیں تو دوسری قسم کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں ان کا بھی کوئی اعتبار نہیں، ہاں البتہ جو تم سے معاہدہ کریں اور معاہدے کے پابند ہوں، تمہارے خلاف ہاتھ نہ اٹھائیں، ان کے خلاف تم نے بھی ہاتھ نہیں اٹھانا اور اس عہد کی پابندی کرنی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ
نہیں مناسب کسی مؤمن کے لئے کہ قتل کرے کسی مؤمن کو مگر حالت خطا میں، اور جو کوئی شخص کسی مؤمن کو
مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى
غلطی سے قتل کر دے پس اُس کے ذمے ہے ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا اور دیت جو سپرد کی جائے گی مقتول کے
اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
اہل کی طرف مگر یہ کہ مقتول کے ورثاء معاف کردیں، پھر اگر وہ مقتول ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہے اور خود وہ مؤمن ہو
فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
تو قاتل کے ذمے ہے ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا، اور اگر وہ مقتول ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان
مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ
عہد ہے تو پھر دیت ہے جو سپرد کی جائے گی مقتول کے اہل کی طرف اور آزاد کرنا ہے ایک مؤمن غلام کو،
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ
اور جو غلام نہ پائے تو اُس کے ذمے ہے دو مسلسل مہینوں کا روزہ رکھنا، یہ مشروع کیا گیا ہے اللہ کی طرف سے از روئے توبہ کے،

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ

اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۹۲﴾ اور جو کوئی قتل کردے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر تو اُس کی سزا

جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا

جہنم ہے، پڑا رہے گا اس جہنم میں، اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اللہ نے اس پر لعنت کی اور تیار کیا ہے اُس کے لئے

عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا

بڑا عذاب ﴿۹۳﴾ اے ایمان والو! جب تم سفر کرو اللہ کے راستے میں تو تحقیق کرلیا کرو

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ

اور نہ کہا کرو اُس شخص کو جو تمہاری طرف سلام ڈالے کہ تو مؤمن نہیں ہے، طلب کرتے ہو تم

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ

دُنیوی زندگی کے سامان کو، اللہ تعالیٰ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں، ایسے ہی تھے تم بھی اس سے

قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

قبل پھر اللہ نے تم پر احسان کیا پس خوب تحقیق کرلیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۹۴﴾

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ

برابر نہیں ہیں مؤمنین میں سے بغیر عذر کے بیٹھنے والے

وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ

اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے، فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو

الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا

جہاد کرنے والے ہیں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ ان لوگوں پر جو بیٹھنے والے ہیں از روئے درجے کے، ہر ایک سے

وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا

اللہ نے وعدہ کیا ہے اچھی حالت کا، اور فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اَجرِ عظیم

عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

میں ﴿۹۵﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت درجات اور مغفرت اور رحمت میں، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۹۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا: نہیں مناسب کسی مومن کے لئے کہ قتل کرے کسی مومن کو مگر حالت خطا میں، یا، اِلَّا قتلًا ذَا خَطَاٍ، مگر ایسا قتل کرنا جو خطا والا ہے، یعنی خطا کے طور پر قتل ہو جائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ کسی مومن کے لئے یہ مناسب نہیں، مومن کی شان یہ نہیں ہے کہ کسی مومن کو قتل کرے وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا: اور جو کوئی شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ: پس اس کے ذِمے ہے آزاد کرنا ایک رقبۂ مومنہ کا، ایمان والے رقبہ کا آزاد کرنا اس کے ذِمے ہے۔ رقبہ کا لفظ مرد عورت دونوں پر بولا جائے گا، غلام ہو یا باندی ہو، اور اس قتل کے کفارے کے لئے اس کا مومنہ ہونا ضروری ہے۔ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ: دِيَة کہتے ہیں قتیل کے بدل کو۔ وَدٰى يَدِيْ دِيَةً: خون بہا دینا، یعنی خون کی قیمت دینا، اور اس سے وہی طے شدہ قیمت مراد ہے جو مقتول کی ادا کی جاتی ہے، اس لیے دیت کا ترجمہ خون بہا کے ساتھ کیا گیا ہے، خون کی قیمت، ''اور اس قتل کرنے والے کے ذِمے دیت ہے جو سپرد کی جائے گی قتیل کے اہل کی طرف'' اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا: مگر یہ کہ اس مقتول کے ورثاء صدقہ کر دیں یعنی معاف کر دیں۔ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ: پھر اگر وہ مقتول ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہے اور خود وہ مقتول مومن ہو، فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ: تو قاتل کے ذِمے ہے آزاد کرنا رقبہ مومنہ کا، ایمان والے غلام یا ایمان والی باندی کا آزاد کرنا، وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ: اور اگر وہ مقتول ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان میثاق ہے، عہد ہے، فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ: تو پھر دیت ہے جو سپرد کی جائے گی اس مقتول کے اہل کی طرف، اور آزاد کرنا ہے رقبۂ مومنہ کا۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ: اور جو رقبہ مومنہ نہ پائے، غلام آزاد کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کے ذِمے ہے دو مہینے مسلسل کے روزے، روزہ رکھنا دو مہینے مسلسل کا، تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ: شُرِعَ ذَالِكَ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ یہ چیز مشروع کی گئی ہے یعنی غلام کا آزاد کرنا اور غلام پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں دو مہینے مسلسل روزے رکھنا مشروع کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے از روئے توبہ کے، ''اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے''۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا: اور جو کوئی قتل کر دے کسی مومن کو جان بوجھ کر، عمد کے ساتھ، فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ: تو اس قاتل کی سزا جہنم ہے خٰلِدًا فِيْهَا: پڑا رہے گا اس جہنم میں، وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ: اور اللہ کا اس پر غضب ہوا، وَلَعَنَهٗ: اور اللہ نے اس پر لعنت کی وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا: اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اے ایمان والو! جب تم سفر کرو اللہ کے راستے میں۔ ضرب فی الارض: سفر کرنا۔ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یعنی جہاد کے سفر پر تم جاؤ۔ فَتَبَيَّنُوْا: تو تحقیق کر لیا کرو۔ تَبَيُّن: کسی چیز کی وضاحت طلب کر لینا۔ فَتَبَيَّنُوْا: تو خوب اچھی طرح سے تحقیق کر لیا کرو۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ: اور نہ کہا کرو اس شخص کو جو تمہاری طرف سلام ڈالے، لَسْتَ مُؤْمِنًا: یہ لَا تَقُوْلُوْا کا مقولہ ہے، جو تمہاری طرف سلام ڈالے اس سے یہ نہ

کہا کرو کہ تو مؤمن نہیں ہے، سلام ڈالنے کی دونوں صورتیں ہیں یا تو مسلمانوں کی طریقے کے مطابق السلام علیکم کہہ دے، یا سلام ڈالنے سے مراد ہے اطاعت کا اظہار، کہ فرمانبرداری کا اظہار کر دے، تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: طلب کرتے ہو تم دنیوی زندگی کے سامان کو فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ: اللہ تعالیٰ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں، كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ: ایسے ہی تھے تم بھی اس سے قبل فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ: پھر اللہ نے تم پر احسان کیا فَتَبَیَّنُوْا: پس خوب اچھی طرح سے تحقیق کر لیا کرو اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا: بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: مؤمنین میں سے بغیر عذر کے بیٹھنے والے۔ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ کا تعلق الْقٰعِدُوْنَ کے ساتھ ہے، الْقٰعِدُوْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ: مؤمنین میں سے بغیر عذر کے بیٹھنے والے اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں۔ لَا یَسْتَوِی کا معنیٰ ہے کہ برابر نہیں، اور فاعل اس کے دو ہیں لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ وَالْمُجٰهِدُوْنَ: قاعدون اور مجاہدون آپس میں برابر نہیں ہیں، بلکہ ان میں درجات کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ: فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ، فضیلت دی ان لوگوں پر جو بیٹھنے والے ہیں، فضیلت دی از روئے درجے کے، یعنی اُن کا درجہ بڑھا دیا۔ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: كُلًّا کی تنوین عوض مضاف الیہ ہے، بیٹھنے والوں اور جہاد کرنے والوں میں سے ہر ایک سے اللہ نے وعدہ کیا ہے اچھی حالت کا، یعنی قاعدین اور مجاہدین دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھی حالت کا وعدہ ہے، وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ: اور فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اَجرِ عظیم میں، بڑھا دیا اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کا اَجرِ عظیم، زیادہ دیا اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو اَجرِ عظیم، اَجرِ عظیم کا بیان یہ ہے دَرَجٰتٍ مِّنْهُ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت درجات وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً: اور مغفرت اور رحمت، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

شانِ نزول اور کلمہ گو کے قتل کی سخت ممانعت

جہاد کا ذکر چلا آ رہا تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں اسلام چونکہ آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، بعض لوگ مختلف قبیلوں میں رہتے ہوئے اسلام قبول کر لیتے تھے، لیکن کسی مجبوری کی بناء پر اسلام کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے، جب موقع آتا تو اسلام کا اظہار کرتے، اس ضمن میں ایک دو واقعات ایسے پیش آئے کہ عین جہاد کے موقع پر کسی شخص نے اسلام کا اظہار کیا، لیکن مجاہدین نے اُس کے اسلام کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ یہ سمجھ کر کہ یہ اپنی جان اور اپنا مال بچانے کے لئے اس وقت کلمہ پڑھ رہا ہے، اُس کو قتل کر دیا، ایسے واقعات پیش آئے، چونکہ حضور ﷺ کی طرف سے اس معاملے میں کوئی واضح ہدایات نہیں تھیں۔ جب سرورِ کائنات ﷺ کو پتا

چلا، تو آپ ﷺ نے اس کے اُوپر بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا، خود اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بخاری شریف میں آتا ہے کہ اُسامہ بن زید کہتے ہیں، کہ ہم کسی جگہ جہاد پر گئے ہوئے تھے، اور ایک شخص جو ہمارے نیزے کی زد میں آگیا، اس نے فوراً کہہ دیا "لا الٰہ الا اللہ" اُسامہ کہتے ہیں کہ ایک میں تھا اور ایک انصاری تھا جو اُس کے پیچھے لگے ہوئے تھے، انصاری نے تو اپنا ہاتھ روک لیا اور اُسامہ نے وار کردیا جس کے نتیجے میں وہ قتل ہوگیا، جب سرورِ کائنات ﷺ کو پتا چلا تو آپ نے بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور یہ کہا کہ جب وہ قیامت کے دن لا الٰہ الا اللہ لے کر آئے گا تو تُو اُس وقت کیا کرے گا؟ بار بار اس جملے کو دُہرایا۔ کہا گیا کہ یارسول اللہ! اُس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کا دِل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا، تمہیں پتا چل جاتا کہ خلوص سے کہا ہے یا جان بچانے کے لئے کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے بس کی بات ہے؟ کہ تم یہ معلوم کرلو کہ خلوص سے پڑھ رہا ہے یا جان بچانے کے لئے پڑھ رہا ہے، تم کسی کا دِل چیر کر دیکھ سکتے ہو؟ اس لئے جب اُس نے کلمہ پڑھ لیا تھا تو تمہیں ہاتھ روک لینا چاہیے تھا، اور اُس کو مسلمان سمجھتے۔ جب یہ کلمہ لے کر وہ قیامت کے دن آئے گا تو تم کیا کرو گے؟ اس طرح بار بار ناراضگی کا اظہار فرمایا، تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے اس وقت اتنا صدمہ ہوا کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگ گیا کہ ہائے کاش! میں آج مسلمان ہوا ہوتا، اور یہ حرکت مجھ سے کُفر کے زمانے میں ہوئی ہوتی[1] تاکہ آج اسلام کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے اس گناہ کو معاف کردیتا، یہ افسوس کا اظہار ہے اپنی اس غلطی پر جو ہوئی تھی۔

اور اسی طرح ایک اور صحابی کا واقعہ حدیث شریف میں آتا ہے، کہ وہ چلے جارہے تھے تو ایک آدمی جوان کے خیال کے مطابق کافر تھا وہ بکریاں چرا رہا تھا، اور اُس کے پاس بہت ساری بکریاں تھیں، وہ ان کی زَد میں آگیا، اُس نے آگے بڑھ کر مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کہا، اُس کے متعلق بھی انہوں نے یہی سمجھا کہ اپنا مال بچانے کے لئے اور اپنی جان بچانے کے لئے اس طرح سے یہ اظہار کررہا ہے، چنانچہ اُس کو قتل کردیا اور اُس کی بکریاں لے لیں، یہ واقعہ جب پیش آیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ترمذی، کتاب التفسیر)۔

پھر یہاں تک سمجھایا اور اتنا محتاط رہنے کی تلقین کی، کہ ایک صحابی پوچھتا ہے کہ یارسول اللہ! اگر میں کسی کافر کے مقابلے میں لڑائی میں مشغول ہوجاؤں اور وہ کافر میرا ایک بازو کاٹ دے، اُس کا وار میرے اُوپر چل جائے اور میرا ایک بازو کٹ جائے، اور بعد میں جس وقت میں اُس پر وار کرنے لگوں تو وہ درخت کی اوٹ میں آجائے، اور جلدی سے کلمہ پڑھ دے، تو کیا میں اُس کو قتل کردُوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہ! قتل نہیں کرنا، صحابی کہتے ہیں کہ یارسول اللہ! اس نے میرا بازو کاٹ دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قتل نہیں کرنا، وہ کہتے ہیں کہ یارسول اللہ! وہ جان بچانے کے لئے ایسا کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا قتل نہیں کرنا، اگر قتل کردو گے تو تمہارا وہ مقام ہوجائے گا جو کلمہ پڑھنے سے پہلے اُس کا تھا، اور کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کا مقام یہ تھا کہ وہ مباح الدم تھا اُس کو قتل کرنا جائز تھا، اب تمہارا یہ مقام ہوجائے گا، کہ تمہیں قصاص میں قتل کیا جائے، تم مباح الدم ہوجاؤ گے، اور اُس کا وہ مقام ہوجائے گا

(۱) مسلم ۱/ ۶۸، باب تحریم قتل الکافر بعد ان قال لا الٰہ الا اللہ/ مشکوٰۃ، ج ۲ ص ۲۹۹، کتاب القصاص، فصل اول۔

جو اس کو قتل کرنے سے پہلے تمہارا تھا کہ تم معصوم الدم تھے، تمہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا، کلمہ پڑھنے کے بعد اس کا وہ مقام ہوگیا۔[1]
یہاں تک احتیاط فرمائی کہ اگر کوئی کافر مسلمانوں کا نقصان بھی کردے اور پھر مسلمان جب اُس پر غالب آجائیں تو بظاہر اگرچہ اس کے اُوپر شبہ ہے کہ اب وہ جان بچانے کے لئے ایک تدبیر کے طور پر کلمہ پڑھتا ہے، لیکن مسلمانوں کو پھر بھی حکم تھا کہ کلمے کی طرف دھیان کرتے ہوئے اس کی جان اور اُس کے مال کو محفوظ کردو، اُس کے اُوپر تصرف نہیں کرنا۔

قتل کی مختلف اَقسام اور ان کے اَحکام

تو ایسے واقعات چونکہ پیش آئے تھے اس لئے اسی جہاد کے تذکرے کے دوران اللہ تبارک وتعالیٰ نے قتلِ مؤمن کی شدّت بیان کردی، کہ جان بوجھ کر تو مؤمن کو قتل کرنا ہی نہیں، اگر کوئی شخص جان بوجھ کر مؤمن کو قتل کردے گا تو اُس کی دنیا کے اندر سزا سورۂ بقرۃ میں آچکی یعنی قصاص، کہ قصاصاً اس کو قتل کردیا جائے گا، اور آخرت کے اعتبار سے اُس کی سزا ان آیات میں ذکر کی جارہی ہے کہ اس کو جہنّم میں ڈال دیا جائے گا، اور مدتِ مدید تک جہنم میں پڑا رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوگا، یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہوگا، اتنی شدّت اس کے اُوپر کی گئی ہے کہ بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کافر ہی ہوگیا اور اس کا انجام کافروں جیسا ہے، لیکن اس بات پر اُمّت کا اِجماع ہے کہ قاتلِ عمد جو جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے تو یہ بہت شدید قسم کا گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر بہت ناراضگی کا اظہار ہوگا، اس کو جہنّم میں ڈالا جائے گا، اصلی سزا اس کی یہی ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ معاف نہ کردیں، یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود یہ وہ مؤمنِ فاسق بشرطیکہ اس قتل کو حلال نہ سمجھے، اگر اس کو حرام سمجھتا ہوا عملی کوتاہی میں مبتلا ہے تو یہ مؤمن ہے، اور مؤمنِ فاسق ہے، اگر زندگی کے اندر توبہ کرلے تو اس کی توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی کسی نیک عمل کی برکت سے اس کا گناہ معاف ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ویسے بھی معاف فرماسکتے ہیں، ورنہ سزا بھگت کر آخرکار ایمان کی برکت سے یہ بھی چھوٹ جائے گا۔ اس لئے یہاں خٰلِدًا فِیۡهَا کے ساتھ چونکہ "ابدًا" کی قید لگی ہوئی نہیں ہے، اس لئے اس کو مکثِ طویل پر محمول کیا جائے گا، کہ مدّتِ دراز تک یہ جہنّم میں پڑا رہے گا، بہت مدّت تک اس کو اس جرم کی سزا ملے گی، اور یہ سزا اُس کی اصلی ہے جو قانونی حیثیت سے طے ہے، باقی! اللہ تعالیٰ مراحمِ خسروانہ کے تحت اپنی مہربانی سے معاف کردے، سزا کم دے دے، کسی کی سفارش سے چھوڑ دے، یا کسی نیکی کی برکت سے ترک کردے، ایسا ہوسکتا ہے، جس طرح مؤمنِ فاسق کے ساتھ ہوگا ویسے اس کے ساتھ ہوگا، اب اس بات پر اِجماع ہے کہ قتلِ مؤمن بہت بڑا کبیرہ ہے لیکن کُفر نہیں ہے، ایسا شخص مؤمنِ فاسق کی طرح ہے، جیسے فاسق کے اَحکام ہوتے ہیں ایسے ہی اَحکام اِس کے ہوں گے۔

اور قتلِ عمد کی تعریف یہ ہے کہ قصد کے ساتھ مارا جائے، اور ایسی چیز ماری جائے جو قتل کے لئے وضع کی گئی ہے، جیسے دھاردار آلہ ہے یا آج کے عرف میں گولی ہے، دھاردار آلے کے ساتھ مارا یا اس کو گولی ماردی، جو چیز قتل کے لئے وضع کی گئی ہے

(۱) بخاری ۲/ ۵۷۳۔ ۲/ ۱۰۱۴، باب قول الله ومن يقتل مؤمنا الخ مسلم ۱/ ۶۷، باب تحريم قتل الكافر بعد أن قال الخ مشكوة ۲/ ۲۹۹، كتاب القصاص.

اُس کے ساتھ مارا اور قصداً مارا، اس کو قتلِ عمد کہتے ہیں، اس میں صرف قصاص ہے، کفارہ نہیں ہے۔ اور اگر مارا تو قصداً ہے لیکن ماری ایسی چیز ہے جو قتل کے لئے وضع نہیں کی گئی، یا آدمی عادۃً اس کے ساتھ قتل نہیں ہوتا، جیسے ایک ڈنڈا مارا تھا، مارا قصد کے ساتھ ہے لیکن ڈنڈے کے ساتھ آدمی عام طور پر مرتا نہیں، یا چھوٹی موٹی اینٹ اُٹھا کر ماردی، ایسی صورت میں اگر وہ مرجائے تو اس کو "قتلِ شبہ عمد" کہتے ہیں، اس میں قصاص تو نہیں ہے لیکن کفارہ بھی آتا ہے اور دیت بھی آتی ہے اور وہ دیت مغلظہ ہے، جیسے کہ فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ سو اُونٹ ہوں گے، اور اس کے اندر تقسیم رُباعی ہے، پچیس پچیس اُونٹ مختلف عمروں کے دیئے جائیں گے، تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ قصد سے نہیں مارا، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ گولی تو ماری تھی شکاری جانور کو، ہاتھ چوک گیا اور گولی لگ گئی کسی انسان کو، یا تیر مارا تھا شکار کو، لیکن لگ گیا کسی انسان کو، اس کو "خطأ فی الفعل" کہتے ہیں۔ اور ایک یہ ہے کہ سامنے کوئی چیز نظر آئی تھی، ہم نے سمجھا کہ یہ کافر ہے یا ہم نے سمجھا کہ یہ شکاری جانور ہے اور گولی ماردی، اور حقیقت میں وہ انسان تھا اور مسلمان تھا، اس کو "خطأ فی القصد" کہتے ہیں، اور "خطأ فی الفعل" ہو یا "خطأ فی القصد" ہو اس میں کسی درجے میں انسان معذور ہوتا ہے کہ مارنے کا ارادہ نہیں تھا، ہاتھ چوک گیا اور گولی دوسری طرف چلی گئی، یا اپنے طور پر تو کسی صحیح چیز کو مارا تھا جس کا مارنا جائز تھا، لیکن حقیقت میں وہ انسان تھا جس کا قتل کرنا درست نہیں تھا، تو یہ قتلِ خطا ہے، اس میں دیت بھی آیا کرتی ہے اور کفارہ بھی ہوتا ہے، لیکن اس میں دیت مخففہ ہے، کہ اس میں سو اُونٹ خماسی تقسیم کے تحت دیئے جاتے ہیں، یعنی بیس بیس اُونٹ مختلف عمروں کے دیئے جاتے ہیں جو پہلی دیت کے مقابلے میں ہلکے ہوتے ہیں، اور کفارہ یہ ہے کہ مؤمن غلام یا مؤمنہ باندی آزاد کرو، اور اگر اس پر قدرت نہیں، قدرت نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو پیسے نہیں ہیں یا غلام ملتا نہیں ہے، جیسے آج کل غلام ملتا نہیں چاہے پیسے موجود ہیں، تو قدرت نہ ہونے کی صورت میں پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے جاتے ہیں، یہ اس گناہ کی توبہ ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ گناہ معاف کردیں گے۔ اور دیت مقتول کے ورثاء کو دی جاتی ہے، اور ورثاء پر اسی اُصول سے تقسیم ہوتی ہے جس طرح وِرثہ تقسیم ہوا کرتا ہے، جتنا جتنا حصہ جس وارث کا ہے اتنی اتنی دیت ان کے سپرد کردی جائے گی۔ اور یہ دیت قاتل کے ذِمّے نہیں ہوتی بلکہ قاتل کے خاندان پر تقسیم کردی جاتی ہے جو اُس کے معاون ہوتے ہیں، اس طرح سے مل جل کر اس کی تلافی کردی جاتی ہے۔ اور ایک قتل اور بھی ہوتا ہے جس کو "قتل بالتسبیب" کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مباشر بالقتل نہیں، بلکہ وہ سبب بنا ہے، جیسے راستے میں گڑھا کھود دیا اور کوئی انسان اس میں گر کر مرگیا، یا راستے میں کوئی ایسی چیز رکھ دی جس کے رکھنے کا اس کو حق نہیں تھا اور اس سے کوئی شخص ٹکرا کے مرگیا، یہ "قتل بالتسبیب" ہے، اور اس میں دیت آیا کرتی ہے، اس میں کفارہ نہیں ہے۔ اور قاتل کسی قسم کا ہو "قتل بالتسبیب" کے علاوہ، وہ وِرثے سے بھی محروم ہوتا ہے، کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی رشتہ دار کو قتل کردے جیسے بیٹے نے باپ کو قتل کردیا، یا بھائی نے بھائی کو قتل کردیا، اور پھر وارث بھی وہ ہو تو اس وارث کو محروم کردیا جاتا ہے، مقتول کا وِرثہ قاتل کو نہیں پہنچا کرتا۔ یہ قتل کے کچھ مختصر احکام ہیں۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے انہی باتوں کی وضاحت کی ہے تاکہ مؤمن محتاط رہیں، اور کسی اعتبار سے بھی کسی مؤمن سے کوئی دوسرا مؤمن قتل نہ ہوجائے۔

پہلے قتلِ خطا کو ذِکر کیا جارہا ہے، "کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں، کسی مؤمن کا یہ کام نہیں، مؤمن کی شان کے یہ لائق

نہیں کہ کسی دوسرے مؤمن کو قتل کرے، ہاں مگر غلطی سے قتل ہوجائے تو دوسری بات ہے'' اس میں بسا اوقات انسان معذور ہوتا ہے، اپنا ارادہ نہیں تھا اور دوسرا آدمی مرگیا، ایسا ہوسکتا ہے، اگر قتلِ خطا کے طور پر قتل ہوگیا تو یہ مؤمن کی شان کے منافی نہیں، کیونکہ اس میں کسی درجے میں اختیار نہیں ہوتا۔ پھر اگر غلطی سے قتل ہوجائے تو اُس کی تلافی کرو، اور تلافی کی صورت یہ ہے کہ ''جو شخص غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کردے تو اُس کے ذِمّے ہے ایک ایمان والے غلام کا آزاد کرنا'' مرد ہو یا عورت ہو، یہ لفظ دونوں پر بولا جاتا ہے، یہاں مؤمنہ ہونا شرط ہے۔ کفّارۂ یمین جو قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا ہے کہ قسم توڑنے کی صورت میں غلام آزاد کرو، یا کفّارۂ ظہار جو ذکر کیا گیا ہے اٹھائیسویں پارے کے پہلے رکوع میں وہاں فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ کا لفظ ہے، مؤمنہ کی قید نہیں ہے، اس لئے وہاں مطلق رقبہ ہے، اس لیے کافر بھی آزاد کردیا جائے تو کفّارہ ادا ہوجاتا ہے، لیکن قتل کے اندر رقبہ مؤمنہ ہونا ضروری ہے۔ اور دوسرے دیت ہے جو سپرد کی جائے گی مقتول کے اہل کے طرف، دیت کی مقدار اُس زمانے میں سو اُونٹ تھی، اور اسی طرح اندازہ تھا کہ کوئی بکریاں دینا چاہے تو کتنی دے گا، کپڑے دینا چاہے تو کتنے دے گا، اور دَراہم، دینار کے ساتھ اگر ادا کرنا چاہے تو ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم۔ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا: مگر یہ کہ اس مقتول کے ورثاء صدقہ کردیں، صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معاف کردیں، اگر سارے مل کر معاف کردیں تو بھی دیت معاف ہوجائے گی، یا جو شخص بھی اپنا حصہ معاف کردے گا اتنی دیت کے اندر تخفیف ہوجائے گی، مثلاً مقتول کے دو بیٹے ہیں جنہوں نے دیت وصول کرنی تھی، ایک نے اپنا حصہ معاف کردیا تو آدھی دینی پڑے گی اور آدھی معاف ہوجائے گی، اور اگر سارے مل کے معاف کردیں تو ساری ساقط ہوجائے گی۔ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ: اور اگر یہ صورت پیش آگئی کہ جو مقتول ہے وہ تو مؤمن ہے لیکن اُس کے ورثاء اور اُس کی برادری سارے کافر محارب ہیں جن کے ساتھ ہماری جنگ ہے، ان کے ساتھ مصالحت نہیں ہے، کافر ہیں، یہاں عداوت سے مسلمانوں کی آپس میں جو عداوت اور مخالفت ہوتی ہے وہ مراد نہیں، بلکہ جماعتِ مسلمین کے ساتھ عداوت مراد ہے یعنی وہ کافر محارب ہیں، تو ایسی صورت میں کفّارہ تو دیا جائے گا کہ رقبہ مؤمنہ آزاد کرو، اور نہ ہونے کے صورت میں روزے رکھو، لیکن دیت نہیں دی جائے گی، اس لئے کہ قتل ہونے والا مؤمن ہے، اور اُس کے رشتہ دار سارے کافر ہیں، اور مؤمن کا وارث کافر نہیں ہوتا، اور وہ حربی ہیں اور حربیوں کو اس قسم کا مالی فائدہ نہیں پہنچایا جاتا۔ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ: اور اگر وہ مقتول ایسے لوگوں میں سے ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہے، آپس میں معاہدہ ہے، تو دیت دینی پڑے گی، ''دیت سپرد کی جائے گی اُس کے اہل کی طرف، اور رقبہ مؤمنہ کا آزاد کرنا بھی ہے'' معاہد ہونے کی صورت میں، جیسے مقتول کے رشتے دار ذمی ہیں یا ان کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے تو ایسی صورت میں دیت بھی سپرد کی جائے گی اور رقبہ مؤمنہ کا آزاد کرنا بھی ہوگا۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ: اور جو رقبہ مؤمنہ نہ پائے، اس کی دونوں صورتیں آپ کی خدمت میں عرض کردی گئیں کہ یا تو غلام موجود نہیں، کہ پیسے ہونے کے باوجود خریدا نہیں جاسکتا، جیسے کہ آج کل حالت ہے، یا غلام تو موجود ہے لیکن پیسے پاس نہیں، تو ایسی صورت میں دو مہینے کے روزے رکھے، اور مسلسل رکھے، درمیان میں ناغہ نہیں کرنا، اور اگر کسی وجہ سے ناغہ ہوجائے بیماری کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، تو پھر نئے سرے سے رکھنے پڑیں گے۔ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ: یہ طریقہ بتایا گیا ہے اللہ کی طرف سے بطور توبہ کے، کہ جب ایسا کرلوگے کہ دیت بھی دے دوگے، کفّارہ بھی دے دوگے، تو اللہ تعالیٰ گناہ معاف کردے گا،

''اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے''۔ آگے قتلِ عمد کا ذکر آ گیا، قتلِ عمد کی یہاں اُخروی سزا ذکر کی گئی ہے، اور اس کی دُنیوی سزا قانونی حیثیت سے سورۂ بقرۃ میں آ گئی کہ قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ ''جو کوئی قتل کرے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر تو اُس کی جزا جہنم ہے، پڑا رہے گا اُس جہنم میں، اور اُس پر اللہ کا غضب ہوگا، اللہ نے اُس کو اپنی رحمت سے محروم کر دیا، اور اُس کے لئے عذابِ عظیم تیار کیا ہے'' یہ مؤمن کی جان کو نقصان پہنچانے کے نتیجے میں اتنی سخت سزا ذکر کی گئی، کہ جس انداز کے ساتھ کافروں کی سزا کا ذکر ہوتا ہے اسی انداز کے ساتھ اس کی سزا کو ذکر کیا گیا ہے، اِس میں جتنی شدت ہے وہ آپ کے سامنے نمایاں ہے۔

قتل کی ادنیٰ حمایت بھی سخت جرم ہے

بلکہ حدیث شریف میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اگر نصف کلمے کے مطابق بھی کسی نے کسی قاتل کی حمایت کی، حدیث شریف میں ''شَطْرَ كَلِمَةٍ'' کا لفظ ہے، نصف کلمے کے مطابق بھی اُس کی حمایت کر دی اور اُس کی تائید کر دی، تو یہ تائید کرنے والا شخص بھی قیامت کے دن ایسے طور پر آئے گا کہ اُس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوگا ''اٰیِسٌ مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ''(1) یہ شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہے، اس کو اللہ کی رحمت سے اُمید نہیں رکھنی چاہیے، یہ مایوس ہے، اگر نصف کلمے کے مطابق بھی اُس کی تائید کی، یعنی ''اُقْتُلْ'' پورا نہیں کہا بلکہ ''اُقْ'' کہہ کر کچھ اشارہ کر دیا جس سے دوسرا سمجھ جائے کہ اس کی حمایت میرے ساتھ ہے، اور میرے اس فعل کا یہ مؤید ہے، تو ایسی صورت میں وہ بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہوگا۔ اسی وجہ سے میں کچھ ذہنی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ مسلم ممالک کے اندر جو گڑبڑ ہوا کرتی ہے، اور ایک جماعت دوسری جماعت کے افراد کو قتل کرتی ہے، جیسے ایران میں ہوا یا جیسے افغانستان میں ہو رہا ہے کہ مسلمان ہی مسلمان کا قاتل ہے، آپس میں اختلاف کی بناء پر یہ لوگ گڑبڑ کرتے ہیں، اور ہمارے سامنے چونکہ صحیح صورتِ حال نہیں ہوتی، تو جن لوگوں کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے ہیں کہ وہ قاتلین کی تائید کرتے ہیں اور ان کے حق میں آواز اُٹھاتے ہیں کہ جو کچھ کر رہے ہیں صحیح کر رہے ہیں، مجھے تو صحیح بات ہے کہ اس معاملے میں ڈر لگتا ہے کہ یہ تو قتلِ مؤمن کا قصہ ہوتا ہے، اور ہم دوسری جگہ پر بیٹھے ہوئے یہ سمجھ نہیں سکتے کہ اس میں سے ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟ تو ایسی صورت میں کسی فریق کی تائید کرنا جس سے اس کو دوسروں کے قتل کرنے پر جرأت ہو یہ خطرے سے خالی نہیں ہے، اس میں بہت محتاط رہنا چاہیے، صحیح حالات کی تحقیق ہمارے بس میں نہیں ہوتی، کہ ہر جماعت اپنی مرضی کے مطابق خبریں باہر بھیجتی ہے، صحیح حالات کھل کر سامنے آتے نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے اور کس کا نہیں، تو ایسی صورت میں اپنی زبان کو محتاط رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

کسی شخص کے کفر و ایمان کے فیصلے کے متعلق تحقیق

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: اب آگے مجاہدین کو وہ احتیاط سکھائی ہے، کہ جب وہ سفرِ جہاد پر جائیں تو اُس وقت چونکہ چھپے چھپائے لوگ بھی مؤمن ہوتے تھے، جو موقع پا کر ایمان کا اظہار کرتے تھے، تو اس بارے میں بے احتیاطی نہ

(1) سنن ابن ماجہ ص ۱۸۸، باب التغليظ فی قتل مسلم/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۰۲، کتاب القصاص، فصل ثالث، عن ابی ہریرۃؓ۔

ہونے پائے، اپنے طور پر تحقیق کر کے قدم اُٹھایا کرو،'' جب تم اللہ کے راستے میں سفر کرو تو خوب اچھی طرح سے تحقیق کیا کرو، اور جو شخص تمہاری طرف سلام ڈالے تو اُس کو یوں نہ کہا کرو کہ تو مؤمن نہیں ہے'' جو السلام علیکم کہتا ہے مسلمانوں کے طریقے کے مطابق، تو سمجھ جایا کرو کہ جس نے اسلامی طریقہ اپنایا ہے یہ مسلمان ہی ہے، اور اگر وہ تمہارے سامنے کلمہ پڑھتا ہے، اور آ کر ''لا الٰہ الا اللہ'' کہتا ہے، صلح کا اظہار کرتا ہے، اطاعت کا اظہار کرتا ہے، تو یہ نہ کہا کرو کہ تو مؤمن نہیں ہے۔ اس آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص السلام علیکم کہہ دے اُسے بھی یہ نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں ہے، اور جو کلمہ پڑھ لے اُسے بھی یہ کہنے کی اجازت نہیں ہے کہ تو مؤمن نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ معاملات کے اندر اُس کو مؤمن سمجھو، یا حدیث شریف میں جیسے آتا ہے کہ جو قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہوا سے مؤمن سمجھو، جو تمہارا ذبیحہ کھاتا ہے اسے مؤمن سمجھو، اس قسم کی باتیں ذکر کی گئی ہیں جس سے بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو کافر کہنا جائز نہیں ہے جو السلام علیکم کہتا ہے، جو ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھتا ہے، جو ہمارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے، یا ہماری طرح نماز پڑھتا ہے، ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے اس کو لَسْتَ مُؤْمِنًا کہنا ٹھیک نہیں ہے، اور ایسے شخص کو کافر نہیں کہنا چاہیے، ان روایات سے اور قرآنِ کریم کی اس آیت سے یہی سمجھ میں آتا ہے، تو کیا ان علامات کی بناء پر کسی کو مؤمن قرار دیا جا سکتا ہے، اور اُس کی تکفیر جائز نہیں ہے؟ یہ یہاں ایک مستقل سوال ہے، کہ السلام علیکم کہہ دینا ہی کسی شخص کو مؤمن قرار دینے کے لئے کافی ہے؟ یا ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھ لینا ہی کسی شخص کو مؤمن قرار دینے کے لئے کافی ہے؟ اور ایسے شخص کی تکفیر جائز نہیں ہے؟ یا جو ہمارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے اُس کی تکفیر جائز نہیں؟ اور اُس کو مؤمن قرار دینا ضروری ہے؟ اس میں حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کو اس میں صرف یہی علامت معلوم ہے، اور اُس کے حالات کی تحقیق نہیں تو بدگمانی نہیں کرنی چاہیے، اور اُس کو مؤمن ہی قرار دینا چاہیے، جیسے ایک شخص ہمارے سامنے آ رہا ہے، ہم نہیں جانتے کہ اس کے خیالات کیا ہیں؟ اس کے عقیدے کیا ہیں؟ اور یہ کس نظریے کا ہے؟ اور آ کر مسلمانوں کی طرح آپ کو ملتا ہے، السلام علیکم کہتا ہے، تو آپ اُس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے مسلمان ہی سمجھیں۔ ایک شخص کو آپ کلمہ پڑھتے ہوئے سنتے ہیں کہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ رہا ہے اور اُس کے دیگر حالات معلوم نہیں ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ آپ اُس پر اعتماد کرتے ہوئے اُس کو مسلمان ہی سمجھیں اور اس کو کافر نہ کہیں، یا ایک شخص کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہے، اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتا ہے، اور اُس کے دیگر حالات آپ کو معلوم نہیں ہیں تو آپ کو چاہیے کہ اس کو مسلمان ہی سمجھیں جب تک اُس کے دوسرے خیالات کا پتا نہ ہو۔

ضروریاتِ دین کا منکر کافر ہے

اور اگر دوسرے حالات معلوم ہو جائیں، اُس کے خیالات کا پتا چل جائے، اور ہمارے سامنے تحقیق ہو جائے کہ یہ ضروریاتِ دین میں سے کسی مسئلے کا منکر ہے، کسی ایسے امر کا منکر ہے جس کو ضروریاتِ دین میں شمار کیا گیا ہے، تو ضروریاتِ دین کا

منکر ہونے کی وجہ سے پھر اس کو کافر قرار دیا جائے گا، پھر اس کو مسلمان قرار دینا ٹھیک نہیں، مثلاً ایک شخص آ کر آپ کو السلام علیکم تو کہتا ہے لیکن وہ خدا کے وجود کا منکر ہے، اور آپ کو تحقیق ہو گئی، اسی طرح ایک شخص آپ کے سامنے آ کر "لا الٰہ الا اللہ" تو پڑھتا ہے لیکن وہ "محمد رسول اللہ" کا قائل نہیں ہے، یا ایک شخص "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" تو پڑھتا ہے، لیکن بعث بعد الموت کا قائل نہیں ہے، مرنے کے بعد اُٹھنے کو وہ صحیح نہیں سمجھتا، یا ایک شخص آپ کے سامنے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھتا ہے لیکن کہتا ہے کہ "پانچ وقت نماز پڑھنا ضروری نہیں، یہ ایسے ہی مولویوں کی بنائی ہوئی بات ہے، اس مصروفیت اور مشغولیت کے دور میں پانچ وقت کی نماز پڑھنا تو اپنے آپ کو صنعتی ترقی میں پیچھے لے جانے والی بات ہے، اپنے اوقات فارغ کر کے کام کرنا چاہیے اور کمانا چاہیے!" اس قسم کی باتیں کرتا ہے، یا سود کو حلال کہتا ہے، زِنا کو حلال سمجھتا ہے، اس قسم کی باتیں جو ضروریاتِ دین میں ہیں، اسی طرح ختم نبوّت کا منکر ہے، سرورِ کائنات ﷺ کو آخری نبی نہیں سمجھتا، تو ان حالات کی تحقیق ہو جانے کے بعد پھر اُس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ ایمان کی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں کہ السلام علیکم کہہ دو یا قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو۔ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں منافقین "لا الٰہ الا اللہ" پڑھتے تھے اور "محمد رسول اللہ" کہتے تھے، خود قرآنِ کریم شہادت دیتا ہے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (سورۂ منافقون) رسول اللہ کی رسالت کی شہادت دیتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کافر ٹھہرے، کیونکہ وحی کے ذریعے سے سرورِ کائنات ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ ان کے دل کا عقیدہ ایسا نہیں ہے۔ یا اسی طرح حضور ﷺ کے زمانے کے آخر میں مسیلمہ جو بنو حنیفہ قبیلے کا اور یمامہ کے علاقے کا تھا، اُس نے نبوّت کا دعویٰ کر دیا، تو تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ وہ باقاعدہ نماز پڑھتا تھا، اور اَذان کہلواتا تھا، اَذان کے اندر "أشهد أن لا إله إلا الله" اور "أشهد أن محمدًا رسول الله" یہی کلمات کہلواتا تھا (معارف القرآن) لیکن وہ حضور ﷺ کے بعد نبوّت کا مدّعی تھا، تو اُس کو کافر قرار دیا گیا، اور باجماعِ اُمت اُس کے خلاف جہاد کیا گیا اور اُس کو قتل کیا گیا۔ تو ان سب باتوں کی طرف دیکھتے ہوئے جو اَصل اُصول نکلتا ہے وہ یہی ہے، اور تکفیر کے اُصول میں یہ بنیادی بات ہے کہ کوئی شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی اَمر کا اگر منکر ہے تو وہ کافر ہے، چاہے کلمہ پڑھتا ہو، چاہے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو، چاہے السلام علیکم کہتا ہو۔ اس لیے السلام علیکم کہنے والے کو، کلمہ پڑھنے والے کو، نماز پڑھنے والے کو اس وقت تک کافر نہیں کہا جائے گا جب تک کہ ہمیں دیگر حالات کی تحقیق نہ ہو، اور سرورِ کائنات ﷺ کے بعد چونکہ دل کے حالات کی تحقیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ نفاق صرف حضور ﷺ کے زمانے میں تھا، اب یا تو کفر ہے یا اسلام،[1] اگر ہمیں ظاہری طور پر اس میں کوئی کفر کی علامت ملے گی تو کافر کہیں گے ورنہ اس کو مؤمن کہیں گے، اس سے ہمیں بحث نہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے؟ کیونکہ کسی کے دل کے حالات کا جان لینا ہمارے بس کی بات نہیں، مسئلہ تو بیان کریں گے کہ جو اُوپر اُوپر سے اقرار کرتا ہو اور دل میں انکار کرتا ہو وہ منافق ہے، لیکن بالتعیین کسی کو منافق قرار دے دینا اب یہ ہمارے بس کی بات

---

(۱) صحیح البخاری ۲/ ۱۰۵۴ باب اذا قال عند قوم شیئا ثم خرج فقال بخلافه/مشکوۃ ج ا ص ۱۸۔

نہیں ہے، کیونکہ دل کے حالات جان لینا ہمارے بس میں نہیں، حضور ﷺ کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہوجاتے تھے، جس کی وجہ سے تیسری قسم موجود تھی، مؤمن کافر اور منافق، اب نفاق نہیں ہے، یعنی حقیقت میں تو ہے لیکن ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ منافق ہے، اگر کوئی کُفر کی بات ہمیں مل جائے تو ہم اُس کو کافر کہیں گے، اگر کُفر کی بات نہ ملے تو ہم اُس کو مؤمن کہیں گے، دل کے حالات کی تحقیق اب ہمارے ذِمّے نہیں ہے۔ اس لئے یوں کہہ دینا کہ ''فلاں کلمہ پڑھتا ہے اُس کو کافر کیسے کہہ دیا جائے؟ فلاں نماز پڑھتا ہے اُس کو کافر کیسے کہہ دیا جائے؟'' یہ حقیقت سے بے خبری ہے، مؤمن بننے کے لئے ضروریاتِ دِین کو ماننا ضروری ہے۔

''ضروریاتِ دِین'' کا مصداق

اور ''ضروریاتِ دِین'' کون کون سی ہیں؟ اس کی وقت پر تحقیق کی جاسکتی ہے، جو معاملہ بھی سامنے آئے گا اُس وقت علماء سے تحقیق کرلی جاتی ہے، کہ یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے یا نہیں؟ جیسے نزولِ عیسیٰ کا عقیدہ ضروریاتِ دِین میں سے ہے، ختمِ نبوّت کا عقیدہ ضروریاتِ دِین میں سے ہے، پانچوں نمازوں کا فرض ہونا انہی اوقات میں انہی کیفیات کے ساتھ یہ بھی ضروریاتِ دِین میں سے ہے، زکوٰۃ ضروریاتِ دِین میں سے ہے، حج کی فرضیت ضروریاتِ دِین میں سے ہے، زِنا کا حرام ہونا ضروریاتِ دِین میں سے ہے، سُود کا حرام ہونا ضروریاتِ دِین میں سے ہے، یہ موٹی موٹی باتیں ہیں، اور ''ضرورت'' اس کو کہتے ہیں جو بدیہی امر ہو کہ ہر عالم جاہل اس کام کو سمجھتا ہو کہ یہ دِین کا کام ہے اور حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے، یعنی اُمت کے عام افراد اس کو جانتے ہیں، تو حضور ﷺ کے زمانے سے جو اتنے واضح اُمور چلے آتے ہیں جن پر اُمت کا اتفاق ہے ان میں سے کسی امر کا انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیا جائے گا، مثلاً قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب نہیں سمجھتا، یا اس قرآنِ کریم کو جو ہمارے سامنے رکھا ہوا ہے محرّف مانتا ہے، یہ ساری کی ساری چیزیں کُفر کی ہیں، جن کے اندر یہ چیزیں پائی جائیں گی ان کو کافر کہیں گے، یا اسی طرح دوسری کوئی علاماتِ کُفر اُس کے اوپر نمایاں ہیں، جیسے کسی بت کو سجدہ کرتا ہے یا اُس نے کافروں کی طرح زُنار باندھ رکھا ہے، یا گلے کے اندر صلیب لٹکا رکھی ہے، یہ نمایاں علامات ہیں جن کی بناء پر کسی کو کافر کہہ دیا جاتا ہے۔

اس لیے یہ جو آپ مسئلہ پڑھیں گے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہیں کرنی چاہیے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی گناہ اور معصیت کی بناء پر کافر نہیں کہا جائے گا، لیکن اگر عقیدہ کُفر والا ہو تو کافر یقیناً قرار دیں گے، یعنی ایک شخص مؤمن ہے، پھر اُس سے کوئی بڑے سے بڑا گناہ ہوجائے، مثلاً زِنا کا صدور ہوگیا، یا وہ سُود لیتا ہے، یا اُس سے قتل کا صدور ہوگیا، تو ان معاصی کی بناء پر اُس کو کافر نہیں کہا جائے گا، البتہ عقیدے کے بدلنے کے ساتھ اُس کو کافر کہیں گے، ضروریاتِ دِین میں سے اگر وہ کسی چیز کا منکر ہوگیا تو ایسی صورت میں اُس کو کافر کہیں گے، تو یہ مطلب ہے اِس اصطلاح کا کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہیں کی جاتی۔

ننانوے وجوہِ کُفر اور ایک وجہِ اِیمان کا مطلب؟

اور اسی طرح ایک اور جملہ آیا کرتا ہے اور عام طور پر مشہور ہے، کہ اگر کسی کی کلام میں ننانوے وجوہ ایسے موجود ہوں جو کُفر

ہیں، اور ایک کا احتمال بھی ایسا ہو جس کو مراد لے لینے سے انسان کُفر سے بچ سکتا ہو تو ایسے کلمے پر بھی کُفر کا حکم نہیں لگایا جاتا، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی میں ننانوے وجوہ کُفر کے موجود ہوں اور ایک وجہ کسی کے مؤمن ہونے کی ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی کی ایک بات ہمارے سامنے آگئی کہ اس نے یوں کہا ہے، اور اس بات کے سو مطلب نکل سکتے ہیں، ننانوے مطلب ایسے ہیں کہ وہ اگر مراد لے لئے جائیں تو کُفر ہے، لیکن اُس کا ایک مطلب ایسا نکل سکتا ہے کہ اگر وہ مراد لے لیا جائے تو کُفر نہیں، تو جب تک قائل خود تعیین نہ کرے کہ میرا مطلب فلاں ہے جو کہ کُفر ہے اُس وقت تک اس قسم کی بات کی بناء پر کافر نہیں کہا جائے گا، بلکہ تاویل کی جائے گی، اور اگر وہ قائل خود کہہ دے کہ میرا یہ مطلب نہیں جس کی بناء پر تم کہتے ہو کہ یہ بات ایمان کے دائرے میں رہ سکتی ہے، بلکہ میں نے وہ مطلب لیا ہے جس کو ہم کہتے ہیں کہ یہ کُفر ہے، اگر وہ خود صراحت کر دے گا تو بھی اُس بات کی بناء پر اُس کو کافر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ بہر حال اِلقائے سلام کو جو مؤمن ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے یہ اُس وقت تک ہے جب تک دیگر حالات کی تحقیق نہ ہو، جیسے ہمارے سامنے ایک اجنبی آدمی آتا ہے اور ہم اُس کے حالات سے واقف نہیں ہیں تو اگر اُس کے اُوپر اسلام کی علامات نمایاں ہیں تو ہم اُس کو مسلمان سمجھیں گے، بدگمانی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن حالات کی تحقیق کے بعد اُس میں اگر کوئی ایسی وجہ پائی جائے جو کافروں والی ہے تو پھر اُس کی تکفیر کی جائے گی۔

سوال:- اگر کوئی کہتا ہے کہ قرآن میں جو ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ'' ہے اس سے مراد دِل کی نماز ہے؟

جواب:- یہ کُفر ہے، نماز سے یہی حسی نماز مراد ہے، جو کہتے ہیں کہ دِل کی نماز مراد ہے، یہ پانچ وقتی نماز مراد نہیں ہے تو یہ ضروریاتِ دِین کا انکار ہے۔

''اے ایمان والو! جب تم چلو اللہ کے راستے میں تو خوب تحقیق کرلیا کرو، اور نہ کہا کرو اُس شخص کو جو تمہاری طرف سلام ڈالے کہ تو مؤمن نہیں ہے، طلب کرتے ہو تم دنیوی زندگی کا سامان'' یعنی دنیوی زندگی کا سامان لینے کے لئے اور ان کا مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے ایسی حرکت نہ کیا کرو، ''اللہ تعالیٰ کے پاس بڑی غنیمتیں ہیں''، اللہ تعالیٰ اور بہت تمہیں دے گا۔ تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے، چھپے چھپائے کلمہ پڑھتے تھے اور ایمان لاتے تھے، تمہارا ایمان بھی تو معتبر تھا، اور جب موقع ملا تو پھر تم نے اظہار کیا، اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں ماحول ایسا دے دیا کہ تم نے اسلام کا اظہار کر دیا، تو جیسے پہلے تم چھپے چھپائے مؤمن تھے اسی طرح اب بھی چھپے چھپائے مؤمن ہو سکتے ہیں، اور وہ جب مسلمانوں کا لشکر دیکھیں اور آ کر اسلام کا اظہار کریں تو قابلِ قبول ہونا چاہیے، آخر تم بھی تو پہلے ایمان کو چھپاتے تھے، تو اسی طرح اگر کوئی شخص ایمان کو چھپائے بیٹھا ہو، اور کافروں مشرکوں کی موجودگی میں اُس کا اظہار نہ کرتا ہو، تو جیسے تمہارا ایمان معتبر تھا ان کا بھی معتبر ہے۔ ''تم بھی پہلے ایسے ہی تھے'' فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ: پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، ''پس خوب اچھی طرح سے تحقیق کرلیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے''۔

جہاد کب فرضِ عین اور کب فرضِ کفایہ ہے؟

آگے وہی جہاد کی ترغیب ہے، اور ترغیب اس انداز سے دی گئی ہے کہ مسئلہ بھی واضح ہوگیا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے، فرض علی العین نہیں، فرض علی العین وہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کے لئے کرنا ضروری ہے، جو بھی چھوڑے گا وہ فاسق اور گناہ گار ہے، اور فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جماعتِ مسلمین پر فرض ہے، اس لئے چند افراد جو ضرورت کے لئے کافی ہوں اگر اس فرض کو ادا کردیں تو باقیوں سے فرض ساقط ہوجائے گا، جیسے جنازہ پڑھنا مسلمانوں کے ذِمّے فرض ہے، چند افراد اگر پڑھ لیں گے تو فرض ادا ہوجائے گا، اور اگر کوئی بھی ادا نہیں کرے گا تو سارے گناہ گار ہوں گے، اس لئے کہا جارہا ہے کہ مجاہدین کا درجہ تو بہت اُونچا ہے قاعدین کے مقابلے میں، لیکن اللہ تعالیٰ نے وعدہ ہر ایک سے اچھا کیا ہوا ہے کہ قاعدین بھی اجر کے مستحق ہیں اور مجاہدین بھی اجر کے مستحق ہیں، لیکن مجاہدین کو اجر زیادہ ملے گا۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے، اِن اعمال کا پابند ہے، تو چاہے گھر ہی بیٹھا رہے آخرت میں اللہ تعالیٰ اُس کو بخش دیں گے، اور پھر فرمایا کہ لیکن جہاد کرنے والوں کے درجات بہت اُونچے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے سو سو درجات اُونچے کرے گا، اور دو درجوں کے درمیان میں اتنا فصل ہوگا جتنا زمین اور آسمان کے درمیان ہے۔[1] اس لئے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے لئے جہاد کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی علامت ہے اس بات کی کہ یہ فرضِ کفایہ ہے، فرض علی العین نہیں، اگر فرض علی العین ہوتا تو اس کے تارکین آخرت میں کامیابی کے مستحق نہ ہوتے، لیکن جو جہاد نہیں کرتے، گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں چاہے بغیر عذر کے بیٹھے ہوئے ہیں، ایسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اچھائی کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ ''نہیں برابر مؤمنوں میں سے بغیر عذر کے بیٹھ رہنے والے'' عذر والوں کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو زیرِ بحث ہی نہیں، اگر کسی کے اندر جہاد کا جذبہ ہے لیکن کسی عذر کی بناء پر وہ جہاد میں نہیں جاسکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو مجاہدوں والا اجر دیتے ہیں۔ ''نہیں برابر وہ لوگ جو بیٹھ رہیں مؤمنوں میں سے بغیر عذر کے، اور وہ لوگ جو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ، فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ بیٹھنے والوں کے مقابلے میں درجے میں، اور ہر ایک کے ساتھ اللہ نے اچھی حالت کا وعدہ کیا ہے'' یعنی قاعدین بھی مردود نہیں ہیں جبکہ جہاد فرض علی العین نہ ہو، ہاں البتہ کافروں کی طرف سے ہجوم ہوجائے اور جو فوج آپ نے مرتب کی ہوئی ہے وہ جہاد کے لئے کافی نہ ہو اور جس وقت تک آپ لوگ شامل نہیں ہوں گے کافروں کو شکست نہیں دی جاسکتی، ایسے حالات میں جس طرح فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ یہ فرض علی العین بھی ہوجاتا ہے، پھر اس کا ترک کرنا گناہ ہوگا۔ ''فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو قاعدین کے مقابلے میں اجرِ عظیم میں'' اجرِ عظیم ان کا بڑھا دیا، اجرِ عظیم کی تفصیل یہ ہے کہ ''اللہ کی طرف سے درجات ملیں گے، اللہ کی طرف سے مغفرت اور رحمت حاصل ہوگی، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

---

(۱) صحیح البخاری ۱/۳۹۱ باب درجات المجاهدين في سبيل الله/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۹، کتاب الجہاد کی پہلی حدیث۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ

بیشک وہ لوگ جن کوفرشتے وفات دیتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، فرشتے کہتے ہیں: تم کس

كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ

چیز میں تھے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم بے بس تھے اپنے علاقے میں، فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع

وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ﴿۹۷﴾

نہیں تھی کہ تم اُس میں ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے ﴿۹۷﴾

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

مگر وہ مرد اور عورتیں اور بچّے جو بے بس ہیں، نہیں طاقت رکھتے وہ

حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ

کسی تدبیر کی اور نہیں ہدایت پاتے وہ کسی راستے کی طرف ﴿۹۸﴾ پس یہی لوگ ہیں، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر

عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

کرے گا، اور اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے ﴿۹۹﴾ اور جو شخص بھی ہجرت کرے اللہ کے راستے میں

يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا

پائے گا وہ زمین میں علیحدہ ہونے کی جگہ بہت زیادہ اور پائے گا وہ وسعت، اور جو شخص بھی نکلے اپنے گھر سے ہجرت کرتا ہوا

اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ

اللہ اور اُس کے رسول کی طرف پھر اُس کو موت پالے پس تحقیق واقع ہوگیا اُس کا اجر اللہ پر،

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ

اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۰﴾ اور جس وقت تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی

جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ

گناہ نہیں کہ تم نماز میں سے کچھ حصہ کم کر دیا کرو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ فتنہ میں ڈال دیں گے تمہیں وہ لوگ

كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝۱۰۱ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ

جنہوں نے کفر کیا، بے شک کافر تمہارے صریح دشمن ہیں ۝۱۰۱ اور جس وقت آپ ان مؤمنین میں موجود ہوں

فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا

پھر آپ ان کے لئے نماز قائم کریں تو چاہیے کہ ان میں سے ایک طائفہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور چاہیے کہ یہ لوگ اپنے ہتھیار

اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ

لے لیں، پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو چاہیے کہ یہ لوگ تمہارے پیچھے چلے جائیں، اور دوسرے طائفہ کو آجانا

اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ

چاہیے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی پھر وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں، اور چاہیے کہ وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار اختیار کرلیں،

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ

چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ غافل ہو جاؤ تم اپنے ہتھیاروں سے اور اپنے سامانوں سے

فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ

پھر وہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں گے، اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تمہیں

اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا

تکلیف ہے بارش کی وجہ سے یا تم بیمار ہو کہ تم اتار کر رکھ دو اپنے ہتھیار، اور اپنا بچاؤ

حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ

اختیار کرو، بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے ۝۱۰۲ پھر جب تم نماز پوری کرلو

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ

تو یاد کرو اللہ کو کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں اور پہلوؤں پر لیٹنے کی حالت میں، پھر جس وقت تم مطمئن ہو جاؤ

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝۱۰۳

تو نماز قائم کیا کرو، بے شک نماز مؤمنوں پر فرض کی ہوئی ہے وقت متعین کرکے ۝۱۰۳

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ

سستی نہ کیا کرو قوم کا پیچھا کرنے میں، اگر تم درد محسوس کرتے ہو تو بیشک وہ بھی تو درد محسوس کرتے ہیں جیسے تم درد محسوس کرتے ہو،

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۚ

اور تم اُمید کرتے ہو اللہ کی جانب سے ایسی چیز کی جس کی وہ اُمید نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۱۰۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: بیشک وہ لوگ جن کو فرشتے وفات دیتے ہیں ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: اس حال میں کہ وہ لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ ظَالِمِيْ اصل میں ظالمین تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ اور وفات دینے والا فرشتہ ایک ہی ہے جس کو ''عزرائیل'' کہتے ہیں باقی اس کے معاونین ہیں، تو جمع کا صیغہ اُن معاونین کی وجہ سے ہے، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ نسبت اسی طرح واحد کی طرف ہی آئے گی قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (سورۂ الم سجدہ: ۱۱) تمہیں وفات دیتا ہے موت کا فرشتہ۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے معاون آتے ہیں، تو معاونین کے اعتبار سے یہاں جمع کا صیغہ آ گیا۔ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ یہ تَوَفّٰىهُمْ کی ھم ضمیر سے حال ہے۔ ''اس حال میں کہ وہ لوگ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں'' قَالُوْا: فرشتے کہتے ہیں فِيْمَ كُنْتُمْ: تم کس چیز میں تھے؟ تمہارا کیا حال تھا؟ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ: وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کمزور قرار دیے گئے تھے علاقے میں، اَرض سے اپنا علاقہ مراد ہے، مُسْتَضْعَفِيْنَ: کمزور سمجھے ہوئے تھے، بے بس تھے، اپنے علاقے میں، اپنے ملک میں۔ قَالُوْا: فرشتے کہتے ہیں، اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہیں تھی؟ وسعت والی نہیں تھی؟ فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا: کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: یہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے، بُری ہے وہ جہنم از روئے ٹھکانے کے، اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ: یہ بیان ہے مُسْتَضْعَفِيْنَ کا۔ مگر وہ مرد اور عورتیں اور بچے جو بے بس ہیں، مُسْتَضْعَفِيْنَ: جو بے بس ہیں، کمزور سمجھے ہوئے ہیں، اس کا مصداق ہے مرد عورتیں اور بچے، لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً: جو نہیں طاقت رکھتے کسی تدبیر کی، حیلہ سے تدبیر مراد ہے، یعنی ہجرت کرنے کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہیں کر سکتے، ''نہیں طاقت رکھتے وہ کسی تدبیر کی'' وَلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا: اور نہیں ہدایت پاتے وہ کسی راستے کی طرف، ان کو کوئی راستہ معلوم نہیں، یا ان کے لئے کوئی راہ کھلی نہیں، فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ: پس یہی لوگ ہیں، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کرے گا وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا: اور اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور جو شخص بھی ہجرت کرے اللہ کے راستے میں يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا: مُراغَم ظرف کا صیغہ ہے، مُراغَمَة: چھوڑ کر کسی طرف چلے جانا، اپنا وطن چھوڑ کر یا اپنے رفقاء کو چھوڑ کر علیحدگی اختیار کر لینا یہ اصل میں مراغمت کا مفہوم ہے، تو مراغم کا معنی جدا ہونے کی جگہ، علیحدہ ہونے کی جگہ، اس لیے بھاگ جانے کی جگہ، چلے جانے کی جگہ، تراجم کے اندر مختلف الفاظ کے ساتھ اس کے مفہوم کو ادا کیا گیا ہے، المذھب،

المهرب، بھاگ کر جانے کی جگہ، جدا ہو جانے کی جگہ، ”جو ہجرت کرے اللہ کے راستے میں“ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّ سَعَةً: پائے گا وہ زمین میں جدا ہونے کی جگہ بہت زیادہ اور پائے گا وہ وسعت۔ سَعَةً یہ وُسعة کے معنی میں ہے۔ وسعت کے دونوں مفہوم ہیں یا تو رزق کی وسعت، یا، اپنے مذہب کے اظہار کی وسعت، یعنی اس کو اتنی گنجائش ملے گی کہ اپنے مذہب پر عمل کر سکے۔ وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا: اور جو شخص بھی نکلے اپنے گھر سے ہجرت کرتا ہوا اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ: پھر اس کو موت پالے، فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ: پس تحقیق واقع ہو گیا اس کا اجر اللہ پر۔ علیٰ وجوب کے لئے آیا کرتا ہے اور یہ حق تفضلی ہے، اس کا اجر اللہ کے ذِمے لگ گیا، اللہ نے اس کے اجر کی ذمہ داری لے لی، وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ: اور جس وقت تم زمین میں سفر کرو، ضرب فی الارض سے زمین میں چلنا مراد ہے یعنی سفر، فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ: تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ: کہ تم نماز میں سے کچھ حصہ کم کر دیا کرو، قصر کر لیا کرو نماز میں سے، اِنْ خِفْتُمْ: اگر تمہیں اندیشہ ہو اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: کہ فتنہ میں ڈال دیں گے تمہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، یعنی کافروں کی طرف سے کسی شرارت کے اُٹھ کھڑے ہونے کا خطرہ ہے، تمہیں کسی تکلیف کے پہنچنے کا خطرہ ہے تو کوئی حرج نہیں کہ تم نماز کو کچھ کم کر دیا کرو، اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا: بیشک کافر تمہارے لیے صریح دشمن ہیں، کھلے دشمن ہیں۔ وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ: اور جس وقت آپ ان مؤمنین میں موجود ہوں فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ: پھر آپ ان کے لئے نماز کو قائم کریں، یعنی جماعت کا وقت آجائے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع آجائے۔ ”تو قائم کریں آپ ان کے لئے نماز کو“ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ: پس چاہیے کہ اُن میں سے ایک طائفہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے وَلْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ: اور چاہیے کہ یہ لوگ اپنے ہتھیار لے لیں فَاِذَا سَجَدُوْا: پھر جب یہ سجدہ کر لیں، یعنی ایک رکعت پوری کر لیں، فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ: تو چاہیے کہ یہ لوگ تمہارے پیچھے چلے جائیں، وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى: اور دوسرے طائفہ کو آجانا چاہیے لَمْ یُصَلُّوْا: جنہوں نے نماز نہیں پڑھی، فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ: پس وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں، وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ: اور چاہیے کہ وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار اختیار کر لیں۔ حِذر کا لفظ ان چیزوں پر بولا جاتا ہے جو دفاعی طور پر استعمال ہوتی ہیں، دوسرے کے حملے سے بچاؤ کے لئے، جیسے سر پر خود یعنی لوہے کی ٹوپی، سینے کی زرہ، اور ہاتھ کی سپر جو دوسرے کا وار روکنے کے لئے ہوتی ہے، حذر کا مصداق اس قسم کا سامان ہے جس کو ہم دفاعی سامان کہتے ہیں، اور اسلحہ سے مراد وہ سامان ہو جائے گا جو جارحانہ کارروائی کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے تلوار اور نیزہ، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں لفظ کہیں اکٹھے آجائیں تو ان کا ترجمہ علیحدہ علیحدہ ہوگا، حذر سے دفاعی سامان مراد ہو جائے گا، اور اسلحہ سے جارحانہ سامان مراد ہو جائے گا جس سے دوسرے پر حملہ کیا جاتا ہے، اور اگر کہیں حِذر کا لفظ اکیلا آجائے جس طرح پیچھے آیا تھا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا (آیت: ۷۱) تو پھر حِذر میں سارا سامان شامل ہوتا ہے دفاعی بھی اور جارحانہ بھی، چونکہ یہاں دونوں لفظ اکٹھے آگئے اس لیے دونوں کا مصداق علیحدہ علیحدہ بیان کر دیا جائے گا، حِذر کا مصداق ہو جائے گا بچاؤ کا سامان، اور اسلحہ کا مصداق ہو جائے گا ہتھیار جس کے ذریعے سے دوسروں پر حملہ کیا جاتا ہے۔ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ: کہ غافل ہو جاؤ تم اپنے سامانِ جنگ سے وَ اَمْتِعَتِكُمْ: اور اپنے سامان

سے، امتعہ متاع کی جمع۔ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً: پھر وہ مائل ہوجائیں گے تم پر یکبارگی مائل ہونا، مائل ہونے سے یہاں حملہ کرنا مراد ہے، تو پھر وہ تم پر یکبارگی حملہ کردیں گے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ: اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے بارش وغیرہ کی، اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى: یا تم بیمار ہو۔ مرضیٰ مریض کی جمع۔ کوئی گناہ نہیں کہ تم اتار کر رکھ دیا کرو اپنا سامان، اَنْ تَضَعُوْا اَسْلِحَتَكُمْ: وَضَعَ يَضَعُ: اتار کے رکھ دینا، ''اتار کے رکھ دو تم اپنا سامان'' وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ: اور اپنا بچاؤ اختیار کرو، اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا: بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ: پھر جب تم نماز پوری کرلو۔ قضاء ادا کرنے کے معنی میں ہے۔ جب تم نماز پڑھ چکو، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا: تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو، قائمین وقاعدین ومضطجعین عَلٰى جُنُوْبِكُمْ: یاد کرو اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں، اور پہلوؤں پر لیٹنے کی حالت میں، یعنی ہر حال میں، کیونکہ عام طور پر انسان کا حال یہی ہوتا ہے کہ یا کھڑا ہوگا یا بیٹھا ہوگا یا لیٹا ہوا ہوگا۔ تو قِيٰمًا یہ قائمین سے ہوکر فَاذْكُرُوا کی ضمیر سے حال ہے، قُعُوْدًا قاعدین کے معنی میں، اور عَلٰى جُنُوْبِكُمْ: مُضْطَجِعِيْنَ علی جُنُوبِکُمْ ''کھڑے ہونے کی حالت، بیٹھنے کی حالت میں، اور پہلوؤں کے بل لیٹنے کی حالت میں'' اس طرح سے اس کا مفہوم ادا کیا جائے گا، یعنی ہر حال میں۔ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ: پھر جس وقت تم مطمئن ہوجاؤ، وہ خوف زائل ہوجائے فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: تو نماز قائم کیا کرو، یعنی اس کے آداب کے ساتھ، اس کی شرطوں کی رعایت رکھتے ہوئے اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک نماز مؤمنوں پر فرض کی ہوئی ہے كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا: وقت متعین کرکے۔ موقوت: وقت متعین کی ہوئی۔ کتاب مکتوب کے معنی میں ہے، مؤمنوں پر نماز لکھی ہوئی ہے، فرض کی ہوئی ہے وقت متعین کرکے۔ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ: سستی نہ کیا کرو، کمزوری نہ دکھایا کرو قوم کا پیچھا کرنے میں۔ قوم سے یہاں دشمن قوم مراد ہے۔ وَهن کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آچکا، کمزور ہونا، سست پڑ جانا، ہمت چھوڑ دینا، یہ اس لفظ کا مفہوم ہوتا ہے۔ ''ہمت نہ چھوڑا کرو، سستی نہ دکھایا کرو، ہمت نہ ہارا کرو قوم کا پیچھا کرنے میں، لفظی ترجمہ ہے قوم کے تلاش کرنے میں، طلب کرنے میں، یعنی اس کا پیچھا کرنے میں، اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ: اگر تم دکھ درد محسوس کرتے ہو فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ: پس بیشک وہ بھی تو دکھ محسوس کرتے ہیں، درد محسوس کرتے ہیں، اَلم محسوس کرتے ہیں جیسے تم اَلم محسوس کرتے ہو، جیسے تم درد زدہ ہوتے ہو، وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ: اور تم اُمید کرتے ہو اللہ کی جانب سے ایسی چیز کی جس کی وہ اُمید نہیں کرتے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ہجرت اور جہاد کا مقصد

جہاد کا ذکر چلا آرہا تھا، اور جہاد کی آیات میں اب اس رکوع میں ہجرت کا تذکرہ آگیا، ہجرت اور جہاد دونوں آپس میں گہری مناسبت رکھتے ہیں، حکم ہے اپنے دین کے بچانے کا اور دینی فتنوں سے بچنے کا، کہ کوئی شخص اس کو دین سے پھسلا نہ سکے اور

زمین پر چلنے والی چیزیں کتنی ہیں جو اپنا رزق اپنے کندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں؟ اَللّٰہُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاکُمْ: اللہ انہیں بھی دیتا ہے تمہیں بھی دے گا، یوں یہ خیالات جو ہجرت سے مانع بنتے ہیں اِن الفاظ میں ان موانع کو اُٹھایا گیا ہے۔ تو یہ مناسبت ہے ہجرت کی اور جہاد کی، جس کی وجہ سے یہاں جہاد کی آیات کے درمیان میں ہجرت کا مسئلہ ذکر کر دیا گیا۔

ہجرت کا لغوی وشرعی معنی اور اس کا صحیح مصداق

هَجَرَ یَهْجُرُ چھوڑنے کے معنی میں ہے، هِجران، هِجر، هِجرة، تَهَاجُر، مُهاجَرة، یہ لفظ کتابوں میں آتے رہتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کو چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ اور شرعی اصطلاح میں ہجرت کا معنی ہوتا ہے کہ ایسے علاقے کو جس میں رہتے ہوئے انسان اپنے دین کی حفاظت نہیں کر سکتا، اس کو چھوڑ کر کسی ایسے علاقے کی طرف جانا جہاں جا کر اپنے دین کے مطابق عمل کر سکیں۔ تو گویا کہ اِس میں ترکِ وطن پایا گیا، اپنے وطن کو چھوڑنا، ایسا وطن جس میں کُفر غالب ہے، اور ایسے وطن کی طرف چلے جانا جہاں اسلام غالب ہے، وہاں رہ کر اِنسان اسلام کے مطابق عمل کر سکتا ہے، اور مقصد ہوتا ہے اللہ کی رضا کو حاصل کرنا اور اپنے دین کے مطابق عمل کرنا۔ اس لیے اگر انسان ایک علاقہ اس وجہ سے چھوڑتا ہے کہ یہاں کُفّار ہمیں ملازمت نہیں کرنے دیتے، ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچاتے ہیں، ہم دوسرے علاقے میں چلے جائیں، وہاں جا کر ہمارا کاروبار اچھا ہو جائے گا، اس جذبے کے تحت جو علاقہ چھوڑا جائے گا تو یہ چھوڑنا ہجرت نہیں کہلائے گا، بلکہ محض دین مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو، جیسے کہ مشہور روایت ہے، عام طور پر خطبوں میں پڑھی جاتی ہے، مشکوٰۃ شریف میں بھی پہلے نمبر پر اس کو نقل کیا گیا، اور بخاری شریف میں بھی پہلے نمبر پر اس کو نقل کیا گیا، اس میں حضور ﷺ نے لوگوں کو یہی تعلیم دی تھی ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِیٍٔ مَا نَوٰی. فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. وَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُهَا. اَوِ امْرَاَةٍ یَتَزَوَّجُهَا. فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَا هَاجَرَ اِلَیْهِ'' (اللفظ للمشکاۃ) کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول کی نیت کر کے ہجرت کرے گا وہ ہجرت صحیح ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے سمجھی جائے گی، اور اگر دُنیا کمانے کے لئے ایک علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں جاتے ہو یا کوئی شادی رچانے کے لئے اور کسی عورت کو حاصل کرنے کے لیے ایک علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقے کی طرف جاتے ہو تو پھر جس طرف تم نے ہجرت کی ہے وہ ہجرت اُدھر ہی ہے، وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف ہجرت نہیں ہے، چاہے تم اپنے آپ کو یہ قرار دیتے رہو کہ ہم مہاجر الی اللہ ہیں، لیکن اللہ نیت کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے انسان کے دِل کا ارادہ اور قصد ہے، اس لیے اگر اللہ کی رضا مقصود ہوگی تو ہجرت صحیح ہے ورنہ صحیح نہیں۔

پھر اسی کے تحت یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ جب مقصد ہی دین ہے اور اپنے دین کو بچانے کے لئے ہجرت کی جائے گی تو ہجرت کر کے تو آ گئے لیکن اس علاقے میں پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اسی طرح سے رہی، دارالاسلام میں آ جانے کے بعد نماز نہیں پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کو پورا نہیں کرتے تو یہ ہجرت کی ایک صورت ہے، ہجرت کی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ ہجرت کی روح اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا ''اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ

مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ"(۱) کامل درجے کا اور صحیح مہاجر وہ ہے جو ان گناہوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے روکا ہے۔ اور اگر کوئی ہجرت کر کے آ گیا اور وہ گناہ اسی طرح سے کر رہا ہے، اللہ کی معصیت اختیار کیے ہوئے ہے، تو پھر اُس علاقے کو چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ علاقہ تو اسی لئے چھوڑا تھا تا کہ ہم دوسرے علاقے میں جا کر اپنے دِین کے مطابق عمل کریں گے، اور اگر دِین کے مطابق عمل کرنا ہی نہیں تھا تو پھر اِس علاقے میں اور اُس علاقے میں کیا فرق تھا؟ پھر صورۃً ہجرت پائی گئی حقیقتاً ہجرت نہیں ہے۔

عدمِ ہجرت پر وعید اور معذورین کا اِستثنا

تو یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو کہ دوسری جگہوں میں رہتے ہوئے ایمان قبول کر لیتے تھے ان کو ہجرت کی ترغیب دیتے ہیں، کہ اگر ہجرت کے اسباب مہیا ہوں اور پھر ہجرت نہ کی جائے تو یہ جرم ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عُذر نہیں چلے گا کہ ہم مغلوب تھے، لوگ ہمیں دِین پر چلنے نہیں دیتے تھے، ہم اس لئے دِین پر نہیں چلے، یہ عُذر بالکل نہیں سنا جائے گا، ہاں البتہ اگر کوئی واقعی کمزور ہے، ایسا دبا ہوا اور بے بس ہے کہ کوئی تدبیر نہیں کر سکتا، جیسے کافروں نے اس کو پکڑ لیا اور باندھ لیا، یا اُس کے پاس کوئی اسباب مہیا نہیں ہیں، تو ایسے شخص کو معافی مل سکتی ہے۔ تو ایسے علاقے سے ہجرت فرض ہے جہاں انسان اپنے دِین کے مطابق عمل نہ کر سکے، اور کوئی دوسرا ایسا علاقہ موجود ہو جہاں جانے کے ساتھ دِین پر عمل کیا جا سکے گا، اور پھر انسان کو اسباب بھی مہیا ہوں، ایسی صورت میں ہجرت کرنا فرض ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: بے شک وہ لوگ جن کو فرشتے وفات دیتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، یہ ظلم ترکِ ہجرت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ ایمان لے آئے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی، فرشتے ان سے پوچھتے ہیں: فِيْمَ كُنْتُمْ: تم کس حال میں تھے؟ کس جگہ پڑے ہوئے تھے؟ یعنی یہ بطورِ تنبیہ کے کہتے ہیں کہ تمہارا کیا حال تھا؟ تم دِین پر کیوں نہیں چلے؟ دِین پر عمل کیوں نہیں کیا؟ تو وہ آگے سے کہتے ہیں کہ ہم تو دبے دبائے تھے، کمزور تھے، بے بس تھے اپنے علاقے میں، ہم دِین پر عمل کیسے کرتے؟ یہ وہ عُذر کریں گے۔ تو فرشتوں کی طرف سے یہ جواب دیا جائے گا کہ تمہارا یہ عُذر معقول نہیں، اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہیں تھی؟ تم اپنے علاقے کو چھوڑ کر اُس طرف چلے جاتے، کیوں نہیں گئے؟ یہ زجر ہے۔ تو جب اختیار ہونے کے باوجود، دوسرا علاقہ موجود ہونے کے باوجود، تمہیں ہجرت کرنے کی قوت اور طاقت ہونے کے باوجود تم نے ہجرت نہیں کی، تو تمہارا یہ کوئی عُذر نہیں ہے کہ ہم دِین پر اس لئے نہیں چل سکے کہ ہم اپنے علاقے میں بے بس تھے۔ "یہ لوگ، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے" تو ان کا یہ عذر قبول نہ ہوا کہ چونکہ ہم کافروں کے علاقے میں رہتے تھے اس لئے ہم اپنے دِین پر نہ چل سکے، "ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔" ہاں! جو واقعی بے بس ہیں، اَلْمُسْتَضْعَفِيْنَ کا معنی ہوگا کہ واقعی بے بس ہیں، جو لوگ خود کہتے تھے کہ ہم بے بس ہیں اور حقیقت میں بے بس نہیں تھے ان کا عُذر کوئی معقول نہیں، اور جو واقعی بے بس ہیں کمزور سمجھے ہوئے ہیں، چاہے وہ مرد ہیں چاہے عورتیں ہیں چاہے بچے ہیں، اور وہ کوئی تدبیر نہیں کر سکتے ہجرت کرنے کی، اور نہ کوئی راہ پاتے ہیں، یا تو ان کو راستہ آتا نہیں یا راستے پر چلنے کے اسباب مہیا نہیں، ان

(۱) مشکوۃ ص ۱۲ عن عبداللہ بن عمر / بخاری ج ۱ ص ۶ باب المسلم من سلم المسلمون.

کے لئے کوئی راہ کھلا نہیں ہے، یہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کردے گا (اللہ کی طرف سے جب اُمید دلائی جائے تو یا ایک قسم کا وعدہ ہوتا ہے، تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو کا وعدہ ہے کہ اللہ ان سے درگزر کر جائے گا)، اور اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے۔ اور یہاں بھی جو عفو کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس میں بھی تاثر دیا گیا ہے کہ گویا کہ ہے تو اِن کا بھی قصور، لیکن مجبوری کی بناء پر ان سے درگزر کرلیا جائے گا، اس سے ہجرت کی اہمیت نمایاں ہے کہ عین مجبوری کی حالت میں بھی اگر کوئی ہجرت نہیں کرسکا تو گویا کہ کیا تو اس نے جرم ہے لیکن اللہ تعالیٰ گرفت نہیں کریں گے، درگزر فرماجائیں گے، لہٰذا جب بھی یہ عُذر زائل ہوجائے اور کوئی حیلہ اور تدبیر ہاتھ آجائے اور دارالاسلام میں جانے کا کوئی راہ مل جائے، تو پھر کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

ہجرت کی ترغیب اور فضائل

''جو کوئی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے'' فی سبیل اللہ کے لفظ میں نیت کا بیان ہے، کہ اُس کی ہجرت اللہ کے راستے میں ہونی چاہیے، جس طرح جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے، قتال فی سبیل اللہ ہوتا ہے، اسی طرح ہجرت فی سبیل اللہ ہے، ''پائے گا وہ زمین میں بہت جگہ علیحدہ ہونے کی'' ایک علاقے سے ہٹ کر دوسرا علاقہ اُس کو مل جائے گا، رہنے کی جگہ اُس کو بہت مل جائے گی، اور اللہ کی طرف سے بڑی وسعت ہوگی، اللہ تعالیٰ روزی بھی دے گا اور دِین کے اظہار کا موقع بھی دے گا، سَعَةً کے لفظ میں یہ بتادیا گیا۔ تو اللہ کے راستے میں ہی ہجرت ہونا ضروری ہے، تب جا کر یہ وعدہ ہے جب نیت صحیح ہو۔ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا: جو کوئی اپنے گھر سے نکلا اس حال میں کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والا ہے، یعنی گھر سے نکلا اسی جذبے سے ہے کہ وہ ہجرت کر کے جارہا ہے اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے، تو پھر مہاجر بننے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہجرت کا ثواب لینے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان کسی ٹھکانے پہنچ جائے اور وہاں جا کر اپنے دِین پر پورا پورا عمل کرے تب اس کو ملے گا، نہیں! بلکہ جب اس نے گھر سے قدم اُٹھایا تو اُس کا پہلا قدم ہی کامیابی کا قدم ہے، اس راستے میں قدم اُٹھانے کے بعد پھرنا کام نہیں ہے، اگر راستے میں موت آگئی تو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا درجہ مہاجرین والا ہے، چاہے جہاں وہ پہنچنا چاہتا تھا وہاں نہیں پہنچا، پھر بھی اللہ کے ذِمّے اجر لگ گیا۔ ''جو کوئی نکلے اپنے گھر سے اس حال میں کہ ہجرت کرنے والا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف، پھر اُس کو موت پالے'' یعنی کسی ٹھکانے پر ابھی نہیں پہنچا، کسی جگہ جا کر اُس کو دِین کے اظہار کا موقع نہیں ملا، تو ایسی صورت میں بھی اُس کا اجر اللہ کے ذِمّے واجب ہوگیا۔ وَمَنْ يَّخْرُجْ: جو نکلے، نکلنا اختیار سے بھی ہوتا ہے کہ اَزخود اِنسان یہ سوچ کر کہ میں یہاں نہیں رہ سکتا اور دوسری جگہ جاؤں گا تو مجھے دِینی طور پر وسعت حاصل ہوگی، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان زبردستی نکال دیا جاتا ہے، جیسے دوسری جگہ صحابہ کرامؓ کا یہ حال ذکر کیا گیا کہ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ (سورۂ آل عمران: ۱۹۵) گھروں سے نکال دیے گئے اور میرے راستے میں تکلیف پہنچائے گئے، تو یہ بھی ہجرت کی صورت ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قصر رُخصت ہے یا عزیمت؟

اب ہجرت ہو یا جہاد دونوں میں سفر کی نوبت آتی ہے، اس مناسبت سے آگے سفر کی نماز کا ذکر آگیا، یوں مناسبت

ہوجائے گی مابعد والی آیت کی ماقبل کے ساتھ، کہ ہجرت اور جہاد جن کا یہاں ذکر چلا آرہا ہے ان دونوں کے اندر ہی سفر کی نوبت آتی ہے اس لیے سفر کے کچھ اَحکام ذکر کیے جارہے ہیں۔ یہ سفر کی نماز ہے جس میں قصر کی تلقین ہے کہ قصر کرسکتے ہو، اور قصر بعض ائمہ کے نزدیک تو رُخصت ہے، ''رُخصت'' کا مطلب یہ ہے کہ مرضی ہے قبول کرو، مرضی ہے قبول نہ کرو، اس لئے اگر تم قصر کرنا چاہتے ہو یعنی دو رکعت پڑھنا چاہتے ہو تو دو رکعت پڑھ لو، اور چار پڑھنا چاہتے ہو تو چار پڑھ لو، لیکن حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ''عزیمت'' ہے، مطلب یہ ہے کہ چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساقط ہی ہوگئیں، سفر کے اندر ظہر کی نماز دو رکعت ہے، بالکل اسی طرح جس طرح حضر میں فجر کی نماز دو رکعت ہے، کہ جیسے آپ اِس پر اضافہ نہیں کرسکتے اُس پر بھی اضافہ نہیں کرسکتے، دو پڑھنی لازم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بطور صدقے کے یہ معاف کردیں، جب اللہ تعالیٰ نے معاف کردیں اور اِن کا مطالبہ نہیں ہے تو یوں سمجھو کہ یہ اب فرض نہیں رہیں، اس لئے دو رکعت ہی پڑھنی چاہیے اس پر اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔

نمازِ قصر کے مزید کچھ اَحکام

یہاں لفظ استعمال کیا گیا ہے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ: زمین میں جس وقت تم چلو، اس میں عموم پیدا ہوگیا کہ صرف جہاد یا ہجرت کے اندر یہ رُخصت حاصل نہیں، بلکہ جس وقت بھی انسان سفر کرے اُس وقت اس کو رُخصت حاصل ہے، اس لیے یہ عمومی عنوان اختیار کرلیا گیا، کیونکہ یہ حکم ضرب فی سبیل اللہ یا قتال فی سبیل اللہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، جس ضرورت کے تحت بھی انسان سفر کرتا ہے اُس سفر میں اس کو یہ رخصت حاصل ہے۔ باقی حدیث شریف کے اندر اس کے اَحکام مفصل ہیں کہ کتنے سفر کا ارادہ ہو تو رُخصت حاصل ہے، اور کتنا سفر ہو تو رُخصت حاصل نہیں ہے، وہ تفصیل آپ فقہ کے اندر پڑھتے رہتے ہیں کہ اس کا مدار تین منزل پر رکھا گیا ہے اور تین منزل کی مسافت اڑتالیس میل ہے، یا چوّن میل ہے، یا اٹھاوَن میل ہے، اس میں اقوال مختلف ہیں، عام طور پر مشہور اور اِس وقت تک جو لوگوں میں معمول چلا آرہا ہے وہ اڑتالیس میل کا ہی ہے۔

وجوبِ قصر کے قول پر ایک اِشکال اور اس کا جواب

اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ: جب تم چلو زمین میں فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ: اب عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم قصر کرلو، بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مباح ہے، اس لئے قصر کرنے کی صورت میں گناہ کوئی نہیں، ویسے قصر ضروری بھی نہیں، اس عنوان سے بظاہر یوں ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن جن کے نزدیک قصر ضروری ہے اور قصر نہ کرنے کی صورت میں گناہ لازم آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ عنوان ظاہر کے مطابق اختیار کیا گیا ہے، کہ جب چار کی بجائے دو رکعت پڑھیں گے تو کسی کے دل میں خیال آسکتا ہے کہ شاید یہ دو رکعت پڑھنا کوئی کوتاہی شمار ہو، تو اس شبہ کو دُور کردیا گیا کہ یہ کوئی کوتاہی نہیں ہے، اگر دو پڑھو گے تو اس کو کوتاہی نہیں سمجھا جائے گا، باقی! دو پڑھنی ضروری ہیں یا نہیں اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں جن کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی تھا کہ آپ دو رکعتیں پڑھتے تھے، خلفاء کا عمل بھی یہی تھا کہ وہ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ جس طرح

بعینہ یہی عنوان سعی بین الصفا والمروۃ کے لئے بھی اختیار کیا گیا ہے، اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرہ:۱۵۸) کہ جوتم میں سے حج کرے یا عمرہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان طواف کرے، حالانکہ وہ طواف بالاتفاق ضروری ہے، ہمارے نزدیک واجب ہے اور باقی ائمہ کے نزدیک فرض ہے، لیکن عنوان وہاں بھی یہی اختیار کیا گیا ہے کہ جو طواف کرے اس پر کوئی گناہ نہیں، وہاں بھی یہی بات تھی کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید یہ صفا مروہ کے درمیان گھومنا بتوں کی تعظیم کے لئے تھا جو مشرکینِ مکہ نے صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے، اور وہ خیال کرتے تھے کہ اب اگر ہم وہاں گھومیں گے تو اس صورت میں گناہ ہوگا، تو اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اس خیال کا اِزالہ کر دیا گیا کہ اگر کوئی اس طرح گھومے تو گناہ نہیں ہے، باقی! احادیث کی دلیل سے معلوم ہوگا کہ یہ گھومنا ضروری ہے، تو صفا مروۃ کے درمیان میں گناہ کا شبہ تھا بایں معنی کہ وہاں مشرکین نے بُت رکھے ہوئے تھے، اور بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اب اگر ہم وہاں گھومیں گے تو یہ گناہ ہوگا، اللہ نے نفی کر دی کہ وہاں گھومنا گناہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ کے شعائر میں سے ہے۔ اور یہاں گناہ کا تصور بایں معنی آتا ہے کہ جب چار کی بجائے دو پڑھیں گے تو دل میں خیال آتا ہے کہ شاید یہ کوتاہی ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دو پڑھنا کوتاہی نہیں، باقی! پڑھنا ضروری ہے یا نہیں، اس کے لیے دوسرے دلائل ہیں، ''مشکوٰۃ شریف''،''باب صلوٰۃ السفر'' میں یہ بات آجائے گی اور حدیث شریف میں اس بحث کو ذِکر کیا جاتا ہے، اور فقہ کے اندر بھی یہ بات مذکور ہے کہ ہمارے ہاں یہ دو رکعتیں رُخصت لازم ہیں، جس کو ہم ''عزیمت'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، ''رُخصت'' کا لفظ اس کے لئے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے، یہ دو رکعت اللہ تعالیٰ نے ساقط ہی کر دیں۔ اور یہ قصر کا حکم ظہر عصر اور عشاء میں ہے، مغرب اور فجر میں قصر نہیں ہے۔

قصر کے لئے خوفِ فتنہ کی قید اِحترازی نہیں

آگے یہ قید آ گئی اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی قصر کرلو تو کوئی گناہ نہیں اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنے میں ڈال دیں گے، یعنی کافروں کی طرف سے شرارت کھڑی ہونے کا ڈر ہو اور ان کی طرف سے تمہیں کوئی پریشانی کا خطرہ ہو تو نماز میں قصر کرلیا کرو کوئی حرج نہیں۔ یہ قید باتفاقِ اُمت اتفاقی ہے، واقعہ کا بیان ہے، کہ جب یہ رُخصت نازل ہوئی تھی اُس وقت حالات ایسے ہی تھے کہ کافروں کی طرف سے اندیشہ ہوتا تھا، تو واقعے کے طور پر اس کو ذِکر کر دیا، ورنہ ساری اُمت کا اس بات پر اِتفاق ہے کہ یہ قصر صرف دشمنوں کی طرف سے خوف کے وقت نہیں، بلکہ امن کے وقت بھی ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ جب حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے، سارا علاقہ فتح ہو چکا تھا اور آپ ﷺ کو ہر طرح سے امن واطمینان نصیب ہو چکا تھا، اور اس وقت اتنی اکثریت تھی کہ کہیں بھی مسلمانوں کا اتنا اجتماع نہیں ہوا تھا، صحابہ ؓ کہتے ہیں کہ اُس وقت بھی رسول اللہ ﷺ نے قصر ہی فرمائی، تو جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ خوف کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ خوف کا ذکر یہاں واقع کا بیان ہے، کہ اُس وقت حالات ایسے ہی تھے۔ خلفاء بھی اسی طرح جب اپنی مملکت کے اندر سفر کرتے تھے، یا حج کے لئے آتے تھے منیٰ میں،

جہاں خصوصیت کے ساتھ اُمتِ محمدیہ کا اجتماع ہوتا ہے، اتنی کثرت ہوتی ہے کہ جتنی کثرت کسی دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتی، تو بھی وہاں قصر ہی کرتے تھے۔ اُن روایات کے بیان کرنے سے مقصد ہی یہی ہے کہ یہ بتادیا جائے کہ قصر خوفِ فتنہ کے ساتھ مشروط نہیں ہے، اس لیے خوفِ فتنہ والی شرط بالاتفاق واقعہ کا بیان ہے، کہ جس زمانے میں قصر کی اجازت آئی تھی اُس وقت حالات ایسے ہی تھے۔

مسافر کے لئے سنتوں کا حکم

اور سننِ مؤکدہ کی سفر میں قصر نہیں کی جاتی، ان کا مسئلہ یہی ہے کہ اگر کوئی چل چلاؤ کی حالت ہے تو چھوڑ دینی چاہئیں، چھوڑنا بہتر ہے، اور اگر کہیں جا کر آپ اطمینان کے ساتھ ٹھہر گئے ہیں تو ان کا پڑھنا بہتر ہے، بہرحال سفر میں وہ مؤکدہ نہیں رہتیں، بلکہ اُن کا درجہ عام نوافل کی طرح ہوجاتا ہے، امن کی حالت میں پڑھ لینی چاہئیں، البتہ فجر کی سنتوں کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ ان کی تاکید زیادہ ہے، ان کے علاوہ جتنی سننِ مؤکدہ ہیں وہ سب نوافل کے درجے میں آجاتی ہیں، پڑھیں گے تو پوری پڑھیں گے، نہ پڑھیں تو چھوڑنے کی اجازت ہے، امن کی حالت میں جب انسان کہیں جا کر ٹھہر جاتا ہے تو اُس وقت تو پڑھ لینی چاہئیں، اور جیسے چل چلاؤ ہوتا ہے کہ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہری اور آپ نماز پڑھنے کے لئے اُترے ہیں، یا سفر جاری ہے اور زیادہ دیر اگر نماز میں لگائی جائے تو سفر میں رُکاوٹ پیش آتی ہے، تو ایسے وقت میں پھر ان کا ترک اَولیٰ ہے، کہ ان کو چھوڑ دے، اور فرض جو دو پڑھنے ہیں وہ اطمینان کے ساتھ ادا کرلے۔ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا: بے شک کافر تمہارے لئے صریح دشمن ہیں، اس لئے ان کی طرف سے خوفِ فتنہ ہوتا ہی ہے، تو اس موقع پر اسی خوفِ فتنہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے اندر بھی قصر کرنے کی اجازت دے دی، تاکہ اس میں تمہارا زیادہ وقت نہ لگے، اور نماز جلدی جلدی پڑھ کے کافروں کی طرف سے اور اپنے دشمنوں کی طرف سے محتاط ہوجایا کرو، اور ان کے مقابلے کے لئے تیار ہوجایا کرو۔

''نمازِ خوف'' کا اصل مقصد

آگے ''صلوٰۃِ خوف'' کا ذکر کیا جارہا ہے، فقہ کی کتابوں میں آپ ''صلوٰۃِ خوف'' کے عنوان سے جس نماز کے مسائل پڑھا کرتے ہیں اِن آیات میں اُس کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کی اور ایمان والوں کی فوجیں بالمقابل ہیں، اُس وقت چونکہ لڑائی ڈنڈے سوٹے کے ساتھ اور تلواروں نیزوں کے ساتھ ہی ہوتی تھی، دونوں فوجیں بالکل آمنے سامنے ہوتی تھیں، درمیان میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا تھا، جب ایک میدان میں آپس میں لڑتا ہے تو چند گزوں کا فاصلہ درمیان میں ہوتا، اُدھر وہ فوج ٹھہری ہوئی ہے اور اِدھر یہ فوج ٹھہری ہوئی ہے، درمیان میں میدان ہے، تو ایسے موقع پر ہوسکتا ہے کہ اگر جماعت ساری کی ساری غافل ہوجائے جیسے جب سجدے میں جائیں گے تو سارے کے سارے ہی دشمن سے بے خبر ہوجائیں گے تو دشمن اگر چاہے تو ایک ہی لحظے میں یکبارگی حملہ کرسکتا ہے، زیادہ دیر نہیں لگے گی، آج والی کیفیت نہیں جس طرح آج جنگیں ہیں کہ فوجوں کے درمیان میں میلوں کا فاصلہ ہوتا ہے، اور ہوائی جہاز کے ذریعے سے گولے گرائے جارہے ہیں، توپ کے ذریعے سے میلوں دُور گولے پھینکے

جارہے ہیں، اُس وقت یہ بات نہیں تھی، بالکل آمنے سامنے ہوتے تھے، تو اگر سارے کے سارے اپنے سامان سے غافل ہوجائیں جیسے سجدے کی حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے تو چاہیں تو ایک ہی منٹ میں آ کر حملہ کر کے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور پھر نماز پڑھنی بھی جماعت کے ساتھ ہے، تو اس سے نماز باجماعت کی اہمیت بھی نمایاں ہے کہ حضور ﷺ موجود ہوں اور آپ امامت کریں تو ہر کسی کا تقاضا ہوگا کہ ہم آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھیں، اگر کسی کو کہہ دیا جائے کہ تُو دوسرے امام کے پیچھے پڑھ لے تو آپ ﷺ کی موجودگی میں یہ چیز ناگوار گزرتی، اس لیے اُصولاً تو اِجازت حضور ﷺ کی موجودگی میں ہی آئی ہے، لیکن ائمۂ فقہ نے روایات کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو عام قرار دیا ہے کہ دوسرے ائمہ کی موجودگی میں بھی اگر لوگ ایک ہی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا چاہیں تو یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے، اور اگر ائمہ اس قسم کے موجود ہیں کہ جن میں بِلا کسی قسم کی دِل کی گرانی کے متعدّد جماعتیں کرائی جاسکتی ہیں تو یہ صورت اختیار کرنی کوئی ضروری نہیں، بہر حال اگر ایک ہی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا قصد ہے تو پھر یہ صورت اختیار کرسکتے ہیں۔

''نمازِ خوف'' کا طریقہ

اس کی تفصیل آپ کے سامنے ہے، متعدّد صورتیں اس کی حدیث شریف میں آئی ہیں، حاصل سب کا یہی ہے کہ دشمن کی طرف سے متیقظ اور بیدار رہیں، ایسا نہ ہو کہ دشمن غافل پا کر یکبارگی حملہ کردے، یہاں جو صورت ذکر کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ ایک گروہ پہلے آپ کے پیچھے کھڑا ہوجائے، جتنے ہتھیار نماز میں ساتھ رکھے جاسکتے ہیں وہ ساتھ رہیں، جتنا بچاؤ اختیار کیا جاسکتا ہے اتنا بچاؤ اختیار کریں، رُکوع اور سجدہ آپ کے ساتھ کریں گے، دوسرا گروہ پیچھے دشمن کی طرف منہ کر کے کھڑا رہے گا، جب یہ سجدہ کر کے فارغ ہوں گے تو پھر یہ اُٹھ کر پیچھے چلے جائیں گے، دوسرا گروہ آجائے گا جو اِمام کے ساتھ دوسری رکعت ادا کرے گا، اور جس وقت یہ دوسری رکعت ادا کرلے گا تو اِمام کے ساتھ ایک رکعت پہلے گروہ کی ہوگئی اور ایک رکعت دوسرے گروہ کی ہوگئی، اور اِمام کی دو پوری ہوگئیں، اس لیے اِمام سلام پھیر دے گا، اور پہلا گروہ دوسری رکعت لاحق کے اُصول سے پوری کرے گا، اور دوسرا گروہ پہلی رکعت مسبوق کے اُصول سے پڑھے گا، یوں دونوں اپنی اپنی ایک ایک رکعت ادا کرلیں گے، اور دو دو رکعتیں سب کی ہوجائیں گی۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ: جس وقت آپ ان میں موجود ہوں، فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ: پھر آپ ان کے لئے نماز قائم کریں، ان میں سے ایک طائفہ کو آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے، اور وہ اپنے ہتھیاروں کو سنبھال کر رکھیں، وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ: اپنے ہتھیاروں کو لے لیں، جس وقت وہ سجدہ کرلیں (سجدہ کرنے سے ایک رکعت پڑھنا مراد ہے) پھر وہ تمہارے پیچھے چلے جائیں، اور دوسرا طائفہ آجائے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی، وہ آپ کے ساتھ مل کر نماز پڑھیں، اور یہ سارے کے سارے اپنا بچاؤ بھی اختیار کریں، اور اپنے ہتھیار بھی اختیار کریں۔ ''چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا کہ غافل ہوجاؤ تم اپنے ہتھیاروں سے اور اپنے سامانوں سے، پھر وہ مائل ہوجائیں تم پر یکبارگی مائل ہونا'' یعنی اس بات کو ہمیشہ مستحضر رکھنا ہے کہ کافروں کو یہ موقع نہیں دینا کہ وہ تمہاری غفلت سے فائدہ اُٹھالیں، غفلت سے یہاں جنگ کی طرف سے غفلت مراد ہے۔ اور کوئی حرج نہیں تم پر کہ اگر کوئی تکلیف ہے بارش کی وجہ سے، یا تم

بیمار ہو اور ہتھیار اُٹھا کر نماز نہیں پڑھی جاسکتی، تو ہتھیار اُتار کر رکھ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اپنا بچاؤ ضرور اختیار کرو کہ جو دفاعی قسم کا سامان ہے اُس کو بہر حال اپنے ساتھ رکھنا ہے، تا کہ ان کے حملے کی صورت میں کوئی نقصان نہ ہو۔

ذِکر اور اِقامتِ صلوٰۃ کی تاکید

''پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو اللہ کو یاد کرو'' کیونکہ ذکر اللہ کے لئے کوئی وقت متعین نہیں، یہ ہر وقت ہونا چاہیے، اور اللہ کا ذکر ہی ہے جو دِلوں کے اندر قوت کا باعث بنتا ہے، جس سے اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے، نماز تو اَدا کر لی اس کیفیت سے، باقی! اللہ کا ذکر ہر حالت میں ہو، ''کھڑے ہوئے اللہ کو یاد کرو، بیٹھے ہوئے یاد کرو، لیٹے ہوئے یاد کرو'' تمہارا کوئی وقت غفلت سے نہیں گزرنا چاہیے، ''اور جب اطمینان نصیب ہو جائے'' خوف وغیرہ زائل ہو جائے تو پھر عام طریقے کے مطابق نماز قائم کرو'' یعنی اُس کے آداب کی رعایت رکھتے ہوئے، کہ نقل وحرکت اور اس طرح سے دوسری چیزیں اس میں نہیں ہونی چاہئیں، ''بیشک نماز مؤمنوں پر فرض کی گئی ہے وقت متعین کر کے'' وقت کا لحاظ بھی رکھا کرو اور اطمینان کے ساتھ اُس کو ادا کیا کرو۔

دوبارہ جہاد کی ترغیب

آگے پھر وہی جہاد کی بات آگئی، کہ قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کیا کرو، اِبتغاء تلاش کرنے کو کہتے ہیں یہاں پیچھا کرنا مُراد ہے، ہمت نہ ہارا کرو، ہمت نہ چھوڑا کرو، اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے اور تم بے آرام ہو رہے ہو تو وہ بھی تو آخر بے آرام ہیں، یہ تو نہیں کہ اس جنگ کے اندر پریشان تم ہی ہو اور تکلیف صرف تمہیں پہنچ رہی ہے، بلکہ جیسے اَلم تمہیں ہے ان کو بھی ہے، جیسے بے آرامی تمہیں ہے ان کو بھی ہے، اور تمہارے اندر یہ ایک زائد بات ہے کہ تمہیں اللہ کی رحمت کی اُمید ہے جس کی اُنہیں اُمید نہیں ہے، اس لئے تمہاری ہمت ان کے مقابلے میں زیادہ بُلند ہونی چاہیے کہ دُنیوی تکلیف کے طور پر تو دونوں برابر ہو، اس لڑائی کی وجہ سے وہ بھی دُکھ اور درد محسوس کرتے ہیں اور تم بھی محسوس کرتے ہو، لیکن تمہیں اللہ کی رحمت سے اُمید ہے اور ان کو نہیں ہے، اس لئے تمہارا درجہ ان سے زائد ہے، تو تمہاری ہمت ان سے زائد ہونی چاہیے وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

إِنَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ
بے شک ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری ٹھیک تا کہ آپ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان اُس چیز کے ساتھ جو
أَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝۱۰۵ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ إِنَّ اللّٰهَ
اللہ نے آپ کو سمجھائی، اور نہ ہوں آپ خیانت کرنے والوں کے لئے جھگڑنے والے (۱۰۵) اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں، بیشک اللہ تعالیٰ

كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ

بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۶﴾ اور آپ جھگڑا نہ کریں ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ

بے شک اللہ نہیں پسند کرتا اُس شخص کو جو خیانت کرنے والا ہو گناہ گار ہو ﴿۱۰۷﴾ وہ لوگوں سے شرماتے ہیں

وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى

اور اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ اللہ ان کے ساتھ ہے جبکہ وہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ایسی بات کا جس کو اللہ پسند

مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ

نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ ان کے عمل کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۰۸﴾ خبردار

هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ

تم ہی یہ لوگ ہو جنہوں نے جھگڑا کیا ان کی طرف سے دنیوی زندگی میں، پھر کون اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرے گا

عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ

ان کی طرف سے قیامت کے دن، یا کون شخص ان پر ذمّے دار ہوگا؟ ﴿۱۰۹﴾ اور جو کوئی شخص کوئی

سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

بُرا کام کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ تعالیٰ سے گناہ کی معافی چاہے تو پائے گا وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا رحم کرنے والا ﴿۱۱۰﴾

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

اور جو کوئی گناہ کا ارتکاب کرے تو سوائے اس کے نہیں کہ وہ ارتکاب کرتا ہے اُس گناہ کا اپنے خلاف، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے

حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ

حکمت والا ہے ﴿۱۱۱﴾ اور جو کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ کرے پھر اس کی تہمت لگادے کسی بے گناہ پر پس تحقیق

احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ

اُس نے اُٹھایا بہتان اور صریح گناہ ﴿۱۱۲﴾ اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل آپ پر اور اُس کی رحمت

لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ

تو البتہ قصد کرلیا تھا ان میں سے ایک گروہ نے کہ آپ کو غلطی میں ڈال دیں، اور وہ نہیں غلطی میں ڈالتے مگر اپنے آپ کو

وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اُتاری

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور تعلیم دی آپ کو ایسی چیز کی جو آپ پہلے نہیں جانتے تھے، اللہ تعالیٰ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے ﴿۱۱۳﴾

لَا خَيْرَ فِیْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ

ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں مگر ان لوگوں کی سرگوشی جو حکم دیتے ہیں صدقے کا یا معروف کا

اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ

یا لوگوں کے درمیان حالات کو دُرست کرنے کا، اور جو کوئی شخص یہ کام کرے گا اللہ کی رضا چاہنے کے لئے

اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ

ہم عنقریب اس کو اجرِ عظیم دیں گے ﴿۱۱۴﴾ اور جو کوئی شخص مخالفت کرے رسول کی

بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ

بعد اس کے کہ اُس کے لئے ہدایت واضح ہوگئی اور اتباع کرے مؤمنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے کی تو ہم پھیر دیں گے اُس کو

مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

جدھر وہ پھرتا ہے، اور اُسے جہنم میں داخل کردیں گے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے ﴿۱۱۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ: بیشک ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری بِالْحَقِّ: ٹھیک ٹھیک، واقع کے مطابق لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ: تاکہ آپ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ: اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے آپ کو دکھائی، جو اللہ نے آپ کو سمجھائی، وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا: اور نہ ہوں آپ خیانت کرنے والوں کے لئے جھگڑنے والے،

وَاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ: اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَلَا تُجَادِلْ: اور آپ جھگڑا نہ کریں عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ: ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا اس شخص کو جو خیانت کرنے والا ہو گنہگار ہو۔ خَوَّانًا یہ مبالغے کا صیغہ ہے خائن سے۔ یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ: استخفاء: خَفِیَ یَخْفٰی: چھپنا۔ اَخْفٰی: چھپانا، باب افعال سے اگر ہو۔ اور استخفاء بھی چھپنے کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ ''وہ چھپتے ہیں لوگوں سے، یا، چھپاتے ہیں اپنے عیب کو لوگوں سے''، اور یہ چھپنا چھپانا چونکہ شرم کی وجہ سے ہوتا ہے اس لیے حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا حاصل ترجمہ کیا ہے کہ ''لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے''، لوگوں سے اپنی باتیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتے۔ اور ''چھپتے ہیں لوگوں سے اور نہیں چھپتے اللہ سے'' اس طرح سے بھی کہہ سکتے ہیں، وَھُوَ مَعَھُمْ: حالانکہ اللہ ان کے ساتھ ہے اِذْ یُبَیِّتُوْنَ: جبکہ وہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں مَالَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ: مِنَ الْقَوْلِ یہ مَا کا بیان ہے، راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ایسی بات کا جس کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ لَا یَرْضٰی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بَیَّتَ تَبْیِیْت کا معنیٰ آپ کے سامنے پہلے بھی ذکر کیا تھا رات کو کوئی کام کرنا، رات کو لڑائی لڑی جائے اس کو بھی تبییت کہتے ہیں جس کو چھاپہ مارنا اور شب خون مارنا کہتے ہیں، اور چھپ چھپا کر رات کو جو مشورہ کیا جاتا ہے اس کو بھی تبییت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ ''اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ایسی بات کا جو اللہ کو پسند نہیں'' وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا: اور اللہ تعالیٰ ان کے عمل کا احاطہ کرنے والا ہے۔ ھٰاَنْتُمْ: یہ ''ھا'' تنبیہ کے لئے ہے۔ خبردار! تم ہی یہ لوگ ہو جنہوں نے جھگڑا کیا اُن کی طرف سے دُنیوی زندگی میں فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنْھُمْ: پھر کون اللہ تعالیٰ سے بحث کرے گا، جھگڑا کرے گا ان کی طرف سے یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ: قیامت کے دن، اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ: یا کون شخص ان پر، وَکِیْلًا: ذمے دار ہوگا، ضامن ہوگا، نگہبان ہوگا، یہ سارے مفہوم اس کے ہوتے ہیں، ''کون شخص ان پر نگہبان ہوگا، ان کا ذمہ دار ہوگا، ان کا کام بنانے والا ہوگا''۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا: اور جو کوئی شخص کوئی برا کام کرے اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ: یا اپنے نفس پر زیادتی کرے، اپنے نفس پر ظلم کرے، ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ: پھر اللہ تعالیٰ سے گناہ کی معافی چاہے، یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: تو پائے گا وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا رحم کرنے والا۔ وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا: اور جو کوئی گناہ کا ارتکاب کرے، فَاِنَّمَا یَکْسِبُہٗ عَلٰی نَفْسِہٖ: سوائے اس کے نہیں کہ ارتکاب کرتا ہے اس گناہ کا اپنے خلاف، علیٰ ضرر کے لئے ہوتا ہے، یعنی اس کا یہ کسب اِثم اسی کے خلاف پڑے گا، اس کا وبال اسی پر آئے گا، ضرر اسی پر آئے گا، وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا: اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔ وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا: جو کوئی خطیئہ کرے یا گناہ کرے، چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ کرے۔ خَطِیْٓئَۃً سے چھوٹا گناہ مراد لے لیجئے، اِثْمًا سے بڑا گناہ مراد لے لیجئے، ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓئًا: رَمٰی یرمی پھینکنے کو کہتے ہیں، تیر پھینکنا، اسی طرح کسی پر جو تہمت لگائی جاتی ہے تو اس کو بھی رَمٰی یرمی کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، سورۂ نور کے پہلے رکوع میں یہ لفظ آئے گا اَلَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ: جو پاکدامن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں، تو یہاں یہی تہمت لگانے کے معنیٰ میں ہے، یعنی اپنا کیا ہوا گناہ کسی بے گناہ پر پھینک دے (رَمٰی یرمی: پھینکنا)، جو شخص چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ کرے پھر پھینک دے اس گناہ کو کسی بَری

پر، کسی بے گناہ پر، یعنی کسی بری اور بے گناہ پر اس کی تہمت لگادے، فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا: پس تحقیق اس نے اُٹھایا بہتان اور صریح گناہ، بہتان خلاف واقع کسی پر بات چسپاں کرنے کو کہتے ہیں۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ: اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل آپ پر اور اس کی رحمت، لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ: البتہ قصد کرلیا تھا ان میں سے ایک گروہ نے کہ آپ کو غلطی میں ڈال دیں، آپ کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیں، یعنی آپ کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کا قصد کرلیا تھا اِن میں سے ایک طائفہ نے، اگر اللہ کا فضل آپ پر نہ ہوتا اور اللہ کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو آپ اِن کے بہکانے سے غلطی میں پڑ جاتے، لیکن اللہ کے فضل ورحمت کی وجہ سے آپ اس غلطی میں واقع نہیں ہوئے، وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ: اور نہیں غلطی میں ڈالتے وہ، نہیں گمراہی میں ڈالتے وہ مگر اپنے آپ کو وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ: اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اُتاری اور حکمت اُتاری وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ: اور آپ کو ایسی بات سکھائی جو آپ نہیں جانتے تھے، تعلیم دی آپ کو ایسی چیز کی جو آپ پہلے نہیں جانتے تھے وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا: اللہ تعالیٰ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے۔ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ: نجویٰ: سرگوشی کرنا، چپکے چپکے جو آپس میں باتیں کی جاتی ہیں، اور یہ اصل میں مصدر ہے، ان کے نجویٰ میں سے بہت سے نجویٰ میں کوئی خیر نہیں، یعنی یہ جو مل جُل کر سرگوشیاں کرتے ہیں اور خفیہ مشورے کرتے ہیں ان میں سے اکثر مشورے ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی خیر نہیں، اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ: مگر جو شخص صدقے کا حکم کرے یا معروف کا حکم کرے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم کرے، اس کے نجویٰ میں خیر ہے، تو مَنْ اَمَرَ کے اُوپر نجویٰ کا لفظ محذوف ہوگا اِلَّا نَجْوٰی مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ: مگر نجویٰ ان لوگوں کا، سرگوشی ان لوگوں کی، خفیہ مشورے ان لوگوں کے جو صدقے کا حکم دیتے ہیں'' صدقہ فرضی ہو یا نفلی ہو، اصل کے اعتبار سے اس میں مخلوق کو فائدہ پہنچانے والا مفہوم ہے، ''یا کسی نیکی کا مشورہ دیتے ہیں'' یہ معروف عام ہے جو بھی ہو'' یا لوگوں کے درمیان حالات کو درست کرنے کا حکم دیتے ہیں'' یہ اُسی معروف کی ایک اعلیٰ قسم ہے کہ لوگوں کے درمیان صلح کروانے کی کوشش کرتے ہیں، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: اور جو کوئی شخص یہ کام کرے گا جس کا ذکر پیچھے ہوا اللہ کی رضا چاہنے کے لئے فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا: ہم عنقریب اس کو اجر عظیم دیں گے۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ: اور جو کوئی رسول کے ساتھ ضد کرے، مُشَاقَّۃ: ضد کرنا، مخالفت میں اَڑ جانا، جو کوئی شخص مخالفت کرے رسول کی مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى: بعد اس کے کہ اس کے لیے ہدایت واضح ہوگئی۔ هُدٰی سے هُدَی اللہ مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اللہ کا بتایا ہوا سیدھا راستہ اس کے لئے واضح ہوگیا، وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ: يَتَّبِعْ کا عطف يُّشَاقِقِ پر ہے، اور اتباع کرے مؤمنین کے راستے کو چھوڑ کر غیر راستے کی، مؤمنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے کی اتباع کرے، نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى: تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر وہ پھرتا ہے، ہم والی بنا دیں گے اس کو اس چیز کا جس کا وہ متولی بنا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے ہم اسے کرنے دیں گے وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ: اور اسے جہنم میں داخل کردیں گے، وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

جہاد وغیرہ کی آیات کے ضمن میں آپ کے سامنے گاہے گاہے منافقین کا ذِکر بھی آیا تھا، اور یہ مدینہ منورہ میں ایک ایسا گروہ تھا جو اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کئے ہوئے تھا، لیکن اپنی غرض پرستی اور مفاد پرستی کی وجہ سے یا بزدلی اور حرص کی وجہ سے ایک موقف پر پکے نہیں تھے، اندر اندر سے ان کی ہمدردیاں کافروں کے ساتھ بھی تھیں، جس وقت وہ اپنا مفاد اُدھر جانے میں سمجھتے تو اُدھر کو لٹک جاتے، اور جب مسلمانوں کے اندر اپنا مفاد سمجھتے تو ان کے ساتھ متعلق ہونے کی کوشش کرتے، یہ گروہ مختلف قسم کی شرارتیں کرتا رہتا تھا، اور یہ جو دو رکوع آپ کے سامنے پڑھے گئے ہیں یہ ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، جس میں کچھ اسی قسم کے لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔

شانِ نزول

تفاسیر میں ان آیات کا شانِ نزول ذکر کیا گیا ہے، جس کو سننے کے بعد آیات جلدی سے اپنے مفہوم پر منطبق ہو جاتی ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک خاندان تھا جو بنواُبیرق کے نام سے مشہور تھا، اور اُس خاندان میں ایک شخص تھا جس کا نام بُشیر لکھا ہے، اور بعض روایات میں اس کا نام طُعمہ آیا ہے، اور ہوسکتا ہے کہ ایک اصل نام ہو اور ایک اس کا لقب ہو، جب ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے دو قسم کے نام آجائیں تو اس میں یہ توجیہ آسان ہوا کرتی ہے کہ ایک اصل نام ہوگا اور ایک اس کا لقب ہوگا، بعض روایات میں طُعمہ ہے طاء کے ساتھ، اور بعض روایات میں بُشیر ہے۔ بہرحال اِس نے قتادہ بن نعمان کے چچا رِفاعہ کے گھر میں رات کو نقب لگا کر چوری کرلی، وہاں سے ایک آٹے کا تھیلا اور کچھ ہتھیار اٹھالئے، پھر اس خیال سے کہ جب تلاشی وغیرہ ہوگی تو ہوسکتا ہے میرے گھر سے نکل آئے اس لیے سیدھا وہ یہودی کے گھر لے گیا اور وہاں امانت رکھ آیا، اور اِتفاق کی بات ایسی تھی کہ اُس آٹے کے تھیلے میں کچھ تھوڑا سا سوراخ تھا، اور وہاں سے کچھ نہ کچھ آٹا ٹپکتا گیا، جب صبح اُٹھے اور پتا چلا کہ چوری ہوگئی، تفتیش شروع ہوئی تو اس نشان کی اتباع کرتے ہوئے لوگ یہودی کے گھر تک پہنچ گئے کہ یہ سامان تیرے ہاں ہے، جب اُس یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اقرار کیا کہ ہاں ہے، لیکن فلاں شخص بنواُبیرق میں سے وہ میرے پاس رات امانت رکھ کر گیا ہے، یہ چیزیں اُس کی ہیں، جب یہ بات سامنے آگئی تو معلوم ہوگیا کہ چوری کرنے والا یہی بشیر بنواُبیرق کا فرد ہے، تو اُس کو پکڑا گیا، اُس کے ساتھ گفتگو کی گئی، اُس نے صاف انکار کردیا، وہ کہنے لگا کہ چور وہ ہے جس کے گھر سے سامان نکلا ہے، میں چور کیسے ہوں؟ اور بنواُبیرق خاندان سارے کا سارا اُس کی حمایت میں جمع ہوگیا، اور یہ لوگ پہلے ہی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے، جن لوگوں کی طبیعت میں اس قسم کی شرارت ہوتی ہے وہ ہوشیار تو ہوتے ہی ہیں، تو پہلے ہی پہنچ گئے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جا کے مقدمہ پہلے ہی دائر کردیں، جا کر کہنے لگے: یارسول اللہ! فلاں کے گھر میں چوری ہوگئی، اور سامان یہودی کے گھر سے نکلا، اور وہ تہمتیں ہم پر لگاتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم چور ہو، بھلا ہم چوری کیسے کرسکتے ہیں؟ جس کے گھر سے سامان نکلا ہے چور ہوگا تو وہی ہوگا، ہمیں خواہ مخواہ یہ لوگ بدنام کرنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ جب سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے یہ بات گئی تو حالات سُن کر ظاہر کے اعتبار سے آپ کی طبیعت بھی کچھ اِدھر مائل ہوئی کہ واقعی اُن لوگوں نے اِن پر زیادتی کی جو اِن کو چور کہا، جب سامان یہودی کے گھر سے نکلا ہے تو چور وہی ہوگا، تو اِن پر اس قسم کی بات کیوں کی گئی؟ پھر قتادہ بن نعمان پہنچے اور انہوں نے جا کر حضور ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیوں بے گناہ لوگوں کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہو؟ ان کے اُوپر چوری کی بات کیوں کرتے ہو؟ جب سامان ان کے گھر سے نہیں نکلا تو یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم انہیں چور کہو، بس اس بات کا سننا تھا کہ قتادہ بن نعمان شرمسار ہوئے، اور اُس کے چچا بھی اپنا حق چھوڑ کر خاموش ہو کے گھر میں بیٹھ گئے، کہ اب کیا کریں؟ اُن کے خیال کے مطابق بات تحقیق کے درجے تک پہنچ گئی تھی کہ چور بشیر ہے بنواُبیرق کا فرد، اور یہودی پر یہ تہمت لگاتا ہے، ساری چال سمجھ میں آ گئی تھی، لیکن معاملہ اس طرح کچھ اُلجھ سا گیا۔ اور سرورِ کائنات ﷺ نے جو قتادہ بن نعمانؓ کے سامنے بات کردی وہ ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے تھی، جس کے سامنے بھی یہ ظاہری حالات جائیں گے وہ اسی طرح ہی کہے گا، کہ بھائی! تم ان کو بلا وجہ کیوں اس طرح سے کہتے ہو؟ یہ چور نہیں ہیں، یا اِن کے اُوپر اس قسم کی بات کرنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ بہرحال انہوں نے آ کر اس طرح صفائیاں دیں اور اس طرح سے آ کر بات بنائی کہ سرورِ کائنات ﷺ کا ظاہری طور پر رُجحان ایسے معلوم ہوا جیسے کہ اس بشیر کی حمایت میں ہے، اور ذہن یہودی کی طرف جا رہا تھا کہ چور اصل میں یہ ہے، اور حقیقت کے لحاظ سے یہ بات خلافِ واقع تھی، اور ان لوگوں نے یہ بات بنائی تھی کہ اپنے جرم کو چھپانے کے لئے دوسرے پر جرم ڈال دیا تھا، اور اپنے مجرم کی حمایت میں وہ سارا خاندان اکٹھا ہو گیا تھا، ان حالات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دو رُکوع نازل فرمائے جس میں اصل واقعے کو واضح فرمایا،[1] اور اس قسم کے لوگوں سے آئندہ کے لئے ہوشیار رہنے کی تاکید کردی، اور جنہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے اس خاندان کے فرد کی حمایت کی تھی، یعنی بشیر کی بنواُبیرق کے لوگوں نے جو حمایت کی تھی ان کو بھی تنبیہ کردی۔ جس وقت معاملہ صاف ہو گیا اور قرآنِ کریم کی آیات کے تحت یہ بات واضح ہو گئی کہ قصور بشیر کا ہے، اور یہودی پر یہ خواہ مخواہ تہمت لگا رہے ہیں، تو بشیر پھر مدینہ منورہ سے بھاگا اور مشرکینِ مکہ کے ساتھ جا کر لاحق ہو گیا، پہلے منافق تھا لیکن نفاق چھپا ہوا تھا، اور اَب علی الاعلان جس وقت وہ مشرکین کے پاس چلا گیا تو وہ مُرتد ہو گیا، اور پھر یہ مکہ معظمہ میں ہی رہا ہے، اور وہاں بھی جیسے کہ بعض تفاسیر میں ہے کہ چوری کرتا ہوا ہی ہلاک ہوا، نقب لگا رہا تھا اور اس پر دیوار گر گئی جس کی وجہ سے وہ مر گیا (تفسیر رازی وغیرہ)، اس طرح وہ جہنم میں پہنچ گیا، اور مُرتد ہونے کی وجہ سے ویسے بھی واجب القتل ہو گیا، لیکن بعد میں وہ مدینہ منورہ آیا نہیں ہے۔

چونکہ اس نے شرک اختیار کیا تھا تو اسی مناسبت سے پھر اگلے رکوع میں شرک کا رَدّ بھی آ رہا ہے، اور مسلمانوں کا طریقہ چھوڑ کر وہ جو غیر مسلموں کے طریقے کی طرف چلا گیا تھا، کہ ظاہری طور پر پہلے مسلمان تھا پھر مشرکوں کا طریقہ اُس نے اختیار کر لیا، تو دوسرے رُکوع کی آخری آیت میں مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اپنانے کی مذمت بھی ساتھ آ رہی ہے، اور یہ آیات ساری اسی واقعے سے متعلق ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: سنن الترمذی ج ۲ ص ۱۳۳، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ النساء

صحیح فیصلہ کرنے کی تاکید

''بیشک ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری ٹھیک'' کتاب سے کتاب کا خاص یہی حصہ مراد ہے جو آیات اتر رہی ہیں اس واقعے کے متعلق، اور حق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بات جو ہم کہہ رہے ہیں یہ بالکل واقع کے مطابق ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ واقع نہیں ہے، حق بات وہی ہوا کرتی ہے جو واقع کے مطابق ہو، تو کتاب سے یہاں یہی آیات مراد ہوں گی جو اس واقعے کے متعلق اُتر رہی ہیں۔ ''تا کہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اللہ کی سمجھائی ہوئی بات کے مطابق'' جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھادے، یعنی ان آیات کے ضمن میں جو بات آپ کی سمجھ میں آئے گی اسی کے مطابق آپ فیصلہ کریں، اللہ تعالیٰ نے یہ تحریر آپ پر اس لیے اُتاری ہے، یہ کتاب آپ پر اس لئے اُتاری ہے، جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھادے جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھادے، جو دِکھا دے، رُویت جس طرح آنکھوں کے ساتھ ہوتی ہے، دِل کے ساتھ بھی ہوتی ہے، جس کو سمجھانے کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا: آپ خائنین کے لئے جھگڑنے والے نہ بنیں، تو گویا کہ بنواُبیرق کو خائنین کہہ دیا جن کی طرف سے حضور ﷺ نے قتادہ بن نعمان ؓ یا رفاعہ سے بات کی تھی، اور کچھ گفتگو کا رُجحان ایسا تھا کہ ان کو کچھ نہ کہو، ان کا اس معاملے میں قصور نہیں ہے، تو گویا کہ صورۃً خائنین کی حمایت ہوگئی۔ ''خائنین کے لئے آپ جھگڑنے والے نہ بنیں'' اس میں صاف اشارہ ہوگیا کہ جن کی طرف آپ کا رُجحان ہوا ہے کہ یہ بے گناہ ہیں، اور ان کی طرف سے آپ نے دوسروں کے ساتھ گفتگو کی ہے، یہی لوگ خیانت کرنے والے ہیں، خیانت انہی میں ہے۔ وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ: اگرچہ اس میں گناہ کوئی نہیں تھا، کیونکہ ظاہری حالات کو سُن کر جدھر قلب کا رُجحان ہوجائے انسان اسی کا مکلف ہے، جب تک حقیقتِ حال معلوم نہ ہو تو جو گفتگو آپ کے سامنے آئے گی، جو بات آپ کے سامنے آئے گی اس میں ظاہر جدھر کو ہوگا تو آخر انسان کا قلبی رُجحان ادھر کو ہی ہوتا ہے، لیکن پھر بھی آپ کی شانِ رفیع کے خلاف ہونے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آپ سے اتنی سی بات بھی ہوگئی اس سے بھی اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کیجئے!

مجرم کی وکالت بھی جرم ہے

اور وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا میں کھلے الفاظ کے اندر اعلان ہوگیا کہ خیانت کرنے والوں کی حمایت میں کسی دوسرے کے ساتھ جھگڑا کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ اسی کے ضمن میں ہی یہ مسئلہ آتا ہے کہ قصوروار کی وکالت جائز نہیں، اگر پتا چل جائے کہ یہ شخص واقعی قصوروار ہے، یہ چور ہے یا یہ قاتل ہے یا غلطی اس کی ہے تو پھر جو شخص اُس کی وکالت کرے گا اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بھی مجرم ہوگا، اور جس طرح وہ خائن گناہ گار ہے اُس کی وکالت کرنے والا اور اُس کی حمایت کرنے والا بھی ویسے ہی گناہ گار ہے، تو وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا کو بنیاد بنا کر یہ مسئلہ ذکر کیا جاسکتا ہے کہ اگر انسان کو پتا چل جائے کہ خیانت اور قصور اُس کی طرف سے ہے تو اُس کی وکالت اور اُس کی حمایت جائز نہیں ہے۔ اس لئے آج کل عدالتوں اور کچہریوں میں جو قصے جاتے ہیں، اگر وکیل کو معلوم ہوجائے کہ میرا موکل غلطی پر ہے پھر بھی وہ اُس کی حمایت کرتا ہے جیسا کہ عام طور پر یونہی چلتے ہیں، پھر اُس کو جھوٹ پڑھاتے ہیں کہ یوں کہنا، یوں نہ کہنا، یہ کرنا، وہ نہ کرنا، اس قسم کی وکالت میں جو فیس لی جاتی ہے بالاتفاق حرام ہے، اور اگر کوئی

وکیل اس بات کا التزام کر لے کہ میں ہمیشہ حق کی حمایت کروں گا، مقدمہ وہی لوں گا جس میں مدعی حق پر ہو، یا مدعی علیہ مظلوم ہو، اور پھر قانون کے دائرے میں رہتا ہوا میں اُس کی حمایت کروں گا تو اس میں جواز ہے، لیکن جہاں غلط مقدمات کی پیروی کی جاتی ہے اور جھوٹ بولنا سکھایا جاتا ہے، جھوٹی باتیں بول بول کر ان کو قانونی زد سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور سزا سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بدترین قسم کا جرم ہے۔

''مجادلہ'' کا مفہوم

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ: تُجَادِلْ یہ مجادلہ سے ہے، مجادلہ جس طرح آپس میں جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں جو فساد کے لئے ہوتا ہے، جس کی بنیاد غلط ہوتی ہے، یعنی کٹ حجتی، آپس میں بحث مباحثہ، تو اسی طرح جھگڑا بسا اوقات کسی بات کی حمایت کرنے کو اور کسی مطالبے کو اصرار کے ساتھ منوانا، یا ناز اور محبّت کے ساتھ ہی کسی کے ساتھ اصرار کرنا اپنا مطالبہ منوانے کے لئے، مجادلہ کا لفظ اس کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں یہ لفظ دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں آیا ہے يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ (سورۂ ہود: ۷۴) جب ابراہیم سے گھبراہٹ دُور ہوگئی اور ان کے پاس بشارت آگئی تو ہم سے جھگڑا کرنے لگ گئے قومِ لوط کے بارے میں۔ وہاں جھگڑا وہ نہیں ہے جس طرح ہمارا جھگڑا ہوتا ہے، یعنی کٹ حجتی، بلاوجہ ضد بازی کے طور پر بحثا بحثی، بلکہ تکرار کے ساتھ سفارش کرنا، اصرار کے ساتھ اپنی بات کو منوانے کے لئے الحاح اور زاری کرنا یہ بھی صورۃً مجادلہ ہے، تو حضور ﷺ نے قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو بات کی تھی اُسی کو یہاں مجادلہ سے تعبیر کیا گیا ہے، ''آپ ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں جھگڑا نہ کیجئے'' ان کی طرف سے ہو کر آپ کو کیا ضرورت ہے دوسروں سے گفتگو کرنے کی۔

خیانت کی مذمّت

يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ یہ اسی اسلامی تصوّر کے طور پر ہے کہ گناہ جو بھی ہوتا ہے اس میں حقیقت میں انسان کا اپنا نقصان ہے، اس لئے کسی پر ظلم کرو تو یہ حقیقت کے اعتبار سے اپنے اوپر ظلم ہے، کسی کو نقصان پہنچاؤ تو یہ حقیقت کے اعتبار سے نقصان اپنے آپ کو پہنچتا ہے، کیونکہ جو شخص مظلوم ہو اوّل تو دُنیا میں اس کی دادرسی ہو جائے گی، اور اگر دُنیا میں نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اُس کو ثواب دیں گے، ظالم بہرحال گرفت میں آئے گا چاہے دنیا میں آئے چاہے آخرت میں، اس لئے دوسرے پر زیادتی کرنا حقیقت کے اعتبار سے اپنے آپ پر زیادتی کرنا ہے، دوسرے سے خیانت کرنا حقیقت کے اعتبار سے اپنے نفس سے خیانت کرنا ہے، تو جو لوگ اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں ان کی طرف سے ہو کر آپ جھگڑا نہ کیجئے، کسی سے بحث نہ کیجئے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا: اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کرنے والا ہو گنہگار ہو، تو جب وہ اللہ کا محبوب نہیں، بلکہ مبغوض ہے، اور ایسے شخص سے اللہ کو نفرت ہے، لَا يُحِبُّ کا معنی ہوتا ہے يُبْغِضُ کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے بغض رکھتا ہے، نفرت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کرنے والے گنہگار ہیں، تو جو ان کی حمایت کریں گے وہ بھی اسی طرح ہو جائیں گے، اس لئے آپ اس میں محتاط رہا کیجئے، یہ خائن لوگ ہیں، یہ ملعون ہیں، اثیم ہیں، ان کی حمایت میں آپ کوئی بات نہ کیجئے۔

گناہ اور خیانت سے بچانے والی چیز

یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ: اب یہ اُن کو ملامت ہے کہ یہ لوگوں سے شرماتے ہیں اور لوگوں سے اپنی باتیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، عیب لوگوں سے چھپاتے ہیں کہ کہیں لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو جائے کہ ہم چور ہیں، اس طرح ہماری رسوائی ہوگی، بدنامی ہوگی، لوگوں سے چھپتے ہیں، چھپاتے ہیں، شرماتے ہیں، اپنے عیب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ: یہ اللہ سے نہیں چھپ سکتے، تو ان کو لوگوں سے شرم آتی ہے اور اللہ سے شرم نہیں آتی؟ کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا عیب کس طرح چھپا رہے گا؟ اور اُس وقت تک انسان کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا جب تک کہ اُس کو اللہ سے شرم نہ آئے، جو صرف لوگوں سے شرماتا ہے اور اللہ سے نہیں شرماتا وہ گناہ سے باز نہیں آسکتا، وہ اگر ایسا انتظام کرلے کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا تو گناہ پر دلیر ہو جائے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ سے حیا اور اللہ سے شرمانا کسی کی طبیعت میں ہو تو پھر نہ وہ خلوت میں گناہ کرسکتا ہے نہ اندھیرے میں کرسکتا ہے نہ کسی کے سامنے کرسکتا ہے، تو خیانت اور گناہوں سے بچانے والی چیز اصل کے اعتبار سے اللہ سے حیا ہے، اور یہی مراقبہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، ہمارا کوئی عیب اللہ تعالیٰ سے چھپا نہیں رہ سکتا، ذہن کے اندر یہ بات بٹھالینا عیوب، نقائص اور غلطیوں سے بچانے والی بہترین چیز ہے، ورنہ اگر صرف ظاہرداری کرنی ہے اور لوگوں سے ہی بچنے کا اور لوگوں سے ہی شرمانے کا جذبہ ہے تو ایسی صورت میں انسان جب یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا تو پھر وہ دلیر ہو جاتا ہے۔ تو ان کو یہی ملامت کی جارہی ہے کہ یہ لوگوں سے چھپتے ہیں، اپنا عیب لوگوں سے چھپاتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگوں سے شرماتے ہیں اور ان کو اللہ سے شرم نہیں آتی؟ اللہ سے یہ اپنی بات کیسے چھپا سکتے ہیں؟ ''نہیں چھپا سکتے یہ اپنی بات اللہ سے، اور وہ اللہ اِن کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ مشورے کرتے ہیں رات کو ایسی بات کے جو اللہ کو پسند نہیں ہے'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا جو انہوں نے میٹنگ کی کہ اپنے آدمی کو بچانے کی کوشش کی جائے، اور اس الزام کو یہودی پر ڈال دیا جائے، جیسے کوئی مجرم جس وقت جرم کر بیٹھتا ہے تو اُس کے حمایتی یونہی مشورے کیا کرتے ہیں کہ اس کو بچانے کی خاطر کسی اور کی طرف منسوب کردو کہ یہ فلاں کی بات ہے، فلاں کی بات ہے، وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا: اللہ تعالیٰ ان کے عمل کا احاطہ کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کے احاطے سے ان کا عمل باہر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ خوب اچھی طرح سے ان کی کارروائیوں کو جانتے ہیں۔

ہر حال میں حق کی حمایت کرنے کی تاکید

اب آگے ان کے حمایتوں کو تنبیہ ہے، ''خبردار! تم ہی لوگ ہو جنہوں نے ان کی طرف سے جھگڑا کیا دُنیوی زندگی میں، تو کون جھگڑا کرے گا اللہ تعالیٰ سے ان کی طرف سے قیامت کے دِن؟'' یعنی آج تو تم بحث کررہے ہو، بحثا بحثی تمہاری جاری ہے، دُنیا کے اندر ان کی حمایت کررہے ہو، اور کل کو اللہ کی عدالت میں بھی تو پیش ہونا ہے، وہاں کون ہے تم میں سے جو اللہ تعالیٰ سے بحث کرے گا اس مسئلے میں ان کی حمایت میں، یا کون ہے جو ان کا کارساز ہوگا، اور ان کا کام بنائے گا، اور ان کے حالات کی وہاں نگرانی

کرے گا، کوئی ہے ایسا؟ تو قیامت کے دن کو یاد کرو جب اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، آخر وہاں بھی تو جا کر بات ہوگی، آج اگر تم ایک ناجائز کام کی حمایت کر کے اپنے آدمی کو بچا ہی لو اور اُس کی پردہ داری کر ہی لو تو یہ پردہ کل کھل جائے گا، یہ ہے اصل میں ذہن جو اسلام اپنے ماننے والوں کو دیتا ہے، جس کی بناء پر پھر مسلمان حقیقت پسند ہوتا ہے، اُس کو ظاہر داری سے بحث نہیں ہوتی، وہ جب بھی بات کرے گا وہ اس نہج سے بات کرے گا کہ کل کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جب راز سب کھل جائیں گے، اس وقت میری کیا پوزیشن ہوگی؟ میں کس مقام پر کھڑا ہوں گا؟ کیا اُس وقت واقعی میں یہی سمجھا جاؤں گا کہ میں حق کی حمایت کرنے والا تھا، یا یہ جو ہم ظاہر داری کر رہے ہیں اور جان بوجھ کر حق کو چھپا رہے ہیں، باطل کی حمایت کر رہے ہیں، کل کو یہ بات ظاہر ہو جائے گی تو رُسوائی ہوگی، بنیادی چیز یہ ہے، جب تک ذہن کے اندر یہ بات نہ بیٹھے اُس وقت تک انسان کا دل دماغ ایمان والا نہیں ہوتا، دل دماغ مؤمن تبھی بنتا ہے جب یہ حقیقت مستحضر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت ہم پیش ہوں گے اُس وقت جو حالت ہم پسند کرتے ہیں اُسی حالت پر ہمیں دُنیا میں رہنا چاہیے، اور کوئی بات اللہ تعالیٰ سے چھپائی نہیں جاسکتی، جب یہ بات ہوگی تو پھر انسان قرابت، رشتے داری، یا دوستی کی وجہ سے کبھی غلط بات کی حمایت نہیں کرے گا۔

توبہ کی تلقین

آگے ان کو توبہ کی تلقین ہے کہ ان کو اپنا گناہ اور قصور چھپانے کی بجائے توبہ کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ ”جو کوئی بُرا کام کرلے یا اپنے نفس پر ظلم کرلے“ دو لفظ بول دیئے، بُرے کام سے مراد ہو جائے گا ایسا کام جس کا نقصان دوسروں تک پہنچے، جیسے کسی کی حق تلفی کرلی، کسی پر ظلم ہو گیا، یَظْلِمْ نَفْسَهٗ: اپنے آپ پر زیادتی کرلی، یعنی کوئی ایسا گناہ جس کا نقصان صرف اپنے آپ کو پہنچ رہا ہے دوسرے کو نہیں، تو ظلم علی النفس سے ایسا گناہ مراد ہو جائے گا جس کا نقصان اسی تک لازم ہے، اور سوء سے مراد ایسا گناہ ہو جائے گا جس کا دوسرے تک بھی اثر پہنچتا ہے، تو ہر قسم کا گناہ مراد ہو گیا، لازم ہو یا متعدی ہو، ”پھر اللہ تعالیٰ سے وہ استغفار کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پائے گا“ اللہ کے ہاں توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے۔ اور اِستغفار کرنے کا طریقہ آپ کے سامنے پہلے عرض کر دیا تھا کہ صرف زبان سے اَسْتَغْفِرُ اللهَ، اَتُوْبُ اِلَيْهِ کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ دِل سے اپنے گناہ کے اُوپر ندامت ہو، اور اپنی غلطی کا اقرار کر کے انسان اُس کی تلافی کرے، حق اللہ ہے تو اس کو اَدا کرے، حق العبد ہے تو اس کو اَدا کرے یا معاف کروائے، اور آئندہ کے لئے عزم کرے کہ میں پھر دوبارہ اس قسم کا کام نہیں کروں گا، تب جا کر صحیح توبہ ہوتی ہے، پھر یہ اِستغفار مفید ہے اور اللہ تعالیٰ بخش دے گا۔ ”اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ نقصان اپنا ہی کرتا ہے“ اُس کا یہ کسب اِثم اپنے خلاف ہی ہے، اس کا ضرر اسی پر واقع ہوگا، ”اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے“ اللہ تعالیٰ اپنی صفات ہمیشہ ذکر فرماتے ہیں، کیونکہ اسی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور کر کے انسان اللہ کی پیشی سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا استحضار اُس کی صفات کے ساتھ انسان کو جرم سے بچانے کے لئے ایک صحیح بنیاد مہیا کرتا ہے۔ ”جو کوئی خطیئہ کرے، چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ کرے، پھر اُس کو کسی

بے گناہ کے سرتھوپ دے یہ تو بہت بڑی بہتان کی بات ہے، بہت بڑا اِثم مبین ہے، اگر کوئی ایسا کرے گا تو اس نے تو بہتان اُٹھایا اور اِثم مبین اٹھایا'' یہ دوسری غلطی ہے کہ اپنی غلطی کا اقرار کر کے اُس کی تلافی کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بے گناہ کے سرتھوپتے ہیں، یہ اور بھی زیادہ بُری بات ہوئی۔

سرورِ کائنات ﷺ پر اللہ کا فضل اور منافقین کی ناکامی

آگے سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق تذکرہ آ گیا کہ اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت تھی جس نے آپ کو صحیح واقعہ بتا کر غلطی میں پڑنے سے بچالیا، ورنہ ان میں سے ایک گروہ نے تو ارادہ کرلیا تھا کہ آپ کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیں، آپ کی حمایت حاصل کرلیں، اور جن کا حق واقعی ضائع ہوا ہے ان کو دبا دیں، خود سچے بن جائیں اور دوسروں کو جھوٹا بنا دیں، خود پاک دامن ہو جائیں اور دوسروں کو چور بنا دیں، انہوں نے تو سکیم ایسی بنائی تھی لیکن آپ پر اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت ہے کہ آپ کو کسی غلطی میں نہیں پڑنے دیتا۔ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ: ان میں سے ایک گروہ نے ارادہ کرلیا تھا کہ آپ کو بھٹکا دیں، اور نہیں بھٹکاتے مگر اپنے ہی نفسوں کو، اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، ''اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اُتار دی اور دانش مندی کی باتیں اُتار دیں، اور آپ کو ایسی بات سکھا دی جو آپ کو معلوم نہیں تھی، اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے'' اس میں حوصلہ شکنی ہوگئی ان لوگوں کی جو حضور ﷺ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی کر کے چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو اپنے ساتھ شامل کر کے دوسروں کے خلاف استعمال کرلیا جائے۔ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ: ''اگر اللہ کا فضل آپ پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو قصد کیا تھا ان میں سے ایک طائفہ نے کہ آپ کو غلطی میں ڈال دے، اور نہیں گمراہی میں ڈالتے وہ، نہیں غلطی میں ڈالتے وہ مگر اپنے آپ کو'' کیونکہ جو بھی اس قسم کی سازش کرتا ہے اور اس قسم کی کوشش کرتا ہے اسی کے ضلال میں اور اسی کی غلطی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا وبال بڑھتا ہے، وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ: اور یہ لوگ آپ کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، چونکہ اللہ اپنے فضل اور رحمت کے ساتھ آپ کو غلطی میں پڑنے سے بچالیتا ہے۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اُتار دی اور حکمت یعنی دانشمندی، دین کی سمجھ، جس کے ذریعے سے منصوص چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے غیر منصوص چیزوں کے اَحکام سمجھے جاتے ہیں یہ بھی حکمت کا مصداق ہے، ''اور آپ کو ایسی ایسی باتیں سکھا دیں جو آپ نہیں جانتے تھے'' جیسے اس واقعے میں بھی حقیقت پہلے آپ کو معلوم نہیں تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے ذریعے سے آپ کو حقیقت سمجھا دی، ''اللہ تعالیٰ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے۔''

جائز اور ناجائز مشورے کا مصداق

اور آگے یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ چھپ چھپ کر مشورے نہ کیا کرو جس میں شر اور فساد ہو، یہ باتیں اللہ تعالیٰ سے تو نہیں چھپتیں، ہاں البتہ کوئی نیکی کا کام ہے، کسی کو نیکی کی تلقین کرنی ہے، لوگوں کو صدقہ خیرات کی ترغیب دینی ہے، یا آپس میں لڑائی جھگڑے والوں کی صلح کرانی ہے، تو ایسے موقع پر اگر کوئی مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آ جائے یہ مشورۂ خیر ہے، اس کی اجازت ہے،

باقی جو مشورے شر وفساد پر مشتمل ہوتے ہیں، اسلام کے خلاف یا اہل حق کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں اس قسم کے مشوروں میں شریک نہیں ہونا چاہیے، ان میں کسی قسم کی کوئی خیر نہیں۔ تناجی، سرگوشی، خفیہ مشورے، ان کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ مجادلہ میں آئے گا جس میں یہ الفاظ ہوں گے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى: اے ایمان والو! آپس میں مل کر اثم وعدوان اور رسول کی نافرمانی کے ساتھ سرگوشیاں نہ کیا کرو، ہاں! اگر کوئی سرگوشی کرنی ہو تو اُس کے اندر بِر اور تقویٰ کی رعایت ہونی چاہیے، نیکی کے متعلق مشورہ ہو، نیکی پھیلانے کا جذبہ ہو، اور لوگوں کے اختلافات اُٹھانے کے لئے اور صلح کرانے کے لئے آپس میں مشورے کئے جائیں، یہ مشورے مفید ہیں۔ لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ: ان لوگوں کی سرگوشیوں میں سے بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، ہاں! البتہ اس شخص کی سرگوشی میں خیر ہے جو صدقے کی تلقین کرتا ہے، صدقہ خواہ واجب ہو یا نفل ہو، یعنی خدمتِ خلق کا کوئی بھی شعبہ جس میں دوسرے کو نفع پہنچانے کی بات ہے، اس قسم کی بات اگر چھپ چھپا کے خفیہ طور پر کسی سے کہی جائے تو درست ہے، کیونکہ ہر دفعہ علی الاعلان بات کا کہنا مناسب نہیں ہوتا، اس قسم کی باتیں بسا اوقات چپکے چپکے کرنے کی بھی ہوتی ہیں، تو اس میں خیر ہے، معروف یعنی نیکی پھیلانے کے لئے، نیکی کی تلقین کرنے کے لئے کوئی مشورے کی ضرورت ہے تو اس مشورے میں بھی خیر ہے، یا لوگوں کے حالات درست کرنے کے لئے، اصلاح ذات البین کے لئے، یعنی صلح کروانا، کہ دو آدمی آپس میں جھگڑے ہوئے ہیں، ان کی کوئی بات اُلجھی ہوئی ہے، تو ان کے معاملے کو سلجھانے کے لئے اگر کوئی خفیہ مشورہ کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

صلح کی فضیلت اور جھگڑے کی مذمت

لوگوں کے درمیان صلح کرانا معروف اور نیکی کا بہت بڑا فرد ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتادوں جس کے ذریعے سے تم روزے رکھنے والے اور رات کو قیام کرنے والے کے درجے کو بھی حاصل کرلو گے، یعنی ایک شخص نفلی روزے بہت رکھتا ہے اور رات کو قیام بہت کرتا ہے، جو اُس کا درجہ ہے تو اس خصلت کے ذریعے سے تم اُس کے درجے کو حاصل کرلو گے، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی افضل، وہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان ان کے حالات کی اصلاح کیا کرو۔[1] جس طرح لوگوں کے درمیان فساد پھیلانا بدترین قسم کی خصلت ہے، کہ ایک آدمی کی بات دوسرے کو پہنچادی جائے اس خیال سے کہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں یہ کبیرہ گناہ ہے، جس کو نمیمہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، "لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ" یا- "لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ"[2] یہ سخن چیں، باتیں چننے والے، جو چھپ چھپا کے باتیں سنتے ہیں، یا مجلس میں بیٹھ کر باتیں سن کے فساد کی نیت سے دوسروں تک پہنچاتے ہیں، چاہے وہ باتیں سچی ہی ہوں تو یہ سچ بولنے والے گناہ گار ہیں، یہ کبیرہ گناہ ہے، فساد مچانے کے لئے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا اگرچہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو، انسان کہے کہ میں قرآن اُٹھا کے کہہ سکتا ہوں کہ بات صحیح ہے، تو چاہے

(۱) سنن ابی داؤد ۲/ ۳۱۷ باب فی اصلاح ذات البین/ ترمذی ۲/ ۷۷، کتاب صفۃ الجنۃ سے کچھ پہلے/ مشکوۃ ۲/ ۴۲۸ باب ما ینھی عنہ الخ، فصل ثانی۔
(۲) مسلم ۱/ ۷۰ کے لفظ: لا یدخل الجنۃ نمام/ بخاری ۲/ ۸۹۵ — مسلم ۱/ ۷۰ — مشکوۃ ۲/ ۴۱۱ باب حفظ اللسان۔ وفی الفلاح الاخیرۃ قتات۔

قرآن اُٹھا کر کہے کہ بات صحیح ہے لیکن اگر اس کا دوسرے تک پہنچانا اس نیت سے ہے تا کہ ان کا آپس میں فساد ہو جائے یہ کبیرہ گناہ ہے اور حرام ہے، ایسا سچ بولنے والا آدمی جو فساد مچانے والا ہے یہ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور اس کی بجائے دو مسلمانوں کی آپس میں صلح کرائی ہے اور ان کا جھگڑا مٹانا ہے تو اس جھگڑے کو مٹانے کے لئے اور صلح کروانے کے لئے اگر کسی وقت خلاف واقع بات بھی کہنی پڑ جائے تو اس کی اجازت ہے، اور وہ شرعاً جھوٹ نہیں، یعنی اس کے اُوپر جھوٹ والی وعید نہیں ہے: "لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ"[1] جو لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہے اگر اُس کو صلح کروانے کے ضمن میں کوئی بات خلاف واقع بھی کہنی پڑ جائے تو شرعاً وہ جھوٹا نہیں ہے، اس کی صورت ایسی ہوتی ہے کہ ایک فریق آپ کے پاس آیا اور اُس نے دوسرے فریق کے متعلق زیادتی کی، گالیاں دیں، بدزبانی کی، پھر دوسرا فریق آپ سے ملتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اُنہوں نے کیا باتیں کی تھیں، تو آپ کہہ دیں کہ آپ کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی، وہ تو کہہ رہے تھے کہ صلح ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے، اور ایسے ہی خواہ مخواہ آپس میں فساد پڑ گیا، اس طرح دوسرے کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک کی بات دوسرے سے چھپائی جائے، اور کسی اچھی بات کی نسبت کر دی جائے جس سے دوسرے کے جذبات اچھے ہو جائیں اور آپس میں شر وفساد ختم ہو جائے، تو اس قسم کا جو خلاف واقع بیان ہے یہ لغۃً اگر چہ جھوٹ ہے لیکن شرعاً مطلوب ہے، جس طرح ہمارا شیخ (سعدی) کہتا ہے کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" جس سچ بولنے کے ساتھ فتنہ اُبھرتا ہو اس سچ سے وہ جھوٹ بہتر ہے جس سے کوئی صلح صفائی ہوتی ہے اور کسی مصلحت کی رعایت رکھی جاتی ہے۔ دھوکا دینے کے لئے اور کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے جھوٹ حرام ہے، لیکن شر کے مٹانے کے لئے خلاف واقع بات کہنے کی ترغیب ہے، تو اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ بھی اگر چہ معروف کا فرد ہے، لیکن اس کو اہمیت کی وجہ سے علیحدہ ذکر کر دیا۔ اور آپس کا فساد شر کا اعلیٰ فرد ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آپس کا فساد حالقہ ہے، مونڈ ڈالنے والا ہے، اور فرمایا کہ یہ سر کے بال نہیں مونڈتا بلکہ دین کو مونڈ کر رکھ دیتا ہے۔[2] کیونکہ جب آپس میں شر وفساد ہوتا ہے تو پھر جھوٹی تہمتیں بھی لگتی ہیں، ایک دوسرے کے متعلق انسان غلط بیانی بھی کرتا ہے، ہر وقت غیبت میں مبتلا ہوتا ہے، چغلیاں کرتا ہے، اور جائز ناجائز ہر طریقے سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، انسان کے اخلاق بھی تباہ ہوتے ہیں، دیانت داری بھی نہیں رہتی، دین، دیانت سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، اور ہر وقت کی بے چینی اور ہر وقت کی سوزش علیحدہ۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: جو یہ کام کرے، یعنی امر بالصدقہ، امر بالمعروف اور اصلاح بین الناس، اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے جو یہ کام کرے، فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا: ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔

حجیتِ اجماع

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ: اور جو رسول سے ضد کرتا ہے، جو رسول کے خلاف پارٹی بناتا ہے، رسول کے خلاف گروہ کھڑا کرتا

---

(۱) بخاری ۱/۳۷۱، باب لیس الکذاب الذی یصلح/ مسلم ۳۲۵/۲، باب تحریم الکذب/ مشکوۃ ۴۱۲/۲، باب حفظ اللسان۔ نیز ۴۲۸/۲، باب ما ینھی عنہ۔

(۲) مشکوۃ ج ۲ ص ۴۲۸ باب ما ینھی عنہ من التھاجر، فصل ثانی/ ترمذی ج ۲ ص ۷۷، ابواب صفۃ الجنۃ سے کچھ پہلے۔

ہے،مُشاقہ کے اندر یہ بات بھی داخل ہے،جس طرح اس بشیر نے قصور کیا،قصور کرنے کے بعد پھر اپنے قبیلے کو حضور ﷺ کے پاس اپنی حمایت میں اکٹھا کر کے لے گیا تھا۔''جو کوئی اللہ کے رسول کے ساتھ ضد کرتا ہے،مخالفت کرتا ہے، بعد اس کے کہ اس کے سامنے ہدایت واضح ہوگئی'' اللہ کا دِین اور اللہ کا طریقہ اُس کے سامنے نمایاں ہے، وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور وہ مؤمنین کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے کی اتباع کرتا ہے۔ یہاں دو باتیں ذکر فرمائیں ایک رسول کے ساتھ مخالفت اور ایک مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے کی اتباع، اور دونوں کی جزاء ایک ہی قسم کی ذکر کی کہ ہم اُس کو کرنے دیں گے جو وہ کرنا چاہتا ہے، ہم اِس کو پھیر دیں گے جدھر وہ پھرتا ہے، جن حالات کی طرف وہ جانا چاہتا ہے ہم اُس کی رَسّی ڈھیلی چھوڑ دیں گے، اور پھر اُس کو جہنم میں پہنچا دیں گے، اس سے معلوم ہوگیا کہ جس طرح رسول کی مخالفت حرام ہے اور یہ جہنم میں لے جانے والی بات ہے، اسی طرح جس بات پر مسلمان متفق ہو جائیں اور وہ مسلمانوں کا طریقہ قرار پا جائے اس طریقے کو چھوڑ کر دوسرے طریقے کی جو اتباع ہے یہ بھی جہنم میں لے جانے والی بات ہے، اس لئے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کو اِجماعِ اُمت کے لئے بطورِ دلیل ذکر کیا ہے کہ اِجماعِ اُمت حجت ہے، اور جس بات پر اُمت متفق ہو جائے اُس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے: ''یَدُ اللهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ''[1] جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے، یا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو میرے ساتھ وعدے کیے ہیں ان وعدوں میں سے ایک وعدہ یہ بھی ہے کہ میری اُمت ضلالت پر جمع نہیں ہوگی، گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی[2] تو جو طریقہ مسلمان مل کر اپنالیں اور وہ سبیل المؤمنین قرار پا جائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی حق ہوتا ہے، اور اُس کی مخالفت اسی طرح مذموم ہے جس طرح اللہ کے رسول کی مخالفت مذموم ہے۔ تو کتاب اللہ کی اتباع، اور سرورِ کائنات ﷺ کی سُنّت کی اتباع، اور تیسرے درجے پر اِجماعِ اُمت ہے، اور ''قیاس'' کا ذِکر آپ کے سامنے ''اُولو الامر'' کے مسئلے کے تحت ذکر کر دیا گیا تھا، ''اِستنباط'' کر کے جو بات نکالی جاتی ہے اُس کا ذِکر وہاں ہوگیا تھا، تو کسی مسئلے کے بیان کرنے کے اُصولِ اربعہ جو ہم ذکر کیا کرتے ہیں وہ اس طرح قرآنِ کریم سے ثابت ہیں۔ وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ: اور ہم اُس کو جہنم میں پہنچا دیں گے وَسَآءَتْ مَصِیْرًا: اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ
بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اُس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اس کے علاوہ جو کچھ ہے
لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾
جس کے لئے چاہے گا، اور جو کوئی شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس تحقیق وہ بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑا ﴿۱۱۶﴾

(۱) ترمذی ۲/۳۹ باب ما جاء فی لزوم الجماعة/مشکوٰۃ ص ۳۰، باب الاعتصام فصل ثانی۔

(۲) مشکوٰۃ ۲/۵۱۴ باب فضائل سید المرسلین، فصل ثانی/سنن دارمی باب ما اعطی النبی ﷺ من الفضل، رقم الحدیث: ۵۵۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ﴿۱۱۷﴾

نہیں پکارتے یہ مشرکین اللہ کے علاوہ مگر عورتوں کو، اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو ﴿۱۱۷﴾

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ﴿۱۱۸﴾

اللہ نے اس پر لعنت کی، اور اُس شیطان نے کہا البتہ ضرور اختیار کروں گا میں تیرے بندوں سے ایک متعین حصہ ﴿۱۱۸﴾

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ

اور البتہ ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور البتہ ضرور انہیں اُمیدیں دِلاؤں گا اور البتہ ضرور انہیں حکم دُوں گا پس البتہ وہ ضرور چیریں گے جانوروں کے کان

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ

اور البتہ ضرور حکم دُوں گا میں انہیں پھر البتہ ضرور تبدیل کریں گے وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو، اور جو شخص شیطان کو دوست بنالے اللہ کو چھوڑ کر

اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۭ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا

پس تحقیق وہ واضح خسارے میں پڑ گیا ﴿۱۱۹﴾ شیطان اِن لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں اُمیدیں دِلاتا ہے، اور نہیں

يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا

وعدے کرتا اِن سے شیطان مگر دھوکے کے ﴿۱۲۰﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور نہیں

يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

پائیں گے یہ اُس جہنم سے ہٹنے کی جگہ ﴿۱۲۱﴾ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ

ضرور داخل کریں گے ہم ان کو باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے

اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ

ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے، اور کون زیادہ سچا ہے اللہ کے مقابلے میں از روئے بات کے ﴿۱۲۲﴾ نہ

بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَھْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ

کسی امر کا مدار تمہاری خواہشات پر ہے نہ اہل کتاب کی خواہشات پر، جو کوئی شخص کوئی بُرا کام کرے گا اسے اُس کا بدلہ دیا جائے گا

وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ

اور نہیں پائے گا وہ شخص اپنے لیے اللہ کے علاوہ کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۲۳﴾ اور جو کوئی شخص نیک کام کرے گا

مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ

مرد ہو یا عورت اس حال میں کہ وہ ایمان والا ہو پس یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل

الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ

ہوں گے اور نہیں ظلم کئے جائیں گے یہ کچھ بھی ﴿۱۲۴﴾ کون زیادہ اچھا ہے از روئے دین کے بمقابلہ اُس شخص کے جس نے اپنی ذات کو

وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ

سپرد کر دیا اللہ کے لئے، اس حال میں کہ وہ اچھی طرح سے کام کرنے والا ہے اور اُس نے اتباع کی ابراہیم کے طریقہ کے جو کہ حنیف تھے، اور اللہ تعالیٰ

اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

نے ابراہیم کو دوست بنایا ﴿۱۲۵﴾ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے،

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۲۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں معاف کرے گا، نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے، وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ: اور بخش دے گا اس کے علاوہ جو کچھ ہے لِمَنْ يَّشَآءُ: جس کے لئے چاہے گا، وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ: اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: پس تحقیق وہ بھٹک گیا بھٹکنا بہت دُور۔ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا: نہیں پکارتے یہ مشرکین اللہ کے علاوہ مگر عورتوں کو۔ اِناث اُنثیٰ کی جمع۔ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا: مَرَدَ: سرکش ہو جانا، طاعت سے نکل جانا۔ اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو، لَعَنَهُ اللّٰهُ: اللہ نے اس پر لعنت کی، اللہ نے اس شیطان کو اپنی رحمت سے دُور کیا، وَقَالَ: اور اس شیطان نے کہا: لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: البتہ ضرور اختیار کروں گا میں تیرے بندوں سے ایک متعین حصہ، اس سے مراد یہ ہے کہ بندوں کی طاعت سے ایک متعین حصہ وصول کروں گا، وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ: اور البتہ ضرور انہیں گمراہ کروں گا وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ: اور البتہ ضرور انہیں خواہشیں دلاؤں گا، ہوسیں دلاؤں گا، خواہشات میں مبتلا کروں گا،

اُمیدیں دِلاؤں گا، وَلَاٰمُرَنَّهُمْ: البتہ ضرور انہیں حکم دوں گا فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ: پس البتہ ضرور کاٹیں گے، چیریں گے وہ جانوروں کے کان۔ بتك: کاٹنا، چیرنا۔ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ: البتہ ضرور حکم دوں گا میں انہیں، فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ: پھر البتہ ضرور تبدیل کریں گے وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو۔ خَلْقَ اللّٰهِ سے اللہ کی مخلوق، اللہ کی بنائی ہوئی صورت مراد ہے، یعنی وہ اللہ کی ساخت کو بدلیں گے۔ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور جو شخص بھی شیطان کو دوست بنالے اللہ کو چھوڑ کر، فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا: پس تحقیق وہ صریح خسارے میں پڑ گیا، اس نے خسارہ اٹھایا صریح خسارہ۔ يَعِدُهُمْ: شیطان اِن لوگوں سے وعدے کرتا ہے وَيُمَنِّيْهِمْ: اور انہیں اُمیدیں دِلاتا ہے، وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ: اور نہیں وعدے کرتا اِن سے شیطان مگر دھوکے کے، اِلَّا غُرُوْرًا: اِلَّا وَعْدَ غُرُوْرٍ، غرور یہ مصدر ہے۔ غَرَّ يَغُرُّ: دھوکا دینا، یعنی شیطان کا وعدہ سوائے دھوکے کے کچھ نہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: یہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اُولٰٓئِكَ کا اشارہ ان کی طرف ہے جو شیطان کے وعدوں اور اس کی اُمیدوں میں آگئے، جن کو شیطان نے بہکالیا، وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا: اور نہیں پائیں گے یہ اس جہنم سے ہٹنے کی جگہ۔ محیص ظرف ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ضرور داخل کریں گے ہم ان کو باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا: ہمیشہ اس کے اندر رہنے والے ہوں گے وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا: اللہ کا وعدہ سچا ہے، وَعَدَ اللّٰهُ وعدًا حقًّا، اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے، وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا: اور قول کے اعتبار سے اللہ سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے، کون زیادہ سچا ہے اللہ کے مقابلے میں ازروئے بات کے، قِیل قول کے معنی میں ہے، لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ: نہ تو تمہاری خواہشات کا اعتبار ہے نہ اہل کتاب کی خواہشات کا اعتبار ہے۔ لَيْسَ الامرُ منوطًا بِاَمَانِيِّكُمْ نہ کسی امر کا مدار تمہاری خواہشات پر ہے نہ اہلِ کتاب کی خواہشات پر۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا: جو کوئی شخص کوئی بُرا کام کرے گا يُّجْزَ بِهٖ: تو اس کا بدلہ دیا جائے گا، وَلَا يَجِدْ لَهٗ: اور نہیں پائے گا وہ شخص اپنے لیے اللہ کے علاوہ کوئی حمایتی نہ کوئی مددگار، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ: اور جو کوئی شخص نیک کام کرے گا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى: مذکر ہو یا مؤنث، مرد ہو یا عورت وَهُوَ مُؤْمِنٌ: اس حال میں کہ وہ ایمان والا ہو، فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ: پس یہی لوگ ہیں جو جنّت میں داخل ہوں گے، وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا: اور نہیں ظلم کیے جائیں گے یہ کچھ بھی۔ نقیر اصل کے اعتبار سے گٹھلی کی پشت پر جو چھوٹا سا گڑھا ہوتا ہے، نُقْرَةٌ فِی ظَهْرِ النَّوَاة، نقیر کا لفظ اُس پر بولا جاتا ہے، اور یہ قلیل کی مثال دینے کے لئے ہے جیسے ہمارے ہاں ''تِل برابر''، ''ناخن برابر''، ''تاگے برابر'' یہ لفظ بولے جاتے ہیں، اور قلیل سے نفی مراد ہوتی ہے، یعنی بالکل ظلم نہیں کیے جائیں، ''نہیں ظلم کیے جائیں گے تِل برابر''، ''نہیں ظلم کیے جائیں گے تاگا برابر'' اس قسم کے لفظ نفی کی تاکید کے لئے ہوا کرتے ہیں، یعنی بالکل ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ ''کون زیادہ اچھا ہے ازروئے دِین کے بمقابلہ اس شخص کے جس نے اپنی ذات کو سپرد کردیا اللہ کے لئے'' وَهُوَ مُحْسِنٌ: اس حال میں کہ وہ اچھی طرح سے کام کرنے والا ہے، اَحْسَنَ اِحسان کا معنی ہوتا ہے ہر کام کے اندر حُسن کی رعایت رکھنا، وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا: اور اس نے اتباع کی ابراہیم کے طریقے کی ایسے ابراہیم جو کہ حنیف تھے، یعنی تمام ادیانِ باطلہ سے ہٹ کر ایک طرف رُخ کرنے والے تھے، وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو

دوست بنایا۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رُکوع میں جو واقعہ آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا اُس کا آخری جزء یہ تھا کہ وہ شخص جس نے چوری کی تھی، جس کی بناء پر یہ حالات پیدا ہوئے، وہ سزا کے ڈر سے مرتد ہو کر مشرکین سے جاملا تھا، اُسی کے متعلق پچھلے رکوع کی آخری آیت میں وعید تھی، کہ جو اللہ کے رسول کی مخالفت مول لیتا ہے، ان سے ضد کرتا ہے، اور مؤمنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کی اتباع کرتا ہے، ہم اُسے کرنے دیتے ہیں جو وہ کرنا چاہتا ہے، ہم اُس کو والی بنادیتے ہیں اس چیز کا جس کا وہ والی بنتا ہے، پھر ہم اُس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔ تو چونکہ وہ مشرک ہو گیا تھا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا تھا، اسی مناسبت سے اِس اگلے رُکوع میں شرک کی مذمت اور مشرکین کا انجام بیان کیا گیا ہے۔

''شرک'' کو ایک جگہ ''اِفترا'' اور یہاں ''ضلال'' کہنے کی وجہ

یہ آیت آپ کے سامنے پہلے بھی گزر چکی ہے، پہلے جس وقت یہ آیت آئی تھی اُس کے آخر میں الفاظ یہ تھے: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (النساء: ۴۸) کہ جو کوئی شرک کرے اس نے بہت بڑے گناہ کا اِفترا کیا، اور یہاں آگیا: فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ وہاں ذکر تھا اصل کے اعتبار سے اہلِ کتاب کا، اور اہلِ کتاب کے سامنے چونکہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات تھیں، وہ توراۃ اور اِنجیل کے حامل تھے، انبیاء ﷩ کا نام لیتے تھے، لوگ ان کے طریقے کو اللہ کا بتایا ہوا طریقہ ہی سمجھتے تھے، تو جب وہ لوگ شرک کا ارتکاب کریں گے تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کے اُوپر اِفترا کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اُوپر ایک جھوٹی بات باندھ رہے ہیں، کیونکہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تعلیم کیا گیا ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم کردہ نہیں ہے، اور یہاں ذکر مشرکینِ مکہ کا ہے جو جاہل ہیں، جن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، اس لئے ان کے صرف بھٹکنے کا ذکر کیا کہ وہ بھٹک کر بہت دُور جا پڑے، ان کے شرک کو یہاں ''اِفترائے عظیم'' کے ساتھ تعبیر نہیں کیا۔

مشرک اور کافر میں فرق اور دونوں کا حکم

''اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اِس بات کو کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دے کر بھی معاف نہیں کریں گے، اور کُفر بھی شرک کے حکم میں ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایمان سے خالی ہو گیا چاہے وہ مشرک ہو، کیونکہ مشرک تو وہ شخص ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کی کسی صفت میں، اُس کے ساتھ محبت

میں، اُس کے ساتھ اطاعت میں، اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کسی دوسرے کو حصہ دار بناتا ہے، محبت میں حصہ دار بناتا ہے کہ جیسی محبت اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے ویسی محبت دوسروں سے کرتا ہے، مشرکین کے ذکر کے اندر یہ لفظ آپ کے سامنے پہلے گزر چکے ہیں: یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۶۵) کہ یہ اپنے اَنداد کے ساتھ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح محبت اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے، تو یہ شرک فی المحبت ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کسی دوسرے کو شریک کرلیا جائے، کہ جیسے اللہ کا حکم مانا جاتا ہے اسی طرح انسان دوسرے کے حکم کو بھی اللہ کے حکم کے برابر قرار دے دے، اللہ کی کسی صفت میں شریک کردے، اُس کے حق میں شریک کردے، محبت میں شریک کرے، اطاعت میں شریک کرے تو وہ مشرک ہوگیا، بہرحال مشرک وہی ہوگا جو اللہ کے وجود کا قائل ہے، اور کوئی شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے جو سرے سے اللہ کے وجود کا قائل ہی نہیں، اُس کو مشرک نہیں کہہ سکتے، وہ کافر ہے، یا اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے قطعی احکام میں سے یعنی ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے، مثلاً انبیاء علیہم السلام کو نہیں مانتا، قرآنِ کریم کو نہیں مانتا، ضروریاتِ دین کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا تھا کہ وہ قطعی اُمور جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہوتے ہیں، لیکن اُس کے بعد پھر وہ اتنے واضح ہوتے ہیں کہ دین میں سے ان کا ہونا سب لوگوں کو معلوم ہوتا ہے، کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا، ایسی باتوں میں سے کسی بات کا اگر وہ انکار کرتے ہیں تو کافر ٹھہرے، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ہی کرتے ہوں، تو قرآنِ کریم کی آیات میں جس طرح مشرک کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ نہیں بخشا جائے گا اسی طرح کافر کے متعلق بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ نہیں بخشا جائے گا، اس لیے جو حکم مشرک کا ہے وہی حکم کافر کا ہے، بعض آیات میں مشرک کی صراحت ہے اور بعض میں کافر کی صراحت ہے، دونوں کا حکم ایک ہی ہے، حاصل سب کا ایک ہے کہ جو صحیح ایمان نہیں رکھتا پھر چاہے وہ کافر ہے چاہے مشرک ہے، اللہ تعالیٰ اُس کو سزا دے کر بھی معاف نہیں کریں گے، یہ دائمی جہنمی ہے، کسی وقت بھی اس کو جہنم سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔

کافر کے دائمی جہنمی ہونے پر ایک اِشکال کا جواب

اور اس پر بظاہر کسی کی طرف سے یہ شُبہ کیا جاسکتا ہے کہ ان مشرکین نے شرک تو ایک محدود زمانے میں کیا، کسی نے چند دِن کیا، کسی نے چند سال کیا، اور اسی طرح کافر نے کُفر تو ایک محدود زمانے میں اختیار کیا، زیادہ سے زیادہ بھی اگر اُس کی عمر ہوگی تو سینکڑوں کے حساب سے ہوگی، اور سزا اُس کو ایسی لامتناہی دی جارہی ہے جس کا حد وحساب ہی کوئی نہیں، تو بظاہر یہ دونوں چیزیں آپس میں مطابق نظر نہیں آتیں، کہ جرم کی سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیے، اور یہ سزا بظاہر ان کے جرم سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں گے تو یہ اِشکال محض سطحی نظر سے ناشی ہے، جرم کی سزا جرم کے مطابق ہوتی ہے یہ ضابطہ صحیح ہے، لیکن وقت میں مطابقت ضروری نہیں کہ جتنے وقت میں جرم ہوا ہے اتنا وقت ہی سزا دی جائے، اب ایک آدمی اگر کسی کو قتل کرتا ہے، اُس کے گولی مارتا ہے تو ایک لمحے میں اس نے جرم کا ارتکاب کرلیا، لیکن جب اُس کو ان دُنیوی عدالتوں میں سزا دی جاتی ہے تو بیس بیس سال کی سزا دے دی جاتی ہے، وجہ یہ ہے کہ جرم چونکہ سخت نوعیت کا ہے تو سزا بھی سخت نوعیت کی ہوگئی، اس لیے وقت میں مطابقت کوئی

ضروری نہیں، چوری کرنے والا چوری چند گھنٹوں میں کر کے فارغ ہوجاتا ہے، اور جب اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے تو یہ سزا اُس کو جب تک اُس کی زندگی رہے گی دائمی ہوگئی، یا دُنیوی عدالتوں کے اندر اس کو مہینوں کی یا سالوں کی سزا ہوجاتی ہے تو یہاں وقت میں کوئی مطابقت نہیں۔ اس لیے جرم کی سنگینی کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے، کہ جرم کے اندر جتنی سنگینی ہوگی اور جرم جتنا سخت ہوگا اُس کے مطابق فیصلہ ہوجائے گا، اور شرک اور کُفر اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے زیادہ دخل اندازی ہے، اور اس کو ظلم عظیم کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے جتنے جرائم ہیں ان کے مقابلے میں اس کی سزا بھی سب سے زیادہ رکھی گئی ہے، اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں باغی کی ہے، اور باغی، بدترین قسم کی سزا کا مستحق ہوا کرتا ہے۔ اور پھر کوئی مشرک اور کافر ہو اس کی نیت یہی ہوتی ہے کہ اگر اس کو کروڑ ہا سال بھی زندگی مل جائے تو بھی یہ اپنا مسلک چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، جس طرح مؤمن کی اپنے ایمان پر دوام کی نیت ہوتی ہے کہ اگر وہ کروڑ ہا سال بھی زندہ رہے تو وہ ایمان پر ہی رہے گا نیت اُس کی یہی ہوتی ہے، اُس کا ارادہ یہ نہیں ہوتا کہ سو سال کے بعد میں اپنا عقیدہ بدل لوں گا، یا ایک لاکھ سال کے بعد میں عقیدہ بدل لوں گا، ہمارے جذبات یہی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوجائے اور کروڑ ہا سال ہماری زندگی ہو تو بھی ہم اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں گے کہ ہمارا ایمان محفوظ رہے، ہم کسی وقت بھی ان عقائد کو بدلنے کا ارادہ نہیں رکھتے، اسی طرح کافر اور مشرک کو بھی اپنی نیت کے اعتبار سے کُفر پر دَوام ہوتا ہے، تو جہنّم میں جانا تو کُفر کی سزا کے طور پر ہے، اور اس کا دَوام ان کی نیتِ دَوام کی وجہ سے ہے، چونکہ وہ اپنے عقیدے کو اپنے لیے دائماً اختیار کئے ہوئے ہیں، جس میں وہ تبدیلی نہیں لانا چاہتے، مؤمن بھی تبدیلی نہیں لانا چاہتا اور کافر بھی تبدیلی نہیں لانا چاہتا، جس کی بناء پر مؤمن کو جنّت میں دَوام ہوگا اور کافر کو جہنّم میں دَوام ہوگا۔

کافر کی نیکی غیر معتبر کیوں؟ اور مؤمن کا جرم قابلِ معافی کیوں؟

پھر کافر کی کسی دوسری نیکی کا اعتبار نہیں، چاہے وہ کتنا ہی ظاہری طور پر نیک کیوں نہ ہو، مثلاً غریب پرور ہے، مسکین پرور ہے، نیکیاں کرتا ہے، اُس کی کسی نیکی کا اعتبار نہیں ہے۔ اور مؤمن جو ایمان لے آتا ہے تو اُس کا گناہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفرت کے قابل ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی اسی اُصول سے سمجھ میں آگئی، کہ بادشاہِ وقت اور حکومتِ وقت کے خلاف جو بغاوت کردے، چاہے وہ بہت زیادہ ڈگری یافتہ ڈاکٹر ہے، انجینئر ہے، بہت بڑا فلاسفر ہے، ہر قسم کی قابلیت اُس کو حاصل ہے، لیکن ایسے باغی کو مُلک کے اندر رہنے کا حق نہیں ہوتا، اُس کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاتا ہے، یا اُس کو گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے، یا مُلک بدر کردیا جاتا ہے، وہ اُس مُلک میں رہنے کا حق دار نہیں جو اُس مُلک کی حکومت کا باغی ہے، چاہے وہ کتنے ہی کمالات کا مالک کیوں نہ ہو۔ بخلاف اس کے کہ اگر کوئی شخص حکومت کا باغی نہیں، حکومت کے ساتھ اُس کا تعلق اطاعت کا ہے اور وہ حاکم کو حاکم تسلیم کرتا ہے، حکومت کے قانون کو وہ قانون مانتا ہے، لیکن پھر اُس سے عملی کوتاہی ہوجاتی ہے، تو ایسے لوگ مُلک میں ہی رہا کرتے ہیں، چاہے وہ چور ہی کیوں نہ ہوں، چاہے وہ ڈاکو ہی کیوں نہ ہوں، چاہے دوسرے قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے

کیوں نہ ہوں، ان کو تنبیہ اور سرزنش تو کی جائے گی لیکن ان کا انجام ویسا نہیں کیا جاتا جیسا باغی کا کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ بغاوت کو برداشت نہیں کرتی، بغاوت ایک ایسا جرم ہے جس کے بعد انسان کی ساری خوبیاں ملیامیٹ ہو جاتی ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ اور اگر ایک شخص اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیے ہوئے ہے تو اس سے کتنی ہی کوتاہیاں کیوں نہ ہو جائیں اس سے درگزر کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے باغیوں کو معاف نہیں کرے گا، اس بغاوت کے ساتھ ان کی کسی نیکی کا کوئی اعتبار نہیں، جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے، سزا دینے کے بعد بھی ان کو چھوڑا نہیں جائے گا، یوں سمجھ لیجئے کہ وہ نجس العین ہو گئے، جہنم میں جانے کے بعد اور آگ میں جلنے کے بعد بھی یہ پاک نہیں ہوں گے کہ ان کو جنت کے قابل سمجھ لیا جائے، یہ نجس العین ہیں۔ اور ایمان والا شخص اگر کوئی گناہ کرتا ہے تو ایسے ہے جیسے کوئی چیز اصل کے اعتبار سے پاک ہو اور عارضی طور پر اس پر نجاست لگ جائے، جیسے کپڑے پر پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں تو دھونے سے پاک ہو جائے گا، لیکن اگر پیشاب کو ہی پاک کرنا چاہیں تو وہ کس طرح پاک ہوگا؟ پاخانے اور گوبر کو اگر آپ دھو کر پاک کرنا چاہیں تو کس طرح پاک ہوگا؟ اسی طرح مشرک کی مثال نجاست کی ہے، کہ وہ جہنم میں جلنے کے بعد اور سزا پانے کے بعد بھی پاک نہیں ہوں گے، اور مؤمن کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی چیز اپنی ذات میں پاک ہو لیکن عارضی طور پر اس پر نجاست آ جائے تو اُس کی صفائی ہو جاتی ہے۔

اللہ کی اطاعت کا مطالبہ احتیاج کی بنا پر نہیں

(ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جو مطالبہ ہے یہ احتیاج کی بنا پر نہیں کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہو، بلکہ یہ سب باتیں اس کی حکمت اور مشیت کے تحت ہیں، ان کو دُنیوی حکومتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ دُنیوی حکومتیں تو ہماری اطاعت کی محتاج ہیں، اس لئے اگر ہم اطاعت نہیں کرتے تو ان کو غصہ آتا ہے، اگر ہم اطاعت کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جو آپ سے چاہتا ہے یہ احتیاج کی بنا پر نہیں، یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، اور اس کی حکمت تک ہماری عقل نہیں پہنچ سکتی، بہرحال اس نے اپنی کتاب میں اس بات کی صراحت کر دی کہ وہ اطاعت پر خوش ہوتا ہے اور نافرمانی سے ناراض ہوتا ہے، چاہے اطاعت سے اس کا فائدہ کوئی نہیں اور نافرمانی سے اس کا نقصان کوئی نہیں۔

کفر و شرک کے علاوہ دیگر گناہوں کی معافی کی تفصیل

تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ شرک کے علاوہ جو کچھ ہوگا، اور دوسری آیات کے قرینے سے ساتھ یہ اضافہ کریں گے کہ کفر کے علاوہ جو کچھ ہوگا، یعنی شرک اور کفر کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ بخش دے گا جس کو چاہے گا، یعنی یہ بخشش بھی مشیت کے تابع ہے، ''مشیت'' کا لفظ بڑھا کر یہ بتا دیا کہ معصیت اور نافرمانی کی جرأت ایمان والوں کو بھی نہیں کرنی چاہیے، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر سزا کے ضرور معاف کر دیں گے ایسی بات نہیں ہے، بلکہ جس کو چاہیں گے سزا دیں گے، بغیر سزا کے بھی چاہیں گے تو معاف کر دیں گے، یہ اللہ کی مشیت پر ہے، اس لئے جرأت اور دلیری کسی میں نہیں ہونی چاہیے، ''بخش دے گا اس کے علاوہ جو کچھ

ہے جس کے لئے چاہے گا'' یعنی سزا دے کر بالیقین، اور بغیر سزا کے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے، اس میں دونوں شقیں آگئیں، کیونکہ اپنی کتاب کے اندر اس نے واضح کر دیا کہ مؤمن آخر کار جنت میں جائے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ گناہ گار بھی ہوگا تو بھی جائے گا، جیسے حدیثِ شفاعت میں تفصیل آئی ہے، روایات کے اندر واضح طور پر یہ بات مذکور ہے کہ باقی گناہ جتنے ہیں وہ سارے کے سارے سزا کے بعد بالیقین بخشے جائیں گے، اور مؤمن آخر کار جنت میں جائے گا چاہے کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اور بغیر سزا کے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید کی جاسکتی ہے، اور کسی کی سفارش سے یا کسی نیکی کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہ معاف کر دیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ اور جو کوئی شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس تحقیق وہ بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔

مشرکین اپنے معبودوں کی شکل عورتوں جیسی کیوں بناتے تھے؟

آگے اسی شرک کی قباحت ہے، شرک کی قباحت کو آپ اس طرح سمجھیں کہ مشرک قومیں جتنی گزری ہیں ان میں اکثر وبیشتر جو معبود اختیار کئے گئے ان کو وہ عورتوں کی شکل پر بناتے تھے، اور عورتوں کی شکل پر بنانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ فرشتوں کو لڑکیاں قرار دیتے تھے اور فرشتوں کی مناسبت سے بعض بت تراشتے تھے۔ فرشتوں کو لڑکیاں قرار دینے کا ذکر قرآنِ کریم میں کئی دفعہ آیا ہے: وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (سورۂ زخرف:۱۹) فرشتوں کو جو کہ اللہ کے بندے ہیں انہوں نے لڑکیاں قرار دے دیا۔ اور دُوسری جگہ ہے: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (سورۂ نجم:۲۱) کیا تم اپنے لئے تو لڑکے تجویز کرتے ہو اور اللہ کے لئے لڑکیاں تجویز کرتے ہو؟ تو چونکہ ان کو لڑکیاں قرار دیتے تھے تو اکثر وبیشتر بت بھی لڑکیوں کے شکل پر بناتے تھے، جنہیں ''دیویاں'' کہا جاتا ہے، مثلاً عزّیٰ مؤنث کا صیغہ ہے، اَعَزّ کا مؤنث ہے، تو یہ بھی عورت کی شکل پر تھا، اس کو عورت ہی سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جاتا تھا، اسی طرح ''منات'' اور ''لات''، اگرچہ ان کی تفاسیر مختلف کی گئی ہیں لیکن یہ بھی کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ یہ مؤنث کے صیغے ہیں اور ان کو بھی مؤنث سمجھ کر ان کے اُوپر ویسے ہی زیورات چڑھاتے تھے اور ویسے ہی زیب وزینت کرتے تھے۔ اور یہاں مشرکینِ ہند، ہندوستان کے مشرک، ہندو، ان کے بت خانوں میں جا کر ان کے بتوں کو دیکھو گے تو وہ بھی اکثر وبیشتر عورتوں کی شکل پر ہوتے ہیں، چاہے مردوں کی شکل پر بھی ہوتے ہیں، لیکن عورتوں کی شکل پر ہونا اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرک ''عورت'' کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرائے بیٹھا ہے، حالانکہ عورت ہر لحاظ سے، اپنی اِستعداد کے لحاظ سے، اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے مردوں کے مقابلے میں کمزور ترین مخلوق ہے، عقل کے اعتبار سے بھی کمزور، اِستعداد کے اعتبار سے بھی کمزور، تو ایسی چیز کو اُٹھا کر اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا لینا، اس میں کتنی قباحت ہے کہ عقل بھی اس سے انکار کرتی ہے۔ اور پھر شرک جو بھی ہے وہ سارے کا سارا شیطان کی اتباع ہے، شیطانی طریقہ ہے، اس لئے اس کی قباحت یا شرک کا نسب نامہ یوں ظاہر کیا جارہا ہے کہ ''یہ لوگ نہیں پکارتے اللہ کے علاوہ مگر لڑکیوں کو، اور نہیں پکارتے مگر شیطانِ مَرید کو۔'' ''شیطانِ مَرید'' یعنی سرکش شیطان، سرکش شیطان کو پکارنا تو ہر صورت میں صادق آتا ہے، اور بعض بعض صورتوں میں ان کا پکارنا لڑکیوں کو بھی ہے، تو فی الجملہ چونکہ ان کے معبودین میں اِناث تھیں، اس

لئے ان کو قباحت کے طور پر یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، کہ ان کی عقل ماری گئی کہ اللہ تعالیٰ کے خلاف ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو ان کے مقابلے میں حسی طور پر بھی نازک مخلوق ہے، اور پھر سرکش شیطان کے پیچھے لگ کر اُس کے کہنے کی بنا پر شرک کرتے ہیں، اس لیے جب وہ غیر اللہ کو پکارتے ہیں تو یوں سمجھو کہ وہ شیطان کو پکارتے ہیں، اور یہ پکارنا اِستغاثہ کے طور پر ہے، مدد طلب کرنا، اُن کے سامنے دُعا کرنا، فریاد چاہنا، اور رحم کی اپیل کرنا، جس طرح مشرک غیر اللہ کو پکارا کرتا ہے یہ وہی دُعا ہے جو حقیقت کے اعتبار سے عبادت ہے۔

شیطان بنی آدم کا کھلا دُشمن ہے

شیطانِ مَرید کو پکارتے ہیں، اور شیطانِ مَرید لَعَنَهُ اللّٰهُ: اس کے اُوپر اللہ نے لعنت کی، گویا کہ وہ انسانیت کا دشمن بھی ہے، جیسے سورۂ اَعراف میں آپ کے سامنے تفصیل آئے گی، کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد فرشتوں کو، اور ساتھ ہی اس ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم دیا، جب یہ اکڑ گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ تُو سجدہ کیوں نہیں کرتا؟ تجھے کس چیز نے روکا سجدہ کرنے سے؟ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو اس نے آگے اپنی بڑائی جتائی تھی کہ میں اس سے اچھا ہوں، مجھے تُو نے آگ سے بنایا اور اِس کو تُو نے مٹی سے بنایا، جب اللہ تعالیٰ نے اس کو مَردود کر دیا، اور اس کے اُوپر لعنت کر دی تو پھر اس نے اللہ سے درخواست کی تھی کہ مجھے مہلت دے دے، لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (سورۂ اَعراف:۱۶) میں ان کے لئے تیرے صراطِ مستقیم پر بیٹھ جاؤں گا، جس طرح گھات لگا کر کوئی ڈاکو بیٹھا ہوا ہوتا ہے کہ جو صراطِ مستقیم پر چلے اسے ہلاک کر دیا جائے، اسے راستے سے بھٹکا دیا جائے، لُوٹ لیا جائے، میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا، ''سیدھے راستے'' سے توحید کا راستہ مُراد ہے، پھر میں ان کے آگے سے، پیچھے سے، دائیں طرف سے، بائیں طرف سے، ہر طرح سے میں ان کو بہکاؤں گا، اور بہکانے کے بعد اُس نے جو اندازہ لگایا تھا کہ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ: کہ ان بنی آدم میں سے اکثر و بیشتر کو تُو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا، وہ تیری نعمتوں کو تیرے شکر کے طور پر استعمال نہیں کریں گے، تیرا کھائیں گے لیکن تیرا گائیں گے نہیں، اکثر و بیشتر ایسے ہوں گے جو گمراہ ہو جائیں گے اور تُو ان کو شکر گزار نہیں پائے گا۔ اور پھر سورۂ سبا میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس بات کا اظہار کیا کہ: وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (آیت:۲۰) کہ عزازیل نے، شیطان نے اپنے گمان کو ان لوگوں کے بارے میں سچا کر دکھایا، اس کا گمان سچا ہو گیا جو اس نے کہا تھا کہ اکثر تیرے ناشکرے ہو جائیں گے، اب مؤمنین کا ایک گروہ بچا، باقی سارے کے سارے اس کے پیچھے لگ گئے۔ تو یہاں یہی ذکر کیا جا رہا ہے کہ یہ ملعون ہے اور انسان کا دشمن ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو پھٹکار دیا، اب جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وضاحت ہو جائے کہ فلاں راستہ رحمٰن کا ہے اور فلاں راستہ شیطان کا ہے، تو شیطان کے راستے کو اختیار کرنا اور رحمٰن کے راستے سے ہٹ جانا گویا کہ دوست کو چھوڑ کر دشمن کے پیچھے لگنا ہے۔ اور پھر اس دشمن سے خیر کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے، یہاں وہی اس کی دشمنی کا اظہار کیا جا رہا ہے،'' اس نے کہا تھا کہ میں ضرور لوں گا تیرے بندوں سے ایک متعین حصہ''،'' متعین حصہ'' طاعت کا مُراد ہے، کہ ان کے اندر جو طاعت کا جذبہ ہے اس میں سے ایک حصہ میں بھی وصول کروں گا کہ میری طاعت کریں گے، تیری نہیں کریں گے۔ وَلَاُضِلَّنَّهُمْ: اور میں انہیں عقائد کے درجے میں گمراہ کروں گا، یہ اِضلال عقیدے

کے درجے میں ہے، کہ ان کے عقائد خراب کروں گا، وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ: اور میں انہیں ہوسیں دلاؤں گا، غلط قسم کی اُمیدیں دلاؤں گا کہ شرک کرنے میں یہ فائدہ ہے، فلاں پیر کی قبر پر چڑھاوا چڑھا آؤ تو یہ فائدہ ہوتا ہے، فلاں جگہ جا کر سجدہ کرآؤ تو یوں ہوتا ہے، اس قسم کی ہوسیں اور اس قسم کی اُمیدیں اور اس قسم کی خواہشات دِلاؤں گا، وَلَاٰمُرَنَّهُمْ: اور میں انہیں حکم دُوں گا، حکم دینے کا مطلب ہے دِل میں وسوسہ ڈالنا، اِلقاء وسوسہ کے ساتھ دِل کے اندر جذبات پیدا کرنا، یہ سب اُمر کے درجے میں ہیں، فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ: یہ عملی زندگی تباہ ہوئی، میں ان کو حکم دُوں گا یعنی ان کے دل میں یہ بات ڈالوں گا، وہ غیراللہ کے نام پر جانور چھوڑیں گے اور علامت کے طور پر ان کے کان کاٹیں گے اور چیریں گے جیسے کہ تمام مشرکین کا یہ طریقہ ہے کہ اپنے معبودوں کے نام پر وہ جانور چھوڑتے ہیں تو علامت کے طور پر ان کے کان چھید دیتے ہیں، کوئی کاٹ دیتا ہے، کوئی اُس میں سوراخ کر دیتا ہے، یہ علامت ہوتی ہے کہ یہ کسی غیراللہ کے نام پر چھوڑا ہوا ہے۔ ''وہ جانوروں کے کان ضرور کاٹیں گے، چیریں گے۔''

''تغییرِ خلقِ اللہ'' کی مختلف صورتیں اوران کا حکم

''اور البتہ ضرور حکم دُوں گا میں انہیں پس وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتیں بگاڑیں گے'' اس کی تفصیل حدیث شریف میں بھی ذکر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس صورت پر بندے کو چاہتا ہے شیطان اُس کو بگاڑنے کی تلقین کرتا ہے، مثلاً ایک عورت کو اللہ نے عورت بنا دیا، اب وہ بہ تکلّف مَرد بننے کی کوشش کرے، یہ بھی شیطان کے حکم کے تحت تغییرِ خلقِ اللہ ہے۔ اور ایک مَرد کو اللہ نے مَرد بنا دیا، اب وہ بہ تکلّف عورت بننے کی کوشش کرے، تشبُّہ بالنساء پیدا ہو، اس لیے مُتَشَبِّهَات بِالرِّجَال اور مُتَشَبِّهِيْنَ بِالنِّسَاء کے اُوپر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی،[1] اور یہ بھی تغییرِ خلقِ اللہ ہے، اور اسی طرح بدن گندھوانے والے کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ بھی تغییرِ خلقِ اللہ ہے، یہ جو بدن کے اُوپر پھول بُوٹے نکلوایا کرتے ہیں جس میں رنگ بھرتے ہیں، اس کو عربی میں ''وَشم'' کہا جاتا ہے تو وَاشِمَات وشم کرنے والی عورتیں، مُسْتَوْشِمات وشم کروانے والی عورتیں، ان کو بھی حضور ﷺ نے ملعون ٹھہرایا، اور اسی طرح وہ عورتیں جو اپنے دانت گھسا گھسا کر یعنی زیب وزینت کے لئے ان کے درمیان میں فصل کر کے ایسی زیب وزینت حاصل کرتی ہیں، ان کو بھی حضور ﷺ نے خلق اللہ کے بدلنے والی ٹھہرایا۔[2] اور ''بیان القرآن'' میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ داڑھی منڈانا بھی اسی میں ہی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جس قسم کی شکل وصورت ہونی چاہیے، جو اُس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے وہ گویا کہ تغییرِ خلقِ اللہ کرتا ہے بأمرِ شیطانی۔ اور ایک تغیر ہم بھی کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت، مثال کے طور پر ختنہ کرتے ہیں تو وہاں بھی اصل شکل جو اللہ نے بنائی ہے اس کو بدلتے ہیں، اسی طرح ناخن کاٹتے ہیں، لبیں کٹواتے ہیں، سَر کے بال منڈواتے ہیں، بغلیں ترشواتے ہیں، اس قسم کی تغییر چونکہ اُمر اللہ کے تحت ہے اس لئے یہ مذموم نہیں ہے۔ تو حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے خلاف شکل وصورت کے اندر جو تغیّر کیا جائے گا وہ سارے کا سارا تغییرِ خلقِ اللہ میں شامل ہے، داڑھی

---

(۱) بخاری ۲/ ۸۷۴ باب المتشبهون بالنساء/ مشکوۃ ج ۲ ص ۳۸۰ باب الترجل، فصل اول۔

(۲) بخاری ۲/ ۸۷۸ باب المتفلجات/ مشکوۃ ۲/ ۳۸۱ باب الترجل، فصل اول۔

منڈوانے کا ذکر یہاں حضرت تھانوی ؒ نے کیا، اور ''بیان القرآن'' میں اسی جگہ صراحت کی ہے کہ مٹھی سے زائد کٹوانا عنت ہے، پھر مؤکد ہے یا غیر مؤکد؟ کہتے ہیں کہ یہ نظر سے نہیں گزرا، ''بیان القرآن'' میں یہ صراحت ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے داڑھی کے بارے میں جو صیغے آئے ہیں، وہ تقاضا یہی کرتے ہیں کہ اس کو بڑھایا جائے، لیکن دوسری روایات میں خود حضور ﷺ کا بھی طول اور عرض سے داڑھی کو کٹوانے کا ذکر آتا ہے،[1] اور خاص طور پر بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کا اثر آتا ہے کہ وہ جب حج یا عمرہ کیا کرتے تھے تو سر کو منڈاتے تھے، اور داڑھی جو قبضہ سے زائد ہوتی اس کو کتروا دیا کرتے تھے،[2] جس کی بنا پر احناف ؒ کے تینوں اماموں کا قول یہی نقل کیا ہے، حضرت ابوحنیفہ ؓ کا بھی اور حضرت ابویوسف ؓ کا اور امام محمد ؓ کا، ''ہدایہ'' کی شرح ''عنایہ'' کے اندر یہ قول مذکور ہے،[3] کہ ان تینوں کے نزدیک کٹوانا بہتر ہے بڑھانے کے مقابلے میں، یعنی چار انگشت سے اور قبضے سے جو زائد ہو اُس کو کٹوانا بہتر ہے، اس لئے ہمارے حضرات اکثر و بیشتر کٹواتے ہی ہیں، اور اگر کوئی نہ کٹوائے اور اسی طرح سے چھوڑ دے، جس طرح سے جا رہی ہے جانے دے، بعض علماء کے نزدیک یہ بھی مستحب ہے، اور جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور چار انگشت سے کم جو کٹواتا ہے یہ بالاتفاق فسق اور حرام ہے، چار انگشت سے چھوٹی رکھنا یعنی کاٹ کاٹ کر اُس کو چھوٹا کر لینا جائز نہیں، البتہ جو چار انگشت سے زائد ہو جائے اُس کا کاٹنا ٹھیک ہے، پھر بعض کے نزدیک کاٹنا افضل ہے اور بعض کے نزدیک نہ کاٹنا افضل ہے۔ اور اسی طرح لبوں (مونچھوں) کا کٹوانا اتنا ضروری ہے کہ ہونٹ کا کنارہ ننگا ہو، اتنے بال نہ ہوں کہ کنگھی کریں تو ہونٹ کا کنارہ چھپ جائے، کیونکہ یہ غلط ہے، البتہ اتنی کاٹ لی جائیں کہ ہونٹ کا کنارہ ننگا رہے، پھر چاہے وہ ابرو کی شکل میں ہو جائیں تو اس کا بھی جواز ہے، لیکن افضل یہ قرار دیا گیا ہے کہ اتنا رگڑ کر ان کو کاٹا جائے کہ چمڑے کا رنگ نظر آجائے، اور اگر کوئی اس سے زائد رکھتا ہے جس طرح آنکھ کے اُوپر ابرو ہے تو یہ بھی درست ہے، اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اَحناف کے نزدیک افضل یہ قرار دیا گیا ہے کہ ان کو اس طرح سے رگڑ کر کاٹا جائے کہ چمڑے کا رنگ نظر آنے لگ جائے، البتہ حلق کی بھی اجازت ہے لیکن اس کی بجائے قینچی سے کاٹنا زیادہ بہتر ہے۔ تو یہ تغییر جو ہم کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے تحت ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو شکل و صورت شریعت کے اَحکام کے مطابق بنائی جائے یہ اللہ تعالیٰ کی محبوب صورت ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب اور محبوب صورت وہی ہے جو اَحکامِ شریعت کے مطابق ہو، اس کے خلاف اگر کوئی شکل و صورت بنانا چاہتا ہے تو وہ شیطانی تغییرِ خلق اللہ ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو، یا اللہ تعالیٰ کی مرغوب صورت کو شیطانی حکم کے تحت بدلتا ہے، تو یہ بھی شیطان کی اطاعت ہے جس کا دعویٰ اُس نے کیا تھا کہ میں لوگوں سے کہوں گا وہ تیری محبوب صورتوں اور تیری بنائی ہوئی شکلوں کو بدلیں گے اور ان میں گڑبڑ کریں گے، تو ایسی تغییر جو کہ شریعت کی نظر میں حُسن کو لئے ہوئے ہے، وہ جائز ہے، یا اسی طرح اس میں نہ حسن ہو نہ قبح ہو تو ایسی تغییر بھی جائز ہے، جس طرح بعض فوائد کے تحت جانوروں کو خصی کر دیا جاتا ہے، یہ بھی تو اسی تغییر میں داخل ہے

(۱) ترمذی ۲/ ۱۰۵ باب ما جاء فی الاخذ من اللحیۃ۔

(۲) بخاری ج ۲ ص ۸۷۵ باب تقلیم الاظفار۔

(۳) العنایۃ ج ۲ ص ۳۴۷ کتاب الصوم، باب ما یوجب القضاء والکفارۃ۔

لیکن ایسے فوائد کے تحت ہے جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ بہرحال! داڑھی کٹوانے اور منڈوانے کا ذکر بھی مفسرین نے یہاں فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللہِ کے تحت کیا ہے، اور مردوں کا عورتوں کے ساتھ تشبہ پیدا کرنا، عورتوں کا مردوں کے ساتھ تشبہ پیدا کرنا، اور اس قسم کے شکل وصورت میں دیگر تصرفات جو شریعت کے خلاف ہیں وہ سب تغییر میں شامل ہیں۔

شیطان کے متبعین کا انجام

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللہِ: اور جو کوئی شیطان کو دوست بنائے اللہ کو چھوڑ کر، فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا: پس تحقیق وہ صریح خسارے میں جا پڑا، خسارے میں اس لیے جا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی بجائے شیطان کی اطاعت کرلی، یہ بھی اپنے آپ کو ذلیل کرنے والی بات ہے، اور آخرت تو برباد ہو ہی گئی۔ يَعِدُهُمْ: شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اور انہیں خواہشیں دلاتا ہے، ہوسیں دلاتا ہے، اور نہیں وعدے کرتا ان سے شیطان مگر دھوکے کے، اس کے وعدے جتنے بھی ہیں سب دھوکا ہی دھوکا ہیں۔ انہیں تلقین کرتا ہے کہ یوں کرلو گے تو یہ فائدہ ہوگا، یہ کرلو گے تو یہ ہوگا، اور ہوسیں دلاتا ہے کہ آخرت تو ہے نہیں، مرنے کے بعد اٹھنا تو ہے نہیں، اس لئے دُنیا میں جو کچھ مزے اُڑانے ہیں اُڑالو، یا اگر آخرت کا عقیدہ سامنے ہوتا بھی ہے تو یوں کہتا ہے کہ فلاں کی معرفت بچ جاؤ گے، تم تو فلاں سے تعلق رکھنے والے ہو، تمہیں اللہ چھوڑ دے گا، فلاں کی اولاد ہو، اس قسم کی خواہشات میں مبتلا کرکے زندگی کو برباد کردیتا ہے، تو یہ لوگ جو شیطان کے چکر میں آجاتے ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا: اور اس سے ہٹنے کی جگہ نہیں پائیں گے۔

مؤمنین کا انجام

اس کے بالمقابل اب دوسروں کا ذکر آگیا، جیسے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا طرز یہی ہے کہ جب کُفار کا ذکر آتا ہے تو مقابلے میں مؤمنین کا ذکر بھی آجاتا ہے، اور مؤمنین کا ذکر آتا ہے تو مقابلے میں کُفار کا ذکر بھی آتا ہے، جزا کے بعد سزا اور سزا کے بعد جزا، یہ باتیں آجاتی ہیں، "بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ" کہ اَضداد کے سامنے آنے کے ساتھ ہی چیزیں واضح ہوا کرتی ہیں، تو جب یہ دونوں طریقے سامنے رکھ کر چلو گے تو پھر کامیابی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں عنقریب داخل کریں گے ہم انہیں باغات میں، جاری ہیں ان کے نیچے سے نہریں خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وَعْدَ اللہِ حَقًّا: اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، وَعَدَ اللہُ وَعْدًا حَقًّا، جیسے پیچھے آیا ہے مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا: شیطان کے وعدے تو دھوکا ہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جو وعدہ کررہا ہے بالکل صحیح اور بالکل واقع کے مطابق ہے، "اور اللہ کے مقابلے میں بات کے اعتبار سے کون زیادہ سچا ہوسکتا ہے؟"

عمل اور عقائد کو صحیح کرنے کی ترغیب

آگے وہی عمل کی اور عقائد کے صحیح کرنے کی ترغیب ہے کہ مشرکین نے جس قسم کی خواہشات لگا رکھی ہیں کہ فلاں ہمیں

چھڑالے گا، فلاں سے ہمارا تعلق ہے، فلاں ہماری سفارش کردے گا، اہلِ کتاب نے اسی طرح سے اُمیدیں لگا رکھی تھیں کہ ہم اولیاء اللہ کی اولاد ہیں، انبیاء کی اولاد ہیں، ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں، اوّل تو ہم جہنم میں جائیں گے ہی نہیں، اگر گئے بھی تو چندروز کے لئے جائیں گے، جیسے ایک جگہ ہے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ: ۱۸) اس زعم کے اندر وہ مبتلا تھے جس کی بناء پر وہ بدعملی میں دلیر ہوگئے تھے، اور عیسائیوں نے بھی اس قسم کے عقیدے تراش کرلئے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نعوذ باللہ! اللہ کے بیٹے ہیں، اور وہ اپنی اُمت کی طرف سے سُولی چڑھ گئے، اس لئے ان کی اُمت کوئی کام کرتی رہے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں آئے گی، عیسیٰ علیہ السلام سب کا کفارہ ہوگئے، تو جب عیسیٰ علیہ السلام کی سُولی کو اُمت کی طرف سے سب کے گناہوں کا کفارہ بنادیا گیا (کرے کوئی اور بھرے کوئی کے اُصول کے تحت، کہ گناہ اُمت کرے گی اور کفارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سُولی پہ چڑھ کردے دیا) تو ایسے وقت میں پھر ان کی اُمت نیکی کی کیا قدر کرے گی؟ اور نیک ہونے کی کیا کوشش کرے گی؟ اسی کی تردید یہاں کی جارہی ہے کہ کسی کی خواہشات پر دارومدار نہیں ہے، نہ تو تمہاری خواہشات پر مدار ہے، نہ اہلِ کتاب کی خواہشات پر مدار ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو ضابطہ یہ ہے کہ جو بھی کوئی بُرا کام کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

مصائبِ مؤمن کے لئے کفّارۂ سیئات کا سبب بنتے ہیں

سُوْٓءًا نکرہ آگیا، کوئی کسی قسم کا بُرا کام کرے گا یُجْزَبِهٖ: تو اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس آیت پر صحابہ رضی اللہ عنہم کچھ پریشان ہوئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر آیا کہ یارسول اللہ! اگر ہر بُرے کام کا بدلہ ملنے لگ گیا تو بچے گا کون؟ کون شخص ایسا ہے جس سے کسی نہ کسی درجے میں سوء کا ارتکاب نہیں ہوتا، چونکہ سُوْٓءًا یہاں نکرہ آگیا، کہ جو شخص بھی کسی قسم کی کوئی بُرائی کرے گا یُجْزَبِهٖ تو اُس کا بدلہ دیا جائے گا، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بات تو اسی طرح ہے کہ سوء کا بدلہ دیا جائے گا لیکن اس بدلے سے یہی مراد نہیں کہ آخرت میں جہنم میں ڈالے جائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو دُنیا کے اندر جو تکلیفیں پہنچاتا ہے وہ بھی ایک قسم کا سوء کا بدلہ ہوتا ہے،[1] اور ان تکلیفوں کی وجہ سے اُن کے سارے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، کسی کو کوئی ٹھوکر لگ گئی، کسی کو کوئی کانٹا لگ گیا، کوئی پریشانی ہوگئی، تو اُس کی برکت سے یہ سارے کے سارے سیئات معاف کردیئے جاتے ہیں، اس لیے دُنیا کی تکلیفیں بھی مؤمن کے لئے ایک قسم کی سوء کی جزا ہے، جس کے بعد وہ سیئات معاف ہوجائیں گے، آخرت میں کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی، یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی جیب میں ایک چیز رکھ کر بھول گیا کہ کہاں رکھی ہے، تھوڑی دیر تلاش کی، پریشان ہوا، بعد میں دیکھا تو جیب میں ہی تھی، اتنی سی پریشانی بھی اگر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں بھی گناہ معاف فرماتے ہیں، تو مؤمن کے لئے گویا کہ جزاءِ سوء اس دُنیا میں ہوجاتا ہے، یہ چھوٹی موٹی پریشانیاں، جیسے کوئی پھوڑا نکل آیا، کوئی زخم ہوگیا، بخار ہوگیا، یہ ساری کی ساری چیزیں سیئات کے کفارے کا باعث بنتی ہیں، وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: اور نہیں پائے گا وہ شخص یعنی بُرا کام کرنے والا اگر اللہ کی گرفت میں آجائے تو کسی کو ولی اور نصیر نہیں پائے گا، نہ اُس کا کوئی حمایتی ہوگا اور نہ اُس کا کوئی مددگار ہوگا۔

---

(۱) دیکھئے: مسند احمد، رقم الحدیث: ۷۳۸۶-۲۲۳۶۸- وغیرہ/سنن ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ نساء/مشکوۃ باب عیادۃ المریض فصل ثانی۔

اللہ کی طرف سے صورۃً بھی ظلم نہیں ہوگا

اور جو کوئی نیک کام کرے پھر ضابطہ عام ہے کہ مرد ہو یا عورت ہو مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى اس میں کسی تخصیص نہیں، کہ مرد کے لئے جزا اور، اور عورت کے لئے جزا اور، ایسا نہیں، بلکہ اس بارے میں دونوں برابر ہیں، مرد ہو یا عورت ہو جو نیک کام کرے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ اُس کے پاس ایمان ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر تو کوئی عمل قبول ہی نہیں، وَهُوَ مُؤْمِنٌ یہ حال واقع ہو رہا ہے لیکن یہاں مقامِ شرط میں ہے فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ: پس یہی لوگ ہیں جو جنّت میں داخل ہوں گے، اور کچھ بھی ظلم نہیں کئے جائیں گے، یعنی ان کی کوئی نیکی برباد نہیں کی جائے گی، کیونکہ ظلم کا مطلب یہ ہے، اگرچہ اس کی نسبت جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے یہ صورۃً ہے، ورنہ حقیقتاً ظلم نہیں، کیونکہ ظلم یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی غیر کی ملک کے اندر اُس کی مرضی کے خلاف تصرف کرے، اس کو ظلم کہتے ہیں، یعنی دوسرے کی حق تلفی، کہ چیز دوسرے کی تھی اور آپ نے اس سے پوچھے بغیر اُس میں تصرف کر لیا، اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر کسی صورت میں صادق نہیں آسکتی، یہاں تو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے، اس لئے ساری کی ساری مخلوق کو اُٹھا کر جہنّم میں پھینک دے تو بھی وہ ظالم نہیں، اور جو معاملہ اور جو تصرف بھی کرے گا اُس کی اپنی ملکیت میں ہوگا، کون پوچھنے والا ہے، لیکن صورۃً ظلم یہ ہے کہ ایک آدمی نے گناہ نہیں کیا اور سزا دے دی جائے، یا نیکی کی تھی اور اُس کے اُوپر بدلہ نہ دیا جائے بلکہ اُس کو برباد کر دیا جائے، تو یہاں صورۃً ظلم کی نفی ہے کہ ان کے اُوپر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا، اس لئے جو نیکی ہوگی اس کا بدلہ چکایا جائے گا، کچھ بھی ظلم نہیں کئے جائیں گے۔

اللہ کے پسندیدہ بندے اور اِحسان کا مفہوم

کون اچھا ہے از روئے دِین کے اس شخص سے جس نے اپنے چہرے کو اللہ کے سپرد کر دیا، اللہ کا مطیع ہو گیا، وَهُوَ مُحْسِنٌ: اور ہر کام کو اچھی طرح سے کرنے لگ گیا، یہ جو فرمایا کہ اپنی ذات کو اللہ کے تابع کر دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ فرمانبرداری اختیار کر لی، دل سے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، اور پھر کام کرتے وقت احسان کی رعایت رکھی، ہر کام کو اچھی طرح سے کیا، ہر کام کو اچھی طرح سے کرنے کا یہ معنی بھی ہے کہ دل میں خلوص ہے اور ظاہری طور پر وہ کام سُنّت کے مطابق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کون سا کام پسند ہے اور کون سا کام پسند نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس کام میں حسن ہے اور کس کام میں حسن نہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی عقل کے ساتھ اس کو دریافت نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کی ذات تو بہت وراء الوریٰ ہے، ہم آپس میں ایک دوسرے کی مشیت اور منشا کو معلوم نہیں کر سکتے، کہ میری خواہش اِس وقت کیا ہے، میں کیا چاہتا ہوں؟ ایک مہمان آپ کے پاس آتا ہے، اور وہ آپ کا رشتہ دار ہوتا ہے، قریبی ہوتا ہے، ملنے جلنے والا ہوتا ہے، آپ کو اُس سے پوچھنا پڑتا ہے کہ ٹھنڈا پسند فرمائیں گے یا گرم؟ بھائی ہونے کے باوجود کسی وقت آپ چائے بنا کر لے آئیں اور اُس کی طبیعت ٹھنڈے کو چاہتی ہو، اور آپ لسی بنا کر لے آئیں اور اُس کی طبیعت گرم کو چاہتی ہو، ایسا ہوتا رہتا ہے، تو جب تم اپنے ہم جنس کی خواہش کو بھی بغیر اُس سے پوچھے معلوم نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ

جس تک عقل کی رسائی نہیں اُس کی منشا کو اور اُس کی مشیت کو بغیر اُس سے پوچھے کیسے دریافت کیا جا سکتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ جو بتائے گا وہی اُس کے نزدیک پسندیدہ ہے، ہم اس میں اپنی طرف سے نہ کمی کر سکتے ہیں نہ بیشی۔ تو احسان کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اُس کی عبادت کی جائے، اس لئے اس کا احسن عنوان ہے ''اِتباعِ سُنّت'' کہ وہ شخص اُصولاً فرمانبردار ہو جائے، اور کام کرتے وقت اِتباعِ سُنّت کی رعایت رکھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول عمل وہی ہے جو اُس نے اپنے نبی کی زبان سے ہمیں سمجھا دیا کہ میں اس قسم کا کام چاہتا ہوں تو ویسے کرو، اور اگر تم نے اپنی طرف سے حاشیہ آرائی کرنی شروع کر دی تو اپنے خیال کے مطابق تم اچھا کام کرنے والے ہو گے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اُس کو بگاڑ کر رکھ دو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پسند اور ناپسند کا علم پیغمبر کی زبان سے ہی ہوتا ہے، تو محسن کا معنی یہ ہوگا کہ ہر کام کرتے وقت اس میں حسن کی رعایت رکھتے ہیں، اور حسن کی رعایت اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جس طرح ہمیں سمجھایا کہ مجھے کام ایسا پسند ہے تو ویسے ہی کرو گے تو گویا کہ اُس کام کے اندر آپ نے حُسن کی رعایت رکھی۔ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا: اور اُس نے اتباع کی ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کی جو کہ حنیف تھا، حنیف کا معنی ہے کہ جو اَدیانِ باطلہ سے ہٹ کر ایک طرف متوجہ ہونے والا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ اس سے اچھا کوئی نہیں، یعنی سب سے اچھا اسی کا طریقہ ہے جو اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور ہر کام کو کرتے وقت اُس میں حسن کی رعایت رکھے اور ملّتِ ابراہیمی کا متبع ہو۔ ''ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا'' جب ابراہیم خلیل اللہ ہیں، اللہ کے خلیل ہیں، تو جو ان کے طریقے پر چلنے والا ہوگا وہ بھی اللہ کا دوست بن جائے گا، اسی خلیل کا طریقہ ہی اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى
آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں عورتوں کے بارے میں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان کے بارے میں، اور جو
عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ
آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں کتاب میں ان یتیم بچیوں کے بارے میں کہ نہیں دیتے ہو تم انہیں
مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
وہ چیز جو ان کے لئے لکھی گئی ہے اور رغبت کرتے ہو تم ان کے نکاح میں اور (جو آیات پڑھی جاتی ہیں) کمزور بچوں کے بارے میں

الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ

اور اِس بارے میں کہ تم انصاف قائم کرو یتیموں کے لئے، اور جو بھی تم اچھا کام کروگے پس بے شک

اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ

اللہ تعالیٰ اُس کو جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اگر کوئی عورت اندیشہ کرے اپنے خاوند کی طرف سے ناموافقت کا یا

اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ

بےرُخی کا تو زوجین پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں کوئی صلح کر لیا کریں، اور صلح کرنا ہی بہتر ہے،

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

حاضر کیے گئے ہیں نفس بخل پر، اگر تم اچھا برتاؤ کرو اور تقویٰ اختیار کرو پس بے شک اللہ تعالیٰ

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ

تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھو گے کہ برابری کرو تم

النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا

عورتوں کے درمیان اگرچہ تم حرص ہی کرو، پس نہ جھک جایا کرو پوری طرح سے جھکنا، کہ چھوڑ دو تم دوسری عورت

كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

کو لٹکی ہوئی چیز کی طرح، اگر تم حالات کو سنوار و گے اور تقویٰ اختیار کرو گے پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۹﴾

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا

اگر زوجین آپس میں جدائی اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ بے نیاز کردے گا ہر کسی کو اپنی وسعت سے، اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے

حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا

حکمت والا ہے ﴿۱۳۰﴾ اور اللہ ہی کے لئے ہے وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، البتہ تحقیق وصیت کی ہم نے

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ

ان لوگوں کو جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے اور تمہیں بھی، کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اور اگر

تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

تم ناشکری کرو گے پس بے شک اللہ ہی کے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ

غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى

بے نیاز ہے تعریف کیا ہوا ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ

بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ

کارساز کافی ہے ﴿۱۳۲﴾ اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور دوسروں کو لے آئے

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا

اور اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۳۳﴾ جو شخص ارادہ کرے دُنیا کے بدلے کا

فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

تو اللہ کے پاس ہی ہے دُنیا کا بدلہ اور آخرت کا بدلہ، اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے ﴿۱۳۴﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

اے ایمان والو! ہو جاؤ تم انصاف کو قائم رکھنے والے، اللہ کے لئے گواہی دینے والے،

وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا

اگرچہ اپنے نفسوں کے یا والدین کے اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی ہو، اگر وہ شخص مال دار ہے

اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ

یا فقیر ہے تو اللہ ان کے ساتھ زیادہ تعلق رکھنے والا ہے، پس تم خواہشات کے پیچھے نہ لگو، ایسا نہ ہو کہ تم انصاف نہ کرو

وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

اگر تم اپنی زبانوں کو موڑو گے یا گواہی دینے سے اعراض کرو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۳۵﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ: اِستفتاء: فتویٰ پوچھنا، حکم شرعی معلوم کرنا۔ آپ سے حکم دریافت

کرتے ہیں عورتوں کے بارے میں، قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے، یعنی اللہ تمہیں حکم شرعی بتلاتا ہے۔ أَفْتٰى إِفْتَاءً: حکم شرعی بتلانا، ''مفتی'' کا لفظ اسی سے لیا گیا ہے، اور ''مستفتی'' اِستفتاء سے ہے، ''اللہ تعالیٰ تمہیں فتویٰ دیتا ہے اِن عورتوں کے بارے میں'' وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ: اس کا عطف ہے اللّٰهُ پر، اور جو آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں کتاب میں وہ بھی تمہیں فتویٰ دیتی ہیں، وہ بھی تمہارے سامنے حکم شرعی ظاہر کرتی ہیں، ''اللہ فتویٰ دیتا ہے اور وہ آیات فتویٰ دیتی ہیں'' تو مطلب یہ ہوا کہ اُن آیات میں جو فتویٰ تمہیں دیا جارہا ہے اور جو حکم بتایا جارہا ہے وہ بھی اللہ کا فتویٰ ہے، ''جو آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں کتاب میں'' فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ: یتیم بچیوں کے بارے میں، الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ: ایسی یتیم بچیاں کہ نہیں دیتے ہو تم انہیں وہ چیز جو ان کے لئے لکھی گئی ہے، جو اُن کے لئے فرض کی گئی ہے، وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ: اور رغبت کرتے ہو تم اُن کے نکاح میں۔ رَغِبَ کا صلہ ''فی'' ہو تو اس میں شوق والا معنی ہوتا ہے، ''اُن عورتوں سے نکاح کرنے میں تم رغبت کرتے ہو''۔ اور رَغِبَ کا صلہ ''عَن'' آجائے تو اس میں اِعراض والا معنی ہوتا ہے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ: اور جو آیات پڑھی جاتی ہیں کمزور بچوں کے بارے میں۔ مِنَ الْوِلْدَانِ یہ مستضعفین کا بیان ہے۔ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ: جو آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں اس بارے میں کہ تم قائم ہو جاؤ یتیموں کے لئے انصاف کے ساتھ، تم انصاف قائم کرو یتیموں کے لئے، وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ: اور جو بھی تم اچھا کام کرو گے فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے۔ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا: اگر کوئی عورت اندیشہ کرے اپنے خاوند کی طرف سے ناموافقت کا۔ بَعل خاوند کو کہتے ہیں۔ نُشوز: ناموافقت۔ نُشوز عورت کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے اور مرد کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے۔ اَوْ اِعْرَاضًا: یا اندیشہ کرے وہ اپنے خاوند کی طرف سے بےرُخی کا، اعراض کا، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ: تو زوجین پر کوئی گناہ نہیں، اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا: کہ وہ آپس میں کوئی صلح کرلیا کریں، وَالصُّلْحُ خَيْرٌ: اور صلح کرنا ہی بہتر ہے، وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ: شُح کا لفظ بخل کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور حرص کے لئے بھی بولا جاتا ہے، مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر:۹، التغابن:۱۶) بخل اور حرص دونوں کی بنیاد ایک ہے یعنی حُبِ مال، اس اعتبار سے کہ آیا ہوا مال جائے نہیں یہ بخل ہے، اور اس اعتبار سے کہ زیادہ سے زیادہ آئے یہ حرص ہے، بنیاد دونوں کی حُبِ مال ہے۔ ''حاضر کیے گئے ہیں نفس بخل پر'' یعنی دلوں کے سامنے، نفسوں کے سامنے ''شُح'' موجود ہے، اَنفُس کے پاس ''شُح'' موجود ہے، یعنی دلوں کے اندر حرص اور بخل ہوتا ہی ہے، ''حاضر کیے گئے ہیں نفس شُح پر''۔ وَاِنْ تُحْسِنُوْا: اگر تم اچھا برتاؤ کرو، وَتَتَّقُوْا: اور تقویٰ اختیار کرو، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ یہ اِنْ کی جزا پر دال ہے، اگر تم اچھے کام کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں جزا دے گا، پس بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا: اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھو گے، اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ: عورتوں کے درمیان برابری کرنے کی، ہرگز طاقت نہیں رکھو گے تم کہ برابری کرو تم عورتوں کے درمیان، وَلَوْ حَرَصْتُمْ: اگرچہ تم طمع ہی کرو، اگرچہ تم برابری کی حرص ہی کرو، فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ: پس نہ جھک جایا کرو پوری طرح سے جھکنا، مائل نہ ہو جایا کرو پوری طرح سے مائل ہونا، ایک طرف کو ڈھلک نہ جایا کرو، فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ: اب جس وقت دو بیویاں ہوں گی اور ایک طرف میلان ہوگا تو وہ مُمال الیہا ہوگئی، اور جس سے میلان ہوگا، جدھر سے توجہ ہٹے گی وہ مُمال عنہا ہوگئی، تو ''ھا'' ضمیر اس عورت

کی طرف لوٹ رہی ہے جس سے رُخ بدل کر میلان دوسری کی طرف ہو گیا،'' پس چھوڑ دو تم اس عورت کو جس سے تم نے اعراض کر لیا، جس سے تم نے دوسری طرف میلان کر لیا، جس کی طرف سے تم دوسری عورت کی طرف پوری طرح ڈھلک گئے، چھوڑ دو تم اس عورت کو لٹکی ہوئی چیز کی طرح'' یعنی ایسے نہ کیا کرو کہ پورے جھک جاؤ اور پھر ایک عورت کو لٹکی ہوئی چھوڑ دو، وَاِنْ تُصْلِحُوْا: اگر تم حالات کو سنوارو گے وَتَتَّقُوْا: اور تقویٰ اختیار کرو گے، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا: اگر زوجین آپس میں جدائی اختیار کر لیں، يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ: تو اللہ تعالیٰ بے نیاز کر دے گا ہر کسی کو اپنی وسعت سے، اپنی وسعت کے سبب سے اللہ تعالیٰ دونوں میں سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا، وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِیْمًا: اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے حکمت والا ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: اور اللہ ہی کے لئے ہے وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے، وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ: البتہ تحقیق وصیت کی ہم نے ان لوگوں کو جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے وَاِیَّاكُمْ: اور تمہیں بھی، اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ: یہ وصیت کا بیان ہے، کہ اللہ سے ڈرتے رہو، وَاِنْ تَكْفُرُوْا: اور اگر تم ناشکری کرو گے، یا کفر کرو گے، اللہ کے اَحکام نہیں مانو گے، فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: جزاء یہاں محذوف ہے، پس بیشک اس میں اللہ کا کوئی نقصان نہیں، تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اگر تم کفر کرو گے تو اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، بیشک اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وَكَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًا: اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اچھی صفتوں کے ساتھ موصوف ہے۔ حمید محمود کے معنی میں ہے، صفتا یا ہوا ہے، تعریف کیا ہوا ہے، یعنی اس کے لئے اچھی صفتیں ثابت ہیں۔ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا: اور اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ: اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو!، اے لوگو! اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہیں لے جائے، وَيَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ: اور دوسروں کو لے آئے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِیْرًا: اور اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا: جو شخص ارادہ کرے دنیا کے بدلے کا، فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ: تو اللہ کے پاس ہی ہے دنیا کا بدلہ اور آخرت کا بدلہ، وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو!، كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ: ہو جاؤ تم قائم رکھنے والے انصاف کو، شُهَدَآءَ لِلّٰهِ: ہو جاؤ تم اللہ کے لئے گواہی دینے والے، وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ: اگرچہ اپنے نفسوں کے خلاف ہی ہو، اَوِ الْوَالِدَیْنِ: یا والدین کے خلاف ہو، وَالْاَقْرَبِیْنَ: اور قریبی رشتے داروں کے خلاف ہو، اِنْ يَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا: اگر وہ شخص جس کے خلاف تم گواہی دے رہے ہو غنی ہے، مالدار ہے یا فقیر ہے، فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا: اللہ اُن کے ساتھ زیادہ تعلق رکھنے والا ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى: پس تم خواہشات کے پیچھے نہ لگو، اَنْ تَعْدِلُوْا: لِئَلَّا تَعْدِلُوا، ایسا نہ ہو کہ تم انصاف نہ کرو، یا انصاف کرنے سے ہٹ کر تم خواہشات کے پیچھے نہ لگو، وَاِنْ تَلْوٗۤا: اگر تم اپنی زبانوں کو موڑو گے، کج ادائی کرو گے، اَوْ تُعْرِضُوْا: یا گواہی دینے سے اعراض کرو گے، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ نساء کی اِبتدا میں یتیم بچیوں، یتیم بچوں، اور عورتوں کے اَحکام کثرت کے ساتھ ذکر کیے گئے تھے، اُن آیات کے شانِ نزول میں آپ کے سامنے یہ ذکر کیا گیا تھا کہ عرب میں مختلف قسم کی بُری رسمیں جاری تھیں جن کی بناء پر وہ یتیم بچوں اور یتیم بچیوں پر بہت ظلم کرتے تھے، یتیم بچی کسی کی کفالت میں ہوتی اور وہ پسند ہوتی تو اُس سے نکاح کر لیتے، پھر اُس کا مہر اور نفقہ میں جو بیوی کا حقِ متعین ہے، وہ ادا نہ کرتے، یا اگر اُس کے بدصورت ہونے کی وجہ سے اُس کی طرف نکاح کی رغبت نہ ہوتی لیکن وہ صاحبِ جائیداد ہوتی اور اُس کے پاس کوئی مال ہوتا تو اُس کا کسی اور جگہ بھی نکاح نہ کرتے تاکہ وہ یہیں مرجائے اور ہم اُس کے مال کو سنبھال لیں، اسی طرح یتیم بچوں کا مال کھا جاتے تھے، عورتوں اور نابالغ بچوں کو وراثت نہیں دیتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ وراثت اُسی کا حق ہے جو تلوار اُٹھائے اور دشمن کے ساتھ لڑے، اور جو لڑتا نہیں ہے وہ وراثت کا حق دار نہیں ہے، اسی قسم کی رُسومِ قبیحہ تھیں اور اسی قسم کے بُرے رِواج تھے جو ظلم وستم پر مبنی تھے، اور ان کے اِزالے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وہ اَحکام نازل فرمائے تھے جن کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ نساء کی اِبتدا میں آئی تھی، یہ آیات بھی کچھ اُسی مضمون سے ہی متعلق ہیں۔

ابتدائی آیات کا شانِ نزول

حاصل اِن کا یہ ہے کہ چونکہ وہ اَحکام رِواج کے خلاف تھے، بقول بعض مفسرین کے لوگ یہ سمجھے کہ شاید یہ عارضی طور پر اَحکام دے دیئے گئے ہیں، کہ عورتوں کو بھی وِرثہ دیا کرو، بچوں کو بھی دیا کرو، اور ان عورتوں کے ساتھ نکاح کرو تو مہر بھی پورا ادا کرو، تو ہوسکتا ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ منسوخ کردیئے جائیں، اور جو پہلا رِواج تھا وہی بحال ہوجائے، اس لئے وہ کچھ ذہنی طور پر اس بارے میں متردّد سے تھے اور اس کے منسوخ ہونے کے اُمیدوار تھے، یا ایسے حالات پیش آگئے کہ بسا اوقات بہتر یہی ہوتا کہ متولّی ہی اُس یتیم بچی کے ساتھ نکاح کرے، کسی دوسری جگہ نکاح کرنا مصلحت کے خلاف ہوتا، جیسے پہلے سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے گزرا تھا کہ یتیم بچوں کا مال آپس میں خلط ملط کرنے سے روک دیا گیا، لوگوں نے علیحدہ کردیا، لیکن پھر مصلحت بعض اوقات یہی ہوتی کہ ان کے مال کو ساتھ خلط ملط کرلیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ تم اگر خلط ملط بھی کرکے رکھو تو کوئی بات نہیں وہ تمہارے بھائی ہیں، لیکن اصلاحِ احوال کی ہمیشہ کوشش کرتے رہو، وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرۃ: ۲۲۰) کہ مفسد اور مصلح کو اللہ تعالیٰ علیحدہ علیحدہ جانتے ہیں، اگر کوئی فسادِ نیت کے ساتھ خلط کرے گا، کہ اس کو یتیم کا مال کھانے کا بہانہ بنائے گا تو اُس کا بھی اللہ تعالیٰ کو علم ہے، اور جو اصلاح کے جذبے کے تحت ایسا کرے گا اُس کا بھی علم ہے، دونوں قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے عمل کے مطابق جزا دیں گے۔ تو اسی مسئلے میں حضور ﷺ کے سامنے یہ تذکرہ ہوا، ان عورتوں کے بارے میں اور یتیم بچیوں کے بارے میں پھر پوچھا گیا کہ ان کے ساتھ نکاح کرلیا کریں یا نہ کیا کریں؟ ان کا کیا حکم ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کے اندر اسی

حکم کی وضاحت فرمائی ہے جو سورۂ نساء کی اِبتدا میں گزراتھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اَحکام بحال ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا حکم ویسے ہی ہے جیسے پہلے تمہیں دے دیا گیا۔

آیاتِ بالا کی تقریر ''بیان القرآن'' کی روشنی میں

دوطرح سے ان آیات کی تقریر کی گئی ہے۔ ''بیان القرآن'' کے مطابق تو ان کی تقریر اس طرح ہے کہ یہ لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہ وہی احکام اس میں باقی ہیں یا اس میں کوئی تغیر وتبدل ہوگیا ہے؟ جیسے میں نے آپ کی خدمت میں شانِ نزول کے تحت بات عرض کی، تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان عورتوں کے بارے میں یعنی وہی جو پہلے دیا جاچکا، اور وہ آیات جو تم پر پڑھی جاتی ہیں وہ بھی تمہیں فتویٰ دیتی ہیں یعنی وہ آیات بھی غیر منسوخ ہیں، اُسی طرح بحال ہیں، وہ آیات جو پڑھی جاتی ہیں ان یتیم بچیوں کے بارے میں جن کو تم نہیں دیتے ہو مَا کُتِبَ لَهُنَّ: جو کچھ ان کے لئے لکھ دیا گیا، یعنی نکاح کرنے کی صورت میں تم ان کا نان نفقہ اور مہر اس انداز ے سے نہیں دیتے جس انداز ے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے لئے متعین کیا ہے، وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہاں رَغِبَ کا صلہ ''عن'' مان کر ترجمہ کیا ہے، یعنی نکاح کرنے کی صورت میں تم ان کو نان نفقہ نہیں دیتے، اور ان کے بدصورت ہونے کی صورت میں جس وقت کہ وہ بدصورت ہوں، بدشکل ہوں، خوبصورت نہ ہوں، تو تم ان کے نکاح سے اعراض کرتے ہو، اور ان کے اموال پر قابض ہوکر بیٹھے رہتے ہو،'' اور وہ آیات جو پڑھی جاتی ہیں کمزور بچوں کے بارے میں'' کمزور بچوں کا حکم آیا تھا کہ یتیم کے مال کا خیال کرو، یتیم کے مال کو کھایا نہ کرو، ان کے حقوق اس میں سے ادا کرتے رہو، جب بالغ ہوجائیں تو ان کے مال ان کے سپرد کردو،'' اور وہ آیات جو پڑھی جاتی ہیں اس بارے میں کہ تم یتیموں کے لئے انصاف کو قائم کرو'' وہ آیات بھی تمہیں فتویٰ دیتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان کا حکم اسی طرح بحال ہے وہ منسوخ نہیں ہیں،'' اور جو بھی نیکی کا کام کروگے پس بیشک اللہ تعالیٰ اسے جاننے والا ہے۔''

آیاتِ بالا کی تقریر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی قلم سے

اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے تقریر اس انداز کے ساتھ کی ہے کہ بعض مواقع میں مناسب یہی معلوم ہوا کہ متولی ہی لڑکی کے ساتھ نکاح کرے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال اُٹھایا گیا کہ ان لڑکیوں کے بارے میں کیا فتویٰ ہے اور کیا حکم ہے کہ ان سے نکاح کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں تمہیں اجازت دیتا ہے، کہ تم نکاح کرلیا کرو، یعنی نکاح کرنے کی اجازت ہے، جب مصلحت یہ ہو کہ یتیم بچی اپنے متولی کے ساتھ ہی نکاح کرلے تو ایسی صورت میں تم نکاح کرلیا کرو، اللہ تمہیں اجازت دیتا ہے،'' اور وہ آیات جو تم پر کتاب میں پڑھی جاتی ہیں'' وہ تو ان عورتوں کے بارے میں تھیں کہ جن کے تم حقوق ادا نہیں کرتے، جن کی تم رعایت نہیں رکھتے، نکاح کرنے کی طرف تمہیں رغبت ہوتی ہے لیکن نان نفقہ پوری طرح سے ادا نہیں کرتے، وہ تو ان عورتوں کے بارے میں تھیں، تو جہاں اس قسم کی بچیاں ہوں جن کے بارے میں کوتاہی کا اندیشہ ہے وہاں تو وہی آیات ہیں جو پہلی ہیں، اور جہاں اس قسم کی بچیاں ہوں کہ مصلحت یہی ہو کہ ان سے نکاح کیا جائے، اور تمہیں خیال ہے کہ ہم ان

کے حقوق ادا کریں گے تو وہاں تمہیں اجازت ہے، نکاح کرلیا کرو، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے آیات کی تقریر یوں ثابت ہوتی ہے۔ حاصل ایک ہی ہے کہ ظلم وستم سے روکنا مقصود ہے، اگر مصلحت ہو تو ان بچیوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ ان کے حقوق ادا کرو، اور اگر دل میں یہ اندیشہ ہو کہ اور کوئی ان کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا ہے نہیں، ہم ہی ان کے متولی ہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، یہ اندیشہ ہے کہ ایسی صورت میں ہم ان کے حقوق ادا نہیں کرسکیں گے، تو پھر نکاح نہ کیا کرو، بات دونوں طرح سے ہی صاف ہے۔

خاوند کے اِعراض کی صورت میں عورت کو ہدایات

وَ اِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِہَا نُشُوۡزًا : اصلاحِ زوجین کے ضابطے جس طرح پہلے آپ کے سامنے گزر چکے ہیں، تو اصلاحِ زوجین کے متعلق ہی یہاں کچھ نصیحتیں کی جارہی ہیں، ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے ناموافقت اور بے رُخی محسوس کرے، اور اُسے اندیشہ ہو کہ یہ مجھے چھوڑ دے گا، مجھے علیحدہ کردے گا، اور اس علیحدگی میں عورت نقصان محسوس کرتی ہے، مثلاً اُس کا کوئی اور متولی نہیں ہے، وہ بوڑھی ہوچکی ہے اور آئندہ کسی جگہ نکاح کی بھی توقع نہیں ہے، یا وہ صاحبِ اولاد ہے اور اُسے خیال ہے کہ اگر مجھے اُس نے چھوڑ دیا اور گھر سے نکال دیا تو میرے بچے برباد ہوجائیں گے، ایسی بیسیوں مصلحتیں ہوسکتی ہیں، خاوند کی طرف سے اگر نشوز پایا جائے اور بے رُخی کا اندیشہ ہو تو پھر اُس عورت کو چاہیے کہ ذرا نرمی برت کر صلح کرلے، نرمی برتنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے خاوند سے یہ کہے کہ میرے جو حقوق آپ کے ذمے ہیں میں ان کے اندر اتنی کمی کردیتی ہوں، آپ مجھے اتنا نفقہ دیتے ہیں، اتنا نہ دیا کرو بلکہ اتنا دے دیا کرو، یا میں اپنا مہر چھوڑتی ہوں، خاوند کو اس قسم کی مراعات دے کر صلح کرلیا کرو، صلح کرنا ہی بہتر ہے، نکاح ہوجانے کے بعد زوجین آپس میں جڑے رہیں بہتری اسی میں ہے، علیحدگی میں مختلف قسم کے فسادات ہوتے ہیں۔ اور دلوں کے اندر حرص تو ہے ہی، بخل تو ہے ہی، لہٰذا جس وقت وہ عورت اپنے حقوق چھوڑے گی اور خاوند سے بوجھ ہلکا کردے گی، تو خاوند یہ سمجھے گا کہ اب اس عورت کا مجھ پر کوئی بوجھ تو ہے نہیں، اور مفت میں ایک بیوی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے تو اس میں کیا حرج ہے، اس طرح آپس میں صلح ہوجائے گی، یوں اگر آپس میں ایک دوسرے کے حقوق میں رعایت دے کر مصالحت کرلی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مرد چونکہ خود مختار ہوتا ہے اور اُس کی طرف سے نشوز اور اِعراض پایا جائے تو چونکہ طلاق دے سکتا ہے، وہ طلاق دینے میں خودمختار اور مستقل ہے، اس لئے یہاں حقوق کی مراعات عورت کی طرف سے ہوگی۔ پہلے آپ کے سامنے آیا تھا کہ اگر عورتوں کی طرف سے نشوز کا اندیشہ ہو، اور وہ خاوند کی فرمانبردار نہ ہوں اور اُس کی حکومت کو اچھی طرح سے تسلیم نہ کرتی ہوں تو خاوند تو چونکہ حاکم ہے، اس نشوز کے ازالے کی یہ تدبیر بتائی گئی تھی کہ پہلے انہیں وعظ ونصیحت کرو، سمجھاؤ، ان کو نفع نقصان کا احساس دلاؤ، اور یہ بتاؤ کہ اس نشوز اور اعراض کا نتیجہ اچھا نہیں ہے، اور اس میں تم نقصان میں رہوگی۔ اگر وعظ ونصیحت کے ساتھ اچھی ہوجائیں تو ٹھیک، ورنہ پھر عملاً کچھ اِعراض کرو، قطعِ تعلق کردو، یہ بھی عورت کے لئے ایک ذہنی تنبیہ ہے، اس سے ٹھیک ہوجائیں تو بہتر، ورنہ پھر اس کے بعد کچھ تھوڑی سے ہاتھ کے ساتھ تنبیہ کرنے کی بھی اجازت تھی وَاضۡرِبُوۡہُنَّ (النساء: ۳۴)،

اور اگر اس طرح سے کچھ مار پٹائی کر کے، کچھ نصیحت کر کے، کچھ اعراض کر کے ان کا دماغ سیدھا ہو جائے تو پھر تم نبھا کیا کرو، پھر خواہ مخواہ ان کے اوپر الزام قائم کرنے کے لیے راستے نہ تلاش کیا کرو۔ بہر حال مرد چونکہ حاکم ہے اس لئے عورت کی طرف سے ناموافقت کے ازالے کے لئے وہ تدبیریں بتائی گئی تھیں کہ عورت اگر کجی اختیار کرتی ہے تو اس کو یوں سیدھا کرو، لیکن اگر کجی خاوند کی طرف سے ہو تو عورت تو یہ کام نہیں کر سکتی کہ وہ ڈنڈا اٹھا لے یا مار پٹائی کرے، کیونکہ پھر مرد عورت کو چھوڑنے میں بااختیار ہے، اس لیے ایسی صورت میں عورت کو کہا گیا ہے کہ تو کچھ اپنے مطالبے چھوڑ دے اور حقوق کے اندر اس کو رعایت دے دے، نرمی برت، اور اس طرح نرمی برت کر اگر آپس میں صلح کرلیں تو لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ: خاوند بیوی دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے، شرعاً اس کی اجازت ہے۔ جس طرح حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی بیوی تھیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے حضور ﷺ نے انہی کے ساتھ ہی نکاح کیا تھا، تو بعض روایات میں الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ حضور ﷺ نے سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا تھا، جب ان کو پتا چلا تو انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے طلاق نہ دیجئے، مجھے اپنی بیویوں میں رہنے دیجئے تا کہ آخرت میں میرا شمار آپ کی بیویوں میں ہو، باقی یہ ہے کہ میں اپنے حقوق چھوڑتی ہوں، اور اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کرتی ہوں۔[1] چنانچہ حضور ﷺ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس دو دو رات ٹھہرا کرتے تھے، اور باقی بیویوں کے پاس ایک ایک رات ٹھہرا کرتے تھے۔ تو یہ ہے صلح کا طریقہ کہ بیوی اپنے حقوق میں تخفیف کر دے، اور اپنے کسی حق کو چھوڑ دے۔

حقوق معاف کرنے کی تفصیل

لیکن اس حق کو چھوڑنے کے بعد پھر آگے فقہ کے اندر آپ تفصیل پڑھیں گے، کہ جو حق اس کا فی الحال ثابت ہے مثلاً مہر خاوند کے ذمے ہے، وہ اُس نے چھوڑ دیا، وہ تو بالکلیہ گر گیا، اب دوبارہ مطالبے کا حق نہیں ہے، مثلاً وہ کہتی ہے کہ ایک ہزار روپے میں نے آپ سے مہر کا لینا ہے میں وہ چھوڑتی ہوں، وہ مجھے نہ دو، لیکن مجھے طلاق بھی نہ دو، خاوند اس کو مان لیتا ہے تو مہر معاف ہو گیا، اب دوبارہ اس کے مطالبے کا حق نہیں ہے۔ اور بعض حقوق ایسے ہیں جو وقتاً فوقتاً ثابت ہوتے ہیں، مثلاً رات گزارنے کا حق ہے اور نفقے کا حق ہے، تو جو ماضی میں ثابت شدہ ہے وہ تو معاف ہو جائے گا، لیکن جو مستقبل میں ہے اُس کے مطالبہ کا حق عورت کو بحال رہتا ہے، اس لئے جب چاہے دوبارہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ میرا حق بحال کرو۔ مستقبل کا حق اِس وقت معاف کرنے سے ساقط نہیں ہوگا، جو ابھی ثابت نہیں ہوا وہ اس معاف کرنے سے ساقط نہیں ہوگا، البتہ مطالبہ نہ کرے تو اس کی مرضی، لیکن بعد میں اگر دوسرے وقت میں وہ مطالبہ کرے گی تو اس کا حق بحال ہے، اور خاوند کو وہ ادا کرنا پڑے گا۔ تو یہ ہے جو یہاں اصلاحی تدبیر بتائی گئی۔

مردوں کو عدل کا حکم اور عدل کی تفصیل

اور آگے مردوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ مردوں کو مردوں کی طرح وقت گزارنا چاہیے، عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں،

---

(۱) ترمذی ۲/۱۳۴، ابواب التفسیر سورۃ النساء/مشکوٰۃ ص ۲۷۹، ۲۸۰، باب القسم فصل ثالث۔

احسان کے ساتھ رہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کریں، اللہ تعالیٰ سب کے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے، اُس کے مطابق جزا دے گا، مرد کا حوصلہ بلند ہونا چاہیے، اس لئے عورت کی طرف سے اگر کوئی کی کوتاہی بھی ہو تو اُس کو درگزر کر دینا چاہیے، اور اُس کو برداشت کر لینا چاہیے، مردوں کو چاہیے کہ اِن کے ساتھ معاملہ اچھے انداز کے ساتھ کریں۔ چنانچہ آگے پھر مردوں کو تنبیہ ہے جیسے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا، کہ ایک سے زیادہ بیویاں اگر کسی کے پاس ہوں تو عدل کرنا فرض ہے، عدل کا معنی ہے برابری، اب برابری کے دو درجے ہیں، ایک ہے ظاہری حقوق میں اور ایک ہے باطنی تعلق میں، ظاہری حقوق تو یہ ہیں کہ نفقہ دونوں کو دو، جو شرعی طور پر دونوں کے لئے متعین ہے، آپ جانتے ہیں کہ نفقہ دینا انسان کے اختیار میں ہے، اگر آپ ایک کو دس روپے دیتے ہیں تو دوسری کو بھی دس روپے دے سکتے ہیں، ایک کو پچاس روپے ماہوار دیتے ہیں تو دوسری کو بھی پچاس روپے ماہوار دے سکتے ہیں، اور اگر آپ کے پاس پچاس روپے ہی دینے کی گنجائش ہے تو پچیس پچیس دونوں پر بانٹ سکتے ہیں، اسی طرح رات کو پاس رہنا، کہ ایک بیوی کے پاس جا کے رہ سکتے ہیں تو دوسری کے پاس بھی رہ سکتے ہیں، یہ حقوق اختیاری ہیں، ان میں کوئی کسی قسم کی مجبوری نہیں ہے، ظاہری عمل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، انسان ان پر بالکل قادر ہے کہ دونوں کے ساتھ برتاؤ یکساں کرے۔ اور ایک برتاؤ باطنی جذبات کے تحت ہے، یعنی باطنی عدل، کہ دونوں کے ساتھ محبت ایک جیسی رکھے، دونوں کے ساتھ نشاطِ طبع ایک جیسا ہو، یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ دل کا لگاؤ اختیاری نہیں، اس لئے ایک بیوی کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسری سے کم ہو ایسا ہو سکتا ہے، ایک بیوی کے پاس انسان جائے تو تعلق پیدا کرنے کا جذبہ ہو، مجامعت کا جذبہ ہو، طبیعت میں نشاط ہو، اور دوسری بیوی کے پاس جائے تو مجامعت کا جذبہ نہ ہو اور طبیعت متوجہ نہ ہو ایسا ہو سکتا ہے، یہ بسا اوقات اختیاری نہیں ہوتا، اس لیے ان حقوق میں برابری ضروری بھی نہیں، جو انسان کے اختیار میں نہیں ہے وہ ضروری بھی نہیں، اس لئے فقہ کے اندر آپ پڑھیں گے کہ عورت کو رات کے مقابلے میں رات دینا تو فرض ہے، کہ اگر ایک کے پاس جا کے رات کو لیٹے ہو تو دوسری رات دوسری کے پاس گزارو، لیکن مجامعت میں برابری ضروری نہیں، کہ اگر ایک کے ساتھ ہم بستری کی ہے تو دوسری کی ساتھ بھی ہم بستری کرو یہ کوئی ضروری نہیں، کیونکہ اس کا مدار نشاطِ طبع پر ہے، اور طبیعت میں کبھی نشاط ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا، کسی کی طرف توجہ کرنے سے طبیعت میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور کسی کی طرف توجہ کرنے سے یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا، یہ بسا اوقات اختیاری چیزیں نہیں ہوتیں، اس لیے ان میں عدل ضروری نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ یہاں یہی بات فرماتے ہیں کہ اگر تم یہ چاہو کہ عورتوں کے اندر بالکل برابری رکھو ظاہراً و باطناً، یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، تفصیل سے آپ سمجھ گئے کہ بس کی بات نہ ہونے کا تعلق باطنی جذبات کے ساتھ ہے، کہ تم بالکل ظاہر اور باطن کے اعتبار سے برابری نہیں رکھ سکتے، ہاں! یہ ضروری ہے کہ پورے کے پورے ایک طرف ہی نہ ڈھلک جایا کرو کہ ظاہری حقوق کی ادائیگی بھی بند کر دو، کہ جس کے ساتھ قلبی محبت ہے ظاہری حقوق بھی اسی کے ہی ادا کرو، ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ ظاہری حقوق ادا کرنا تمہارے بس میں ہے، اس میں ایک کو چھوڑنا اور دوسری کی طرف پورا متوجہ ہو جانا جائز نہیں، جس کی طرف تم ڈھلک جاؤ گے کہ دل کے ساتھ بھی محبت اسی سے لگا لی اور ظاہری حقوق بھی اسی کے ادا کرتے ہو، نان نفقہ بھی اسے ہی دیتے ہو، اور دوسرے بھی سارے معاملات اسی کے ساتھ ہیں، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک بیچاری کو تم نے درمیان میں لٹکی ہوئی چھوڑ دیا کہ نہ وہ خاوند والی ہے

کیونکہ خاوند اُس کے حقوق ادا نہیں کرتا، اور نہ وہ بے خاوند ہے کہ وہ طلاق نہیں دیتا، اس طرح اللہ کی مخلوق میں سے ایک فرد کو لٹکا ہوا چھوڑ دینا کہ اُس کے حقوق بھی ادا نہ کرو اور اُس کو علیحدہ بھی نہ کرو یہ مناسب نہیں ہے۔ بہر حال پورے عدل کا مطالبہ ظاہراً و باطناً ہے بھی نہیں، البتہ جو تمہارے بس میں ہے اس میں کوتاہی نہ کرو کہ ظاہری حقوق ادا کرنے بھی چھوڑ دو۔

آیتِ بالا سے بعض گمراہوں کا ایک غلط اِستدلال اور اس کا جواب

تو اس آیت سے آپ کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ جتنا بس میں ہے وہاں عدل ضروری ہے، جو بس میں نہیں ہے وہاں سرے سے عدل ضروری ہی نہیں، لہٰذا اس آیت کو دوسری آیت کے ساتھ جوڑ کر، کہ اُدھر کہا کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء: ۳) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل اور برابری نہیں کرسکو گے تو پھر ایک کے ساتھ نکاح کیا کرو، اور یہاں آیت یہ آگئی کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے، تمہارے اندر استطاعت ہی نہیں کہ تم عدل کرو، ان دونوں آیتوں کو جوڑ کر بعض زائغین اور گمراہ قسم کے لوگ یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے تعدّدِ ازواج کی اجازت ہی نہیں دی، کیونکہ ایک جگہ کہہ دیا کہ عدل کرسکو تو نکاح کرو، اور دوسری جگہ کہہ دیا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے، معلوم ہوگیا کہ متعدّد نکاح کرنے ہی نہیں چاہئیں، یہ تحریف ہے، غلط ہے، گمراہی ہے، یہ مقصد نہیں ہے، یہ مفہوم اِجماعِ اُمت کے خلاف ہے، جس عدل کو ضروری قرار دیا جارہا ہے وہ آپ کے اختیار میں ہے، وہ ہے ظاہری حقوق کے اندر عدل، نان نفقہ، شب باشی اور اس قسم کے کام، اور جس میں تمہیں کہا جارہا ہے کہ تم پوری طرح سے برابری کر ہی نہیں سکتے اس سے مراد باطنی جذبات ہیں، جیسے حضور ﷺ کا فرمان آتا ہے کہ آپ تمام بیویوں کے درمیان عدل کیا کرتے تھے، اور پھر اللہ سے دعا کیا کرتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ''[1] اے اللہ! جو میرے بس میں تھا میں نے ان کو دے دیا، ان کے درمیان برابری کردی، اور جو میرے بس میں نہیں ہے تیرے بس میں ہے اس بارے میں میرے پہ ملامت نہ کرنا، اس سے وہی میلانِ قلبی مراد ہے، تو ان دونوں آیتوں کو جوڑ کر اس طرح سے نتیجہ نکالنا قرآنِ کریم کی مراد نہیں، بلکہ یہ لوگوں کی اپنی ذہنی ساخت ہے جس کو قرآنِ کریم میں ٹھونستے ہیں۔ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ: تم سے ہو ہی نہیں سکتا کہ تم عورتوں کے درمیان پوری طرح سے برابر کرو اگرچہ تم کتنی ہی طمع کیوں نہ کرو، کیونکہ یہ تمہارے بس میں نہیں ہے، چاہو بھی تو قلبی اعتبار سے برابری نہیں ہوسکتی، کسی کے ساتھ محبت کم ہوگی کسی کے ساتھ زیادہ ہوگی، کسی کے ساتھ نشاطِ طبع کم ہوگا کسی کے ساتھ زیادہ ہوگا، ''پس تم پوری طرح سے ایک طرف کو نہ مائل ہو جایا کرو'' کہ دل اگر ایک طرف ہے تو ظاہری طور پر بھی برتاؤ ایک کے ساتھ ہی ہو، دوسری کو لٹکی ہوئی چھوڑ دی، ''پھر چھوڑ دو تم اس دوسری عورت کو'' ھَا ضمیر لوٹے گی اُس عورت کی طرف جس سے میلان دوسری طرف ہوگیا، یعنی تُمال عنہا، ''اُس کو تم لٹکی ہوئی چھوڑ دو'' وَاِنْ تُصْلِحُوْا: اگر تم حالات کو سنوار کر رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ ص۲۷۹، باب القسم، فصل ثانی، عن عائشہؓ / ابو داؤد ۱/۲۹۰، باب فی القسم بین النساء / ترمذی ۱/۲۱۷، باب ماجاء فی التسویۃ بین الضرائر۔

جدائی ہوجانے کی صورت میں زوجین کو ہدایات

اور اگر کسی اعتبار سے بھی آپس میں صلح نہ ہوسکے، حالات نہیں سدھرتے، موافقت نہیں ہوتی، تو پھر کوئی بات نہیں، صلح آپس میں کرنی ہے تو خودداری کے ساتھ کرنی ہے، مناسب حالات کے تحت کرنی ہے، اور اگر جدائی ہی متعین ہوجائے تو اللہ تعالیٰ دونوں کا ہی کارساز ہے، بیوی یہ نہ سمجھے کہ میرے بغیر خاوند کا گزارہ نہیں ہوسکتا، اور خاوند یہ نہ سمجھے کہ میرے بغیر یہ زندگی نہیں گزار سکتی، اگر کسی وجہ سے جدائی ہو ہی جاتی ہے تو پھر اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہر ایک کی ضرورت پوری کرے گا، ''اور اگر وہ جدائی اختیار کر ہی لیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے دونوں کو ہی ایک دوسرے سے بے نیاز کردے گا'' مرد کی ضرورت بھی اللہ پوری کردے گا، اور عورت کی ضرورت بھی اللہ پوری کردے گا، ''اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے حکمت والا ہے''۔ یہ جو کہا کہ اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے آگے اس وسعت کے بیان کے طور پر یہ بات کہی جارہی ہے کہ ''اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے'' جب سارے زمین وآسمان کا مالک اللہ ہی ہے تو اللہ بڑی وسعت والا ہے، اور اس وسعت سے دونوں کی ضرورت پوری کردے گا۔

بار بار تقویٰ کی تاکید اور قدرتِ باری کو ذکر کرنے کی وجہ

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ: یہ بار بار جو تقوے کا حکم آرہا ہے چونکہ تقویٰ ساری نیکیوں کا مدار ہے، ''اَلتَّقْوٰی مِلَاكُ الْحَسَنَات'' تقوے کے ذریعے سے تمام نیکیاں قابو میں آتی ہیں، جب تک دل کے اندر خوفِ خدا پیدا نہ ہو اور تقویٰ پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرسکتا، اسی کی تاکید کے طور پر کہا جارہا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے تھے انہیں بھی ہم نے وصیت کی تھی اور تمہیں بھی یہی وصیت کی ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اور اگر تم کفر کروگے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی نہیں کروگے تو اللہ کا کیا بگاڑو گے؟ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اللہ تو سب سے مستغنی ہے۔ دوسری دفعہ یہ جو لفظ آئے ہیں تو اسی معنیٰ کو بیان کرنے کے لئے ہیں کہ اللہ کا تم کوئی نقصان نہیں کرسکتے، وہ تو تمام زمین اور آسمان کی چیزوں کا مالک ہے، وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا: اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اچھی تعریفوں کے ساتھ صفتایا ہوا ہے، اچھی تعریفیں اس کے لئے ہیں، لفظ حمید محمود کے معنی میں ہے، وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: اب تیسری دفعہ جو یہ لفظ ہیں تو یہ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا کی تمہید کے طور پر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے، جب وہ زمین وآسمان کا مالک ہے تو ہر ایک کی ضرورت کو پورا کرنے والا وہی ہے، ہر کسی کا کارساز وہی ہے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ: اگر اللہ چاہے تو تم سب کو یکبار ختم کرکے اوروں کو پیدا کردے، اللہ کی قدرت سے کیا بعید ہے، اس لئے ایسے مالک سے، ایسے قادر سے، ایسی وسعت والے سے اور ایسے بے نیاز سے ڈرتے رہنا چاہیے، اور اُس کے احکام کی پابندی کرنی چاہیے، ''اگر چاہے تو لے جائے تم سب کو اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو، اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

دُنیا کو مقصود بنالینا کوئی عقل مندی نہیں

اگلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ نیکی جو بھی کرو اللہ تعالیٰ سے آخرت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے کرو، صرف دُنیا کو مقصود بنالینا کوئی عقل مندی نہیں ہے، کیونکہ دُنیا فانی ہے، اگر انسان کی ہر کوشش اور انسان کی ساری کی ساری صلاحیتیں اسی کے لئے صرف ہوں گی تو یہ کوئی دُور اندیشی نہیں، ''جو کوئی شخص دُنیا کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے'' فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: تو اللہ کے پاس دُنیا کا ثواب بھی ہے اور آخرت کا بھی، اس کلام کو یوں کھول دیجئے کہ جو شخص دُنیا کا ارادہ کرے اور جو شخص ثوابِ آخرت کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے پاس دونوں ہی ثواب ہیں، دُنیا کا بھی اور آخرت کا بھی، اس لیے جب اللہ تعالیٰ سے خیر مانگو تو دُنیا اور آخرت کی اکٹھی مانگو، صرف دُنیا کو مقصود بنالینا عقل مندی نہیں، یا یوں لفظ بیان کئے گئے ہیں کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَفِي رَأْيِهٖ فَسَادٌ جو کوئی صرف دُنیا کا بدلہ چاہتا ہے اُس کی رائے میں فساد ہے وہ عقل مند آدمی نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے پاس تو دُنیا بھی ہے اور آخرت بھی ہے، تو پھر اگر اللہ سے مانگنی ہے تو اعلیٰ چیز مانگو یا دونوں چیزیں مانگو، دُنیا کا ثواب بھی مانگو اور آخرت کا بھی مانگو، صرف دُنیا پر اکتفاء کرنے والے کی رائے میں فساد ہے، وہ عقل مند آدمی نہیں، وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے۔

عدل کی عمومی تاکید

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ: اب پھر عدل وانصاف کی بات آگئی۔ ''اے ایمان والو! انصاف کو قائم کرنے والے ہوجاؤ اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے ہوجاؤ'' قرآنِ کریم میں سورۂ حدید کے اندر ایک آیت موجود ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (آیت:۲۵) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تو مقصد یہ ہے کہ لوگ انصاف کو قائم کریں، یعنی انصاف کا قائم کرنا اِرسالِ رُسل اور اِنزالِ کُتب سے اصل مقصود ہے، انصاف کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ادائے حقوق، کہ ہر کسی کا حق ادا کرو، جو شخص ہر کسی کا حق ادا کرتا ہے وہ منصف اور عادل ہے، اور جو کسی کا حق ادا نہیں کرتا وہ منصف اور عادل نہیں ہے، تمام لوگوں سے مطالبہ یہی کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا اُتارنا اسی لئے ہوا ہے، اللہ نے میزان اور ترازو اُتاری تاکہ اس کے ذریعے سے حقوق کی ادائیگی اور حقوق کا وصول کرنا مناسب طریقے سے ہوجائے، تو انصاف کا قائم کرنا مقصود ہے۔

صحیح ادائے شہادت کی تاکید

جب ہر شخص انصاف کا مکلّف ہوا، کیونکہ یہ صرف حُکام کو خطاب نہیں کہ انصاف کیا کریں، بلکہ ہر ہر فرد کو خطاب ہے۔ اب اس انصاف کے ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ انصاف کے ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے لئے گواہی دیا کرو، یعنی جس وقت گواہی دینے لگو تو اُس وقت اللہ کی رضا مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات سامنے ہو، اس لیے گواہی واقع کے مطابق دو، چاہے وہ گواہی

تمہارے اپنے خلاف پڑے، چاہے والدین کے خلاف پڑے، چاہے اقربین کے خلاف پڑے، اپنے خلاف پڑے، یعنی کوئی تم سے ایسی بات پوچھتا ہے جس کا اقرار اگر تم کرو تو نقصان تمہارا ہو جائے، یا اگر تم اقرار کرلو تو والدین کا نقصان ہے یا اقربین کا نقصان ہے تو بھی گواہی صحیح دو۔ صحیح گواہی میں رکاوٹ دو طرح سے پڑسکتی ہے، بسا اوقات تو انسان اپنے مفاد اور اپنی محبت کی بنا پر گواہی کو بدلتا ہے جیسے والدین اور اقربین کے حق میں انسان گواہی ایسی دے گا کہ ان کو فائدہ پہنچے اور نقصان نہ پہنچے، اور کبھی عداوت کی بنا پر گڑ بڑ کرتا ہے جیسے سورۂ مائدہ میں آئے گا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ٘ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا١ؕ اِعْدِلُوْا١۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (آیت: ۸)، تو گواہی کے اندر گڑ بڑ یا عداوت کی بنا پر ہوگی یا محبت کی بنا پر ہوگی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے اوپر گواہی کے سلسلہ میں نہ محبت کا اثر ہونا چاہیے نہ عداوت کا ہونا چاہیے، اگر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تمہیں محبت ہے تو بھی اظہار ٹھیک کرو اور واقعہ صحیح بیان کرو، اور اگر ایسی جگہ ہے جہاں تمہاری عداوت ہے تو بھی اگر کوئی تم سے بات پوچھ لے تو دشمن کے متعلق بھی گواہی صحیح دو، کیونکہ عدالت کا مدار سارے کا سارا ہے ہی شہادت پر، اگر شہادت کا نظام بگڑ جائے تو عدالت کبھی قائم نہیں ہوسکتی، حاکم نے بھی فیصلہ کرنا ہے تو لوگوں کے بیان سن کر ہی کرنا ہے، اگر لوگ بیان غلط دیں گے تو فیصلہ غلط ہو جائے گا، اور اگر لوگ بیان صحیح دیں گے تو فیصلہ صحیح ہوگا، اس لئے یہ تاکید کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے گواہی قائم کیا کرو، اس کے اندر کسی قسم کا خلل نہ ڈالا کرو، ''اے ایمان والو! ہو جاؤ تم قائم کرنے والے انصاف کو، اللہ کے لئے گواہی دینے والے، اگرچہ وہ اپنے نفسوں کے خلاف ہی ہو'' شہادۃ علی النفس اقرار ہے، تو یہاں آ گیا شہادت صحیح دیا کرو، چاہے اس کا نقصان اپنے آپ کو پہنچے، اور اُس (مائدہ والی) آیت میں آ گیا کہ دشمن کے متعلق شہادت دینی پڑ جائے تو بھی گواہی صحیح دو، نہ عداوت سے متاثر ہو کر گواہی میں گڑ بڑ ڈالو، نہ محبت سے متاثر ہو کر۔ اسی طرح جس پر تم سے گواہی طلب کی گئی ہے اگر وہ مالدار ہے تو اس کی رعایت نہ کرو، اور اگر وہ فقیر ہے تو اُس پر رحم نہ کرو، بسا اوقات مال کے اعتبار سے ایک آدمی بڑا ہوتا ہے تو انسان سوچتا ہے کہ بڑا آدمی ہے اس کے خلاف بات کیوں کریں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس کے متعلق تم سے پوچھا جائے وہ فقیر آدمی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے واقعہ کا اظہار کردیا تو اس کا مزید رگڑا نکل جائے گا، پہلے بھی بیچارہ فقیر ہے تو اس کو مزید رگڑا کیا دیں، تو غنی اور مالدار کی رعایت رکھتے ہوئے بسا اوقات انسان غلط گواہی دے دیتا ہے، اور فقیر پر رحم کرتے ہوئے بسا اوقات غلط گواہی دے دیتا ہے، کہ ہم ایسی بات کیوں کہیں جس سے اس کو مزید نقصان پہنچے، لیکن یہ جذبات حق اور عدل کے خلاف ہیں، اگر تم ایسے جذبات رکھو گے تو انصاف کسی صورت میں قائم نہیں رہ سکتا، فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا کا مطلب یہ ہے کہ غنی سے بھی اللہ کا زیادہ تعلق ہے اور فقیر سے بھی اللہ کا زیادہ تعلق ہے، یہ مصلحت اللہ سمجھتا ہے، تم اس قسم کے رحم میں یا اس قسم کی رعایت میں نہ آیا کرو، بات اگر کرنی ہے تو غنی ہے تو بھی صحیح کرو، اور فقیر ہے تو بھی صحیح کرو، یہ بھی نہ ہو کہ غنی کی رعایت کرتے ہوئے تم اور طرح سے بات کردو، اور فقیر کی رعایت نہیں ہے تو اور طرح سے کرو، قانون یکساں ہے فقیر کے لئے بھی اور غنی کے لئے بھی، اللہ کا ان کے ساتھ زیادہ تعلق ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مصلحت کو زیادہ سمجھتا ہے، تم اس میں کسی قسم کی کج ادائی نہ کرو۔

''اِتباعِ ہویٰ'' کی بجائے ''اِتباعِ ہُدیٰ'' کا حکم

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا: خواہشات کے پیچھے نہ چلا کرو کہ جس طرح تمہارا دل چاہے تم ویسے کرو، لفظِ ''ہویٰ''، ''ہُدیٰ'' کے مقابلے میں آتا ہے، ''ہُدیٰ'' سے ''ہدیٰ اللہ'' مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی ہدایت، ''اِتباعِ ہدیٰ'' مقصود ہے، ''اِتباعِ ہویٰ'' ممنوع ہے، اوران دونوں کی آپس میں ضد ہے، اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی تب ہوسکے گی جب تم اپنی خواہشات کو پسِ پشت ڈال دوگے، اوراگر تم اپنی خواہشات کی اتباع کروگے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پابندی کسی صورت میں نہیں ہوسکتی، تو مطالبہ یہ ہے کہ ہدایت کی پابندی کرو، اللہ کے قانون کے تبع رہو، چاہے وہ تمہاری خواہش کے مطابق ہےاور چاہے خواہش کے خلاف ہے، اگر تم خواہشات کے پیچھے لگ جاؤ گے تو پھر عدل وانصاف کسی صورت میں تم قائم نہیں رکھ سکتے۔ وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى: خواہشات کے پیچھے نہ لگا کرو کہ پھر تم انصاف نہیں کروگے، یا انصاف سے اعراض کر کے انصاف کو چھوڑ کر تم خواہشات کے پیچھے نہ لگا کرو، تو اتباعِ ہویٰ سارے نظامِ عالم کو برباد کرنے والی چیز ہے، اورآج جتنے فسادات آپ کے سامنے ہیں وہ سارے کے سارے اتباعِ ہویٰ کی بنا پر ہی ہیں، اِتباعِ ہویٰ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہےاور صحیح ضابطے کو نہیں دیکھتا کہ ضابطہ کیا ہے؟ قانون کیا ہے؟ عدل کیا ہے؟ انصاف کیا ہے؟ بس اپنے دل کی چاہی ہوئی بات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو جب سارے کے سارے اپنی خواہشات کو پورا کرنے لگ جائیں گے، اور خواہشات کے اندر تضاد ہے، تو عالم کے اندر فساد ہی فساد ہوگا، ہر کوئی ایک دوسرے سے اُلجھے گا، اوراگر خواہشات کو مٹا کر اللہ کے قانون کی پابندی کرلی جائے تو سب میں اتفاق ہوجائے گا۔

وَاِنْ تَلْوٗٓا: اگر تم کج زبانی کروگے اَوْ تُعْرِضُوْا: یا اعراض کروگے، کج زبانی اور اعراض دو لفظ بولے گئے، کج زبانی کا مطلب یہ ہے کہ گواہی دیتے وقت اس کے اندر کج زبانی کرلی، کوئی لفظ آگے پیچھے کردیا، زبان کو مروڑ کر مفہوم کچھ کا کچھ کردیا، گواہی دیتے ہوئے اگر تم کج زبانی کروگے، یا یہ ہے کہ گواہی دینے سے اعراض کرو کہ دینے کے لیے جاتے ہی نہیں، یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو اِختیار کرلیا جائے تو عدالت کا سارے کا سارا نظم خراب ہوجاتا ہے، ایک آدمی گواہی دینے کے لئے چلا گیا لیکن صحیح نہیں دیتا، یا ایک آدمی کے پاس واقعہ کا علم ہے لیکن وہ گواہی نہیں دیتا تو صحیح فیصلہ کس طرح ہوگا؟ لہٰذا اگر تم گواہ ہو اور تمہیں واقعہ کا علم ہے تو اُس کا اظہار صحیح کرو اور اُس کے اندر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ کرو، تب جا کے ادائے حقوق کا معاملہ ٹھیک ہوگا، ''اگر تم کج زبانی کروگے یا تم اِعراض کروگے'' فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لے آؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو

نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ

اُتاری اُس نے اپنے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُتاری اُس نے اِس سے قبل، اور جو کوئی

يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ

انکار کرے اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور یوم آخر کا پس تحقیق

ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ

وہ بھٹک گیا بھٹکنا بہت دُور کا ﴿۱۳۶﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر انہوں نے کفر کیا پھر

اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ

ایمان لائے پھر کُفر کیا پھر زیادہ ہوتے گئے از روئے کُفر کے، نہیں ہے اللہ کہ انہیں بخشے

وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا

اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں راستے کی ہدایت کرے ﴿۱۳۷﴾ بشارت دے دو منافقوں کو اس بات کی کہ ان کے لئے دردناک

اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ

عذاب ہے ﴿۱۳۸﴾ جو کافروں کو دوست بناتے ہیں مؤمنین کو چھوڑ کر،

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ

کیا یہ منافق اُن کافروں کے پاس عزّت کے متلاشی ہیں؟ پس بیشک عزّت اللہ ہی کے لئے ہے ساری کی ساری ﴿۱۳۹﴾ اور تحقیق اُتار چکا

عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ

اللہ تعالیٰ تم پر کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیات کے متعلق کہ اُن کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے

بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ

تو ان کے ساتھ شامل ہوکر بیٹھا نہ کرو جب تک کہ وہ لوگ اس کے علاوہ کسی اور بات میں نہ لگ جائیں

اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡكٰفِرِيۡنَ فِىۡ جَهَنَّمَ

بے شک تم بھی تب ان جیسے ہوجاؤ گے، بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے منافقوں اور کافروں کو جہنم میں

جَمِيۡعَا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيۡنَ يَتَرَبَّصُوۡنَ بِكُمۡ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَـكُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰهِ

سب کو ﴿۱۴۰﴾ اور یہ منافق وہ لوگ ہیں جو تمہارے متعلق انتظار میں ہیں، پھر اگر تمہارے لئے فتح ہوجائے اللہ کی جانب سے

قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ ۖ وَاِنۡ كَانَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نَصِيۡبٌ ۙ قَالُوۡۤا اَلَمۡ

تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے، اور اگر کافروں کے لئے کوئی حصّہ ہوجاتا ہے تو پھر یہ کہتے ہیں ان کافروں کو کہ کیا

نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَيۡكُمۡ وَنَمۡنَعۡكُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ

ہم تم پر غالب نہیں آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تمہیں بچایا نہیں مؤمنین سے؟ پس اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان

يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾

قیامت کے دن، اور ہرگز نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مؤمنین کے خلاف کوئی راستہ ﴿۱۴۱﴾

اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ ۚ وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَى

بیشک منافق لوگ چالبازی کرتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ انہیں چالبازی کی سزا دینے والا ہے، اور جس وقت یہ اُٹھتے ہیں

الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَلَا يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ

نماز کی طرف تو اُٹھتے ہیں سستی کے مارے ہوئے، لوگوں کے سامنے ریاکاری کرتے ہیں اور نہیں یاد کرتے اللہ کو

اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰ لِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى

مگر بہت کم ﴿۱۴۲﴾ متردّد ہیں ان دو حالوں کے درمیان، نہ پوری طرح اِن کی طرف ہیں اور نہ پوری طرح

هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰۤاَيُّهَا

اِن کی طرف ہیں، اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے پس ہرگز نہیں پائے گا تو اُس کے لئے راستہ ﴿۱۴۳﴾ اے

الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ

ایمان والو! کافروں کو دوست نہ بنایا کرو مؤمنین کو چھوڑ کر

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ﴿١٤٤﴾ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ

کیا تم چاہتے ہو کہ تم اللہ کے لیے اپنے خلاف ایک واضح دلیل قائم کرلو ﴿۱۴۴﴾ بے شک منافق لوگ

فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾ إِلَّا الَّذِينَ

جہنم کے نچلے درجے میں ہوں گے، اور تو ہرگز ان کے لئے مددگار نہیں پائے گا ﴿۱۴۵﴾ مگر وہ لوگ جو

تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللّٰهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ

توبہ کرلیں اور اپنے احوال کو سنوار لیں اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں اور خالص کرلیں اپنی طاعت کو اللہ کے لئے پس یہ لوگ

مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٤٦﴾

مؤمنین کے ساتھ ہوں گے، اور عنقریب دے گا اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو اجرِ عظیم ﴿۱۴۶﴾

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿١٤٧﴾

اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزار ہو جاؤ اور ایمان لے آؤ، اللہ تعالیٰ قدر کرنے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۱۴۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اُتاری اس نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو اُتاری اس نے اس سے قبل، پس جو کوئی انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور یومِ آخر کا، فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: پس تحقیق وہ بھٹک گیا بھٹکنا بہت دُور کا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے ثُمَّ كَفَرُوْا: پھر انہوں نے کُفر کیا، ثُمَّ اٰمَنُوْا: پھر ایمان لائے ثُمَّ كَفَرُوْا: پھر کُفر کیا، ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا: پھر زیادہ ہوتے گئے از روئے کُفر کے، یعنی کُفر میں بڑھتے گئے، لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ: نہیں ہے اللہ کہ انہیں بخشے، یعنی اللہ انہیں بخشے گا نہیں، وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا: اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں راستے کی ہدایت کرے، راستے سے جنّت کا راستہ مراد ہے، یعنی اللہ انہیں جنّت کا راستہ نہیں دِکھائے گا، اللہ انہیں بخشے گا نہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بخشنے والا ابھی نہیں اور راستہ دکھانے والا ابھی نہیں، بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ: بشارت دے دو منافقوں کو، خبر دے دو منافقوں کو بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: اس بات کی کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ عذابِ الیم بشارت کی چیز نہیں ہے لیکن اِستہزاءً اور تہکماً اس کو بشارت قرار دیا جاتا ہے، یعنی ہر شخص اپنے مستقبل کے متعلق اچھی خبر سننے کا مشتاق ہوتا ہے، منافقین کے لئے یہی اچھی خبر ہے کہ اِن کو دردناک عذاب ہوگا، الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ: ایسے منافق جو بناتے ہیں کافروں کو دوست مؤمنین کو چھوڑ کر، اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ: کیا یہ منافق اُن

کافروں کے پاس عزت کے متلاشی ہیں؟ عزت چاہتے ہیں؟ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا: پس بیشک عزت اللہ ہی کے لئے ہے ساری کی ساری، وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ: اور تحقیق اُتار چکا اللہ تعالیٰ تم پر کتاب میں اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا: کہ جب تم سنو اللہ کی آیات کو کہ ان کا انکار کیا جارہا ہے۔ یُكْفَرُ بِهَا یہ اٰیٰتِ اللّٰهِ سے بدلِ اشتمال ہے۔ جب تم اللہ کی آیات کے متعلق سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جارہا ہے وَیُسْتَهْزَاُ بِهَا: اوران کا مذاق اُڑایا جارہا ہے، فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ: توان کے ساتھ شامل ہوکر بیٹھا نہ کرو، حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ: جب تک کہ وہ لوگ اس کے علاوہ کسی اور بات میں نہ لگ جائیں۔ خوض گھسنے کو کہتے ہیں، مشغول ہونے کو، آپ بھی کہا کرتے ہیں کہ غور وخوض کرلو، جب تک کہ وہ لگ نہ جائیں اس کے علاوہ کسی دوسری بات میں، اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ: بے شک تم بھی تب ان جیسے ہوجاؤ گے۔ اِذًا کی تنوین عوضِ مضاف الیہ ہے، یعنی جب تم ان کے پاس بیٹھو گے ایسے حال میں کہ وہاں اللہ کی آیات کا انکار کیا جارہا ہے اوران کا اِستہزا اُڑایا جارہا ہے تو ایسے وقت میں تم بھی ان جیسے ہوجاؤ گے، اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْكٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا: بیشک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے منافقوں کواور کافروں کو جہنم میں سب کو، الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ: اور یہ منافق وہ لوگ ہیں جو تمہارے متعلق انتظار میں ہیں۔ تربّص انتظار کرنے کو کہتے ہیں، یہ لفظ پہلے بھی گزرا تھا یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرۃ:۲۲۸) انتظار میں رکھیں اپنے نفسوں کو تین حیض تک۔ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ: جو تمہارے متعلق انتظار میں ہیں۔ یَتَرَبَّصُوْنَ کا مفعول یہاں محذوف ہوجائے گا یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ، دوائر دائرہ کی جمع ہے، تمہارے متعلق گردشوں کے انتظار میں ہیں، فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ: پھر اگر تمہارے لئے فتح ہوجائے اللہ کی جانب سے تو کہتے ہیں کہ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ یعنی ہم تمہارے ساتھ تھے، اس لئے اس مالِ غنیمت میں ہمیں بھی شریک کرو اوراس فتح کے فوائد ہمیں بھی پہنچنے چاہئیں، وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ: اوراگر کافروں کے لئے کوئی حصہ ہوجاتا ہے فتح کا، غنیمت کا، قَالُوْٓا: تو پھر یہ منافق کہتے ہیں ان کافروں کو اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْكُمْ: کیا ہم نے تمہارا گھیرا نہیں ڈال لیا تھا؟ کیا ہم تم پر غالب نہیں آنے لگے تھے؟، جیسے دوسری جگہ ہے اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ (سورۂ مجادلہ:۱۹) شیطان نے ان کا گھیرا ڈال لیا، شیطان ان کے اوپر غالب آگیا، اس کا مفہوم یہی ہوا کرتا ہے وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ: کیا ہم نے تمہیں بچایا نہیں مؤمنوں سے؟ نَمْنَعْ یہ بھی لَمْ کے نیچے داخل ہے اوراستفہام کا تعلق اس کے ساتھ بھی ہے، یعنی اُن پر احسان جتلاتے ہیں کہ تم ہمارے گھیرے میں تو آگئے تھے اگر ہم تمہارے ساتھ ہمدردی نہ رکھتے تو مسلمان تمہیں نقصان پہنچاتے، لیکن ہم نے کھیل بگاڑ دیا اور تمہیں بچالیا، اس طرح ان کافروں پر احسان جتاتے ہیں فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پس اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن، وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا: اور ہرگز نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مؤمنوں کے خلاف کوئی راستہ، یعنی کافروں کو مؤمنوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کامیابی کی راہ نہیں دے گا۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: بیشک منافق لوگ چالبازی کرتے ہیں اللہ کے ساتھ وَهُوَ خَادِعُهُمْ: اوراللہ تعالیٰ ان کے ساتھ چالبازی کرنے والا ہے۔ یہ لفظ مشاکلۃً آگیا، اللہ تعالیٰ ان کو دھوکا دینے والا ہے، یعنی ان کے دھوکے کی اور چالبازی کی سزا دینے والا ہے، جیسے یہ لفظ سورۂ بقرۃ کے اندر بھی آیا تھا یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (آیت:۹)، وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰی: قَامَ اِلٰی شَیْءٍ: توجہ کرنا، اور جب یہ متوجہ ہوتے ہیں نماز کی طرف، جب یہ اُٹھتے ہیں نماز کی طرف قَامُوْا كُسَالٰی:

تو اُٹھتے ہیں سستی کے مارے ہوئے، کُسالیٰ کَسلان کی جمع ہے، جیسے سُکاریٰ سکران کی جمع آتی ہے۔ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ: دکھلاوا کرتے ہیں لوگوں کو، یُرَآءُوْنَ رِیاء سے لیا گیا ہے، لوگوں کے سامنے ریاکاری کرتے ہیں، وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا: اور نہیں یاد کرتے اللہ کو مگر بہت کم، یعنی نماز میں اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں، مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ: ذٰلِكَ کا اشارہ مؤمنین وکافرین کی طرف ہے جیسے کہ آگے آ گیا لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ، لٹکے ہوئے ہیں، متردّد ہیں، کہ کبھی رجوع مؤمنین کی طرف ہوتا ہے کبھی کافروں کی طرف۔ بَیْنَ کا مضاف الیہ چونکہ متعدد ہوا کرتا ہے اس لیے یہاں ذٰلِكَ کا اشارہ المؤمنین والکافرین کی طرف ہوگا، یہ مجموعہ جس کا ذکر پہلے آیا ہوا ہے، یعنی کافروں اور مؤمنوں کے درمیان یہ متردّد ہیں، ''نہ پوری طرح اِن کی طرف ہیں اور نہ پوری طرح اِن کی طرف ہیں'' یعنی اندر سے کافروں کی طرف ہیں تو ظاہری طور پر کافروں کی طرف نہیں، اور ظاہری طور پر مؤمنوں کی طرف ہیں تو اندر سے مؤمنوں کی طرف نہیں، وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ: اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا: پس ہرگز نہیں پائے گا تُو اس کے لئے راستہ۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ: اے ایمان والو! کافروں کو دوست نہ بنایا کرو مؤمنین کو چھوڑ کر، اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا: کیا تم چاہتے ہو کہ تم اللہ کے لئے اپنے خلاف ایک واضح دلیل قائم کرلو؟ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ: بیشک منافق لوگ جہنّم کے نچلے درجے میں ہوں گے، دَرك درجے کے معنی میں ہے، نچلے درجے ہوں گے جہنّم سے، وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا: اور تو ہرگز ان کے لئے مددگار نہیں پائے گا، اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا: مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں وَاَصْلَحُوْا: اور اپنے احوال کو سنوار لیں، وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ: اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں، وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ: اور خالص کرلیں اپنی طاعت کو اللہ کے لئے، فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ: یہ لوگ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور عنقریب دے گا اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو اَجْرًا عَظِیْمًا: اجرِ عظیم۔ مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ: اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ: اگر تم شکر گزار ہو جاؤ اور ایمان لے آؤ، وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا: اللہ تعالیٰ قدر کرنے والا ہے جاننے والا ہے۔ لفظِ شکر کی نسبت دونوں کی طرف آجاتی ہے بندوں کی طرف بھی جیسے کہ اِنْ شَكَرْتُمْ کے اندر نسبت انسانوں کی طرف ہے، اور اس کی نسبت اللہ کی طرف بھی ہوتی ہے اس لئے وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا کے اندر شکر کا لفظ اللہ کی صفت بن گیا، اصل کے اعتبار سے شکر کا مفہوم ہوتا ہے قدردانی، بندے اللہ کی نعمتوں اور اللہ کے احسانات کی قدر کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے عمل کی قدر کرتا ہے، اور اس کو قبول کر کے اس پر جزا دیتا ہے، اس اعتبار سے شکر کی نسبت دونوں کی طرف ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع سورت سے یہاں تک زیادہ تر فروعی اَحکام مذکور ہوئے ہیں، اُصول پر بحث کم آئی ہے، اب یہاں سے سورت کے قریب الی الختم تک زیادہ تر مباحث اُصولی ذکر کئے جارہے ہیں یعنی کُفر اور ایمان کے، اور آخر میں پھر کچھ اَحکام کا ذکر آئے گا۔

ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم کیوں؟ (چار توجیہات)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: یہ خطاب بھی ایمان والوں کو ہے اور آگے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ کے تحت پھر ایمان لانے کا حکم دیا جارہا ہے تو اصل بات یہ ہے کہ ایک ہی چیز میں اجمال اور تفصیل کے اعتبار سے فرق بھی ہوسکتا ہے، اور اس کے ابتدائی درجے اور انتہائی درجے کے اعتبار سے فرق بھی ہوسکتا ہے، تو یہاں اس کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ جنہوں نے بالاجمال ایمان قبول کیا، جیسے ایمان کی دعوت دی جائے وہ کہتے ہیں کہ ہم مؤمن ہوگئے، یوں بالاجمال وہ ایمان لے آئے، ان کو چاہیے کہ بالتفصیل ایمان لائیں اور ان چیزوں کے بارے میں اپنے عقیدے کو درست کریں، اجمالاً ایمان لے آنے کے بعد ان کو تفصیل بتائی جارہی ہے، جیسے ایک کافر آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مؤمن ہوتا ہوں، کلمہ پڑھ لیا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، مؤمن بن گیا، اب آگے اُس کو تفصیل بتائی جائے گی، کہ ان ان چیزوں کے متعلق ایمان لانا ضروری ہے، تو جو بالاجمال ایمان لائے ہیں انہیں چاہیے کہ اس تفصیل کو اپنے ذہن میں مستحضر کریں اور ان کے بارے میں اپنے عقیدے کو ٹھیک کریں، تو اجمال اور تفصیل کے اعتبار سے بھی فرق کیا جاسکتا ہے۔ اور کسی کام کے ابتدائی درجے اور انتہائی درجے کے اعتبار سے بھی فرق کیا جاسکتا ہے، ابتدائی درجہ ہوتا ہے ناقص، اور انتہائی درجہ ہوتا ہے کمال کا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو سرسری طور پر ایمان لائے ہیں ان کو چاہیے کہ اب اپنے ایمان کے اندر کمال پیدا کریں، اور ان سب چیزوں کو وہ قبول کریں جن کا ذکر آگے کیا جارہا ہے، پہلے ایمان کی ابتدا ہوئی اور آگے انتہا یہ ہوگی کہ ان سب چیزوں کو ماننے جن کو آگے ذکر کیا جارہا ہے...... یا زیادہ تر یہاں منافقین کو سمجھانا مقصود ہے، جیسے کہ آگے تفصیل کے ساتھ منافقین کا ذکر کیا جارہا ہے، تو پھر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا سے مراد چونکہ منافق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے لوگو! جو ظاہری طور پر ایمان لائے ہو تمہیں چاہیے کہ دل سے اور باطن سے بھی ان چیزوں کا مانو جن کا ذکر آگے کیا جارہا ہے، تو ظاہر اور باطن کے اعتبار سے بھی فرق کیا جاسکتا ہے، کہ جو اپنی زبان کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ایمان کا اظہار کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ دل سے بھی ان احکام کو قبول کریں جو آگے ذکر کیے جارہے ہیں...... اور اگر اس سے اہل کتاب کو خطاب مراد لے لیا جائے تو اس کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ جو انبیائے سابقین پر ایمان لے آئے، موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، انہیں چاہیے کہ اب ان چیزوں پر ایمان لائیں، اسی طرح جو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے انہیں چاہیے کہ اب ان چیزوں پر ایمان لائیں۔ بہرحال آپ کی منطقی اصطلاح کے مطابق اس میں تحصیلِ حاصل نہیں ہے، کہ ایمان والوں کو کہا جائے کہ ایمان لے آؤ، بظاہر اس میں تحصیلِ حاصل ہے، اس اِشکال کو اُٹھا رہا ہوں کہ یہ تحصیلِ حاصل نہیں، یا تو اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، یا کسی کام کے ابتدائی اور انتہائی درجے کے اعتبار سے فرق ہے، یا ظاہر اور باطن کے اعتبار سے فرق ہے، یا انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والوں کو خطاب کر کے موجودہ نبی پر ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے، اس طرح سے دونوں کے درمیان میں فرق آجائے گا۔

ان بنیادی چیزوں کا تذکرہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے

''اے ایمان والو! ایمان لے آؤ اللہ پر'' یعنی ایمان کی بنیاد یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو مانو، اللہ تعالیٰ کی ذات پر

ایمان لاؤ، اور اُس کی صفات پر ایمان لاؤ، اس کو وحدہٗ لاشریک مانو۔ ''اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ'' اس رسول سے موجود الوقت رسول مراد ہے یعنی سرورِ کائنات ﷺ، اللہ پر ایمان لانا معتبر تب ہوگا جب اُس کے رسول کو بھی مانا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اس طرح لایا جائے گا جس طرح اُس کا بھیجا ہوا رسول بتائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا معتبر وہی ہوتا ہے جو رسول کی معرفت حاصل کیا جائے، اپنی عقل کے ساتھ سوچ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی عقیدہ قائم کر لینا کوئی معتبر نہیں۔ ''اور اس کتاب کو بھی مانو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اُتاری ہے'' یہاں نَزَّلَ کا لفظ استعمال کیا۔ نَزَّلَ تَنْزِیْل: تھوڑا تھوڑا کر کے بالاہتمام موقع بہ موقع اُتارنا، چونکہ قرآنِ کریم کا نزول اسی طرح ہوا ہے، بخلاف دوسری کتابوں کے جو انبیاء علیہم السلام پر اُتری تھیں صحیفے یا کتابیں، جیسے تورات، انجیل، یا دوسرے انبیاء علیہم السلام پر جو صحیفے اُترے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس اہتمام کے ساتھ نہیں اُتارتے تھے جس طرح قرآنِ کریم کو تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا، بلکہ ساری کی ساری کتاب ہی دے دیتے تھے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ''طور'' پر گئے تھے اور ساری کتاب یکبارگی دے دی، اور ایسے ہی دیگر صحیفے ہیں، تو نَزَّلَ کے اندر اہتمام ہے کہ ''اُتارا اُس نے کتاب کو اپنے رسول پر'' یعنی بالاہتمام تھوڑا تھوڑا کر کے، اس کتاب کو بھی مانو تب جا کے ایمان معتبر ہوگا، اب آپ جانتے ہیں کہ جب قرآن پر بھی ایمان ہو گیا تو اس میں ساری ضروری ضروری چیزیں آ گئیں۔ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ: اور اس کتاب کو بھی مانو جو اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل اتاری۔ یہاں اَنْزَلَ کا لفظ آیا ہے، اور کتاب سے اگر مفرد مراد لیا جائے تو تورات مراد ہے، کیونکہ مہتم بالشان کتاب قرآنِ کریم سے پہلے تورات ہی اُتری ہے، باقی چھوٹے چھوٹے صحیفے تھے، اور انجیل بھی تورات کا ایک قسم کا تتمہ ہے، اَحکام کا مجموعہ اور مختلف قسم کی زندگی کے متعلق ہدایات زیادہ تر تورات میں ہی آئی ہیں، اس لئے بنی اسرائیل جتنے بھی تھے ان کے انبیاء علیہم السلام تورات کی تعلیم دیتے تھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تورات کے مبلغ تھے، اور اس کے تتمہ کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کی گئی تھی، اس لئے اگر مفرد مراد لیا جائے تو اس کا مصداق تورات ہے، ورنہ جنس کے طور جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتری ہیں صحیفوں کی شکل میں یا بڑی کتابوں کی شکل میں، جیسے زَبور، تورات، انجیل یا صحفِ ابراہیم یا صحفِ موسیٰ، وہ سارے اس میں مراد ہو جائیں گے۔ تو اللہ پر بھی ایمان آ گیا، اللہ کے رسول پر ایمان آ گیا، قرآنِ کریم پر ایمان آ گیا، جب قرآنِ کریم پر آپ ایمان لائیں گے اور اس کو اللہ کی کتاب سمجھیں گے تو اس کے جتنے مندرجات ہیں وہ سارے کے سارے آپ تسلیم کریں گے، تو کوئی بات بھی باہر نہیں رہی، ساری باتیں اس کے اندر آ گئیں۔

آگے اس کی دوسری شق بیان کی جا رہی ہے یعنی مثبت کے بعد منفی پہلو، کہ ''جو کوئی انکار کرے اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور یومِ آخر کا، وہ بھٹک کر دُور جا پڑا'' اس سے معلوم ہو گیا کہ ان چیزوں میں سے ہر چیز کا انکار کُفر ہے، اللہ کا انکار کر دو، اللہ کی ذات کا انکار کر دو، اُس کی کسی صفت کا انکار کر دو، اس کے کسی حکم کا انکار کر دو، وہ سب اللہ کے انکار میں شامل ہے، یا اُس کے رسولوں میں سے کسی کا انکار کر دو، فرشتوں کا انکار کر دو، فرشتوں کے وجود کا انکار کر دو، یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ کا انکار کر دیا، جہاں ایمان کی تفصیل آتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کے ساتھ، کتابوں کے ذکر کے ساتھ اور رسولوں کے

ذکر کے ساتھ ملائکہ پر ایمان لانے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں، ملائکہ پر ایمان لانا ضروری ہے، وجہ اُس کی یہ ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے بندوں تک اُس کے احکام اور اُس کی دوسری باتیں پہنچنے کے لئے واسطہ بنتے ہیں، نبی اور رسول براہِ راست اللہ تعالیٰ سے گفتگو کر کے اَحکام نہیں لیتا، یہاں درمیان میں فرشتوں کا واسطہ ہے، اب اگر کوئی شخص اس واسطے کا انکار کردے تو بندوں کا اور اللہ تعالیٰ کا ربط کسی وجہ سے بھی نہ رہا، اس لیے دِین کی صداقت تبھی ثابت ہوتی ہے جب اس درمیان والے واسطے کو بھی مانا جائے، اللہ تعالیٰ رسولوں تک جو پیغام پہنچاتے ہیں اور اپنی کتابوں کو جو اُتارتے ہیں ان سب میں واسطہ فرشتے بنتے ہیں، جبریل علیہ السلام آتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے محافظ اور نگران دوسرے بھی ہوا کرتے ہیں، تو فرشتوں پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ بندوں کے درمیان اور اللہ کے درمیان رابطے کا کام ان کے ذریعے سے ہوتا ہے، اگر اس کا کوئی شخص انکار کردے تو گویا کہ بندوں اور اللہ کے درمیان میں اُس نے رابطہ توڑ دیا، براہِ راست اللہ سے گفتگو کر کے انبیاء علیہم السلام احکام نہیں لاتے، انبیاء علیہم السلام پر جو کچھ نازل ہوتا ہے اور جو باتیں پہنچتی ہیں وہ ملائکہ کی وساطت سے پہنچتی ہیں، اس لیے اس واسطے کو ماننا ضروری ہے، اور اس کا انکار گویا سارے دِین کا انکار ہے، اگر کوئی شخص انکار کردے کہ جبریل علیہ السلام کا وجود ہی نہیں ہے، تو پھر قرآنِ کریم کے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی طرف آنے کی کیا سند رہی؟ اس لئے بار بار یہ مضمون آیا کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ (سورۂ شعراء: ۱۹۳) اللہ تعالیٰ ذکر فرماتے ہیں کہ روح الامین اس کو لے کر آیا، جبریل علیہ السلام نے اس کو آپ کے دل پر اُتارا، یہ ساری کی ساری سند جو واضح کی گئی ہے وہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اگر درمیان سے فرشتوں کا انکار کردیا جائے، اس لئے فرشتوں پر ایمان لانے کی اہمیت بھی برابر سرابر ہے، جس طرح اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اور کتابوں کا ذکر مجموعی طور پر ہوگیا، جو بھی اللہ کی طرف سے اُتری ہیں، جن کی تفصیل ہمیں معلوم ہے یا جن کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں، ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرنا کُفر ہے۔ ''اور رسولوں کا جو انکار کرے'' یہ جمع کے طور پر آ گیا، چاہے ہم سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کہلاتے ہیں لیکن ماننا سب کو ضروری ہے، اگر کسی ایک نبی یا ایک رسول کا انکار کیا جائے تو یہ بھی کُفر ہے، اس لئے بالاجمال یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ اللہ کی طرف سے جتنے بھی نبی برحق آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے رسول آئے ہم سب کو مانتے ہیں۔ ''اور پھر یومِ آخر یعنی قیامت کے دن پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے، اس عقیدے کی اہمیت بھی بالکل اللہ پر ایمان لانے کے برابر ہے، اس لئے اگر کوئی شخص آخرت کا منکر ہو اور یہ کہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب وکتاب کے لئے پیش نہیں ہونا وہ بھی اسی طرح کافر ہے۔ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: جو ان میں سے کسی چیز کا بھی انکار کرے گا وہ گمراہ ہو کر بہت دُور جا پڑا۔ تو اس میں ایمان کی کچھ تفصیل آ گئی کہ یہ چیزیں بنیادی ہیں، جس وقت تک ان کو تسلیم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا، تو بالاِجمال ایمان لانے والوں کو چاہیے کہ اس تفصیل کو اپنے ذہن میں حاضر کر کے اِن سب کو مانیں، تب جا کے ان کا ایمان معتبر ہوگا، اور ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنا کُفر کا باعث ہے۔

زندگی کی نیکیوں کا اعتبار خاتمہ بالخیر پر ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا: بیشک جو لوگ ایمان لے آتے ہیں پھر کُفر کر لیتے ہیں، تو ایمان والی فضیلت ان کی ختم ہوگئی، وہ مرتد ہوگئے، ''پھر وہ ایمان لائے پھر انہوں نے کُفر کیا'' تو اس کُفر کے بعد پھر ایمان لے آتے تو بھی کُفر ختم ہو جاتا، لیکن ''پھر کُفر میں بڑھتے رہتے ہیں، نہ اللہ انہیں بخشے گا اور نہ اللہ انہیں جنّت کا راستہ دکھائے گا'' اگر چہ پہلے ایمان لائے تھے لیکن ان کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا جبکہ اُس کے بعد کُفر کر لیا گیا۔ اس کا مصداق یا تو یہود ہیں، یہود کی تاریخ اسی بات پر شاہد ہے کہ پہلے یہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، بعد میں بچھڑے کو پُوج کر کافر ہوگئے، پھر موسیٰ علیہ السلام کی تلقین کے ساتھ پھر ایمان لائے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر کے پھر کافر ہوئے، اب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے کُفر میں اور بڑھ گئے، اگر یہ ایمان نہیں لائیں گے تو چاہے یہ اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی اولاد قرار دیں، چاہے یہ حاملِ تورات ہوں، چاہے موسیٰ علیہ السلام کا نام لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نہ ان کو بخشے گا نہ ان کو جنّت کی راہ دکھائے گا، یہ اسی طرح سے اگر کُفر کے اندر بڑھتے چلے گئے اور ان کی موت کُفر پر آگئی تو تورات کا ماننا اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا ان کے کسی کام کا نہیں ہے۔ یا اس کا مصداق منافق ہو سکتے ہیں کہ منافقین بھی آتے تھے اور آ کر ایمان کا اظہار کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کے اَحکام کا اِستہزا کر کے پھر کُفر کر لیتے تھے، اور پھر کبھی آتے تھے جب کوئی موقع آتا تو پھر ایمان کا اظہار کرتے، لیکن پھر خلوت میں جاتے تو پھر کُفر کرتے، تو اگر وہ دل سے ایمان نہ لائیں اور اسی طرح کُفر کے اندر بڑھتے رہیں تو وہ بھی مغفرت سے اور جنّت کے راستے سے محروم ہو جائیں گے۔ اگر خاتمہ ایمان پر ہوگا تب جا کے زندگی کی نیکیوں کا اعتبار ہے، اور اگر خاتمہ ایمان پر نہ ہوا تو پہلی زندگی میں ایمان ہو، عبادت ہو، طاعت ہو جو کچھ ہو سب بے کار ہو جاتا ہے، خاتمہ کُفر پر ہونے کی صورت میں کوئی نیکی قبول نہیں۔ تو یہ لوگ کبھی ایمان لاتے ہیں کبھی کُفر کرتے ہیں، کُفر کے اندر اگر یہ ترقی کرتے چلے گئے، اور مرنے سے پہلے انہوں نے صحیح طریقے سے ایمان قبول نہ کیا، تو ان کے سابق ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، یہ سارے برباد ہو جائیں گے۔ گویا کہ پہلے ایمان کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد یہ ضروری قرار دے دیا، کہ ایمان کے بعد کُفر کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے، اگر کوئی کُفر کا ارتکاب کرے گا تو ایمان لانے کا کوئی اعتبار نہیں، اگر خاتمہ کُفر پر ہوا تو آخرت میں اُس کا شمار کافروں میں ہوگا، چاہے دُنیا کے اندر وہ بار بار ایمان لایا ہو۔

اولیاء کو خاتمہ بالخیر کا فکر زیادہ کیوں ہوتا ہے؟

اسی لئے تو اولیاء اللہ کو خاتمے کا بہت فکر ہوتا ہے، جس شخص کے دل میں بھی ایمان کی قدر ہوگی اُس کو خاتمہ بالایمان کا بہت خیال ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ ایمان پر کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری زندگی کی کمائی آخر وقت میں لُٹا بیٹھیں۔ ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ عام مؤمنین اپنے خاتمے کے لئے اتنے فکر مند نہیں ہوتے جتنے نیک لوگ اور اولیاء اللہ آخر وقت میں پہنچ کر ڈرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے روتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان کو محفوظ رکھے، نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کے اُوپر آخر وقت میں ایمان کی فکر کا خاص طور پر غلبہ ہوتا ہے، اور ہر وقت وہ چوکنے رہتے ہیں کہ کہیں ایمان ضائع نہ ہو جائے۔ تو میں نے ان کی

خدمت میں بھی عرض کیا کہ بھائی! چوروں اورڈاکوؤں سے سرمایہ دار ہی ڈرا کرتے ہیں، اور جو ہم جیسا فقیر آدمی ہو اُس کے گھر میں دن کو تلاش کریں تو کچھ نہیں ملتا، رات کو وہ امن سے سوتے ہیں کہ چور آئیں گے بھی تو کیا اُٹھا کر لے جائیں گے؟ جیسے گلستان کے اندر شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لطیفہ بیان کیا ہوا ہے کہ ایک درویش گودڑی پوش کے گھر رات کو چور آ گھسے تو اُس کی آنکھ کھل گئی، جب اس نے دیکھا کہ چور اندر کچھ تلاش کرتے پھر رہے ہیں، تو کہتا ہے کہ بھائی! کیوں تکلیف کرتے ہو؟ مجھے یہاں دن کی روشنی میں کچھ نہیں ملتا، تم رات کی تاریکی میں کیا ڈھونڈتے ہو؟ جس کی یہ پوزیشن ہو اس کو کیا ضرورت ہے چوروں سے اور ڈاکوؤں سے ڈرنے کی؟ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے گا اور امن کے ساتھ سوئے گا کہ اگر کوئی آ بھی گیا تو کیا لے جائے گا؟ اور جس کے گھر کے اندر سرمایہ ہے، سونا ہے، چاندی ہے، مال دولت اُس نے اکٹھا کر رکھا ہے، وہ اُس کی حفاظت کے لئے خود بھی چوکنا رہتا ہے، پہریدار بھی رکھتا ہے، تالے بھی لگاتا ہے، دیواریں بھی مضبوط بنائے گا، سوٹ کیس بھی مضبوط رکھے گا، حتیٰ کہ حفاظتی تدبیر کے تحت وہ کتے بھی پالتا ہے، کہ کوئی چور وغیرہ آ کر کوئی نقصان نہ پہنچا جائے۔ اسی طرح جس شخص کو اپنے خاتمے کا فکر نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اُس کے پاس دولتِ ایمان ہے ہی نہیں یا اُس کو اپنی اس دولت کی قدر نہیں ہے، اس لئے اُس کو شیطان کی طرف سے اور ایمان کے ڈاکوؤں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا، اور جن لوگوں نے ساری محنت کر کے اس دولت کو اکٹھا کیا اور نیکیوں کے ڈھیر لگائے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو نیکی کرنے کی توفیق دی ہے، ایسے لوگ آخر وقت میں ڈرتے ہیں کہ اب اس سے فائدہ اُٹھانے کا وقت قریب آ رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چور نقب لگالے اور کوئی شیطان اس میں آ کر تصرف کر لے اور ساری زندگی کی کمائی ضائع ہو جائے۔ تو اولیاء اللہ کے اُوپر آخر وقت میں یہ جو غلبہ ہوا کرتا ہے کہ ان کو ایمان کی فکر ہوا کرتی ہے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ ایمان کے مسئلے میں سرمایہ دار ہیں، انہوں نے نیکیوں کے ڈھیر اکٹھے کر رکھے ہیں، اور جتنا آدمی تہی دامن ہوگا اتنا بے فکر ہوگا۔ بہرحال خاتمہ ایمان پر ہونا اللہ کا بہت بڑا احسان ہے، تبھی جا کے زندگی کی نیکیاں آخرت میں کام آسکتی ہیں، ورنہ پہلے اگر ایمان لائے پھر کفر ہو گیا اور پھر کفر میں ترقی کرتے چلے گئے اور خاتمہ کفر پر ہو گیا، ایمان دوبارہ نہیں لائے، تو ایسی صورت میں نہ اللہ بخشے گا نہ جنت کا راستہ دکھائے گا، یہ تو صریح کفر کی سزا تھی۔

''نفاق'' کا مفہوم اور منافقین کا انجام

اور کفر کی ایک دوسری قسم ہے جس کو ''نفاق'' کہتے ہیں کہ ظاہری طور پر زبان کے ساتھ تو ایمان کا اظہار کریں اور دل میں ایمان نہ ہو، تو یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے کافر ہی ہیں، اور یہ خوش نہ رہیں کہ ہم جس وقت اپنی زبان سے کلمہ پڑھتے ہیں اور زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں تو ہمیں بھی کوئی فائدہ پہنچے گا، ''ان منافقوں کو بھی کہہ دو کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے''، پہلے صریح کفر کا ذکر تھا اب نفاق کا ذکر آ گیا، جو اِبطانِ کفر ہے کہ ظاہری طور پر اگرچہ ایمان کا اظہار کیا ہوا ہے لیکن دل میں کفر چھپایا ہوا ہے تو ان کو بھی عذابِ الیم کی خبر دے دیجئے، اس خبر کو لفظِ بشارت کے ساتھ ذکر کیا استہزاءً، کہ ہر شخص اپنے مستقبل کے لئے اچھی خبر سننا چاہتا ہے تو ان کے لئے اچھی خبر یہی ہے کہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ ''منافق'' دوغلے کو کہتے ہیں، جس کا ظاہر اور ہو

اور باطن اور ہو، حقیقتاً نفاق یہی ہے: ''اِظْهَارُ الْاِيْمَانِ وَاِبْطَانُ الْكُفْرِ '' اور اس کے بعد نفاق عملی بھی ہوتا ہے کہ معاملات میں اور گفتگو میں انسان کا ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ ہو تو اُس کو نفاق عملی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

منافقین کی علامات اوران کے کردارِ بد پر تنبیہ

آگے منافقوں کی اس موقع محل کے اعتبار سے خاص علامت ذکر کر دی، تاکہ جس کے اندر اس قسم کے جذبات ہوں وہ چوکنے ہو جائیں۔ منافق یہ ہیں کہ جن کی ہمدردیاں مؤمنین کے ساتھ نہیں، ان کی دوستیاں کافروں کے ساتھ ہیں، کافر اس وقت اردگرد یہود تھے اور مشرکینِ مکہ تھے، اور یہ ٹولہ جو کہ منافق تھا یہ دل دل میں ان سے ہمدردی رکھتا تھا، انہی کے ساتھ اُن کا میل جول اور انہی کے ساتھ خیر خواہی تھی، اور مؤمنین کی خیر خواہی نہیں کرتے تھے، ان کے ساتھ دوستی نہیں لگاتے تھے، تو یہ ایک نشاندہی کر دی، اُنگلی اُٹھا کر بتا دیا گیا کہ منافقوں کا ٹولہ یہ ہے جن کی ہمدردیاں اور دوستیاں کافروں کے ساتھ ہیں، مؤمنوں کے ساتھ ہمدردیاں نہیں ہیں، اس لئے جو شخص طبعی طور پر کافروں سے مانوس ہے اور مسلمانوں سے مانوس نہیں ہے، اور کافروں کے پاس ہی اُٹھتا بیٹھتا ہے، انہی کے ساتھ ہی خیر خواہی اور ہمدردی رکھتا ہے، تو اگرچہ ظاہری طور پر ایمان کا اظہار کرتا بھی ہو تو یہ علامت ہے کہ یہ مسلوب الایمان ہے، اس کے دل میں ایمان نہیں ہے، مؤمنوں سے اس کو محبت نہیں، مؤمنوں کی خیر خواہی نہیں، اُس کا جتنا رجحان ہے وہ سارے کا سارا کافروں کی طرف ہے، يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: بناتے ہیں کافروں کو دوست مؤمنین کو چھوڑ کر، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بھاگ بھاگ کر ادھر کیوں جاتے ہیں؟ کیا یہ وہاں عزت کے متلاشی ہیں؟ یہ سمجھتے ہیں کہ مؤمنین کے ساتھ ہم مل کر رہیں گے تو ہمیں عزت نہیں ملے گی، کُفّار کے ساتھ ملیں گے تو وہاں ہمارا اِکرام ہوتا ہے، اِحترام ہوتا ہے، وہاں ہمیں عزت ملے گی؟، یہ عزت تلاش کرنے کے لئے ان کافروں کے دروازوں پر جاتے ہیں؟ ان کو سُن لینا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کے ہاں ہی ہے، عزت اسے ملتی ہے جسے اللہ دیتا ہے۔ یہ منافقین کی ایک کمزوری تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ہم ان کافروں کے ساتھ بنا کر رکھیں گے تو یہ کسی وقت بھی ہمارے لئے باعثِ عزت ہو سکتے ہیں، کیونکہ ان کو اِطمینان نہیں تھا کہ مسلمان غالب آئیں گے، کہتے ہیں کہ کبھی وہ وقت آ سکتا ہے کہ یہ کافر دوبارہ غالب آ جائیں، اگر ہماری دوستیاں ان کے ساتھ ہوں گی تو ہم اپنی عزت بچالیں گے، قرآنِ کریم میں سورۂ منافقون میں بھی یہ بات ذکر کی گئی: يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (آیت:۸) وہاں بھی یہی بات ذکر کی گئی کہ عزت ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی وساطت سے اُس کے رسول کو ملے گی اور مؤمنین کو ملے گی، لیکن منافقوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کافروں کے ساتھ تعلق قائم کریں گے تو ہمیں عزت وہیں ملے گی۔ ''کیا یہ ان کے پاس عزت کے متلاشی ہیں؟'' ان کو سُن لینا چاہیے کہ ''عزت ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے'' اب وقت آ گیا کہ یہود و نصاریٰ سے یہ عزت چھین کر مؤمنین کو دے دی جائے گی، اور یہود و نصاریٰ بھی ذلیل ہوں گے، مشرکین بھی ذلیل ہوں گے، اور جو در پردہ ان کے ساتھ ہمدردیاں اور دوستیاں رکھنے والے ہیں، ان کے پلے بھی اب ذلت ہی پڑے گی۔

قَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ: یہ بھی ان منافقین کے کردار پر ہی انکار کرنا مقصود ہے، کہ دعویٰ تو یہ ایمان کا کرتے ہیں، جب ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو پتا نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہوا ہے کہ جس مجلس کے اندر اللہ کی آیات کا انکار کیا جائے اور ان کا اِستہزا کیا جائے وہاں بیٹھنا جائز نہیں ہے، جب یہ صریح طور پر پہلے حکم آچکا ہے تو پھر یہ اُس کی خلاف ورزی کیوں کرتے ہیں؟ اور جب یہ ان کی مجلسوں میں جا کر بیٹھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کو کُفر سے نفرت نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا اِستہزا یہ خوشی کے ساتھ سنتے ہیں، تو پھر یہ یقیناً انہی کے ساتھ ہی ہیں، پھر ان کا مؤمنوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ جو قَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اُتار چکا ہے، اس سے اشارہ ہے سورۂ اَنعام کی اس آیت کی طرف: وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (آیت:۶۸) کہ جب دیکھیں آپ ان لوگوں کو جو ہماری آیات میں گھستے ہیں تکذیب کے طور پر، تو آپ ان سے اِعراض کر جائیے جب تک کہ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں، اگر یہ بات شیطان تمہیں بھلا بھی دے تو یاد آجانے کے بعد پھر ان ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو، اور سورۂ اَنعام مکی ہے، تو یہ آیت مکہ میں اُتر چکی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پڑھی جاتی تھی تو منافقین بھی اس آیت کو سنتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب یہ حکم دیا جاچکا ہے کہ ایسی مجلسوں میں بیٹھنا جائز نہیں ہے تو پھر یہ دوڑ دوڑ کر ان مجلسوں میں جا کے کیوں بیٹھتے ہیں؟ اگر بیٹھو گے تو تمہارا درجہ بھی وہی ہو جائے گا جو ان کا ہے۔

کُفّار کی مجلس میں جانے کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم

اس لیے مسئلہ یہی ہے کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کے اَحکام کا انکار کیا جا رہا ہو، دِین پر پھبتیاں کسی جا رہی ہوں، دِین کی باتوں کا انکار کا جا رہا ہو، اس مجلس میں بیٹھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی شخص اس مجلس میں رضائے قلبی کے ساتھ بیٹھے گا تو واقعتاً کافر ہے، کیونکہ رضا بالکُفر کُفر ہے، اس لیے اگر دل سے خوش ہے، ان کی باتیں خوش ہو کر سنتا ہے، ان کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ شخص بھی کافر ہو جائے گا۔ اور اگر یہ کراہتِ قلبی کے ساتھ بیٹھتا ہے لیکن جا کے بیٹھتا اپنے اختیار سے ہے، کوئی مجبوری نہیں ہے، کراہتِ قلبی کے ساتھ بیٹھتا ہے تو یہ فسق ہے، اور اُس وبال اور لعنت میں یہ بھی گرفتار ہو گا جو اس قسم کی باتوں کی بناء پر کافروں پر پڑے گی، اس عذاب کے اندر یہ بھی مبتلا ہو گا، چاہے حقیقتاً کافر نہ ہو، درجے کا فرق پڑ جائے۔ اور ایک ہے وہاں کسی مجبوری کی بنا پر جانا کہ انسان ایسی مجلس میں پھنس گیا کہ زبان کے ساتھ انکار بھی نہیں کر سکتا، دل میں انتہائی نفرت ہے، اور اُٹھ کر بھی نہیں جا سکتا، حالات ایسے ہو گئے، تو ایسی صورت میں انسان معذور ہے۔ اور اگر انسان وہاں اس خیال سے جائے کہ میں ان کی باتیں سنوں پھر ان کا جواب دوں، جیسے مناظرے کی مجلس میں کفریات سننی پڑتی ہیں اور پھر ان کا جواب دیا جاتا ہے، بحث و مناظرہ میں ان کے اِشکالات کو دُور کیا جاتا ہے، تو ایسی مجلس میں جو باتیں تبلیغ کی نیت کے ساتھ سنی جائیں گی تا کہ بعد میں ان کے اِشکالات دُور کیے جائیں اور ان کو سمجھایا جائے، یعنی ان کے ساتھ بحث و مناظرہ جس طرح سے ہوتا ہے، اُس مجلس میں انسان تبلیغِ دِین کی نیت سے جاتا ہے، اور تبلیغ کی نیت سے جانے کے بعد پھر ان کی باتیں بھی سننی پڑتی ہیں جو کُفر کی ہیں، تو ایسی صورت میں جانا باعث ثواب

ہے،اور ایسے شخص کے لئے تو گنجائش ہے کہ وہاں جائے اوران کے ساتھ بحث کرے،اور بحث کر کے ان کے اِشکالات دُور کرے، اور اس کے علاوہ باقی صورتوں میں اجتناب کرنا چاہیے۔اور وہاں جا کر اگر رغبت اور شوق کے ساتھ بیٹھیں گے اور ایسے لوگوں کے ساتھ محبت لگا کے بیٹھیں گے تو پھر اس وبال کے اندر گرفتار ہوں گے جو ان کافروں پر آئے گا،اس مسئلے کی یہ تفصیل ہے۔

دورِ حاضر کے اہلِ باطل کی مجالس میں جانے کا شرعی حکم

اور یہ بھی یاد رکھئے! مختلف مسلک کے لوگ جو ہم سے نظریاتی نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں، جیسے اہل تشیع، رافضی اور شیعہ ہیں، یا مرزائی ہیں، یا اسی طرح بریلوی طبقہ ہے، جو اپنے وعظوں اور تقریروں میں اس قسم کی باتیں کرتے ہیں جن کو ہم دِین کے خلاف سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک ان کی بعض باتیں قرآنِ کریم کی تحریف کا مصداق ہیں، یا بعض مجلسوں کے اندر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تبرا کیا جاتا ہے اور ان کو برا بھلا کہا جاتا ہے، ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، یا قرآنِ کریم کی تفسیر اس انداز سے کی جاتی ہے جو ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے، تو یہ ساری کی ساری مجلسیں اسی کا مصداق ہیں جس کا ذکر یہاں آرہا ہے کہ جہاں اللہ کی آیات کا انکار کیا جارہا ہے، یا اللہ کے دِین کا اِستہزا اُڑایا جارہا ہے، وہ اپنے خیال کے اعتبار سے چاہے صحیح کہہ رہے ہوں، لیکن ہماری تحقیق کے مطابق اس میں اللہ کی آیات کا انکار لازم آتا ہے، یا دِین کا اِستہزا لازم آتا ہے، ایسی مجلسوں اور ایسے جلسوں میں جانا حرام ہے، کیونکہ جب تم اپنے اختیار کے ساتھ شوق سے جاتے ہو، وہاں جا کر پھر شوق سے بیٹھ کے سنتے ہو، اور وہاں تم انکار نہیں کر سکتے، بیٹھ کر سنتے رہو گے تو انتہائی درجے کی بے غیرتی ہے چاہے دل کے اندر انکار ہی ہو، اور اگر بولو گے تو فساد ہوگا، اور فساد کرنے کا جواز نہیں ہے کہ وہاں جا کر اس طرح کی کوئی بات کرو گے تو اپنا بھی نقصان کرو گے اور اپنے مسلک کو بھی نقصان پہنچاؤ گے، اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ ایسی مجلسوں میں انسان نہ ہی جائے، اور اگر جائے گا تو گناہ میں باقاعدہ شریک ہوگا۔ وہاں جا کر نہ تو آپ ان کو تبلیغ کر سکتے ہیں، نہ آپ کی معلومات میں کوئی ایسا اضافہ ہوتا ہے کہ پہلے آپ نہیں جانتے، اور اب آپ کو پتا چلے گا کہ وہ کیا کہتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں آپ کو پتا ہے، اور آپ کی معلومات میں ہیں جس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں، تو پھر اس قسم کی مجلسوں میں جانا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ کر سننا گناہ سے خالی نہیں، اور وہاں آپ انکار کر نہیں سکتے، کیونکہ اگر انکار کرو گے تو دِینی دُنیوی دونوں اعتبار سے نقصان دِہ ہے، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس مجلس کے اندر کھڑے ہو کر شور مچا دیا کرو کہ یہ کیا بات کی جارہی ہے، کیونکہ پھر یقیناً لڑائی ہوگی، فساد ہوگا، فتنہ پھیلے گا، اور اس کے نقصانات زیادہ ہیں، اور ان کی مجلس میں جا کر اس قسم کا فساد کرنا ہر کسی کے نزدیک جرم ہوگا، کوئی شخص آپ کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا، ہر کوئی آپ سے کہے گا کہ آپ وہاں کیوں گئے؟ یہی وجہ ہے کہ وہاں آپ بیٹھتے ہیں اور بیٹھ کر سنتے ہیں، اور سُن کر آپ کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کے آجاتے ہیں، پتا نہیں ساتھ کچھ ایمان بھی بچا کر لاتے ہو یا نہیں؟ اس لیے مخالفین کے جلسوں میں اور ان کی مجلسوں میں جا کر شریک ہونے کی عادت بہت بُری ہے، یہ کانوں کی شہوت ہے اور یہ بُری بات ہے، اس سے اجتناب چاہیے، امن اسی میں ہے۔ کیونکہ تبلیغ کی نیت سے آپ وہاں نہیں جاسکتے، تو پھر وہاں بیٹھ کر سننا اور چپ کر کے اس کو گوارا کرنا یقیناً بے غیرتی ہے، اور اگر اس میں غلط باتیں آئیں گی، دِین کے خلاف باتیں آئیں گی، اور آپ کی تحقیق کے

مطابق وہ باتیں دین کے خلاف ہیں، یا دین کی باتوں کا مذاق اُڑایا جارہا ہے، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں اور ہمارا ان کے متعلق جو عقیدہ ہے وہ ہمارے ایمان کا ایک جزء ہے، تو ایسی صورت میں ان کے متعلق اگر بری بری باتیں سنی جائیں گی تو کتنی بے غیرتی اور کتنی بے حیائی ہے کہ انسان وہاں جم کر بیٹھا رہے، اس لیے اس میں احتیاط چاہیے، اپنے مسلک کا جلسہ سنو، اپنے مسلک کے لوگوں کی مجلس میں جاؤ، اور دوسرے مسلک کی مجلسوں میں یا ان کے جلسوں میں جانا، پھر خلافِ دین باتوں کو سننا، پھر وہاں خاموش ہو کر بیٹھے رہنا گناہ سے خالی نہیں ہے، اس آیت کے تحت یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

دُوسرے مسلک کی کُتب کا مطالعہ کرنا کس کے لئے دُرست ہے؟

سوال:- دُوسرے مسلک کی کتابیں پڑھنا ٹھیک ہے یا نہیں؟

جواب:- کتابیں پڑھنا اس شرط کے ساتھ کہ آپ اس درجے کے ہیں کہ آپ ان کی معلومات حاصل کر کے ان کی تردید کر سکتے ہیں اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر ان کی کتابیں پڑھنا جائز ہے، اور طالبِ علم کی چونکہ ابھی ایسی پوزیشن نہیں ہوتی، اپنے مسلک کے اوپر پورا احاطہ نہیں ہوتا، اور کتابیں پڑھنے کے ساتھ خواہ مخواہ اِشکالات میں مبتلا ہو کر دماغ خراب ہوتا ہے، اس لئے ہم یہی کہا کرتے ہیں کہ جب تک انسان بالتفصیل اپنے مسلک سے واقف نہ ہو جائے تو غیر مسلک کی کتابیں بھی نہ پڑھے، ہم نے کئی اسی طرح سے بگڑتے ہوئے دیکھے ہیں کہ اپنے طور پر ان کو تحقیق کا جذبہ ہوتا ہے کہ ہم تحقیق کر رہے ہیں، لیکن اپنے اندر صلاحیت اتنی ہوتی نہیں کہ ان کے اعتراض کے اُوپر گرفت کرلیں، تو پڑھتے پڑھتے اسی قسم کے خیالات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ کئی ہم نے ''جماعت اسلامی'' کے لٹریچر سے متاثر ہوتے دیکھے، اور اسی طرح دوسرے جن کو ہم اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے ہیں، جب لوگ ان کی کتابیں پڑھنے لگ جاتے ہیں تو ان کا دماغ بھی خراب ہو جاتا ہے، جب تک اپنے مسلک کا پوری طرح سے احاطہ نہ ہو جائے اُس وقت تک غیر مسلک کتاب دیکھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ ہر شخص کے دماغ میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ غلط بات کو سمجھنے کے بعد پھر اُس کی تردید کماحقہٗ کر سکے، اسی لئے تو حدیث شریف میں صراحتاً آتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب تم دجال کے متعلق سنو کہ وہ آگیا ہے تو اس سے دُور ہٹنے کی کوشش کرنا، اس سے دُور بھاگنا، قریب جانے کی کوشش نہ کرنا، بسا اوقات ایک شخص یہ سمجھے گا کہ میرا ایمان صحیح ہے، میں اپنے عقیدے پر مضبوط ہوں، اور اسی مضبوطی کے خیال سے وہ دجال کے قریب چلا جائے گا، کہ چلو سنوں تو سہی کہ کیا کہتا ہے؟ دیکھوں تو سہی کہ اس کا حال کیا ہے؟ جس وقت وہ دجال کے پاس جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو اتنے شبہات دیے ہوئے ہوں گے، اور اس کے ہاتھ سے اس قسم کے کام ظاہر ہو رہے ہوں گے کہ وہاں جا کر یہ بھی پھنس جائے گا اور کافر ہو جائے گا۔[1] اس لئے عام لوگوں کو حکم یہی ہے کہ اس قسم کے دجال جو آجائیں تو ان سے دُور ہٹا کرو: ''اِيَّاكُمْ وَاِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ''[2] اگر تمہارے پاس دجال آئیں جو غلط باتیں

(۱) ابوداؤد، ج ۲ ص ۲۳۷ باب خروج الدجال/ مشکوۃ ۲/ ۴۷۷ باب العلامات، فصل ثانی، عن عمران.
(۲) مشکوۃ ص ۲۸ عن ابی ہریرۃ/ صحیح مسلم، باب فی الضعفاء والکذابین/ صحیح ابن حبان ج ۱۵ ص ۱۶۹

بیان کرتے ہوں تو ان سے دُور رہو، اُن سے اپنے آپ کو دُور رکھو اور ان کو اپنے آپ سے دُور رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں گمراہی اور فتنے میں ڈال دیں۔ ہر فتنے کے اندر اچھل کر جا پڑنا، کودنا، اور چھلانگ لگا کر اس میں داخل ہو جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا، ہر آدمی میں باطل کی تردید کی صلاحیت نہیں ہوتی، جو مشکلات پیش آتی ہیں اور جو شبہات پیش آتے ہیں ہر انسان ان کو رَدّ نہیں کر سکتا، پھر ان شبہات کے اندر خود مبتلا ہو جاتا ہے، یہ بات جو ذکر کر رہا ہوں انہی روایات کی روشنی میں کر رہا ہوں۔ ہاں البتہ جن کو اللہ نے دل گردہ مضبوط دیا ہے، اور وہ اپنے عقیدے کے پکے ہیں، دوسرے کی بات کو پکڑ سکتے ہیں، تردید کر سکتے ہیں، تو آج تک علمائے حق نے اہل باطل کے ساتھ مناظرے کئے ہیں، اور ان کے خیالات کو سنا بھی ہے اور تردید بھی کی ہے۔ دجال کے پاس بھی ایک شخص جائے گا، ''مشکوٰۃ شریف'' میں روایت موجود ہے کہ ایک شخص جائے گا، دجال اُس کو کہے گا کہ تو مجھے رَبّ مان، وہ کہے گا کہ ہمارا رَبّ کوئی مخفی نہیں ہے، ہم اپنے رَبّ کو پہچانتے ہیں، تُو رَبّ نہیں ہے! وہ اُسے قتل کر دے گا، قتل کرنے کے بعد دوبارہ اُس کو زندہ کرے گا، پھر کہے گا کہ تُو میرے اُوپر ایمان نہیں لاتا؟ وہ کہے گا کہ میری بصیرت تیرے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی کہ تو دجال ہے۔[1] تو جن کا عقیدہ اور جن کے خیالات اتنے پختہ ہوں ان کو تو وہ مجلس نقصان نہیں دیتی بلکہ ان کا وجود باطل کو نقصان پہنچاتا ہے، لیکن یہ پوزیشن ہر کسی کی نہیں ہوتی، اس لئے غیر مسلک کی کتابیں نہ پڑھو، غیر مسلک کی مجلسوں میں نہ جاؤ، اپنے اکابر کی کتابیں دیکھو، اور اپنے بزرگوں کی مجلسوں میں جاؤ، اسی میں ایمان کی حفاظت ہے، ورنہ انسان اپنی اسی جرأت اور دلیری کے اندر اپنے ایمان کا نقصان کر بیٹھتا ہے۔

منافقین کی اِسلام دُشمنی اور اُن سے ہوشیار رہنے کی تاکید

اور یہ منافق ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں تم ہوشیار رہا کرو، چاہے تمہارے اندر شامل ہیں لیکن ہر وقت ان کے دل میں تمنا یہی ہوتی ہے کہ تم کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ، اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ: یعنی الدَّوَائِرَ یہ یَتَرَبَّصُوْنَ کا مفعول نکلے گا، ''تمہارے بارے میں گردشوں کے منتظر رہتے ہیں'' کہ تم کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ۔ اور اگر کبھی تمہیں فتح مل جاتی ہے اللہ کی طرف سے تو پھر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ اس وقت مالِ غنیمت میں حصہ بٹانے کے لئے آ جاتے ہیں۔ اور اگر کبھی کافروں کو حصہ مل جاتا ہے تو پھر ان پر احسان جتاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو تم پر غالب آ گئے تھے ہم نے تو گھیرا ڈال لیا تھا، اگر ہماری ہمدردیاں تمہارے ساتھ نہ ہوتیں تو آج تم نہ بچتے، ہم نے قصہ خراب کر دیا اور تمہیں مؤمنوں سے بچا لیا، اس لئے ہمارا احسان مانو اور جو کچھ تم نے کمایا ہے وہ ہمیں بھی دو، تو لینے کے لئے اور ہاتھ پھیلانے کے لئے وہاں بھی حاضر ہوتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا'' یعنی ان کافروں کے درمیان اور تمہارے درمیان، ان منافقوں کے درمیان اور تمہارے درمیان، اس فیصلے سے عملی فیصلہ مراد ہے کہ اب یہاں تو سارے کے سارے خلط ملط ہو، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر کسی کے درمیان امتیاز کر دے گا۔ ''اور

(۱) بخاری ۱؍۲۵۳ باب لا یدخل الدجال المدینۃ/ مسلم ۲؍۴۰۲ باب فی صفۃ الدجال/ مشکوۃ ۲؍۴۷۵،۴۷۴ باب العلامات، فصل اول۔

اس فیصلے میں اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مؤمنوں کے خلاف کامیابی کی راہ نہیں بنائے گا'' یعنی یہ فیصلہ جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اس میں غلبہ مؤمنین کو ہوگا، یہاں دنیا میں مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مؤمنوں کے خلاف کوئی راستہ نہیں بناتا، کافروں کو غلبہ نہیں دیتا، بلکہ پیچھے چونکہ یوم القیامۃ کا ذکر آیا ہوا ہے کہ اللہ فیصلہ قیامت کے دن کریں گے، اس لیے یہاں بھی مراد ہے کہ قیامت کے دن اس فیصلے میں مؤمنوں کو غالب فرمائیں گے، کافروں کو غالب نہیں کریں گے۔ '' بے شک منافق اللہ سے چالبازی کرتے ہیں'' یعنی ان کا کردار ایسا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں، اللہ کو یہ دھوکا کیا دے سکتے ہیں، اللہ تو ان کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے، کیا مطلب؟ کہ جب یہ اس قسم کی چالبازیاں کرتے ہیں اور ظاہری طور پر ان کو مفاد پہنچ جاتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ہوشیار ہیں، دیکھو! ہم نے کیسے فائدہ اٹھالیا، حالانکہ یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ رَسّی ڈھیلی چھوڑ کر ان کو اور زیادہ عذاب کی طرف لے جا رہا ہے، اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہوتے جا رہے ہیں، '' اللہ تعالیٰ ان کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ ان کو دھوکا دیتا ہے، ان کے خِداع کی اللہ انہیں جزا دے گا'' جس طرح سے چاہو اس بات کو ادا کرسکتے ہو۔

منافقین کی نماز کی کیفیت

'' جب یہ اُٹھتے ہیں نماز کی طرف تو اُٹھتے ہیں سستی کے مارے ہوئے'' کیونکہ نشاط خوشی اور چستی تو عقیدے کے ساتھ آئے گی، اور یہ تو نماز کو مفید چیز سمجھتے نہیں، اور انہوں نے صرف ظاہرداری کے طور پر اُٹھنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر ہم نماز میں حاضر نہ ہوئے تو ہمارا کفر کھل جائے گا، یہ مؤمن ہمیں اپنی جماعت میں بھی شامل نہیں سمجھیں گے، چنانچہ ایسے ہی بات تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں معاشرہ ایسے ہی تھا کہ مؤمن اسے ہی سمجھا جاتا تھا جو مؤمنین کے ساتھ مل کر نماز پڑھتا تھا، اور جو مسجد میں نہ آتا اور مؤمنین کے ساتھ مل کر جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھتا اس کو منافق ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ کافر ہے، مؤمن نہیں ہے، اس وقت معاشرے کی یہی پوزیشن تھی، یہ آج بدبختی غالب آئی ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے تو کیا، مسلمانوں کے لیڈر ہونے کے لئے بھی نمازی ہونا ضروری نہیں ہے، مسجد میں آنا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تو اپنی جگہ رہا، یعنی مسلمانوں کے راہنما اور لیڈر بننے کے لئے بھی یہ شرط نہیں کہ وہ مسجد میں آتا ہو اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہو، چہ جائے کہ مؤمن بننے کے لئے مسجد کی حاضری ضروری ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاشرہ ایسا ہی تھا کہ جو شخص مسجد میں نہیں آتا تھا اور جماعت کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتا تھا اسے مؤمن ہی نہیں شمار کیا جاتا تھا۔ بہرحال منافق آتے تو اس لئے تھے تاکہ جماعت میں شامل رہیں، لیکن دل میں چونکہ عقیدہ نہیں تھا، ایسی صورت میں کوئی چُستی نہیں تھی، بس ایسے ہی مصیبت کے مارے جس طرح ایک چٹی سر پر پڑ گئی جو اُتارنی ہے تو ایسی صورت میں ٹوٹے پھوٹے بدن کے ساتھ نماز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور مقصد ان کا صرف دکھلاوا کرنا ہوتا ہے، يُرَآءُوْنَ النَّاسَ طبیعتوں میں اخلاص نہیں ہے، '' اور نہیں ذکر کرتے اللہ کا مگر بہت کم'' یعنی ظاہرداری کے طور پر ہونٹ ہلا لیتے ہیں کہ کبھی اللہ کا نام لے لیتے ہوں گے، جب وہ شوق کے ساتھ نماز پڑھتے ہی نہیں تو اس میں انہوں نے اللہ کو یاد کیا کرنا ہے؟

منافقین کا تذبذب

مؤمنوں اور کافروں کے درمیان یہ مذبذب ہیں، متردّد ہیں، کبھی اِدھر کو جھکتے ہیں، کبھی اُدھر کو جھکتے ہیں، نہ پوری طرح اِدھر ہیں نہ پوری طرح اُدھر ہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک دفعہ اسی کی مثال میں نے حدیث شریف سے آپ کے سامنے واضح کی تھی، کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کی مثال ''شاۃٍ عائرۃ''[1] جیسی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان میں متردّد ہے، وہ بکرے کی تلاش میں کبھی اِدھر کو ''میں، میں'' کرتی ہوئی جاتی ہے اور کبھی اُدھر کو جاتی ہے۔ تو یہ اپنی شہوت اور خواہش کو پورا کرنے کے لئے کبھی اِدھر کو بھاگتے ہیں کبھی اُدھر کو بھاگتے ہیں، جدہر سے ان کی خواہش پوری ہوتی ہے اُدھر کو متوجہ ہو جاتے ہیں، نہ پوری طرح مؤمنوں کے ساتھ ہیں اور نہ پوری طرح کافروں کے ساتھ ہیں، اصل مقصد ان کا مزہ اُڑانا اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔ ''جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے تو اُس کے لئے راستہ نہیں پائے گا۔''

مؤمنین مخلصین کو نصیحت

منافقین کا کردار سامنے آجانے کے بعد آگے مؤمنین مخلصین کو نصیحت کی جارہی ہے کہ ''اے ایمان والو! تم کافروں کو دوست نہ بناؤ مؤمنین کو چھوڑ کر، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کے لئے اپنے خلاف تم ایک واضح دلیل قائم کر دو؟'' یعنی اگر تمہاری دوستی کافروں کے ساتھ ہوگی تو عذاب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک واضح دلیل ہے، کہ اللہ یہ الزام قائم کر کے تمہیں بھی عذاب میں ڈال دے گا، تو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے خلاف تم سلطانِ مبین نہ قائم کرو، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کے ساتھ دوستی لگانا ایک واضح حجت ہے کہ تمہیں عذاب دیا جائے اور تمہیں بھی جہنّم کے اندر ڈال دیا جائے۔

منافقین کا اَنجامِ بد اور ان کو توبہ کی ترغیب

''بیشک منافق لوگ جہنّم کے نچلے درجے میں ہوں گے'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کافروں سے بھی بدتر ہیں، کیونکہ کھلا کافر دین کے لئے اتنا نقصان دہ نہیں ہوتا، جتنے یہ چھپے ہوئے دشمن نقصان دہ ہوتے ہیں، کہ ظاہری طور پر مؤمن کہلا کر مؤمنوں کی جماعت میں شامل ہیں، اور شکوک شبہات پھیلاتے ہیں، اور اس طرح سے مؤمنوں کی جماعت کو ان کے ہاتھوں نقصان زیادہ پہنچتا ہے، ''ان کے لئے تو ہرگز مددگار نہیں پائے گا''۔ لیکن ان کے لئے بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں، ''جو لوگ توبہ کرلیں'' یعنی نفاق کو چھوڑ دیں، وَاَصْلَحُوْا: اور اپنے ظاہری اعمال کو دُرست کرلیں، کافروں سے رُخ موڑ لیں، ان کی دوستیاں چھوڑ دیں، ہمدردیاں مؤمنین کے ساتھ کرلیں، اور اعتماد اللہ پر کرلیں، اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں، عزّت اور رزق کی تلاش میں کافروں کی طرف نہ جھانکیں، ''مضبوطی کے ساتھ تھام لیں اللہ تعالیٰ کو، اور اپنے دین کو خالص کرلیں اللہ کے لئے'' خلوص آجائے، ظاہرداری نہ رہے، ''تو پھر یہ

---

(۱) مسلم ۲/۳۷۰، کتاب صفات المنافقین/ مشکوٰۃ ج۱ ص۱۷ باب الکبائر فصل اول۔ حدیث کے مفہوم کے لئے دیکھیں مرقاۃ شرح مشکاۃ۔

لوگ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے، اور عنقریب اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اَجرِ عظیم دے گا۔" اگلی آیت میں بھی ترغیب ہے یہ "شکر" کا خطاب مجموعی طور پر اگرچہ جماعت مؤمنین کو ہے، لیکن مقصد منافق ہیں جس طرح پیچھے ذکر چلا آرہا ہے۔ "اے منافقو! اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کے کیا کرے گا" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ کسی کو عذاب نہیں دیتا، تمہارے عذاب دینے پر اللہ کا کوئی کام نہیں اٹکا ہوا، "اگر تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار رہو، اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب کیوں دے گا؟" یعنی نہیں دے گا، "بے شک اللہ تعالیٰ قدر دان ہے علم والا ہے" جو بھی اُس کی طاعت کرے گا، اخلاص کے ساتھ اُس کے دین کو قبول کرے گا تو اللہ قدر کرے گا، اللہ تعالیٰ علیم ہے کہ کسی کی کوئی حرکت اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں رہتی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا بری بات کے ظاہر کرنے کو مگر ایسے شخص کا جہر کرنا جو مظلوم ہو

وَكَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا ﴿١٤٨﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ

اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے﴿١٤٨﴾ اگر تم کسی بھلائی کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ یا

تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ﴿١٤٩﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ

کسی برائی سے درگزر کرو پس بے شک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا قدرت رکھنے والا ہے﴿١٤٩﴾ بے شک وہ لوگ

یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ

جو اللہ کے ساتھ اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فرق ڈال دیں اللہ

وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّیُرِیْدُوْنَ

اور اُس کے رسولوں کے درمیان، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں

اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿١٥٠﴾ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْكٰفِرُوْنَ

کہ اس کے درمیان کوئی راستہ نکال لیں ﴿١٥٠﴾ یہی لوگ ہیں جو بالکل پکے کافر

حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ﴿١٥١﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ

ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے﴿١٥١﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر

وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ

اور اس کے سب رسولوں پر اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، یہی لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کو

اُجُوْرَھُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿١٥٢﴾

ان کے اجر دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے﴿١٥٢﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ:

برائی کے ظاہر کرنے کو، مِنَ الْقَوْلِ کو سُوء کے ساتھ ملا کے ترجمہ کیجئے، بُری بات کے ظاہر کرنے کو یعنی برملا اور علی الاعلان کہنے کو اللہ پسند نہیں کرتا اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: اِلَّا جَهْرَ مَنْ ظُلِمَ، مگر ایسے شخص کا جہر کرنا جو مظلوم ہو، یعنی جس شخص پر ظلم کیا گیا ہے وہ اگر علی الاعلان کسی کے متعلق کوئی بُری بات کہتا ہے تو یہ مستثنیٰ ہے، وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا: اگر تم کسی بھلائی کو ظاہر کرو، اَوْ تُخْفُوْهُ: یا اس کو چھپاؤ، اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ: یا کسی برائی سے درگزر کرو، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا قدرت رکھنے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ: بیشک وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کُفر کرتے ہیں وَرُسُلِهٖ: اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ کُفر کرتے ہیں، وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: اور چاہتے ہیں، ارادہ کرتے ہیں کہ تفریق ڈال دیں، فرق ڈال دیں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان، وَيَقُوْلُوْنَ: اور کہتے ہیں کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ: ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں، وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ: اور بعض کا انکار کرتے ہیں، وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا: اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ نکال لیں ذٰلِكَ کا اشارہ المذکور کی طرف ہے، یعنی کُل پر ایمان لانا، کُل کے ساتھ کُفر کرنا، اس کے بین بین راستہ نکالنا چاہتے ہیں کہ بعض کو مانیں بعض کو نہ مانیں، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا: یہی لوگ ہیں جو بالکل سچے پکے کافر ہیں، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا: اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ: اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ: یہی لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اجر دے گا، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پچھلے پارے کے آخری حصے میں ایمان کے بنیادی اُصول ذِکر کرنے کے بعد کافروں اور منافقوں کا ذکر آیا تھا، خصوصیت کے ساتھ کافروں کی دوستی سے منع کیا گیا تھا، اور منافقین کی علامت یہ ذکر کی گئی تھی کہ وہ کافروں سے دوستی لگاتے ہیں، مؤمنین کو چھوڑ کر ان کے محبت کے جذبات جتنے ہیں وہ سارے کافروں سے متعلق ہیں، اسی مضمون پر پچھلے پارے کا اختتام تھا۔ پہلی آیت لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ کا تعلق ماقبل کے ساتھ دو طرح سے جوڑا گیا ہے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تو ربط اس طرح سے دیا کہ یہ کافر اور منافق جن کا ذکر پیچھے آیا، اُن کی طرف سے اہلِ ایمان کو ایذا بھی پہنچتی تھی، تکلیفیں بھی پہنچتی رہتی تھیں، اُن سے شکوے اور شکایت بھی پیدا ہوتی رہتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کسی کو کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اُس کا اظہار کر سکتا ہے، اور عام طور پر کسی کی غیبت اور کسی کی بُرائی بیان کرنا اللہ کو پسند نہیں ہے، بُری بات کا

ظاہر کرنا یعنی کسی کے اندر کوئی عیب ہے، کسی کے اندر کوئی نقص ہے، اُس کو علی الاعلان کہنا، برملا بیان کرنا، دوسروں کے سامنے اُس کا اظہار کرنا اللہ کو پسند نہیں، جس کے ضمن میں یہ بات آتی ہے کہ غیبت ناپسندیدہ ہے۔

غیبت کا گناہ زِنا سے سخت کیوں ہے؟

کیونکہ غیبت کا حاصل بھی یہی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے، صحابہ کرام کے سامنے ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا ''اَلْغِیْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا''(۱) غیبت زِنا سے بھی زیادہ سخت ہے، وجہ اس کی یہ ذکر کی گئی کہ زانی اگر زنا کرلے پھر اپنے طور پر توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں، کیونکہ زِنا حقوق اللہ میں شامل ہے، اس کی معافی براہِ راست اللہ سے متعلق ہے، یہ حقوق العباد میں نہیں، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دوسرے کی بے عزتی ہوئی اور دوسرے کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو یہ حقوق العباد میں ہونا چاہیے، لیکن یہ حقوق العباد میں نہیں ہے، کیونکہ حقوق العباد میں وہ چیز ہوا کرتی ہے جو بندوں کے حلال کرنے کے ساتھ حلال ہوجائے اور معاف کرنے کے ساتھ معاف ہوجائے، اگر یہ حقوق العباد میں سے ہوتا تو کوئی عورت اگر خوشی کے ساتھ کسی کو اپنے سے استمتاع کرنے کی اجازت دے دیتی یا کوئی شخص اپنی بیوی کے متعلق کسی کو خوشی کے ساتھ اجازت دے دیتا تو حقوق العباد ہونے کی صورت میں یہ جائز ہوجانا چاہیے تھا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ کوئی خوشی کے ساتھ قدرت دے دے تو بھی یہ حلال نہیں، اور صاحبِ حق اگر معاف کرے تو بھی حلال نہیں، معلوم ہوا کہ اس کا تعلق براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ہے، بندوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور غیبت حقوق العباد میں شامل ہے، اور حقوق العباد میں بایں معنی شدت ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اس کو معاف نہیں کرتا، جب تک کہ صاحبِ حق سے معافی نہ لے لی جائے، تو یہ غیبت کی وضاحت آپ نے فرمائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ ؓ سے پوچھا کہ غیبت کیا ہے؟ یا صحابہ ؓ نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ غیبت کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ''ذِکْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ''، تیرا اپنے بھائی کو یاد کرنا، ذکر کرنا ایسی چیز کے ساتھ جس کو وہ پسند نہیں کرتا، یعنی پس پشت اس کو ایسے الفاظ سے ذکر کیا جائے کہ جب اُس کو پتا چلے کہ فلاں شخص نے میرے متعلق یہ لفظ استعمال کیے ہیں، یا فلاں شخص نے میرا یہ عیب دوسرے کے سامنے ذکر کیا ہے، تو اس کو ناگوار گزرے، یہ غیبت کی تعریف ہے۔ تو صحابہ ؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! اگر وہ بات واقعی اس میں موجود ہو جو ہم کہہ رہے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی تو غیبت ہے کہ اس کے واقعی عیب کو ذکر کیا جائے، اور اگر اس میں عیب موجود نہ ہو اور آپ اپنے طور پر جھوٹ بولیں، اپنی طرف سے کوئی عیب گھڑ کر اُس کے ذمے لگائیں، یہ تو بہتان ہے جس کا درجہ غیبت سے بھی اُوپر ہے،(۲) تو اس طرح سے کسی کے متعلق برائی کا اظہار اللہ کو پسند نہیں ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ ج۲ ص۴۱۵ باب حفظ اللسان، فصل ثالث۔ عن ابی سعید وجابر/شعب الایمان رقم: ۶۳۱۵، ۶۳۱۶

(۲) مسلم ج۲ ص۳۲۲ باب تحریم الغیبة/ترمذی ۲/۱۵، باب ما جاء فی الغیبة/مشکوٰۃ ۲/۴۱۲ باب حفظ اللسان، فصل اول، عن ابی ھریرۃ ؓ۔

کن مواقع پر دوسرے کا عیب ظاہر کیا جا سکتا ہے؟

ہاں! البتہ اگر کوئی شخص خاص طور پر کسی کے ظلم کا نشانہ بن گیا تو وہ اگر ظالم کی شکایت کرے اور ظالم کے ظلم کو کسی کے سامنے ظاہر کرے تو یہ لَا یُحِبُّ سے مستثنیٰ ہے، کہ یہ لَا یُحِبُّ میں شامل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو اس قسم کے جہر سے بغض نہیں، کیونکہ جہاں اللہ تعالیٰ کے متعلق لَا یُحِبُّ آئے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس چیز سے نفرت ہے، اللہ اس سے بغض رکھتے ہیں، جس سے اس کا حرام ہونا معلوم ہوتا ہے، اور اِلَّا مَنْ ظُلِمَ کے ساتھ جب اِستثنیٰ آ گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ حرام نہیں، اس کی اجازت ہے، تو کافروں اور منافقوں کے طرف سے بھی اس قسم کی اِیذا پہنچ سکتی تھی، تو علی الخصوص اگر کسی فرد کو کوئی تکلیف پہنچے تو اُسے شکوہ شکایت کی اجازت دے دی، اور عام طور پر کسی کے عیب کو ظاہر کرنے اور کسی کی بُرائی ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ پھر اِلَّا مَنْ ظُلِمَ کے اندر مظلوم کو جو اجازت دی گئی ہے، تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور کو اجازت نہیں صرف مظلوم کو اجازت ہے، کہ وہ ظالم کے ظلم کو ظاہر کر سکتا ہے۔ مفسرین ﷭ لکھتے ہیں کہ اس میں حصر اضافی ہے، حصر اضافی کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علاوہ اوروں کو بھی اجازت ہے جن کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا، اور اس کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ جہاں شرعی فائدہ ہو اور شریعت کسی صحیح غرض کے تحت اگر بات کرنے کی اجازت دیتی ہے، چاہے وہ بات کرنے والا مظلوم نہیں اور کسی ظالم کا اُس کے اُوپر ظلم نہیں ہوا، پھر بھی شرعی مصلحت کے تحت کسی کے عیب کو ظاہر کیا جا سکتا ہے، جیسے رواۃِ حدیث پر علماء جرح کرتے ہیں اور راویوں کے عیب ظاہر کرتے ہیں، یہ ایک شرعی مصلحت کے تحت ہے کہ اگر یہ عیب نہ ظاہر کیے جائیں اور اُن کی حیثیت کو نمایاں نہ کیا جائے تو سچے اور جھوٹے میں امتیاز نہیں کیا جا سکے گا، اور پھر دین کی باتوں کے اندر خلط ملط ہو جائے گا، کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ آپس میں مل جائیں گے، تو دِین کے مسئلے کو نکھارنے کے لئے اور صحیح اور غیر صحیح روایت میں فرق کرنے کے لئے راویوں کے حالات کو ذکر کیا جاتا ہے، تو اس میں مختلف قسم کے حالات آتے ہیں، کسی میں کوئی عیب نکالتے ہیں، کسی میں کوئی عیب نکالتے ہیں، تو یہ جو راویوں پر جرح کی جاتی ہے یہ جرح بھی اگرچہ اظہارِ عیب ہے لیکن ایک شرعی مصلحت کے تحت ہے اس لیے اس کی اجازت ہے۔ اور ایسے ہی آپ خود تو مظلوم نہیں ہیں، لیکن کسی دوسرے کو ظلم سے بچانے کے لئے بسا اوقات کوئی عیب ظاہر کرنا پڑتا ہے، مثلاً آپ کسی سے کوئی رشتہ کرنا چاہتا ہے، جس سے رشتہ کرنا چاہتا ہے اُس میں کوئی واقعی عیب ایسا معلوم ہے کہ جس کی بناء پر آئندہ اس کو نقصان پہنچے گا، اور وہ شخص آپ سے مشورہ پوچھتا ہے، تو آپ کے ذمے ضروری ہے کہ آپ صحیح مشورہ دیں اور اس صاحب معاملہ کے عیب کو ظاہر کر دیں، اسی طرح کسی کے اُوپر زیادتی کرنے کا کہیں مشورہ ہو رہا ہو اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ فلاں شخص فلاں کی عزت لوٹنا چاہتا ہے، فلاں کا مال لوٹنا چاہتا ہے، یا اس کی جان کا نقصان کرنا چاہتا ہے، اس قسم کے لوگوں کے عیب کو ظاہر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں شرعی مصلحت ہے۔ اور ایسے ہی ایک اور صورت بھی ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں: ''کُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًی'' میری ساری اُمت ہی عافیت دی ہوئی ہے کسی

کی غیبت جائز نہیں، "اِلَّا الْمُجَاهِرِیْنَ"(۱) مگر جو معصیت جہاراً کرتے ہیں، علی الاعلان جو گناہوں کے اندر مبتلا ہیں، اس لیے اگر کسی وقت اُن کے کسی عیب کا تذکرہ آجائے تو یہ بھی غیبت میں شامل نہیں ہے۔ غیبت حرام اس لئے ہے کہ اپنے عیب کھلنے سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے، دُکھ محسوس کرتا ہے، یہ ایسے ہے جیسے آپ نے اُس کے بدن کا گوشت کاٹ کر کھالیا، اور بدن کا گوشت کاٹ کر کھانے والی بات تبھی صادق آتی ہے جب وہ تذکرہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو، اور اس کا کوئی مخفی عیب کھول دیا جائے جس سے وہ بے عزت ہو، لیکن جب وہ گناہ کرتا ہی علی الاعلان ہے، اور اپنی زبان کے ساتھ ہی لوگوں کو بتاتا پھرتا ہے، کہ میں نے یہ کیا اور وہ کیا، تو اگر اُس کے اس عیب کو کوئی دوسرا شخص ذکر کرے گا تو اُس کے لئے کوئی باعث تکلیف نہیں، جب وہ اپنی پردہ دری خود کرتا ہے تو دوسرا شخص اگر اُس کی پردہ داری نہ کرے تو معذور ہے، یعنی یہ اظہار غیبت میں شامل نہیں ہوگا، یہ علیحدہ بات ہے کہ اس قسم کے فضول تذکروں سے بھی انسان اپنی زبان کو محفوظ رکھے۔ بہر حال جہاں کوئی شرعی مصلحت ہو وہاں بُرائی کا اظہار جائز ہے، اور جہاں شرعی مصلحت نہ ہو وہاں جائز نہیں ہے۔ اور یہاں خصوصیت کے ساتھ مظلوم کو اجازت دی گئی ہے کہ مظلوم اپنے ظالم کی شکایت کرے اور پھر وہ شکایت بھی ایسے لوگوں کے سامنے ہو جو اس کا تعاون کر سکیں، اس کو ظلم سے بچا سکیں یا ظالم سے انتقام لے سکیں، جیسے کہ عدالت میں جا کر اظہار کرتا ہے، حاکم کے سامنے اظہار کرتا ہے، یا کسی بڑے کے سامنے اظہار کرتا ہے تا کہ اس کی تلافی کر دی جائے تو یہ اظہار مبغوض نہیں، اللہ تعالیٰ کو اس سے نفرت نہیں، اس کی اجازت ہے، یوں بھی اس کا تعلق ماقبل کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

پہلی آیت کا ماقبل کے ساتھ ایک اور ربط

اور اس طرح سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عمومی عنوان کے ساتھ منافقین کی مذمت کی ہے، کہ منافقین درکِ اسفل من النار میں جائیں گے، یہ کافروں سے بدتر ہیں، جہنم کے نچلے درجے میں جائیں گے، ان کی مذمت کر دی گئی، تو جو عیب جماعت کے کچھ افراد میں پایا جائے اصلاح کا طریقہ یہی ہوا کرتا ہے کہ اُس کو بالاجمال عمومی عنوان کے ساتھ ذکر کریں، جس شخص کے اندر وہ بیماری ہوگی اور جو اس کمی اور کمزوری میں مبتلا ہوگا وہ اپنی اصلاح خود کر لے گا، قرآن کریم نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے، اس لئے نام لے کر کسی کو نہیں کہا کہ فلاں منافق ہے اس سے ہوشیار رہو، بلکہ عمومی عنوان ذکر کیا ہے، علامات ذکر کی ہیں، جذبات کا تذکرہ کیا ہے، کہ جن کے اس قسم کے جذبات ہیں وہ منافق ہیں، اور منافقوں کا ایسا کردار ہے، یہ کردار اختیار کرنا ٹھیک نہیں، اپنی نیت میں اخلاص پیدا کریں، دین کو صحیح طور پر قبول کریں، کافروں سے تعلقات توڑ دیں، ورنہ یہ جماعت نقصان اُٹھائے گی، اس قسم کے تذکرے عمومی عنوان کے طور پر ذکر کر دیئے گئے ہیں، متعین کر کے کسی کے متعلق نہیں کہا گیا۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جب آپ کو پتا چلتا کہ جماعت میں کچھ افراد کسی غلطی میں مبتلا ہیں تو چاہے علی الخصوص

---

(۱) بخاری ۲/۸۹۶ باب ستر المؤمن علی نفسہ/ مشکوٰۃ ۲/۴۱۲ باب حفظ اللسان، فصل اول، عن ابی ہریرۃ/ مفہوم حدیث کے لئے دیکھیں مشکوٰۃ کا حاشیہ

ہی معلوم ہوجاتا کہ فلاں شخص نے یہ غلطی کی ہے، لیکن وعظ اور خطبے میں آپ ﷺ خصوصیت کے ساتھ کسی کونشانہ بنا کرنہیں کہا کرتے تھے، بلکہ عمومی عنوان کے ساتھ نصیحت فرماتے: ''مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا''(۱) لوگوں کو کیا ہوگیا کہ وہ ایسے ایسے کام کرتے ہیں، تم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو فتان ہیں، لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں، جیسے حضرت معاذؓ نے ایک دفعہ نماز میں قراءت بہت لمبی شروع کردی تھی جس کی وجہ سے ایک شخص نے نماز توڑ کر اپنی علیحدہ نماز پڑھ لی، اور پھر جا کر حضور ﷺ سے شکایت کی کہ یارسول اللہ! ہم سارا دن تو کام کرتے ہیں اور معاذ اتنی دیر کے ساتھ آتے ہیں، اور آکر سورۂ بقرہ شروع کردیتے ہیں، اور اپنا واقعہ بیان کردیا، تو حضور ﷺ نے بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔(۲) اور ایسے ہی ایک اور واقعہ اس طرح کا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ''(۳) تم میں سے بعض وہ ہیں جو نفرت دلاتے ہیں، بھگانے والے ہیں، تو ''مَا بَالُ اَقْوَامٍ'' کہ لوگوں کو کیا ہوگیا کہ ایسا کام کرتے ہیں، یوں عمومی عنوان کے ساتھ حضور ﷺ ذکر فرمادیا کرتے تھے۔ خصوصی مجلس کے اندر تو خصوصی خطاب کرکے نصیحت کرنا مفید ہوتا ہے لیکن جہاں عمومی وعظ اور عمومی تقریر ہو وہاں عمومی عنوان اختیار کرنا ہی مفید ہوتا ہے، کسی خاص فرد کو نشانہ بنا کر بات کہنا بسا اوقات مزید فتنے کو ہوا دینا بن جاتا ہے، اس سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے، اس لیے عمومی عنوان کے ساتھ ہی کہا جائے۔
تو یہاں بھی یہی بات ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا ذکر عمومی عنوان سے کیا ہے، اور پھر یہ ساتھ نصیحت بھی کی ہے کہ کسی کو نشانہ بنا کر کہ تو منافق، تو ایسا، تو ایسا، اس قسم کی باتوں کو اللہ پسند نہیں فرماتا، یوں بری باتیں ظاہر نہیں کرنی چاہئیں، یہ مصلحت کے خلاف ہے، اس سے جماعت کے اندر زیادہ فتنہ کھڑا ہوجاتا ہے، نفاق کا تعلق قلب کے ساتھ ہے اگر آپ کہیں کہ فلاں شخص منافق ہے، وہ کہے گا کہ میں منافق نہیں ہوں، اس سے تُو تکار شروع ہوجائے گی، آپ کے لئے ثبوت مہیا کرنا مشکل ہوجائے گا، وہ اُلٹ کر آپ کو کہہ دے گا، وہ آپ کی ایسی خامیاں سامنے لاکر کہے گا کہ تُو منافق ہے، تو اس طرح سے ''تُو منافق، تُو کافر، تُو ایسا'' اس قسم کی باتیں بُری ہیں، ایک دوسرے کے متعلق تعیین کے ساتھ کہنے کی ضرورت نہیں، علی العموم اس قسم کا عنوان اختیار کرکے بات کی جائے گی، جس کے اندر کوئی کمی ہوگی، کوئی نقص ہوگا، خامی ہوگی وہ خود سمجھ جائے گا، اور اگر وہ نہیں سمجھے گا تو علامات کے ساتھ آپ تاڑ کر رکھیے کہ یہ علامات کس پر صادق آتی ہیں اور اس سے محتاط رہیے، علی الخصوص کسی کو نشانہ بنا کر اس قسم کی بات نہ کہیے ورنہ فساد پھیلتا ہے۔ تو جهر بالسوء من القول کا مصداق یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ ایک عمومی عنوان کے ساتھ کہی ہوئی بات کو عام ہی رہنے دینا چاہیے، اور کسی کو خاص طور پر نشانہ بنا کر اس قسم کی باتیں کرنا اللہ کو پسند نہیں، یہ مفہوم بھی اس کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

مظلوم کے لئے ظلم کا اظہار جائز ہے، لیکن بہتر نہیں

تو اللہ تعالیٰ بُری بات کے علی الاعلان کہنے کو پسند نہیں فرماتے، ہاں! کوئی مظلوم آدمی اگر ظالم کی بات علی الاعلان کہتا ہے

---

(۱) كان النبی إذا بلغه عن الرجل الشیء لم يقل ما بال فلان يقول ولكن يقول ما بال أقوام يقولون كذا و كذا (ابوداؤد ۲/ ۳۰۴، باب فی حسن العشرة)

(۲) بخاری ۱/ ۹۸ باب من شكا امامه۔ ۲/ ۹۰۱، باب من لم یر اکفار الخ/ مشکوۃ ۱/ ۷۹، باب القراءة فصل اول۔

(۳) بخاری ۱/ ۹۷ باب تخفيف الامام/ مشکوۃ ۱/ ۱۰۱، باب ما علی الامام فصل اول۔

اور کسی کے سامنے کھل کر کہتا ہے تو یہ مستثنیٰ ہے، اس کی اجازت ہے۔ تو اِلَّا کے بعد جو چیز آئے گی زیادہ سے زیادہ اس کی اباحت ثابت ہوگی، یعنی ایسا کہنا ضروری نہیں ہے، اور اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جائے گی، بس اجازت ہے کہ کوئی مظلوم اپنے ظالم کے ظلم کو ظاہر کردے، جیسے کہ آگے کہا جائے گا کہ اگر تم معاف ہی کردیا کرو تو بہتر ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ ظالم کے ظلم کو بھی جہاں تک ہوسکے ٹالنے کی کوشش ہی کرو، اور اگر نا قابلِ برداشت ہوجائے، اور تم دل میں بہت تکلیف محسوس کرتے ہو، کہ جب تک اس کا اظہار نہیں کیا جائے گا دِل ہلکا نہیں ہوگا تو اِجازت ہے، کہہ لیا کرو۔

مظلوم کو تنبیہ

وَكَانَ اللهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے، یہ صفت یہاں ذکر کردی جس میں مظلوم کو بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے، کہ ظالم کی شکایت کے طور پر جو بات بھی تم کرو گے اللہ اس کو سنتا ہے، اور حالات کو بھی جانتا ہے کہ ظالم نے کتنا ظلم کیا، اور تم اس کے مطابق بیان کرتے ہو یا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہو، اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، لہٰذا ظالم کے متعلق بھی بات اگر کہنی ہے تو پوری ذمہ داری سے کہو، اتنی بات ہی کرو جتنی واقع ہوئی ہے، اور اگر ایک کی دس بنا کر کہو گے اور اس طرح مظلوم ہونے کے جذبے کے تحت آکر جھوٹے الزام اُس پر لگانا شروع کردو گے تو اللہ تعالیٰ سب سنتا ہے اور سب جانتا ہے، پھر یہ جرم تم پر قائم ہوجائے گا۔

اَخلاقِ عالیہ اپنانے کے لئے سب سے بڑا اُصول

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا: اگر تم کوئی اچھی بات ظاہر کرو، نیکی ظاہر کر کے کرو، اَوْ تُخْفُوْهُ: یا تم اس کو چھپاؤ، اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ: یا کسی بُرائی سے تم درگزر کر جاؤ، فَاِنَّ اللهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا: پس بیشک اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا قدرت رکھنے والا ہے۔ اس میں اصل کے اعتبار سے عفو عن السوء کی ترغیب دینی مقصود ہے، کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کر ہی لیتا ہے تو حتی الوسع اسے معاف کردیا کرو، چاہے انتقام لینے کی اجازت ہے لیکن معاف کردینا بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی صفت ذکر فرمائی عفو اور قدیر، یعنی اللہ تعالیٰ صاحبِ عفو ہے، درگزر کرنے والا ہے، قدیر ہے، صاحبِ قدرت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کے اندر اگر کوئی شخص خلل ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ انتقام لے لے، ہر طرح سے وہ قادر ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود اُس نے عفو اپنی صفت قرار دے رکھی ہے، کہ اکثر و بیشتر درگزر کر جاتا ہے، کبھی کہیں پکڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کا معاملہ جو بندوں کے ساتھ چلتا ہے اُس میں عفو کا معاملہ زیادہ ہے اور انتقام کبھی کبھی ہوتا ہے، گرفت کبھی کبھی ہوتی ہے، تو یہاں جو صفاتِ الٰہیہ ذکر کی گئی ہیں ان کے ذکر کرنے سے مقصد بھی یہی ہے کہ تم بھی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ کو اختیار کرو، اللہ کی عادات کو اپناؤ، کہ جس طرح اللہ تعالیٰ قدرت کے باوجود معاف کردیتا ہے اسی طرح اگر تمہیں ظالم پر قدرت بھی حاصل ہوجائے تو اس سے درگزر کرنے کی کوشش کیا کرو۔ یہ اخلاقِ عالیہ کا ایک بہت بڑا اُصول ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جو ہمارے سامنے آئی ہوئی ہیں، اللہ کے اسماء کے تحت جو اُس کی صفات مذکور ہیں، ان صفات کے مطابق عمل اختیار کرنا، اِس کو تَخَلُّقْ بِاَخْلَاقِ اللهِ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عادات کو اپنانا یہ اخلاقِ عالیہ کا بہت بڑا اصول ہے، یہاں بھی اسی طرح ہے کہ قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خُلق ہے، اور بندوں کو چاہیے کہ اسی خلق کو اپنائیں، جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا: یَارَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ: اے اللہ! تیرے بندوں میں سے تجھے سب سے زیادہ عزیز اور پیارا بندہ کون سا ہے؟ تیرے بندوں میں سے زیادہ باعزت تیرے نزدیک کون سا ہے؟ قَالَ: مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نزدیک عزیز ترین بندہ وہ ہے جو قدرت پانے کے بعد معاف کردے۔[1] اور جب انتقام لینے کی قدرت ہی نہ ہو پھر تو معاف کرنا ہی کرنا ہے، وہ تو جیسے کہا کرتے ہیں کہ "مجبوری کا نام صبر"، لیکن جو قابلِ تعریف بات ہے وہ ہے قدرت پانے کے بعد معافی، کہ تم قادر ہوگئے، اگر چاہتے تو تم اس سے انتقام لے سکتے تھے، جس نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے اُس کو تم نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن اس کے بعد اگر تم معاف کردو یہ اخلاقِ عالی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے، انتقام لینے کی اجازت ہے اور معاف کردینا بہتر ہے۔ اور اگر انتقام لینا ہو تو اس میں بھی پھر پابندی شرعی طور لگائی گئی کہ موازنہ برقرار رکھنا ہوگا، یہ نہیں کہ جوش میں آکر تم اُس کو زیادہ نقصان پہنچادو، اگر اِنتقام لینا چاہتے ہو اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (سورۂ نحل:۱۲۶) کہ جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے اس کے برابر تکلیف پہنچا کر تم انتقام لے سکتے ہو، لیکن اگر صبر کرلو اور معاف کردو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے عفو اور قدیر کو جوذکر کیا تو اس کا مقصد یہی ہے کہ جیسے اللہ قادر ہونے کے باوجود درگزر کرتا ہے اور معاف کرتا ہے، تم بھی اگر اپنے ظالم پر قادر ہو جاؤ، انتقام لینے کی تمہیں قدرت حاصل ہو جائے پھر درگزر کر جاؤ تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اہلِ کتاب کے کُفر کو نمایاں کرنے کا مقصد

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ: درمیان میں نصیحت کرنے کے بعد پھر وہی کافروں کا ذکر آگیا، خصوصیت سے یہاں اہلِ کتاب کا کُفر ظاہر کرنا مقصود ہے، اور مدینہ منورہ کے ساتھ چونکہ یہود ہی آباد تھے، اور یہود کے ساتھ تعلقات کی بنا پر ہی بعض لوگوں نے نفاق اختیار کر رکھا تھا، اس لیے جن لوگوں کی ان یہود کے ساتھ دوستیاں تھیں جب اُن کے سامنے کُفر کے عنوان کے ساتھ ان یہود کا ذکر آتا تو بعض لوگ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی تاویلیں کرتے ہوں کہ کافروں سے مشرکینِ مکہ مراد ہیں، اور یہ یہود کافر نہیں، یہ تو اللہ کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں، اللہ کے رسولوں پر ان کا ایمان ہے، اللہ کی کتاب ان کے پاس ہے، تو ان کا کُفر دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہے، اس لئے ان کے ساتھ تعلقات میں کوئی خرابی نہیں، یہ اہلِ علم میں سے ہیں اور ساری چیزیں مانتے ہیں جتنی ماننی چاہئیں، تو یوں مغالطہ دے سکتے تھے۔ اور اسی طرح یہود بھی اپنے آپ کو مؤمنین میں شمار کرتے تھے، کہ ہم بھی مؤمن ہیں، کیونکہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، اللہ کے رسول کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں، اللہ کی کتاب کو مانتے ہیں...... یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اہلِ کتاب کے ساتھ ہمارا اختلاف صرف سرورِ کائنات ﷺ کی ذات پر ایمان لانے کے اعتبار سے ہی ہے، کہ مؤمنین حضور ﷺ پر ایمان لے آئے اور اہلِ کتاب حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے، چاہے عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے "عیسائی" کہلائیں، چاہے موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے "یہودی" کہلائیں، "موسوی" کہلائیں، فرق یہیں آکر پڑا، ورنہ جتنے بھی اہلِ کتاب ہیں وہ آخرت کے قائل ہیں، اللہ تعالیٰ کے قائل ہیں، اور توحید کے مدعی تھے، اور اپنے خیال کے مطابق وہ مشرک نہیں تھے، کتاب کو مانتے تھے،

(۱) مشکوٰۃ ص ۴۳۴ باب الغضب، فصل ثالث، عن ابی ہریرۃؓ / شعب الایمان ج ۱۰ ص ۵۵۰۔

فرشتوں کو مانتے تھے، جنات کو مانتے تھے، باقی جتنی ضروریاتِ دین ہیں سب کو تسلیم کرتے تھے، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کا انکار کردیا..... تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ یہی ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ رسولوں میں سے کسی ایک رسول کا انکار کرنے والا بھی بالکل اسی طرح سے ٹھوس اور پکا کافر ہے جس طرح سے کوئی سرے سے خدا تعالیٰ کے وجود کا انکار کردے، بلکہ اِن کا کُفر زیادہ غلیظ ہے بایں معنی کہ یہ جاننے کے باوجود انکار کرتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کے طرف سے کتاب کے نزول کو یہ مانتے ہیں اور باقی سب چیزوں کو مانتے ہیں، اور ان کی کتابوں کے اندر پیش گوئیاں بھی موجود ہیں، پھر بھی اگر یہ قرآن کو نہیں مانتے تو ان کا کُفر اور بھی زیادہ نمایاں ہوگیا، لہٰذا ان کو بھی بالکل دوسرے کافروں کی طرح سمجھو، یہ نہیں کہ ان کے کُفر کے اندر کسی قسم کی خفت ہے یا ہلکا پن ہے، بلکہ جیسے دوسرے کافر ہیں ویسے یہ کافر ہیں۔ تو اس آیت کے اندر ان یہود کے کُفر کو زیادہ نمایاں کرکے ذکر کیا گیا ہے کہ پیچھے جو منع کیا گیا تھا کہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کے ساتھ دوستی نہ لگاؤ، تو کافرین کا مصداق یہ یہود بھی ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: بیشک جو لوگ اللہ کا انکار کرتے ہیں اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور ارادہ کرتے ہیں کہ فرق ڈال دیں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان، کہ اللہ کو مانیں اور رسولوں کو نہ مانیں، یا یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں بعض پر اور انکار کرتے ہیں بعض کا، یہ اپنی زبان سے کہتے تھے، مثلاً یہودی عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے تھے اور اسی طرح حضور ﷺ کو بھی نہیں مانتے تھے اور باقی پیغمبروں کو مانتے تھے، عیسائی باقی پیغمبروں کو مانتے تھے حضور ﷺ پر اِیمان نہیں لاتے تھے، تو بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ تو یہاں ذکر یہ ہوگیا کہ کوئی اللہ کا انکار کرے تو بھی وہی بات ہے، سارے رسولوں کا انکار کرے تو بھی وہی بات ہے، اور بعض کو مانے بعض کو نہ مانے تو بھی وہی بات ہے، یہ سارے کا سارا کُفر ہے، ایسا کرنے والا شخص مؤمن نہیں، اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ''کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں بعض پر اور کُفر کرتے ہیں بعض کے ساتھ، اور ایمان اور کُفر کے درمیان میں یہ راستہ نکالنا چاہتے ہیں'' کہ سب کو ماننا، سب کا انکار کرنا، اس کے درمیان درمیان یہ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، ایسا کوئی راستہ نہیں، یا تو اِنسان پوری طرح سے کافر ہوگا یا پوری طرح سے مؤمن ہوگا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ درمیان میں کوئی راستہ نکال لے، کہ بعض کو مانے اور بعض کو نہ ماننے کی صورت میں مؤمن بن جائے، ایسا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لئے فرمادیا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا: یہ لوگ بالکل سچے پکے کافر ہیں، اِن کے کُفر میں کوئی شک نہیں۔

ضروریاتِ دِین میں سے ایک کا انکار، سارے دِین کا انکار ہے!

اسی سے وہ اُصول نکلتا ہے کہ ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک بات کا انکار کرنے والا بھی ایسے ہی کافر ہے جیسے سارے دین کا انکار کرنے والا، پھر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم کسی کو کافر کیسے کہیں وہ تو اللہ کو مانتا ہے، وہ تو کلمہ پڑھتا ہے، وہ تو حضور ﷺ کا نام لیتا ہے، وہ تو فلاں کام کرتا ہے، اِس کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ ایمان کو اپنی اصطلاح میں یوں سمجھ لیجئے کہ یہ موجبہ کلیہ ہے، تمام ضروریات کو ماننا ایمان ہے، اور موجبہ کلیہ کی نقیض آپ کے ہاں سالبہ جزئیہ ہے، کہ اگر ایک فرد پر بھی وہ حکم ثابت نہ کیا جائے تو موجبہ کلیہ ٹوٹ جاتا ہے، تو ایمان ایجابِ کلّی کے درجے میں ہے کہ جتنی بھی ضروریاتِ دین ہیں سب کو تسلیم کرو تب مؤمن بنوگے،

لیکن کافر ہونے کے لئے سب کا انکار ضروری نہیں، بلکہ ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار کر دو گے تو سلبِ جزئی متحقق ہو گیا، جب سلبِ جزئی متحقق ہو گیا تو ایجابِ کلّی ختم ہو گیا، اس لیے ایک چیز کا انکار کرنے سے بھی انسان ایسے ہی کافر ہوتا ہے جیسے سارے دین کا انکار کرنے سے کافر ہوتا ہے۔ عام طور پر جو ضروریاتِ دین والا اُصول آپ کے سامنے ذکر کیا جاتا ہے وہ اسی قسم کی آیات سے نکلتا ہے، کہ ساری ضروریاتِ دین کو تسلیم کرنا ایمان ہے، اور اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دیا جائے تو ایسے ہی کفر ہے جیسے سارے دین کا انکار کر دیا۔ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا: اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: اور جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، سب پر، کسی کو نہیں چھوڑتے، لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ: اُن میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، یہاں فرق ڈالنا ماننے نہ ماننے کے اعتبار سے ہے، کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں ایسا فرق نہیں ڈالتے، بلکہ سب کو تسلیم کرتے ہیں، یہ لوگ مؤمن ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اجر دے گا، اس لئے ہم سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے والے مؤمن تبھی سمجھے جائیں گے جب ہم موسیٰ علیہ السلام کو بھی مانیں، عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مانیں، اگر کوئی شخص کلمہ پڑھتا ہے، اور کسی ایسے نبی کی نبوّت کا انکار کرتا ہے جس کی نبوّت دلائلِ قطعیہ کے تحت ثابت ہے، تو ایسی صورت میں حضور ﷺ کا نام لینا بھی اس کے لئے کوئی مفید نہیں ہے، وہ ویسے ہی کافر کا کافر ہے، "ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، یہ لوگ مؤمن ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ ان کے اُجور دے گا" وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ

سوال کرتے ہیں آپ سے اہلِ کتاب کہ اُتاریں آپ اُن پر کتاب آسمان سے پس تحقیق

سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ

سوال کیا انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز کا پس کہا انہوں نے کہ دکھاؤ ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا، پھر پکڑ لیا انہیں

الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

کڑک نے اُن کے ظلم کے سبب سے، پھر بنایا انہوں نے بچھڑے کو معبود بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح

الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا

دلائل آ گئے پھر ہم نے اس سے بھی درگزر کیا، اور ہم نے موسیٰ کو بہت واضح غلبہ دیا ﴿۱۵۳﴾ اور اُٹھایا ہم نے

فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ

ان کے اُوپر طور ان کے میثاق کے ساتھ، اور ہم نے انہیں کہا کہ داخل ہو جاؤ تم دروازے میں جھکتے ہوئے اور ہم نے انہیں کہا

لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿١٥٤﴾ فَبِمَا

کہ ہفتے کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرو اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا ﴿١٥٤﴾ ان کے

نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ

اپنے عہد کو توڑ دینے کی وجہ سے اور ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے اللہ کی آیات کے ساتھ، اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء کو

حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ

ناحق اور ان کے کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل پردے میں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ان کے کُفر کی وجہ سے،

فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥٥﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا

پس یہ نہیں ایمان لاتے مگر بہت کم ﴿١٥٥﴾ اور ان کے کُفر کی وجہ سے اور ان کے مریم پر بہتان عظیم بولنے کی

عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ

وجہ سے ﴿١٥٦﴾ اور ان کے کہنے کی وجہ سے کہ بے شک ہم نے قتل کر دیا مسیح کو یعنی عیسیٰ بن مریم کو جو اللہ کا

اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ

رسول ہے، حالانکہ انہوں نے اُس کو قتل نہیں کیا اور نہ اسے سولی پر چڑھایا لیکن ان کے لئے شُبہ ڈال دیا گیا، اور بیشک

الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ

وہ لوگ جو عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ اس کی طرف سے تردّد میں ہیں، اُن کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں

اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿١٥٧﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ

سوائے خیالات کی اتباع کے، یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے اُس کو قتل نہیں کیا ﴿١٥٧﴾ بلکہ اللہ نے اُس کو اپنی طرف اُٹھا لیا،

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا

اور اللہ تعالیٰ غلبے والا ہے حکمت والا ہے ﴿١٥٨﴾ اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں مگر

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ

البتہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ پر عیسیٰ کی موت سے پہلے، اور قیامت کے دن عیسیٰ اُن پر

شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ

گواہ ہوں گے ﴿۱۵۹﴾ جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کے سبب سے ہم نے حرام کر دیں اُن پر

طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

پاکیزہ چیزیں جو پہلے ان کے لئے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت روکنے کی وجہ سے ﴿۱۶۰﴾

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ

اور ان کے سُود لینے کی وجہ سے حالانکہ یہ روکے گئے ہیں سُود لینے سے، اور ان کے کھانے کی وجہ سے لوگوں کے مالوں کو

بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ

غلط طریقوں سے، اور ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں ﴿۱۶۱﴾ لیکن

الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں ان میں سے اور ایمان لانے والے ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر جو اُتاری گئی

اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

آپ کی طرف اور اُس چیز پر جو اُتاری گئی آپ سے قبل اور وہ لوگ جو نماز کو قائم کرنے والے ہیں اور جو زکوٰۃ دینے والے ہیں

وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

اور جو ایمان لانے والے ہیں اللہ پر اور یوم آخر پر، یہی لوگ ہیں کہ ہم ان کو عنقریب اَجرِ عظیم دیں گے ﴿۱۶۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ: سوال کرتے ہیں آپ سے اہلِ کتاب کہ اتاریں آپ ان پر کتاب آسمان سے فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ: پس تحقیق سوال کیا انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑی چیز کا۔ شَيْئًا اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ۔ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً: پھر کہا انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو۔ اَرِ اَمر کا صیغہ، نَا مفعول۔ اَرِنَا: دکھا

ہمیں اللہ تعالیٰ جَهْرَةً: رُؤْيَةً ذاتَ جهرةٍ، کھلم کھلی رُویت، ''دِکھا تُو ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا'' یعنی بالکل آمنے سامنے، فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ: پھر پکڑ لیا انہیں کڑک نے بِظُلْمِهِمْ: ان کے ظلم کے سبب سے، ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ: اتَّخَذُوا کا دوسرا مفعول محذوف ہے، پھر بنایا انہوں نے بچھڑے کو معبود بعد اس کے ان کے پاس واضح دلائل آگئے، فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ: پھر ہم نے اس سے بھی درگزر کیا، عَفَا: درگزر کرنا، وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت واضح غلبہ دیا، سلطان غلبے کو بھی کہتے ہیں، رُعب اور دبدبے کو بھی کہتے ہیں، دلیل، سند، حکومت یہ سارے اس کے معنی آتے ہیں، ''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت واضح رُعب دیا، یا بہت واضح غلبہ دیا''، وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ: اور اُٹھایا ہم نے ان کے اوپر طور بِمِيْثَاقِهِمْ: ان کے میثاق کے ساتھ، یعنی جب ہم میثاق لے رہے تھے اس وقت ہم نے ان کے اُوپر طور کو معلق کیا، جیسے کہ سورۂ بقرہ میں جو لفظ آئے ہیں وہاں اَخذِ میثاق کا ذکر پہلے ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (آیت: ٦٣)۔ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا: اور ہم نے کہا انہیں کہ داخل ہو جاؤ تم دروازے میں جھکتے ہوئے، سُجَّدًا ساجد کی جمع ہے، وَقُلْنَا لَهُمْ: اور ہم نے انہیں کہا لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ: ہفتے کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرو، وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا: اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: میثاق، نقض کا مفعول ہے، اور نقض مصدر ہے، اس کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اور فَبِمَا کے اندر ''مَا'' زائدہ ہے، ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے کے سبب سے، وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ: اور ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے اللہ کی آیات کے ساتھ، اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء کو ناحق، وَقَوْلِهِمْ: اور ان کے کہنے کی وجہ سے قُلُوْبُنَا غُلْفٌ: غُلف، اَغلف کی جمع ہے، اغلف اس چیز کو کہتے ہیں جس پر غلاف چڑھا ہوا ہو، ''ہمارے دِل پردے میں ہیں، ہمارے دِل غلاف میں ہیں'' بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: ان کے دِل غلاف میں نہیں جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں پر مُہر لگادی ان کے کُفر کی وجہ سے پس یہ نہیں ایمان لاتے مگر بہت کم، وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا: اور ان کے کُفر کی وجہ سے، اور ان کے مریم علیہا السلام پر بہتانِ عظیم بولنے کی وجہ سے، بہتانِ عظیم لگانے کی وجہ سے، قول کا مفعول بُهْتَانًا عَظِيْمًا ہے، یعنی چونکہ انہوں نے مریم علیہا السلام کے متعلق ایک بہت بڑی خلافِ واقع بات کہی اس کے سبب سے، وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ: اور ان کے کہنے کی وجہ سے کہ بیشک ہم نے قتل کر دیا مسیح کو یعنی عیسیٰ ابنِ مریم کو جو اللہ کا رسول ہے، وَمَا قَتَلُوْهُ: حالانکہ انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا، وَمَا صَلَبُوْهُ: اور نہ انہوں نے اسے سُولی پہ چڑھایا، وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ: لیکن ان کے لئے شُبہ ڈال دیا گیا، شُبِّهَ لَهُمْ کا ترجمہ اسی طرح سے کرنا ہے، ان کے لئے اِشتباہ واقع کر دیا گیا، وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ: اور بیشک وہ لوگ جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ: وہ اس کی طرف سے تردّد میں ہیں، شک میں ہیں، مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ: ان کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں، اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ: سوائے خیالات کی اِتباع کے، ظن سے مراد خلافِ دلیل بات ہے، اور علم سے مراد ایسی بات ہے جو مدلل بالدلیل ہو، ''عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کو کوئی علم نہیں سوائے خیالات کی اتباع کے'' وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا: یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ: بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اُٹھا لیا، وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ غلبے والا ہے حکمت والا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں، اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ: مگر البتہ ضرور ایمان لائے گا اس پر قَبْلَ مَوْتِهٖ: اس کا

ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے، تفسیر میں بات آجائے گی، عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے قبل، یا وہ اہلِ کتاب اپنی موت سے قبل ۔ مَوْتِہٖ کی ضمیر اہلِ کتاب کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، یعنی اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں مگر البتہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی موت سے پہلے، یا اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں مگر ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے قبل، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا: اور قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام ان پر گواہ ہوں گے۔ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ: ان لوگوں کے ظلم کے سبب سے جو یہودی ہوئے، جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کے سبب سے ہم نے حرام کردیں ان پر پاکیزہ چیزیں، اُحِلَّتْ لَهُمْ: جو پہلے ان کے لئے حلال کی گئی تھیں، وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا: اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت روکنے کی وجہ سے، یا بہت لوگوں کو روکنے کی وجہ سے، اس کا تعلق بھی حَرَّمْنَا کے ساتھ ہی ہے، وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا: اور ان کے سُود لینے کی وجہ سے، وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ: حالانکہ یہ روکے گئے ہیں سُود لینے سے، وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ: اور ان کے کھانے کی وجہ سے لوگوں کے مالوں کو غلط طریقوں سے، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: اور تیار کیا ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک عذاب ۔ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ الخ: لیکن وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں ان میں سے اور ایمان لانے والے ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو اُتاری گئی آپ کی طرف اور اس چیز پر جو اُتاری گئی آپ سے قبل، وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ: اَلْمُقِيْمِيْنَ کا عطف اَلْمُؤْمِنُوْنَ پر ہی ہے، عطف کے تقاضے سے اَلْمُقِيْمِيْنَ کو مرفوع ہونا چاہیے تھا، وَالْمُؤْمِنُوْنَ والمقیمون، رفعی حالت اس پر ہونی چاہیے تھی لیکن یہاں اس کو نصبی حالت میں پڑھا گیا ہے مقیمین، یہ نصب علی الاختصاص ہے یا نصب علی المدح جس کو آپ کہتے ہیں، ترکیب بدلنے کے ساتھ ہی مدح کی طرف یا ان کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہو گیا، یعنی خصوصیت کے ساتھ میں ذِکر کرتا ہوں ان لوگوں کا جو نماز کو قائم کرنے والے ہیں، وَالْمُؤْتُوْنَ: یہ اسی طرح قاعدے کے مطابق مرفوع ہے، اور وہ لوگ جو زکوٰۃ دینے والے ہیں، وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اور وہ لوگ جو ایمان لانے والے ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر، اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا: یہی لوگ ہیں کہ ہم ان کو عنقریب اَجرِ عظیم دیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں علی الخصوص یہود کا ذکر آیا تھا، جو بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، ان آیات میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا، اس کا اوّلین مصداق یہود تھے جیسے کہ آپ کے سامنے اس کی تفصیل آچکی، اور آج یہ رُکوع جو آپ کے

سامنے پڑھا گیا یہ اوّل سے لے کر آخر تک یہود کے اَحوال پر ہی مشتمل ہے، اور اس میں اُن کے کچھ جرائم شمار کرائے گئے جو قومی سطح پر اُن کے اندر پائے گئے تھے، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو ان کا معاملہ تھا وہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس ذکر کرنے سے مقصد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے، کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور آپ کے ساتھ ہر روز گڑبڑ کرتے رہتے ہیں، نئے نئے اعتراض اُٹھاتے رہتے ہیں تو آپ اس پر تعجب نہ کیجئے، ان لوگوں کا مزاج یہی ہے اور ان لوگوں کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ یہ حق کے مقابلے میں ہمیشہ حیلہ جو واقع ہوئے ہیں، اور جو ان کو حق کی تلقین کرنے کے لئے آتے ہیں اُن کے مقابلے میں ہمیشہ یہ سرکشی کرتے ہیں۔ مختلف واقعات کی طرف اشارے کر کے جماعتی سطح پر ان کا مزاج واضح کیا گیا ہے، اور جتنے واقعات اس رکوع کے اندر ذکر کئے گئے ہیں، یہ سارے کے سارے بالتفصیل آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں اور کچھ سورۂ آل عمران میں گزر چکے ہیں، اس لئے ان کی زیادہ تفصیل اور تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی، چونکہ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

یہود کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مطالبہ اور اس کا مسکت جواب

پہلے ان کی طرف سے جو سوال ذکر کیا گیا ہے یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ، اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ یہودی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور آ کر ذکر کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے لکھی لکھائی کتاب دی تھی، اور موسیٰ علیہ السلام لکھی لکھائی کتاب لے کر آئے تھے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے رسول ہیں جس طرح آپ کہتے ہیں تو آپ بھی اسی قسم کی کوئی لکھی لکھائی کتاب لائیں، ہم مان جائیں گے، ورنہ یہ صورت جو آپ بتلاتے ہیں اس کو تسلیم کرنے کے لئے ہم تیار نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے، اگر ہر شخص کی مرضی کے مطابق اُس کے سامنے آیات اور معجزات ظاہر کئے جائیں تو کوئی نظم ٹھیک رہ ہی نہیں سکتا، نبی کی نبوّت کو ثابت کرنے کے لئے مطلقاً معجزے کی ضرورت ہے، اور جو شخص کہے کہ ایسا معجزہ دکھا دو، ویسے ہی دکھایا جائے تب جا کر وہ ایمان لائے اور اس کی فرمائش پوری کردی جائے، یہ دروازہ نہیں کھولا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کی حکمت جس طرح سے ہو اس طرح سے تو وہ آیات کو ظاہر کرتے ہیں، اگر لوگوں کے مطالبے کو یہ اہمیت دے دی جائے کہ جیسے مطالبہ وہ کریں ویسے ہی کر کے دکھایا جائے تو ایسے موقع پر تو ہر شخص پھر اللہ کی قدرت کا امتحان کرنے کے لئے بیٹھ جائے گا، کوئی کہے گا کہ میں تب مانوں گا سورج کو مشرق کی طرف سے چڑھاؤ، کوئی کہے گا تب مانوں گا مغرب کی طرف سے چڑھاؤ، کوئی کہے گا شمال کی طرف سے لاؤ، کوئی کہے گا جنوب کی طرف سے لاؤ، بالکل متضاد اور اُلٹ پلٹ قسم کے مطالبے شروع کردیں گے، تو اس طرح سے بات نہیں بنا کرتی، اُلٹا بگڑ جایا کرتی ہے۔ آج بھی عدالت کا اُصول ہے کہ مدّعی جو بھی دعویٰ کرے اُس کو چاہیے کہ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے گواہ پیش کرے، جو گواہ وہ پیش کرے اُن گواہوں پر جرح کرنے کا حق تو مدعا علیہ کو ہوتا ہے کہ یہ معتبر ہیں یا نہیں، لیکن یہ حق مدعا علیہ کو کوئی عدالت بھی نہیں دیتی کہ مدعا علیہ کی فرمائش کے مطابق گواہ پیش کئے جائیں کہ فلاں شخص گواہی دے تو میں مانوں گا، اور فلاں گواہی دے تو میں نہیں مانتا، گواہ متعین کرنے کا حق مدعا علیہ کو نہیں ہوتا، گواہ مدّعی پیش کرے گا، باقی مدعا علیہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ ان گواہوں پر جرح کرے کہ یہ معتبر ہیں یا نہیں، ان کی شہادت کے ساتھ دعویٰ ثابت ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، یہ بحث کرنے کا تو حق ہوتا ہے، باقی! اگر وہ

مطلقاً کہے کہ میں اس گواہ کی گواہی نہیں مانتا، فلاں شخص آ کر گواہی دے تو میں مانوں گا، یہ حق مدعا علیہ کو نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو بھی نبی آیا اللہ تعالیٰ نے اُس کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے معجزات دیے، اُن معجزات پر تو تم بحث کرو کہ اس میں معجزہ ہونے کی حیثیت کہاں تک ثابت ہے اور کہاں تک ثابت نہیں؟ یہ مدعا کو ثابت کرتے ہیں یا نہیں کرتے؟ ان کی دلالت اپنے مدعا روا ضح ہے یا نہیں ہے؟ یہ تو بحث کرنے کا حق ہے، باقی یہ کہنا کہ ''فلاں کام کر کے دکھاؤ، ہم تب مانیں گے!'' یہ کہنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو پھر ہر شخص کی نئی نئی فرمائشیں ہوں گی، اور دُنیا کا اور کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اگر ہر کسی کے مطالبے کو یوں پورا کر دیا جائے۔ یہاں انہوں نے جو مطالبہ کیا تھا یہ بھی ایسا ہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تو لکھی لکھائی کتاب لائے تھے، آپ بھی لائیں، حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے آسمان سے لکھی لکھائی کتاب ہی اُتاری جائے، اگر یہ دلیل مان لی جائے تو کس کس نبی کی نبوت کو آپ اس انداز سے ثابت کریں گے؟ بعض نے تو کتاب سے یہی مراد لیا ہے کہ لکھی لکھائی کتاب لاؤ جس طرح موسیٰ علیہ السلام لائے تھے تب ہم مانیں گے، اور بعض تفسیروں میں روایت اس انداز سے نقل کی گئی ہے کہ رُؤسائے یہود کہنے لگے کہ ہمارے نام لکھا ہوا کوئی رقعہ اور تحریر لاؤ جس میں یہ لکھا ہوا ہو ''اللہ کی جانب سے فلاں شخص کے نام، یہ ہمارا پیغمبر ہے، رسول ہے، اس کو تم تسلیم کرو!'' اس قسم کی تحریر ہمارے اُوپر اُتارے تب جا کے ہم مانیں گے، پھر کتاب سے مطلقاً مکتوب یعنی لکھی ہوئی تحریر مُراد ہوگی، پھر یہ معروف کتاب مُراد نہیں ہے، اور یہ بھی ضد اور عناد ہے جس کو کہتے ہیں کہ نہ ماننے کے لئے بہانے بہت ہوتے ہیں، یہ اسی طرح ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' والی بات ہے کہ چونکہ تسلیم تو کرنا نہیں اس لئے اس قسم کا کوئی نہ کوئی اڑنگا لگا دو، نہ یہ ہمارا مطالبہ پورا کر سکیں گے نہ ہم مانیں گے، کہنے کے لئے بات ہمارے ہاتھ میں آجائے گی کہ دیکھو جی! ہم نے تو ماننے کا ارادہ کیا تھا لیکن ہمیں جس طرح اطمینان آئے وہ اس قسم کی دلیل ہی نہیں دیتے، اس قسم کے بہانے بنانے کے لئے وہ اس قسم کی فرمائشیں کرتے تھے، اور ایسی باتیں جب سامنے آتی تھیں تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قلبی طور پر دُکھ ہوتا تھا، ان کے اس رویے سے تکلیف پہنچتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی ہے کہ آپ ان کی باتوں سے کیوں تکلیف محسوس کرتے ہیں، ان کی تو فطرت ہی یہی ہے۔ پہلے لفظوں کا ترجمہ یہ ہوا کہ ''اہلِ کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر کوئی کتاب اُتاریئے'' كِتٰبًا نکرہ ہے یعنی کوئی کتاب لکھی لکھائی لے آؤ، یا یہ مطلب ہے کہ کوئی تحریر لے آؤ ہمارے نام، یہ لفظ دونوں قسم کی روایتوں پر منطبق ہوتے ہیں جو تفاسیر کے اندر لکھی ہوئی ہیں۔

یہود کا موسیٰ علیہ السلام سے مذکورہ مطالبے سے بھی بڑا مطالبہ

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ۔ اَكْبَرَ یہ ''شَيْئًا'' محذوف کی صفت ہے آپ سے یہ اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں تو آپ اس پر تعجب نہ کریں، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا، اپنے پیغمبر سے جس کا یہ خود کلمہ پڑھتے تھے اُس سے اس سے بھی بڑی بات کا سوال کیا تھا۔ وہ بڑی بات یہ تھی کہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا آمنے سامنے دکھا تو پھر ہم مانیں گے، ورنہ نہیں مانتے، یہ پہلے مطالبے کے مقابلے میں بڑا مطالبہ ہے، اور اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے

سورۂ بقرہ میں آچکا۔ بڑا کیوں قرار دیا؟ بڑا اس طرح ہے کہ آسمان سے لکھی لکھائی کتاب کا اُتر آنا اس میں کوئی امتناع نہیں ہے نہ عقلی نہ شرعی، عقلاً ممکن ہے اور شرعاً واقع ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام پر لکھی لکھائی کتاب آئی تھی، لیکن اس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا دیکھا جانا شرعاً ممکن ہی نہیں، اور یہاں رہتے ہوئے انسان کی آنکھ اس بات کا تحمل کر ہی نہیں سکتی کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لے، تو اُس مطالبے کے مقابلے میں یہ بڑا مطالبہ ہے۔ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً: دکھا ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا، پھر پکڑ لیا ان کو کڑک نے اُن کے ظلم کے سبب سے، یعنی یہ جو انہوں نے زیادتی شروع کی اور اس قسم کے مطالبے کرنے شروع کیے طور پر جاکر، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بجلی گری تھی جس کی وجہ سے یہ سارے مر گئے تھے، اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے ان کو دوبارہ زندگی ملی تھی، اس کی تفصیل پہلے آپ کے سامنے آچکی۔

''ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ'' میں ''ثُمَّ'' ترتیبِ واقعی کے لئے نہیں

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ: یہ اگلی بات آگئی، اور یہ ثُمَّ تاخیر ذکری یا استبعاد کے لئے ہے، ورنہ اتخاذِ عجل کا واقعہ ترتیب کے لحاظ سے اُن کے اس مطالبے سے پہلے کا ہے، واقعات کی جو ترتیب آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اس میں یہ بات مذکور ہے کہ اتخاذِ عجل پہلے ہوا تھا، اور ان کا یہ مطالبہ اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً بعد میں ہوا تھا، موسیٰ علیہ السلام طور پر جس وقت چلہ کشی کے لئے تشریف لے گئے تھے، چالیس راتیں وہاں گزار کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب دے دی تھی، اور اس وقت طور پر ہی اطلاع دی تھی کہ سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا: اَضَلَّھُمُ السَّامِرِیُّ (سورۂ طٰہٰ: ۸۵)، ایک بچھڑا بنا کر ان کا معبود بنا کے کھڑا کر دیا تھا، یہ اطلاع اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر دے دی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تھے تو پیچھے یہ واقعہ پیش آگیا، سورۂ طٰہٰ کے اندر اس کی زیادہ تفصیل آئے گی، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تھے، اور آکر ہارون علیہ السلام کو بھی تنبیہ کی تھی، قوم کو بھی تنبیہ کی تھی، سامری کو بھی تنبیہ کی تھی، پھر سب نے توبہ کی، اس سزا کے طور پر وہ لوگ قتل کئے گئے جو کہ مرتد ہو گئے تھے۔ اس تفصیل کے بعد پھر اُن کے سامنے تورات پیش کی گئی تو تورات کو سُن کر وہ کہنے لگے کہ ہم کس طرح یقین کریں کہ یہ اللہ کی کلام ہے؟ ہمیں تو یقین نہیں آتا، پھر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اجازت لے کر ستر آدمیوں کو منتخب کر کے طور پر لے گئے تھے کہ چلو میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے کہلوا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کہہ دیں گے کہ یہ کتاب میری ہے اس کو تسلیم کرلو، جب ستر آدمیوں کو وہاں لے گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز سن لی تب انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں کیا پتا کہ کون بول رہا ہے؟ سامنے آئے اور آکر سامنے بات کرے، جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا سامنے نہ دیکھ لیں اُس وقت تک ہم یقین نہیں کرتے، جب وہ اتنے سر چڑھ گئے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بجلی آئی تھی جس کی بنا پر وہ مر گئے یا بے ہوش اور نیم مردہ ہو گئے، تب موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا تھا، تو واقعات کی ترتیب اس طرح ہے، ان کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ اتخاذِ عجل کے بعد ہے۔ اور یہاں ثُمَّ کے ساتھ اس کو ذکر کیا جا رہا ہے ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ، جس سے بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً پہلے پایا گیا اور اتخاذِ عجل کا واقعہ

بعد میں پیش آیا، اس بات کو آپ کی خدمت میں سمجھا رہا ہوں کہ ثُمَّ یہاں یا تو تاخیرِ ذکری کے لئے ہے کہ چونکہ ان کی شرارتیں شمار کرنی ہیں، اس میں تاریخی واقعات ترتیب کے طور پر بیان کرنا مقصود نہیں ہے، یا یہ بطور استبعاد کے ہے۔

بچھڑے کو معبود بنانا رُؤیت باری کے مطالبے سے بڑی شرارت کیسے ہے؟

استبعاد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگلی بات پہلے سے بھی زیادہ بعید ہے جو انہوں نے کہی، "انہوں نے بنالیا بچھڑے کو معبود بعد اس کے کہ ان کے پاس بینات آگئے"، بینات کے آجانے کے بعد انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، یہ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کے مقابلے میں بھی بڑی شرارت ہے، بڑی اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت دُنیا کے اندر رہتے ہوئے شرعاً ممتنع ہے، کہ ان آنکھوں کے ساتھ بیداری میں انسان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا، جیسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا: لَنْ تَرٰىنِیْ (سورۂ اعراف: ۱۴۳)، ورنہ عقلاً ممکن ہے، عقلاً اس میں کوئی امتناع نہیں ہے، اگر عقلاً بھی ممتنع ہوتی کہ ہو ہی نہیں سکتی تو موسیٰ علیہ السلام مطالبہ ہی نہ کرتے، کیونکہ نبی وقت کا اَعقل الناس ہوتا ہے، وقت کا سب سے بڑا عقل مند ہوتا ہے، اگر یہ مطالبہ عقل کے تقاضے کے خلاف ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام مطالبہ نہ کرتے، موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ کرنا علامت ہے اس بات کی کہ عقل تو اس بات کو گوارا کرتی ہے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے اللہ نظر آجائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت شرعاً اس کے اُوپر پابندی لگادی کہ لَنْ تَرٰىنِیْ: تو مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔ لیکن آخرت میں یہ رُؤیت واقع ہوگی جیسے احادیث صحیحہ میں آیا ہوا ہے، اور قرآنِ کریم کی آیات سے اشارے نکلتے ہیں، جنتی جس وقت جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی رُؤیت وہاں پائی جائے گی، آخرت میں یہ رُؤیت واقع ہے، وہاں اللہ تعالیٰ اہل جنت کے اندر تحمل پیدا فرمادیں گے۔ اسی طرح حضور ﷺ معراج پر عالمِ بالا میں تشریف لے گئے تھے تو آپ کو بھی اللہ کی رُؤیت ہوئی، اگرچہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، بہرحال صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال موجود ہیں کہ اللہ کی رُؤیت ہوئی، تو عالمِ بالا میں ہوسکتی ہے، عالمِ بالا مکان کے اعتبار سے وہی عالمِ آخرت ہے، اگرچہ زمان قیامت کے بعد آئے گا لیکن مکان کے اعتبار سے وہ عالمِ آخرت ہے، جو شخص بھی اس عالمِ آخرت میں پہنچ جائے گا اُس کے اُوپر آثار وہی طاری ہوجائیں گے جو آخرت والے ہیں، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت عالمِ آخرت میں موجود ہیں، اگرچہ زمانِ آخرت نہیں آیا، لیکن عالمِ آخرت میں موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہاں اُن کو نہ کوئی بیماری، نہ کوئی تکلیف، نہ کھانے کی احتیاج، نہ کچھ اور، جیسے گئے تھے ویسے واپس آجائیں گے، چاہے ہزار ہا سال گزر جائیں۔ اسی طرح حضور ﷺ جب عالمِ بالا میں تشریف لے گئے تو آپ میں بھی وہی جنتیوں والے آثار پیدا ہوگئے، لہٰذا اگر اللہ کی رُؤیت ہوجائے تو کسی دلیل کے خلاف نہیں ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس بارے میں اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات انکار کرتے ہیں اور بعض اس کا قول کرتے ہیں، اس سے بحث نہیں ہے کہ ان میں سے راجح قول کون سا ہے، بہرحال رُؤیت ممکن ہے، آخرت میں واقع ہوگی، دُنیا میں عقلاً ممکن ہے اور شرعاً ممتنع ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ بچھڑے کو شریک کرلینا، اور بچھڑے کے اندر اُلوہیت کو مان لینا، یہ تو عقلاً بھی ممتنع ہے اور شرعاً بھی ممتنع ہے، نہ دُنیا میں واقع ہے نہ آخرت میں، نہ ماضی میں نہ مستقبل میں، کبھی ہو ہی نہیں سکتی، تو جو قوم اس طرح سے گڑبڑ کررہی ہو کہ ایسے عقل کے خلاف، نقل کے خلاف، فطرت کے خلاف وہ کام کر بیٹھتے ہیں،

اور اس قسم کے دعوے کر لیتے ہیں تو اگر آپ کی مجلس میں آ کر وہ اس قسم کے غلط سلط مطالبے کرتے ہیں، تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے؟ ان سے تو اسی قسم کی باتوں کی توقع رکھی جاسکتی ہے، جیسے انہوں نے اپنے انبیاء ﷺ کے ساتھ کیا ویسے اُوٹ پٹانگ آپ کے ساتھ بھی ماریں گے، تو ان کے اس قسم کے مطالبوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح سے ثُمَّ استبعاد کے لئے آ گیا کہ ان لوگوں کی تو یہ بات ہے کہ بچھڑے کو معبود بنالیا، جس میں نہ کوئی عقلاً گنجائش نہ شرعاً گنجائش نہ فطرت کے تحت گنجائش، تو پہلی بات کے مقابلے میں دوسری بات زیادہ ہوگئی۔ ''پھر بنالیا انہوں نے بچھڑے کو'' کیا بنالیا؟ دوسرا مفعول محذوف ہے اِلٰھًا، جیسے پیچھے بھی آیا تھا: بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ (البقرۃ: ۵۴) وہاں بھی دُوسرا مفعول محذوف تھا، کہ ''پھر بنالیا انہوں نے بچھڑے کو معبود'' مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ: بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آ چکے تھے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے، اللہ تعالیٰ کی توحید کے، پھر بھی بچھڑے کو معبود بنالیا، فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ: پھر ہم نے انہیں معاف کیا، معافی کا ذکر بھی سورۂ بقرہ میں آ چکا، ''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو صریح غلبہ دیا، صریح رُعب دیا، یا بہت واضح دلیل دی'' اور اس سلطانِ مبین کا مصداق آپ علیہ السلام کے معجزات بھی ہو سکتے ہیں، ویسے رُعب دبدبہ اور ہیبت بھی موسیٰ علیہ السلام کو بہت حاصل تھی۔

یہود کے مزید جرائم کا تذکرہ

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ: یہ واقعہ بھی گزر چکا کہ جب وہ ستر آدمی اٹھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوبارہ اُن کو حیات مل گئی یا اُن کی وہ بے ہوشی دُور ہوگئی، پھر وہ آئے، آ کے قوم کے سامنے بیان کر دیا کہ یہ بات تو صحیح ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہہ بھی دیا، لیکن ساتھ اللہ تعالیٰ نے یوں بھی کہہ دیا تھا کہ جو حکم مشکل معلوم ہو بیشک اس پر عمل نہ کرنا، تو بات کو سننے کے بعد پھر تحریف کر دی، جیسے واقعہ پہلے آپ کے سامنے آ چکا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر پہاڑ کو معلق کیا تھا، اور ان سے عہد لیا تھا کہ کہو ہم پوری طرح سے اس پر عمل کریں گے، اور اگر تم اس قسم کا عہد نہیں کرتے تو ابھی پہاڑ گرا کر تمہیں پیس دیا جائے گا، یہ بھی چونکہ ایک قسم کا ارتداد تھا، اور مُرتد کو ایمان کی طرف لانے کے لئے تشدد کیا جا سکتا ہے، پہلے یہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور پہلے انہوں نے کتاب کا مطالبہ خود کیا کہ کوئی کتاب لاؤ تا کہ ہم اُس پر عمل کریں، اب یہ جو گڑبڑ کر رہے تھے تو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قوتِ قاہرہ کا ایک نمونہ دکھایا کہ یہ دیکھو! پہاڑ تمہارے سَروں کے اُوپر معلق ہے، سیدھے ہو جاؤ، ورنہ پھر اس کو گرا کر تمہیں پیس دیا جائے گا، تو یہاں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، کہ اپنی تسلیم کردہ کتاب اور اپنا نبی جس پر ایمان لائے ہوئے ہیں وہ کتاب لایا، اور پھر انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا، پھر بھی آگے سے اس طرح گڑبڑ کرنے لگ گئے، تو ان کی یہ تاریخ ہے اور اس جماعت کی یہ فطرت ہے، اگر آپ کے ساتھ یہ کجی کریں اور ٹیڑھا پن اختیار کریں تو اس میں کون سی حیرانی کی بات ہے؟ ''ہم نے اُٹھایا ان کے اُوپر پہاڑ کو'' بِمِيْثَاقِهِمْ: ان کے میثاق کے ساتھ، یعنی میثاق لیتے ہوئے یا میثاق لینے کے لئے، دونوں طرح سے تفسیروں میں ترجمہ موجود ہے۔

''اور کہا ہم نے انہیں، داخل ہو جاؤ دروازے میں جھکتے ہوئے'' وہ جو شہر فتح کیا تھا، اس کی تفصیل بھی آپ کے سامنے

پہلے آگئی، اللہ تعالیٰ نے جس وقت ان کو بیت المقدس پر فتح دے دی تو کہا کہ اب شکر ادا کرتے ہوئے، تواضع اور انکساری کے ساتھ اس شہر میں داخل ہو جاؤ۔ جیسے حضور ﷺ نے جب مکہ معظمہ کو فتح کیا تھا تو روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ اُونٹنی پر سوار تھے، جب مکہ معظمہ میں گئے ہیں تو سر اِتنا جھکا ہوا تھا کہ آپ کا سَر مبارک آگے پالان کی لکڑی کے ساتھ لگ رہا تھا،[1] اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے، تواضع کے ساتھ، انکسار کے ساتھ، کہ اللہ نے یہ انعام کیا، احسان کیا، اس طرح سے عاجزانہ طور پر شہر میں داخل ہوئے۔ تو ان کو بھی حکم تو اسی طرح تھا کہ شہر کے دروازے میں داخل ہوتے وقت جھکتے ہوئے جانا، اور یہ لفظ بولتے ہوئے جانا حِطَّةٌ حِطَّةٌ، ہمارے گناہ معاف کر دیئے جائیں، ہماری غلطیاں معاف کر دی جائیں، لیکن یہاں بھی انہوں نے معاملہ اُلٹ کر دیا، کہ اکڑے اور سرینوں کے بل چلے، سرینوں کے بل چلنے کی تفصیل بھی آپ کے سامنے عرض کر دی گئی تھی، کہ عام طور پر تو لوگ اس کا نقشہ یہی بنایا کرتے ہیں، کہ شہر میں داخل ہوتے ہوئے وہ یوں سرین گھسیٹتے گھسیٹتے شہر کے اندر داخل ہوئے، یہ مذاق بنا لیا عملاً بھی اور قولاً بھی، کہ ''حِطه'' کا ''حنطة'' بنا لیا، گندم گندم، دانے دانے، اس طرح کہتے ہوئے لفظ کو بھی بگاڑ لیا، یعنی قول کو بھی بگاڑ لیا اور عمل کو بھی بگاڑ لیا، اس طرح سے شہر میں داخل ہوئے، لیکن یہ جو مفہوم عام طور پر آپ سمجھتے ہیں کسی حد تک واقع کے مطابق نہیں ہے، کہ ذکر تو کرنا ہے اِن کی سرکشی اور تکبر کا، اور متکبر لوگ سرین گھسیٹتے ہوئے شہر میں داخل نہیں ہوا کرتے، اس لیے اس سے مُراد اکڑنا ہے، کہ جب انسان خوب اچھی طرح سے اکڑتا ہے تو آپ بھی کبھی یہ نقشہ بنا کر دیکھ لینا، کہ پیچھے انسان کے سرین نمایاں ہو جایا کرتے ہیں، جتنا انسان سینہ کھولے گا اور اکڑے گا اتنا سرین پیچھے کو نکلتے ہیں، پھر جب انسان اکڑ کر چلتا ہے تو سرینوں کی ہیئت بدل جاتی ہے، اس کو کہتے ہیں کہ سرین کے بل چل رہا ہے، یعنی اُس کا سارا زور سرینوں پر پڑا ہوا ہے، تو تحقیر کے طور پر یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے، اس طرح سے وہ اکڑ کر اور سینہ آگے کو نکال کر اور سرین پیچھے کو نکال کے حرکت دیتے ہوئے جو داخل ہوئے یہ اُن کی متکبرانہ چال کا نقشہ ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے عملاً بھی انہوں نے سرکشی کی، اور جو اُن کو قول تلقین کیا گیا تھا کہ تم نے حطة حطة یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے جانا ہے اس کو بھی انہوں نے بگاڑ دیا۔ ''ہم نے کہا انہیں کہ داخل ہو جاؤ دروازے میں جھکتے ہوئے۔''

''اور ہم نے انہیں یہ بھی کہا تھا کہ ہفتے کے دِن میں تجاوز نہ کرنا'' اس کا ذِکر بھی پہلے آپ کے سامنے ہو چکا، جس کے نتیجے میں پھر اُن کو بندر بنا دیا گیا تھا، اس واقعے کی تفصیل سورۂ اَعراف میں آئے گی کہ ہفتے کے دِن شکار کرنے کی ممانعت تھی، کچھ لوگ سمندر کے کنارے پر رہتے تھے، مچھلیوں کے شکار کے عادی تھے، ان کو روک دیا گیا تھا، لیکن وہ باز نہیں آئے، وہ واقعہ بھی تاریخ میں معلوم ہے، اور کتاب اللہ میں ذکر کر دیا گیا۔

''اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا تھا'' فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: اس باء کا متعلق ظاہر نہیں کیا گیا، گویا کہ اُن کے جرائم دھڑا دھڑ شمار کیے جا رہے ہیں، باقی! ان جرائم کا نتیجہ یہاں ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ نتیجہ واضح ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ ان کے اپنے عہد توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون کر دیا، یہ مغضوب ہو گئے، ان کے اُوپر لعنت ہوگئی، ان کے اُوپر غضب ہو گیا، وہ چیز

(۱) ''سیرتِ مصطفیٰ'' و دیگر کتب سیرت، نیز دیکھیں مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۵۲ و مسند ابی یعلیٰ ج ۶ ص ۲۰۰ ولفظہ: فَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ تَخَشُّعًا۔

چونکہ نمایاں تھی اس لئے اُس کو ذکر نہیں کیا، صرف جرائم کی فہرست دی ہے، اس باء کا متعلق لفظوں میں مذکور نہیں ہے، ہم نے ان کو ان کے عہد توڑنے کے سبب سے ملعون کر دیا۔ ''عہد توڑنے کے سبب سے، اور ان کے اللہ کی آیات کے ساتھ انکار کرنے کے سبب سے، اور ان کے انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرنے کے سبب سے۔''

''اور ان کے اس کہنے کے سبب سے کہ ہمارے دِل پردے میں ہیں'' اس کا مطلب بھی آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں آچکا۔ ''دِل پردے میں ہیں'' کا کیا مطلب؟ کہ ہمارے دِل یوں محفوظ ہوگئے کہ اب غیر مذہب والوں کا ہمارے دِل پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، ہم اپنے عقیدے میں اتنے ٹھوس ہیں۔ اس میں وہ تأثر یہ دینا چاہتے تھے کہ ہم اپنے نظریات میں ٹھوس ہیں، بالکل پختہ ہیں، کسی دوسرے کی بات ہم پر کوئی اثر نہیں کرتی گویا کہ ہمارے دل پردے میں ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ پردے میں کوئی نہیں ہیں، یہ نہ سمجھیں کہ ان کے دِل محفوظ ہیں اور ان کے اُوپر غلاف چڑھے ہوئے ہیں کہ غیر بات اور ناحق بات ان کے دِل پر اثر انداز نہیں ہوتی، یہ بات نہیں، بلکہ ان کے دِلوں پر مُہر لگ گئی، ان کے اندر حق قبول کرنے کا جذبہ ہی نہیں رہا، ان کے کُفر کے سبب سے ان کے دِلوں کو مطبوع کر دیا گیا، ان کے اُوپر مُہر لگا دی گئی، تو اصل وجہ تو یہ ہے کہ دِل مسخ ہوگئے کہ حق قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے دِل محفوظ ہیں، قُلُوْبُنَا غُلْفٌ: ان کے کہنے کہ وجہ سے کہ ہمارے دِل پردے میں ہیں، غلاف میں ہیں، بَلْ: اس سے اِضراب ہوگیا، یہ جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں ایک بات آگئی، آگے پھر اسی طرح سے جرائم کی فہرست آرہی ہے، ''بلکہ مُہر لگائی اللہ نے ان کے قلوب پر ان کے کُفر کے سبب سے، پھر یہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم'' یعنی بہت کم ایمان لانے کی توفیق ہوتی ہے، اور وہ کم ایمان قابلِ اعتماد نہیں، یا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائیں گے، یا کم ایمان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو بات ان کی مرضی کے مطابق آجائے وہ تو مان لیتے ہیں، لیکن اس کو مان لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

آگے پھر وہی جرائم کا ذکر ہے ''اور ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے، اور ان کے مریم پر بہتانِ عظیم بولنے کی وجہ سے'' عامل وہی ''لَعَنّٰهُمْ'' ہے، ہم نے ان کے اُوپر لعنت کی، یہ مغضوب ٹھہرے، یہ ملعون ہیں، مغضوب ہیں، اور ان کے ملعون اور مغضوب ہونے کی وجوہ یہ ہیں جو ذِکر کی جارہی ہیں، کہ انہوں نے کُفر بھی کیا اور مریم علیہا السلام کے اُوپر ایک بہت بڑا بہتان باندھا، وہ مریم علیہا السلام پر بہت بڑا بہتان کیا تھا؟ یہ تفصیل بھی آپ کے سامنے آلِ عمران میں آچکی، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت چونکہ بواسطہ باپ نہیں ہوئی، ان کے والد موجود نہیں، اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنے کلمہ ''کُن'' کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وجود بخشا، اور یہود نے حضرت مریم علیہا السلام پر زبان درازی کی، اُن کو غلط کار بتایا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب میں طعن زنی کی، جیسے کہ اشارہ وہاں سورۂ مریم میں آئے گا: مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا (آیت:۲۸) پہلے پہلے ابتداءً جب حضرت مریم علیہا السلام سے انہوں نے گفتگو کی تھی تو یہی کہا تھا کہ یہ تُو کہاں سے لے آئی؟ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا: یہ تو تو بہت بُری بات لے آئی، بہت بُری چیز کا تُو نے ارتکاب کیا، تیرا باپ بھی اچھا آدمی تھا، تیرا باپ تو بُرا آدمی نہیں تھا، نہ تیری ماں بدکارہ تھی، تُو یہ کہاں سے آگئی اس قسم کی؟ جس کے جواب میں حضرت مریم علیہا السلام نے بچے کی طرف اشارہ کیا تھا اور پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری صفائی دی تھی، اب یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں

معجزہ ظاہر ہوا، اور اتنا قاطع معجزہ تھا کہ جس کے بعد سب شبہات ختم ہو جانے چاہئیں تھے، لیکن یہ بدبخت جس بات پر اڑ جاتے ہیں تو پھر کسی چیز کو چھوڑنے پر تو آتے ہی نہیں، کہ اتنی صفائی ہونے کے باوجود اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس کی وضاحت ہو جانے کے باوجود اور معجزانہ طور پر سارا معاملہ سامنے آجانے کے باوجود انہوں نے اس بہتانِ عظیم سے توبہ نہیں کی، تو مریم علیہا السلام کے اُوپر بہتانِ عظیم لگانا یہ بھی مستقل ان کے لئے لعنت کا باعث بنا، اور اس کی بنا پر یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے۔

قتلِ عیسیٰ کے دعوے کو قتلِ انبیاء سے علیحدہ ذِکر کرنے کی وجہ

وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ: اب یہاں انداز دیکھئے، آپ کے سامنے حیاتِ مسیح کا مسئلہ پہلے سورۂ آلِ عمران میں آچکا، یہاں صرف الفاظ کی طرف توجہ فرمائیے، پیچھے ذکر کیا: وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ، ان کے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کی وجہ سے، تو جس کا مطلب ہے کہ قتلِ انبیاء ایک واقعہ ہے، انبیاء علیہم السلام کو انہوں نے قتل کیا ہے، قتلِ انبیاء کو سبب قرار دیا ان کے اُوپر لعنت اور غضب کا، لیکن انبیاء علیہم السلام سے عیسیٰ علیہ السلام کو علیحدہ کرلیا، اب یہاں یہ نہیں کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قتل کرنا بھی ان کے لئے موجبِ لعنت اور موجبِ غضب ہو گیا، بلکہ یہاں وجہ یہ بیان کی ہے وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ: ان کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا، یہ کہنا باعثِ لعنت ہے، ورنہ اگر یہ قتل کا واقعہ پیش آیا ہوتا تو یا تو اس کو اِجمالاً ''وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ'' میں رکھ دیا جاتا، کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا، تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ان کا دعویٰ ہے کہ ہم نے قتل کیا، اور ان کی عادت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا کرتے تھے تو ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی قتل ہو گئے ہوں، اس لیے قرآنِ کریم نے اِجمال کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ساتھ شامل کر دیا۔ لیکن قرآنِ کریم نے یہ مغالطہ پیدا نہیں ہونے دیا، اس لئے ''وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ'' کو علیحدہ ذِکر کیا جس سے معلوم ہو گیا کہ کچھ انبیاء علیہم السلام ایسے گزرے ہیں جن کو انہوں نے قتل کیا، جیسے کہ پہلے بھی آیا تھا: يَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ حَقٍّ (آلِ عمران: ۲۱)، یہ واقعات ہیں کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کو یہ قتل نہیں کر سکے، عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ ہم نے اُن کو قتل کر دیا، اور کسی نبی کے متعلق اس قسم کا دعویٰ کرنا بھی موجبِ لعنت ہے، ورنہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ پیش نہیں آیا، اس لیے صراحتاً نفی کر دی اور اس کو اِجمال میں نہیں چھوڑا تاکہ کوئی مغالطہ نہ لگ جائے۔ ''اور ان کے کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے قتل کر دیا مسیح عیسیٰ بن مریم کو'' یعنی عیسیٰ بیٹا مریم کا، اور مسیح ان کا لقب ہے، یہ لفظ بھی پہلے گزر چکے، مسیح کا لفظ مشیحا یا ماشیح سے معرّب ہے بمعنی مبارک، اور عیسیٰ، اَیْشُوع سے معرّب ہے جس کا معنی ہے سیّد، سردار، اس قسم کے لفظ سریانی زبان کے ہیں، اور ان کا معنی اسی طرح ذکر کیا گیا ہے، سورۂ آلِ عمران میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے یہی معنی ذکر کیے ہیں، یعنی یہ کہنا ان کے لئے موجبِ لعنت ہو گیا۔ آگے جو ''رَسُوۡلَ اللّٰهِ'' کا لفظ ہے اگر تو یہ یہود کی کلام میں ہو تو یہ بھی قول کا مقولہ ہے، یعنی وہ یوں کہتے تھے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو ہم نے قتل کر دیا، پھر تو ''رَسُوۡلَ اللّٰهِ'' کا لفظ استعمال کرنا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بطورِ استہزا کے ہے، کہ وہی عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ کا رسول ہے، تو یہ بطورِ استہزا کے ''رسول اللہ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ورنہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول نہیں سمجھتے

تھے، یا یہ ''رَسُوْلَ اللّٰہِ'' کالفظ اللہ کی طرف سے بڑھایا گیا اُن کے جرم کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے، کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کردیا، وہ مسیح عیسیٰ بن مریم ہے کون؟ وہ ''اللہ کا رسول'' ہے، ''اللہ کے رسول'' کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ ہم نے اُس کو قتل کردیا۔ وَمَا قَتَلُوْهُ: انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا، وَمَا صَلَبُوْهُ: اور نہ انہوں نے اُس کو سُولی چڑھایا۔

''شُبِّہَ لَہُمْ'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ: لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا، ان کے لئے شبہ واقع ہوگیا، قرآنِ کریم نے اتنی بات ہی کہی، اور حدیث شریف میں بھی صحیح روایات میں اِس کی کوئی وضاحت نہیں کہ ان کو شبہ کس طرح پڑ گیا تھا؟ یہ شبہ میں کس طرح ڈال دیے گئے؟ اِشتباہ ان کے لئے کس صورت میں پیش آیا؟ مفسرین نے جو روایات نقل کی ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے جو شخص گیا تھا، عیسیٰ علیہ السلام مکان میں تھے، دو طرح سے روایت نقل کی گئی ہے، ایک روایت تو اس طرح سے ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مکان میں بند تھے اور اُن کا محاصرہ کرلیا گیا، ایک آدمی اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑنے کے لئے گیا، جس وقت یہ اندر چلا گیا تو حضرت جبریل علیہ السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تو اُٹھالیا، اور اس شخص کے اُوپر عیسیٰ علیہ السلام کا شِبہ ڈال دیا، اس کی صورت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کردی، جب یہ باہر نکلا تو لوگوں نے اسی کو پکڑ لیا اور پکڑ کر اُس کو قتل کیا یا سُولی چڑھایا، لیکن بعد میں جس وقت یہ ہنگامہ فرو ہوا تو سوچنے لگے کہ یہ تو عیسیٰ نہیں ہے، ظاہری شکل تو اس طرح سے معلوم ہوتی ہے، باقی بدن تو عیسیٰ والا نہیں ہے، اور اگر یہ عیسیٰ ہے تو ہمارا آدمی کہاں چلا گیا؟ اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو عیسیٰ کہاں چلا گیا؟ اس طرح سے اشتباہ واقع ہوا اور افواہیں پھیلیں، کسی طرف کچھ اور کسی طرف کچھ، یوں یہ شبہ میں پڑ گئے۔ یا ایک روایت یوں نقل کی گئی ہے کہ ایک مکان کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواری موجود تھے، جب دشمنوں کی طرف سے، یہودیوں کی طرف سے اُس مکان کا محاصرہ کرلیا گیا اور وہ اُن کو پکڑ کر قتل کرنا چاہتے تھے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے تیار ہے؟ کہ اس کو قتل کردیا جائے اور مجھے اللہ تعالیٰ بچالے، وہ شخص جو اس وقت ان کے ہاتھ سے شہید ہوگا وہ قیامت کے دن میرے ساتھ ہوگا۔ ایک حواری نے اپنے آپ کو پیش کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنا لباس اسے پہنادیا اور اپنی پگڑی اُس کے سر پر رکھ دی اور وہ باہر نکلا، جس وقت وہ باہر نکلا تو وہ سمجھے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام ہے، اور اُسی کو پکڑ کر لے گئے اور لے جا کر قتل کردیا، اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی جگہ محفوظ رہ گئے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اُوپر اُٹھالیا، تو اس طرح سے اُن کو اِشتباہ پیش آگیا۔ یا یہ ہے کہ اس وقت دشمنوں کا غلبہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے حالات نہیں تھے کہ ان کی جماعت ان کے ساتھ ہو، جس وقت دشمن عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے آئے تھے، قتل پر تو وہ قادر نہ ہوسکے، اپنی خفت کو مٹانے کے لیے شہرت کردی کہ ہم نے اس کو قتل کردیا، ہم نے اس کو سُولی چڑھادیا، دوسرے لوگوں کے لئے اِشتباہ واقع ہوگیا۔ جیسے ایک فوج آکے کسی کے مکان کا محاصرہ کرلے اور قتل کرنے پر قادر نہ ہوں، وہ کسی طرح سے گم ہوجائے، لیکن اپنی خفت مٹانے کے لئے کہیں کہ ہم اس کو قتل کر آئے ہیں، ہم نے اس کو دفن کردیا، ہم نے اس کو سُولی چڑھادیا، تو اس قسم کے غلط پروپیگنڈے کے ساتھ دُور والے لوگوں کے لیے اِشتباہ واقع ہوگیا، آخر لوگوں نے تو وہی بات ماننی تھی

جس طرح سے انہوں نے مشہور کی اور جیسی خبریں ان کو پہنچیں، تو جھوٹ انہوں نے بولا جو عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے اور دُوسرے لوگوں کے لیے اِشتباہ واقع ہوگیا، انہوں نے کہہ دیا کہ ہاں جی! سُولی چڑھا دیا گیا۔ جیسے آپ کے سامنے ابھی یہ واقعہ پیش آیا کہ بھٹو کو سُولی چڑھایا گیا، لیکن کیا لوگوں نے یقین کیا؟ لوگ کہتے تھے: نہیں جی! بس ایسے ہی قصہ بنایا ہے، ایسے ہی کہانی بنائی ہے، وہ تو پتا نہیں کہاں پہنچ گیا ہوگا؟ وہ تو آجائے گا، یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا، ایسی افواہیں جب لوگ پھیلایا کرتے ہیں تو دوسرے لوگوں کے لئے بسا اوقات اِشتباہ واقع ہوجاتا ہے، اب کوئی کہے گا کہ چڑھایا ہے، کوئی کہے گا کہ نہیں چڑھایا، اس طرح سے معاملہ غلط ملط سا ہوگیا۔ تو شُبِّہَ لَہُمْ کی یہ ساری صورتیں ممکن ہیں، قرآنِ کریم نے ان میں سے کوئی صورت متعین نہیں کی، اس نے تو صرف یہی کہا ہے کہ لوگوں کے لئے اِشتباہ ہوگیا، اس لئے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا، سُولی دے دیا، ورنہ بات صاف ہے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ: نہ انہوں نے قتل کیا، نہ انہوں نے سُولی دیا۔

حیات ونزولِ عیسیٰ کا منکر کافر ہے

اس لئے حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام قطعی مسئلہ ہے اور ضروریاتِ دین میں سے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول نہیں ہوئے، مصلوب نہیں ہوئے، بلکہ وہ زندہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی طرف اُٹھالیا، اور قیامت کے قریب وہ نازل ہوں گے، قرآنِ کریم میں جس طرح سے اشارہ موجود ہے، سورۂ زخرف میں یہ لفظ آتے ہیں: وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ (سورۂ زخرف:۶۱) وہاں یہی ذکر کیا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے لئے عَلَم ہیں، یعنی اُن کا نازل ہونا قیامت کے آنے کے لئے ایک علامت بنے گا اور اس سے پتا چلے گا کہ قیامت آنے والی ہے، تو قیامت کے لئے وہ عِلم ہیں یعنی اُن کا آنا قیامت کے آنے کے لئے ایک علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگا اور وہ قیامت کی علامت بنے گا، تو اُن کا آسمان سے نزول بھی قطعی ہے، ضروریاتِ دین میں سے ہے، جو شخص حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کا منکر ہو وہ بھی کافر، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا منکر ہو وہ بھی کافر، یہ عقیدہ قطعیات میں شامل ہے کہ آخر وقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور آکر اس اُمت کی اِمامت سنبھالیں گے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں گے، عیسائیت کو باطل کریں گے، خنزیر کو قتل کردیں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، اور اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سے جو ایمان لے آئیں گے وہ تو بچ جائیں گے اور باقی جتنے لوگ ہوں گے وہ قتل کردیے جائیں گے، اس وقت یا اسلام ہوگا یا تلوار، جزیہ بھی ختم ہوجائے گا، حدیث شریف میں یہ ساری کی ساری بات واضح ہے، اور علمائے اُمت نے اس کو ضروریاتِ دین میں شمار کیا ہے۔

دُنیائے عیسائیت کا دار و مدار

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ: بیشک وہ لوگ جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کے بارے میں لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ: وہ اس کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ: ان کے پاس کوئی صاف ستھرا علم عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نہیں ہے، ”عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کو کوئی علم نہیں“ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ: سوائے خیالات کی اتباع کے، بس توہمات ہیں، خیالات ہیں، بے دلیل باتیں ہیں جن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور مدلل بات علم کی ان کے پاس کوئی نہیں، بس یہ بات یقینی

ہے کہ انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا، اب اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول نہیں ہوئے، مصلوب نہیں ہوئے، تو عیسائیت سرے سے باطل ہو جاتی ہے، موجودہ عیسائیت کا تو سارے کا سارا مدار عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر ہے، ان کا مذہبی فلسفہ جتنا ہے وہ سارے کا سارا اسی بنیاد پر کھڑا کیا گیا ہے۔ ''انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا، یہ یقینی بات ہے، بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اُٹھالیا، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' کی تفسیر میں دو اقوال

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اس آیت کا مطلب دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، ''اہلِ کتاب'' سے چونکہ اہلِ کتاب جماعت مُراد ہے، ہر ہر فرد اس سے مُراد نہیں ہے، تو اس کا معنی یوں بھی کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق آخر وقت کے ساتھ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس کی یہی تفسیر صحیح روایات میں آئی ہے، کہ ایک وقت آئے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے، اور اس وقت جو اہلِ کتاب ہوں گے وہ اُن پر ایمان لائیں گے، عیسائی وغیرہ جو ہوں گے وہ اُن کی موت سے قبل ان پر ایمان لائیں گے، اور جو ایمان نہیں لائیں گے وہ برباد ہو جائیں گے، بہر حال عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بعد میں ہوگا تو یہ واقعہ ثابت ہو جائے گا کہ ان لوگوں کا عقیدہ اُن کے متعلق غلط ہے۔ ''نہیں ہے اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی مگر ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے قبل'' اس صورت میں اِس کا تعلق نزولِ عیسیٰ کے وقت کے ساتھ ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اہلِ کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے قبل عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت نزع کا عالم شروع ہوتا ہے اُس وقت ہر چیز کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، مؤمن آدمی پر اپنے ایمان کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ میں مؤمن ہوں اور اللہ کی رضا میرے ساتھ ہے، اس لیے اُس کو آخرت کا شوق پیدا ہوتا ہے، کافر کا کُفر اس کے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے، پھر وہ سمجھ جاتا ہے کہ میں واقعی اللہ کا مغضوب ہوں اور میں کافر ہوں، اور میرے کُفر کی وجہ یہ ہے، تو اس طرح سے یہودی ہوں یا نصرانی اُن کو بھی اپنے ایمان کی حقیقت اُس وقت معلوم ہوتی ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح حقیقت ان کے سامنے آجاتی ہے، اگرچہ اُس وقت اُن کا ایمان لانا ایسا ہی ہے جیسے فرعون کے سر سے جب پانی گزر گیا تھا تو فرعون ایمان لایا تھا، اور جب پانی سر سے گزر جائے تو اس کے بعد ایمان لانے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، اگرچہ بات وہ صحیح کہیں، حقیقت اُن کے سامنے منکشف ہو جائے، وہ یقین بھی کر لیں، لیکن اُس وقت کا ایمان چونکہ مشاہدے کے بعد ہوتا ہے تو اُس کا کوئی اعتبار نہیں، یعنی وہ وقت گزر چکا ہوتا ہے، ایسے وقت میں جب جان کنی کا عالم شروع ہوتا ہے اور آخرت کا عالم منکشف ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ مان بھی جائیں گے تو ایمان معتبر نہیں، بہر حال وہ مان لیں گے، یہ مطلب بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے، ''اہلِ کتاب میں سے نہیں ہے کوئی بھی مگر ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی موت سے قبل، اور عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اُن پر گواہ ہوں گے۔''

یہود کے ملعون ہونے کی دیگر وجوہات

آگے پھر وہی ان کے جرائم ہیں، ''یہودیوں کی طرف سے ظلم کے سبب سے'' یعنی جو انہوں نے بدکرداری اختیار کی تھی، ''ہم نے ان کے اُوپر پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں'' اس کی تفصیل سورۂ انعام میں آرہی ہے۔ ''اور ان

کے اللہ کے راستے سے روکنے کے سبب سے روکنا بہت زیادہ، یا، بہت سارے لوگوں کو روکنے کے سبب سے" کہ اللہ کے راستے سے یہ روکتے ہیں، اور یہ ان کا روکنا بھی سبب بنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت ساری پاکیزہ چیزوں کو حرام کردیا۔ "اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ ان کو سود لینے سے روکا گیا" اس میں تو یہود بہت چابک دست واقع ہوئے ہیں، جتنا سودی کاروبار آج ان کا ہے اتنا شاید کسی کا بھی نہ ہو، اور اُس زمانے میں بھی سارا سودی کاروبار یہی کرتے تھے، "حالانکہ ان کو سود لینے سے روکا گیا ہے" توراۃ کے اندر بھی حرمتِ سود اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآنِ کریم کے اندر اس کی حرمت کا ذکر آیا ہے، سود کسی زمانے میں بھی حلال نہیں رہا، توراۃ میں ان کو روکا گیا تھا لیکن یہ باز نہیں آئے، انہوں نے اس جرم کا بھی ارتکاب کیا۔ "اور لوگوں کے مالوں کو ناحق کھانے کی وجہ سے" ناحق کھانا یا تو اس طرح سے کہ جو یہ کہتے تھے: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (آل عمران: ۷۵) کہ اُمّی اور اَن پڑھ لوگوں کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں، ہم جس طرح سے چاہیں ان کا مال کھا سکتے ہیں، اس لئے وہ امانتوں میں خیانتیں کرتے تھے اور لوگوں کے مال کھا جاتے تھے، یا اس سے مراد مذہبی رشوتیں ہیں یعنی فیصلوں کے اندر رشوت اور لوگوں کو غلط مسئلے بتا بتا کر چڑھاوے وصول کرتے تھے، جس کا ذکر قرآنِ کریم کی دُوسری آیت میں آیا ہوا ہے: إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (سورۂ توبہ: ۳۴) کہ ان کے درویش ہوں یا مولوی اور علماء ہوں، لوگوں کا مال غلط طریقے سے کھاتے ہیں، اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

یہود کو توبہ کی ترغیب اور "راسخین فی العلم" کی صفات

وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا: مِنْهُمْ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے جو کافر ہیں ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، حالانکہ جن کا ذکر آرہا ہے وہ سارے ہی کافر ہیں، تو مِنْهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جو لوگ آخر وقت تک کفر پر اَڑے رہیں گے ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، کیونکہ یہ کتنے ہی گندے ہوں، کتنے ہی حرام خور ہوں، کتنے ہی جھوٹے ہوں، لیکن توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، مرنے سے پہلے پہلے یہ بھی ایمان لے آئیں گے تو اُن کے سارے جرائم معاف ہوجائیں گے، چنانچہ جو یہود مسلمان ہوئے ان کا مسلمانوں والا شرف اُن کو حاصل ہوگیا، اور پچھلے جرائم جتنے تھے وہ سارے مٹ گئے، ہاں! البتہ آخر وقت تک جو لوگ کفر پر اَڑے رہیں گے، اُن کے لئے دردناک عذاب ہے جیسے کہ اگلی آیت کے اندر آگیا کہ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ: لیکن جو علم کے اندر پختہ ہیں، پختہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اس علم کو اور شریعت کو ایک نمائشی کپڑے کی طرح نہیں پہنا ہوا، کہ جب لوگوں کی طرف نکلے تو چولے پہن کر نکل آئے، تسبیحات پکڑ کے نکل آئے، زُلفیں سنوار لیں، اور درویش بن کر آگئے کہ لوگ سمجھیں کہ ماشاء اللہ! بڑے پاک باز لوگ ہیں، جس طرح سے ایک نمائشی جامہ ہوا کرتا ہے وہ نمائشی جامہ انہوں نے نہیں بنایا، بلکہ علم کے اندر ان کے قدم راسخ ہیں، اور راسخ فی العلم وہی ہوا کرتا ہے جس کا علم صحیح ہو اور پھر وہ اُس کے مطابق عمل بھی کرے، ٹھوس ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ یہ نہیں کہ خواہشات کی آندھی اُن کو پروں اور تنکوں کی طرح جدھر چاہے

اُڑا کر لے جائے، ماحول کے تقاضے اُن کو جدھر چاہیں خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں، ایسے نہیں، بلکہ وہ پختہ لوگ ہیں، چٹانوں کی طرح اپنے مسلک کے اُوپر ڈٹے رہتے ہیں، حوادثات آئیں، خواہشات اُبھریں، ماحول غلط ہو، موافق ہو یا ناموافق، اپنے موقف پر پکے ہیں، یہ ہوتے ہیں راسخ فی العلم لوگ، اور اگر کسی کے پاس علم تو ہے لیکن ذرا سی آندھی ماحول کے خلاف آئی تو اِدھر اُدھر کو اڑ گئے، کسی طرف سے کوئی فتنے کا سیلاب آیا تو خس وخاشاک کی طرح اس کے سامنے بہہ گئے، تو یہ علم ایک نمائشی علم ہوا کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا علم کے اندر راسخ قدم نہیں ہے، قدم راسخ یوں ہوا کرتا ہے کہ علم کے تقاضے کے اُوپر پکے ہیں، ہواؤں کے تھپیڑے لگیں، سیلاب کا زور چڑھ جائے، فتنے آجائیں، خواہشاتِ نفسانی کا خلاف کرنا پڑے، وہ اپنی جگہ ٹھوس ہیں، علم کے تقاضوں پر پکے ہیں، ہلتے نہیں ہیں، انہیں کہتے ہیں راسخ فی العلم۔ تو ایسے لوگ اُن میں بھی تھے، جب حضور ﷺ کا ذکر سامنے آیا تو انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا، جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور اس قسم کے دوسرے لوگ۔ ''لیکن وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں ان میں سے، اور جو اپنی فطرت صحیحہ کے تحت ایمان لانے والے ہیں، اُن کے اندر ایمان کی رمق باقی ہے، اگرچہ اتنے راسخ فی العلم نہ ہوں، تو مومنون کا لفظ عام ہو گیا، راسخ فی العلم بھی مؤمن ہیں، لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کے عقیدوں میں کچھ صحت باقی تھی، اگرچہ علم میں اُن کو وہ رسوخ نہیں تھا۔'' وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو اُتاری گئی آپ کی طرف اور اُس چیز پر جو اُتاری گئی آپ سے پہلے، اور خصوصیت سے میں تعریف کرتا ہوں اُن لوگوں کی جو نماز قائم کرنے والے ہیں'' کیونکہ نماز کی پابندی ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ انسان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، بشرطیکہ نماز سوچ سمجھ کر پڑھے، اللہ کے سامنے تواضع اور انکسار کے اظہار سے صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اس لئے گناہ چھوٹتے ہیں، نیکی کا جذبہ اُبھرتا ہے، یہ نماز کی خاصیت ہے، اور جو لوگ نماز کی پابندی نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو بھی چھوڑ سکتے ہیں، حق قبول کرنے کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی، ''اور زکوٰۃ دینے والے ہیں'' اس لئے مال کی محبت میں مبتلا نہیں، بلکہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والے ہیں، ''اور جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یوم آخر پر، یہی لوگ ہیں کہ ہم ان کو عنقریب اجر عظیم دیں گے۔''

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ
بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف جیسے کہ وحی بھیجی ہم نے نوح اور نوح کے بعد انبیاء کی طرف، اور وحی بھیجی ہم نے
اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ
ابراہیم کی طرف اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس

وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ
اور ہارون اور سلیمان کی طرف، اور ہم نے داؤد کو زبور دی ﴿۱۶۳﴾ اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا بیان ہم نے آپ پر

عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ
کر دیا اس سے قبل، اور بعض ایسے رسول بھی کہ ہم نے وہ آپ پر بیان نہیں کیے، اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے

مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ
کلام کی خاص طور پر کلام کرنا ﴿۱۶۴﴾ ہم نے ان سب کو رسول بنایا بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کے لئے کوئی دلیل

لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾
باقی نہ رہے اللہ پر رسولوں کے بھیجے جانے کے بعد، اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۱۶۵﴾

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ
لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اُس چیز کے ذریعہ سے جو اُس نے آپ کی طرف اُتاری، اور وہ چیز اُتاری بھی اپنے علم کے ساتھ، اور فرشتے

يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا
بھی گواہی دیتے ہیں، اور اللہ گواہ کافی ہے ﴿۱۶۶﴾ بے شک وہ لوگ جو کفر کرتے اور اللہ کے

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
راستے سے روکتے ہیں تحقیق وہ بھٹک گئے بھٹکنا دُور کا ﴿۱۶۷﴾ بے شک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں

وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾
اور حق تلفی کرتے ہیں، نہیں ہے اللہ کہ بخشے انہیں، اور نہیں ہے اللہ کہ چلائے انہیں راستے پر ﴿۱۶۸﴾

اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
مگر جہنم کے راستے پر، ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں گے، اور یہ بات اللہ پر

يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ
آسان ہے ﴿۱۶۹﴾ اے لوگو! تحقیق تمہارے پاس رسول آگیا ٹھیک بات لے کر تمہارے ربّ کی طرف سے

فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّکُمْ ؕ وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
پس تم ایمان لے آؤ، یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا، اور اگر تم کفر کروگے تو بیشک اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے
وَالْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۱۷۰﴾
اور زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۱۷۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ کَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ: بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف جیسے کہ وحی بھیجی ہم نے نوح علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے بعد انبیاء علیہم السلام کی طرف۔ مِنْۢ بَعْدِہٖ کی ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور وحی بھیجی ہم نے ابراہیم کی طرف، اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان علیہم السلام کی طرف، وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا: اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور دی، زبور مطلق کتاب کو بھی کہتے ہیں، اور اسی طرح خاص اس کتاب کا نام بھی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی۔ وَرُسُلًا: وَاَرْسَلْنَا رُسُلًا اور بھیجا ہم نے ایسے رسولوں کو کہ قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ: ہم نے ان کا ذکر کردیا آپ پر اس سے قبل، یعنی اِس سورت کے نزول سے قبل، اِن آیات کے نزول سے قبل، مکی سورتوں میں۔ قَصَّ یَقُصُّ بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ ہم نے اس ایسے رسول بھیجے کہ جن کا بیان ہم نے آپ پر کردیا اس سے قبل، اور بعض ایسے رسول بھی کہ ہم نے وہ آپ پر بیان نہیں کئے، وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا: اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی خاص طور پر کلام کرنا، رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ: جَعَلْنَاھُمْ رُسُلًا ہم نے ان سب کو رسول بنایا بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ: تاکہ لوگوں کے لئے کوئی دلیل باقی نہ رہے اللہ پر رسولوں کے بھیجے جانے کے بعد، یا رسولوں کے ان آدمیوں کی طرف آجانے کے بعد اِن کے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے، وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا: اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْہَدُ: لیکن اللہ گواہی دیتا ہے، بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَیْکَ: اس چیز کے ذریعہ سے جو اس نے آپ کی طرف اُتاری، اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ: اور اُتاری بھی وہ چیز اپنی علمی شان کے ساتھ، اپنے علم کے ساتھ اس کو اُتارا۔ گواہی کس چیز پہ دیتا ہے؟ اس بات پر کہ آپ نبی ہیں، اللہ کی طرف سے مرسل ہیں، اور یہ کلام جو اُتاری گئی یہ شہادت کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کلام کے ذریعے سے جس کو آپ پر اُتارا، اور اُتارا بھی اپنے علم کے ساتھ، یعنی وہ اللہ کی علمی شان پر مشتمل ہے، اس کے ذریعے سے اللہ گواہی دیتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ کے نبی ہیں، وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْہَدُوْنَ: اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں، وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا: اور اللہ گواہ کافی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، یا مضارع کے طور پر ترجمہ کرلیں، کیونکہ اگر ماضی اسم موصول کے بعد آجائے تو اس کا ترجمہ مضارع کے طور پر بھی کیا جاسکتا ہے، بیشک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں تحقیق وہ بھٹک گئے بھٹکنا دُور کا، اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا: بے شک وہ لوگ جو کفر

کرتے ہیں اور حق تلفی کرتے ہیں، کیونکہ ظلم کا اصل مفہوم یہی ہے حق تلفی کرنا، اور شرک و کفر اور احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی یہ سب درجہ بدرجہ ظلم کا مصداق ہے، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) اور اسی طرح ہر گناہ کو ظلم علی النفس کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اور ظلم علی الناس بھی گناہ کا شعبہ ہی ہے، لوگوں کے حقوق تلف کرنا،'' بے شک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اور ظلم کرتے ہیں'' لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ: نہیں ہے اللہ کہ بخشے انہیں، وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ: اور نہیں ہے اللہ کہ ہدایت دے ان کو راستے کی مگر جہنم کے راستے کی نہیں ہے اللہ کہ چلائے انہیں راستے پر مگر جہنم کے راستے پر، خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا: ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: اور یہ بات اللہ پر آسان ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ: اے لوگو! قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ: تحقیق تمہارے پاس رسول آ گیا ٹھیک بات لے کر تمہارے رَبّ کی طرف سے، حق اس بات کو کہا جاتا ہے جو واقع کے مطابق ہو۔ فَاٰمِنُوْا: پس تم ایمان لے آؤ، یعنی رسول برحق آ گیا، حق لے کر آ گیا، پس تم ایمان لے آؤ، خَيْرًا لَّكُمْ: يَكُنْ خَيْرًا لَّكُمْ یہ ایمان لانا تمہارے لیے بہتر ہوگا، يَا فَاٰمِنُوْا وَاقْصِدُوْا خَيْرًا لَّكُمْ، ایمان لے آؤ اور اپنے لیے بھلائی کا قصد کرو، وَاِنْ تَكْفُرُوْا: اور اگر تم کفر کرو گے فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یہ الفاظ دال ہیں جزا پر، جزا محذوف ہے، اگر تم کفر کرو گے تو اللہ کا کوئی نقصان نہیں، نقصان اپنا ہی کرو گے، پس بیشک اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت ولا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

چونکہ آج کا سبق کم از کم اکیس دن کے ناغے کے بعد ہو رہا ہے، تو شاید پچھلا مضمون آپ حضرات کے ذہن میں نہیں ہوگا، ذرا غور فرمالیجئے، پچھلے رُکوع میں ذکر آیا تھا: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ، یہود کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ پر یہ سوال اُٹھایا گیا تھا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے پچھلے سبق میں کر دی گئی تھی کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر کتاب اتری ہے اسی طرح آپ کوئی کتاب لائیں، تب ہم مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے، یا بعض مفسرین کی رائے کی مطابق اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تحریر اتاریں، جس میں آپ کی نبوّت کا ذکر ہو، اور نام بنام ہمیں خطاب کر کے کہا گیا ہو کہ یہ میرا رسول ہے اس کو مان لو، اس قسم کی کوئی تحریر آپ آسمان سے اُتاریں گے تو ہم مانیں گے، ورنہ ہم ماننے کے لیے تیار نہیں، اس قسم کے سوالات چونکہ وہ محض آپ کو تنگ کرنے کے لئے کرتے تھے، ورنہ انبیاء علیہم السلام کی نبوّت کا ثبوت مطلقاً معجزات سے ہوتا ہے، کسی خاص معجزے کو متعین کر کے اُس کا مطالبہ کرنے کا حق کسی کو نہیں، کیونکہ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے کہ لوگ جس قسم کا معجزہ مانگیں ویسے دکھایا جائے تب نبی کی نبوت ثابت ہو تو پھر یہ دنیا کا نظم قائم نہیں رہ سکتا، لوگ ایسے اُلٹ پلٹ مطالبے کرنے شروع کر دیں گے کہ جن کو اگر پورا کر دیا جائے تو دُنیا کا نظام مختل ہوگا، کوئی کہے گا سورج شمال کی طرف سے چڑھا کے دکھاؤ، کوئی کہے گا جنوب کی طرف سے چڑھا کے دکھاؤ، کوئی کہے گا بارش لا کے دکھاؤ، کوئی کہے گا سورج نکال کر دکھاؤ،

اس قسم کے اُلٹ پلٹ سوالات جب ہوں گے تو یہ معاملہ گڑ بڑ ہو جائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے عادت یہی رکھی ہے کہ نبی کی نبوت کے ثابت کرنے کے لئے معجزات اور دلائل تو قائم فرماتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ لوگ جس قسم کی دلیل کا مطالبہ کریں اور جیسے معجزے کا مطالبہ کریں ویسے ہی عطا کر دیا جائے اللہ تعالیٰ نے یہ عادت نہیں رکھی۔ اور اگر کبھی اظہار قدرت کے طور پر ایسا ہوا کہ لوگوں نے جیسا معجزہ مانگا اس نبی کو ویسا عطا کر دیا گیا، جیسے صالح علیہ السلام کی قوم نے پتھر سے اُونٹنی نکالنے کا مطالبہ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ صالح علیہ السلام کو دے دیا، تو پھر اللہ تعالیٰ کی عادت یہ رہی ہے کہ منہ مانگے معجزے کو دیکھ کر بھی اگر قوم نے تسلیم نہیں کیا تو اس کے بعد اُس قوم کو تباہ کر دیا جاتا ہے، باقی نہیں رکھا جاتا، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد عمومی عذاب کے ساتھ لوگوں کو تباہ کرنا اللہ کی حکمت نہیں تھی، اس لئے بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ ان کا منہ مانگا معجزہ ان کو نہیں دیا جا رہا، کیونکہ اگر وہ معجزہ دے دیا گیا تو ان کا معاملہ ہی ختم ہو جائے گا، ان کا کام ہی تمام کر دیا جائے گا، قُضِیَ الْاَمْرُ (سورۂ انعام: ۸) فیصلہ ہی ہو جائے گا، اور ابھی یہ اللہ کی حکمت نہیں ہے کہ ان کو اس طرح عمومی عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا جائے۔ تو پچھلی آیات میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے یہ بات کہی گئی تھی، کہ اگر یہ اس قسم کے سوالات کرتے ہیں تو آپ گھبرائیں نہیں، یہ ان کی پرانی عادت ہے، پہلے انبیاء علیہم السلام کو بھی انہوں نے اسی طرح تنگ کیا تھا، خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑی بڑی باتوں کا مطالبہ کیا تھا، اور پھر انبیاء علیہم السلام کے معجزات دیکھنے کے بعد جماعتی طور پر ان کا جو کردار ہے، اور جس نبی پر ایمان لائے اس کے ساتھ بھی ان کا جس قسم کا معاملہ ہے وہ سارے کا سارا پچھلے رُکوع کے اندر ذکر کیا گیا، کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے کیسے واقعات گزرے؟ اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے کیا کیا؟ اس کی تفصیل آپ کے سامنے پچھلے رُکوع کے اندر آئی ہے، اِس رُکوع میں اُسی مضمون کا تتمہ ہے۔

سلسلۂ رِسالت کا اِثبات اور اس کا مقصد

جس کا حاصل یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کوئی پہلے رسول یا کوئی پہلے نبی نہیں، کہ ان کی نبوت اور رسالت کو پہچاننے کے لئے کسی قسم کی دِقت پیش آئے، بلکہ یہ سلسلہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت پہلے سے شروع کر رکھا ہے، اور بہت انبیاء علیہم السلام بھیجے ہیں، اور ان سب نبیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ علیحدہ علیحدہ رہا، کسی کو کتاب دی، کسی کو صحیفہ دیا، کسی کو کوئی کتاب بھی نہیں دی، صحیفہ بھی نہیں دیا، ویسے وحی ان کے اُوپر آئی، اللہ کی طرف سے راہنمائی حاصل ہوئی، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ معجزے دیئے، کسی کو کوئی شان عطا فرمائی، کسی کو کوئی شان عطا فرمائی، لیکن مقصد ان سب کے اِرسال کا متحد تھا کہ وہ لوگوں کو بشارت دینے کے لئے اور خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے آتے تھے، کہ جو اللہ کے اَحکام کو قبول کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کے سامنے یوں اچھا نتیجہ لائیں گے، دنیا اور آخرت میں وہ فلاح اور کامیابی حاصل کرے گا، اور جو اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو تسلیم نہیں کرے گا دنیا اور آخرت کے اندر وہ عذاب کا نشانہ بنے گا، اس متحد مقصد کے لئے ان انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا، اور اتنے نبی بھیجے گئے کہ بعض کا ذکر تو قرآنِ کریم میں صراحتاً ہے اور بعض کا نہیں ہے۔

انبیاء ورُسل کی تعداد قطعی طور پر ثابت نہیں

اسی لئے اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد کو متعین کر کے ایمان نہیں لایا جاتا، کہ اللہ کی طرف سے اتنے نبی آئے اور ہم ان کو مانتے ہیں، ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ذِکر آتا ہے لیکن وہ روایت اس درجے کی نہیں کہ اُس کو عقیدے کی بنیاد بنایا جاسکے، اس لئے ہم یوں کہا کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جتنے نبی آئے، خواہ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش ہم ان سب کو مانتے ہیں، صحیح تعداد اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے نبی بھیجے گئے، کتنے ان میں سے رسول بھیجے گئے، اُسی روایت میں تین سو تیرہ رسولوں کا ذکر ہے، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے، لیکن چونکہ وہ خبرِ واحد ہے اور سند کے اعتبار سے بھی اتنی قوی نہیں، جس کی بنا پر اس روایت کو متعین طور پر عقیدے کے لئے بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، کہ ہم کہیں کہ ہم ایک لاکھ چوبیس ہزار کو مانتے ہیں، اور اس سے زیادہ کو نہیں مانتے، کیونکہ یہ کوئی دلیل قطعی نہیں ہے ظنی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ تعداد کچھ کم ہو، اور ممکن ہے تعداد زیادہ ہو، یہ احتمال اس کے اندر موجود ہے، جیسے کہ کم درجے کی روایات کی حیثیت ہوا کرتی ہے، تو اس میں پھر خطرے کی بات ہے کہ تعداد کم ہو اور ہم زیادہ کو مان لیں، یا تعداد زیادہ ہو اور ہم تھوڑوں کو مان لیں، اس لیے بالاجمال ایمان لائیں گے، فرشتوں کی تعداد کو بھی متعین کر کے ایمان نہیں لایا جاتا بلکہ جتنے اللہ کے فرشتے ہیں ہم سب کو مانتے ہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی جماعت کو بھی بالاجمال اس طرح سے مانا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے آئے ہم ان سب کو تسلیم کرتے ہیں، ہم ان میں سے کسی کا انکار نہیں کرتے، ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوں یا اس سے کم وبیش، تین سو تیرہ رسول ہوں یا اس سے کم وبیش، متعین تعداد کر کے نہیں، بلکہ جتنے اللہ کی طرف سے آئے ہم ان سب کو تسلیم کرتے ہیں۔ تعداد اتنی کثرت کے ساتھ ہے اور مقصد ان سب کا تبشیر وانذار تھا کہ ماننے والوں کو بشارت دی جائے اور انکار کرنے والوں کو خطرے سے آگاہ کر دیا جائے، تعداد اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر صراحتاً بیان نہیں کی، جن کو وہ کچھ نہ کچھ پہچانتے تھے ان کا نام بنام ذکر کر دیا، اور جن کو وہ لوگ پہچانتے نہیں تھے، جن کا ذکر انہوں نے سُنا ہوا نہیں تھا، ان کا بالاجمال ذکر کر دیا، بہر حال یہ آیت نص ہے اس بارے میں کہ انبیاء علیہم السلام صرف اتنے ہی نہیں آئے جن کا قرآن میں ذکر ہے، بلکہ اس میں صراحتاً آ گیا کہ بعض ایسے بھی ہیں جن کا ذکر ہم نے آپ کے سامنے نہیں کیا، اور بعض ایسے ہیں جن کا ذکر کر دیا گیا۔

سلسلۂ رِسالت اِتمامِ حجت کے لئے ہے

اور ان کے آنے کا پھر نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب اللہ تعالیٰ انسانوں کو قیامت کے دن حاضر کریں گے، اور ان سب سے پوچھیں گے کہ تم نے میری اطاعت کیوں نہیں کی؟ اگر اللہ کی طرف سے رسول نہ آئے ہوتے تو وہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں تیرا راستہ کسی نے نہیں بتایا، یہ حجت وہ قائم کر سکتے تھے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں، اللہ تعالیٰ نے چونکہ ہر معاملہ بالکل عدل وانصاف کے ساتھ کرنا ہے، تو رسول بھیج کر اللہ نے یہ حجت تام کر دی، اب ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے عذاب سے بچنے کے لئے کوئی حجت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیج کے اِتمام حجت کر دی، حق اور باطل کو خوب اچھی طرح سے نمایاں کر دیا، اب کسی کے پاس

کوئی کسی قسم کا عذر باقی نہیں ہے، لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ کا یہی معنی ہے، تا کہ لوگوں کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے، کہ وہ یوں کہیں کہ ہمیں کوئی بتانے والا نہیں آیا، اس لئے ہم سے غلطیاں ہوگئیں، اللہ تعالیٰ نے یہ عذر بھی ختم کردیا۔

اس لئے لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اچھے انجام کو حاصل کرنے کے لئے وقت کے نبی پر ایمان لائیں، اور جو حق وہ لے کر آئے اسے قبول کریں، اس لئے آگے يَا أَيُّهَا النَّاسُ کے ساتھ ایک عمومی خطاب کیا گیا، اور سب لوگوں کو سرورِ کائنات ﷺ کے اُوپر ایمان لانے کی دعوت دی گئی، بلاتخصیص کسی فرقے اور کسی قوم کے، جو بھی "النّاس" کا مصداق ہے اور جو بھی "انسان" کہلاتا ہے سب کو خطاب کیا گیا ہے کہ اس کو مان لو اور اس ماننے کے اندر تمہارا بھلا ہے، اور اگر تم اس کا انکار کروگے تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہیں ہوگا، اپنے آپ کو بگاڑو گے، نقصان اپنے آپ کا کروگے، اس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی بھی ہوگئی، اور یہ بنیاد بھی قائم کردی گئی کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوّت کے ثابت کرنے کے لئے کسی ایک ہی معجزے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، کہ ہر کسی کو وہی معجزہ دیا جائے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو مختلف قسم کے معجزے دیئے، مختلف حالات تھے، ایسے ہی سرورِ کائنات ﷺ کو معجزہ دیا گیا اور یہ ایک علمی شان کا معجزہ ہے، یہ جو کتاب اُتری ہے، اللہ تعالیٰ کا علم اس کے اندر اُترا ہے، سب سے بڑا معجزہ حضور ﷺ کا اِثباتِ نبوّت کے لئے یہی ہے، تو اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں، اور یہ لوگ جو نہیں تسلیم کرتے سوائے ضد اور عناد کے ان کے پلے اور کچھ نہیں ہے۔

اِس موقع پر آدم علیہ السلام کا ذِکر کیوں نہیں کیا گیا؟

تو انبیاء علیہم السلام کا ذِکر کرتے ہوئے اِبتدا اس سے کی گئی کہ "ہم نے آپ کی طرف ویسی وحی بھیجی ہے جیسی وحی ہم نے نوح علیہ السلام کی طرف بھیجی تھی" حالانکہ ہمارے عقیدے میں سب سے پہلے نبی اس دُنیا کے اندر حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور آدم علیہ السلام سے لے کر نوح علیہ السلام تک متعدّد نبی گزرے ہیں، جن کا ذکر اگرچہ قرآنِ کریم میں صراحتاً نہیں ہے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے پہلے بھی بہت سے نبی گزرے ہیں، ان کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا، اس لئے نہیں کیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام جس وقت اس دُنیا میں آئے تھے تو دینِ حق لے کر آئے تھے، دینِ فطرت لے کر آئے تھے، آپ بھی اسی طریقے پر تھے اور جو بچے آپ کے پیدا ہوئے وہ ساری کی ساری اولاد حضرت آدم علیہ السلام کے طریقے پر ہی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اَحکام اُترتے تھے چونکہ زندگی کی ابھی اِبتدا تھی، دُنیا آباد ہو رہی تھی، اِبتدائی دور تھا تو اُس میں اللہ کی طرف سے جو ہدایات اُترتی تھیں وہ معمولی قسم کی تھیں، رہنے سہنے کے متعلق، کھانے پینے کے متعلق، ان کی راہنمائی کے لئے کہ یوں وقت گزارنا ہے، یوں زندگی گزارنی ہے، اور ایسے اَحکام اللہ کی طرف سے ان کے اُوپر نہیں آئے جن کی موافقت ومخالفت کا اُس وقت قصہ چھڑا ہو، جیسے جیسے انبیاء علیہم السلام ہدایات دیتے تھے ویسے ویسے وہ لوگ اپنا وقت گزارتے چلے گئے، اگر کسی نے کوئی نافرمانی اور معصیت کی تو یا اُس کو دُنیا میں سزا ہوگئی یا آخرت میں اللہ تعالیٰ پکڑے گا، جیسا کہ ہابیل اور قابیل کے قصے میں آپ نے پڑھا اور سنا کہ ہابیل کو قابیل نے قتل کیا، تو یہ بھی ایک جرم تھا، دُنیا میں بھی اُس کے اُوپر گرفت ہوئی اور آخرت میں بھی اُس کے اُوپر گرفت ہوگی، اس قسم کے کام تو ہوئے، لیکن کفر وشرک،

اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار، نبوت کا انکار، اللہ کے دین کی تکذیب، اس قسم کے جرائم اُس وقت نہیں پائے گئے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک دُنیا کسی نہ کسی درجے میں آباد ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدّت کے ساتھ اَحکام جو آئے ہیں وہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں آئے ہیں، اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کے اندر کُفر وشرک بھی رواج پا گیا تھا، اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم شرک کے اندر مبتلا ہوگئی تھی، تو سب سے پہلے نبی جو کُفر اور شرک کی تردید کے لئے دُنیا کے اندر مبعوث کیے گئے ہیں وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، انہوں نے شرک کی تردید کی اور توحید کے اُوپر دلائل قائم کیے، اور ان کے وعظ ونصیحت کی مخالفت کی بنا پر قوم کو تباہ کیا گیا، ان کے اُوپر ایک عمومی عذاب آیا، تو اس دُنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی عمومی گرفت کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے شروع ہوا، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی چونکہ رَدِّ شرک اور رَدِّ کُفر پر مشتمل ہے، اور آپ کی وحی کے قبول کرنے میں فلاحِ دارین ہے، اور آپ کی وحی کی مخالفت کرنے میں ڈرایا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے عمومی عذاب آسکتا ہے، اس لئے آپ کی وحی کو حضرت نوح علیہ السلام کی وحی کے ساتھ تشبیہ دی گئی، اور حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے بعد کے سلسلے کی وحی کے ساتھ تشبیہ نہیں دی گئی، کیونکہ وہ بالکل اِبتدائی دور کی وحی تھی، اور اَحکام کی شدّت، رَدِّ شرک، رَدِّ کُفر اور دیگر اَحکام حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی تشبیہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ہے، پہلے دور کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا۔

خلاصۂ آیات

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ: ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے کہ وحی کی ہم نے نوح علیہ السلام کی طرف، اس تشبیہ کی وجہ آپ کے سامنے ذکر کردی گئی، ''اور نوح علیہ السلام کے بعد نبیوں کی طرف'' ان نبیوں کی تعداد نہیں ذکر کی گئی کہ النّبیین کا مصداق کتنے لوگ ہیں، نبیوں کی جماعت میں سے جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر اہلِ کتاب میں تھا یا اہلِ کتاب کی زبانی مشرکین بھی سنتے رہتے تھے، کسی نہ کسی درجے میں ان کا تعارف تھا اور ان کی طرف وہ لوگ اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے، تو النّبیّٖنَ میں سے ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کردیا، یہ ذکرِ خاص بعد العام ہے، ''اور جیسے کہ وحی بھیجی ہم نے (وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ بھی کَمَآ کے نیچے داخل ہے) ابراہیم علیہ السلام کی طرف، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور اَسباط کی طرف'' اسباط سبط کی جمع ہے، سبط کہتے ہیں اولاد الاولاد کو، اس کا مصداق اولادِ یعقوب ہے، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد آپ کی اولاد جو پھیلی تو بہت کثرت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اولادِ یعقوب علیہ السلام میں ہوئے ہیں، ''جیسے کہ وحی بھیجی ہم نے اولادِ یعقوب علیہ السلام کی طرف، اور عیسیٰ علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام اور یونس علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی طرف، اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور دی'' ان کو بھی چونکہ خصوصیت کے ساتھ کتاب ملی تھی تو ان کا ذکر علیحدہ کردیا، زبور سے یہاں وہی کتاب مُراد ہے جو ان کو دی گئی تھی۔ ''اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا بیان ہم نے آپ پر کردیا اس سے قبل'' یعنی ان آیات کے نزول سے قبل، یا سورت کے نازل ہونے سے قبل مکی زندگی میں ہم نے آپ پر کچھ رسولوں کا تذکرہ کیا، ''اور ایسے رسول بھی بھیجے جن کا ذکر ہم نے آپ پر نہیں کیا، اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام کی'' اس کا ذکر

بھی آپ کے سامنے آ گیا، اور یہ کلام بھی مشافہۃً رُوبرو نہیں تھی، بلکہ من وراء الحجاب تھی، بہرحال ہوئی فرشتے کی وساطت کے بغیر، طور پر جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے تھے، جس کی تفصیل آپ کے سامنے دوسری سورتوں میں آئے گی۔ آگے ان کے بھیجے جانے کا متعین طور پر ایک مقصد مذکور ہے، کہ ہم نے ان سب کو رسول بنایا تھا بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ: اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے تھے ڈرانے والے تھے لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ: تاکہ لوگوں کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے ان رسولوں کے آجانے کے بعد، یا اللہ کی طرف سے ان رسولوں کے بھیجے جانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے، اس حجت سے وہی حجت مراد ہے جیسے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا کہ جب اللہ کی طرف سے گرفت ہوگی تو وہ یہ نہ کہنے پائیں کہ ہمیں سمجھانے والا کوئی نہیں آیا، اگر ہمیں کوئی بتانے والا آجاتا اور کوئی تیرے راستے کی نشاندہی کرتا تو ہم اُس کو قبول کرتے اور اس پر چلتے، اس لئے ہم معذور ہیں کہ ہمارے سامنے حق واضح نہیں ہوا، اس قسم کی حجت جو لوگ قائم کر سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو ختم کر دیا۔ "تاکہ لوگوں کے لئے کوئی حجت باقی نہ رہے اللہ کے مقابلے میں رسولوں کے آجانے کے بعد یا رسولوں کے بھیجے جانے کے بعد، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے" اگر وہ بغیر ارسالِ رسول کے بھی پکڑتا اور عذاب دیتا تو بھی اُس کو روکنے والا کوئی نہیں، لیکن وہ چونکہ حکیم بھی ہے اس لئے اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ بندوں پر اِتمامِ حجت کیا جائے اور اس اِتمامِ حجت کے بعد پھر ان کے اوپر گرفت کی جائے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور مخالفین کے انجامِ بد کا ذِکر

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ: اس "لٰکِن" کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت تو آپ کی بھی ثابت ہے، جس طرح ان انبیاء علیہم السلام کی ثابت ہے جن کا ذکر پہلے آیا ہے، اور اگر یہ لوگ نہیں مانتے اور تکذیب کرتے رہیں تو کرتے رہیں لیکن اللہ تو آپ کی نبوّت کی گواہی دیتا ہے، اور گواہی دیتا ہے اُس چیز کے ذریعے سے جو آپ کی طرف اُتاری، اور اُتاری بھی اپنے علم کے ساتھ، اس سے یہی کتاب مراد ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا علم نازل کیا۔ "اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ گواہ کافی ہے" اللہ کی گواہی کے بعد کسی اور کی گواہی کی ضرورت ہی نہیں، اس لئے آپ کی نبوّت ثابت ہے، اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو آپ کسی قسم کے غم میں مبتلا نہ ہوں، یہ الفاظ بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے بتادیئے گئے۔

اب آگے مخالفت کرنے والوں کا بُرا انجام ظاہر کر دیا گیا، کہ جو آپ کی نبوّت کو نہیں مانتے اور اس حق کو تسلیم نہیں کرتے ان کا یہ انجام ہوگا، "بیشک وہ لوگ جو کُفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں" یعنی خود کُفر کرتے ہیں پھر اللہ کے راستے سے روکتے بھی ہیں جیسے اُس وقت اہلِ کتاب کی حالت تھی، اور ایسے ہی مشرکینِ مکہ کے رُؤساء بھی، "تحقیق وہ بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑے، بھٹک گئے بھٹکنا بہت دُور کا، بیشک وہ لوگ جو کُفر کرتے ہیں اور ظلم کرتے ہیں، نہیں ہے اللہ کہ بخشے انہیں" یعنی آخرت میں ان کافروں کی بخشش نہیں ہوگی، "اور نہ ہی ان کو کسی راستے پر چلائے گا مگر جہنم کے راستے پر" جہنم کے راستے کے علاوہ

اللہ ان کو کسی راستے پر نہیں چلائے گا، یعنی ایسے راستے پر چلائے گا کہ یہ جہنم میں جا گریں گے،'' اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اور یہ بات اللہ پر آسان ہے'' یعنی اتنے لوگوں کو اکٹھا کر کے جہنم میں پھینک دینا اور جہنم کے راستے پر چلانا اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔

حضور ﷺ پر ایمان لانے کی عمومی دعوت

اب آگے عمومی طور پر سب انسانوں کو خطاب کر کے سرورِ کائنات ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، نہ اس میں کسی قوم کی تخصیص ہے، نہ کسی فرقے کی تخصیص ہے، اے لوگو! قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ: تحقیق تمہارے پاس رسول آ گیا ٹھیک بات لے کر تمہارے رَبّ کی طرف سے، فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ: ایمان لے آؤ اس رسول پر، یہ ایمان لانا تمہارے لئے بہتر ہے، یا مطلب یہ ہے کہ ایمان لے آؤ اور اپنے لئے بھلائی کا قصد کرو۔'' اور اگر تم کُفر کرو گے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑو گے، اس میں نقصان تمہارا ہی ہے'' فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پس بیشک اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، تو جو زمین اور آسمانوں کا مالک ہے تمہارے ایمان لانے سے اس کا کوئی فائدہ نہیں، اور تمہارے کُفر کرنے سے اُس کا کوئی نقصان نہیں، اس لئے ایمان لانے میں تمہارا ہی بھلا ہے، اور اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے اور انکار کرو گے تو اس میں نقصان تمہارا ہی ہے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ
اے کتاب والو! اپنے دِین میں غلوّ نہ کرو اور نہ بولو اللہ پر مگر حق،
اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ
سوائے اس کے نہیں کہ مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے اور اُس کا کلمہ ہے،
اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ
ڈالا اللہ تعالیٰ نے وہ کلمہ مریم کی طرف اور اللہ کی طرف سے وہ ذی رُوح ہے، پس تم ایمان لے آؤ اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر،
وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ
اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں، باز آ جاؤ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، سوائے اس کے نہیں کہ اللہ ایک ہی معبود ہے، پاک ہے وہ اس بات

يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

سے کہ اُس کے لئے اولاد ہو، اُسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور کافی ہے اللہ کارساز ﴿۱۷۱﴾

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ

ہرگز عار نہیں کرتے مسیح اللہ کا بندہ ہونے سے اور نہ مقرب

الْمُقَرَّبُوْنَ ۗ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ

فرشتے عار کرتے ہیں، اور جو اللہ کا بندہ بننے سے عار کرے اور تکبر میں مبتلا ہو جائے پس عنقریب اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب

اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ

جمع کرے گا ﴿۱۷۲﴾ پھر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے پس پورے دے گا اللہ تعالیٰ انہیں

اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا

ان کے اجر اور زیادہ دے گا انہیں اپنے فضل سے، اور وہ لوگ جنہوں نے عار کی

وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ

اور تکبّر کیا پس اللہ تعالیٰ انہیں درد ناک عذاب دے گا، اور نہیں پائیں گے وہ اپنے لیے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ

اللہ کے علاوہ کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۷۳﴾ اے لوگو! تحقیق آگئی تمہارے پاس

بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

مضبوط دلیل تمہارے رب کی طرف سے اور ہم نے اُتار دیا تمہاری طرف ایک واضح نور ﴿۱۷۴﴾ پھر جو لوگ

اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ

اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اُس کو مضبوطی سے تھامتے ہیں پس عنقریب داخل کرے گا اللہ انہیں اپنی طرف سے رحمت میں

وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۗ

اور فضل میں، اور راہنمائی کرے گا ان کی اپنی طرف سیدھے راستے کی ﴿۱۷۵﴾ وہ آپ سے حکم پوچھتے ہیں،

قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کلالہ کے بارے میں، اگر کوئی شخص ہلاک ہوجائے اور اُس کے لئے اولاد موجود نہ ہو

وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ

اور اُس کے لئے بہن ہو تو اُس بہن کے لئے نصف ہوگا اس چیز کا جو مرنے والا چھوڑ گیا، اور بھائی وارث ہوگا اُس بہن کا اگر اس بہن

لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَاِنْ

کے لئے اولاد نہ ہو، اور اگر بہنیں دو موجود ہوں تو ان دونوں کے لئے دو ثلث ہوں گے اُس مال میں سے جس کو بھائی چھوڑ جائے، اور اگر

كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ

وہ بہن بھائی مرد اور عورت اکٹھے ہوں تو مذکر کے لئے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے،

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لیے تا کہ تم بھٹک نہ جاؤ، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۱۷۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے کتاب والو! لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: لَا تَغْلُوْا یہ لفظ غُلُوّ سے لیا گیا ہے، غلو کا معنی اصل میں ہوتا ہے حد سے تجاوز کرنا، کسی چیز کو اس کے مقام سے آگے بڑھا دینا، لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: اپنے دین میں غلو نہ کرو، حد سے بڑھی ہوئی باتیں نہ کرو، جو دین کے احکام ہیں ان کو اسی معیار پر رہنے دو جس معیار پر اپنی دلیل کے ساتھ وہ ثابت ہیں، ان کے اندر اپنی طرف سے مبالغہ آمیزی نہ کرو، وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: اور نہ بولو اللہ پر مگر حق، حق کا معنی ثابت شدہ چیز، جو حقیقتاً ثابت ہے وہی چیز اللہ کے متعلق بیان کرو، اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ: سوائے اس کے نہیں کہ مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے اور اس کا کلمہ ہے، اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ: ڈالا اللہ تعالیٰ نے وہ کلمہ مریم کی طرف، وَرُوْحٌ مِّنْهُ: اور اللہ کی طرف سے وہ ذی روح ہے۔ روح سے ذی روح مراد ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: پس تم ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ: اور ثلاثہ نہ کہو، ثلاثہ کا معنی تین، تین نہ کہو یعنی یہ نہ کہو آلہہ ثلاثہ ہیں، ثلاثہ سے باز آجاؤ، نہ کہو ثلاثہ، اِنْتَهُوْا: رُک جاؤ اس عقیدے سے! باز آجاؤ اس عقیدے سے! ثلاثہ کہنے سے باز آجاؤ! خَيْرًا لَّكُمْ: يَكُنْ خَيْرًا لَّكُمْ: یہ باز آنا تمہارے لیے بہتر ہے، یا، رُک جاؤ اس تثلیث سے، اس بات سے رُک جاؤ وَاقْصِدُوْا خَيْرًا لَّكُمْ جیسے اسی قسم کے الفاظ پچھلے رکوع میں بھی آئے تھے، تو ترجمہ

اسی طرح کیا گیا تھا، ''اپنی بھلائی کا قصد کرو'' ۔ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ الخ: سوائے اس کے نہیں کہ اللہ الٰہ واحد ہے، پاک ہے وہ اس بات سے کہ اس کے لئے اولاد ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور کافی ہے اللہ کارساز۔ لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ: اِستِنکاف: عار کرنا، ہرگز عار نہیں کرتے مسیح علیہ السلام اللہ کا بندہ ہونے سے اور نہ مقرب فرشتے عار کرتے ہیں، وَمَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ: اور جو اللہ کی عبادت سے، اللہ کا بندہ بننے سے عار کرے وَیَسْتَكْبِرْ: اور تکبر میں مبتلا ہو جائے فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا: پس عنقریب اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب جمع کرے گا، پھر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ: پس پورا دے گا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اجر، اور زیادہ دے گا انہیں اپنے فضل سے، اور وہ لوگ جنہوں نے عار کی اور تکبر کیا، فَیُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا: پس اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب دے گا، وَّلَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا: اور نہیں پائیں گے وہ اپنے لیے اللہ کے علاوہ کوئی کارساز نہ کوئی مددگار۔ ولی: خیر خواہ، ہمدرد، حمایتی۔ نہ کوئی اپنے لئے حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار پائیں گے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ: اے لوگو! قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: تحقیق آ گئی تمہارے پاس مضبوط دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے، برھان دلیل قطعی کو کہتے ہیں، برہان اور دلیل کا لفظ اُردو میں مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کا ترجمہ مؤنث کے ساتھ کیا جا رہا ہے، عربی میں یہ لفظ مذکر ہے، ''تمہارے پاس آ گئی تمہارے رَبّ کی طرف سے واضح دلیل'' وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا: اور ہم نے اُتار دیا تمہاری طرف ایک واضح نُور، ایک واضح روشنی، مبین واضح کے معنی میں۔ ''پھر جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں'' وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ: اور اس کو مضبوطی سے تھامتے ہیں۔ اِعتصام: کسی چیز کو مضبوطی سے تھام لینا، فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ: پس عنقریب داخل کرے گا اللہ تعالیٰ انہیں اپنے طرف سے رحمت میں اور فضل میں، وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا: اور راہنمائی کرے گا ان کی اپنی طرف سیدھے راستے کی، ان کو ایسے سیدھے راستے پر چلائے گا جو اللہ کی طرف پہنچتا ہے، اللہ کے قرب کی طرف جاتا ہے۔ یَسْتَفْتُوْنَكَ: آپ سے اِستفتاء کرتے ہیں، حکم پوچھتے ہیں، فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے، مستفتی: فتویٰ پوچھنے والا، اسی سے ہے مفتی: فتویٰ دینے والا۔ آپ سے اِستفتاء کرتے ہیں، پوچھتے ہیں۔ کس چیز کے متعلق پوچھتے ہیں؟ تو جواب میں ہی چونکہ سوال کی وضاحت ہے اس لئے سوال کو دُہرا کر آگے جواب ذِکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، سوال خود جواب سے سمجھ میں آ جائے گا، قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کلالہ کے بارے میں، معلوم ہو گیا کہ اِستفتاء بھی کلالہ کے بارے میں تھا۔ کلالہ ہر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ اُصول موجود ہوں اور نہ فروع موجود ہوں، یعنی باپ دادا میں سے بھی کوئی موجود نہیں، اور اولاد میں بھی کوئی نہیں، اس کو کلالہ کہتے ہیں، یہاں اس لفظ کا مصداق یہی ہے، ویسے پھر بعد میں توسعاً اس وراثت کے لئے بھی کلالہ کا لفظ بول دیا جاتا ہے جو ایسا شخص چھوڑ کر جائے، اور ان ورثاء پر بھی کلالہ کا لفظ بول دیا جاتا ہے جو ایسے شخص کے وارث ہوتے ہیں، یعنی یہ شخص جس کے اُصول و فروع موجود نہیں یہ بھی کلالہ کا مصداق ہے، اور ایسے شخص کے جو ورثاء ہوتے ہیں روایاتِ حدیث میں بعض جگہ ان پر بھی کلالہ کا لفظ بولا ہوا ہے، اور ایسے شخص کا جو چھوڑا ہوا مال ہوتا ہے وِرثہ،

اس کے لئے بھی کلالہ کا لفظ بول دیتے ہیں، یہاں مراد خود وہ شخص ہے مرنے والا جس کے اُصول بھی موجود نہ ہوں فروع بھی موجود نہ ہوں، نہ تو اس کی اولاد میں سے کوئی لڑکا لڑکی موجود ہے اور نہ اس کے اُصول باپ دادا کوئی موجود ہے، ایسے شخص کی میراث کے بارے میں سوال کیا گیا تھا جس کی وضاحت یہاں کی جارہی ہے۔ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ: اگر کوئی شخص ہلاک ہوجائے اور اس کے لئے اولاد موجود نہ ہو، اسی طرح سے روایاتِ حدیث سے معلوم ہوا کہ اُصول کی طرف بھی کوئی موجود نہیں، کیونکہ اگر کوئی شخص مرے، اولاد اس کی نہیں، لیکن اس کا باپ موجود ہے تو سارا وِرثہ باپ لے جایا کرتا ہے، اگر ماں باپ دونوں موجود ہوں تو ثلث ماں کا ہوتا ہے باقی باپ کا، جیسے کہ شروع سورت کے اندر اس کی تفصیل آپ کے سامنے آگئی تھی، تو یہاں جو بہن بھائیوں کی میراث ذکر کی جارہی ہے یہ تبھی صادق آئے گی کہ جس وقت اس کی اولاد کے ساتھ ساتھ اس کے اُصول یعنی باپ اور دادا موجود نہیں، ''اگر کوئی شخص ہلاک ہوجائے اور اس کے لئے اولاد نہ ہو، اور اس کے لئے بہن ہو'' یہاں بہن سے مراد اخیافی کے علاوہ دوسری ہے، کیونکہ ماں شریک بہن بھائی کا ذکر شروع سورت کے اندر آگیا جہاں میراث کے قصے آئے تھے، جن کو آپ اخیافی کہتے ہیں وہ اصحابِ فرائض میں سے ہیں، کہ وہاں بہن اور بھائی میں سے ایک موجود ہو تو وہاں آیا تھا اس کو چھٹا حصہ دے دیا جائے، دو یا دو سے زائد موجود ہوں تو وہ ثلث میں شریک ہیں اور برابر تقسیم کردیا جاتا ہے، وہاں لڑکے اور لڑکی کا کوئی فرق نہیں ہے، آپ کو یاد ہوگا، ابتدا کے اندر ذِکر کیا گیا تھا کہ اس سے اخیافی بہن بھائی مراد ہیں، جو شروع کے اندر دورُکوع میراث کے آئے تھے ان میں یہ مسئلہ آیا تھا، اور یہاں آگئے عینی بہن بھائی، اگر تو ماں باپ دونوں میں شریک موجود ہوں جن کو عینی کہتے ہیں تو پھر علاتیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور اگر عینی موجود نہ ہوں تو پھر علاتی عینیوں کے حکم میں ہیں، عینی کہا جاتا ہے حقیقی بہن بھائیوں کو جو ماں باپ دونوں میں شریک ہیں، اور علاتی کہا جاتا ہے ان بہن بھائیوں کو جو صرف باپ میں شریک ہیں ماں میں شریک نہیں ہیں، اخیافی کہا جاتا ہے ان کو جو صرف ماں میں شریک ہیں باپ میں شریک نہیں ہیں، تو جو ماں میں شریک ہوں اور باپ میں شریک نہ ہوں ان کا مسئلہ پہلے آگیا، اور یہاں مسئلہ ذکر کیا جارہا ہے عینی کا، اور عینی موجود نہ ہو تو پھر علاتی عینی کے حکم میں ہے۔ حاصل اس مسئلے کا یہ ہے کہ یہ (عینی اور علاتی) بہن بھائی جو ہوا کرتے ہیں یہ بالکل اولاد کے حکم میں ہیں، جیسے اگر ایک لڑکی موجود ہو تو اس کو نصف میراث ملتی ہے، تو یہاں ایک بہن موجود ہوگی تو اس کو نصف میراث ملے گی، جیسے وہاں دو لڑکیاں موجود ہوں تو دو ثلث جائیداد ان کو ملتی ہے، تو یہاں دو بہنیں یا دو سے زیادہ بہنیں موجود ہوں گی تو دو ثلث جائیداد ان کو ملے گی، جیسے وہاں اولاد میں لڑکا لڑکی دونوں موجود ہوں تو لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کے طور پر میراث تقسیم ہوتی ہے، کہ لڑکے کے لئے دو حصے اور لڑکی کے لئے ایک حصہ، لڑکے کو لڑکے سے دوگنا دیں گے، تو یہاں بھی اگر بہن بھائی دونوں قسم کے موجود ہیں، بھائی بھی موجود ہیں بہنیں بھی موجود ہیں، تو یہاں بھی لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کے طور پر میراث کو تقسیم کردیا جائے گا، بہرحال جو حکم اولاد کا ہے وہی حکم عینی بہن بھائیوں کا ہے، یہی مسئلہ یہاں ذکر کیا ہوا ہے، اگر عینی موجود ہو تو پھر علاتی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، عینی حق دار ہوگا اور علاتی محروم ہوں گے، اور اگر عینی موجود نہیں تو

پھر علاتی بہن بھائی عینی کے حکم میں ہیں۔ ''مرنے والے کے لئے بہن ہو'' فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ: تو اس بہن کے لئے نصف ہوگا اس چیز کا جو یہ مرنے والا چھوڑ گیا، وَهُوَ يَرِثُهَآ: لیکن اگر مرنے والی بہن ہے اور پیچھے بھائی موجود ہے تو بھائی عصبہ ہے، بہن مر جائے گی تو کل میراث اسی کو پہنچ جائے گی، بہن عصبہ نہیں ہے جبکہ وہ اکیلی موجود ہو، اور اگر بہن مرے تو بھائی عصبہ ہے، اس لئے بھائی مرے گا تو بہن کو تو اس کی جائیداد کا نصف دیں گے، اور باقی دوسرے حصے داروں کو پہنچے گا، اگر کوئی حق دار موجود نہ ہو تو پھر رد کر کے دوبارہ اسی بہن کو دے دیا جائے گا، لیکن اگر مرنے والی بہن ہے جس کی اولاد بھی ہے نہیں اور اصول میں بھی کوئی موجود نہیں، اور بھائی اس کا وارث بن رہا ہے تو بھائی ساری میراث لے جائے گا کیونکہ وہ عصبہ ہے، میراث کی کتابوں کے اندر اس کی تفصیل موجود ہے۔ ''اور وہ بھائی وارث ہوگا اس بہن کا اگر اس بہن کے لئے اولاد نہ ہو'' اسی طرح اس کے اصول میں اس کا باپ وغیرہ بھی موجود نہیں، تب بھائی وارث ہوگا، ورنہ باپ کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوتے ہیں۔ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ: اگر بہنیں دو موجود ہوں فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ: پھر ان دونوں کے لئے دو ثلث ہوں گے مِمَّا تَرَكَ: اس مال میں سے جس کو بھائی چھوڑ جائے، وَإِنْ كَانُوْٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً: اور اگر پیچھے بچے ہوئے بہن بھائی مرد وعورت اکٹھے ہیں، ''اگر ہیں وہ پیچھے رہنے والے بھائی یعنی مرد اور عورتیں'' فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ: تو پھر مذکر کے لئے دو لڑکیوں کا حصہ ہے یعنی لڑکے کے لئے دو حصے اور لڑکی کے لئے ایک حصہ، اس نسبت کے ساتھ تقسیم کر دیں گے۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوْا: اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لئے تاکہ تم بھٹک نہ جاؤ۔ لِئَلَّا تَضِلُّوْا تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے وضاحت کرتا ہے احکام کی، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ماقبل سے ربط

سورت اپنے اختتام کو پہنچی، آپ کے سامنے تفصیل گزر چکی کہ پچھلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے زیادہ تر یہود کا تذکرہ کیا تھا، اہلِ ایمان کے علاوہ اہلِ کتاب میں سے یہود کا تذکرہ اس سورت کے اندر زیادہ آیا ہے، اور آئندہ آیات میں نصاریٰ کو خطاب کر کے دینِ حق کی کچھ تفہیم کی جا رہی ہے۔

نصاریٰ کا تعارف اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا غلو

نصاریٰ وہ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے تھے، اور عیسیٰ علیہ السلام رسول برحق ہیں، اور ہم ان کو اسی طرح اللہ کا

رسول مانتے ہیں جس طرح سرورِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں، وہ من جانب اللہ مبعوث تھے، اور ان کو کتاب بھی عطا کی گئی تھی، ان کا یہ امتیاز آپ کے سامنے سورۂ آلِ عمران میں وضاحت کے ساتھ ذکر کر دیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے، حضرت مریم علیہا السلام جو ولیہ صالحہ اللہ کی نیک بندی تھیں ان کے اُوپر اللہ کی قدرت اثر انداز ہوئی، اور جبریل علیہ السلام تشریف لائے، نفخۃ جبریلیہ ہوا یعنی انہوں نے آکر گریبان میں پھونک ماری اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن کے اثر سے یعنی عام انسان پیدا ہوتے ہیں، کہ ظاہری طور پر نطفہ رحم میں اِلقاء ہوتا ہے، پھر اللہ کے کلمہ کن کا اثر قبول کر کے وہ بچہ بنتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت صرف کلمہ کن سے ہوئی، اور اس میں نطفۂ مَرد کو واسطہ نہیں بنایا گیا، اس لئے ان کو براہِ راست اللہ کے کلمہ کن کی پیداوار قرار دیا گیا، گویا کہ یہ اللہ کے کلمے کا ظہور ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے بنا دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر دیا، یہی مثال آئی تھی: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (آل عمران:۵۹) کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ تو یہ وضاحت ہو جانے کے بعد عیسائیوں کو چاہیے تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی درجے پر رکھتے جو درجہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا، کہ اللہ کے مقبول بندے ہیں، اللہ کے مقرب بندے ہیں، اللہ کے رسول ہیں، نبی ہیں، صاحبِ کتاب ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح القدس کے ساتھ ان کو تائید حاصل ہے، اس عقیدے پر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو قبول کرتے اور ان کے بیان کے مطابق توحید کو اِختیار کر کے اللہ کی عبادت کرتے، عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کرتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس درجے پر تھے اس درجے پر ان کو رکھا جاتا، ان کی تعلیم کے مطابق جب تک نیا رسول نہ آتا انہی کی شریعت پر چلتے، اور جب نیا رسول آجاتا تو ان کی نصیحت کے مطابق اس آنے والے رسول کو مان لیتے، اگر وہ یہ طریقہ اپناتے تو یہ صراطِ مستقیم ہے، دُنیا کے اندر ہدایت یافتہ ہوتے اور آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب پاتے۔ لیکن ان عیسائیوں اور ان نصرانیوں نے دین کے بارے میں غلو اختیار کیا، یعنی دین کی باتوں کو ان کے ٹھکانے پر نہیں رہنے دیا، غلط باتیں اور جھوٹ کی آمیزش کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی نسبت کی گئی، کہ یہ سب کچھ اللہ کا بیان کیا ہوا ہے، اور خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے بارے میں وہ حد سے بہت آگے نکل گئے، جس درجے کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اُس درجے پر نہیں رہنے دیا۔ جس طرح یہود تفریط کر کے کافر ہوئے، نصاریٰ افراط کے درجے میں کافر ہو گئے، انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، یہ عقیدہ بھی ان میں سے بعض کا تھا (سورۂ توبہ:۳۰)، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام کو ہی اللہ کہتے تھے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ، تو اِبن اللہ کا عقیدہ بھی تھا، اور: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ (المائدۃ:۱۷-۷۲) کا عقیدہ بھی بنایا، اور اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدۃ:۷۳) کا عقیدہ بھی بنایا کہ تین میں سے ایک ہیں، یہ ان کے عقیدے قرآنِ کریم کے اندر ذکر کئے گئے، جب وہ تین میں سے تیسرا اللہ کو کہتے تھے، تو باقی دو جو ساتھ شامل کرتے تھے، بعض روح القدس کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو ساتھ شامل کرتے تھے، اور بعض مریم علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو شامل کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ، مریم اور عیسیٰ یہ ثلاثہ ہو گئے، یا اللہ تعالیٰ، عیسیٰ اور روح القدس یہ ثلاثہ ہو گئے، یہ ہے ان کا تثلیث کا عقیدہ، اور پھر چونکہ اِنجیل کے اندر صراحتاً

توحید بھی مذکور ہے، تو انہوں نے ایک چیستان بنالیا کہ تین ایک ہیں اور ایک تین ہیں، اور اس قسم کی پہیلیوں میں پڑکر انہوں نے اپنا دین سارے کا سارا خراب کرلیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بشریت سے نکالا، انسانوں کی صف سے نکالا، اللہ کی اولاد قرار دیا، اللہ کی طرح قدیم قرار دیا، اللہ کی طرح قادرِ مطلق قرار دیا، یہ عقیدہ اختیار کر کے وہ حد سے نکل گئے اور کافر ہو گئے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں ان کو یہی تعلیم دی ہے کہ اس غلو سے باز آجاؤ، اور غلو سے باز آنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق وہی بات کہو جو صحیح طور پر دلیل کے ساتھ ثابت ہے، اپنی طرف سے اس میں آمیزش نہ کرو۔

اُمم سابقہ کی بیماریاں اُمتِ محمدیہ میں

اور یہ غلو کی بیماری تقریباً تمام اُمتوں میں ہی ہوئی، کہ عقیدت میں آکر وہ اپنے انبیاء کو، اپنے اولیاء کو، اپنے مشائخ کو، اپنے اساتذہ کو، بسا اوقات اس طرح بڑھاتے ہیں کہ ان کو ان کی حد پر نہیں رہنے دیتے، سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی اُمت کو اسی غلو سے ڈرایا، اور بہت سارے مختلف طریقوں کے ساتھ حضور ﷺ نے وضاحت کی، بعض روایات میں آتا ہے کہ تم لوگ بھی پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلو گے، جیسی باتیں انہوں کیں ویسی تم بھی کرو گے، اور تمہاری باتوں میں ان کی باتوں کے ساتھ اتنی مطابقت ہوگی کہ اگر ان میں سے کوئی شخص گوہ کی بل میں گھسا ہوگا تو تم بھی گوہ کی بل میں گھسو گے[1] مشکوٰۃ شریف میں روایات موجود ہیں، اور ایک روایت میں یہ لفظ بھی ہے کہ اگر ان میں کوئی شخص ایسا ہوا جو اپنی ماں کے پاس علانیہ آتا تھا تو میری اُمت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اپنی ماں کے پاس علانیہ آئیں گے۔[2] حدیث میں الفاظ ہیں: ''حَذْوَ النعلِ بالنعلِ'' جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے مطابق ہوتا ہے، اس طرح تمہاری پہلی اُمتوں کے ساتھ مطابقت ہوگی، کہ جس قسم کے نظریات وخیالات ان میں پیدا ہوئے، تمہارے اندر بھی اسی قسم کے اُٹھیں گے اور چمکیں گے۔ اور فرمایا کہ پہلے لوگ تو بہتر فرقوں کے اندر بٹے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹے گی (حوالہ گزر چکا)، کیونکہ وہ تو بہتر کے بہتر ہی گمراہ ہوئے، ہمارے ہاں بہتر گمراہ ہوں گے اور ایک اہلِ حق میں سے ہوگا، اس اہلِ حق والے فرقے کو شمار کر کے تہتر بن جائیں گے۔ تو غلو والی بیماری جو ان لوگوں کے اندر تھی یہی بیماری اس اُمت کے بعض فرقوں کے اندر آئی، اور اس غلو کی بنا پر وہ بھی اسی طرح سے صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے جس طرح سے پہلے نصاریٰ وغیرہ غلو اختیار کرنے کی وجہ سے بھٹکے۔

سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، بخاری شریف میں بھی روایت آتی ہے، مشکوٰۃ میں بھی ہے، باب العصمیۃ میں، ''لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْیَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ''[3] کہ میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کیجیو جس

(۱) بخاری ۱/۴۹۱ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل/ مشکوٰۃ ۲/۴۵۸ باب تغیر الناس، فصل اول۔

(۲) سنن الترمذی ج ۲ ص ۹۳ باب ما جاء فی افتراق ہذہ الأمۃ/ مشکوٰۃ ص ۳۰ باب الاعتصام، فصل ثانی، عن عبداللہ بن عمرو۔

(۳) بخاری ۱/۴۹۰ باب قول اللہ واذکر فی الکتاب مریم/ مشکوٰۃ ۲/۴۱۷ باب المفاخرۃ، فصل اول۔

طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں پس عبداللہ ورسولہٗ کہا کرو۔ دو لفظ بیان فرمائے "عبداللہ" "ورسولہٗ" اس کا یہ معنی نہیں کہ "عبداللہ ورسولہٗ" کے علاوہ کچھ کہنا دُرست نہیں، جیسے ہم "سیدالرسل" کہتے ہیں، "فخرالرسل" کہتے ہیں، "اِمام الانبیاءؑ" کہتے ہیں، "سرورِکائنات" کہتے ہیں، "فخرِ موجودات" کہتے ہیں، "شافعِ یومِ محشر" کہتے ہیں، اس قسم کے القاب سرورِکائنات ﷺ کی تعریف اور مدح میں ہم استعمال کرتے ہیں، تو یہ کوئی اس روایت کے خلاف نہیں، جیسے کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "عبداللہ ورسولہٗ" کہا کرو۔ تو اس قسم کے القاب کا اختیار کرنا اس روایت کے خلاف نہیں، کیونکہ یہاں "عبداللہ ورسولہٗ" کا لفظ بول کر حضور ﷺ نے تعریف کی حد بندی کی ہے، کہ میری مدح اور میری تعریف اگر کرنا چاہو تو اس کی یہ دو طرفیں ہیں، کہ میں اللہ کا بندہ بھی ہوں اور اللہ کا رسول بھی ہوں، اس لیے میری تعریف میں اس قسم کے لفظ استعمال نہ کرنا جو میری عبدیت کے منافی ہوں کہ مجھے عبدیت سے نکال کر تم اُلوہیت کی طرف لے جاؤ، جیسی باتیں اللہ کے متعلق بولی جاتی ہیں، میرے متعلق بھی ایسے ہی کہنے لگ جاؤ، جب تم میری تعریف اس انداز سے کرو گے جس طرح سے اللہ کی تعریف کی جاتی ہے اور ایسی باتیں میری طرف منسوب کرنے لگ جاؤ گے جس قسم کی باتیں اللہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ذہن میں میرا "عبداللہ" ہونا نہیں رہا۔ اور صرف میرے "عبد" ہونے کی طرف دیکھتے ہوئے ایسی باتیں بھی میری طرف منسوب نہ کرنا جو میری شان کے مناسب نہ ہوں، گھٹیا درجے کی باتیں ہوں، جیسے عام انسانوں کے متعلق کی جاتی ہیں، اگر تم میرا تذکرہ اس انداز سے کرو گے جس طرح عام انسانوں کا کیا جاتا ہے، اور میری طرف ایسی باتیں منسوب کرو گے جو گھٹیا قسم کی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ ہونے کا تصور تمہارے ذہن میں نہیں رہا۔ اِفراط سے بچانے کے لئے تو "عبداللہ" ہونے کا اظہار فرمایا کہ تعریف میں آگے نہ بڑھ جائیو، میں اللہ کا بندہ ہوں، لیکن ادب واحترام میں کسی قسم کی کوتاہی بھی نہ کیجیو، کیونکہ میں "اللہ کا رسول" ہوں، ان دونوں باتوں کی رعایت رکھتے ہوئے کہ "اللہ تعالیٰ کا بندہ" بھی قرار دو اور "اللہ کا رسول" بھی قرار دو، ان دونوں حدوں کی رعایت رکھتے ہوئے جس قسم کی بھی تعریف تم کر سکتے ہو کرو، ایسی بات بھی منسوب نہ کرو جو شانِ رسالت کے منافی ہے، کیونکہ یہ تفریط اور کوتاہی ہے، اور ایسی بات بھی حضور ﷺ کی طرف منسوب نہ کرو جو شانِ عبدیت کے منافی ہو، تو شانِ عبدیت کو اور شانِ رسالت کو باقی رکھتے ہوئے حضور ﷺ کی مدح اور تعریف میں جو کلمات بھی استعمال کیے جائیں ٹھیک ہیں، گویا کہ اس روایت میں حضور ﷺ نے اپنی مدح اور تعریف کے لئے دو حدیں بتائی ہیں کہ نہ تو عبدیت کے منافی کوئی بات میری طرف منسوب کرو، نہ رسالت کے منافی کوئی بات میری طرف منسوب کرو، عبدیت اور رسالت دونوں کی رعایت رکھتے ہوئے جو تعریف بھی کی جائے وہ بجا ہے۔

اور اس صراطِ مستقیم کو اُمت کے لوگوں نے چھوڑا، انبیاء علیہم السلام کے متعلق اس اُمت کے لوگوں نے بھی عقیدہ ایسے ہی بنایا جیسے کہ نصاریٰ کا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، تو کہنے والوں نے یہی کہا کہ "اللہ ہی محمد ﷺ کی شکل میں آ گیا" اس قسم کے شعر

جو پڑھا کرتے ہیں، کہ جو ''عرش پر مستوی تھا اَحد ہو کر وہ اَحمد بن کر مدینہ منورہ میں آ گیا''، ''اَحد اور اَحمد میں صرف ایک میم کا پردہ ہی ہے''، ''میم کا پردہ اوڑھ کر آ گئے، اور جن کی نظر کمزور ہے اور اس پردے کے اندر نہیں دیکھ سکتے وہ تو اَحد اور اَحمد میں فرق کرتے ہیں، اور جن کو اللہ نے بینائی دے دی وہ اندر تک پہنچتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ میم کا برقع اوڑھا ہوئے ہے، باقی اندر سے اَحد ہی ہے!'' تو یہ اسی قسم کا عقیدہ ہے جس قسم کا عقیدہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ کہہ کر عیسائیوں نے اختیار کیا تھا، تو ایسا بھی کُفر اس اُمت میں ہوا، اور اس طرح سے حصہ دار بنا دیا جائے جس طرح ثالث ثلاثہ کہنے والوں نے کہا۔ تو خدائی کے اندر حصے دار بنا دیا جائے تو یہ بھی اس طرح سے عیسائیت والا عقیدہ ہو جائے گا، اگر انبیاء اور اولیاء کے متعلق اس قسم کے عقیدے رکھے جائیں تو یہ سب کا سب غلو ہے۔

غلوّ سے بچنے کا سنہری اُصول اور غلوّ کے مفاسد

اور اس غلو سے بچنے کے لئے جو طریقہ بتایا گیا وہ یہ ہے: لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: بس اس اُصول کو اگر لازم پکڑ لو گے تو غلو سے بچ جاؤ گے، کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بات وہی کہو جو دلیل صحیح کے ساتھ ثابت ہے، اپنی طرف سے اس میں آمیزش نہ کرو، عقائد کے بارے میں بھی عقیدہ وہی رکھو جو دلیلِ صحیح سے ثابت ہو، مثلاً کتابُ اللہ میں آ گیا، یا اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے بیان کرنے کے لئے جو مبین بنا کر بھیجے یعنی اپنے رسول، انہوں نے صراحت کے ساتھ اس بات کو بیان کر دیا، عقیدہ اور نظریہ بھی اسی کے مطابق رکھو، اس کے اندر اپنی طرف سے آمیزش کر کے حد سے تجاوز نہ کرو، اَحکام کے درجے میں بھی ہر چیز کو اسی طرح مانو جس طرح قرآن اور حدیث کے ساتھ ثابت ہوگئی، اگر دلیل کے ساتھ اس کا فرض ہونا ثابت ہے تو اس کو فرض سمجھو، واجب ہے تو واجب کے درجے میں رکھو، سُنّت ہے تو سُنّت کے درجے میں رکھو، مستحب ہے تو مستحب کے درجے میں رکھو، ادب کے درجے میں ہے تو ادب کے درجے میں رکھو، مکروہ ہے تو مکروہ سمجھو، حرام ہے تو حرام سمجھو۔ اور اگر کوئی شخص ایک ایسی چیز کے متعلق جو دلیل کے ساتھ محض مستحب ثابت ہوتی ہے لیکن برتاؤ اُس کے ساتھ وہ کرے جس طرح فرض قطعی کے ساتھ کیا جاتا ہے، یا ایک چیز کے متعلق دلیل سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اس میں صرف کراہتِ تنزیہی ہے لیکن اس کے ساتھ معاملہ وہ کرے جس طرح حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے، یا ایک چیز نہ فرض ہے نہ واجب ہے، اِباحت کے درجے میں ہے، اور اُس کو اپنے طور پر ایسے اپنا لیا جائے جیسے کہ واجب یا فرض ہوتا ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ بدعت اسی دروازے سے آتی ہے اور یہی غلو فی الدین ہے، جس وقت بھی دین کا حلیہ بگڑتا ہے اسی طرح بگڑتا ہے، کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ باتوں پر اِکتفاء نہیں کرتے بلکہ اپنی پچر ساتھ لگانی شروع کر دیتے ہیں، اِجتہادی اَحکام کو قطعیات کے درجے میں لے گئے، مباحات کو فرائض کے درجے میں لے گئے، اور سنن کے ساتھ وہ معاملہ شروع کر دیا جو قطعی فرائض کے ساتھ ہوتا ہے، مکروہات کو حرام قرار دے دیا، یا جو چیز حرام تھی اس کے ساتھ وہ برتاؤ شروع کر دیا جو حلال کے ساتھ ہوتا ہے، اور فرضوں کے ساتھ لاپروائی شروع کر دی، اور اس کے خلاف کو اِختیار کر لیا، تو یہ چیزیں جو دلیل کے ساتھ ثابت نہ

ہوں جب ان کو یوں بیان کیا جاتا ہے تو یہ دین کے اندر غلو ہے، اور اسی کو ہم بدعت کہتے ہیں، یہی ایجادِ بندہ کہلاتی ہے، اور اس کا اختیار کرنا غلو فی الدین کی بنا پر بسا اوقات انسان کے لئے گمراہی کا باعث بنتا ہے، اور اگر نظریات اور عقیدے کے اندر اس قسم کا غلو آجائے تو بسا اوقات انسان کفر تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ وہی شخص اس غلو فی الدین سے بچ سکتا ہے جو اس اُصول کو مضبوطی سے تھام لے کہ دلیل کے ساتھ جو بات ثابت ہے ہم اُسے ہی بیان کریں گے، اُسے ہی اختیار کریں گے، اُسے ہی اپنائیں گے، اپنے طور پر چاہے کتنی ہی حسین چیز کیوں نہ ہو ہم اس کے ساتھ اس کا پیوند نہیں لگائیں گے، اگر اس نظریے پر آپ پکے رہیں گے تو آپ صراطِ مستقیم پر ہیں اور غلو فی الدین سے بچ جائیں گے، ورنہ اگر عقائد ونظریات میں اس کے خلاف اختیار کیا جائے گا تو بھی گمراہی ہے، اور عمل کے اندر اس چیز کو اِختیار کیا جائے گا تو بھی گمراہی ہے۔ تو وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ یہ گویا کہ غلو فی الدین سے بچنے کی ایک صورت ہے، اور گمراہی جب بھی اُمتوں میں آئی اسی طرح سے آئی کہ اپنے طور پر ایک چیز کو اچھا سمجھ کر اس کو دین بنالیا گیا جبکہ دلیل کے ساتھ اس کا دین ہونا ثابت نہیں ہے۔

بدعت کی مذمت مثال کے ذریعے

اس بات کو سمجھانے کے لئے میں آپ کی خدمت میں ایک مثال عرض کردوں، کہ ہمارے ہاں ایک سکہ چلتا ہے جس کو ہم نوٹ کہتے ہیں، وہ سرکاری طور پر جاری ہوتا ہے، اس پر حکومت کی مہر ہوتی ہے، ذمہ دار آدمی کے دستخط ہوتے ہیں، اگر آپ کو وہ سکہ کہیں سے مل جائے، یا نوٹ مل جائے سو کا، پچاس کا، دس کا، پانچ کا، آپ اُس کو بِلا جھجک اپنی جیب میں رکھیں گے، کسی جگہ گرفتار ہونے کا آپ کو اندیشہ نہیں ہے، اور جہاں آپ کو ضرورت پیش آئے گی چاہے سرکاری دفاتر ہوں، چاہے بازار ہو، دُکان ہو، کہیں بھی ہوں، آپ اپنی جیب سے نوٹ کو نکالیں گے، دُکان دار کے سامنے پیش کریں گے، پیش کرنے کے بعد اُس کے معاوضے میں جو چیز حاصل کرنا چاہیں گے آپ کو مل جائے گی، اُس کی مالیت آپ کے پاس محفوظ ہے، جب چاہو اُس سے فائدہ اُٹھالو، اب اگر وہ نوٹ نیا نویلا اور خوبصورت ہے تو بھی اُس کی مالیت وہی ہے، اور اگر وہ کسی درجے میں میلا ہو گیا بلکہ اگر کسی درجے میں پھٹ بھی گیا تو چونکہ حکومت کی ذمہ داری ہے، وہ نوٹ لیتے ہیں اور آپ کو اُس کی مالیت ادا کردیتے ہیں، جب چاہیں آپ اس سے فائدہ اُٹھالیں۔ اور اس کی بجائے ایک آدمی اپنے طور پر اس کاغذ سے بڑھیا کاغذ لے لے، اور جس قسم کا نقش ونگار اس کے اُوپر کیا گیا ہے اُس سے بڑھیا نقش ونگار کرلے، نقش ونگار کرنے کے بعد اُس کے اُوپر وہی سو روپیہ لکھ لے، اور پھر بازار میں اُس کو سو روپے کی جگہ چلانے کی کوشش کرے، تو آپ کو معلوم ہے کہ حکومت کی نظر میں یہ بدترین قسم کا مجرم ہے، اور اگر یہ پکڑا گیا تو اس کو انتہائی درجے کی سخت سزا دی جائے گی، اور وہ نوٹ جو یہ بنا کرلے گیا ہے یہ بچوں کے ہاتھ میں کھیلنے کے تو کام آسکتا ہے، اس کی مالیت بازار میں کوئی نہیں، حالانکہ اس کا کاغذ اچھا ہے، نقش ونگار اچھا ہے، سو روپیہ اس کے اُوپر لکھا ہوا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہ حکومت کا منظور شدہ

نہیں ہے۔ جونوٹ حکومت کا منظور شدہ ہے وہ میلا بھی ہوتو اپنی مالیت ادا کرتا ہے، اور اگر حکومت کا منظور شدہ نہیں ہے اور آپ نے اپنے طور پر بنایا ہے تو خوبصورت سے خوبصورت تر بھی اگر آپ بنالیں گے تو اُس کی کوئی مالیت نہیں، اُلٹا یہ جرم ہے۔ شرعی اَحکام کو بالکل اسی طرح سمجھئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جو بیان کر دیا گیا اور اللہ کے رسول نے جو عمل کر کے دکھادیا تو یہ رجسٹرڈ سکہ ہے، اگر آپ اس کو اپنی جیب میں لے کر جائیں گے اللہ تعالیٰ کے دربار میں، تو اس کی مالیت آپ کو یقیناً ادا کی جائے گی، کیونکہ اُس کے اُوپر رسول کے دستخط موجود ہیں، ذمہ داری کے ساتھ یہ سکہ چلایا گیا ہے، اور آپ اس کو آخرت کے بازار میں لے جائیں گے تو اس کی مالیت وصول کرلیں گے، لیکن اگر آپ نے اپنے طور پر عمل اختیار کیا اور خوبصورت سے خوبصورت طریقہ اختیار کرلیا تو اس کے اُوپر ثواب تو کیا ملنا ہے، اُلٹا اللہ تعالیٰ کے ہاں مجرمانہ طور پر گرفتار ہو جاؤ گے، کہ تمہیں ہماری خدائی کے اندر اپنے اَحکام جاری کرنے کا حق کس نے دیا تھا؟ اس لئے اپنے طور پر کوئی حکم بنا کر اُس کو شرعی قرار دے دینا اور اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف منسوب کر دینا، اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں بغاوت ہے۔ بدعت کی سب سے زیادہ مذمت اسی لئے کی جاتی ہے کہ اس کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں بغاوت کا پہلو موجود ہے، یہ حکومت کے مقابلے میں ایک نئی حکومت ہے، متوازی حکومت قائم کرلی، کہ اَحکام جاری کرنا تو اللہ کا کام تھا، اور ان اَحکام کی وضاحت اللہ کے رسول کے ذِمے تھی، اور ہم نے اپنے طور پر ٹکسال بنالیا، اور اللہ کے اَحکام کے مقابلے میں نئے اَحکام جاری کرنے شروع کر دیے، یہ ہے جس کے ساتھ دِین میں بربادی آتی ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اہلِ کتاب کو یہی بات یہاں سمجھاتے ہیں۔ ''اہلِ کتاب'' کا لفظ اگرچہ یہود ونصاریٰ دونوں پر بولا جاتا ہے، لیکن یہاں نصاریٰ مُراد ہیں جس طرح سے آگے آنے والی باتوں سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ بہرحال ہدایت کی بنیاد یہی ہے وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: کہ اللہ کے متعلق وہی بات کہو جو ثابت ہے، حقیقت ہے، دلیل کے ساتھ اُس کا ثبوت ہوگیا، اپنے طور پر باتیں بنا بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کیا کرو۔

عیسائیوں کی نظریاتی گمراہی کی نشان دہی

اب آگے ان کی نظریاتی گمراہی جو انہوں نے اپنے طور پر باتیں بنائی تھیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل کے ساتھ ثابت نہیں تھیں، اُس کی نشاندہی ہے۔ ''سوائے اس کے نہیں کہ مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے، اور اُس کے کلمہ کن کی پیداوار ہے'' رسول اللہ کا عقیدہ بالکل ٹھیک ہے، باقی رہا کہ بن باپ پیدا ہوئے تو وہ اللہ کے کلمے کا اثر ہے ''وہ کلمہ اللہ نے مریم کی طرف ڈالا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ذی رُوح ہے'' رُوح کی نسبت اللہ کی طرف کردی، ''رُوح اللہ'' کہہ دیا، جس طرح ہم ''بیت اللہ'' کہتے ہیں شرافت کو ظاہر کرنے کے لئے۔ ''پھر تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے سب رسولوں پر''، تو عیسیٰ علیہ السلام بھی ان رسولوں میں سے ایک رسول ہے، جیسا عقیدہ تم نے باقی رسولوں کے متعلق رکھنا ہے ویسا ہی عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق رکھنا ہے، یہ بھی تو اُسی زنجیر کی ایک کڑی

ہیں، اسی سلسلے کے ایک فرد ہیں، جیسے درجات ان کے ہیں اور جیسی خصوصیت ان کی ہے اسی طرح سے عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں۔ ''اور ثلاثہ نہ کہا کرو'' تثلیث کا عقیدہ چھوڑ دو، ''باز آجاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، سوائے اس کے نہیں کہ اللہ اِلٰہ واحد ہے'' اس میں ثلاثہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، ''وہ اس بات سے پاک ہے کہ اُس کے لئے اولاد ہو'' اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ بھی نہ کہو، اولاد سے اللہ پاک ہے، ''اُسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کافی کارساز ہے'' اُس کو کسی دوسرے شریک کی ضرورت نہیں۔ پھر آگے فرمایا کہ تم تو عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس طرح کا عقیدہ اختیار کرتے ہو، خود عیسیٰ علیہ السلام سے بھی تو پوچھو کہ وہ اپنے متعلق کیا کہتے ہیں؟ یعنی جس کو ہماری زبان میں کہا جاتا ہے ''مدّعی سست گواہ چست'' کہ مدّعی تو دعویٰ کرتا نہیں، گواہی دینے والے پہلے موجود ہیں، اب عیسیٰ علیہ السلام تو اپنی عبدیت کا اعلان کریں اور یہ کہیں کہ تُو عبد نہیں، تُو اِلٰہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے

حدیث شریف میں آتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ تیری مثال میری اُمت کے اندر عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے، جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو قسم کے لوگ گمراہ ہوئے ہیں، تیرے بارے میں بھی دو قسم کے لوگ گمراہ ہوں گے، ایک کوتاہی کرنے والے جیسے یہود، کہ انہوں نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے مرتبے پر نہ رکھا، بلکہ اتنا گھٹایا کہ ان کو ایک شریف انسان بھی قرار نہ دیا، ان کی ماں پر بھی تہمتیں لگائیں، وہ بھی گمراہ ہوئے۔ اور ایک محبِّ مُفرِط یعنی محبت کے اندر اِفراط کرنے والے، کہ انہوں نے اتنا بڑھایا کہ بشریت سے نکال کر اُلوہیت میں لے گئے، تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا[1] کہ تیرے بارے میں بھی میری اُمت میں دو فریق گمراہ ہوں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا ایک فرقہ جس کو ہم ''خارجی'' کہتے ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوتاہی کا شکار ہوئے کہ وہ ان کو مؤمن بھی نہیں سمجھتے، اور دُوسرے محبِّ مُفرِط جن کو ہم ''رافضی'' کہتے ہیں، انہوں نے اتنا بڑھایا کہ ان کو ان کی حد سے نکال کر پتا نہیں کہاں تک لے گئے، رسولوں سے بھی اُوپر لے گئے، اور اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت میں برابر کا شریک کردیا۔ بعض تاریخی روایات کے اندر مذکور ہے کہ عبداللہ بن سبا کا ٹولہ علی رضی اللہ عنہ کو ''رَبّ'' کہتا تھا کہ یہ رَبّ ہے، اِلٰہ ہے، خدا ہے۔ جیسے آج بھی روافض کے عقیدے اپنے اَئمہ کے متعلق کچھ اسی قسم کے ہیں، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو گرفتار کروایا اور زندہ جلادینے کا حکم دیا، ''زَنادقہ'' کے لفظ کے ساتھ اس کا ذکر صحیح روایات میں آیا ہوا ہے، کہ بعض زَنادقہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زندہ جلادیا تھا، اور یہ ''زَنادقہ'' کون تھے؟ شراحِ حدیث نے لکھا ہے کہ یہ وہی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اُلوہیت کی نسبت کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اِلٰہ کہنے والے زِندیق تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو پکڑوایا اور ان کو زِندہ جلادیا، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کو جب پتا چلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو زِندہ جلادیا تو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے انکار فرمایا تھا

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۵۶۵ عن علیؓ / مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۷۔

کہ اگر میں ہوتا تو ان کو قتل کرواتا، زندہ نہ جلاتا، کیونکہ حضور ﷺ نے آگ کے ساتھ عذاب دینے سے منع فرمایا تھا،[1] ہمیں چاہیے کہ ہم کسی چیز کو زندہ نہ جلائیں۔ جیسے ایک حدیث میں ہے: ''لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ''[2] کہ آگ کے ساتھ عذاب دینا رَبُّ النار کا ہی کام ہے۔ بہرحال حدیث شریف میں صحیح روایات کے اندر یہ واقعہ موجود ہے، زندیق کی تفصیل میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اُلوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آگے تاریخ کے اندر یہ بات مذکور ہے کہ اس فرقے کے دوسرے لوگ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گرفت میں نہیں آسکے، جب انہیں پتا چلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو زِندہ جلادیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو ہمیں اور دلیل مل گئی کہ علی ہی خدا ہے، کیونکہ جب حدیث میں آتا ہے کہ: ''لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ'' کہ آگ کے ساتھ عذاب وہی دیا کرتا ہے جو رَبُّ النار ہو، جب علی نے آگ کے ساتھ عذاب دیا تو معلوم ہوگیا کہ یہ رَبُّ النار ہے،[3] یعنی جو سزا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رُبوبیت کی نسبت کی بنا پر ان بد دِماغوں نے اسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رُبوبیت کی دلیل بنالیا، کہ جب حدیث میں آتا ہے کہ آگ کے ساتھ عذاب دینا رَبُّ النار کا ہی کام ہے، اور علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو آگ کا عذاب دیا تو معلوم ہوگیا کہ رَبُّ النار یہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں مدعی سست اور گواہ چست، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو برداشت نہیں کرتے کہ ان کی طرف رُبوبیت کی نسبت ہو، اور اتنے بیزار ہیں کہ اس قسم کی نسبت کرنے والوں کو زِندہ جلادیا، اور لوگ کہتے ہیں کہ یہی دلیل ہے کہ یہ رَبُّ النار ہیں، آگ کا مالک بھی یہی ہے۔

تو ایسا حساب یہاں بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ کا عبد بننے سے عار ہی نہیں کرتے، ان کے دِل میں تو کسی قسم کی کوئی بڑائی نہیں ہے کہ اللہ کی عبادت سے اِعراض کریں، اور اِنہوں نے عبودیت سے نکال کر پتا نہیں کہاں تک پہنچادیا؟! ایسے ہی اللہ کے مقرب فرشتے بھی اللہ کی عبادت سے کوئی عار نہیں کرتے، اللہ کا بندہ بننا ان کے نزدیک اچھی شان ہے، عبودیت ان کے لئے شرف ہے، عبودیت سے نہ ان کو نفرت نہ اِستکبار۔ تو اس لئے یہاں وہی بات ہوگی کہ وہ تو اپنے متعلق ''عبد'' ہونے کا اعلان کریں اور تم لوگوں نے غلو کرکے ان کو عبدیت سے نکال کر اُلوہیت میں داخل کردیا۔

مجموعی طور پر تمام اِنسانوں کو اِیمان لانے کا حکم

تثلیث کے عقیدے کی تردید کرنے کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کو رَدّ کرنے کے بعد پھر اِجتماعی طور پر تمام انسانوں کو خطاب کرکے ایمان لانے کا حکم ہے، جیسے کہ ان آیات کی اِبتدا میں بھی ''يَآ أَيُّهَا النَّاسُ'' کا خطاب کرکے ایمان لانے کی

---

(۱) بخاری ۲/ ۱۰۲۳ کتاب استتابة المرتدین / مشکوۃ ۲/ ۳۰۷ باب قتل اهل لردۃ۔ نوٹ:- زنادقہ کے مصداق میں یہ ایک قول ہے، اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

(۲) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۷ باب فی کراهیة حرق العدو/ مشکوۃ ۲/ ۳۰۷، باب قتل اهل لردۃ، فصل ثانی۔

(۳) وسطیة اهل السنة بین الفرق ج ۱ ص ۲۱۷ مطبوعہ بیروت۔ وغیرہ۔

دعوت دی گئی تھی، "اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے واضح دلیل آ گئی" اور اس واضح دلیل کا مصداق سرورِ کائنات ﷺ کا وجود ہی ہے، آپ کا وجود اپنی صفات کے ساتھ اور معجزات کے ساتھ حق کی ایک بہت نمایاں دلیل تھی، "اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایک واضح نور اُتار دیا" اس کا مصداق کتاب اللہ ہے جو اپنی روشنی میں حق اور باطل کو نمایاں کر کے دکھا دیتی ہے، اور اللہ کی طرف قُرب کے راستوں کو واضح کرتی ہے، "پھر جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور اس کو مضبوطی سے تھامیں پس عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا، اور اپنی طرف ان کو صراطِ مستقیم پر چلائے گا" یعنی ایسے راستے پر چلائے گا جس کے نتیجے میں اللہ کا قُرب نصیب ہوگا۔ یہ مضمون اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

آخری آیت کا مفہوم

اور سورت کی اِبتدا میں چونکہ میراث کے مسائل کی تفصیل آئی تھی، تو اس میں سے ایک جزء کی یہاں کچھ وضاحت کی جارہی ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص مرجائے جس کی اولاد بھی موجود نہیں، اُصول بھی موجود نہیں، لوگوں نے پوچھا تھا کہ اس کی وراثت کو کس طرح سے تقسیم کیا جائے؟ تو اس آیت میں اس کی وضاحت کردی گئی، مضمون آپ کے سامنے واضح ہوگیا، اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ: اگر کوئی شخص ہلاک ہوجائے اور اُس کے لئے اولاد موجود نہ ہو، اور ایسے ہی روایات سے ثابت ہے کہ اُصول بھی موجود نہ ہوں، "اور اُس کے لئے بہن ہو" بہن سے یہاں عینی بہن مراد ہے، "تو اس بہن کے لئے اُس کے چھوڑے ہوئے ترکے کا نصف ہوگا، اور وہ بھائی اُس بہن کا وارث بنے گا" یعنی ایسی بہن مرجائے جس کے اُصول وفروع موجود نہیں ہیں، "بھائی اُس بہن کا وارث بنے گا اگر اُس بہن کے لئے اولاد نہیں" چونکہ بھائی عصبہ ہے اس لئے وہ کُل جائیداد لے لے گا، "اور اگر وہ بہنیں دو ہوں تو ان دونوں کے لئے دو ثلث ہے اس مال میں سے جو اس نے چھوڑا، اور اگر وہ بہن بھائی مرد اور عورت اکٹھے ہیں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ: تو پھر مذکر کے لئے دولڑکیوں کے برابر حصہ ہے، اللہ تعالیٰ وضاحت کرتا ہے تمہارے لیے اَنْ تَضِلُّوْا: لِئَلَّا تَضِلُّوْا تاکہ تم بھٹک نہ جاؤ، معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اَحکام کے خلاف چلنا ضلالت ہے، "اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔"

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ